بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً

تذکرۃ المحدثین رحمہم اللہ

حصہ اول تا سوم

مرتبہ: ضیاالدین اصلاحیؒ

MAKTABA-E-REHMANIA

مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)

بَلِّغُوا عَنِّی وَلَوْ اٰیَۃً

تذکرۃ المحدثین

حصہ اول

اس میں دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات و سوانح اور اُن کی خدمات حدیث کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

مرتبہ: ضیاء الدین اصلاحیؒ

مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)
اقراء سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون: 37355743-37224228-042

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

MAKTABA-E-REHMANIA

مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)

نام کتاب: .... تذکرۃ المحدثین (اول)

مرتبہ: .... ضیاء الدین اصلاحیؒ

ناشر: .... مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)

مطبع: .... لٹل سٹار پرنٹرز لاہور

ضروری وضاحت

ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کے لیے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لیے پھر بھی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرما دیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

Marfat.com

فہرست مضامین

حصہ اول

مقدمہ ۳۷

امام مالک رحمہ اللہ ۴۲

نام ونسب وولادت: ۴۲
تعلیم وتربیت: ۴۳
مدینہ کے فقہائے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین: ۴۳
تابعین مدینہ رحمہم اللہ: ۴۳
فقہائے سبعہ رحمہم اللہ: ۴۳
شیوخ مالک: ۴۳
امام کے شیوخ اعزہ: ۴۴
علم حدیث: ۴۴
شیوخ کی تعداد: ۴۵
غیر مدنی شیوخ: ۴۵
علم فقہ: ۴۵
امام مالک رحمہ اللہ کا انتخاب شیوخ: ۴۶
خصوصیات شیوخ مالک رحمہ اللہ: ۴۶
امام صاحب نے اہل عراق سے کیوں روایت نہیں کی: ۴۷
اپنے دادا اور بعض فقہائے سبعہ سے کیوں نہیں روایت کی: ۴۷
اساتذہ آپ کے معترف تھے: ۴۸
مجلس درس: ۴۸
مجلس مالک: ۴۹
مجلس کی تہذیب: ۴۹
طریقۂ درس: ۵۰
اس طریقہ کی خوبی: ۵۱
مجلس درس کی شہرت: ۵۱
تلامذہ ومستفیدین ۵۲
تلامذہ کی خصوصیات: ۵۲
فقہ وفتاوی ۵۳
فقہ مالک: ۵۳
حکومت کا اعلان: ۵۳
حکومت کے مقابلہ میں آزادی فتوی طلاق مکرہ: ۵۴
لا ادری: ۵۴
ممالک بعیدہ کے استفتا سے احتراز: ۵۴
رائے پوچھنے پر زجر: ۵۵
جواب میں کاوش فکر: ۵۵
انصاف پسندی: ۵۵
اہل علم کا اعتراف ۵۵
عام حالات ۵۶
طلاق مکرہ کا فتوی: ۵۷
منصور کی لاعلمی اور ندامت: ۵۸
وفات ۶۰
اخلاق وعادات اور ذاتی حالات ۶۱
طاعت الٰہی۔ حب رسول: ۶۱
حب مدینہ: ۶۲
فیاضی: ۶۲

Marfat.com

مہمان نوازی: ۶۲
صبر واستقلال: ۶۲
حلم وعفو: ۶۲
حق گوئی وآزادی: ۶۲
خودداری: ۶۳
انصاف پسندی: ۶۳
اہل علم کی عزت: ۶۳
حلیہ: ۶۴
پوشاک: ۶۴
تصنیفات ۶۴
مؤطا ۶۶
مؤطا: ۶۶
تالیف مؤطا: ۶۶
وجہ تسمیہ: ۶۷
تعداد مرویات: ۶۷
موضوع: ۶۷
مؤطا اور دیگر فقہائے مجتہدین کے مجموعہ ہائے حدیث: ... ۶۸
مؤطا اور اس کی معاصر کتابیں: ۶۸
طبقات کتب حدیث میں مؤطا کا درجہ: ۶۸
طبقہ اولیٰ میں مؤطا کا درجہ: ۶۹
مؤطا کے نسخے: ۶۹
شروح وتعلیقات: ۷۰
مؤطا کا ایک اور امتیاز: ۷۰

امام ابوداؤد طیالسی رحمۃ اللہ علیہ ۷۱

نام ونسب: ۷۱
ولادت: ۷۱
خاندان ووطن: ۷۱
اساتذہ وشیوخ: ۷۱
تلامذہ: ۷۲
رحلت وسفر: ۷۲
فضل وکمال: ۷۲
حفظ وضبط: ۷۲
عدالت وثقاہت: ۷۳
معرفت حدیث: ۷۳
اخلاق وعادات: ۷۴
وفات: ۷۴
مسند طیالسی: ۷۴
ترتیب وتبویب: ۷۵
خصوصیات: ۷۵
بعض اعتراضات اور ان کا جواب: ۷۵

امام عبدالرزاق بن ہمام رحمۃ اللہ علیہ ۷۷

نام ونسب: ۷۷
ولادت، وطن اور خاندان: ۷۷
اساتذہ: ۷۷
تلامذہ: ۷۷
رحلت وسفر: ۷۸
مقبولیت ومرجعیت: ۷۸
اعتراف کمال: ۷۸
حفظ وضبط: ۷۸
ثقاہت: ۷۸
پیشہ: ۷۹
شعر وسخن: ۷۹
وفات: ۷۹
تصنیفات ۷۹
عبدالرزاق پر نقد وجرح: ۷۹
ا۔ شیعیت: ۷۹
۲۔ سوء حفظ وفتور عقل: ۸۰

Marfat.com

امام اسد بن موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ ۸۱

نام ونسب: ۸۱
ولادت، وطن، خاندان: ۸۱
اساتذہ وشیوخ: ۸۱
تلامذہ: ۸۱
طلب حدیث کے لیے سفر: ۸۱
حفظ وثقاہت: ۸۱
اتباع سنت: ۸۲
وفات: ۸۲
اولاد: ۸۲
تصنیفات: ۸۲
ایک اعتراض کا جواب: ۸۲

امام عبید اللہ بن موسیٰ عبسی رحمۃ اللہ علیہ ۸۳

نام ونسب: ۸۳
ولادت وخاندان ووطن: ۸۳
اساتذہ: ۸۳
تلامذہ: ۸۴
حفظ وثقاہت: ۸۴
حدیث میں درجہ: ۸۴
قراءت وتفسیر اور فقہ: ۸۴
زہد وعبادت: ۸۴
وقار: ۸۵
عقیدہ ومسلک: ۸۵
وفات: ۸۵
تصنیفات: ۸۵
ایک شبہ کا جواب: ۸۵

امام عبد اللہ بن زبیر حمیدی رحمۃ اللہ علیہ ۸۶

نام ونسب: ۸۶
خاندان ووطن: ۸۶
اساتذہ: ۸۶
تلامذہ: ۸۶
فضل وکمال: ۸۷
ضبط وثقاہت: ۸۷
فقہ واجتہاد: ۸۷
زہد وورع: ۸۷
اتباع سنت: ۸۷
عقیدہ ومسلک: ۸۷
ایمان: ۸۸
تقدیر: ۸۸
رؤیت: ۸۸
صفات الٰہی: ۸۸
مرتکبین کبائر: ۸۸
احترام صحابہ رضی اللہ عنہم: ۸۸
وفات: ۸۸
تصنیفات: ۸۹

امام سعید بن منصور رحمۃ اللہ علیہ ۹۰

نام ونسب: ۹۰
وطن: ۹۰
اساتذہ: ۹۰
تلامذہ: ۹۰
رحلت وسفر: ۹۱
عظمت: ۹۱
حفظ وثقاہت: ۹۱
وفات: ۹۱
تصنیفات: ۹۱
نقد وجرح: ۹۲

Marfat.com

امام محمد بن صباح دُولابی رحمۃ اللہ علیہ ۹۳

نام ونسب: ۹۳
ولادت: ۹۳
خاندان: ۹۳
وطن: ۹۳
اساتذہ: ۹۳
تلامذہ: ۹۴
حفظ وثقاہت: ۹۴
زہد وتقویٰ: ۹۴
عزت واحترام: ۹۴
وفات: ۹۵
اولاد: ۹۵
تصنیفات: ۹۵

امام یحییٰ بن عبد الحمید حمانی رحمۃ اللہ علیہ ۹۶

نام ونسب: ۹۶
خاندان ووطن: ۹۶
پیدائش: ۹۶
اساتذہ: ۹۶
تلامذہ: ۹۶
حدیث میں درجہ: ۹۷
ثقاہت: ۹۷
وفات: ۹۷
تصنیفات: ۹۷

امام مسدد بن مسرہد رحمۃ اللہ علیہ ۹۸

نام ونسب: ۹۸
ولادت وخاندان: ۹۸
اساتذہ وشیوخ: ۹۸
تلامذہ: ۹۸
حدیث میں امتیاز: ۹۹
حافظ: ۹۹
ثقاہت: ۹۹
وفات: ۹۹
تصانیف: ۹۹

امام نعیم بن حماد خزاعی رحمۃ اللہ علیہ ۱۰۰

نام ونسب: ۱۰۰
خاندان ووطن: ۱۰۰
اساتذہ وشیوخ: ۱۰۰
تلامذہ: ۱۰۰
طلب حدیث کے لئے سفر: ۱۰۱
حفظ وثقاہت: ۱۰۱
فقہ: ۱۰۱
علم وفضل: ۱۰۱
دینی حمیت: ۱۰۱
قید وبند: ۱۰۱
وفات: ۱۰۱
تصنیفات: ۱۰۲

امام عبد اللہ بن محمد جعفی رحمۃ اللہ علیہ ۱۰۳

نام ونسب: ۱۰۳
خاندان ووطن: ۱۰۳
اساتذہ: ۱۰۳
تلامذہ: ۱۰۳
رحلت وسفر: ۱۰۳
حفظ وثقاہت: ۱۰۴
اعتراف: ۱۰۴
وفات: ۱۰۴
حلیہ: ۱۰۴

Marfat.com

تصنیفات: ۱۰۴

امام ابوبکر بن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ ۱۰۵

نام ونسب: ۱۰۵
ولادت، خاندان اور وطن: ۱۰۵
اساتذہ اور شیوخ: ۱۰۵
تلامذہ: ۱۰۵
رحلت وسفر: ۱۰۶
اعتراف کمال: ۱۰۶
حفظ وضبط: ۱۰۶
ثقاہت: ۱۰۶
وفات: ۱۰۷
تصنیفات: ۱۰۷
مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۰۷
ترتیب: ۱۰۷
اہمیت: ۱۰۷
خصوصیات: ۱۰۸

امام اسحٰق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ ۱۰۹

نام ونسب: ۱۰۹
ولادت: ۱۰۹
خاندان ووطن: ۱۰۹
اساتذہ: ۱۰۹
تلامذہ: ۱۱۰
طلب حدیث کے لئے سفر: ۱۱۰
علم وفضل کا اعتراف: ۱۱۰
شرف امامت: ۱۱۱
علم حدیث میں کمال وامتیاز: ۱۱۱
حفظ وضبط: ۱۱۱
صدق وثقاہت: ۱۱۲
حزم واحتیاط: ۱۱۳
حفاظت واشاعت حدیث: ۱۱۳
فقہ واجتہاد: ۱۱۳
ابن راہویہ کے فقہی اصول اور بنیادیں: ۱۱۳
پہلا مناظرہ: ۱۱۴
دوسرا مناظرہ: ۱۱۴
مذہب ومسلک: ۱۱۵
عقیدہ وکلام: ۱۱۵
زہد واتقا: ۱۱۵
وفات: ۱۱۶
اولاد: ۱۱۶
تصنیفات: ۱۱۶

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ۱۱۷

نام ونسب: ۱۱۷
خاندان: ۱۱۷
ولادت: ۱۱۷
مقام پیدائش: ۱۱۷
وطن: ۱۱۷
ابتدائی تعلیم: ۱۱۸
رحلت وسفر: ۱۱۸
شیوخ واساتذہ: ۱۱۸
تلامذہ: ۱۱۸
اہل علم کا اعتراف اور شہادتیں: ۱۱۹
فضل وکمال: ۱۲۰
حافظہ: ۱۲۰
عدالت وثقاہت: ۱۲۰
نقد وتمیز: ۱۲۰
مسند درس: ۱۲۱
مرجعیت ومقبولیت: ۱۲۱

Marfat.com

عبادت واعمال ۱۲۱
نماز: ۱۲۱
نوافل: ۱۲۲
تہجد: ۱۲۲
تلاوت: ۱۲۲
دعاواستغفار: ۱۲۲
صدقہ وخیرات: ۱۲۲
روزہ: ۱۲۲
حج: ۱۲۳
آخرت کا استحضار: ۱۲۳
دُنیا سے بے رغبتی: ۱۲۳
اتباعِ سنت اور محبت رسول: ۱۲۳
جاہ ومنصب سے گریز: ۱۲۳
امراو سلاطین سے بے تعلقی: ۱۲۴
خودداری: ۱۲۵
انکسار وتواضع: ۱۲۶
شرافت وحسن خلق: ۱۲۶
وقار ومتانت: ۱۲۶
خلوت پسندی: ۱۲۶
نظافت وپاکیزگی: ۱۲۷
ذریعہ معاش: ۱۲۷
غذا: ۱۲۷
لباس: ۱۲۷
حلیہ: ۱۲۸
ابتلاء اور آزمائش ۱۲۸
علالت ووفات: ۱۳۲
ازواج واولاد: ۱۳۳
ابوالفضل صالح: ۱۳۴
ابوعبدالرحمٰن عبداللہ: ۱۳۴
کلام وعقائد ۱۳۴
صفاتِ الٰہی اور قرآن: ۱۳۵
تشبیہ اور جسمیت: ۱۳۵
رؤیت باری: ۱۳۵
ایمان واسلام: ۱۳۵
مرتکبین کبائر: ۱۳۶
فقہ واجتہاد ۱۳۶
کیا امام احمد فقیہ اور صاحب مذہب نہیں تھے؟ ۱۳۶
افتا کے شرائط: ۱۳۷
فقہ حنبلی کے اصول: ۱۳۸
۱۔نصوص: ۱۳۸
۲۔فتاوائے صحابہؓ: ۱۳۸
۳۔ضعیف ومرسل روایات: ۱۳۸
۴۔قیاس: ۱۳۹
فقہ حنبلی کی خصوصیات: ۱۳۹
فقہ حنبلی کے رواۃ وناقلین: ۱۴۰
خلال: ۱۴۰
ابوالقاسم خرقی: ۱۴۰
غلام الخلال: ۱۴۰
اسلامی ملکوں میں اس مذہب کی اشاعت: ۱۴۰
مذہب حنبلی کے متعلق بعض شکوک واعتراضات: ۱۴۱
اتباعِ سنت: ۱۴۱
کثرت وتعدد اقوال: ۱۴۲
قیاس سے عدم تعلق: ۱۴۲
تشدد اور مذہب حنبلی: ۱۴۳
تصنیفات ۱۴۳
۱۔کتاب الصلوٰۃ: ۱۴۳
۲۔کتاب الزہد: ۱۴۴
۳۔کتاب التفسیر: ۱۴۴

Marfat.com

۴۔ کتاب السنۃ: ۱۴۴
مسند احمد بن حنبل: ۱۴۴
مسند کے اجزا اور حدیثوں کی تعداد: ۱۴۴
مسند کے مرویات کی قسمیں: ۱۴۵
مسند کی تالیف میں احتیاط: ۱۴۵
مسند کی اہمیت اور کتب حدیث میں اس کا درجہ: ۱۴۶
خصوصیات: ۱۴۶
زمانہ تصنیف: ۱۴۷
تہذیب و تنقیح: ۱۴۷
شرح وحواشی: ۱۴۸
۱۔ شرح مسند: ۱۴۸
۲۔ الدر المنتقد: ۱۴۸
۳۔ عقود الزبرجد: ۱۴۸
۴۔ غرائب مسند: ۱۴۸
۵۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۱۴۸
۶۔ جامع المسانید: ۱۴۸
۷۔ جامع المسانید والالقاب بالخص الاسانید: ۱۴۸
۸۔ اطراف المسند المعتلی باطراف المسند الحنبلی: ۱۴۹
۹۔ جمع الفوائد من جامع الاصول ومجمع الزوائد: ۱۴۹
۱۰۔ منتقی الاخبار فی الاحکام: ۱۴۹
۱۱۔ ثلاثیات مسند: ۱۴۹
۱۲۔ فہرست رجال مسند: ۱۴۹
مسند پر بعض اعتراضات: ۱۴۹
۳۔ ضعیف حدیثیں: ۱۵۰
۴۔ موضوع حدیثیں: ۱۵۰

امام محمد بن یحییٰ ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ ۱۵۱

نام ونسب: ۱۵۱
وطن: ۱۵۱
اساتذہ: ۱۵۱
تلامذہ: ۱۵۱
حفظ وثقاہت: ۱۵۲
فضل وکمال: ۱۵۲
عبادت وتقویٰ: ۱۵۲
حج: ۱۵۲
وفات: ۱۵۲
تصنیفات: ۱۵۲

امام عبد بن حمید رحمۃ اللہ علیہ ۱۵۳

نام ونسب: ۱۵۳
وطن: ۱۵۳
اساتذہ: ۱۵۳
تلامذہ: ۱۵۳
طلب حدیث کی ابتدا اور سفر: ۱۵۴
فضل وکمال: ۱۵۴
حفظ وثقاہت: ۱۵۴
وفات: ۱۵۴
تصنیفات حمید: ۱۵۴
تفسیر: ۱۵۴
مسند: ۱۵۵

امام اسحاق بن بہلول رحمۃ اللہ علیہ ۱۵۶

نام ونسب: ۱۵۶
وطن، ولادت اور خاندان: ۱۵۶
اساتذہ: ۱۵۶
تلامذہ: ۱۵۶
رحلت وسفر: ۱۵۶
حفظ وضبط: ۱۵۷
نقد وتمیز: ۱۵۷
فقہ: ۱۵۷

Marfat.com

قراءت:.......... ۱۵۷
لغت، نحو و عربیت:.......... ۱۵۷
امامت:.......... ۱۵۷
اخلاق و عادات:.......... ۱۵۷
وفات:.......... ۱۵۸
اولاد:.......... ۱۵۸
آمدنی:.......... ۱۵۸
تصنیفات:.......... ۱۵۸

امام ابو محمد عبد اللہ دارمی رحمۃ اللہ علیہ ۱۵۹

نام و نسب:.......... ۱۵۹
ولادت، خاندان، وطن:.......... ۱۵۹
اساتذہ:.......... ۱۵۹
تلامذہ:.......... ۱۵۹
طلب حدیث کے لئے سفر:.......... ۱۶۰
حفظ و ضبط:.......... ۱۶۰
ثقاہت:.......... ۱۶۰
معرفت و روایت:.......... ۱۶۱
فقہ و تفسیر:.......... ۱۶۱
عقل و دانش:.......... ۱۶۱
عبادت و تقویٰ:.......... ۱۶۱
جاہ و منصب اور دنیا طلبی سے پرہیز:.......... ۱۶۲
سنت و حدیث کی مدافعت:.......... ۱۶۲
فقہی مذہب و مسلک:.......... ۱۶۲
فضل و امامت:.......... ۱۶۲
وفات:.......... ۱۶۲
تصنیفات.......... ۱۶۳
کتب و ابواب کی تعداد:.......... ۱۶۳
ترتیب:.......... ۱۶۳
خصوصیات:.......... ۱۶۴
سنن یا مسند دارمی:.......... ۱۶۴
کیا سنن دارمی صحاح ستہ میں شامل ہے؟.......... ۱۶۵
ایک شبہ کا ازالہ:.......... ۱۶۵

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ۱۶۷

نام و نسب اور ابتدائی حالات:.......... ۱۶۷
امام صاحب کی شہرت:.......... ۱۶۸
تحصیل علم کے لئے مختلف مقامات کا سفر:.......... ۱۶۹
نیشاپور کا سفر:.......... ۱۶۹
جلاوطنی اور انتقال:.......... ۱۷۱
عام اخلاق و عادات، وجہ معاش اور تصنیفات.......... ۱۷۲
خودداری:.......... ۱۷۲
سادگی و قناعت:.......... ۱۷۲
انکساری:.......... ۱۷۲
رواداری و بے تعصبی:.......... ۱۷۳
ورزش:.......... ۱۷۳
صفائی:.......... ۱۷۳
جامع صحیح بخاری.......... ۱۷۴
صحیح بخاری کا اصلی نام احادیث اور ابواب وغیرہ کی تعداد: ۱۷۴
صحیح بخاری کی خصوصیات:.......... ۱۷۴
بخاری اور مسلم:.......... ۱۷۵
صحیح بخاری کی شرحیں:.......... ۱۷۸

امام ابو مسعود درازی رحمۃ اللہ علیہ ۱۷۹

نام و نسب:.......... ۱۷۹
وطن، خاندان و ولادت:.......... ۱۷۹
اساتذہ و شیوخ:.......... ۱۷۹
تلامذہ:.......... ۱۷۹
رحلت و سفر:.......... ۱۷۹
حفظ و ثقاہت:.......... ۱۸۰

Marfat.com

فضل وکمال: ۱۸۰
احادیث کی حمایت: ۱۸۰
زہد واتقاء: ۱۸۱
وفات: ۱۸۱
تصنیفات: ۱۸۱
مسند: ۱۸۱

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۲

نام ونسب اور ابتدائی حالات: ۱۸۲
امام صاحب کی شہرت: ۱۸۳
وفات: ۱۸۴
اخلاق وعادات: ۱۸۴
تصنیفات وتالیفات: ۱۸۶
صحیح مسلم ۱۸۶
مقدمہ مسلم: ۱۸۷
صحیح مسلم اور اس کی خصوصیات: ۱۹۶
صحیح مسلم کا طریق روایت: ۱۹۹
مسلم کے شروح وغیرہ: ۲۰۰

امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ ۲۰۲

نام ونسب: ۲۰۲
ولادت: ۲۰۲
خاندان ووطن: ۲۰۲
اساتذہ اور شیوخ: ۲۰۲
تلامذہ: ۲۰۳
رحلت وسفر: ۲۰۳
حدیث میں امتیاز: ۲۰۳
اعتراف کمال: ۲۰۳
فقہی مسلک: ۲۰۴
اعمال واخلاق: ۲۰۴
متعلقین اور اہل خاندان: ۲۰۴
وفات: ۲۰۴
تصنیفات: ۲۰۵
تفسیر: ۲۰۵
تاریخ: ۲۰۵
سنن: ۲۰۵
ترتیب وتعداد احادیث: ۲۰۵
رواۃ: ۲۰۶
اہمیت: ۲۰۶
خصوصیات: ۲۰۶
کیا سنن ابن ماجہ صحاح ستہ میں شامل نہیں ہے؟ ۲۰۷
صحاح ستہ میں سنن ابن ماجہ کا درجہ: ۲۰۹
سنن ابن ماجہ کی ضعیف ومنکر روایتیں: ۲۰۹
شروح وتعلیقات: ۲۱۱

امام ابوداؤد سجستانی رحمۃ اللہ علیہ ۲۱۳

نام ونسب: ۲۱۳
ولادت وخاندان: ۲۱۳
وطن: ۲۱۳
اساتذہ وشیوخ: ۲۱۴
تلامذہ: ۲۱۴
سماع حدیث کے لیے سفر: ۲۱۵
حفظ وضبط: ۲۱۵
جرح وتعدیل: ۲۱۵
حدیث میں کمال: ۲۱۵
فقہ واجتہاد: ۲۱۶
تفسیر ودیگر علوم: ۲۱۶
فقہی مذہب: ۲۱۶
تدین وتقویٰ: ۲۱۶
دنیوی جاہ وحشمت سے بے زاری: ۲۱۷

Marfat.com

وفات واولاد: ۲۱۷
تصنیفات: ۲۱۷
سنن ابی ابوداؤد: ۲۱۸
سنن کی اہمیت: ۲۱۸
خصوصیات: ۲۱۹
سنن ابی داؤد کی چار حدیثیں: ۲۲۰
سنن کے متداول نسخے اوران کے رواۃ: ۲۲۱
شروح وتعلیقات: ۲۲۱
معالم السنن: ۲۲۱
شرح قطب الدین: ۲۲۱
تلخیص منذری: ۲۲۱
شرح نووی: ۲۲۲
شرح ابن قیم: ۲۲۲
شرح مغلطائی: ۲۲۲
انتحاء السنن یا عجالۃ العالم: ۲۲۲
شرح ابن ملقن: ۲۲۲
شرح عراقی: ۲۲۲
شرح ابن رسلان: ۲۲۲
شرح عینی: ۲۲۳
شرح سیوطی: ۲۲۳
شرح سندی: ۲۲۳
غایۃ المقصود: ۲۲۳
عون المعبود: ۲۲۳
التعلیق المحمود: ۲۲۴
الہدی المحمود لترجمۃ سنن ابی داؤد: ۲۲۴
بذل المجہود فی حل ابی داؤد: ۲۲۴
المنہل المورد: ۲۲۵
ایک اعتراض کا جواب: ۲۲۵

امام بقی بن مخلد قرطبی رحمۃ اللہ علیہ ۲۲۶

نام ونسب: ۲۲۶
ولادت ووطن: ۲۲۶
اساتذہ وشیوخ: ۲۲۶
تلامذہ: ۲۲۶
طلب علم کے لیے سفر: ۲۲۷
حدیث میں درجہ ومرتبہ: ۲۲۷
تفقہ واجتہاد: ۲۲۷
علوم کی اشاعت: ۲۲۷
علم وفضل کا اعتراف: ۲۲۸
بعض فقہا کی مخالفت: ۲۲۸
زہد وتقویٰ: ۲۲۸
نماز: ۲۲۸
تلاوت قرآن: ۲۲۹
روزہ: ۲۲۹
حج بیت اللہ: ۲۲۹
جہاد: ۲۲۹
دعا کی برکت: ۲۲۹
اخلاق وعادات: ۲۲۹
حق پسندی: ۲۲۹
وفات: ۲۲۹
حلیہ: ۲۳۰
تصنیفات: ۲۳۰

امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ ۲۳۱

نام ونسب: ۲۳۱
وطن: ۲۳۱
پیدائش: ۲۳۱
سماع حدیث کے لیے سفر: ۲۳۱

Marfat.com

اساتذہ:......۲۳۲
حافظہ:......۲۳۳
اعتراف کمال:......۲۳۴
تلامذہ:......۲۳۴
تفسیر:......۲۳۴
فقہ:......۲۳۵
عملی زندگی:......۲۳۵
خشیت الٰہی:......۲۳۵
امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب:......۲۳۵
ایک التباس کا ازالہ:......۲۳۵
وفات:......۲۳۶
تصانیف:......۲۳۶
جامع ترمذی سے پہلے کی کتب حدیث:......۲۳۶
جامع ترمذی:......۲۳۷
جامع ترمذی کی خصوصیات:......۲۳۷
ابن حزم کی تنقید:......۲۳۹
موضوعات ابن جوزی اور جامع ترمذی:......۲۳۹
ایک اعتراض واشکال اور اس کا جواب:......۲۴۰
شروح ترمذی:......۲۴۲
تجرید ترمذی:......۲۴۴
حواشی:......۲۴۴
شمائل ترمذی:......۲۴۴
کتاب العلل:......۲۴۶

امام حارث بن ابی اسامہ رحمۃ اللہ علیہ ۲۴۷

نام ونسب:......۲۴۷
خاندان:......۲۴۷
پیدائش اور وطن:......۲۴۷
اساتذہ وشیوخ:......۲۴۷
تلامذہ:......۲۴۷
طلب حدیث کے لیے سفر:......۲۴۸
حافظہ:......۲۴۸
ثقاہت:......۲۴۸
کثرت روایت ومعرفت حدیث:......۲۴۸
عسرت وتنگدستی:......۲۴۸
خودداری:......۲۴۸
وفات:......۲۴۹
مسند:......۲۴۹
حارث پر طعن وجرح:......۲۴۹

امام احمد بن ابی عاصم نبیل رحمۃ اللہ علیہ ۲۵۰

نام ونسب:......۲۵۰
ولادت:......۲۵۰
خاندان ووطن:......۲۵۰
اساتذہ:......۲۵۰
تلامذہ:......۲۵۰
سفر:......۲۵۰
حفظ وثقاہت:......۲۵۱
فقہ:......۲۵۱
منصب قضا:......۲۵۱
مذہب ومسلک:......۲۵۱
زہد وورع:......۲۵۱
اتباع سنت واجتناب بدعت:......۲۵۱
اعتراف کمال:......۲۵۱
وفات:......۲۵۲
تصانیف:......۲۵۲

امام ابوبکر بزار رحمۃ اللہ علیہ ۲۵۳

نام ونسب:......۲۵۳
خاندان ووطن:......۲۵۳

Marfat.com

اساتذہ: ۲۵۳
تلامذہ: ۲۵۳
رحلت وسفر: ۲۵۳
حفظ وثقاہت: ۲۵۴
وفات: ۲۵۴
اولاد: ۲۵۴
مسند: ۲۵۴
بزار پر غلطی کا الزام: ۲۵۵
امام ابو مسلم کشی رحمۃ اللہ علیہ ۲۵۶
نام ونسب: ۲۵۶
ولادت: ۲۵۶
خاندان ووطن: ۲۵۶
اساتذہ وشیوخ: ۲۵۶
تلامذہ: ۲۵۷
سفر: ۲۵۷
حفظ وثقاہت: ۲۵۷
مرجعیت ومقبولیت: ۲۵۷
امارت وشکوہ اور جود وسخاوت: ۲۵۷
پیشہ: ۲۵۸
وفات: ۲۵۸
تصنیفات: ۲۵۸
امام محمد بن نصر مروزی رحمۃ اللہ علیہ ۲۵۹
نام ونسب: ۲۵۹
ولادت، خاندان وطن: ۲۵۹
اساتذہ: ۲۵۹
تلامذہ: ۲۵۹
رحلت وسفر: ۲۵۹
حدیث میں درجہ: ۲۶۰
فقہ وخلافیات: ۲۶۰
مذہب ومسلک: ۲۶۰
مقبولیت: ۲۶۰
امامت: ۲۶۰
زُہد وعبادت: ۲۶۱
ذریعہ معاش اور جود وسخا: ۲۶۱
اولاد: ۲۶۱
حلیہ: ۲۶۱
وفات: ۲۶۲
تصنیفات: ۲۶۲
مسند: ۲۶۲
کتاب القسامۃ: ۲۶۲
امام ابو محمد ابن جارود رحمۃ اللہ علیہ ۲۶۳
نام ونسب: ۲۶۳
وطن: ۲۶۳
اساتذہ: ۲۶۳
تلامذہ: ۲۶۳
ضبط واتقان: ۲۶۳
وفات: ۲۶۳
تصنیفات: ۲۶۳
امام ابو عبد الرحمٰن نسائی رحمۃ اللہ علیہ ۲۶۵
نام ونسب: ۲۶۵
پیدائش: ۲۶۵
وطن: ۲۶۵
اساتذہ اور شیوخ: ۲۶۵
تلامذہ: ۲۶۶
تعلیم وتحصیل حدیث کے لیے سفر: ۲۶۶
علم حدیث میں امتیاز: ۲۶۶

Marfat.com

حفظ وثقاہت: ۲۶۶
جرح وتعدیل: ۲۶۷
فقہ وتفسیر: ۲۶۷
عہدۂ قضا: ۲۶۷
زہد وتقویٰ اور عبادت: ۲۶۷
اخلاقی کمالات: ۲۶۸
امامت وتقدم: ۲۶۸
فقہی مذہب: ۲۶۸
عقیدہ: ۲۶۸
غذا اور لباس: ۲۷۱
خاندانی وجاہت: ۲۷۱
وفات: ۲۷۱
ازواج واولاد: ۲۷۲
حلیہ: ۲۷۲
تصنیفات: ۲۷۲
سنن نسائی کی اہمیت: ۲۷۳
خصوصیات: ۲۷۴
شروح وتعلیقات: ۲۷۵
حافظ ابن کثیر کی تنقید: ۲۷۶

امام ابو یعلی موصلی رحمۃ اللہ علیہ ۲۷۷

نام ونسب: ۲۷۷
ولادت، خاندان ووطن: ۲۷۷
اساتذہ: ۲۷۷
تلامذہ: ۲۷۷
طلب علم کے لیے سفر: ۲۷۷
حفظ وثقاہت: ۲۷۷
زہد واتقا: ۲۷۸
اخلاص: ۲۷۸
شہرت ومقبولیت: ۲۷۸
وفات: ۲۷۸
تصنیفات: ۲۷۸

امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ ۲۸۰

نام ونسب: ۲۸۰
ولادت، خاندان ووطن: ۲۸۰
اساتذہ: ۲۸۰
تلامذہ: ۲۸۰
رحلت وسفر: ۲۸۰
حفظ وثقاہت: ۲۸۱
حدیث میں درجہ ومرتبہ: ۲۸۱
فقہ واجتہاد: ۲۸۲
کلام وعقائد کے بعض مسائل: ۲۸۲
فضل وکمال کا اعتراف: ۲۸۳
اتباع سنت: ۲۸۳
بزرگی وکرامت: ۲۸۴
قناعت: ۲۸۴
سخاوت: ۲۸۴
صاف گوئی: ۲۸۵
امامت وشہرت: ۲۸۵
وفات: ۲۸۵
تصنیفات: ۲۸۶
فقہ حدیث بریرہ: ۲۸۶
کتاب التوحید والصفات: ۲۸۶
صحیح ابن خزیمہ: ۲۸۶

امام ابو عوانہ اسفرائینی رحمۃ اللہ علیہ ۲۸۷

نام ونسب: ۲۸۷
وطن: ۲۸۷
اساتذہ: ۲۸۷

Marfat.com

تلامذہ: ۲۸۷
طلب حدیث کے لیے سفر: ۲۸۸
حفظ وثقاہت: ۲۸۸
اعتراف کمال: ۲۸۸
فقہ واجتہاد: ۲۸۸
مذہب ومسلک: ۲۸۸
زہدواتقا: ۲۸۸
تصنیفات: ۲۸۹
خصوصیات: ۲۸۹
امام ابوجعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ ۲۹۰
نام ونسب: ۲۹۰
ولادت: ۲۹۰
خاندان ووطن: ۲۹۰
اساتذہ: ۲۹۰
تلامذہ: ۲۹۱
طلب علم کے لیے سفر: ۲۹۱
حفظ وثقاہت: ۲۹۱
اعتراف کمال: ۲۹۱
جامعیت: ۲۹۱
زہدواتقاء: ۲۹۲
فقہی مسلک: ۲۹۲
شافعی مذہب ترک کرنے کا سبب: ۲۹۲
وفات: ۲۹۳
اولاد۔تصنیفات: ۲۹۳
مشکل الآثار: ۲۹۵
معانی الآثار: ۲۹۶
خصوصیات: ۲۹۸
معانی الآثار پر اعتراض اور اس کا جواب: ۲۹۹
شروح وتلخیصات: ۳۰۰

حصہ دوم

دیباچہ ۳۰۳
تمہید ۳۰۵
امام عبدالباقی بن قانع رحمۃ اللہ علیہ ۳۰۶
نام ونسب: ۳۰۶
ولادت، خاندان اور وطن: ۳۰۶
اساتذہ: ۳۰۶
تلامذہ: ۳۰۶
رحلت وسفر: ۳۰۶
حفظ وثقاہت: ۳۰۷
حدیث میں درجہ: ۳۰۷
رجال: ۳۰۷
فقہ وقضا: ۳۰۷
مذہب ومسلک: ۳۰۷
وفات: ۳۰۷
تصنیفات: ۳۰۸
ابن قانع پر بعض اعتراضات: ۳۰۸
امام سعید بن السکن رحمۃ اللہ علیہ ۳۱۰
نام ونسب: ۳۱۰
ولادت ووطن: ۳۱۰
اساتذہ وشیوخ: ۳۱۰
تلامذہ: ۳۱۰
طلب علم کے لیے سفر: ۳۱۰
حفظ وثقاہت: ۳۱۱
حدیث میں درجہ: ۳۱۱
امامت وشہرت: ۳۱۱
وفات: ۳۱۱
تصنیفات: ۳۱۱

Marfat.com

۱۔ مصنف: ۳۱۱

۲۔ الصحیح المنتقی: ۳۱۲

امام ابوبکر شافعی رحمۃ اللہ علیہ ۳۱۳

نام ونسب: ۳۱۳

ولادت ووطن: ۳۱۳

اساتذہ: ۳۱۳

تلامذہ: ۳۱۳

حصول علم کے لیے سفر: ۳۱۳

ضبط وثقاہت: ۳۱۴

حدیث میں درجہ ومرتبہ: ۳۱۴

مذہب ومسلک: ۳۱۴

کارنامہ: ۳۱۴

وفات: ۳۱۴

پیشہ: ۳۱۴

تصنیفات: ۳۱۴

امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ ۳۱۶

نام ونسب: ۳۱۶

خاندان: ۳۱۶

وطن: ۳۱۶

(متوفی ۳۵۴ھ) ۳۱۶

ولادت: ۳۱۷

شیوخ واساتذہ: ۳۱۷

تلامذہ: ۳۱۷

طلب علم کے لیے سفر: ۳۱۸

حفظ وثقاہت: ۳۱۸

حدیث میں بلند پایگی: ۳۱۸

فقہ: ۳۱۸

دیگر علوم: ۳۱۸

جامعیت: ۳۱۹

فہم وفراست: ۳۱۹

علم کا شوق وذوق: ۳۱۹

منصب قضا: ۳۱۹

مقبولیت وشہرت: ۳۱۹

فقہی مسلک: ۳۲۰

جرح وتعدیل: ۳۲۰

فکر وخیال میں جدت: ۳۲۰

اخلاق وعادات: ۳۲۱

الحاد اور بدعقیدگی کا الزام اور اس کا جواب: ۳۲۱

وفات: ۳۲۷

تصنیفات: ۳۲۷

مختصرات وزوائد: ۳۲۹

ایک شبہ کا جواب: ۳۳۰

امام ابوبکر آجری رحمۃ اللہ علیہ ۳۳۲

نام ونسب: ۳۳۲

ولادت ووطن: ۳۳۲

اساتذہ وشیوخ: ۳۳۲

تلامذہ: ۳۳۳

حفظ وضبط اور حدیث میں درجہ: ۳۳۳

فقہ: ۳۳۳

تدین وتقویٰ: ۳۳۳

فقہی مسلک: ۳۳۳

وفات: ۳۳۳

تصنیفات: ۳۳۴

امام ابوالقاسم طبرانی رحمۃ اللہ علیہ ۳۳۵

نام ونسب: ۳۳۵

ولادت: ۳۳۵

Marfat.com

خاندان: ۳۳۵
وطن: ۳۳۵
اساتذہ: ۳۳۵
(متوفی ۳۶۰ھ) ۳۳۵
تلامذہ: ۳۳۶
تحصیل علم کے لیے سفر: ۳۳۶
حفظ وثقاہت: ۳۳۶
حدیث میں درجہ: ۳۳۷
فقہی مذہب: ۳۳۷
ابوبکر جعابی سے ایک دلچسپ مناظرہ: ۳۳۷
دینی غیرت وحمیت: ۳۳۸
وفات: ۳۳۸
تصنیفات: ۳۳۹
معاجم ثلاثہ: ۳۴۰
معجم کی تعریف: ۳۴۰
۷۷۔ معجم کبیر: ۳۴۰
۷۸۔ معجم اوسط: ۳۴۰
۷۹۔ معجم صغیر: ۳۴۱
امام طبرانی پر بعض اعتراضات اور ان کا جواب: ۳۴۳

امام ابوعمرو بن نجید رحمۃ اللہ علیہ ۳۴۶

نام ونسب: ۳۴۶
پیدائش، خاندان ووطن: ۳۴۶
اساتذہ وشیوخ: ۳۴۶
تلامذہ: ۳۴۶
حدیث میں درجہ: ۳۴۶
زہد وتصوف: ۳۴۷
انفاق فی سبیل اللہ: ۳۴۷
اخلاص: ۳۴۷
حکیمانہ وصوفیانہ اقوال: ۳۴۷
وفات: ۳۴۸
اولاد واحفاد: ۳۴۸
تصنیفات: ۳۴۹

امام ابوبکر اسماعیلی رحمۃ اللہ علیہ ۳۵۰

نام ونسب: ۳۵۰
پیدائش، خاندان اور وطن: ۳۵۰
شوقِ علم اور طلب حدیث کے لیے سفر: ۳۵۰
(متوفی ۳۷۱ھ) ۳۵۰
اساتذہ وشیوخ: ۳۵۱
تلامذہ: ۳۵۱
حفظ وضبط: ۳۵۱
حدیث میں درجہ: ۳۵۱
مسند درس: ۳۵۲
فقہ واجتہاد: ۳۵۲
قراءت: ۳۵۲
تدین واخلاق: ۳۵۲
دولت وثروت: ۳۵۲
شہرت ومقبولیت: ۳۵۳
فقہی مسلک: ۳۵۳
کلامی عقائد: ۳۵۳
وفات: ۳۵۳
اولاد: ۳۵۳
تصنیفات: ۳۵۴

امام ابوالحسن دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ ۳۵۵

نام ونسب: ۳۵۵
ولادت ووطن: ۳۵۵
اساتذہ: ۳۵۵
تلامذہ: ۳۵۵

Marfat.com

طلب حدیث کے لیے سفر: ۳۵۶
حفظ وذکاوت: ۳۵۶
ثقاہت: ۳۵۷
علل واسماء الرجال: ۳۵۷
حدیث میں درجہ: ۳۵۸
فقہ وخلافیات: ۳۵۹
فقہی مذہب: ۳۵۹
نحو،تفسیر،قراءت وتجوید: ۳۵۹
شعروادب: ۳۵۹
جامعیت: ۳۶۰
فہم ودانش: ۳۶۰
ورع وتقویٰ: ۳۶۰
شہرت ومقبولیت: ۳۶۰
لطائف وظرائف: ۳۶۱
اخلاق وعادات: ۳۶۲
عقائد: ۳۶۲
وفات: ۳۶۲
امام دارقطنی پر بعض اعتراضات: ۳۶۲
شیعیت کا الزام: ۳۶۲
تدلیس: ۳۶۴
خودستائی: ۳۶۴
یافعی کا اعتراض: ۳۶۵
تعصب: ۳۶۵
تصنیفات: ۳۶۸
۵۔ اختلاف الموطآت: ۳۶۸
۶۔ غرائب مالک: ۳۶۸
۷۔ الاربعین: ۳۶۹
۸۔ کتاب الضعفاء: ۳۶۹
۹۔ اسماء المدلسین: ۳۶۹
۱۰۔ اسئلۃ الحاکم: ۳۶۹
۱۱۔ باب القضاء بالیمین مع الشاہد: ۳۶۹
۱۲۔ کتاب الجہر: ۳۶۹
۱۳۔ رسالہ قراءت: ۳۶۹
۱۴۔ الرباعیات: ۳۷۰
۱۵۔ کتاب المجتبیٰ من السنن الماثورہ: ۳۷۰
۱۶۔ کتاب الاخوۃ: ۳۷۰
۱۷۔ کتاب الافراد: ۳۷۰
۱۸۔ کتاب التصحیف: ۳۷۰
۱۹۔ کتاب المؤتلف والمختلف: ۳۷۱
۲۰۔ کتاب العلل: ۳۷۱
المجلد الثانی: ۳۷۱
المجلد الثالث: ۳۷۲
المجلد الخامس: ۳۷۲
۲۱۔ کتاب الاسخیاء: ۳۷۲
۲۲و۲۳۔ کتاب الالزامات والتتبع: ۳۷۲
۲۴۔ سنن دارقطنی: ۳۷۵
سنن کی اہمیت اور کتب حدیث میں اس کا درجہ: ۳۷۵
خصوصیات: ۳۷۶
سنن کے نسخے: ۳۷۷
سنن کے حواشی،تعلیقات اور زوائد: ۳۷۸
سنن پر اعتراض: ۳۷۸

امام ابوسلیمان حمد خطابی رحمۃ اللہ علیہ ۳۸۰

نام ونسب: ۳۸۰
ولادت ووطن: ۳۸۰
نسبتیں: ۳۸۰
اساتذہ: ۳۸۰
تلامذہ: ۳۸۱
رحلت وسفر: ۳۸۱

Marfat.com

جامعیت: ۳۸۱
اعتراف کمالات: ۳۸۱
حدیث میں درجہ: ۳۸۱
فقہ: ۳۸۲
لغت وعربیت: ۳۸۲
شعر وسخن: ۳۸۲
زہد واتقا: ۳۸۳
امامت ومرجعیت: ۳۸۳
مسلک: ۳۸۳
اخلاق وعادات: ۳۸۳
پیشہ: ۳۸۳
انتقال: ۳۸۳
تصنیفات: ۳۸۴
۱۰۔کتاب تفسیر اسامی الرب عزوجل: ۳۸۴
۱۱۔اعلام السنن: ۳۸۴
۱۲۔غریب الحدیث: ۳۸۴
۱۳۔معالم السنن: ۳۸۴

امام ابن جمیع رحمۃ اللہ علیہ ۳۸۶

نام ونسب: ۳۸۶
ولادت، خاندان ووطن: ۳۸۶
رحلت وسفر: ۳۸۶
اساتذہ: ۳۸۶
تلامذہ: ۳۸۶
حفظ وضبط اور حدیث میں درجہ ومرتبہ: ۳۸۷
مداومت عمل اور ذوق عبادت: ۳۸۷
وفات: ۳۸۷
مسند یا معجم: ۳۸۷

امام ابوعبداللہ حاکم رحمۃ اللہ علیہ ۳۸۸

نام ونسب: ۳۸۸
ولادت: ۳۸۸
خاندان ووطن: ۳۸۸
اساتذہ: ۳۸۹
تلامذہ: ۳۸۹
شوق علم: ۳۸۹
رحلت وسفر: ۳۹۰
حدیث وروایت میں کمال وامتیاز: ۳۹۰
حفظ وثقاہت: ۳۹۰
کلامی مذہب: ۳۹۰
تدین وتقویٰ: ۳۹۰
سیاسی واجتماعی مشاغل: ۳۹۱
مقبولیت ومرجعیت: ۳۹۱
وفات: ۳۹۲
تصنیفات: ۳۹۲
۱۶۔کتاب العلل: ۳۹۲
۱۷۔تفسیر القرآن: ۳۹۳
۱۸۔تخریج الصحیحین ۳۹۳
۱۹۔مزکی الاخبار: ۳۹۳
۲۰۔کتاب الاکلیل: ۳۹۳
۲۱۔المدخل الی علم الحدیث: ۳۹۴
۲۲۔تاریخ نیشاپور: ۳۹۴
۲۳۔معرفۃ علوم الحدیث: ۳۹۴
۲۴۔المستدرک علی الصحیحین: ۳۹۵
مستدرک کی تعریف: ۳۹۵
مستدرک کی تالیف کی وجہ: ۳۹۶
مستدرک کی اہمیت: ۳۹۶
مستدرک کی حدیثوں کی نوعیتیں: ۳۹۶

Marfat.com

تلاش وتفحص: ۳۹۸
مستدرک کی خصوصیات: ۳۹۸
طرز استدلال: ۴۰۰
حزم واحتیاط: ۴۰۱
احادیث کے متعلق وضاحتیں: ۴۰۱
مستدرک کی تلخیصات: ۴۰۲
صحیح مستدرک اور حاکم پر بعض اعتراضات کا جائزہ: ۴۰۴
مستدرک اور صحیحین: ۴۰۴
ضعیف وموضوع حدیثیں: ۴۰۷
تساہل کا الزام: ۴۰۸
حاکم کی تصحیح کا حکم: ۴۱۱
رفض وتشیع کا الزام: ۴۱۳
شافعیت میں غلو اور تعصب کا الزام: ۴۲۴

امام ابوالقاسم حمام رازی رحمۃ اللہ علیہ ۴۲۹

نام ونسب: ۴۲۹
ولادت، خاندان اور وطن: ۴۲۹
اساتذہ: ۴۲۹
تلامذہ: ۴۲۹
حفظ وضبط: ۴۳۰
ثقاہت: ۴۳۰
علل واسماء الرجال میں مہارت: ۴۳۰
حدیث میں درجہ: ۴۳۰
وفات: ۴۳۰
تصنیفات: ۴۳۰

امام ابوبکر بن مردویہ الکبیر اصبہانی رحمۃ اللہ علیہ ۴۳۱

نام ونسب: ۴۳۱
ولادت ووطن: ۴۳۱
اساتذہ: ۴۳۱
تلامذہ: ۴۳۱
سفر: ۴۳۱
حدیث میں درجہ: ۴۳۲
وفات: ۴۳۲
تصنیفات: ۴۳۲

امام ابوبکر احمد بن محمد برقانی خوارزمی رحمۃ اللہ علیہ ۴۳۳

نام ونسب: ۴۳۳
ولادت ووطن: ۴۳۳
اساتذہ: ۴۳۳
تلامذہ: ۴۳۳
رحلت وسماع حدیث کی ابتدا: ۴۳۴
حفظ وثقاہت: ۴۳۴
فن حدیث میں امتیاز اور اس سے غیر معمولی اشتغال: ۴۳۴
تفسیر وقرآنیات: ۴۳۴
فقہ: ۴۳۴
نحو وعربیت: ۴۳۵
شعر وسخن: ۴۳۵
ورع وتقویٰ: ۴۳۵
وفات: ۴۳۵
تصنیفات: ۴۳۵

امام ابونعیم اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ ۴۳۶

نام ونسب: ۴۳۶
ولادت: ۴۳۶
خاندان: ۴۳۶
اساتذہ: ۴۳۶
تلامذہ: ۴۳۷
رحلت وسفر: ۴۳۷
حفظ وضبط اور ثقاہت: ۴۳۷

Marfat.com

حدیث میں درجہ ومرتبہ: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۳۷
فقہ وتصوف میں بلند پائیگی: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۳۸
عقیدہ: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۳۸
شہرت ومقبولیت اور مجلس درس کی وسعت: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۳۸
ابونعیم کے خلاف شورش وہیجان: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۳۹
وفات: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۳۹
تصنیفات: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۳۹
ابونعیم پر بعض اعتراضات: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۱

ابومحمد حسن خلال رحمۃ اللہ علیہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۳

نام ونسب: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۳
ولادت: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۳
وطن: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۳
اساتذہ: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۳
تلامذہ: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۳
حفظ وثقاہت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۳
وفات: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۴
تصنیفات: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۴

امام ابوعبداللہ قضاعی رحمۃ اللہ علیہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۵

نام ونسب: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۵
وطن وخاندان: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۵
اساتذہ وشیوخ: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۵
تلامذہ: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۵
رحلت وسفر: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۵
دیث: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۶
فقہ: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۶
تاریخ وتراجم: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۶
فضل وکمال: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۶
عہدۂ قضا: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۶

امامت ومقبولیت: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۶
مسلک: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۶
وفات: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۶
تصنیفات: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۶

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی رحمۃ اللہ علیہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۸

نام ونسب: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۸
ولادت ووطن: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۸
اساتذہ وشیوخ: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۸
تلامذہ: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۹
طلب حدیث کے لیے سفر: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۹
حفظ وثقاہت: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۹
حدیث میں درجہ ومرتبہ: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۹
فقہ: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۵۰
عربیت وشعر وسخن: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۵۱
تحقیق وانصاف پسندی: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۵۱
امامت ومرجعیت: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۵۱
اعتراف کمالات: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۵۲
فقہی مذہب: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۵۲
کلامی مذہب: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۵۳
زہد وورع: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۵۳
عادات واخلاق: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۵۳
وفات: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۵۳
اولاد: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۵۳
تصنیفات: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۵۳
خصوصیات: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۵۸
بیہقی وسنن بیہقی پر اعتراض: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۶۱

حافظ ابن عبدالبر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۶۲

نام ونسب: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۶۲

Marfat.com

ولادت: ۴۶۲
خاندان ووطن: ۴۶۲
اساتذہ: ۴۶۲
تلامذہ: ۴۶۳
رحلت وروایت کی ابتدا: ۴۶۳
حفظ وضبط اور ثقاہت: ۴۶۳
حدیث میں درجہ ومرتبہ: ۴۶۳
رجال اور جرح وتعدیل میں امتیاز: ۴۶۴
تفقہ واجتہاد: ۴۶۴
دیگر علوم: ۴۶۵
شعر وسخن: ۴۶۵
اعتراف کمالات: ۴۶۶
فقہی مذہب: ۴۶۶
عہدۂ قضا: ۴۶۶
امراء ووزراء سے تعلقات: ۴۶۷
تدین: ۴۶۷
ابتلاء وآزمائش: ۴۶۷
وفات: ۴۶۷
اولاد: ۴۶۷
تصنیفات: ۴۶۷
مقصد تصنیف: ۴۷۳
شرائط: ۴۷۳
خصوصیات: ۴۷۴
ملخصات وذیول: ۴۷۴
ایک شبہ کا ازالہ: ۴۷۵

امام ابوبکر خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ۴۷۷

نام ونسب: ۴۷۷
ولادت ووطن: ۴۷۷
اساتذہ: ۴۷۷
تلامذہ: ۴۷۸
رحلت وسفر: ۴۷۸
حدیث میں درجہ ومرتبہ: ۴۷۸
فقہ: ۴۸۰
تاریخ: ۴۸۰
قراءت وعلم قرآن: ۴۸۰
شعر وادب: ۴۸۰
دیگر کمالات: ۴۸۱
ذہانت وفطانت اور مطالعہ سے دلچسپی: ۴۸۱
اعزاز ومقبولیت: ۴۸۲
شکوہ ودبدبہ اور وقار ومتانت: ۴۸۲
زہد وتدین: ۴۸۲
دولت وثروت کی فراوانی اور جذبہ خیر وخیرات: ۴۸۳
امراء ووزراء سے تعلقات: ۴۸۳
استغناء وبے نیازی: ۴۸۳
فقہی مسلک: ۴۸۴
عقیدہ: ۴۸۴
ابتلاء وآزمائش: ۴۸۴
وفات: ۴۸۵
حلیہ: ۴۸۵
اولاد: ۴۸۵
تصنیفات: ۴۸۶
ذیول: ۴۹۰
خطیب پر بعض اعتراضات: ۴۹۲

ابو عبد اللہ محمد ابونصر فتوح حمیدی ۴۹۸

نام ونسب: ۴۹۸
ولادت: ۴۹۸
وطن: ۴۹۸
تعلیم: ۴۹۸

Marfat.com

اساتذہ: ۴۹۹
تلامذہ: ۴۹۹
طلب علم اور سماع حدیث کے لیے سفر: ۴۹۹
اشتغال علم: ۴۹۹
ضبط وثقاہت: ۵۰۰
حدیث میں درجہ ومرتبہ: ۵۰۰
علم رجال: ۵۰۰
ذہانت و وسعت علم: ۵۰۰
فقہ: ۵۰۱
سیر وتاریخ: ۵۰۱
ادب وعربیت: ۵۰۱
شعر وسخن: ۵۰۱
ورع وتقویٰ: ۵۰۲
دُنیا سے بیزاری: ۵۰۲
فقہی مذہب ومسلک: ۵۰۲
وفات: ۵۰۲
مدفن: ۵۰۲
تصنیفات: ۵۰۳
ایک اعتراض اور اس کا جواب: ۵۰۴

حافظ شیرویہ بن شہردار دیلمی رحمۃ اللہ علیہ ۵۰۵

نام ونسب: ۵۰۵
ولادت ووطن: ۵۰۵
خاندان: ۵۰۵
شیوخ: ۵۰۵
تلامذہ: ۵۰۵
رحلت وسفر: ۵۰۵
حدیث میں درجہ: ۵۰۶
تاریخ وسیر: ۵۰۶
ذہانت: ۵۰۶
عقیدہ ومسلک: ۵۰۶
فقہی مذہب: ۵۰۶
اخلاق واوصاف: ۵۰۶
شکل وشباہت: ۵۰۶
وفات: ۵۰۶
اولاد: ۵۰۷
تصنیفات: ۵۰۷

امام ابومحمد حسین فراء بغوی رحمۃ اللہ علیہ ۵۰۸

نام ونسب: ۵۰۸
ولادت ووطن: ۵۰۸
اساتذہ: ۵۰۸
تلامذہ: ۵۰۸
سماع حدیث کی ابتدا: ۵۰۹
حدیث میں درجہ: ۵۰۹
تفسیر: ۵۰۹
فقہ: ۵۰۹
جامعیت واعتراف سے کمالات: ۵۱۰
شغل: ۵۱۰
زہد وعبادت: ۵۱۰
سادگی وقناعت: ۵۱۰
طہارت ونظافت: ۵۱۱
وفات: ۵۱۱
تصنیفات: ۵۱۱
معالم التنزیل: ۵۱۱
نام: ۵۱۲
تقسیم وترتیب: ۵۱۲
تعداد احادیث: ۵۱۲
خصوصیات: ۵۱۳
بعض اعتراضات: ۵۱۳

Marfat.com

ابوالحسن رزین بن معاویہ عبدری سرقسطی رحمۃ اللہ علیہ ۵۱۸
نام ونسب: ۵۱۸
خاندان ووطن: ۵۱۸
اساتذہ: ۵۱۸
سفر ومجاورت مکہ: ۵۱۸
حدیث میں درجہ: ۵۱۸
اعتراف کمالات: ۵۱۸
فقہی مسلک: ۵۱۸
صلاح وتقویٰ: ۵۱۹
وفات: ۵۱۹
تصنیفات: ۵۱۹
ابوبکر محمد بن عبداللہ بن العربی رحمۃ اللہ علیہ ۵۲۰
نام ونسب: ۵۲۰
ولادت: ۵۲۰
خاندان: ۵۲۰
وطن: ۵۲۰
اساتذہ: ۵۲۱
تلامذہ: ۵۲۱
رحلت وسفر: ۵۲۱
حدیث میں درجہ: ۵۲۱
فقہ: ۵۲۲
تفسیر: ۵۲۲
ادب وبلاغت نحو وکلام اور علم تاریخ وغیرہ میں مہارت: ۵۲۲
شعر وسخن: ۵۲۲
جامعیت اور اعتراف کمال: ۵۲۲
درس وتدریس اور شہرت ومقبولیت: ۵۲۳
فقہی مذہب: ۵۲۳
اخلاق وعادات: ۵۲۳
ظرافت: ۵۲۳
ثروت وامارت: ۵۲۳
زہد وعبادت: ۵۲۴
منصب قضا: ۵۲۴
ابتلاء وآزمائش: ۵۲۴
وفات: ۵۲۵
تصنیفات: ۵۲۵
قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ ۵۲۹
نام ونسب: ۵۲۹
ولادت وخاندان: ۵۲۹
وطن: ۵۲۹
اساتذہ: ۵۲۹
تلامذہ: ۵۳۰
طلب علم کے لیے رحلت وسفر: ۵۳۰
حفظ وذکاوت: ۵۳۰
علم حدیث میں درجہ: ۵۳۰
تفسیر وفقہ: ۵۳۰
دیگر علوم: ۵۳۰
شعر وسخن: ۵۳۱
خطابت: ۵۳۱
قضا: ۵۳۱
جامعیت واعتراف کمالات: ۵۳۱
شہرت ومقبولیت: ۵۳۱
فقہی مذہب: ۵۳۲
اخلاق وعادات: ۵۳۲
خشیت وحق پسندی: ۵۳۲
جلاوطنی اور وفات: ۵۳۲
اولاد واحفاد: ۵۳۲
تصنیفات: ۵۳۳
مختصرات وشروح: ۵۳۶

Marfat.com

ایک اعتراض: ۵۳۷

ابوالسعادات مبارک بن اثیر جزریؒ ۵۳۸

نام ونسب: ۵۳۸
ولادت ووطن: ۵۳۸
خاندان: ۵۳۸
نسبتیں: ۵۳۹
اساتذہ: ۵۳۹
تلامذہ: ۵۳۹
طلب علم کے لیے سفر: ۵۳۹
حدیث میں بلند پائیگی: ۵۳۹
قرآنی علوم: ۵۳۹
فقہ: ۵۳۹
لغت، غریبیت اور نحو: ۵۳۹
ادب وانشا: ۵۴۰
شعروسخن: ۵۴۰
حساب وریاضی: ۵۴۰
جامعیت واعتراف کمالات: ۵۴۰
فقہی مذہب: ۵۴۰
تدین وتقویٰ: ۵۴۰
حسن خلق: ۵۴۱
امراسے تعلقات اور شاہی درباروں سے توسل: ۵۴۱
سرائے کی تعمیر: ۵۴۱
بیماری اور خانہ نشینی: ۵۴۱
وفات: ۵۴۲
تصنیفات: ۵۴۲
ا۔ کتاب الاذواد والذوات: ۵۴۲
نام ونسب: ۵۴۷

امام ضیاء مقدسی رحمۃ اللہ علیہ ۵۴۷

ولادت ووطن: ۵۴۷
اساتذہ: ۵۴۷
تلامذہ: ۵۴۷
رحلت وسفر: ۵۴۷
علم وفن سے اشتغال: ۵۴۸
حفظ وضبط: ۵۴۸
حدیث میں درجہ: ۵۴۸
جرح وتعدیل: ۵۴۸
فقہ وعلوم قرآن: ۵۴۸
فضل وکمال: ۵۴۸
زہد وورع: ۵۴۹
سیرت واخلاق: ۵۴۹
مدرسہ کا قیام: ۵۴۹
فقہی مسلک: ۵۴۹
وفات: ۵۴۹
تصنیفات: ۵۴۹

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ ۵۵۲

نام ونسب: ۵۵۲
ولادت ووطن: ۵۵۲
اساتذہ: ۵۵۲
تلامذہ: ۵۵۲
سیروسیاحت: ۵۵۲
حفظ وضبط: ۵۵۳
حدیث میں بلند پائیگی: ۵۵۳
فقہ وافتاء: ۵۵۳
قرآنیات: ۵۵۳
لغت، عربیت اور نحو وصرف: ۵۵۴
جامعیت: ۵۵۴
انہماک فی العلم: ۵۵۴

Marfat.com

درس وتدریس: ۵۵۵
زہد واتقاء: ۵۵۵
سادگی وقناعت: ۵۵۵
ہدیے اور تحفے نہ قبول کرنا: ۵۵۶
صبر واستقلال: ۵۵۶
اخلاق وعادات: ۵۵۷
تصوف: ۵۵۷
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر: ۵۵۷
متانت ووقار: ۵۵۷
اعتراف فضل وکمال: ۵۵۷
فقہی مذہب اور انصاف پسندی: ۵۵۸
عقیدہ ومسلک: ۵۵۸
خلوت پسندی: ۵۵۸
وفات: ۵۵۹
تصنیفات: ۵۵۹
بعض اعتراضات: ۵۶۷

امام ابو محمد عبد المؤمن دمیاطی رحمۃ اللہ علیہ ۵۶۸

نام ونسب: ۵۶۸
ولادت ووطن: ۵۶۸
اساتذہ: ۵۶۸
تلامذہ: ۵۶۸
طلب علم کے لیے سفر: ۵۶۹
شوق علم: ۵۶۹
حفظ وثقاہت: ۵۶۹
حدیث میں درجہ ومرتبہ: ۵۶۹
نقد: ۵۷۰
قراءت: ۵۷۰
نحو لغت وعربیت: ۵۷۰
انساب: ۵۷۰
شعر وسخن: ۵۷۰
جامعیت: ۵۷۱
امامت ومرجعیت: ۵۷۱
تدین وتقویٰ: ۵۷۱
اخلاق وعادات: ۵۷۱
لطافت وظرافت: ۵۷۱
آسائش وفراغت: ۵۷۲
فقہی مسلک: ۵۷۲
منطق وکلام سے نفرت وبیزاری: ۵۷۲
وفات: ۵۷۳
حلیہ: ۵۷۳
تصنیفات: ۵۷۳

امام ولی الدین خطیب تبریزی رحمۃ اللہ علیہ ۵۷۵

نام ونسب: ۵۷۵
خاندان ووطن: ۵۷۵
اساتذہ: ۵۷۵
تلامذہ: ۵۷۵
علم وفضل: ۵۷۵
زہد وورع: ۵۷۶
فقہی مسلک: ۵۷۶
وفات: ۵۷۶
تصنیفات: ۵۷۶
استدراک: ۵۷۷
شروح وحواشی: ۵۷۸

امام جمال الدین زیلعی رحمۃ اللہ علیہ ۵۸۳

نام ونسب: ۵۸۳
ولادت ووطن: ۵۸۳
اساتذہ وشیوخ: ۵۸۳

Marfat.com

حفظ وضبط: ۵۸۳
حدیث میں درجہ: ۵۸۳
فقہ: ۵۸۴
علم وفن سے اشتغال: ۵۸۴
فقہی مذہب: ۵۸۴
سیرت واخلاق: ۵۸۴
مقبولیت: ۵۸۵
عبادت وریاضت: ۵۸۵
وفات: ۵۸۵
تصنیفات: ۵۸۵
۳۔نصب الرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ: ۵۸۵

حصہ سوم

شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ ۶۳۰

نام ونسب: ۶۳۰
ولادت ووطن: ۶۳۰
اساتذہ: ۶۳۰
تلامذہ: ۶۳۱
رحلت وسفر ۶۳۲
مجلس درس وافادہ: ۶۳۳
علم حدیث سے شغف: ۶۳۴
علم وفضل: ۶۳۵
علماء وزہاد سے تعلق اور اہل علم، مشائخ وطلبہ کی امداد وتکریم: ۶۳۵
بیعت وارادت: ۶۳۶
تصوف وسلوک: ۶۳۷
اصلاح وتربیت کا طریقہ: ۶۳۹
ورع وتقویٰ اور کثرت عبادت وریاضت: ۶۴۰
دُنیا سے نفرت اور بے رغبتی: ۶۴۱
تصوف کی چار خصوصیات: ۶۴۱
قلت طعام۔قلت کلام: ۶۴۲
قلت منام۔خلوت پسندی اور عزلت گزینی: ۶۴۲
خوارق وکرامات: ۶۴۲
وجد وحال: ۶۴۳
مہدویت سے تعلق وانقطاع: ۶۴۴
شیخ محمد غوث گوالیاری کی تکفیر: ۶۴۵
اتباع سنت: ۶۴۶
أمر بالمعروف ونہی عن المنکر: ۶۴۷
سخاوت وفیاضی: ۶۴۷
معیشت میں سادگی اور قناعت: ۶۴۸
رزق کے معاملہ میں توکل: ۶۴۸
حلال کمائی ضائع نہیں ہوتی: ۶۴۸
اپنے کام خود کرنا: ۶۴۹
نوکروں سے اچھا برتاؤ: ۶۴۹
پاکیزہ زندگی اور عمدہ سیرت: ۶۵۰
غیر معمولی شہرت ومقبولیت: ۶۵۰
امراو سلاطین سے تعلقات: ۶۵۰
بعض عہدوں پر متمکن ہونا اور الزامات سے متہم ہونا: ۶۵۱
غیرت وخودداری اور عدم مداہنت: ۶۵۳
وفات: ۶۵۳
تصنیفات: ۶۵۴
۲: تبیین الطرق الی اللہ تعالیٰ: ۶۵۵
۳: جوامع الکلم فی المواعظ والحکم: ۶۵۵
۴: غایۃ الکمال فی بیان افضل الاعمال: ۶۵۵
۵: مجموعہ حکم کبیر: ۶۵۶
۶: مختصر النہایہ فی اللغۃ: ۶۵۶
۷: الوسیلۃ الفاخرۃ فی سلطنۃ الدنیا والآخرۃ: ۶۵۶

شیخ محمد بن طاہر رحمۃ اللہ علیہ ۶۶۲

نسب وقومیت: ۶۶۳

Marfat.com

ولادت ووطن: ۶۶۵
شیخ کا زمانہ: ۶۶۶
تحصیل علم: ۶۶۶
اساتذہ: ۶۶۷
تلامذہ: ۶۶۷
حرمین کا سفر اور حج بیت اللہ: ۶۶۸
ذہانت وفطانت: ۶۶۸
طلبہ کی امداد اور حسن سلوک: ۶۶۸
درس وتدریس: ۶۶۹
شیخ کا کتب خانہ: ۶۶۹
علم حدیث میں بلند پائیگی: ۶۷۰
مسلک ومذہب: ۶۷۰
فیاضی وسخاوت: ۶۷۰
صلاح وتقوی: ۶۷۱
مخالفین کا حملہ اور زخم لگنا: ۶۷۱
قوم کی اصلاح اور رد مہدویت: ۶۷۲
تجہیز وتکفین: ۶۷۴
اولاد واحفاد: ۶۷۴

شیخ عبدالوہاب: ۶۷۴

شیخ الاسلام بن شیخ عبدالوہاب: ۶۷۵

اکرام الحق: ۶۷۵

نورالحق: ۶۷۶

عبدالحق: ۶۷۶

محی الدین: ۶۷۶

شیخ عبدالقادر: ۶۷۶

تصنیفات: ۶۷۶
ذیول، تکملے اور تعلیقات: ۶۸۳

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۶۸۵

نام ونسب: ۶۸۵
خاندان: ۶۸۵
آغا محمد ترک اور ان کے بیٹے ملک معزالدین: ۶۸۵
ملک موسیٰ: ۶۸۶
شیخ فیروز: ۶۸۶
شیخ سعداللہ: ۶۸۷
شیخ سعداللہ کی اولاد: ۶۸۷
شیخ رزق اللہ مشتاقی: ۶۸۷
شیخ سیف الدین: ۶۸۸
ولادت: ۶۹۰
تعلیم وتربیت: ۶۹۰
اعلیٰ تعلیم: ۶۹۱
قرآن مجید کا حفظ: ۶۹۲
ماوراء النہر کے علما سے استفادہ: ۶۹۲
شوق علم اور مطالعہ سے شغف: ۶۹۲
اساتذہ: ۶۹۳
تعلیم سے فراغت اور دانشمندان ماوراء النہر سے استفادہ کا
زمانہ: ۶۹۴
شیخ موسیٰ سے بیعت: ۶۹۵
درس وتدریس کا آغاز: ۶۹۶
فتح پور سیکری میں قیام: ۶۹۶
سفر حجاز: ۶۹۹
حج وزیارت مدینہ: ۷۰۱
حجاز سے واپسی کے بعد کے بعض واقعات: ۷۰۳
شیخ عبدالوہاب متقی کی وصیت وہدایت: ۷۰۳
لاہور کا سفر اور شاہ ابوالمعالی سے استفادہ: ۷۰۴
درس وتدریس اور مدرسہ: ۷۰۵

Marfat.com

تلامذہ: ۷۰۸

شیخ محدث اور دینی علوم: ۷۱۱

تفسیر وعلوم قرآن: ۷۱۱

فقہ: ۷۱۲

تصوف وسلوک: ۷۱۳

علم حدیث: ۷۱۷

شیخ عبدالحق کے اولیات: ۷۱۹

ذوقِ علم ومطالعہ اور شیخ کا کتب خانہ: ۷۲۲

شعروسخن کا ذوق: ۷۲۲

شیخ کی عظمت ومقبولیت اور اعتراف جامعیت وکمال: ۷۲۴

صلاح وتقویٰ اور عبادت میں انہماک: ۷۲۵

اصلاحی ودینی خدمات: ۷۲۶

دین کی غلط تعبیر اور بیجا تاویل وتحریف کی مخالفت: ۷۲۷

عقیدۂ نبوت کے منافی امور کا ردوابطال: ۷۲۷

مہدوی تحریک کا ردوابطال: ۷۲۸

علماء ومشائخ کی فتنہ سامانی سے بیزاری: ۷۲۹

عقلیت پسندی اور فلسفہ کی تردید: ۷۲۹

افراط وتفریط سے اجتناب اور اعتدال وسلامت روی: ۷۳۱

سلاطین وامراء سے تعلقات اور ان کی اصلاح کے لئے سعی وکوشش: ۷۳۲

اتباع سنت کی دعوت: ۷۳۴

ردبدعت: ۷۳۵

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور شیخ احمد سرہندیؒ: ۷۳۶

تقلید میں شدت اور حقیقت میں غلو وتعصب کا الزام: ۷۴۳

وفات اور مقبرہ: ۷۴۴

اولاد واحفاد: ۷۴۵

تصنیفات: ۷۴۷

ترتیب وتبویب: ۷۶۱

خصوصیات: ۷۶۴

شیخ نورالحق دہلویؒ ۷۶۵

شیخ کی اولاد واحفاد: ۷۶۵

نام، خاندان، پیدائش، وطن اور تعلیم: ۷۶۵

درس وتدریس: ۷۶۶

جامعیت اور علمی کمالات: ۷۶۶

فقہی مسلک: ۷۶۷

زہد واتقا: ۷۶۷

سلوک ومعرفت: ۷۶۸

عہدۂ قضاء: ۷۶۸

سلاطین سے تعلقات اور ان کی قدردانی: ۷۶۹

شعروسخن: ۷۶۹

وفات: ۷۷۰

اولاد واحفاد: ۷۷۰

تصنیفات: ۷۷۰

کتب کی ابتدا کے نوٹ: ۷۷۳

استنباط واخذ نتائج: ۷۷۴

دفع تعارض: ۷۷۵

اشکالات کے جواب: ۷۷۶

شارحین کے اقوال سے بے اطمینانی: ۷۷۷

فقہی اختلاف کا ذکر اور حنفی مذہب کی تائید وترجیح: ۷۷۸

شیخ نورالحق غالی حنفی نہ تھے: ۷۷۹

بعض اہم بحثیں: ۷۸۰

اسباب ووجوہ کا ذکر: ۷۸۳

صحیح بخاری کے ابواب کی مناسبت کا ذکر: ۷۸۴

شکوک وشبہات کا جواب: ۷۸۶

اصول ومصطلحات حدیث کی تشریح: ۷۸۹

زبان کے اسلوب، بلاغت اور عربیت کے مباحث: ۷۹۲

Marfat.com

شیخ نور اللہ ۷۹۴

شیخ سیف اللہ ۷۹۴

شیخ محب اللہ ۷۹۴

حافظ فخر الدین ۷۹۴

شیخ نور الحق ثانی ۷۹۵

حافظ محمد محسن دہلوی اور شیخ محمد احسان . ۷۹۶

شیخ الاسلام محمد ۷۹۷

تصانیف: ۷۹۷

مولانا سلام اللہ محدث رام پوری ۸۰۲

فضل وکمال: ۸۰۲

درس وافادہ: ۸۰۳

وفات: ۸۰۳

اولاد: ۸۰۳

تصنیفات: ۸۰۳

مولانا نور الاسلام ۸۰۵

تعلیم: ۸۰۵

وفات: ۸۰۶

تصنیفات: ۸۰۶

شیخ محمد سالم ۸۰۷

Marfat.com

اجمالی فہرست

امام مالک رحمۃ اللہ ۴۲

امام ابوداؤد طیالسی رحمۃ اللہ علیہ ۷۱

امام عبدالرزاق بن ہمام رحمۃ اللہ علیہ ۷۷

امام اسد بن موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ ۸۱

امام عبداللہ بن موسیٰ عبسی رحمۃ اللہ علیہ ۸۳

امام عبداللہ بن زبیر حمیدی رحمۃ اللہ علیہ ۸۶

امام سعید بن منصور رحمۃ اللہ علیہ ۹۰

امام محمد بن صباح دولابی رحمۃ اللہ علیہ ۹۳

امام یحییٰ بن عبدالحمید حمانی رحمۃ اللہ علیہ ۹۶

امام مسدد بن مسرہد رحمۃ اللہ علیہ ۹۸

امام نعیم بن حماد خزاعی رحمۃ اللہ علیہ ۱۰۰

امام عبداللہ بن محمد جعفی رحمۃ اللہ علیہ ۱۰۳

امام ابوبکر بن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ ۱۰۵

امام اسحٰق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ ۱۰۹

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ۱۱۷

امام محمد بن یحییٰ عدنی رحمۃ اللہ علیہ ۱۵۱

امام عبد بن حمید رحمۃ اللہ علیہ ۱۵۳

امام اسحاق بن بہلول رحمۃ اللہ علیہ ۱۵۶

امام ابومحمد عبداللہ دارمی رحمۃ اللہ علیہ ۱۵۹

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ۱۶۷

امام ابومسعود درازی رحمۃ اللہ علیہ ۱۷۹

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۲

امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ ۲۰۲

امام ابوداؤد سجستانی رحمۃ اللہ علیہ ۲۱۳

Marfat.com

امام بقی بن مخلد قرطبی رحمۃ اللہ علیہ ۲۲۶

امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ ۲۳۱

امام حارث بن ابی اسامہ رحمۃ اللہ علیہ ۲۴۷

امام احمد بن ابی عاصم نبیل رحمۃ اللہ علیہ ۲۵۰

امام ابوبکر بزار رحمۃ اللہ علیہ ۲۵۳

امام ابو مسلم کشی رحمۃ اللہ علیہ ۲۵۶

امام محمد بن نصر مروزی رحمۃ اللہ علیہ ۲۵۹

امام ابو محمد ابن جارود رحمۃ اللہ علیہ ۲۶۳

امام ابو عبد الرحمٰن نسائی رحمۃ اللہ علیہ ۲۶۵

امام ابو یعلیٰ موصلی رحمۃ اللہ علیہ ۲۷۷

امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ ۲۸۰

امام ابو عوانہ اسفرائینی رحمۃ اللہ علیہ ۲۸۷

امام ابو جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ ۲۹۰

امام عبد الباقی بن قانع رحمۃ اللہ علیہ ۳۰۶

امام سعید بن السکن رحمۃ اللہ علیہ ۳۱۰

امام ابوبکر شافعی رحمۃ اللہ علیہ ۳۱۳

امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ ۳۱۶

امام ابوبکر آجری رحمۃ اللہ علیہ ۳۳۲

امام ابو القاسم طبرانی رحمۃ اللہ علیہ ۳۳۵

امام ابو عمرو بن نجید رحمۃ اللہ علیہ ۳۴۶

امام ابو الحسن دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ ۳۵۵

امام ابن جمیع رحمۃ اللہ علیہ ۳۸۶

امام ابو عبد اللہ حاکم رحمۃ اللہ علیہ ۳۸۸

امام ابو القاسم تمام رازی رحمۃ اللہ علیہ ۴۲۹

امام ابوبکر بن مردویہ الکبیر اصبہانی رحمۃ اللہ علیہ ۴۳۱

امام ابوبکر احمد بن محمد برقانی خوارزمی رحمۃ اللہ علیہ .. ۴۳۳

امام ابو نعیم اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ ۴۳۶

ابو محمد حسن خلال رحمۃ اللہ علیہ ۴۴۳

امام ابو عبد اللہ قضاعی رحمۃ اللہ علیہ ۴۴۵

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی رحمۃ اللہ علیہ ۴۴۸

حافظ ابن عبد البر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ ۴۶۲

امام ابوبکر خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ۴۷۷

Marfat.com

ابو عبد اللہ محمد ابو نصر فتوح حمیدی ۴۹۸
حافظ شیرویہ بن شہردار دیلمی رحمۃ اللہ علیہ ۵۰۵
امام ابو محمد حسین فراء بغوی رحمۃ اللہ علیہ ۵۰۸
ابو الحسن رزین بن معاویہ عبدری سرقسطی رحمۃ اللہ علیہ ۵۱۸
ابو بکر محمد بن عبد اللہ بن العربی رحمۃ اللہ علیہ ۵۲۰
قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ ۵۲۹
ابو السعادات مبارک بن اثیر جزری .. ۵۳۸
امام ضیاء مقدسی رحمۃ اللہ علیہ ۵۴۷
امام نووی رحمۃ اللہ علیہ ۵۵۲
امام ابو محمد عبد المومن دمیاطی رحمۃ اللہ علیہ ۵۶۸
امام ولی الدین خطیب تبریزی رحمۃ اللہ علیہ ۵۷۵
امام جمال الدین زیلعی رحمۃ اللہ علیہ ۵۸۳
شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ ۶۳۰
شیخ محمد بن طاہر ۶۶۳
شیخ عبد الوہاب ۶۷۴
شیخ الاسلام بن شیخ عبد الوہاب ۶۷۵
اکرام الحق: ۶۷۵
نور الحق: ۶۷۶
عبد الحق: ۶۷۶
محی الدین: ۶۷۶
شیخ عبد القادر: ۶۷۶
شیخ عبد الحق محدث دہلوی ۶۸۵
ملک موسیٰ: ۶۸۶
شیخ فیروز: ۶۸۶
شیخ سعد اللہ: ۶۸۷
شیخ رزق اللہ مشتاقی: ۶۸۷
شیخ سیف الدین: ۶۸۸
شیخ نور الحق دہلوی ۷۶۵
شیخ نور اللہ ۷۹۴
شیخ سیف اللہ ۷۹۴
شیخ محب اللہ ۷۹۴
حافظ فخر الدین ۷۹۴

Marfat.com

شیخ نور الحق ثانی ۷۹۵
حافظ محمد محسن دہلوی اور شیخ محمد احسان . ۷۹٦
شیخ الاسلام محمد ۷۹۷
مولانا سلام اللہ محدث رام پوری ۸۰۲
مولانا نور الاسلام ۸۰۵
شیخ محمد سالم ۸۰۷

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مقدمہ

کلام مجید اگر چہ ایک واضح اور کھلی ہوئی کتاب ہے، اس میں کوئی غموض وخفا نہیں ہے لیکن اس میں اس کی تعلیمات کی پوری تفصیل اور تمام جزئیات کا احاطہ نہیں ہوسکتا تھا، اس لئے بہت سے احکام مجمل یا کلیات کی شکل میں ہیں جن کی وضاحت وتشریح اور کلیات سے جزئیات کی تفریع رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول وعمل سے فرمائی، آپ کا کام محض کلام الٰہی کو لوگوں تک پہنچا دینا نہیں تھا بلکہ اس کی تبیین وتشریح بھی تھی۔

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾ (نحل:۴۴)

"اور ہم نے تمہاری طرف نصیحت (قرآن مجید) اتاری تاکہ لوگوں کے لیے جو اتارا گیا ہے اس کو ان سے کھول کر بیان کرو شاید وہ اس پر غور وفکر کریں۔"

ایک دوسری آیت میں ہے:

وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ ۙ وَهُدًی وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۴﴾

(نحل:۶۴)

"اور ہم نے تم پر اس لیے کتاب اتاری ہے تاکہ تم ان کے لیے ان چیزوں کی وضاحت کرو جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور اس کو ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں ہدایت ورحمت بنا کر اتارا۔"

یہ تبیین وتشریح آپ اپنی طرف سے نہیں بلکہ اس فہم یا ملکہ نبوت کی راہنمائی سے کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے آپ میں ودیعت کیا تھا۔

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىکَ اللّٰهُ ؕ (النسا:۱۰۵)

"اور ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ تم لوگوں کے درمیان جس طرح تم کو خدا نے سمجھایا ہے اس طرح فیصلہ کرو۔"

اس "اَرٰىکَ" سے مراد فہم نبوت ہے، اس آیت میں اگر چہ صرف فیصلہ کا ذکر ہے لیکن اس میں آپ کے تمام احکام داخل ہیں، اس لیے کہ آپ جو تعلیم اور جو حکم دیں گے وہ ایک طرح کا فیصلہ ہی ہوگا۔

آپ جو کچھ بھی کہتے تھے، یا حکم بھی دیتے تھے، وہ درحقیقت ایک قسم کی وحی ہوتی تھی جس کو اصطلاح میں وحی خفی سے تعبیر کیا

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ؕ﴿۳﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۙ﴿۴﴾ (نجم:۴)

Marfat.com

''رسول اپنی خواہش سے کچھ بھی نہیں کہتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔''

اس لیے آپ کے تمام احکام واجب التعمیل ہیں، اس فہم نبوت اور وحی سے مستنبط احکام کو قرآن مجید نے حکمت سے تعبیر کیا ہے۔

وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾

(النسا:۱۱۳)

''اور تم پر کتاب وحکمت اتاری اور تم کو وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے اور یہ تم پر خدا کا بڑا فضل ہے۔''

مسلمانوں پر خدا نے یہ احسان جتایا ہے۔

وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مَاۤ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ (البقرہ:۲۳۱)

''اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ تم پر کتاب وحکمت اتاری جس کے ذریعہ وہ تم کو نصیحت کرتا ہے۔''

دوسری آیت میں ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲﴾ (جمعہ:۲)

''وہی اللہ ہے جس نے اَن پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے اور کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور اس سے پہلے وہ گمراہی میں مبتلا تھے۔''

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے ذمہ صرف آیات قرآنی کی تلاوت وتبلیغ نہیں بلکہ مسلمانوں کی تعلیم وتزکیہ بھی تھا اور آپ ان کو کتاب اللہ کے ساتھ حکمت کی تعلیم بھی دیتے تھے، یہ حکمت اگرچہ قرآن مجید اور وحی خفی سے ماخوذ ہے مگر اس سے الگ چیز ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کے اقوال واعمال ہیں، اس لیے کتاب کے ساتھ وہ بھی مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہیں، آپ کی ذات اور آپ کا ہر قول وفعل مسلمانوں کے لیے نمونہ عمل تھا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:۲۱)

''لوگو! تمہارے لیے رسول کے اندر اچھا نمونہ ہے۔''

اسی لیے قرآن مجید میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول کی اطاعت کی بھی تاکید ہے اور بہت سی آیات میں اَطِيْعُوا اللّٰهَ کے ساتھ ساتھ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ کا بھی حکم ہے۔

وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ (آل عمران:۱۳۲)

''اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (محمد:۳)

''مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔''

وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾

(المائدہ:۹۲)

Marfat.com

''اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ڈرو پھر اگر تم روگردانی کرو گے تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف پوری تبلیغ ہے (یعنی اس کو منوانے کی ذمہ داری اس پر نہیں ہے)۔''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾ (انفال:۲۰)

''اے مسلمانو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو، حالانکہ تم سنتے ہو۔''

یہ ظاہر ہے کہ اطاعت نام ہے کسی حکم کی تعمیل یا کسی عمل کی تقلید کا، یعنی رسول اللہ ﷺ جو حکم دیں اس کی تعمیل اور جس چیز پر عمل کریں اس پر عمل کیا جائے، اسی کا نام حدیث وسنت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی محبت رسول کے اتباع پر موقوف ہے اور اس کا صلہ بندوں سے اللہ کی محبت اور مغفرت ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾

(آل عمران:۳۱)

''آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

رسول کی اطاعت عین خدا کی اطاعت اور رسول کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ''۔

''جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔''

اطاعت کے ان احکام میں رسول اللہ ﷺ کے وہ تمام اقوال وافعال داخل ہیں جو آپ نے مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلہ میں ارشاد فرمائے یا ان پر عمل کیا، اس لیے کتاب اللہ کے بعد ان کی حیثیت بھی قانون کی ہے اور وہ مسلمانوں کے لیے کتاب اللہ ہی کی طرح واجب العمل ہیں، کلام مجید میں ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿۳۶﴾ (احزاب:۳۶)

''اور کسی مسلمان مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ان کے کسی معاملہ میں فیصلہ کردے تو اس میں اس کو چون وچرا کا اختیار باقی رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں ہے۔''

''امر'' میں آپ کے تمام احکام داخل ہیں جن کی وضاحت احادیث سے ہوتی ہے، مسلم میں ہے:

ما نهيتكم عنه فاجتنبوه وما امرتكم به فافعلوه۔ (مسلم ج ۲ کتاب الفضائل باب توقیرہ ﷺ)

''میں جس چیز سے تم کو منع کردوں اس سے رک جاؤ اور جس چیز کا حکم دوں اس کو اختیار کرو۔''

ایک دوسری حدیث میں اس سے زیادہ واضح الفاظ میں ہے:

''وہ زمانہ قریب ہے کہ کسی آدمی سے جب وہ اپنے پرتکلف تخت پر تکیہ لگائے بیٹھا ہوگا، میری کوئی حدیث بیان کی جائے گی تو وہ کہے گا کہ ہمارے درمیان اللہ عزوجل کی کتاب موجود ہے، ہم اس میں جو چیز حلال پائیں گے اس کو حلال سمجھیں گے اور جو چیز

Marfat.com

حرام پائیں گے اس کو حرام سمجھیں گے ایسے لوگوں کو آگاہ ہونا چاہیے کہ جس کو اللہ کے رسول نے حرام کیا ہے وہ بھی خدا کی حرام کی ہوئی چیز کی طرح حرام ہے۔'' (سنن ابن ماجہ ص ۳)

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے سارے اقوال واعمال مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہیں اور جس طرح قرآن مجید کے اوامر ونواہی کا ماننا ان کے لیے ضروری ہے اسی طرح رسول کے اوامر ونواہی کا بھی، اسی کا نام حدیث وسنت ہے، قول رسول کا نام حدیث ہے اور عمل متواتر کا سنت اور کلام مجید کے بعد اسی حدیث وسنت کا درجہ ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''ترکت فیکم الثقلین کتاب اللہ و سنتی'' میں نے تمہارے لیے دو بھاری چیزیں چھوڑی ہیں کتاب اللہ اور اپنی سنت بلکہ اپنی سنت کے ساتھ خلفائے راشدینؓ کی سنت پر بھی عمل کا حکم دیا ہے: ''علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین'' جن کی زندگی اتباع سنت کا نمونہ تھی۔

درحقیقت اسلام کی پوری عمارت قرآن مجید اور احادیث نبویہ پر قائم ہے، وہ کلام مجید کی تفسیر بھی ہے، اس کے اجمال کی تفصیل بھی، اس کے کلی احکام سے جزئیات کی تفریع بھی اور اسلام کے قرن اول کی تاریخ بھی، اس کے بغیر اسلام کی تعلیم اور اس کی ابتدائی تاریخ کے بہت سے اوراق سادہ رہ جاتے ہیں، اسلام کے ارکانِ اربعہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے تفصیلی احکام بھی نہیں معلوم ہو سکتے ہیں اور نہ اس کو حدیث کی مدد کے بغیر ادا کیا جا سکتا ہے، ان کے صرف کلی احکام قرآن مجید میں ہیں، اس کی تفصیل حدیث وسنت سے معلوم ہوتی ہے۔ یہی حال اکثر اوامر ونواہی اور حلال وحرام کا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت، اسلام کا ظہور، اس کی تبلیغ، اس کی راہ کی صعوبتیں، غزوات، اسلام کا غلبہ واقتدار، حکومت الٰہیہ کا قیام، اس کا نظام، رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور آپ کی سیرت معلوم کرنے کا ذریعہ صرف حدیث ہے، اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو اسلام کی بہت سی تعلیمات اور تاریخ اسلام کے بہت سے گوشے مخفی رہ جائیں گے اس لیے احادیث نبویہؐ اسلام اور اسلامی تاریخ کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں اور اس پر ان کی عمارت قائم ہے، اس لیے خود رسول اللہ ﷺ نے ان کی روایت واشاعت کا حکم دیا ہے اور مبلغ حدیث کے لیے دعا فرمائی ہے:

نضّر اللہ امرأ سمع منا حدیثا فحفظہ حتی یبلغہ فرب حامل فقہ الی من ھو افقہ منہ و رب حامل فقہ لیس بفقیہ۔ (ابوداؤد ج ۲ کتاب العلم باب فضل نشر العلم)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خدا اس شخص کو سرسبز وشاداب رکھے جس نے ہم سے ایک حدیث سنی، اس کو محفوظ رکھا اور اس کو دوسروں تک پہنچایا، کیونکہ بسا اوقات علم کا حامل اس کو ایسے شخص تک پہنچاتا ہے جو اس سے زیادہ سمجھدار ہوتا ہے اور وہ خود سمجھدار نہیں ہوتا۔''

آپ نے حدیثوں کی کتابت کا بھی حکم دیا ہے، بعض لوگوں کے لیے حدیثیں لکھوائی ہیں: (حدثوا عنی ولا حرج)۔ (اکتبوا لابی شاہ) حجۃ الوداع میں آپ نے جو خطبہ دیا تھا، جو اسلام کے بہت سے اساسی احکام پر مشتمل ہے، ان کو دوسروں تک پہنچانے کا عام حکم دیا تھا، چنانچہ حدیث کی ان تمام کتابوں میں جن میں اس خطبہ کا ذکر ہے آپ کا ارشاد: (فلیبلغ الشاھد الغائب)[1] بھی ہے، یعنی جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ ان لوگوں تک ان احکام کو پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں، اسی کا نام روایت حدیث ہے۔

[1] اس قسم کے اور بھی ارشادات حدیث کی کتابوں میں ہیں، ہم نے صرف مثالاً چند نقل کیے ہیں۔

Marfat.com

اس لیے عہد رسالت سے لے کر بعد کے ہر دور میں حدیث نبوی کی نقل و روایت کا سلسلہ جاری رہا، یہ حدیثیں پوری دنیائے اسلام میں بکھری ہوئی تھیں، محدثین کرام کا یہ بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اس زمانہ میں جبکہ سفر کی سہولتیں نہ تھیں اور سفر ہم معنی سقر سمجھا جاتا تھا اور نہ نشر و اشاعت کے موجودہ سامان تھے، تعلیم بھی محدود تھی، دنیائے اسلام کا چپہ چپہ چھان کر رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال یعنی حدیث و سنت کو تحقیق و صحت کے پورے اہتمام کے ساتھ جمع و مرتب کیا، ان کے رد و قبول اور صحت و سقم کے جانچنے اور رواۃ کی جرح و تعدیل کے اصول بنائے، اصول حدیث کا مستقل فن ایجاد کیا، ہزاروں راویانِ حدیث کے حالات نہایت صحت و تحقیق کے ساتھ قلمبند کیے جو مسلمانوں کا بڑا قابل فخر کارنامہ ہے۔

اس لیے صاحب تصنیف محدثین کے حالات میں ایک کتاب کی تالیف عرصہ سے دارالمصنفین کے پیش نظر تھی، حضرت سیّد صاحبؒ دارالمصنفین کے قیام سے بھی پہلے امام بخاری اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کے حالات الندوہ میں لکھ چکے تھے، امام مالکؒ کے حالات بعد میں کتابی شکل میں شائع کر دیے، مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم نے امام مسلم کے حالات اور راقم نے امام ترمذی کے حالات لکھے تھے، سید صاحبؒ کی خواہش تھی کہ اس سلسلہ کو مکمل کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے، مگر اس وقت یہ کام نہ ہو سکا، اب اس زمانہ میں جبکہ موجودہ دور کے مجتہدین حدیث سے آزادی کے لیے اس کے پورے ذخیرہ کو مشکوک اور ناقابل اعتبار قرار دینے کی مہم میں لگے ہوئے ہیں، محدثین کرام کے حالات کو شائع کرنے کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس ہوئی تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ انہوں نے کس جانکاہ محنت اور کتنی تحقیق و احتیاط کے ساتھ حدیثوں کو جمع و مرتب کیا اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ تحقیق و صحت کے مادی و عقلی معیار کے اعتبار سے بھی دنیا کا کوئی علمی ذخیرہ حدیث کی کتابوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

یہ کتاب دو جلدوں میں ہوگی، پہلی جلد میں امام مالکؒ سے لے کر امام طحاویؒ تک یعنی دوسری صدی ہجری سے لے کر چوتھی صدی ہجری کے شروع تک (جو تدوین حدیث کا سب سے اہم دور ہے) کے محدثین اور ان کی تصانیف کے حالات ہیں، دوسری جلد میں اس کے بعد کے محدثین کے حالات ہوں گے۔

اس حصہ میں امام بخاریؒ کے حالات سید صاحبؒ کے قلم کے ہیں، امام مالکؒ کے حالات حیات امام مالکؒ کی تلخیص ہے، امام مسلمؒ کے حالات مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم کے اور امام ترمذی کے راقم کے تحریر کردہ ہیں، باقی محدثین کے حالات مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی نے لکھے ہیں، اس طرح یہ کتاب صاحب تصنیف محدثین کرام کا تذکرہ بھی ہے، تدوین حدیث کی تاریخ بھی اور حدیث کی موجودہ کتابوں پر نقد و تبصرہ بھی، اللہ تعالیٰ اس کو نافع بنائے۔

معین الدین احمد ندوی

دارالمصنفین اعظم گڑھ

۱۵/ مارچ ۱۹۶۸ء

Marfat.com

امام مالک رحمہ اللہ

(المتوفی ۱۷۹ھ/۷۹۵ء)

نام ونسب وولادت:

مالک نام ابوعبداللہ کنیت امام دارالہجرۃ لقب تھا سلسلۂ نسب یہ ہے: مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن حارث بن عمر بن حارث بن غیمان بن حبیثل بن عمرو ابن حارث ذی اصبح۔ (کتاب الانساب سمعانی، ورق ۴۱)

امام مالکؒ خالص عرب خاندان سے تھے جو جاہلیت اور اسلام دونوں میں معزز تھا بزرگوں کا وطن یمن تھا مگر اس اسلام کے بعد مدینۃ النبی ﷺ میں سکونت اختیار کر لی تھی نسباً یمن کے آخری خاندان شاہی یعنی حمیر کی شاخ ''اصبح'' سے تعلق رکھتے تھے امام کے مورث اعلیٰ حارث اس خاندان کے شیخ تھے اسی لئے ذی اصبح کے لقب سے مشہور ہوئے۔

آپ کے خاندان میں سب سے پہلے آپ کے پردادا ابوعامر عہد نبویؐ میں مشرف بہ اسلام ہوئے امام مالکؒ کے دادا مالک بن ابی عامر جلیل القدر تابعی اور صحاح کے رواۃ میں داخل ہیں حضرت عثمانؓ کے ساتھ ان کو یک گونہ اختصاص تھا چنانچہ جن سربکف جوانمردوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ان کی لاش کو دشمنوں کے نرغہ سے اٹھا کر دفن کرنے کی خطرناک خدمت انجام دی تھی ان میں ایک یہ بھی تھے فن روایت وحدیث میں ان کو حضرت عمر عثمان طلحہ عقیل بن ابی طالب ابو ہریرہؓ ام المومنین حضرت عائشہ و دیگر صحابہ کبار رضی اللہ عنہم سے شرف تلمذ حاصل تھا مدینہ کے مشہور فقیہ سلیمان بن یسار اور خود مالک کے بیٹوں نے اور دوسروں نے مالک سے حدیث روایت کی ہے موطا میں بھی ان کی روایات ہیں امام نسائی نے ان کی توثیق کی ہے ۱۰۴ھ میں وفات پائی۔

مالک بن ابی عامر کے تین بیٹے تھے انس امام مالک کے والد بزرگوار ربیع اور ابوسہیل نافع ابوسہیل نافع ایک بلند پایہ محدث تھے ثقات تابعین اور ارکان حدیث میں ان کا شمار ہے امام مالکؒ نے موطا میں ان سے روایت کی ہے۔

امام کے عم محترم ربیع اور والد ماجد انس بھی اپنے خاندان کی علمی وراثت سے محروم نہ تھے تاہم اس فن میں کوئی مخصوص پایہ نہیں رکھتے تھے اور نہ موطا میں امام نے ان سے کوئی روایت کی ہے۔

(تزئین الممالک، ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰، اسعاف المبطا برجال الموطا ۳۳ تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ ص ۱۸۸، کتاب الانساب سمعانی ورق ۴۱)

امام مالکؒ کی صحیح تاریخ ولادت (۹۳ھ) ہے کیونکہ یہ تاریخ امام کے شاگرد خاص یحییٰ ابن بکیر سے سند کے ساتھ مروی ہے جو مدتوں امام کی صحبت میں رہے ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص: ۱۹۲)

Marfat.com

تعلیم وتربیت:

امام نے ہوش سنبھالا تو اپنے کو علم کی آغوش میں پایا' خود ان کا گھر اور گھر سے باہر پورا شہر علماء وفضلاء کا مخزن تھا' آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد سینکڑوں صحابہ دور دراز مقامات میں نکل گئے تھے لیکن معدن سونا نکلنے کے بعد بھی معدن ہے' تمام اکابر صحابہؓ جو علوم شریعت کے امین اور قرآن وسنت کے خزینہ دار تھے' اسی مقدس شہر میں سکونت پذیر تھے' عہد نبویؐ اور اس کے بعد ۲۴' ۲۵ برس تک پوری حکومت اسلامیہ کا یہ مرکز تھا' یہیں سے احکام وفتاویٰ فقہائے صحابہؓ کی مجلس میں طے ہو کر تمام دنیائے اسلام میں پھیلتے تھے۔

مدینہ کے فقہائے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین:

حضرت ابو بکرؓ صدیق' عمرؓ فاروق اور حضرت عائشہؓ جو اسرار شریعت کے راز داں تھے' حضرت عبداللہ بن عمرؓ جن سے بڑھ کر آنحضرت ﷺ کے اعمال وسنن کا متبع اور واقف کار کوئی دوسرا نہ تھا' حضرت ابن عباسؓ جو حبر الامۃ تھے' حضرت ابو ہریرہؓ جن سے بڑھ کر حدیث کا کوئی دوسرا راوی نہیں' حضرت زید بن ثابتؓ جو کاتب وحی تھے' ان سب کی درسگاہیں اسی شہر میں آباد تھیں۔

تابعین مدینہ رحمۃ اللہ علیہم:

تلامذۂ صحابہؓ میں سے جن کو اصطلاح میں تابعین کہتے ہیں' قاسم بن محمد' عروہ بن زبیر نافع' عبداللہ بن دینار' سالم بن عبداللہ' خارجہ بن زید' سعید بن مسیب' ہشام بن عروہ' عبداللہ بن عتبہ (۱۰۲ھ)' محمد بن منکدر' عبیداللہ بن عتبہ بن مسعود' محمد بن مسلم بن شہاب زہری' عامر بن عبداللہ' جعفر صادق' ربیعہ رائی' ابو سہیل نافع بن مالک اور سلیمان بن یسار وغیرہ وہ بزرگان اسلام ہیں جن کے فضل وکمال کے آغوش میں اسلام کے علم ودین نے نشوونما پائی ہے' اسی مدینۃ النبیؐ کے لعل وگہر تھے۔

فقہائے سبعہ رحمۃ اللہ علیہم:

ان میں سے ابو بکر بن حارث (۹۴ھ) خارجہ بن زید (۹۹ھ) قاسم بن محمد (۱۰۱ھ) سعید بن مسیب (۱۰۱ھ) عبداللہ بن عتبہ (۱۰۲ھ) سالم بن عبداللہ (۱۰۶ھ) سلیمان بن یسار (۱۰۰ھ) مدینہ کے فقہائے سبعہ کہلاتے ہیں' صحابہؓ کے بعد تمام فتاویٰ' مسائل اور مقدمات وقضایا انہی کے فیصلہ سے طے پاتے تھے' ان کی مجلس اجتماعی اس عہد کی سب سے بڑی عدالت عالیہ تھی' فقہ مدینہ جس کا ذکر آگے آئے گا ان ہی فقہائے سبعہ کی علمی مجلسوں کے نتائج زیر بحث ہیں۔

شیوخ مالک:

امام مالک نے جب آنکھ کھولی تو مدینہ باغ وبہار تھا' چند کے سوا تمام بزرگوار درس وافتاء میں مشغول تھے' امام نے ان میں سے اکثر سے استفادہ کیا اور اس طرح مدینہ کا جو علم متفرق سینوں میں پراگندہ تھا وہ ایک سینہ میں مجتمع ہو گیا اسی لئے امام دار الہجرۃ آپ کا لقب ہوا' امام کے شیوخ کی یوں تعداد تو بہت ہے اسماء الرجال کی کتابوں میں ہے کہ: (روی عن خلق کثیر) یعنی انہوں نے بہت سے لوگوں سے روایتیں کی ہیں۔

Marfat.com

امام کے شیوخ اعزہ:

خود امام کا گھر علم حدیث کا مرجع تھا' آپ کے دادا' چچا اور والد محدث تھے' امام کے دادا جو ثقات رواۃ میں ہیں' امام کے ہوش تک زندہ تھے لیکن ان سے بلاواسطہ امام نے فیض حاصل نہیں کیا' ابو سہیل نافع امام کے ایک چچا روایت وحدیث کے شیخ تھے' امام زہری وغیرہ کے استاذ ہیں' امام نے بھی ان سے حدیثیں سیکھیں ہیں' آپ کے والد انس اور دوسرے چچا ربیع دونوں اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں لیکن ان سے کوئی روایت امام نے مؤطا میں نقل نہیں کی۔

امام نے غالباً لڑکپن سے طلب علم شروع کی' خود انکی زبانی مروی ہے ''میں نافع کے پاس آتا تھا تو ایک کمسن لڑکا تھا' میرے ساتھ ایک غلام ہوتا تھا' نافع اتر کر آتے تھے تو مجھ سے حدیث بیان کرتے تھے۔'' (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص: ۸۸ ترجمہ نافع)

اس وقت تک تعلیم کا نصاب نہایت سادہ تھا یعنی قرآن مجید' حدیث اور فقہ۔

امام مالک نے قرآن مجید کی قراءت وسند مدینہ کے امام القراء ابورویم نافع بن عبدالرحمٰن متوفی ۱۶۹ھ سے حاصل کی' (ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰ وجلد ۳ ص: ۵۱) جن کی قراءت پر آج تمام دنیائے اسلام کی قراءت کی بنیاد ہے' قرآن مجید کی تعلیم ہمیشہ مسلمانوں میں لڑکپن میں ہوتی ہے' عجب نہیں کہ اس کا یہی زمانہ ہو۔

علم حدیث:

علم حدیث کی تعلیم بھی بچپن ہی سے شروع ہوئی جیسا کہ گزشتہ روایت سے ثابت ہوتا ہے' اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام کے سب سے پہلے شیخ الحدیث حضرت نافع ہیں یا ممکن ہے آپ کے چچا ابو سہیل ہوں لیکن یہ محض قیاس ہے اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی۔

نافع: نافع حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام اور حدیث وروایت میں ان کے شاگرد تھے' حضرت نافع نے کامل تیس سال حضرت ابن عمرؓ کی خدمت کی ہے' ان کے علاوہ اور متعدد صحابہ حضرت عائشہؓ' ام سلمہؓ' حضرت ابو ہریرہؓ' حضرت ابو سعید خدریؓ وغیرہ سے بھی روایت کی ہے' امام اوزاعی' امام زہری' ایوب سختیانی' ابن جریج' امام مالک جیسے ائمہ حدیث ان سے شرف تلمذ رکھتے تھے' نافع کی جلالت قدر کا اس سے اندازہ ہوگا کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے جو خود نافع قدر فن تھے' نافع کو اہل مصر کی تعلیم کے لیے بھیجا تھا' ۱۱۷ھ میں نافع نے وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۷ و ۸۸)

نافع جب تک زندہ رہے' امام مالک ان کے حلقہ درس سے استفادہ کرتے رہے' وہ ان سے پوچھتے تھے کہ ''ان مسائل میں حضرت ابن عمرؓ نے کیا فرمایا ہے'' نافع ان کے اقوال بیان کرتے تھے' شاگرد کو استاد کے علم وفضل پر اتنا غرور تھا کہ فرماتے ہیں کہ ''جب میں ابن عمرؓ کی حدیث نافع کی زبان سے سن لیتا ہوں تو اس کی پروا نہیں کرتا کہ کسی اور سے بھی اس کی تائید سنیں'' شاگرد واستاد کے شرف وقبول کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ روایت مالک عن نافع عن ابن عمرؓ کو دنیا سلسلۃ الذہب یعنی ''طلائی زنجیر'' کہہ کر پکارتی ہے۔ (ابن خلکان ج ۳ ص: ۵۰)

نافع کے علاوہ امام نے مدینہ کے دوسرے شیوخ کبار سے بھی حدیث سیکھی' جن میں ممتاز نام یہ ہیں: محمد بن شہاب زہری' جعفر صادق بن محمد' محمد بن منکدرؒ' محمد بن یحییٰ انصاری' ابو حازم' یحییٰ بن سعید۔

Marfat.com

شیوخ کی تعداد:

امام مالک نے مؤطا میں جن شیوخ سے روایت کی ہے ان کی مجموعی تعداد شاہ ولی اللہ صاحب نے مسوی کے مقدمہ میں پچھتر بتائی ہے لیکن اسعاف المبطاً برجال المؤطا سے میری تحقیق کے مطابق شیوخ کی تعداد چورانوے ہے لیکن یہ تعداد مؤطا کی احادیث وآثار کی ہے ورنہ اصل میں امام مالک کی احادیث صحیحہ وغیر صحیحہ کی تعداد دس ہزار ہے اس لحاظ سے اگر شیوخ کی تلاش کی جائے تو موجودہ تعداد سے بہت زیادہ بڑھ جائے گی امام مسلم نے امام مالک کے شیوخ کے احوال میں ایک مستقل کتاب لکھی تھی لیکن اب وہ ناپید ہے۔

غیر مدنی شیوخ:

امام مالک کے اساتذہ میں بعض غیر مدنی شیوخ کے نام بھی ملتے ہیں شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک ایسے چھ اشخاص ہیں جیسا کہ مقدمہ مسوی میں لکھا ہے لیکن درحقیقت نو شخص ہیں ایک شام کے ابراہیم بن ابی عبلہ مقدسی دو مکہ معظمہ کے محمد بن مسلم ابوالزبیر مکی اور حمید بن قیس اعرج مکی دو خراسان کے عطاء بن ابی مسلم خراسانی اور زیادہ بن سعد خراسانی دو جزیرہ کے عبدالکریم بن مالک جزری اور زید بن انیسہ جزری اور دو بصرہ کے ایوب سختیانی بصری اور حمید بن ابی حمید الطویل بصری امام نے ان ممالک کا کبھی سفر نہیں کیا اس لیے ان بزرگوں سے اخذ واستفادہ کا موقع مدینہ ہی میں ملا ہوگا کیونکہ حج وزیارت کی غرض سے اکثر بزرگان علم کا سال میں ایک بار اور کبھی کبھی کئی کئی بار مدینہ میں آنا ہوتا تھا۔

علم فقہ:

امام مالک نے فقہ کی تعلیم گو نافع وغیرہ شیوخ سے بھی پائی لیکن ابوعثمان ربیعۃ الرای سے خاص طور سے اس کی تحصیل کی ربیعہ مدینہ کے کبار تابعین میں تھے حضرت انسؓ وغیرہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دامن تربیت میں تعلیم پائی تھی امام مالک یحیی الانصاری شعبہ اوزاعی حسن بصری لیث مصری وغیرہم جو اس طبقہ کے اکابر رجال واعیان علم ہیں ان کے شاگرد ہیں ربیعہ کے ساتھ امام مالک کا اختصاص اس درجہ تھا کہ تاریخ ورجال میں ''شیخ مالک'' ان کے نام کا جزو ہوگیا ہے ربیعہ اجتہاد واستنباط وتفریع ورائے میں اس قدر معروف تھے کہ ''رائی'' ان کا لقب ہوگیا امام ابن حنبل ان کو ثقہ کہتے ہیں ابن شیبہ کا قول ہے کہ وہ ''ثقہ'' ثبت اور مدینہ کے مفتیوں میں سے ایک تھے خطیب نے لکھا ہے ''وہ فقہ کے عالم اور فقہ وحدیث دونوں کے حافظ تھے''

ربیعہ رائی خاص مسجد نبویؐ میں درس دیتے تھے قرن اول کا مدینہ جو سینکڑوں محدثین وفقہاء کا مخزن تھا اس میں فتویٰ دینا ایک خاص لیاقت وقابلیت کا کام تھا ربیعہ رائے اس وصف سے متصف اور ان اکابر فقہائے محدثین میں تھے جن کو مدینۃ الرسول کے مفتی ہونے کی سعادت حاصل تھی دولت عباسیہ کے پہلے فرماں روا سفاح نے قاضی دارالخلافت کا عہدہ ان کے سپرد کیا حکومت عباسیہ کا پہلا پایہ تخت انبار تھا یہیں ۱۳۶ھ میں انہوں نے وفات پائی۔

امام مالک کے شیوخ واساتذہ کی یہ تعداد اس زمانہ کے کثرت شیوخ کے مذاق کے لحاظ سے نہایت کم ہے اور عجب نہیں کہ ان بزرگوں کو جو تعداد کو افضلیت کا معیار جانتے ہیں تعجب ہو لیکن درحقیقت اس میں بھی امام مالک کے لیے ایک

Marfat.com

عزیمت خاص مضمر ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ کا انتخاب شیوخ:

صحابہؓ کے بعد تابعینؒ کا دور شروع ہوا' یہ دور ثانی یا قرن ثانی گو عمومیت اور اکثریت کے لحاظ سے خیر و برکت کا عہد اور صدق و طہارت کا دور تھا تاہم زمانہ کا کوئی دور بھی ایسا نہیں گزرا ہے اور نہ گزر سکتا ہے' جب مجمع انسانی فاسد عنصر سے بالکل خالی ہو زمانہ کے خیر یا شر ہونے کا فیصلہ صرف نسبتاً ہو سکتا ہے' صحابہ کا قرن اول اپنے ماقبل و مابعد کی نسبت سے خیر القرون تھا تاہم وہ ماعز اور زن مخزومیہ وغیرہ کے وجود سے خالی نہ تھا' گو یہ ہستیاں بھی قرون مابعد کے اخیار و ابرار سے شرف صحبت' قوت ایمان' اعتراف قصور و خشیت الٰہی اور توبہ و ندامت میں بدرجہا بہتر تھیں' عفی اللہ عنہم۔

صحابہؓ کے بعد تابعین کا زمانہ بھی اپنے مابعد کے لحاظ سے برکات کا مجمع اور کمالات کا منبع تھا' تاہم وہ انسانی طبقات کے جو اقسام ہیں ان سے یکسر پاک بھی نہ تھا' بہتیرے لوگ قصداً جھوٹ بولتے تھے' بہتیرے اپنے غایت زہد و سادہ دلی سے ہوٹا بولنے والے کو سچا سمجھ کر بلا تامل اس کی بات نقل کرتے تھے' اس طرح نادانستہ کذب بیانی میں مبتلا ہو جاتے تھے' سینکڑوں غیر فقیہ راوی ایسے تھے جو اپنی روایات کا خود محل و مفہوم نہیں سمجھتے تھے' کچھ ایسے تھے جو فن کی عدم ممارست کے سبب سے جید وردی میں تمیز نہیں کر سکتے تھے لیکن چونکہ اس زمانہ کی آب و ہوا میں روایت حدیث اور اشاعت قول نبوی کا مذاق پھیلا ہوا تھا اور یہی عزو شرف کا ذریعہ تھا' اس لئے اہل فضل اور مستحقین علم کے پہلو بہ پہلو نااہل اور غیر مستحقین بھی اپنی مسند بچھاتے پھرتے تھے' باہر کے ناواقف آفاقی جن میں زیادہ تر عراقی تھے' ہر چمکدار چیز کو سیم خالص سمجھ کر اور ڈھیر سے بلا تمیز ایک خروارہ اٹھاتے پھرتے تھے اور اس بار گراں کے ساتھ جب گھر لوٹتے تھے تو اپنے کو سب سے بڑے ڈھیر کا مالک سمجھ کر خوش ہوتے تھے۔

امام مالک کا وطن مدینہ تھا' بچپن سے علما میں تربیت پائی' ایک ایک صاحب حدیث سے برسوں ملاقاتیں رہیں' ہر ایک سرمایہ دار کی متاع کے ایک ایک ذرہ سے واقف تھے اور یہ غیر ممکن ہے کہ نااہلوں کی نااہلیت خود اپنے ارباب وطن سے مخفی رہے۔

خصوصیات شیوخ مالک رحمۃ اللہ:

امام مالک نے صرف ان ہی اساتذۂ فن سے استفادہ کیا جو اہلیت و استحقاق کے مسند نشین تھے اور صرف ان شیوخ کے حلقۂ درس میں بیٹھے جو صدق و طہارت میں معروف اور حفظ و فقہ میں ممتاز تھے' امام ممدوح ہمیشہ تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ میں کبھی کسی غیر فقیہ (سفیہ) کی مجلس میں نہیں بیٹھا' امام ابن حنبل فرماتے ہیں کہ ''یہ مخصوص نعمت تھی جو صرف حضرت امام مالک کے حصہ میں آئی''۔ امام صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''اس صحن مسجد (نبوی) میں ان ستونوں کے پاس میں نے ستر شیوخ کو پایا جو قال اللہ قال الرسول کہا کرتے تھے لیکن ان میں سے ایک کے پاس بھی میں نہیں بیٹھا''۔ کبھی فرماتے ''مدینہ میں بیسیوں اشخاص تھے جن سے لوگ حدیث سیکھتے تھے لیکن میں نے کبھی ان سے اخذ علم نہیں کیا' یہ چند قسم کے لوگ تھے' بعض نادانستہ جھوٹ بولتے تھے' بعض مغز سخن سے ناواقف تھے' بعض پورے جاہل تھے' ابن وہب جو امام صاحب کے نامور شاگرد ہیں نقل کرتے ہیں کہ امام صاحب نے فرمایا کہ مدینہ میں ایسے لوگ تھے کہ اگر بارش کی دعا مانگی جاتی تو ان کی برکت سے آسمان سے پانی برس پڑتا' اور بہت سی احادیث اور مسائل کی ان کو سماعت بھی حاصل تھی لیکن میں نے

Marfat.com

ان سے استفادہ نہیں کیا کیونکہ وہ صرف متقی اور زاہد تھے اور حدیث و روایت اور فتویٰ کا کام صرف زہد و اتقا اور سادگی سے نہیں چل سکتا اس کے لیے اتقاو پرہیز گاری کے ساتھ علم و فہم اور پختگی کی حاجت ہے وہ یہ جانتا ہو کہ اس کے منہ سے کیا نکل رہا ہے اور کل قیامت کے دن یہ معاملہ کہاں تک پہنچے گا' جس زہد کے ساتھ پختگی اور دانائی نہ ہو وہ اس راہ میں مفید نہیں اور نہ وہ حجت ہے اور نہ ایسے لوگوں سے اخذ علم کرنا چاہیے۔'' امام مالک کے بھانجے اسماعیل بن ابی اویس روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں مالک کو کہتے سنا ہے کہ ''یہ علم حدیث دین ہے پہلے دیکھ لو کہ کس سے حاصل کرتے ہو' میں نے ان ستونوں کے پاس ستر آدمیوں کو قال قال رسول اللہ کہتے سنا لیکن میں نے ان سے ایک حرف نہیں سیکھا' حالانکہ ان میں سے ہر شخص ایسا تھا کہ اگر خزانہ بھی ان کے سپرد کیا جاتا تو ان کی ایمان داری اور دیانت کے شیشہ میں بال نہ آتا لیکن وہ اس فن کے آدمی نہ تھے۔'' مطرف بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے امام کی زبان سے ان کا قول سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ ''میں نے اس شہر میں بہت سے نیک و صالح لوگوں کو پایا لیکن ان سے میں نے حدیث نہیں سنی۔'' لوگوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ ''جو وہ کہتے تھے وہ سمجھتے نہ تھے۔'' (مقدمہ اسعاف ص ۲ '۳ '۴ '۵)

امام صاحب نے اہل عراق سے کیوں روایت نہیں کی:

امام کے شیوخ میں کوئی عراقی نہیں ہے' ابو مصعب جو امام کے شاگرد اور مشہور محدث ہیں' بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اہل عراق سے کیوں روایت نہیں کی؟ جواب میں فرمایا کہ ''کیا میں ایسے لوگوں سے روایت کروں جن کو میں نے دیکھا ہے کہ یہاں آ کر ان لوگوں سے حدیث سیکھتے ہیں جن پر وثوق نہیں کیا جا سکتا'' ابو مصعب کا بیان ہے کہ ''میں نے کہا کہ وہ اپنے شہر میں بھی ایسے ہی لوگوں سے روایت کرتے ہیں؟'' اسی قسم کا سوال ایک بار امام مالک سے شعیب بن حرب نے کیا کہ آپ لوگ اہل عراق سے کیوں نہیں روایت کرتے؟ امام صاحب نے کیا معقول جواب دیا' فرمایا کہ ''ہمارے بزرگوں نے ان کے بزرگوں سے روایت نہیں کی اس لیے ہمارے پچھلوں نے بھی ان کے پچھلوں سے روایت نہیں کی۔ (مقدمہ اسعاف ص ۲ '۳)

امام مالک جب کسی غیر مدنی شیخ سے اخذ حدیث کرنا چاہتے تھے تو پہلے اس کو پوری طرح جانچ لیتے تھے' امام کا کوئی شیخ اگر عراقی کہا جا سکتا ہے تو وہ بصرہ کے ایوب سختیانی مشہور تابعی المتوفی ۱۳۱ھ ہیں جن کی نسبت ابن سعد کہتے ہیں: ''کان حجۃ ثقۃ ثبتا فی الحدیث جامعا کثیر العلم'' اور جن کو شعبہ نے سید الفقہاء کا خطاب دیا ہے اور جن کا نام رجال میں احد الائمۃ الاعلام کے وصف کے ساتھ لیا جاتا ہے' امام مالک فرماتے ہیں کہ مکہ میں حج کے موقع پر ان کو دو سال میں نے دیکھا لیکن ان سے کوئی حدیث نہیں لکھی' تیسرے سال دیکھا کہ وہ صحن زمزم میں بیٹھے ہیں' جب آنحضرت ﷺ کا اسم گرامی لیا جاتا تو وہ اتنا روتے کہ مجھ کو رحم آتا تھا' جب یہ حال دیکھا تو ان کی حدیث لکھی۔ (مقدمہ اسعاف ص ۳ تا ۵)

اپنے دادا اور بعض فقہائے سبعہ سے کیوں نہیں روایت کی:

امام جب سن رشد کو پہنچے اس وقت آپ کے دادا مالک بن ابی عامر زندہ تھے' ان کی وفات کے وقت امام کی عمر ۱۲' ۱۳ سال کی تھی فقہائے سبعہ میں سے سالم بن عبداللہ نے ۱۰۶ھ میں وفات پائی' جب کہ امام کی عمر ۱۶ برس کی تھی' سلیمان بن

Marfat.com

یسار نے ۱۰۷ھ میں انتقال کیا‘ اس وقت امام ۱۷ سال کے تھے تاہم امام صاحب نے ان بزرگوں سے بلا واسطہ کوئی روایت نہیں کی‘ اس کا سبب خود انہوں نے بیان فرما دیا ہے کہ ’’مدینہ میں بعض ایسے لوگوں کا زمانہ میں نے پایا ہے جو ۱۰۰ اور ۱۰۵ برس کی عمر کو پہنچ گئے تھے لیکن ایسے بوڑھوں کی روایت نہیں لی جاتی ہے اور اگر کوئی لے تو عیب شمار کیا جائے گا‘‘ اور یہ بالکل سچ ہے کیونکہ عمر کی طوالت کا حفظ و عقل کے ضعف پر جو اثر پڑتا ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔

امام مالک کے اس احتیاط و تمیز و نقد کا یہ اثر تھا کہ امام مالک جس شیخ سے روایت کرتے تھے وہ ثقاہت و عدالت و حفظ میں نشان سمجھا جاتا تھا‘ یحییٰ بن معین جو مبصرین فن حدیث کے امام ہیں فرماتے ہیں کہ ہم لوگ امام کے آگے کیا ہیں ہم لوگ تو ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں‘ جب کسی شیخ کا نام آتا ہے تو دیکھتے ہیں کہ امام مالک نے اس سے لیا ہے یا نہیں‘ اگر نہیں لیا ہے تو چھوڑ دیتے ہیں۔‘‘ امام احمد بن حنبل سے کسی نے ایک راوی کی نسبت پوچھا انہوں نے فرمایا کہ ’’میرے نزدیک وہ اچھا ہے کیونکہ امام مالک نے اس سے روایت کی ہے۔‘‘ (ان تمام اقوال کے لیے دیکھیے مقدمہ اسعاف)

اساتذہ آپ کے معترف تھے:

امام مالک فطرتاً قوی الحافظہ تھے‘ خود فرمایا کرتے تھے کہ کوئی چیز میرے خزانہ دماغ میں آ کر پھر نہ نکلتی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۸‘ ۱۸۹) اور خود دوسروں کو بھی اس کا اعتراف تھا‘ ابوقلابہ کہتے ہیں: کان مالک احفظ اھل زمانہ (تزیین الممالک ص ۹ مصر) ایک بار استاذ ربیعہ کی معیت میں امام زہری کی مجلس میں حاضر ہوئے‘ امام زہری نے اس دن چالیس سے زیادہ حدیثوں کا املا کرایا۔ دوسرے دن پھر مجلس منعقد ہوئی تو امام مالک اپنے استاذ کے ساتھ پھر حاضر ہوئے‘ امام زہری نے کہا کتاب لاؤ‘ میں اس سے حدیث بیان کروں‘ کل جو میں نے بیان کیا تھا اس سے تم کو کیا فائدہ ہوا‘ ربیعہ نے کہا اس مجلس میں ایک شخص ہے جو کل کی تمام حدیثیں زبانی سنا دے گا‘ زہری نے پوچھا وہ کون ہے؟ ربیعہ نے کہا ابن ابی عامر‘ زہری نے سنانے کا اشارہ کیا‘ امام صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے چالیس حدیثیں سنا دیں‘ زہری نے تعجب سے کہا میرا خیال تھا کہ یہ حدیثیں میرے سوا کسی کو یاد نہیں ہیں۔ (تزیین الممالک ص ۹ مصر ۱۰)

شوق علم اور فراغ قلب بہت کم مجتمع ہوئے ہیں‘ امام مالک کے فقر کی نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ چھت کی کڑیاں فروخت کر کے ضرورتیں پوری کیں لیکن دست طلب علم کو تاہ نہیں کیا۔

اس لیے آپ فرماتے تھے کہ اس علم میں کسی شخص کو اس وقت تک کمال حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ مبتلائے فقر نہ ہو اور اس پر بھی طلب علم کو ترجیح دے (تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ ص ۱۸۸) امام مالک طلب علم کے لیے بجز موسم حج کے مدینہ سے باہر نہیں نکلے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کو طلب علم کے لیے محنت نہیں اٹھانی پڑی‘ ابن سعد نے امام مالک سے بیک واسطہ روایت کی ہے کہ نافع سے حدیث سیکھنے کا وقت ٹھیک دوپہر کو مقرر تھا‘ دوپہر کی دھوپ کی بلا سایہ شہر سے باہر بقیع میں جاتا تھا‘ جہاں ان کا مسکن تھا‘ مدینہ کے ایک فقیہ ابن ہرمز تھے‘ ان کے گھر صبح کو آتا تھا تو رات کو جاتا تھا۔ (طبقات ابن سعد)

مجلس درس:

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ امام صاحب کی لیاقت و استحقاق کا اعتراف عام طور سے کیا جا رہا تھا اور امام کے شیوخ کی

Marfat.com

موجودگی میں امام کے مستفیدین کا الگ حلقہ قائم ہو چکا تھا (تزیین الممالک ص ۱۰) شیخ الفقہ ربیعہ متوفی ۱۳۶ھ زندہ تھے کہ امام مالک فقہ و فتویٰ کے مرجع بن گئے (ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰) اور ربیعہ کی وفات کے بعد تو متفقہ طور سے فقہ و رائے و اجتہاد کے امام تسلیم کر لیے گئے ابن ربیعہ نے جو مصر کے ایک شیخ حدیث ہیں، شیخ مدینہ ابو الاسود نعیم بن عروہ بن زبیر سے پوچھا کہ ''ربیعہ کے بعد مدینہ میں فقہ و اجتہاد کا امام کون ہے؟'' انہوں نے جواب دیا کہ نوجوان اصحی (تزیین الممالک ص ۹) یعنی (مالک بن انس اصحی)۔

مجلس مالک:

فن حدیث میں امام صاحب کے خاص شیخ حضرت ابن عمرؓ کے غلام نافع تھے، حضرت ابن عمرؓ آنحضرت ﷺ کے بعد ساٹھ برس تک حدیث و فقہ و فتویٰ و ارشاد کے مرکز رہے ہیں، حضرت نافع کامل تیس برس تک سفر و حضر اور خلوت و جلوت میں ہمیشہ حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ رہے اور ان کے بعد ان کی مجلس درس میں ان کے جانشین ہوئے، ۱۱۷ھ میں وفات پائی، امام مالک کم از کم بارہ برس حضرت نافع کے درس میں رہے۔

حضرت نافع کی وفات کے بعد امام مالک ان کے جانشین ہوئے، شعبہ جو کوفہ کے رئس المحدثین تھے، بیان کرتے ہیں کہ ''نافع کی وفات کے ایک سال بعد مدینہ آیا تو دیکھا کہ مالک ایک حلقہ کے صدر نشین ہیں۔'' (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۸) اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب نے ۱۱۷ھ میں اپنی مجلس درس مستقل قائم کی۔

مجلس کی تہذیب:

امام صاحب کی مجلس درس ہمیشہ پر تکلف فرش اور بیش قیمت قالینوں سے آراستہ رہتی تھی، وسط مجلس میں شہ نشین تھی، جس پر امام صاحب املائے حدیث کے وقت رونق افروز ہوتے تھے، جابجا شرکائے مجلس کے لیے پنکھے پڑے رہتے تھے، جب حدیث کا درس ہوتا تو انگیٹھی میں عود اور لوبان جلائی جاتی، صفائی و نزاہت کا یہ عالم تھا کہ فرش پر ایک تنکا بھی بار خاطر ہوتا تھا، جب حدیث نبویؐ کے املا کا وقت آتا پہلے وضو یا غسل کر کے عمدہ اور بیش قیمت پوشاک زیب تن فرماتے، بالوں میں کنگھی کرتے، خوشبو لگاتے اس اہتمام کے بعد مجلس علمی کی صدارت کے لئے باہر تشریف لاتے۔

(تزیین الممالک ص ۱۳ و ۱۶ و بستان المحدثین ص ۲۰۳)

سب لوگ سرنگوں خاموش مؤدب بیٹھتے تھے، یہاں تک کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی جب امام کی مجلس درس میں آ کر شریک ہوئے تو وہ بھی اسی طرح مؤدب ہو کر بیٹھے (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۹) اس وقت امام صاحب کی ہر ادا سے شکوہ اور وقار کا اظہار ہوتا تھا، پوری مجلس پر ایک مقدس سکوت طاری رہتا تھا، امام شافعی فرماتے ہیں کہ ''ہم لوگ کتاب کے ورق بھی اس ڈر سے نہیں الٹتے تھے کہ کھڑکھڑاہٹ کی آواز نہ ہو'' (توالی التاسیس بمناقب ابن ادریس ابن حجر) جاہ و جلال اور شان و شکوہ سے کاشانہ امامت پر بارگاہ شاہی کا دھوکہ ہوتا تھا، طلبہ کا ہجوم، مستفتیوں کا ازدحام، امرا کا ورود، علما کی تشریف آوری، سیاحوں کا گزر، حاجیوں کی موجودگی، نشست مکان کے پھاٹک پر سواریوں کا انبوہ دیکھنے والوں پر رعب طاری کر دیتا تھا، اسی موقع پر ایک شاعر کا گزر ہوا تو بے اختیار اس کی زبان سے یہ دو شعر نکل گئے۔ (تزیین ص ۱۷)

Marfat.com

یدع الجواب فما یراجع ھیبۃ ✵ والسائلون نواکس الاذقان

اگر امام جواب نہیں دیتے تو ہیبت سے پھر پوچھا نہیں جاسکتا' پوچھنے والے سرنیچے کئے رہتے ہیں۔

ادب الوقار وعز سلطان التقی ✵ فھو المھاب ولیس ذا سلطان

وقار کا ادب اور سلطان تقویٰ کا جاہ وجلال ہے' لوگ اس سے ڈرتے ہیں حالانکہ یہ صاحب حکومت نہیں ہے۔

امام مالک صاحب حکومت نہ تھے لیکن صاحب حکومت اس آستانہ پر آ کر جھکتے تھے' امام شافعیؒ نے اپنی تعلیم کے لئے والی مدینہ کو بہ غرض سفارش جب در امامت پر لانا چاہا تو اس نے کہا ''میرا کہاں وہاں گزر۔''

حدیث کا املا مسجد نبوی یا مجلس درس سے باہر نہیں کرتے تھے' خلیفہ مہدی اور ہارون دونوں نے خیمہ خلافت میں املا کی خواہش کی لیکن امام نے انکار کر دیا' جلدی میں یا کسی کام کی مصروفیت میں یا راہ چلتے ہوئے حدیث نہیں بیان فرماتے تھے کہ خلاف ادب ہے' درحقیقت سماع وفہم حدیث کے لئے اطمینان اور حضور قلب چاہیے جو ان موقعوں پر عموماً مفقود ہوتے ہیں' ان کی مجلس میں زور زور سے بولنا بھی خلاف ادب تھا' ایک بار خلیفہ منصور امام سے مسجد میں مناظرہ کر رہا تھا اور اس کی آواز نہایت بلند ہو رہی تھی' امام نے ڈانٹ کر یہ آیت پڑھی: (ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰ وتہذیب الاسماء قسم اول ج ۲ ص ۷۷)

لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ۔ (حجرات: ۲) پیغمبر کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو۔

آپ کا معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک مصلیٰ پر اوراد و وظائف میں مشغول رہتے' طلوع کے بعد لوگ آنا شروع ہوتے' امام صاحب ان کی طرف متوجہ ہو کر خیریت پوچھتے' مجلس کی یہ ترتیب تھی کہ قریب تر اچھے' مستعد اور صاحب فہم طلبہ کو جگہ دیتے' پھر علی قدر مراتب لوگ آ آ کر بیٹھتے جاتے' درس شروع کرنے سے پہلے فرما دیتے کہ ''مشہور اور صاحب فہم لوگ قریب بیٹھیں' املا آہستہ اور سکون کے ساتھ کرتے' ایک حدیث ختم ہو جاتی تو دوسری شروع کرتے۔''

طریقۂ درس:

مختلف شیوخ کی مجلسوں میں درس کا طرز مختلف تھا' اکثر شیوخ کا دستور تھا کہ وہ خود کسی بلند مقام پر بیٹھ جاتے یا کھڑے ہو جاتے' طلبہ ترتیب کے ساتھ آگے پیچھے قلم دوات لے کر بیٹھ جاتے' شیخ زبانی یا اپنا جزو حدیث ہاتھ میں لے کر اس سے املا کرتا' طلبہ لکھتے جاتے تھے' مجلس درس میں اگر غیر معمولی اجتماع ہوتا تو تھوڑی تھوڑی دور پر مستملی کھڑے ہو کر شیخ کے الفاظ آگے کو پہنچاتے' امام مالک بھی کبھی کبھی اس طریقہ سے درس دیتے تھے' ابن علیہ جو ایک اچھے شاگرد تھے' امام کے مستملی تھے۔

لیکن مدینہ کے اکثر شیوخ کا دستور یہ تھا کہ وہ اپنی احادیث وفتاویٰ وتعلیقات کو پہلے قلم بند کر لیتے' یا کسی مستعد اور صاحب فہم شاگرد کو لکھنے پر مامور کرتے' یہ لکھے ہوئے اجزا کاتب کے ہاتھ میں ہوتے اور وہ مجلس میں اس کو پڑھتا' شیخ جابجا اس کے مطالب کی تشریح کرتا جاتا' اگر کاتب سے غلطی ہو گئی ہوتی تو اس کی تصحیح کر دیتا' امام صاحب کے کاتب کا نام ابن حبیب تھا' جن کا شمار محدثین کبار میں ہے' کبھی معن بن عیسیٰ یا دوسرے تلامذہ پڑھتے' یہی سبب ہے کہ امام کے بعض تلامذہ مثلاً یحییٰ جن کی روایت بخاری میں ہے بجائے حدثنا مالک واخبرنا مالک کے قراءۃً علی مالک کہتے ہیں۔

امام صاحب اس اصول کی شدت سے پابندی کرتے تھے' یحییٰ بن سلام اسی بات پر ناراض ہو کر مجلس سے اٹھ گئے کہ

Marfat.com

"خود نہیں پڑھتے' شاگردوں سے پڑھواتے ہیں" یحییٰ بن سلام تو خیر ایک ادنیٰ شاگرد تھے' خود خلیفۂ وقت ہارون نے امین و مامون کے لیے درخواست کی کہ امام پڑھیں اور یہ سنیں تو امام نے شیوخ مدینہ کا نام گنا کر فرمایا کہ "ہمارے شہر کے شیوخ کا یہی دستور تھا" (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۹۰' ۱۹۱) کیا عجیب بات ہے کہ جس بات کے لیے لوگوں کو اس قدر اصرار تھا وہی آج ایک مدت سے تمام مدارس اسلامیہ کا دستور عام ہے۔

اس طریقہ کی خوبی:

شیوخ مدینہ کا یہ طریقہ متعدد وجوہ سے زیادہ محتاط اور بہتر ہے' مجمع عام میں جب کوئی شخص بولنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو عجلت' کثرت ازدحام اور کبھی مرعوبیت کے سبب سے اس میں مسامحت ہو سکتی ہے' بخلاف اس کے اگر پہلے سے لکھ لیا جائے تو فراغ خاطر' اطمینانِ قلب اور فرصت فکر و مراجعت کے سبب سے صحت و حفظ و وثوق کے ذرائع زیادہ ہیں' محدث کا خود قراءت نہ کرنا اس لیے زیادہ مناسب ہے کہ وہ دوبارہ سن کر اپنے مسودہ کی تصحیح کر سکے کیونکہ خود پڑھنے میں اکثر دیکھا گیا کہ زبان و نظر اپنی یاد کی بنا پر غلط لکھے ہوئے کو بھی صحیح پڑھتی ہے' دوسرا اجنبی شخص ہر سطر پر بار بار ٹھہرتا ہے' اس طرح معلم کو ہر مرتبہ غلطی پر تنبیہ ہوتی ہے' لیکن اس سے بھی بڑی مصلحت اس میں یہ ہے کہ اکثر فقہائے محدثین احادیث و آثار کے ساتھ اپنی ذاتی تحقیق و رائے یا کسی لغت کی شرح بھی بیان کرتے جاتے تھے' چنانچہ امام زہری کا یہی طرز تھا لیکن اس طرز میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اکثر طلبہ اصل اور اضافہ میں تمیز نہیں کر سکتے تھے اور متن حدیث اور شیخ کے کلام میں ان کو اشتباہ ہوتا تھا' امام مالک کا طرز نہایت محفوظ تھا کہ اصل تو کاتب پڑھتا تھا اور اضافہ خود اپنی زبان مبارک سے ادا کرتے تھے' اس طرح ہر طالب علم کو اصل و اضافہ و ادراج میں فرق معلوم ہو جاتا تھا۔

مجلس درس کی شہرت:

ایک تو مدینہ خود اسلام کا گہوارہ اور نسلاً بعد نسلٍ دین کا مرکز تھا' دوسرے امام ہمام کا خاندان ابتدا سے علم کے ساتھ ایک خاص نسبت رکھتا تھا' ان اضافی اوصاف کے ساتھ خود ذاتی جوہر نے وہ پر و بال نکالے کہ پوری دنیائے اسلام مشرق سے مغرب تک امام کے آوازۂ شہرت سے معمور ہو گئی اور امام کی درس گاہ مزر و بوم کے اختلاف و بوقلمونی کا مظہر بن گئی' ایک طرف سیستان دوسری صدی کی مملکت اسلام کا مشرقی گوشہ اور دوسری طرف قرطبہ دنیائے اسلام کا مغربی گوشہ' دونوں کے ڈانڈے مدینۃ الرسول میں آ کر مل گئے' ممالک عرب' ممالک شام' ممالک عراق' ممالک عجم' ممالک ترکستان' ممالک مصر' ممالک افریقہ' ممالک اندلس و ایشیائے کوچک' الغرض ایشیا' افریقہ اور یورپ تینوں براعظموں سے طالبان علم کے قافلے مسلسل مدینہ کا رخ کرنے لگے' اس طرح پیغمبر عالم علیہ الصلاۃ والسلام کی یہ پیشینگوئی پوری ہوئی۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوشک ان یضرب الناس اکباد الابل فلایجدون احدا اعلم من عالم المدینۃ۔ (ترمذی ابواب العلم باب ماجاء فی عالم اھل المدینۃ)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب لوگ طلب علم کے لیے اونٹ بٹھائیں گے لیکن مدینہ کے عالم سے زیادہ بڑا عالم وہ کسی کو نہ پائیں گے۔

Marfat.com

تلامذہ و مستفیدین

محدث ذہبی لکھتے ہیں کہ "امام مالک سے اتنے لوگوں نے روایت کی ہے جن کا شمار تقریباً ناممکن ہے" (تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ا ص ۱۸۷ حیدر آباد دکن) ان کے تلامذہ میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو دوسرے علماء کی مجلس سے فضل و کمال کی سند حاصل کر چکے تھے، بلکہ خود امام کے شیوخ بھی امام کے احسان علمی کے بار سے سبکدوش نہ تھے۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۵ ۶ ذکر مالک بن انس) خود امام مالکؒ فرماتے تھے کہ "بہت کم ایسے لوگ ہیں جن سے میں نے سیکھا ہو اور آخر میں ان کو خود مجھ سے پوچھنے کی حاجت نہ پڑی ہو" (تزئین الممالک نقلا فضائل مالک لابن محمد الزہرانی ص ۷۰)

تلامذہ کی خصوصیات:

امام کو اپنے تلامذہ و مستفیدین کی حیثیت سے بھی متعدد خصوصیات حاصل ہیں، جس کثرت، جس رتبہ اور جتنے طبقات کے لوگ امام کے حلقۂ فیض میں داخلہ ہیں وہ محدثین و فقہاء میں سے کسی کو نصیب نہیں: ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۱﴾

۱۔ کثرت تعداد کے لحاظ سے امام مالک کے تلامذہ کی تعداد (۱۳۰۰) ہے فربری کی روایت کے مطابق امام بخاری کے شاگردوں کی تعداد ۹۰۰۰۰ ہے لیکن ان کا تیرہ سو منتخب روزگار تلامذہ سے کوئی مقابلہ نہیں ان میں سے چند (۴ یا ۵) کے سوا ہر ایک اس فن کا نکتہ داں اور بلند پایہ محدث ہے۔

۲۔ امام بخاریؒ کے نوے ہزار رواۃ میں سے ایک مخصوص تعداد کے سوا باقی کے حالات مجہول و مستور اور نام بنام غیر معلوم ہیں لیکن امام مالک کے تمام رواۃ و تلامذہ نام بنام معلوم و مشہور ہیں ابو بکر خطیب بغدادی، ابن بشکوال اندلسی، قاضی عیاض، شمس الدین دمشقی حافظ سیوطی نے ان کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے رسائل میں جمع کر دیے ہیں۔

۳۔ دوسرے عام محدثین کے تلامذہ کی دنیا جغرافیائی حیثیت سے اس قدر وسیع نہیں جس قدر امام مالک کی ہے، ابو حنیفہؒ کے تلامذہ تمام عجم و عرب میں پھیلے ہوئے تھے لیکن افریقہ و اندلس ان سے بے نیاز رہے امام اوزاعی کا علم اندلس میں پھیلا لیکن عجمی ممالک ان سے مستفید نہ ہوئے، لیکن امام مالک کے علم و معارف نے دنیائے اسلام کے کسی گوشہ کو بھی اپنی غلامی سے آزاد نہ چھوڑا۔

۴۔ لیکن محض تلامذہ کی کثرت اور جغرافیائی وسعت اس قدر مایہ فخر نہیں ہے، جس قدر ان کا علو رتبہ، رفعت کمال اور کثرت فضل ہے، امام مالک اپنے ہمسروں میں اس حیثیت سے جس قدر ممتاز ہیں اس کو محض عطیۂ الٰہی سمجھنا چاہیے جو صرف عالم مدینہ کے لیے مقدر تھا، ان کے حلقۂ تلامذہ و مستفیدین میں ان کے شیوخ بھی شامل ہیں اور دوسرے ایسے ائمہ کبار و ارباب فن بھی جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی اقلیم مستقل کا فرمانروا ہے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب شے یہ ہے کہ امام کا حلقۂ افادہ اتنے مختلف النوع طبقوں پر مشتمل ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ یہ مختلف سمتوں اور جہات کے خطوط کیونکر ایک ہی مرکز کی طرف رجوع ہوئے مثلاً خلفائے اسلام امرائے بلاد، تابعین ائمہ

Marfat.com

محدثین ائمہ مجتہدین فقہاء زہاد وصوفیائے کرام ادباء وشعراء مورخین مفسرین اور فلاسفہ سب آپ کے حلقہ مستفیدین میں داخل تھے۔

اس عہد کے بعد کے تمام محدثین کبار بلا استثناء بیک واسطہ یا بدو واسطہ امام مالک کے تلمذ سے مشرف ہیں۔ مسانید و صحاح کے مصنفین میں امام احمد بن حنبل امام بخاری امام مسلم امام ترمذی ابوداؤد ونسائی صرف ایک واسطہ سے امام کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہیں اور ان پر ان کو ناز وفخر ہے یہ فخر آٹھویں صدی تک باقی رہا چنانچہ محدث کبیر شمس الدین ذہبی فخریہ لکھتے ہیں کہ "میں سات واسطوں سے امام کا شاگرد ہوں۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۱۸۷) امام نووی کو بھی ساتویں صدی میں امام سے قرب نسبت پر ناز ہے مقدمہ شرح مسلم میں اپنے استاد کے حال میں لکھتے ہیں "ایک کتاب کی سند مجھ کو کتب بخاری مسلم ترمذی ابوداؤد نسائی سب سے بہتر ملی اور وہ امام مالک کی مؤطا ہے جو ان تمام محدثین کے شیخ تھے۔

(مقدمہ صحیح مسلم ص ۶ مصر)

فقہ وفتاویٰ

فقہ مالک

امام مالکؒ کے فقہ وفتاویٰ کی بنیاد فقہ مدینہ پر ہے شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے مصفی کے مقدمہ میں لکھا ہے:

"امام مالک بنائے فقہ برحدیث آنحضرتؐ نہادہ است کہ مسند باشد یا مرسل ثقاہ بعد ازاں قضایائے حضرت عمرؓ عمل او بعد ازاں برفتاوائے سائر صحابہ وفقہائے مدینہ کہ سعید بن مسیب وعیرہ ابن زبیر قاسم وسالم وسلیمان بن یسار وابوسلمہؓ وابوبکر بن عبدالرحمن وابوبکر بن عمرو وعمر بن عبدالعزیز۔ (مقدمہ مصفی ص ۱۱)

مؤطا کے طرز استدلال اور احادیث وآثار کا جس نے بغور مطالعہ کیا ہے وہ یقیناً اس کی تائید کرے گا کہ امام مالک کی فقہ وفتاویٰ کی یہی وہ بنیادی اصول ہیں جن پر امام مالک فقہی فتاویٰ کا جواب دیتے تھے۔

امام مالک کے فضل وکمال کا تمام شیوخ مدینہ کو اعتراف تھا اس کے باوجود انہوں نے اس قدر احتیاط کی کہ جب تک ستر بڑے علمائے عظام نے امام صاحب کی قابلیت واستحقاق کا فتویٰ نہ دیا انہوں نے اس مرتبہ عالی پر قدم رکھنے کی ہمت نہ کی آپ کا معمول تھا کہ جب کسی فتویٰ کا جواب ارشاد فرماتے تو پہلے ماشاء اللہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہتے۔

(تزئین الممالک عن ابن نعیم ص ۸ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۱)

حکومت کا اعلان

نہ صرف مدینہ وحجاز بلکہ تمام اطراف ملک سے سائلین کا ازدحام رہتا تھا موسم حج میں جب پوری دنیائے اسلام عرصہ عرفات میں جمع اور سارے علمائے دین کوفہ بصرہ خراسان وغیرہ سے سمٹ کر حرم مکہ میں جمع ہو جاتے تھے تو حکومت کی طرف سے اعلان ہوتا تھا کہ امام مالک اور ابن ابی ذئب کے سوا اور کوئی فتویٰ نہ دے۔" (ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰)

Marfat.com

حکومت کے مقابلہ میں آزادیٔ فتویٰ طلاقِ مکرہ:

حکومت کی اس تعظیم و تکریم کا اثر شاید دوسروں پر یہ ہوتا کہ وہ کم از کم مختلف فیہ مسائل میں اپنی رائے کے خلاف حکومت کے منشاء کی تعلیم کرتے لیکن امام صاحب اپنی حریت رائے اور اعلانِ حق میں اس کی پروا نہیں کرتے تھے' اگر کسی کو زبردستی اپنی بیوی کو طلاق دینے پر مجبور کیا جائے اور وہ ڈر کر محض جبر سے طلاق دیدے تو امام ابوحنیفہ اور بعض دیگر ائمہ کے نزدیک طلاق واقع ہو جائے گی لیکن امام مالک اور اکثر اصحابِ حدیث اس کے قائل ہیں کہ طلاق واقع نہ ہوگی' والی مدینہ جعفر بن سلیمان عباسی نے جو خلیفہ منصور کا چچا زاد بھائی بھی تھا امام کو حکم دیا کہ وہ یہ فتویٰ نہ دیں لیکن امام صاحب نے علی الاعلان اپنی رائے کا اظہار کیا اور آخر اس کے لئے کوڑوں کی سزا تک گوارا کی۔

لاادری:

اس سے بھی زیادہ شدید موقع اعلان کا اپنے نفس کے مقابلہ میں ہوتا ہے' مفتی کے لئے جس قدر پہلی قسم کی حریت کی حاجت ہے اس سے زیادہ دوسری قسم کی حریت کی ضرورت ہے لیکن امام صاحب جس طرح پہلی منزل میں مستقیم تھے' دوسری منزل میں بھی درماندہ نہ تھے' امام صاحب سے جب کوئی فتویٰ پوچھا جاتا اور اس وقت اس جزئیہ پر اطلاع نہ ہوتی تو نہایت کشادہ پیشانی کے ساتھ فرماتے تھے کہ لاادری میں نہیں جانتا' امام کے شاگرد ابن وہب کہتے ہیں کہ اگر میں امام مالک کی لاادری لکھا کرتا تو کتنی تختیاں بھر جاتیں۔ (تزئین الممالک ص ۱۴ عن ابی نعیم)

ممالک بعیدہ کے استفتاء سے احتراز:

چنانچہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ دور کے شہروں سے جو مستفتی آتے تھے امام صاحب ان کو بھی ایسا ہی جواب دیتے تھے' ابن عبدالبر کی روایت ہے کہ ایک شخص نہایت دور دراز مسافت سے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے ایک مسئلہ پوچھا' امام صاحب نے فرمایا کہ ''میں اس کو اچھی طرح نہیں جانتا'' سائل نے کہا کہ ''میں چھ مہینے کی راہ طے کر کے صرف اس مسئلہ کی خاطر حاضر ہوا ہوں جن لوگوں نے مجھ کو بھیجا ہے میں ان کو جا کر کیا جواب دوں گا۔' امام صاحب نے فرمایا کہ کہہ دینا کہ ''مالک نے کہا کہ میں نہیں جواب دے سکتا''۔ (جامع بیان العلم ابن عبدالبر ص ۱۲۵ مصر)

امام صاحب کی یہ احتیاط درحقیقت شدتِ تقویٰ اور ایک نہایت دقیق نکتہ پر مبنی تھی' مفتی کی حالت یہ ہے کہ آج وہ ایک مسئلہ کی نسبت ایک رائے رکھتا ہے' دوسرے دن اس سے صحیح تر صورت اس کے خیال میں آتی ہے' ایسے موقع پر شہر اور اس کے قرب و جوار میں مستفتی کو اپنی غلطی کی اطلاع دے سکتا ہے لیکن اس زمانہ میں جب وسائل سفر آسان نہ تھے' دور کے مقامات میں تصحیح و تغلیط کی اطلاع مشکل تھی' امام صاحب کے ایک مصری دوست نے حیرت سے امام صاحب سے پوچھا آپ ان بیماروں کو جو کوسوں دور سے مصائب سفر و مصارف برداشت کر کے آتے ہیں کیوں واپس کر دیتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا یہ صحیح ہے کہ مصری مصر سے' شامی شام سے' عراقی عراق سے آتے ہیں اور پوچھتے ہیں' مگر میں نے جو جواب آج دیا ہے اس کے بجائے اگر کل مجھ کو اور جواب معلوم ہوا اس وقت کیا ہوگا'' حضرت لیث مصری نے جب امام کا یہ قول سنا تو رو پڑے کہ مالک لیث سے قوی تر ہیں اور لیث ان سے کمزور تر۔ (تزئین الممالک عن ابی نعیم ص ۱۴)

Marfat.com

رائے پوچھنے پر زجر:

فتووں کے جواب میں اکثر فرماتے تھے کہ: قال رسول اللہ کذا سائل نے کہا آپ کی رائے کیا ہے؟ آپ نے جواب میں یہ آیت پڑھی: فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۶۳﴾ (تزئین الممالک عن ابی نعیم ص ۱۴) جب کسی مسئلہ قیاسی کو بیان فرماتے تو پہلے یہ آیت پڑھتے: إِنْ نَظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِينَ ﴿۳۲﴾

جواب میں کاوش فکر:

مسائل وفتاویٰ کا جواب ہمیشہ نہایت دقت نظر اور کاوش فکر سے دیتے تھے ابن ابی اویس کہتے ہیں کہ ایک بار امام صاحب نے فرمایا کہ کبھی کبھی ایسا مسئلہ پیش آجاتا ہے کہ خواب وخور حرام ہو جاتا ہے ابن ابی اویس نے کہا آپ کی بات تو لوگوں کو نقش فی الحجر کی طرح تسلیم ہوتی ہے پھر آپ کیوں یہ مشقت برداشت کرتے ہیں امام کس نکتہ سنجی کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ "ابن ابی اویس! اس حال میں تو مجھ کو اور بھی کاوش کرنی چاہیے۔" (مناقب مالک للزواوی ص ۳۹ عن سعید بن مسیب)

انصاف پسندی:

اگر کسی مسئلہ میں غلطی ہو جاتی اور کوئی شخص اس کی اصلاح کرتا تو فوراً تسلیم کر لیتے تھے ایک شخص نے پوچھا کیا وضو میں پاؤں کی انگلیوں میں تخلیل کرنی چاہیے؟ امام نے فرمایا: لیس ذالک علی الناس ابن وہب امام کے شاگرد بیٹھے تھے مجلس کے بعد انہوں نے کہا کہ تخلیل کی ایک حدیث میرے پاس ہے امام نے حدیث سن کر فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے اور اس کے بعد پھر ہمیشہ فتویٰ اس کے موافق دیا۔ (الزواوی ص ۲۷)

امام مالک تقریباً ساٹھ برس مستقل فقہ وفتاویٰ میں مصروف رہے امام کے تلامذہ نے ان کے مسائل فقہیہ کو مدون بھی کیا ہے سب سے پہلی کتاب اسد بن فرات قاضی افریقہ کی "اسدیہ" ہے اور سب سے ضخیم ابن قاسم (متوفی ۱۹۱ھ) کی المدونہ ہے جو خود امام کی زندگی میں مدون ہو رہی تھی مدونہ مصر میں چھپ گئی ہے تیسری کتاب ابن وہب مصری متوفی (۱۹۷ھ) کی کتاب المجالسات عن مالک ہے ان کتابوں میں امام کے ہزاروں مسائل وفتاویٰ مدون ہیں ابن قاسم مصنف مدونہ کے متعلق مشہور ہے کہ ان کو امام کے چالیس ہزار مسائل زبانی یاد تھے۔

اہل علم کا اعتراف

امام مالک ارباب رائے میں داخل ہیں محدثین نے ارباب رائے کا کم اعتراف کیا ہے لیکن اس کے باوجود امام صاحب محدثین میں وہی درجہ رکھتے ہیں جو صاحب فن اپنے اتباع اور مقلدین میں رکھتا ہے یحییٰ بن معین جو حدیث ورجال کے ناقد ہیں کہتے ہیں "مالک اقلیم حدیث کے بادشاہ ہیں" محدث کبیر سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ "ہم لوگ مالک کے سامنے کیا چیز ہیں؟ ہم تو ان کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہیں اگر امام مالک نے کسی شخص سے روایت کی ہے تو اس سے کرتے

Marfat.com

ہیں ورنہ چھوڑ دیتے ہیں'' عبدالرحمٰن مہدی کا قول ہے' کہ ''روئے زمین پر مالک سے بڑھ کر حدیث کا کوئی امانت دار نہیں''۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے' علماء میں امام مالک ستارہ ہیں'' محدث ابن نہیک کا قول ہے کہ ''صحت حدیث میں مالک پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔'' امام ابن حنبل سے ایک شخص نے پوچھا کہ ''اگر کسی کی حدیث وہ زبانی یاد کرنی چاہے تو کس کی کرے؟'' جواب دیا کہ ''مالک بن انس کی۔'' ابن مہدی سے جو نہایت مشہور محدث ہیں'' ایک شخص نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ مالک ابوحنیفہ سے زیادہ فقیہ ہیں'' انہوں نے فرمایا ''میں نے یہ تو نہیں کہا' لیکن یہ کہتا ہوں کہ مالک ابو حنیفہ کے استاد (حماد) سے بھی زیادہ فقیہ ہیں۔''

سفیان بن عیینہ با ایں ہمہ علم و فضل' حلال و حرام اور حدیث معمول کا املاء اور امام مالک کے حلقہ میں بیٹھ کر سنتے اور وہاں سے اٹھ کر اپنے مستفیدین کے حلقہ میں بیٹھتے تھے سفیان ثوری جو مجتہد مستقل ہیں وہ مناسک حج میں امام کی پیروی کرتے تھے' ابن معین جو نقد حدیث میں امام ہیں' فرماتے ہیں'' مالک خدا کی طرف سے خلق پر ایک حجت تھے۔'' ابن معین کا دوسرا قول ہے کہ ''اصحاب زہری میں مالک سے بڑھ کر کوئی اثبت نہیں'' یحییٰ بن سعید القطان جو امام حدیث ہیں فرماتے ہیں کہ ''مالک اس امت کے لئے رحمت تھے'' ابن ابی حازم نے ناقد حدیث دراوردی سے پوچھا کہ ''اس خدائے کعبہ کی قسم! مالک سے بڑا کوئی عالم تم نے دیکھا؟'' جواب دیا کہ ''خدایا نہیں۔''

عام حالات

اب ہم مجلس درس واستفادہ سے اٹھ کر دربار شاہی میں آتے ہیں' امام صاحب ۹۳ھ میں پیدا ہوئے تھے جبکہ ولید سریر آرائے خلافت تھا لیکن پچیس برس کے بعد ۱۱۷ھ میں جب امام تعلیم سے فارغ ہو کر شہرت عام حاصل کر رہے تھے تو خلافت امویہ کا دم واپسیں تھا (۱۳۲ھ) میں خلافت عباسیہ کے نام سے تاریخ کا نیا باب شروع ہوا۔

خلافت عباسیہ کا پہلا تاجدار ابوالعباس سفاح تھا' اس کے بعد اس کا بھائی ابوجعفر منصور خلیفہ ہوا' اس انقلاب سے پہلے وہ مدینہ کی درسگاہ کا ایک طالب علم اور امام مالک کے طبقہ کا ایک شریک صحبت تھا۔

خلافت کے بعد منصور نے (۱۴۰ھ میں) پہلا حج کیا اور مکہ معظمہ کے بعد مدینہ منورہ آیا' شہر کے شرفا اور علما اس کے استقبال کے لئے نکلے' سفیان ثوری' سلیمان خواص اور امام مالک بھی اس لئے اس سے ملنے کے لئے آئے کہ کل تک وہ علم حدیث کی مجلسوں میں ان کے ساتھ برابر کا شریک تھا' دیکھیں اب وہ کس حال میں ہے؟ دربار میں حجاز کے تمام علما اور فقہا موجود تھے' منصور نے امام صاحب کی طرف خطاب کر کے کہا'' اے ابوعبداللہ! میں اختلافات سے گھبرا گیا ہوں عراق میں تو کچھ نہیں ہے' شام میں صرف جہاد کا شوق ہے' کوئی بڑا علم نہیں' جو کچھ ہے وہ حجاز میں ہے اور حجاز کے علما کے سرخیل آپ ہیں' میں چاہتا ہوں کہ آپ کی اس تصنیف موطا کو خانہ کعبہ میں آویزاں کر دوں کہ لوگ اسی کی طرف رجوع کریں اور تمام اطراف ملک میں اس کی نقلیں بھیجوں تاکہ اسی کے مطابق لوگ فتویٰ دیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اس نے ایک ایسی کتاب کی تالیف کی خواہش ظاہر کی جو ابن عباس'' ابن مسعودؓ اور ابن عمرؓ کے اصول فقہ کے بین بین اور معتدل ہو' اس کے بعد امام صاحب نے موطا تالیف کی۔

Marfat.com

جادہ پسند علماء کے لئے یہ طلائی موقع تھا لیکن امام صاحب کے قدم کو اس موقع پر لغزش نہ ہوئی انہوں نے فرمایا کہ ''صحابہ تمام اطرافِ ملک میں پھیل گئے تھے ان کے فتاویٰ اور احکام اپنے اپنے مقام میں وارثتاً ان کے فقہا و علما تک پہنچے ہیں اور ہر جگہ وہی مقبول ہیں ایسی حالت میں ایک شخص کی رائے و عقل پر جو راستی و غلطی دونوں کر سکتا ہے تمام ملک کو مجبور کرنا مناسب نہیں'' منصور نے کہا ''اگر آپ مجھ سے متفق ہوتے تو میں یہی کرتا'' (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۹ کتاب الامامۃ ابن قتیبہ ج ۲ ص ۱۷۲ مناقب مالک للزواوی ص ۲۴) ایک بار اس نے پوچھا کہ ''اے عبداللہ! تم سے بھی زیادہ کوئی عالم ہے؟ امام نے فرمایا: ''ہاں'' پوچھا: ''وہ کون ہے؟'' فرمایا: ''ان کا نام یاد نہیں'' منصور نے کہا ''میں بنو امیہ کے زمانہ میں طلب علم کر چکا ہوں سب کو جانتا ہوں'' (مناقب زواوی ص ۲۴)

امام مالک کے فضل و کمال کا اعتراف منصور نے نہ صرف امام کے سامنے کیا بلکہ پیٹھ پیچھے بھی کرتا تھا ایک بار ان کی عدم موجودگی میں فرمایا کہ ''سفیان ثوری اور امام مالک ابن انس کے سوا کوئی نہیں جس کا ادب کیا جائے۔''

نئے تاج دار امویوں کے استیصال اور بیخ کنی میں لگے ہوئے تھے اور منصور نے احتیاطاً یا سوء ظن کی بناء پر فاطمی و علوی سادات کی بیخ کنی شروع کر دی آخر تنگ آ کر ان ہی سادات میں سے ۱۴۵ھ میں محمد نفس زکیہ نے مدینہ میں علم بغاوت بلند کر دیا اکثر لوگوں نے ان کا ساتھ دیا لیکن تقدیر ساتھ نہ تھی بڑی بہادری سے میدانِ جنگ میں لڑے مگر مارے گئے ان کے بعد ان کے بھائی ابراہیم اس ساز و سامان سے نکلے کہ منصور بدحواس ہو گیا چند مہینوں کے بعد ابراہیم کی شہادت پر جنگ کا خاتمہ ہو گیا منصور نے اپنے عم زاد بھائی جعفر کو مدینہ کا والی مقرر کیا۔

امام مالک منصور کی نوازشوں کے باوجود ان تمام کوششوں میں حق کے ساتھ تھے امام صاحب نے فتویٰ دیا کہ ''خلافت نفس زکیہ کا حق ہے'' لوگوں نے پوچھا کہ ''ہم منصور کی بیعت پر حلف اٹھا چکے ہیں'' امام صاحب نے فرمایا ''منصور نے جبراً بیعت لی ہے (ان واقعات کے لیے دیکھو کتاب الامامۃ ج ۲ ص ۲۸۲ ابن خلدون ج ۳ ص ۱۹۰) اور جو کام جبراً کرایا جائے شرع میں اس کا اعتبار نہیں حدیث میں ہے کہ اگر جبراً طلاق کسی سے دلائی جائے تو واقع نہ ہوگی۔''

طلاق مکرہ کا فتویٰ:

جعفر نے مدینہ پہنچ کر نئے سرے سے لوگوں سے بیعت لی امام مالک کو کہلا بھیجا کہ آئندہ طلاق جبری کے عدم اعتبار کا فتویٰ نہ دیں کہ لوگوں کو بیعت جبری کی بے اعتباری و عدم صحت کے لئے سند ہاتھ آئے لیکن امام صاحب نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور بدستور جبری معاملہ کے عدم صحت کا فتویٰ دیتے رہے جعفر نے غضبناک ہو کر حکم دیا کہ ان کو ستر کوڑے مارے جائیں چنانچہ امام دار الہجرۃ مجرم کی طرح لائے گئے کپڑے اتارے گئے اور شانہ امامت پر دستِ ظلم نے ستر کوڑے پورے کیے تمام پیٹھ لہولہان ہو گئی دونوں ہاتھ مونڈھے سے اتر گئے اس پر بھی جعفر کی تسلی نہ ہوئی تو حکم دیا کہ اونٹ پر بٹھا کر شہر میں ان کی تشہیر کی جائے امام صاحب اس حال زار بازاروں اور گلیوں سے گزر رہے تھے اور زبان صداقت نشان باواز بلند کہہ رہی تھی ''جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے جو نہیں جانتا ہے وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاق جبری درست نہیں'' (طبقات ابن سعد ترجمہ مالک مناقب للزواوی)

اس واقعہ کے بعد اسی طرح خون آلود کپڑوں میں مسجد نبوی میں تشریف لائے پشت مبارک سے خون صاف کیا اور دو رکعت

Marfat.com

نماز پڑھ کر لوگوں سے فرمایا کہ ''سعید بن مسیب کو جب کوڑے مارے گئے تھے تو انہوں نے بھی مسجد میں آ کر نماز پڑھی تھی'' (تزئین نقلاً عن الخطیب روایۃً عن ابی وہب ص ۱۳) یہ تعزیر گو تحقیر کے لئے تھی لیکن اس نے امام کی عزت و وقار کے پایہ کو اور بلند کر دیا' یہ واقعہ (۱۴۷ھ) کا ہے۔ (کتاب الانساب سمعانی ترجمہ اصبحی)

منصور کی لاعلمی اور ندامت:

جعفر والیٔ مدینہ کی یہ حرکت منصور کو پسند نہ آئی اور فوراً اس کو معزول کر کے بذلت تمام گدھے پر سوار کر کے بغداد طلب کیا اور امام مالکؒ کو معذرت کا خط لکھا۔

دوسرے سال ۱۵۸ھ میں جب کہ تمام حجاز و عراق میں سکون ہو چکا تو حج کے ارادہ سے منصور حجاز آیا امام مالک ملنے کو آئے اور بعض روایتوں میں ہے کہ حج سے پہلے خود امام کو بغداد بلا بھیجا اور نہایت تعظیم سے ملا اور بوثوق کہا کہ ''نہ میں نے تعزیر کی اجازت دی اور نہ مجھے اس کا علم ہوا' امام صاحب نے فرمایا کہ ''ہاں آپ کو اطلاع نہ ہوگی'' منصور نے خلعت پیش کیا' قاعدہ تھا کہ خلعت کے کپڑے درباری کے کندھے پر رکھ دیئے جاتے تھے' حاجب نے یہی عام طریقہ امام صاحب کے ساتھ برتنا چاہا' امام صاحب پیچھے ہٹ گئے' منصور نے حاجب کو ڈانٹا کہ اس خلعت کو آپ کے فرودگاہ میں پہنچا دو''۔

منصور کو ایک بار معلوم ہوا کہ علما میری حکومت سے ناراض ہیں تو اس نے خلاف وقت شب کو ابن ابی ذئب و ابن سمعان اور امام مالک کو طلب کیا' امام صاحب واقعہ سمجھ گئے' زندگی سے ناامید ہو کر' غسل فرما کر' کفن کے کپڑے پہن کر اور حنوط مل کر دربار میں آئے' منصور نے کہا اے گروہ فقہا! مجھ کو ایک خبر معلوم ہوئی ہے جس کا افسوس ہے' تمہارا فرض تھا کہ پہلے تو تم لوگ میری اطاعت کرتے اور مجھ کو برا کہنے سے باز رہتے' پھر اگر مجھ میں کچھ عیب تھا تو مجھ کو نصیحت کرتے' امام صاحب نے فرمایا کہ امیر المؤمنین خدا کا ارشاد ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝ (حجرات: ۶)

''مسلمانو! اگر کوئی فاسق تم کو کچھ خبر دے تو اس کی تحقیق کر لو' ایسا نہ ہو کہ نادانستگی میں بے گناہوں کو ستاؤ' پھر اپنے کئے پر تم کو ندامت ہو''

منصور نے کہا' اچھا بتاؤ کہ میں تمہارے نزدیک کیسا ہوں؟ امام نے فرمایا مجھے اس کے جواب دینے سے معاف رکھو' منصور نے ابن سمعان کی طرف رخ کیا' وہ بولے ''امیر المؤمنین آپ سب سے بہتر ہیں' حج کرتے ہیں' جہاد کرتے ہیں' مظلوموں کی امداد کرتے ہیں' اسلام کے پشت پناہ ہیں' عادل ہیں' اب منصور نے ابن ابی ذئب سے پوچھا کہ تم مجھ کو کیسا سمجھتے ہو' ابن ابی ذئب نے نہایت دلیری سے کہا کہ ''تم بدترین مخلوق ہو' مسلمانوں کی تمام دولت اپنی شان و شوکت میں صرف کرتے ہو' غریبوں کو ہلاک اور امیروں کو پریشان کر ڈالا' بتاؤ کل تم خدا کے سامنے کیا جواب دو گے؟ منصور نے کہا' ''تم دیکھتے ہو کہ تمہارے سامنے یہ کیا چیز ہے'' ابن ابی ذئب نے کہا ''ہاں ننگی تلواریں دیکھتا ہوں لیکن آج کی موت کل کی موت سے بہتر ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ابن سمعان اور ابن ابی ذئب چلے گئے لیکن امام تشریف فرما رہے' منصور نے کہا ''مجھے آپ کے

Marfat.com

کپڑوں سے حنوط کی بو آتی ہے‘‘ امام صاحب نے فرمایا اس بے وقت کی طلبی سے میں اپنی زندگی سے مایوس ہو کر آیا تھا‘ منصور نے کہا ’’سبحان اللہ ابو عبداللہ کیا میں خود اپنے ہاتھ سے اسلام کا ستون گراؤں گا‘‘ (کتاب الامامۃ والسیاسۃ ج ۲ ص ۲۷۶ مصر)

۱۵۸ھ میں منصور نے انتقال کیا اور محمد المہدی اس کا جانشین ہوا اور ۱۶۰ھ میں حج کے ارادہ سے عازم مکہ ہوا‘ حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ آیا‘ شہر کے قریب پہنچا تو شرفاء و علمائے شہر نے استقبال کیا جن میں امام مالک بھی تھے‘ مہدی نے امام کو سلام کر کے سینہ سے لگا لیا‘ اس سال حجاز میں سخت قحط تھا‘ موقع پا کر امام نے فرمایا ’’امیر المؤمنین اس وقت آپ جس شہر میں جا رہے ہیں وہاں مہاجرین و انصار کی اولاد آباد ہے‘ وہ روضۂ نبویؐ کے ہمسایہ ہیں‘‘ مہدی امام کا مقصد سمجھ گیا اور ۲۵ لاکھ درہم امام کے پاس بھیج دیئے کہ تقسیم کرا دیجئے‘ امام نے رقم اپنے معتمد تلامذہ کے حوالہ کی کہ حسب حاجت لوگوں میں تقسیم کر دیں۔

(کتاب الامامۃ والسیاسۃ ج ۲ ص ۲۹۰ و مناقب مالک للزواوی ص ۲۷)

ایک مرتبہ تین ہزار دینار اپنے صاحب اعظم ربیع کے ہاتھ امام کی خدمت میں بھیجے اور خواہش ظاہر کی کہ آپ بغداد میرے ساتھ چلیں‘ امام صاحب نے قاصد سے کہا تھیلیاں اب تک سربستہ اسی طرح پڑی ہیں‘ جی چاہے لے جاؤ لیکن مالک مدینہ نہیں چھوڑ سکتا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: المدینۃ خیر لھم لو کانوا یعلمون۔ (زواوی عن ابی مصعب ص ۲۸)

ایک مرتبہ مہدی نے سواری بھیجی کہ اس پر سوار ہو کر بارگاہ خلافت میں آئیں‘ امام نے سواری واپس کر دی کہ میں مدینہ میں سوار ہو کر نہیں نکلتا کیونکہ ان گلیوں میں رسول اللہ ﷺ چلتے پھرتے تھے‘ پیادہ آئے بیمار تھے اس لئے بعض مشاہیر علمائے مدینہ سے ٹیک لگا کر بیٹھے‘ مہدی نے کہا سبحان اللہ‘ اگر میں خود یہ خدمت ان سے لینا چاہتا تو شاید ان میں سے کوئی قبول نہ کرتا‘ مغیرہ نے کہا ’’امیر المؤمنین! مالک جس سے ٹیک لگا کر بیٹھیں وہ اس کے لئے شرف ہے۔‘‘

مہدی نے اسی سفر میں مؤطا کی سماعت کی بلکہ بعض روایتوں میں ہے کہ مہدی ہی کے لئے امام نے مؤطا لکھی گو یہ صحیح نہیں‘ مہدی نے موسیٰ و ہارون اپنے دونوں بیٹوں کو حکم دیا کہ امام سے مؤطا سنیں‘ شہزادوں نے امام کو بلا بھیجا‘ امام صاحب نے فرمایا ’’علم بیش قیمت شے ہے اس کے پاس خود شائقین آتے ہیں‘‘ اس جواب پر مہدی کی اجازت سے دونوں شہزادے خود مجلس درس میں حاضر ہوئے‘ شہزادوں کے اتالیق نے کہا پڑھ کر سنایئے‘ امام صاحب نے فرمایا کہ ہمارے علماء کا دستور یہ ہے کہ طلبہ پڑھیں‘ شیوخ سنیں‘ مہدی کو اس کی اطلاع دی گئی تو اس نے کہا ان علما کی اقتدا کرو اور تم خود پڑھو چنانچہ شہزادوں نے خود پڑھا اور امام نے سماعت کی۔ (تزئین الممالک ص ۴۵)

۱۷۰ھ میں ہارون رشید خلیفہ ہوا‘ خلافت کے پہلے ہی سال حج و زیارت کے لیے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ حاضر ہوا‘ لوگ پیادہ استقبال و تہنیت کے لئے نکلے‘ امام صاحب بھی محمل میں سوار ہو کر آئے‘ ہارون رشید نے ان کو دیکھ کر بڑی مسرت ظاہر کی اور کہا آپ کی تصنیفات پہنچیں‘ میں نے خاندان کے نوجوانوں کو ان کے مطالعہ کی تاکید کی ہے لیکن اس کا کیا سبب ہے کہ میں نے ان میں ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ کی روایتیں نہیں پائیں‘‘ امام نے فرمایا امیر المؤمنین! یہ دونوں بزرگوار ہمارے شہر میں نہ تھے۔

۱۷۴ھ میں ہارون رشید اپنے دونوں شہزادوں امین و مامون کو لے کر حج کے لئے آیا اور مؤطا کے املا کے لیے امام کو سرا پردۂ خلافت میں طلب کیا‘ امام صاحب نے انکار کیا اور خود مؤطا کے بغیر تشریف لائے‘ ہارون رشید نے شکایت کی‘ امام صاحب نے فرمایا‘ علم تیرے گھر سے نکلا ہے خواہ اس کو ذلیل کر خواہ عزت دے‘ یہ سن کر ہارون رشید متاثر ہوا اور امین اور

Marfat.com

مامون کو لے کر مجلس درس میں حاضر ہوا' وہاں طلبہ کا ہجوم تھا' ہارون رشید نے امام سے کہا اس بھیڑ کو الگ کر دیجئے'' امام نے فرمایا شخصی فائدہ کے لئے عام افادہ کا خون نہیں کیا جا سکتا'' ہارون رشید مسند پر بیٹھ گیا' امام نے فرمایا امیر المومنین ''تواضع پسندیدہ ہے'' یہ سن کر ہارون نیچے اتر گیا' اور امام سے درخواست کی آپ قراءت کیجئے امام نے فرمایا خلاف عادت ہے'' اور معن بن عیسیٰ کو جو ایک مستعد طالب علم تھے اور آگے چل کر بڑے بڑے محدثین کے استاد ہوئے اشارہ کیا' انہوں نے قراءت شروع کی' اور ہارون نے مع شہزادوں کے سماعت کی۔

اس سفر میں شام و عراق و حجاز کے کل علما ساتھ تھے' قاضی ابو یوسف بھی اس مجمع میں شریک تھے' ہارون رشید نے ان سب علما کی ایک علمی مجلس منعقد کی' امام صاحب مسند تدریس پر رونق افروز ہوئے مؤطا کا املا شروع ہوا' ہر مسئلہ کے اختتام پر فقہا و محدثین سکوت کی زبان سے صحت کا اعتراف کرتے جاتے تھے' فقہی معلومات کا ایک دریا تھا' جو زبان امامت سے اُمنڈ اُمنڈ کر سواحل قلوب تک پہنچ رہا تھا۔

ہارون رشید کے نام امام مالک کا ایک رسالہ بھی ہے جس میں امام نے ہارون کو نصائح کیے ہیں اور آداب و سنن کی تعلیم دی ہے' یہ رسالہ مصر میں ۱۳۲۲ھ میں چھپ گیا ہے اور لاہور میں اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

وفات

آخر عمر میں اتنے ضعیف و ناتواں ہو گئے تھے کہ مسجد نبوی کی حاضری' جماعت میں شرکت اور غم و شادی کی تقریبوں میں آنا جانا بند ہو گیا تھا' لوگ اعتراض کرتے تو فرماتے کہ ''ہر شخص اپنا ہر عذر نہیں بیان کر سکتا'' معن بن عیسیٰ م ۱۹۸ھ امام کے عزیز ترین شاگرد تھے امام کے خادم تھے امام صاحب انہی کے سہارے چلتے تھے لیکن اس ضعف و ناتوانی کے عالم میں بھی درس و افتا کی خدمت جاری تھی' یحییٰ بن یحییٰ اندلسی مصمودی امام اندلس جب دوسری بار مصر سے لوٹ کر مدونہ کی سند لینے کے لئے آئے تو امام صاحب بستر مرض الموت پر تھے۔

اتوار کے روز بیمار پڑے اور تقریباً تین ہفتہ بیمار رہے' مرض کی شدت میں کوئی تخفیف نہ ہوئی لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب وقت آخر ہے' مدینہ کے تمام علماء و امرا آخری دیدار کے لئے جمع ہو گئے یحییٰ اندلسی کا بیان ہے کہ مجھے تو اپنی محرومی کا رونا تھا ہی' وہ لوگ بھی جو مدتوں امام کی ملازمت کا شرف حاصل کر چکے تھے وہ بھی رو تے تھے' تلامذہ کے علاوہ حدیث و فقہ کے ایک سو ساٹھ علماء مؤدب با چشم گریاں آس پاس بیٹھے تھے۔

نبض کی حرکت آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی آنکھوں سے آنسو جاری تھے' قعنبی جو امام کے اخص تلامذہ میں تھے وہ اس وقت حاضر ہوئے اور گریہ کا سبب دریافت کیا' فرمایا کہ قعنبی! میں نہ روؤں تو کون روئے' اے کاش! مجھ کو میرے ہر قیاسی فتویٰ کے بدلہ ایک کوڑا مارا جاتا اور میں فتویٰ نہ دیتا'' گریہ جاری تھا اور لب متحرک تھے کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

امام صاحب بروایت صحیحہ ۹۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱ ربیع الاول ۱۷۹ھ کو انتقال فرمایا' ۸۶ برس کی عمر پائی' ۱۱۷ھ میں مسند درس پر قدم رکھا اور ۶۲ برس تک علم و دین کی خدمت میں مصروف رہے۔

جنازے میں ایک خلقت کا ہجوم تھا' والی مدینہ عبد اللہ بن محمد ہاشمی خود پیادہ شریک تھا اور نعش اٹھانے والوں میں

Marfat.com

داخل تھا' جنت البقیع جس کی خاک میں اسلام کے ارکان عظام واعلام کرام مدفون ہیں امام مدینہ کا جسد مبارک بھی اسی خاک کو سپرد ہوا۔ (ان بیانات کے لیے ملاحظہ ہو ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۱ تزئین الممالک ص ۴۱)

دور دراز شہروں اور ملکوں کے علما کو جب امام کی وفات کی خبر پہنچی تو ہر جگہ ماتم کیا گیا' کوفہ میں سفیان بن عیینہ کو جب معلوم ہوا تو ان پر سکوت طاری ہو گیا اور جب بولے تو یہ بولے کہ "روئے زمین پر مالک نے اپنی مثال نہیں چھوڑی" حماد بن زید نے کہا "خدا ان پر رحم کرے' مذہب میں ان کا بڑا مقام تھا۔"

امام کی تاریخ پیدائش ووفات پر ایک بزرگ نے یہ قطعہ کہا ہے:

فخر الأئمة مالك نعم الامام لسالك

مالک اماموں کے فخر ہیں۔ پیرو کے لئے بہترین پیشوا ہیں۔

مولده "نجم هدى" وفاته فاز مالك

(بستان المحدثین ص ۳)

ان کی تاریخ پیدائش ہدایت کا ستارہ ہے اور ان کی تاریخ وفات یہ ہے کہ مالک کامیاب ہے۔

اخلاق وعادات اور ذاتی حالات

طاعت الٰہی:

امام کا شمار عباد زمانہ میں تھا' (کتاب الفہرست ابن ندیم ذکر عباد ص ۲۶۰) درس وافتاء سے جو وقت بچتا وہ زیادہ تر عبادت اور تلاوت میں صرف ہوتا' امام کی خواہر محترمہ سے کسی نے پوچھا کہ امام مالک گھر میں کیا کرتے تھے؟ جواب دیا ان کے دو کام تھے "المصحف والتلاوۃ" (مناقب مالک للزواوی ص ۳۳) امام صاحب کی صاحبزادی سے منقول ہے کہ امام جمعہ کی شب عبادت و طاعت میں مشغول رہتے تھے' امام صاحب کے بھانجے ابن ابی یونس سے روایت ہے کہ امام مہینہ کی پہلی تاریخ کو شب زندہ دار رہتے تھے۔ (تزئین الممالک ص ۱۸)

حب رسول:

حضرت سرور کائنات ﷺ کا بے حد ادب کرتے تھے' جب نام مبارک زبان پر آتا چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا' لوگ پوچھتے تو فرماتے کہ ہم نے جن مقدس بزرگوں کی زیارت کی ہے انکی حالت مجھ سے بھی بڑھ کر تھی۔ (مناقب مالک للزواوی ص ۳۳) مسجد نبوی میں جس کے ایک حجرہ میں روضہ انور ہے شور وغل ناپسند فرماتے کہ یہ آستانہ نبوت سے گستاخی ہے' کلام نبوی اس وقت تک زبان پر نہ آتا جب تک وضو یا غسل فرما کر باادب بیٹھ نہ لیتے' امام کے اصطبل میں کثرت سے گھوڑے اور خچر تھے مگر کبھی مدینہ کی گلیوں میں سوار ہو کر نہ نکلے' لوگوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ "مجھے شرم آتی ہے کہ جو سرزمین قدوم نبوی سے مشرف ہوئی ہے اس کو میں جانوروں کے سموں سے روندوں (ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰ وبستان المحدثین ص ۷) ذات نبوی کی محبت اور حدیث نبوی کے شغل وانہماک کے سبب سے کوئی شب ایسی کم گزرتی جس میں عالم رویا میں زیارت نبوی کا شرف

Marfat.com

حاصل نہ ہوتا۔ (تزئین عن ابی نعیم والخطیب ص ۱۲)

حبّ مدینہ:

امام کو مدینہ سے غایت درجہ محبت تھی، بجز سفر حج کبھی مدینہ سے باہر نہیں نکلے، منصور نے بغداد کی سکونت کے لئے درخواست کی پذیرائی نہ ہوئی، مہدی نے تین ہزار دینار بھیجے اور کہلا بھیجا کہ بغداد کا عزم کیجئے، فرمایا "اشرفیاں علی حالہا رکھی ہیں، جی چاہے تو لے جاؤ مگر مالک سے مدینہ نہیں چھوٹ سکتا۔ (تذکرہ ذہبی ج ۱ ص ۱۹۰) انتہائے محبت یہ ہے کہ جمہور اسلام کے خلاف امام مکہ معظمہ پر مدینہ منورہ کو فضیلت دیتے ہیں۔ (اعلام علماء اعلام لعبد الکریم بن محب اللہ المکی ص ۳ قلمی کتب خانہ بانکی پور)

فیاضی:

امام مالک طبعاً فیاض تھے، ایک بار امام شافعیؒ کو لے کر اصطبل کا ملاحظہ کر رہے تھے، امام شافعیؒ نے بعض گھوڑوں کی تعریف کی، امام صاحب نے تمام اصطبل ان کی نذر کر دیا، (توالی التاسیس معالی ابن ادریس لابن حجر) ہر سال امام شافعیؒ کو گیارہ ہزار دینار مرحمت فرماتے تھے۔

مہمان نوازی:

مہمان نوازی عربوں کا خاصہ اور ایک مؤمن کا فرض ہے لیکن امام صاحب کا اخلاقِ میزبانی اس سے بھی زیادہ تھا، امام شافعی جو طالب علم کی حیثیت سے ان کے گھر میں ٹھہرتے تھے، امام ان کے لئے خود اپنے ہاتھوں سے خوان اٹھا کر لاتے تھے، صبح کی نماز کے لیے اپنے ہاتھ سے پانی لا کر رکھتے تھے، باوجود وقار کے رخصت کے وقت خود بازار تک جا کر سواری کر دی اور روپیہ کی ایک تھیلی زادِ راہ کے لئے عنایت کی۔ (مرات الاوراق ابن حجہ حموی ج ۱ ص ۲۰۰)

صبر و استقلال:

استقلال وضبط کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ موزہ میں بچھو تھا، امام مالک نے بے خبری میں اس کو پہن لیا، اور مجلس درس میں آ کر بیٹھ گئے، بچھو نے مسلسل سترہ بار ڈنک مارا لیکن آدابِ مجلس کے خیال سے امام نے پہلو تک نہ بدلا، چہرہ کا رنگ بار بار متغیر ہو رہا تھا، اختتام درس کے بعد عبداللہ بن مبارک نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ موزہ میں بچھو ہے۔ (بستان المحدثین ص ۶۷)

حلم وعفو:

خودداری وجلالت شان کے ساتھ حلم وعفو جو ایک گراں قدر جوہر ہے اکثر جمع نہیں ہوتا لیکن امام میں یہ دونوں صفتیں مجتمع تھیں، ایک طرف تو منصور ورشید جیسے قہار سلاطین کو ڈانٹ دیتے ہیں، دوسری طرف آپ کے شانہ مبارک پر بیل ہاتھوں سے کوڑا مارا جاتا ہے تو آپ انگیز کرتے ہیں اور منصور جب مجرم کی سزا کا ذکر کرتا ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ میں نے معاف کیا۔ (کتاب الامامۃ ابن قتیبہ ج ۲ ص ۲۸۶)

حق گوئی و آزادی:

امام صاحب خلفا کے دربار میں آمد ورفت رکھتے تھے، بعض لوگوں کو اس پر اعتراض تھا، امام صاحب نے فرمایا کہ "اگر نہ

Marfat.com

جاؤں تو حق گوئی کا موقع کہاں ملے"؟ (مناقب مالک للزواوی ص ۳۱) امام مالک کو اس لئے کوڑے مارے گئے کہ حق کے اظہار میں انہوں نے حکومت کی پروانہ کی' ایک دن منصور نے مسجد نبوی میں زور وشور سے مناظرہ شروع کیا' امام نے فرمایا کہ ادب ملحوظ رہے' عباسیوں کے مقابلہ میں محمد نفس زکیہ نے جب علم بلند کیا تو آپ نے علی الاعلان فتویٰ دیا کہ خلافت محمد نفس زکیہ کا حق ہے' عباسیوں نے زبردستی بیعت لی ہے۔

خودداری:

علم کی شان یہ ہے کہ اس کی جلالت ملحوظ رکھی جائے تا کہ لوگوں میں اہل علم کا وقار قائم رہے اور ان میں اکتساب علم کا ذوق پیدا ہو۔ امام مالک نے اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھا، اوپر گزر چکا ہے کہ امام صاحب مجلس درس میں بڑے وقار ومتانت اور خودداری کے ساتھ بیٹھتے تھے، لوگ اعتراض کرتے تو فرماتے کہ: اریدان اجل العلم. یعنی میں چاہتا ہوں کہ علم کی شان بڑھاؤں۔ بڑے بڑے امراء اور حکام آستانۂ امامت پر حاضر ہوتے ہوئے کانپتے تھے، رشید نے اپنے خیمہ میں املائے حدیث کے لیے بلایا تو فرمایا: لوگ علم کے پاس آتے ہیں، لوگوں کے پاس علم نہیں جاتا۔ رشید خود آیا تو مسند درس پر بیٹھنا چاہا، فرمایا تواضع محبوب ہے۔ رشید نے کہا آپ پڑھیے۔ فرمایا: اپنی یہ عادت نہیں۔ (مناقب مالک للزواوی ص ۲۹)

منصور کے دربار کا یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی دربار میں آتا تو خلیفہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا، امام نے کبھی یہ ذلت گوارا نہ کی۔

انصاف پسندی:

لیکن اس خودداری اور اس اظہارِ حق سے زیادہ گران قیمت اور مشکل الحصول شے انصاف پسندی ہے، وہ بھی اپنے نفس کے مقابلہ میں امام صاحب کا یہ حال تھا کہ جس مسئلہ پر عبور نہ ہوتا تو بمتانت فرما دیتے کہ: مجھے نہیں معلوم۔ آپ کے ایک شاگرد کا قول ہے کہ میں امام کے "نہیں معلوم" کو لکھا کرتا تو تختیاں بھر جاتیں۔

ابن القاسم امام کے ایک شاگرد نے کہا کہ مصر کے علماء بیع وشرا کے مسائل میں بڑی مہارت رکھتے ہیں، امام مالک نے پوچھا، انہوں نے کس سے ان کی تعلیم پائی؟ ابن القاسم نے کہا کہ آپ سے، فرمایا کہ مجھے تو خود ان میں دخل نہیں۔

(مختصر جامع بیان العلم لابن عبد البر ص ۱۲۵)

اہل علم کی عزت:

خلیفہ ہارون رشید مجلس درس میں آیا تو اس کو مسند سے نیچے اتر کر بیٹھنا پڑا لیکن ایک بار امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تو امام نے اس قدر تعظیم کی کہ ان کے لیے اپنی چادر فرش پر بچھائی، وہ اٹھ گئے تو طلبا سے کہا کہ یہ عراق کے ابوحنیفہ ہیں، جو اس ستون کو سونا ثابت کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، اس کے بعد کوفہ کے محدث سفیان آئے تو ان کی بھی تعظیم کی لیکن اس سے کم، ان کے چلے جانے کے بعد فرمایا کہ لوگوں کی علمی قدر مراتب عزت کرنی چاہیے۔

عبدالرحمن بن قاسم آپ کے شاگرد تھے لیکن ان کو خط لکھتے تھے تو "فقیہ مصر" لکھا کرتے تھے' ایک بار آپ کے نامور شاگرد قعنبی محدث مدینہ آرہے تھے' تو امام صاحب اپنے تلامذہ کو لے کر خود بنفس نفیس انکے استقبال کیلئے شہر سے باہر نکل آئے۔

(تذکرۃ ذہبی ج ۱ ص ۳۵۱)

Marfat.com

حلیہ:

رنگ سرخ وسپید قد بلند وبالا بدن بھاری پیشانی کشادہ آنکھیں بڑی ناک اونچی داڑھی بڑی اور گھنی سر میں قدرتا بال نہ تھے مونچھوں کو بہت چھوٹی کرانا ناپسند کرتے تھے خضاب کا استعمال کبھی نہیں کیا۔

پوشاک:

مزاج میں صفائی اور نزاہت غایت درجہ تھی ہمیشہ نفیس اور بیش قیمت پوشاک زیب بدن فرماتے تھے بعض لوگ اس پر ٹوکتے تو فرماتے کہ میں اس شہر (مدینہ) کے جس عالم سے ملا اس کو خوش پوشاک پایا امام صاحب کو اپنے کپڑوں کا خاص اہتمام تھا عدن کے کپڑے اس زمانہ میں مشہور اور بیش قیمت ہوتے تھے وہاں سے اپنے لئے کپڑے منگواتے تھے کبھی کبھی مرو کے بنے ہوئے کپڑے بھی استعمال کرتے۔

(ابن ندیم مطبوعہ یورپ ص ۲۸۰ و مراۃ الجنان ج ۱ ص ۳۷۳، ۳۷۴ و بستان المحدثین ص ۳)

خوشبو کا استعمال ہمیشہ کرتے تھے عود کی انگیٹھیاں جلتی رہتی تھی کپڑے خوشبو سے بسے رہتے تھے جس گلی سے ایک بار نکل جاتے دیر تک اس میں خوشبو پھیلی رہتی اور اکثر فرماتے کہ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ خدا نے جس کو نعمت دی ہو اس کے آثار اس پر نہ ظاہر ہوں کبھی کبھی طیلسان کا بھی استعمال کرتے جو اس زمانہ میں علما کی نشانی تھی عمامہ جب زیب سر فرماتے تو شملہ گلے میں لپیٹ کر دائیں یا بائیں شانہ پر ڈال لیتے ہاتھ میں ایک چاندی کی انگوٹھی جس کے سیاہ پتھر کے نگینہ پر حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ نقش تھا۔

امام مالک کا یہ شرف کیا کم ہے کہ مدینہ مطہرہ کی خاک پاک جسم مبارک کا عنصر تھی لیکن اس سے بھی زیادہ شرف یہ ہے کہ مسکن وہ تھا جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مکان تھا اور مجلس ونشست گاہ وہ تھی جو حضرت عمر فاروقؓ کا دولت خانہ تھا یہیں اکثر املائے حدیث کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں اس بنا پر امام مالک نہ صرف علوم ومعارف فاروقی کے وارث تھے بلکہ ان کی مادی جائداد کا بھی خدا نے انھیں وارث بنایا تھا۔

تصنیفات

اس عہد میمون میں تصنیف وتالیف کی ابتدا ہو چکی تھی امام کے دست مبارک سے جو کتابیں ترتیب پائی ہیں یا ان کی طرف منسوب ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ موطا کی نسبت مفصل بحث آگے آئے گی موطا اور ان کی دوسری تصنیفات میں پہلا امتیاز یہ ہے کہ موطا کی روایت امام کے تلامذہ نے کی ہے اور بقیہ رسائل وکتب صرف بعض تلامذہ کی روایت سے ثابت ہیں۔

۲۔ رسالۃ مالک الی الرشید: یہ خلیفہ ہارون رشید کے نام خط کے طور پر ۲۴ صفحہ کا ایک رسالہ ہے جس میں امام نے خلیفہ کو ہر قسم کے دینی ودنیاوی واخلاقی نصائح کیے ہیں۔

بعض علماء نے اس بناء پر اس کی نسبت امام صاحب کی طرف کرنے سے انکار کیا کہ اس میں بعض ضعیف ومنکر حدیثیں

Marfat.com

ہیں لیکن اصل یہ ہے کہ اخلاقیات میں محدثین اس قدر احتیاط نہیں کرتے تھے' ابن ندیم نے الفہرست میں اس کا ذکر کیا ہے' یہ رسالہ چھپ گیا ہے اور لاہور میں کسی شخص نے اس کا اردو ترجمہ بھی چھاپا ہے۔

۳۔ **احکام القرآن**: یہ خود امام کی تصنیف نہیں ہے' بلکہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور ماہر علوم قرآن علامہ ابو محمد مکی بن ابی طالب اندلسی متوفی (۴۳۷ھ) کی تالیف ہے امام مالک سے جو احکام قرآن یعنی آیات احکامیہ کی تفسیریں مروی ہیں ان کو علامہ موصوف نے اس میں یکجا کر دیا ہے' اسی لئے اس کا پورا نام کتاب الماثور عن مالک فی احکام القرآن ہے۔

(تزیین الممالک ص ۴۰،۴۱)

۴۔ **المدونۃ الکبریٰ**: فقہ مالکی کی ضخیم کتاب ہے' بعض لوگ اس کو خود امام کی تصنیف بتاتے ہیں حالانکہ عبدالرحمٰن بن قاسم متوفی ۱۹۱ھ امام کے ایک شاگرد کی تصنیف ہے' البتہ اس لحاظ سے امام کی تصنیف کہنا درست ہے کہ یہ کتاب درحقیقت ان کے ''ملفوظات فقہیہ'' کا مجموعہ ہے' ابن قاسم نے امام کے زمانہ میں مدینہ سے واپس آ کر امام کے مجتہدات واقوال کو ایک کتاب کی صورت میں مدون کرنا شروع کیا تھا اور شاید اسی زمانہ میں ختم بھی ہوگئی تھی کیونکہ یحییٰ مصمودی دوسری بار مصر سے مدونہ ابن قاسم کو خود امام سے سننے کے لئے آئے تھے لیکن افسوس کہ امام اس وقت بستر مرض پر تھے۔ (ابن خلکان ترجمہ ابن قاسم)

مصر میں مدونہ چھپ گئی ہے اور ہر جگہ ملتی ہے۔

۵۔ **رسالۃ مالک الیٰ ابن مطرف**: غسان بن محمد بن مطرف کے نام ''فتویٰ'' کی بحث پر ایک رسالہ ہے۔

۶۔ **رسالۃ مالک الیٰ ابن وھب**: امام کے شاگرد رشید ابن وہب کے نام سے مسئلہ قضا وقدر پر ایک مشہور رسالہ ہے' قاضی عیاض نے اس رسالہ کی تعریف کی اور لکھا ہے' وھو من خیار الکتب فی ھذا الباب الدال علی سعۃ علمہ بھذا الشان۔

۷۔ **کتاب الاقضیہ**: بعض قاضیوں کے لئے امام نے یہ رسالہ لکھا' غالباً اس میں عہدہ قضا کے متعلق اصول وہدایات ہوں گے۔

۸۔ **کتاب المناسک**: ابو جعفر زہری امام کے ایک دوست کا بیان ہے کہ یہ امام مالک کی سب سے بڑی تصنیف تھی جس میں حج کے احکام ومسائل تھے۔

۹۔ **تفسیر غریب القرآن**: اس کی روایت خالد بن عبدالرحمٰن مخزومی نے امام سے کی ہے۔

۱۰۔ **کتاب المجالسات عن مالک**: ابن وہب امام کے تلمیذ رشید نے امام کی مجالس میں حدیث وآثار واخلاق کے جو متفرق فوائد ونکات سنے ان کو اس میں جمع کیا ہے' حافظ سیوطی نے یہ رسالہ دیکھا تھا۔

۱۱۔ **تفسیر القرآن**: قرآن مجید کی تفسیر بروایت احادیث مسندہ ہے' حافظ سیوطی نے اس کو دیکھا تھا اور اس کی تعریف کی ہے لیکن یہ مشکوک ہے کہ آیا یہ خود امام کی تالیف ہے' یا کسی شاگرد نے امام سے اس کی تعلیق کی ہے۔

۱۲۔ **کتاب المسائل**: ان رسائل وکتب کے علاوہ امام کی اور بھی تصنیفات تھیں' محدث خطیب نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ ابو العباس سفاح کے سامنے بہت سے منتشر اوراق پڑے تھے جن کی نسبت اس نے کہا کہ یہ امام صاحب کے ستر ہزار مسائل کا مجموعہ ہے۔ ان معلومات کے لیے مقدمہ فتح الباری ملاحظہ ہو۔

Marfat.com

مؤطا

امام کی اصلی تصنیف ''مؤطا'' ہے جو قرآن پاک کے بعد کتب خانۂ اسلام کی دوسری کتاب ہے' اول کلام خدا ہے اور ثانی کلام رسول اللہ۔

١٣٢ھ میں خلافت امویہ مٹ کر خلافت عباسیہ قائم ہوتی ہے اسی کے پس وپیش عہد میں سینکڑوں مجموعہ ہائے حدیث مدون ہوئے' مؤطا کی تالیف کا بھی یہی زمانہ ہے۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد اکثر صحابہ تعلیم وارشاد اور جہاد وغزا کی نیت سے بلادِ مفتوحہ میں پھیل گئے تھے لیکن صحابہ کا گروہ عظیم جن میں اکابر واجلہ فقہا داخل تھے' مدینہ ہی میں رہا' امام مالک کا عہد وہ ہے جب احادیث وروایات تمام بلاد اسلامیہ میں منتشر تھیں' اس لحاظ سے ان کے عصر میں جن ملکوں میں مجموعہ ہائے حدیث کی تدوین ہوئی وہ اپنے اپنے حدود ملکی کے اندر محدود تھے مرکز نبوت اور مہبط وحی مدینہ میں جو علوم نبوی کا سب سے بڑا گنجینہ تھا حدیثوں کی جمع وترتیب' جس خوش بخت کی قسمت میں تھی وہ امام مالک ہیں۔ (ان معلومات کے لیے مقدمہ فتح الباری ملاحظہ ہو)

مؤطا:

مؤطا علوم مدینہ کا مجموعہ ہے' جہاں زروجواہر کی اصلی کان تھی' تمام اکابر صحابہ واعاظم تابعین کا مسکن یہی شہر مبارک تھا' اس لئے یہ صحیفہ مقدس انہی بزرگوں کی روایات وفتاویٰ پر مبنی ہے' اس بنا پر یہ صحیفہ حقیقت میں صحیح ترین' موثق ترین اور کامل ترین احکام اسلامیہ کا مجموعہ ہے۔ (مقدمہ مسوی شاہ ولی اللہ صاحب وکشف الظنون ج ٢ ص ٥٧٢)

تالیف مؤطا:

یہ ظاہر ہے کہ امام مالک ہمیشہ مدینہ ہی میں قیام فرما رہے' اس لئے تالیف کا مقام معلوم ہے لیکن صحیح زمانہ متعین نہیں' ١٣٠ھ سے زوال بنی امیہ کی تاریخ شروع ہوتی ہے اس سے پہلے تصنیف وتالیف کا شغل عام نہ تھا' ١٤٢ھ میں منصور نے آخری حج کیا ہے' اس وقت مؤطا متداول ومشہور ہو چکی تھی۔ (ایضاً جامع بیان العلم ابن البر ص: ٦٧) اس لئے اس کا زمانہ تالیف ان دونوں کا درمیانی زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ایک روایت ہے کہ امام مالک نے منصور ہی کے حکم سے موطا کی تالیف شروع کی تھی' اس کی فرمائش تھی کہ اس مجموعۂ احکام میں نہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سختیاں ہوں نہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی رخصتیں اور نہ عبداللہ بن مسعود کے شواذ۔ (کتاب الامامۃ والسیاسۃ ذکر منصور ج ٢ ص ١٤٠ و ١٤١)

امام صاحب جب مؤطا کی تالیف میں مشغول ہوئے اور اس کی خبر دوسرے لوگوں کو پہنچی تو مدینہ کے علما بھی اپنی اپنی احادیث کا مجموعہ تیار کرنے لگے' لوگوں نے امام سے جا کر عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ ''صرف حسن نیت کو بقا ہے'' یہ پیشین گوئی کس قدر صحیح ثابت ہوئی چنانچہ موطائے امام مالک کے سوا کوئی مؤطا دنیا میں معلوم وباقی نہیں رہی' بعض لوگوں نے رشک کا انتقام دوسری طرح لیا' محمد بن اسحٰق صاحب سیر ومغازی نے کہا' ''مالک کی کتابیں میرے پاس لاؤ میں ان کے عیوب

Marfat.com

دکھاؤں‘ مالک کی کتابوں کا ناقد تو میں ہوں۔‘‘ (تہذیب الکمال‘ مالک بن انس)

امام مالک نے تصنیف سے فارغ ہو کر اس کو شیوخ حدیث کی خدمت میں پیش کیا‘ سب نے بہ غایت پسند کیا‘ عام اہل مدینہ کے لئے وہ دن عجیب مسرت کا تھا‘ جب ان کے مجموعہ فضائل میں ایک اور فضیلت کا اضافہ ہو رہا تھا‘ سعدون نام کا ایک شاعر مؤطا کی تعریف میں کہتا ہے: (بستان المحدثین ذکر امام مالک ص ۹)

فبادر مؤطا مالک قبل فوته   فما بعده ان فات للحق مطلب

مالک کی مؤطا کو جلد لو کھونے نہ پائے‘ اگر یہ کھوگئی تو حق کی جستجو کی پھر جگہ نہیں۔

ودع للمؤطا كل علم تريده   فان المؤطا الشمس والغير كوكب

اور مؤطا کے لئے ہر اس علم کو جس کو چاہتے ہو چھوڑ دو کہ مؤطا آفتاب ہے اور اس کے علاوہ دوسری کتابیں ستارہ ہیں۔

وجہ تسمیہ:

مؤطا کے لغوی معنی ’’روندا ہوا‘‘ یا ’’چلا ہوا‘‘ کے ہیں شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے ’’روندے ہوئے یا چلے ہوئے ’’مجازی معنی یہ ہیں کہ ’’جس پر عام ائمہ اور علما اور اکابر چلے ہوں اور جس کو ان سب کی رایوں نے روندا اور پامال کیا ہو یعنی سب نے اس کے متعلق گفتگو کی ہو اور اس سے اتفاق کیا ہو‘‘ اس طرح گویا اس کے معنی ’’متفق‘‘ اور ’’مطابق‘‘ کے ہیں‘ چونکہ تمام شیوخ حدیث نے اس سے اتفاق و مطابقت کی‘ اس لئے اس کا نام مؤطا مشہور ہو گیا۔ (مقدمہ مسوی شاہ ولی اللہ صاحب ص ٦) میرے نزدیک اس سے زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ ’’مؤطا اس راستہ کو کہتے ہیں جس پر لوگ بکثرت گزرتے ہوں‘‘ سنت کے معنی بھی راستہ کے ہیں یہ وہ راستہ ہے جس پر آنحضرت ﷺ گزرے‘ مؤطا وہ پامال راستہ ہے جس پر آنحضرت ﷺ کے بعد تمام صحابہ گزرے‘ غرض مؤطا کا لفظ اپنی حقیقت کا آپ مفسر ہے کہ ان مسائل پر مشتمل ہے جن پر صحابہ کا عمل رہا ہے اور جمہور سلف جن پر چلے ہیں۔

تعداد مرویات:

ابتداءً مؤطا میں دس ہزار حدیثیں تھیں لیکن امام کے خامہ صحت پسند نے تقریباً آٹھ ہزار حدیثیں قلم زد کر دیں‘ باقی ۱۷۲۰ ہیں جن میں سے مسند اور مرفوع ٦۰۰ ہیں‘ مرسل ۲۳۵‘ موقوف ٦۱۳‘ تابعین کے اقوال و فتاویٰ ۲۸۵‘ بلاغات مالک ۷۵۔ (مقدمہ مسوی شاہ ولی اللہ صاحب ٦)

موضوع:

مؤطا کا موضوع صرف احکام فقہیہ ہیں اس لئے وہ سینکڑوں ابواب و فصول جو بخاری و مسلم اور ترمذی وغیرہ میں نظر آتے ہیں مؤطا ان سے خالی ہے‘ کیونکہ فقہیات سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے اس بنا پر محدثین کی اصطلاح کے مطابق اس کو ’’کتاب السنن‘‘ کہنا چاہیے۔

Marfat.com

مؤطا اور دیگر فقہائے مجتہدین کے مجموعہ ہائے حدیث:

چاروں مجتہدین فقہا میں سے ہر ایک کے انتساب سے ایک مجموعۂ حدیث موجود ہے لیکن امام کے سوا کسی امام مجتہد کے قلم سے حدیث کی کوئی تصنیف ظاہر نہیں ہوئی، ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ۔ مسند ابی حنیفہ کے نام سے متعدد کتابیں موجود ہیں مگر دراصل یہ تمام کتابیں امام ابوحنیفہ کے سینکڑوں برس بعد امام ممدوح کے تلامذہ کی تصنیفات اور غیر معروف مسانید سے لے کر محمد بن یعقوب اور حسین بن خسرو وغیرہ نے تالیف کی ہیں اور ان کو مسند ابی حنیفہ امام اعظم کے نام سے موسوم کر دیا ہے۔

مسند امام شافعیؒ کی حقیقت یہ ہے کہ امام شافعیؒ نے اپنی تصنیفات میں بر سبیل استدلال جو حدیثیں روایت کی ہیں، ابوجعفر بن محمد بن مطر نیشاپوری اور ابوالعباس نامی ایک شافعیؒ نے ان کو یکجا کر دیا ہے، مسند احمد بن حنبل کی تالیف یقیناً امام احمد نے شروع کی تھی لیکن وہ ابھی مسودہ تھا کہ امام موصوف نے وفات پائی اس کی تبییض و ترتیب بعد کو امام احمد کے صاحبزادہ عبداللہ نے کی، جو افسوس ہے کہ اس میدان کے مرد نہ تھے، اسی لیے اس میں مدنی اور عراقی مسندوں میں تخلیط ہے اور صحیح احادیث کا التزام نہیں، گو خود امام ابن حنبل کو اس کا دعویٰ تھا۔

مؤطا اور اس کی معاصر کتابیں:

مؤطا سے قبل اور خود اس کے زمانہ میں بیسیوں مسانید اور مؤطائیں لوگوں نے لکھیں، جن میں سے بعض اب تک باقی ہیں لیکن اور مؤطاؤں اور مؤطائے امام مالک کے موازنہ سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ مؤطا اور ان کتابوں میں وہی نسبت ہے جو صحیح بخاری کو مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن بیہقی سے ہے خود ان کتابوں کا فقدان اور عدم شہرت اس کی سب سے بڑی دلیل ہے، تین خاص وجوہ سے مؤطا کا امتیاز بالکل روشن ہو جاتا ہے۔

۱۔ مؤطا سے پہلے جو حدیث کی کتابیں لکھی گئیں ان کا مبنیٰ زیادہ تر صحابہؓ و تابعینؒ کے آثار و فتاویٰ تھے، امام مالک نے مؤطا میں احادیث صحاح و مسند یا منقطع جو مرسل کو مبنائے اوّل اور آثار و فتاویٰ کو مبنائے ثانی قرار دیا۔

۲۔ دوسرا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ ان میں صحت کا التزام نہیں کیا گیا تھا اور مؤطا میں صرف اسی حدیث یا فتویٰ نے جگہ پائی ہے جس کو صحت کا شرف حاصل تھا۔

۳۔ تیسری بات یہ کہ مؤطا مدینہ میں تالیف ہوئی ہے اور اس کے رواۃ حجازی ہیں اور دیگر مسانید اور مؤطائیں کوفہ بصرہ، واسط، شام، یمن، خراسان اور رے وغیرہ میں لکھی گئیں اس لیے ان کو یہ خصوصیت حاصل نہیں ہے اور اس پر تمام علمائے حدیث کا اتفاق ہے کہ حجاز کی حدیثیں صحت، قوت اور جودت اسناد میں سب پر فائق ہیں۔

طبقات کتب حدیث میں مؤطا کا درجہ:

علمائے حدیث نے کتب حدیث کو چار مختلف طبقات میں منقسم کیا ہے، طبقہ اولیٰ میں وہ تصانیف ہیں جن کے مصنفین حدیث کے امام اور فن کے نقاد تھے اور جن کی تصنیفات صحت، جودت اسناد اور قبول محدثین کے لحاظ سے سب سے مقدم ہیں اور جن کے رجال حفظ، ثبوت، وثوق، شہرت میں معروف ہیں اس طبقہ میں مؤطا، بخاری اور مسلم داخل ہیں۔

Marfat.com

طبقہ اولیٰ میں مؤطا کا درجہ:

عام علماء تو اس کو مسلم بلکہ ترمذی کے بھی بعد جگہ دیتے ہیں لیکن محققین قدما اور عموماً متاخرین میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبد العزیز صاحب اس کو بخاری سے بھی مقدم سمجھتے ہیں اور خود میں بھی بدءِ طلب حدیث سے یہی اعتقاد جازم رکھتا ہوں۔

یہ صحیح ہے کہ مؤطا میں مرسل، موقوف اور منقطع حدیثیں ہیں، جو صحیح کے لئے قادح ہیں لیکن ان کا ارسال، وقف اور انقطاع مؤطا کی روایت کے لحاظ سے درست ہے اور خود حقیقت کی رو سے یہ تمام مراسیل و موقوفات و منقطعات، متصل، مرفوع و مسند ہیں اور خود ان کا رفع و اتصال و اسناد امام بخاری و امام مسلم و ترمذی وغیرہ نے کیا ہے۔ اس بنا پر درحقیقت مؤطا میں کوئی مرسل، موقوف یا منقطع حدیث نہیں اس میں جو حدیث بھی ہے اس پر (الا ماشاء اللہ) بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ کی مہر تصدیق لگی ہوئی ہے اس سے مؤطا کی صحت کے درجہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ مؤطا کو سب سے بڑا شرف یہ بھی حاصل ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں کلام اللہ کے بعد جو کتاب آئی وہ کلام الرسول کا یہی اصح ترین مجموعہ تھا، کشف الظنون میں ہے ''سب سے پہلی کتاب جو اسلام میں لکھی گئی ہے وہ مؤطا ہے۔'' (کشف الظنون ج ۲ ص ۵۷۲) قاضی ابو بکر ابن عربی م ۵۴۶ھ مؤطا کی شرح میں لکھتے ہیں یہ ''پہلی کتاب ہے جو شریعت اسلامیہ میں لکھی گئی ہے'' حضرت سفیان کہتے ہیں ''سب سے پہلے مالک نے صحیح تالیف کی۔''

۲۔ باوجود نقش اول ہونے کے بھی اس کے بعد کی کتابیں اس کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتیں، جس کے متعلق ائمہ مجتہدین اور علمائے حدیث کی قوی شہادتیں موجود ہیں، امام شافعی م ۲۰۴ھ فرماتے ہیں ''روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد کوئی کتاب مؤطا امام مالک سے زیادہ صحیح نہیں ہے'' ابو بکر ابن عربی فرماتے ہیں ''یہ اسلام کی سب سے پہلی کتاب ہے اور سب سے پچھلی بھی، کیونکہ پھر اس کے مثل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔''

شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کتاب الام میں امام شافعی اور کتاب الآثار میں امام محمد کی جو فقاہت ہے وہ مؤطا ہی کے صدقہ میں ہے۔

۳۔ امام مالک سے مؤطا کی روایت کرنے والے جس پایہ کے لوگ ہیں وہ بخاری اور مسلم کے نہیں ہیں اس لئے خواص و عوام کی نقل و روایت میں جو فرق ہے وہ یقیناً مؤطا اور دیگر کتب کے نقل و روایت میں ہے۔

۴۔ رسول اللہ ﷺ اور مؤلفین حدیث میں جتنے واسطے کم ہوں گے اسی قدر اس کی تالیفات زیادہ معتبر اور مستند ہوں گی بخاری و مسلم کی روایتیں عموماً پانچ چھ واسطوں سے مروی ہیں، مؤطا کی حدیثیں تین چار واسطوں سے زیادہ کی نہیں ہیں، امام بخاری کو اپنی بیس ثلاثیات پر ناز ہے اور مؤطا کی بنیاد ہی ثلاثیات پر ہے اس کے علاوہ اس میں چالیس ثنائیات ہیں۔

مؤطا کے نسخے:

مؤطا امام مالک صاحب سے تیس مختلف طریقوں سے مروی ہے جن میں مشہور ۱۶ نسخے ہیں، ان میں سے معتبر اور باوثوق کبار اور باوثوق تر چار ہیں یعنی یحییٰ ابن بکیر، ابو مصعب اور ابن وہب کے نسخے لیکن متداول ترین اور مشہور ترین یحییٰ کی روایت والا نسخہ ہے کتاب کی مشہور ترتیب یہ ہے: اول کتاب الجنائز، پھر کتاب الصلوٰۃ، پھر کتاب الزکوٰۃ، پھر کتاب

Marfat.com

الصیام اس کے بعد تمام نسخے کتاب الحج تک متفق ہیں، کتاب الحج کے بعد سے پھر مختلف الترتیب ہیں۔ (بستان المحدثین ص ۱۰،) اس قسم کا اختلاف بخاری و مسلم سب میں ہے۔

شروح و تعلیقات:

کسی تصنیف کی قبولیت و ہر دلعزیزی کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کو شارحین، معلقین و محشین کی ایک بڑی جماعت ہاتھ آئے اور اس میں کمیت سے زیادہ اصل چیز کیفیت ہو موطا ان دونوں خصوصیات کے لحاظ سے خوش قسمت ہے، تقریباً پچیس علمائے کبار نے اس کی شرح و تعلیق اور دیگر خدمات انجام دی ہیں، قدما میں ابن حبیب مالکی متوفی ۲۳۹ھ، امام ابوسلیمان خطابی م ۳۸۸ھ، ابن رشیق قیروانی م ۴۵۶ھ، محدث ابن عبدالبر م ۴۶۳ھ، امام باجی اندلسی متوفی ۴۷۴ھ، قاضی عیاض متوفی ۵۴۴ھ، قاضی ابوبکر بن عربی متوفی ۵۴۶ھ اور متاخرین میں حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ علامہ زرقانی مصری م ۱۱۲۲ھ، شاہ ولی اللہ دہلوی م ۱۱۷۶ھ وغیرہ داخل ہیں۔

امام خطابی، حافظ سیوطی، ابن عبدالبر، ابن حزم، ابوالولید باجی نے بحذف فتاویٰ صرف موطا کی احادیث کی تلخیص کی ہے، حافظ سیوطی نے رجال موطا کو علیحدہ کیا ہے، احمد بن عمران، اخفش بصری اور قاضی عیاض نے موطا کے لغات حل کئے ہیں، باجی اور دار قطنی نے موطا کے اختلاف نسخ پر بحث کی ہے، ابوالحسن علی بن محمد قابسی نے موطا کی صرف متصل الاسناد حدیثیں جمع کی ہیں، ابن بشکوال اور خطیب بغدادی نے صرف ان لوگوں کے حالات لکھے ہیں جنہوں نے امام سے موطا کی روایت کی ہے، غرض موطا کے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی تعداد ستر کے قریب ہے۔

موطا کا ایک اور امتیاز:

سلاطین اور خلفائے اسلام میں سینکڑوں ایسے گزرے ہیں جو صاحب سیف و قلم تھے جن کے نام سے تخت و منبر دونوں عزت پاتے تھے لیکن کسی کے متعلق یہ ذکر نہیں ہے کہ اس نے طلب علم واخذ سند کے لیے کوئی سفر کیا ہو کیونکہ خود ان کا دربار اساتذہ کا مرکز اور علما کا مرجع ہوتا تھا، تنہا امام مالک کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ ان کی کتاب موطا کے لئے مہدی، ہادی، رشید، مامون اور امین جیسے مشاہیر خلفائے اسلام نے عراق سے حجاز تک کا سفر کیا اور آخر میں چھٹی صدی میں بزرگ ترین سلاطین اسلام صلاح الدین ایوبی فاتح بیت المقدس نے قاہرہ سے اسکندریہ تک صرف اسی کی خاطر سفر گوارا کیا۔

(تزئین الممالک ص ۴۶)

Marfat.com

امام ابوداؤد طیالسی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۰۴ھ)

نام ونسب:

سلیمان نام ابوداؤد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: سلیمان بن داؤد بن جارود۔

(تاریخ بغداد ج۹ ص ۲۴ خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۱۵۱ تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۲۲)

ولادت:

وہ باتفاق ۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے علامہ سمعانی نے ربیع الاول کا مہینہ بھی لکھا ہے۔

خاندان ووطن:

آبائی وطن فارس ہے بصرہ میں مستقل بودوباش اختیار کر لی تھی اصلاً غلام زادہ تھے ان کے والدین قبیلہ قریش کے موالی تھے فارسی بصری قرشی اور طیالسی کی نسبتوں سے منسوب کئے جاتے ہیں ان میں سب سے زیادہ مشہور نسبت طیالسی ہے جو طیالسہ کی جانب ہے طیالسہ طیلسان کی جمع ہے یہ ایک قسم کی چادر ہوتی تھی جس کو اہل عرب عماموں کے اوپر اوڑھتے تھے اس نسبت سے جو لوگ منسوب ہیں ان میں ابوداؤد سب سے زیادہ مشہور اور ممتاز ہیں۔ (کتاب الانساب ورق ۳۷۵)

طیلسان فارسی زبان کا لفظ ہے اصمعی کے نزدیک وہ اصل میں تالشان (تالسان) تھا اور معرّب ہو کر طیلسان ہو گیا ہے۔

(لسان العرب ج ۷ ص ۴۳۱) اس نسبت سے منسوب ہونے کا سبب نہیں معلوم ہو سکا۔

اساتذہ وشیوخ:

حافظ ابوداؤد طیالسی کو دوسری صدی ہجری کا مبارک زمانہ ملا جو علم وفضل اور خیر وبرکت کے لحاظ سے خیر القرون میں شمار کیا جاتا ہے اس لیے ان کو مقدس اور برگزیدہ علمائے اسلام کی صحبت میسر آئی اور بڑے بڑے محدث علما سے استفادہ کا موقع ملا ان کے اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک ہزار شیوخ سے حدیثیں لکھیں ان میں ابن عون اور ان کے مرتبہ کے متعدد لوگ تھے بعض مشہور شیوخ کے نام حسب ذیل ہیں:

ابان بن یزید عطار، ابراہیم بن سعد، ایمن بن نابل جریر بن حازم، جریر بن عبدالحمید، حبیب بن یزید، حرب بن شداد، حماد بن درہم، حماد بن سلمہ، زائدہ بن قدامہ، زہیر بن معاویہ، سفیان بن سعید ثوری، شعبہ بن حجاج، عبدالرحمن بن ابی الزناد، عبداللہ بن عون، عبدالعزیز بن ماجشون، قرہ بن خالد، ابوعوانہ وضاح بن عبداللہ، ورقاء، ہشام بن عبداللہ دستوائی، ہمام

Marfat.com

بن یحییٰ اور یزید بن ابراہیم وغیرہ۔

(تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۵،۲۴ وکتاب الانساب ورق ۲۷۵ وتہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۸۶)

تلامذہ:

جس طرح انہوں نے بیشمار مشائخ سے اکتساب فیض کیا تھا، اسی طرح ان کے دامن سے بھی بکثرت طلبہ اور محدثین وابستہ ہوئے، ان میں سے بعض مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں:

احمد بن ابراہیم دورقی، احمد بن حنبل، اسحاق بن منصور کوسج، ابوبکر بن ابی شیبہ ابو مسعود رازی، ابن فرات، بکار بن قتیبہ ثقفی، حجاج بن یوسف الشاعر، عباس دوری، عبداللہ بن محمد مسندی، عثمان بن ابی شیبہ، علی بن مدینی، علی بن مسلم طوسی، عمرو بن علی فلاس، محمد بن ابوبکر مقدمی، محمد بن بشار بندار، محمد بن رافع، محمد بن سعد کاتب واقدی، محمد بن غیلان، ہارون حمال، یعقوب بن ابراہیم دورقی اور یونس بن حبیب اصبہانی وغیرہ۔

(تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۵،۲۴ کتاب الانساب ورق ۲۷۵ وتہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۸۶)

آپ کے استاد جریر بن عبدالحمید نے بھی آپ سے روایت کی ہے، (تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۴ وتہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۸۳) مؤلفین صحاح اور امام طیالسی کے زمانہ میں کافی تفاوت ہے اس لیے ان میں سے تین نے آپ سے بالواسطہ روایت کی ہے، حافظ ابن حجر نے امام بخاری (مقدمہ فتح الباری ص ۲۳۸) اور مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نے امام ترمذی کے سلسلۂ رواۃ میں ان کا نام گنایا ہے، (مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۲۷۰، ۳۲۰) شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوداؤد سجستانی کے متعلق لکھا ہے کہ غالباً وہ ان سے بیک واسطہ روایت کرتے ہیں۔ (بستان المحدثین ص ۳۲)

رحلت وسفر:

ابوداؤد کے مشائخ کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے حدیث کی طلب وجستجو کے لیے مختلف مقامات کا سفر کیا ہوگا لیکن کتابوں میں صرف بغداد اور اصبہان کے سفر کا ذکر کیا ہے۔

فضل وکمال:

حدیث کے علاوہ ان کے دوسری علمی کمالات پردۂ خفا میں ہیں اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کن کن علوم وفنون میں جامعیت رکھتے تھے، صرف فن حدیث میں ان کی مہارت وژرف نگاہی کا حال معلوم ہوتا ہے جس نے ان کو مرتبۂ امامت پر فائز کیا۔

حفظ وضبط:

ان کا حافظہ غیر معمولی تھا، علمائے فن اور ان کے معاصرین نے اس کا اعتراف کیا ہے، بعض علما کا بیان ہے کہ "ان کو ۳۰ ہزار اور بعض نے کہا ہے کہ ۴۰ ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں" یونس بن حبیب اصبہانی فرماتے ہیں کہ انہوں نے اصبہان میں ایک لاکھ حدیثیں محض اپنی یادداشت سے املا کرائیں، عمرو بن علی فلاس کہتے ہیں کہ "محدثین کے زمرہ میں مجھ کو کوئی شخص ابوداؤد سے بڑا حافظ نظر نہیں آیا، میں نے ان کو خود یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں ۳۰ ہزار حدیثیں زبانی بیان کرتا ہوں" علی

Marfat.com

بن مدینی کا بیان ہے کہ میری نظر سے کوئی ان سے زیادہ حدیثوں کا حافظ نہیں گزرا، محمد بن بشار کا قول ہے کہ ”جتنی حدیثیں ابو داؤد سے لکھی گئیں اتنی کسی اور محدث سے نہیں لکھی گئیں، صالح بن احمد عجلی ان کو کثیر الحفظ بتاتے ہیں، ابن عدی کا بیان ہے کہ ” بصرہ میں ابوداؤد طیالسی اپنے زمانے میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے اور اس وصف میں وہ اپنے معاصرین میں فائق وبرتر تھے“ ہشیم بن خارجہ نے امام احمد سے دریافت کیا کہ ”ابوداؤد اور ابوعبیدہ حداد میں کس کو آپ زیادہ پسند کرتے ہیں؟“ فرمایا ابوداؤد حافظہ کے لحاظ سے فائق ہیں اور ابوعبیدہ زیادہ تر کتابوں سے روایت کرتے ہیں، اس لیے غلطی بہت کم کرتے ہیں“ وکیع کا بیان ہے کہ ”طویل حدیثوں کا ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں رہا“ (العبر ج ۱ ص ۳۴۴ و کتاب الانساب ورق ۷۵ ۳، تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۲ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۴۱۴، تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۸۴) شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں ”ابوداؤد طویل حدیثوں کو اچھی طرح محفوظ کرتے تھے اور اس وصف میں اپنے معاصرین سے ممتاز تھے۔“

عدالت وثقاہت:

ثقاہت میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا، علمائے جرح وتعدیل نے ان کی توثیق کی ہے، عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں ”وہ لوگوں میں سب سے زیادہ سچے تھے“ (تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۸ و تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۸۳، کتاب الانساب ورق ۷۵ ۳ و میزان الاعتدال ج ۹ ص ۴۱۳ و طبقات ابن سعد قسم دوم ج ۷ ص ۵۱) ابوالمنذر نعمان کا ارشاد ہے کہ ”وہ ثقہ اور معتبر تھے“ ابن معین سے شعبہ کے تلامذہ کے متعلق دریافت کیا گیا کہ ابوداؤد طیالسی اور حرمی میں آپ کے نزدیک کون زیادہ بہتر ہے تو انہوں نے فرمایا کہ ابوداؤد صدوق ہیں، اس لیے وہ مجھ کو زیادہ پسند ہیں، صالح بن احمد عجلی اور خطیب بغدادی نے ان کو ثقہ وثابت بتایا ہے، عمرو بن علی نے ان کو ثقہ ومعتبر کہا ہے، ابن عدی عمرو کی رائے کی تصدیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ میرے اور دوسروں کے نزدیک متیقظ اور ثابت تھے، ابوحاتم ان کو صدوق محدث قرار دیتے ہیں، ابومسعود رازی نے امام احمد سے ان کے بارے میں سوال کیا تو ارشاد ہوا کہ وہ ثقہ اور صدوق تھے، امام نسائی کا ارشاد ہے کہ ”ابوداؤد ثقہ اور لوگوں میں سب سے زیادہ سچے تھے، ابن حبان نے بھی ان کو ثقات میں شامل کیا ہے اور محمد بن سعد صاحب طبقات لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے، (طبقات ابن سعد قسم دوم ج ۷ ص ۵۱) شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ یحییٰ بن معین وابن المدینی وفلاس ووکیع ودیگر علمائے رجال اور التعدیل وتوثیق مفرط نمودہ اند۔ (بستان المحدثین ص ۴۱)

معرفت حدیث:

وہ حدیثوں کے صرف ناقل وحافظ ہی نہ تھے بلکہ ان کی پرکھ میں بھی مہارت رکھتے تھے، بندار کا بیان ہے کہ وہ حفظ اور معرفت حدیث کے لحاظ سے نہایت برتر تھے۔

وکیع جیسے نامور محدث حدیث میں ان کی غیر معمولی واقفیت اور تمیز کی بنا پر ان کو جبل العلم کہتے تھے، یحییٰ بن معین ان کو عبدالرحمٰن بن مہدی سے بھی زیادہ صاحب علم اور حدیثوں کا واقف کار بتاتے ہیں، ان کے استاذ شعبہ کو ان کے علم وتمیز پر اتنا اعتماد تھا کہ اپنی حاضر موجودگی میں ان کو مسند درس پر رونق افروز ہونے کی اجازت دے دیتے تھے، ابوحاتم کا بیان ہے کہ معرفت حدیث میں ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ وہ شعبہ سے مذاکرہ کر سکتے تھے، اس سلسلہ میں ابوداؤد کی یہ خصوصیت قابل ذکر

Marfat.com

ہے کہ بعض محدثین اور شیوخ کی روایات کا ان سے زیادہ کوئی واقف کار نہ تھا، عثمان بری کے متعلق وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میرے سینہ میں ان کی ۱۲ ہزار حدیثیں محفوظ ہیں، مشہور محدث شعبہ کی روایتوں کے لیے تو وہ سند کی حیثیت رکھتے تھے، احمد بن سعید دارمی نے امام احمد سے سوال کیا کہ شعبہ کی حدیثیں کس سے قلمبند کی جائیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ جب تک ابوداؤد زندہ ہیں ہمارا خیال ہے کہ ان ہی سے نقل وروایت کی جائے، ابومسعود رازی کا بیان ہے کہ شعبہ کی روایتوں کے معاملہ میں ابوداؤد سے زیادہ کوئی واقف کار مجھ کو نہیں ملا۔ (تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۷، ۲۸، ۲۹ وخلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۱۵۱) حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''واز محدثان آنجا مثل شعبہ وہشام دستوائی وابن عون وغیرہم روایات بسیار دارد۔''
(بستان المحدثین ۳۱)

اخلاق وعادات:

ابوداؤد طیالسی کے اخلاق وعادات اور اعمال وعبادات وغیرہ کی تفصیل نہیں معلوم ہوسکی، بعض واقعات سے ضمناً ان کے بعض اوصاف کا پتہ چلتا ہے، مثلاً اصبہان میں ایک لاکھ حدیثیں املا کرانے کے بعد جب ان کو اپنی بعض غلطیوں کا پتہ چلا تو انہوں نے ان کو تسلیم کرلیا اور اپنے شاگردوں کو بھی ہدایت کی کہ وہ بھی ان کی تصحیح کرلیں۔

امام احمد نے بھی ان کی اس خوبی کا ذکر کیا ہے کہ وہ اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتے تھے۔

وفات:

مشہور روایت کے مطابق ۷۲ سال کی عمر میں ۲۰۴ھ میں ان کا انتقال ہوا، بعض لوگوں نے صفر اور بعض نے ربیع الاول ۲۰۴ھ کا مہینہ بتایا ہے، ۲۰۳ھ اور ۲۱۴ھ بھی سنہ وفات بتایا جاتا ہے لیکن یہ غلط ہے، اس زمانہ کے حاکم بصرہ یحییٰ بن عبداللہ بن عمر نے نمازِ جنازہ پڑھائی''۔ (تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۹)

مسند طیالسی:

مسانید کے جو مجموعے مشہور ومتداول ہیں، ان میں ایک ابوداؤد طیالسی کی مسند بھی ہے، اس کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ وہ دوسرے مسانید کے مقابلہ میں قدیم ہے، بعض علما نے اس کو سب سے قدیم مسند بتایا ہے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۱، والرسالۃ المستطرفہ ص ۵۲) حاکم صاحب مستدرک فرماتے ہیں کہ ''علمائے اسلام میں عبیداللہ موسیٰ اور ابوداؤد طیالسی نے سب سے پہلے تراجم رجال پر مسانید مرتب کیے۔'' (المدخل فی اصول الحدیث ص ۴) لیکن علمائے محققین کی ایک جماعت کو اس رائے سے اتفاق نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ ''عام مصنفین مسانید کے مقابلے میں ابوداؤد کا زمانہ قدیم ہے، اس لیے لوگوں نے ان کی مسند کو بھی سب سے قدیم سمجھ لیا، حالانکہ اس کی جمع وترتیب ان کے بعد بعض متاخرین خراسانی حفاظ نے کی ہے، (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۱) بہرحال اس کی قدامت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، گو بعض مشہور کتب حدیث کی طرح ان کی مسند کو زیادہ شہرت نصیب نہیں ہوئی لیکن اس کو مسانید میں یک گونہ خصوصیت حاصل ہے شاہ ولی اللہ صاحب نے کتب حدیث کے تیسرے طبقہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۷)

Marfat.com

ترتیب و تبویب:

یہ مسند گیارہ اجزا پر مشتمل ہے، اس کی ترتیب میں بڑی حد تک مسانید کے عام اصول کا لحاظ رکھا گیا ہے، یعنی صحابہؓ کے شرف و تقدم اور سبقت فی الاسلام کے لحاظ سے روایتیں نقل کی گئی ہیں، پہلے خلفائے راشدین، عشرہ مبشرہ اور کبار صحابہؓ کی حدیثیں ہیں، چھٹے جز کے آخر سے صحابیات کی مرویات کا سلسلہ شروع ہو کر ساتویں جز میں ختم ہوتا ہے، سب سے پہلے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور اس کے بعد حضرت عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما کی روایات ہیں، ہر صحابی کی حدیثیں الگ الگ عنوان سے ہیں، بعض صحابہ کی حدیثیں دو جگہ بھی نقل ہو گئی ہیں، بعض مقامات پر ایک صحابی کی روایتوں میں دوسرے صحابی کی روایتیں بھی خلط ملط ہو گئی ہیں، مسند کی باقاعدہ جمع و ترتیب کا کام بعض اہل خراسان نے کیا اور زیادہ تر روایتیں یوسف بن حبیب کے واسطہ سے مروی ہیں۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۱۶۸۰)

خصوصیات:

1. اس کی سب سے اہم خصوصیت اس کی قدامت ہے۔
2. مسند کی اکثر روایتیں دوسری مشہور کتب حدیث میں موجود ہیں۔
3. کہیں کہیں آثار صحابہ بھی نقل کیے گئے ہیں۔
4. حدیث کی کتابوں کے عام خصوصیات مثلاً رواۃ کے ناموں کے متعلق مختلف قسم کی وضاحتیں، کثرت طرق، تعدّد اسناد، اختلاف الفاظ و معانی یا خاص اضافہ و کمی کا ذکر، روایتوں کے باہمی فرق، رواۃ کے سہو و نسیان، روایات کے درجہ و حیثیت کی تشریح، دو روایتوں کے درمیان ترجیح، روایات کی تصویب و تخطیہ، ان کے یا راویوں کے متعلق اپنے یا شیوخ کے شک و تردد کا اظہار، مشکل الفاظ، روایات کے ابہام اور مفہوم کی وضاحت اور ان کے بعض خاص پہلوؤں اور نکتوں کی تشریح وغیرہ اس میں بھی موجود ہیں۔

یہ مسند پہلی مرتبہ مطبع دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد سے ۱۳۲۱ھ میں شائع ہوئی ہے، صفحات کی تعداد ۳۹۲ ہے، ارکان دائرہ نے حاشیے میں متعدد کتب حدیث خصوصاً مسند احمد، سنن ترمذی اور سنن ابی داؤد سے اس کی حدیثوں کی مطابقت یا اختلاف کو دکھایا ہے اور کہیں کہیں لغات اور بلاد و اماکن وغیرہ کی بھی مختصر تشریح کی ہے، خاتمہ میں مسند کے قدیم نسخہ سے اس نسخہ کا مقابلہ کیا گیا ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ ساتویں صدی ہجری سے قبل کا خدا بخش خان لائبریری میں موجود ہے، شیخ عبدالرحمن بنا ساعاتی نے مسند احمد کی طرح اس کو بھی فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے، اسی کے ساتھ موصوف نے اس کی ''المحود علی منحۃ المعبود'' کے نام سے تصحیح و تعلیق لکھی ہے، اصل و تعلیق دو جلدوں میں مطبع میمنہ مصر سے شائع ہوئی ہے۔

بعض اعتراضات اور ان کا جواب:

ابوداؤد طیالسی پر سہو و خطا اور تدلیس کے اعتراضات بھی ملتے ہیں۔

ا۔ خطا: ابوحاتم، ابراہیم جوہری، ابن سعد اور علامہ ذہبی وغیرہ نے ان کی بھول چوک اور خطا و نسیان کا ذکر کیا ہے، مگر ان سے ابوداؤد کے حفظ و ضبط، علم و فضل اور ثقاہت میں فرق نہیں آتا، خطا و نسیان تو بشریت کا خاصہ ہے، جس سے کوئی محدث بھی

Marfat.com

بری نہیں، چنانچہ ان پر جن لوگوں نے اعتراض کیا ہے وہ بھی ان کو ثقہ اور ضابط مانتے ہیں، فلاس کا بیان ہے کہ ''میں جانتا ہوں کہ علامت منافق والی حدیث میں کسی نے ان کی متابعت نہیں کی ہے تاہم اس کے باوجود وہ ثقہ وضابط ہیں۔

(تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۸۶)

دوسری چیز یہ ہے کہ محدثین اور علمائے فن کے نزدیک سہو وخطا کرنے والا متروک الحدیث نہیں سمجھا جاتا، ائمہ صحاح کی کتابوں میں بھی ایسے رواۃ کی روایتیں موجود ہیں، اس لیے یہ الزام خواہ صحیح ہو یا غلط، اس سے ابوداؤد کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا، یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ابوداؤد طیالسی کے حافظہ میں حدیثوں کا بڑا ذخیرہ محفوظ تھا اور وہ اپنی یادداشت سے حدیثیں بیان کرتے تھے، اس لیے ان سے بھول چوک کا ہو جانا تعجب انگیز نہیں ہے، ابن عدی کہتے ہیں کہ ''جو شخص محض یادداشت سے ۴۰ ہزار حدیثیں بیان کرے اس سے بعض روایتوں میں اس طرح کے سہو وخطا کا ہو جانا کہ جس روایت کو دوسرے موقوفاً بیان کرتے ہوں وہ اس کو مرفوعاً یا جس کو لوگ مرسلاً بیان کرتے ہوں وہ اس کو موصولاً بیان کردے، بعید اور تعجب خیز نہیں کیونکہ اس کا تمام تر دارومدار حافظہ پر ہوتا ہے، باقی ابوداؤد نہ صرف میرے بلکہ دوسرے لوگوں کے نزدیک بھی متیقظ اور ثابت ہیں (تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۸۶ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۴۱۳) ہیں، امام احمد سے ایک مرتبہ کسی نے ان کی غلطیوں کا ذکر کیا تو فرمایا ان کی غلطی کو غلطی نہیں کہنا چاہیے، خطا کا الزام اس وقت ان پر درست ہو سکتا ہے جب ان سے ان کی غلطی کا تذکرہ کیا جائے اور وہ متنبہ نہ ہوں لیکن ان کا یہ حال ہے کہ ان سے جس وقت ان کی غلطی کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ فوراً متنبہ ہو جاتے اور سمجھ لیتے ہیں، (تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۶) دوسرے مؤرخین اور ائمہ تعدیل نے بھی اس قسم کی توجیہ بیان کی ہے۔

۲۔ تدلیس: دوسرا اعتراض تدلیس کا ہے، یعنی وہ ایک راوی کی روایت کو دوسرے کی طرف منسوب کر دیتے تھے، محمد بن منہال فرماتے ہیں ''ابوداؤد نے ہم سے ابن عون کے واسطہ سے ۲۰ سے کچھ زیادہ حدیثیں بیان کیں، مگر ان میں سے ایک کے علاوہ جس کو میں نہیں جانتا تھا باقی حدیثیں یزید بن زریع کی تھیں۔ (ایضاً ص ۲۵ و تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۸۴)

حافظ ابن حجر نے دو اور واقعے نقل کیے ہیں، ان میں سے ایک ان ہی محمد بن منہال کے واسطہ سے اور دوسرا امام دارقطنی کی کتاب الجرح والتعدیل سے ماخوذ ہے، ان تینوں واقعات سے خود ظاہر ہے کہ ابوداؤد نے غلطی سے روایت کا انتساب اصل راوی کے بجائے دوسرے کی جانب کر دیا ہے، خود حافظ ابن حجر نے جو ان واقعات کے ناقل ہیں، انھیں تحریف وتدلیس کے بجائے سہو ونسیان پر محمول کرنے کی کوشش کی ہے اور بجز ایک قلیل جماعت کے جمہور کا متفقہ فیصلہ یہی ہے کہ تدلیس میں کوئی عیب نہیں ہے'' سفیان ثوری جیسے بزرگ جو امیر المؤمنین فی الحدیث کہلاتے ہیں اور بہت سے اہل کوفہ بھی تدلیس کرتے تھے، ابن صلاح لکھتے ہیں:

''صحیح یہ ہے کہ مدلس جس چیز کو لفظ محتمل سے روایت کرے اور سماع واتصال کی وضاحت نہ کرے تو اس کا حکم مرسل اور اس کی قسموں جیسا ہے لیکن جس روایت کو ایسے الفاظ سے بیان کیا جائے جن سے اتصال کی صراحت ہوتی ہے جیسے سمعت، حدثنا، اخبرنا وغیرہ تو وہ مقبول اور قابل حجت ہے، صحیحین وغیرہ کتب معتبرہ میں بھی اس قسم کی بے شمار روایتیں ہیں، جیسے قتادہ، اعمش، سفیانین اور ھشام بن بشیر وغیرہ کے واسطہ سے اور یہ اس بنا پر کہ تدلیس دراصل کذب نہیں بلکہ ایک طرح کا ابہام ہے جو لفظ محتمل کی بنا پر ہوتا ہے۔'' (مقدمہ ابن صلاح ص ۳۵)

Marfat.com

امام عبدالرزاق بن ہمام

(متوفی ۲۱۱ھ)

نام ونسب:

عبدالرزاق نام، ابوبکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: عبدالرزاق بن ہمام بن نافع۔

ولادت، وطن اور خاندان:

یمن کے مشہور شہر اور پایہ تخت صنعا میں ۱۲۶ھ میں پیدا ہوئے، قبیلہ حمیر سے ولا کا تعلق تھا، صنعانی حمیری کی نسبتوں سے زیادہ مشہور اور یمنی بھی کہے جاتے تھے۔ (تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۵۴۳، ۵۴۴، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۳، مراۃ الجنان ج ۲ ص ۵۲، تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۳۱۴، بستان المحدثین ص ۴۸)

اساتذہ:

بلند پایہ محدثین اور کبار ائمہ فن میں ابن جریج، امام اوزاعی، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن ابی سبرہ، امام مالک، معتمر بن سلیمان، معمر بن راشد، ازدی اور ہیثم بن بشر واسطی وغیرہ سے اعزہ و متعلقین میں اپنے والد ہمام اور چچا وہب سے اور دوسرے علما و مشائخ میں ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ، اسماعیل بن عیاش، ایمن بن نابل، ثور بن یزید کلاعی، جعفر بن سلیمان، داؤد بن قیس فرار، زکریا بن اسحاق مکی، سعید بن بشر، سعید بن عبدالعزیز، عبدالرحمٰن بن زید اسلم، عبدالعزیز بن ابی زیاد عبداللہ بن زیاد بن سمعان، عبداللہ بن عمر عمری اور ابو معشر، نجیح سندی وغیرہ سے شرف تلمذ حاصل ہے، معمر ازدی سے خاص تعلق تھا، سات، آٹھ سال تک مستقل ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ (تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۳۱۱)

تلامذہ:

ان کے تلامذہ میں خود ان کے بعض شیوخ ابن عیینہ اور معتمر بن سلیمان معاصرین و اقران میں ابو اسامہ حماد بن سلمہ اور وکیع، ائمہ اسلام اور ناقدین حدیث میں امام احمد، اسحاق بن راہویہ، علی بن مدینی، محمد بن یحییٰ ذہلی اور یحییٰ بن معین اور دوسرے مشہور لوگوں میں ابراہیم بن موسیٰ، ابوموسیٰ، ابومسعود رازی، احمد بن صالح، احمد بن میں منصور رمادی، احمد بن یوسف سلمی، اسحاق بن ابراہیم دبری، اسحاق بن ابراہیم سعدی، اسحاق بن منصور کوسج، حجاج بن شاعر، حسن بن علی خلال، زہیر بن حرب، سلمہ بن شبیب، عبد بن حمید، عبداللہ بن محمد مسندی، عبدالرحمٰن بن بشر، عمرو الناقد، محمد بن رافع، محمد بن مہران حمال، یحییٰ بن جعفر بیکندی اور یحییٰ ابن موسیٰ وغیرہ شامل ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۳۱۱)

Marfat.com

رحلت وسفر:

مؤرخین نے تجارت کے لیے شام اور حج وزیارت کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے جانے کا ذکر کیا ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۴) مگر حدیث کی طلب وجستجو کے لیے سفر کی تصریح نہیں کی ہے، ان کے مشائخ کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے مشہور اور اہم مراکز کا سفر ضرور کیا ہوگا۔

مقبولیت ومرجعیت:

ان کے فضل وکمال اور علمی عظمت نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنا دیا تھا، مؤرخین کا بیان ہے کہ "رسول اللہ ﷺ کے بعد ان کے علاوہ کسی اور شخص کے پاس اس قدر زیادہ لوگ سفر کر کے نہیں آئے، اکثر علمائے اسلام ان کی بارگاہ کمال میں حاضر ہوئے تھے۔ (تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۵۴۳ وکتاب الانساب ورق ۳۵۵، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۴) مؤرخ یافعی نے ان کو المرتحل الیہ من الآفاق یعنی وہ شخص جس کے پاس لوگ مختلف اطراف واکناف سے آتے تھے، لکھا ہے۔
(مراۃ الجنان ج ۲ ص ۵۲)

اعتراف کمال:

علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے انکو مخزن علم بتایا ہے، ایک مرتبہ امام احمد سے پوچھا گیا کہ ان سے زیادہ بہتر اور برتر محدث کا آپ کو علم ہے؟ فرمایا نہیں! انکے معاصر ہشام کو اعتراف تھا "ہم لوگوں میں سب سے زیادہ صاحب علم عبدالرزاق ہیں۔
(مراۃ الجنان ج ۲ ص ۵۳ و ۱۱۱ و ۱۱۲)

حفظ وضبط:

ابراہیم بن عباد دیری کا بیان ہے کہ عبدالرزاق کو ۱۷ ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں، ہشام بن یوسف فرماتے ہیں "ہم لوگوں میں سب سے بہتر حافظہ ان کا تھا۔"

ثقاہت:

ان کی ثقاہت پر علما کا اتفاق ہے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ بے شمار اہل حدیث نے ان کو ثقہ اور متقن کہا ہے، ابوحاتم فرماتے ہیں، کہ "عبدالرزاق کی حدیثیں لکھے جانے اور احتجاج کے لائق ہیں" ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ ان کی حدیثیں ثابت اور معتبر ہیں، ابن حبان یعقوب بن شیبہ آجری، عجلی اور بزار وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے، اور ذہلی وغیرہ نے ان کو احادیث کے معاملہ میں بڑا متیقظ قرار دیا ہے، امام احمد سے ابن جریج کے شاگردوں میں ان کے اور برسانی کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا عبدالرزاق زیادہ ثقہ اور معتبر راوی ہیں، مشہور محدث معمر کی حدیثوں کے سب سے بڑے حافظ اور سب سے زیادہ مستند راوی یہی تھے، یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ معمر کی حدیثوں کے لیے عبدالرزاق سے زیادہ بہتر اور معتبر کوئی نہیں، امام احمد کے نزدیک معمر کی عبدالرزاق کے واسطہ سے مروی حدیثیں بصریوں کے توسط سے مروی روایات سے زیادہ بہتر ہیں اور جب ان کی کسی حدیث کے متعلق ان کے تلامذہ مختلف الرائے ہوتے تھے تو عبدالرزاق کی روایت کو قبول کرتے تھے۔
(تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۴، تہذیب ج ۲ ص ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۴، ۳۱۹، بستان المحدثین ص ۳۸)

Marfat.com

پیشہ:

عبدالرزاق تجارت پیشہ تھے اور بسلسلۂ تجارت شام جایا کرتے تھے۔

شعروسخن:

شعروسخن کا ذوق تھا، اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

فذاک زمان لعبنا بہ وھذا زمان بنا یلعب

ایک وہ زمانہ تھا جس سے ہم کھیلتے تھے اور اب یہ زمانہ ہے جو ہم سے کھیل کر رہا ہے۔

وفات:

۸۵ سال کی عمر میں جب کہ ہوش وحواس بجا نہیں رہتے تھے ۲۱۱ھ میں وفات پائی، ابن سعد کے بیان کے مطابق شوال کا مہینہ تھا۔

تصنیفات

حافظ عبدالرزاق متعدد کتابوں کے جامع ومصنف بھی تھے، مگر ان میں سے اکثر معدوم ونایاب ہیں، بعض کے نام یہ ہیں: ۱۔ جامع یا سنن عبدالرزاق، اس کی اکثر حدیثوں کی صحاح میں تخریج کی گئی ہے، ۲۔ کتاب السنن فی الفقہ، ۳۔ کتاب المغازی، ۴۔ تفسیر میں بھی ایک کتاب لکھی تھی، ۵۔ مصنف، عبدالرزاق کی سب سے زیادہ اہم اور مشہور کتاب ہے، اس کو فقہی ابواب پر مرتب کیا گیا ہے، اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ مصنف کے جو مجموعے موجود ہیں ان میں مصنف ابن ابی شیبہ کے بعد سب سے مشہور یہی ہے اور قدامت کے لحاظ سے یہ اس پر بھی فوقیت رکھتی ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے حدیث کی کتابوں کے تیسرے طبقہ میں اس کا ذکر کیا ہے، اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اکثر روایتیں ثلاثی ہیں، مصنف عبدالرزاق ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے، جرمنی اور حجاز کے کتب خانوں میں اس کے مکمل اور ناقص نسخ موجود ہیں۔

عبدالرزاق پر نقد وجرح:

بعض علمائے جرح وتعدیل نے عبدالرزاق پر نقد وجرح بھی کی ہے:

۱۔ شیعیت

ان کی جانب شیعیت کی نسبت کی جاتی ہے لیکن اس کے متعلق ان کا خود بیان ہے کہ "مجھے اس بات پر کبھی شرح صدر نہیں ہوا کہ جناب امیر کو شیخین سے افضل قرار دوں"، سلمہ بن شبیب ان کا قول نقل کرتے ہیں کہ "حضرت ابوبکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم پر خدا کی رحمت ہو، جس شخص کے دل میں ان بزرگوں کی محبت نہ ہو وہ مؤمن نہیں، مجھ کو اپنے اعمال میں سب سے زیادہ بھروسہ ان حضرات کی محبت ہی پر ہے"، ابوالازہر فرماتے ہیں کہ "عبدالرزاق نے بتایا کہ وہ شیخین کی تفضیل کے

Marfat.com

قائل تھے اور کہتے تھے کہ خود حضرت علی سے بھی یہی ثابت ہے، وہ اپنے کو شیخین سے افضل اور بہتر کہنے سے منع کرتے تھے، جناب امیر کی شان میں اس سے بڑی اور کیا گستاخی ہوگی کہ ان سے محبت رکھنے کے باوجود ان کے عقیدہ و مسلک کی مخالفت کی جائے، جس چیز کو ان کی شیعیت سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ بعض اکابر کی طرح وہ بھی حضرت علیؓ اور اہل بیتؓ کے بڑے گرویدہ تھے لیکن دوسرے صحابہؓ کے مراتب و درجات کو اہل سنت ہی کی طرح مانتے تھے، اس لیے ان کے معاصرین اور تلامذہ تک کو ان کی شیعیت کا علم نہ تھا، امام احمد سے ان کے صاحبزادہ عبداللہ نے اس کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میرے کانوں نے ان سے اس طرح کی کوئی بات نہیں سنی ہے، ان کے بارے میں مجھ کو صرف اس قدر معلوم ہے کہ وہ احادیث سے بڑا شغف رکھتے تھے' حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ان پر شیعیت کا اعتراض کیا جاتا ہے، حالانکہ اس کی حقیقت صرف اس قدر تھی کہ وہ حضرت علی سے بڑی محبت اور ان کے قاتل سے سخت نفرت کرتے تھے، علمائے جرح و تعدیل نے متفقہ طور پر ان کی توثیق کی ہے اور ان کی روایات کو تسلیم کیا ہے، کتب صحاح میں ان کی روایات اس کا ثبوت ہیں۔

۲۔ سوءِ حفظ و فتورِ عقل:

دوسری جرح یہ ہے کہ ضعیفی میں ان کی بصارت زائل ہوگئی تھی اور سوءِ حفظ اور فتورِ عقل میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن یہ علت محض آخری دور کی حدیثوں کے لیے قادح اور مانع ہو سکتی ہے اس کے پہلے کی روایات کے ثبوت و اعتبار میں اس سے فرق نہیں آتا بلکہ بعض علما نے بڑھاپے کی صرف ان ہی روایتوں کو کمزور کہا ہے جن کو وہ یادداشت سے بیان کرتے تھے۔

بعض اور بھی اعتراضات کیے گئے ہیں لیکن حافظ ابن حجر اور علامہ ذہبی نے ان کو سراسر مہمل اور بے بنیاد قرار دیا ہے۔

Marfat.com

امام اسد بن موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۱۲ھ)

نام ونسب:

اسد نام اور اسد السنہ لقب تھا، شجرۂ نسب یہ ہے: اسد بن موسیٰ بن ابراہیم بن ولید بن عبدالملک بن مروان بن حکم۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۶۸)

ولادت، وطن، خاندان:

۱۳۲ھ میں اموی حکومت کے زوال وانقراض کے سال مصر میں پیدا ہوئے، خاندان بنوامیہ سے نسبی تعلق تھا، اس لیے اموی اور مصری کہلاتے ہیں۔ (ایضاً وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۴۵)

اساتذہ وشیوخ:

ان کو جن نامور محدثین اور اکابر فضلا سے شرف تلمذ ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

ابن ابی ذئب، حماد بن سلمہ، روح، شعبہ، شیبان، عبدالعزیز بن ماجشون، لیث بن سعد، محمد بن طلحہ، مسعودی، معاویہ بن صالح اور یونس بن ابی اسحاق وغیرہ۔

تلامذہ:

بعض نامور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

احمد بن صالح مصری، رحیم، ربیع بن سلیمان مرادی، عبدالملک بن حبیب، محمد بن عبدالرحیم برقی، مقدام بن داؤد عینی، ابو یزید یوسف قراطیسی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۶۸ وتہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۶۰)

طلب حدیث کے لیے سفر:

طلب حدیث کے لیے ان کے رحلت وسفر کا ذکر بھی ملتا ہے، علامہ ذہبی وابن حماد حنبلی لکھتے ہیں: رحل فی طلب الحدیث، انہوں نے حدیث کی طلب کے لیے سفر کیا۔ (العبر ج ۱ ص ۳۶۱)

حفظ وثقاہت

اپنے زمانہ کے صاحب کمال محدثین اور ثقہ وضابط حفاظ میں شمار کیے جاتے ہیں، علمائے رجال نے الحافظ کے لقب سے ان کا تذکرہ کیا ہے، امام بخاری نے ان کو مشہور الحدیث کہا ہے اور ان کی روایتوں سے استشہاد کیا ہے، اسی طرح امام ابوداؤد

Marfat.com

اور امام نسائی نے بھی استدلال کیا ہے، امام نسائی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے، ابن یونس، ابن قانع، عجلی اور بزار وغیرہ نے بھی ان کی توثیق کی ہے، ابن حبان نے ثقات میں ان کا تذکرہ کیا ہے، خلیلی لکھتے ہیں ''مصری صالح'' یعنی اسد ابن موسیٰ مصری حدیثوں کے لیے صالح و معتبر تھے، (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۶۰) ابن حماد نے لکھا ہے کہ ''احد الثقات الاکیاس'' یعنی وہ ثقہ اور دانشمند لوگوں میں سے ایک تھے۔ (شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۷)

اتباعِ سنت:

سنت سے خاص شغف تھا، عجلی نے صاحب سنہ کہا ہے، (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۶۰) اسی لیے اسد السنہ کہلاتے تھے۔

وفات:

۸۰ سال کی عمر میں اپنے وطن مصر میں ۲۱۲ھ میں انتقال کیا۔ (خلاصہ تہذیب الکمال)

اولاد:

حافظ ابن حجر نے سعید نام کے ایک فرزند کا ذکر کیا ہے، تابعین کے فضائل و مناقب میں انکی ایک کتاب دو جلدوں میں تھی اس میں انہوں نے اپنے والد اور اس طبقہ کے دوسرے محدثین سے بکثرت روایات کی ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۶۰)

تصنیفات:

اسد السنہ صاحب تصنیفات تھے، (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۶۸) لیکن ان کی تصانیف میں صرف مسند اور کتاب الزہد کا ذکر ملتا ہے، بعض علمائے اسلام نے اس کو سب سے قدیم مسند بتایا ہے، یہ رائے درست ہو یا نہ ہو اتنا مسلّم ہے کہ مصر میں سب سے پہلے یہی مسند مرتب کی گئی، علامہ ابن عدی کا بیان ہے کہ مصر میں سب سے پہلے اسد السنہ نے مسند مرتب کی جو یحییٰ بن عبدالحمید حمانی اور مسدد ابن مسرہد بصری سے قدیم العہد تھے، (الرسالۃ المستطرفہ ص ۵۳) اس لیے یہ قدیم ترین مسانید میں ہے اور اس کی اہمیت کا سبب اس کی قدامت ہی ہے۔

ایک اعتراض کا جواب:

اسد السنہ پر بعض اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، مثلاً علامہ ابن حزم نے ان کو منکر الحدیث اور ضعیف قرار دیا ہے، ابن یونس نے لکھا ہے کہ وہ منکر حدیثیں بیان کرتے تھے لیکن ان اقوال کی حیثیت شواذ و نوادر کی ہے جو علمائے فن اور ائمہ جرح و تعدیل کی عام توثیق کے مقابلہ میں قابل اعتنا نہیں، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ مجھے ان کے کسی عیب کا حال معلوم نہیں سوائے اس کے کہ ابن حزم نے ان کو ضعیف بتایا ہے لیکن یہ تضعیف مردود اور نا قابل تسلیم ہے، (میزان الاعتدال ج ۱ ص ۹۷) وہ اور حافظ ابن حجر دونوں لکھتے ہیں: و احسب الآفۃ من غیرہ۔ (ایضاً تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۶۰) یعنی ان کی روایتوں میں جو ضعف و سقم نظر آتا ہے وہ بعد کے دوسرے رواۃ کی وجہ سے ہے۔

Marfat.com

امام عبید اللہ بن موسیٰ عبسی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۱۳ھ)

نام ونسب:

عبید اللہ نام، ابو محمد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، عبید اللہ بن موسیٰ بن ابی المختار باذام۔

(تقریب التہذیب ص ۱۷ او تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۵۰)

ولادت وخاندان ووطن:

۱۲۸ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے، قبیلہ عبس کے مولیٰ تھے، (خلاصہ تذہیب ص ۲۵۳ و تہذیب ج ۷ ص ۵۰) اس لئے کوفی اور عبسی کہلاتے ہیں لیکن علامہ سمعانی کا بیان ہے:

العبسی ــــ الی عبس بن بغیض بن ریث بن غطفان ـــ عدنان وھی القبیلۃ المشھورہ التی ینسب الیھا العبسیون بالکوفۃ۔ (کتاب الانساب ورق ۳۸۲)

عبسی عبس بن بغیض ..... عدنان کی طرف نسبت ہے اور یہ وہ مشہور قبیلہ ہے جس کی طرف کوفہ کے عبسی منسوب ہیں۔

سید مرتضیٰ زبیدی فرماتے ہیں:

عبس محلۃ بالکوفۃ قد نزلھا بنو عبس و منھا العبسیون المحدثون و من الضوابط ان من کان من اھل الکوفۃ فھو بالموحدۃ منسوب الی ھذہ المحلۃ۔ (تاج العروس ج ۴ ص ۱۸۴)

عبس کوفہ میں ایک محلہ ہے جہاں بنو عبس آ کر اترے تھے اور ان ہی میں سے عبسی محدثین ہیں اور یہ قاعدہ کلیہ میں سے ہے کہ جو راوی اہل کوفہ میں سے ہوتا ہے، وہ بائے موحدہ کے ساتھ اسی محلہ کی طرف منسوب ہے۔

ان بیانات سے عبید اللہ بن موسیٰ کا عرب نژاد ہونا اور قبیلہ عبس سے ولا کے بجائے نسبی تعلق ظاہر ہوتا ہے۔

اساتذہ:

ان کے مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابن آدم محاربی، ابن جریج، اسرائیل بن یونس، اسماعیل بن ابی خالد، الاعمش، امام اوزاعی، ایمن بن نابل، حسن بن صالح، حنظلہ بن ابی سفیان، زکریا بن ابی زائدہ، سفیان ثوری، شیبان، عبد العزیز بن سیاہ، عثمان بن اسود، محمد بن عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ، معروف بن خربوذ، موسیٰ بن عبیدہ ربذی، ہارون بن سلیمان فرا، ہشام بن عروہ، یونس بن ابی اسحاق وغیرہ۔

(التہذیب ج ۷ ص ۵۱)

Marfat.com

تلامذہ:

ان کے تلامذہ اور منتسبین کی تعداد بے شمار ہے چند نام یہ ہیں:

ابراہیم بن دینار بغدادی، ابوبکر بن شیبہ، ابوحاتم، ابوسعید اشج، احمد ابن ابراہیم دورقی، احمد بن ابی سرح رازی، احمد بن حنبل، اسحق بن منصور، اسحق بن راہویہ، حجاج بن شاعر، حسین علی بن اسود، دارمی، سفیان بن عیینہ، عباس بن العظیم منذری، عباس دوری عبداللہ بن صباح عطار، عبداللہ بن محمد مسندی، عثمان بن ابی شیبہ، قاسم بن زکریا، محمد بن حسین بن اشکاب، محمد بن سعد کاتب واقدی، محمد بن سلیمان باغندی کبیر، محمد بن عبداللہ بن نمیر، محمد بن یحییٰ ذہلی، محمود بن غیلان، وکیع بن جراح، یحییٰ بن معین، یعقوب سفیان وغیرہ۔ (ایضاً ص ۵۱، ۵۳) خالد بن حمید مہری عمر میں عبیداللہ بن موسیٰ سے بڑے تھے، ان کے باوجود انہوں نے ان سے احادیث روایت کی ہیں، ائمہ صحاح نے بالواسطہ ان سے حدیثیں بیان کی ہیں۔

(تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۵۱، ۵۲)

حفظ وثقاہت:

علمائے فن نے ان کا ''الحافظ'' کہہ کر تعارف کرایا ہے، ابن معین، ابن عدی اور عجلی وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے، ابن حبان وابن شاہین نے ثقات میں تذکرہ کیا ہے، ابوحاتم اور ابن سعد ثقہ، صدوق اور حسن الحدیث بتاتے ہیں، ابوداؤد نے انکو جائز الحدیث اور ابن قانع نے صالح الحدیث کہا ہے، اسرائیل کی مرویات کے سب سے زیادہ معتبر راوی یہی سمجھے جاتے تھے۔

(تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۵۱، ۵۲ وطبقات ابن سعد ج ۶ ص ۷۹ ۲ ومیزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۷۰)

حدیث میں درجہ:

علم حدیث میں ان کا مقام نہایت بلند تھا، علمائے فن کو ان کی اس خصوصیت کا اعتراف ہے، ان کے پاس احادیث کا نہایت وافر ذخیرہ تھا، علامہ ابن سعد نے انھیں کثیر الحدیث لکھا ہے۔

قراءت وتفسیر اور فقہ:

وہ حدیث کے علاوہ فن قراءت، تفسیر اور فقہ میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے، حمزہ بن علی بن صالح اور عیسیٰ بن عمر سے علم قراءت کی تحصیل کی تھی اور لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیتے تھے، علوم قرآنی میں مہارت کی وجہ سے صاحب قرآن کہلاتے تھے۔ عجلی کا بیان ہے کہ ''عالما بالقرآن رأسافیہ'' (قرآنی علوم کے ماہر ممتاز عالم تھے) اور فقہ میں بھی یک گونہ امتیاز رکھتے تھے، صاحب مرأۃ الجنان کا بیان ہے:

کان اماما فی الفقہ والحدیث والقرآن: یعنی عبیداللہ فقہ، حدیث اور قرآن سے متعلقہ علوم کے امام تھے۔

زہد وعبادت:

علم وفضل کی طرح زہد وتقوی اور تدین میں بھی ممتاز تھے یافعی لکھتے ہیں، موصوفا بالعبادۃ والصلاح۔ (مرأۃ الجنان ج ۲ ص ۵۷ وتہذیب التہذیب ج ۷ ص ۵۳، ۵۲) (یعنی وہ عبادت وصلاح سے متصف تھے) علامہ ذہبی کا بیان ہے، کان ذازھد وعبادۃ واتقان۔ (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۷۰) (یعنی وہ زاہد، عبادت گزار اور صاحب دیانت تھے)۔

Marfat.com

وقار:

مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ شرم وحیا کی وجہ سے ہمیشہ نگاہیں نیچی رکھے اور سر جھکائے رہتے تھے، ان کو کبھی ہنسی مذاق کی بات کرتے نہیں دیکھا گیا، نہایت باوقار طریقہ پر رہتے تھے۔

(میزان الاعتدال ج ۲ ص ۷۰ وتہذیب التہذیب ج ۷ ص ۵۲ وطبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۷۹)

عقیدہ ومسلک:

بعض لوگوں نے ان کو شیعہ لکھا ہے مگر شیعیت اس زمانہ میں تفضیلیت سمجھی جاتی تھی۔

وفات:

مامون کے عہد خلافت میں شوال کے آخر یا شروع ذیقعدہ ۲۱۳ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ (ایضاً)

تصنیفات:

عبیداللہ کی تصنیفات میں صرف مسند کا پتہ چلتا ہے، اس کی اہمیت کا سبب بھی قدامت ہے، بعض علمائے اسلام نے سب سے قدیم مسند اسی کو قرار دیا ہے لیکن عام لوگوں کا خیال ہے کہ کوفہ میں سب سے پہلے یہی مسند لکھی گئی۔ (الرسالۃ المستطرفہ، ص ۵۳) علمائے محدثین نے اس کی قدامت کی وجہ سے اس کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ایک شبہ کا جواب:

بعض ائمہ جرح وتعدیل نے شیعیت کی وجہ سے ان کی تضعیف کی ہے، امام احمد اور بعض دوسرے علماء نے ان کو صاحب تخلیط اور منکر الحدیث قرار دیا ہے، عثمان بن ابی شیبہ ان کی ثقاہت وصداقت کے معترف ہونے کے باوجود کہتے ہیں کہ وہ سفیان ثوری کی حدیثوں میں قبیح قسم کا اضطراب کرتے تھے لیکن مجموعی طور پر ان کی توثیق کی گئی ہے، علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ ”وہ امام بخاری کے شیوخ میں ہیں اور بذات خود نہایت ثقہ بزرگ تھے، البتہ شیعیت سے متہم کیے جاتے تھے“۔ ائمہ صحاح کا ان سے روایت کرنا ان کے ضبط وثقاہت کا بڑا ثبوت ہے۔

Marfat.com

امام عبداللہ بن زبیر حمیدی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۱۹ھ)

نام ونسب:

عبداللہ نام، ابوبکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: عبداللہ بن زبیر بن عیسیٰ ابن عبیداللہ۔

خاندان ووطن:

ان کا خاندان عربی النسل اور وطن مکہ معظمہ تھا، وہ حمیدی، اسدی، زبیری، قریشی، اور مکی کی نسبتوں سے مشہور ہیں، سب سے مشہور نسبت قریش کے مشہور قبیلہ اسد کے ایک معزز فرد حمید کی جانب ہے۔ (کتاب الانساب ورق ۳۲) سن ولادت کا پتہ نہیں چلتا

اساتذہ:

حمیدی کے بعض مشہور شیوخ کے نام حسب ذیل ہیں:

ابراہیم بن سعد، بشر بن بکر تنیسی، سفیان بن عیینہ، عبدالعزیز بن حازم، فضیل ابن عیاض، محمد بن ادریس شافعی، مروان بن معاویہ، مسلم بن خالد وکیع اور ولید بن مسلم وغیرہ۔ ان بزرگوں میں سفیان بن عیینہ اور امام شافعیؒ سے ان کو بڑا ہی خاص تعلق تھا، ۱۹، ۲۰ سال تک سفیان کی خدمت میں رہنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا، ان کی دس ہزار حدیثیں حمیدی کو زبانی یاد تھیں، ان کے مرویات کے سب سے زیادہ معتبر اور قابل وثوق راوی سمجھے جاتے تھے، امام شافعیؒ کی صحبت میں بھی ایک عرصہ تک رہے، ان کے ہمراہ مصر تشریف لے گئے اور فقہ کی تکمیل وتخریج کی۔

تلامذہ:

حمیدی کے اکثر تلامذہ فن حدیث کے ممتاز ماہرین تھے، بعض کے نام یہ ہیں:

احمد بن ازہر نیشاپوری، اسماعیل بن عبداللہ سمویہ، بشر بن موسیٰ، سلمہ بن شبیب، ابوزرعہ عبیداللہ بن عبدالکریم رازی، عبید اللہ بن فضالہ نسائی، محمد بن احمد قرشی، ابوبکر محمد بن ادریس، ابوحاتم محمد بن ادریس، محمد بن اسماعیل بخاری، محمد بن سنجر، محمد بن عبد اللہ بن عبدالرحیم برقی، محمد بن یحییٰ ذہلی، ابوالعباس محمد بن یونس کدیمی، محمد بن یونس نسائی، ہارون حمال، یعقوب بن شیبہ، یعقوب بن سفیان اور یوسف بن موسیٰ قطان، امام بخاری ان کے خاص فیض یافتہ لوگوں میں تھے، اپنی صحیح میں ۷۵ حدیثیں ان کے واسطہ سے روایت کی ہیں۔ (فتح الباری ص ۱۱)

Marfat.com

فضل وکمال:

ان کے علم وفضل اور امامت پر محدثین اور ارباب فن کا اتفاق ہے، امام احمد اور امام بخاری نے ان کو امام کہا ہے، اسحاق بن راہویہ کا بیان ہے کہ ''ابوعبیدہ، شافعی اور حمیدی ہمارے زمانہ میں امام ہیں، صاحب شذرات لکھتے ہیں کہ وہ مکہ کے مشہور عالم ومحدث اور امام حجت تھے، ذہبی فرماتے ہیں کہ ''حمیدی مشہور اور کبار ائمہ دین میں تھے، ان کا خود بیان ہے کہ عراق میں احمد، خراسان میں اسحاق اور حجاز میں مجھ سے سبقت لے جانے والا کوئی دوسرا نہیں۔

ضبط وثقاہت:

ان کی قوت حافظہ اور ثقاہت بہت مسلّم ہے، امام شافعی کو ان کے غیر معمولی حافظہ کا اعتراف تھا، مؤرخین نے ان کو کثیر الحدیث لکھا ہے یعنی ان کے علم وحفظ میں احادیث کا وافر ذخیرہ اور وسیع سرمایہ محفوظ تھا، ابن سعد، حبان، حاکم اور ابوحاتم وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے، (طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۶۳، ۲۶۴ و تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۱۶ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲، ۳) امام بخاری کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ ان کی روایت ملنے کے بعد وہ دوسروں کی مرویات کی پروا نہیں کرتے تھے۔

فقہ واجتہاد:

فقہ وافتا میں بھی ان کا پایہ نہایت بلند تھا، امام شافعی سے اس کی تحصیل کی تھی اور امام بخاری حدیث کی طرح فقہ میں بھی ان کے شاگرد تھے اور ان سے اس کی تحصیل کی تھی، مکہ کے فقیہ ومفتی کی حیثیت سے حمیدی کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، مصر سے واپسی کے بعد وہ یہاں فقہ وافتا کا کام عمر بھر انجام دیتے رہے، صاحب مستدرک لکھتے ہیں وہ مکہ کے مشہور عالم ومحدث اور مفتی تھے، حدیث وفقہ میں ان کا وہی درجہ اور مرتبہ تھا جو امام احمد کا عراق میں تھا۔

زہد وورع:

ورع وتقویٰ اور دیانت وپاکبازی میں بھی ممتاز تھے، ابن عدی نے ان کی نیکی اور پاکبازی کا ذکر کیا ہے، ابن حبان نے ان کو صاحب دین وفضیلت لکھا ہے۔

اتباع سنت:

اتباع سنت میں بڑا اہتمام تھا، ابن حبان نے ان کو صاحب سنت بتایا ہے۔ (تہذیب التہذیب ج ۵ ج ۲۱۶، وحسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۴۶) احادیث وآثار سے شدت تمسک کی بناء پر وہ اہل رائے کو ناپسند کرتے تھے، اس کا اندازہ ان کے رسالہ اصول السنہ سے ہوتا ہے۔

عقیدہ ومسلک:

عقیدہ وعمل کے لحاظ سے وہ محدثین اور سلف کے مسلک پر عامل تھے، رسالہ اصول السنہ سے ان کے بعض عقائد واعمال کے متعلق ان کا نقطہ نظر معلوم ہوتا ہے۔

Marfat.com

ایمان:

قول وعمل دونوں کا نام ہے، اس میں کمی وبیشی ہوتی ہے، سفیان بن عیینہ کے سامنے ان کے بھائی ابراہیم نے کہا کہ ''ایمان کم نہیں ہوتا'' تو وہ غضبناک ہو گئے اور فرمایا کہ تم سچے ہو، ان مسائل کے بارے میں لب کشائی نہ کرو، ایمان کم بھی ہوتا ہے اور سلب بھی ہو جاتا ہے' ایمان وعمل کا اعتبار نیت پر موقوف ہے۔

تقدیر:

تقدیر کے خیر وشر ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے، یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ جو کچھ ہوا ہے اس کا ہونا ضروری تھا اور نہ ہونا ناممکن تھا اور جو کچھ نہیں ہوا ہے اس کا نہ ہونا ممکن نہیں تھا۔ قرآن اللہ کا کلام ہے جو لوگ اس کو مخلوق کہتے وہ مبتدع اور سلف صالحین کے مسلک سے منحرف ہیں۔

رویت:

موت کے بعد مؤمنین دیدارِ الٰہی سے مشرف ہوں گے۔

صفاتِ الٰہی:

قرآن کی وہ آیتیں جن میں اللہ کے ید ویمین اور استوا وتمکن وغیرہ کا ذکر ہے، یا اس قسم کی جو حدیثیں ہیں ان کے مجرد بیان پر اکتفا اور توقف کرنا چاہیے، نہ ان میں کسی اضافہ کا ہم کو حق ہے اور نہ تشریح وتفسیر کا، اس قسم کی آیات واحادیث میں بحث وکلام کرنے والے اہل باطل اور فرقہ جہمیہ ومعطلہ میں شامل ہیں۔

مرتکبین کبائر:

کبائر کے مرتکبین کو کافر سمجھنا خوارج کا عقیدہ ہے، گناہ کرنے سے انسان کافر نہیں ہوتا۔

احترام صحابہ رضی اللہ عنہم:

مسلمانوں کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے دعا واستغفار کرنا چاہیے، قرآن مجید میں ہے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ (الحشر:۱۰)

اے رب بخش دے ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے پہلے داخل ہوئے ایمان میں اور نہ رکھ ہمارے دلوں میں بیر ایمان والوں کا۔

اگر کوئی شخص ایک صحابی کو بھی برا بھلا کہے تو وہ جادۂ سنت سے منحرف ہے۔

(اصول السنہ بر خاتمہ مسند حمیدی مرتبہ مولانا حبیب الرحمان الاعظمی ج ۲ ص ۵۴۶ تا ۵۴۸)

وفات:

اپنے وطن مکہ میں ربیع الاول ۲۱۹ھ میں وفات پائی، ۲۲۰ھ بھی سنہ وفات بتایا جاتا ہے۔

Marfat.com

تصنیفات:

رسالہ اصول السنۃ۔ کے علاوہ حمیدی کی دوسری کتابوں کے نام یہ ہیں:

ا۔ کتاب الرد علی النعمان، ۲۔ کتاب التفسیر۔ (مقدمہ مسند ج ا ص بحوالہ جرح وتعدیل ج اول ق ا ص ۴۰)

۳۔ مسند: حمیدی کی یہ سب سے زیادہ مشہور کتاب ہے جو گیارہ اجزا اور ۱۲۹۳ حدیثوں پر مشتمل ہے۔ (الرسالۃ المستطرفہ ص ۵۷) ان کے رواۃ میں بشر بن موسیٰ اسدی بڑے ثقہ اور نامور محدث تھے، بعض صحابہؓ کے مرویات اس میں شامل نہیں ہو سکے، اس کی اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:

1. اس کا شمار قدیم ترین کتب مسانید میں شامل ہوتا ہے اور اغلب یہ ہے کہ مکہ میں سب سے پہلے یہی مسند مرتب کی گئی تھی۔
2. اکثر روایات مرفوع ہیں، موقوف روایتیں کم ہیں۔
3. صحابہؓ وتابعینؒ کے آثار کا حصہ بھی اس میں شامل ہے۔
4. احادیث کے نقل وروایت ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ ایک ماہر فن کی طرح ان کے متعلق مختلف النوع معلومات بھی درج ہیں۔

مسند کے مخطوطے دار العلوم دیو بند، حیدر آباد کے مکتبہ سعیدیہ وجامعہ عثمانیہ اور دمشق کے دار الکتب الظاہریہ میں موجود تھے، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے ان نسخوں کی مدد سے مسند کو پہلی مرتبہ ۱۹۶۳ء میں تصحیح وتحشیہ کے بعد دو جلدوں میں شائع کیا ہے، خاتمہ پر رسالہ اصول السنہ بھی دیدیا ہے، حواشی میں مشکل الفاظ کی تشریح، اختلاف نسخ اور مختلف کتب حدیث سے اس کی حدیثوں کے باہمی اختلاف ومطابقت وغیرہ کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے مطالب عالیہ میں مسند کے زوائد بیان کئے ہیں۔

(مقدمہ مسند حمیدی ص ۲، ۳، ۴، ۹، ۲۰، ۲۱)

Marfat.com

امام سعید بن منصور رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۲۷ھ)

نام ونسب:

سعید نام اور ابوعثمان کنیت تھی، سلسلہ نسب یہ ہے: سعید بن منصور، ابن شعبہ۔

وطن:

سعید کا سن ولادت نہیں معلوم ہو سکا اور وطن کے متعلق بھی اختلاف ہے، ایک روایت کے مطابق وہ جوزجان میں پیدا ہوئے اور بلخ میں نشوونما پائی، زیادہ مشہور روایت یہ ہے کہ ان کا وطن مرو تھا اور بلخ میں بودوباش اختیار کر لی تھی، طالقان کو بھی ان کا مولد بتایا جاتا ہے، اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ مرو، طالقان اور جوزجان سب بلخ ہی کے قرب ونواح میں تھوڑے سے فاصلہ پر واقع تھے، بلخ جو بعد میں ان کی مستقل قیام گاہ بن گیا تھا خراسان کا مشہور ومردم خیز شہر اور ایک عرصہ تک اس کا پایہ تخت رہا ہے، ان مقامات کی نسبت سے وہ مروزی، طالقانی، بلخی اور خراسانی مشہور ہیں۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵، تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۸۹ خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۱۴۳ کتاب الانساب ورق ۸۹، بستان المحدثین ص ۴۸)

اساتذہ:

سعد بن منصور نے نہایت مقدس علمائے اسلام اور برگزیدہ محدثین سے کسب فیض کیا تھا، مشہور محدث اسماعیل بن علیہ کے مرویات کے سب سے بڑے ناقل ہونے کی وجہ سے ان کے روایہ کہلاتے تھے، امام مالک سے انہوں نے موطا کے علاوہ بہت سی حدیثوں کا سماع کیا تھا، لیث بن سعد اور سفیان بن عیینہ سے بھی ان کو روایت کرنے کا شرف حاصل ہے، دوسرے مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوقدامہ حارث بن عبیدہ، حماد بن زید، داؤد بن عبدالرحمٰن بن ابی الزناد، ابوالاحوص سلام بن سلیم، شریک بن عبداللہ، ابو شہاب عبدربہ بن قانع، عبدالعزیز بن ابی حازم، مسلمہ بن دینار، عبیداللہ بن ایاد، فلیح بن سلیمان، مہدی بن میمون، ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن، ہشیم بن بشیر اور ابوعوانہ وضاح بن عبداللہ بزار وغیرہ۔

تلامذہ:

اساتذہ کی طرح ان کے تلامذہ میں بھی نامور علماء محدثین شامل ہیں، امام احمد، امام مسلم اور ابوداؤد ان کے حلقہ فیض میں داخل تھے، صحاح کی دوسری کتابوں میں بھی سعید کے مرویات بالواسطہ شامل کیے گئے ہیں، چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

Marfat.com

ابوثور ابراہیم بن خالد کلبی، ابوبکر اثرم، ابوشعیب حرانی احمد بن خلید حلبی، بشر بن موسیٰ، حرب بن اسماعیل کرمانی، حسن بن محمد زعفرانی، عباس بن عبداللہ سندی، عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی، ابوزرعہ عبدالرحمٰن بن عمرو دمشقی، ابوزرعہ عبیداللہ بن کریم رازی، عمر بن منصور نسائی، ابوحاتم محمد بن ادریس، محمد بن علی بن میمون رقی، ابوعبداللہ محمد بن یحییٰ ذہلی اور یحییٰ بن موسیٰ وغیرہ۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵ تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۸۹، خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۱۴۳ کتاب الانساب ورق ۸۹، بستان المحدثین ص ۴۸)

رحلت وسفر:

حدیث کی طلب وجستجو میں ان کے کثرت سفر کو مزی نے و کان حافظا جوالاً اور علامہ ابن حجر نے طاف البلاد کے الفاظ سے بیان کیا ہے۔ (خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۱۴۳ و تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۸۹)

عظمت:

سعید بن منصور کی علمی عظمت کا اندازہ ان کے اساتذہ اور تلامذہ کے ناموں سے ظاہر ہے، امام احمدؒ ان کے بڑے قدرداں اور مداح تھے اور ہمیشہ عزت واحترام کے ساتھ ان کا ذکر کرتے تھے، محمد بن عبدالرحیم جب ان کی روایت بیان کرتے تو تعریف کرتے اور کہتے: حدثنا سعید و کان ثبتا۔ (تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۸۹)

حفظ وثقاہت:

علمائے فن ان کے حفظ وثقاہت کے بھی معترف تھے، یحییٰ بن حسان دوسرے محدثین کے مقابلہ میں ان کی فضیلت اور حفظ وضبط کے بڑے قائل تھے، حرب کرمانی کا بیان ہے کہ "سعید نے ہم کو دس ہزار حدیثیں زبانی املا کرائیں، امام احمد ان کو سچا اور صاحب فضل وکمال بتاتے ہیں، ابوحاتم، ابن حبان، ابن نمیر، ابن خراش، ابن قانع اور مسلمہ بن قاسم وغیرہ نے ان کی توثیق وتعدیل کی ہے، خلیلی کہتے ہیں کہ ان کی ثقاہت پر اتفاق ہے، حافظ ذہبی نے ان کو الحافظ الثقۃ اور الحافظ الامام الحجۃ لکھا ہے، ابن عماد کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور مشہور محدثین میں تھے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵ تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۸۹، ۹۰ ومیزان الاعتدال ج ۱ ص ۳۹۱ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۶۲)

وفات:

آخر عمر میں انہوں نے مکہ معظمہ میں مستقل قیام کر لیا تھا اور یہیں تقریباً ۸۹ سال کی عمر میں مشہور اور صحیح روایت کے مطابق ۲۲۷ھ میں وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد قسم اول جز ۵ ص ۳۶۷، العبر فی خبر من غبر ج ۱ ص ۳۹۹)

تصنیفات:

سعید بن منصور صاحب تصانیف تھے (تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۹۰) مگر ان کی کتابیں معدوم ہیں، صرف ایک کتاب سنن کا ذکر ملتا ہے لیکن یہ بھی طبع نہیں ہوئی ہے، سنن کو انہوں نے آخر عمر میں مکہ معظمہ میں قیام کے زمانہ میں مرتب کیا تھا۔ (الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۳) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بڑی چھان بین محنت واحتیاط اور حذف وترمیم کے بعد مرتب کی گئی تھی، اس لئے نہایت مستند اور معتبر ہوگی، احمد بن نجدہ اور محمد بن علی بن صائغ نے اس کی روایت کی ہے، اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ

Marfat.com

ہے کہ اکثر روایتیں ثلاثی ہیں (تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۸۹، بستان المحدثین ص ۴۷) اور اہمیت کا حال یہ ہے کہ (جمع فیہ ما تجمع غیرہ) سنن ابی سعید میں جو کچھ اکٹھا کیا گیا، دوسرے مجموعہ احادیث ان سے خالی ہیں، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:

صاحب السنن المشهورة التى لا يشاركه فيها الا القليل۔

(خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۱۴۳ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۹۹)

وہ اس مشہور سنن کے مصنف ہیں جو بے نظیر اور عدیم المثال ہے۔

نقد و جرح:

سعید بن منصور کے متعلق علامہ ذہبی نے یعقوب فسوی سے روایت کی ہے کہ ''وہ اپنی غلطی جان لینے کے بعد بھی اس سے رجوع نہیں کرتے تھے لیکن ان کی عام مدح و توصیف کے متعلق اتنے کثرت سے اقوال منقول ہیں کہ ان کے مقابلہ میں اگر فسوی کا قول صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں اور اس سے سعید کے مرتبہ و عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ''ایسا وہ اس لیے کرتے تھے کہ ان کو اپنی کتاب کی صداقت و صحت پر پورا اعتماد اور وثوق تھا''

(میزان الاعتدال ج ۱ ص ۳۹۱ و تقریب التہذیب ص ۹۴)

Marfat.com

امام محمد بن صباح دُولابی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۲۷ھ)

نام ونسب:

نام محمد، ابوجعفر کنیت، بزاز لقب اور والد کا نام صباح ہے، اس سے زیادہ نسب نامہ کی تفصیل نہیں معلوم ہو سکی۔

ولادت:

مؤرخین اور علمائے طبقات ورجال نے ان کے سن ولادت کی تصریح نہیں کی ہے لیکن ان کی وفات ۲۲۷ھ میں ہوئی اور خطیب نے لکھا ہے کہ اس وقت ستر سال سے زیادہ عمر تھی، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ وفات کے وقت ۷۷ سال کے تھے، (تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۷ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۴۷ و تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۳۱) اس اعتبار سے وہ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

خاندان:

ان کے خاندان کا قبیلہ مزنیہ سے ولاء کا تعلق تھا، (تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۵ و تہذیب ج ۹ ص ۲۲۹) اسی بنا پر مزنی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

وطن:

ان کی نسبت دولابی کے متعلق اختلاف ہے، بعض لوگوں کے نزدیک دولاب رے کے ایک گاؤں کا نام ہے جہاں وہ پیدا ہوئے تھے۔ (میزان ج ۳ ص ۴۷ و تہذیب ج ۹ ص ۲۳۰) علامہ سمعانی کا خیال ہے کہ دولاب رہٹ اور چرخی کو کہتے ہیں جو شخص اس کا پیشہ کرتا ہو یا جس کے پاس چرخی ہو اسے دولابی کہا جاتا ہے، (کتاب الانساب ورق ۲۳۴) ابوجعفر محمد بن صباح کو بھی اسی بنا پر دولابی کہا جاتا ہے، یاقوت حموی کے نزدیک دولاب نام کے متعدد مقامات تھے، ابوجعفر دولابی کا تعلق دولاب مبارک سے تھا جو بغداد کے مشرقی جانب واقع ہے، (معجم البلدان ج ۴ ص ۱۰۳) آخر میں انہوں نے بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

(تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۵ و تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۲۹ و ص ۲۳۰)

اساتذہ:

ابوجعفر دولابی نے نہایت برگزیدہ اور جلیل القدر محدثین سے احادیث کی روایت کی ہے، بعض شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن سعد، ابن ابی عبیدہ حداد، اسماعیل بن جعفر، اسماعیل بن زکریا خلقانی، اسماعیل بن علیہ، حفص بن غیاث،

Marfat.com

خالد بن عبداللہ واسطی، سعید بن محمد وراق، سفیان بن عیینہ، قاضی شریک بن عبداللہ، عبدالرحمٰن بن ابی الزناد، عبداللہ بن مبارک، عمر بن یونس یمامی، ابوقطن عمرو بن ہشیم، فضل بن موسیٰ سینانی، ہشیم بن بشیر، ولید بن ابی ثور، ولید بن مسلم، یزید بن ہارون، یوسف بن یعقوب، ماجشون وغیرہ۔

تلامذہ:

ان کے تلامذہ میں بھی ممتاز محدثین شامل ہیں، چند کے نام ہیں:

ابراہیم حربی، ابراہیم بن ہانی، ابراہیم بن یعقوب جوز جانی، ابن ابی خثیمہ، ابن ابی الدنیا، ابوحاتم رازی، ابوزرعہ دمشقی ابوزرعہ رازی، ابوقدامہ سرخسی، احمد بن حنبل، ابویعلی احمد بن علی موصلی، احمد بن محمد بن صباح، احمد بن منصور رمادی، احمد بن یحییٰ حلوانی، اسماعیل سمویہ، حسن بن علی خلال، حسن بن محمد صباح زعفرانی، داؤد بن سلیمان دقاق، عبداللہ بن حنبل، عبدالملک بن عبدالحمید میمونی، عثمان بن سعید دارمی، عیسیٰ بن عبداللہ طیالسی، فضل بن سہل اعرج، ابوالعلا محمد بن احمد جعفر، محمد بن بشیر بن مطر، محمد بن غالب تمتام، محمد بن یحییٰ حرانی، محمد بن یحییٰ ذہلی، یحییٰ بن معین وغیرہ۔

(تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۵، ۳۶۶ و تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۲۹، ۲۳۰)

ائمہ صحاح اور اصحاب سنن میں، امام بخاری، امام مسلم اور ابوداؤد نے براہ راست اور دوسرے ائمہ نے امام بخاری کے واسطے سے ان سے روایت کی ہے، صحیح بخاری میں ۱۲ اور صحیح مسلم میں ۲۰ حدیثیں ان کے واسطہ سے مروی ہیں۔

(تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۳۰، ۲۳۱)

حفظ وثقاہت:

علمائے فن نے باتفاق ان کو ثقہ وضابط قرار دیا ہے، امام احمد فرماتے تھے کہ وہ ہمارے شیخ اور نہایت ثقہ بزرگ ہیں، ابن معین کا بیان ہے کہ دولابی ثقہ و مامون تھے، احمد عجلی نے ان کو ثقہ، ابوحاتم نے ثقہ، قابل حجت اور مستند کہا ہے اور ابن حبان نے ثقات میں شامل کیا ہے، تمتام جب ان کے واسطہ سے حدیث بیان کرتے تو کہتے ہم سے محمد بن صباح دولابی نے جو ثقہ و مامون تھے، روایت کی ہے، یعقوب بن شیبہ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ، صاحب حدیث اور ہشیم کے مرویات کے سب سے زیادہ ممتاز عالم تھے، سلمہ نے ان کو ثقہ اور مشہور محدث اور ذہبی نے ثقہ وحجت قرار دیا ہے۔

(ایضاً و تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۶ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۷۴)

زہد وتقویٰ:

تدین وتقویٰ اور زہد وصلاح میں بھی نہایت ممتاز تھے، علامہ ابن عدی فرماتے ہیں کہ وہ بڑے صالح اور نیک بزرگ تھے۔

(تہذیب ج ۹ ص ۲۳۱)

عزت واحترام:

علمی ودینی حیثیت سے ان کی شخصیت اتنی ممتاز تھی کہ علما وصلحا کے ہر طبقہ میں یکساں مقبول تھے، امام احمد ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ (ایضاً ص ۲۳۰)

Marfat.com

وفات:

تقریباً ۷۷ سال کی عمر میں بغداد میں محرم ۲۲۷ھ میں انتقال کیا۔

(تہذیب ص ۲۳۱ و میزان ج ۳ ص ۴۷ و تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۶، ۳۶۷)

اولاد:

مؤرخین نے ان کے ایک صاحبزادے احمد کا ضمناً تذکرہ کیا ہے، جو بڑے صاحب کمال محدث تھے۔

(کتاب الانساب ورق ۲۳۴ و تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۶)

تصنیفات:

ان کی تصنیفات میں ایک مجموعہ سنن کا مؤرخین اور علمائے طبقات ورجال نے ذکر کیا ہے، (البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۹۹) ذہبی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سنن واحکام سے متعلقہ روایات کا یہ ایک مختصر مگر منتخب اور مستند مجموعہ تھا۔ (العبر ج ۱ ص ۳۹۹)

Marfat.com

امام یحییٰ بن عبدالحمید حمانی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۲۸ھ)

نام ونسب:

یحییٰ نام ابوزکریا کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: یحییٰ بن عبدالحمید بن عبدالرحمٰن ابن میمون بن عبدالحمید۔
(تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۶۷)

حافظ ابن حجر نے عبدالرحمٰن اور آخری عبدالحمید کے بجائے عبداللہ اور عبدالرحمٰن لکھا ہے۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۴۳)

یحییٰ کے والد بھی اکابر محدثین میں شمار کیے جاتے ہیں، اور ان کے پردادا میمون کا لقب کشمین تھا۔
(تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۶۷ ومقدمہ فتح الباری ص ۴۱۵)

خاندان ووطن:

قبیلہ حمان سے نسبی تعلق رکھتے تھے، یہ قبیلہ کوفہ میں آباد ہو گیا تھا جو یحییٰ کا وطن ہے اسی لئے وہ کوفی اور حمانی کی نسبتوں سے مشہور ہیں۔

پیدائش:

ان کے سن ولادت کی تعیین وتصریح کتابوں میں نہیں ہے، قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۵ھ اور ۱۶۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔

اساتذہ:

اپنے والد ماجد عبدالحمید کے علاوہ انہوں نے جن نامور محدثین سے اکتساب فیض کیا تھا ان کے نام حسب ذیل ہیں۔
ابراہیم بن سعد، ابواسرائیل ملائی، ابوبکر بن عیاش، ابوخالد الاحمر، ابوعوانہ، ابومعاویہ ضریر، جریر بن عبدالحمید، جعفر بن سلیمان، حکیم بن ظہیر، حماد بن زید، خالد بن عبداللہ، سفیان بن عیینہ، سلیمان بن بلال، شریک بن عبداللہ، عبدالرحمٰن بن زید، عبدالرحمٰن بن غسیل، عبداللہ بن مبارک، عبدالواحد بن زیاد، قیس بن ربیع، ہشام، وکیع اور یحییٰ بن یمان وغیرہ۔

تلامذہ:

ان کے حلقۂ فیض سے جو اہم اور جلیل القدر محدثین وابستہ تھے، ان کے نام یہ ہیں:
ابوبکر بن ابی الدنیا، ابوحاتم، ابوقلابہ قاشی، ابویعلی موصلی، احمد بن یحییٰ حلوانی، حمدان بن علی وراق، عبداللہ بن احمد دورقی، عبداللہ بن محمد بغوی، عثمان بن خرزاذ، علی بن عبدالعزیز بغوی، تمیم ابن عباد ترمذی، محمد بن ابراہیم بوشنجی، محمد بن ایوب، محمد بن

Marfat.com

حسین و داعی، محمد بن عبید بن ابی الاسد، موسیٰ بن اسحاق انصاری اور موسیٰ بن ہارون وغیرہ۔
(کتاب الانساب ص ۱۷۵ و تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۶۷، ۱۶۸ و تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۴۳)

سفر: طلب حدیث کے لئے ان کے سفر و سیاحت کا بھی ذکر ملتا ہے، خطیب نے بغداد جانے کی تصریح کی ہے۔

حدیث میں درجہ:

وہ بلند پایہ اور نامور محدث تھے، ان کے اساتذہ میں سفیان بن عیینہ وغیرہ ان کے علم و فضل اور حدیث میں کمال کے معترف تھے، علامہ ذہبی اور خطیب نے احد ارکان الحدیث اور احد المحدثین کے الفاظ سے ان کا تعارف کرایا ہے۔
(تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۶۸ و العبر ج ۱ ص ۴۰۴)

حافظہ: ان کی قوت حفظ غیر معمولی تھی، ائمہ فن نے الحافظ، الحافظ الکبیر و کان من اعالی الحفاظ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱ و خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۴۲۵) وغیرہ الفاظ سے انھیں موسوم کیا ہے، ابن معین کا بیان ہے کہ کوفہ میں ان سے بڑا کوئی حافظ حدیث نہیں تھا، شریک کے مرویات خاص طور پر انھیں حفظ تھے، ایک روایت کے مطابق ان کی سات ہزار حدیثوں کا ذخیرہ یحییٰ حمانی کے پاس تھا۔

ثقاہت:

اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، ابن عدی فرماتے ہیں: لا باس بہ یعنی ان کی روایات میں کوئی مضائقہ نہیں، ابن معین نے ان کی ثقاہت کا اعتراف کیا ہے ایک دفعہ فرمایا کہ وہ صدوق تھے، محض حسد کی وجہ سے ان میں کلام کیا گیا ہے لیکن امام نسائی نے انھیں ضعیف اور امام احمد ابن مدینی، ذہلی اور علامہ ابن سعد وغیرہ ائمہ نے ان پر جرح بھی کی ہے۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۴۴ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۹۶) لیکن ان کی اکثریت ان کو ثقہ اور حجت مانتی ہے، امام بخاری تک نے اپنی صحیح میں فضائل قرآن کے ابواب میں ان کے واسطہ سے ایک روایت نقل کی ہے۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۴۱۵)

وفات:

مشہور روایت کے مطابق ان کا انتقال رمضان ۲۲۸ھ میں ہوا (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱ و خلاصہ تذہیب ص ۴۲۵، تہذیب ج ۱۱ ص ۲۴۸) لیکن ابن سعد کا بیان ہے کہ ۲۳۰ھ میں وفات پائی۔ (طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۸۷)

تصنیفات:

ان کی ایک تصنیف مسند کا پتہ چلتا ہے، جو بہت ضخیم تھی۔ (کتاب الانساب ورق ۱۷۵) ابن عدی لکھتے تھے:

ولہ مسند صالح ولم ار شیئا منکرا فی مسندہ۔ (خلاصہ تذہیب ص ۴۲۵ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۹۶)

مسند حمانی نہایت عمدہ اور بہتر ہے مجھے اس کے اندر کوئی منکر حدیث نظر نہیں آئی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کوفہ میں سب سے پہلے یہی مسند مرتب کی گئی، جو صحیح نہیں معلوم ہوتا، عبید اللہ ابن موسیٰ بھی صاحب مسند ہیں، ان کے اور حمانی کے سن وفات میں کم از کم پندرہ سال کا تفاوت ہے، اس لئے غالب گمان یہی ہے کہ انہوں نے حمانی سے پہلے مسند مرتب کی ہوگی لیکن مسند حمانی کی قدامت بھی مسلم ہے۔

Marfat.com

امام مسدد بن مسرہد رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۲۸ھ)

نام ونسب:

ابوالحسن کنیت، مسدد لقب اور عبدالملک نام تھا، نسب نامہ یہ ہے، مسدد بن مسرہد ابن مسربل بن ماسک بن حرو بن یزید بن شبیب بن صلیب بن مالک بن اسد بن شریک۔

دوسرا نسب نامہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے: مسدد بن مسرہد بن مسربل بن مغربل بن مرعبل ابن مطربل بن ارندل بن سرندل بن عرندل بن ماسک بن مستورد۔ (شذرات الذہب ج ۲ ص ۶۶)

علامہ سمعانی نے دونوں نسب نامے نقل کر کے پہلے کو صحیح بتایا ہے۔ (کتاب الانساب ورق ۳۲)

ولادت وخاندان:

نسبی تعلق عرب کے مشہور قبیلہ بنواسد سے اور وطن بصرہ ہے، اسی لئے اسدی اور بصری کہلاتے ہیں، (تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۰۷) سن ولادت کی مورخین اور علمائے طبقات نے کوئی تصریح نہیں کی ہے، اس لئے اس کی تعیین دشوار ہے، قیاس ہے کہ ۱۵۵ھ یا اس سے کچھ پہلے یا بعد میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

اساتذہ وشیوخ:

ان کے بعض اکابر شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوالاحوص، ابوعوانہ اسمٰعیل بن علیہ، باذام بن عمرو، جراح بن ملیح، جعفر بن سلیمان، بشر بن مفضل، جویریہ بن اسماء، حماد بن زید، حمید بن اسود، خالد بن حارث، خالد بن عبداللہ واسطی، عبداللہ بن یحییٰ بن ابی کثیر عبدالواحد بن زیاد، عبدالوارث بن سعید، عیسیٰ بن یونس، فضیل بن عیاض، قطان، محمد بن جابر یمامی، معتمر بن سلیمان، مہدی بن میمون وکیع ہشیم، یزید بن زریع اور یوسف بن ماجشون وغیرہ۔ (تہذیب ج ۱۰ ص ۱۰۷)

تلامذہ:

بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں: ابراہیم بن یعقوب جوزجانی، ابوحاتم رازی، ابوخلیفہ جمی، ابوزرعہ رازی، احمد بن محمد بن مدریہ، قاضی اسمٰعیل بن اسحٰق، حسن بن احمد کرمانی، حماد بن اسحٰق، محمد بن سعید وندانی، معاذ بن مثنی، یعقوب بن شیبہ، قاضی یوسف بن یعقوب وغیرہ۔

ائمہ صحاح میں امام بخاریؒ نے بلا واسطہ اور امام ترمذیؒ نے بالواسطہ اور امام ابوداؤد نے دونوں طریقوں پر ان سے

Marfat.com

روایت کی ہے۔ (ایضاً ص ۱۰۷، ۱۰۸)

حدیث میں امتیاز:

مسدد بن مسرہد کے اساتذہ و تلامذہ کی عظمت سے خود ان کے مقام و مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے، ان کا اپنے زمانہ کے اکابر فضلاء اور بصرہ کے نہایت مشہور اور جلیل القدر محدثین میں شمار ہوتا ہے۔ (کتاب الانساب ورق ۳۲)

حافظہ:

انکا حافظہ نہایت قوی تھا، محدثین میں وہ "الحافظ" کے لقب سے مشہور تھے، عجلی کا بیان ہے کہ انکی یادداشت اتنی اچھی تھی کہ جب وہ املا کرانے لگتے تو اتنی زیادہ حدیثیں بیان کرتے کہ ہم لوگ لکھتے لکھتے گھبرا جاتے تھے، (تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۰۸) ذہبی نے الحافظ الحجۃ اور ابن عماد نے "احد الحفاظ الثقات" لکھا ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۶۶)

ثقاہت:

ان کی عدالت و ثقاہت پر علمائے فن کا اتفاق ہے یحییٰ بن معین روایت کرتے ہیں کہ یحییٰ بن سعید قطان فرماتے تھے کہ اگر میں مسدد سے ملتا تو ضرور ان سے حدیثیں نقل و روایت کرتا، بلاشبہ وہ اس کے اہل تھے، ان کا پایہ نہایت بلند اور وہ بڑے ثقہ تھے، ابو حاتم فرماتے ہیں کہ ان کی وہ حدیثیں جو قطان عبداللہ بن عمرؓ کے واسطے سے روایت کرتے ہیں، دنانیر کے مانند ہیں، گویا تم رسول اللہ ﷺ سے ان کو سن رہے ہو۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۰۸، ۱۰۹)

امام احمد جیسے بزرگ ان کی عظمت و ثقاہت کے مداح و معترف تھے، ان کے شاگرد رشید میمونی کا بیان ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ مسدد کی اللہ مغفرت کرے کیا ہی عمدہ اور بہتر شیخ تھے، ابو زرعہ فرماتے ہیں کہ امام احمد نے مجھ سے کہا کہ مسدد سے جو حدیثیں میں بیان کرتا ہوں وہ صحیح اور درست ہیں، اس لئے تم کو ان سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے، ابن معین، ابو حاتم ابو قلغ عجلی اور امام نسائی وغیرہ ائمہ جرح نے ان کی توثیق کی ہے اور ابن حبان نے ثقات میں تذکرہ کیا ہے، جعفر بن عثمان نے یحییٰ بن معین سے دریافت کیا کہ بصرہ کے کس شخص کی حدیثیں لکھی جائیں تو فرمایا مسدد سے، لاریب وہ ثقہ اور مستند تھے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۹ و طبقات ابن سعد قسم دوم جز ہفتم ص ۵۷)

وفات:

رمضان المبارک ۲۲۸ھ میں جب کہ بوڑھے ہو چکے تھے انتقال کیا۔ (العبر ج ۱ ص ۴۰۳ و تذکرہ ج ۲ ص ۹ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۶۶)

تصانیف:

ان کی تصنیفات میں صرف مسند کا ذکر ملتا ہے، علامہ ذہبی نے اس کے بعض حصوں کا سماع کیا تھا، (العبر ج ۱ ص ۴۰۳ اور الرسالۃ المستطرفہ ص ۵۳) یہ مقطوع و موقوف ہر قسم کی روایتوں کا مجموعہ تھا، امام دارقطنی نے سب سے پہلی مسند اسی کو قرار دیا ہے اور ابن عدی کا بیان ہے کہ بصرہ میں مسند لکھنے کا شرف سب سے پہلے مسدد ہی کو حاصل ہوا، (تقریب التہذیب ص ۴۴۳ و تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۰۹) اس مسند کی اہمیت اس کی قدامت کی وجہ سے ہے، تمام اصحاب تراجم و فہرست نے اس کا ذکر کیا ہے اس سے بھی اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

Marfat.com

امام نعیم بن حماد خزاعی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۲۸ھ)

نام ونسب:

نعیم نام ابو عبداللہ کنیت، اور نسب نامہ یہ ہے: نعیم بن حماد بن معاویہ بن حارث بن ہمام بن سلمہ بن مالک۔
(تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۰۷ و تہذیب ج ۱۰ ص ۴۵۸)

خاندان ووطن:

ان کا قبیلہ خزاعہ سے خاندانی اور خراسان کے مشہور مرو سے وطنی تعلق تھا لیکن مصر میں مستقل بود و باش اختیار کر لی تھی اس لئے خزاعی، مروزی اور مصری کی نسبتوں سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

اساتذہ وشیوخ:

انہوں نے جن نامور علمائے اسلام سے استفادہ کیا تھا، ان کے نام حسب ذیل ہیں:

ابراہیم بن سعد، ابراہیم بن ہمان، ابوبکر عیاش، ابوحمزہ عسکری، ابوداؤد طیالسی، بقیہ بن ولید، جریر بن عبدالحمید، حفص بن غیاث، خارجہ بن مصعب، زبید بن سعد، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن مبارک، عبدالوہاب ثقفی، عیسیٰ بن عبید کندی، فضل بن موسیٰ سنیانی، فضل بن عیاض، نوح ابن ابی مریم، معتمر بن سلیمان اور ہشیم وغیرہ، روح بن عبادہ سے ۵۰ ہزار حدیثوں کا سماع کیا تھا۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۵۸)

تلامذہ:

ان کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن جوزجانی، ابوالاحوص عکبری، ابوبکر صنعانی، ابوحاتم رازی، ابواسماعیل ترمذی، احمد بن منصور رمادی، احمد بن یوسف سلمی، اسماعیل سمویہ، بکر بن سہل، میاطی، حمزہ بن محمد بن عیسیٰ بغدادی، علی بن داؤد قنطری، عصام بن رواد بن جراح، عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی، محمد بن عوف طائی، محمد بن یحییٰ ذہلی اور یحییٰ بن معین وغیرہ۔

صحاح ستہ کے مصنفین کے متعلق حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

امام بخاری نے صرف ایک دو موقع پر ان سے روایت کی ہے لیکن اکثر مواقع پر تعلیق کی ہے، امام مسلم نے مقدمہ میں ایک جگہ ان کی روایت لی ہے، بقیہ ائمہ سنن میں امام نسائی کے علاوہ سب نے ان سے بالواسطہ روایتیں کی ہیں۔
(تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۵۸)

Marfat.com

طلب حدیث کے لئے سفر:

مؤرخین لکھتے ہیں کہ: طلب الحدیث طلبا کثیرا بالعراق و الحجاز یعنی عراق وحجاز میں نہایت دلچسپی اور انہماک سے حدیث کی تحصیل و تکمیل کی، عراق وحجاز میں ایک عرصہ تک قیام کرنے کے بعد مصر تشریف لائے اور ۴۰ سال کے لگ بھگ وہاں رہے۔ (ایضاص ۴۶۲، تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۱۳، ومیزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۳۸)

حفظ وثقاہت:

حفظ وضبط اور ثقاہت واتقان کے لئے مشہور وممتاز تھے، یحیی بن معین، امام احمد، عجلی، ابن عدی، اور ابو حاتم وغیرہ متعدد اکابر محدثین اور ائمہ جرح وتعدیل نے ان کی توثیق کی ہے، بعض ائمہ فن نے ان کے وہم وخطا کا بھی ذکر کیا ہے لیکن اس سے ان کی عدالت وثقاہت میں فرق نہیں آتا، ابن معین وغیرہ کا بھی یہی خیال ہے۔

(تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۶۰ تا ۴۶۳ ومیزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۴۰ و ۲۴۱)

فقہ:

حدیث کی طرح ان کو فقہ سے بھی بڑی مناسبت تھی اور علم فرائض کے ماہر تھے اسی لئے فرائضی بھی کہلاتے تھے، مؤرخین نے فقیہ عارف بالفرائض اور من اعلم الناس بالفرائض کہہ کر اس کا اعتراف کیا ہے۔

علم وفضل:

ان کے علم وفضل کے بھی تمام علماء معترف تھے، علامہ ذہبی وغیرہ نے ان کے متعلق احد علماء العصر (یکتائے روزگار) اور کان من اوعیة العلم (خزانہ) علم لکھا ہے۔ (تہذیب ج ۱۰ ص ۴۶۳ ومیزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۴۰ و ۲۴۱)

دینی حمیت:

نعیم بن حماد بڑے متبع سنت اور دیندار بزرگ تھے، حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ وہ ان لوگوں میں تھے جو سنتوں کے معاملہ میں نہایت متشدد ومتصلب تھے اور اہل بدعت واہواء سے سخت متنفر اور بیزار رہتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ پہلے وہ خود بھی جہمیہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن ابو عصمہ کے فیض صحبت سے جن کے یہ کاتب تھے اور جو جہمیت سے سخت متنفر تھے ان کو بھی جہمیہ اور اہل اہواء سے سخت تنفر ہو گیا تھا۔ (تہذیب ج ۱۰ ص ۴۶۳ ومیزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۴۰ و ۲۴۱)

قید وبند:

امام نعیم کی دینی حمیت اور غیرت کا ثبوت یہ بھی ہے کہ ان سے خلق قرآن کا عقیدہ جبراً قبول کرنے کے لئے کہا گیا لیکن انہوں نے اصحاب دعوت وعزیمت کی طرح اس کو ماننے سے انکار کر دیا، اس کے نتیجہ میں انکو قید وبند کی مشقت سے دوچار ہونا پڑا اور وہ مصر سے قید کر کے عراق لائے گئے اور بغداد یا سامرا میں قید خانہ میں انتقال کیا۔ (ایضا وطبقات ابن سعد ج ۷ ص ۲۰۶)

وفات:

۱۳ جمادی الاولیٰ ۲۲۸ھ کو انتقال کیا، ۲۲۷ھ کی بھی روایت کی گئی ہے۔ (ایضا)

Marfat.com

تصنیفات:

وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں: وله المصنفات فی السنن وغیرها، (البدایہ ج ۱۰ ص ۳۰۲) ان کی تصنیفات میں دو کتابوں کے نام معلوم ہوسکے ہیں۔

۱۔ الفتن والملاحم: یہ بڑی اہم، مشہور اور اپنے موضوع پر نہایت قدیم کتاب ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ (ضحی الاسلام ج ۲ ص ۱۲۶)

۲۔ مسند: اس کو قدامت کی بنا پر بڑی اہمیت حاصل ہے، ایک عرصہ تک یہ اہل علم میں متداول رہ چکی ہے، بعض علما سب سے قدیم مسند اسی کو بتاتے ہیں، امام احمد فرماتے ہیں ہمارے علم کے مطابق کتب مسند میں سب سے پہلی تصنیف نعیم کی ہے، خطیب نے لکھا ہے کہ مسند کے سب سے پہلے جامع و مرتب یہی تھے۔ (تہذیب ج ۱۰ ص ۵۹ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸)

Marfat.com

امام عبداللہ بن محمد جعفی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۲۶ھ)

نام ونسب:

عبداللہ نام، ابوجعفر کنیت اور مسندی لقب تھا، سلسلہ نسب یہ ہے: عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن جعفر بن یمان بن اخنس بن خنیس۔ (کتاب الانساب ورق ۵۳۱ وتہذیب التہذیب ج ۶ ص ۹)

خاندان ووطن:

ماوراء النہر کا مشہور شہر بخارا جو امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری اور دوسرے اکابر محدثین کا مولد ومسکن ہے، ابوجعفر جعفی بھی اسی خاک کے نامور محدث تھے، جعفی بن سعد مذحجی کے مولیٰ تھے اسی نسبت سے جعفی کہلائے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۷۵ وحاشیۃ العبرج ۱ ص ۴۰۵ بحوالہ انساب) مسندی اس لئے کہلاتے تھے کہ مرسل اور منقطع حدیثوں کے بجائے ان کو مسند اور متصل حدیثوں کی تلاش رہتی تھی۔ (تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۹، ۱۰ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۷۵ وکتاب الانساب ورق ۵۳۱)

اساتذہ:

ابوجعفر مسندی کے بعض اساتذہ وشیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوداؤد، ابوعامر عقدی، اسحاق بن ازرق، حرمی بن عمارہ، خلیل بن احمد مزنی، سفیان بن عیینہ، عبدالرزاق، فضیل بن عیاض، مروان بن معاویہ، معتمر بن سلیمان، یحییٰ بن آدم وغیرہ۔

تلامذہ:

چند مشہور تلامذہ یہ ہیں:

ابوحاتم رازی، ابوزرعہ رازی، احمد بن سیار، حمدون بن عمارہ بزار، عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی، عبیداللہ بن واصل، محمد بن احمد بن ہارون مصیصی، محمد بن نصر مروزی محمد بن یحییٰ ذہلی وغیرہ۔

ان کی محدثانہ عظمت اس سے ظاہر ہے کہ امام بخاری اور ان کے واسطہ سے امام ترمذی نے ان سے روایتیں نقل کی ہیں، امام بخاری کی صحیح میں ان کے واسطہ سے ۴۴ حدیثیں درج ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۷۵ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۶۷)

رحلت وسفر:

مورخین اور علمائے طبقات نے احادیث کی طلب وجستجو کے لیے ان کے سفر وسیاحت کا بھی ذکر کیا ہے، حافظ ذہبی نے

Marfat.com

یمن جانے کی تصریح کی ہے۔

حفظ وثقاہت:

محدثین اور علمائے فن نے ان کو ثقہ اور معتبر حافظ و محدث قرار دیا ہے، ابن عماد نے الثبت، حافظ ذہبی نے الحافظ الحجۃ اور علامہ ابن حجر نے ثقہ و حافظ کہہ کر ان کا تعارف کرایا ہے۔ (شذرات الذہب ج ۲ ص ۶۷ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۷۵ وتقریب التہذیب ص ۱۴۱) احمد بن یسار فرماتے ہیں کہ وہ صاحب سنت اور ضبط واتقان اور صدق وعدالت کے لیے مشہور تھے، ابو حاتم نے صدوق اور ابن حبان نے ثقہ و متقن کہا ہے اور علامہ خلیلی کا خیال ہے کہ ان کی ثقاہت واعتبار پر اتفاق ہے۔
(تہذیب ج ۶ ص ۹و۱۰ و تذکرہ ج ۲ ص ۷۶)

اعتراف:

اہل علم اور محدثین نے ان کے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے، علامہ سمعانی نے عالم بخاریٰ اور دوسرے علماء نے امام حدیث لکھا ہے حاکم بیان ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں بخاری کے استاد اور ماوراء النہر کے امام تھے، حسن بن شجاع نے ایک بار امام بخاری کی ایک حدیث سے ناواقفیت دیکھ کر حیرت سے فرمایا کہ آپ خزانہ حدیث یعنی ابوجعفر مسندی کے پاس جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس حدیث سے ناواقف ہیں۔ (تذکرہ ج ۲ ص ۷۶ کتاب الانساب ورق ۱۳۱)

وفات:

ان کی وفات ان کے وطن بخارا میں ذیقعدہ ۲۲۹ھ میں ہوئی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۷۶ تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۹)

حلیہ:

خوش قامت اور موزوں اندام تھے، بڑھاپے کی وجہ سے سر اور ڈاڑھی کے بال سفید ہو گئے تھے۔
(تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۹)

تصنیفات:

ان کی تصنیفات میں ایک مسند کا ذکر ملتا ہے ماوراء النہر میں سب سے پہلے ان ہی کو مسند کی جمع وتدوین کی سعادت حاصل ہوئی، حاکم کا بیان ہے کہ انھیں مسندی کہے جانے کا سبب یہ ہے کہ ماوراء النہر میں صحابہؓ کے ناموں کی ترتیب پر سب سے پہلے انہی نے احادیث جمع کی تھیں، (ایضاً ص ۱۰) یہ مسند بھی اپنی صحت وقدامت کی وجہ سے مشہور اور اہم سمجھی جاتی ہے۔

Marfat.com

امام ابوبکر بن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۳۵ھ)

نام ونسب:

عبداللہ نام، ابوبکر کنیت، اورنسب نامہ یہ ہے: عبداللہ محمد بن ابی شیبہ ابراہیم بن عثمان بن خواستی۔

ولادت، خاندان اور وطن:

ابن ابی شیبہ ۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے ان کا وطن واسط ہے اور وہ قبیلہ بنوعبس کے مولیٰ تھے، ان کا خاندان علمی حیثیت سے ممتاز تھا، ان کے دادا ابوشیبہ جن کے نام کی نسبت سے وہ مشہور ہوئے، ایک صاحب علم بزرگ تھے اور ۲۳ سال تک منصور کے زمانہ میں واسط میں منصب قضا پر فائز رہے، ابوشیبہ کے فرزند محمد کو بھی علم وفن سے اشتغال تھا، وہ فارس کے قاضی تھے، ان کے تین صاحبزادے عبداللہ، عثمان، اور قاسم اکابر محدثین میں شمار کیے جاتے ہیں، ابوبکر کا خاندان بعد میں کوفہ میں آباد ہوگیا تھا، اس لیے بعض لوگوں نے ان کو یہیں کا باشندہ بتایا ہے، کوفی، واسطی اور عبسی ان کی مشہور نسبتیں ہیں۔

(تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۶۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰ وتہذیب ج ۶ وکتاب الانساب ورق ۳۸۲ وبستان المحدثین ص ۴۹)

اساتذہ اور شیوخ:

ابوبکر نے جن نامور محدثین سے اکتساب فیض کیا تھا، ان میں سے بعض کے نام حسب ذیل ہیں:

ابن ابی زائدہ، ابن شریح، ابوبکر بن عیاش، اسمٰعیل بن علیہ، اسمٰعیل بن عیاش، جریر بن عبدالحمید، حفص ابن غیاث، ابو اسامہ حماد بن سلمہ، خلف بن خلیفہ، سفیان بن عیینہ، ابوالاحوص سلام بن سلیم، ابوخالد الاحمر سلیمان بن حیان، شریک بن عبداللہ نخعی، عباد بن عوام، عبدالاعلیٰ ابن عبدالاعلیٰ، عبداللہ بن ادریس، عبدالرحمٰن بن محمد محاربی، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن مبارک، عبداللہ بن نمیر، عمر بن عبید، ابونعیم فضل بن دکین، محمد بن بشر عبدی، محمد بن حازم، محمد بن فضیل، ابومعاویہ، مروان بن معاویہ، معتمر بن سلیمان، وکیع بن جراح، ہشیم بن بشیر، یحییٰ بن سعید قطان، یزید بن مقدام، یزید بن ہارون وغیرہ۔

تلامذہ:

نامور فقہاء ومحدثین میں امام احمد بن حنبل، ابوزرعہ، ابوحاتم اور بقی بن مخلد کے علاوہ صحاح ستہ کے مصنفین میں امام بخاری، مسلم اور ابن ماجہ کو براہ راست اور امام نسائی کو بالواسطہ روایت کرنے کا فخر حاصل ہے، دوسرے مشہور علما میں ابراہیم بن اسحٰق حربی، ابوبکر احمد بن ابی عاصم النبیل، جعفر فریابی، حسن بن علی معمری، زکریا ساجی، عباس بن محمد دوری، عبداللہ بن احمد

Marfat.com

بن حنبل، عبداللہ بن احمد اہوازی، ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بغوی، عثمان بن خرزاذ، محمد بن ابراہیم مربع، محمد بن اسحاق صاغانی، محمد بن سعد، محمد بن عبدوس بن کامل، محمد بن عبید اللہ مناوی، محمد بن عثمان بن ابی شیبہ، محمد بن محمد باغندی، موسیٰ بن اسحاق انصاری، ہشیم بن خلف دوری، یعقوب بن شیبہ اور یوسف بن یعقوب نیشاپوری وغیرہ۔

رحلت وسفر:

ان کے بعض مشائخ کے علاوہ اکثر کا وطن کوفہ اور واسط ہے لیکن دوسرے مراکز حدیث کے محدثین سے بھی انہوں نے استفادہ کیا ہے، چنانچہ بغداد میں ان کے قیام اور درس وتدریس کی تصریح بہت سے مؤرخین نے کی ہے۔
(تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۶۶ و تہذیب التہذیب ج ص ۲ و ۳)

اعتراف کمال:

ابن ابی شیبہ کے معاصر علما اور نامور محدثین کو ان کے علم وفضل اور فن حدیث میں تبحر اور جامعیت کا اعتراف ہے، ابوعبید قاسم بن سلام فرماتے ہیں کہ علم حدیث چار آدمیوں پر تمام ہوگیا، ابوبکر بن ابی شیبہ، حسن ادا، خوش سلیقگی اور حفظ و مذاکرہ میں امام احمد، فقہ و معرفت حدیث میں یحییٰ بن معین جامعیت اور کثرت روایت میں اور علی بن مدینی حدیث کے مخارج و علل سے واقفیت میں یکتائے روزگار تھے، امام احمد کا ارشاد ہے کہ ابوبکر بن ابی شیبہ میرے نزدیک اپنے بھائی عثمان سے افضل و برتر ہیں، آپ کے صاحبزادہ عبداللہ نے عرض کیا کہ ابن معین عثمان کو فائق سمجھتے ہیں فرمایا لیکن میں ابوبکر ہی کو زیادہ پسند کرتا ہوں، (تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴، ۳، ۲) علامہ ذہبی نے عدیم النظیر، الامام، احد الاعلام، اور حافظ ابن کثیر نے احد الاعلام و ائمۃ الاسلام وغیرہ القاب سے ان کا ذکر کیا ہے، (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰) شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ ''وہ حدیث کے امام تھے۔'' (بستان المحدثین ص ۴۹)

حفظ وضبط:

ان کے حفظ وضبط کا علما نے اعتراف کیا ہے، عمرو بن علی فلاس فرماتے ہیں کہ ''میں نے ان سے بڑا حافظ حدیث نہیں دیکھا، صالح محمد جزرہ کا بیان ہے کہ ''مذاکرے کے وقت ابن ابی شیبہ سے بہتر یادداشت کسی کی نہیں تھی، حافظ ابوزرعہ کہتے ہیں کہ ''ان سے بڑا حافظ حدیث میں نے نہیں پایا، احمد بن حمید سے کوفہ کے سب سے بڑے حافظ حدیث کے بارے میں سوال کیا گیا، تو انہوں نے جواب دیا کہ ابوبکر بن ابی شیبہ، ابن حبان لکھتے ہیں کہ اپنے زمانہ میں منقطع روایتوں کے سب سے بڑے حافظ یہی تھے۔

ثقاہت:

امام احمد ان کو صدوق، عجلی، ابوحاتم، ابن خراش اور ابن قانع ثقہ وثابت، اور خطیب و ابن حبان نے متقن کہا ہے، علامہ ابن ناصر الدین اور حافظ ذہبی نے ثقۃ التحریر لکھا ہے، ابن معین سے دریافت کیا گیا کہ کوفہ کے کس آدمی سے حدیث بیان کی جائے، فرمایا ابوشیبہ کے دونوں بیٹوں ابوبکر اور عثمان سے ایک مرتبہ ابن معین سے ان کے شریک سے سماع کا حال دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ وہ ہمارے نزدیک سچے ہیں، اگر وہ شریک کے بجائے کسی اور متقدم سے بھی سماع کا دعویٰ کرتے تو ہم ان کو بھی

Marfat.com

مان لیتے، میں نے خود ان سے اس کے متعلق دریافت کیا تھا، کہ آپ نے شریک سے کب سماع کیا ہے؟ فرمایا کہ چودہ سال کی عمر میں جب میرا حافظہ اس وقت سے زیادہ اچھا اور بہتر تھا۔ (بستان المحدثین ص ۴۹)

وفات:

ابن ابی شیبہ نے تقریباً چوہتر ۷۴ سال کی عمر میں ۸/محرم الحرام ۲۳۵ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

(تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۸۱ و العبر ج ۱ ص ۴۲۱)

تصنیفات:

تصنیفی حیثیت سے ابن ابی شیبہ باکمال مصنف تھے، ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ: "احسنهم و ضعا للكتاب ابن ابی شیبہ۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰) مصنفین اور تذکرہ نگاروں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی متعدد تصنیفات تھیں لیکن وہ سب معدوم اور نایاب ہیں، ابن ندیم نے ان کی حسب ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ کتاب السنن فی الفقہ، ۲۔ کتاب التفسیر، ۳۔ کتاب التاریخ، ۴۔ کتاب الفتن، ۵۔ کتاب صفین، ۶۔ کتاب الجمل، ۷۔ کتاب الفتوح، ۸۔ کتاب المسند۔ (والفہرست ص ۳۸)

لیکن عام مورخین ان کی چار کتابوں کا ذکر کرتے ہیں، مسند، تفسیر، کتاب الاحکام اور مصنف، آخری دونوں کتابوں کا ابن ندیم نے ذکر نہیں کیا ہے، اس طرح ابن ابی شیبہ کی معلوم کتابوں کی تعداد دس ہو جاتی ہے، مسند کے متعلق ملا چلپی نے لکھا ہے کہ "وہ ایک بڑی اور ضخیم کتاب ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ:

ابوبکر بن ابی شیبہ کی سب سے مشہور کتاب مصنف ہے، اس کی بدولت ان کو لازوال شہرت نصیب ہوئی، یہ حدیث کی اہم اور بلند پایہ کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور، اہم، جامع اور مبسوط یہی کتاب ہے، مصنف عبدالرزاق اس کے مقابلہ مین قدیم ضرور ہے لیکن یہ اس سے زیادہ ضخیم اور جامع ہے۔

(کشف الظنون ج ۲ ص ۳۰، ۲۴، ۴۵۱)

ترتیب:

محدثین کے طریقہ کے مطابق اس کو سندوں کے ساتھ فقہی کتابوں کی طرح ابواب و کتب پر مرتب کیا گیا ہے، اس کی ابتدا کتاب الطہارۃ سے ہوتی ہے، یہ کئی اجزا پر مشتمل ہے۔

اہمیت:

حافظ ابن کثیر نے اس کے متعلق تحریر فرمایا کہ "ابوبکر بن ابی شیبہ لاجواب اور عدیم المثال مصنف کے مرتب ہیں، ان سے پہلے اور بعد کسی زمانہ میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی، شاہ ولی اللہ دہلوی نے حدیث کی کتابوں کے تیسرے طبقہ میں اس کا شمار کیا ہے، حافظ ابن حزم اندلسی نے اس کو موطا سے بھی بالاتر بتایا ہے۔

(البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۱۵ و حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۵ و تذکرہ ج ۳ ص ۳۲۷)

Marfat.com

یہ رائے مبالغہ سے خالی نہیں لیکن اس سے مصنف کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

خصوصیات:

اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اکثر مرویات صحاح ستہ کی کتابوں میں موجود ہیں، امام بخاری نے تیس اور امام مسلم نے ۱۵۴۰ روایات کی تخریج کی ہے سنن ابی داؤد میں بکثرت اور سنن ابن ماجہ میں غالباً سب سے زیادہ اسی سے حدیثیں لی گئی ہیں۔ (تہذیب ج ۶ ص ۴ وامام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۴۵)

۲۔ احکام و مسائل کا اس سے زیادہ جامع اور مستند کوئی مجموعہ نہیں ہے، (النکت الطریفہ ص ۳) اس میں وہی روایتیں شامل کی گئی ہیں جن سے کوئی فقہی مسئلہ مستنبط ہوتا ہے۔

۳۔ نقل احادیث غیر جانبدارانہ ہے، اہل حجاز اور اہل عراق سب کے مرویات بلا ترجیح و تنقید ذکر کئے گئے ہیں۔

۴۔ اس میں مرفوع و متصل روایات کے ساتھ مرسل، منقطع اور موقوف حدیثیں بھی ہیں اور صحابہؓ کے آثار، تابعین کے فتاوے اور فقہاء وغیرہ کے آراء و اقوال بھی بیان کئے گئے ہیں، اس سے ہر حدیث کے متعلق سلف کے تعامل اور ائمہ کے اتفاق واختلاف کا پتہ چل جاتا ہے۔

مصنف کا ایک باب ھذا ما خالف بہ ابو حنیفۃ الاثر الذی جاء عن رسول اللہ ﷺ کے عنوان سے امام ابوحنیفہؒ کے رد میں بھی ہے، اس کے جواب میں زاہد الکوثری نے النکت الطریفۃ فی التحدث عن ردہ ابن ابی شیبۃ علی ابی حنیفۃ کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جو قاہرہ کے مطبع انوار سے ۱۳۶۵ھ میں شائع ہوا ہے اور دوسو ستر ۲۷۰ صفحے پر مشتمل ہے لیکن علامہ کوثری نے اعتراف کیا ہے کہ اس رد کے باوجود مصنف ابن ابی شیبہ کا اہل عراق پر بڑا احسان ہے کیونکہ ان کے فقہی دلائل کے لیے سب سے زیادہ جامع اور مستند ماخذ یہی ہے۔"

مصنف کے قلمی نسخے، جرمنی، مدینہ منورہ کے مکتبہ محمودیہ اور خدیویہ مصر وغیرہ میں موجود ہیں، (مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۵ والرسالۃ المستطرفہ ص ۳۶، فہرست کتب خانہ خدیویہ ج ۱ ص ۴۲۴) ہندوستان میں مکتبہ ہندیہ، کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ مولانا عبدالحئی لکھنوی اور بعض دیگر کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، (تذکرۃ النوادر ص ۳۶ بحوالہ مکتوبات شاہ احسان اللہ سندی، فہرست کتب خانہ آصفیہ ج ۱ ص ۶۲۲) اس کے بعض اجزاء ملتان سے شائع ہوئے ہیں، چوتھا جزو ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں کتاب الزکوٰۃ، کتاب الجنائز، کتاب الایمان والنذور والکفارات شامل ہیں۔

Marfat.com

امام اسحٰق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۳۸ھ)

نام ونسب:

اسحٰق نام، ابو یعقوب کنیت اور ابن راہویہ لقب تھا، شجرۂ نسب یہ ہے: اسحٰق بن ابراہیم بن مخلد بن ابراہیم بن مطر بن عبید اللہ بن غالب بن عبدالوارث بن عبید اللہ بن عطیہ بن مرہ بن کعب ابن ہمام بن اسد بن مرہ حنظلہ بن مالک بن زید بن منات بن تیم۔

اسحٰق کے والد ابراہیم بطن مادر ہی میں تھے کہ ان کی والدہ نے مکہ معظمہ کا سفر کیا، اسی سفر میں کسی مقام پر ان کی ولادت ہوئی، اس لئے اہل مرو انہیں راہوی یا راہویہ یعنی راستہ والا کہتے تھے، اسحٰق کا بیان ہے کہ میرے والد کو جب لوگ راہویہ کہتے تھے تو ان کو ناگوار ہوتا تھا لیکن مجھے ابن راہویہ کہا جاتا ہے تو کوئی ناگواری نہیں ہوتی۔ (تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۴۷، ۳۴۸، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۰۹، ۴۱۰، طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۳، تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۱۳، تہذیب ج ۱ ص ۲۱۶)

ولادت:

ابن راہویہ بروایت صحیح ۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے، ۱۱۶ھ اور ۱۶۳ھ میں روایتیں بھی کی گئی ہیں۔ (ایضاً)

خاندان ووطن:

ان کا وطن خراسان کا مشہور شہر مرو تھا لیکن انہوں نے نیشاپور میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، (الانتقاء لابن عبدالبر ص ۱۰۸) اس لئے مروزی اور نیشاپوری کہلاتے تھے، تیمی اور حنظلی کی نسبتوں سے ان کا عربی النسل ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

اساتذہ:

ان کے مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابو اسامہ، ابو بکر بن عیاش، ابو معاویہ، اسباط بن محمد، اسماعیل بن علیہ، بشر بن مفضل، بقیہ بن ولید، جریر بن عبدالحمید رازی، حاتم بن اسمٰعیل، حفص بن غیاث، سفیان بن عیینہ، سلیمان بن نافع عبدی، سوید بن عبدالعزیز، شعیب بن اسحٰق، عبد الرحمٰن بن مہدی، عبدالرزاق بن ہمام، عبدالعزیز دراوردی، عبداللہ بن مبارک، عبداللہ بن وہب، عبدہ بن سلیمان، عبدالوہاب ثقفی، عتاب بن بشیر جزری، عمر بن ہارون، عیسٰی بن یونس، غندر، فضیل بن عیاض، محمد بن بکر برسانی، محمد بن سلمہ حرانی، معاذ بن ہشام، معتمر بن سلیمان نضر بن شمیل، وکیع بن جراح، ولید بن مسلم اور یحیٰی بن قانع وغیرہ۔

Marfat.com

تلامذہ:

ابن راہویہ کے تلامذہ کے مختلف طبقے ہیں: (۱) ان کے بعض اساتذہ بقیہ بن ولید، محمد بن یحییٰ ذہلی اور یحییٰ بن آدم وغیرہ۔ (۲) اور معاصرین میں احمد بن حنبل، اسحٰق بن منصور، کوسج، محمد بن رافع اور یحییٰ بن معین۔ (۳) اور عزیزوں میں فرزند محمد نے بھی استفادہ کیا ہے اور صحاح ستہ کے مصنفین میں امام ابن ماجہ کے علاوہ سب کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے، بعض اور ممتاز تلامذہ اور منتسبین کے نام حسب ذیل ہیں:

ابراہیم بن ابی طالب، احمد بن سلمہ، اسحاق بن ابراہیم نیشاپوری، جعفر فریابی، حسن بن سفیان، زکریا سجری، ابوالعباس سراج، عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی، عبداللہ بن محمد بن شیرویہ، محمد بن افلح، محمد بن نصر مروزی اور موسیٰ بن ہارون وغیرہ۔

(تاریخ بغداد ۶ ص ۳۴۵ تا ۳۴۷، ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۰ و طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۲، ۲۳۳، تہذیب ج ۱ ص ۲۱۷)

طلب حدیث کے لئے سفر:

علامہ ابن عساکر اور حافظ ابن حجر نے آپ کے کثرت سفر (**فطاف البلاد لطلب الحدیث**) (حدیث کی طلب وتحصیل کے لیے مختلف شہروں میں پھرے) کہہ کر ذکر کیا ہے اور خطیب نے لکھا ہے کہ حجاز، عراق، یمن اور شام وغیرہ مراکز حدیث کا سفر کیا اور بغداد کئی بار تشریف لائے، عراق کا سفر ۲۳ سال کی عمر میں ۱۸۴ھ میں کیا تھا۔

(تاریخ بغداد ۶ ص ۳۴۵ تا ۳۴۷، ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۰ و طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۲، ۲۳۳، تہذیب ج ۱ ص ۲۱۷)

علم وفضل کا اعتراف:

اسحاق بن راہویہ بلند پایہ علمائے اسلام میں تھے، معاصرین علما اور اساطین فن نے ان کے فضل وکمال اور علمی عظمت و بلند پائیگی کا اعتراف کیا ہے۔

امام احمد بن حنبل جو ان کے بڑے مداح اور قدرداں تھے، فرماتے ہیں، خراسان وعراق میں ان کا کوئی ہمسر نہیں، بغداد کے اس پل کو ان سے زیادہ عظیم وبرتر کسی آدمی نے عبور نہیں کیا، گو بعض مسائل میں ہمارا اور ان کا اختلاف ہے اور اہل علم کے درمیان تو اختلاف ہوا ہی کرتے ہیں" ایک مرتبہ اسحاق کے صاحبزادے محمد ان کی خدمت میں حصول علم کے لئے حاضر ہوئے تو ارشاد ہوا کہ تمہارا اپنے والد سے وابستہ رہنا زیادہ مفید اور بہتر ہے ان سے زیادہ پر عظمت آدمی تمہاری آنکھوں نے نہ دیکھا ہوگا، امام احمد ان کی عظمت کے اس حد تک قائل تھے کہ اگر ان کے سامنے کوئی انھیں ابن راہویہ کہتا تو ناگواری کا اظہار کرتے اور فرماتے کہ اسحاق بن ابراہیم حنظلی کہا کرو۔

محمد اسلم کہتے ہیں کہ اگر امام ثوری زندہ ہوتے تو اسحاق کے علم وفضل سے بے نیاز نہیں رہتے، احمد بن سعید رباطی کا قول ہے کہ وہ اور ابن عیینہ اور حماد بھی ان کے محتاج ہوتے، محمد بن یحییٰ صفار نے سنا تو کہا کہ اگر حسن بصری زندہ ہوتے تو اکثر چیزوں میں ان کو اسحاق کی جانب رجوع کرنا پڑتا، ابن خزیمہ کا بیان ہے کہ اگر وہ تابعین کے زمانہ میں ہوتے تو وہ لوگ بھی ان کے علم وفضل کے معترف ہوتے، نعیم بن حماد فرماتے ہیں کہ اگر کوئی خراسانی اسحٰق بن راہویہ کے علم وکمال میں کلام یا نکتہ چینی کرے تو اسے متہم فی الدین سمجھو، سعید بن ذویب فرماتے ہیں کہ روئے زمین پر اسحاق کے مانند میں نے کوئی آدمی نہیں

Marfat.com

دیکھا، ابویحییٰ شعرانی کا بیان ہے کہ علمی مذاکرہ کے وقت وہ یکتا اور یگانہ معلوم ہوتے تھے۔ یحییٰ بن یحییٰ کا بیان ہے کہ خراسان میں علم کے دو خزانے تھے، ایک محمد بن سلام بیکندی کے پاس، دوسرا اسحاق بن راہویہ کے پاس ہے، حسین بن منصور بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں یحییٰ اور اسحاق کے ہمراہ ایک شخص کی عیادت کرنے گیا، جب ہم لوگ اس کے گھر کے پاس پہنچے تو اسحاق پیچھے ہو گئے اور یحییٰ سے کہا پہلے آپ داخل ہوں کیونکہ آپ ہم سے عمر میں بڑے ہیں، انہوں نے کہا بیشک میں عمر میں بڑا ہوں لیکن علم و فضل میں آپ فائق ہیں اس لئے پہلے آپ ہی چلیں، حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں "وہ جلیل القدر علمائے اسلام اور نامور محدثین و حفاظ عالم میں تھے۔ (تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۴۹، ۵۰، ۵۱، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۰، ۱۱، ۱۲، تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۱۸، ۲۱۹، طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۴، ۲۳۵، انتقاء ص ۱۰۸)

شرفِ امامت:

اسحاق بن راہویہ کا شمار ان ائمہ میں ہوتا ہے جو صاحب مذہب، فقیہ و مجتہد تھے مگر اب ان کا فقہی اور اجتہادی مذہب مٹ چکا ہے لیکن ایک زمانہ میں یہ بھی مسلمانوں کا معمول بہ مسلک رہا ہے، امام احمد اور امام نسائی ان کے متعلق فرماتے ہیں، امام من ائمة المسلمین یعنی مسلمانوں کے ایک امام یہ بھی ہیں، ایک مرتبہ امام احمد سے ان کے بارہ میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ وہ مسلمانوں کے امام ہیں ہمارے نزدیک شافعی، حمیدی اور اسحاق تینوں امام ہیں، محمد بن یحییٰ ذہلی کا بیان ہے کہ ایک دن بغداد کے مقام رصافہ میں ائمہ محدثین امام احمد اور یحییٰ بن معین وغیرہ جمع تھے لیکن مجلس صدارت پر اسحاق بن راہویہ رونق افروز تھے اور وہی اس مجلس کے خطیب بھی تھے، محمد بن نصر فرماتے ہیں وہ ہمارے اور ہمارے مشائخ کے شیخ و بزرگ تھے، فضل شعرانی کہتے ہیں وہ بلاشک وشبہ خراسان کے امام تھے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: احد الاعلام و علماء الاسلام، علامہ ابن سبکی تحریر فرماتے ہیں: احد ائمة الدین و اعلام المسلمین و هداة المؤمنین۔ دوسرے مؤرخین نے بھی ان کو احد أئمة الاسلام احد أئمة المسلمین و علما من اعلام الدین امام مشرق اور عالم نیشاپور وغیرہ لکھا ہے۔ (حوالہ مذکورہ اختلاف صفحات و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۱۲ و البدایہ ج ۱۰ ص ۳۱۷ میزان الاعتدال ج ۱ ص ۸۶ والعبر ج ۱ ص ۴۴۶ و مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۲۱ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۸۹)

علم حدیث میں کمال و امتیاز:

علم حدیث سے ان کو خاص تعلق تھا اور وہ اکابر محدثین اور نامور حفاظ میں شمار کئے جاتے ہیں، خلیل کا بیان ہے کہ وہ "شہنشاہ حدیث تھے" حدیثوں کے نشر و اشاعت، درس و مذاکرہ، حفظ و ضبط اور حزم و احتیاط کے لئے ان کی ذات بڑی اہمیت اور شہرت رکھتی ہے، ذیل میں ان کی ان خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حفظ و ضبط

اسحاق بن راہویہ کا حافظہ غیر معمولی اور یادداشت حیرت انگیز تھی، ابن حبان، خطیب بغدادی اور ابن عساکر وغیرہ نے حافظہ میں ان کی جامعیت کا اعتراف کیا ہے، علامہ ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ اگر اسحاق تابعین کے عہد میں ہوتے تو وہ لوگ بھی ان کے حافظے کے معترف ہوتے، قتیبہ بن سعید کا بیان ہے کہ خراسان کے نامور حفاظ میں اسحاق بن راہویہ اور ان کے بعد امام

Marfat.com

دارمی اور امام بخاری تھے، ابو یحییٰ شعرانی کہتے ہیں کہ میں نے ان کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی، وہ ہمیشہ یادداشت سے حدیثیں بیان کرتے تھے، ان کا خود بیان ہے کہ میں نے کبھی کوئی چیز قلمبند نہیں کی جب بھی مجھ سے کوئی حدیث بیان کی گئی میں نے اسے یاد کرلیا، میں نے کسی محدث سے کوئی حدیث کبھی دوبارہ بیان کرنے کے لئے نہیں کہا، یہ کہنے کے بعد انہوں نے پوچھا کیا تم لوگوں کو اس پر تعجب ہے؟ لوگوں نے کہا جی ہاں، یہ حیرت کی بات ہی ہے، انہوں نے کہا جس چیز کو میں ایک مرتبہ سن لیتا ہوں وہ مجھے یاد ہو جاتی ہے، ستر ہزار سے زیادہ حدیثیں ہر وقت میری نگاہ کے سامنے رہتی ہیں اور میں ان کے متعلق بتا سکتا ہوں کہ وہ کتاب میں کس جگہ ہیں؟ ابو داؤد خفاف کی روایت کے مطابق انہوں نے ایک لاکھ حدیثوں کے متعلق کہا کہ وہ میری نظر کے سامنے ہیں' میں ان کا تذکرہ کر سکتا ہوں ایک دفعہ انہوں نے گیارہ ہزار حدیثیں زبانی املا کرائیں اور پھر جب دوبارہ کتاب سے ان کی قراءت کی تو ایک لفظ کی بھی کمی یا بیشی نہیں نکلی، احمد بن سلمہ کہتے ہیں کہ انہوں نے پوری مسند کا زبانی املا کرایا، ابو حاتم رازی نے ابو زرعہ سے اسحاق بن راہویہ کے حفظ اسانید و متون کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ ان سے بڑا کوئی حافظ حدیث نہیں دیکھا گیا، احمد بن سلمہ نے ابو حاتم کو بتایا کہ انہوں نے یادداشت سے اپنی تفسیر کا املا کرایا ہے تو ابو حاتم نے کہا یہ اور زیادہ حیرت انگیز بات ہے کیونکہ مسند حدیثوں کا ضبط تفسیر کے اسناد و الفاظ کے ضبط کے مقابلہ میں آسان ہے، امیر خراسان عبداللہ بن طاہر نے ایک مرتبہ ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا، انہوں نے فرمایا کہ اس کے متعلق سنت یہ ہے اور یہی اہل سنت کا قول ہے لیکن امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ کی رائے اس سے مختلف ہے، ابراہیم بن ابی صالح وہاں موجود تھے بولے امیر المؤمنین اسحاق غلط کہتے ہیں، امام ابو حنیفہؒ کا مسلک اس سے مختلف نہیں ہے، انہوں نے جواب دیا کہ مجھ کو یہ مسئلہ یاد ہے، فلاں کتاب کا فلاں جزو لایئے، کتاب لائی گئی اور ابن طاہر نے اس کو الٹنا شروع کیا تو اسحاق نے کہا امیر المؤمنین گیارہویں ورق کی نویں سطر میں ملاحظہ فرمایئے، چنانچہ اس کے اندر وہ مسئلہ اسحاق کے بیان کے عین مطابق نکلا، امیر نے کہا ہم کو معلوم تھا کہ آپ کو مسائل از بر ہیں لیکن حافظہ کا یہ مشاہدہ ہمارے لیے یقیناً حیرت انگیز ہے۔ (تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۵۰ تا ۳۵۴، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۳ و ۴۱۴، طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۴، ۲۳۵، تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۱۷، میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۸۷، ابن خلکان ج ۱ ص ۱۱۳)

صدق و ثقاہت:

اس غیر معمولی حفظ کے ساتھ اسی درجہ کا صدق اور ثقاہت بھی تھی، ابو حاتم فرماتے ہیں کہ کثیر الحفظ ہونے کے باوجود اسحاق کا ضبط و اتقان اور غلطیوں سے محفوظ و مصؤن رہنا حیرت انگیز ہے، خطیب بغدادی وغیرہ لکھتے ہیں کہ وہ حفظ و ثقاہت دونوں کے جامع تھے، ذہبی نے ان کو ثقہ و حجت بتایا ہے اور ابن حبان نے ان کا ثقات میں ذکر کیا ہے، امام نسائی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ و مامون تھے، امام دارمی کا بیان ہے کہ اسحاق اپنے صدق کی وجہ سے اہل مغرب و مشرق کے سردار بن گئے تھے، امام احمد کو ان کے صدق و ثقاہت پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک دفعہ انہوں نے ان سے کوئی حدیث پوچھی، جب اسحاق نے اسے بیان کیا تو ایک شخص نے اعتراض کیا کہ وکیع نے یہی روایت اس سے مختلف طریقہ پر بیان کی ہے، امام احمد نے برافروختہ ہوکر کہا خاموش رہو، جب ابو یعقوب جو امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں کوئی روایت بیان کریں تو اسے بلا تامل قبول کر لینا چاہیے۔

(تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۵۰ تا ۳۵۳) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۲، ۴۱۳، طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۴ و تہذیب ج ۱ ص ۲۱۷)

Marfat.com

حزم واحتیاط:

ان حافظہ کے ساتھ اتنے محتاط تھے کہ بچپن میں انہوں نے عبداللہ بن مبارک سے حدیثیں سنی تھیں مگر ان کو روایت نہیں کرتے تھے کہ احتیاط کے خلاف ہے۔ (تاریخ بغداد ج ٦ ص ٣٤٥، تاریخ ابن عساکر ج ٢ ص ٤١٠)

حفاظت واشاعت حدیث:

ان کی ذات سے حدیث نبوی کی بڑی اشاعت اور سنت نبوی کا بڑا احیا ہوا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ "اسحاق بن راہویہ نے سنتوں کا دفاع اور مخالفین حدیث کا قلع قمع کیا" وہب بن جریر کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ اسحاق، صدقہ اور یعمر کو ان کی اسلامی خدمات کا صلہ عطا فرمائے، ان لوگوں نے مشرق کی زمین میں حدیثوں کی اشاعت اور سنت نبوی کا احیا کیا۔

فقہ واجتہاد:

حدیث کی طرح فقہ واجتہاد کے بھی ماہر تھے، ابواسحاق شیرازی، حاکم صاحب مستدرک اور خطیب نے ان کو فقہ واجتہاد میں جامع اور اکابر فقہا میں شمار کیا ہے، حافظ ابن کثیر نے احد المجتھدین من الانام اور ابن حبان نے نامور وممتاز فقہا میں ان کا شمار کیا ہے، ایک مرتبہ امام احمد ابن حنبل سے ان کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ اسحاق کے مانند کون ہوسکتا ہے، ایسے ہی لوگوں سے مسائل دریافت کرنے چاہئیں، ہم لوگ بھی ان سے فتوے پوچھتے ہیں۔

(تاریخ بغداد ج ٦ ص ٣٤٩، ٣٥٠، تاریخ ابن عساکر ج ٢ ص ٤١١، ٤٤١، ٤١٢، البدایہ والنہایہ ج ١٠ ص ٣١٧)

غرض فقہی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا اور وہ مسلمہ امام اور صاحب مذہب فقہا میں ہیں اور متعدد علما نے ان کا محدث کے بجائے فقیہ ومجتہد ہی کی حیثیت سے ذکر کیا ہے، کتب خلاف میں ان کے اقوال وفتاویٰ اور فقہی واجتہادی تخریجات موجود ہیں، ابن رشد مالکی نے اپنی کتاب بدایۃ المجتہد میں اکثر امام احمد کے ساتھ اسحاق کے اقوال بھی نقل کیے ہیں، ایک زمانہ تک مسلمانوں میں اسحاق کا مذہب رائج رہا۔

ابن راہویہ کے فقہی اصول اور بنیادیں:

فقہ وحدیث میں امام احمد بن حنبل اور اسحاق کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے، دونوں بزرگوں کی فقہ واجتہاد کا دار ومدار حدیث پر ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے رسالہ الانصاف میں لکھا ہے کہ ان کے مسائل کی بنیاد احادیث اور اقوال صحابہؓ پر زیادہ ہے، ابوحاتم سے پوچھا گیا کہ آپ کا میلان ان دونوں کی جانب زیادہ ہے، فرمایا مجھے ان سے زیادہ پر عظمت شخص نظر نہیں آتا، ان دونوں نے احادیث قلمبند کیں، ان کا مذاکرہ کیا اور ان پر تصنیفات کیں، علامہ ابن حجر لکھتے ہیں وفروع علی السنن، یعنی ان کی فقہی تفریعات سنن واحادیث پر مبنی ہوتی ہیں لیکن امام احمد کے برخلاف ان کا میلان امام مالک کی طرف زیادہ ہے جن کا اصل ماخذ اہل مدینہ کے اقوال ہوتے ہیں اور امام احمد زیادہ تر آثار وروایات پر اعتماد کرتے ہیں۔

فقہ واجتہاد میں ان کے کمال کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے امام شافعی جیسے عظیم المرتبت امام ومجتہد سے دو مرتبہ مناظرہ کیا اور صالح بن احمد روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مناظرہ کے موقع پر میرے والد بھی موجود تھے، ان کا بیان

Marfat.com

ہے کہ اسحاق امام شافعیؒ کے مقابلہ میں غالب نظر آ رہے تھے۔

(تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۱، ۴۱۲ و تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۱۹، تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۵۱)

پہلا مناظرہ:

پہلی مرتبہ جب وہ امام احمد کے اصرار پر امام شافعی سے ملے تو انہوں نے مکہ کے مکانات کو کرایہ پر دیے جانے کے متعلق ان سے مناظرہ کیا اور اسحاق کرایہ پر دینا جائز نہیں سمجھتے تھے اور امام شافعی جائز سمجھتے تھے، ان کا استدلال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ (حشر،ع ۱)

واسطے ان مفلسوں، وطن چھوڑنے والوں کے جو نکالے ہوئے آئے ہیں اپنے گھروں سے۔

من دیار کی نسبت مالکوں کی طرف کی گئی ہے یا غیر مالکوں کی طرف، فتح مکہ کے روز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من أغلق بابه فهو آمن و من دخل دار ابی سفیان فهو آمن۔

جس نے اپنا دروازہ بند کر لیا اور جو ابو سفیان کے گھر داخل ہو گیا اس کو امان ہے۔

یہاں دار و باب کی نسبت جس کی جانب کی گئی ہے کیا وہ اس کا مالک تھا یا نہیں؟ حضرت عمرؓ نے قید خانہ کے لئے جو مکان خریدا تھا، وہ اس کے مالک یا غیر مالک سے خریدا تھا؟ اسی طرح رسول کریمؐ نے فرمایا:

وهل ترك لنا عقيل من دار

یعنی کیا عقیل نے ہمارے لیے کوئی گھر چھوڑا ہے۔

اسحاق کی دلیل یہ تھی کہ ان کی رائے کی تائید بعض تابعین سے منقول ہے، امام شافعیؒ کا جواب یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے مقابلہ میں کسی شخص کی رائے حجت نہیں ہو سکتی، اسحاق کی دوسری دلیل یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: سَوَآءَ ۨالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ (الحج: ۲۵) یعنی مسجد حرام میں مکہ کے باشندوں اور باہر کے لوگوں دونوں کا برابر حق ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک یہ حکم مسجد حرام کے ساتھ خاص تھا، امام شافعیؒ کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مکہ کی زمین لوگوں کے لئے مباح ہوتی تو رسول اللہ ﷺ: لم يترك لنا عقيل مسكنا کے بجائے یہ فرماتے کہ جو جگہ ہم کو مل جائے یا جس شخص کے گھر میں بھی ہم لوگ اتر پڑیں وہ گھر اور جگہ ہمارے لئے مباح ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مکہ کی زمین لوگوں کی ملکیت بن سکتی ہے، اس لیے اس کو کرایہ پر بھی دیا جا سکتا ہے، آخر میں اسحاق کو امام شافعیؒ کی اصابت رائے کا اعتراف کرنا پڑا اور وہ شافعیؒ کی عظمت اور علم و فضل کے معترف ہو گئے اور جب کبھی ان کا ذکر کرتے تو تعریف و توصیف کرتے اور اپنی بات پر نادم بھی ہوتے۔

دوسرا مناظرہ:

دوسرے مناظرہ میں امام احمد بھی شریک تھے اور غالباً اسی کے متعلق ان سے روایت ہے کہ اس میں امام شافعیؒ کے مقابلہ میں اسحاق کی رائے وزنی معلوم ہوتی تھی، چنانچہ وہ اس مسئلہ میں اسحاق کے ہم نوا بھی ہو گئے تھے، اس مناظرہ کا موضوع بحث مردار کی کھال تھی، امام کے نزدیک وہ دباغت کے بعد پاک ہو جاتی ہے، اسحاق نے دلیل طلب کی تو انہوں نے

Marfat.com

حضرت میمونہؓ کی یہ حدیث بیان کی: ان النبی مر بشاۃ میتۃ فقال ھلا انتفعتم بجلدھا (آپؐ نے ایک مردہ بکری دیکھ کر فرمایا کہ کیوں نہیں تم لوگوں نے اس کی کھال سے فائدہ اٹھایا؟) اسحاق نے اس کے جواب میں ابن حکیم کی یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں یہ لکھایا کہ: لا تنتفعوا من المیتۃ باھاب و لا عصب (یعنی مردار کے غیر مدبوغ اور مدبوغ کسی قسم کے چمڑے سے انتفاع نہ کرو) اور یہ تحریر آپ کی وفات سے صرف ایک ماہ پہلے کی ہے، اس لیے میمونہ کی روایت اس سے منسوخ ہو جاتی ہے، امام شافعیؒ نے فرمایا کہ میں تو سماعی حدیث بیان کرتا ہوں اور آپ تحریر کا تذکرہ کرتے ہیں، اسحاق نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے قیصر و کسریٰ کے نام جو خطوط لکھے تھے وہ تحریری تھے اور اللہ کے یہاں ان کے خلاف حجت ہوں گے، اس جواب پر امام شافعیؒ خاموش ہو گئے۔

مذہب و مسلک:

اسحاق بن راہویہ خود صاحب مذہب مجتہد تھے، اس لیے چاروں مشہور اجتہادی مذاہب میں وہ کسی سے وابستہ نہ تھے، البتہ امام دارقطنی نے ان کو امام شافعیؒ کے راویوں میں اور امام بیہقی نے ان کے اصحاب میں ذکر کیا ہے، اسی طرح ابن خلکان نے لکھا ہے کہ مناظرہ کے بعد جب ان کو امام شافعیؒ کے علم و فضل کا اندازہ ہوا تو وہ ان کے اصحاب میں داخل ہو گئے اور ان کی کتابوں کو مہیا کر کے نقل کیا، (تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۱۲) لیکن ان آراء و اقوال سے ان کا شافعی المذہب ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ صرف امام شافعی سے تلمذ اور تعلق ظاہر ہوتا ہے، علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں ''امام شافعیؒ سے ان کا صرف اس حد تک تعلق ثابت ہے کہ اسحاق نے ان کی کتابیں لکھیں اور ان کی صحبت میں رہے لیکن امام ابو ثور کی طرح ان کے بھی مختارات و اجتہادات ہیں، البتہ ان کا رجحان امام احمد کی طرح حدیث و اتباع سلف کی جانب زیادہ تھا۔'' (الانتقاء ص ۱۰۸)

عقیدہ و کلام:

اسحاق بن راہویہ اتباع سنت اور طریقۂ سلف کی پیروی میں نہایت متشدد تھے، اس لیے کلام و عقائد کے غیر ضروری مسائل میں بحث و تدقیق اور غور و خوض ناپسند کرتے تھے، ان کے زمانہ میں خلق قرآن کا معرکہ آراء مسئلہ پیش آیا، گو انھوں نے امام احمد کی طرح اس میں اولوالعزمی اور ثابت قدمی نہیں دکھائی مگر وہ بھی قرآن کو خدا کا کلام اور غیر مخلوق سمجھتے تھے، احمد بن سعید رباطی کا شعر ہے۔

لم یجعل القرآن خلقا کما قد قالہ زندیق فاسق

اسحاق بن راہویہ نے فاسق اور زندیق شخص کی طرح قرآن کو خدا کی مخلوق قرار نہیں دیا۔

زہد و اتقا:

امام ابن راہویہ کے زہد و اتقا کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ وہ حدیث و فقہ اور حفظ و صدق کی طرح ورع و تقویٰ کے بھی جامع تھے، محمد بن اسلم طوسی نے ان کی وفات کے وقت فرمایا: ''میں نے ان سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا) (فاطر: ۲۸) یعنی اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔'' (تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۲، تاریخ بغداد ج ۶ ص: ۳۴۵)

Marfat.com

وفات:

مشہور روایت کے مطابق انہوں نے ۷۷ سال کی عمر میں بروز یکشنبہ ۱۴ یا ۱۵ شعبان ۲۳۸ھ کو انتقال کیا، ۲۳۷ھ بھی روایت کی گئی ہے، ایک شاعر کے مرثیہ کا شعر ہے:

یاھدۃ ماھددنا لیلۃ الاحد فی نصف شعبان لاتنسی مدی الابد

جس سانحہ عظیم سے ہم لوگ اتوار کی رات میں ۱۵ شعبان کو دوچار ہوئے، اس کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

آپ کی قبر زیارت گاہ خلائق ہے، بعض بزرگوں نے آپ کی بخشش و مغفرت کے خواب بھی دیکھے۔

(تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۵۵ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۴)

اولاد:

آپ کی اولاد میں تین صاحبزادوں کا نام ضمناً ملتا ہے: (۱) ابوالحسن علی، (۲) محمد (۳) یعقوب۔

(تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۴۷ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۰ و طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۲)

تصنیفات:

علمائے طبقات و تراجم نے ان کو صاحب تصانیف کثیرہ لکھا ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب ضائع ہو گئیں جن تصنیفات کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ کتاب السنن فی الفقہ: (الفہرست ص ۳۲۱) اس کے نام سے موضوع ظاہر ہے۔

۲۔ کتاب التفسیر: علامہ سیوطی نے عہد تابعین کے بعد کی جن تفسیروں کو اہم اور اقوال صحابہؓ و تابعینؒ کی جامع قرار دیا ہے ان میں سفیان بن عیینہ اور وکیع بن جراح وغیرہ کی تفسیروں کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ (الاتقان ۲ ص ۱۹۰) اس کو وہ خود باقاعدہ مرتب و مکمل بھی کر چکے تھے اور اس کا املا بھی کرایا تھا۔

۳۔ مسند: یہ ان کی سب سے اہم اور مشہور تصنیف اور ۶ جلدوں پر مشتمل ہے، (تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۱۳) حاکم نیشاپوری نے دوسرے دور کی مسانید میں امام احمد کی مسند کے ساتھ اس کا نام بھی گنایا ہے۔ (المدخل فی اصول الحدیث ص ۴) ان کی ترتیب و تکمیل سے بھی وہ اپنی زندگی میں فارغ ہو چکے تھے اور اپنے شاگردوں کو زبانی اور پڑھ کر اس کا املا بھی کرایا تھا، علامہ سیوطی فرماتے ہیں۔

واسحاق یخرج امثل ماورد عن ذالک الصحابی فیما ذکرہ الرازی۔ (تدریب الراوی ص ۵۷)

ابوزرعہ رازی کا بیان ہے کہ اسحاق ان ہی روایتوں کی تخریج کرتے تھے جو اس صحابی کی سب سے بہتر اور اچھی روایت ہوتی تھی۔

اس مسند کا ایک قلمی نسخہ علامہ سیوطی کے قلم کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے، علامہ ذہبی نے ان کے رجال کے نقد میں ایک مستقل کتاب لکھی تھی، اس کو بھی سیوطی نے اس نسخہ کے حاشیے میں درج کیا ہے۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۵)

Marfat.com

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۴۱ھ)

نام ونسب:

احمد نام، ابوعبداللہ کنیت، شیخ الاسلام اور امام السنۃ القاب، شیبانی، ذہلی، بصری، مروزی اور بغدادی نسبتیں ہیں، سلسلہ نسب یہ ہے: احمد بن محمد بن حنبل بن ہلال بن اسد بن ادریس بن عبداللہ بن حیان بن عبداللہ بن انس بن عوف بن قاسط بن مازن بن شیبان۔

خاندان:

امام احمد خالص عربی النسل تھے، ان کا خاندانی سلسلہ بنی شیبان سے جو قبیلہ عدنان کی شاخ ہے، سے ملتا ہے، یہ خاندان اپنی شجاعت، دلیری اور غیرت وحمیت کے لیے ہمیشہ سے مشہور تھا، آپ کے دادا حنبل امویوں کے عہد میں سرخس کے گورنر اور والد محمد ایک بہادر سپاہی تھے جن کا ۳۰ سال کی عمر ہی میں جب کہ امام احمد صرف ۳ سال کے تھے انتقال ہوگیا، آپ کی والدہ ماجدہ نے پرورش وپرداخت کی۔

دنیوی وجاہت کی طرح علمی حیثیت سے بھی یہ خاندان بہت ممتاز تھا اور اس میں متعدد علما وفضلا، مقررین، شعرا اور ماہرین انساب گزرے ہیں۔ (تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۸ و ۲۹ تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۱۲)

ولادت:

امام احمد ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے بعض مورخین نے تصریح کی ہے کہ ربیع الاول کا مہینہ تھا۔ (تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۸)

مقام پیدائش:

امام صاحب شکم مادر ہی میں تھے کہ ان کی والدہ مرو سے بغداد تشریف لے آئیں، یہیں امام صاحب کی ولادت ہوئی، ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ مرو میں پیدا ہوئے تھے اور شیر خوارگی کے زمانہ میں بغداد آئے۔ (تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۸)

وطن:

آپ کا خاندان ایک عرصہ تک بصرہ میں آباد رہا، آپ کے دادا خراسان تشریف لائے یہاں روز اور مروشاہجہان نام کے دو شہر قریب ہی آباد تھے، امام صاحب کا تعلق دوسرے مرو سے تھا جو ہر زمانہ میں اکابر علماء وفضلا کا گہوارہ رہا ہے۔ (معجم البلدان ج ۸ ص ۳۵) لیکن امام صاحب کی نشوونما بغداد میں ہوئی اور یہیں آپ کی عمر کا اکثر حصہ بسر ہوا، اس لیے اسی کو آپ کا

Marfat.com

اصلی وطن سمجھا جاتا ہے۔

ابتدائی تعلیم:

امام صاحب کی تعلیم کا سلسلہ بچپن ہی میں شروع ہو گیا تھا، ۴ سال کی عمر میں انہوں نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا، سات سال کی عمر میں حدیث پڑھنا شروع کر دی اور ۱۵، ۱۶ سال کے سن میں اس کی باقاعدہ طلب و تکمیل میں مصروف ہو گئے۔

رحلت و سفر:

امام صاحب عرصہ تک بغداد ہی میں رہ کر وہاں کے مشائخ سے سماع کرتے رہے اس کے بعد انہوں نے دوسرے مشہور مراکز حدیث کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، یمن، شام اور جزیرہ وغیرہ کا رخ کیا۔ (تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۱۲ و تہذیب الاسماء نووی ج ۱ ص ۱۱)

شیوخ و اساتذہ:

امام احمد نے آنکھیں کھولیں تو بغداد علماء و فضلا کا مرکز اور دینی علوم کا گہوارہ بنا ہوا تھا، اس لیے شروع میں وہ یہیں کے مشائخ اکابر کے دامن فیض سے وابستہ رہے، بغداد میں ان کی نظر سب سے پہلے مشہور محدث حافظ ہشیم بن بشیر واسطی (م ۱۸۳ھ) پر پڑی جو حضرت عبداللہ ابن عباس و ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مرویات کے متبحر عالم تھے چار سال تک اسی خرمن علم کی خوشہ چینی کرتے رہے، جب یہ آفتاب غروب ہو گیا تو دوسرے اساتذہ فن کی جانب متوجہ ہوئے، بچپن میں امام یوسف کے درس میں بھی شریک ہوئے تھے، سفیان بن عیینہ، سلیمان بن داؤد طیالسی، عبدالرحمن بن مہدی، عبداللہ بن نمیر، وکیع بن جراح اور یحییٰ بن سعید وغیرہ جیسے اکابر محدثین اور ائمہ وقت سے بھی ان کو استفادہ کا موقع ملا، (البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۶) امام احمد کے اساتذہ میں سب سے زیادہ ممتاز اور باکمال شخصیت امام شافعیؒ کی ہے، ان سے ان کے بڑے مراسم اور گوناگوں تعلقات تھے، فقہ کے علاوہ حدیث و انساب کا علم بھی ان سے حاصل کیا تھا، امام شافعی جب تک بغداد میں رہے وہ ان کے حلقۂ درس سے وابستہ رہے، جب مصر تشریف لے گئے تو امام احمد نے بھی وہاں جانا چاہا مگر عسرت و ناداری کی بنا پر اس کا موقع نہیں ملا، امام احمد کو امام شافعیؒ کی ذات سے بڑی عقیدت اور شیفتگی تھی، اور وہ ان کا ہمیشہ بڑا احترام کرتے تھے، امام شافعی سوار ہوتے تو یہ ان کے پیچھے پیچھے پیدل ان سے سوال کرتے جاتے تھے، ان کا خود بیان ہے کہ میں نے تیس سال سے کوئی ایسی نماز نہیں پڑھی جس میں امام شافعیؒ کے لیے دعا نہ کی ہو، (ایضاً) شفیق استاذ کو بھی اپنے لائق شاگرد سے بڑی محبت اور ان کے علم و فضل اور دیانت و تقویٰ پر بڑا اعتماد تھا، ان سے روایت بھی کرتے تھے، امام احمد کا خود بیان ہے کہ امام شافعیؒ نے جتنا استفادہ ہم سے کیا اتنا ہم ان سے نہیں کر سکے، عبداللہ بن احمد کا بیان ہے کہ امام شافعیؒ کی کتاب میں حدثنی الثقه یا اخبرنی الثقه سے میرے والد ہی مراد ہیں، امام شافعی فتویٰ دیتے تو ان سے بھی مشورہ لیتے تھے، فرط تعلق کی بنا پر اکثر ان کے گھر بھی تشریف لے جایا کرتے تھے۔ (احمد بن حنبل ص ۲۹)

تلامذہ:

امام احمد کے تلامذہ کے مختلف طبقے ہیں، آپ کے اساتذہ میں حسن بن موسیٰ اشیب، زیاد بن ایوب، عبدالرحمن بن مہدی، عبدالرزاق بن ہمام، محمد بن ادریس شافعی، وکیع بن جراح، ہشام بن عبدالملک طیالسی، یحییٰ بن آدم اور یزید بن ہارون

Marfat.com

وغیرہ نے آپ سے استفادہ کیا ہے، خلف (حافظ ابن حجر نے ان کو بھی امام احمد کا استاذ بتایا ہے، تہذیب ج ۳ ص ۱۵۶) ابن ہشام داؤد بن وضی اور قتیبہ بن سعید ثقفی نے عمر میں بڑے ہونے کے باوجود آپ سے روایت کی ہے، ہم عصروں میں احمد بن ابی الحواری، حسین بن منصور، عبد الرحمٰن بن ابراہیم، عبید اللہ بن سعید سرخسی، علی بن عبد اللہ مدینی، محمد بن رافع قشیری، محمد بن یحیٰی بن ابی سمینہ اور یحیٰی بن معین وغیرہ کو آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے، اعزہ میں آپ کے چچیرے بھائی حنبل بن اسحاق اور صاحبزادگان صالح اور عبد اللہ کو آپ سے روایت کرنے کا فخر حاصل ہے، صحاح ستہ کے مصنفین میں امام بخاری، ۱ مسلم اور ابو داؤد بلا واسطہ اور امام ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ بالواسطہ آپ کے شاگرد ہیں، عام تلامذہ کی تعداد جن میں سے اکثر امام وقت سمجھے جاتے تھے بے شمار ہے۔

اہل علم کا اعتراف اور شہادتیں:

امام احمد کے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کے متعلق ان کے اساتذہ، معاصرین اور تلامذہ کے بکثرت اقوال طبقات وتراجم کی کتابوں میں موجود ہیں۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ''بغداد کو جب میں نے چھوڑا تو وہاں امام احمد سے زیادہ صاحب علم وفضل اور متدین ومتورع کوئی شخص نہیں تھا'' امام ابو ثور فرماتے ہیں کہ ''وہ سفیان ثوری سے بڑے عالم وفقیہ اور ہمارے شیخ وامام ہیں'' یحیٰی بن معین کا بیان ہے کہ ''میں نے ان سے بہتر آدمی نہیں دیکھا، ان کی توصیف وتعریف میں مبالغہ برا نہیں۔'' علی بن مدینی سے جب کہا گیا کہ ''امام احمد کا اس زمانہ میں وہی حال ہے جو سعید بن مسیب کا ان کے زمانہ میں تھا۔'' تو انہوں نے فرمایا کہ ''نہیں سعید بن مسیب کے زمانہ میں ان کی طرح کے لوگ موجود تھے مگر موجودہ دور میں امام احمد کی کوئی مثال نہیں، ابو عبید فرماتے ہیں کہ حدیث وسنت میں نہ امام احمد سے بڑا کوئی عالم ہے اور نہ علمائے اسلام میں ان کا کوئی مقابل۔

(طبقات الشافعیہ سبکی ج ۱ ص ۲۰۰ وطبقات الفقہاء شیرازی ص ۷۵، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۳۹، ۴۰ وتاریخ بغداد ج ۴ ۱۴ والبدایہ ج ۱۰ ص ۳۳۶)

امام صاحب کے مشہور شاگرد ابراہیم حربی فرماتے ہیں کہ ''ان کو اللہ نے سلف وخلف کے علوم کا مخزن بنایا تھا، علی بن مدینی کا ارشاد ہے کہ ''وہ ہمارے اور اللہ کے درمیان حجت ہیں، جب کسی مسئلہ میں مجھ کو ان کا فتویٰ مل جاتا ہے تو میں بے تکلف اس پر عمل کرتا ہوں، ابو نصر بن ماکولا کہتے ہیں کہ ''ان کو صحابہ وتابعین کے مذاہب سے سب سے زیادہ واقفیت تھی۔

امام احمد کی عظمت اس سے بھی ظاہر ہے کہ علمائے امت نے ان کی مدح وتوصیف کو تقویٰ ودیانت کا ثبوت اور ذم وتنقیص کو ایمان کے منافی اور نفاق کی علامت قرار دیا ہے، سفیان بن وکیع فرماتے ہیں کہ ''امام احمد کی عیب جوئی کرنے والا فاسق وفاجر ہے۔'' احمد دورقی کا بیان ہے کہ ''امام احمد کی مذمت کرنے والے کو بے دین سمجھنا چاہیے'' ابو حاتم اور قتیبہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''امام سے محبت وعقیدہ رکھنے والا متبع سنت اور غیر مبتدع ہے ابن اعین نے ان دو شعروں میں یہی حقیقت بیان کی ہے:

---

۱ (محمد بن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے امام احمد سے کتاب المغازی کے آخر میں مسند بریدہ کے اندر احمد بن حسن ترمذی کے واسطہ سے ایک حدیث کی روایت کی ہے، کتاب الصدقات میں محمد بن عبد اللہ انصاری سے روایت کرنے کے بعد لکھا ہے کہ وزادنی احمد بن حنبل عن محمد بن عبد اللہ انصاری اور کتاب النکاح میں حدثنا اخبرنا کے بجائے قال لنا احمد بن حنبل تحریر کیا ہے۔ (کتاب الجمع فی رجال الصحیحین ص ۵)

Marfat.com

اضحی ابن حنبل محنۃ مامونۃ — وبحب احمد یعرف المتنسک

واذا رأیت لاحمد متنقصا — فاعلم بان ستورہ ستھتک

(صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۱ و تہذیب الاسماء ج ا ص ۱۱۲،۱۱۱ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۴ و البدایہ ج ا ص ۳۴۲ و تاریخ بغداد ج ص ۴۲۰)

احمد کی ذات ایک بہترین کسوٹی ہے، ان کی محبت دینداری کی علامت ہے، اگر کوئی شخص ان کی مذمت کرتا ہے تو یقین مانو اس اس کی قلعی کھل کر رہے گی۔

فضل وکمال:

امام احمد بڑے بلند پایہ محدث اور ان تمام اوصاف وکمالات سے متصف تھے جو ایک امام حدیث میں ہونے چاہئیں۔

حافظہ:

ان کی قوتِ حافظہ کا کمال اس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے چار سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرلیا تھا، مؤرخین کا بیان ہے کہ ان کے پاس بارہ گٹھروں کے بقدر کتابیں تھیں اور وہ سب ان کو زبانی یاد تھیں، علی بن مدینی فرماتے تھے کہ ''ان سے بہتر کسی کا حافظہ نہیں تھا، احمد بن سعید دارمی کہتے ہیں ''امام احمد کی طرح باوجودیکہ وہ کمسن تھے کسی کو حدیثیں یاد نہیں تھیں، ابوزرعہ فرماتے تھے کہ ''ہمارے مشائخ میں ان سے بڑا کوئی حافظ حدیث نہیں تھا، ان کو لاکھوں حدیثیں یاد تھیں''۔

عدالت وثقاہت:

ان کی توثیق پر ائمہ فن کا اتفاق ہے، عجلی کا بیان ہے کہ ''وہ حدیث میں ثقہ وضابط تھے'' ابن سعد لکھتے ہیں کہ ''وہ ثقہ و ثابت اور صدوق تھے'' امام نسائی ان کو ثقہ ومعتمد قرار دیتے ہیں، حافظ ابن حجر نے ان کو متقن کہا ہے، ابن حبان نے ان کا ثقات میں ذکر کیا ہے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ''بغداد کی عجیب چیزوں میں ایک یہ نوجوان بھی تھا کمسنی کی وجہ سے جس کے بال بھی سیاہ نہیں ہوئے تھے مگر جب وہ حدثنا کہتا تھا تو ہر طرف سے صدوق کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ (صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۱، تہذیب الاسماء ص ۱۱۱، طبقات سبکی ج ا ص ۲۰۰، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۴، ۳۰، ۳۱، تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۱۹، ۴۱۵، تہذیب التہذیب ج ا ص ۷۴، ۷۵، طبقات ابن سعد ج ا ص ۹۲)

نقد وتمیز:

وہ حدیثوں کے معتبر ناقل ہی نہ تھے بلکہ روایتوں میں امتیاز میں بھی پورا ملکہ رکھتے تھے، ابو حاتم فرماتے ہیں کہ امام احمد کو صحیح اور سقیم روایتوں کی معرفت میں بڑا کمال اور خاص امتیاز حاصل تھا'' ابو عبید کا بیان ہے کہ ''وہ حدیث ورجال میں سب سے بہتر مہارت اور اچھی پرکھ رکھتے تھے، امام شافعیؒ کو ان کی بصیرت پر اس درجہ اعتماد تھا کہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''جب کوئی روایت تمہارے معیار پر صحیح وثابت اتر جائے تو مجھے بھی بتلادو میں اس کو بے تکلف قبول کرلوں گا، عمر بن احمد ناقد کا بیان ہے کہ ''حدیث میں احمد کی موافقت کے بعد مجھ کو دوسروں کی مخالفت کی پروا نہیں ہوتی''۔

(تہذیب الاسماء واللغات ج ا قسم اول ص ۱۱۱ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۴ و البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۷)

Marfat.com

مسند درس:

چالیس سال کی عمر میں درس وتدریس کی مسند پر رونق افروز ہوئے، آپ کی مجلس درس بڑی باوقار، سنجیدہ اور شائستہ ہوتی تھی، لوگ ہمہ تن گوش رہتے اور مذاق ومزاح کا ایک کلمہ بھی زبان پر نہ لاتے، ابوعبید بیان کرتے ہیں کہ ”میں امام ابو یوسف، محمد بن حسن شیبانی، یحییٰ بن سعید اور عبدالرحمٰن بن مہدی وغیرہ باکمال محدثین وفقہا کے درس میں شریک رہا ہوں لیکن امام احمد کی طرح مجھ پر کسی کی ہیبت ووحشت طاری نہیں ہوئی، ان کی مجلس نہایت بارعب اور پروقار ہوتی تھی“ درس میں حاضرین اور شرکاء کا جم غفیر ہوتا تھا، علمائے سیر کا بیان ہے کہ پانچ پانچ ہزار کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے تھے۔

(صفۃ الصفوہ ج ۲ ص ۱۹۲)

مرجعیت ومقبولیت:

شہرت ونا موری اور امامت وسیادت سے کنارہ کش رہنے کے باوجود عالم اسلام کا کوئی گوشہ بھی آپ کے آوازۂ شہرت سے خالی نہ تھا، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ عنفوان شباب ہی میں ان کو پوری شہرت حاصل ہوگئی تھی اور بڑھاپے میں تو ہر جگہ ان کا نام روشن ہوگیا تھا۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۷) آپ کے دروازے پر طلبہ کا ہجوم رہتا تھا، جب قید کئے گئے تو عالم اسلام میں کہرام مچ گیا، بیمار ہوئے تو مزاج پرسی کے لیے لوگوں کا ایک جم غفیر ہر وقت موجود رہتا، جنازہ میں شرکت کرنے والے بے شمار تھے، وہ عوام وخواص ہر طبقہ میں یکساں مقبول اور ہر دل عزیز تھے، ادریس بن عبدالکریم مقری فرماتے ہیں کہ اکابر علما وفقہا اور نامور محدثین بھی ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے اور سلام کرنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے، عوامی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ ایک شخص کے سوال پر اس کو کوئی چیز دی تو دوسرے شخص نے اسے بقیمت خریدنا چاہا، مگر پہلے شخص نے یہ کہہ کر دینے سے انکار کردیا کہ ”مجھ کو بھی تمہاری طرح اس سے برکت کی امید ہے“ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ ”امامت وسیادت آپ کے نام کا جزو ہوگئی تھی۔“ (مجموعۃ الرسائل ص ۵)

عبادات واعمال

نماز:

نماز باجماعت ادا کرتے تھے، اپ کا ارشاد ہے کہ اذان سے پہلے ہی نماز کے لئے تیار ہوجانا چاہیے، جماعت کا اس قدر اہتمام تھا کہ جب خلق قرآن کے انکار کے جرم میں آپ کو کوڑے لگائے گئے اور بدن لہولہان ہوگیا اس وقت بھی ابن سماعۃ کی اقتدا میں نماز ادا کی، انہوں نے اعتراض کیا کہ خون سے لت پت ہونے کے باوجود آپ نے نماز پڑھی؟ جواب دیا کہ (قد صلی عمر وجرحہ یثعب دما) یعنی قاتلانہ حملہ میں حضرت عمرؓ کا جسم بھی لہولہان ہوگیا تھا مگر انہوں نے اسی حالت میں نماز ادا کی تھی، نمازوں میں استغراق ومحویت اور خشوع وخضوع کا یہ حال تھا کہ بقول عبدالرزاق ان کی نمازوں سے سلف کی یادتازہ ہوجاتی تھی۔

Marfat.com

نوافل:

آپ کے صاحبزادہ عبداللہ کا بیان ہے کہ میرے والد روز و شب میں تین سو رکعتیں نفل پڑھتے تھے، ابتلاء کے بعد ضعف کی وجہ سے ۱۵۰ رکعتیں کر دی تھیں۔

تہجد:

عشاء کے بعد تھوڑی دیر تک آرام فرماتے پھر ساری رات نماز اور یادِ الٰہی میں گزارتے بچپن ہی سے یہ معمول بن گیا تھا اور کبھی اس میں فرق نہ آنے دیتے، ابوبکر مروزی فرماتے ہیں کہ چار مہینے میں نے ان کے ساتھ قیام کیا، اس عرصہ میں کبھی انہوں نے تہجد ترک نہیں کیا۔ (صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۲، ۱۹۶، ۱۹۷، وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۱، ۳۶، البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۵)

تلاوت:

تلاوتِ قرآن سے بڑا شغف تھا، شب میں قیام اور دن کا اکثر حصہ تلاوت قرآن میں بسر ہوتا، ہر ساتویں دن اور ایک روایت کے مطابق ہر روز ایک قرآن ختم کرتے تھے۔

دعا و استغفار:

خدا سے دعا و استغفار اور تضرع و گریہ زاری بھی معمولات میں داخل تھے، بڑے مستجاب الدعوات تھے، آپ کی دعاؤں میں برکت و تاثیر دیکھ کر اکثر لوگ آپ سے دعا کی فرمائش کرتے تھے، ایک دفعہ آپ کے ایک پڑوسی نے اپنی اپاہج ماں کے لئے دعا کی درخواست کی تو امام صاحب سخت برہم ہوئے اور فرمایا کہ ہم تو خود تم لوگوں کی دعاؤں کے زیادہ محتاج ہیں، وہ آدمی اپنے گھر واپس لوٹ رہا تھا تو امام صاحب کی خادمہ نے راستہ میں آ کر اس کو بتایا کہ تمہاری واپسی کے بعد سے وہ برابر تمہاری ماں کے لیے دعا کر رہے ہیں، اس نے آ کر اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو خود اس کی ماں نے دروازہ کھولا اور بتایا کہ اب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی ہوں۔ (صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۲، ۱۹۷، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۵، ۳۶)

صدقہ و خیرات:

غربت و ناداری کے باوجود طبیعت میں بڑی فیاضی تھی، جہاں تک ہوسکتا غریبوں کی امداد فرماتے، امراء و سلاطین کے تحائف قبول نہ فرماتے، اگر کبھی مجبوراً قبول بھی کرنا پڑتا تو اس کو محتاجوں اور ضرورتمندوں میں تقسیم کر دیتے۔

روزہ:

روزوں کے اہتمام کا یہ حال تھا کہ قید خانہ میں سحری اور افطار کا انتظام ہونے کے باوجود پانی کے چند گھونٹ پی کر روزہ رکھتے، ایک دن جب معتصم باللہ کے جلاد کوڑے لگا رہے تھے تو کچھ ستو لائے اور کہا کہ اس ضعف و نقاہت کی حالت میں روزہ رکھنا ٹھیک نہیں ہے مگر آپ نے ان کی درخواست قبول نہ کی، فرض کے علاوہ مسنون اور مستحب روزے بھی اکثر رکھتے تھے، متوکل نے امام صاحب کے علاج کے لئے ابن ماسویہ طبیب کو بھیجا تو اس نے بتایا کہ امیر المومنین انہیں کوئی بیماری نہیں، ان کی کمزوری اور بیماری کی وجہ کم خوری اور نمازوں کی زیادتی ہے۔

Marfat.com

حج

پانچ مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، تین دفعہ ناداری کی وجہ سے پاپیادہ تشریف لے گئے، تیسری اور چوتھی مرتبہ مجاورت بھی کی۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۵، ۳۳۹، وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۰، ۵۰ وصفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۷ وتہذیب الاسماء ج ۱ ص ۱۱۲)

آخرت کا استحضار:

آخرت کے تصور اور مواخذہ الٰہی سے ان کا دل ہر وقت لرزہ براندام رہتا تھا، ان کی مجلسوں کا موضوع گفتگو یہی تھا، علی بن مدینی کو تاکید کی کہ "ہمیشہ آخرت کو پیش نظر رکھو۔"

دنیا سے بے رغبتی:

امام صاحب کی مجلس میں دنیا اور اس کے مزخرفات کا تذکرہ نہیں ہوتا تھا، اگر کوئی اس قسم کا تذکرہ کرتا تو آپ خاموش رہتے، مامون، معتصم، واثق اور متوکل ہر ایک نے مال و دولت کا انبار آپ کے قدموں پر نچھاور کرنا چاہا مگر آپ نے دنیا کے چند خزف ریزوں کی خاطر دین کا سودا نہیں کیا، آپ کے سامنے ابن ابی شیبہ، عبدالاعلیٰ اور دوسرے محدثین کے عیش وعشرت کا ذکر کیا جاتا تو فرماتے کہ دنیا چند روزہ ہے، اس سے کوئی بڑی مراد حاصل نہیں ہو سکتی، کل آخرت میں جو کامیاب ہوگا کامیابی اسی کی ہے، ایک مرتبہ مامون نے محدثین میں زروجواہر تقسیم کرنے کے لئے بھیجا تو آپ کے علاوہ کسی نے لینے سے انکار نہیں کیا، فرماتے تھے کہ مجھے سب سے زیادہ اس دن آرام ملتا ہے جس دن میرے پاس کوئی چیز نہیں ہوتی۔

(صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۲ و ۲۱۱ وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۸، ۳۹، والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۸ و ۳۲۹)

اتباع سنت اور محبت رسول:

امام کی زندگی کا مشن ہی سنت کی تائید وحمایت اور بدعات کا ابطال تھا، خلاف سنت کاموں کو دیکھ کر سخت برہم ہوتے تھے، اور سنت کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ نشست وبرخاست کو ناپسند کرتے تھے، خود کبھی قصداً سنت ترک نہیں کی اور جب اپنے کسی عمل کے خلاف سنت ہونے کا علم ہو جاتا تو فوراً اس سے باز آجاتے تھے، مرض الموت میں شدت الم کے باوجود کراہنا اس لئے پسند نہیں کیا کہ وہ خلاف سنت ہے، اکثر دعا فرماتے تھے: امتنا علی الاسلام والسنۃ (اے اللہ! اسلام اور سنت پر ہمارا خاتمہ کر)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری عقیدت ومحبت سے بھی آپ کا دل معمور تھا، قید خانہ میں آپ کو تین بال دیئے گئے اور بتایا گیا کہ یہ موئے مبارک ہیں، آپ نے انکو حرز جان بنائے رکھا اور انتقال کے وقت وصیت کی کہ قبر میں ان کو میری دونوں آنکھوں اور زبان پر رکھ دیا جائے۔ (صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۲، ۲۰۱ وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۸، ۳۹، والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۸، ۳۲۹)

جاہ ومنصب سے گریز:

آپ کی استغناء وبے نیازی نے کبھی کسی منصب واعزاز کو قبول کرنا گوارا نہیں کیا، خلفاء سلاطین نے مقرب بارگاہ بنانا اور انعام واکرام سے نوازنا چاہا مگر آپ نے ہمیشہ رد فرمایا، امام شافعیؒ نے خلیفہ ہارون سے یمن کے عہدۂ قضا کا ذکر کر کے ایک

Marfat.com

مناسب اور بہتر قاضی کے تقرر کی فرمائش کی، خلیفہ نے کہا آپ کے حلقہ میں جو موزوں شخص ہو اس کا انتخاب کر کے مجھے مطلع کیجیے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ انتخاب امام احمد پر پڑی، جب ان سے اس کا ذکر کیا تو امام احمد نے جواب دیا کہ میں تو آپ کے پاس طلب علم کے لئے حاضر ہوتا ہوں اور آپ مجھ کو عہدۂ قضا قبول کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں، اگر آپ کے پاس علم کی دولت نہ ہوتی تو اب میں آپ سے رسم وراہ ترک کر دیتا، امام شافعی یہ سن کر نہایت نادم اور پشیمان ہوئے۔
(تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۱ و البدایہ والنہایہ ۱۰ ص ۳۲۸)

امراء و سلاطین سے بے تعلقی:

امراء و سلاطین سے ہمیشہ بے تعلق رہے، خلفائے نے آپ کے سامنے مختلف قسم کی پیشکشیں کیں مگر انہوں نے ان کو ٹھکرا دیا، امیر المومنین عبداللہ ابن طاہر نے اپنے حاجب سے سلام کہلایا اور ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا امام صاحب نے فرمایا کہ یہ مجھے پسند نہیں ہے اور امیر سے مجھ کو توقع ہے کہ ایک ناگوار کام کی مجھ کو زحمت نہ دیں گے، ابن طاہر کا خود بیان ہے کہ ''میں دو آدمیوں (یحییٰ اور احمد) کو نہایت عزیز رکھتا ہوں لیکن دونوں نہ کبھی میرے یہاں آئے اور نہ دوسرے امرا کے قریب پھٹکے ہیں'' آپ کے چچا اسحاق نے آپ سے کہا کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کے لیے امرا کے یہاں جایا کریں اور اسحاق بن راہویہ کو مثال میں پیش کیا آپ نے جواب دیا کہ عم محترم! آپ اسحاق کے طرز عمل کو پیش کرتے ہیں، اگر میری ان سے ملاقات ہوئی تو میں ان کو بھی ضرور منع کروں گا، سلاطین و امرا کی صحبت فتنہ ہے، جب ہم ان سے دور اپنے کو محفوظ نہیں رکھ سکتے تو قریب ہونے کے بعد کیا حال ہوگا، متوکل اپنے پیش رووں کی غلطیوں کی تلافی کے لیے ہر وقت آپ کی دلجوئی کی فکر میں رہتا، روزانہ قاصد بھیج کر خیریت دریافت کرتا، معاملات سلطنت اور مہمات امور میں مشورے طلب کرتا، مال و دولت اور انعام واکرام سے مالا مال کرنا چاہتا مگر اس کا یہ التفات امام صاحب پر سخت بار ہوتا، آپ رو کر فرماتے: سلمت من ھؤلاء حتی اذا کان فی آخر عمری بلیت بھم (صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۲۰۱ وطبقات الشافعیہ سبکی ج ۱ ص ۲۰۳ وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۶ و ۴۰ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۹ واحمد بن حنبل والمحنہ ص ۱۳۶) (زندگی بھر میں ان لوگوں کی آزمائشوں سے محفوظ رہا لیکن آخر عمر میں ان کے فتنوں سے دوچار ہو رہا ہوں) کبھی ارشاد فرماتے: ھذا امر اشد علی من ذلک (یہ نوازشات کا معاملہ تو میرے لیے اس ابتلاء و آزمائش سے بھی زیادہ سخت اور شاق ہے) ان کو ہدایا و تحائف سے بھی سخت پرہیز تھا، ایک مرتبہ خلیفہ نے امیر بغداد عبداللہ بن اسحاق کو خط لکھا کہ امام صاحب کو کسی طرح دربار میں لائے، امام صاحب نے ضعف و نقاہت کا عذر کیا، متوکل کو معلوم ہوا تو اس نے لکھا کہ میں آپ کی دید اور قربت کا مشتاق اور دعا و برکت کا خواستگار ہوں، اس لیے امام صاحب کو مجبوراً اس کے لشکر گاہ میں قیام کرنا پڑا، خلیفہ روزانہ آپ کے لیے پر تکلف کھانے اور انواع و اقسام کے میوہ جات بھجواتا مگر آپ نے کبھی ان کو تناول نہیں فرمایا، ۸ روز تک مسلسل روزے رکھتے رہے، سولہ دنوں تک وہاں قیام رہا اس مدت میں صرف ستو پر اکتفا فرماتے رہے، خلیفہ نے خلعت اور اپنی خاص سواری بھیج کر بلا بھیجا، آپ نے اس خیال سے کہ واپسی کی اجازت مل جائے گی، جانا منظور کر لیا لیکن ایک ٹٹو پر سوار ہو کر تشریف لے گئے، خادم نے ایک بیش قیمت جوڑا پہنایا، چند دنوں کے بعد واپسی کی اجازت ملی تو شاہی خلعت وہیں چھوڑ دی اور فرمایا کہ اس کو بیچ کر اس کی قیمت غرباء و مساکین میں تقسیم کر دی جائے، اس کے باوجود عرصہ تک اس واقعہ سے متاثر اور اس کی اذیت محسوس کرتے رہے، اپنے اعزہ و متعلقین کو بھی امرا

Marfat.com

کے یہاں آمد ورفت اوران کے ہدیے قبول کرنے سے منع فرماتے تھے، بعض اعزہ کے یہاں آمدورفت بھی اس لیے ترک کر دی تھی کہ وہ سلاطین کے یہاں نشست وبرخاست رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ خلیفہ نے آپ کے اہل وعیال کے لیے چار ہزار درہم بھجوائے، امام صاحب نے انکار کرنا چاہا تو خلیفہ نے کہلایا کہ یہ تو اہل وعیال کے لیے ہے، امام صاحب سن کر خاموش ہو گئے لیکن متعلقین کو ملامت اوران کے سامنے دنیوی زندگی کی بے ثباتی اور آخرت کی حیات سرمدی کا ذکر فرماتے رہے، ان لوگوں نے عرض کیا کہ حدیث میں ہے کہ اس مال کو لینے میں کوئی قباحت نہیں جو بلا طلب مل جائے اور حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم بھی امرا کے تحائف قبول فرماتے تھے، آپ نے فرمایا کہ اس میں اوران بزرگوں کے معاملہ میں بڑا فرق ہے اگر مجھ کو بھی معلوم ہو جائے کہ یہ مال ظلم و جور سے حاصل نہیں کیا گیا ہے تو لینے میں تامل نہ ہوگا۔

ایک دفعہ تین روز کا فاقہ تھا، اپنے کسی شاگرد سے آٹا قرض لیا، گھر والوں نے بھوک کی شدت کا خیال کر کے فوراً روٹی پکا کر حاضر کر دی، دریافت فرمایا کہ اس قدر جلد کس طرح روٹی پک گئی بتایا گیا کہ صالح کے یہاں آگ جل رہی تھی وہیں پکا لی گئی، صالح امرا وسلاطین کے تحفے قبول کرتے تھے، اس لیے آپ نے ان کے چولہے پر پکی ہوئی روٹیاں کھانے سے انکار کر دیا اور حکم دیا کہ صالح کے گھر میں جانے کا دروازہ بند کر دیا جائے۔

متوکل نے امام صاحب کے اخراجات کے لیے یعقوب بن قوصرہ کے ہاتھ دس ہزار درہم بھجوائے، امام صاحب نے لینے میں لیت ولعل کیا، یعقوب نے کہا کہ اگر آپ اسے قبول نہیں فرماتے تو خلیفہ کو آپ سے بدگمانی ہوگی اور روپے رکھ کر چلے گئے، رات کے آخری پہر میں امام صاحب نے اپنے بیوی، بچوں اور دوسرے متعلقین کو اکٹھا کر کے فرمایا کہ ان روپیوں کی وجہ سے مجھے رات بھر نیند نہیں آئی، اس لیے ان کو ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے، چنانچہ ان لوگوں نے اسی وقت بصرہ وبغداد کے محتاج اور ضرورت مند محدثین کی ایک فہرست تیار کی اور صبح ہوتے ہی ساری رقم تقسیم کر دی گئی۔

(تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۶ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۸ تا ۳۴۰)

خودداری:

احباب اور مخلصین سے بھی کسی قسم کا انتفاع خودداری کے منافی سمجھتے تھے، حسن بن عبدالعزیز نے ایک مرتبہ ایک ہزار دینار کی تین تھیلیاں بھیجیں اور کہلایا کہ ”یہ حلال وطیب مال ہے اس کو قبول فرمایئے اور اہل وعیال کو اس سے فائدہ اٹھانے دیجیے، امام صاحب نے واپس کر دیا اور کہلا بھیجا کہ ”ہم کو اس کی ضرورت نہیں، بحمد اللہ ہم آرام وراحت سے ہیں، عبدالرزاق کے سامنے امام احمد کا ذکر کیا گیا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا کہ ایک دفعہ وہ میرے پاس آئے مجھے معلوم تھا کہ ان کے پاس خرچ نہیں ہے، اس لیے میں نے خلوت میں لے جا کر دس دینار نذر پیش کی، مسکرا کر فرمایا، میں نہایت آرام سے ہوں، آپ نے ناحق زحمت گوارا کی، اگر میں اور لوگوں سے اس قسم کی رقمیں لیتا ہوتا تو اس کے قبول کرنے میں تامل نہ ہوتا۔

(تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۶ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۸ تا ۳۴۰ ایضاً باختلاف صفات وصفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۳)

Marfat.com

انکسار و تواضع:

طبعاً بڑے متواضع اور منکسر المزاج تھے، خاندانی نجابت، علمی برتری، مذہبی عظمت اور غیر معمولی شہرت و مقبولیت کے باوجود ان میں کبر و غرور کا شائبہ بھی نہ تھا، یحییٰ ابن معین فرماتے ہیں کہ میرا اور ان کا پچاس سال سے سابقہ ہے مگر انہوں نے اپنے خیر و صلاح اور خاندانی وجاہت پر فخر و برتری کا اظہار نہیں کیا، ایک شخص نے کہا آپ عربی النسل ہیں، ارشاد ہوا کہ "ہم مسکین اور فقیر لوگ ہیں، محمد بن حسن فرماتے ہیں کہ جب وہ راستہ چلتے تو کوئی آگے پیچھے نہ ہوتا، اس کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے، ابو عوانہ کے درس میں شریک ہونے کے لیے گئے تو لوگوں نے ممتاز جگہ پر بٹھانے کی کوشش کی، آپ نے کہا میں شیخ کے سامنے بیٹھوں گا، ہم کو معلمین کے سامنے تواضع سے پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے، اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، صالح کا بیان ہے کہ میرے والد کبھی دوسروں سے وضو کا پانی تک نہیں لانے کے لیے کہتے تھے بلکہ خود ہی کنویں سے پانی نکال کر وضو کرتے تھے۔ فوراً ان وفات سے دو دن پہلے عیادت کے لیے حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ کے غلام نے آپ کو پنکھا جھلنا چاہا آپ نے روک دیا، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ امام احمد پر خدا کی رحمت ہو، نہایت متواضع اور خلیق بزرگ تھے۔

(ایضاً باختلاف صفحات و تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۱۴)

شرافت و حسن خلق:

امام احمد شرافت اور حسن خلق کا پیکر تھے، کبھی کسی کے ساتھ بد سلوکی نہیں کی، اگر کوئی شخص آپ کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تو آپ اس کا اور بہتر بدلہ چکانے کی فکر کرتے، کوئی ناگوار خاطر بات کہتا تو خندہ پیشانی سے اس کو انگیز کر لیتے، زبان پر شکایت یا ملامت کا لفظ نہیں آنے دیتے، طالب علمی کے زمانہ میں مکہ تشریف لے گئے اور ابن سماعہ کے مکان میں قیام کیا، اتفاقاً ایک دن ان کے کپڑے اور جملہ سامان چوری ہو گیا، قیام گاہ پر واپس آئے تو ابن سماعہ کی والدہ نے اس کی خبر کی، آپ خاموش رہے اور صرف اس قدر فرمایا کہ میری تختیاں کیا ہوئیں جن پر میں حدیثیں لکھتا تھا۔ (تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۷)

وقار و متانت:

طبیعت میں وقار تھا اس لیے عام لوگوں سے ملنا جلنا، خواص کے یہاں آمد و رفت، بازاروں میں چلنا پھرنا ناپسند تھا، لطف و تفریح کے کاموں سے اس لیے پرہیز کرتے تھے کہ اس سے علم کی عظمت ختم ہو جاتی ہے، اگر کبھی متوکل کے دربار میں حاضر ہونا پڑا تو علم کی آن بان اور شان و شکوہ میں فرق نہ آنے دیا۔ (العبر ج ۱ ص ۴۳۵)

آپ کی متانت پر مزاح بھی بار ہوتا تھا اس لیے آپ کے اساتذہ بھی اس کا لحاظ کرتے تھے، ایک دن یزید بن ہارون نے اپنے شاگردوں کے سامنے مزاح کی کوئی بات کہی، بعد میں ان کو معلوم ہوا کہ امام احمد بھی موجود تھے تو سخت شرمندہ ہوئے اور سر پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ اگر تم لوگوں نے بتا دیا ہوتا کہ وہ موجود ہیں تو میں مذاق نہ کرتا، ایک روز اسماعیل بن علیہ کے شاگرد کسی بات پر ہنسے تو وہ سخت برہم ہوئے اور فرمایا کہ امام احمد کی موجودگی میں تم لوگ ہنسی مذاق اور بے شرمی کی باتیں کرتے ہو۔

خلوت پسندی:

خلوت پسند تھے ازدہام اور ہنگامہ آرائی کو سخت ناپسند کرتے تھے، جنازہ، جماعت اور عیادت کے علاوہ گھر سے باہر

Marfat.com

نہیں نکلتے تھے مگر انکے فضل وکمال نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنا دیا تھا، اس لیے ہر وقت طلبہ اور شائقین علم کا ہجوم رہتا تھا۔

نظافت و پاکیزگی:

طبیعت نظافت پسند تھی، گندگی سے سخت نفرت تھی، اکثر باوضو رہتے، ہمیشہ صاف ستھرے کپڑوں میں نظر آتے رہے۔
(تاریخ بغداد ج ۴ ص ۱۱۶ وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۰، ۳۵ وصفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۰)

ذریعہ معاش:

امام صاحب کی آمدنی کا اصل ذریعہ صرف ایک آبائی جائداد تھی جس سے کل سترہ درہم ماہوار کرایہ ملتا تھا، اسی میں تنگی ترشی سے بسر کرتے اور خدا کا شکر بجالاتے، اتنی حقیر آمدنی اہل وعیال کے خرچ کے لیے بالکل ناکافی تھی، اس لیے اکثر گھر میں فاقہ ہوتا تھا، کئی کئی دن تک چولہا جلنے کی نوبت نہ آتی، مگر فقر وفاقہ کا اثر کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے اور نہ کسی کا تحفہ اور ہدیہ قبول کرتے، ایک مرتبہ آپ کی والدہ کے پاس کپڑا نہ تھا، ایک صاحب نے ہدیہ کرنا چاہا تو منظور نہیں کیا، آپ کے احباب آپ کی حالت دیکھ کر آپ کی خدمت کرنا چاہتے، مگر انکار کر دیتے، آپ کے صاحبزادہ صالح کا بیان ہے کہ وہ اکثر لوگوں کی پیشکش مسترد کر دیتے اور ہمیشہ یہی فرماتے کہ الحمدللہ ہم لوگ آرام وعافیت سے ہیں، حالانکہ گھر میں ایک حبہ بھی نہیں ہوتا تھا، محنت ومزدوری کر لینا پسند تھا مگر کسی کے سامنے دست طلب دراز کرنا گوارا نہ تھا، ایک مرتبہ یمن میں تھے تو کپڑے چوری ہو گئے، کئی دن گھر سے نہ نکلے، جب لوگوں کو تلاش ہوئی اور حال معلوم ہوا تو کچھ روپیوں کا انتظام کیا گیا مگر آپ نے صرف ایک دینار قبول کیا اور اس کے معاوضہ میں ایک تحریر لکھی، بعض اوقات ازار بند بُن کر فروخت کر کے اخراجات پورے کرتے تھے، گھر میں پھٹا پرانا بوریا تھا اسی پر بیٹھتے تھے، انتقال کے وقت گھر میں چند چیتھڑوں کے علاوہ کچھ نہیں نکلا۔

غذا:

غذا بہت سادہ اور معمولی تھی، خشک روٹی کا ٹکڑا پانی سے تر کر کے نمک سے کھایا کرتے، پھلوں میں خربوزے سے شوق تھا، اکثر سرکہ کا استعمال کرتے، ایک درہم کی چربی مہینہ بھر کے لئے کافی ہوتی، آخر عمر میں چربی کھانا بھی چھوڑ دیا تھا، بیماری کے دنوں میں بھی نمک، سرکہ، اچار اور روٹی آپ کی خوراک تھی، ایک مرتبہ روزہ سے تھے، شام کو گھر سے افطار آیا، امیر بغداد نے کہا ذرا میں بھی دیکھوں، دیکھا تو چند روٹیاں اور کھیرا نکلا، اس نے کہا یہی سادگی اور قناعت تو آپ کو ہماری دعوتیں قبول کرنے نہیں دیتی، متوکل کے یہاں سے پر تکلف کھانا آتا مگر آپ ستو پر قناعت کرتے، اس نے ایک دفعہ دس ہزار درہم بھجوائے، امام صاحب نے سب صدقہ کر دیا، علی بن جہم نے کہا امیر المومنین ان کو مال ودولت سے کیا سروکار، ان کے لیے تو ایک نان جویں کافی ہے خلیفہ نے کہا تم صحیح کہتے ہو۔ (تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۸، ۳۹ وصفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۰)

لباس:

آپ کا عام لباس قمیص اور ازار تھا، سر پر عمامہ بھی باندھتے تھے، موٹا جھوٹا مگر سفید اور صاف ستھرا کپڑا زیب تن فرماتے تھے۔

Marfat.com

حلیہ:

رنگ ملیح مائل بہ سپیدی تھا، مگر چہرہ نہایت خوبصورت اور بارونق تھا، قد ایک روایت کے مطابق لانبا اور دوسری روایت کے مطابق میانہ اور درمیانی تھا، آخر میں داڑھی کے چند بال سفید ہوگئے اس لیے حنا کا خضاب لگاتے تھے۔
(تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۹، ۳۰، تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۸)

ابتلاء اور آزمائش

عباسی خلفا کے دور میں عجمی روح کی کارفرمائی اور یونانی منطق و فلسفہ کے اثرات نے عربوں کے سادہ مذاق طبیعت کو بدل دیا اور وہ سادہ اور سہل دین حنیف پر عقیدہ رکھنے کے بجائے لایعنی موشگافیوں اور فلسفہ و کلام کے غیر ضروری مباحث میں الجھ کر مختلف گروہوں میں بٹ گئے، ان میں فرقہ معتزلہ زیادہ مشہور اور ممتاز ہے، اس نے دین کی حفاظت و خدمت کا کام بھی انجام دیا لیکن اس کی بدولت مذہب میں نئے نئے اور بے بنیاد مسائل بھی پیدا ہوگئے، اس لئے محدثین جن کا مقصد زندگی احیائے سنت اور رد بدعت تھا، معتزلہ کے عقائد و افکار کے خلاف صف آرا ہوگئے، معتزلہ کے ان مسائل میں خلق قرآن کا مسئلہ بھی تھا۔

ہارون رشید کے زمانہ تک اس عقیدہ کو ماننے والے بہت تھوڑے لوگ تھے اور وہ بھی اپنے عقیدہ کا اعلان نہیں کرتے تھے، بشر مریسی کے متعلق جب خلیفہ کو معلوم ہوا کہ وہ اس عقیدہ کا قائل ہے تو اس نے قسم کھائی کہ اگر یہ شخص مجھ کو مل گیا تو میں اسے نہایت بے دردی سے قتل کر ڈالوں گا۔ (احمد بن حنبل والمحنۃ ص ۴۸، ۴۹)

اس کے بعد مامون خلیفہ ہوا، وہ بڑا علم و ادب نواز اور علما و شعرا کا قدرداں تھا، بچپن ہی میں اس کو برامکہ کی صحبت میسر آئی، فلسفہ کے مطالعہ اور مختلف زبانوں کی تعلیم اور غیر قوموں کے علما کی صحبت و معاشرت کے اثر سے وہ عقل پرست اور آزاد خیال ہوگیا، اس لیے ہارون رشید کے زمانہ میں جو معتزلہ گوشہ گیر تھے وہ اس کے زمانہ میں کھل کر میدان میں آگئے اور رفتہ رفتہ اس کے دربار سے وابستہ ہوگئے، مامون کی تائید و سرپرستی نے معتزلہ کے اثر و رسوخ کو بہت بڑھا دیا اور انہوں نے بزور شمشیر لوگوں سے خلق قرآن کا اقرار کرانا چاہا، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے محدثین و فقہا کی ایک جماعت جس کے سربراہ امام احمد ابن حنبل تھے، آگے بڑھی، معتزلہ کی قیادت احمد بن ابی داؤد (م ۲۴۰ھ) کے ہاتھ میں تھی جو نہایت فاضل و لائق شخص تھا، شروع میں مامون کو اس مسلک کی جبری تبلیغ و اشاعت میں تامل تھا (حیوۃ الحیوان دمیری ج ۱ ص ۱۵) بلکہ باقاعدہ اس کے اظہار میں بھی پس و پیش تھا، (احمد بن حنبل والمحنۃ ص ۵۳، ۵۴) لیکن احمد بن ابی داؤد کی حکمت و فراست نے اس کو اس پر آمادہ کر لیا اور ۲۱۸ھ میں اس نے اعلان کیا کہ جو لوگ خلق قرآن کا اقرار نہ کریں گے انھیں سخت سزا دی جائے گی۔

اس مسئلہ میں اس کو اتنی ضد پیدا ہوگئی کہ اسی زمانہ میں اس کو رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے طرسوس جانا پڑا تو وہاں سے والی بغداد اسحاق بن ابراہیم کو تاکیدی خطوط لکھے کہ لوگوں سے زبردستی اس عقیدہ کا اقرار کرایا جائے اور ممالک اسلامیہ کے تمام علما و فقہا اور مذہبی راہنماؤں سے اس مسئلہ میں ان کی رائیں دریافت کر کے مجھ کو مطلع کیا جائے، اس حکم کی تعمیل میں

Marfat.com

امام صاحب بھی طلب کیے گئے اور ان سے خلق قرآن کے متعلق سوال کیا گیا آپ اسحاق کے ردوکد کے باوجود صرف یہی فرماتے رہے کہ ''قرآن خدا کا کلام ہے، میں اس کو مخلوق نہیں کہہ سکتا۔''

اسحاق نے امام احمد اور دوسرے علما کے بیانات قلمبند کر کے مامون کے پاس بھیج دیئے، مامون نے اس کے جواب پر یہ حقارت آمیز تنقید کی تھی اور امام احمد کے بارے میں لکھا تھا کہ ''ان کے بارے میں جو کچھ تم نے لکھا امیر المؤمنین نے اسے پڑھا، احمد کو بتادو کہ امیر المؤمنین اس کے مفہوم و منشا سے پورے طور پر واقف ہیں، اس مسئلہ میں ان کے جاہلانہ عقیدہ سے مطلع ہوئے اس کا خمیازہ بہر حال ان کو بھگتنا پڑے گا۔''

خط کے آخر میں یہ حکم بھی تھا کہ ''بشر بن ولید اور ابراہیم بن مہدی کو توقتل کر دو اور باقی لوگوں میں جن کو رائے پر اصرار ہو پابہ زنجیر میرے پس بھیج دو، میں خود ان لوگوں کی موت وحیات کا فیصلہ کر دوں گا'' یہ فرمان جب مجمع عام میں پڑھ کر سنایا گیا تو اس کی ہیبت نے بڑے بڑے لوگوں کے عزم کو متزلزل کر دیا اور وہ مامون کے ہم زبان ہو گئے، علامہ قواریری اور سجادہ نے کسی قدر استقلال دکھایا مگر جب پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں تو دوسرے دن سجادہ اور تیسرے دن قواریری نے بھی اپنی رائے سے رجوع کر لیا اور صرف امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح آخر وقت تک ثابت قدم رہے، اس لیے ان کو مامون کے پاس پابجولاں بھیج دیا گیا مگر ابھی یہ لوگ رقہ ہی میں تھے کہ مامون کے انتقال کی خبر آ گئی۔ (ملخص از تاریخ طبری ج ۱۱ ص ۱۱۲، ۱۳۳)

مامون مرتے وقت ہونے والے خلیفہ کو وصیت کر گیا تھا کہ وہ عقیدۂ خلق قرآن کا لوگوں سے اقرار کرائے اور قاضی احمد بن ابی داؤد کو اپنے دربار سے وابستہ رکھے اور جملہ معاملات میں ان کی رائے و مشورہ پر عمل کرے، معتصم باللہ نے اس وصیت پر پورا پورا عمل کیا اور اس معاملہ میں اپنے پیشرو سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوا۔

امام احمد مامون کی وفات کے بعد طرسوس سے قید و بند کی حالت میں بغداد لائے گئے، راستہ میں ان کے رفیق محمد بن نوح کا انتقال ہو گیا، امام صاحب نے ان کی تجہیز و تکفین کی اور نماز جنازہ پڑھائی (طبقات الشافعیہ سبکی ج ۱ ص ۲۰۹ والبدایہ والنہایہ ۱۰ ص ۳۳۲) اور وہ اکیلے رمضان کے مہینہ میں بغداد پہنچے اور پیروں میں کئی بھاری بیڑیاں پہنا کر داخل زنداں کیے گئے اور پھر سزا کے لیے معتصم باللہ کے سامنے پیش کیے گئے، اس موقع پر لوگوں نے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی اور کہا آپ کے ساتھیوں میں سے تو کسی شخص نے عزیمت کی یہ راہ اختیار نہیں کی، آخر آپ کیوں اس قدر جوش و ہمت سے کام لے رہے ہیں؟ تو آپ نے جواب میں صرف اس قدر فرمایا کہ للہ اس قسم کی باتیں کرنے کے بجائے کتاب اللہ اور سنت نبویؐ سے کوئی ثبوت پیش کرو، ان دو چیزوں کے علاوہ میں کسی اور بات کا قائل نہیں، بعض لوگوں نے رخصت اور تقیہ کی حدیثیں پیش کیں، فرمایا لیکن حدیث خباب کے بارے میں کیا کہتے ہو، جس میں ہے کہ ''تم سے پہلے لوگوں کو آروں سے چیر دیا جاتا تھا مگر وہ لوگ اپنے دین سے روگردانی کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے'' آپ کے چچا اسحاق بھی آپ کی رہائی کے لیے کوشاں تھے، انہوں نے امام احمد سے کہا ''تمہارے ساتھی تو اقرار کر کے چھوٹ گئے اور تم قید و بند کی مشقت جھیل رہے ہو، آپ نے فرمایا چچا جان ''جاہل لوگ تو خیر ناواقف ہی ہیں لیکن جب علما تقیہ کا سہارا لیں تو آخر حق کس طرح واضح ہو گا'' اسحاق کا بیان ہے کہ انہوں نے مجھ کو بالکل لاجواب کر دیا۔ (احمد بن حنبل والمحنہ ص ۸۹)

معتصم باللہ کو اس مسئلہ سے اتنی دلچسپی اس لیے تھی کہ اول تو مامون کی وصیت تھی، دوسرے احمد بن ابی داؤد برابر اس کو تختی

Marfat.com

کرنے پر ابھارتے رہتے تھے، ورنہ وہ امام صاحب کے معاملہ میں نرم تھا، اس نے بار بار آپ کو سمجھانے کی کوشش کی اور یہاں تک کہا کہ احمد میں تم پر اپنے بیٹوں سے بھی زیادہ شفیق اور مہربان ہوں، اگر تم ذرا بھی اقرار پر آمادہ ہو جاؤ تو تمہیں رہا کر دوں گا اور خود اپنے ہاتھوں سے تمہاری ان بیڑیوں کو کھول دوں گا (طبقات الشافعیہ ج۱ ص ۲۱۲، ۲۱۳) ایک مرتبہ وہ امام صاحب کی گفتگو سے متاثر ہو گیا اور اس کی سختی میں بہت کمی آ گئی، مگر ابوداؤد نے یہ کہہ کر پھر ورغلایا کہ اگر آپ نے ان کو سزا نہ دی تو لوگ کہیں گے کہ مامون کے مسلک سے دستبردار ہو گئے اور انہوں نے آپ کو زیر کر لیا، یہ سن کر پھر امام صاحب سے بگڑ گیا، امام صاحب کی سزا کی تفصیل خود ان کی زبان سے سننے کے قابل ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جب میں معتصم کے قریب گیا تو سلام کرنے کے بعد کچھ دیر خاموش رہا، پھر عرض کیا، امیر المؤمنین رسول اللہ ﷺ نے کس چیز کی تعلیم دی ہے؟ اس نے کہا لا الہ الا اللہ کے اقرار و شہادت کی، میں نے عرض کیا کہ: ''میں تو اس کی شہادت دیتا ہوں'' پھر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت بیان کی جس میں وفد عبدالقیس کا ایمان کے متعلق سوال اور رسول اللہ ﷺ کا جواب مذکور ہے، میری گفتگو کے بعد اس نے ابن ابی داؤد سے کچھ باتیں کیں اور مجھ سے کہا اگر تمہارا معاملہ میرے پیش رو خلیفہ کے زمانہ سے نہ چلا آتا تو میں تم سے تعرض نہ کرتا، اس کے بعد عبدالرحمٰن کو مجھ سے بحث و مناظرہ کرنے کا حکم دیا، جس کا سلسلہ تین دن تک جاری رہا، میرے دلائل اور براہین کے سامنے سب کو عاجز اور خاموش ہو جانا پڑا، مگر وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے باز نہ آتے، بغداد کے گورنر اسحاق بن ابراہیم نے کہا، امیر المؤمنین یہ گمراہ اور کافر ہے، اس کو رہا کرنا دانشمندی کے خلاف ہے، خلیفہ نے غضبناک ہو کر کہا تم پر خدا کی لعنت ہو، مجھ کو امید تھی کہ تم میری بات مان لو گے، اب اس نے میرے جسم کے کپڑے اتارنے اور مجھ کو گھسیٹنے کا حکم دیا اور جلادوں کو طلب کیا، میں نے عرض کیا، امیر المؤمنین خدا سے ڈریئے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

لا یحل دم امرء مسلم یشهد ان لا اله الا الله الا باحدی الثلاث۔

بجز تین صورتوں کے کسی حال میں بھی کسی مسلمان کا جو لا الہ الا اللہ کا اقرار کرتا ہو خون بہانا جائز نہیں۔

دوسری حدیث میں نے یہ پڑھی:

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا اله الا الله فاذا قالوها عصموا منی دمائهم واموالهم۔

مجھے لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے تا آنکہ وہ لا الہ نہ کہہ دیں، جب انہوں نے لا الہ الا اللہ کہہ دیا تو ان کی جان و مال محفوظ ہو گیا۔

اس لیے آپ میرے خون کو کیسے حلال سمجھ رہے ہیں، میں نے تو حلال کرنے والے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا ہے، امیر المؤمنین جس طرح اس وقت میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں، اسی طرح آپ کو بھی خدا کے سامنے کھڑا ہونا ہے، میرا خیال تھا کہ اب وہ باز آ جائیں گے لیکن لوگ برابر ان کو اکساتے اور مجھ کو کافر اور گمراہ بتاتے رہے، معتصم نے ان کی باتوں سے متاثر ہو کر جلادوں کو مجھے کوڑے مارنے کا حکم دیا، اس حکم پر ہر جلاد دو کوڑے پوری قوت سے لگاتا، اس طرح مجھ کو بہت سے کوڑے لگائے گئے، ہر کوڑے پر مجھے غشی طاری ہو جاتی تھی، جب کوڑے لگانا بند کر دیا جاتا تو ہوش میں آ جاتا اور دیکھتا کہ معتصم میرے پاس موجود ہے اور کہہ رہا ہے، احمد کیوں نہیں لوگوں کی بات مان لیتے، دوسرے حاضرین کہتے کہ خلیفہ تم سے درخواست کر رہے ہیں اور تم ان کی بات ٹھکرا رہے ہو مگر میں کسی بات پر دھیان نہ دیتا، میرا اصرار صرف اس قدر تھا کہ:

Marfat.com

اعطونی شیئامن کتاب اللہ او سنۃ رسولہ حتی اقول بہ۔

میرے سامنے اللہ کی کتاب یا اس کے رسول کی سنت سے کوئی دلیل لادو تب ہی میں تمہاری بات مان سکتا ہوں۔

اس پر مجھ کو زدوکوب کیا جاتا، آخر میں مار کی شدت سے میرے ہوش وحواس بجانہ رہے اور تکلیف کا احساس تک ختم ہو گیا، اس سے خلیفہ خوفزدہ ہو گیا اور اس نے رہائی کا فرمان جاری کر دیا اور پورے اسی کوڑے زور وقوت سے لگائے جانے کے بعد میں ۲۵/ رمضان کو رہا کر دیا گیا۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۴ وطبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۲۱ تا ۲۱۳)

حافظ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ امام صاحب کو جب سزا دینے کیلئے لایا گیا تو بغداد میں ایک کہرام مچ گیا تھا اور جب پہلا کوڑا لگایا گیا تو آپ نے بسم اللہ کہا، دوسری مرتبہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہا، تیسری بار فرمایا: القرآن کلام اللہ غیر مخلوق اور چوتھی مرتبہ یہ آیت تلاوت کی: لَّن يُصِيبَنَآ إِلَّا مَا كَتَبَ ٱللَّهُ لَنَا، محمد بن اسماعیل روایت کرتے ہیں کہ ایک نوجوان کو میں نے یہ کہتے سنا کہ احمد کو اسی کوڑے جتنے زور سے لگائے گئے تھے اگر کسی ہاتھی کو بھی اتنے زور سے مارا جاتا تو وہ چیخ اٹھتا۔

(صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۸)

رہائی کے وقت بھی ابن ابی داؤد نے مزاحمت کی مگر اس کا بس نہ چلا معتصم باللہ نے ایک بہترین خلعت اور سواری دے کر روانہ کیا، آپ کے ہمراہ جم غفیر تھا، گھر آنے کے بعد آپ نے خلعت فروخت کر کے اس کی قیمت غربا ومساکین میں تقسیم کر دی۔ (احمد والمحنۃ ص ۱۳)

رہائی کے بعد معتصم باللہ کو امام صاحب کے ساتھ اتنی سختی برتنے پر ندامت ہوئی، اسحاق کو تاکید کی کہ امام صاحب کی خیریت سے برابر مطلع کرتا رہے، وہ ہر روز آپ کے گھر جا کر مزاج پرسی کرتا تھا، خلیفہ کی طرف سے طبی امداد بہم پہنچائی گئی، جب امام صاحب صحت یاب ہو گئے تو وہ بہت خوش ہوا اور سارے مسلمانوں میں بھی مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ (ایضا)

ابتلا کے بعد امام صاحب بہت کمزور ہو گئے، پشت پر ضرب کے جو نشانات پڑ گئے تھے، وہ ہمیشہ باقی رہے، کلائی میں ایسا کاری زخم لگا تھا کہ عمر بھر اس کی تکلیف محسوس کرتے رہے، آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''اللہ ابو الہیثم کی مغفرت کرے'' آپ کے فرزند عبداللہ نے دریافت کیا یہ کون شخص ہے؟ فرمایا جب مجھ کو کوڑے لگانے کے لئے جلادوں کے درمیان کھڑا کیا گیا تو ایک نوجوان نے پیچھے سے میرا دامن کھینچا اور کہا مجھ کو جانتے ہو؟ میں نے کہا نہیں، اس نے بتایا کہ میں مشہور عیار وشاطر ڈاکو ابو الہیثم ہوں، مجھے دنیا کے چند معمولی خزف ریزوں کے لئے مختلف وقتوں میں اٹھارہ ہزار کوڑے لگائے گئے مگر میں اپنے شیطانی اعمال سے باز نہیں آیا، تم کو خدا کی راہ میں مارا جائے گا اس لئے تمہارے دل میں راہ حق سے انحراف کا خیال بھی نہیں آنا چاہیے مجھ پر اس بات کا بڑا اثر ہوا اور اس سے بڑی تقویت حاصل ہوئی اب بھی جب ضرب کی شدت محسوس ہوتی ہے تو اس شخص کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اس کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔ (صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۸)

امام احمد نے سوائے ابن ابی داؤد کے ان تمام لوگوں کو جنہوں نے آپ کے ساتھ یہ ظالمانہ برتاؤ کیا تھا، معاف کر دیا، ابن ابی داؤد کے بارے میں فرماتے تھے کہ اگر وہ اس فتنہ کا داعی ومحرک نہ ہوتا اور اپنی بدعتوں سے باز آ جاتا تو اسے بھی معاف کر دیتا، واثق باللہ نے عفو خواہی کی تو ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے خاندان سے تمہاری قرابت وتعلق کی بنا پر میں نے اوّل روز ہی تمہیں معاف کر دیا تھا۔ (ایضا)

Marfat.com

معتصم باللہ کے بعد واثق باللہ خلیفہ ہوا، یہ بھی اس مسئلہ میں بڑا سخت تھا، اس نے بہت سے محدثین اور علمائے حق کو قید و بند اور قتل کی سزائیں دیں، مشہور صاحب عزیمت بزرگ احمد بن نصر خزاعی کو تختۂ دار پر چڑھایا لیکن امام احمد کے ساتھ کوئی سختی نہیں کی، البتہ ان کو جلاوطن کر دیا، امام صاحب اسکے زمانہ خلافت بھر روپوش رہے، جمعہ و جماعت کیلئے بھی باہر نہیں نکلتے تھے۔
(البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۵)

اس کے بعد متوکل خلیفہ ہوا، اس نے ان تمام عقائد و خیالات کو جو کتاب و سنت کے خلاف تھے بالکل روک دیا، امام صاحب کو ابتلا سے نجات دلوائی اور ان کے اعزاز و اکرام کا فرمان جاری کیا اور یہ اعلان بھی کرا دیا کہ قرآن مخلوق نہیں ہے، اس کی خلافت سے معتزلہ کے زور و قوت کا خاتمہ اور ان کا اثر کم ہو گیا۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۵، الطبقات الکبریٰ شعرانی ج ۱ ص ۴۷)

یہ فتنہ ۲۱۸ھ سے ۲۳۴ھ تک یعنی سولہ سال رہا اور امام احمد نے ۲۸ یا ۳۰ مہینے قید و بند اور مشقت و محن میں گزارے۔
(البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۶)

اس عظیم ابتلا سے جو امام احمد کی ہمت و عزیمت کا غیر معمولی نمونہ ہے، ان کی شہرت و مقبولیت میں بڑا اضافہ ہو گیا، امام صاحب کے دوسرے اوصاف و کمالات میں تو اور لوگ بھی شریک و سہیم تھے لیکن راہ حق میں یہ ثابت قدمی اور اولوالعزمی انھیں کا طغرائے امتیاز ہے، علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں ''امام احمد کی ذات گرامی صبر و ابتلا اور استقامت علی الحق کے لیے ضرب المثل ہے، تین جابر و قاہر بادشاہوں کے ظلم و استبداد اور غیر معمولی مشکلات و شدائد کے باوجود ان کی استقامت و عزیمت میں فرق نہ آیا، اور نہ وہ کتمانِ حق اور اخفائے علم کے مرتکب ہوئے اور نہ رخصتوں اور تقیہ کا سہارا لیا بلکہ ہر حال میں انہوں نے اپنے کو سنت نبوی اور آثار صحابہ سے وابستہ رکھا اور دین کی اشاعت اور بدعات کا استیصال کرتے رہے، یہ وہ مخصوص فضل و کمال ہے جس میں امام صاحب کا کوئی معاصر صاحب علم ان کا شریک نہیں''۔ (مجموعۃ الرسائل ص ۵)

اسحٰق بن راہویہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے اسلام کو دو آدمیوں کے ذریعہ اعزاز و غلبہ عطا کیا، امت میں ان دونوں کی کوئی مثال نہیں یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جنہوں نے فتنہ ارتداد کے موقع پر اس کا مقابلہ اور اسلام کی مدافعت کی، دوسرے امام احمد جو فتنۂ خلق قرآن کے زمانہ میں پیش پیش رہے۔

بعض بزرگوں نے آپ کی وفات کے بعد خواب دیکھا کہ آپ اس حق گوئی اور صبر و استقلال کی بنا پر خدا کے خاص فضل و انعام سے نوازے گئے۔ (تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۱۷ و ۴۱۸ و ۴۲۳، البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۲، ۳۴۲، وطبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۰۲، ۲۰۳ وابن خلکان ج ۱ ص ۲۸ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۲ و تہذیب الاسماء ج ۱ قسم ۱ ص ۱۵)

علالت و وفات:

۲/ ربیع الاول بروز چہار شنبہ کو شدید بخار میں مبتلا ہوئے، ۹ دن تک علالت کا سلسلہ جاری رہا، بیماری کے زمانہ میں عیادت کرنے والوں کا بڑا ہجوم رہتا تھا، مسجدیں بھر جاتیں تھیں، سڑکوں اور گلیوں میں لوگوں کا اتنا مجمع ہوتا تھا کہ آمد و رفت کے راستے بند اور خرید و فروخت دشوار ہو گئی تھی، لوگوں کو جب موقع ملتا تو جوق در جوق حاضر ہو کر سلام عرض کرتے، خلیفہ کو اس اژدہام کی خبر ہوئی تو اس نے گلیوں کے صدر دروازوں پر وقائع نگار متعین کر دیے جو لوگوں کو امام صاحب کے حال سے مطلع کرتے تھے، راستہ بند ہو جانے کی وجہ سے زائرین چھپ کر دیواریں پھاند کر امام صاحب کی زیارت کرتے، آخری روز ایک

Marfat.com

بزرگ داخل ہوئے اور فرمایا احمد اللہ کے حضور حاضر ہونے کو یاد کرو تو بے اختیار چیخ نکلی اور آنسو رخسار پر ٹپک پڑے، بھرائی ہوئی آواز میں بچوں کو بلوایا اور ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور انگلیوں میں خلال کرانے کے لیے کہا، وضو کرتے وقت برابر اللہ کو یاد کرتے رہے، وضو کرنے کے بعد روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، اس سے پہلے ایک مؤثر وصیت بھی کی تھی۔

تاریخ وفات ۱۲/ ربیع الاول ۲۴۱ھ ہے، اس وقت ۷۷ سال کی عمر تھی، ابن خلکان نے ۱۷/ ربیع الاول اور مؤرخین نے رجب اور ربیع الآخر کا مہینہ بھی لکھا ہے، وفات کی خبر مشتہر ہوتے ہی صف ماتم بچھ گئی، گلیوں اور سڑکوں پر آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے جو درد وغم کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

محمد بن طاہر امیر بغداد نے اپنے بچوں اور حاجب کے ہمراہ کفن بھجوایا مگر امام صاحب کے متعلقین نے اس کو لینے سے انکار کیا اور کہا کہ امیر نے جب زندگی میں ان کو ناگوار کاموں سے معاف رکھا تو موت کے بعد بھی معاف رکھیں۔

جنازہ میں اتنا بڑا مجمع تھا کہ صحرائے ابی قیراط سے جہاں جنازہ رکھا گیا تھا سوق رقیق اور قطعیہ کے پل تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے، محمد بن طاہر نے نماز کے بعد شرکا کا تخمینہ لگایا تو تقریباً آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں تھیں، ان کے علاوہ بے شمار آدمی سڑکوں، راستوں اور چھتوں وغیرہ پر تھے، عبدالوہاب وراق کا بیان ہے کہ جاہلیت اور اسلام میں کسی زمانہ میں بھی اتنے زیادہ آدمی کسی جنازہ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔

(صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۲۰۰ و ۲۰۱ و تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۲۲ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۵ و ۴۶)

امام کے فرزند عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سنا تھا کہ اہل بدعت اور ہمارے درمیان وجہ امتیاز جنازہ ہے، اللہ نے ان کی بات صحیح کر دی، بلاشبہ وہ امام سنت تھے، آپ کے سب سے بڑے حریف احمد بن ابی داؤد کی جو قاضی القضات بھی تھے، موت کی ایک شخص کو بھی پروا نہیں ہوئی، صرف حکومت کے ارکان اور وابستگان کی ایک محدود جماعت جنازہ میں شریک ہوئی۔

تجہیز و تکفین کے دن مسجد رصافہ میں جن لوگوں نے عصر کی نماز ادا کی تھی، ان کی تعداد بھی ۲۰ ہزار سے زیادہ تھی حاضرین کی زیادتی کی وجہ سے جنازہ کی نماز کئی بار ہوئی، اور عصر سے پہلے جسد مبارک کو قبر میں نہ رکھا جا سکا، تدفین کے بعد بھی نماز جنازہ کا سلسلہ جاری رہا، امیر بغداد محمد بن عبداللہ بن طاہر نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔

باب حرب کے مقبرہ میں امام صاحب کو دفن کیا گیا، وفات کے بعد بھی ایک عرصہ تک لوگ قبر پر آتے اور کئی دنوں تک نماز جنازہ پڑھتے رہے، مزار مبارک اب تک زیارت گاہ خلائق ہے۔

امام صاحب کی وفات اور مغفرت کے متعلق بعض کرامتیں اور خواب بیان کیے جاتے ہیں، متعدد لوگوں نے آپ کی مغفرت اور عالم آخرت میں آپ کے اعزاز و اکرام کے خواب دیکھے۔

ازواج و اولاد:

امام احمد نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں، پہلی بیوی عباسہ بنت فضل کے بطن سے بڑے صاحبزادہ صالح تولد ہوئے، ان کی وفات کے بعد ریحانہ سے شادی کی، ان کے بطن سے عبداللہ پیدا ہوئے، جب ریحانہ کا بھی انتقال ہو گیا تو ایک لونڈی کو خرید کر عقد میں داخل کیا، ان سے چھ لڑکے حسن، حسین محمد اور سعید اور ایک لڑکی زینب پیدا ہوئیں۔

Marfat.com

ابوالفضل صالح:

یہ امام صاحب کے سب سے بڑے فرزند اور ۲۰۳ھ میں پیدا ہوئے، کم سنی میں گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی وجہ سے ان کو امام صاحب سے نقل و روایت کا زیادہ موقع نہیں ملا، تاہم ان کے واسطے سے امام صاحب کی حدیثوں کا بڑا حصہ مروی ہے اور وہ فقہ حنبلی کے ناقلین میں بھی شمار کیے جاتے ہیں، آخر میں اصبہان کے قاضی مقرر کیے گئے، جب عہدۂ قضا پر مامور کیے گیے تو رو پڑے اور فرمایا کہ مجھے میرے والد یاد آ گئے، اس لیے رو پڑا، وہ مجھ کو اس حالت میں دیکھنا پسند نہ کرتے لیکن خدا شاہد ہے کہ میں نے قرضوں کی زیادتی اور اپنے والد کے اہل و عیال کی کفالت ہی کے خیال سے یہ منصب قبول کیا، رمضان ۲۶۶ھ میں وفات پائی۔

(مقدمہ ثلاثیات مسند احمد ص ۱۴ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۹)

ابوعبدالرحمٰن عبداللہ:

یہ نہایت ثقہ و ضابط اور بڑے بلند پایہ محدث تھے، (الفہرست ابن ندیم ص ۳۳۲) ان کو امام احمد کے علاوہ بھی متعدد کبار محدثین سے روایت کرنے کا فخر حاصل ہے، امام احمد صاحب کی روایتیں سب سے زیادہ انھیں کے واسطہ سے مروی ہیں، انہوں نے امام کی اکثر کتابوں کی بھی روایت کی ہے یکشنبہ ۲۲/ جماری الاولیٰ ۲۹۰ھ کو انتقال کیا، آپ کے بھتیجے زہیر بن صالح نے جنازہ کی نمازہ پڑھائی، میت میں ایک بڑے مجمع نے شرکت کی، وفات سے پہلے دریافت کیا گیا کہ آپ کس جگہ دفن ہونا پسند کریں گے؟ فرمایا مجھے معتبر طریقے سے معلوم ہوا ہے کہ قطیعہ میں کوئی پیغمبر مدفون ہیں اس لیے اپنے والد کے مقابلہ میں پیغمبر کے قرب و جوار میں دفن ہونا مجھ کو زیادہ پسند ہے۔ (مقدمہ ثلاثیات، مسند احمد ص ۱۵ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۲۹)

سعید امام صاحب کی وفات سے ۵۰ روز قبل پیدا ہوئے تھے، بعد میں کوفہ کے گورنر بھی مقرر ہوئے، محمد امام کی بیماری کے زمانہ میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے۔ (مقدمہ ثلاثیات، مسند احمد ص ۱۵، البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۴۱)

کلام وعقائد

امام احمد فقیہ و مجتہد ہونے کے باوجود عملی اور اعتقادی مسائل میں فقہا اور متکلمین کی طرح زیادہ تحقیق و تدقیق نہیں کرتے تھے بلکہ محدثین کے مسلک کے مطابق جو کچھ ظواہر حدیث سے ثابت ہوتا تھا اسی پر عمل کرتے اور اعتقاد رکھتے تھے، اس لیے جب ان سے اس قسم کے سوالات کیے جاتے تو وہ خاموش رہتے اور ان میں غور و تفتیش کو بدعت بتاتے، ایک شخص نے کرابیسی سے قرآن کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے کہا وہ اللہ کا کلام اور غیر مخلوق ہے، اس نے پوچھا متکلم اور قاری قرآن کے جن الفاظ کو پڑھتا اور ادا کرتا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کرابیسی نے کہا قاری کی قراءت اور متکلم کا قول مخلوق ہے، امام احمد سے اس کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے کہا اس طرح غیر ضروری سوالات اور مباحث میں غور و خوض اور ان کی بحث و تفتیش بدعت اور سکوت افضل ہے، (احمد بن حنبل والمحنہ ص ۳۳) ایک دفعہ الفاظ قرآن کے بارے میں آپ سے تین بار سوال کیا گیا آپ دو مرتبہ خاموش رہے تیسری مرتبہ امام بخاری نے جواب دیا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں، البتہ بندوں کے افعال

Marfat.com

مخلوق ہیں لیکن اس طرح کے مسائل میں پڑنا بدعت اور خلاف سنت ہے۔ (احمد بن حنبل المحنہ ص ۳۵)

گو امام احمد اس قسم کے مسائل عام مسلمانوں کے سامنے بیان کرنا پسند نہیں کرتے تھے تاہم اقتضاء ضرورت کی بنا پر ان سے اس طرح کے مسائل میں جو آرا منقول ہیں، ان میں بھی احتیاط پوری طرح ملحوظ ہے مثلاً:

صفاتِ الٰہی اور قرآن:

قرآن کے بارے میں امام صاحب کی رائے گزر چکی ہے ایک مرتبہ متوکل کو اس مسئلہ کے متعلق جواب دیتے ہوئے تحریر فرمایا: ''سلف صالحین قرآن کو کلام اللہ اور غیر مخلوق مانتے تھے اور یہی ہمارا بھی مسلک ہے، میں صاحب کلام نہیں اور نہ اس معاملہ میں کسی قسم کی بحث و تفتیش کو پسند کرتا ہوں، کتاب اللہ سنت نبوی اور صحابہ کرام و تابعین عظام سے جو کچھ ثابت و منقول ہے اس سے زیادہ کدو کاوش کو میں معیوب سمجھتا ہوں۔ (ایضاً ص ۱۵۹)

وہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ان صفتوں سے جو قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہیں متصف مانتے ہیں لیکن ان کی ماہیت حقیقت پر بحث و گفتگو کو ناپسند اور ان کی دور از کار تاویل کو بدعت سمجھتے تھے، ان کے نزدیک جس طرح اللہ قدیم ہے، اسی طرح اس کی صفات بھی قدیم ہیں اور کلام بھی خدا کی ایک صفت ہے اس لیے وہ قدیم ہے۔

تشبیہ اور جسمیت:

وہ اللہ کی تشبیہ اور جسمیت کے قائل نہیں ہیں اسی لیے (وجآء ربک) سے وجآء ثواب ربک مراد لیتے ہیں۔

(البدایہ والنہایہ ۱۰ ص ۳۲۷)

رؤیت باری:

عام اہل سنت والجماعت کی طرح امام احمد بھی عالم آخرت میں مؤمنین کے لیے اللہ کی رؤیت اور دیدار کے قائل ہیں، اس کے ثبوت میں متعدد قرآنی آیات و احادیث موجود ہیں، امام صاحب صہیب رومی کی ایک روایت سے بھی استدلال کرتے تھے جس میں: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ..... (یونس:۲۶) میں وَزِيَادَةٌ کی تفسیر رؤیت سے کی گئی ہے۔

(البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۷)

ایمان و اسلام:

امام احمد کے نزدیک ایمان قول و عمل دونوں سے عبارت ہے اور اس میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ (ایضاً) ان کا قول ہے کہ کار خیر سے ایمان میں اضافہ اور معاصی سے اس میں کمی ہو جاتی ہے، برے کاموں کے ارتکاب سے ایمان سلب ہو جاتا ہے لیکن اسلام باقی رہتا ہے، اسلام اس وقت ختم ہوتا ہے جب آدمی خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرتا یا فرائض میں کسی فرض کو تمرد کی وجہ سے ترک کر دیتا ہے، غفلت اور کوتاہی سے اگر کوئی شخص فرض بجا نہ لائے تو یہ خدا کی مرضی پر موقوف ہے کہ اسے عذاب دے یا معاف کر دے۔ (المناقب ابن جوزی ص 212)

Marfat.com

مرتکبین کبائر:

مرتکب کبائر کو کافر نہیں سمجھتے تھے، آپ کا قول ہے کہ "اہل توحید میں سے کوئی شخص کافر نہیں ہوسکتا خواہ وہ کبائر کا مرتکب ہی کیوں نہ ہو۔ (ایضاً)

لیکن وہ تارکِ صلوٰۃ کو کافر سمجھتے تھے، اس بارے میں ان کا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مناظرہ بھی ہوا تھا۔

مسئلہ خلافت: حضرت علیؓ کی ذات سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے تھے لیکن عام صحابہ کی عظمت و برتری کے بھی قائل تھے، خلفائے ثلاثہ اور حضرت امیر معاویہؓ وغیرہ کسی صحابی کو سبّ و شتم کرنا ان کے نزدیک معصیت ہے، خلافت کے معاملہ میں ان کا وہی نقطۂ نظر ہے جو عام اہل سنت والجماعت کا ہے، امام صاحب اس کی تائید میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت پیش کرتے تھے:

ماراه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن و مار أوه سيئا فهو عند الله سيئ۔

جس چیز کو جملہ مسلمان بہتر خیال کریں وہ اللہ کے نزدیک بہتر ہے اور جس کو سب برا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی برا ہے۔

فرماتے تھے کہ تمام صحابہؓ نے حضرت ابوبکر کو رسول اللہ کا خلیفہ منتخب کیا اس سے ان کی فضیلت و بزرگی خود ہی ثابت ہو جاتی ہے، عمر بن عثمان حمصی نے خلافت کے متعلق آپ کی رائے دریافت کی تو فرمایا، پہلے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ ہیں، اس کے بعد حضرت عمرؓ پھر حضرت عثمانؓ اور سب سے آخری خلیفہ حضرت علیؓ ہیں، جو لوگ حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ پر ترجیح دیتے ہیں وہ درحقیقت ان اجلہ صحابہؓ اور اہل شوریٰ پر نکتہ چینی کرتے ہیں جنہوں نے حضرت عثمانؓ کو مقدم قرار دیا تھا۔

(البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۸)

فقہ و اجتہاد [1]

کیا امام احمد فقیہ اور صاحب مذہب نہیں تھے؟

امام احمد کا شمار ان چار مشہور ائمہ اسلام اور فقہا مجتہدین میں ہوتا ہے جن کے اجتہادی مذاہب پر چوتھی صدی سے اب تک مسلمان عمل کرتے چلے آرہے ہیں لیکن بعض متقدمین علما کو ان کے فقیہ اور صاحب مذہب ہونے میں کلام ہے، علامہ ابن جریر فرماتے ہیں۔

انما هو رجل حديث لا رجل فقه۔ وہ صرف محدث ہیں، فقیہ نہیں۔ (ضحی الاسلام ج ۲ ص ۲۳۵)

علامہ ابن عبدالبر نے الانتقا میں محض ائمہ ثلاثہ کا تذکرہ کیا ہے، ابن قتیبہ نے ان کو فقہا کے زمرہ میں شامل نہیں کیا ہے، بشاری مقدسی نے ان کو فقہا کے بجائے اصحاب حدیث میں شامل کیا ہے (احسن التقاسیم ص ۳۷) مگر ان کے سوا اکثر علما متقدمین نے ان کو بلند پایہ فقیہ و مجتہد بھی مانا ہے اور امام فقہ و صاحب مذہب بھی تسلیم کیا ہے، امام شافعی تک نے ان کو فقہ و اجتہاد میں

---

[1] (امام احمد کے حالات اور کارناموں پر موجودہ زمانہ کے مشہور مصری عالم ڈاکٹر ابوزہرہ نے نہایت عمدہ کتاب تالیف کی ہے اور اردو میں اس کے کئی ترجمے ہو چکے ہیں اس کتاب کا یہ حصہ بڑا اہم اور نہایت بیش قیمت ہے، ہم نے بھی یہاں اس سے زیادہ استفادہ کیا ہے)

Marfat.com

امام بتایا ہے، (مختصر صفۃ الصفوہ ص ۲۲۱) اور متاخرین تو امام احمد کو محدث کے بجائے فقیہ ہی کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہیں، ساتویں صدی کے مشہور عالم دمیری نے اصحاب المذہب المتبوعہ میں ان کے مذہب کا ذکر کیا ہے (حیاۃ الحیوان ج ۱ ص ۸۱) اور اسی صدی کے مشہور مؤرخ علامہ ابن خلدون کا بیان ہے۔

وقد صار اهل الاسلام اليوم على تقليد هؤلاء الأيمة الاربعة۔ (مقدمہ ابن خلدون ص ۴۹۱)

اب مسلمان ان ہی چار اماموں کی تقلید کرتے ہیں۔

علامہ شہرستانی نے مسلمانوں کے اجتہادی مذاہب میں اس مذہب کو بھی شامل کیا ہے (الملل والنحل شہرستانی برحاشیہ الملل ابن حزم ج ۲ ص ۴۵) صاحب مفتاح السعادۃ لکھتے ہیں: امام احمد ان مجتہدین میں ہیں جن کے اقوال وآرا پر عمل کیا جاتا ہے اور جن کا مذہب اکثر شہروں میں مروج ہے'' (مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۹۸) صاحب کشف الظنون تحریر فرماتے ہیں ''مشہور مذاہب جن کی صحت مسلّم ہے چار ہیں اور وہ امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد کی جانب منسوب ہیں'' (کشف الظنون ج ۲ ص ۲۰۲) شاہ ولی اللہ صاحب رسالۂ الانصاف میں محدثین فقہا کے متعلق تحریر فرماتے ہیں ''ان لوگوں نے گزشتہ ائمہ فقہ کی تقلید پر اکتفا کرنے کے بجائے خود اصول وقوانین متعین کئے۔۔۔ان لوگوں میں بھی غیر معمولی فضل وکمال، فقہی بصیرت اور حدیث اور اس کے مراتب و درجات سے واقفیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ نمایاں امام احمد ہیں'' (الانصاف فی بیان سبب الخلاف ص ۱۳) اور عقد الجید میں فقہ اسلامی کے مذاہب اربعہ میں اس مسلک کو بھی شامل کیا ہے۔

علامہ شبلیؒ عہد مامون کے اہل کمال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اور خصوصاً امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا وہ پایہ ہے کہ اسلامی دنیا کے بڑے بڑے حصوں میں انھیں کے اجتہادی مسائل پر گیارہ سو برس سے آج تک مذہبی قانون بنے ہوئے ہیں۔''

(المامون ج ۲ ص ۱۸)

غرض ساتویں صدی بلکہ اس کے پہلے سے اسلامی فقہ وقانون اور اس کی تاریخ وتدوین کے سلسلہ میں امام احمد کا ایک امام فقہ اور صاحب مذہب کی حیثیت سے ذکر ہوتا چلا آرہا ہے، اس لیے جس طرح ان کا فقیہ ومجتہد ہونا مسلّم ہے اسی طرح صاحب مذہب اور امام فقہ ہونا بھی بلاریب ثابت ہے۔

متقدمین کا امام صاحب کو فقیہ وصاحب مذہب کی حیثیت سے تذکرہ نہ کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ آپ کے تفقہ و اجتہاد کے قائل نہیں تھے، بلکہ اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ امام صاحب پر حدیث کا اثر زیادہ غالب تھا، اس لیے ان بزرگوں نے ان کے نمایاں وصف وامتیاز کے اعتبار سے ان کو فقیہ کے بجائے صرف محدث ہی کہا اور لکھا۔

افتا کے شرائط:

امام احمد کے نزدیک علوم قرآن، اسانید صحیحہ، سنن نبوی اور متقدم علما کے اقوال سے پوری واقفیت کے علاوہ مفتی کے اندر مندرجہ ذیل اوصاف پائے جانے ضروری ہیں:

۱۔ اس کی نیت خالص ہو، ۲۔ علم، حلم، وقار اور سکینت سے متصف ہو، ۳۔ علم میں کامل اور صاحب غلبہ واختیار ہو تاکہ جرأت کے ساتھ اپنے فیصلوں کو نافذ کر سکے، ۴۔ بذات خود مکتفی اور مستغنی ہو یعنی دوسروں کا محتاج ودست نگر نہ ہو، ۔ لوگوں کے حالات اور ذہنی کیفیات سے باخبر ہو۔ (اعلام الموقعین ج ۳ ص ۲۳۸، ۲۳۴)

Marfat.com

فقہ حنبلی کے اصول:

حافظ ابن قیم نے امام احمد کے تفقہ واجتہاد کے حسب ذیل اصول بیان کئے ہیں۔

ا۔ نصوص:

فقہ حنبلی میں سب سے اہم اور مقدم چیز یہی ہے، اس میں کتاب وسنت دونوں شامل ہیں اس اصل کے ہوتے ہوئے کسی اور چیز کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ فتاوائے صحابہؓ:

امام احمد کے نزدیک نصوص کے بعد اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ صحابہؓ کے اقوال وفتاوی ہیں اور وہ ان کو کتاب وسنت کے بعد ہر چیز پر مقدم قرار دیتے ہیں، اگر کسی مسئلہ میں صحابہ سے مختلف اقوال منقول ہوں تو اس قول کو ترجیح دی جائے گی جو کتاب وسنت سے قریب تر ہو، اگر اس کا اندازہ نہ ہوسکے تو صرف اختلاف صحابہ کو ذکر کر کے خاموشی اختیار کر لی جائے گی اور کسی کو ترجیح نہ دی جائے گی۔ (اعلام الموقعین ج ص ۳۲) دوسرا اصول یہ ہے کہ افضل صحابی کا قول مرجح سمجھا جائے گا، مثلاً:

صحابہ میں اختلاف کی صورت میں خلفا کا قول مرجح مانا جائے گا، یا ایک جانب شیخین ہوں اور دوسری طرف دوسرے خلفا، تو شیخین کے قول کو اختیار کیا جائے گا، اسی طرح حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما میں اختلاف کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ کی رائے پر عمل کیا جائے گا، ایک صورت یہ بھی ہے کہ اگر ایک ہی درجہ اور مرتبہ کے صحابہؓ کے درمیان اختلاف ہو تو ایک کا قول دوسرے کے لیے حجت نہ ہوگا، امام صاحب سے اس کی بھی روایت کی گئی ہے کہ وہ اختلاف صحابہ کی صورت میں ان سب کے اقوال پر عمل کرنے کو بہتر سمجھتے تھے اور اپنی رائے سے کسی صحابی کے قول کو مرجوح قرار دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ (ایضاج ۳ ص ۳۷۸)

بعض لوگ امام صاحب پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ فتاوائے صحابہؓ کے مقابلہ میں نصوص کی بھی پروا نہیں کرتے، علامہ ابن قیم ان لوگوں کے جواب میں لکھتے ہیں:

امام احمد نص کی موجودگی میں اسی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے اور اس کے مخالف ہر چیز کو رد فرما دیتے تھے مثلاً حضرت عمرؓ کے برخلاف انہوں نے مبتوتہ کے متعلق فاطمہ بنت قیس کی حدیث اور جنبی کے تیمم کے بارے میں عمار بن یاسرؓ کی حدیث کو صحیح قرار دیا اور حضرت ابن عباسؓ اور ایک روایت کے مطابق حضرت علیؓ کے ایک فتویٰ کو جو سبیعہ اسلمی کی حدیث صحیح کے خلاف تھا رد فرما دیا۔ (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۳۲)

۳: ضعیف ومرسل روایات:

تیسرا ماخذ ضعیف ومرسل روایات کو بتاتے ہیں، اسحاق بن ابراہیم ہانی نے ان سے چند مسائل دریافت کئے جن کے متعلق بعض مرسل روایتیں موجود تھیں لیکن صحابہؓ وتابعینؒ سے بروایت صحیح وباتصال ان کے خلاف فتویٰ موجود تھا تو فرمایا کہ ''صحابہ سے جو کچھ باتصال ثابت ہے وہ مجھ کو زیادہ پسند ہے اور قیاس ورائے پر ان کو ترجیح دی جائے گی، آپ کے صاحبزادے عبداللہ نے دریافت فرمایا کہ صحیح وصالح اور ضعیف وسقیم روایتوں میں امتیاز نہ کرنے والے محدث اور فقیہ و صاحب رائے میں کس کے فتویٰ پر عمل کیا جائے گا، فرمایا ''میرے نزدیک رائے کے مقابلہ میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا

Marfat.com

زیادہ بہتر ہے"۔

یہ واضح رہے کہ ضعیف سے منکر، باطل اور ایسی حدیثیں مراد نہیں ہیں جن کے راوی متہم ہوں، دوسرے فقہا نے بھی اس اصول کو ایک حد تک اختیار کیا ہے، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے علاوہ امام اعظمؒ نے بھی قہقہہ اور نبیذ تمر سے وضو کئے جانے کے متعلق ضعیف حدیثوں کو قیاس پر ترجیح دی ہے۔

۴۔ قیاس:

سب سے آخری چیز قیاس ہے، امام صاحب محض ضرورت کے وقت اس کی اجازت اور ممکن حد تک اس سے پرہیز کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، اپنے ایک شاگرد کو تاکید کی کہ:

ایاک ان تتکلم فی مسئلۃ لیس لک فیھا اثر۔ (ایضاً ج ۱ ص ۳۱ و ۳۲)

جس مسئلہ میں اثر موجود نہ ہو اس میں بحث و کلام نہ کرو۔

لیکن ظاہریہ کی طرح وہ قیاس کے منکر نہیں ہیں، ان کا قول ہے کہ "کوئی شخص قیاس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا" البتہ وہ اہل عراق کی طرح قیاس میں زیادہ توسع کے قائل نہ تھے۔

ان اصول اربعہ کے علاوہ بھی بعض چیزوں کا امام احمد لحاظ کرتے تھے مثلاً اقوال تابعین، استصحاب، مصالح، سد ذرائع اور اجماع وغیرہ، ان کی تفصیل حنابلہ کی کتابوں میں موجود ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اجماع کے منکر تھے لیکن علمائے حنابلہ نے اس کی جو تشریح کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بعض شرطوں کے ساتھ اجماع کے قائل تھے۔

فقہ حنبلی کی خصوصیات:

۱۔ فقہ حنبلی کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس کا دار و مدار تمام تر حدیث و روایت اور نقل و اثر پر ہے، امام صاحب مقدور بھر احادیث سے انحراف اور بے تعلقی پسند نہیں کرتے تھے اور احادیث و آثار پر وسعت نظر کی بنا پر ان کو رائے و قیاس سے بہت کم کام بھی لینا پڑتا تھا، عبدالوہاب وراق کا بیان ہے کہ امام احمد نے ستر ہزار مسائل کا اخبرنا و حدثنا کہہ کر جواب دیا (ترجمہ احمد بن حنبل از ابوزہرہ ص ۲۳۰) اس خصوصیت کی وجہ سے اول تو امام صاحب غیر وقوع پذیر مسائل کے بارہ میں فتویٰ دینے سے احتراز فرماتے تھے، دوسرے فقہی تفریعات و تخریجات پر ان کے فتوے مبنی نہیں ہوتے تھے، اس لئے اس فقہ کو تمام تر احکام شرعی پر مبنی کہا جاسکتا ہے۔

۲۔ حیل و مخارج کا جو در اصل مذہبی قیود اور بندشوں سے بچنے کے ذرائع ہیں حنبلی فقہ میں وجود نہیں ہے۔

۳۔ بعض حیثیتوں سے فقہ حنبلی میں بڑی وسعت اور لچک بھی پائی جاتی ہے کیونکہ امام صاحب کے نزدیک عبادات اور ان مسائل و معاملات کو چھوڑ کر جن کی حلت و حرمت کی تصریح موجود ہے، اشیا کی اصل اباحت ہے، اس اصل کو تسلیم کر لینے کے نتیجہ میں حنبلی فقہ کے اندر بڑی لچک اور کشادگی پیدا ہوگئی ہے، اس لئے اگر ایک جانب نصوص شرعیہ سے شدت تمسک کی بنا پر اس مذہب میں فقہی استنباط کا دائرہ محدود ہو گیا ہے تو دوسری جانب حرام کرنے والی متعدد پابندیوں کو ختم کر کے اس نے بڑی سہولت بھی پیدا کر دی ہے۔

Marfat.com

۴۔ حنبلی مذہب نے اجتہاد کا دروازہ کبھی بند نہیں ہونے دیا اور ہر دور میں حنابلہ کے اندر ائمہ و مجتہدین موجود رہے۔

فقہ حنبلی کے رواۃ و ناقلین:

امام احمد نے اپنے اقوال و فتاویٰ خود منضبط نہیں کئے بلکہ وہ دوسروں کو بھی ان کے جمع و تدوین سے منع کرتے تھے، مگر بعض ضرورتوں کی بنا پر اسکی اجازت بھی ان سے ثابت ہے اسی لیے آپ کی زندگی میں آپ کے مذہب کا چرچا تو ہو گیا تھا مگر وہ آپ کے انتقال کے بعد مرتب و مدون کیا گیا، آپ سے براہ راست علوم کی تحصیل و تکمیل کرنے والے حسب ذیل حضرات ہیں۔

ابو بکر احمد بن اثر، احمد بن محمد بن حجاج مروزی، عبدالملک بن عبدالحمید، صالح بن احمد، عبداللہ بن احمد، حرب بن اسماعیل اور ابراہیم بن اسحاق حربی۔

لیکن فقہ حنبلی کے اصل جامع خلال ہیں۔ (اعلام الموقعین ج ا ص ۳۱)

خلال:

امام احمد کے اقوال و فتاوے کے اصل جامع و مرتب ابو بکر احمد بن محمد بن خلال (م ۳۱۱ھ) ہیں، انہوں نے ۲۰ سے زائد جلدوں میں امام احمد کے فتوے جمع کئے ان کو امام صاحب سے براہ راست کسب فیض کا موقع نہیں ملا لیکن مذہب میں ان کا درجہ بلند ہے، یہ فقہ حنبلی کے جامع و ناقل ہی نہ تھے بلکہ اس کے ناشر بھی ہیں۔

ابوالقاسم خرقی:

عمر بن حسین خرقی (م ۳۳۴ھ) بھی کبار حنابلہ میں ہیں، انہوں نے خلال کی کتابوں کی تلخیص اور ان میں اضافہ کیا، اور ان کی کتاب "المختصر" حنبلی مذہب کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہے اس کی متعدد شرحوں میں موفق الدین مقدسی کی شرح المغنی زیادہ مشہور اور اہم ہے۔

غلام الخلال:

ابو بکر عبدالعزیز بن جعفر (م ۳۶۳ھ) خلال کے مشہور شاگردوں میں تھے، اس لئے ان کو غلام الخلال کہا جاتا تھا، (شذرات الذہب ج ۳ ص ۴۵) انہوں نے بھی خلال کی کتابوں کی تلخیص اور ان میں اضافہ کا کام انجام دیا۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ اور انکے شاگرد حافظ ابن قیم بھی اس مذہب کے بڑے اہم رکن اور شارح سمجھے جاتے ہیں۔

اسلامی ملکوں میں اس مذہب کی اشاعت:

اس مذہب کی اشاعت بغداد سے ہوئی، شروع میں اس کو وہاں غلبہ بھی حاصل تھا، پھر بصرہ اور عراق میں پہنچا، ساتویں صدی میں مصر کے حدود میں داخل ہوا اور قاضی عبداللہ بن محمد حجاوی نے جو ۷۳۸ھ میں عہدۂ قضا پر متمکن تھے اس کی مصر میں عام نشر و اشاعت کی، اندلس میں تیسری صدی ہی میں یہ حنبلی مذہب داخل ہو چکا تھا، بقی بن مخلد (۲۰۱، ۲۷۶) وہاں سے بغداد آئے اور امام صاحب سے براہ راست اس کی تحصیل کی اور اندلس واپس جا کر جامع قرطبہ میں اس مذہب کا درس دینا شروع کیا، بشاری مقدسی نے اقلیم اقور، جرجان، رحاب، ماوراء النہر اور سوس وغیرہ میں بھی اس کے وجود کا ذکر کیا ہے۔

Marfat.com

(احسن التقاسیم ص ۱۲۶ الدیباج المذہب ص ۱۳ و مقدمہ ابن خلدون ص ۴۹۱ و حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۲۰۵)

اس زمانہ میں آل سعود کا جو مملکت عربیہ کے سربراہ ہیں یہی مذہب ہے اور سارے بلاد نجد وحجاز میں یہ سرکاری مذہب کی حیثیت سے مروج ہے۔

مذہب حنبلی کے متعلق بعض شکوک واعتراضات:

امام احمد کے مذہب ومسلک پر جو شکوک عائد کیے جاتے ہیں ان کی مختصر وضاحت ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

اتباعِ سنت:

حنبلی مذہب کے متبعین ہر زمانہ میں کم رہے اور مذاہب ثلاثہ کے مقابلہ میں اس کو زیادہ فروغ نہیں نصیب ہوسکا خود حنابلہ کو بھی اس کا اعتراف ہے، ان کا ایک شاعر معترضین کے جواب میں کہتا ہے:

یقولون لی قد قل تبعۃ احمد — وکل قلیل فی الانام ضئیل

فقلت لهم مهلا غلطتم بزعمکم — الم تعلموا ان الکرام قلیل

وما ضرنا انا قلیل وجارنا — عزیز وجار الاکثرین ذلیل

(اتحاف النبلاء ص ۱۸۴ بحوالہ ریحانۃ الاولیا خفاجی)

"لوگ کہتے ہیں کہ امام احمد کے متبعین کی تعداد کم ہے اور جو گروہ کم ہوتا ہے اس کو حقیر سمجھا جاتا ہے، میں نے ان لوگوں کو جواب دیا کہ تم توقف سے کام لو، تمہاری رائے صحیح نہیں ہے کیونکہ شرفا کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے، ہمیں اپنی قلت تعداد کا غم نہیں اور نہ اس سے ہم کو نقصان پہنچ سکتا ہے، اس لیے کہ ہمارے پڑوسی غالب اور مقتدر لوگ ہیں جب کہ ان لوگوں کے جن کی تعداد زیادہ ہے، پڑوسی ذلیل وخوار ہیں۔"

اس جواب میں شاعرانہ تعلی اور مبالغہ زیادہ ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ تعداد کی قلت وکثرت فیصلہ کن نہیں ہوا کرتی یہاں تک کہ میدان کارزار میں بھی صرف کثرت تعداد موثر نہیں ثابت ہوتی اس لیے نہ تو اس کو حق وانصاف کا معیار بنایا جاسکتا ہے اور نہ وہ فی نفسہ فخر ومباہات کی کوئی چیز ہے، علامہ ابن خلدون نے اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ "اس مذہب کو فقہی بصیرت اور اجتہادی شان سے کم سروکار ہے" مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ عام لوگ نہ تو کسی چیز کو اس کی صحت یا خوبیوں کی بنا پر قبول کرتے ہیں اور نہ غور وفکر کے بعد اس کو اختیار کرتے ہیں، ان کا ردوقبول عموماً پروپیگنڈہ، وقتی سیاست اور بعض اجتماعی عوامل واثرات کا نتیجہ ہوتا ہے، ذیل میں اس کے چند وجوہ درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مذہب شاہانہ سرپرستی سے اکثر محروم رہا کیونکہ امام احمد اپنے زہد وتقویٰ کی بنا پر کبھی دنیوی اعزاز ووجاہت کے طالب نہیں ہوئے بلکہ وہ ہمیشہ امرا وسلاطین کے درباروں سے کنارہ کش رہے، انکے پیرو بھی ان کی تقلید میں جاہ ومنصب اور سلاطین کے دربار سے بے تعلق رہے، یہ چیز حنبلی مذہب کے ارتقاء واشتہار میں بڑی حد تک مانع ثابت ہوئی۔

۲۔ مذاہب اربعہ میں یہ سب سے متاخر ہے اس کی داغ بیل پڑنے سے پہلے ہی دوسرے مذاہب عوام میں مشہور ومقبول اور مختلف ملکوں میں پھیل چکے تھے، ان کی شہرت کے سامنے اس وقت کے دوسرے اجتہادی مذاہب کا جو بعد میں

Marfat.com

بالکل معدوم ہو گئے چراغ ٹمٹمانے لگا تھا، ان حالات میں کسی نئے مذہب کا لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر لینا حیرت انگیز ہے، اس حیثیت سے حنبلی مذہب کا یہ بڑا کمال ہے کہ اس نے مذاہب ثلاثہ کی شہرت و ہمہ گیری کے باوجود نہ صرف اپنے کو باقی رکھا بلکہ ایک حد تک خود بھی عوامی اور ہمہ گیری مذہب بن گیا۔

۳۔ امام احمد اپنی فقہ وافتا کی نقل وتحریر کو پسند نہیں کرتے تھے اور انہوں نے شروع میں بڑی سختی کے ساتھ لوگوں کو اس کی ممانعت کر دی تھی، اس بنا پر بھی ان کے مذہب کی ترقی واشاعت میں رکاوٹ پیش آئی۔

گو حنبلی مذہب کے متبعین کی تعداد ہمیشہ کم رہی تاہم وہ خواص کا مرکز توجہ رہا ہے، نواب صدیق حسن خاں صاحب فرماتے ہیں:

"چنداں مجتہدین کہ در طریقہ او برخاستند در ہیچ مذہب معلوم نیست واگر ہیچ کسے نباشد مگر ابن تیمیہ وابن قیم او برائے موازنہ باتمام علمائے زماں واہل سلوک جہاں کفایت است۔" (تقصار جیود الا حرار ص ۹۴)

شیخ ابو زہرہ بھی اس کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "بیشک خواص کا جہاں تک تعلق ہے ان کی کثرت نہیں ملے گی اور اس مذہب کے لیے صرف ابن تیمیہ اور ابن قیم کا وجود کافی ہے۔ (احمد بن حنبل ترجمہ اردو ص ۴۷۳)

کثرت وتعدد اقوال:

فقہ حنبلی پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس میں اختلاف روایات اور کثرت اقوال بہت ہیں بلکہ بعض مسائل میں متضاد اقوال تک منقول ہیں حالانکہ کثرت وتعدد اقوال سے کوئی مذہب بھی خالی نہیں اور اس کو ائمہ کی حق پرستی اور اخلاص کا ثبوت سمجھا جاتا ہے، امام صاحب سے ایک ہی مسئلہ میں کثرت اقوال کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے زہد واتقا کی وجہ سے کوئی بات علم وثبوت کے بغیر نہیں فرماتے تھے لیکن لوگوں کے اصرار اور کثرت سوال سے مجبور ہو کر بعض اوقات تردد کی حالت میں ان کو فتویٰ دینا پڑ جاتا تھا، اس لیے جب اس کے خلاف صحیح قول معلوم ہو جاتا تو وہ فوراً اپنے قول سے رجوع کر لیتے تھے، اسی طرح صحیح حدیث اور مستند اثر صحابی نہ پاکر وہ ضعیف ومرسل روایت کے مطابق بھی فتویٰ دیتے تھے مگر بعد میں جب صحیح روایت اور قول صحابی سامنے آتا تو اپنے پہلے فتویٰ سے رجوع فرما لیتے، اس رجوع کی جن لوگوں کو اطلاع ہو جاتی تھی وہ اس کے اور جن کو اطلاع نہیں ہوتی وہ پہلے ہی قول کے مطابق امام صاحب" کا مسلک بیان کرتے تھے۔

۲۔ بعض مسائل میں خود روایات اور اقوال صحابہ بھی مختلف ہوتے تھے جو اگر قوت وصحت کے لحاظ سے یکساں ہوتے اور ان میں ترجیح کی کوئی خاص وجہ نہ معلوم ہوتی تو عام فقہا کے برخلاف امام صاحب خود بھی مسئلہ کو دو قولوں پر چھوڑ دیتے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے روادار نہ ہوتے۔

قیاس سے عدم تعلق:

بعض لوگوں کے نزدیک اس مذہب کو قیاس سے بہت کم سروکار ہے، اس غلط فہمی کی اصل وجہ تو یہی ہے کہ امام صاحب نصوص، آثار، اخبار آحاد، مراسیل اور ضعیف روایات بلکہ تابعین اور ائمہ عظام کے اقوال کی موجودگی میں بھی قیاس کرنے کے شدید مخالف تھے اور شدت احتیاط وتورع کی بنا پر فرضی اور تقدیری مسائل میں بھی بلا ضرورت قیاس کرنے کو ناپسند اور احتیاط

Marfat.com

وتقویٰ کے منافی سمجھتے تھے، اس لیے عام مذاہب فقہ کے مقابلہ میں اس حیثیت سے اس کو واقعی قیاس سے زیادہ سروکار نہیں ہے، کیونکہ امام احمد کے نزدیک کسی حدیث کو چاہے وہ خبر واحد ہی کیوں نہ ہو قیاس سے رد نہیں کیا جا سکتا، ان کا اور ان کے متبعین کا خیال ہے کہ قیاس صحیح، حدیث کے معارض نہیں ہو سکتا ہے، علامہ ابن تیمیہؒ نے رسالۃ القیاس فی الشرع الاسلامی میں متعدد ایسے مسائل پر جنھیں خلاف قیاس کہا جاتا ہے حالانکہ وہ احادیث سے ثابت ہیں، بحث کر کے دکھایا ہے کہ وہ عین قیاس کے مطابق ہیں، حافظ ابن قیم کی کتابوں میں بھی اس پر مفصل بحثیں موجود ہیں۔

تشدد اور مذہب حنبلی:

بعض مسائل میں حنبلی مذہب کی سخت گیری اور تشدد کو بھی مورد طعن بنایا جاتا ہے لیکن اصل میں اس کا سبب یہ ہے کہ امام صاحب اتباع سنت کے جذبہ سے سرشار تھے اس لیے نہ تو وہ دین وشریعت کے خلاف کوئی بات کہنے سننے کے روادار ہوتے تھے اور نہ کسی حال میں احادیث وآثار صحابہ سے دستبردار ہونے کو پسند کرتے تھے، جن چیزوں کو معمولی سمجھا جاتا ہے، ان میں بھی وہ بڑی سختی اور پوری احتیاط برتتے تھے، عام حنابلہ نے بھی آپ کے اتباع میں اس سختی اور شدت کو روا رکھا، بلکہ بعض لوگ تو زہد وتقشف میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے عوام پر بھی سختی کا دروازہ کھول دیا جس کے نتیجہ میں ایک زمانہ میں بڑی شورش اور ہیجان برپا ہو گیا تھا، علامہ ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں ۳۲۳ھ کے واقعات میں اس کا تذکرہ کیا ہے لیکن حنابلہ کی اس سختی اور شدت کا امام صاحب سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے کیونکہ وہ زیادہ تر اپنی ہی ذات تک سختی کو روا رکھتے تھے اور کمال زہد کی وجہ سے عبادات اور مشروعات میں اپنی طرح دوسروں کے لیے بھی پسند فرماتے تھے کہ وہ احتیاط اور تورع کو اپنا شعار بنائیں، ظاہر ہے ان امور میں اعتدال کے ساتھ شدت وتصلب اختیار کرنا مذموم نہیں ہے، البتہ عام لوگ اعتدال وتوازن کو برقرار نہ رکھنے کی وجہ سے افراط وتفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔

لیکن عبادات اور محظورات سے قطع نظر عقود وشروط اور غیر منصوص امور کی حلت واباحت میں امام صاحب بڑے روادار اور توسع پسند تھے اور دوسرے فقہا کی طرح ان کے یہاں ان چیزوں میں زیادہ شدت اور تنگی نہیں پائی جاتی۔

تصنیفات

امام صاحب کی جانب کئی تصنیفات منسوب ہیں جن میں چند کے علاوہ سب ناپید ہیں۔

ا۔ کتاب الصلوٰۃ:

یہ مختصر رسالہ پہلی مرتبہ ہندوستان سے ۴۲ صفحات میں ۱۳۱۱ھ میں امام احمد کے ایک مکتوب کے ساتھ جو مسدد بن مسرہد کے نام ہے شائع ہوا تھا، دوسری مرتبہ ۱۳۴۷ھ میں علامہ ابن قیم کے رسالہ کتاب الصلوٰۃ واحکام تارکہا کے ساتھ مطبع محمد علی صبیح مصر میں چھپا، اس میں مسنون اور صحیح طریقہ نماز کی وضاحت کی گئی ہے اور متابعت امام کی اہمیت بیان کی گئی ہے رکوع وسجود اور دوسرے ارکان میں امام پر مقتدی کے سبقت کرنے کے متعلق جو ممانعت اور وعیدیں حدیثوں میں مذکور ہیں ان کو جمع کر کے ان کی تشریح کی گئی ہے۔

Marfat.com

۲۔ کتاب الزہد:

مسند کے بعد امام صاحب کی یہ دوسری اہم کتاب ہے، علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں ''جن لوگوں نے زہد و رقاق کے متعلق حدیثیں جمع کی ہیں ان میں عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد بڑی اہم ہے لیکن اس میں کمزور اور واہی روایتیں بھی ہیں سب سے عمدہ امام احمد کی کتاب ہے، جس کی ترتیب ناموں پر ہے'' حافظ ابن کثیر بیان کرتے ہیں ''اس موضوع پر متقدمین اور متاخرین علما میں سے کسی کی کتاب بھی اس کے ہم پایہ نہیں ہے'' علامہ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ''یہ مسند کے ثلث کے بقدر ہے اور اس کی متعدد حدیثیں اور آثار مسند احمد میں نہیں ہیں'' اس کا ایک قلمی نسخہ برلن میں ہے، امام احمد کی کتاب الزہد کا ایک حصہ مختصر کتاب الزہد کے نام سے حجاز سے شائع ہو گیا ہے'' آپ کے صاحبزادے عبداللہ نے اس کے زوائد تحریر کئے تھے۔

(کشف الظنون ج ۲ ص ۷۹، ۲ البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۹ و تعجیل المنفعۃ ص ۸ والرسالۃ المستطرفہ ۱۸)

۳۔ کتاب التفسیر:

۴۔ کتاب السنۃ:

اس کا مخطوطہ برلن میں موجود ہے (تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ ص ۲۴۱) اور غالباً طبع بھی ہو چکی ہے دوسری کتابوں اور رسائل کے نام یہ ہیں، ۵۔ کتاب طاعۃ الرسول، ۶ کتاب الایمان، ۷۔ کتاب الاعتقاد، ۸۔ الناسخ والمنسوخ، ۹۔ المقدم والموخر فی کتاب اللہ، ۱۰۔ کتاب الفرائض، ۱۱۔ کتاب الفضائل، ۱۲۔ فضائل الصحابہ، ۱۳۔ فضائل ابوبکر، ۱۴۔ فضائل حسنین، ۱۵۔ مناقب علی، ۱۶۔ کتاب المسائل، ۱۷۔ کتاب المناسک، ۱۸۔ کتاب العلل، ۱۹۔ کتاب التاریخ، ۲۰۔ کتاب الاشربہ، ۲۱۔ کتاب الرد علی الجہمیہ، ۲۲۔ کتاب الرد علی من ادعی تناقض القرآن، ۲۳۔ کتاب الرد علی الزنادقہ۔ (الفہرست)

ان مستقل تصنیفات کے علاوہ امام صاحب کے فتاویٰ اور مسائل کو بھی خلال نے جامع کبیر میں جمع کیا ہے۔

مسند احمد بن حنبل:

امام صاحب کی سب سے مشہور اور حدیث کی اہم ترین کتاب ہے، امام صاحب سے پہلے بھی اس طرح کی کتابیں لکھی گئیں اور بعد میں بھی لیکن کسی مجموعۂ مسانید کو اس قدر شہرت و مقبولیت اور اعتبار و استناد نصیب نہیں ہوا، اس میں عام کتب مسانید کی طرح صحابہ کی ترتیب پر حدیثیں مرتب کی گئی ہیں، ترتیب میں زیادہ تر سبقت فی الاسلام کا لحاظ رکھا گیا ہے لیکن اس اصول کا ہر جگہ التزام نہیں کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ ترتیب میں بہت سی غلطیاں ہو گئی ہیں، مثلاً مدنیوں کی روایت شامیوں میں اور شامیوں کی مدنیوں میں شامل کر دی گئی ہیں۔ (بستان المحدثین ص ۳۰)

مسند کے اجزا اور حدیثوں کی تعداد:

مسند احمد تقریباً ۲۴/۱۷ اجزا پر مشتمل اور سات سو صحابہ کی حدیثوں کا مجموعہ ہے جن کی تعداد عام طور سے تیس اور چالیس ہزار بتائی جاتی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ مسند کی اصل روایات تو تیس ہزار ہیں باقی دس ہزار کے قریب زوائد عبداللہ ہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ مکررات کے ساتھ چالیس ہزار اور حذف مکررات کے بعد تیس ہزار حدیثیں ہیں۔

(بستان المحدثین ص ۲۹، ۳۰)

Marfat.com

مسند کے مرویات کی قسمیں:

مسند کی حدیثوں کی چھ قسمیں ہیں:

۱۔ وہ حدیثیں جن کو امام صاحب کے فرزند عبداللہ ان کے حوالے سے بیان کرتے ہیں یہی اصل مسند احمد ہے، اس قسم کی روایتیں ۳، ۴ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں۔

۲۔ وہ روایتیں جو عبداللہ نے آپ سے اور آپ کے علاوہ دوسرے محدثین سے روایت کی ہیں، اس طرح کی روایات بہت کم ہیں۔

۳۔ وہ حدیثیں جن کو عبداللہ نے آپ کے بجائے دوسرے شیوخ سے نقل کیا ہے، اس طرح کی حدیثوں کو زوائد عبداللہ کہتے ہیں، انکی تعداد پہلی قسم سے کم مگر اور قسموں سے زیادہ ہے۔

۴۔ وہ روایتیں جن کو عبداللہ نے امام صاحب سے تو سنا لیکن آپ کے سامنے ان کی قراءت نہیں کی تھی، اس قسم کی روایتیں بھی بہت کم ہیں۔

۵۔ ایسی حدیثیں جن کو انہوں نے نہ تو امام صاحب سے سنا اور نہ آپ کے سامنے پڑھا بلکہ آپ کی کتاب یا کسی تحریر سے ان کو نقل کیا ہے، اس قسم کی حدیثیں بھی کم ہیں۔

۶۔ ابوبکر قطیعی کے زیادات جن کو انہوں نے عبداللہ اور امام احمد کے بجائے کسی اور محدث سے روایت کیا ہے، اس طرح کی روایتیں بہت کم ہیں۔ (الفتح الربانی ص ۸)

امام صاحب کے مسند اور زوائد کا فرق بیان کرتے ہوئے حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ ''زوائد میں ضعیف اور موضوع روایتیں بھی شامل ہو گئی ہیں جن کو ناواقف لوگ امام احمد ہی کی جانب منسوب کرتے ہیں''۔

مسند کی تالیف میں احتیاط:

امام صاحب نے مسند کی ترتیب و تالیف میں غیر معمولی احتیاط سے کام لیا ہے ان کا خود بیان ہے کہ انہوں نے اس کو ساڑھے سات لاکھ سے زائد حدیثوں سے منتخب و مرتب کیا تھا، علمائے فن کا بیان ہے کہ انہوں نے مسند کی تدوین میں صحیح احادیث کی تخریج اپنے اوپر لازم کر لی تھی، ابوموسیٰ مدینی کا بیان ہے کہ امام احمد نے مسند میں ان ہی لوگوں سے روایتیں نقل کی ہیں جن کی صداقت و دیانت مسلم تھی مطعون لوگوں کی روایات نقل کرنے سے پرہیز کیا ہے، امام احمد صاحب خود فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کو لوگوں کے لئے امام و حجت بنایا ہے تاکہ اختلاف کے وقت وہ اس کی جانب رجوع کر سکیں، اگر اس میں ان کو کوئی حدیث مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ کسی ایسی حدیث کو صحیح نہ تسلیم کریں جو اس میں موجود نہ ہو۔

(طبقات الشافعیہ سبکی ج ۱ ص ۲۱۸ و معجم المصنفین ج ۲ ص ۳۳۴، ۳۳۵ و کشف الظنون ج ۲ ص ۲۳۱ و حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱ ص ۱۰۷)

امام صاحب کی احتیاط کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ مسند کے مسودہ میں کانٹ چھانٹ اور حذف و ترمیم کرتے رہتے تھے اور اپنے بے نظیر حافظہ کے باوجود وہ محض اپنی یادداشت سے کوئی حدیث بیان کرنا احتیاط کے خلاف سمجھتے تھے علی بن مدینی کا بیان ہے کہ ''ہمارے رفقا میں امام احمد سے بڑا کوئی حافظ نہ تھا لیکن وہ کتاب سے حدیثیں بیان کرتے

Marfat.com

تھے اور ہم کو بھی تاکید کرتے تھے کہ جب حدیثیں بیان کریں تو کتاب کو پیش نظر رکھیں۔ ابراہیم بن خالد بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ امام احمد کی مجلسوں میں حدیثیں یاد کرتے اور ان پر بحث و مذاکرہ کرتے لیکن ان کو قلمبند کرنا چاہتے تو وہ جھپٹ کر کتاب لاتے اور فرماتے کہ کتاب بہترین یادداشت ہے۔''

فرطِ احتیاط کی بنا پر کوئی ایسی حدیث نہیں بیان کرتے جو صرف ایک ہی سند سے مذکور ہوتا آنکہ اس کی نظیر نہ مل جائے، احادیث فضائل وغیرہ میں کچھ نرمی گوارا بھی کر لیتے تھے لیکن احکام و حدود کی روایتوں میں ذرا بھی تساہل گوارا نہیں تھا، فرماتے ہیں ''فضائل اعمال اور ان کی ترغیب و جزا وغیرہ سے متعلق اگر کوئی حدیث ہم کو معلوم ہوتی ہے تو اس میں زیادہ شدت سے کام نہیں لیتے لیکن حدود، کفارات، اور فرائض وغیرہ سے متعلق روایتوں میں بڑی چھان بین اور پوری سختی اور احتیاط برتتے ہیں۔''

(تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۲ و تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ قسم اول ص ۱۱۱، الطبقات الکبریٰ شعرانی ج ۱ ص ۴۶ شذرات الذہب ج ۱ ص ۹۸)

مسند کی اہمیت اور کتب حدیث میں اس کا درجہ:

گو محدثین کے نزدیک مسانید کا درجہ سنن سے کم تر ہے لیکن مسند احمد کی حیثیت عام مسانید سے مختلف ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کو دوسرے درجہ کی کتابوں یعنی سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور مجتبیٰ النسائی کے لگ بھگ اور تیسرے درجہ کی کتابوں سے جس میں عام جوامع و مسانید شامل ہیں، اس کو اہم اور ممتاز قرار دیا ہے'' حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ''مسند احمد کی حدیثوں کی نوعیت عام کتب مسانید سے مختلف ہے، ابوالحسن علی بن احمد ہیثمی لکھتے ہیں کہ ''وہ دوسری کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ صحیح اور بہتر ہے۔ (التنقیح فی اصول الحدیث ص ۴۰، حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۷، تدریب الراوی ص ۵۷)

مسند احمد کا شمار ان اہم اور امہات کتب میں ہوتا ہے جن پر ملت اسلامیہ کا ہمیشہ اعتماد و اعتبار رہا ہے اور جن سے محدثین نے ہر زمانہ میں اخذ و استفادہ کیا ہے، علامہ سبکی فرماتے ہیں ''وہ اس امت کی اساسی اور بنیادی کتابوں میں ہے'' ابوموسیٰ مدینی کا بیان ہے کہ ''مسند ایک اہم اصل اور محدثین کے لیے قابل وثوق مرجع ہے'' مسند کے بارہ میں عام فیصلہ یہ ہے کہ ''کتب صحاح ستہ بشمول مؤطا امام مالک اور مسند احمد اصل دارومدار اور اعتماد کی چیزیں اور روز روشن کی طرح نمایاں اور مشہور ہیں''۔

صحت و جودت کے لحاظ سے بھی مسند کی اہمیت کم نہیں ہے، علامہ سیوطی فرماتے ہیں ''مسند کے زوائد صحیحین، ترمذی اور ابوداؤد کے زوائد صحیحین کے مقابلہ میں کم ضعیف ہیں، اس کی ہر روایت مقبول اور ضعیف روایتیں بھی حسن سے قریب تر ہیں'' احمد عبدالرحمٰن بنا ساعاتی نے لکھا ہے کہ ''امام احمد کا قابل تعریف کارنامہ اور امت پر زبردست احسان یہ ہے کہ انہوں نے لوگوں کے لیے مسند جیسی مشہور کتاب کی تخریج کی جس کی اہمیت کا ہر زمانہ کے محدثین نے اعتراف کیا اور کہا ہے کہ وہ صحیحین کے بعد تمام کتب احادیث میں سب سے زیادہ صحیح حدیثوں کی جامع ہے۔'' (الفتح الربانی ص ۸۱۷)

خصوصیات:

۱۔ مسند احمد کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت تو یہی ہے کہ وہ حدیث کی اہم معتبر اور صحیح کتابوں میں ہے۔

۲۔ مسند سے بڑا اور ضخیم کوئی مجموعہ حدیث نہیں، حافظ ابن کثیر، ابوبکر ہیثمی اور علامہ ابن حجر نے لکھا ہے کہ اس سے زیادہ حدیثیں کسی کتاب میں نہیں ہیں۔

Marfat.com

۳۔ احادیث کے دوسرے مجموعوں میں جو روایات متفرق طور پر پائی جاتی ہیں، ان کا اکثر حصہ اس میں موجود ہے، اس لحاظ سے وہ حدیث کی سب سے زیادہ جامع کتاب ہے، ایک مرتبہ ابوالحسن یونینی سے دریافت کیا گیا کہ ان کو صحاح ستہ زبانی یاد ہیں؟ انہوں نے کہا یاد بھی ہیں اور نہیں بھی، لوگوں نے پوچھا یہ کیسے؟ فرمایا کہ مجھ کو مسند احمد بن حنبل یاد ہے جس میں چند کے علاوہ صحاح کی تمام حدیثوں کی اصل موجود ہے اس اعتبار سے گویا میں ان کا بھی حافظ ہوں، بعض علما کا بیان ہے کہ ''اگر کسی کو تمام کتابوں کی جامع کوئی ایسی کتاب مطلوب ہو جس کا مصنف بھی عظیم و برتر ہو تو اسے مسند احمد کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

(حواشی سعدی ص ۵ و مقدمہ تحفہ الاحوذی ص ۹۰)

۴۔ مسند کا تصنیفی حسن، اخبار و روایات کا تناسب اور بہتر انتخاب بھی اس کی ایک خصوصیت ہے، اہل نظر اور مبصرین کا خیال ہے کہ وضع و تالیف کے لحاظ سے وہ بے مثال کتاب ہے، علامہ ابن حجر نے علامہ ابن صالح کا جواب دیتے ہوئے مسند کی اس خصوصیت کا تذکرہ کیا ہے اور ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حسن بیان و سیاق کے لحاظ سے کوئی کتاب اس کے برابر نہیں۔

۵۔ مسند میں تین سو ثلاثی حدیثیں ہیں۔

۶۔ عام کتابوں کی جملہ خصوصیات بھی اس میں موجود ہیں۔

زمانۂ تصنیف:

امام صاحب مسند کی جمع و تدوین میں اسی وقت سے مصروف ہو گئے تھے، جب انہوں نے علم حدیث کی طلب و تکمیل شروع کی تھی اور عمر بھر اس میں مشغول اور حذف و اضافہ کرتے رہے، صاحب المنہج نے لکھا ہے کہ ۱۸۰ھ میں مسند کی تالیف شروع کر دی تھی اور شمس الدین جزری فرماتے ہیں کہ باقاعدہ تکمیل سے پہلے ہی انتقال فرما گئے تھے۔''

(احمد بن حنبل لابی زہرہ بحوالہ المنہج جز اول)

تہذیب و تنقیح:

مسند کو امام صاحب نے مسودہ کی صورت میں چھوڑا تھا اس لیے آپ کے بعد آپ کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ نے اس میں بعض اضافے کر کے اس کی باقاعدہ تہذیب و تنقیح کی، علامہ شمس الدین جزری کا بیان ہے ''امام احمد نے مسند کو جمع کرنا شروع کیا اور اس کو الگ الگ ورقوں میں لکھ کر جدا جدا اجزاء میں تقسیم کیا مگر اس کی تکمیل سے پہلے ہی انتقال فرما گئے۔ البتہ آخر عمر میں انہوں نے اپنی اولاد اور گھر والوں کو جمع کر کے اس کو سنا دیا تھا، آپ کے انتقال کے بعد آپ کے صاحبزادے نے اس کو مرتب کیا اور مسند کی روایات کے مشابہ و مماثل مسموعات بھی اس میں شامل کر دیئے'' مسند کا موجودہ متداول نسخہ عبداللہ ہی کا مرتب کیا ہوا ہے لیکن اس کی فروگزاشتوں کی بنا پر بعض لوگوں نے اس کو از سر نو مرتب کیا، اصفہان کے بعض محدثین نے اس کو ابواب پر ترتیب دیا تھا مگر یہ نسخہ معدوم ہے، حافظ ناصر الدین نے بھی ابواب پر مرتب کیا تھا مگر دمشق میں حادثۂ تیمور کے وقت ان کا نسخہ ضائع ہو گیا، ابوبکر محمد بن عبداللہ بن محی الدین صامت نے حروف معجم پر مرتب کیا تھا۔ (بستان المحدثین ص ۲۹، وبلوغ الامانی ص ۱۰، ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۱ بحوالہ المصعد الاحمد) حال میں مصر کے ایک فاضل احمد عبدالرحمن البنا ساعاتی نے الفتح الربانی کے نام سے اس کو ابواب پر مرتب کیا ہے حاشیہ پر ان ہی کے قلم سے بلوغ الامانی کے نام سے اس کی شرح بھی ہے، اس کی ۵

Marfat.com

جلدیں ۱۳۵۵ھ میں شائع ہوئی تھیں اس میں مکررات کو حذف کر دیا گیا ہے، ربوہ سے بھی ابھی حال ہی میں ایک جلد شرح وتعلیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

شرح وحواشی:

مسند کے شروح، تعلیقات اور مختصرات کے نام یہ ہیں:

۱۔ شرح مسند:

یہ علامہ ابوالحسن بن عبدالہادی سندی (م ۱۱۳۸ھ) کی ضخیم شرح ہے۔

۲۔ الدری المشقد:

یہ مسند کا مختصر اور شیخ سراج الدین عمر بن علی بن ملقن (م ۸۰۵ھ) اور شیخ زین الدین عمر بن احمد شماع جلسی کی تالیف ہے۔

۳۔ عقود الزبرجد:

یہ تعلیق علامہ سیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے حروف معجم پر مرتب کی ہے۔

۴۔ غرائب مسند:

ابوعمر محمد بن عبدالواحد (م ۳۴۵ھ) کی تالیف ہے۔

۵۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد:

ابوالحسن علی بن ابوبکر ہیثمی (م ۸۰۷ھ) نے اس کو ابواب پر مرتب کیا ہے جو ۶ جلدوں پر مشتمل اور امام احمد، بزار، ابو یعلی موصلی کے مسانید اور طبرانی کے معاجم ثلاثہ کی ان حدیثوں کا مجموعہ ہے جو صحاح میں شامل نہیں ہیں، اس کے بعض اجزاء کے قلمی نسخے دار الکتب المصریہ میں موجود ہیں، نواب صدیق حسن خاں صاحب نے ایک جزو ۱۳۰۸ھ میں ۲۸۸ صفحات میں ایک مقدمہ کے ساتھ دہلی سے شائع کیا تھا۔

۶۔ جامع المسانید:

اس کو علامہ ابن کثیر نے ۸ جلدوں میں مرتب کیا ہے اور اس میں مسند احمد، مسند بزار، مسند ابویعلی، طبرانی کی معجم کبیر اور صحاح کی حدیثیں شامل کی ہیں، اس کے دو قلمی نسخے دار الکتب المصریہ اور کوبر لی وغیرہ میں ہیں۔

۷۔ جامع المسانید والالقاب باخص الاسانید:

اس میں علامہ ابن جوزی نے صحیحین، ترمذی اور مسند احمد کی حدیثیں ۷ جلدوں میں مسانید پر مرتب کی ہیں۔

Marfat.com

۸۔ اطراف المسند المعتلی باطراف المسند الحنبلی:

یہ حافظ ابن حجر کی تالیف اور دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

۹۔ جمع الفوائد من جامع الاصول ومجمع الزوائد:

صحاح کے علاوہ احمد، دارمی، ابویعلی، بزار کے مسانید اور طبرانی کے معاجم ثلاثہ کی روایتوں پر مشتمل ہے اور ابوعبداللہ محمد بن سلیمان مغربی متوفی ۱۰۹۴ھ کی تالیف ہے۔

۱۰۔ منتقی الاخبار فی الاحکام:

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے کتب صحاح اور مسند احمد کی حدیثوں کا اس میں انتخاب کیا ہے، علامہ شوکانی نے نیل الاوطار کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے۔ (کشف الظنون ج دوم صفحات ۲۳۱، ۲۳۲، ۱۲۶، ۱۵۶، ۳۸۵، حصہ اول ص ۸۵ ۳ و بلوغ الامانی ص ۲۰ و بستان المحدثین ص ۲۲، الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۱۴، ۱۲۹، ۱۴۴، مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۴۰، مفتاح السنۃ ص ۱۱۱ و ۱۱۳ و معجم المطبوعات ج ۲ کام ۱۹۰۳، فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۲۳)

۱۱۔ ثلاثیات مسند:

محب الدین وضیاء الدین مقدسی نے اس میں مسند کی ثلاثی روایتوں کی تخریج کی ہے، شمس الدین سفارینی حنبلی نے اس کی شرح لکھی ہے۔ اصل اور شرح پہلی مرتبہ مکتب اسلامی دمشق سے ۱۳۸۰ھ میں دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

۱۲۔ فہرست رجال مسند:

مولانا نجم الدین اور مولانا نور الحق نے رجال مسند کی ایک مفصل اور جامع فہرست اردو میں مرتب کی ہے جو رسالہ اورینٹل کالج لاہور میں چھپ چکی ہے۔

مسند پر بعض اعتراضات:

مسند پر اعتراضات بھی کیے گئے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ مسند میں مکررات ہیں لیکن درحقیقت یہ کوئی عیب نہیں بلکہ ایک طرح کی خوبی ہے کیونکہ تکرار کا مقصد کثرت اسناد، تعدد طرق، اختلاف متن اور متابعات وغیرہ کو ظاہر کرنا ہے محدثین ایک ہی حدیث کو ایک صحابی سے متعدد طرق اور مختلف الفاظ کے ساتھ صرف اس لئے روایت کرتے ہیں کہ احادیث کا استقصا واحاطہ بھی ہو جائے اور وہ محفوظ و مدون بھی ہو جائیں اسی لئے صحیحین اور جملہ کتب معتبرہ میں بھی بکثرت مکررات پائے جاتے ہیں اور مسانید میں صحابہؓ کے ناموں کی ترتیب پر حدیثیں نقل کیے جانے کی وجہ سے تکرار ناگزیر بھی ہے۔

۲۔ بعض صحیح روایتیں مسند میں نہیں ہیں، یعنی ایسی متعدد حدیثیں جو صحیحین اور کتب معتبرہ میں پائی جاتی ہیں مسند میں نہیں ہیں، حالانکہ امام صاحب کا دعویٰ ہے کہ اس میں جملہ صحیح احادیث درج ہیں، اگر اس دعویٰ کی نسبت امام صاحب کی جانب صحیح ہے تو غالباً اس زمانہ میں وضع حدیث کے عام فتنہ کے پیش نظر آپ نے ایسا فرمایا ہوگا تا کہ لوگ غلط روایتوں اور وضعی حدیثوں سے

Marfat.com

محتاط رہیں، دوسرے امام صاحب نے اپنے مقدور بھر مسند میں صحت کا پورا اہتمام ملحوظ رکھا تھا، اس لیے ان کے علم ویقین میں ان کا یہ دعویٰ بالکل صحیح تھا لیکن اس سے یہ ضروری نہیں ہے کہ مسند حقیقتاً تمام صحیح حدیثوں کی جامع ہو، تیسرے اکثر صحیح حدیثوں کی اصل فی الواقع اس میں موجود ہے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ ''امام صاحب کا ارشاد غالب احوال کے لحاظ سے ہے ورنہ صحیحین، سنن اور اجزاء وغیرہ میں بہت سی قوی حدیثیں ایسی ہیں جو مسند میں نہیں ہیں، شمس الدین جزری کا بیان ہے کہ اس سے مقصود حدیثوں کی اصل ہے اور یہ بالکل درست ہے اس لیے کہ غالباً کوئی حدیث ایسی نہیں ملے گی جس کی اصل مسند میں موجود نہ ہو، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ''امام صاحب کی مراد ان حدیثوں سے ہے جو شہرت وتواتر کے درجہ تک نہیں پہنچی ہیں ورنہ بہت سی مشہور اور صحیح حدیثیں ان کی مسند میں نہیں ہیں۔

(ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۰۹ بحوالہ المصعد الاحمد ص ۲۱، بستان المحدثین ص ۳۰)

۳۔ضعیف حدیثیں:

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ مسند میں ضعیف روایات بھی ہیں، محققین علما نے اس کو تسلیم کیا ہے اس لیے جو لوگ مطلقاً مسند کی صحت کے مدعی ہیں ان کا خیال درست نہیں، اس کا بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ امام صاحب عمر بھر مسند کے مسودہ میں ترمیم فرماتے رہے، وہ ضعیف وغریب روایتیں متابعت، تعدد طرق اور دوسری روایتوں کی تائید کے لیے نقل کرتے تھے، اس لیے مسند ضعیف روایتوں سے خالی نہیں لیکن اتنے ضخیم مجموعہ میں اگر کچھ ضعیف حدیثیں شامل بھی ہوں تو ان سے اس کی صحت وشہرت میں فرق نہیں آتا، مجموعی طور پر وہ ایک مستند اور اہم کتاب ہے، ضعیف وغریب روایتوں سے حدیث کی کونسی کتاب خالی ہے، ابن تیمیہ جیسے شخص کو یہ تسلیم ہے کہ ''صحیحین کی بعض حدیثوں میں اس قسم کے الفاظ آگئے ہیں جو ضعف سے خالی نہیں۔''

(منہاج السنۃ ج ۲ ص ۶۲)

۴۔موضوع حدیثیں:

مسند میں بعض موضوع حدیثیں بھی بتائی جاتی ہیں لیکن عام علمائے فن نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے، ابن حجر نے القول المسدد میں اور سیوطی نے الذیل الممہد میں ان تمام روایتوں کا جن کو موضوع بتایا جاتا ہے پوری تحقیق سے جائزہ لیا ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔

''ایک جماعت کا دعویٰ ہے کہ مسند میں موضوع روایتیں بھی ہیں ابوالفضل عراقی نے موضوعات ابن جوزی کے تتبع سے نو حدیثوں کو موضوع بتایا ہے، میں نے جب ابن جوزی کے بیان کا مطالعہ کیا تو موضوعات کی تعداد بیس نظر آئی لیکن تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں سے اکثر حدیثیں صحیح ہیں اور ان کو موضوع قرار دینے کا فیصلہ درست نہیں، البتہ چند روایتوں کے بارے میں اس قسم کا شبہ ضرور رہتا ہے لیکن غالب اور قوی احتمال ان کے بارے میں بھی مدافعت ہی کا ہے۔ (تعجیل المنفعۃ ص ۱)

بعض علما نے جن میں ابن تیمیہ بھی شامل ہیں، یہ تفریق کی ہے کہ عبداللہ اور قطیعی کے زوائد میں موضوع روایتیں ہیں لیکن مسند کا وہ حصہ جو امام صاحب کی [illegible] ہے، موضوع حدیثوں سے خالی ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ جمہور علما کے نزدیک مسند احمد بن حنبل میں موضوع حدیثیں نہیں پائی جاتیں۔

Marfat.com

امام محمد بن یحییٰ عدنی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۴۳ھ)

نام ونسب:

محمد نام، ابو عبداللہ کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: محمد یحییٰ بن ابو عمر۔
بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابو عمران کے والد کی کنیت تھی (تقریب التہذیب ص ۲۴۷) مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔
(تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۱۸)

وطن:

ان کے آباء واجداد کا اصل وطن عدن ہے لیکن انہوں نے مکہ میں مستقل بود و باش اختیار کر لی تھی، (ایضاً وخلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال ص ۳۶۴) علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ان کی پیدائش اور نشوونما بھی یہیں ہوئی تھی، (کتاب الانساب ورق ۳۸۶) اسی وجہ سے عدنی اور مکی کہلاتے ہیں، خاندان اور سن ولادت کا حال نہیں معلوم ہو سکا۔

اساتذہ:

انہوں نے جن برگزیدہ وبلند پایہ محدثین سے کسب فیض کیا تھا ان میں سے بعض مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں:
داؤد بن عجلان، سفیان بن عیینہ، عبدالرحیم بن زید عمی، عبدالرزاق، عبدالعزیز دراوردی، عبدالعزیز بن عبدالصمد عمی، عبداللہ بن صنعانی، عبدالمجید بن ابی رواد، عبدالوہاب ثقفی، فرج بن سعید بن علقمہ ماربی، فضیل بن عیاض، محمد بن یحییٰ بن قیس مازنی، مروان بن معاویہ، معن بن عیسیٰ، ولید بن مسلم، ہشام بن سلیمان، یحییٰ بن سلیم طائفی، یحییٰ بن عیسیٰ الملی، یزید بن ہارون، یعقوب بن جعفر بن ابی کثیر اور اپنے والد یحییٰ بن ابو عمر وغیرہ سے۔
سفیان بن عیینہ کے خاص تلامذہ میں تھے، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ وہ لازم ابن عیینہ پہلی مرتبہ ۱۸ سال کی عمر میں ان کے درس میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ (تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۱۸، ۵۱۹ وتقریب التہذیب ص ۲۴۷)

تلامذہ:

محمد بن یحییٰ عدنی کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مؤلفین صحاح میں امام مسلم، امام ترمذی اور ابن ماجہ نے ان سے بلاواسطہ اور امام نسائی نے بالواسطہ روایتیں کی ہیں، امام بخاری نے بھی ان سے ایک حدیث تعلیقاً بیان کی ہے، دوسرے ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں:
ابوحاتم، ابوزرعہ دمشقی، ابوزرعہ رازی، احمد بن عمرو خلال مکی، اسحاق بن ابراہیم بن اسماعیل نسفی، اسحاق بن احمد بن نافع

Marfat.com

خزاعی، بقی بن مخلد، زکریا بن یحییٰ سجزی، عبداللہ بن صالح بخاری، عبداللہ بن محمد بن شیرویہ، عثمان بن خرزاذ، علی بن عبداللہ عصایری، ابوالولید محمد بن عبداللہ ازرقی، مفضل بن محمد جندی، نعیم ازدی، ہارون بن یوسف شطوی، ہلال بن علاء اور ان کے فرزند عبداللہ بن محمد وغیرہ۔ (ایضاً و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۴ و کتاب الانساب ورق ۳۸۶)

حفظ و ثقاہت:

حافظہ میں امتیاز کی وجہ سے الحافظ کے لقب سے موسوم کیے جاتے تھے، عبدالرحمٰن بن محمد حاتم اپنے والد کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ صالح الحدیث اور صدوق تھے، امام احمد نے بھی ان کو معتبر قرار دیا ہے، مسلمہ کا بیان ہے کہ لا بأس به یعنی عدنی میں کوئی عیب نہ تھا، امام مسلم نے ان کو صدوق و حجت اور ابن حبان و ابن اثیر نے ان کو ثقہ بتایا ہے۔

(تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰ و خلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال ص ۳۶۴ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۴ و کتاب الانساب ۳۸۶)

فضل و کمال:

ان کے کمال کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اکثر اصحاب صحاح نے ان کی روایتوں کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، امام مسلم نے اپنی صحیح میں ان کے واسطے سے ۲۱۶ حدیثیں ذکر کی ہیں، امام احمد کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ جب ان سے رواۃ مکہ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ مکہ کے لوگوں میں ابن ابی عمر سے روایتیں کرو، علمائے طبقات کا بیان ہے کہ وصار شیخ الحرم فی زمانہ، یعنی وہ اپنے زمانہ میں شیخ الحرم تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۴ و تہذیب ج ۹ ص ۵۱۹ و ۵۲۰)

عبادت و تقویٰ:

علم و فضل کے ساتھ بڑے عابد و زاہد اور نہایت صالح و متدین تھے، اکثر طواف کعبہ میں مشغول رہتے، (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۴) تمام مؤرخین نے ان کے زہد و صلاح کا ذکر کیا ہے۔

حج:

حج بیت اللہ سے ۷۷ مرتبہ مشرف ہونے کی سعادت میسر آئی، ان کا خود بیان ہے کہ ۷۰ مرتبہ پیدل چل کر میں نے حج کیا تھا۔ (ایضاً و تہذیب ج ۹ ص ۵۱۹)

وفات:

عدنی نے بڑی طویل عمر پائی اور ذی الحجہ ۲۴۳ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ (ایضاً و خلاصہ تذہیب ص ۳۶۴)

اولاد: علمائے سیر نے ان کے تلامذہ کے تذکرہ میں ان کے ایک فرزند عبداللہ کا ذکر کیا ہے، اسی لیے انکی کنیت ابوعبداللہ ہے۔

تصنیفات:

عدنی کی تصنیفات میں صرف مسند کا پتہ چلتا ہے، اس کے راوی ان کے مشہور شاگرد اسحاق بن احمد بن نافع خزاعی تھے، اس مسند کو ایک زمانہ میں بڑی شہرت تھی اور وہ اصبہان وغیرہ میں متداول رہ چکی ہے۔

(تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۱۹ و کتاب الانساب ورق ۳۸۶)

Marfat.com

امام عبد بن حمید رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۴۹ھ)

نام ونسب:

عبدالحمید نام، ابو محمد کنیت، ایک ضعیف روایت یہ بھی ہے کہ عبدالمجید نام تھا۔ نسب نامہ یہ ہے: عبدالحمید بن حمید بن نصر، عام طور سے وہ عبدالحمید کے بجائے صرف عبد بن حمید کہے جاتے تھے۔

(تہذیب التہذیب ج۶ ص ۴۵۵ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۲۱ و بستان المحدثین ص ۲۳)

وطن:

وطن کش یا کس ہے اور اسی کی نسبت سے وہ کشی یا کسی مشہور ہیں، کش جرجان کے قریب اس سے ۹ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں کا نام ہے، محمد بن طاہر مقدسی نے لکھا ہے کہ کس کش کی تعریب ہے لیکن ابن ماکولا کا بیان ہے کہ کش غلط ہے، جب میں بخارا اور سمرقند گیا تو وہاں کے لوگ اس کو کس کہتے تھے، یہ سمرقند کے قریب ایک شہر کا نام ہے، عبد بن حمید اسی کی جانب منسوب ہیں، بعض لوگوں نے کش کو اصبہان کا گاؤں بتایا ہے۔ (معجم البلدان ج ۷ ص ۲۵۴ و کتاب الانساب مقدسی ص ۱۲۹)

اساتذہ:

عبد بن حمید کے اساتذہ اور شیوخ میں بلند پایہ محدثین اور مقدس بزرگ شامل ہیں، اس کا اندازہ اس فہرست سے ہوگا۔

احمد بن اسحاق حضرمی، جعفر بن عون، حسن اشیب، حسین بن علی جعفی، روح بن عبادہ، سعید بن عامر، عارم، عبدالرزاق، عبدالصمد بن عبدالوارث، عبداللہ بن بکر سہمی، عبیداللہ بن موسیٰ، علی بن عاصم، عمر بن یونس یمامی، محمد بن بشر عبدی، محمد بن بکر برسانی، مسلم بن ابراہیم، مصعب بن مقدام یحییٰ بن آدم، یزید بن ہارون، یعقوب بن ابراہیم، یعلی بن عبید یونس بن محمد مؤدب، ابن ابی فدیک، ابو اسامہ، ابوداؤد حضرمی، ابو عامر عقدی، ابو عاصم، ابوالنضر، ابونعیم، ابوالولید طیالسی وغیرہ۔

(تہذیب التہذیب ج۶ ص ۴۵۵، ۴۵۶)

تلامذہ:

ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی وسیع ہے، ان میں سے اکثر کا شمار اجلہ محدثین اور ائمہ فن میں ہے، بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں: ابراہیم بن خریم شاشی، بکر بن مرزبان، سلیمان بن اسرائیل نجندی، سہل بن شاذویہ، شاہ بن جعفر، ابو معاذ عباس بن ادریس ملقب بجزک، عمر بن بجیر، عمر بن محمد اور آپ کے صاحبزادے محمد بن عبد وغیرہ۔

Marfat.com

صحاح ستہ کے مصنفین میں امام مسلم اور امام ترمذی نے اپنی اپنی کتابوں میں ان سے روایتیں لی ہیں اور امام بخاری نے دلائل النبوۃ میں بطریق تعلیق ان کی روایت نقل کی ہے۔ (ایضاً ص ۴۵۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۵ و بستان المحدثین ص ۳۲)

طلب حدیث کی ابتدا اور سفر:

آغاز شباب کے بعد ان کو تحصیل علم کا خیال اور حدیث کی طلب و جستجو کا شوق پیدا ہوا اور اس کے لیے مختلف ملکوں اور شہروں کا سفر کیا، گو اس کی تصریح نہیں ملتی کہ کن کن شہروں اور ملکوں میں گئے لیکن ان کے اساتذہ مختلف ملکوں اور شہروں سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ انہوں نے ان کا سفر کیا ہوگا۔

فضل و کمال:

عبد بن حمید نامور محدثین میں تھے، ان کی عظمت کے لیے اتنا کافی ہے کہ ائمہ صحاح تک نے ان سے اپنی کتابوں میں روایتیں نقل کی ہیں، اصحاب طبقات و تراجم کا بیان ہے کہ وہ فن حدیث کے امام تھے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۵ و بستان المحدثین ص ۳۲)

حفظ و ثقاہت:

ان کے حفظ و ضبط اور ثقاہت پر علما کا اتفاق ہے، علامہ ذہبی نے ان کو احفظ اور ائمہ ثقات میں بتایا ہے، ابن حبان فرماتے ہیں کہ وہ ان علمائے ثقات میں تھے جنہوں نے جمع و تصنیف کا کام کیا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور حافظ تھے، ابن عماد حنبلی کا بیان ہے کہ وہ ثقہ و ثابت تھے، (تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۵۶ و تقریب التہذیب ص ۱۳۴) شاہ عبد العزیز صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ ''خیلے ثقہ و معتبر''۔

وفات:

مشہور اور صحیح روایت کے مطابق ۲۴۹ھ میں اپنے وطن کش میں انتقال کیا، شاہ عبد العزیز صاحبؒ نے ۲۴۳ھ سن وفات تحریر کیا ہے، بعض لوگوں کا بیان ہے کہ دمشق میں وفات پائی لیکن عام محققین کے نزدیک ان کا دمشق جانا ہی ثابت نہیں ہے۔

تصنیفات حمید:

عبد بن حمید کی متعدد تصنیفات ہیں مگر صرف دو کتابوں کا علمائے سیر و طبقات نے ذکر کیا ہے۔

تفسیر:

ابن کثیر کے بیان صاحب التفسیر الحافل سے اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، شاہ عبد العزیز صاحب فرماتے ہیں کہ ''دیار عرب میں یہ تفسیر مشہور و متداول تھی'' اس کے راوی ابن خریم ہیں، حافظ ابن حجر کی نظر سے اس کا ایک جزو گزرا تھا۔

(البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۴ و بستان المحدثین ص ۴۲ و تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۵۶)

Marfat.com

مسند:

ان کی دوسری اہم کتاب مسند ہے، مسند میں ان کی دو کتابیں کبیر وصغیر تھیں، مسند صغیر دراصل کبیر کا انتخاب اور ایک جلد پر مشتمل ہے، اس میں بعض مشاہیر صحابہ کی حدیثیں درج نہیں ہیں، عبد بن حمید کے شاگرد ابراہیم بن خریم نے اس کی ان سے روایت کی ہے، اس کی ابتداء مسند ابی بکر سے ہوتی ہے، (بستان المحدثین ص ۳۲ والرسالۃ المستطرفۃ ص ۵۷ وتہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۵۶) یہ مسند ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے لیکن اس کے مخطوطے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، جرمنی کے مکتبہ جامع قردین، ایاصوفیہ، کوپرویلو وغیرہ کے علاوہ ہندوستان کے مکتبہ سدیہ اورنٹیل پبلک لائبریری بانکی پور اور دائرۃ المعارف العثمانیہ میں بھی اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔

(مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۲۵، فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ ص ۷۵، تذکرۃ النوادر ص ۷، ۸، ۳ ومفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ ص ۲۱)

Marfat.com

امام اسحاق بن بہلول رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۵۲ھ)

نام ونسب:

اسحاق نام، ابو یعقوب کنیت، نسب نامہ ہے: اسحاق بن بہلول بن حسان بن سنان۔ (تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۶)

وطن، ولادت اور خاندان:

ان کا وطن قدیم اور مشہور شہر انبار ہے جو دریائے فرات کے کنارے بغداد سے ۱۰ فرسنگ کے فاصلہ پر واقع ہے، یہیں وہ ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے، ان کا خاندانی تعلق قبیلہ تنوخ سے ہے، اسی نسبت سے تنوخی اور انباری مشہور ہوئے۔ (ایضاً ص ۳۶۹)

اساتذہ:

اسحاق کو جن نامور محدثین سے شرف تلمذ حاصل ہے ان کے نام یہ ہیں:

ابن ابی فدیک، ابو اسامہ، ابو بحر بکراوی، ابو داؤد حفری، ابو عاصم نبیل، ابو عامر عقدی، ابو عبدالرحمٰن مقری، ابو معاویہ ضریر، ابو نعیم، ابو یحییٰ حمانی، اسحاق بن یوسف ازرق، اسماعیل بن علیہ، ابو ضمرہ انس بن عیاض، جعفر بن عون، حسین جعفی، سعید بن سالم قداح، سفیان بن عیینہ، شعیب بن حرب، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن داؤد خریبی، عبداللہ بن نمیر، عفان بن مسلم، علی بن عاصم، ابو قطن عمر بن ہشیم، عبیداللہ بن موسیٰ، غندر، قبیصہ بن عقبہ، محمد بن عبید، محمد بن قاسم ازدی، معاویہ بن ہشام، وکیع بن جراح،، وہب بن جریر، ابو النضر ہاشم بن قاسم، یحییٰ بن آدم، یحییٰ بن سعید قطان، یعلی بن عبید اور ان کے والد بہلول وغیرہ۔ (تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۶)

تلامذہ:

مشہور تلامذہ حسب ذیل ہیں:

ابراہیم حربی، ابو بکر بن ابی الدنیا، قاضی ابو عبداللہ محاملی، عبداللہ بن محمد بن ناجیہ، قاسم بن زکریا مطرز، محمد بن عبدالرحیم صاعقہ، محمد بن موسیٰ نہر تیری، یحییٰ بن صاعد اور دونوں صاحبزادے احمد، بہلول اور پوتے یوسف بن یعقوب، جعفر فریابی وغیرہ۔ (تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۶، ۳۶۷، تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۰۰)

رحلت وسفر:

انہوں نے علم کی جستجو اور حدیث کی طلب وتکمیل کے لئے بغداد، کوفہ، بصرہ، مدینہ اور مکہ کا سفر کیا۔
(تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۶)

Marfat.com

حفظ وضبط:

حفظ ضبط اور صدق وثقاہت میں بڑے ممتاز تھے اسی لئے علمائے فن نے ان کو الحافظ کہا ہے، ابن صاعد کا بیان ہے کہ تقریباً ۵۰ ہزار حدیثیں انہوں نے زبانی بیان کیں مگر کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی، خطیب اور حافظ ذہبی لکھتے ہیں: و کان ثقة (یعنی ومعتبر تھے) عبدالرحمٰن نے اپنے والد ابوحاتم سے ان کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا وہ صدوق تھے۔

(ایضاً وص ۳۶۸، والعبر ج ۲ ص ۳)

نقد وتمیز:

حفظ وثقاہت کی طرح ان کو صحیح وغلط روایات میں امتیاز کا بھی ملکہ تھا، ذہبی نے ان کو الناقد لکھا ہے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۰ وتاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۶)

فقہ:

فقہ میں بھی ممتاز تھے اور اس میں کتابیں بھی لکھی ہیں، اس کی تحصیل وتکمیل حسن بن زیاد لولوئی اور امام ابو یوسف کے ممتاز ترین شاگرد ہشیم بن موسیٰ سے کی تھی مگر وہ فقہائے مقلدین میں نہ تھے بلکہ مجتہد تھے اور بعض مسائل میں عام فقہا سے منفرد رائے رکھتے تھے، خطیب کا بیان ہے۔

وله مذاهب اختارها ينفرد بها۔ (تاریخ بغداد ج ۶، ۳۶۶، ۳۶۷)

بعض مسائل میں ان کے مختارات وتفردات پائے جاتے ہیں۔

قراءت:

قراءت کے فن سے بھی دلچسپی تھی اور اس میں بھی انہوں نے کتاب لکھی تھی۔

لغت، نحو وعربیت:

حدیث وفقہ کے علاوہ ان کو لغت، نحو اور شعر وادب میں بھی دستگاہ حاصل تھی۔ (تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۶، ۳۶۷)

امامت:

ان علوم میں کمال کی بنا پر ان کا شمار ائمہ فن میں ہوتا تھا، علامہ ذہبی لکھتے ہیں: و کان من کبار الائمة (یعنی وہ اکابر ائمہ میں تھے)۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۰ والعبر ج ۲ ص ۳)

اخلاق وعادات:

بڑے فیاض وسیر چشم تھے، ان کی آمدنی وافر تھی مگر خود بقدر کفاف پر زندگی بسر کرتے تھے اور آمدنی کا بڑا حصہ غریبوں اور ناداروں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ (تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۵)

Marfat.com

وفات:

اسحاق نے طویل عمر پائی ۸۸ سال کی عمر میں اپنے وطن انبار میں ماہ ذوالحجہ ۲۲ھ میں انتقال کیا، امیر انبار بحونہ بن قیس شیبانی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ (تاریخ بغداد ج۶ ص ۳۶۵)

اولاد:

علمائے سیر نے ان کے تین صاحبزادوں احمد، بہلول یعقوب اور ایک پوتے یوسف بن یعقوب کا ذکر کیا ہے۔

آمدنی:

ان کی زندگی اطمینان وفراغت سے بسر ہوتی تھی، ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ متوکل نے میرے والد کو طلب کر کے ان سے سماع کیا اور اتنی زمین عطا کی جس کی پیداوار سے ۱۲ ہزار سالانہ آمدنی ہوتی تھی، اس کے علاوہ پانچ ہزار درہم سالانہ مزید دفتر شاہی سے ملتا تھا۔ (ایضاوتذکرہ ج ۲ ص ۱۰۰)

تصنیفات:

وہ کثیر التصانیف تھے، فقہ، حدیث اور قراءت کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی ان کی تصنیفات تھیں، خطیب کا بیان ہے صنف فی غیر ذلک من انواع العلم لیکن وہ سب معدوم ہیں، جن کتابوں کا ذکر ملتا ہے وہ یہ ہیں:

1. قراءت میں ایک کتاب کا تذکرہ کیا جاتا ہے لیکن اس کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔
2. فقہ میں ان کی کتاب کا نام المتضاد تھا۔
3. حدیث میں ایک ضخیم مسند لکھی تھی۔ (ایضا)

Marfat.com

امام ابو محمد عبد اللہ دارمی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۵۵ھ)

نام و نسب:

عبد اللہ نام، ابو محمد کنیت، سلسلہ نسب یہ ہے: عبد اللہ بن عبد الرحمن فضل بن بہرام بن عبد الصمد خزرجی نے بہرام کے بجائے مہران لکھا ہے۔ (تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ و تہذیب ج ۵ ص ۲۹۴ و خلاصہ تذہیب ص ۲۰۴)

ولادت، خاندان، وطن:

۱۸۱ھ میں خراسان کے مشہور شہر سمرقند میں پیدا ہوئے، قبیلہ تمیم کی ایک شاخ دارم سے نسبی تعلق تھا، اس کی نسبت سے سمرقندی، تمیمی اور دارمی کہلائے، آخری نسبت سے جو دارم بن مالک کی جانب زیادہ مشہور ہوئے۔

(ایضاً و کتاب الانساب ورق ۲۱۸)

اساتذہ:

امام دارمی کو جن نامور علماء و مشائخ سے استفادہ کا موقع میسر آیا ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

احمد بن اسحاق حضرمی، اسود بن عامر شاذان، اشہل بن حاتم، ابو صالح کاتب، لیث بن سعد ابو بکر حنفی، ابو المغیرہ حمصی، ابو عاصم، ابو نعیم، جعفر بن عون، حبان بن ہلال، ابو الیمان حکم بن نافع بہرانی، حیوۃ بن شریح، زکریا بن عدی، سعید بن عامر ضبعی، عبد الصمد بن عبد الوارث، عبد اللہ بن موسیٰ، ابو علی عبید اللہ بن عبد المجید حنفی، عثمان بن عمر بن فارس، محمد بن مبارک صوری، محمد بن یوسف فریابی، مروان بن محمد، نضر بن شمیل، وہب بن جریر، ابو النضر ہاشم بن قاسم، یحییٰ بن حسان تنیسی، یزید بن ہارون اور یعلی بن عبید وغیرہ۔ (تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ و کتاب الانساب ورق ۲۱۸ و تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۴)

تلامذہ:

ان کے تلامذہ میں بڑے بڑے نامور محدثین اور ائمہ فن شامل ہیں، ابن ماجہ کے علاوہ دوسرے تمام ائمہ صحاح کو ان سے تلمذ کا فخر حاصل ہے، امام مسلم، ابوداؤد اور ترمذی نے اپنی کتابوں میں ان کے مرویات درج کیے ہیں، مشہور محدثین اور علمائے نقد و جرح میں محمد بن یحییٰ ذہلی، ابو زرعہ، ابو حاتم اور امام احمد کے فرزند عبد اللہ نے بھی ان سے روایت کی ہے، بعض اور ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں:

بقی بن مخلد، بندار بن بشار، جعفر بن محمد فریابی، حسن بن صباح بزار، حفص بن احمد بن فارس رجاء بن مرجی، صالح بن محمد

Marfat.com

جزرہ، عبداللہ بن واصل بخاری، عمر بن بجیر، عمر بن محمد بجیری عیسیٰ بن عمر سمرقندی، محمد بن عبدوس بن کامل، سراج اور مطین وغیرہ۔
(تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵)

طلب حدیث کے لئے سفر:

امام دارمی نے اس زمانہ کے دستور کے مطابق حدیث کی طلب و تکمیل کے لئے شام، بغداد، مصر عراق، خراسان اور مکہ و مدینہ کا سفر کیا، خطیب اور دوسرے مورخین نے ان کے سفر و رحلت کی کثرت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ایک تھے جو حدیث کے لئے بہت زیادہ سفر کیا کرتے تھے۔ بعض علمائے رجال نے لکھا ہے کہ رحل وطوف یعنی طلب حدیث کے لیے سفر کیا اور ملکوں کی خاک چھانی، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں "صاحب رحلت و اسفار ست، اکثر بلادِ اسلام راگشتہ و علم حدیث را از بلدان بعیدہ جمع کردہ۔

(العبر ج ۲ ص ۸ مسرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۶۱، شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۳۰، بستان المحدثین)

حفظ وضبط:

قدرت نے ان کو حفظ وضبط کا غیر معمولی ملکہ عطا کیا تھا، ائمہ فن کے اعترافات ملاحظہ ہوں:
عبداللہ بن نمیر جیسے بلند پایہ محدث کا بیان ہے کہ "دارمی حافظہ کے لحاظ سے ہم پر فوقیت رکھتے تھے رجاء بن جابر مرجی کا بیان ہے کہ میں نے احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، علی بن مدینی اور شاذ کونی وغیرہ ائمہ حدیث میں سے کسی کو عبداللہ سے بڑا حافظ نہیں پایا، امام احمد سے ان کے فرزند عبداللہ نے حفاظ حدیث کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے چند نوجوانان خراسان کا جن میں دارمی کا نام بھی تھا، ذکر کیا، عبداللہ اپنے والد سے یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ "حفظ جن چار آدمیوں پر تمام ہو گیا، ان میں ایک یہ بھی تھے" عثمان بن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ "ان کے ضبط کے متعلق جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ فائق تھے" محمد بن ابراہیم شیرازی کا بیان ہے کہ "دارمی کا حافظہ ضرب المثل ہے" ابو عبداللہ حکم فرماتے ہیں کہ "وہ مشہور و برگزیدہ حفاظ حدیث میں تھے" ابن حبان لکھتے ہیں کہ "وہ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے حدیثیں حفظ و جمع کیں" امام نووی تحریر فرماتے ہیں کہ "دارمی اپنے زمانہ کے ان مشہور حفاظ میں تھے جن کے بہت کم لوگ فضل و کمال اور حفظ وضبط میں ہمسر تھے، خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ "وہ ان علمائے اسلام اور حفاظ حدیث میں سے ایک ہیں جو احادیث کے حفظ و جمع کے لئے مشہور ہیں" بندار فرماتے ہیں، حفاظ دنیا چار ہیں ان میں سمرقند کے امام دارمی بھی شامل ہیں۔ (تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶ و تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵، ۲۹۶ و تدریب الراوی ص ۲۷، ۲۷۷ و مقدمہ مسند دارمی ص ۷)

ثقاہت:

ان کی ثقاہت و عدالت کے بھی علمائے فن اور ارباب کمال معترف ہیں، ابو حاتم رازی کا بیان ہے کہ: "وہ سب سے زیادہ ثقہ و ثابت تھے" امام احمد کو ما ورائے ثقاہت اور خطیب صاحب صدق و ثقاہت بتاتے ہیں، ابن حبان نے ان کو حفاظ متقنین میں اور ابو حاتم نے ثقہ و صدوق لوگوں میں شامل کیا ہے۔ (تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۰ و تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۶)

Marfat.com

معرفت وروایت:

وہ احادیث کی معرفت وتمیز کے لئے مشہور تھے روایت کی طرح درایت میں بھی ان کا مقام بلند تھا، رجا بن جابر مرجی فرماتے ہیں کہ "میں نے ان سے بڑا کسی کو حدیث سے واقفیت رکھنے والا نہیں دیکھا، احمد بن یسار کہتے ہیں کہ حدیث میں ان کی واقفیت غیر معمولی اور نظر بڑی وسیع اور گہری تھی، عثمان بن ابی شیبہ ان کے حافظہ کی طرح ان کی معرفت وبصیرت کے بھی معترف تھے، ابو منصور شیرانی کا بیان ہے کہ ان کی درایت ضرب المثل تھی، علم حدیث میں ان کی واقفیت اور تمیز کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے امام احمد کے سامنے ابن المنذر کی تعریف کی تو انہوں نے فرمایا کہ مجھ کو ان سے کوئی واقفیت نہیں مگر حیرت ہے کہ تم لوگوں کو عبداللہ بن عبدالرحمٰن کا علم نہیں، پھر تین مرتبہ تاکید کے ساتھ فرمایا کہ (علیک بذاک السید) یعنی تم کو اس سردار کے حلقۂ فیض سے وابستہ رہنا ضروری اور لازم ہے، ایک اور شخص نے امام احمد سے حمانی کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ دارمی کے قول کی بنا پر ہم ان کو متروک الحدیث سمجھتے ہیں، عبداللہ بن مبارک مخرمی کا بیان ہے کہ "اے اہل خراسان جب تک یہ تمہارے درمیان موجود ہیں تم کو کسی اور سے اشتغال رکھنے کی ضرورت نہیں۔"

(تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۱، ۳۲ وتہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵)

فقہ وتفسیر:

امام دارمی کو دوسرے اسلامی علوم وفنون میں بھی دستگاہ حاصل تھی، فقہ وتفسیر سے ان کی مناسبت اور تعلق کا اکثر علمائے رجال نے ذکر کیا ہے، حافظ ابن حجر ان کو باکمال مفسر اور صاحب علم فقیہ قرار دیتے ہیں، (تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵) ان فنون میں انہوں نے کتابیں بھی لکھیں تھیں اور فقہ میں ان کے مجتہدانہ کمالات کا ثبوت ان کی سنن سے بھی ملتا ہے۔

عقل ودانش:

اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت ودانائی اور عقل وفراست سے بھی خاص طور پر بہرہ ور کیا تھا خطیب اور دوسرے مؤرخین کا بیان ہے کہ: وکان علی غایۃ العقل ونہایۃ الفضل، یعنی وہ نہایت عاقل وفاضل شخص تھے، بعض علمائے رجال لکھتے ہیں کہ "وہ اپنی متانت اور دانشمندی کے لیے مشہور تھے۔ (تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶)

عبادت وتقویٰ:

امام دارمی علم وعمل دونوں کے جامع تھے اور زہد وتقویٰ کے لحاظ سے بھی ان کا مرتبہ نہایت بلند تھا، ان کو عبادت واطاعت الٰہی میں بڑا انہماک تھا، عبداللہ بن نمیر فرماتے ہیں کہ "وہ ورع وتقویٰ کے اعتبار سے ہم سب پر فوقیت رکھتے تھے" خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ وہ زہد واتقا سے متصف تھے" ابو منصور شیرازی کا بیان ہے کہ "ان کی ذات زہد وتقویٰ اور دیانت وعبادت کے لئے ضرب المثل تھی" عثمان بن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے ان کی عصمت اور پاکیزگی نفس کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس سے زیادہ عظیم اور برتر تھے"۔

(تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶ وتہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵)

Marfat.com

جاہ و منصب اور دنیا طلبی سے پرہیز:

دنیاوی عیش و تنعم سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے، قناعت اور سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے، امام احمد فرماتے ہیں کہ ''میرے سامنے کفر پیش کیا گیا میں نے اس کو ٹھکرا دیا، دارمی کے سامنے دنیا پیش کی گئی اور وہ اس کی جانب مائل اور متوجہ نہ ہوئے'' دنیوی جاہ و منصب سے بے نیازی کا یہ حال تھا کہ ان کو سمرقند کا محکمہ قضا پیش کیا گیا تو قبول کرنے سے انکار کر دیا، پھر سلطان کے اصرار پر چند دنوں کے لئے قبول کر لیا مگر بہت جلد اس سے سبکدوش ہو گئے۔

(تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶)

سنت و حدیث کی مدافعت:

انہوں نے حدیث کی خدمت و اشاعت اور اس کی حمایت و مدافعت بھی کی اور مخالفین حدیث کا مقابلہ کر کے ان کا زور توڑ دیا، احادیث کے متعلق شکوک و اعتراضات کا جواب اور کذب و دروغ کی آمیزشوں سے ان کو پاک کر کے عوام و خواص سب کے دلوں میں ان کی اہمیت و عظمت اور رسول کی محبت بٹھا دی، اس طرح مختلف حیثیتوں سے انہوں نے علم حدیث و آثار کو فروغ بخشا، علمائے رجال لکھتے ہیں ''اپنے وطن سمرقند میں حدیث و سنت کا بول بالا کر کے لوگوں کو اس کی جانب مائل اور مخالفین حدیث کا قلع قمع کر دیا''۔ (خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۲۰۴)

فقہی مذہب و مسلک:

کتابوں میں ان کے فقہی مذہب کی تصریح موجود نہیں ہے لیکن قیاس اور ان کی سنن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام محدثین کی طرح وہ کسی ایک امام کے مسلک سے وابستہ نہ تھے بلکہ اپنے اجتہاد و تفقہ کے مطابق حدیث و قرآن کی پیروی کرتے تھے۔

فضل و امامت:

ان گوناگوں کمالات نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنا دیا تھا اور وہ ائمہ مسلمین میں شمار کئے جاتے ہیں، معاصرین علماء نے بھی ان کی اس حیثیت کو تسلیم کیا ہے، امام احمد ان کو امام وسید کے لقب سے موسوم کرتے تھے، ابو سعید اشج کا بیان ہے کہ ''وہ ہمارے امام ہیں'' ابو حاتم فرماتے ہیں کہ ''دارمی اپنے زمانہ کے ائمہ میں تھے'' ابو حامد بن شرقی کا خیال ہے کہ ''خراسان میں ۱۵ ائمہ حدیث پیدا ہوئے، ان میں ایک یہ بھی تھے۔''

(خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۲۰۴ و تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۰ و تذکرۃ الحفاظ ۲ ص ۱۱۶ و تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵)

وفات:

مشہور روایت کے مطابق تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں اپنے وطن سمرقند میں انہوں نے ۸ ذی الحجہ ۲۵۵ھ پنجشنبہ کے دن بعد نماز عصر انتقال کیا اور عرفہ کے دن جمعہ کو تجہیز و تکفین ہوئی لیکن بعض مورخین کا بیان ہے کہ انتقال عرفہ کے دن اور تجہیز و تکفین نحر کے دن انجام پائی، امام بخاری کو جب وفات کی خبر ہوئی تو فرط غم سے سر جھکا کر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور آنکھوں سے

Marfat.com

آنسو جاری ہو گئے اور یہ شعر پڑھا:

ان تبق تفجع بالاحبة کلھم   وفناء نفسک لا ابالک افجع

اگر تو زندہ ہوتا تو احباب کی مفارقت کے صدمے برداشت کرتا، تیرا صفحۂ ہستی سے معدوم ہونا سب سے زیادہ دردناک سانحہ ہے۔

تصنیفات

امام دارمی کی جانب حسب ذیل تصنیفات منسوب ہیں:

۱۔ کتاب التفسیر

۲۔ الجامع یا کتاب الجامع: خیر الدین زرکلی نے اس کا نام الجامع الصحیح لکھا ہے اور اس کو مطبوعہ بتایا ہے، (اعلام ج ۲ ص ۵۶۳) غالب گمان ہے کہ یہ فقہ واحکام کی کتاب ہے۔

مولانا سید ابوالوزیر احمد حسن صاحب نے حاشیہ مشکوٰۃ میں امام دارمی کی رد جہمیت میں بھی کچھ کتابیں بتائی ہیں (حاشیہ تنقیح الرواۃ دیباچہ مشکوٰۃ،۶) لیکن ان کے نام نہیں تحریر کیے''۔

اسی طرح علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ ''علمائے سیر نے ان کی تصنیفات میں جامع، مسند تفسیر اور ان کے علاوہ کتابوں کا ذکر کیا ہے مگر غالباً موجود صرف دو کتابیں ہیں۔ (تدریب الراوی ص ۵۷)

۳۔ سنن دارمی: یہ ان کی سب سے مشہور اور اہم کتاب ہے، صحاح ستہ کے بعد حدیث کی جو کتابیں زیادہ اہم اور مستند سمجھی جاتی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے، شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی فرماتے ہیں ''کتاب او از احسن کتب حدیث است'' (اکمال شرح مشکوٰۃ ص ۱۶) اس کی اہمیت کی بنا پر محدثین اور علمائے فن نے اس کی حدیثوں کو قابل احتجاج اور لائق استدلال خیال کیا ہے، مشکوٰۃ میں جو منتخب کتابوں کی حدیثوں کا منتخب مجموعہ ہے، صحاح اور دوسری معتبر کتابوں کی طرح اس کی احادیث بھی شامل ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے کتب حدیث کے تیسرے طبقہ میں اس کا ذکر کیا ہے، اس کی صحت واسناد کی بنا پر اس کو صحاح ستہ میں بھی شامل کیا گیا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔

کتب وابواب کی تعداد:

سنن دارمی ۳۵ فصول (کتب) اور ایک ہزار چار سو آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔

ترتیب

عام کتب حدیث وسنن کے برعکس اس کی ابتدا: ''باب ما کان علیه الناس قبل مبعث النبی ﷺ من الجهل والضلالة'' سے ہوتی ہے، اس فصل کے مختلف ابواب میں رسالت مآب ﷺ کے ان اوصاف وخصائص کو جو کتب قدیمہ میں مذکور ہیں اور آپ کے معجزات، فضائل ومحامد، اتباع سنت اور علم کی اہمیت وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد عام کتب سنن کی طرح طہارت اور نماز وغیرہ کے جملہ ابواب اور آخر میں وصایا اور فضائل قرآن کے ابواب ہیں۔

Marfat.com

خصوصیات:

ا۔اس میں ۱۵ ثلاثی حدیثیں ہیں یہ تعداد بظاہر تو کم معلوم ہوتی ہے لیکن سنن کی کمیت اور دوسری کتابوں کے لحاظ سے کم نہیں ہے، اسی لیے بعض علمائے فن کا بیان ہے کہ ''اس کی ثلاثیات بخاری کی ثلاثیات سے زیادہ ہیں اور رباعیات بکثرت ہیں۔
(الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۹ و مقدمہ مشکوٰۃ ص ۱۵ و مقدمہ داری ص ۷)

۲۔اس کی ایک اہم خصوصیت صحت کا التزام اور علوئے اسناد بھی ہے، علمائے رجال کا بیان ہے و لہ اسانید عالیۃ یعنی داری کی سندیں نہایت عالی اور بلند پایہ ہیں۔ (الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۹) علمائے جرح و تعدیل نے تصریح کی ہے کہ اس کے اکثر رجال ثقہ اور بیشتر حدیثیں صحیح و ثابت ہیں، علامہ ابن حجر نے اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کو سنن ابن ماجہ سے بھی زیادہ اہم اور فائق بتایا ہے۔ (مقدمہ داری ص ۷)

۳۔یہ اگرچہ حدیث کی کتاب ہے لیکن اس میں فقہی مسائل و مباحث اور ان کے متعلق فقہا کے اختلافات و دلائل بھی بیان کیے گئے ہیں اور مختلف اقوال میں تطبیق و توجیہ یا مرجح و مختار مسلک کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔

۴۔احادیث کی طرح صحابہؓ و تابعینؒ کے آثار و فتاویٰ بھی نقل کیے گئے ہیں، بلکہ بعض بعض ابواب میں صرف صحابہؓ و تابعینؒ کے اقوال و آثار ہی مذکور ہیں۔

۵۔عام خصوصیات اور جملہ فنی خوبیوں سے بھی یہ کتاب آراستہ ہے، مثلاً روایات کے مفہوم و منشا کی وضاحت، ابہام کی تشریح، دقیق الفاظ اور مشکل لغات کا حل، رواۃ کے ناموں کی مختلف حیثیتوں سے وضاحت، بلاد و اماکن کی تحقیق، تعدد طرق و اسناد و روایات اور ان کے الفاظ کا فرق و اختلاف اور متابعات وغیرہ کی تفصیل مسند، مرفوع اور منقطع و موقوف کی توضیح، خطا، شک، تردد اور اشتباہ کی تصریح، روایات اور رواۃ کے متعلق مختلف قسم کی وضاحتیں، اساتذہ کی وضاحت و تشریح، راوی کے سماع و عدم سماع اور لقا و عدم لقا کا ذکر، احادیث کی تصویب، ان کے درمیان ترجیح و اسباب ترجیح اور ان کے نسخ و عدم نسخ وغیرہ کی تفصیل موجود ہے۔

سنن یا مسند داری:

اس کتاب کو سنن اور مسند دونوں کہا جاتا ہے، اس لیے اس کی مختصر وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

مسند میں صحابہؓ کے ناموں کی ترتیب پر حدیثیں درج ہوتی ہیں اور سنن کی ترتیب فقہی ابواب پر ہوتی ہے، ایمانیات اور کتاب الطہارۃ سے لے کر وصایا تک کی حدیثیں ابواب کے ماتحت نقل کی جاتی ہیں، اس تعریف کی رو سے داری کا شمار سنن ہی میں ہونا چاہیے، علامہ سیوطی فرماتے ہیں ''کہا جاتا ہے کہ مسند داری مسند نہیں ہے بلکہ اس کی ترتیب ابواب پر ہے۔'' (تدریب الراوی ص ۵۷) صاحب شرح الفیہ کا بیان ہے کہ ''ابن صلاح نے اس کو مسانید میں شمار کیا ہے حالانکہ یہ ان کا وہم ہے کیونکہ اسکی ترتیب مسانید کے بجائے ابواب پر ہے'' (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۳) شاہ عبدالعزیز صاحب ارقام فرماتے ہیں:

''و این کتاب برخلاف اصطلاح محدثین مشہور بمسند گشتہ حالانکہ مرتبہ بر ابواب است نہ بر صحابہ، پس باید کہ آنرا سنن داری گویند''
(بستان المحدثین ص ۴۳)

Marfat.com

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی اصل حیثیت سنن کی ہے تاہم ابن صلاح کے قول کو اس قدر شہرت ہوئی کہ اب وہ سنن کے بجائے مسند ہی کے نام سے زیادہ مشہور ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "کتاب السنن جو مسند دارمی کے نام سے موسوم کی جاتی ہے مرتبہ میں عام سنن سے کم تر نہیں ہے" (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۳) اس کا سبب یہ ہے کہ مسند کا اطلاق کبھی ان کتابوں پر بھی کیا جاتا ہے جن کی ترتیب صحابہؓ کے ناموں کے بجائے فقہی ابواب پر ہوتی ہے لیکن ان کی سندیں آنحضور ﷺ تک منتہی اور مذکور ہوتی ہیں، اسی لیے امام بخاری نے اپنی کتاب کا نام الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ و سننه و ایامه، رکھا ہے اور امام مسلم نے بھی صحیح مسلم کو مسند کے نام سے تعبیر کیا ہے، (فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ ص ۱۵۸) اس لحاظ سے سنن دارمی کو بھی مسند کہا جا سکتا ہے، عراقی کا بیان ہے کہ "یہ مسند کے نام سے مشہور ہے، جیسا کہ امام بخاری نے اپنی کتاب کا نام بھی مسند رکھا ہے کیونکہ اس کی احادیث کی سندیں رسول اللہ تک مذکور ہیں" (تدریب الراوی ص ۵۷) یہاں ایک اور شبہ ہوتا ہے جس کا جواب دیتے ہوئے مولانا عبدالحلیم چشتی لکھتے ہیں "اسی طرح سنن دارمی کو مسند دارمی کے نام سے ذکر کرتے ہیں حالانکہ اس میں تمام حدیثیں مرفوع نہیں ہیں، مرسل، منقطع اور معضل سب ہی کچھ ہیں مگر مرفوعات کا ذخیرہ زیادہ ہے، اس لیے اس کو بھی مسند کہہ دیتے ہیں۔" (فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ ص ۱۸۵)

اس تفصیل سے ثابت ہو گیا کہ اگرچہ دارمی کی تصنیف اپنی نوعیت اور ترتیب وغیرہ کے لحاظ سے سنن میں شامل ہے لیکن وہ مسند کے نام سے بھی مشہور ہے اور اس کو مسند کہنا غلط نہیں ہے۔

کیا سنن دارمی صحاح ستہ میں شامل ہے؟

جمہور علمائے اسلام کے نزدیک صحاح کی چھٹی کتاب سنن ابن ماجہ ہے لیکن بعض لوگوں نے مؤطا امام مالک کو اور بعض نے دارمی کو صحاح کی چھٹی کتاب قرار دیا ہے، مغلطائی کی یہی رائے ہے، ان لوگوں کے دلائل یہ ہیں کہ دارمی کی سنن صحت کے لحاظ سے ابن ماجہ کی سنن پر فوقیت رکھتی ہے، اس کی سندیں عالی، رجال ثقہ وقوی، رباعیات بکثرت اور شاذ و منکر روایات بہت کم ہیں، علاوہ ازیں امام دارمی کا زمانہ قدیم ہے اور فضل و کمال کے لحاظ سے ان کا مرتبہ زیادہ ہے۔

لیکن بایں ہمہ جمہور کے قول کے مقابلہ میں یہ قول مرجوح سمجھا جائے گا۔

ایک شبہ کا ازالہ:

مسند دارمی کے متعلق یہ جو کہا جاتا ہے کہ "وہ مرسل، موقوف، منقطع اور معضل روایات پر مشتمل ہے، تو دراصل یہ امام بخاری کی صحیح کے مقابلہ میں ہے جیسا کہ عراقی کے پورے بیان سے اس کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔

"یہ مسند کے نام سے مشہور ہے، جس طرح امام بخاری نے اپنی کتاب کا نام المسند الجامع رکھا ہے لیکن (بخاری کے مقابلہ میں) دارمی کے اندر مرسل، منقطع اور معضل روایتیں زیادہ ہیں" (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۳) اور اس قول سے دارمی کی شہرت و اہمیت میں بھی فرق نہیں آتا کیونکہ اس کی صحت، علو اسناد وغیرہ کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے، باقی وقف، ارسال اور انقطاع وغیرہ تو حقیقت میں امام دارمی کے حزم و احتیاط کی دلیل ہے اور مؤطا امام مالک جیسی معتبر اور اہم کتاب میں تو اسی قسم کی روایتوں کی زیادتی ہے۔

Marfat.com

سنن دارمی کا ایک قلمی نسخہ ۷۳۵ھ کا لکھا ہوا ۲۵۵ اوراق پر مشتمل کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود (فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۲۱) ہے، ۱۲۸۶ھ میں نواب صدیق حسن خان صاحب حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ تشریف گئے تو ان کو وہاں شاہ ولی اللہ صاحب کے ذخیرۂ کتب میں اس کا ایک نسخہ دستیاب ہوا اور انہوں نے اس کو نقل کر ڈالا، اسی نقل کو ۱۲۹۳ھ میں مولانا عبدالرشید بن محمد شاہ کشمیری نے دو اور نسخوں سے جن میں سے ایک ۸۰۰ھ کا لکھا ہوا تھا اور اس کی تصحیح صاحب حصن حصین علامہ جزری نے کی تھی مقابلہ وتصحیح کے بعد مختصر حواشی کے ساتھ مطبع نظامی کانپور سے شائع کیا۔

مولانا عبدالرشید صاحب نے حواشی میں دوسرے نسخوں سے اس کا فرق بھی ظاہر کیا ہے اور مشکل الفاظ، اعراب، اسماء رجال اور بلاد واماکن کی مختصر تشریح اور حدیث کے معنی ومفہوم کی مختصر وضاحت بھی کی ہے اور اس کے شروع میں ایک مقدمہ کے اندر سنت وحدیث کی اہمیت، محدثین کی عظمت، کتب حدیث کے اقسام اور امام دارمی کے حالات وسوانح اور ان کی سنن کے مقام ومرتبہ وغیرہ سے بحث کی ہے۔

سنن دارمی کی ثلاثیات کو الگ سے بھی مرتب کیا گیا ہے، حاجی خلیفہ لکھتے ہیں:

”کتاب ثلاثیات دارمی ـــــ ان پندرہ حدیثوں پر مشتمل ہے جو ان کی مسند میں بیان ہوئی ہیں۔

(کشف الظنون ج اول ص ۳۵۵)

Marfat.com

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۵۶ھ)

نام ونسب اور ابتدائی حالات:

سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ، ان کا اصلی نام محمد اور کنیت ابوعبداللہ ہے، ان کے جد اعلیٰ بردزبہ فارس کے رہنے والے اور مذہباً مجوسی تھے۔

امام صاحب کے جد امجد مغیرہ پہلے شخص ہیں، جو اس خاندان میں مشرف بہ اسلام ہوئے، اس زمانہ کا قاعدہ تھا کہ جس شخص کے ہاتھ پر اسلام لاتے تھے، اسی کی نسبت سے نومسلم مشہور ہوجاتے تھے، مغیرہ چونکہ امیر بخارا یمان جعفی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے، اس لئے جعفی مشہور ہوگئے، اور یہ لقب نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا ہوا امام صاحب تک پہنچا، اس بنا پر امام صاحب جعفی کے لقب سے بھی مشہور ہیں۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۴۷۸ و کتاب الانساب ورق ۱۳۲)

امام صاحب کے دادا ابراہیم کا حال کچھ نہیں معلوم ہوسکا لیکن ان کے والد اسماعیل چوتھے طبقہ کے معتبر محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں، اسماعیل کی ثقاہت اور مرتبہ کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام مالک اور حماد جیسے محدثین کی انہوں نے شاگردی کی اور ابن مبارک جیسے شیوخ کی صحبت میں مدتوں رہے، اہل عراق نے اکثر حدیثیں ان سے روایت کی ہیں، خود امام بخاری نے تاریخ کبیر میں ان کے حالات لکھے ہیں اور اپنے بزرگ والد کے فضل وکمال پر فخر کیا ہے۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۴۷۸)

امام صاحب کے نام سے زیادہ ان کی وطنیت مشہور ہے، اس لئے اس قدر ہر شخص جانتا ہے کہ ان کا اصلی وطن بخارا ہے، بخارا قدیم جغرافیہ میں اقلیم پنجم کے صوبہ ماوراء النہر کا ایک جلیل القدر شہر سمجھا جاتا تھا (معجم البلدان ج ۲ ص ۸۱ و ۸۲ و تاریخ ابن خلکان ج ۳ ص ۳۳۲) لیکن جدید جغرافیہ کے رو سے ایشیائی ترکستان میں واقع ہے اس کی پشت پر سمرقند، داہنی طرف تاشقند، بائیں طرف صحرائے کراکورم اور سامنے صحرائے قزل خورم ہے، دوسری صدی کے اواخر میں (جب بخارا کو امام صاحب کی پیدائش کا شرف حاصل ہوا) خلفائے عباسیہ کے زیر حکومت تھا اور مقامی انتظام کیلئے دربار خلافت کی طرف سے ایک گورنر رہا کرتا تھا۔

شوال کی تیرہویں تاریخ تھی اور جمعہ کا دن تھا، جب ۱۹۴ھ میں امام بخاری پیدا ہوئے ابھی کھیل کود کے دن ختم نہیں ہوئے تھے کہ ان کے والد اسماعیل ان کو یتیمی کا داغ دے کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے، ان کی والدہ جن کی تنہا سرپرستی اور توجہ پر ان کی آئندہ ترقی کا دارومدار تھا، ان کو اور ان کے بڑے بھائی احمد کو لے کر بخارا سے مکہ معظمہ چلی آئیں، وہیں انہوں نے نشوونما پائی اور ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۴۷۸)

امام صاحب کی تحصیل علم کا زمانہ بچپن ہی سے شروع ہوتا ہے، ابتدائی تعلیم میں علم فقہ پر توجہ کی اور امام وکیع اور امام ابن

Marfat.com

مبارک جیسے اساتذۂ فن کی تصنیفات کا مطالعہ کیا، پندرہ برس کی عمر میں فقہ کی تعلیم سے فارغ ہو گئے تو اس مقدس فن کی جانب متوجہ ہوئے، (ایضاً ص ۴۷۹ وطبقات الشافعیہ الکبریٰ ۲ ص ۴ و ۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۳۴) جس کی پریشان اور پراگندہ حالت ان کی آئندہ توجہ اور سرپرستی کا انتظار کر رہی تھی، اگرچہ اس تفصیل کا حال نہیں معلوم ہوتا کہ امام صاحب نے کن مشائخ سے فن حدیث کو حاصل کیا لیکن اس قدر مسلم ہے کہ ان کا فضل و کمال اسحاق بن راہویہ اور علی بن المدینی کے فیضان تعلیم کا زیادہ ممنون ہے۔

ان بزرگوں کے علاوہ اور جن مشائخ کا تاریخوں میں پتہ چلتا ہے، ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے شیوخ میں مختلف درجہ اور مختلف طبقے کی جماعتیں شامل تھیں، مثلاً

1. تبع تابعین جیسے محمد بن عبداللہ انصاری، ابو عاصم النبیل۔
2. تبع تابعین کے معاصر، مگر کسی ثقہ تابعی سے انہوں نے حدیث کی روایت نہیں کی، جیسے آدم ابن ایاس۔
3. تبع تابعین سے جن لوگوں کو اخذ حدیث کا موقع ملا، جیسے قتیبہ بن سعید، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، علی بن مدینی، یحییٰ بن معین۔ (امام مسلم نیشاپوری نے بھی ان لوگوں سے روایت کی ہے)

۴۔ ہم درس طلبہ جیسے محمد بن یحییٰ ذہلی، ابو حاتم رازی، محمد بن عبدالرحیم صاعقہ۔

۵۔ امام صاحب کے معاصرین جیسے عبداللہ بن حماد آملی، عبداللہ بن ابی العاص خوارزمی۔ (مقدمہ فتح الباری ۴۷۹، ۴۸۰)

امام صاحب کے شوق علم کا یہ حال تھا کہ بغداد، بصرہ، خراسان، کوفہ، خوارزم، حجاز اور شام میں اس وقت کوئی محدث ایسا نہ تھا، جس سے امام صاحب نے کچھ نہ کچھ اخذ نہ کیا ہو، (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۳۴ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳) ان کے تمام شیوخ کی مجموعی تعداد ایک ہزار اسی ہے جس میں پہلے قسم کے محدثین کا حصہ زیادہ ہے۔ (مقدمہ فتح الباری ۴۷۹)

امام صاحب فطرۃً نہایت قوی الحافظہ تھے، فطرت کی اس فیاضی سے انہوں نے فن حدیث کی تحصیل میں بہت فائدہ اٹھایا، استاذ سے جو حدیث سنتے فوراً زبانی یاد کر لیتے، ابتدا میں کتابت حدیث کے سخت خلاف تھے، ان کا قول تھا کہ:

"کتابت سے انسان کی فطری قابلیت کم ہو جاتی ہے اور محض کتابوں پر اعتماد کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔"

(مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۷)

لیکن آگے چل کر جب ضروریات زمانہ متقاضی ہوئے تو ان کو اپنی رائے بدلنی پڑی۔

امام صاحب کی شہرت:

امام صاحب کے فضل و کمال کی شہرت، اس سے پہلے کہ وہ فارغ التحصیل ہوں دور دور تک پہنچ چکی تھی، حفظ حدیث میں ان کا پایہ اس قدر بلند تھا کہ بڑے بڑے محدثین مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، اس لئے ان کی تیزی ذہن اور قوت حافظہ کا عام طور پر اعتراف کیا جاتا تھا، ان کے زمانہ کے وہ علما جن کے گرد و پیش ایک بڑی جماعت تلامذہ کی رہتی تھی اور جو فضل و کمال کے لحاظ سے خود امام فن کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے کسی مجموعۂ حدیث کو امام صاحب صحیح تسلیم کرتے، تو فخریہ لہجہ میں کہتے کہ:

"ہماری ان حدیثوں کو محمد بن اسماعیل بخاری نے صحیح تسلیم کیا"۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۳، ۴۸۴)

یعنی ان احادیث کی صحت میں اب کس کو کلام ہو سکتا ہے، جب امام بخاری جیسے نقاد نے صحیح قرار دیا۔

Marfat.com

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس شہرت نے وہ ترقی کی کہ دور دور سے لوگ سمع حدیث کی غرض سے حاضر ہونے لگے، ائمہ حدیث درس دیتے ہوئے امام صاحب کو اپنی مسند خاص پر جگہ دیتے اور امام احمد بن حنبل جیسے بزرگ کہتے ہیں کہ ''خراسان کی سرزمین نے محمد بن اسماعیل جیسا شخص پیدا نہیں کیا''۔ (تاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۱)

یوسف بن موسیٰ مروزی نے بصرہ میں امام صاحب کی وسعت علم اور شہرت کا پر اثر منظر دیکھا تھا، ان کا بیان ہے کہ ایک دن کسی شخص کو گلیوں میں پکارتے ہوئے سنا کہ ''اے قدردانان علم! ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل آج کل بصرہ میں تشریف فرما ہیں، جو شخص ان کی زیارت کا مشتاق ہو، جامع مسجد میں حاضر ہو'' یہ آواز سنتے ہی جامع مسجد میں حاضر ہوا، مسجد میں اس وقت بہت سے علما جمع تھے، ایک ادھیڑ عمر کا شخص ستون کی آڑ میں نماز پڑھ رہا تھا، معلوم ہوا کہ امام محمد بن اسماعیل بخاری یہی ہیں، نماز سے فارغ ہو کر علما کی طرف متوجہ ہوئے، حاضرین نے درخواست کی، آج حدیث کے متعلق خطبہ دیں، امام صاحب نے منظور فرمایا، شہر میں اعلان کر دیا گیا کہ فلاں وقت امام صاحب بیان فرمائیں گے، جوق در جوق مسجد میں جمع ہونے لگے، جب حاضرین کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی تو امام صاحب کھڑے ہوئے اور یوں بیان کرنا شروع کیا، کہ اے علمائے بصرہ! آج میں تمہارے سامنے وہ حدیث پیش کروں گا جن کے راوی تمہارے شہر بصرہ کے رہنے والے ہیں، مگر تم کو ان کی خبر نہیں'' اس کے بعد انہوں نے جتنی حدیثیں بیان کیں، سب کے رواۃ اہل بصرہ تھے۔ (تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۵، ۱۶)

امام صاحب کی اس وسعت معلومات اور معرفت حدیث کو دیکھ کر اکثر علما کہا کرتے تھے کہ:

انما ھو آیۃ من آیات اللہ تمشی علی وجہ الارض ماخلق الا للحدیث۔

(مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۵ والبدایہ ج ۱۱ ص و تاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۵)

امام بخاری خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جو زمین پر چلتی پھرتی نظر آتی ہے، خدا نے ان کو صرف حدیث ہی کیلئے پیدا کیا۔

تحصیل علم کے لئے مختلف مقامات کا سفر:

امام صاحب نے تحصیل علم اور زیارت علما کے لئے دور دراز مقامات کے سفر کئے، مصر و شام میں استفادۂ حدیث کی غرض سے دوبارہ گئے، حجاز میں متواتر چھ سال تک قیام کیا، کوفہ و بغداد میں جو علما کا مسکن تھا، بار بار آیا کیے، بصرہ میں چار بار گئے اور بعض مرتبہ پانچ پانچ برس تک قیام کیا، ایام حج میں مکہ معظمہ چلے جاتے اور فراغت کے بعد پھر بصرہ چلے آتے، (مقدمہ فتح الباری ص ۴۷۹ و تاریخ بغداد ج ۲ ص ۴، ۵) ان تمام سفروں میں نیشاپور کا سفر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

نیشاپور کا سفر:

نیشاپور اس زمانے میں علم حدیث کا مرکز تھا، مسلم بن حجاج صاحب صحیح مسلم اور ان کے استاذ امام محمد بن یحییٰ ذہلی جیسے محدث اسی کی خاک سے اٹھے تھے اور ان کے علم و فضل نے نیشاپور کو دور دور تک مشہور کر دیا تھا، ایسی حالت میں امام صاحب کا نیشاپور جانا اور بڑے بڑے اساتذہ کی موجودگی میں اپنے فضل و کمال کا سکہ بٹھانا ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔

امام صاحب جس شان سے نیشاپور میں داخل ہوئے اور جس جوش سے ان کا خیر مقدم کیا گیا، اس کی تصویر خود امام مسلم نے ان مختصر لفظوں میں کھینچی ہے:

Marfat.com

''امام بخاری جب نیشاپور میں تشریف لائے تو اس دھوم دھام سے ان کا استقبال کیا گیا کہ والیانِ ملک اور سلاطین کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔'' (مقدمہ فتح الباری ص ۴۹۱)

امام صاحب نیشاپور پہنچ کر درس وتدریس حدیث میں لگ گئے، علمائے شہر اکثر اوقات حاضر ہوا کرتے اور امام صاحب کی معلومات حدیث سے مستفیض ہوتے، خود امام مسلم کا یہ حال تھا کہ امام صاحب کی روزانہ مجلس کبھی ان سے خالی نہیں ہوتی تھی، ایک دن امام صاحب کی جامعیت اور تبحر علمی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بے اختیار پیشانی کا بوسہ لے لیا اور جوش میں آ کر کہا کہ:

دعنی اقبل رجلیک یا امیر المؤمنین فی الحدیث۔

اے ملک حدیث کے بادشاہ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں قدم بوسی کا شرف حاصل کروں۔

امام محمد بن یحییٰ ذہلی اس پایہ کے شخص تھے کہ امام مسلم کے استاذ اور نیشاپور کے مسلم محدث تھے، انہوں نے اپنے تمام شاگردوں کو حکم دیدیا تھا کہ امام صاحب کی مجلس میں حاضر ہوا کریں خود امام صاحب کی شہرت اور فضل وکمال نے اس طرح لوگوں کو گرویدہ کیا کہ امام ذہلی جیسے بزرگوں کی مجلسیں بے رونق ہوگئیں۔ (ایضاً وتاریخ بغداد ج ۲ ص ۳۰ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۱)

ایک دن امام ذہلی نے اپنی مجلس میں فرمایا کہ ''میں کل محمد بن اسماعیل بخاری کی ملاقات کو جاؤں گا جس شخص کا جی چاہے میرے ساتھ چلے'' ساتھ ہی امام ذہلی کو یہ خیال ہوا کہ امام بخاری کی بدولت میری درسگاہ میں جو بے رونقی چھا گئی ہے، اس کا اثر میرے طلبہ پر بھی پڑا ہے، اس لیے میرے ساتھیوں میں سے کوئی طالب علم ایسی بات نہ پوچھ بیٹھے، جس کی بدولت مجھ میں اور محمد بن اسماعیل میں رنجش ہوجائے اور غیر اقوام کو اہل سنت کے اختلاف پر ہنسی اڑانے کا موقع ہاتھ آجائے، اس لیے اپنے ہمراہیوں کو تاکید کردی کہ امام بخاری سے اختلافی مسائل کے متعلق کوئی سوال نہ کیا جائے۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۴۹۱)

دوسرے دن امام ذہلی اپنی جماعت کے ساتھ امام صاحب کے یہاں پہنچے، اتفاقاً وہی صورت پیش آ گئی جس کا انھیں خوف تھا، ایک شخص نے اٹھ کر امام صاحب سے سوال کیا کہ یا ابا عبد اللہ قرآن کے جو الفاظ ہماری زبان سے نکلتے ہیں، کیا وہ مخلوق ہیں؟ اس کے اصلی الفاظ یہ تھے: ''لفظی بالقرآن مخلوق'' امام صاحب ساکت رہے، پھر اس شخص نے دوبارہ سوال کیا، امام صاحب نے مجبور ہو کر جواب دیا کہ:

القرآن کلام اللہ غیر مخلوق ولفظی بالقرآن الفاظنا والفاظنا من افعالنا وافعالنا مخلوقۃ۔ (ایضاً)

قرآن کلام الٰہی اور غیر مخلوق ہے، اور جو الفاظ ہماری زبانوں سے نکلتے ہیں وہ ہمارے الفاظ ہیں اور ہمارے الفاظ ہماری زبان کی ایک حرکت ہے اس لئے ہمارا ایک فعل ہے اور افعال مخلوق ہیں۔

امام صاحب نے ان مختصر لفظوں میں درحقیقت اس بحث کا فیصلہ کردیا تھا، ظاہر ہے کہ اگر قرآن کا مفہوم نفس کلام سے ہے، تو کلام خدا کی ایک صفت ہے، اور خدا کی صفت کیوں کر مخلوق ہوسکتی ہے؟ اگر وہ الفاظ مراد ہیں جو ہماری حادث زبانوں سے نکلتے ہیں، تو چونکہ وہ مخلوق کا ایک فعل ہے، لہٰذا ان کے مخلوق ہونے میں کلام نہیں۔

لیکن اس دقیق جواب کو عوام نہ سمجھ سکے، اس لئے اس واقعہ کو اس قدر بڑھایا اور شہرت دی کہ امام صاحب کی عام ہردلعزیزی میں فرق آ گیا مگر جو لوگ دقیقہ رس اور نکتہ سنج تھے، وہ اس جواب کی تہہ کو پہنچ گئے اور پیشتر سے زیادہ وقعت کرنے

Marfat.com

لگے، انہی لوگوں میں ایک شخص امام مسلم بھی تھے، ان کو جب معلوم ہوا کہ امام ذہبی بھی اس جواب کی بدولت امام صاحب کے مخالف ہو گئے اور انہوں نے اپنی مجلس میں منادی کرادی کہ "جو شخص لفظی بالقرآن مخلوق کا قائل ہو وہ ہماری مجلس میں شریک نہ ہو" تو سخت برآشفتہ ہوئے اور وہ تمام نوشتے اونٹوں پر لدوا کر واپس کر دیے جن میں امام ذہبی کی تقریریں قلمبند کی تھیں۔

(مقدمہ فتح الباری ص ۴۹۱، ۴۹۲)

جب یہ اختلاف ایک نازک حد تک پہنچ گیا تو امام صاحب نیشاپور کو خیر باد کہہ کر اپنے وطن مالوف بخارا کو روانہ ہوئے، اہل بخارا کو جب اطلاع ہوئی کہ ان کا ہم وطن کمال اور شہرت کی خلعت سے آراستہ ہو کر پھر اپنے وطن مالوف کی طرف واپس آرہا ہے تو جوشِ مسرت میں استقبال کے لئے بڑھے، شہر سے دو کوس کے فاصلہ پر امرائے شہر نے خیر مقدم کیا اور درہم و دینار نثار کرتے ہوئے شہر میں لائے، (ایضاً ۴۹۴) اللہ اکبر! ایک وہ زمانہ تھا جب بے باپ کا ایک یتیم بچہ حسرت و یاس کی گود میں بخارا سے نکلا تھا اور ایک یہ زمانہ ہے، جب وہی یتیم بچہ امام حدیث ہو کر امرائے شہر کے غول میں خراماں خراماں اسی بخارا میں داخل ہو رہا ہے۔

جلاوطنی اور انتقال:

بخارا میں امام صاحب نے ایک مدت تک آرام و راحت سے زندگی بسر کی لیکن آخر میں اپنی غیور اور خوددار طبیعت کی بدولت مصیبت میں مبتلا ہو گئے، شاہ بخارا نے حکم دیا کہ بخارا سے فوراً نکل جائیں۔

امام صاحب کے بعض رشتہ دار سمرقند کے ایک چھوٹے سے قریہ خرتنگ میں رہتے تھے، امام صاحب بخارا سے نکل کر وہیں چلے آئے اور آخر عمر تک وہیں رہے، جلاوطنی کا انھیں سخت افسوس تھا، وفورِ غم میں بے اختیارانہ زبان سے نکل جاتا، کہ الٰہی باوجود وسعت کے زمین میرے لئے تنگ ہو گئی ہے، اس لیے اب مجھ کو اٹھا لے۔

(تاریخ بغداد ج ۲ ص ۳۴ و مقدمہ الباری ص ۴۹۴ و تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۲)

عجیب اتفاق ہے کہ یہ دعا ایسی مقبول ہوئی کہ تھوڑے ہی دنوں میں خدا نے دنیا سے اٹھا لیا، (ایضاً) ۲۵۶ھ میں شب کو نماز کے بعد انتقال ہوا، شوال کے مہینے میں تیرہویں تاریخ کو پیدا ہوئے اور شوال ہی کی چاند رات میں دوشنبہ کو وفات پائی اور عید کے دن ظہر کی نماز کے بعد تجہیز و تکفین ہوئی۔

دوسرے دن جب یہ خبر مشہور ہوئی تو سمرقند میں ایک تہلکہ مچ گیا، اس دھوم دھام سے جنازہ اٹھایا گیا کہ سارا سمرقند مشایعت میں ساتھ تھا، اور بڑے بڑے علما اور امرا با چشم پُر نم نمازِ جنازہ میں شریک تھے، نمازِ ظہر کے بعد دفن کیا گیا اور آسمانِ حدیث کا یہ منور آفتاب سرزمین سمرقند میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

ایک شاعر نے اختصار کے ساتھ امام صاحب کا سال ولادت، سال وفات اور سن عمر کو ذیل کے دو شعروں میں یوں نظم کیا ہے، جو بہت دلچسپ ہے:

کان البخاری حافظا و محدثا جمع الصحیح مکمل التحریر
میلادہ صدق و مدۃ عمرہ فیھا حمید و انقضی فی نور

(بستان المحدثین ص ۱۳)

Marfat.com

امام صاحب کا حلیہ یہ تھا، جسم دبلا پتلا، قد میانہ، رنگ گندمی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۵ و تہذیب ج ۹ ص ۴۸)

عام اخلاق و عادات، وجہ معاش اور تصنیفات

خودداری:

امام صاحب کی مقدس زندگی میں بعض ایسی شائستہ خصوصیات پائی جاتی ہیں، جن سے بڑے بڑے نامور لوگوں کا اخلاقی دامن خالی ہے، ان کی طبیعت سخت درجہ غیور، خوددار اور بے تکلف تھی، ان کے واقعات زندگی کے آخری حصہ میں تم پڑھ آئے ہو کہ امیر بخارا نے جلاوطن کر دیا تھا مگر کس لئے؟ صرف اس لئے کہ انہوں نے علم کی عظمت کے آگے ایک دنیادار کی عزت کا لحاظ نہیں کیا، امیر بخارا کی خواہش تھی کہ امام صاحب اس کے دربار میں حاضر ہو کر صحیح بخاری اور تاریخ کبیر سنائیں، امام صاحب نے اس خواہش کو رد کر دیا کہ میں علم کو ذلیل کرنا نہیں چاہتا، کہ سلاطین کے آستانے پر لے جا کر پیشکش کروں، اگر امیر کو سچا شوق ہے، تو میری مجلس میں آ کر شریک ہو، امیر بخارا کی درخواست تھی کہ وہ قصر شاہی میں آ کر شہزادوں کو تعلیم دیں، امام صاحب نے فرمایا کہ میں امیر کے لڑکوں کو کوئی خصوصیت نہیں دے سکتا، میری مجلس عام ہے، جس کا جی چاہے آ کر شریک ہو، امیر بخارا کو یہ استغنا ناگوار گزرا، حکم دے دیا کہ ہمارے شہر سے نکل جاؤ، امام صاحب نے اپنے وطن سے نکلنا منظور کر لیا مگر علم کی ذلت گوارا نہ کی، (مقدمہ فتح الباری ص ۴۹۴) خودداری کا خیال اس درجہ تھا کہ خود ان کا قول ہے:

"میں نے اپنے استاذ علی بن مدینی کے سوا اور کسی کے مقابلہ میں اپنے کو چھوٹا نہ سمجھا"

(مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۴ و تہذیب ج ۹ ص ۵۰)

سادگی وقناعت:

امام صاحب نے عمر بھر کبھی اس امر کی کوشش نہیں کی کہ عام علما کی طرح کسی امیر یا بادشاہ کی فیاضی سے فائدہ اٹھائیں، کئی مرتبہ اس اس قسم کے مواقع ہاتھ آئے مگر انہوں نے وظیفہ قبول نہیں کیا، اپنے پدر بزرگوار کی میراث میں جو کچھ ملا اس پر آخری عمر تک قناعت کی، اس زمانے میں تجارت کی اس خاص صورت کو کہ ایک شخص اپنا روپیہ صرف کرے اور دوسرا اپنی محنت اور مشترکہ تجارت سمجھی جائے، مضاربت کہتے تھے، امام صاحب اسی طریقہ کی تجارت میں اپنے روپے لگا دیتے اور اسی کی قلیل آمدنی سے ضروریات زندگی پوری کرتے۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۰)

انکساری:

بہت کم لوگ ہوں گے، جن کو زندگی میں ایسی لا انتہا شہرت نصیب ہوئی ہوگی جس کو خود ان کی آنکھوں نے دیکھا تھا، باوجود اس کے انھیں معمولی سے معمولی شخص سے بھی کسی نامعلوم امر کو دریافت کرنے میں عار نہیں آتا تھا، ان کے اساتذہ کی طول طویل فہرست میں بعض ان لوگوں کے نام نظر آتے ہیں، جو ان کے ہم عمر یا ہم سبق تھے۔

(مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۰ و تہذیب ج ۹ ص ۴۷)

Marfat.com

رواداری و بے تعصبی:

امام صاحب کا ایک بے نظیر وصف ان کی بے تعصبی ہے، جب ہم ان کے مجموعہ احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو بہت سی ایسی حدیثیں پاتے ہیں جن کے راوی مذہب اہل سنت کے خلاف تھے، امام صاحب نے ان سے روایت کرنے میں کچھ تامل نہیں کیا، اگرچہ خود ان کے مذہب سے اختلاف رکھتے تھے۔

ورزش:

امام صاحب کو جسمانی ورزش کا بہت شوق تھا، سواری اور تیر اندازی میں اس درجہ مہارت تھی کہ ان کا نشانہ بہت کم غلط ہوتا تھا۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۱)

صفائی:

امام صاحب کوئی دنیادار آدمی نہیں تھے، ان کی زندگی بالکل سیدھی سادھی اور خالص علمی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی صفائی کا اس درجہ خیال رہتا تھا کہ فرش پر ایک تنکے کا پڑا رہنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے، اثنائے درس میں ایک شخص نے اپنی ڈاڑھی سے ایک تنکا نکال کر فرش پر ڈال دیا، امام صاحب کی جب نظر پڑی تو چپکے سے اٹھے اور تنکے کو اٹھا کر باہر صحن میں ڈال دیا۔

(مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۲)

امام صاحب کا حلقہ درس نہایت وسیع تھا، اسلامی دنیا کے ہر حصہ سے طلبہ کی جماعت جوق در جوق آ کر شریک ہوتی اور بڑے بڑے پایہ کے اشخاص حلقہ تلامذہ میں شامل ہوتے، ان کی مجلس درس کبھی مسجد میں اور کبھی ان کے خاص مکان پر منعقد ہوتی تھی، ان کے شاگردوں میں حافظ ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، ابوعبدالرحمٰن نسائی، مسلم بن حجاج جیسے جید محدث نظر آتے تھے جو حدیث کے ارکان ستہ کے تین جلیل القدر رکن ہیں، ابن خزیمہ، محمد بن نصر مروزی، صالح بن محمد جو آگے چل کر خود بڑے پایہ کے مصنف ہوئے، امام صاحب کے عام شاگردوں میں داخل ہیں۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۴۹۳)

امام صاحب کو زمانہ تحصیل علم ہی میں تصنیف و تالیف کا شوق ہوا اور آخر عمر تک قائم رہا، ان کی ابھی اٹھارہ برس کی عمر تھی، جب ایک کتاب "قضایائے صحابہ و تابعین" نامی لکھی (تاریخ بغداد ج ۲ ص ۷) اور بڑے بڑے مشائخ کو متحیر کر دیا۔

تاریخ کبیر مدینہ منورہ کی چاندنی راتوں میں لکھی جب آسمان کی منور اور قدرتی قندیل نے دنیا کے مصنوعی چراغوں سے مستغنی کر دیا تھا۔ (ایضا)

صحیح بخاری کا مفصل ذکر مستقل عنوان سے آگے آرہا ہے لیکن اس کے علاوہ دیگر تصنیفات کی مجمل فہرست یہ ہے:

۱۔ تاریخ کبیر، ۲۔ تاریخ اوسط، ۳۔ تاریخ صغیر، ۴۔ خلق افعال عباد، ۵۔ رسالہ رفع الیدین، ۶۔ قراءت فاتحہ خلف الامام، ۷۔ الادب المفرد، ۸۔ بر الوالدین، ۹۔ کتاب الضعفاء، ۱۰۔ الجامع الکبیر، ۱۱۔ التفسیر الکبیر، ۱۲۔ کتاب الاشربہ، ۱۳۔ کتاب الہبہ، ۱۴۔ کتاب المبسوط، ۱۵۔ کتاب الکنی، ۱۶۔ کتاب العلل، ۱۷۔ کتاب الفوائد، ۱۸۔ کتاب المناقب، ۱۹۔ اسامی الصحابہ، ۲۰۔ کتاب الواحد، ۲۱۔ قضایا الصحابہ۔

Marfat.com

جامع صحیح بخاری

ہجرت کی پہلی صدی تک احادیث کی تدوین نہیں ہوئی، صحابہ کا خیال تھا کہ اگر آثار نبوی مرتب کئے جائیں تو ممکن ہے کہ آگے چل کر ایک زمانہ ایسا آئے کہ کلام الٰہی اور کلام نبوی میں کوئی امتیاز نہ رہے اور لوگ غلطی میں پڑ جائیں، علاوہ اس کے ابھی اہل عرب اس قدر متمدن نہیں ہوئے تھے کہ کتابت اور جمع وتصنیف کا عام رواج ہوتا، دوسری صدی میں جب علوم وفنون کی اشاعت اور تدوین کی بنیادیں پڑیں اور کتابت کا عام رواج ہوا تو جمع حدیث پر بھی لوگوں کو توجہ ہوئی، امام مالک نے مؤطا میں اہل حجاز کی حدیثیں جمع کیں، ابن جریج نے مکہ معظمہ میں، امام اوزاعی نے شام میں، سفیان ثوری نے کوفہ میں اور ابوسلمہ حماد نے بصرہ میں احادیث کے مجموعے ترتیب دیئے، عبید اللہ بن موسیٰ کوفی اور نعیم بن حماد وغیرہ نے مسندیں مرتب کیں اور دوسری صدی کے اختتام تک بیسوں مجموعے تیار ہو گئے۔ (ملخص از مقدمہ فتح الباری ص ۴، ۵)

تیسری صدی میں امام بخاری کو جمع حدیث پر توجہ ہوئی، کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک احادیث کے بے شمار مجموعے مرتب ہو چکے تھے، اس لئے امام صاحب نے اگر ان سے چھانٹ کر ایک مجموعہ تیار کر لیا، تو یہ کوئی اہم کام نہ تھا لیکن یہ خیال صحیح نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ امام صاحب سے پیشتر اگرچہ متعدد مجموعے مرتب ہو چکے تھے مگر ان کی حالت کیا تھی اور امام صاحب نے جو مجموعہ تیار کیا ہے، اس کی حالت کیا ہے، اس پہلو سے اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ صحیح بخاری کی اصلی خصوصیت کیا ہے؟ اور امام صاحب کا یہ کام کس قدر اہم اور کس درجہ دشوار تھا، ہم اس مضمون میں اسی حیثیت سے صحیح بخاری پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

صحیح بخاری کا اصلی نام احادیث اور ابواب وغیرہ کی تعداد:

صحیح بخاری کا اصلی نام یہ ہے: "الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ وسننہ وایامہ" حقیقت یہ ہے کہ ایک حدیث کے مجموعے کے لیے اس سے زیادہ مناسب جامع اور واقعی نام نہیں ہو سکتا۔

صحیح بخاری میں تقریباً دس ہزار حدیثیں ہیں جو چھ لاکھ حدیثوں سے منتخب کر کے درج کی گئیں، (مقدمہ فتح الباری ص ۴۶۵، ۴۷۰) ۱۶۰ کتاب ہیں اور تین ہزار چار سو پچاس ابواب ہیں، ان تمام شیوخ کی تعداد جن سے صحیح بخاری کی حدیثیں لی گئی ہیں، دو سو نواسی ہے، تیرہ سو چالیس مشائخ ایسے ہیں جن سے مسلم نے روایت نہیں کی صرف امام بخاری نے روایت کی ہے۔

ثلاثیات اس حدیث کو کہتے ہیں جو صرف تین راویوں کے واسطہ سے امام صاحب تک پہنچی ہے، صحیح بخاری میں اس قسم کی بائیس حدیثیں ہیں جن پر امام صاحب کو فخر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بجا فخر ہے۔

صحیح بخاری کی خصوصیات:

امام صاحب جمع حدیث پر متوجہ ہوئے، تو بے انتہا مشکلات کا سامنا ہوا، انہوں نے دیکھا کہ جس قدر کتابیں مرتب ہوئی ہیں، وہ محض احادیث کا ایک مجموعہ ہیں، جن میں نہ صحت کا التزام کیا گیا ہے، نہ علت وضعف سے بحث کی گئی ہے، اس قسم کے مجموعوں کا تیار کر لینا کوئی مشکل اور اہم کام نہ تھا، مشکل یہ تھا کہ ایک صحیح اور اصح مجموعہ تیار کیا جائے، صحت کے علاوہ ترتیب

Marfat.com

کے لحاظ سے بھی منتظم اور مرتب ہو، صحیح آثار کی غیر صحیح آثار سے تمیز کی جائے، التزام ہو کہ حتی المقدور اعلیٰ اقسام کی حدیثیں اس میں درج کی جائیں۔

امام بخاری پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس التزام اور صحت سے حدیث کا ایک مجموعہ تیار کیا، اس لحاظ سے یہ جس قدر اہم تھا اسی قدر دشوار تھا، امام صاحب نے نہایت کوشش اور جانکاہی سے اول لاکھوں حدیثیں جمع کیں، پھر نہایت دقت نظر سے ان پر نقادانہ نظر ڈالی، اصول و قواعد کے ساتھ ان میں سے دس ہزار حدیثیں منتخب کیں اور ترتیب وار ایک جلد میں جمع کیا۔

امام بخاری نے اس مہم کو سر کرنے کے لیے پہلا کام یہ کیا کہ حدیث کے درجے مقرر کیے اور ان کو مختلف قسموں میں تقسیم کیا، صحت اور سند کے لحاظ سے کوشش کی کہ مستفیض، متواتر، حسن حدیثیں جمع کی جائیں، ان سے دوسرے درجہ پر صحیح حدیثوں کو لیا جائے مگر صحیح سے نیچے درجہ کی حدیثیں جیسے مطلق حسن، وغیرہ کو صحیح بخاری میں جگہ نہ دی جائے [1]۔ اگرچہ یہ التزام مسلم اور صحاح اربعہ میں بھی پایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ موطا امام مالک بھی اس خصوصیت میں شریک ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس خوبی اور عمدگی سے امام صاحب نے اس التزام کو نبھایا ہے، اس کی نظیر کوئی مجموعہ پیش نہیں کر سکتا، یہی وجہ ہے کہ اصح الکتب کے خطاب سے یہ کتاب سرفراز ہوئی۔

بخاری اور مسلم:

حدیث کی چھ صحیح کتابوں میں خصوصیت کے ساتھ دو کتابیں زیادہ صحیح، مستند اور قابل اعتماد تسلیم کی گئی ہیں، صحیح بخاری اور صحیح مسلم ان دونوں کتابوں کی نسبتاً زیادہ صحت میں کسی کو کلام نہیں لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ صحیحین میں اصح کون ہے؟ عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ ان دونوں کتابوں میں صحیح ترین کتاب جامع صحیح بخاری ہے لیکن بعض اہل مغرب کو اس میں کلام ہے، ان کا خیال ہے کہ مسلم، بخاری سے زیادہ صحیح اور قابل اعتماد ہے لیکن یہ خیال کسی صورت صحیح نہیں ہو سکتا، بخاری کو مسلم پر فضیلت ہے اور اکثر حیثیتوں سے ترجیح حاصل ہے، سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ وجوہ ترجیح کیا کیا ہو سکتے ہیں۔

صحیح بخاری اور مسلم کا مقابلہ چند حیثیتوں سے کیا جا سکتا ہے، حسن ترتیب، احادیث اور ترجمہ کا تناسب، عدم شذوذ اعلال، قوت رواۃ، استنباط مسائل، اتصال اسناد، زبان، صحت حدیث، پہلی دو حیثیتوں کو چھوڑ کر باقی ہر حیثیت سے بخاری کو مسلم پر فضیلت حاصل ہے، بخاری میں سوء ترتیب اور بعض موقعوں میں عدم مناسبت حدیث و ترجمہ باب کا عیب ضرور ہے مگر اس سے کتاب کی حقیقی خوبیوں پر پردہ نہیں پڑ سکتا، صحیح بخاری اس رنگ اور التزام کی پہلی تصنیف ہے، امام صاحب کے سامنے

---

[1] (جس حدیث کو کم از کم تین جلیل القدر صحابیوں نے الگ الگ طریقوں سے روایت کیا ہو اور اس کے رواۃ میں روز بروز ترقی ہوتی گئی ہو، تو اس حدیث کو مستفیض کہتے ہیں، حدیث کی یہ اعلیٰ قسم ہے، اگر تین سے زیادہ مشہور اصحاب سے مروی ہو تو اس کو متواتر کہتے ہیں: انما الاعمال بالنیات ایک مشہور حدیث ہے جس کے اول راوی صرف حضرت عمرؓ ہیں، ان سے علقمہ نے روایت کی اور علقمہ سے صرف محمد بن ابراہیم بن محمد سے فقط یحییٰ بن سعید نے اور یحییٰ سے بے شمار لوگوں نے روایتیں کیں، لہٰذا یہ حدیث متواتر ہے، متواتر کے بعد تیسرے درجہ پر حدیث حسن ہے، حسن اس حدیث کو کہتے ہیں جو مختلف طریقوں سے مروی ہو اور ہر طریق کی حدیث کا مضمون دوسرے طریق کی حدیث کی تائید کرتا ہو اگر ایک ہی طریق سے مروی ہو تو اس کو غریب مطلق کہتے ہیں، حسن کی دو قسمیں ہیں، صحیح اور مطلق، حسن صحیح وہ حدیث ہے جس کے بعض یا کل طریقوں کے تمام راوی ثقہ، عادل، غیر مجروح، غیر منکر اور نیز راوی اول کوئی مشہور صحابی و صاحب سلسلہ روایت میں اتصال ہو۔ (مطلق حسن وہ حدیث ہے جس میں یہ بعض شرائط نہ پائی جائیں)۔

Marfat.com

اس قسم کا کوئی نمونہ نہیں تھا، مسلم نقش ثانی ہے، صحیح بخاری نے اس کے لیے راستہ صاف کر دیا تھا، ایک اعلیٰ درجہ کا نمونہ پیش نظر تھا، اس لیے اگر ترتیب وغیرہ میں نسبتاً چند نقص پائے جاتے ہیں تو ان کی بنا پر امام صاحب پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، اس قسم کی فروگزاشتوں کا ایک ایسی کتاب میں جس کے لیے پہلے سے کوئی نمونہ نہ رہا ہو، رہ جانا کوئی مستبعد نہیں ہے اور اس لحاظ سے امام صاحب کی معذوری ظاہر ہے۔

صحیح مسلم کے مقابلہ میں صحیح بخاری کی خوبیاں بے شمار ہیں لیکن جن حیثیتوں کو ہم نے پیش کیا ہے ان کو پیش نظر رکھ کر اگر دیکھا جائے، تو سات خصوصیتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو صرف بخاری کا حصہ ہیں، مسلم کو ان میں شرکت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

۱۔ امام بخاری کا اصلی مقصود اگرچہ احادیث صحیحہ کی تدوین ہے، مگر ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ترتیب احادیث میں فقہی فوائد کو بھی ملحوظ رکھا اسی لیے صحیح بخاری کی ترتیب فقہی ابواب اور مسائل کے موافق رکھی گئی ہے اور بعض ایسے باب پائے جاتے ہیں جن کو مسائل قرار دے کر ان کے جواز یا عدم جواز میں قرآن مجید کی آیات پیش کی ہیں، کہیں کہیں معلقات اور مرفوعات سے حلت اور حرمت پر استدلال کیا ہے اور ان کے متعلق اگر حدیثیں ملی ہیں تو ان کو بھی پیش کر دیا، مثلاً صحیح بخاری کی ابتدا میں، الایمان یزداد و ینقص کو ایک مسئلہ فرض کر کے لتزدادوا ایمانا اور لیطمئن قلبی وغیرہ آیات اور اقوال صحابہ سے زیادت و نقص ایمان کو ثابت کیا ہے، اس خصوصیت کی بدولت صحیح بخاری تحقیق مسائل کا بھی ایک عمدہ ذریعہ ہے، برخلاف مسلم کے کہ اس کی اصلی غرض صرف احادیث صحیح کو ابواب فقہیہ کی حیثیت سے مرتب کرنا ہے، اس لیے مسائل کی تحقیقات کے حصہ سے بالکل خالی ہے۔

۲۔ ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ امام بخاری احادیث سے اس زمانہ کی معاشرت کا پتہ لگاتے ہیں اور معمولی واقعات سے نہایت مفید نتائج نکال کر ہر نتیجہ کو الگ الگ بابوں میں درج کرتے ہیں، مثلاً ایک حدیث ہے کہ بریرہؓ کو جو حضرت عائشہؓ کی لونڈی تھی، کسی نے کچھ گوشت صدقہ کے طور پر دیا، حضرت عائشہؓ نے وہ گوشت آنحضرت ﷺ کو یہ کہہ کر نہیں دیا کہ "یہ گوشت صدقہ کا ہے اور آپ صدقہ نہیں کھاتے" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "بریرہ کے لیے بیشک صدقہ ہے لیکن اگر بریرہ مجھے دے تو میرے لیے ہدیہ ہے۔"

امام مسلم نے اس حدیث کو باب الصدقہ میں درج کیا ہے، مگر امام بخاری نے اس ایک حدیث سے متعدد نتائج پیدا کیے ہیں اور مختلف بابوں میں نقل کیا ہے، ایک موقع پر یہ نتیجہ نکالا ہے، کہ جن لوگوں پر صدقہ حرام ہے، ان کی لونڈیوں کو صدقہ دینا جائز ہے، کیونکہ ازواج رسول اللہ ﷺ کی لونڈیوں نے صدقہ لیا اور آنحضرت ﷺ مانع نہیں ہوئے، ایک اور موقع پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ اگر کسی شخص کو صدقہ دیا جائے اور وہ کسی ایسے شخص کو وہ چیز ہدیہ کے طور پر دے، جس پر صدقہ حرام ہے تو اس کا قبول کرنا جائز ہے۔

۳۔ ایک باریک فرق صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں یہ ہے کہ جب کسی ایک شیخ کے شاگردوں سے یہ دونوں بزرگ روایت کرتے ہیں تو اس میں شک نہیں کہ ان کے شرط کے مطابق ان میں عدل، ثقاہت، قوت حافظہ، سلامتی ذہن، تقویٰ یہ تمام شرطیں ضرور پائی جاتی ہیں لیکن چونکہ تمام شرطیں ہر راوی میں برابر درجہ کی نہیں ہو سکتیں، کوئی عادل ہے، کوئی زیادہ عادل ہے، کوئی بہت زیادہ عادل ہے، اس لیے امام بخاری جس احتیاط اور دقت نظر کے ساتھ ان سے روایت کرتے ہیں، وہ امام مسلم

Marfat.com

میں نہیں پائی جاتی، امام زہری کے تلامذہ کے پانچ طبقے ہیں، اگرچہ سب کے سب معتبر رواۃ میں سے ہیں لیکن اوصاف کی کمی اور زیادتی کے لحاظ سے ان کے مدارج باہم متفاوت ہیں، امام بخاری اول طبقہ سے اصولاً اور دوسرے طبقہ سے ضمناً روایت کرتے ہیں، مگر امام مسلم دوسرے طبقہ سے اصولاً اور تیسرے طبقہ سے ضمناً اور پہلے طبقہ سے کبھی کبھی روایت کرتے ہیں، اسماء الرجال کے ماہرین کو اس کا پتہ آسانی سے لگ سکتا ہے۔

۴۔ بخاری کی قدر و منزلت کا اندازہ مسلم کے مقابلہ میں اس حیثیت سے بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے رواۃ کی تعداد جن سے امام صاحب نے صحیح میں روایت کی ہے ۴۳۰ سے کچھ زائد ہے، اس تعداد میں سے صرف ۸۰ راوی ایسے ہیں جن میں علما نے کلام کیا ہے لیکن مسلم کے خاص راوی ۶۲۰ ہیں، ان میں ۱۶۰ راویوں کو علما نے ضعیف قرار دیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام صاحب کے کمزور راویوں سے مسلم کی ضعیف رواۃ کی تعداد بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ بخاری کے ضعیف رواۃ زیادہ تر بخاری کے شیوخ میں سے ہیں، جن سے امام صاحب کی مدتوں صحبت رہی، ان کے حالات اور خیالات سے اطلاع حاصل کی، اس لئے قیاس اس امر کو تسلیم نہیں کرتا کہ امام بخاری جیسے نقاد مدتوں کی صحبت پر ان کے ضعف سے واقف نہ ہوئے ہوں اور روایت حدیث میں تامل نہ کیا ہو، اس بنا پر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان راویوں کو ضعیف قرار دینا صحیح نہیں، برخلاف امام مسلم کے کہ ان کے ضعیف راوی اکثر قدما میں سے ہیں، جن کی تنقید کا نہ ان کو موقع مل سکتا تھا، نہ ان کے حالات کی کافی اطلاع تھی، اس لئے اس صورت میں ان کے ضعف سے بے خبر رہنا زیادہ قرین قیاس ہے۔

۵۔ علما نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی تمام حدیثوں میں سے ۲۱۰ حدیثوں کو ضعیف قرار دیا ہے، ان میں سے صرف اسّی بلکہ اس سے بھی کم ضعیف حدیثیں بخاری کی ہیں اور ۱۳۰ حدیثیں صحیح مسلم کی۔

۶۔ بخاری و مسلم میں ایک بڑا نازک اور باریک فرق، ادبی حیثیت کا بھی ہے، ایک ہی حدیث کے مضمون کو دونوں کتابوں میں دیکھئے، بخاری کی طرزِ ادا، نشست الفاظ، سلاست بیان، جس قدر پسندیدہ اور اعلیٰ ہوگی، اس کی نظیر مسلم میں کم ملے گی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب نے اس زبان کو پیش نظر رکھا، جو عہد رسالت یا اس سے قریب تر زمانے میں مستعمل تھی، یعنی امام صاحب نے معانی حدیث کے ساتھ الفاظ حدیث کا بھی اوروں سے زیادہ خیال رکھا۔

۷۔ امام مسلم حدیث معنعن [1] کے اتصال اسناد کے لیے راوی اور مروی عنہ [2] کی صرف ہم عصری کافی سمجھتے ہیں، بشرطیکہ راوی مدلس [3] مشہور نہ ہو، چنانچہ صحیح کے مقدمہ میں انہوں نے خود تصریح کر دی ہے لیکن امام بخاری سلسلہ روایت کے اتصال کے لیے صرف معاصرت کو کافی نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک مدلس مشہور نہ ہونے کے ساتھ دونوں کی ملاقات بھی ضروری ہے، چنانچہ امام صاحب نے تاریخ کبیر میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے، ہم اس موقع پر اس اختلاف کے نتیجہ کو دکھلانا کافی سمجھتے ہیں۔

امام صاحب چونکہ ملاقات کو شرط قرار دیتے ہیں، اس لئے ایسی حدیث معنعن کو جس کے راوی اور مروی عنہ کی باہم ملاقات ثابت نہ ہوئی ہو، اگرچہ راوی مدلس مشہور نہ ہو، متصل الاسناد تسلیم نہیں کرتے اور اس بنا پر اس کو صحیح بھی نہیں قرار دیتے،

---

[1] (معنعن: اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی اسناد عن فلان عن فلان کے ساتھ بیان کی گئی ہو) [2] (یعنی جس سے روایت کی جائے) [3] (مدلس: اس راوی کو کہتے ہیں جو روایت میں اپنے شیخ کا نام درمیان سے چھوڑ دے)

Marfat.com

کیونکہ صحیح ہونے کے لئے بالاجمال اتصال اسناد کی ضرورت ہے، مگر امام مسلم متصل مان کر صحیح احادیث درج کردیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صحت اور احتیاط کے لحاظ سے جس قدر صحیح بخاری کا اصول تنقید مواقف عقل ہے، اسی قدر مسلم کا اصول قرائن صحیح اور قواعد احتیاط سے دور ہے۔

امام صاحب اس پہلو پر غور کرتے ہیں کہ صرف معاصرت کیونکر روایت حدیث کے لئے ہم کو اطمینان دلا سکتی ہے، جبکہ ممکن ہے کہ ایک ہی زمانے میں دو شخص ہوں، مگر ان کی باہمی ملاقات نہ ہوئی ہو اور ایک تیسرے شخص کی وساطت سے کوئی حدیث ایک شخص تک پہنچ گئی ہو، یہ سچ ہے کہ راوی مدلس مشہور نہیں ہے لیکن مدلس نہ ہونا اس امر کے لئے کافی دلیل نہیں ہوسکتی کہ بغیر کسی واسطہ کے بذاتہٖ راوی نے مروی عنہ سے سماعت حدیث کی ہے، صرف ایک یہی اختلاف اس امر کے لئے کافی ہے کہ مسلم کے مقابلہ میں امام بخاری جمع حدیث میں کس قدر احتیاط سے کام لیتے ہیں اور جو اصول تنقید قائم کئے ہیں، وہ کس درجہ مطابق عقل اور قیاس صحیح کے مؤید ہیں۔

ہم نے یہاں صحیح بخاری کی سات ایسی خصوصیتیں دکھلائی ہیں جو صحیح مسلم کے مقابلہ میں قابل توجہ ہیں، اصح الکتب بعد کتاب اللہ کے خطاب سے تمام کتابیں محروم رہیں، مگر صحیح بخاری کی صحت احتیاط، قوت رواۃ، اتصال اسناد، اور اسی قسم کی بے نظیر خوبیوں نے خود کو اس معزز خطاب کا مستحق ثابت کیا، علما نے اس استحقاق کو بجا تسلیم کیا اور کلام اللہ کے بعد جگہ دی۔

امام صاحب نے اس کا بڑا حصہ مدینہ منورہ میں لکھا ہے، ترتیب سے پہلے تمام ضروری عنوان لکھ لئے تھے، ہر عنوان کے نیچے حدیثیں درج کرتے جاتے تھے، جس عنوان کے متعلق کوئی حدیث نہ ملتی، تو اس کو چھوڑ کر دوسرے بابوں کی ترتیب پر متوجہ ہوجاتے، چنانچہ صحیح بخاری میں بعض عنوان ایسے پائے جاتے ہیں، جن کے متعلق کوئی حدیث درج نہیں ہوئی۔

صحیح بخاری جب مرتب ہوگئی، تو امام صاحب نے اپنے استاذ علی بن المدینی اور امام احمد بن حنبل جیسے اکابر محدثین کی خدمت میں اس غرض سے پیش کی کہ ان بزرگوں کی نظر ثانی سے مزین ہوجائے لیکن امام صاحب کی احتیاط اور تنقید نے صحیح کو اس درجہ اصح مرتب کیا تھا، کہ صرف چار حدیثوں کو انہوں نے اس قابل بتایا کہ صحیح سے خارج کردی جائیں، اگرچہ وہ چار حدیثیں بھی دراصل صحیح ہیں۔

صحیح بخاری کی شرحیں:

صحیح بخاری کو جو حسن قبول حاصل ہوا، اس کی ایک ادنیٰ دلیل یہ ہے کہ شارحین کی جتنی بڑی اور جس درجہ کی جماعت اس کو نصیب ہوئی، شاید کسی کتاب کو ملی ہو، نامعلوم شرحوں کو چھوڑ کر کشف الظنون سے ان ۵۳ شرحوں کا پتہ لگتا ہے، جو امام ابو سلیمان خطابی صاحب معالم السنن، علامہ ابن حجر عسقلانی، علامہ بدرالدین احمد عینی، امام فخرالدین یحییٰ نووی اور حافظ جلال الدین سیوطی جیسے اکابر علما اور محدثین کے قلموں سے نکلی ہیں۔[1]

---

[1] (حضرت سید صاحب نے طوالت کی وجہ سے ان شرحوں کے نام تحریر نہیں فرمائے، حقیقت یہ کہ بخاری کے شروح وحواشی کی تعداد بہت زیادہ ہے، عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی اس کی شرحیں لکھی گئی ہیں اور ترجمے کئے گئے ہیں، مولانا عبدالسلام مبارکپوری مرحوم نے سیرت البخاری میں ۱۴۳ شرحوں کے نام لکھے ہیں لیکن یہ تعداد بھی مکمل نہیں۔ (م ن)

Marfat.com

امام ابو مسعود درازی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۵۸ھ)

نام ونسب:

احمد نام، ابو مسعود کنیت، اور نسب نامہ یہ ہے: احمد بن فرات بن خالد۔

وطن، خاندان وولادت:

آخری عمر میں اصبہان میں سکونت اختیار کر لی لیکن اصلی وطن رے ہے، اسی لیے رازی کہلاتے تھے، ضبی کی نسبت سے جو قبیلہ مضر کے ایک شخص ضبہ بن ادد کی جانب ہے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عربی النسل تھے۔ (کتاب الانساب ورق ۲۴۳ و ۳۶۱ و اللباب ج ۱ ص ۲۵۰ و ج ۲ ص ۱۷) ان کے سن ولادت کا پتہ نہیں چلتا۔

اساتذہ وشیوخ:

ان کے چند مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابن ابی فدیک، ابوداؤد طیالسی، ابوصالح کاتب لیث، ابوعامر عقدی، ابویمان حمصی، ازہر بن سمان، جعفر بن عون حسین بن علی جعفی، ابواسامہ حماد بن اسامہ، شبابہ بن سوار، عبداللہ بن نمیر، عبدالرزاق بن ہمام، محمد بن عبداللہ بن ابی جعفر رازی، محمد بن عبید، محمد بن یوسف فریابی، یعلی بن عبید، یزید بن ہارون وغیرہ۔ (تاریخ ج ۴ ص ۳۴۳ و تہذیب ج ۱ ص ۶۶)

تلامذہ:

ابو مسعود درازی کے بعض مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابن ابی عاصم، امام ابوداؤد، جعفر فریابی، عبدالرحمٰن بن یحییٰ بن مندہ، عبداللہ بن جعفر بن احمد، ابوخلیفہ عبداللہ بن خلیفہ بصری، محمد بن عبدالرحمٰن بن مندہ۔ (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۶)

رحلت وسفر:

حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ۱۲ سال کی عمر میں انہوں نے حدیث کی تحریر وکتابت شروع کر دی تھی، اس کے بعد انہوں نے مختلف ملکوں اور دور دراز کے مقامات کا سفر کیا، ان کے کثرت اسفار کا اندازہ ذہبی کے ان الفاظ: واکثر الترحال فی لقی الرجال (محدثین سے ملاقات کے لیے انہوں نے بہت سارے سفر کیے) اور ''طوف النواحی'' وغیرہ سے کیا جا سکتا ہے، خطیب بغدادی نے بصرہ، کوفہ، حجاز، یمن، شام، جزیرہ اور بغداد وغیرہ جانے کا ذکر کیا ہے، بغداد امام احمد کی زندگی میں گئے

Marfat.com

تھے اور وہاں کے نامور علما سے مذاکرہ کیا تھا۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۴ و ۱۲۵ والعبر ج ۲ ص ۱۶ و تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۴۳)

حفظ و ثقاہت:

ابو مسعود کے حافظہ کی جودت کا علما نے اعتراف کیا ہے، خطیب بغدادی لکھتے ہیں: احد حفاظ الحدیث و من کبار الائمۃ فیہ (وہ اکابر حفاظ اور ائمہ محدثین میں تھے) امام احمد فرماتے ہیں کہ "اس آسمان کے نیچے احادیث نبوی کا ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں" ابوبکر بن شیبہ کا ارشاد ہے کہ میرے نزدیک جو تین آدمی سب سے بڑے حافظ حدیث ہیں، ان میں ابو مسعود بھی ہیں، ابو الشیخ کا بیان ہے کہ وہ حفاظ کبار میں تھے، ابو نعیم کا بیان ہے کہ وہ ائمہ حفاظ میں تھے، ابوبکر اعین اور امام احمد سے مروی ہے کہ مسند روایتوں کا ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں۔

یحیٰی بن معین فرماتے ہیں کہ میں نے کسی کمسن کو ان سے زیادہ بہتر یادداشت والا نہیں دیکھا، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ ۱۸ سال کی عمر میں ان کے حافظہ کی شہرت ہوگئی تھی، ان کے حفظ و ضبط کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب وہ مصر تشریف لے گئے تو لوگوں سے کہا کہ مصریوں کی حدیثیں سنو، چنانچہ وہاں کے ہر ہر شیخ کی حدیثیں بیان کرنا شروع کیا حالانکہ ابھی یہاں کے علما سے ملاقات بھی نہیں کی تھی۔

ان کے صدق و ثقاہت کا ائمہ محدثین کو اعتراف ہے، امام ذہبی اور حافظ ابن حجر نے ان کو ثقہ، حافظ اور حجت کہا ہے، علامہ ابن حبان نے بھی ان کی ثقاہت اور ان کے حفظ و ضبط، مذاکرہ و استحضار اور جمع و تصنیف احادیث کا ذکر کیا ہے، ابو عروبہ کا بیان ہے کہ وہ حافظہ میں ابوبکر بن ابی شیبہ اور تثبت میں احمد بن سلیمان رہاوی کے ہم پایہ تھے، ابراہیم بن اورمہ فرماتے ہیں کہ اس وقت تین ہی حفاظ رہ گئے ہیں، ان میں بھی ابو مسعود احسن الحدیث ہیں، امام احمد سے بھی ان کی توثیق منقول ہے، ایک مرتبہ فرمایا کہ تم لوگ ان سے حدیثیں لکھو وہ صدوق ہیں، خلیلی اور حاکم نے ان کو ثقہ کہا ہے۔

(تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۴۳ و تہذیب ج ۱ ص ۶۶ و ۶۷ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۵ و خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۱۱)

فضل و کمال:

ابو مسعود رازی کے فضل و کمال اور حدیث میں امتیاز و تبحر کے متعلق کتابوں میں بہت سے علمائے فن اور ماہرین حدیث کے اعترافات موجود ہیں، امام احمد ان کی بڑی تعظیم و توقیر اور ہمیشہ مدح و توصیف کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے تھے، جب یحیٰی بن معین اور امام احمد کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور احادیث کا بحث و مذاکرہ شروع ہوتا تو یہ حدیثیں بیان کرتے تھے اور امام احمد خاموشی سے سنتے تھے، ایک دفعہ پانچ آدمیوں نے پانچ حدیثیں بیان کیں جب انہوں نے چھٹی حدیث بیان کی تو امام بہت مسرور ہوئے کیونکہ ان کو اس کا علم نہ تھا، علی بن مدینی ان کو علمائے راسخین میں بتاتے ہیں اور حجاج بن شاعر کہتے ہیں کہ میں نے اس فن میں ان سے زیادہ ماہر اور صاحب کمال آدمی نہیں دیکھا، مورخین اور اصحاب سیر نے احد الاعلام محدث اصبہان اور من کبار الائمہ وغیرہ لکھا ہے۔ (ایضا)

احادیث کی حمایت:

ان کے زمانہ میں احادیث کی مخالفت و منع کا فتنہ بپا تھا، اس لیے ائمہ محدثین کی طرح یہ بھی اس کی مخالفت اور احادیث

Marfat.com

کی حفاظت ونصرت کے لیے کمربستہ رہتے تھے۔ (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۷)

زہدو اتقا:

خطیب نے لکھا ہے کہ وہ نیک اور صاحب خیر لوگوں میں تھے اور ابن حبان کا بیان ہے کہ سنن و آداب نبوی کے اتباع و تمسک کا بڑا التزام رکھتے تھے۔ (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۷ و تاریخ بغداد ج ۴ ص ۲۴۳)

وفات:

شعبان ۲۵۸ھ میں انتقال کیا۔ (ایضا)

تصنیفات:

ابومسعود رازی کثیر التصانیف تھے مگر ان کی تصنیفات دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں رہیں اور نہ ان کا کوئی ذکر ملتا ہے، صرف تفسیر و حدیث کی کتابوں کا علمائے سیر نے ذکر کیا ہے، تفسیر کی کتاب کا بھی نام نہیں معلوم ہو سکا۔

(تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۶، العبر ج ۲ ص ۱۶ و مراۃ الجنان ج ۲ ص ۱۹۹)

مسند:

اس کا سب نے تذکرہ کیا ہے مگر نام کے علاوہ اور کچھ نہیں معلوم، بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جمع و تالیف میں انہوں نے بڑی چھان بین اور نہایت حزم و احتیاط سے کام لیا تھا، ابومسعود کا خود بیان ہے کہ میرے استاذ عبدالرزاق ایک ایک حدیث کا مجھ سے ۵۰۰ مرتبہ تکرار کرتے تھے، ایک اور موقع پر فرمایا کہ میں نے ایک ہزار سات سو پچاس اشخاص سے حدیثیں سنیں اور لاکھوں حدیثیں تحریر کیں لیکن اپنی تصنیف میں صرف ۳۱۰ شیوخ کی روایتیں شامل کی ہیں جن کی تعداد پانچ ہزار ہے۔

(تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۶، ۶۷ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۵ و الرسالۃ المستطرفہ ص ۷۳)

Marfat.com

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۶۱ھ)

نام ونسب اور ابتدائی حالات:

سلسلۂ نسب یہ ہے: مسلم بن حجاج بن مسلم بن ورد بن کوشاد، ان کا اصلی نام مسلم اور ابوالحسین کنیت اور عساکر الدین لقب ہے، (بستان المحدثین ص ۱۰۴) مولد و مسکن کے لحاظ سے اگر چہ ان کے مایہ خمیر میں عجم کی خاک کا عنصر بھی شامل ہے لیکن دراصل ان کا سلسلۂ نسب عرب کے مشہور قبیلہ بنی قشیر سے ملتا ہے، اسی بنا پر ان کو قشیری بھی کہتے ہیں۔
(کتاب الانساب ورق ۴۵۴ و ۴۵۳)

امام مسلم تیسری صدی کے اوائل یعنی ۲۰۶ھ میں خراسان کے مشہور شہر نیشاپور میں پیدا ہوئے، (تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۵۷ و تہذیب الاسماء واللغات ص ۹۲ جلد دوم قسم اول) یہ وہ مبارک زمانہ تھا، جس میں علم حدیث نے صحابہ اور تابعین کے مقدس سینوں سے نکل کر مستقل فن کا قالب اختیار کر لیا تھا اور ہزاروں مجتہد اور امام پیدا ہو گئے تھے۔ اس لیے عام طور پر علم حدیث کا غلغلہ بلند تھا اور اس کے ساتھ خوش قسمتی سے امام صاحب کی ولادت نیشاپور جیسے شہر میں ہوئی تھی جو اس زمانہ میں محدثین کا پایہ تخت تھا، اس لحاظ سے لازمی طور پر امام صاحب نے بھی اس مقدس فن کی طرف ایسے مناسب وقت میں توجہ کی جو ہر قسم کے علمی نشوونما کا اصلی زمانہ تھا، چنانچہ [1] اگر سال ولادت کے متعلق عام روایتوں کا اعتبار کیا جائے، تو انہوں نے بارہ برس کی عمر میں حدیث کی سماعت شروع کر دی تھی، محدثین کے گروہ میں اگر چہ بہت سے ایسے بزرگ ہیں، جنہوں نے پانچ، سات برس کی عمر میں ہی حدیث کی سماعت شروع کر دی تھی اور یہ واقعہ ان کے کارناموں میں غیر معمولی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، خود امام بخاری کی سماعت کا ابتدائی زمانہ ۲۰۵ھ سے شروع ہوتا ہے، (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۳۴) جس میں ان کا سن دس برس سے زائد نہ تھا لیکن درحقیقت یہ فخر و مباہات کا ذریعہ نہیں ہو سکتا کیونکہ بالکل کم سنی کے زمانہ میں کوئی شخص ایسے عظیم الشان فن کا پورے طور پر متحمل نہیں ہو سکتا، امام صاحب کو بھی اس زمانہ کی حالت اور نیشاپور کی علمی وسعت کے لحاظ سے اس قسم کے مواقع حاصل تھے، تاہم انہوں نے علم حدیث کی سماعت کو اس زمانے پر موقوف رکھا جو ہر قسم کی اہلیت کا زمانہ ہوتا ہے، اس سے

---

[1] (امام صاحب کے سال کے ولادت کے متعلق اگر چہ عام تذکرے متفق اللفظ ہیں تاہم علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا سال ولادت ۲۰۴ھ بتایا ہے اور ان کے سماعت حدیث کی ابتدا ۲۱۸ھ میں قرار دی ہے، اس لحاظ سے ان کی سماعت کا زمانہ ۱۴ برس کی عمر سے شروع ہوتا ہے، اس سے اگر چہ ہمارے قیاس کی اور زیادہ تائید ہوتی ہے لیکن ہم نے سال ولادت کے متعلق ابن خلکان کا زیادہ اعتبار کیا ہے کیونکہ انھوں نے بطور خود زیادہ تحقیق سے کام لیا ہے، ان کے علاوہ ذہبی کے الفاظ بھی ضعف پر دلالت کرتے ہیں، حافظ ابن حجر، علامہ ابن کثیر اور بعض مورخین نے بھی ۲۰۴ھ کی روایت کی ہے اور شاہ عبدالعزیز نے ان دونوں کے علاوہ ۲۰۲ھ کی بھی روایت کی ہے ص (۱۰۶)

Marfat.com

قیاس ہوتا ہے کہ انہوں نے اس فن کے نشیب وفراز اور اس نکتہ کو پیش نظر رکھ کر اس میدان میں قدم رکھا لیکن افسوس ہے کہ امام صاحب کی طالب علمی کے حالات اس قدر کم معلوم ہیں کہ اس کا پتہ بھی نہیں چل سکتا کہ انہوں نے سب سے پہلے کس کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا مگر انہوں نے جس سرگرمی کے ساتھ اس مقدس فن کی طرف توجہ کی، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس زمانہ میں اگرچہ خود خراسان اور نیشاپور میں، اسحاق بن راہویہ اور امام ذہلی جیسے اساتذۂ فن موجود تھے، تاہم امام صاحب نے ان بزرگوں کو چھوڑ کر ان تمام مقامات کی خاک چھانی، جہاں جہاں علم حدیث کا جلوہ نظر آتا تھا، رے کے محدثین میں سے محمد بن مہران حمال اور ابوغسان وغیرہ سے سماعت کی، عراق میں امام احمد بن حنبل اور ابوعبداللہ بن مسلمہ قعنبی سے فائدہ اٹھایا، حجاز میں سعید بن منصور اور ابومصعب سے روایتیں حاصل کیں، مصر میں عمرو بن سواد اور حرملہ بن یحییٰ جو امام شافعیؒ کے ممتاز شاگرد تھے کے خرمن فیض کی خوشہ چینی کی، (مقدمہ صحیح مسلم للنووی) بغداد میں آخر عمر تک سفر کا سلسلہ قائم رکھا، چنانچہ ۲۵۹ھ میں بغداد کا سفر امام صاحب کا آخری سفر تھا۔ [1] کیونکہ اس کے بعد موت نے دو برس سے زیادہ جینے کا موقع نہیں دیا، بغداد میں یحییٰ بن صاعد اور محمد مخلد سے استفادہ کیا، احمد بن سلمہ کی رفاقت میں بصرہ اور بلخ کا بھی سفر کیا (تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۲۱۰ و تذکرہ احمد بن سلمہ) امام بخاری سے بھی ان کے نیشاپور کے سفر میں، بہت کچھ فائدہ اٹھایا، (تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۰۳ و تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۵۲۷) ان بزرگوں کے علاوہ احمد بن یونس یربوعی، اسماعیل بن ابی اویس، عون بن سلام، اسحاق بن راہویہ، یحییٰ بن یحییٰ نیشاپوری، قتیبہ بن سعید، علی بن جند، محمد بن رمح، ابراہیم بن منذر، ابوبکر بن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ، وغیرہ سے بھی استفادہ کیا۔ (تہذیب الاسماء جلد ۲ قسم اول ۹۱)

امام صاحب کی شہرت:

امام صاحب کے زمانہ میں علم حدیث کے عام مذاق اور مذہبی احساس کے باہمی اختلاط نے اگرچہ سیکڑوں ہزاروں ائمہ فن پیدا کر دیئے تھے، جن کی شہرت اور فضیلت کا عموماً اعتراف کیا جاتا تھا اور جن میں اکثر بزرگوں کو امام صاحب کی استادی کا بھی شرف حاصل تھا، تاہم امام صاحب کی فطری قابلیت اور قوت حافظہ نے ان تمام بزرگوں کو اپنے فضل وکمال کا معترف بنالیا، یہاں تک کہ وہ محدثین بھی جو امام صاحب کے ہم درجہ اور فن حدیث کے امام تھے، ان سے روایت کرتے میں مطلق دریغ نہیں کرتے تھے، چنانچہ ابوحاتم رازی، موسیٰ بن ہارون، احمد بن سلمہ، ابوعیسیٰ ترمذی، یحییٰ بن صاعد، ابوعوانہ اسفرائینی، اسی قسم کے بزرگ ہیں، ان بزرگوں میں احمد بن سلمہ وہ بزرگ ہیں جو بصرہ اور بلخ کے سفر میں امام صاحب کے رفیق اور ۱۵ برس تک صحیح مسلم کی ترتیب میں شریک رہ چکے ہیں، امام صاحب کی طباعی اور ذہانت نے خود ان کے اساتذہ کو اس قدر گرویدہ بنالیا تھا کہ اسحاق بن راہویہ جیسے امام فن ان مختصر الفاظ میں ان کے فضل وکمال کی نسبت پیشینگوئی کرتے تھے:

ای رجل یکون ھذا؟ خدا جانے یہ کس بلا کا شخص ہوگا۔

امام صاحب کی تنقید اور حقیقت شناسی کا اس قدر شہرہ تھا کہ ابوزرعہ اور ابوحاتم جیسے اداشناس بزرگ ان کو معرفت حدیث

---

[1] (ابن خلکان نے اس سفر کا ذکر ان کے اساتذہ اور تحصیل علم کے ضمن میں کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بغداد کا سفر بھی اسی غرض سے ہوا تھا اگرچہ اس کی خود تصریح نہیں کی، خطیب نے بھی سفر بغداد کا اسی طور پر ذکر کیا ہے مگر ان کے یہاں یہ لفظ بھی ملتا ہے: "حدث بھا" ج ۱۳ ص ۱۰۱، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب سے بغداد کے لوگوں نے بھی کسب فیض کیا تھا)

Marfat.com

میں اس زمانے کے تمام مشائخ پر ترجیح دیتے تھے، (ایضاً وبستان المحدثین ص ۱۰۴ وتہذیب الاسماء قسم اول ج ۲ ص ۹۱ وتاریخ بغداد ج ۱۳ و مقدمہ نووی ص ۱۰) اسحاق کوسج خود امام صاحب سے خطاب کر کے فرماتے تھے:

لن نعدم الخیر ما ابقاک اللہ للمسلمین۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۶۵ و تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۲۷)

جب تک خدا آپ کو مسلمانوں کے لئے زندہ رکھے گا بھلائی ہمارے ہاتھ سے نہ جانے پائے گی۔

ابو قریش نے ان کو دنیا بھر کے حفاظ اربعہ میں شمار کیا ہے۔ (تذکرۃ ذہبی ج ۲ ص ۱۶۶ وتہذیب ج ۱۰ ص ۱۲۸)

غرض کہ امام صاحب کی مقبولیت اور شہرت اس درجہ کو پہنچ گئی کہ اہل مغرب نے ان کے نام کو امام بخاری جیسے مسلم امام کے نام سے بھی اُونچا اُچھالا۔

وفات:

امام صاحب کے واقعاتِ زندگی میں ان کی وفات کا واقعہ جس قدر افسوس ناک ہے، اس سے زیادہ حیرت انگیز اور قابل لحاظ ہے، کیونکہ اس سے امام صاحب کی علمی شیفتگی کا پتہ چلتا ہے، اصل واقعہ یہ ہے کہ عین مجلس حدیث میں لوگوں نے امام صاحب سے ایک حدیث پوچھی، سوءِ اتفاق سے امام صاحب کو وہ حدیث یاد نہ تھی، اس لئے مکان پر آ کر اپنے مجموعہ حدیث میں اس کی جستجو شروع کی، اس چھان بین میں اس قدر محو ہوئے کہ سامنے خرما کا ایک ڈھیر رکھا ہوا تھا، اس سے نکال نکال کر کھاتے جاتے تھے لیکن حدیث کی فکر میں اس کی مطلق ان کو خبر نہیں ہوئی کہ اس بے خودی کی حالت میں کتنے خرمے کھا گئے، یہی واقعہ ان کی موت کا سبب ہوا۔ (تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۰۳ وتہذیب ج ۱۰ ص ۱۲۷)

عام طور پر تذکرہ نویسوں نے اگرچہ اس واقعہ سے نفیاً یا اثباتاً کچھ تعرض نہیں کیا، لیکن اس قسم کے واقعے عقلاً ممکن بلکہ واقع ہوتے رہتے ہیں، اس لئے اس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں، بہر حال امام صاحب نے ۲۵ / رجب ۲۶۱ھ کو یکشنبہ کے دن نیشاپور میں بوقت شام ۵۵ برس کی عمر میں [1] وفات پائی، دوشنبہ کے دن جنازہ اٹھایا گیا اور نیشاپور کے باہر ایک مقام مصر آباد میں سپرد خاک کر دیئے گئے۔ (تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۲۷)

اخلاق وعادات:

امام صاحب نہایت پاکیزہ خو اور انصاف پسند تھے، اس زمانہ میں اگرچہ عام طور پر مسلمانوں کی اخلاقی حالت نہایت مہذب اور شائستہ تھی تاہم جس طرح اس زمانے کے اہل کمال میں باہم ان بن رہتی ہے، اسی طرح اس زمانہ کے مقدس اصحاب بھی اس سے خالی نہ تھے، اسی بنا پر رجال کی کتابوں میں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ باہم معاصرین کی جرح وقدح قابل قبول نہیں کیونکہ وہ لوگ ایک دوسرے کی نسبت رشک وحسد سے بہت کچھ برا بھلا کہہ دیا کرتے تھے، یہ محض معمولی درجہ کے لوگوں کا شیوہ نہ تھا بلکہ یحییٰ بن معین جیسے مقدس اصحاب بھی اس زمرہ میں شامل ہیں مگر امام صاحب کا دامن ہمیشہ اس قسم کے دھبوں سے پاک رہا اور انہوں نے ہمیشہ نہایت فیاضی سے اس کا عملی ثبوت دیا، نیشاپور کے سفر میں امام بخاری کی مجلس میں ضرور آتے تھے اور ان سے استفادہ کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ان کے تبحر علمی سے متاثر ہو کر نہایت بے خودی کی حالت

[1] (صحیح روایت کے مطابق امام صاحب کی عمر انتقال کے وقت ۵۵ سال تھی مگر بعض مورخین نے جن میں ابن کثیر بھی شامل ہیں ۵۷ سال عمر بتائی ہے)

Marfat.com

میں پکار اٹھے، دعنی اقبل رجلیک یا امیر المؤمنین فی الحدیث۔ (خطیب اور ابن کثیر کے الفاظ یہ ہیں: دعنی حتی اقبل رجلیک یا استاذ الاستاذین وسید المحدثین وطبیب الحدیث فی عللہ دیکھو تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۰۳ والبدایہ ج ۱۱ ص ۳۴) یعنی اے ملک حدیث کے بادشاہ! مجھ کو قدم بوسی کی اجازت دیجئے، اسی طرح اپنی کتاب مسلم کو خود ابوزرعہ رازی کی خدمت میں پیش کیا، وہ جن حدیثوں کو صحیح بتاتے تھے، ان کو بعینہٖ قائم رکھتے تھے اور جن حدیثوں پر نکتہ چینی کرتے تھے، ان کو بے تکلف چھوڑتے جاتے تھے (مقدمہ مسلم نووی ص ۲۶) لیکن ان کا حقیقی وصف، ان کی آزادی اور حق گوئی ہے اور اس کی وقعت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے، جب مسلمانوں کی عام حالت کا اندازہ کیا جائے، آج تو مسلمانوں کا رواں رواں تقلید کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے لیکن اس زمانے میں بھی قرون اولیٰ کے بعد ہی سے بے جا طرفداری اور ناجائز رعایت کا مادہ پیدا ہو گیا تھا اور امتداد زمانہ کے ساتھ روز بروز اس کو ترقی ہوتی جاتی تھی لیکن امام صاحب پر اس کا بالکل اثر نہ پڑ سکا وہ اس قدر حق پرست تھے کہ اس کے مقابلہ میں اپنے اساتذہ کا بھی خیال نہیں کرتے تھے، چنانچہ جب امام بخاری نے نیشاپور کا سفر کیا اور سوء اتفاق سے ایک جزئی سوال، یعنی مسئلہ خلق قرآن کے متعلق عوام اور عوام کے ساتھ امام ذہلی جیسے نکتہ سنج محدث بھی امام صاحب کے مخالف ہو گئے اور اس مخالفت کا یہ اثر ہوا کہ امام ذہلی نے اپنی مجلس حدیث میں عام اعلان کر دیا۔

الا من قال باللفظ فلا یحل لہ ان یحضر مجلسنا۔

خبردار جو شخص قرآن مجید کے الفاظ کو مخلوق کہے گا اس کو ہماری مجلس میں آنا حرام ہے۔

اس موقع پر امام صاحب نے اپنی اسی حق پرستی سے کام لیا، وہ امام بخاری کی رائے کو صحیح سمجھتے تھے، اس لیے ایک حق بات پر امام ذہلی کے شاگردانہ تعلق کو بالکل بھلا دیا اور سر مجلس اپنی چادر تان کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی مجلس کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہا اور گھر پر جا کر ان کی تقریروں کے تمام نوشتے اونٹوں پر لدوا کر بھجوا دیے۔

(تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۰۳ و تاریخ ابن خلکان ص ۵۲۷)

امام بخاری کی یہ تائید اور حمایت بھی ایک خاص مسئلہ میں تھی، ورنہ عام طور پر وہ امام بخاری کے بھی ہم زبان نہیں، چنانچہ معنعن روایتوں میں امام بخاری ہم عصری کے ساتھ راوی اور مروی عنہ میں ملاقات کی جو ایک ضروری شرط قرار دیتے ہیں، امام صاحب اس کے سخت مخالف ہیں، چنانچہ صحیح مسلم کے مقدمہ میں جہاں اس مسئلہ کی بحث کی ہے، اس کو پڑھ کر سخت حیرت ہوتی ہے، یا تو یہ حال تھا کہ ایک جزئی مسئلہ پر امام ذہلی کے قدیم شاگردانہ تعلق کو چھوڑ کر امام بخاری کے ہم خیال بن گئے اور اپنی عمر کی کمائی (یعنی امام ذہلی کے مجموعۂ حدیث) کی بھی کچھ پروا نہ کی یا خود امام بخاری کی تردید ان الفاظ میں کرتے ہیں:

وقد تکلم بعض منتحلی الحدیث من اہل عصر نافی تصحیح الاسانید و سقمہا بقول لو ضربنا عن حکایتہ وذکر فسادہ لکان رایا متینا و مذہبا صحیحا اذ الاعراض عن القول المطرح احزی۔

(مقدمہ مسلم مصر ص ۱۲۷، ۱۲۸)

یعنی ہمارے زمانہ کے بعض مدعیان حدیث اسانید کی صحت اور سقم کے متعلق ایک ایسے قول کے قائل ہوئے ہیں کہ اگر ہم اس کے ذکر اور اس کی تردید سے اعراض کرتے تو اچھا ہوتا کیونکہ مردود اقوال سے اعراض کرنا ہی مناسب ہے۔

کہاں یہ خوش اعتقادی کہ ان کے فضل و کمال سے متاثر ہو کر نہایت جوش کے ساتھ فرماتے تھے۔

Marfat.com

دعنی اقبل رجلیک یا امیر المؤمنین فی الحدیث۔

یعنی اے علم حدیث کے بادشاہ مجھ کو قدم بوسی کی اجازت دیجئے۔

کہاں یہ کیفیت کہ ان ہی کا ذکر اس بے پروائی کے ساتھ کرتے ہیں۔

زعم القائل الذی افتتحنا الکلام علی الحکایۃ عن قولہ والاخبار عن سوء رویتہ۔

(مقدمہ صحیح مسلم ص ۱۲۹)

ہم نے جس قائل کے قول اور اس کی غلط فہمی کا ذکر کیا ہے وہ گمان کرتا ہے۔

الغرض ان کی حق پسند روش، ان کو تقلید، تعصب اور بے جا طرفداری کا مطلق خوگر نہیں ہونے دیتی تھی، اس لیے وہ اسی شاہراہ پر چلتے تھے جس کی طرف ان کا حق پرست دل رہنمائی کرتا تھا۔ [۱]

تصنیفات وتالیفات:

امام صاحب کو تصنیف وتالیف کا فطری شوق تھا، صحیح مسلم کو جس تحقیق اور جامعیت کے ساتھ لکھا اس کا ذکر ایک مستقل عنوان سے آگے آئے گا لیکن اس کے علاوہ اور بھی نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں جن کے موضوع اور اجمالی حالت کا اندازہ خود ان کے نام کی فہرست سے ہوگا:

۱۔مسند کبیر، ۲۔الاسماء (الکنی)، ۳۔جامع کبیر، ۴۔کتاب العلل، ۔کتاب التمیز، ۶ کتاب الوحدان، ۷۔کتاب الافراد، ۸۔کتاب الاقران، ۹۔کتاب سوالاتہ لاحمد بن حنبل، ۱۰۔کتاب حدیث عمرو بن شعیب، ۱۱۔کتاب الانتفاع باہب السباع، ۱۲۔کتاب مشائخ مالک، ۱۳۔کتاب مشائخ ثوری، ۱۴۔کتاب مشائخ شعبہ، ۱۵۔کتاب من لیس لہ الاراد واحد، ۱۶ کتاب المخضرمین، ۱۷ کتاب اولاد الصحابہ، ۱۸۔کتاب اوہام المحدثین، ۱۹۔کتاب الطبقات، ۲۰۔کتاب افراد الشامیین۔

صحیح مسلم

امام صاحب نے اگرچہ جیسا کہ ہم ابھی لکھ آئے ہیں، علم حدیث کے متعلق خاص خاص موضوع پر نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں لیکن ان کو صحیح مسلم کی شہرت اور مقبولیت نے اس طرح دبا لیا ہے کہ آج کوئی شخص ان کا نام بھی نہیں جانتا، امام صاحب کی تصنیفات سے قطع نظر کرکے، حدیث کی عام کتابوں کا بھی قریب قریب یہی حال ہے، خود صحیح بخاری کو اگرچہ ائمہ فن نے متعدد حیثیتوں سے مسلم پر ترجیح دی ہے، تاہم مسلم کو یہ شرف قبول حاصل ہے کہ ہمیشہ بخاری کے ساتھ ساتھ اس کا بھی نام لیا جاتا ہے، اس لئے ہم مسلم کی ان خصوصیات کو دکھانا چاہتے ہیں، جنہوں نے اس کو اس قدر شہرت دی ہے۔

---

[۱] (اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عموماً محدثین کا گروہ اگرچہ کسی امام کا مقلد نہ تھا اور نہ اس کو ہونا چاہیے تھا تاہم ان میں کسی بزرگ کا مذہب کسی خاص امام سے زیادہ ملتا جلتا تھا تو ان کو تقلید پرست لوگ اس امام کی طرف منسوب کر دیتے تھے، چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

وکان صاحب الحدیث ایضا قد ینسب الی احد المذاہب لکثرۃ موافقتہ کالنسائی والبیہقی ینسبان الی الشافعی غالباً اسی بنا پر یا اور کسی وجہ سے صاحب کشف الظنون نے امام صاحب کو ایک ضمنی تذکرے میں امام شافعی کی طرف منسوب کر دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بجائے خود ایک مستقل امام تھے اور ہر مسئلہ کے متعلق اپنی آزادانہ رائے رکھتے تھے اس لیے ان کو کسی مجتہد کی طرف منسوب کرنا ان کی تحقیر ہے)

Marfat.com

اس سلسلہ میں جو چیز سب سے زیادہ قابل ذکر ہے وہ اس کتاب کا مقدمہ ہے، کیونکہ اس سے ایک طرف جرح وتعدیل اور اصول حدیث کے متعلق نہایت مہتم بالشان نکتے معلوم ہوتے ہیں اور دوسری طرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب نے جس زمانے میں اس کو مرتب کیا، اس میں کس قدر موضوع حدیثیں پیدا ہو گئی تھیں، اس لئے ایسی حالت میں ایسی صحیح کتاب کا مرتب کرنا کس قدر دشوار اور اہم تھا، اس بنا پر ہم سب سے پہلے اسی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

مقدمہ مسلم:

مذہب اگرچہ دنیا کی تمام قوموں کو عزیز ہے، تاہم مسلمانوں نے اس کو جس عزت کی نگاہ سے دیکھا، دنیا کی کوئی قوم اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ علمی حیثیت سے مسلمانوں نے سب سے پہلے جس چیز کی طرف توجہ کی وہ یہی مذہبی علوم وفنون تھے، ان میں نحو، ادب، تفسیر، اصول فقہ اگرچہ سب کے سب بالذات یا بالواسطہ مذہبی علوم ہیں اور اس لئے مسلمانوں نے ان سب میں کمال پیدا کیا، تاہم ان میں علم حدیث چونکہ مذہب کا سب سے زیادہ ضروری عنصر تھا، اس لئے یہ مقدس فن ایک مدت تک عام طور پر مسلمانوں کے دل ودماغ کا جولانگاہ رہا، اس عام مذاق نے اگرچہ نہایت مفید نتائج پیدا کئے، تاہم چونکہ مذہبی حیثیت سے یہ گروہ نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اس لئے نااہل اور خود غرض لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت نے اس فن کو محض نام ونمود کا ذریعہ قرار دے کر موضوع اور غیر معتبر روایتوں کا ایک طوفان اٹھا دیا، چنانچہ خود امام صاحب اپنے مقدمہ میں ضعیف راویوں کا استقصا کر کے لکھتے ہیں:

ولا احسب کثیرا ممن یعرج من الناس علی ما وصفنا من ھذہ الاحادیث الضعاف والاسانید المجھولۃ ویعتد بروایتھا بعد معرفتہ وبما فیھا من التوھن والضعف الا ان الذی یحملہ عن روایتھا والاعتداد بھا ارادۃ التکثیر بذلک عند العوام ولان یقال ما اکثر ما جمع فلان من الحدیث والف من العدو من ذھب فی العلم ھذا المذھب ومسلک ھذا الطریق فلا نصیب لہ فیہ وکان بان یکنی جاھلا اولی من ان ینسب الی العلم۔ (ص ۱۲۷)

ہمارا خیال ہے ان مجہول الاسناد اور ضعیف روایتوں پر جن کو ہم نے بیان کر دیا ہے، ان کے ضعف کے ظاہر ہونے کے بعد بجز ان لوگوں کے جن کو عوام کے نزدیک کثرت سے حدیثیں بیان کرنے کا شوق ہوتا ہے، تاکہ یہ کہا جائے کہ فلاں نے کس کثرت سے حدیثیں جمع کی ہیں، اکثر لوگ اعتبار نہ کریں گے لیکن جو لوگ علم حدیث میں یہ مسلک اختیار کرتے ہیں، ان کو اس فن میں ذرا بھی دخل نہیں اور ان کو بجائے عالم کے جاہل کہنا اچھا ہے۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ اس زمانے میں محض شہرت کے لئے ہر قسم کی رطب ویابس حدیثوں کے روایت کرنے کا مذاق پیدا ہو چلا تھا لیکن ان خود غرض لوگوں سے گزر کے جو دفتر غیر معتبر اور موضوع حدیثوں کی روایت میں شہرت عام رکھتا تھا، وہ متقشف زاہدوں اور مسجد نشینوں کا مقدس فرقہ تھا، چنانچہ اس زمانہ کے نکتہ سنج لوگ، ان بزرگوں کو جس نگاہ سے دیکھتے تھے، اس کا اندازہ ذیل کی روایتوں سے ہوگا:

حدثنی محمد بن ابی عتاب قال اخبرنی عفان عن محمد بن یحیی بن سعید القطان عن ابیہ

Marfat.com

قال لم نر الصالحین فی شئ اکذب منهم فی الحدیث قال ابن ابی عتاب فلقیت ابا محمد بن یحیی بن سعید القطان فسالته عنه فقال عن ابیه لم تر اهل الخیر فی شئ اکذب منهم فی الحدیث قال مسلم یقول یجری الکذب علی لسانهم و لا یتعمدون الکذب۔ (ص ۹۵، ۹۴)

مجھ سے محمد بن ابی عتاب اور ان سے عفان اور ان سے محمد بن یحییٰ بن سعید بن قطان اور ان سے ان کے باپ نے حدیث بیان کی کہ ہم حدیث میں صالحین سے زیادہ جھوٹا کسی کو نہیں دیکھتے، دوسری روایت میں ہے کہ ابن ابی عتاب کا بیان ہے کہ میں نے محمد بن یحییٰ بن سعید بن قطان سے ملاقات کی اور اس حدیث کو پوچھا تو انہوں نے اپنے باپ کے ذریعہ سے بیان کیا کہ تم حدیث میں اہل خیر سے زیادہ جھوٹا نہ پاؤ گے، امام مسلم کا بیان ہے کہ ان کے قول کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ جھوٹ بول جاتے ہیں مگر اس کا قصد نہیں کرتے۔

حدثنا الحلوانی قال سمعت عفان قال حدثت حماد بن سلمة عن صالح المری بحدیث عن ثابت فقال کذب و حدثت هماما عن صالح المری بحدیث فقال کذب۔ (مقدمہ مسلم ص ۱۱۰، ۱۱۱)

حلوانی نے ہم سے روایت کی کہ میں نے عفان سے سنا کہ انہوں نے حماد بن سلمہ کے پاس صالح مری کے ذریعہ سے ثابت سے ایک روایت بیان کی، انہوں نے کہا کہ صالح جھوٹ کہتا ہے، اسی طرح ان کا بیان ہے کہ میں نے صالح مری کے ذریعہ سے ہمام کے پاس ایک حدیث بیان کی، انہوں نے فرمایا کہ وہ جھوٹ کہتا ہے۔

حالانکہ صالح مری اتنے بڑے زاہد، خدا ترس اور رقیق القلب تھے جن کی نسبت شارح نووی نے یہ الفاظ لکھے ہیں:

و کان صالح رحمه الله حسن الصوت بالقرآن و قدمات بعض من سمع قراءته و کان شدید الخوف من الله تعالی کثیر البکاء قال عفان ابن مسلم کان صالح اذا اخذ فی قصصه کانه رجل مذعور یفزعک امره من حزنه و کثرة بکائه کانه ثکلی (حاشیہ مقدمہ مسلم ص ۱۱۱)

صالح رحمہ اللہ نہایت خوش الحانی سے قرآن پڑھتے تھے، یہاں تک کہ بہت سے لوگ ان کی قراءت سن کر مر گئے، وہ خدا کا سخت خوف کرتے تھے اور اکثر روتے رہتے تھے، عفان بن مسلم کا بیان ہے کہ جب وہ قصے بیان کرتے تھے تو اس خوف زدہ آدمی کی طرح معلوم ہوتے تھے جو اپنے کثرتِ خوف سے تم کو بھی خوف و دہشت میں مبتلا کر دے گا اور ان کی نوحہ زاری سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ ایک عورت ہیں جو اپنے لڑکے کا ماتم کر رہی ہے۔

صالح مری کی طرح اور بھی بہت سے بزرگ تھے جو مذہب کے سخت پابند تھے لیکن احادیث میں بہت کچھ ملمع سازی کیا کرتے تھے۔

حدثنی محمد بن عبد الله بن قهزاذ من اهل مرو قال اخبرنی علی بن حسین بن واقد قال قال عبد الله بن المبارک قلت سفیان الثوری ان عباد بن کثیر من تعرف حاله و اذا حدث جاء بامر عظیم فتری ان اقول للناس لا تاخذوا عنه قال سفیان بلی قال عبد الله فکنت اذا کنت فی مجلس ذکر فیه عباد اثنیت علیه فی دینه و اقول لا تاخذوا عنه۔ (مقدمہ مسلم ص ۹۴)

مجھ سے محمد بن عبد اللہ بن قہزاذ مروزی نے روایت کی کہ مجھ کو علی بن حسین بن واقد نے خبر دی کہ عبد اللہ بن مبارک فرماتے تھے کہ

Marfat.com

میں نے سفیان ثوری سے کہا کہ آپ تو عباد بن کثیر کا حال خوب جانتے ہیں، جب وہ حدیث بیان کرتے ہیں تو قیامت ڈھاتے ہیں، تو کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں کہ میں لوگوں سے کہہ دوں کہ ان کی حدیثیں نہ قبول کرو، انہوں نے کہا ہاں، عبد اللہ بن مبارک کا بیان ہے کہ اس کے بعد جب کسی مجلس میں عباد کا ذکر آتا تھا تو میں ان کے تدین کی تعریف کرتا تھا لیکن اسی کے ساتھ ہی لوگوں سے یہ بھی کہتا تھا کہ ان کی حدیثیں قبول نہ کرو۔

حدثنا محمد حدثنا عبد اللہ بن عثمان قال قال ابی قال عبد اللہ بن المبارک انتہیت الی شعبۃ فقال ھذا عباد بن کثیر فاحذروہ۔ (مقدمہ صحیح مسلم ص ۹۴)

ہم سے محمد اور ان سے عبد اللہ بن عثمان نے حدیث بیان کی کہ ان کے باپ نے کہا کہ ہم سے عبد اللہ بن مبارک نے فرمایا کہ میں شعبہ کے پاس گیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ عباد بن کثیر ہے اس سے بچتے رہو۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض محدثین نے صاف صاف تصریح کر دی ہے کہ یہ لوگ اس فن میں اہلیت نہیں رکھتے تھے۔

حدثنی احمد بن ابراہیم قال حدثنی سلیمان بن الحرب عن حماد بن زید قال ذکر فرقد عند ایوب فقال ان فرقدًا لیس صاحب حدیث۔ (مقدمہ مسلم ص ۱۲۲)

ہم سے احمد بن ابراہیم اور ان سے سلیمان بن حرب اور ان سے حماد بن زید نے روایت کی کہ ایوب کے یہاں فرقد کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا کہ فرقد اہل حدیث نہیں۔

حالانکہ فرقد تابعی اور بہت بڑے عابد شخص تھے، چنانچہ شارح نووی کہتے ہیں:

التابعی العابد لا یحتج بحدیثہ عند اہل الحدیث لکونہ لیس صفتہ، کما قدمنا فی قولہ لم نر الصالحین فی شئ اکذب منہم فی الحدیث۔ (حاشیہ مقدمہ ص ۱۲۲)

یعنی فرقد تابعی اور عابد شخص تھے، اہل حدیث کے نزدیک ان کی حدیثوں کا اس بنا پر اعتبار نہیں کیا جاتا کہ یہ ان کا فن نہیں تھا، جیسا کہ ہم نے لم نر الصالحین فی شئ اکذب منہم فی الحدیث کے ذکر میں بیان کیا۔

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ چونکہ یہ تمام بزرگ نہایت خدا ترس، متقشف اور عبادت گزار ہوتے تھے، اس لیے محدثین نے ان کی دروغ گوئی اور ضعیف روایت کی یہ وجہ بتائی ہے کہ یہ لوگ اہل فن نہ تھے، چنانچہ پہلی حدیث میں خود امام صاحب نے تصریح کر دی ہے کہ یہ لوگ عمداً جھوٹ نہیں بولتے تھے، چنانچہ شارح نووی اس قول کی شرح میں لکھتے ہیں:

معناہ ماقالہ مسلم انہ یجری الکذب علی السنتہم ولا یتعمدون ذلک لکونہم لا یعانون صناعۃ اہل الحدیث فیقع الخطافی روایاتہم ولا یعرفونہ ویروون الکذب ولا یعلمون انہ کذب۔

(حاشیہ مقدمہ ص ۹۴)

یعنی مسلم نے جو یہ کہا ہے کہ وہ لوگ یوں ہی جھوٹ بول جاتے ہیں لیکن اس کا قصد نہیں کرتے، اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ صاحب فن نہ تھے، اس لیے ان کی روایتوں میں غلطی واقع ہو جاتی ہے لیکن وہ لوگ اس کو نہیں جانتے جھوٹ روایت کر دیتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ یہ جھوٹ ہے۔

Marfat.com

اس وجہ کی صحت میں کوئی شبہ نہیں لیکن ہم کلیتاً اس سے اتفاق نہیں کر سکتے کیونکہ جس طرح اس زمانے کے عام واعظ، مریدین کو خوش اور مجلس وعظ کے گرمانے کے لیے نہایت عجیب وغریب حدیثیں بیان کر جاتے ہیں، اسی طرح ان لوگوں کی نسبت بھی اس قسم کا خیال پیدا ہو سکتا ہے، بہر حال واقعہ جو کچھ ہو لیکن ان بزرگوں کی یہ تمام خانہ براندازیاں چونکہ مذہب اور مذہب کے ساتھ زہد کے پردے میں تھیں، اس لیے عام طور پر کوئی شورش نہیں پیدا ہوئی، خیر، اس بنا پر محدثین کے گروہ میں زیادہ تر شور وغل اس وقت ہوا جب عقائد کے متعلق مبتدعانہ خیالات ظاہر ہوئے، اسلام میں اختلافی مسائل کی بنیاد اگرچہ آنحضرت ﷺ کے بعد ہی پڑ گئی تھی لیکن بدعت کا آغاز صحابہؓ کے آخری زمانہ میں ہوا، چنانچہ معبد جہنی، غیلان دمشقی، یونس اسواری نے اسی زمانہ میں قضا وقدر کا انکار کیا۔ (ملل ونحل شہرستانی ص ۳۱ بر حاشیہ ملل ابن حزم جلد اول مطبع ادبیہ مصر طبع اول ۱۳۱۷ھ شرح مواقف ج ۲ ص ۴۷۹) تابعین کے زمانے میں اس قسم کے اور بھی بہت سے گمراہ پیدا ہوئے، چنانچہ جعد بن درہم نے بنی امیہ کے زمانے میں ایک عجیب وغریب خیال ظاہر کیا، اس نے صراحتاً دعویٰ کیا کہ خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نہ اپنا خلیل بنایا اور نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا (میزان الاعتدال ذہبی جلد ۱ ص ۱۷۵ مطبعہ سعادت مصر ۱۳۲۵ھ) اس جرم پر اس کو خالد بن عبداللہ قسری نے جو ہشام بن عبدالملک کی طرف سے عراق کا گورنر تھا، عید الضحیٰ کے دن عجیب شان سے قتل کیا، پہلے اس نے ایک عام اعلان کیا کہ میں آج خدا کی راہ میں قربانی کرنا چاہتا ہوں، جس کو شریک ہونا ہو وہ شریک ہو جائے، اس طور پر اس نے مسلمانوں کے مجمع عام میں قربانی کی، (اس کا واقعہ نہایت مشہور ہے، اسی کی طرف علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے: فقتل علی ذلک بالعراق یوم النحر والقصۃ مشھورۃ میزان الاعتدال جلد اول ص ۱۸۵) اس کے بعد اس کا عام مذاق پیدا ہو گیا او ر نہایت کثرت سے لوگوں نے محدثین کے خلاف اپنے خیالات ظاہر کرنا شروع کیے، جہم بن صفوان نے جس کی طرف فرقہ جہمیہ منسوب ہے، نصر بن سیار کے زمانے میں ترمذ میں اپنی بدعت کی اشاعت کی، وہ جبریہ اعتقاد رکھتا تھا، اس لیے بندے کو مجبور محض قرار دیتا تھا، اس جرم پر سالم بن احوز المازنی نے اس کو بنی امیہ کے آخری زمانے میں مرو میں قتل کر ڈالا، (ملل ونحل شہرستانی جلد اول ص ۱۰۹) تقریباً اسی زمانے میں بصرہ میں واصل بن عطا الغزال جو حسن بصری کا شاگرد تھا اور اس کے شاگرد عمرو بن عبید نے اعتزال کی بنیاد قائم کی، مقاتل بن سلیمان مفسر نے خراسان میں خدا کے لیے ہر قسم کے صفات ثابت کیے اور جسمیت کا قائل ہوا، ان سب کے بعد سجستان میں ابوعبداللہ بن کرام نے چند مذاہب سے کچھ مسائل اخذ کر کے ایک جدید مذہب قائم کیا اور اس کو ایک کتاب کے ذریعہ سے خراسان وغیرہ میں رواج عام دیا، (ملل ونحل شہرستانی جلد اول ص ۱۴۵ و ۱۴۴) اس کا خیال تھا کہ ایمان محض قول باللسان کا نام ہے، اس لحاظ سے اگر کوئی شخص دل میں کفر کا اعتقاد رکھے اور زبان سے خدا اور شریعت کا اقرار کرے تو وہ مؤمن ہے، اس بنا پر نیشاپور میں آٹھ سال تک قید رہا، اس کے بعد بیت المقدس چلا گیا اور شام میں ۲۵۵ھ میں وفات پائی اور اس کے مقلدین واصحاب نے اس کی قبر پر اعتکاف کیا (میزان الاعتدال ذہبی ج ۳ ص ۱۲۷) اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فرقے پیدا ہو گئے تھے لیکن ہم کو جہاں تک معلوم ہے، ان گمراہ سازوں میں روایتوں کے گھڑنے میں صرف عمرو بن عبید، مقاتل بن سلیمان اور کرامیہ مشہور ہیں، جہم بن صفوان کے متعلق تو علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں صاف تصریح کر دی ہے:

وما علمتہ روی شیئا ولکنہ زرع شرا عظیما (جلد اول ص ۱۹۷)

Marfat.com

ہمارے خیال میں اس نے کوئی روایت نہیں کی، البتہ بہت بڑی برائی کا بیج بو گیا۔

اسی طرح غیلان دمشقی، یونس اسواری، جعد بن درہم وغیرہ کا بھی رواۃ حدیث میں شمار نہیں، کرامیہ عموماً ترغیب وترہیب کے متعلق وضع احادیث کو جائز رکھتے تھے اور بعض ریاکار زاہد بھی اس خیال میں انہی کے ہمزبان تھے، ان کا یہ دعویٰ محض زبانی نہ تھا، بلکہ اس کو استدلال سے بھی ثابت کرتے تھے، مثلاً ایک روایت میں ہے:

من كذب علي متعمدا ليضل به فليتبوأ مقعده من النار۔

یعنی گمراہ سازی کے لئے جو میری طرف جھوٹ باتیں منسوب کرتا ہے اس کو جہنم میں اپنا ٹھکانا بنالینا چاہئے۔

اور چونکہ ترغیب وترہیب کے لئے جھوٹ بولنا گمراہ سازی میں داخل نہیں اس لئے اس کا مرتکب، شرعی مجرم نہیں قرار پا سکتا، اسی طرح بعض کا یہ بھی خیال تھا کہ چونکہ اس دروغ مصلحت آمیز سے آنحضرت ﷺ کا کوئی نقصان نہیں ہوتا (نووی حاشیہ مقدمہ مسلم ص ۷۰) اس لئے اس پر من كذب علي [1] کا حکم نہیں جاری ہو سکتا لیکن اس کا مجرم صرف کرامیہ اور زہاد کو قرار دینا خلاف انصاف ہے، خود ہمارے علما بھی اس قسم کی حدیثوں میں بہت کچھ سہل نگاری کرتے ہیں، (حاشیہ نووی مطبوعہ ہند ص ۴۱) مقاتل بن سلیمان کا وضع حدیث میں جو پایہ تھا، اس کا اندازہ میزان الاعتدال کی اس عبارت سے ہو سکتا ہے۔

عن النسائي قال والكذابون المعروفون بوضع الحديث ابن ابي يحيى بالمدينة والواقدي ببغداد ومقاتل بن سليمان بخراسان ومحمد بن سعيد الشامي (جلد ۳ ص ۶۴)

یعنی امام نسائی نے فرمایا کہ مدینہ میں ابن ابی یحییٰ بغداد میں واقدی، خراسان میں مقاتل بن سلیمان اور شام میں محمد بن سعید نہایت جھوٹے اور وضع حدیث میں مشہور ہیں۔

معتزلہ کا گروہ چونکہ زیادہ تر عقلیات کا شیفتہ تھا، اس لئے روایتوں سے بہت کم اعتنا رکھتا تھا لیکن اس گروہ میں صرف عمرو بن عبید ننگ خاندان ہے، اس کو حسن بصری کی صحبت کا شرف حاصل تھا، اس لئے اکثر روایتوں کو غلط طور پر ان کی طرف منسوب کر دیتا تھا اور اسی کے ساتھ بعض اس قسم کی روایتیں بھی بیان کرتا تھا، جس سے معتزلہ کے مذہب کی تائید ہوتی تھی۔

حدثني عمرو بن علي ابو حفص قال سمعت معاذ بن معاذ يقول قلت لعوف بن جميلة ان عمرو بن عبيد حدثنا عن الحسن ان رسول الله ﷺ قال من حمل علينا السلاح فليس منا قال كذب والله عمرو ولكنه اراد ان يحوزها الى قوله الخبيث۔ (مقدمہ صحیح مسلم ص ۱۰۹)

مجھ سے عمرو بن علی حفص نے روایت کی کہ میں نے معاذ بن معاذ سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے عوف بن جمیلہ سے کہا کہ ہم سے عمرو بن عبید نے حسن بصری سے روایت کی کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم سے نہیں، انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم عمرو جھوٹ کہتا ہے، لیکن وہ چاہتا ہے کہ اس روایت کو اپنے مردود قول کی طرف الٹ پھیر کر لائے۔

اس حدیث کی صحت میں کوئی کلام نہیں لیکن چونکہ عمرو بن عبید نے اس کو غلط طور پر حسن بصری کی طرف منسوب کر دیا تھا، اس لئے عوف بن جمیلہ نے اس کو مردود قرار دیا، کیونکہ عمرو بن عبید کو اس حدیث سے معتزلہ کے ایک خیال کی تائید منظور تھی۔

---

[1] (مطلب یہ کہ علی ضرر کیلئے استعمال کیا جاتا ہے، اسلئے جب ترغیب وترہیب سے شرعی فائدے حاصل ہوتے ہیں، تو اس قسم کے جھوٹ بولنے میں کیا حرج ہے)

Marfat.com

معتزلہ کا مذہب ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب دائرۂ ایمان سے نکل کر ہمیشہ کے لئے جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے، وہ لوگ اس قسم کے مجرم کو فاسق کا خطاب دیتے ہیں، چنانچہ عمرو بن عبید کو اس حدیث کے ظاہری معنی سے اسی خیال کی تائید کرنا منظور تھی، اس کے علاوہ عمرو بن عبید میں یہ کمال بھی تھا کہ خفیف تغیر وتبدل سے احادیث کے اصلی معنی بدل دیا کرتا تھا:

حدثنی حجاج بن الشاعر قال حدثنا سلیمان بن حرب حدثنا ابن زید یعنی حماد قال قیل لایوب ان عمرو بن عبید روی عن الحسن قال لا یجلد السکران من النبیذ فقال کذب انما سمعت الحسن یقول یجلد السکران من النبیذ۔ (مقدمہ مسلم: ۱۱۰)

مجھ سے حجاج بن شاعر اور ان سے سلیمان بن حرب اور ان سے ابن زید یعنی حماد نے بیان کیا کہ ایوب سے کہا گیا کہ عمرو بن عبید نے حسن بصری سے روایت کی ہے کہ تاڑی سے نشہ کرنے والے شخص کو کوڑے نہیں مارے جائیں گے، انہوں نے فرمایا کہ وہ جھوٹ کہتا ہے، میں نے تو ان سے سنا ہے کہ ایسے شخص کو کوڑے مارے جائیں گے۔

اس روایت میں عمرو بن عبید نے صرف لفظ "لا" کے بڑھا دینے سے ایسا عظیم الشان تغیر پیدا کر دیا، مختصر یہ کہ اعتزال کی وجہ سے عمرو بن عبید روایت حدیث میں سخت بدنام تھا:

حدثنی حجاج قال نا سلیمان بن حرب قال سمعت سلام بن ابی مطیع یقول بلغ ایوب انی آتی عمرًا فاقبل علی یومًا فقال ارأیت رجلًا لا تأمنه علی دینه کیف تأمنه علی الحدیث۔

(مقدمہ صحیح مسلم ص ۱۱۰)

مجھ سے حجاج اور ان سے سلیمان بن حرب نے بیان کیا، کہ میں نے سلام بن ابی مطیع کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایوب کو معلوم ہوا کہ میں عمرو کے پاس آمد و رفت رکھتا ہوں، تو وہ میرے پاس آئے اور فرمایا کہ تمہیں جس شخص کے مذہب پر اعتماد نہیں اس کی حدیثوں پر کیوں کر اعتماد کرتے ہو۔

اسی سلسلہ میں محمد بن سعید مصلوب اور عبداللہ بن مسعود ابو جعفر المدنی بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، محمد بن سعید مصلوب کو وضع حدیث میں جو جرأت اور بے باکی تھی، اس کا اندازہ شارح نووی کی اس عبارت سے ہو سکتا ہے:

قال خالد بن یزید سمعته یقول اذا کان کلام حسن لم ار باسًا ان اجعل له اسنادًا۔

یعنی خالد بن یزید کا بیان ہے کہ میں نے خود اس کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جب کوئی اچھا کلام مل جاتا ہے تو مجھے اس کے لئے اسناد گڑھنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا۔

اسی ضعف روایت کی وجہ سے مدلسین نے اس کے سینکڑوں نام بدلے ہیں، تاکہ انہیں مصنوعی ناموں کے پردے میں اس کا عیب چھپ جائے، اس کے ساتھ یہ مذہبی حیثیت سے بھی متہم تھا، چنانچہ احمد بن حنبل کا بیان ہے کہ اس کو زندقہ کی تہمت میں ابو جعفر نے قتل کر ڈالا، (نووی ص ۵۶) عبداللہ بن مسور اگرچہ مذہبی حیثیت سے بدنام نہ تھا، تاہم وضع حدیث میں وہ بھی محمد بن سعید کا ہم خیال تھا:

Marfat.com

حدثنا عثمان بن ابی شیبة قال ناجریر عن رقبة ان ابا جعفر الهاشمی المدنی کان یضع احادیث کلام حق ولیست احادیث النبی ﷺ و کان یرویها من النبی ﷺ۔

(مقدمہ مسلم ص ۱۰۷،۱۰۸)

ہم سے عثمان بن ابی شیبہ نے اور ان سے جریر نے رقبہ کے ذریعہ سے روایت کی کہ ابو جعفر ہاشمی مدنی اچھے کلام کو حدیث کے قالب میں ڈھال کر آنحضرت ﷺ سے روایت کرتا تھا، حالانکہ وہ آنحضرت کا کلام نہیں ہوتا تھا۔

اسی طرح عبدالقدوس شامی بھی عام طور پر کذاب خیال کیا جاتا تھا۔

حدثنی احمد بن یوسف الازدی قال سمعت عبدالرزاق یقول مارأیت ابن المبارک یفصح یقوله کذاب الا لعبد القدوس فانی سمعت یقول له کذاب۔ (مقدمہ مسلم:۱۱۷)

مجھ سے احمد بن یوسف ازدی نے بیان کیا، کہ میں نے عبدالرزاق سے سنا کہ ابن مبارک کسی شخص کو کذاب نہیں کہتے تھے، لیکن میں نے ان کو عبدالقدوس کو کذاب کہتے ہوئے سنا۔

اس فرقہ مبتدعہ میں روافض کا بھی شمار ہے، بلکہ اہل حدیث زیادہ تر اسی گروہ سے نالاں ہیں، کیونکہ یہی لوگ زیادہ تر اپنے مذہب کی تائید میں موضوع اور غلط حدیثیں روایت کرتے تھے، چنانچہ اسی بنا پر امام شافعیؒ ان کی حدیثوں کو مطلقاً دائرہ اعتبار سے خارج سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کو عام طور پر اہل بدعت کی روایتوں کے قبول کرنے میں اس قدر تشدد نہیں:

حدثنی سلمة بن شبیب قال نا الحمیدی قال نا سفیان قال کان الناس یحملون عن جابر قبل ان مایظهر ما اظهر فلما اظهر ما اظهر اتهمه الناس فی حدیثه و ترکه بعض الناس فقیل له وما اظهر قال الایمان بالرجعة۔[1]

مجھ سے سلمہ بن شبیب اور ان سے حمیدی اور ان سے ابوسفیان نے بیان کیا کہ قبل اس کے کہ جابر اپنا خیال ظاہر کرے، لوگ اس سے حدیثیں روایت کرتے تھے لیکن جب اس نے اپنا خیال ظاہر کیا تو لوگ اس کو متہم کرتے تھے بلکہ بعض لوگوں نے اس کو بالکل متروک الحدیث قرار دیا، پھر ان سے پوچھا گیا کہ اس نے کیا خیال ظاہر کیا، فرمایا: ایمان بالرجعة۔

حدثنی حسن الحلوانی قال انا ابو یحیی الحمانی قال نا قبیصة واخوه انهما سمعا الجراح بن ملیح یقول سمعت جابر بن یزید عندی سبعون الف حدیث عن ابی جعفر عن النبی ﷺ کلها۔

مجھ سے حسن حلوانی اور ان سے ابویحیٰی حمانی اور ان سے قبیصہ اور ان کے بھائی نے روایت کی کہ ہم دونوں نے جراح بن ملیح سے سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ میں نے خود جابر بن یزید سے یہ سنا کہ میرے پاس ۷۰ ہزار حدیثیں ہیں جو کل کی کل آنحضرتؐ سے ابو جعفر کے ذریعہ سے مروی ہیں۔

لیکن بایں ہمہ ہم کو اس گروہ کا ممنون ہونا چاہیے کہ اس نے علم حدیث کے متعلق قدما کی رائے میں ایک نہایت مفید انقلاب پیدا کر دیا، چنانچہ اس کے پہلے اسناد کا اس قدر التزام نہ تھا، یا تھا تو کم از کم اس کے متعلق اس قدر تشدد سے کام نہیں لیا

[1] (روافض کا خیال ہے کہ حضرت علی بادلوں کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں، چنانچہ جب وہ آسمان سے پکاریں گے تو ہم ان کی اولاد کے ساتھ خروج کریں گے)۔

Marfat.com

جاتا تھا لیکن جب بدعت نے زیادہ زور پکڑا تو محدثین نے اس کی طرف خاص توجہ کی اور اس کو لوازم مذہب سے قرار دیا۔

حدثنا ابو جعفر محمد بن الصباح قال ثنا اسماعیل بن زکریا عن عاصم الاحول عن ابن سیرین قال لم یکونوا یسئلون عن الاسناد فلما وقعت الفتنۃ قالوا سموا لنا رجالکم فینظر الی اھل السنۃ فیوخذ حدیثھم وینظر الی اھل البدع فلا یوخذ حدیثھم۔ (مقدمہ صحیح مسلم ص ۸۴)

ہم سے ابو جعفر محمد بن صباح اور ان سے اسماعیل بن زکریا اور ان سے عاصم احول نے ابن سیرین سے روایت کی کہ لوگوں سے پہلے اسناد نہیں پوچھے جاتے تھے لیکن جب فتنہ پھیلا تو لوگ کہنے لگے کہ ہم کو اپنے راویوں کے نام بتاؤ تا کہ اہل سنت کو دیکھ کر حدیثیں قبول کی جائیں اور اہل بدعت کی حدیثیں نہ لی جائیں۔

سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اسی گروہ کی برکت سے احادیث کی تالیف وتدوین کا سلسلہ قائم ہوا کیونکہ عمرو بن عبید، جہم بن صفوان، واصل بن عطا، مقاتل بن سلیمان کے ظہور کا زمانہ وہ پر آشوب زمانہ تھا جس میں ملکی انقلاب کا حشر برپا تھا، حوادث زمانہ نے بنو امیہ کا دفتر الٹ کر بنی عباس کو صاحب تخت وتاج قرار دیا تھا، علما و محدثین بھی اس قیامت خیز انقلاب سے محفوظ نہ تھے، خراسانی لشکر نے سینکڑوں اہل علم کو تہ تیغ کر دیا تھا، اس لیے خوف تھا کہ ملکی تغیر کے ساتھ، ان خانہ براندازوں کے خیالات سے اسلام کے اصل عقائد میں کہیں انقلاب نہ پیدا ہو جائے، اس بنا پر علما نے تدوین کتب کی طرف توجہ کی اور علوم شریعت صحابہ اور تابعین کے مقدس سینوں سے نکل کر منظر عام پر آ گئے، یہ سچ ہے کہ اس ذریعہ سے مسلمانوں کا اصلی جوہر قوت حافظہ مٹ گیا لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آج ہمارے پاس جو کچھ بچا کھچا سرمایہ رہ گیا ہے، وہ انہیں کوششوں کا نتیجہ ہے۔

بہر حال یہاں تک جب بحث تھی، اس کا تعلق ایک خاص گروہ کے ساتھ تھا لیکن ایک عام بات جس کا تعلق ہر گروہ اور ہر شخص کے ساتھ ہو سکتا ہے، یہ کہ کثرت روایت سے احتراز کیا جائے اور اسی کے ساتھ ہر شخص کے فہم و درایت کے موافق روایتیں کی جائیں اور عموماً ہر کس و ناکس سے روایتوں کے قبول کرنے میں سختی اور احتیاط سے کام لیا جائے چنانچہ صحابہ اور تابعین میں جو لوگ نکتہ سنج اور حقیقت شناس تھے، وہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے۔

حدثنا یحیی بن یحیی قال نا ھشیم عن سلیمان التیمی عن ابی عثمان النھدی قال قال عمر بن الخطاب بحسب المرء من الکذب او یحدث بکل ماسمع۔ (مقدمہ مسلم ص ۷۴، ۷۵)

ہم سے یحیی بن یحیی نے روایت کی کہ ہم کو ہشیم نے سلیمان تیمی سے اور ان سے عثمان نہدی نے خبر دی کہ حضرت عمر بن الخطاب فرماتے تھے کہ آدمی کے لیے یہی جھوٹ بہت ہے کہ جو کچھ سنے اس کو روایت کر دے۔

حدثنی ابو الطاھر احمد بن عمرو بن عبد اللہ بن عمرو بن سرح قال نا ابن وھب قال قال لی مالک اعلم انہ لیس یسلم رجل حدث بکل ماسمع ولا یکون اماما وھو یحدث بکل ماسمع۔

(مقدمہ صحیح مسلم ص ۷۵)

ہم سے ابو طاہر احمد بن عمرو بن عبد اللہ بن عمرو بن سرح نے روایت کی کہ ہم کو ابن وہب نے خبر دی کہ مجھ سے امام مالک نے فرمایا کہ تم خوب سمجھ لو کہ جو شخص جو کچھ سنتا ہے اور اس کی روایت کرتا ہے وہ خطا سے نہیں بچ سکتا اور وہ شخص امام نہیں ہو سکتا۔

Marfat.com

حدثنی ابو الطاھر و حرملة بن یحیی قالا نا ابن وھب قال اخبرنی یونس عن ابن شھاب عن عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبة ان عبد اللہ بن مسعود قال ما انت بمحدث قوما حدیثا لا تبلغه عقولھم الا کان لبعضھم فتنة۔ (مقدمہ مسلم ص ۷۴)

ہم سے ابوالطاہر اور حرملہ بن یحیٰی نے روایت کی کہ ہم دونوں کو ابن وہب نے خبر دی کہ ہم سے یونس نے اور ان سے ابن شہاب نے اور ان سے عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ نے روایت کی کہ عبداللہ بن مسعود فرماتے تھے کہ جب تم کسی قوم کے مبلغ عقل سے باہر حدیث بیان کرو گے تو وہ یقیناً ان میں سے بعض کے لیے فتنہ و فساد ہو گی۔

حدثنی الفضل بن سھل قال حدثنی عفان بن مسلم قال نا ھمام قال قدم علینا ابو داؤد الاعمی فجعل یقول ثنا البراء و ثنا زید بن ارقم فذکر نا ذلک لقتادة فقال کذب ماسمع منھم انما کان ذلک سائل یتکفف الناس زمن الطاعون الجارف۔ (مقدمہ مسلم ص ۱۰۴)

مجھ سے فضل بن سہل نے بیان کیا کہ مجھ سے عفان بن مسلم نے روایت کی کہ ہم کو ہمام نے خبر دی کہ میرے پاس ابوداؤد اعمٰی آئے اور کہنے لگے کہ مجھ سے براء نے حدیث بیان کی اور زید بن ارقم نے حدیث بیان کی تو میں نے اس کا ذکر قتادہ کے سامنے کیا انہوں نے کہا وہ جھوٹ کہتا ہے، اس نے ان میں سے کسی سے نہیں سنا، وہ تو طاعون جارف کے زمانے میں لوگوں سے بھیک مانگا کرتا تھا۔

اور در حقیقت قدما کے یہ اقوال بالکل دور اندیشی پر مبنی ہیں، کیونکہ عادۃً ہر شخص جھوٹی سچی باتیں سنا کرتا ہے، اس لیے کثرت روایت سے کوئی شخص جھوٹ سے نہیں بچ سکتا، اسی طرح بہت سی حدیثیں عام لوگوں کے دائرہ عقل سے خارج ہوتی ہیں، اس لیے ان کے سامنے اس قسم کی حدیثوں کے بیان کرنے میں نہایت دقیق اور خطرناک غلطیوں کا احتمال ہے۔

ان ہی عام غلطیوں میں تدلیس اور واقعہ تاریخی کے خلاف روایتیں بھی ہیں تدلیس کی بہت سی صورتیں ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اکثر لوگ روایت حدیث میں مجہول اور ضعیف ہوتے تھے، اس لیے اکثر رواۃ کے عیوب کی پردہ پوشی کے لیے ان کے نام کو کنیت اور کنیت کو نام سے بدل کر روایات کیا کرتے تھے تا کہ وہ لوگ جس نام اور کنیت کے ساتھ ضعیف مشہور ہیں، ان میں التباس اور اشتباہ پیدا ہو جائے، اسی طرح بہت سے لوگ واقعہ تاریخی کے خلاف روایتیں کیا کرتے تھے۔

حدثنا اسحاق بن ابراھیم الحنظلی قال سمعت بعض اصحاب عبد اللہ قال قال ابن المبارک نعم الرجل بقیة لو لا انه یکنی الا سامی و یسمی الکنی کان دھرا یحدث عن ابی سعید الو حاظی فاذا ھو عبد القدوس۔ (مقدمہ مسلم ص ۱۷)

ہم سے اسحٰق بن ابراہیم حنظلی نے روایت کی کہ میں نے عبداللہ بن مبارک کے بعض اصحاب سے سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ بقیہ کیا اچھا آدمی تھا اگر وہ ناموں کو کنیت اور کنیت کو ناموں سے نہ بدلتا تھا، ایک زمانے تک وہ ابوسعید وحاظی سے روایت کرتا تھا، آج وہ عبدالقدوس نکلا۔

حدثنی عبد اللہ بن عبد الرحمان الدارمی قال سمعت ابانعیم و ذکر المعلی بن عرفان فقال قال حدثنا ابو وائل قال خرج علینا ابن مسعود بصفین فقال ابو نعیم اتراہ بعث بعد الموت۔

(مقدمہ صحیح مسلم ص ۱۱۷، ۱۱۸)

Marfat.com

ہم سے عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی نے روایت کی کہ ہم نے ابونعیم سے معلی بن عرفان کا ذکر سنا وہ فرماتے تھے کہ معلی نے ہم سے ابووائل کی سند سے روایت کی کہ ہم پر حضرت ابن مسعود نے جنگ صفین میں چڑھائی کی راوی کا بیان ہے کہ ابونعیم نے اس سے کہا کہ کیا تمہارے نزدیک وہ قبر سے اٹھ کر آئے تھے۔

مطلب یہ کہ معلی نے ابووائل کی طرف اس حدیث کی غلط نسبت کی کیونکہ حضرت ابن مسعود نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کی خلافت ختم ہونے سے تین برس پہلے ۳۲یا۳۳ھ میں وفات پائی اور جنگ صفین حضرت علیؓ کے زمانے میں واقع ہوئی، اس لئے ابووائل جیسے ثقہ اور ضابط شخص ایسی خلاف عقل حدیث کیونکر روایت کر سکتے تھے، ان تحقیقات کے بعد امام صاحب نے معنعن حدیث کی بحث چھیڑی ہے اور نہایت سختی کے ساتھ امام بخاری کے مذہب کو باطل کیا ہے، معنعن روایتوں کے متعلق محدثین کی رائیں نہایت مختلف ہیں، امام بخاری کا مذہب یہ ہے کہ راوی اور مروی عنہ میں ملاقات ثابت ہونی چاہئے، متاخرین نے اس سے بھی زیادہ سختی سے کام لیا ہے، چنانچہ قابسی کے نزدیک مطلق لقا بھی کافی نہیں بلکہ اچھی طرح ملاقات کرنی چاہیے، ابوالمظفر سمعانی نے امتداد صحبت کی قید لگائی، ابوعمر والدانی المقری نے ان تمام شرائط پر اس شرط کا بھی اضافہ کیا ہے کہ دونوں میں روایت بھی ثابت ہو لیکن امام مسلم کے نزدیک صرف راوی اور مروی عنہ کی ہم عصری اور امکان ملاقات صحت روایت کے لیے کافی ہو سکتا ہے، بشرطیکہ راوی مدلس نہ ہو۔ (مقدمہ مسلم نووی ص ۳۲ و تدریب الراوی ص ۷۴)

اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے، (ایضاً) ان کا استدلال یہ ہے کہ ثبوت لقا کے بعد معنعن روایت عموماً متصل الاسناد سمجھی جاتی ہے، حالانکہ اس صورت میں ارسال کا احتمال قائم رہتا ہے، فرض کرو زید نے عمرو سے عمرو نے بکر سے روایت کی، زید اور عمر میں لقا بھی ثابت ہے، زید ثقہ بھی ہے لیکن پھر بھی یہ احتمال باقی ہے کہ زید اور عمرو کے درمیان میں کوئی واسطہ ہو، مگر صحت روایت پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا، اسی طرح امکان لقا کی صورت میں راوی کے غیر مدلس اور ثقہ ثابت ہونے کے بعد ارسال اور انقطاع کا شبہہ قابل اعتبار نہیں لیکن در حقیقت امام صاحب کا یہ مذہب صحیح نہیں، کیونکہ راوی ثقہ اور غیر مدلس ہے اور لقا بھی ثابت ہے تو اس صورت میں ظن غالب ہے کہ وہ بلاواسطہ روایت کرتا ہے، کیونکہ ثقہ اور غیر مدلس راویوں کے حالات کے تتبع سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس طور پر حدیثیں اسی وقت روایت کرتے تھے، جب بذات خود سن لیتے تھے لیکن عدم لقا کی صورت میں اس قسم کا غلبہ ظن نہیں پیدا ہو سکتا، اس تحقیق کے بعد ہم مسلم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

صحیح مسلم اور اس کی خصوصیات:

اوپر گزر چکا ہے کہ امام صاحب نے جس زمانے میں صحیح مسلم کو مرتب کیا، اس میں موضوع، ضعیف، غلط ہر قسم کی حدیثیں موجود تھیں، اس بنا پر انہوں نے صحیح کے مقدمہ میں احادیث کی تین قسمیں اور راویوں کے تین طبقے قرار دیے ہیں۔

۱۔ وہ حدیثیں جو بالکل صحیح ہوں، اور ان کے رواۃ عموماً متقن، حافظ، ضابط اور ثقہ تسلیم کئے گئے ہوں۔

۲۔ وہ حدیثیں جن کے رواۃ کو باعتبار ثقاہت اور حفظ و اتقان پہلے قسم کے راویوں سے کم درجہ رکھتے ہوں۔

۳۔ وہ حدیثیں جن کے رواۃ کو عموماً یا اکثر محدثین نے مردود قرار دیا ہو۔

امام صاحب نے تصریح کی ہے، کہ میں پہلی قسم کی حدیثوں کے بعد دوسری قسم کی روایتوں کو درج کروں گا لیکن مجھ کو تیسری قسم کی حدیثوں سے کچھ تعلق نہیں (مقدمہ مسلم ص ۴۸ تا ۵۰) اس تصریح کے موافق طبقہ ثالثہ کی روایتوں کے متعلق تو کوئی

Marfat.com

اختلاف نہیں ہوسکتا تھا، البتہ اس مسئلہ میں اہل علم نہایت مختلف الرائے ہیں کہ صحیح مسلم میں دوسرے طبقہ کی حدیثیں درج ہوئیں یا نہیں۔

حافظ ابوعبداللہ حاکم اور حافظ ابوبکر بیہقی کا خیال ہے کہ امام صاحب کو موت نے دوسرے طبقے کی حدیثوں کے تخریج کا موقع نہیں دیا، اس لیے صحیح مسلم میں صرف طبقہ اول کی حدیثیں درج ہوسکیں، امام ابوسفیان کا (جو خود امام صاحب کے ہم صحبت ہیں، بیان ہے کہ امام صاحب نے ہر طبقہ کے لیے الگ الگ کتابیں مرتب کیں اور ان میں بالاستقلال ہر طبقہ کی روایتیں جمع کیں، چنانچہ انہی کتابوں میں سے ایک صحیح مسلم بھی ہے۔

لیکن قاضی عیاض کی تحقیق یہ ہے کہ صحیح مسلم میں دونوں طبقہ کی حدیثیں موجود ہیں، البتہ فرق یہ ہے کہ دوسرے قسم کی حدیثیں متابعتاً یا شواہداً درج کی گئی ہیں، اسی طرح ان ابواب میں بھی اس قسم کی حدیثیں آ گئی ہیں، جن میں پہلے طبقہ کی حدیثیں دستیاب نہ ہوسکیں، اسی طور پر ان راویوں کی روایتوں سے بھی تعرض کیا گیا ہے، جن کو بعض محدثین نے معتبر اور بعض نے غیر معتبر قرار دیا ہے یا یہ کہ ان کے رواۃ متہم بالبدعہ ہیں، جیسا کہ خود امام بخاری نے کیا ہے، اس تحقیق کے موافق صحیح مسلم میں بجز ان حدیثوں کے جن کے رواۃ کو عموماً اکثر محدثین نے مردود قرار دیا ہے، ہر قسم کی روایتیں درج ہیں۔

(مقدمہ نووی ص ۳۳ تا ۳۵)

بہر حال صحیح یعنی قسم اول کی حدیثوں میں امام صاحب کی شرط یہ ہے کہ حدیث متصل الاسناد ہو، شروع سے اخیر تک ثقہ راویوں کے ذریعہ سے مروی ہو شذوذ و عالت سے خالی ہو، اس میں امام صاحب کی خصوصیت نہیں، بلکہ عموماً محدثین کے نزدیک جب کسی حدیث میں یہ تمام شروط پائے جاتے ہیں تو وہ صحیح تسلیم کی جاتی ہے، البتہ اختلاف اس وقت ہوتا ہے، جب ان شرائط میں سے کوئی شرط موجود نہ ہو، ان میں باہم اس شرط کے اشتراط میں اختلاف زیادہ ہو، زیادہ تر اختلاف ان روایتوں میں ہوتا ہے، جن میں ایک فریق کے نزدیک صحیح کے تمام شرائط موجود ہوں اور دوسرے کے نزدیک معدوم، مثلاً امام بخاری کے نزدیک ابوزبیر مکی، سہیل بن ابی صالح، حماد بن سلمہ وغیرہ میں صحیح کے تمام شرائط موجود نہیں، اس لئے وہ ان سے روایت نہیں کرتے، اس کے بخلاف یہ لوگ امام مسلم کے نزدیک قابل اعتبار ہیں، اسی طرح عکرمہ بن مرزوق سے امام بخاری روایت کرتے ہیں، لیکن امام مسلم ان کو قابل روایت نہیں قرار دیتے، اس بنا پر امام مسلم نے امام بخاری کے چار سو چونتیس راویوں سے اور امام بخاری نے امام مسلم کے چھ سو پچیس راویوں سے روایت نہیں کی۔ (نووی ص ۱۵، ۱۶)

اس موقع پر اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بخاری کو قوت اسناد کے لحاظ سے مسلم پر ترجیح ہے، تاہم مسلم میں بھی چند خصوصیتیں ایسی پائی جاتی ہیں، جو امام بخاری کے مقابل میں مرجحانہ حیثیت سے پیش کی جاتی ہیں، چنانچہ ہم ان کو ایک خاص ترتیب سے درج کرتے ہیں۔

ا۔ حسن ترتیب: صحیح مسلم کو جن حیثیتوں سے ایک بے نظیر تصنیف کا خطاب دیا گیا ہے، ان میں ایک عام وصف اس کتاب کی طرز ادا اور حسن ترتیب ہے، (ایضاً ص ۱۱) امام بخاری نے اگرچہ روایتوں کی تنقید میں نہایت احتیاط اور نکتہ سنجی سے کام لیا ہے تاہم چونکہ وہ متون حدیث سے ایک خاص نتیجہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، اس لئے ان احادیث کو متعدد طریقوں سے مختلف بابوں میں درج کرتے ہیں، بلکہ اکثر احادیث کو ان ابواب میں درج کر دیتے ہیں جو بظاہر ان کے بالکل مناسب نہیں

Marfat.com

ہوتے، اس لحاظ سے بخاری میں اس قدر سوء ترتیبی پیدا ہوگئی ہے کہ متاخرین کے ایک گروہ نے بخاری کی ان روایتوں کا کلیتاً انکار کردیا، جو نامناسب ابواب میں درج تھیں، کیونکہ ابواب کے عدم تناسب اور غیر موزونی سے ان کی طرف خیال بھی مائل نہیں ہوسکتا تھا، اس کے بخلاف امام مسلم ہر حدیث کو ایک خاص اور مناسب باب میں درج کرتے ہیں، اور اسی کے ساتھ طرق مختلفہ اور اسانید کی تشریح اور رواۃ کے خاص خاص الفاظ کی طرف بھی اشارہ کرتے جاتے ہیں، اس لئے مسلم میں حسن ترتیب کے ساتھ احادیث کی تحقیق اور تفتیش کا موقع بھی نہایت آسانی سے مل سکتا ہے۔ (ایضاً ص ۱۴،۱۵)

۲۔ امام بخاری چونکہ فقہی مسائل کے استنباط کی غرض سے احادیث پر مجتہدانہ نظر ڈالتے ہیں، اس لئے اسناد کے متصل ہونے کا بہت کم خیال رکھتے ہیں، چنانچہ بخاری میں غیر مسند روایتیں اور تعلیقات کی کثرت اسی کا نتیجہ ہے، (مقدمہ نووی ص ۱۶) اسی طرح وہ اجتہاد کے موقعوں پر اکثر ان احادیث کی طرف جو پہلے گزر چکی ہیں، نہایت خفیف اشارہ کرتے جاتے ہیں، اس بنا پر اس طریقہ سے اگرچہ ان کی دقت نظر اور اجتہادی قوت کا پتہ چلتا ہے اور وہ حدیثیں بھی درحقیقت متصل الاسناد اور صحیح ہوتی ہیں تاہم بظاہر ان کے متعلق بہت سے خدشے پیدا ہوجاتے ہیں، چنانچہ ابن حزم ظاہری نے حرمت ملاہی کا اسی بنا پر انکار کردیا کہ بخاری میں اس کے متعلق جو حدیث مروی ہے، وہ منقطع یعنی معلق ہے لیکن امام مسلم نے چونکہ احادیث کو محض محدثانہ حیثیت سے دیکھا ہے، اس لیے مسلم میں یہ ظاہری فروگزاشت بہت کم نظر آتی ہے، چنانچہ تحقیقی رائے کے مطابق اس میں صرف بارہ جگہ تعلیقات یعنی منقطع روایتیں پائی جاتی ہیں۔

۳۔ امام بخاری اہل شام سے جو روایتیں کرتے ہیں ان کے نام اور کنیت میں اکثر ان کو اشتباہ ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ نام اور کنیت کے لحاظ سے ان کو مختلف موقعوں پر دو شخص سمجھ جاتے ہیں لیکن امام مسلم کو کسی موقع پر اس قسم کا دھوکا نہیں ہوا، اس سے امام صاحب کی قوت ممیزہ اور وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے۔

۴۔ امام بخاری کی حدیثوں میں تقدیم وتاخیر، حذف اور اسقاط کی وجہ سے اکثر تعقید اور پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں لیکن مسلم کی نشست الفاظ میں کہیں اس قسم کی تعقید نہیں پائی جاتی، یہ سچ ہے کہ بخاری کی دوسری روایتوں کی اعانت سے تعقید کی یہ گرہ کھل جاتی ہے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلم کا طرز ادا بخاری کی بہ نسبت زیادہ صاف ہے، واضح اور قریب الفہم ہے، ان خصوصیتوں کے علاوہ امام صاحب نے عموماً صحیح مسلم میں حزم اور احتیاط کے جو پہلو اختیار کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ محدثین کی درسگاہ میں عموماً درس وتدریس کے دو طریقے معین تھے، ایک تو یہ کہ اساتذہ خود حدیثوں کو پڑھتے تھے اور ساتھ ساتھ اس کی تشریح بھی کرتے جاتے تھے، دوسرے یہ کہ اساتذہ اپنے مجموعہ حدیث کو خود شاگرد کے ہاتھ میں دے دیتے تھے، وہ اس کو پڑھتا تھا اور شیخ کو محض تشریح مطلب کی زحمت گوارا کرنی پڑتی تھی، ان دونوں طریقوں سے اگرچہ احادیث کی صحت اور قطعیت پر مساویانہ اثر پڑتا ہے، تاہم راویانہ حیثیت سے یہ بحث آپڑتی ہے کہ دوسری قسم کی حدیثوں کو "حدثنا" کے ساتھ روایت کرسکتے ہیں یا نہیں؟ امام بخاری امام زہری، یحییٰ بن سعید قطان وغیرہ کے نزدیک اس لفظ کے ساتھ روایت کرسکتے ہیں لیکن محدثین کا ایک بہت بڑا گروہ جن میں امام شافعی، امام اوزاعی، امام نسائی جیسے اکابر فن داخل ہیں، ان دونوں قسموں میں تفریق کرتا ہے اور دوسری قسم کی روایتوں صرف "اخبرنا" سے جائز رکھتا ہے، امام مسلم بھی انہی بزرگوں کے ہم خیال ہیں (مقدمہ نووی ص ۱۲) اس لیے ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ یہ طریقہ کس قدر حزم، احتیاط اور دوراندیشی پر مبنی ہے۔

Marfat.com

اس مسئلہ کو طے کرنے کے لیے سب سے پہلے لفظ "حدیث اور خبر" کی حقیقت پر غور کرنا چاہیے، خبر ایک عام لفظ ہے کیونکہ اس کے لیے بالذات یا بواسطہ محض اظہار واقعہ کی ضرورت ہے، اس کے بخلاف حدیث (گفتگو) ایک ایسی چیز ہے کہ اس کا وجود بغیر اپنی زبان کے ہو ہی نہیں سکتا اور اگر کسی دوسرے ذریعہ سے ہو تو وہ محض ترجمانی یا اخبار ہوگا، اس بنا پر صرف انہی حدیثوں کو "حدثنا" سے روایت کر سکتے ہیں جن کو شیخ نے خاص اپنی زبان سے بیان کیا ہو۔ (ایضاً ص ۲۲)

۲۔ اکثر روایتوں میں راویوں کے الفاظ، متن حدیث کے بعض حروف اور رواۃ کے اوصاف اور نام و نسب میں اختلاف ہو جاتا ہے، اس لیے امام صاحب نہایت احتیاط کے ساتھ ہر ایک کی تفصیل کر دیتے ہیں، جن سے متعدد نتائج پیدا ہوتے ہیں، اولاً تو خود امام صاحب کی وسعت نظر اور صداقت کا پتہ چلتا ہے، دوسرے یہ کہ اختلاف لفظ کی وجہ سے بعض موقعوں پر معنوی اختلاف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ (مقدمہ نووی ص ۲۲)

۳۔ محدثین کے زمانے میں علم حدیث کی وسعت نے بعض ایسے مجموعے پیدا کر دیئے تھے جن میں صرف ایک ہی روایت اور ایک ہی اسناد سے تمام حدیثیں مروی ہوتی تھیں، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس قسم کے مجموعوں سے متعدد روایتیں کی جائیں تو بوقت روایت ہر حدیث کے لیے تجدید اسناد کی ضرورت ہوگی یا احادیث کے متحد الاسناد ہونے کی وجہ سے بعد کی، دوسری حدیثیں اسی پہلی اسناد پر محمول کر دی جائیں گی، وکیع بن جراح اور یحییٰ بن معین کے نزدیک تجدید اسناد کی کوئی ضرورت نہیں لیکن استاذ ابواسحاق اسفرائینی جو اصول حدیث کے بہت بڑے امام ہیں، اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور ہر حدیث کو بقید اسناد روایت کرنا ضروری سمجھتے ہیں، امام مسلم بھی انہی کے ہم زبان ہیں اور اپنی خاص روایتوں میں اس کی تفریق کر دیتے ہیں، چنانچہ صحیفۂ ابن ہمام سے جو روایتیں کی ہیں، اسی اصول پر کی ہیں، (ایضاً) اب غور کرنا چاہیے کہ امام صاحب کا یہ طرز عمل، کس قدر دور اندیشی پر مبنی ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تجدید اسناد سے راوی کی احتیاط اور دیانت کا ٹھیک پتہ چل جاتا ہے لیکن اس سے قطع نظر کر کے اگر عام طور پر اس طریقہ سے سہل انگاری کی جائے تو آئندہ چل کر رواۃ کی بے احتیاطی سے اکثر حدیثوں میں اختلاط پیدا ہو جائے، اس لیے صداقت اور تورع کے علاوہ امام صاحب کا یہ اصول بالکل عقل کے موافق ہے۔

۴۔ امام صاحب احادیث کی روایت میں اس قدر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں کہ لغزش کا گمان بھی نہیں ہو سکتا، چنانچہ سلسلۂ روایت میں ایک موقع پر سلیمان بن بلال اور یحییٰ بن سعید کا نام آ گیا ہے لیکن چونکہ امام صاحب نے اپنے شیخ سے ان راویوں کا نام بقید نسب نہیں سنا تھا، اسلئے سلسلۂ روایت میں انکے نسب کا ذکر اس تصریح کے ساتھ کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خود امام صاحب کا ذاتی اضافہ ہے، اس سے امام صاحب کی صداقت اور دیانت کا پتہ چلتا ہے۔ (مقدمہ نووی ص ۲۳)

صحیح مسلم کا طریق روایت:

ان اصول و شرائط ہی کے لحاظ سے صحیح مسلم ایک بے نظیر اور مستند تصنیف نہیں بلکہ جن ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے، ان میں بھی وہی قطعیت اور قوت پائی جاتی ہے جو اس کتاب کے لیے موزوں تھی، عام طور پر جن بزرگوں کی متصل الاسناد روایتوں کے ذریعہ سے اس کتاب نے شہرت پائی ہے ان کے نام یہ ہیں: ابواسحاق ابراہیم بن محمد بن سفیان، ابواحمد محمد بن عیسیٰ الجلودی، ابوالحسین عبدالغافر فارسی، ابوعبداللہ بن محمد بن الفضل فراوی، امام فقیہ الحرمین ابوالفتح منصور بن عبدالمنعم فراوی، ابو

Marfat.com

اسحاق ابراہیم بن ابی حفص، عمرو بن مفر الواسطی، ان بزرگوں میں سب سے پہلے امام ابواسحاق ابراہیم بن محمد بن سفیان نے خود امام مسلم سے روایت کی اس کے بعد علی سبیل الترتیب یہ مبارک سلسلہ امام ابواسحاق واسطی تک پہنچا، چنانچہ شیخ محی الدین نووی شارح مسلم نے جامع دمشق میں انہی سے پوری کتاب کی سماعت کی، ان بزرگوں میں فضل وکمال اور ثقاہت کے علاوہ جو بات خاص لحاظ کے قابل ہے، وہ یہ ہے کہ یہ تمام اصحاب نیشاپوری اور سن رسیدہ ہیں، ان میں اگرچہ امام ابواسحاق ابراہیم، واسطی ہیں لیکن چونکہ انہوں نے ایک مدت تک نیشاپور میں اقامت کی ہے، اس لیے یہ بھی درحقیقت اسی سلسلہ میں داخل ہیں، طرق روایت کی اس خصوصیت نے مسلم کو اور بھی قطعی اور یقینی بنا دیا ہے لیکن اس کے علاوہ اہل مغرب کے نزدیک یہ کتاب ابی محمد بن علی القلانسی کی روایت سے بھی مشہور ہے، ابو محمد قلانسی سے ابو بکر احمد بن یحییٰ کے توسط سے ابی العلا عبدالوہاب بن عیسیٰ نے روایت کی تھی، چنانچہ ابوعبداللہ محمد بن یحییٰ نے مصر میں ان سے اس کتاب کی سماعت کی اور اس کو خاص اپنی روایت کے ذریعہ سے مغرب میں پہنچایا، مگر مغرب کے سوا یہ طریقۂ روایت عام طور پر نہ پھیل سکا، اس لیے تمام تر دارومدار ابواسحاق ابراہیم بن سفیان کی روایت پر آ جاتا ہے۔ (مقدمہ نووی ص ۱۱)

مسلم کے شروح وغیرہ:

صحیح مسلم کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بھی ہوسکتا ہے کہ تعلیقات اور شروح کے علاوہ اہل علم کے ایک بہت بڑے گروہ نے جن میں وہ اصحاب بھی شامل ہیں، جنہوں نے مسلم کے اکثر شیوخ کی آنکھیں دیکھیں تھیں، مسلم کے طرز پر نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں اور مسلم کی احادیث کو خاص اپنی اسانید سے جمع کیا، ان کتابوں میں اگرچہ مسلم کی خصوصیتیں نہ پیدا ہوسکیں تاہم چونکہ اسی پیمانہ پر لکھی گئی تھیں، اس لیے صحت اور قطعیت کی جھلک ان میں بھی نظر آتی ہے اور اسی کے ساتھ چونکہ وہ لوگ اپنی خاص خاص اسانید سے روایتیں کرتے ہیں، اس لیے روایت کے متعدد طرق پیدا ہو جاتے ہیں اور اس ذریعہ سے علو اسناد کے ساتھ احادیث میں نہایت قوت آ جاتی ہے، چنانچہ ان میں چند کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

۱) تخریج ابی جعفر احمد بن حمدان بن علی النیشافوری المتوفی ۳۱۱ھ
۲) تخریج ابی نصر محمد بن محمد الطوسی الشافعی المتوفی ۳۴۴ھ
۳) مسند الصحیح لابی بکر محمد بن محمد بن رجا النیشافوری الاسفرائینی المتوفی ۲۸۶ھ
۴) مختصر المسند الصحیح علی مسلم للحافظ ابی عوانہ یعقوب بن اسحاق الاسفرائینی المتوفی ۳۱۶ھ
۵) تخریج ابی حامد احمد بن محمد الشاز کی الفقیہ الشافعی الھروی المتوفی ۳۰۵ھ
۶) مسند صحیح لابی بکر محمد بن عبداللہ الجوزقی النیشافوری الشافعی المتوفی ۳۸۸ھ
۷) المسند المستخرج علی کتاب مسلم للحافظ ابی نعیم احمد بن عبداللہ الاصبھانی المتوفی ۴۳۰ھ
۸) المخرج علی صحیح مسلم لابی الولید حسان بن محمد القرشی الفقیہ الشافعی ۳۴۹ھ۔

(مقدمہ نووی ص ۲۲ و ۲۷)

شروح کی تعداد ان کتابوں سے بھی زیادہ ہے اور ان میں بعض شرحیں قاضی عیاض اور امام جلال الدین سیوطی جیسے ائمہ فن کے قلم سے نکلی ہیں لیکن آج کل عام طور پر شیخ محی الدین نووی کی شرح زیادہ مشہور اور عام طور پر متداول ہے، شروح کی

Marfat.com

کثرت کے ساتھ شراح کے سلسلے میں شافعی، مالکی، حنفی، غرض ہر مذہب کے لوگ داخل ہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ ہر فرقہ بلاتخصیص مذہب مسلم کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ (اس سلسلہ میں مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کی فتح الملہم بھی قابل ذکر ہے)

مسلم پر اعتراضات: اہل فن نے تنقیدی حیثیت سے مسلم پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں، وہ اگرچہ اس کی خوبیوں کے مقابل میں اس قدر کم وقعت اور بے حقیقت ہیں کہ ان کی طرف خیال بھی نہیں مائل ہو سکتا تاہم چونکہ اس سے اس امر کا انداز ہوگا کہ مسلم کی صحت اور خصوصیات کے مقابل میں جب اس زمانہ میں اس سے زیادہ نہ ہو سکا، تو اب اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا، اس لیے ہم خاص طور پر ان کا ذکر کرتے ہیں۔

مسلم پر ایک عام اعتراض جس میں امام بخاری بھی شامل ہیں، یہ ہے کہ امام مسلم اور بخاری نے بہت سی حدیثوں کو چھوڑ دیا جن کے راویوں کی سند سے وہ خود صحیحین میں روایت کرتے ہیں، یہاں تک کہ اکثر ان حدیثوں سے بھی اعراض کر گئے ہیں، جن کو صحابہ کی ایک جماعت نے خود آنحضرت ﷺ سے روایت کیا تھا اور صحابہؓ کے بعد وہ حدیثیں نہایت صحیح طور پر مروی ہوئیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ صحیفہ ابن ہمام کو یہ دونوں بزرگ بالاتفاق صحیح تسلیم کرتے ہیں لیکن روایتوں میں خاص خاص حدیثیں منتخب کر لیتے ہیں، حالانکہ صحت اور قطعیت میں وہ تمام مساوی ہیں، اس لحاظ سے بخاری اور مسلم کو احادیث صحیحہ کا کامل مجموعہ نہیں کہا جا سکتا، اس کے علاوہ مسلم نے ضعفا اور طبقہ ثانیہ کے رواۃ سے بھی روایتیں کی ہیں، حالانکہ صحیح مسلم میں طبقہ اولیٰ کی روایتوں کا التزام کیا گیا ہے۔ (مقدمہ نووی ص ۲۴)

امام ابوالحسن دارقطنی نے خاص اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام الاستدراکات والتتبع ہے، اس میں انہوں نے استقراء کر کے صحیحین کی ان روایتوں کی تعداد دو سو بتائی ہے (مقدمہ نووی ص ۲۷) لیکن یہ اعتراضات درحقیقت محض عامیانہ اعتراضات ہیں کیونکہ بخاری اور مسلم کو اگر احادیث صحیحہ کا مجموعہ تسلیم کیا گیا ہے تو صرف اس بنا پر تسلیم کیا گیا ہے کہ ان میں جو حدیثیں درج ہیں وہ تمام صحیح اور منتخ ہیں، اس لیے اگر بہت سی صحیح حدیثیں، ان کتابوں میں نہ درج ہو سکیں تو ان پر کوئی الزام نہیں آسکتا کہ ان میں تمام صحیح حدیثوں کا حصر مقصود نہیں، اسی طرح مسلم پر ضعف رواۃ اور عدم صحت کا الزام ہی نہیں دیا جا سکتا کیونکہ انہوں نے اس قسم کی روایتوں کو متابعات اور شواہد کے سلسلہ میں قوت اسناد کے لیے درج کر دیا ہے، اس لیے اس ذریعہ سے اصل حدیث پر کوئی حرف نہیں آسکتا اور اس کے ساتھ اکثر راویوں کا ضعف امام صاحب کی روایت کے بعد ظاہر ہوا ہے، چنانچہ احمد بن عبدالرحمٰن بن وہب اسی قسم کے راوی ہیں، اس لیے اس ضعف کا اثر خود امام صاحب کی روایت پر نہیں پڑ سکتا۔

ان اعتراضات سے قطع نظر کر کے جو بات خاص لحاظ کے قابل ہے، وہ یہ ہے کہ معنعن روایتوں کے متعلق اگرچہ امام صاحب کا مذہب صحیح نہیں، تاہم اس کا اثر خود ان کی کتاب پر کچھ نہیں پڑ سکتا، کیونکہ طرق روایت کی کثرت سے صحیح مسلم میں کوئی ایسی حدیث نہیں مل سکتی جس میں اس غلط اصول پر عمل کیا گیا ہو، چنانچہ نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

وان کنا لا نحکم علی مسلم بعمله فی صحیحه بهذا المذهب لکونه یجمع طرقا کثیرة یتعذر معها وجود هذا الحکم الذی جوزه (مقدمہ نووی ص ۱۴)

بہر حال ان معمولی اعتراضات کی بنا پر مسلم کی صحت، تنقید اور احتیاط کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

Marfat.com

امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۷۳ھ)

نام ونسب:

محمد نام، ابوعبداللہ کنیت، ابن ماجہ لقب اور سلسلۂ نسب یہ ہے۔ محمد بن یزید بن عبداللہ۔ (بستان المحدثین ص ۱۱۲)
ماجہ کو بعض لوگوں نے آپ کے دادا اور بعض نے آپ کی ماں کا نام بتایا ہے لیکن علمائے محققین کے نزدیک آپ کے والد کا لقب تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

"ماجہ لقب پدر ابوعبداللہ است نہ لقب جد او نہ نام مادر او۔"

قزوین کے مشہور مؤرخ خلیلی کا بیان ہے کہ "ماجہ یزید کا عرف تھا" اور محدث رافعی لکھتے ہیں "ان کا نام محمد بن یزید ہے اور ماجہ یزید کا لقب اور ان کا شجرۂ نسب اس طرح بھی بیان کیا جاتا ہے "محمد بن یزید بن ماجہ" مگر پہلی بات زیادہ ثابت ہے۔"
(عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۲۳ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۲ وتہذیب ج ۹ ص ۵۳۲)

ولادت:

ان کا خود بیان ہے کہ میں ۲۰۹ھ میں پیدا ہوا۔ (وفیات الاعیان ابن خلکان ج ۲ ص ۲۷۳ وشروط الائمۃ الستہ ص ۹)

خاندان ووطن:

ماجہ سے جو دراصل ماہ یا ماہچہ کا معرب ہے، ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابن ماجہ عجمی نژاد تھے لیکن عرب کے مشہور قبیلہ ربیعہ سے ان کا رشتۂ موالات تھا، اس لیے ربعی اور مولیٰ ربیعہ کہلاتے ہیں، عراق، عجم وایران کے مشہور اور مردم خیز شہر قزوین کو آپ کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے، اس نسبت سے آپ قزوینی کہے جاتے ہیں۔
(وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۸۴، المنتظم ابن جوزی ج ۵ ص ۹۰)

اساتذہ اور شیوخ:

ان کے شیوخ کی تعداد بکثرت ہے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تین سے زیادہ شیوخ سے استفادہ کیا تھا، امام مالک اور لیث کے تلامذہ سے بھی آپ کو روایت کرنے کا شرف حاصل ہے، حافظ ابوالقاسم علی بن حسن متوفی ۵۷۱ھ نے ائمہ صحاح کے شیوخ پر ایک مستقل رسالہ تحریر کیا تھا، اس میں ابن ماجہ کے اساتذہ کا بھی ذکر ہے، چند مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں۔
ابراہیم بن منذر حزامی م ۲۳۶ھ، ابوبکر ابن ابی شیبہ م ۲۳۵ھ، جبارہ بن مغلس م ۲۴۱ھ، حمدون بن عمارہ بغدادی،

Marfat.com

داؤد بن رشید م ۲۳۹ھ، سہل بن اسحاق بن ابراہیم واسطی، عبداللہ بن محمد معروف بحافظ ابوبکر بن ابی الدنیا بغدادی، عبداللہ بن معاویہ م ۲۴۳ھ، علی بن حسن جرشی، علی بن سعید نسائی، محمد بن احمد جوزجانی، محمد بن رمح م ۲۴۲ھ، محمد بن سعید بغدادی، محمد بن عبداللہ بن نمیر م ۲۳۴ھ، ابوجعفر محمد بن ہارون بغدادی اور ہشام بن عمار م ۲۴۵ھ۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۰ و تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۱)

تلامذہ:

ابن ماجہ کے بعض مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن دینار جرشی، احمد بن ابراہیم قزوینی، ابوالطیب احمد بن روح شعرانی، احمد بن محمد مدنی، اسحاق بن محمد قزوینی، جعفر بن ادریس، ابوبکر حامد ابہری، حسین بن علی، سعدون، سلیمان بن یزید قزوینی، ابوالحسن علی بن ابراہیم قطان قزوینی، علی بن سعید غدالی، محمد بن عیسیٰ صفار۔ (ایضاً)

رحلت وسفر:

امام ابن ماجہ کے زمانہ میں محدثین اطراف عالم میں پھیلے ہوئے تھے، اس لیے انہوں نے حصول حدیث کے لیے مختلف ملکوں کا سفر کیا، خراسان، عراق، حجاز، مصر، شام، بصرہ، کوفہ، مکہ، رے اور بغداد وغیرہ کی تصریح کتابوں میں موجود ہے، شروع میں اکیس، بائیس سال کی عمر تک اپنے وطن قزوین ہی میں جو خود علم وفن کا گہوارہ اور علماء محدثین کا بڑا مرکز تھا، حدیث اور دوسرے علوم کی تکمیل فرماتے رہے، ۲۳۰ھ میں علم کی تلاش وجستجو میں اپنے وطن سے باہر نکلے۔

(تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۰ و تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۱ و خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۳۴)

حدیث میں امتیاز:

انہوں نے جب آنکھیں کھولیں تو اس وقت ہر طرف حدیث کے درس وتدریس اور اس کی کتابت وتحریر کا کام سرگرمی سے جاری تھا اور اسی کی طلب وتکمیل کو فضیلت وکمال کا اصلی معیار خیال کیا جاتا تھا، اس لئے ان کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بھی یہی فن بنا اور اکابر حفاظ ومحدثین کی کثرت کے باوجود انہوں نے اس میں اتنا امتیاز وکمال اور ایسی شہرت حاصل کی کہ ان کی علمی جلالت کا سکہ بیٹھ گیا اور بڑے بڑے ائمہ فن ان کی عظمت وبرتری کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے، اس کا اندازہ درج ذیل اقوال سے ہوتا ہے۔

اعتراف کمال:

حافظ ابویعلی خلیل فرماتے ہیں، وہ ایک بلند پایہ معتبر اور لائق حجت محدث تھے، ان کی عظمت وثقاہت پر اتفاق ہے، ان کو فن حدیث سے پوری واقفیت تھی اور وہ اس کے جلیل القدر حافظ تھے، ابوالقاسم رافعی فرماتے ہیں، کہ "ائمہ مسلمین میں ابن ماجہ بھی ایک بڑے معتبر امام ہیں، ان کی قبولیت پر سب کا اتفاق ہے" علامہ ابن جوزی تحریر فرماتے ہیں "وہ حدیث وتاریخ اور تفسیر کے ممتاز ماہر تھے" علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں "وہ فن حدیث کے امام اور اس کے متعلقات پر بڑا عبور رکھتے تھے" علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ "ابن ماجہ عظیم الشان حافظ وضابط صادق القول اور وسیع العلم تھے" علامہ ابن اثیر قمطراز ہیں

Marfat.com

کہ وہ ذی عقل صاحب علم اور امام حدیث تھے، جمال الدین تغری بردی لکھتے ہیں ''ابن ماجہ امام، حافظ، حجت اور ناقد حدیث تھے۔۔۔۔ان کو متعدد فنون میں مہارت حاصل تھی'' ابن ناصر الدین، ارشاد فرماتے ہیں ''مشہور علمائے اسلام میں ایک ابن ماجہ بھی ہیں۔۔۔۔۔وہ حدیثوں کے حافظ اور اس میں نہایت معتبر اور بلند پایہ شخص تھے'' حافظ ابن حجر عسقلانی کا بیان ہے کہ ''وہ صاحب سنن، حافظ حدیث اور امام فن تھے''۔ (وفیات الاعیان خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۱، المنتظم فی اخبار الملوک والامم ج ۵ ص ۹۰ کامل ابن اثیر مطبوعہ لیڈن ج ۷ ص ۲۹۸ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۱۶۴ وغیرہ)

ان اقوال سے ان کے محدثانہ کمال وعظمت کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

فقہی مسلک:

ان کے فقہی مسلک کے بارے میں یقینی طور سے کوئی بات نہیں کہی جاسکتی، گمان غالب یہ ہے کہ وہ بھی عام محدثین کی طرح کسی خاص مذہب فقہ سے وابستہ نہ رہے ہوں گے، البتہ اہل عراق کے مقابلہ میں ان کا رجحان اہل حجاز کی طرف زیادہ تھا، اس کا اندازہ ان کی سنن سے بھی ہوتا ہے، اسی بنا پر بعض علما ان کو حنبلی اور شافعی کہہ دیتے ہیں جو صحیح نہیں ہے، علامہ ابن طاہر جزائری فرماتے ہیں ''ابن ماجہ وغیرہ علمائے حدیث ائمہ مجتہدین میں سے کسی کے مقلد نہیں تھے، البتہ فقہا محدثین امام شافعی، احمد اور اسحاق بن راہویہ وغیرہ کے قول کی طرف میلان رکھتے تھے''۔ (توجیہ النظر ص ۱۸۵)

اعمال واخلاق:

امام ابن ماجہ کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں، اس لئے ان کے اعمال واخلاق کے بارہ میں کوئی تفصیل نہیں بیان کی جاسکتی، حافظ ابن کثیر نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ ''وہ علم وفضل کی طرح تدین وتقویٰ اور زہد وصلاح کے بھی جامع تھے، احکام شریعت کی شدت سے پابندی کرتے تھے، اور اصول وفروغ میں پورے طور پر متبع سنت تھے، اس پر خود ان کی سنن شاہد ہے''۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۲)

متعلقین اور اہل خاندان:

ان کے خاندانی حالات اور ازواج واولاد کی بھی تفصیل نہیں ملتی، صرف ان کے ایک صاحبزادے عبداللہ اور دو بھائیوں ابوبکر اور ابوعبداللہ کا محمد بن طاہر نے ان کی وفات اور تجہیز وتکفین کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے۔ (شروط الائمۃ الستہ ص ۹)

وفات:

امام ابن ماجہ نے دوشنبہ ۲۲ رمضان المبارک ۲۷۳ھ کو ۶۴ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا دوسرے دن سہ شنبہ کو تجہیز وتکفین ہوئی، (ایضا) ایک روایت یہ بھی ہے کہ ۲۷۵ھ میں وفات پائی، ان کے سانحہ وفات پر بعض شعرا نے نہایت پر درد مرثیے کہے، محمد بن اسود قزوینی کے مرثیہ کا پہلا شعر یہ ہے:

لقد اوھی دعائم عرش علم — وضعضع رکنہ فقد ابن ماجہ

ترجمہ: ابن ماجہ کی وفات سے علم کے پایہ تخت کے ستون ڈھ گئے۔

Marfat.com

یحییٰ بن زکریا طرائفی کہتا ہے:

ایا قبر ابن ماجة غثت قطرا ملثا بالغداة و بالعشی

(تہذیب ج ۹ ص ۵۳۱)

ترجمہ: اے ابن ماجہ کی قبر تو صبح و شام باران رحمت سے سیراب ہو۔

تصنیفات:

ابن ماجہ کی علمی و تصنیفی یادگاروں میں تین اہم اور مشہور تصنیفات ہیں۔

تفسیر:

اس کی اہمیت کا اندازہ علامہ ابن کثیر کے اس بیان سے ہوتا ہے:

ولا بن ماجة تفسير حافل۔

یعنی ابن ماجہ کی ایک ضخیم و جامع تفسیر ہے۔

علامہ سیوطی نے دور صحابہؓ و تابعینؒ کے بعد تفسیروں کا تذکرہ کرنے کے بعد تفسیر ابن جریر کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک اہم ماثوری و منقولی تفسیر اور ابن جریر کی طرح اس میں بھی احادیث و آثار صحابہؓ و تابعینؒ کو بالاسناد نقل کیا گیا تھا۔

تاریخ:

ان کو تاریخ میں بھی درک تھا اور تاریخ میں بھی کوئی کتاب لکھی تھی، ابن خلکان نے تاریخ ملیح اور حافظ ابن کثیر نے تاریخ کامل کے وصف سے اس کا ذکر کیا ہے، حافظ ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ "میری نظر سے قزوین میں ابن ماجہ کی تاریخ گزری تھی، یہ دراصل عہد صحابہ سے لے کر مصنف کے زمانہ تک تاریخ اور بلاد اسلامیہ اور روایان حدیث کے حالات پر مشتمل ہے" (تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۲ و شروط الائمہ الستہ ص ۹) اس سے اس تاریخ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، مگر افسوس ہے کہ یہ دستبرد زمانہ سے معدوم ہوگئی۔

سنن:

ابن ماجہ کا سب سے بڑا علمی و تصنیفی اور دینی کارنامہ ان کی ممتاز اور شہرۂ آفاق تصنیف سنن ہے، اس کی بدولت ان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، موجودہ کتب حدیث میں یہ ایک اہم اور متداول کتاب خیال کی جاتی ہے اور اکثر مدارس کے نصاب میں بھی شامل ہے۔

ترتیب و تعداد احادیث:

عام کتب سنن کی طرح اس میں بھی ایمانیات سے وصایا تک کے جملہ ابواب فقہی ترتیب کے مطابق درج ہیں اور یہ ۳۲ کتب، ۱۵۰۰ ابواب اور چار ہزار حدیثوں پر مشتمل ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۰ و بستان المحدثین ص ۱۱۲ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۲)

Marfat.com

رواۃ:

رافعی کا بیان ہے کہ ابن ماجہ سے ان کے جن تلامذہ نے سنن کی روایت کی ہے ان میں چار اشخاص زیادہ مشہور ہیں:
۱۔ ابوالحسن قطان، ۲۔ سلیمان بن یزید، ۳۔ ابوجعفر محمد بن عیسیٰ، ۴۔ ابوبکر حامد ابہری۔ حافظ ابن حجر نے اس فہرست میں دو ناموں کا اور اضافہ کیا ہے سعدون، ابراہیم بن دینار۔ (تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۲) ان تمام رواۃ میں حافظ ابوالحسن قطان کی روایت کو زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

"ابوالحسن قطان کہ صاحب روایت سنن اوست از جملہ شاگردان رشید اوست۔" (بستان المحدثین ص ۱۱۲)

سنن کا جو نسخہ ابوالحسن سے مروی ہے اس کی بہت سی روایتیں خود ان کی سند سے بھی منقول ہیں۔

اہمیت:

سنن ابن ماجہ، حدیث کی ان چھ مشہور اور معتبر کتابوں میں شمار کی جاتی ہے جو صحاح ستہ کہلاتی ہیں، علمائے فن کو اعتراف ہے کہ "یہ اسلامیات کی عظیم ترین اور حدیث کی امہات کتب میں ہے" حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ "سنن سے ابن ماجہ کے علمی تبحر اور کثرت معلومات کا پتہ چلتا ہے" حافظ ابوذرعہ جیسے باکمال محدث کا ارشاد ہے کہ "اگر یہ لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچی تو حدیث کی سب یا اکثر کتابیں بالکل معطل ہو جائیں گی" حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ "یہ نہایت جامع وجید کتاب اور بے شمار ابواب وغرائب پر مشتمل ہے" "سنن ابن ماجہ کی اس عظمت واہمیت کی بنا پر اس کو ہر زمانہ میں نہایت مستند اور قابل حجت خیال کیا گیا ہے، رافعی فرماتے ہیں "محدثین نے اس کو صحیحین اور سنن ابی داؤد وسنن نسائی کے ساتھ شامل کیا ہے اور اس کے مرویات کو حجت ومستند قرار دیا ہے۔" (شذرات ج ۲ ص ۱۶۴)

خصوصیات:

سنن ابن ماجہ کو صحاح میں آخری درجہ پر رکھا گیا ہے تاہم اس میں بھی بعض اہم خصوصیات پائی جاتی ہیں۔
۱۔ اس میں بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جن سے صحاح ستہ کی دوسری کتابیں خالی ہیں، علمائے فن نے اس کی اسی خصوصیت کی بنا پر اس کو صحاح میں شامل کیا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۲ وتذکرہ ج ۲ ص ۲۱۰ وتہذیب ج ۲ ص ۵۳۱)

۲۔ حسن ترتیب وتبویب کے لحاظ سے تمام کتب حدیث اور صحاح میں اس کو امتیاز حاصل ہے، یعنی جس خوبی کے ساتھ احادیث کو ابواب کے اندر بلاتکرار، اختصار کے ساتھ اس میں نقل کیا گیا ہے، دوسری کتابیں اس سے خالی ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

"فی الواقع از حسن ترتیب وسرد احادیث بے تکرار آنچہ کہ ایں کتاب دارد ہیچ از کتب ندارد۔" (بستان ص ۱۱۲)

اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "اس مفید ترین کتاب کی تبویب فقہی اعتبار سے نہایت عمدہ ہے۔"

۳۔ عدم تکرار اور اختصار کے باوجود سنن کی ابن ماجہ نہایت جامع کتاب ہے اور دوسری کتابوں کی بہ نسبت زیادہ مسائل ومعلومات پر مشتمل ہے، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں، ابن ماجہ کی کتاب سنن واحکام کی حیثیت سے بہت عمدہ اور جامع ہے، غالباً اسی خوبی کی بنا پر حافظ ابوزرعہ نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اس کے سامنے حدیث کے دوسرے جوامع اور مصنفات بے کار ہو

Marfat.com

جائیں گے، ان کا یہ خیال بڑی حد تک صحیح ثابت ہوا، چنانچہ حدیث کی بہت سی کتابیں جو صحت و جودت کے لحاظ سے اس سے زیادہ اہم اور بلند پایہ ہیں لیکن ان کو اس کے جیسی شہرت و مقبولیت نہیں حاصل ہو سکی، حضرت شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ "اگر کسی شخص کو بہت زیادہ متون پر مشتمل کتاب کی تلاش ہو تو اس کو سنن ابن ماجہ کا مطالعہ کرنا چاہیے، اس وصف میں وہ دوسری کتب حدیث سے منفرد و ممتاز ہے"۔ (حواشی سعدی ص ۱۵)

۴۔ سنن ابن ماجہ میں ۵ ثلاثی روایتیں ہیں، اس خصوصیت میں اس کو صحیح بخاری کے سوا تمام کتب صحاح پر فوقیت حاصل ہے۔

۵۔ کتب حدیث کی عام خصوصیت یعنی متعدد اور گوناگوں تشریحات اور حدیثوں کے متعلق مختلف قسم کی وضاحتیں اس میں بھی موجود ہیں بعض حدیثوں کے بارے میں اس قسم کی تصریح بھی ہے کہ "یہ فلاں شہر والوں کی حدیث ہے"۔

کیا سنن ابن ماجہ صحاح ستہ میں شامل نہیں ہے؟

اگرچہ جمہور اور متاخرین علما کے نزدیک یہ صحاح ستہ میں شامل ہے تاہم بعض لوگوں نے اس کے بجائے موطا امام مالک اور سنن دارمی کو یہ درجہ دیا ہے، اس لیے اس مسئلہ کی مختصر وضاحت کی جاتی ہے:

شروع میں صرف صحیحین اور سنن ابی داؤد و سنن نسائی کو حدیث کی اہم ترین کتابیں خیال کیا جاتا تھا، حافظ ابن السکن اور حافظ ابن مندہ وغیرہ سے اس کی تصریح منقول ہے، (شروط الائمۃ الستہ ص ۸) اس کے بعد حافظ ابو طاہر سلفی نے جامع ترمذی کو بھی ان کتابوں میں شامل کر لیا، ساتویں صدی ہجری کے نامور محدثین میں علامہ ابن صلاح اور علامہ نووی نے بھی ان ہی پانچوں مصنفین کی وفیات ذکر کی ہیں لیکن غالباً پہلی مرتبہ محمد بن طاہر مقدسی م ۵۰۷ھ نے جو شروط الائمۃ الستہ اور اطراف الکتب الستہ کے مصنف ہیں، امام ابن ماجہ کو بھی مصنفین صحاح کے زمرہ میں شامل کر لیا اور حافظ عبدالغنی مقدسی م ۶۰۰ھ نے پانچوں کتابوں کی طرح اس کے رجال کو بھی مدون کیا، ان کے بعد جمہور متاخرین کے نزدیک یہ روایت چل نکلی، علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ "ابن طاہر کے بعد مصنفین اطراف و رجال نے ان کی متابعت کی" (تدریب الراوی ص ۳۰) اسی بنا پر ساتویں صدی ہجری کے نامور محدث نووی کے متعلق جنہوں نے ابن ماجہ کی سنن کو نظر انداز کر دیا تھا حیرت ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں (ایضا) "مصنف نے سنن ابن ماجہ کو صحاح میں داخل نہیں کیا حالانکہ خود ان کے عہد میں اور اس کے بعد کا چھا اہم اور بنیادی کتابوں میں شمار ہونا شہرت پذیر ہو چکا تھا" اس سلسلہ میں دوسرے علما اور ائمہ فن کے اقوال یہ ہیں:

علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ "صحاح ستہ کی ایک کتاب سنن ابن ماجہ بھی ہے" ابن عماد نے بھی اس قول کو نقل کیا ہے، علامہ ابن ناصر الدین فرماتے ہیں "ابن ماجہ کی سنن اسلامیات کی بنیادی کتابوں میں ہے" علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں "ابن ماجہ اس سنن کے مصنف ہیں جو صحاح ستہ میں شامل ہے۔" ابو القاسم رافعی فرماتے ہیں "محدثین نے سنن ابن ماجہ کو صحیحین اور سنن ابی داؤد و سنن نسائی کے ساتھ شامل کیا ہے" صاحب مرآۃ الجنان لکھتے ہیں "کہ ان کی کتاب ان چھ کتابوں میں سے ایک ہے جن کو بنیادی کتب اور امہات فن میں شمار کیا جاتا ہے" حافظ عبدالقادر قرشی کا بیان ہے کہ "جب محدثین کسی روایت کے خیال رواۃ الائمۃ الستہ کہتے ہیں تو اس سے امام بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کو مراد لیتے ہیں" حافظ سخاوی لکھتے ہیں "بعض علما نے سنن ابن ماجہ کو موطا پر اس لیے مقدم اور صحاح میں شامل کیا ہے کہ اس میں کتب خمسہ سے بہت سی

Marfat.com

روایتیں زیادہ ہیں" شارح سندی ارشاد فرماتے ہیں: "عام متاخرین اس بات کے حق میں ہیں کہ ان کی سنن صحاح کی چھٹی کتاب ہے" شاہ عبدالعزیز صاحب رقمطراز ہیں کہ "ابن ماجہ جن مفید اور نفع بخش کتابوں کے مصنف ہیں، ان میں یہ سنن بھی ہے جو صحاح ستہ میں ہے" نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں "شاہ عبدالحق صاحب دہلوی کا بیان ہے کہ "ابن ماجہ کی سنن کا شمار ان اہم ترین اسلامی وحدیثی کتابوں میں ہوتا ہے جن کو اصول ستہ، کتب ستہ اور صحاح ستہ کہا جاتا ہے، میں اس میں امہات ستہ کا اضافہ کرتا ہوں اور جب محدثین رواہ الجماعۃ کہتے ہیں تو اس سے یہی چھ اشخاص مراد ہوتے ہیں اور جب رواہ الاربعہ کہتے ہیں تو ان کی مراد شیخین کے بجائے، امام ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ سے ہوتی ہے۔ (تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۶۴ والباعث الحثیث ص ۹۰ ومراۃ الجنان ج ۲ ص ۸۸ ومقدمہ شرح سندی باب ذکر الدیلم وفضل قزوین فتح المغیث ص ۳۳ وبستان المحدثین ص ۱۱۲ والحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۱۱۰) دوسرے علماء تراجم وفہرست نے بھی اس کو صحاح ستہ میں شامل کیا ہے۔

(کشف الظنون ج ۲ ص ۳۴ واعلام ج ۳ ص ۱۰۰۲)

لیکن علما کی ایک جماعت کو مؤطا کو صحاح کی چھٹی کتاب ماننے پر اصرار ہے، رزین بن معاویہ عبدری م ۵۲۵ھ نے کتاب التجرید للصحاح والسنن میں کتب خمسہ اور مؤطا امام مالک کی روایتیں درج کی ہیں، ابن اثیر جزری م ۶۰۶ھ نے بھی اپنی کتاب جامع الاصول میں اسی کی تقلید کی ہے، حافظ ابوجعفر بن زبیر غرناطی کہتے ہیں "ان سب میں بہتر وہ کتابیں ہیں جن کے اعتماد پر مسلمانوں کا اتفاق ہے اور یہ وہی کتب خمسہ اور موطا ہے جو تصنیف میں ان پر مقدم اور مرتبہ میں کمتر نہیں، عبدالغنی نابغی کا بیان ہے کہ اہل مشرق کے نزدیک چھٹی کتاب سنن ابن ماجہ اور اہل مغرب کے نزدیک امام مالک کی مؤطا ہے۔

(بحوالہ ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۲۴)

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنن ابن ماجہ کے مقابلہ میں مؤطا کے ماننے والوں کی تعداد بہت کم ہے، اس لیے یہ قول مرجوح سمجھا جائے گا لیکن جہاں تک مؤطا کی صحت وجودت اور اہمیت وعظمت کا سوال ہے، اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، وہ حدیث کی طرح فقہ، آثار اور فتاوائے صحابہؓ وتابعینؒ سب کا مجموعہ ہے اور مرفوع، موقوف، مرسل ومسند ہر قسم کی روایتوں پر مشتمل ہے، اس لیے اس کی موجودہ شکل وصورت میں اس کا حدیث کی مروج ومتداول کتابوں سے مقابلہ کرنا مناسب نہیں ہے، اس کا جو مقام ومرتبہ ہے اس میں حدیث کی کوئی کتاب بھی اس کی ہمسری نہیں کرسکتی، اس کی قدامت، عظمت اور صحت کی وجہ سے اکثر محققین علمائے صحیحین پر بھی اس کو فوقیت دی ہے، خطیب کے نزدیک وہ تمام جوامع ومسانید سے بڑھ کر ہے، (تدریب الراوی ص ۳۶) شاہ ولی اللہ صاحب کا بھی یہی خیال ہے، نواب صدیق حسن خاں صاحب فرماتے ہیں "شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی اور ان لوگوں کے نزدیک جو ان کے ہمنوا ہیں، حدیث وفقہ میں صحیح ترین کتاب مؤطا ہے، پھر بخاری پھر مسلم، شاہ صاحب نے شرح مؤطا یعنی مصفی کے شروع میں روئے زمین کی تمام کتابوں پر مؤطا کی ترجیح کے سلسلہ میں بڑی لمبی بحث کی ہے اور یہی صحیح ہے۔" (مسک الختام شرح بلوغ المرام ص ۱۸)

سنن ابن ماجہ کو مؤطا پر مقدم کرنے کی وجہ اس کی مزید افادیت ہے جو بہت سی زائد حدیثوں کے درج کرنے سے اس میں پیدا ہوگئی ہے، ورنہ صحت وقوت کے اعتبار سے سنن ابن ماجہ کیا صحاح ستہ کی کوئی کتاب بھی مؤطا کے مقابلہ میں پیش نہیں کی جاسکتی۔

Marfat.com

رہا سنن دارمی کا معاملہ تو اس کے قائل صرف حافظ صلاح الدین خلیل علائی م ۷۶۱ھ ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ "اس میں ضعیف رواۃ اور شاذ و منکر روایتیں بہت کم ہیں، اس لیے سنن ابن ماجہ کے بجائے اس کو صحاح کی چھٹی کتاب قرار دینا بہتر ہے۔" (مقدمہ سنن دارمی ص ۷) حافظ ابن حجر کی جانب بھی اس قسم کا قول منسوب کیا جاتا ہے، مگر ان سے اس کے برعکس باتیں بھی منقول ہیں، محمد بن اسماعیل امیر یمانی کا بیان ہے کہ وہ مؤطا امام مالک کو صحاح ستہ میں شامل کرتے تھے، اس کے علاوہ شارح سنن علاؤالدین مغلطائی پر جن کے قول پر علامہ خلیل علائی کی رائے کی بنیاد ہے، ابن حجر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "دارمی کو مغلطائی سے پہلے کسی نے صحاح میں شامل نہیں کیا اور وہ بھی اس بنیاد پر کہ انہوں نے حافظ منذری کے قلم سے یہی لکھا دیکھا تھا۔" (تدریب الراوی ص ۵۷) حافظ ابن حجر کے ان مختلف اقوال کی بنا پر ان کو علائی کا مؤید نہیں کہا جا سکتا لیکن علائی کے قول کا دارومدار مغلطائی کے ایک خیال پر مبنی ہے، جس کے متعلق محمد امیر یمانی لکھتے ہیں کہ علائی کو مغلطائی کے قول سے مغالطہ ہوا ہے حالاں کہ مغلطائی کے قول میں اس کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ وہ سنن دارمی کو صحاح ستہ میں داخل کرتے تھے، بلکہ اصلی احتمال یہ ہے کہ انہوں نے اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے کہ اس کے رجال و روایات اکثر و بیشتر صحیح ہیں، سنن ابن ماجہ پر اس کو مقدم اور اہم قرار دیا ہے۔" (ماتمس الیہ الحاجۃ ص ۳۶ و ۳۷)

بہر حال سنن دارمی کو خواہ صحت و قوت کے لحاظ سے ابن ماجہ کی سنن پر فوقیت کیوں نہ حاصل ہو لیکن تنہا اس خصوصیت کی بنا پر اس کو ابن ماجہ کی جگہ صحاح ستہ میں نہیں رکھا جا سکتا اور نہ علائی کے ایک منفرد خیال کی وجہ سے جمہور کی رائے کو مسترد کیا جا سکتا ہے۔

صحاح ستہ میں سنن ابن ماجہ کا درجہ:

ان بیانات سے اتنا تو واضح ہو گیا کہ ابن ماجہ کی سنن صحاح ستہ میں شامل ہے لیکن اس کا مرتبہ پانچوں سے کمتر ہے، شارح سندی کہتے ہیں "وہ کتب خمسہ سے کمتر ہے" ابن وزیر یمانی کا بیان ہے کہ اس کا درجہ سنن نسائی و سنن ابی داؤد کے بعد ہے لیکن یہ ترجیح مجموعی حیثیت سے ہے، یعنی اس میں دوسری کتابوں کے مقابلہ میں ضعیف روایتیں زیادہ ہیں مگر کتب خمسہ کی ہر روایت صحت کے لحاظ سے ابن ماجہ کی ہر روایت پر فوقیت نہیں رکھتی، بعض علما کا بیان ہے کہ ابن ماجہ کی بعض روایتیں صحیح بخاری کی بعض حدیثوں سے بھی اصح ہیں۔ (توضیح الافکار ج ۱ ص ۲۲۲ و ۲۲۳ بحوالہ امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۴۲)

سنن ابن ماجہ کی ضعیف و منکر روایتیں:

امام ابن ماجہ کی احتیاط اور کوشش کے باوجود سنن میں ضعیف روایتیں بھی شامل ہو گئی ہیں مگر علمائے فن کے ایک گروہ کے نزدیک ان کی تعداد بہت کم ہے، چنانچہ ابوزرعہ رازی کا بیان ہے کہ "مجھے اس میں بہت کم ایسی حدیثیں ملیں جن میں کسی قسم کا شک یا خرابی ہو، دس سے کچھ زیادہ روایتیں ایسی ہوں گی، ان کی دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے تیس سے کم حدیثوں کو ضعیف الاسناد قرار دیا، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ سنن ابن ماجہ کی تھوڑی حدیثوں کے سوا سب بہتر اور عمدہ ہیں۔"

(شروط الائمۃ الستہ ص ۹ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰ و البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۲)

مگر حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ "اس میں ضعیف روایتیں بہت زیادہ ہیں" علامہ ذہبی، حافظ ابوزرعہ کے مذکورہ بالا قول

Marfat.com

پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ۳۰ سے ان کی مراد ساقط الاسناد حدیثیں ہوں گی، ورنہ جن حدیثوں سے حجت قائم نہیں ہوتی، ان کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہے، شاید ایک ہزار کے قریب ہوں، اسی طرح علامہ سیوطی نے لکھا ہے، ابن طاہر نے ابو زرعہ سے جو روایت کی ہے وہ صحیح نہیں ہے، اس کی سند منقطع ہے، اگر اس کو محفوظ تسلیم کیا جائے تو غالباً اس سے ابوزرعہ کی مراد ساقط الاعتبار روایتیں ہوں گی، یا ان کی نظر سے اس وقت تک اس کتاب کا تھوڑا حصہ گزرا تھا، ورنہ ابوزرعہ نے سنن ابن ماجہ کی بہت ساری روایتوں کو منکر، باطل اور ساقط بتایا ہے۔''

ان اقوال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابن ماجہ میں بھی دوسری کتابوں کی طرح ضعیف روایات ہیں اور ان کی تعداد کتب خمسہ کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ ہے، اسی لیے اس کا درجہ ان کے مقابلہ میں کمتر سمجھا جاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس سے اس کی اہمیت اور عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا، کیونکہ کسی کتاب کا صحاح ستہ میں ہونا اس کی تمام روایتوں کی صحت و استناد کا ثبوت نہیں ہے بلکہ مجموعی حیثیت کے اعتبار سے ان کو صحاح میں شامل کیا گیا ہے، شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں ''ان چاروں کتابوں (ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ) میں حدیث کی جملہ اقسام، یعنی صحیح، حسن اور ضعیف ہر قسم کی روایتیں پائی جاتی ہیں اور ان کو صحاح کا نام علی وجہ التغلیب دیا جاتا ہے۔'' (تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۱ و توضیح الافکار ص ۲۲۳ بحوالہ امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۳۹ و مقدمہ زہر الربی علی المجتبیٰ ص ۸ و حواشی سعدی ص ۱۵)

۲۔ محدثین اور علماء رجال نے اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ سنن کے اندر منکر، واہی اور موضوع روایتیں بھی ہیں، صرف حافظ ابن حجر کی رائے ہے کہ اس کی منکر حدیثوں کی تعداد زیادہ ہے، ورنہ سیوطی اور ذہبی کے گزشتہ بیانوں سے ظاہر ہے کہ ساقط الاعتبار روایتوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، حافظ ذہبی نے تذکرہ میں لکھا ہے کہ سنن ابن ماجہ بہترین کتاب ہے، کاش اس کو چند واہی حدیثیں جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے خراب نہ کردیتیں، علامہ ابن جوزی نے ۳۴ حدیثوں کو موضوع قرار دیا ہے، مولانا عبدالرشید نعمانی نے ان سب کو اور آٹھ مزید روایات یعنی کل ۴۲ حدیثیں نقل کر کے ان پر فنی حیثیت سے بحث کی ہے۔ (تہذیب ج ۹ ص ۵۳۱، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۰ ما تمس الیہ الحاجۃ ص ۳۸، ۴۵)

اس تفصیل سے اگرچہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سنن میں منکر روایتیں بھی ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور نہ اتنے بڑے ذخیرہ میں چند منکر و واہی روایات کا پایا جانا کوئی خاص عیب ہے۔

۳۔ اس سلسلہ کی آخری مگر اہم بحث یہ ہے کہ ''ابن ماجہ کے تفردات ضعیف ہیں۔'' حافظ ابن حجر نے ابوالحجاج مزی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ''ابن ماجہ کی وہ سب روایتیں ضعیف ہیں جن میں وہ ائمہ خمسہ سے منفرد ہیں لیکن حافظ ابن حجر کو خود اس اصول و کلیہ سے اتفاق نہیں ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''اگرچہ سنن ابن ماجہ میں ضعیف و منکر روایتیں زیادہ ہیں لیکن میرے استقصاء و تتبع کے مطابق ان کے تفردات کے بارے میں مطلقاً یہ حکم لگانا درست نہیں ہے۔ مزی کے قول کو رجال پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے، حدیثوں پر اس کا اطلاق صحیح نہیں ہے، کیونکہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ جن روایتوں میں ابن ماجہ منفرد ہیں ان میں صحیح و حسن ہر قسم کی حدیثیں ہیں'' (تہذیب ج ۹ ص ۵۳۱) شارح سندی کا بیان ہے کہ ''سنن ابن ماجہ میں صحاح خمسہ پر زوائد بہت ہیں اور مشہور یہ ہے کہ ان کے تفردات ضعیف ہوا کرتے ہیں حالانکہ یہ کلیہ صحیح نہیں ہے'' مولانا عبدالرشید نعمانی نے حافظ ابن حجر کے قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رجال کے متعلق بھی کلی طور پر یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا اور اس کی چند مثالیں دے کر تردید کی

Marfat.com

ہے۔ (ما تمس الیہ الحاجۃ ص ۳۸)

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ ضعیف اور بعض منکر روایتوں کے باوجود سنن ابن ماجہ صحاح ستہ میں شامل ہے اور جن حدیثوں میں انہوں نے ائمہ خمسہ سے تفرد کیا ہے ان میں صحیح، حسن اور ضعیف ہر قسم کی حدیثیں شامل ہیں۔

شروح وتعلیقات:

سنن ابن ماجہ کے ساتھ علما نے بڑا اعتنا کیا اور اس کے متعدد حواشی وشروح لکھے جن کی تعداد نسائی کے شروح وحواشی سے زیادہ ہے۔

۱۔ شرح سنن ابن ماجہ: سب سے پہلے علاؤالدین مغلطائی بن قلیج م ۷۶۲ھ نے سنن ابن ماجہ کی ایک جامع شرح لکھنا شروع کی تھی، مگر وہ اس کو مکمل نہ کر سکے، یہ نامکمل شرح پانچ جلدوں میں ہے، (کشف الظنون ج ۲ ص ۳۴) اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ ٹونک میں موجود ہے۔ (امام ابن ماجہ اور علم حدیث ۲۴۵)

۲۔ ما تمس الیہ الحاجۃ علیٰ سنن ابن ماجہ: شیخ سراج الدین عمر بن علی بن ملقن م ۸۰۴ھ نے سنن کی ان حدیثوں کی جو کتب خمسہ میں نہیں ہیں، ۸ جلدوں میں ایک مفصل شرح لکھی۔

۳۔ شرح سنن ابن ماجہ: ابن رجب زبیری کی یہ شرح نایاب ہے، شیخ ابوالحسن سندی نے اپنے حواشی میں اس کا ذکر کیا ہے۔

۴۔ الدیباجہ فی شرح سنن ابن ماجہ: شیخ کمال الدین محمد بن موسیٰ دمیری م ۸۰۸ھ نے ۵ جلدوں میں شرح لکھی مگر تسوید وتبییض سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔

۵۔ شرح سنن ابن ماجہ: ابن سبط عجمی بہ برہان الدین ابراہیم بن محمد حلبی م ۸۴۱ھ کی سنن پر یہ ایک لطیف تعلیق ہے۔

۶۔ مصباح الزجاجہ: علامہ جلال الدین سیوطی م ۹۱۱ھ کا مختصر حاشیہ جو نہایت مقبول ومتداول اور سنن کے ساتھ طبع ہو چکا ہے، مصر سے اس کا اختصار بھی شائع ہوا ہے۔

۷۔ شرح سنن ابن ماجہ: ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندی م ۱۱۳۸ھ نے صحاح کی دوسری کتابوں کی طرح اس کا بھی حاشیہ لکھا جو سنن کے ساتھ چھپ کر بہت مقبول ہوا، اس میں مشکل اور غریب الفاظ اور اعراب کی وضاحت کا بڑا اہتمام کیا گیا ہے۔

(کشف الظنون ج ۲ ص ۳۴ والضوء اللامع ج ۱ ص ۱۴۱)

۸۔ شرح انجاح الحاجۃ: شیخ عبدالغنی بن ابوسعید مجددی دہلوی م ۱۲۹۵ھ کی یہ مختصر مگر جامع شرح ہے اور سنن کے ساتھ حاشیہ پر دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

۹۔ حاشیہ بر سنن ابن ماجہ: مولانا فخر الحسن گنگوہی نے اس تعلیق کے اندر علامہ سیوطی اور مولانا مجددی دونوں شرحوں کو مفید اضافہ کے ساتھ جمع کیا ہے جو کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔

۱۰۔ مفتاح الحاجۃ: یہ شیخ محمد علوی کا حاشیہ ہے جو اصح المطابع لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔

۱۱۔ رفع العجاجہ عن سنن ابن ماجہ: مشہور عالم اور مترجم حدیث مولانا وحید الزماں، وقار نواز جنگ نے سنن ابن ماجہ کا اردو ترجمہ اور اس کی مختصر شرح اردو میں لکھی ہے، جو متوسط تقطیع کی تین ضخیم جلدوں میں مطبع صدیقی لاہور سے ۱۳۱۰ھ میں چھپ

Marfat.com

چکی ہے۔

شرحوں اور حواشی کے علاوہ سنن کے زوائد، رجال اور اس کی دوسری حیثیتوں پر بھی کام کئے گئے ہیں۔

۱۲۔ المجرد فی اسماء رجال ابن ماجہ: علامہ ذہبی نے اس میں ابن ماجہ کے ان رواۃ کا تذکرہ کیا ہے، جن سے صحیحین میں کوئی روایت درج نہیں ہے، اس کا قلمی نسخہ دمشق کے کتب خانہ ظاہریہ میں بیس ورقوں میں موجود ہے۔

۱۳۔ زوائد ابن ماجہ: یہ حافظ شہاب الدین بوصیری م ۸۴۰ھ کی تالیف ہے، اس میں ہر روایت کے اسناد کی قوت و ضعف کو بیان کیا گیا ہے، یہ کتاب اگرچہ ناپید ہے لیکن علامہ سندی نے اپنی شرح میں اس کی اہم اور ضروری باتیں نقل کر دی ہیں۔

۱۴۔ ماتمس الیہ الحاجہ لمن یطالع سنن ابن ماجہ۔۔۔: ابن ماجہ اور علم حدیث، یہ دونوں مفید کتابیں مولانا عبدالرشید نعمانی نے ابن ماجہ اور علم حدیث عربی اور اردو میں لکھی ہیں، ان میں ابن ماجہ کے حالات و سوانح اور سنن پر مبسوط تبصرہ کے علاوہ، حدیث کی حجیت، تاریخ و تدوین اور ائمہ اربعہ اور مصنفین صحاح کے شرائط اور امام ابن ماجہ کے عہد تک کے بعض اکابر محدثین کا مختصر تذکرہ بھی ہے۔

Marfat.com

امام ابوداؤد سجستانی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۷۵ھ)

نام ونسب:

سلیمان نام، ابوداؤد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: سلیمان بن اشعث بن اسحاق بن بشیر بن شداد بن عمرو بن عمران۔
(تاریخ بغداد ج ۹ ص ۵۵ وکتاب الانساب تا ورق ۲۹۲ وتاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۸۱)

بعض مؤرخین سے نسب نامہ میں معمولی اختلاف بھی منقول ہے۔

امام کے جداعلیٰ عمران کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے اور اسی میں ان کی شہادت ہوئی۔ (کتاب الانساب ورق ۲۹۲ وتہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۶۹)

ولادت وخاندان:

امام ابوداؤد کا خود بیان ہے کہ وہ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے تھے، (تاریخ بغداد ج ۹ ص ۵۶) اور مشہور قبیلہ ازد سے ان کا نسبی تعلق تھا، اس لیے ازدی کہلاتے ہیں۔

وطن:

خراسان کے مشہور علاقہ سجستان (سیستان) کو امام صاحب کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے لیکن بعض لوگوں نے بصرہ کے ایک گاؤں سجستان یا سجستانہ کو آپ کا وطن بتایا ہے جو صحیح نہیں، محمد بن طاہر مقدسی لکھتے ہیں ''میں نے محمد بن نصر، قل ھو اللہ خان سے سنا کہ امام ابوداؤد کا وطن بصرہ کا ایک گاؤں سجستان ہے جو خراسان کے سجستان سے الگ ہے، اسی طرح کی ایک اور روایت بھی ہے لیکن ابن نصر کا یہ بھی بیان ہے کہ انہوں نے جب بصرہ والوں سے اس کی تحقیق کی تو پتہ چلا کہ وہاں کے لوگ اس نام کے کسی گاؤں سے واقف نہیں، یہ روایات ناقابل اعتماد ہیں، دوسرے معتبر علماء وحفاظِ حدیث میں سے بھی کسی نے اس طرح کی تصریح نہیں کی ہے کہ ان کا وطن مشہور سجستان کے علاوہ کسی اور جگہ ہے۔ (کتاب الانساب مقدسی ص ۱۰۹) علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ''سجستان کی جانب نسبت ہے جو کابل کے ایک مشہور شہر کا نام ہے۔'' (کتاب الانساب سمعانی ورق ۲۹۲) شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں ''ابن خلکان کو انساب میں مہارت اور تاریخ دانی میں کمال کے باوجود اس نسبت کے متعلق غلط فہمی ہو گئی ہے اور بقول صاحب طبقات علامہ تاج الدین سبکی یہ وہم ہے، صحیح یہ ہے کہ یہ نسبت سیستان (سجستان) کی جانب ہے جو ایک مشہور ملک اور سندھ وہرات کے درمیان قندھار کے قریب واقع ہے، چشت بھی جو بزرگانِ چشت کا مسکن ہے، اسی ملک کے اندر ہے اور قدیم زمانہ میں اس ملک کا پایہ تخت بست تھا۔ (بستان المحدثین ص ۱۰۷ والحطہ ص ۱۲۵)

Marfat.com

مگر علامہ ابن خلکان بھی جمہور کے قول کو راجح سمجھتے ہیں، ان کا بیان یہ ہے "سجستانی۔۔۔ کی نسبت مشہور سجستان کی جانب ہے لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بصرہ کے ایک گاؤں سجستان یا سجستانہ کی جانب منسوب ہے، واللہ اعلم۔
علامہ ذہبی نے بھی دونوں اقوال ذکر کیے ہیں، وہ لکھتے ہیں "ابوداؤد کا وطن سجستان ہے جو مکران اور سندھ کے اطراف و جوانب اور ہرات کے مقابل میں واقع ہے لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا تعلق بصرہ کے ایک گاؤں سجستان سے تھا۔"
(تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۸۳ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۷۰)

اس غلط فہمی کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ امام صاحب نے آخر عمر میں بصرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، اس لیے بعض لوگوں نے ان کا اصلی وطن بھی اس کے قرب و جوار ہی کے علاقہ کو سمجھ لیا۔

اساتذہ و شیوخ:

حافظ ابن حجر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے اساتذہ کی تعداد تین سو کے قریب ہے، ان میں امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور ابوثور جیسے بلند پایہ فقہائے محدثین اور یحییٰ بن معین، ہشام بن عبدالملک طیالسی، ابوبکر بن ابی شیبہ اور عثمان بن ابی شیبہ جیسے نامور ناقدین فن اور ائمہ محدثین شامل ہیں، چند اور مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:
حیوہ بن شریح، خلف بن ہشام بغدادی، ربیع بن نافع حلبی، زہیر بن حرب، سعید بن سلیمان بزار واسطی، سعید بن منصور، سلیمان بن حرب، سلیمان بن عبدالرحمن دمشقی، شجاع بن مخلد، صفوان بن صالح دمشقی، عبداللہ بن رجاء بصری، عبداللہ بن محمد نفیلی دمشقی، عمرو بن عون ہزار واسطی، ابورجاء قتیبہ بن سعید، محمد بن بشار بندار بصری، محمد بن صباح بزار دولابی، محمد بن منہال، مسدد بن مسرہد، ہشام بن خالد ازرق دمشقی، ہناد بن عمرو اور ابومحمد وہب بن بقیہ وغیرہ۔
(تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۷۲، ۱۷۰ و مقدمہ غایۃ المقصود ص ۵،۶)

تلامذہ:

امام صاحب کے تلامذہ کا حلقہ بھی بڑا وسیع ہے، سنن کے رواۃ میں ابوعمرو احمد بن علی حسن بصری، ابوعلی محمد بن احمد بن عمرو لؤلؤی، ابوالطیب احمد بن ابراہیم اشنائی، ابوسعید احمد بن محمد بن زیاد اعرابی، ابوبکر محمد بن عبدالرزاق بن داسہ، ابوالحسن علی بن حسن بن عبد انصاری، ابوعیسیٰ اسحاق بن موسیٰ بن سعید رملی اور ابواسامہ محمد بن عبدالملک بن یزید رواس۔
دوسری کتابوں کے رواۃ میں: ابوعبداللہ محمد بن احمد بصری، ابوبکر احمد بن سلیمان بخارا، اسماعیل بن محمد صفار، ابوعبید محمد بن علی بن عثمان آجری اور دوسرے مشہور علما میں آپ کے صاحبزادے ابوبکر بن ابی داؤد، ابوعوانہ، یعقوب بن اسحاق الفرائینی، حرب بن اسماعیل کرمانی، زکریا ساجی، ابوبکر احمد بن محمد خلال اور احمد بن محمد بن یٰسین ہروی وغیرہ۔
صحاح ستہ کے مصنفین میں امام ترمذی اور امام نسائی کو بھی آپ سے تلمذ حاصل ہے اور امام احمد نے بھی جو ان کے اساتذہ میں تھے، ایک حدیث ان سے روایت کی ہے، (تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۷۲، ۱۶۹ و ۱۷۰ و مقدمہ غایۃ المقصود ص ۵،۶) امام ابوداؤد کے تلامذہ میں چار اشخاص زیادہ مشہور و ممتاز ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

Marfat.com

''و چہار کس از جملہ شاگردان او خلیفہ سر آمد محدثین شدند اول پسرش ابو بکر بن ابی داؤد، دوم لولوی، سوم ابن الاعرابی، چہارم ابن داسہ'' (بستان المحدثین ص ۱۰۷)

سماع حدیث کے لیے سفر:

ابوداؤد نے اپنے زمانہ کے دستور کے مطابق حصول حدیث کے لیے مختلف مقامات کا سفر کیا، وہ سجستان میں پیدا ہوئے لیکن بصرہ کو مسکن بنایا جو اس زمانہ میں علم وفن اور محدثین وفقہا کا بہت بڑا مرکز تھا، کئی بار بغداد تشریف لے گئے، حجاز، عراق، خراسان، مصر، شام، جزیرہ نیشاپور، مرو اور اصبہان وغیرہ کے محدثین کی خدمت میں بھی حاضر ہو کر ان سے استفادہ کیا۔

(تاریخ بغداد ج ۹ ص ۵۶ البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۵۵،۵۴)

حفظ وضبط:

ان کا حافظہ نہایت قوی اور ذہن بڑا رسا تھا، محمد بن یاسین ہروی فرماتے ہیں ''حفاظ حدیث میں ابوداؤد بھی ایک مشہور حافظ ہیں'' ابوحاتم کا بیان ہے کہ ''وہ حفظ کے اعتبار سے دنیا کے اماموں میں ایک امام تھے'' محمد بن مخلد فرماتے ہیں کہ ابوداؤد ہزاروں حدیثوں کا مذاکرہ کرتے تھے، اور جب انہوں نے سنن مرتب کی تو تمام اہل زمانہ ان کے حفظ وتقدم کے معترف ہو گئے، امام نووی فرماتے ہیں کہ جمہور علمائے اسلام کو ان کے کمال حفظ کا اعتراف ہے۔

(تہذیب ج ۴ ص ۱۷۲ و تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۲۲۴)

جرح وتعدیل:

حفظ وضبط اور ثقاہت وعدالت کی طرح جرح وتعدیل میں بھی ان کا پایہ نہایت بلند تھا اور صحیح وسقیم، قوی وضعیف، مشہور ومنکر اور حسن وشاذ ہر قسم کی روایتوں کے پرکھنے میں ان کو پورا ملکہ حاصل تھا، ان کی قوت تمیز، نقد ونظر اور ثقاہت وعدالت پر اساطین فن کا اتفاق ہے، محمد بن یٰسین ہروی فرماتے ہیں کہ ''وہ احادیث نبوی کے حافظ وواقف کار بھی تھے اور ان کی اسناد وعلل کے ماہر بھی'' ابوعبداللہ بن مندہ کا بیان ہے کہ ''احادیث کی تخریج، معلول وثابت اور غلط وصحیح میں تمیز کرنے والے چار آدمی ہیں، امام بخاری اور امام مسلم اور ان کے بعد ابوداؤد اور نسائی'' حافظ ابن جوزی جیسے سخت گیر کو بھی علل حدیث میں ان کی معرفت کا اعتراف ہے'' ابوحاتم فرماتے ہیں کہ ''وہ احادیث میں نہایت معتبر ومتقن اور امام تھے۔''

(تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۷۰ و ۱۷۲ و المنتظم ج ۵ ص ۵۷)

حدیث میں کمال:

ابوداؤد اس دور میں پیدا ہوئے تھے، جب دنیائے اسلام نامور محدثین سے معمور تھی، اس زمانہ میں انہوں نے اس فن میں اتنا کمال پیدا کیا کہ ائمہ حدیث اور اساطین فن میں ان کو امتیازی درجہ حاصل ہو گیا اور سب نے ان کی جلالت قدر کا اعتراف کیا، ابراہیم حربی کہتے ہیں کہ ''فن حدیث ان کے لیے اس طرح آسان ہو گیا تھا، جس طرح حضرت داؤد کے لیے لوہا نرم اور موم بن گیا تھا، موسیٰ بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ ''وہ دنیا میں تحصیل حدیث اور عقبیٰ میں جنت کے لیے پیدا کیے گئے تھے، میں نے ان سے زیادہ افضل وبرتر کوئی آدمی نہیں دیکھا'' احمد بن محمد بن یٰسین ہروی نے ان کو فرسان حدیث میں شمار کیا

Marfat.com

ہے، حاکم صاحب مستدرک کی رائے ہے کہ ''وہ اپنے دور میں امام المحدثین تھے'' امام نووی فرماتے ہیں کہ ''علمائے اسلام ابو داؤد کی مدح وتوصیف ان کے وفور علم حدیث میں فہم صائب اور ذہن رسا پر متفق ہیں'' محمد بن مخلد کہتے ہیں کہ ابوداؤد کے معاصرین اور اہل زمانہ ان کی امامت فن کے معترف تھے۔''

(تاریخ بغداد ج ۹ ص ۵۸ وابن خلکان ج ۱ ص ۳۸۲، تذکرہ ج ۲ ص ۱۶۹ وتہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۲۲۴)

فقہ واجتہاد:

اگرچہ امام ابوداؤد کی شہرت محدث کی حیثیت سے زیادہ ہے لیکن فقہ واجتہاد میں بھی ان کو بڑی بصیرت حاصل تھی اور حدیث کی طرح فقہ میں بھی ان کی نظر وسیع اور گہری تھی، ابوحاتم ان کو امام فقہ قرار دیتے ہیں، صاحب شذرات اور یافعی نے لکھا ہے کہ ''وہ حدیث وفقہ دونوں میں ممتاز اور بلند حیثیت رکھتے تھے'' بعض علما کا بیان ہے کہ اصحاب صحاح میں امام بخاری کے بعد اجتہاد وتفقہ کے لحاظ سے ابوداؤد کا مرتبہ سب سے بلند ہے'' ان پر فقہی ذوق اتنا غالب تھا کہ تمام ارباب صحاح ستہ میں صرف ان ہی کو ابواسحاق شیرازی نے طبقات الفقہاء میں شامل کیا ہے، اسی فقہی ذوق کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں صرف احکام ومسائل کے متعلق حدیثیں درج کی ہیں۔

تفسیر ودیگر علوم:

تفسیر کے بھی عالم تھے، اس موضوع پر انہوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی، حدیث، فقہ وتفسیر کے علاوہ دوسرے علوم سے بھی ان کو پوری واقفیت تھی، ابوبکر خلال کا بیان ہے کہ ''ابوداؤد اپنے زمانہ کے صاحب فضیلت اور پیش رو امام تھے، علوم کی تخریج ومعرفت اور ان کے مواقع ومقامات کی واقفیت وآگاہی میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔

فقہی مذہب:

ابواسحاق شیرازی نے طبقات الفقہا میں ابوداؤد کو حنابلہ میں شمار کیا ہے، ان کے حنبلی ہونے کا ایک قوی قرینہ یہ ہے کہ وہ امام احمد کے خاص شاگرد اور متعدد مسائل میں ان کے ہمنوا تھے لیکن بعض لوگوں نے ان کو شافعی المذہب قرار دیا ہے۔

(اتحاف النبلاء ص ۲۵۶)

تدین وتقویٰ:

علم وفن کی طرح وہ زہد وتقویٰ کے بھی امام تھے، ابوحاتم کا بیان ہے کہ وہ فقہ وعلم، حفظ وضبط اور عبادت وتقویٰ ہر اعتبار سے دنیا کے اماموں میں ایک امام تھے، یٰسین ہروی فرماتے ہیں کہ ''وہ بے مثال عالم وحافظ ہونے کے علاوہ عبادت وریاضت، عفت وپاکدامنی، خیر وصلاح اور ورع وتقویٰ میں بھی منفرد خصوصیات کے مالک تھے'' (تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۷۲) آداب شریعت کی پابندی اور سنت نبوی کے اتباع کا خاص اہتمام تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

''در حفظ حدیث واتقان روایت وعبادت وتقوی وصلاح واحتیاط درجہ عالی داشت''۔ (بستان المحدثین ص ۱۰۸)

علامہ ابن کثیر کا بیان ہے:

وکان فی اعلی درجۃ النسک والعفاف والصلاح والورع۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۵)

Marfat.com

دنیوی جاہ وحشمت سے بے زاری:

امام صاحب کو دنیا اور اس کے لذائذ ومرغوبات سے کوئی دلچسپی نہ تھی، امراء وسلاطین کے دربار سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اور دنیاوی جاہ وحشمت اور اعزاز واکرام کی کبھی طلب نہیں کی، خلفا کی وجاہت کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں تھا اور وہ ان کو عام لوگوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور نہ ان کے ساتھ کوئی امتیاز برتتے تھے، ان کے خادم ابوبکر بن جابر کا بیان ہے کہ ''میں امام صاحب کے ساتھ بغداد میں مقیم تھا، ایک دن جب وہ مغرب کی نماز پڑھ کر گھر داخل ہوئے تو کچھ دیر کے بعد دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی، میں نے دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ امیر ابواحمد موفق امام صاحب سے ملنے کے خواہش مند ہیں، میں نے اطلاع کی، آپ نے ان کو اندر بلوالیا اور پوچھا کہ کیسے زحمت فرمائی؟ انہوں نے کہا کہ میں تین درخواستیں لے کر حاضر ہوا ہوں، ایک تو یہ کہ آپ بصرہ میں مستقل قیام فرمائیں تاکہ مختلف مقامات کے طالبانِ حدیث آپ سے استفادہ کر سکیں، دوسرے میرے بچوں کو سنن کی تعلیم دیں، تیسرے روایت اور درس حدیث کے حلقہ میں میرے بچوں کے لیے مخصوص نشست کا انتظام فرمادیں۔ امام صاحب نے فرمایا کہ پہلی دونوں باتیں مناسب ہیں لیکن تیسری بات ناممکن ہے، علم کے معاملہ میں شریف ووضیع، اعلیٰ وادنیٰ سب برابر ہیں، اس لیے کوئی امتیاز نہیں برتا جاسکتا، چنانچہ امیر کے لڑکے بھی عام لوگوں کی طرح حلقۂ درس میں شریک ہوکر سماع حدیث کرتے۔ (دیباچہ غایۃ المقصود)

وفات واولاد:

بہتر سال کی عمر میں بروز جمعہ ۱۶/شوال ۲۷۵ھ کو امام صاحب نے عالم آخرت کا سفر اختیار کیا، عباس بن عبدالواحد نے جنازہ کی نماز پڑھائی، (اتحاف النبلاص ۲۵۷) اولاد میں ایک صاحبزادہ ابوبکر عبداللہ کا جو آپ کے شاگرد اور نامور محدث تھے ذکر ملتا ہے۔

تصنیفات:

امام صاحب کی جن تصنیفات کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں:

۱۔ کتاب الرد علیٰ اہل القدر: اس کے راوی ابوعبداللہ بصری ہیں۔

۲۔ کتاب الناسخ والمنسوخ: ابوبکر نجار اس کے راوی ہیں۔

۳۔ کتاب المسائل: ابوعبید آجری نے اس کی روایت کی ہے اور اس میں ان کے وہ سوالات درج ہیں جو انہوں نے اپنے استاذ امام احمد سے کیے تھے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۲۹۹)

۴۔ مسند مالک: اسماعیل بن محمد صفار اس کے راوی ہیں۔

۵۔ کتاب المراسیل: یہ رسالہ ۱۳۱۰ھ میں مطبع علمی سے شائع ہوا ہے اور وہ ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ (معجم المطبوعات کالم ۳۱۰)

۶و۷۔ کتاب المصابیح وکتاب المصاحف: صاحب کشف الظنون نے ان دونوں کو امام صاحب کے صاحبزادہ ابوبکر عبد

Marfat.com

اللہ کی تصنیف بتایا ہے لیکن ابن ندیم نے امام صاحب کی تصنیفات میں ان کو شمار کیا ہے۔

(کشف الظنون ج ۲ ص ۱۰۱ و ۴۴۵ و الفہرست ص ۳۲۴)

۸۔ کتاب البعث والنشور، ۹۔ کتاب التفسیر، ۱۰۔ کتاب نظم القرآن، ۱۱۔ کتاب فضائل القرآن، ۱۲۔ کتاب شریعۃ التفسیر، ۱۳۔ کتاب شریعۃ المقاریٔ، ۱۴۔ سنن ابی داؤد، یہ امام صاحب کی سب سے مشہور و مقبول اور فن حدیث کی بڑی اہم اور مستند کتاب ہے، اس کا مفصل تعارف درج ذیل ہے۔

سنن ابی ابوداؤد:

یہ چار ہزار آٹھ سو منتخب حدیثوں پر مشتمل ہے، امام صاحب نے اس کی ترتیب و تالیف کا کام ۲۴۱ھ سے پہلے بغداد میں انجام دیا، (معالم السنن ج ۱ ص و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۴۸ و تاریخ بغداد ص ۵۶) سنن ابی داؤد سے پہلے حدیث کی جو کتابیں لکھی گئیں ان کا تعلق جوامع اور مسانید سے ہے، یعنی ان میں سنن، احکام، تفسیر، قصص، اخبار، مواعظ و آداب ہر قسم کی روایتیں ہیں لیکن امام ابوداؤد نے اپنی راہ سب سے الگ نکالی، تمام محدثین میں ان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے صرف سنن و احکام کی روایات اپنے مجموعہ میں درج کی ہیں، اہل مکہ کے نام اپنے رسالہ میں تحریر فرماتے ہیں "میں نے سنن میں صرف احکامی روایات جمع کی ہیں، زہد اور فضائل اعمال وغیرہ کی حدیثیں اس میں شامل نہیں ہیں، اس کی جملہ چار ہزار حدیثیں احکام و مسائل سے متعلق ہیں۔" (رسالۃ ابی داؤد الی اہل مکہ ص ۸)

سنن کی اہمیت:

سنن ابی داؤد کا شمار حدیث کی امہات کتب اور صحاح ستہ میں ہوتا ہے، اکثر علمائے اسلام نے صحیحین کے بعد تمام کتب حدیث میں اس کو سب سے اہم بتایا ہے، اس کتاب کو مرتب کرنے کے بعد جب اس کو امام احمد کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کو بہت پسند کیا اور اس کی تعریف کی، زکریا ساجی کا بیان ہے کہ قرآن مجید، اسلام کی اصل بنیاد اور سنن ابوداؤد اس کا ستون ہے، ابن الاعرابی فرماتے ہیں "مصحف یعنی کتاب اللہ اور سنن ابوداؤد کے بعد کسی اور چیز سے واقفیت کی ضرورت نہیں" محمد بن مخلد کہتے ہیں کہ "ابوداؤد نے سنن مرتب کرنے کے بعد جب لوگوں کے سامنے اس کو بیان کیا تو محدثین نے اس کو مصحف کی طرح قابل اتباع سمجھا" امام خطابی فرماتے ہیں "سنن ابوداؤد ایک عمدہ اور نفیس کتاب ہے، علوم دینیہ میں ایسی بے نظیر کتاب نہیں لکھی گئی، تمام لوگوں میں اسے حسن قبول حاصل ہوا اور وہ اہل علم اور فقہا کے مختلف طبقات میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے، اس میں ہر ایک کی آسودگی کا سامان موجود ہے اور عراق، مصر، بلادِ مغرب اور اکثر ملکوں کے لوگوں کا اس پر اعتماد و دار و مدار ہے، علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں "ابوداؤد کبار محدثین اور ماہرین فن علما میں تھے اور ان کی سنن جیسی کتاب کسی اور نے نہیں لکھی" حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں "سنن ابی داؤد علما کے درمیان مشہور و متداول اور مقبول تصنیف خیال کی جاتی ہے، ابوالعلا محسن کا بیان ہے کہ انہوں نے خواب میں نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

من اراد ان یستمسک بالسنن فلیقرأ سنن ابی داؤد۔

سنن کی اتباع کی آرزو رکھنے والوں کو سنن ابی داؤد کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

Marfat.com

امام ابوداؤد خود فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ کے بعد اس کتاب سے زیادہ کسی اور چیز کا علم ضروری نہیں، اگر کسی شخص کو ان دونوں کے علاوہ کسی اور چیز سے واقفیت نہ ہو تو اس کو کوئی نقصان نہ ہوگا۔ (تاریخ بغداد ج ۹ ص ۵۶، ابن خلکان ج ۱ ص ۸۲ ۳ و البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۶۹ و مقدمہ معالم السنن ج ۱ ص ۸ ۷ ۹ و تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۷۱، صفۃ الصفوۃ ج ۵ ص ۵۱)

خصوصیات:

۱۔ سنن ابی داؤد کی سب سے اہم خصوصیت اور اس کا امتیاز یہ ہے کہ وہ صرف احکام و مسائل سے متعلق روایات و اخبار پر مشتمل ہے، امام ابوداؤد سے پہلے اس قسم کی حدیث کی کتابیں لکھنے کا رواج نہ تھا، امام نووی کا بیان ہے کہ اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر وہ ائمہ حدیث اور علمائے آثار کی توجہات کا مرکز بن گئی اور گو اس تخصیص کی بنا پر وہ احادیث کے بہت سے ابواب سے خالی ہے لیکن فقہی احادیث کا جتنا بڑا ذخیرہ اس کتاب میں موجود ہے، وہ صحاح ستہ کی کسی اور کتاب میں نہیں، حافظ ابوجعفر بن زبیر غرناطی متوفی ۷۰۸ھ نے صحاح ستہ کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

ولابی داؤد فی حصر احادیث الاحکام واستیعابہا لیس لغیرہ۔

(کتاب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۲۲۷، تدریب الراوی ص ۷۶)

اور فقہی حدیثوں کے حصر و استیعاب کے سلسلہ میں ابوداؤد کو جو خصوصیت حاصل ہے وہ دوسرے مصنفین کو نہیں۔

احکام و مسائل میں اس کی جامعیت کی بنا پر علمائے امت نے کتاب اللہ کے بعد دوسری کتابوں کے مقابلہ میں اس کی تعلیم کو زیادہ ضروری قرار دیا ہے اور اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ فقہاء و مجتہدین کا معتمد علیہ ماخذ رہی ہے، زاہد الکوثری لکھتے ہیں "حلال و حرام کے متعلق احکامی احادیث کے لیے یہ نہایت مفید اور نفع بخش کتاب ہے" بعض علمائے اصول کا بیان ہے کہ "مجتہدین کے لیے اس کی احادیث سے واقفیت کافی ہے" ابوبکر جصاص کی احکام و مسائل کے متعلق جملہ کتابوں (احکام القرآن، جامع کبیر، شرح مختصر طحاوی اور شرح مختصر کرخی وغیرہ) کا خاص ماخذ و مرجع یہی کتاب ہے۔ (دیباچہ رسالہ ابی داؤد ص ۲)

۲۔ فقہ و استنباط احکام و مسائل کے لحاظ سے بھی یہ بڑی بلند پایہ کتاب ہے کیونکہ امام ابوداؤد کا درجہ فقہ و اجتہاد میں بھی نہایت بلند تھا۔

۳۔ امام بخاری و ترمذی کی طرح ابوداؤد کی بھی اکثر و بیشتر روایتیں علماء و ائمہ مجتہدین، فقہاء امصار، صحابہؓ و تابعینؒ اور تبع تابعین وغیرہ کی معمول بہا ہیں، خصوصاً امام مالک، سفیان ثوری اور امام اوزاعی وغیرہ محدثین اور فقہا کے مسالک و مذاہب کے لیے تو وہ اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، علامہ خطابی کا بیان ہے کہ "وہ فقہاء و مجتہدین کے اختلاف کے درمیان حکم اور حجت ہے اور عراق، مصر، بلاد مغرب اور دیگر ممالک کے لوگوں کا اس پر دار و مدار ہے"۔ (مقدمہ معالم السنن ص ۲)

۴۔ سنن میں صحیح الاسناد، قوی، متصل اور مرفوع حدیثوں کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، اس کی صحت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ امام صاحب نے پہلے پانچ لاکھ حدیثیں جمع کی تھیں، پھر ان میں سے کل چار ہزار آٹھ سو حدیثیں منتخب کیں، اس سلسلہ میں خود لکھتے ہیں "سنن میں چار ہزار آٹھ سو حدیثیں شامل ہیں، جو سب صحیح یا قریب قریب صحیح ہیں، میں نے اپنے علم و یقین بھر صحیح بلکہ اصح روایتیں نقل کرنے کی کوشش کی ہے اور ہمیشہ ان حدیثوں کو ترجیح دی ہے جو سند کے اعتبار سے بلند اور اعلیٰ درجہ کی ہیں، مرسل حدیثیں اس وقت نقل کرتا ہوں جب مسند اور متصل روایتیں نہیں ملتیں کیونکہ مراسیل بھی ائمہ متقدمین مثلاً [illegible] ثوری

Marfat.com

اور اوزاعی وغیرہ کے نزدیک لائق حجت اور قابل استناد ہیں، البتہ امام شافعی اور امام احمد کو ان کی حجیت میں کلام ہے، میرے نزدیک مسند و متصل روایات کے نہ ہونے کی صورت میں وہ معتبر و مستند ہیں لیکن ان کی طرح ان کو قوی نہیں سمجھتا، میں نے اس میں کوئی ایسی حدیث نہیں درج کی جس کے متروک اور ساقط ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہو۔ اسی طرح متروک الاحادیث راویوں سے روایت کرنے سے بھی پرہیز کیا ہے، منکر اور ضعیف الاسناد روایتوں کو میں قابل اعتنا ہی نہیں سمجھتا لیکن صحیح روایتوں کے نہ ہونے کی صورت میں ان کو ان کے ضعف اور وجوہ نکارت کی تصریح کے بعد نقل کیا ہے، جن غیر صحیح الاسناد روایتوں کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے، وہ قابل احتجاج اور صالح سمجھی جائیں گی، اسی طرح غریب اور شاذ روایات کے بجائے مشہور اور معمول بہ روایتیں جمع کرنے پر خاص دھیان دیا ہے۔

۵۔ امام ابوداؤد کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی سند اور ایک ہی متن میں متعدد اسانید اور مختلف متون کو جمع کر دیتے ہیں اور ہر حدیث کے الفاظ کو علیحدہ علیحدہ بیان کرتے ہیں۔

۶۔ روایتوں کے تکرار سے حدیث کی کوئی کتاب خالی نہیں لیکن امام ابوداؤد نے حتی الامکان تکرار سے احتراز، کثرت طرق کو نظر انداز اور طویل حدیثوں کو مختصر کر دیا ہے۔ تکرار سے اس وقت کام لیا ہے، جب روایت میں کوئی خاص اور نئی بات نظر آئی ہے۔

۷۔ نقل روایات میں استقصاء و جامعیت کے علاوہ اس میں حسن ترتیب و تالیف کی بھی شان پائی جاتی ہے، علامہ خطابی فرماتے ہیں:

الاان کتاب ابی داؤد احسن رصفا، یعنی ابوداؤد کی سنن ترتیب و حسن تالیف کے لحاظ سے سب میں عمدہ ہے، پڑھنے والوں کے مزاق و طبیعت کے لحاظ ہی کی وجہ سے انہوں نے تکرار، کثرت طرق اور طول بیان سے پرہیز کیا ہے۔

۸۔ سنن ابی داؤد میں ایک ثلاثی روایت بھی ہے۔

۹۔ رواۃ کے ناموں، کنیتوں اور القاب کے اجمال و ابہام کی تفصیل و توضیح، ان کی ثقاہت و عدم ثقاہت کی نشاندہی اور روایات کے حسن و قبح اور صحت و سقم وغیرہ کی وضاحت بھی کی ہے۔

سنن ابی داؤد کی چار حدیثیں:

امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ میرے اس منتخب مجموعۂ احادیث میں صرف چار حدیثیں انسان کو دین پر عمل کرنے کے لیے کافی ہیں اور وہ یہ ہیں: انما الاعمال بالنیات، من حسن اسلام المرء ترکہ مالایعنیہ، لا یکون المؤمن مؤمنا حتی یرضی لاخیہ مایرضاہ لنفسہ اور الحلال بین والحرام بین و بینہما مشتبہات۔

امام صاحب کی اس تصریح میں بڑی بصیرت و حکمت پوشیدہ ہے، شاہ عبد العزیز صاحب اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''ایک مجتہد و مرشد کو شریعت کے کلی قاعدوں اور مہمات امور سے واقف ہونے کے بعد جزئی مسائل اور واقعات میں ان سب کے سوا کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ پہلی حدیث عبادات کی صحت و درستگی، دوسری عمر عزیز کے اوقات کی حفاظت، تیسری پڑوسیوں، قرابتداروں، متعارف لوگوں اور دیگر متعلقین وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی کیلئے اور چوتھی ان تمام شکوک و شبہات کے ازالہ کیلئے کافی ہے جو علما کے اختلافات و دلائل کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ (بستان المحدثین ص ۱۰۷)

Marfat.com

سنن کے متداول نسخے اوران کے رواۃ:

امام ابوداؤد سے ان کے سات تلامذہ نے سنن کی روایت کی ہے لیکن ان میں چار تلامذہ زیادہ مشہور ہیں اوران کی نسبت سے ہر زمانہ میں سنن کے چار نسخے مشہور ومتداول رہے ہیں۔(مقدمہ معالم السنن)

ا۔نسخۂ لولوی: یعنی ابوعلی محمد بن احمد بن عمرو لولوی کا نسخہ جو ہندوستان اور بلادِ مشرق میں رائج ومقبول ہے اور سب سے زیادہ مستند ومعتبر سمجھا جاتا ہے کیونکہ امام صاحب نے آخری عمر یعنی ۲۷۵ھ میں اس کا املا کرایا تھا، اس کے بعد ان کی وفات ہوگئی تھی، اس لیے یہ گویا آخری نسخہ ہے۔

۲۔نسخۂ ابن داسہ: یعنی حافظ ابوبکر محمد بن بکر تمار، بصری کا نسخہ، یہ بلادِ مغرب میں مشہور ومقبول تھا، اس میں اور لولوی کے نسخے میں بڑی یکسانیت ہے، کہیں کہیں محض تقدیم وتاخیر کا جزوی اختلاف ہے، کمی بیشی کا کوئی فرق نہیں، بعض علما کے نزدیک سب سے زیادہ کامل اور جامع یہی نسخہ ہے، مشہور شارح سنن علامہ خطابی کے پیش نظر یہی تھا، انہوں نے ابن داسہ سے براہ راست تحصیل علم اور روایت کی تھی۔

۳۔نسخۂ رملی: یعنی حافظ ابوعیسیٰ اسحاق بن موسیٰ بن سعید آملی کا نسخہ، یہ تقریباً ابن داسہ کے نسخہ سے ملتا جلتا ہے، آملی ابوداؤد کے وراق تھے۔

۴۔نسخۂ ابن اعرابی: اس میں اور دوسرے نسخوں میں بڑا فرق واختلاف ہے اوران کے مقابلہ میں اس میں کمی بھی ہے، کتاب الفتن والملاحم، کتاب الحروف، کتاب الخاتم وغیرہ مکمل اور کتاب اللباس کا نصف حصہ اور کتاب الوضوء، کتاب الصلوۃ اور کتاب النکاح کے بھی بیشتر حصے اس میں درج نہیں ہیں۔(مقدمہ غایۃ المقصود ص ۷ مقدمہ معالم السنن ص ۲۳)

شروح وتعلیقات:

سنن ابی داؤد کی اہمیت اور افادیت کی بنا پر ہر زمانہ کے علما نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، اس کے مختصرات مرتب کیے، اس کی شرحیں اور حواشی لکھے، جن میں اہم مباحث ومشکلات کا حل رواۃ اور غریب الفاظ وغیرہ کی تحقیقات کی گئی ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

معالم السنن:

مشہور محدث امام ابوسلیمان حمد بن محمد خطابی (م ۳۸۸ھ) کی شرح جو سب سے قدیم اور مشہور اور سب میں ممتاز ہے، اس کو مطبعہ علمیہ حلب نے ۱۳۵۱ھ میں نہایت اہتمام سے شائع کیا۔

شرح قطب الدین:

قطب الدین ابوبکر بن احمد بن دعین یمنی شافعی م ۶۵۲ھ نے اس کی چار ضخیم جلدوں میں شرح لکھی تھی، مگر نایاب ہے۔

تلخیص منذری:

ابومحمد زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی مصری م ۶۵۶ھ نے سنن ابی داؤد کا اختصار کیا تھا اور اس کا نام مجتبیٰ رکھا، غایۃ

Marfat.com

المقصود کے ساتھ اس کو بھی شائع کیا گیا ہے۔

شرح نووی:

مشہور محدث اور باکمال شارح حدیث ابوزکریا محی الدین یحیٰی ابن شرف نووی م ۶۷۶ھ نے بھی اس کی شرح لکھنا شروع کی تھی مگر مکمل نہیں کر سکے۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۶۲)

شرح ابن قیم:

حجۃ الاسلام شمس الدین محمد بن ابوبکر قیم جوزی م ۷۵۱ھ نے منذری کی تہذیب کے مطابق ابوداؤد کی شرح وتہذیب کی تھی جو نہایت بلند پایہ اور مفید کتاب ہے، اس میں اس کے مشکلات سے تعرض اور معلول احادیث پر فاضلانہ بحثیں کی گئی ہیں، یہ کتاب شائع ہو چکی ہے، غایۃ المقصود کی پہلی جلد کے ساتھ یہ بھی شامل ہے:

شرح مغلطائی:

یہ حافظ علاء الدین مغلطائی بن قلیج م ۷۶۲ھ کی ناتمام شرح ہے۔

انتحاء السنن یا عجالۃ العالم:

ابو محمود شہاب الدین احمد بن محمد المقدسی م ۷۶۵ھ نے خطابی کی معالم السنن کی تلخیص کی اور اس کا نام انتحاء السنن واقتفاء السنن رکھا بعض لوگوں نے غلطی سے اس کا نام عجالۃ العالم من کتاب المعالم بتایا ہے، مکتبہ آستانہ سے چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

شرح ابن ملقن:

شیخ سراج الدین عمر بن علی بن ملقن شافعی م ۸۰۴ھ نے زوائد علی الصحیحین کے نام سے دو جلدوں میں ابوداؤد کی ان روایتوں کی شرح لکھی ہے جو صحیحین میں نہیں ہیں۔

شرح ولی الدین عراقی:

ابوزرعہ ولی الدین احمد بن عبدالرحیم زین الدین عراقی م ۸۲۶ھ نے بھی اس کی ایک ناتمام شرح لکھی جو ابتدا سے سجدۂ سہو تک سات جلدوں میں ہے، ایک اور جلد میں صیام، حج اور جہاد وغیرہ ابواب کی بھی شرح ہے، اگر یہ شرح مکمل ہوتی تو یہ تقریباً چالیس جلدوں پر مشتمل ہوتی۔

شرح ابن رسلان:

ابوالعباس احمد بن حسین رملی مقدسی معروف بہ ابن رسلان م ۸۴۴ھ نے سنن ابوداؤد کی نہایت مکمل اور جامع شرح لکھی تھی۔ ... عرب ممالک میں آٹھ ضخیم جلدوں میں دیکھی ہے جو نہایت مفید اور عمدہ مطالب پر مشتمل ہے، مولانا شمس الحق مرحوم لکھتے ہیں کہ ... کی نہایت عمدہ شرحوں میں ہے اور کتب خانہ آستانہ میں اس کی چار جلدیں پائی جاتی ہیں، ابن رسلان حافظ ابن حجر کے ارشد

Marfat.com

تلامذہ میں تھے، اس لیے انہوں نے اس شرح میں ان کے اقوال وآرا بھی نقل کیے ہیں۔

شرح عینی:

علامہ بدالدین عینی م ۸۵۵ھ کی شرح جو صرف ایک جزو پر مشتمل ہے۔

شرح سیوطی:

علامہ جلال الدین سیوطی م ۹۱۱ھ نے مرقاۃ الصعود الی سنن ابی داؤد کے نام سے شرح لکھی۔

شرح سندی:

علامہ ابوالحسن سندی م ۱۱۳۹ھ نے دیگر کتب صحاح کی طرح فتح الودود علی سنن ابی داؤد کے نام سے اس کا بھی حاشیہ لکھا تھا جو نہایت مشہور اور مقبول ہے، صاحب کشف الظنون نے اس کو شرح لطیف کہا ہے۔
(کشف الظنون و مقدمہ غایۃ المقصود ص ۷ تا ۱۰ و اتحاف النبلاص ۹۰ و ۹۱)

غایۃ المقصود:

مولانا شمس الحق عظیم آبادی مرحوم نے ۳۲ جلدوں میں سنن ابی داؤد کی ایک نہایت مبسوط و جامع اور مفصل شرح لکھی، اس کی صرف ایک ہی جلد دہلی کے مطبع انصاری سے شائع ہوئی ہے، یہ نہایت عمدہ شرح ہے، اس کے شروع میں ایک طویل مقدمہ بھی ہے جس میں ابوداؤد اور سنن کے متعلق بڑے مفید معلومات درج ہیں، اس کی اہمیت مولانا خلیل احمد سہانپوری کے اس بیان سے ظاہر ہوتی ہے "میں نے شیخ ابوالطیب شمس الحق کی شرح غایۃ المقصود کا ایک حصہ دیکھا، وہ سنن ابوداؤد کے اسرار وغوامض کے کشف و اظہار کے لیے کافی ہے، واللہ یہ خوب شرح ہے، مصنف نے اس میں پوری کاوش کی ہے اور تلاش و جستجو کا حق ادا کر دیا ہے (مقدمہ بذل المجہود ج اول ص ۱) اس شرح کے ساتھ ابن قیم کی شرح اور تلخیص بھی شامل ہے۔

عون المعبود:

یہ بھی مولانا شمس الحق ہی کی شرح ہے اور سنن ابی داؤد کے متن کے ساتھ ۴ جلدوں میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی ہے، یہ دراصل غایۃ المقصود کا خلاصہ ہے۔

عام طور سے اس کے مؤلف اور شارح مولانا شمس الحق ڈیانوی سمجھے جاتے ہیں لیکن شرح کی جلد اول کے خطبہ اور اسی جلد کے خاتمہ اور دوسری جلد کے خاتمہ میں مولانا کے چھوٹے بھائی مولانا شرف الحق نے اس کو اپنی تصنیف بتایا ہے، مگر خود مولانا شمس الحق صاحب نے چوتھی جلد کے خاتمہ و آغاز اور تیسری جلد کے خاتمہ میں تصریح کی ہے کہ یہ ان کی تصنیف ہے، مولانا خلیل احمد سہارن پوری اور صاحب معجم المطبوعات نے اس کو مولانا اشرف ہی کی تصنیف قرار دیا ہے، (ایضاً و معجم المطبوعات کالم ص ۱۰۰۳۱) مگر مولانا تلطف حسین صاحب نے جو مولانا شمس الحق صاحب کے ہم عصر و ہم سبق اور عون المعبود کے ناشر بھی ہیں لکھا ہے "کہ مولانا شمس الحق صاحب کو شرح ابی داؤد لکھنے کا مبارک خیال مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی کی ترغیب سے ہوا، انہوں نے سنن کے گیارہ نسخے جمع کیے اور ان کا مقابلہ کر کے ایک صحیح نسخہ تیار کیا اور اسی کو اصل قرار دیا، مزی کی تحفۃ

Marfat.com

الاشراف، منذری کی تلخیص اور امام خطابی کی معالم السنن اور ابن اثیر کی جامع الاصول وغیرہ کی کو بھی پیش نظر رکھ کر غایۃ المقصود کی تالیف وترتیب شروع کی مگر بعض وجوہ سے اسی درمیان میں ایک مختصر شرح لکھنے کا خیال بھی ان کو ہوا تو عون المعبود کی تالیف شروع کی اور چند ممتاز علما کو اس کام میں معاون بنایا، جنہوں نے متن کی تصحیح اور شرح کی تالیف میں ان کا ہاتھ بٹایا اور مولانا نے ان سب سے ان کی استعداد کے مطابق کام لیا، ان علما کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔ مولانا ابو عبد الرحمٰن شرف الحق محمد اشرف ڈیانوی جو شارح کے چھوٹے بھائی تھے، ۲۔ شیخ الحدیث مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری صاحب تحفۃ الاحوذی، ۳۔ مولانا ابو عبد اللہ محمد ادریس ڈیانوی جو شارح کے صاحبزادے ہیں، ۴۔ مولانا عبد الجبار بن نور احمد ڈیانوی جو مصنف کے ماموں زاد بھائی تھے۔ [1]

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام حضرات بھی عون المعبود کی تالیف میں کسی نہ کسی حیثیت سے مصنف مولانا شمس الحق کے شریک تھے اور بقول مولانا تلطف حسین ''یہ تمام لوگ شارح عون المعبود مولانا شمس الحق صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے اور شب و روز اس خدمت کو انجام دیتے جو مولانا ان کے سپرد کرتے (خاتمہ عون المعبود جلد رابع ص ۵۵۳) لیکن اصل شارح مولانا شمس الحق ہی تھے، البتہ چند اور علما نے ترتیب و تالیف میں ان کی اعانت کی تھی، مگر اس اعانت کی بنا پر ان کی جانب اس شرح کو منسوب کرنا صحیح نہیں ہے، یہ عام قاعدہ ہے کہ اساتذہ و شیوخ اپنے شاگردوں سے مواد و معلومات اکٹھا اور مآخذ و حوالے تلاش کراتے اور تصنیف و تالیف کے سلسلہ کے بعض امور ان کے سپرد کرتے ہیں بلکہ بعض ابواب و فصول بھی ان سے لکھا کر ان میں حسب منشا معمولی یا غیر معمولی ترمیم کرتے ہیں لیکن ان کے باوجود اصل کتاب اساتذہ ہی کی جانب منسوب کی جاتی ہے اور اس کو معیوب نہیں خیال کیا جاتا، اس لیے مولانا شرف صاحب کو اس کا مصنف و شارح قرار دینا غلط ہے، وہ صرف اس علمی بورڈ کے ایک رکن تھے، مولانا شمس الحق نے ان کی دلدہی کی وجہ سے کچھ اجزا ان کی جانب منسوب ہو جانے کو ناپسند نہیں کیا۔

التعلیق المحمود:

اس کو شیخ فخر الحسن گنگوہی نے مرتب کیا ہے۔

الہدی المحمود لترجمۃ سنن ابی داؤد:

مشہور مترجم حدیث وقار نواز جنگ مولانا وحید الزماں ابن مسیح الزماں م ۱۹۲۰ء نے دو ضخیم جلدوں میں ایک شرح لکھی جو سنن کے اردو ترجمہ اور تشریحی فوائد پر مشتمل اور چھپ چکی ہے، صاحب شرح کے حالات میں مولانا عبد الحلیم چشتی نے ایک جامع کتاب لکھی ہے جو مکتبہ نور محمد آرام باغ کراچی سے شائع ہوئی ہے۔

بذل المجہود فی حل ابی داؤد:

مشہور حنفی عالم و محدث مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری کی شرح جو پانچ جلدوں پر مشتمل اور شائع ہو چکی ہے، یہ شرح مفید علمی وفنی مطالب پر مشتمل ہے۔

[1] (خاتمہ عون المعبود جلد رابع ص ۵۵۳، اس جماعت میں اور بھی بعض حضرات شامل تھے، مولوی ابو یحییٰ امام خان نوشہروی نے اس فہرست میں قاضی یوسف حسین خان پوری ہزاروی اور مولوی محمد شاہجہان پوری کے نام بھی تحریر کیے ہیں۔ (تراجم علمائے اہل حدیث ص ۴۰۲)

Marfat.com

المنہل المورد:

یہ مفید ومختصر شرح حال ہی میں حجاز سے شائع ہوئی ہے لیکن ہماری نظر سے نہیں گزری۔

ایک اعتراض کا جواب:

بعض علمائے جرح وتعدیل نے سنن ابی داؤد میں موضوع روایتوں کی بھی نشاندہی کی ہے، علامہ ابن جوزی کے نزدیک اس قسم کی حدیثوں کی تعداد نو ۹ ہے لیکن علمائے محققین نے اس اعتراض کو تسلیم نہیں کیا ہے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

''سنن ابی داؤد کی اعلیٰ ومستندترین روایتیں وہ ہیں جن کی شیخین نے تخریج کی ہے اس قسم کی حدیثیں نصف کتاب پر مشتمل ہیں، اس کے بعد ان روایتوں کا نمبر ہے جن کی شیخین میں سے کسی ایک نے تخریج کی ہے، تیسرا درجہ ان روایتوں کا ہے جن کی گو صحیحین میں تخریج نہیں کی گئی ہے تاہم وہ علت وشذوذ سے پاک اور سنداً قوی وجید ہیں، اس کے بعد وہ روایتیں ہیں جو صحیح الاسناد اور صالح سمجھی جاتی ہیں اور دو تین طرق سے مروی ہونے کی بنا پر علماء نے ان کو قبول کیا ہے، بعض ایسی روایات بھی ہیں جو رواۃ کے سوء حفظ کی بنا پر ضعیف ہیں اور ان کے بارے میں ابوداؤد نے سکوت اختیار کیا ہے، بعض احادیث باعتبار رواۃ ضعیف ہیں مگر ابو داؤد نے ان کے ضعف کی تصریح کردی ہے لیکن بعض اوقات وہ ضعف کے متعلق اس لیے خاموش رہتے ہیں کہ نکارت کا پہلو بہت واضح اور نمایاں ہوتا ہے۔'' (سیر النبلا)

امام خطابی تحریر فرماتے ہیں:

''محدثین کے نزدیک حدیث کی تین قسمیں ہیں ۱۔ صحیح، ۲۔ حسن، ۳۔ سقیم، امام ابوداؤد کی کتاب صحیح اور حسن دونوں قسموں کی جامع اور سقیم کی مختلف بڑی اور اہم قسموں مثلاً موضوع، مقلوب اور مجہول وغیرہ سے یکسر خالی ہے، اگر شاذ ونادر سقیم کی معمولی اور جزئی قسموں کی روایتیں درج ہوگئی ہیں تو امام صاحب اس کی حقیقت ونوعیت بیان کر کے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوگئے ہیں''۔ (شرح معالم السنن ج ۱ ص ۶)

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنن ابی داؤد موضوع روایتوں سے پاک ہے، البتہ ضعیف ومرسل روایتوں کے پائے جانے کا خود امام صاحب نے اپنے رسالہ میں ذکر واعتراف کیا ہے لیکن اس سے اس کی اہمیت، شہرت، وثوق اور اعتبار واستناد میں کوئی فرق نہیں آتا۔

امام صاحب کا یہ بیان کہ: ''مالم یذکر فیه شیء فھو صالح'' یعنی جن روایتوں کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہے، وہ صالح ہیں، علمائے فن کی بحث ونظر کا خاص موضوع رہا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عام طور سے علما نے اس طرح کی حدیثوں کو صحیح وحسن تسلیم کیا ہے لیکن مکمل استقصاء وتتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی بعض حدیثیں ضعیف بھی ہیں۔ واللہ اعلم۔

Marfat.com

امام بقی بن مخلد قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۷۶ھ)

نام ونسب:

بقی نام، ابوعبدالرحمٰن کنیت اور شیخ الاسلام لقب تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے: بقی بن مخلد بن یزید۔

ولادت ووطن:

اندلس کے مشہور شہر اور اسلامی علوم وفنون اور تہذیب وثقافت کے مرکز قرطبہ میں ۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔

(تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۲۷۷)

اساتذہ وشیوخ:

بقی بن مخلد نے تقریباً تین سو اساتذہ سے کسب فیض کیا تھا، ان کا شمار امام احمد کے خاص اور مایۂ ناز شاگردوں میں ہوتا ہے، ان کے اکثر شیوخ کو امام مالک، سفیان بن عیینہ، امام شافعی اور حماد بن زید وغیرہ جلیل القدر محدثین اور فقہا سے شرف تلمذ حاصل تھا، چند ممتاز مشائخ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن محمد شافعی، ابراہیم بن منذر حزامی، ابوثور، ابومصعب زہری، احمد بن ابراہیم دورقی، ابوطاہر احمد بن سرح، بکار بن عبداللہ، حارث بن مسکین، خلیفہ بن خیاط، دحیم، ابوخیثمہ زہیر بن حرب، زہر بن حماد، سحنون بن سعید، سلمہ بن شعیب، صفوان بن صالح، ابوبکر عبداللہ بن ابی شیبہ، عبداللہ بن ذکوان، عون بن یوسف، محمد بن بشار بندار، محمد بن عبداللہ بن نمیر، محمد بن عبید بن حسان، محمد بن عیسیٰ اعشیٰ، محمد بن عمر عدنی، محمد بن محمد مصطفیٰ الحمصی، ہارون بن عبداللہ حمال، یحییٰ بن عبداللہ بن بکیر، یحییٰ بن عبدالحمید حمانی، یحییٰ بن یحییٰ لیثی وغیرہ۔

(تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۲۷۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۴ وتاریخ العلماء والرواۃ الاندلس لابن الفرضی ص ۱۰۹)

تلامذہ:

ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، بعض کے نام حسب ذیل ہیں:

"احمد بن بقی، احمد بن عبداللہ اموی، اسلم بن عبدالعزیز، حسن بن سعید (یاسعد) عبداللہ بن یونس قبری مرادی، محمد بن عمر لبابہ، محمد بن وزیر وغیرہ۔

[1] (یہ امام بقی کے بڑے شاگرد اور ان کے راویہ کہلاتے تھے، بقی کی کتابوں کی نشرواشاعت میں ان کا بڑا ہاتھ ہے)۔

Marfat.com

طلب علم کے لیے سفر:

انہوں نے علم کی تحصیل و تکمیل کے لیے مغرب و مشرق کے اکثر شہروں کا سفر کیا تھا، مؤرخین نے ان کو ذو رحلہ واسعۃ (یعنی کثیر الاسفار بتایا ہے) ابن مندہ اور حمیدی کا بیان ہے کہ ''رحلت اور طلب حدیث کیلئے ان کے سفر مشہور ہیں''۔

علم کی طلب و تحصیل میں تن آسانی کو ناپسند کرتے تھے، اپنے شاگردوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ طالبعلم بنتے ہو؟ اس طرح بھی علم کی طلب کی جاتی ہے کہ جب تم فارغ ہوتے ہو اور تم کو کوئی ضرورت نہیں ہوتی تو حصول علم کے لیے نکلتے ہو، میں نے ایسے جانباز اور شوقین طالب علم دیکھے ہیں جن کے پاس کھانے کے لیے درخت کے پتوں کے سوا کچھ نہ تھا اور انہوں نے کاغذ خریدنے کے لیے اپنے پائجامے تک بیچ دیئے۔

حدیث میں درجہ و مرتبہ:

امام بقی نے اس زمانہ کے دستور کے مطابق علم حدیث کی جانب زیادہ توجہ کی اور اس میں اتنا کمال پیدا کیا کہ ان کا شمار اکابر محدثین میں ہوتا ہے، مؤرخین اور علمائے سیر نے لکھا ہے کہ بالغ فی الجمع والروایۃ یعنی حدیث کی روایت و تحریر میں ان کو بڑا انہماک تھا، حفظ و ضبط اور صدق و ثقاہت میں بھی ممتاز تھے، علامہ ذہبی نے ان کو ثقہ حجت اور ثبت اور حافظ ابن عساکر نے الحافظ اور حمیدی نے من الحفاظ المحدثین لکھا ہے، حدیث کے ضبط و نقل میں ان کی احتیاط اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ انکو کمسنی میں سفیان ثوری کے بعض تلامذہ سے ملاقات و استفادہ کا موقع ملا تھا مگر ان سے روایت کرنے سے احتراز کیا۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۶۰۴ و تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۳۷۹)

تفقہ و اجتہاد:

فقہ و اجتہاد میں بھی بلند مرتبہ رکھتے تھے، کسی خاص امام یا مذہب کے پابند نہ تھے بلکہ خود فقیہ و مجتہد اور صاحب اختیارات تھے، حافظ ذہبی اور علامہ ابن عساکر وغیرہ نے لکھا ہے: و کان مجتھدا متخیر الا یقلد احدا (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص و تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۳۷۹) یعنی وہ مجتہد، صاحب اختیارات اور کسی امام کے مقلد نہ تھے۔

علوم کی اشاعت:

ایک بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ممالک مشرق سے واپسی کے بعد اندلس کی سرزمین کو احادیث و روایات کی نشر و اشاعت سے معمور کر دیا، حافظ ابن عساکر وغیرہ کا بیان ہے:

رجع الی الاندلس فملأھا علما جما۔

یعنی اندلس واپس آ کر اس کو علوم سے مملو کر دیا۔

متعدد اہم اور امہات کتب کو اندلس میں متعارف کرایا، مؤرخین کا بیان ہے:

کتب المصنفات الکبار وادخلھا الاندلس ونشر بھا علم الحدیث۔ (تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۳۷۹)

وہ بڑی اور بلند پایہ کتابوں کو نقل کر کے اندلس لائے اور یہاں علم کی اشاعت کی۔

ابن الفرضی نے تصریح کی ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الفقہ (الام) امام شافعی، کتاب التاریخ و کتاب الطبقات

Marfat.com

لخلیفہ بن خیاط اور سیر عمر بن عبدالعزیز کو وہی اندلس لائے اور اہل اندلس کو اس سے متعارف کرایا۔
(تاریخ العلماء والرواۃ الاندلس ص ۱۰۸ و ۱۰۹)

علم وفضل کا اعتراف:

محدثین اور ارباب کمال نے امام بقی کے دینی وعلمی کمالات کا اعتراف کیا ہے، علامہ ذہبی نے ان کو امام، قدوہ، احدالائمہ الاعلام، عدیم المثال اور یکتائے روزگار لکھا ہے، احمد بن ابی خثیمہ فرماتے ہیں کہ ''جس شہر میں بقی جلوہ فرما ہوں، وہاں کے کسی آدمی کو ہم لوگوں کے پاس آنے کی کیا ضرورت؟'' علامہ ابن حزم لکھتے ہیں کہ ''وہ امام احمد کے مخصوص اور ارشد تلامذہ میں تھے اور امام بخاری، مسلم اور نسائی کے ہمسر و مثیل تھے'' طاہر بن عبدالعزیز کا بیان ہے کہ میں نے مسند بقی کا ایک جزو محمد بن اسماعیل صائغ کو دکھایا تو انہوں نے فرمایا کہ ''یہ شخص بحر علم کا شناور ہے'' وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ''عراق سے واپسی کے بعد میں اپنے محترم استاذ یحییٰ بن بکیر کی خدمت میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو انہوں نے مجھے اپنے پہلو میں بٹھایا اور مجھ سے سات حدیثیں سنیں۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۴ و ۲۰۵ و تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۲۷۹ و تاریخ العلماء والرواۃ ص ۱۰۸)

بعض فقہا کی مخالفت:

دوسرے ارباب کمال کی طرح ان کو بھی علماء وفقہا کی ایک جماعت کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، وہ بڑے متبع سنت تھے، اس لیے مجتہدین اور فقہا کی تقلید کے بجائے براہ راست احادیث وآثار کی پیروی کرتے تھے، اس زمانہ میں اندلس میں فقہ مالکی کا غلبہ تھا، اس لیے عموماً لوگوں کو مؤطا اور اہل مدینہ کی حدیثوں سے زیادہ واقفیت تھی اور اس کے مقابلہ میں اہل عراق کے متعلق یہ بدگمانی تھی کہ وہ قلیل الاحادیث ہیں، چنانچہ بقی نے جب مصنف ابن ابی شیبہ کا جس کو وہ لائے تھے درس دینا اور احادیث کی نشر واشاعت شروع کی تو فقہا کی ایک جماعت مسائل میں اختلاف کو برداشت نہ کرسکی اور بقی کی مخالفت شروع کردی، عوام کو بھی ان کے خلاف بھڑکا دیا، ان کو مخالفت کے اس طوفان سے مجبور ہوکر درس وتدریس کا مشغلہ ترک کردینا پڑا، جب فرمانروائے اندلس محمد بن عبدالرحمن بن حکم اموی کو جو خود بھی صاحب علم اور علم وفن اور علما کا بڑا قدرشناس تھا، اس ہنگامہ کی خبر ہوئی تو اس نے شیخ الاسلام اور ان کے مخالفین کو طلب کیا اور مصنف ابن ابی شیبہ کو منگا کر خود اس کا مطالعہ کیا اور اس قدر پسند کیا کہ اپنے کتب خانہ کے لیے اس کی نقل فراہم کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ ہمارا کتب خانہ ایسی اہم کتاب سے خالی نہ ہونا چاہیے اور شیخ الاسلام سے کہا کہ آپ علم کی نشر واشاعت جاری رکھیں اور احادیث رسول کا جو ذخیرہ آپ کے پاس ہے اس سے لوگوں کو فیض یاب فرمائیں اور مخالفین کو بھی تنبیہ کی کہ ان سے آئندہ کسی قسم کا تعرض نہ کریں۔ (تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۲۷۸)

زہد وتقویٰ:

زہد ورع میں بھی ان کا پایہ بلند تھا، مؤرخین اور علمائے سیر نے ان کو متدین، زاہد اور صاحب تقویٰ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ ائمہ محدثین اور زہاد صالحین میں سے تھے۔

نماز:

شب بیدار اور نوافل وتہجد کے پابند تھے، یافعی نے متبتل اور ذہبی نے عابد و متہجد لکھا ہے۔

Marfat.com

تلاوتِ قرآن:

تلاوت قرآن سے اتنا شغف تھا کہ ہر رات کو تہجد کی نماز میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے۔

روزہ:

رمضان کے علاوہ بھی اکثر مسلسل روزے رکھتے تھے لیکن جمعہ کو افطار کرتے تھے۔

حج بیت اللہ:

تیس یا پینتیس مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے وطن سے دو بار بلاد مشرق تشریف لے گئے، پہلی مرتبہ بیس اور دوسری دفعہ چودہ سال تک وہاں مقیم رہے، دونوں مرتبہ ان کا معمول تھا کہ وہ سال بھر مختلف شہروں کے علمائے فن اور محدثین کی خدمت میں حاضر ہو کر علم وفن کی تحصیل کرتے تھے اور حج کے زمانہ میں مکہ معظمہ چلے جاتے اور حج وزیارت سے شرف اندوز ہوتے تھے۔

جہاد:

ان میں جہاد کا بھی جذبہ تھا، چنانچہ کئی جنگوں میں شریک ہوئے۔

دُعا کی برکت:

مستجاب الدعوات تھے اکثر لوگ ان کی دعا کی برکت وتاثیر کی وجہ سے ان سے دعا کی فرمائش کرتے تھے۔

اخلاق وعادات:

بڑے ستودہ صفات، متواضع اور خلیق تھے، لوگوں کے درد وغم میں شریک رہتے، ان کی حاجت روائی کرتے، مریضوں کی عیادت اور جنازوں میں شرکت معمول تھا، ہر نیک کام سے رغبت تھی، کبھی کسی سائل کو واپس نہ کرتے، اگر کچھ نہ ہوتا تو کپڑے تک دے دیتے۔

حق پسندی:

بڑے حق پسند اور حق گو تھے سچی بات کہنے میں کسی کی پروا نہ کرتے تھے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۴ و ۲۰۵ تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۲۷۸)

وفات:

مشہور اور صحیح روایت کے مطابق انہوں نے سہ شنبہ ۲۹ / جمادی الاخری ۲۷۶ھ کو اندلس میں وفات پائی، امام دارقطنی نے ۲۷۳ھ کی بھی روایت کی ہے لیکن یہ ضعیف ہے، محمد بن یزید نے نماز جنازہ پڑھائی اور بنو عباس کی جانب منسوب ایک قبرستان میں دفن کیے گئے۔ (تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۲۷۹ و تاریخ العلماء الاندلس ص ۱۰۹)

Marfat.com

حلیہ:

دراز قد تھے، داڑھی گھنی تھی، بالوں میں خضاب لگاتے تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۴)

تصنیفات:

علامہ بقی کثیر التصانیف اور صاحب کمال مصنف تھے، ابن عساکر نے لکھا ہے، انہوں نے نہایت عمدہ کتابیں لکھیں جو ان کی جامعیت، دقت نظر، کثرتِ مطالعہ اور وسعت معلومات پر شاہد ہیں، ان کی تصنیفات بے نظیر اور اسلام کی اہم بنیادی کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں'' (تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۲۷۹) مگر افسوس ہے کہ بہت سے قدما کی طرح ان کی کتابیں بھی ناپید ہو گئیں جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ فتاوائے صحابہؓ وتابعینؒ ومن دونہم۔

۲۔ کتاب التفسیر: اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ علامہ ذہبی و یافعی نے اس کو جلیل القدر بتایا ہے، علامہ ابن حزم کے خیال میں یہ لاجواب اور عدیم الشال تفسیر تھی، وہ اس کو تفسیر ابن جریر پر بھی ترجیح دیتے تھے۔

۳۔ ان کی تصنیفات میں مسند کبیر سب سے اہم اور عظیم الشان تصنیف ہے، جو ایک ہزار تین سے زیادہ صحابہؓ کی حدیثوں پر مشتمل ہے، حافظ ابن جوزی اور علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ سولہ سو سے زیادہ صحابہؓ کی حدیثیں اس میں درج تھیں، اس کی ترتیب فقہی ابواب پر ہے، اس لیے اس کو مصنف ومسند دونوں کہا جاتا ہے، ابن حزم کے حسب ذیل بیان سے اس کی اہمیت اور صحت واعتبار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

''اس کتاب کو انہوں نے صحابہؓ کے ناموں پر مرتب کیا ہے، اس میں ایک ہزار تین سو سے زیادہ کی روایات ہیں، ہر صحابی کی حدیث کو فقہ واحکام کے ابواب وعنوانات کے تحت نقل کیا گیا ہے، اس اعتبار سے یہ مسند بھی ہے اور مصنف بھی، میرے علم میں اس مرتبہ واہمیت کی اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، انہوں نے اپنی ثقاہت، ضبط، اتقان، حدیث میں جامعیت اور جودت شیوخ کے باوجود ایک سو چوراسی راویوں سے اس کی روایت کی ہے جو قریب قریب سب مشہور اور بلند پایہ محدث ہیں۔'' (تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص وکشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۱)

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ''ابن حزم نے اس کو مسند احمد بن حنبل پر ترجیح دی ہے، جو میرے خیال میں محل نظر ہے، مسند ابن حنبل اس سے بھی زیادہ جامع وجید کتاب ہے۔'' (البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۶)

Marfat.com

امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۷۹ھ)

نام ونسب:

امام موصوف نسباً قبیلہ بنی سلیم سے تعلق رکھتے تھے، محمد نام، ابوعیسیٰ کنیت ہے اور نسب نامہ یہ ہے:
محمد بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک، سلمی ترمذی بوغی، علامہ سمعانی نے ضحاک کے بجائے شداد لکھا ہے۔

(دیکھو کتاب الانساب نسبت ترمذی ورق ۱۰۶)

وطن:

خراسان اور ماوراء النہر کا خطہ ہمیشہ سے علم وفن اور ارباب کمال کا مرکز رہا ہے، تاریخ اسلام کے بہت سے نامور علما اسی خاک سے اٹھے، امام ابوعیسیٰ ترمذی بھی اسی مردم خیز سرزمین کے ایک فرزند تھے، صنعانیان کے مشہور ترمذ کو آپ کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہے، ترمذ کا لفظ، تِیرمذ، تِرمذ، تُرمذ تینوں طریقوں سے ہے لیکن عام طور پر ترمذی ہی مشہور ہے، یاقوت نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے، (معجم البلدان ج ۲ ص ۳۸۲ ذکر ترمذ) یہ شہر دریائے جیحون کے مشرقی کنارے پر بلخ کے محاذ میں کسی زمانہ میں بڑا آباد اور بارونق شہر تھا، یہاں بڑے بڑے اربابِ کمال پیدا ہوئے، سمعانی اور یاقوت نے بعض کے مختصر حالات لکھے ہیں، بوغی ایک قریہ بوغ کی جانب نسبت ہے، جو ترمذ سے چھ فرسخ کی مسافت پر ہے، بعض روایتوں کے مطابق امام ترمذی اسی میں آسودۂ خواب ہیں۔ (ابن خلکان ج ۲ ص ۳۸۳)

پیدائش:

امام موصوف ۲۰۹ھ میں ترمذ میں پیدا ہوئے، اس کی تفصیل نہیں ملتی کہ انہوں نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی لیکن اس زمانہ میں خراسان اور ماوراء النہر کا علاقہ علم وفن کا مرکز بن چکا تھا اور امام بخاری جیسے جلیل القدر محدث کی مسند علم بچھ چکی تھی اور دور دور کے تشنگانِ علم یہاں کھچ کھچ کر آتے تھے، اس سے قیاس یہی ہے کہ امام ترمذی نے ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی ہوگی۔

(ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۳)

سماع حدیث کے لیے سفر:

اسلام کی تعلیمات اور علم دین کی بنیاد کتاب اللہ کے بعد حدیث نبوی پر ہے، اس کے بغیر دین کا صحیح اور پورا علم نہیں ہو سکتا، اس لیے ہر دور میں مسلمانوں نے اس کی جانب بڑا اعتنا کیا، خصوصاً ابتدائی چند صدیوں میں اس کی اشاعت وحفاظت کا

Marfat.com

اتنا اہتمام کیا جس کی مثال دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کرسکتی، نفس حدیث کے متعلق بہت سے علوم ایجاد ہو گئے، حجاز، عراق، خراسان، ماوراء النہر، شام ومصر ومغرب وغیرہ دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں مرکز حدیث قائم ہو گئے تھے، حجاز کے بعد عراق وخراسان کو اس باب میں ایک خاص امتیاز حاصل رہا ہے، اکثر بڑے بڑے محدثین یہیں پیدا ہوئے، اس لیے ان مقامات میں حدیث کا ذوق وشوق عام تھا، امام بخاری کے علم وشہرت نے اس شوق کو اور بڑھایا، اسی ماحول میں امام ترمذی کی نشوونما ہوئی، خود ان کے وطن میں امام بخاری جیسے جلیل القدر محدث پیدا ہو چکے تھے، اس لیے امام ترمذی کو بھی حدیث نبوی کا شوق دامن گیر ہوا، چنانچہ انہوں نے خراسان اور ماوراء النہر کے علاوہ سماع حدیث کے لیے دنیائے اسلام کے مختلف حصوں کا سفر کیا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: طاف البلاد وسمع خلقا من الخراسانیین والعراقیین والحجاز۔ (تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۸۷) یعنی انہوں نے متعدد شہروں کا سفر کیا اور خراسان وعراق اور حجاز کے ارباب کمال سے سماع کیا۔

اساتذہ:

ان کے شیوخ کی تعداد بے شمار ہے، ان کے ناموں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اس دور کے ہر خرمن حدیث سے خوشہ چینی کی، ان میں امام بخاری ومسلم کے شیوخ بھی ہیں، ان سب کا استقصاء دشوار ہے، سمعانی اور ذہبی نے بعض ممتاز شیوخ کے نام لکھے ہیں، امام بخاری، مسلم، علی بن حجر مروزی، ہناد بن سری، ابوکریب، محمد بن العلا، محمد بن موسیٰ الزمن، محمد بن بشار، عبداللہ بن عبدالرحمن الدارمی، قتیبہ بن سعید، ابومصعب، ابراہیم بن عبداللہ ہروی، اسماعیل بن موسیٰ، سوید بن نصر، محمد بن عبدالملک، عبداللہ بن معاویہ جمحی، وغیرہ (کتاب الانساب نسبت ترمذی وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۷) یہ تمام شیوخ اپنے عہد کے جلیل القدر محدث تھے، اکثر اصحاب صحاح نے ان سے استفادہ کیا ہے، ان کے مختصر حالات یہ ہیں:

۱۔ ابوالحسن علی بن حجر بن ایاس سعدی مروزی بڑے متجر عالم اور اکابر حفاظ حدیث میں تھے، شعروادب کا بھی ذوق رکھتے تھے، حدیث کے علاوہ قرآن کے بڑے عالم تھے، ذہبی نے ان کی کتاب احکام القرآن کا ذکر کیا ہے ۲۴۴ھ میں وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳۶)

۲۔ ابوالسری ہناد بن سری تمیمی، بڑے عابد ومرتاض محدث تھے، ذہبی انہیں قدوہ، زاہد اور شیخ الکوفہ لکھتے ہیں، ساری عمر خلائق دنیوی سے آزاد ہو کر، عبادت وریاضت میں بسر کی، زہد وعبادت کی وجہ سے کوفہ کے راہب کہلاتے تھے، امام احمد لوگوں کو ان کی جانب رجوع کرنے کا مشورہ دیتے تھے، زہد پر ایک کتاب بھی لکھی تھی، ۲۴۳ھ میں وفات پائی۔ (ایضا ص ۹)

۳۔ ابوکریب محمد بن العلا بڑے جلیل القدر حافظ تھے، کوفہ میں ان کا کوئی مقابل نہ تھا، حفظ حدیث میں وہ اپنے شیوخ سے بھی زیادہ معتبر مانے جاتے تھے، انہوں نے کوفہ میں تین لاکھ حدیثوں کی اشاعت کی، ان کے ایک شاگرد موسیٰ بن اسحاق نے ان سے ایک لاکھ حدیثیں سنی تھیں، ۲۴۸ھ میں وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۰)

۴۔ ابوبکر محمد بن بشار بن عثمان عبدلی، بصرہ کے بڑے حافظ حدیث تھے، ان کے تلامذہ کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے، ان کی روایات میں بعض محدثین نے کلام کیا ہے لیکن ان کا درجہ اس سے ظاہر ہے کہ بخاری ومسلم ان سے حدیثیں لیتے تھے، ۲۵۲ھ میں وفات پائی۔ (تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۷۰، ۷۱)

۵۔ ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمن تمیمی، دارمی، سمرقند کے جلیل القدر عالم اور حافظ حدیث تھے، ان کی علمی جلالت اور حفظ

Marfat.com

حدیث پر محدثین کا اتفاق ہے، امام احمد بن حنبل انھیں امام حدیث کہتے تھے، فقہ وتفسیر میں بھی کمال حاصل تھا، زہد وورع میں بھی ممتاز تھے، محمد بن ابراہیم کا بیان ہے کہ وہ عقل ودیانت کے انتہائی درجہ پر تھے، ان کا علم حفظ ودرایت اور زہد وعبادت ضرب المثل تھا، سمرقند میں انہی کی ذات سے حدیث وآثار کی اشاعت ہوئی، وہ مفسر کامل اور فقیہ عالم تھے، فن حدیث وتفسیر میں ان کی تصانیف ہیں، ابن حبان لکھتے ہیں کہ وہ حافظ ومتقن اور زاہد ومتورع تھے، انہوں نے حفظ کے ساتھ حدیثوں کو جمع کیا، ان کو سمجھا، اس پر کتاب لکھی، سنت کو پھیلایا، اس کی حفاظت کی، اس کی دعوت دی، اس کے مخالفوں کو مٹایا، خطیب لکھتے ہیں کہ انہوں نے حدیث کی تلاش میں بڑے طویل سفر کیے، وہ حفظ واتقان، صدق وورع، زہد وعبادت تمام کمالات کے جامع تھے، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی سب نے ان سے فیض حاصل کیا ہے، دنیاوی وجاہت سے بھاگتے تھے، ایک مرتبہ اصرار سے مجبور ہو کر عہدۂ قضا قبول کر لیا تھا لیکن پھر ایک ہی فیصلہ کے بعد مستعفی ہو گئے، ۲۵۵ھ میں وفات پائی۔

(تہذیب ج ۵ ص ۲۹۶)

۶۔ ابورجا قتیبہ بن سعید بلخی بغلانی، خراسان کے نامور حافظ حدیث تھے، حافظ ذہبی انھیں شیخ الحفاظ اور محدثِ خراسان لکھتے ہیں، ان کے حفظ پر محدثین کا اتفاق ہے، دولت علم کے ساتھ دولت دنیا سے بھی بہرہ ور تھے، ۲۴۰ھ میں وفات پائی۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳۲)

۷۔ ابومصعب احمد بن ابی بکر زہری امام مالک کے شاگرد رشید اور مدینہ منورہ کے مشہور محدث، فقیہ اور قاضی تھے، فقہ میں ان کا پایہ بلند تھا، ذہبی انھیں امام الفقہ لکھتے ہیں، اہل مدینہ کے مذاہب پر بڑی وسیع نظر تھی، ابن حجر نے سن وفات ۲۴۲ھ اور ذہبی نے ۲۹۹ھ لکھا ہے۔ (تہذیب ج ۱ ص ۲۰ وتذکرہ ج ۲ ص ۲۷)

۸۔ ابواسحاق ابراہیم بن عبدالرحمٰن ہروی، اصل وطن ہرات تھا لیکن بغداد میں متوطن ہو گئے تھے، ہرات کے ممتاز حفاظ میں تھے۔ (تہذیب تذکرۂ ابراہیم)

۹۔ ابومحمد بن اسماعیل بن موسیٰ فزاری کوفہ کے محدث تھے، ان کے تشیع کی وجہ سے بعض محدثین نے ان کی روایات میں کلام کیا ہے لیکن ابن حبان نے ثقات میں لکھا ہے اور بخاری، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے ان سے روایت کی ہے، ۲۴۵ھ میں وفات پائی۔ (تہذیب ج ۱ ص ۳۳۵ و۳۳۶)

۱۰۔ ابوبکر محمد بن عبدالملک، امام احمد بن حنبل کے خاص اصحاب میں ہیں، بغداد کے محدث تھے، طلب حدیث میں بڑے طویل سفر کیے، تمام اصحابِ سنن نے ان سے روایتیں لی ہیں ۲۵۸ھ میں وفات پائی۔ (تذکرہ ج ۲ ص ۱۳۳)

۱۱۔ ابوجعفر عبداللہ بن معاویہ جمحی بصرہ کے محدث تھے، ابن حبان نے ثقات میں لکھا ہے، اصحاب صحاح میں ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ کے شیخ تھے ۲۴۳ھ میں وفات پائی۔ (تہذیب ج ۶ ص ۳۸)

حافظہ

امام ترمذی کے لیے قدرت کی جانب سے حفظ کے تمام سامان فراہم ہو گئے تھے، ایک طرف شیوخ میں ایسے اکابر محدثین سے استفادہ کا موقع ملا، دوسری طرف حافظہ نہایت قوی تھا، ان کا ایک حیرت انگیز واقعہ رجال کی تقریباً سب کتابوں میں موجود ہے کہ انہوں نے ایک شیخ سے ایک جزو کے بقدر حدیثیں قلم بند کیں، اتفاق سے تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان کو پھر

Marfat.com

ان سے ملاقات کا اتفاق ہوا، انہوں نے شیخ مذکور سے دوبارہ سماع حدیث کی درخواست کی، شیخ نے سنانا شروع کی، امام ترمذی کے ہاتھ میں ایک سادہ بیاض تھی، شیخ کو شبہ ہوا کہ اس میں وہ حدیثیں لکھی ہوئی ہیں، ابوعیسیٰ امتحاناً ایسا کررہے ہیں، اس لیے ان کو ناگوار ہوا، ابوعیسیٰ نے یہ غلط فہمی دور کر کے کہا کہ مجھے آپ کی حدیثیں حفظ ہیں اور اسی وقت کل حدیثیں سنا دیں، شیخ نے کہا معلوم ہوتا ہے تم نے میرے پاس آنے سے پہلے ان کو حفظ کرلیا تھا، ابوعیسیٰ نے کہا نہیں، اگر آپ کو شبہ ہو تو دوسری حدیثیں سنا کر امتحان کر لیجئے، شیخ نے امتحاناً چالیس غریب حدیثیں سنائیں، ابوعیسیٰ نے صرف ایک مرتبہ سن کر اسی وقت چالیس حدیثیں دہرادیں، یہ غیر معمولی حافظہ دیکھ کر شیخ کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ (بستان ص ۱۲۱)

اعتراف کمال:

یوں تو امام ترمذی نے بہت سے شیوخ سے استفادہ کیا تھا لیکن جس سے ان کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا، وہ امام بخاری ہیں، وہ امام بخاری کے خاص تلامذہ میں تھے، ان کے فیض اور امام ترمذی کے حافظہ، ذوق و شوق اور تلاش و جستجو نے ان کو اس عہد کا امام بنادیا، ان کے علم و کمال پر تمام محدثین اور علما کا اتفاق ہے، ابن حبان لکھتے ہیں کہ امام ترمذی ان لوگوں میں تھے جنہوں نے حدیثوں کا ذخیرہ جمع کیا، اس پر تصنیف کی اور انھیں حفظ کیا، حافظ ذہبی اور ابن حجر دونوں ان کو امام حدیث لکھتے ہیں، امام بخاری کے بعد خراسان میں ان سے بڑا کوئی محدث نہ تھا: "مات البخاری و لم یخلف بخراسان مثل ابی عیسیٰ فی العلم و الورع" وہ امام بخاری کے خلیفہ شمار کیے جاتے تھے، خود امام بخاری کو لائق شاگرد پر ناز تھا اور انہوں نے ان الفاظ میں ان کے کمال علم کی سند عطا کی تھی کہ تم نے مجھ سے جتنا فائدہ حاصل کیا، اس سے زیادہ میں نے تم سے حاصل کیا، (تہذیب ج ۹ ص ۳۸۹ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۸ و بستان المحدثین ص ۱۲۱) اس سند کے بعد امام ترمذی کے لیے اور کسی سند کی ضرورت نہیں رہ جاتی، امام بخاری نے ان سے ایک حدیث روایت کی ہے۔

تلامذہ:

ان کے علمی کمالات نے ان کی ذات کو طالبان حدیث کا مرجع بنادیا تھا، ان کے تلامذہ میں خراسان اور ترکستان کے علاوہ دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں کے آدمیوں کے نام ملتے ہیں، چند ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابو حامد احمد بن عبداللہ بن داؤد مروزی، ہیثم بن کلیب الشاشی، محمد بن محبوب، ابوالعباس محبوبی مروزی، احمد بن یوسف نسفی، ابوالحارث اسد بن حمدویہ، داؤد بن نصر بن سہل بزدوی، عبد بن محمد بن محمود نسفی، محمود بن نمیر، محمد بن محمود، محمد بن مکی بن نوح، ابوجعفر محمد بن سفیان بن النظر، محمد بن المنذر وغیرہ۔ (تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۸۷)

تفسیر:

حدیث امام ترمذی کا خاص فن تھا، اس کے علاوہ تفسیر میں پورا درک اور فقہ میں کمال رکھتے تھے، ترمذی میں انہوں نے ابواب تفسیر کے تحت میں آیات قرآنی کے متعلق جو احادیث نبوی اور آثار صحابہ جمع کیے ہیں ان سے تفسیر کے متعلق ان کے علم و نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

Marfat.com

فقہ:

حفظ حدیث کے ساتھ وہ مجتہد فقیہ تھے، ان کے تفقہ پر جامع ترمذی شاہد ہے، ترمذی کا خاص امتیاز یہی ہے کہ وہ محض احادیث کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ فقہی اجتہاد کی کتاب بھی ہے، اس میں امام ترمذی نے مختلف ائمہ کے فقہی مذاہب، ان کے استنباطات اور دلائل کو جمع کر دیا ہے اور جابجا اس پر تنقید بھی کرتے گئے ہیں، مزید بحث آئندہ آئے گی۔

عملی زندگی:

امام ترمذی میں جس درجہ کا علم تھا، اسی درجہ کا عمل اور زہد وتقویٰ بھی تھا، وہ زہد و ورع میں بھی امام بخاری کے جانشین تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

مات البخاری ولم یخلف بخراسان مثل ابی عیسٰی فی العلم والحفظ والورع والزھد۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۸)

خشیت الٰہی:

ان کا دل خشیت الٰہی سے اتنا لبریز تھا کہ ہر وقت رویا کرتے تھے اور روتے روتے آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۸) لیکن دل کی آنکھیں روشن ہوگئی تھیں، بعض روایتوں میں ہے کہ وہ پیدائشی نابینا تھے لیکن یہ صحیح روایتوں کے خلاف ہے اور یوں بھی خلاف قیاس ہے، اس لیے کہ ایک نابینا کا ایسے زمانہ میں جب کہ سفر کی سہولتیں نہ تھیں ساری دنیائے اسلام کی خاک چھاننا عقل سے بعید ہے اور طلب حدیث کے لیے امام ترمذی کی سیاحت مسلّم ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب:

امام ترمذی کا زمانہ ائمہ اربعہ کے بعد ہے لیکن وہ ان میں سے کسی کے مقلد نہ تھے بلکہ خود مجتہد تھے، بعض مسائل میں امام احمد بن حنبل اور امام شافعیؒ کی تائید سے بعضوں کو یہ گمان ہوا کہ وہ شافعی یا حنبلی تھے لیکن اس سے ان کی تقلید کا نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے، انہوں نے بعض مسائل میں ان کی مخالفت بھی کی ہے، مثلاً گرمی کی شدت میں نماز ظہر کی تاخیر کے مسئلہ میں ان کی رائے امام شافعیؒ کے خلاف ہے، وہ اپنی تحقیق سے جو رائے دیتے تھے، کبھی کسی کے موافق پڑ جاتی تھی اور کبھی مخالف، اس لیے کسی امام کی تائید سے ان کو اس کا مقلد سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

ایک التباس کا ازالہ:

امام ابوعیسیٰ ترمذی کے علاوہ دو اور محدثین ترمذی کی نسبت سے مشہور ہیں، ایک ابوعبداللہ محمد بن علی المعروف بحکیم الترمذی، دوسرے ابوالحسن احمد بن حسن ترمذی، یہ دونوں صاحب تصنیف ہیں، حدیث میں حکیم ترمذی کی نوادر الاصول مشہور کتاب ہے لیکن یہ بہت غیر معتبر ہے، اس لیے نام سے دھوکا نہ کھانا چاہیے، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

"حکیم ترمذی ابوعیسیٰ ترمذی کے علاوہ دوسرے شخص ہیں، حکیم ترمذی کی نوادرالاصول کی اکثر حدیثیں غیر معتبر ہیں، ناواقف حکیم ترمذی کو ابوعیسیٰ ترمذی سمجھ کر ان کی غیر معتبر حدیثیں امام ترمذی کی جانب منسوب کر دیتے ہیں، ان دونوں میں فرق

Marfat.com

کرنا ضروری ہے۔ (بستان المحدثین ص ۶۸) ابوالحسن ترمذی البتہ بڑے پایہ کے محدث ہیں امام احمد بن حنبل کے اصحاب میں تھے، بخاری، ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ نے ان سے روایتیں کی ہیں، ۲۴۰ھ میں وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۷)

وفات:

مشہور روایت کے مطابق امام ترمذی نے ۲۷۹ھ میں وفات پائی۔ (اتحاف النبلاء ص ۲۸۷)

تصانیف:

مؤرخین کے اجمالی بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ترمذی کی بہت سی تصانیف تھیں لیکن ان کی تین تصانیف کا علم ہے، جامع یا سنن ترمذی، شمائل ترمذی اور کتاب العلل، ابن ندیم نے تین کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، ان میں دو تو ترمذی اور کتاب العلل ہیں لیکن تیسری کا نام اس نے کتاب التاریخ لکھا ہے۔ (فہرست ابن ندیم ۳۲۵)

جامع ترمذی سے پہلے کی کتب حدیث:

امام ترمذی سے بہت پہلے مسلمانوں میں نہ صرف حفظ وطلب حدیث بلکہ اس کی تدوین کا بھی شوق پیدا ہو گیا تھا اور محدثین کی یادداشتوں کے علاوہ باقاعدہ مرتب ،مبوب کتابیں مرتب ہو چکی تھیں، خود ترمذی کے زمانہ میں بھی حدیث کی مختلف قسموں کے مجموعے مرتب ہوئے، ان میں اولیت کا سہرا امام دارالہجرۃ امام مالک کے سر ہے۔

مؤطا کے علاوہ اس وقت تک حدیث کی جو کتابیں تالیف ہو چکی تھیں، ان میں سے بعض قابل ذکر کتابوں کے نام یہ ہیں: مسند ابوداؤد طیالسی المتوفی ۲۰۴ھ، مصنف عبدالرزاق بن ہمام المتوفی ۲۱۱ھ مسند عبداللہ بن زبیر حمیدی المتوفی ۲۱۹ھ، سنن سعید بن منصور المتوفی ۲۲۷ھ، مصنف عبداللہ بن محمد المعروف بہ مصنف ابن ابی شیبہ المتوفی ۲۳۵ھ، مسند عبداللہ بن حمید الکشی المتوفی ۲۴۰ھ، مسند احمد بن حنبل المتوفی ۲۴۱ھ، مسند عبداللہ بن عبدالرحمٰن تمیمی دارمی المتوفی ۲۵۵ھ، صحیح محمد بن اسماعیل بخاری المتوفی ۲۵۶ھ، صحیح مسلم بن حجاج المتوفی ۲۶۱ھ، سنن ابن ماجہ المتوفی ۲۷۳ھ، سنن ابی داؤد المتوفی ۲۷۵ھ، مسند یحییٰ بن عبدالحمید حمانی المتوفی ۲۲۸ھ، مسند نعیم بن حماد خزاعی المتوفی ۲۲۸ھ، مسند مسدد بن مسرہد المتوفی ۲۲۸ھ، مسند اسحاق بن راہویہ المتوفی ۲۳۸ھ۔ [1]

ان کے علاوہ اور بھی کتابیں ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام ترمذی سے پہلے کتنے راہ رو اس دشوار گزار منزل سے گزر چکے تھے، گو ان میں سے زیادہ تر مؤطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو حسن قبول کا درجہ حاصل ہوا لیکن اعتبار اور استناد سے بعض اور کتابیں بھی محروم نہ رہیں، ان کی موجودگی میں حدیث کی کسی اور کتاب کی تالیف کا خیال اور اس کا حسن قبول پانا اور بھی دشوار تھا، اس لیے امام ترمذی نے گزشتہ کتابوں سے الگ اپنی راہ نکالی اور اپنی کتاب میں ایسی خصوصیات پیدا کیں جن سے گزشتہ کتابیں خالی تھیں، اس سے نہ صرف یہ کتاب اپنی ماسبق کتابوں سے ممتاز ہوگئی، بلکہ فائدہ کے لحاظ سے بھی سب سے بڑھ گئی، اس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

---

[1] (ان کتابوں کی تفصیل کے لیے دیکھو بستان المحدثین شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی) (اصحاب ستہ کے شرائط بہت سی کتابوں میں ہیں، ہمارے پیش نظر ابوبکر حازمی کی شروط الائمۃ الخمسہ ہے)

Marfat.com

جامع ترمذی:

تمام فنون خصوصاً فن حدیث میں کمیت سے زیادہ اس کی کیفیت نقص وکمال کا معیار ہے، یعنی روایت اور درایت کے اصول کے اعتبار سے صحیح حدیثوں کا مختصر مجموعہ معلل حدیثوں کے ضخیم مجموعوں سے کہیں بہتر ہے، اسی معیار سے ہم کو جامع ترمذی کا جائزہ لینا چاہیے، ترمذی کا درجہ صحت اس سے ظاہر ہے کہ امت نے اس کو صحاح کا درجہ دیا اور ترتیب میں اس کو صحیحین کے بعد ہی جگہ ملی۔

حدیث کی صحت وعدم صحت کا مدار دو چیزوں پر ہے، رواۃ کی حیثیت اور سلسلۂ سند کی کیفیت، اصول حدیث کے رو سے رواۃ کے بارے میں سب اصحاب صحاح کے بنیادی شرائط تقریباً یکساں ہیں، یعنی راوی کا اسلام، فہم وفراست، صداقت، عدم تدلیس، عدالت مع جملہ شرائط حفظ، ضبط، تیقظ، عدم وہم، سلامت ذہن اور صحت عقیدہ سب کے نزدیک ضروری شرائط ہیں۔ (اصحاب ستہ کے شرائط بہت سی کتابوں میں ہیں، ہمارے پیش نظر ابوبکر حازمی کی شروط الائمۃ الخمسہ ہیں) پھر ان اوصاف میں کمی وزیادتی کے اعتبار سے رواۃ کے مدارج قائم ہو جاتے ہیں، اور ان مدارج اور سند کی حیثیت اور اس کے اقسام کے اعتبار سے حدیث کی صحت وعدم صحت اور نقص وکمال سے اختلاف شروع ہو جاتا ہے، مثلاً امام بخاری اور مسلم عموماً وہی حدیثیں قبول کرتے ہیں جن کے راویوں کی ثقاہت وعدالت متفق علیہ ہو، جرح وتعدیل کے رو سے بالکل مامون ومصؤن ہوں، سند نقائص سے پاک ہو، بلکہ حاکم نے صحیحین کے شرائط میں ایک روایت کے لیے ان اوصاف کے دو راویوں کے ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن یہ شرط کلیہ کی صورت میں صحیح نہیں ہے کیونکہ امام بخاری کی تمام روایتیں اس شرط کے مطابق نہیں ہیں، البتہ اس کا بڑا حصہ اسی قسم کا ہے۔

اسی ترمذی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ روایت کسی نہ کسی امام یا محدث کی معمول بہا ہونا چاہیے، خواہ راوی اور سند اصول حدیث کے رو سے یکسر نقائص سے پاک نہ ہو، چنانچہ وہ چوتھے طبقہ تک کے راویوں کی روایتیں قبول کر لیتے ہیں اور صحیح، مسلسل اور مرفوع روایتوں کے ساتھ ضعیف، مرسل، منقطع اور مضطرب روایتوں کو بھی رد نہیں کرتے لیکن عموماً اس قسم کی روایتوں کو وہ شواہد اور متابعات کی حیثیت سے لیتے ہیں یعنی ایک صحیح روایت کے ساتھ اس کی تائید میں دوسری معطل روایت قبول کرتے ہیں لیکن وہ ہر روایت کا عیب وہنر اور نقص وکمال بھی ظاہر کر دیتے ہیں، اس لیے پڑھنے والے کو اس کی حیثیت اور درجہ کا علم ہو جاتا ہے یہ خصوصیت ترمذی کے علاوہ صحاح کی اور کسی کتاب میں نہیں ہے۔

جامع ترمذی کی خصوصیات:

گو صحاح میں ترتیب کے لحاظ سے ترمذی کا درجہ صحیحین کے بعد ہے لیکن اس کی خصوصیات کی وجہ سے اس کا افادہ صحاح کی تمام کتابوں سے زیادہ عام ہے، شیخ الاسلام اسماعیل ہروی لکھتے ہیں کہ ترمذی بخاری اور مسلم سے زیادہ فائدہ بخش ہے، ان دونوں کتابوں سے صرف صاحب کمال اور صاحب نظر فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ترمذی نے احادیث کی ضروری شرح بھی کر دی ہے، اس لیے اس سے محدثین اور فقہا وغیرہ ہر طبقہ کے لوگ مستفید ہو سکتے ہیں، (مقدمہ احوذی) ترمذی کی یہ خصوصیات حسب ذیل ہیں:

Marfat.com

ا۔اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تمام حدیثیں کسی نہ کسی امام، محدث، یا فقیہ کی معمول بہا ہیں، یعنی ہر روایت کسی نہ کسی صاحب علم کے نزدیک صحیح، اسقام سے پاک، لائق حجت اور قابل عمل ہے، صرف دو حدیثیں اس سے مستثنیٰ ہیں، ایک یہ کہ "رسول اللہ ﷺ نے بغیر خوف وخطر یا سفر اور بارش کی رخصت کے مدینہ میں ظہر اور عصر کی نمازیں ایک ساتھ پڑھیں۔" دوسری یہ کہ "جب کوئی شراب پیئے تو اس کے کوڑے لگاؤ، تین مرتبہ سزا کے بعد بھی اگر باز نہ آئے تو قتل کردو۔"
(کتاب العلل ص ۶۴۶)

۲۔دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ایک طرف اس میں روایات کی تکرار بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے، دوسری طرف ایک مسئلہ کے متعلق مختلف روایتوں کی جانب اشارہ بھی کر دیا ہے، مثلاً ایک روایت نقل کرنے کے بعد لکھ دیتے ہیں کہ اس باب میں فلاں فلاں راویوں سے بھی حدیث مروی ہے اور اس روایت کے متن میں جو کمی یا زیادتی ہوتی ہے اس کو بھی ظاہر کر دیتے ہیں۔

۳۔تیسری خصوصیت یہ ہے کہ جرح وتعدیل کے رو سے جس روایت یا سند میں جو عیب وہنر ہوتا ہے، اس کو ظاہر کر دیتے ہیں، مثلاً یہ حدیث صحیح ہے، حسن ہے، ضعیف ہے، مضطرب ہے، مرسل ہے، منقطع ہے، غیر محفوظ ہے، سند قوی نہیں ہے، فلاں راوی متکلم فیہ ہے، اس کے حفظ میں کلام ہے، یا نسیان ہے، وغیر ذالک، جس سے پڑھنے والے کو اس کی حیثیت اور درجہ کا علم ہو جاتا ہے۔

۴۔چوتھی یہ کہ فقہی حدیثوں میں فقہا کے مذاہب، ان کے استنباطات دلائل اور ان کے اختلافات اور اس پر اپنی رائے بھی ظاہر کر دیتے ہیں مثلاً اس حدیث سے فلاں امام نے احتجاج واستدلال کیا ہے، اس میں یہ اختلاف ہے، یا اس کا استدلال صحیح نہیں ہے۔اس سے ائمہ کے مذاہب اور ان کے اختلافات کا بھی علم ہو جاتا ہے، اس خصوصیت نے ترمذی سے فقہی استفادہ کو بہت آسان کر دیا ہے۔

۵۔پانچویں یہ کہ رواۃ کے ناموں کنیتوں اور القاب کے اجمال کی تفصیل کر دی ہے۔

اس کی ان خصوصیات نے ترمذی کی افادی حیثیت کو بھی بڑھا دیا ہے، ابن اثیر جزری لکھتے ہیں کہ حسن ترتیب مکررات کی کمی اور فائدہ کی زیادتی کے لحاظ سے ترمذی حدیث کی بہترین کتابوں میں ہے، اس کے علاوہ اور کسی کتاب میں مختلف مذاہب، ان کے وجوہ استدلال اور حسن وغریب حدیث کے اقسام کی تفصیل نہیں ہے۔" (جامع الاصول و ص ۱۰۳)

شمائل ترمذی کے محشی شیخ ابراہیم بن محمد شافعی باجوری کہتے ہیں کہ امام ترمذی کی جامع تمہارے لیے کافی ہے، وہ تمام حدیثی اور فقہی فوائد اور سلف وخلف کے مذاہب کی جامع مجتہد کے لیے کافی اور مقلد کو دوسری کتابوں سے بے نیاز کرنے والی ہے۔(مواہب لدنیہ ص ۷)

شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک جامع ترمذی، بخاری، مسلم اور ابوداؤد تینوں کی بعض اچھی خصوصیات کی جامع ہے اور اس میں ان سے زیادہ مفید باتیں ہیں، چنانچہ وہ بخاری، مسلم اور ابوداؤد کی خصوصیات بتانے کے بعد لکھتے ہیں:

چوتھے ابوعیسیٰ ترمذی ہیں، انہوں نے بخاری، مسلم اور ابوداؤد کی بعض خصوصیات کو اپنی کتاب میں جمع کر دیا ہے، شیخین کے طریقہ پر متون اور اسناد کے ابہام کی تفصیل کر دی ہے اور ابوداؤد کے طریقہ پر ان احادیث کو جمع کر دیا ہے جن پر کسی کا

Marfat.com

عمل ہے اوران تینوں پر یہ اضافہ ہے کہ صحابہ اور مختلف ملکوں کے فقہا کے مذاہب کا بھی ذکر کر کے اپنی کتاب کو جامع بنا دیا ہے، طرق حدیث کا نہایت لطیف اختصار کیا ہے، اس طرح کہ ایک حدیث نقل کر کے دوسرے طرق کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور ہر حدیث کے عیب وہنر کو ظاہر کر دیا ہے کہ صحیح یا حسن یا ضعیف یا منکر ہے اور وجہ ضعف بھی بتادی ہے تا کہ طالب کو قابل اعتبار اور نا قابل اعتبار حدیث سے واقفیت ہو جائے، جس کا نام بتانے کی ضرورت تھی، اس کا نام لے لیا ہے جس کی کنیت کی ضرورت تھی، اس کی کنیت بتادی ہے، غرض انہوں نے صاحب علم کے لیے کوئی چیز مخفی نہیں چھوڑی ہے، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جامع ترمذی مجتہد کے لیے کافی اور مقلد کے لیے دوسری کتابوں سے بے نیاز کرنے والی ہے، (حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۲۱) شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی رقمطراز ہیں کہ ''یہ جامع ترمذی حدیث کی بہترین کتابوں میں ہے بلکہ بعض وجوہ اور حیثیات سے حدیث کی تمام کتابوں سے بہتر ہے، ایک ترتیب وعدم تکرار کی حیثیت سے دوسرے فقہا کے مذاہب اور ان کے استدلال کے ذکر کی حیثیت سے، تیسرے حدیث کے اقسام صحیح، حسن، ضعیف، غریب اور معلل بعلل کے ذکر کی حیثیت سے، چوتھے رواۃ کے نام، ان کے القاب اور کنیتوں اور علم رجال کے متعلق دوسرے فوائد کی حیثیت سے۔ (بستان المحدثین ص ۱۲۱)

ابن حزم کی تنقید:

امام ترمذی کی علمی جلالت اور جامع ترمذی کی مذکورہ بالا خصوصیات کے باوجود اس پر بعض محدثین نے تنقید بھی کی ہے، ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز امام ابن حزم کا امام ترمذی کو مجہول لکھنا ہے لیکن ان کے اس بیان کو بالاتفاق محدثین نے رد کیا ہے اور اس کو امام ترمذی سے ابن حزم کی ناواقفیت کا نتیجہ قرار دیا ہے، چنانچہ حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں:

''حافظ العلم ابوعیسیٰ ترمذی کی ثقاہت متفق علیہ ہے اور ان کے بارے میں ابومحمد بن حزم کا یہ قول کہ وہ مجہول ہیں، نا قابل توجہ ہے، درحقیقت ابن حزم ان سے اور ان کی کتاب جامع اور علل سے واقف ہی نہ تھے۔'' (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۱۷)

حافظ ابن حجر امام ترمذی کے کمالات لکھنے کے بعد فرماتے ہیں:

''ابومحمد بن حزم نے ترمذی کو مجہول لکھ کر اپنی ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے، وہ غالباً ترمذی سے واقف ہی نہ تھے اور نہ ان کو ان کے حفظ اور تصانیف کی خبر تھی، ابن حزم نے اس قسم کے الفاظ بعض اور مشہور ثقات حفاظ مثلاً امام ابوالقاسم بغوی، اسماعیل بن محمد الصفار اور ابوالعباس الاصم وغیرہ کے متعلق بھی استعمال کیے ہیں، یہ البتہ تعجب انگیز امر ہے کہ حافظ ابن الفرضی نے اپنی کتاب ''المؤتلف والمختلف'' میں ترمذی کے رتبہ کے مطابق ان کا تذکرہ کیا ہے، اس پر ابن حزم کی نظر کیسے نہیں پڑی۔''

(تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۸۸)

موضوعات ابن جوزی اور جامع ترمذی:

اس سلسلہ میں دوسری چیز یہ ہے کہ ابن جوزی نے موضوعات میں ترمذی کی ۲۳ روایتوں کو موضوع شمار کیا ہے لیکن محدثین نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے، اس بارے میں ابن جوزی کا تشدد مشہور ہے، جس طرح حاکم حدیث کی تحسین کرنے میں غیر محتاط ہیں، اسی طرح ابن جوزی موضوع کہہ دینے میں متشدد ہیں اور ان دونوں کا یہ تشدد وتساہل مشہور ہے، ابن جوزی نے ترمذی کے علاوہ صحاح کی بعض اور کتابوں بلکہ صحیح مسلم تک کی بعض روایات کو موضوع کہہ دیا ہے، محدثین نے ان کے اس تشدد

Marfat.com

پر بحث کی ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ:

''ابن جوزی کی موضوعات میں زیادہ تر موضوع حدیثیں ہیں اور قابل تنقید حدیثوں کے مقابلہ میں ناقابل تنقید حدیثیں بہت کم ہیں، پھر بھی اس میں ایک خرابی یہ ہے کہ ابن جوزی بعض ان حدیثوں کو بھی جو موضوع نہیں ہیں، موضوع گمان کر لیتے ہیں جس طرح حاکم میں یہ نقص ہے کہ وہ غیر صحیح حدیث کو بھی صحیح کہہ دیتے ہیں، ان دونوں کے اس تشدد و تساہل کی وجہ سے ان کی کتابوں سے ماہر فن کے علاوہ دوسرا فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اس لیے کہ ان کی ہر نقل کردہ حدیث میں اس تساہل اور بے احتیاطی کا امکان رہتا ہے'' حافظ سیوطی نے القول الحسن فی الذب عن السنن میں ثابت کیا ہے کہ ترمذی کی روایتیں موضوع نہیں ہیں۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۸۰)

ایک اعتراض و اشکال اور اس کا جواب:

امام ترمذی پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے جامع ترمذی کی روایات کی تحسین و تصحیح میں تساہل سے کام لیا ہے اور وہ ایک ہی حدیث کو حسن صحیح، حسن غریب تک کہہ دیتے ہیں، حالانکہ کسی ایک حدیث میں ایک ساتھ ان تینوں اوصاف یا ان میں سے کسی دو کا اجتماع نہیں ہو سکتا، محدثین نے اس کے مختلف جوابات دیے ہیں۔

درحقیقت یہ اعتراض اور اشکال اس لیے پیش آتا ہے کہ حدیث، حسن، صحیح اور غریب کے ایک متعین معنی ایک خاص تعریف اور ایک قسم کو معیار قرار دے کر اس پر ترمذی کے حسن، صحیح اور غریب کو منطبق کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے اگر ان حدیثوں کے جملہ مراتب و درجات ان کے اقسام ان کی مختلف نوعیتوں اور اس بارے میں محدثین کے اختلافات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ اشکال پیدا نہیں ہو سکتا، اولاً ترمذی خود مجتہد تھے، انہوں نے اصطلاحوں کے مروجہ معنی کو بجنسہٖ قبول نہیں کیا تھا بلکہ ان کی بعض اصطلاحوں کا مفہوم عام اصطلاحوں سے مختلف تھا، مثلاً حسن کی مشہور تعریف یہ ہے کہ جس کا مخرج معلوم ہو اور اس کے رجال مشہور ہوں، (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۳) لیکن ترمذی کے نزدیک حسن وہ ہے جس کا کوئی راوی کذب سے متہم نہ ہو اور روایت شاذ نہ ہو (کتاب العلل ص ۶۵۳ مطبع العلوم دہلی) اور جیسا کہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے مقدمہ شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ یہ بھی حسن کی محض ایک قسم کی تعریف ہے، (مقدمہ تحفۃ الاحوذی) نیز امام ترمذی نے خود اس کی تصریح کر دی ہے کہ جس حدیث کو انہوں نے حسن کہا ہے، اس سے عام محدثین کی اصطلاح نہیں بلکہ ان کا حسن مراد ہے۔ (کتاب العلل ص ۶۵۴)

اسی طریقہ سے حدیث کی صحت کے بہت سے مدارج اور اس کی مختلف نوعیتیں ہیں اور اس کے لحاظ سے صحیح کی بہت سی قسمیں ہو جاتی ہیں، ابن صلاح لکھتے ہیں کہ ''حدیث صحیح وہ ہے کہ جس کی سند شروع سے آخر تک مسلسل ہو، اس کے تمام راوی عادل و ضابط ہوں اور روایت شاذ و معلل نہ ہو، ایسی حدیث بالاتفاق تمام محدثین کے نزدیک صحیح ہے، یعنی یہ صحت کا اعلیٰ درجہ ہے، پھر کسی حدیث میں ان اوصاف کے پائے جانے یا نہ پائے جانے کے اختلاف کی بنا پر صحت کے لیے کسی امام یا محدث کے نزدیک ان شرائط میں سے کسی شرط کے ضروری نہ ہونے کی بنا پر اس حدیث کی صحت و عدم صحت میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، جیسے مرسل حدیث جن ائمہ کے نزدیک حجت ہے، ان کے نزدیک وہ حدیث صحیح میں شامل ہے اور جن کے نزدیک حجت نہیں ہے ان کے نزدیک صحیح نہیں ہے، پھر جب محدثین کسی حدیث کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ صحیح ہے تو ان کے یہ معنی ہیں کہ ان کے نزدیک صحت کے شرائط اس میں موجود ہیں، یہ ضروری نہیں ہے کہ واقع میں بھی ایسا ہی ہو...... اسی طریقہ سے جب

Marfat.com

کسی حدیث کے متعلق محدثین کہتے ہیں کہ وہ صحیح نہیں ہے تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ وہ جھوٹی ہے کیونکہ ایسی بعض حدیثیں بھی درحقیقت سچی ہوتی ہیں بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی سند ان کے نزدیک صحت کے شرائط کے مطابق نہیں ہے۔ پھر صحیح حدیث کی دو قسمیں ہیں، متفق علیہ اور مختلف فیہ، پھر اس کی قسمیں مشہور اور غریب ہیں پھر کسی حدیث میں صحت کے شرائط کے تمکین کے لحاظ سے صحت کے درجات میں فرق پیدا ہو جاتا ہے یعنی جس کمال کے ساتھ یہ شرائط پائے جائیں گے، اسی قدر صحت کا درجہ بڑھ جائے گا اور اس میں جتنی کمی ہوگی اسی اعتبار سے صحت میں فرق پیدا ہو جائے گا، اس لحاظ سے صحیح حدیث کی بے شمار قسمیں ہو جاتی ہیں۔ (مقدمہ ابن صلاح ص ۶)

اسی طرح صحیح اور حسن کی دو قسمیں ہیں، صحیح لذاتہ اور حسن لذاتہ اور صحیح لغیرہ اور حسن لغیرہ، صحیح لذاتہ اور حسن لذاتہ کی تعریف تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی، صحیح لغیرہ وہ ہے جس میں صحیح لذاتہ کے تمام شرائط تو نہ پائے جاتے ہوں لیکن کثرت طرق نے اس کمی کو پورا کر دیا ہو، حسن لغیرہ وہ حدیث ہے جس میں ضعف ہو لیکن تعدد طرق نے اس ضعف کو دور کر دیا ہو، اسی طرح سے غرابت کی دو قسمیں ہیں، متن کی غربت اور سند کی غرابت، یعنی سند میں کوئی راوی منفرد ہو گیا ہو یا کسی حدیث کے اصل متن میں عام روایات کے خلاف کوئی جزوی کمی یا زیادتی یا تغیر ہو۔

ان تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھنے کے بعد حسن، صحیح اور غریب کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں رہ جاتا، مثلاً ایک ہی حدیث میں ایک محدث کے نزدیک حسن یا صحیح کے جملہ شرائط پائے جاتے ہیں، اس لیے اس کے نزدیک وہ حسن یا صحیح ہوگی اور دوسرے کے نزدیک نہیں پائے جاتے، اس لیے اس کے نزدیک نہ حسن ہوگی نہ صحیح، ایک کے نزدیک حسن کے شرائط پائے جاتے ہیں دوسرے کے نزدیک صحیح کے، اس لیے ایک کے نزدیک حسن ہوگی دوسرے کے نزدیک صحیح ہوگی۔

اسی طریقہ سے ایک ہی حدیث ایک کے نزدیک حسن ہو سکتی ہے اور دوسرے کے نزدیک صحیح، جس کو امام ترمذی نے حسن صحیح سے تعبیر کیا ہے بلکہ ایک شخص کے نزدیک ایک ہی حدیث حسن لذاتہ اور صحیح لغیرہ ہو سکتی ہے، یا ایک حدیث دو سندوں سے مروی ہے، ایک سند کے اعتبار سے حسن ہے، دوسری متن کے اعتبار سے صحیح، پھر صحیح کے بہت سے مدارج ہیں، ان مدارج کے اعتبار سے صحیح کے ادنیٰ درجہ کا اجتماع حسن کے اعلیٰ درجہ کے ساتھ ہو سکتا ہے اور اس لحاظ سے کہ صحیح کے اعلیٰ شرائط کے تحت میں حسن کے ادنیٰ شرائط خود بخود آ جاتے ہیں، ہر صحیح حدیث حسن کہی جا سکتی ہے اور متقدمین کے یہاں صحیح حدیث پر حسن کا اطلاق ملتا ہے، اس کے علاوہ حسن اور صحیح کے اجتماع کی محدثین نے اور صورتیں بھی نقل کی ہیں۔

اسی طریقہ سے غرابت اور حسن میں بھی کوئی تضاد نہیں ہے، ممکن ہے ایک حدیث سند کے اعتبار سے غریب ہو اور متن کے اعتبار سے حسن اور ترمذی کی مراد یہی ہے، اسی طریقہ سے صحت اور غرابت کا اجتماع بھی ہو سکتا ہے، شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے مقدمہ مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ صحت اور غرابت کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

(تحفۃ الاحوذی بحوالہ مقدمہ مشکوٰۃ ص ۲۰۰)

غرض صحیح، حسن اور غریب کے جملہ اقسام و مدارج اور اختلاف کو پیش نظر رکھنے کے بعد ان کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں رہ جاتا، اسی سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ترمذی نے حدیثوں کی تحسین و تصحیح میں بھی تساہل سے کام نہیں لیا ہے بلکہ وہ کسی نہ کسی پہلو سے حسن و صحیح ہوتی ہے۔

Marfat.com

یوں تو کتاب اللہ کے علاوہ کسی کتاب کے متعلق قطعی صحت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا، بخاری و مسلم تک خردہ گیری سے محفوظ نہیں ہیں، ایسی حالت میں ترمذی کیوں محفوظ رہتی لیکن مجموعی حیثیت سے سلف سے لے کر خلف تک اس کی صحت مسلمہ چلی آتی ہے جس کا ثبوت صحاح ستہ میں اس کا شمار ہوتا ہے، پھر صحاح میں بھی صحیحین کے بعد ہی اس کو جگہ ملی، ملا کاتب چلپی لکھتے ہیں: "هو ثالث الكتب لستة في الحديث" (کشف الظنون ج ا ص ۳۷۵) اور ائمہ حدیث اس کو احادیث حسن کی بنیاد قرار دیتے ہیں، ابن صلاح لکھتے ہیں: "كتاب ابی عیسی اصل فی معرفة الحديث الحسن" (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۳) یعنی امام ترمذی کی کتاب حدیث حسن کی معرفت کے لیے اصل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ترمذی کے متعلق اوپر بہت سے اکابر علما و محدثین کی رائیں گزر چکی ہیں، یہاں تک ان کے اعادے کی ضرورت نہیں، خود ترمذی کے زمانہ میں عراق، خراسان اور حجاز کے علما و محدثین سے اس کو حسن قبول کی سند مل چکی ہے، امام ترمذی کا بیان ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے بعد میں نے اس کو حجاز، عراق اور خراسان کے علما کے سامنے اظہار رائے کے لیے پیش کیا، ان سب نے اس کو پسند کیا اور اہل نظر نے اس کو یہ سند عطا کی کہ: من كان فی بيته هذا الكتاب فكانما فی بيته نبی يتكلم۔ یعنی جس کے گھر میں یہ کتاب موجود ہو، اس کے گھر میں گویا نبی بول رہا ہے، (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۸) اہل علم شعرا نے اس کی تعریف میں قصائد لکھے ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی اور نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے بستان المحدثین اور حطہ میں یہ قصائد نقل کیے ہیں۔ (حطہ ص ۱۰۴ و بستان المحدثین ص ۱۲۲)

شروح ترمذی:

ترمذی کی اہمیت اور اس کی فائدہ رسانی کی وجہ سے علماء و محدثین نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا، اس کی شرحیں لکھیں، حواشی لکھے، مختصرات مرتب کیے، اس کے مشکلات حل کیے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر معلومات کا بیش قیمت ذخیرہ فراہم کر دیا۔

صاحب کشف الظنون نے اس کی آٹھ شرحوں کا ذکر کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ سب سے پہلی اور قدیم شرح حافظ ابوبکر محمد بن عبداللہ شبیلی المعروف بہ ابن العربی المتوفی ۵۴۶ھ کی عارضۃ الاحوذی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب نے بستان المحدثین میں اس کا مستقل تذکرہ کیا ہے، (بستان المحدثین ۱۳۷) اس کا ایک حصہ مجموعہ شروح اربعہ کے ساتھ چھپ گیا ہے، [1] اور کامل نسخہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۲۔ دوسری حافظ ابوالفتح محمد بن محمد بن سید الناس یعمری شافعی المتوفی ۷۳۴ھ کی شرح، یہ بڑی ضخیم ہے، شارح نے اس میں حدیث کے علاوہ اور بھی بہت سے مباحث شامل کر دیے ہیں، دو ثلث کی یہ شرح دس جلدوں میں آئی ہے اور مصنف کے قلم سے تمام نہ ہو سکی، ان کے بعد حافظ زین الدین عبدالرحیم بن حسین العراقی المتوفی ۸۰۶ھ نے پوری کی، اس کا مکمل نسخہ بھی مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں ہے۔

[1] (نواب محمد علی خاں مرحوم والی ٹونک کے فرزند نواب زادہ محمد عبدالوہاب خاں صاحب ترمذی کی چار شرحوں عارضۃ الاحوذی قوت المغتذی سیوطی اور ابو طیب سندھی اور سراج احمد سرہندی کی شرحوں کی مجموعہ شروح اربعہ کے نام سے چھپوایا تھا غالباً اس کی ایک ہی جلد چھپ سکی)

Marfat.com

۳۔ تیسری صحیحین اور ابوداؤد پر ترمذی کے زوائد کی سراج الدین عمر بن علی الملقن التوفی ۸۰۴ھ کی شرح ہے۔

۴۔ چوتھی سراج الدین عمر بن رسلان بلقینی شافعی التوفی ۸۰۵ھ کی شرح العرف الشذی یہ بھی تمام نہ ہوسکی، صرف ایک ٹکڑے کی شرح ہے۔

۵۔ پانچویں حافظ زین الدین عبدالرحمٰن بن احمد بن نقیب حنبلی التوفی ۔۔۔کی شرح بیس جلدوں میں تھی، کسی ہنگامے میں ضائع ہوگئی، اب اس کا نام صرف کتابوں میں ملتا ہے۔

۶۔ چھٹی حافظ جلال الدین سیوطی التوفی ۹۱۱ھ کی شرح القوت المغتذی، اس کا ایک حصہ شروح اربعہ کے ساتھ چھپا ہے۔

۷۔ ساتویں حافظ زین الدین عبدالرحمٰن بن احمد بن رجب حنبلی التوفی ۷۹۵ھ کی شرح، اس کا اور کچھ حال نہیں معلوم۔

۸۔ آٹھویں شیخ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندی مدنی التوفی ۱۱۳۸ھ کی شرح، شیخ مذکور نے اس کو مدینہ طیبہ میں لکھا تھا، کشف الظنون نے اسے بڑی لطیف شرح لکھا ہے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۲۷۵)

ملا کاتب چلپی نے صرف ان آٹھ شروح کا تذکرہ کیا ہے لیکن ان کے علاوہ اور شرحیں بھی ہیں، مثلاً

۹۔ نویں شیخ سراج احمد سرہندی کی فارسی شرح اس کا بھی ایک حصہ شروح اربعہ میں چھپا ہے۔

۱۰۔ دسویں حافظ ابن حجر عسقلانی التوفی ۸۵۲ھ کی اللباب فی مایقول الترمذی فی الباب، امام ترمذی نے فی الباب عن فلاں کہہ کر جن روایتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، اس میں اس کی تفصیل مع جرح وتعدیل ہے، اس کا نسخہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۱۱۔ گیارہویں ابوطیب سندھی التوفی ۱۱۰۹ھ کی شرح، یہ بھی شروح اربعہ میں ہے۔

۱۲۔ بارہویں حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اپنی ایک شرح کا حوالہ دیا ہے۔

۱۳۔ تیرہویں مولانا شمس الحق مرحوم عظیم آبادی کی ہدایۃ اللوذعی بنکات الترمذی۔

۱۴۔ چودہویں الکوکب الدری مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، یہ جامع ترمذی پر مولانا کے افاذات ہیں، جسے مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی مرحوم نے مرتب کیا تھا اور مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم نے شائع کیا ہے۔

۱۵۔ پندرہویں العرف الشذی کے نام سے مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری کے افادات کو ان کے ایک شاگرد نے جمع کیا ہے۔

۱۶۔ سولہویں مولانا عبدالرحمٰن مرحوم مبارکپوری کی التحفۃ الاحوذی، یہ چھپ گئی ہے، اس کا مقدمہ خاص طور سے اہل علم کے مطالعہ کالائق ہے، کاتب سطور نے اس مضمون میں اس سے استفادہ کیا ہے۔

۱۷۔ مولانا اصغر حسین صاحب پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے حنفی نقطۂ نظر والے طلبہ کے استفادہ کے لیے نزول الشوی کے نام سے ترمذی کی احادیث کے متعلق مختلف قسم کے سوالات اوران کے جوابات لکھے ہیں، اس کا ایک حصہ چھپ گیا ہے۔

مختصرات ترمذی: شرحوں کے علاوہ ترمذی کے مختصرات بھی کیے گئے، کشف الظنون میں تین مختصروں کا حال لکھا ہے، ایک نجم الدین محمد بن عقیل البالسی شافعی التوفی ۷۲۹ھ کا، دوسرا نجم الدین سلیمان بن عبدالقوی الطوفی حنبلی التوفی ۷۱۰ھ کا، اس کا قلمی

Marfat.com

نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہے، (فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج اول ص ۴۱۱) اسی سے حافظ صلاح الدین خلیل بن کلیدی علائی نے ترمذی کی سو حدیثوں کا انتخاب کیا ہے۔

تجرید ترمذی:

ابوالفضل محمد تاج الدین بن عبدالحسن المعروف بہ قلعی نے ترمذی کی تجرید بھی کی، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ میں ہے۔ (فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج اول ص ۲۷۹)

حواشی:

ان مستقل کتابوں کے علاوہ ترمذی پر بہت سے حواشی بھی لکھے گئے، ہندوستان کی مطبوعہ ترمذی میں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری کا حاشیہ زیادہ شائع ہے۔

شمائل ترمذی:

اس مضمون کا اصل مقصد جامع پر تبصرہ تھا اور امام ترمذی کی باقی دونوں کتابیں یعنی شمائل اور کتاب العلل موضوع سے خارج ہیں لیکن شمائل کی اہمیت کی وجہ سے اس کا بھی مختصر تذکرہ مناسب معلوم ہوا۔

جس طرح آنحضرت ﷺ کے ارشادات گرامی مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہیں، اسی طرح آپ کے اخلاق مبارک، اعمال، طور طریقے، طبعی امور، آپ کی زندگی کا ہر پہلو اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے حالات جستہ جستہ حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں لیکن امام ترمذی سے پہلے خاص اس موضوع پر کوئی مستقل کتاب نہ تھی، یہ سعادت سب سے پہلے امام ترمذی کے حصہ میں آئی اور آنحضرت ﷺ کے حلیہ مبارک، لباس، ساز و سامان، عادات و خصائل، رفتار و گفتار، نشست و برخاست، اخلاق اور معمولات کے متعلق جتنی روایتیں امام ترمذی کو پہنچیں، انہوں نے ان کو شمائل میں جمع کر دیا ہے، گو یہ کتاب مختصر ہے لیکن ایسی جامع ہے کہ اس میں اخلاق نبوی کا پورا مرقع نظر آجاتا ہے، شمائل ترمذی کے بعد اس موضوع پر اور کتابیں لکھی گئیں لیکن اولیت کا سہرا امام ترمذی کے سر رہا، کشف الظنون میں شمائل ترمذی کے علاوہ دو اور کتابوں کا نام ملتا ہے، ایک ابوالعباس جعفر بن محمد المستغفری المتوفی ۴۳۲ھ کی ''شمائل النبی'' دوسری ابوالحسن علی بن محمد بن ابراہیم فزاری المعروف بہ ابن المقری غرناطی المتوفی ۵۵۲ھ کی ''شمائل بالنور الساطع الکامل'' (کشف الظنون ج ا ص ۶۷) ان کے علاوہ ایک اور کتاب ''شمائل محمدی'' شیخ عبدالرسول بن عبدالصمد کی ہے۔ (فہرست کتب خانہ رام پور ص: ۹۳) لیکن جو حسن قبول شمائل کو حاصل ہوا وہ کسی کے حصہ میں نہ آیا۔

اس کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ جامع ترمذی کی طرح علماء و محدثین نے اس کی بھی بہت سی شرحیں اور حواشی لکھے، بعض شرحوں اور ان کے شارحین کے نام یہ ہیں:

۱۔ اشرف الوسائل فی شرح الشمائل، حافظ ابن حجر مکی المتوفی ۹۷۳ھ یہ شرح حرم محترم میں رمضان کے مقدس مہینے میں لکھی گئی تھی۔ (اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر اور کتب خانہ رامپور میں موجود ہے۔ فہرست کتب خانہ خدیویہ ج ۲ ص ۵۹۳، فہرست کتب خانہ رامپور ص: ۶۵)

Marfat.com

۲۔شرح شمائل مصلح الدین محمد بن صلاح بن جمال اللاری المتوفی ۹۷۹ھ یہ شرح عربی میں ہے، اس کے علاوہ انہوں نے فارسی میں بھی ایک شرح لکھی ہے۔

۳۔زہر الخمائل علی الشمائل حافظ جلال الدین سیوطی۔

۴۔جمع الوسائل، نورالدین علی بن سلطان محمد القاری المعروف بہ ملا علی قاری المتوفی ۱۰۱۶ھ شیخ محمد بن عمر بن حمزہ انطا کی نے تہذیب الشمائل کے نام سے اس کی تہذیب کر کے اس کو سلطان بایزید کی خدمت میں پیش کیا تھا، (اس کا قلمی نسخہ مصر اور پٹنہ لائبریری میں ہے۔ فہرست کتب خانہ خدیویہ ج ۱ ص ۲۷۳ و مفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ ص ۲۷۱) یہ شرح قسطنطنیہ میں ۱۲۹۰ھ میں چھپ چکی ہے۔

۵۔شرح شمائل مولانا عصام الدین ابراہیم بن محمد اسفرائینی المتوفی ۹۴۳ھ، (اس کا قلمی نسخہ پٹنہ اور رام پور کے کتب خانوں میں ہے، مفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ ص ۲۷۱ و فہرست رام پور ج ۱ ص ۹)

۶۔شرح شمائل مولی محمد حنفی، یہ شرح ۹۲۶ھ میں لکھی گئی۔ (اس کا قلمی نسخہ پٹنہ اور رامپور کے کتب خانوں میں ہے، مفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ ص ۲۷۱ و فہرست رامپور ج ۱ ص ۹۰)

۷۔شرح شمائل حافظ زین الدین محمد المعروف بہ عبد الرؤف بن تاج العارفین مناوی المتوفی ۱۰۳۱ھ یہ شرح مولانا عصام الدین اسفرائینی اور ابن حجر مکی کی شرحوں کا خلاصہ ہے اور کچھ مزید اضافے بھی ہیں، خواجہ اسحاق آفندی المتوفی ۱۱۲۰ھ نے ترکی میں اس کا ترجمہ کیا اور مصطفیٰ بن حسین حلبی المعروف بہ مظلوم زادہ نے اسے ترکی میں نظم کیا، (کشف الظنون ج ص ۷۶، اس کے قلمی نسخے مصر اور پٹنہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں، ملاحظہ ہو فہرست مصر ج اول ص ۳۶۰ و مفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ ص ۲۷۱) یہ شرح مصر اور قسطنطنیہ کے مطبعوں سے شائع ہو چکی ہے۔ (معجم المطبوعات کالم ۱۷۹۹)

کشف الظنون میں صرف ان شرحوں کا تذکرہ ہے لیکن ان کے علاوہ اور بھی بعض شرحیں ہیں جن کے نام یہ ہیں:

۸۔الفوائد الجلیلۃ البہیہ شیخ محمد بن قاسم بن محمد احمد بن جسوس، شارح بارہویں صدی کے آخر کے ممتاز علما میں تھے، (فہرست کتب خانہ مصر جلد ۱ ص ۳۸۲) یہ مطبع بولاق میں ۱۲۹۶ میں چھپ گئی ہے۔

۹۔مواہب محمدیہ شیخ سلیمان بن منصور عجیلی شافعی المتوفی ۱۲۰۴ھ، اس کے قلمی نسخے کتب خانہ خدیویہ اور پٹنہ لائبریری میں ہیں۔ (ایضاً ص ۲۳۹ و مفتاح الکنوز ج ۱ ص: ۵۳۴)

۱۰۔شرح شمائل شاہ میرک بخاری۔ (مفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ ص ۲۷۱)

۱۱۔اس فخر و منزلت سے ہندوستان بھی محروم نہ رہا اور یہ سعادت و شرف بھی اسی خاندان کے حصہ میں آیا، جس کے فیض سے ہندوستان میں حدیث کا سرچشمہ جاری ہوا، یعنی شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے خلف الصدق مولانا نور الحق شارح بخاری و مسلم نے شمائل ترمذی کی بھی ایک شرح لکھی، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ رام پور میں ہے۔ (فہرست رام پور ص: ۹۰)

۱۲۔شرح حسن آفندی ۱۲۵۴ھ میں بولاق میں چھپی ہے۔ (معجم المطبوعات کالم ۷۵۵)

۱۳۔خصائل نبوی ترجمہ اردو شمائل ترمذی مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم، ترجمہ کے ساتھ احادیث کے متعلق مختلف قسم کے مفید معلومات اور مشکلات کا حل بھی ہے، یہ ترجمہ چھپ گیا ہے۔

Marfat.com

شرحوں کے علاوہ شمائل کے متعدد حواشی بھی لکھے گئے، دو مشہور حواشی اور محشی کے نام یہ ہیں:

ا۔ مواہب لدنیہ شیخ ابراہیم بن محمد باجوری المتوفی ۱۲۷۶ھ یہ حاشیہ سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہوا اور عام طور سے متداول ہے۔

۲۔ حاشیہ ابوالضیاء نورالدین علی بن علی شبرالمی شافعی المتوفی ۱۰۸۷ھ حاشیہ شمائل اور ابن حجر مکی کی شرح شمائل دونوں پر ہے، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ میں ہے۔ (فہرست عربی کتب خانہ خدیویہ ص: ۳۳۲)

کتاب العلل:

امام ترمذی کی تیسری کتاب، کتاب العلل ہے، یہ علل حدیث پر ایک مختصر لیکن مفید رسالہ ہے، حدیث کی صحت اور اس کے اسقام کی جانچ کے لیے جرح و تعدیل کے اصول و قواعد اور مستقل فنون ہیں لیکن بعض حدیثوں میں ایسے مخفی عیوب ہوتے ہیں جن کا علم ان اصولوں اور فنون سے نہیں ہوتا اور ایک روایت اصول و قواعد کے اعتبار سے بالکل صحیح ہوتی ہے لیکن اس میں کوئی ایسی مخفی علت ہوتی ہے جس کا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا، اس کے لیے حدیث پر بڑی وسیع اور دقیق نظر کی ضرورت ہے، ان عیوب کے معلوم کرنے کے لیے علل الحدیث ہے، حاکم لکھتے ہیں:

علوم حدیث میں ایک علم حدیث کی علتوں کے جاننے کا علم ہے، یہ صحیح، سقیم اور جرح و تعدیل کے علاوہ ایک مستقل علم ہے۔۔۔ حدیث مختلف وجوہ سے معلل ہو جاتی ہے جس میں جرح و تعدیل کو کوئی دخل نہیں ہوتا، اس لیے کہ مجروح حدیث تو سرے سے ساقط اور ناقابل اعتبار ہے، اکثر ثقات کی حدیثوں میں ایسی علت ہوتی ہے جو ان کی نظر سے مخفی رہتی ہے اور حدیث معلل ہو جاتی ہے، اس کے علم کا ذریعہ صرف حفظ، فہم اور معرفت حدیث ہے۔ (معرفۃ علوم الحدیث حاکم ص: ۱۱۲)

حاکم نے اس کی مثالیں بھی دی ہیں، یہ ایسا دقیق علم ہے کہ اس کے لیے بڑی وسعت و دقت نظر کی ضرورت ہے، اس لیے بہت کم محدثین نے علل حدیث پر لکھا ہے جن لوگوں نے لکھنے کی ہمت کی، ان میں ایک امام ترمذی ہیں، ان کا یہ رسالہ جامع ترمذی کے آخر میں لگا ہوا ہے۔

Marfat.com

امام حارث بن ابی اسامہ رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۸۲ھ)

نام ونسب:

ابومحمد کنیت، حارث نام اور سلسلہ نسب یہ ہے: حارث بن محمد بن ابو اسامہ بن یزید بن عدی بن سائب بن شماس بن حنظلہ بن عامر بن حارث بن مرہ بن مالک بن حنظلہ بن مالک بن زید مناۃ بن تمیم۔ (تاریخ بغداد ج ۸ ص:۲۱۹)

اپنے دادا کی نسبت سے مشہور ہو کر حارث بن ابو اسامہ کہلاتے ہیں، ابو اسامہ کا اصل نام داہر تھا۔ (بستان المحدثین ص:۳۳)

خاندان:

حارث عرب نژاد اور مشہور قبیلہ بنی تمیم سے تعلق رکھتے تھے (ایضا) اسی لیے تمیمی کہے جاتے تھے۔

پیدائش اور وطن:

ان کا وطن بغداد ہے (ایضا) اور غالباً وہ یہیں ماہ شوال ۱۸۶ھ میں پیدا ہوئے (تاریخ بغداد ج ۸ ص ۲۱۸ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۴ والمنتظم ابن جوزی ج ۵ ص ۱۵۵) وطن کی نسبت سے بغدادی بھی کہلاتے تھے۔

اساتذہ وشیوخ:

حارث بن ابی اسامہ کو جن اکابر محدثین اور علمائے اسلام سے استفادہ کا موقع ملا، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

اسحاق بن عیسیٰ بن طباع، اسود بن عامر شاذان، حسن بن موسیٰ اشیب، روح بن عبادہ، عبداللہ بن بکر، عبدالوہاب بن عطا، عبیداللہ بن موسیٰ عبسی، عفان بن مسلم، علی بن عاصم، محمد بن عاصم، محمد بن عمر واقدی، محمد بن کناسہ، ابوالنظر، ہاشم بن قاسم، ہوزہ بن خلیفہ، یزید بن ہارون، ابوبدر سکونی، ابو عاصم نبیل وغیرہ۔

تلامذہ:

بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں:

احمد بن سلیمان نجاد، احمد عثمان بن آدمی، احمد بن معروف خشاب، اسماعیل بن علی خطبی، جعفر خلدی، عبدالصمد بن علی طستی، محمد بن احمد حکیمی، ابوجعفر محمد بن جریر طبری، محمد بن خلف بن مرزبان، محمد بن خلف وکیع، محمد بن مخلد عطار، ابوبکر بن ابی الدنیا، ابوبکر بن خلاد، ابوبکر شافعی، ابوعمرو بن سماک۔ (تاریخ بغداد ج ۸ ص ۲۱۸، ۲۱۴)

Marfat.com

طلب حدیث کے لیے سفر:

گو ان کے سفر و سیاحت کی تصریح نہیں ملتی لیکن ان کے اساتذہ اور شیوخ کا تعلق مختلف ملکوں سے تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے علم حدیث کی تلاش و جستجو میں مختلف ملکوں اور شہروں کا سفر کیا تھا۔

حافظہ:

تذکرہ نگاروں نے ان کو الحافظ کہا ہے، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے خصوصیت کے ساتھ ان کے حافظہ کا تذکرہ کیا ہے۔

ثقاہت:

بیشتر محدثین اور علمائے جرح و تعدیل نے ان کی توثیق کی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ ''ابو حاتم ابن حبان، ابراہیم حربی اور امام دارقطنی اور اسی پایہ کے دوسرے اکابر محدثین اور علمائے محققین نے ان کی توثیق کی ہے''۔ (بستان المحدثین ص: ۳۳) امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ وہ صدوق تھے، برقانی نے ان سے حارث کے متعلق سوال کیا تو فرمایا کہ ان کے مرویات کو صحاح میں شامل کرو، ابراہیم حربی سے سوال کیا گیا کہ وہ معاوضہ لیتے ہیں، ایسی صورت میں کیا ان سے حدیثیں سنی جاسکتی ہیں، انہوں نے جواب دیا کہ ہاں سنو وہ ثقہ ہیں، ابن حبان نے ان کو ثقات میں شامل کیا ہے، ابوالعباس بناتی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے، احمد بن کامل کا بیان ہے کہ حارث ثقہ اور معتبر ہیں، ابن جوزی بھی ان کو ثقہ لکھتے ہیں، علامہ ذہبی نے تذکرہ میزان اور عبر میں ان کی ثقاہت کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی بعض سندیں نہایت عالی ہیں اور ان کے متعلق خواہ مخواہ بلا دلیل و حجت شک و تردد کیا جاتا ہے۔ (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۲۰۵ بستان المیزان ج ۲ ص ۱۵۷ و تذکرہ ج ۲ ص ۱۹۴)

کثرت روایت و معرفت حدیث:

حارث کے حافظہ میں احادیث کا وافر ذخیرہ محفوظ تھا، ان کو کثیر الروایات اور کثیر الحدیث شمار کیا جاتا تھا، ابوالعباس بناتی کا بیان ہے: راویۃ الاخبار کثیر الحدیث نیز وہ حدیثوں کے معاملہ میں بڑے واقف کار اور ان کی اچھی پرکھ رکھتے تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے: کان حافظا عارفا بالحدیث۔ (لسان و میزان حوالہ مذکور)

عسرت و تنگدستی:

ان کی زندگی بڑی عسرت اور تنگدستی کی تھی، کثیر العیالی کی بنا پر اکثر زیر بار رہتے تھے، ان کا خود بیان ہے کہ ''میرے چھ لڑکیاں تھیں، ناداری کی وجہ سے ان کی شادی نہیں کر سکتا اور غیروں میں شادی کرنے کو غیرت گوارا نہیں کرتی، بعض لوگوں نے شادی کا پیغام بھیجا لیکن وہ بھی میری ہی طرح فقیر اور محتاج تھے، ایسے لوگوں سے شادی کر کے مجھے اور بھی زیادہ زیر بار ہونا پڑتا، عسرت ہی کی بنا پر وہ تعلیم حدیث کا معاوضہ لینے پر مجبور تھے۔

خودداری:

اس عسرت و تنگدستی کے باوجود اپنے فقر و فاقہ کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ (بستان المحدثین ص: ۳۳)

Marfat.com

وفات:

چھیانوے سال کی طویل عمر میں ۲۸۲ھ کو شب عرفہ میں انتقال کیا اور عرفہ کے دن چاشت کے وقت سپرد خاک کیے گئے۔ (تاریخ بغداد ج ۸ ص: ۲۱۹)

مسند:

ان کی تصنیفات میں صرف ایک مسند کا ذکر ملتا ہے، اس میں صحابہؓ کے بجائے شیوخ کی ترتیب پر حدیثیں لکھی گئی ہیں، اس قسم کی کتابوں کو اصطلاحاً معجم کہا جاتا ہے لیکن جس طرح بعض اور کتابیں بھی محدثین کی اصطلاح کے برخلاف مسند کہلاتی ہیں، اسی طرح یہ کتاب بھی معجم کے بجائے مسند کے نام سے مشہور ہے۔ (بستان المحدثین: ۳۲، ۳۳)

یہ مسند طبع نہیں ہوئی، اس کا نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے، احمد بن ابوبکر بوصیری متوفی ۸۴۰ھ نے "اتحاف الخیرۃ بزوائد المسانید العشرۃ" میں اس کی ان حدیثوں کو جمع کیا ہے جو صحاح ستہ میں نہیں ہیں۔

حارث پر طعن و جرح:

حدیث کی تعلیم کا معاوضہ لینے کی بنا پر بعض محدثین نے ان پر نقد کیا ہے اور ان کو مجروح، ضعیف اور متروک الحدیث قرار دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگوں کے نزدیک تعلیم حدیث کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے اور ایسے شخص کی حدیثیں ناقابل قبول ہیں لیکن یہ اصول علی الاطلاق صحیح نہیں ہے، اس کے بارے میں جواز و عدم جواز دونوں قسم کی رائیں ملتی ہیں، علامہ سیوطی کا بیان ہے کہ:

> "امام احمد، اسحاق بن راہویہ اور ابو حاتم رازی کے نزدیک اس شخص کی حدیث قبول نہیں کی جائے گی جو حدیث بیان کرنے کا معاوضہ لیتا ہو لیکن امام بخاری کے استاذ ابونعیم فضل بن دکین اور علی بن عبدالعزیز بغوی اور بعض دوسرے علما نے اس کی اجازت دی ہے، ابواسحاق شیرازی کا فتویٰ یہ ہے کہ جو لوگ حدیث کی تعلیم و تدریس کی وجہ سے اپنے متعلقین کی کفالت اور ان کی معیشت کا انتظام نہ کر سکیں، ان کے لیے اجرت و معاوضہ لینا جائز ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ یتیم کے مال میں سے ضرورت مند اولیا اور سرپرستوں کو بقدر کفاف لینے کی اجازت دی گئی ہے۔" (تدریب الراوی ص: ۱۲۴)

خطیب نے دونوں قسم کے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

> "جو لوگ معاوضہ نہ لینے کے قائل ہیں ان کا مقصد راوی کو طعن اور سوءِ ظن سے منزہ قرار دینا ہے کیونکہ معاوضہ لینے کے بعد آدمی میں نرمی اور مداہنت پیدا ہو جاتی ہے لیکن درحقیقت ان لوگوں کے نزدیک بھی محض مکروہ تنزیہی ہے، حرام و ناجائز نہیں اور اکثر سلف اس باب میں رخصت کے قائل ہیں۔" (کتاب الکفایہ ص: ۱۵۴)

اس لیے دونوں پہلو برابر ہیں خصوصاً جو لوگ تنگدستی کی بنا پر معاوضہ لینے پر مجبور ہیں، ان کے لیے پوری گنجائش موجود ہے اور اس سے ان کی ثقاہت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، اس لیے امام حارث پر محض اس بنا پر تنقید نہیں کی جا سکتی۔

Marfat.com

امام احمد بن ابی عاصم نبیل رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۸۷ھ)

نام ونسب:

احمد نام، ابوبکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، احمد بن عمرو بن ابو عاصم ضحاک بن مخلد۔

(العبر فی خبر من غبر جلد ۷۹، البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ ص ۸۴)

ولادت:

مورخین کے بیان کے مطابق وفات کے وقت ان کی عمر ۹۰ سال تھی (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۴) اس اعتبار سے وہ ۱۹۷ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

خاندان ووطن:

عراق کے مشہور علمی مرکز بصرہ کو ان کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے لیکن انہوں نے اصبہان میں بودوباش اختیار کر لی تھی، قبیلۂ شیبان سے ان کا نسبی تعلق ہے ان کے جد امجد ابو عاصم ضحاک کا جو النبیل کے لقب سے مشہور اور نامور محدث وفقیہ تھے، امام ابوحنیفہ کے ممتاز اصحاب میں شمار ہوتا ہے، بخاری جیسے امام حدیث ان کے دامن فیض سے وابستہ تھے، ابن ابی عاصم کے نانا ابوسلمہ موسیٰ بن اسماعیل بھی بلند پایہ محدث تھے اور ان سے ان کو روایت کرنے کا شرف بھی حاصل ہے۔

اساتذہ:

اپنے نانا کے علاوہ امام بخاری، ابوالولید طیالسی، ہدبہ بن خالد اور ہشام بن عمار جیسے نامور علما اور اکابر محدثین سے روایت حدیث کی ہے۔

تلامذہ:

مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں: احمد بن بندار، احمد بن معید سمسار، ابومحمد بن حبان، ابواحمد عسال، عبدالرحمٰن بن محمد بن سنان، محمد بن احمد کسائی، وغیرہ۔

سفر:

علم کی تلاش وجستجو خصوصاً حدیث کی طلب کے لیے مختلف بلاد کا سفر کیا، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ: وله الرحلة الواسعة۔

Marfat.com

حفظ وثقاہت:

حدیث میں آپ کا پایہ اتنا بلند تھا کہ امام وحافظ حدیث کے لقب سے موسوم کیے جاتے تھے، تمام علمائے فن کو ان کے ضبط وحفظ، عدالت وثقاہت کا اعتراف ہے، ابن ابی حاتم نے صدوق اور ابن اعرابی نے حدیث ومسائل فقہ کا بڑا حافظ بتایا ہے، یادداشت کی قوت کا یہ حال تھا کہ ۵۰ ہزار سے زیادہ حدیثیں وہ زبانی بیان کرتے تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۴)

فقہ:

فقہ واجتہاد میں بھی ممتاز درجہ رکھتے تھے، علمائے طبقات نے فقہ میں ان کے کمال کا اعتراف کیا ہے، ابن اعرابی کا بیان ہے کہ شقیق بلخی کے ایک ہزار مسائل ان کو زبانی یاد تھے۔

منصب قضا:

ان کے فقیہ ومجتہد ہونے کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ امام احمد کے صاحبزادے صالح کے بعد اصبہان کے قاضی مقرر کیے گئے اور سولہ سال تک اس منصب پر فائز رہے۔ (ایضا)

مذہب ومسلک:

ابونعیم اور بعض دوسرے علمائے طبقات نے ان کو ظاہری المذہب بتایا ہے (ایضا) لیکن صاحب شذرات نے ان کی ایک کتاب الرد علی داؤد الظاہری کا ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا میں ممکن ہے وہ ظاہری رہے ہوں لیکن بعد میں اس مسلک سے رجوع کر لیا ہوگا اور شوافع اور دوسرے اصحاب حدیث کی طرح ظواہر حدیث پر عمل اور ان سے احکام ومسائل کا استنباط کرتے ہوں گے۔

زہد وورع:

علم کے ساتھ عمل کی دولت سے بھی سرفراز تھے، اصحاب طبقات وتراجم نے ان کے زہد وورع اور تدین وتقویٰ کا بھی ذکر کیا ہے، ان کو تصوف اور صوفیا سے بھی تعلق تھا اور بزرگانِ دین کی خدمت میں استفادہ واصلاح کے لیے جاتے تھے، ابو تراب نخشبی سے خاص تعلق تھا، ان کی بعض کرامتیں بھی بیان کی گئی ہیں۔

اتباعِ سنت واجتنابِ بدعت:

بڑے متبع سنت تھے اور مبتدعین کو سخت ناپسند کرتے تھے، فرماتے تھے "مجھے پسند نہیں کہ میری مجلس میں کوئی مبتدع مفتری، فحش گو، لعن وطعن کرنے والا، امام شافعی اور محدثین کے مسلک سے منحرف وبیزار شخص شریک ہو"۔ (البدایہ ج ۱۱ ص ۸۴)

اعتراف کمال:

محدثین انکے کمالات کے معترف تھے، علامہ ذہبی نے انکو صاحب مناقب اور کبیر القدر لکھا ہے، ابن عماد فرماتے ہیں:

جمع بین العلم والفہم والحفظ والزہد والعبادۃ والفقہ۔

وہ علم وفہم، حفظ واتقان، حدیث، زہد وعبادت اور فقہ واجتہاد کے جامع تھے۔

Marfat.com

وفات:

امام ابن عاصم نے ربیع الآخر ۲۸۷ھ میں انتقال کیا۔ (تذکرہ ج ۲ ص ۲۱۴)

تصانیف:

وہ کثیر التصانیف تھے، زنگیوں کی شورش کے زمانہ میں ان کی اکثر کتابیں ضائع ہوگئیں، حسب ذیل تصانیف کے نام کتابوں میں ملتے ہیں:

1. الرد علی داؤد الظاہری: نام سے معلوم ہوتا ہے کہ امام داؤد ظاہری کے رد میں ہے۔
2. کتاب السنۃ: یہ مسئلہ صفات کے متعلق احادیث کا ایک اہم مجموعہ تھا، اس کی تالیف کا انداز علمائے سلف کی کتابوں کے مطابق تھا۔ (البدایہ ج ۱۱ ص ۸۴)
3. مسند: یہ ضخیم اور اہم مسند، پچاس ہزار حدیثوں پر مشتمل ہے، (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳) تمام قابل ذکر علماء و مصنفین نے اس کا تذکرہ کیا ہے، حافظ منذری کے قلم کا لکھا ہوا اس کا ایک مکمل نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۵)
4. کتاب الدیات: دیت وقصاص کے متعلق روایات کا یہ مجموعہ ۱۳۲۳ھ میں مصر سے ۸۴ صفحے میں شائع ہوا ہے۔

Marfat.com

امام ابوبکر بزار رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۹۲ھ)

نام ونسب:

ابوبکر کنیت، بزار لقب، اور احمد نام ہے، سلسلۂ نسب صرف دادا تک معلوم ہے، یعنی احمد بن عمرو بن عبدالخالق۔
بعض اہل لغت کا بیان ہے کہ بزار تیلی کو کہتے ہیں لیکن شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:
"کسے را گویند تخم فروشی کند وآں کسی را در لغت ہندی پنساری نامند"۔

(لباب ج ا ص ۱۱۸ و تاج العروس ج ۳ ص ۱۴۱ و بستان المحدثین ص ۳۴)

یعنی بزار تخم فروش کو کہا جاتا ہے جسے ہندوستانی زبان میں پنساری کہتے ہیں۔

خاندان ووطن:

قبیلۂ ازد کی ایک شاخ عتیک سے آپ کا خاندانی اور بصرہ سے وطنی تعلق تھا، اسی نسبت سے عتکی اور بصری مشہور ہوئے۔

(کتاب الانساب ورق ۸۴ ۳، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۶)

اساتذہ:

بزار کے بعض اساتذہ کے نام یہ ہیں: ابراہیم بن سعید جوہری، اسماعیل بن سیف بندار، حسن بن علی بن راشد واسطی، عبدالاعلیٰ بن حماد، عبداللہ بن معاویہ جمحی، عبدالرحمٰن بن فضیل بن موفق، عمر بن موسیٰ، فلاس، محمد بن یحییٰ بن فیاض زمانی، ہدبہ بن خالد۔

تلامذہ:

ان کے بعض تلامذہ اور مستفیدین کے نام درج ذیل ہیں:
ابواحمد عسال، ابوبکر بن سلم، ابوبکر بن مہندس، ابوالشیخ، ابوالقاسم طبرانی، ابوالحسن علی بن محمد مصری، حسن بن رشیق، عبدالباقی بن قانع، عبداللہ بن حسن، محمد بن ایوب بن صموت، محمد بن عباس بن نجیح۔

رحلت وسفر:

ابتدائی تعلیم کے زمانہ کے سفر کا حال معلوم نہیں ہوتا، البتہ اس کا تذکرہ ملتا ہے کہ آخری زمانہ میں انہوں نے احادیث کی نشرواشاعت کے لیے بغداد، اصفہان اور شام وغیرہ کے سفر کیے اور ایک عرصہ تک ان مقامات پر قیام کرکے یہاں کے طلبہ اور

Marfat.com

شائقین کو حدیث کی تعلیم دیتے رہے۔ (تاریخ بغداد جلد ۴ ص ۳۳۴ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶)

حفظ وثقاہت:

محدثین نے ان کے فضل وکمال اور حفظ وثقاہت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

ابوالشیخ فرماتے ہیں کہ:

''حفاظ دنیا میں ایک وہ بھی تھے اور علی بن مدینی کے بعد کوئی شخص ان سے زیادہ حدیثوں کا جاننے والا نہیں گزرا، بغداد کے حفاظ و محدثین ان کے گرد جمع ہو کر ان سے روایتیں قلمبند کرتے تھے۔،، (بستان المحدثین ص ۳۴)

ابن قطان کا بیان ہے کہ ''وہ لوگوں میں حدیثوں کے سب سے بڑے حافظ تھے'' ابن یونس اور خطیب بغدادی نے بھی ان کے حافظہ کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، ابو یوسف یعقوب بن مبارک فرماتے ہیں کہ: مارأیت انبل من البزار و لا احفظ خطیب ذہبی اور صاحب مغنی نے ان کو ثقہ وصدوق قرار دیا ہے اور امام دارقطنی نے ان کی توصیف وستائش بھی کی ہے اور ان کو ثقہ بھی بتایا ہے، ابوعوانہ نے اپنی صحیح میں ان سے حدیث نقل کی ہے۔

(لسان المیزان جلد ۱ ص ۲۳۸ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۵۹ و تاریخ بغداد جلد ۴ ص ۳۳۴)

وفات:

بزار نے ۲۹۲ھ میں شام کے مشہور شہر رملہ میں جہاں وہ حدیث کی تعلیم واشاعت کے لیے تشریف لے گئے تھے، انتقال کیا، ابن قانع نے ۲۹۱ھ سن وفات بتایا ہے، (لسان المیزان جلد ۱ ص ۲۳۸ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۵۹ و تاریخ بغداد جلد ۴ ص ۳۳۴) مگر پہلا قول صحیح ہے۔

اولاد:

ان کے ایک فرزند ابوالعباس محمد کا ذکر ملتا ہے جو نامور محدث تھے اور امام دارقطنی اور احمد بن عوف جیسے مشاہیر فن نے ان سے کسب فیض کیا تھا۔ (تاج العروس ج ۳ ص ۴)

مسند:

فن حدیث میں بزار کے کمال کا ثبوت مسند کی جمع وتالیف ہے، مسند میں ان کی دو کتابیں تھیں، المسند الکبیر المعلل اس کا نام البحر الزاخر بھی ہے اور دوسری مسند صغیر، کبیر میں حدیثوں کے علل اور مخفی اسباب قادحہ کے متعلق بھی بحث وکلام کیا گیا ہے، اسی لیے اس کو کتب معلل میں شمار کیا جاتا ہے، محدثین کی اصطلاح میں معلل وہ کتابیں کہلاتی ہیں جن میں مصنف ان مخفی اسباب وعلل کو بیان کرتا ہے جو صحت حدیث کے لیے موجب قدح ہیں، عراقی کا بیان ہے کہ بزار نے صحیح وغلط روایتوں سے کم اور رواۃ حدیث کے تفرد وعدم متابعت سے زیادہ تعرض کیا ہے۔ (بستان المحدثین ص ۳۴)

حافظ ابن حجر نے اس کے ان زوائد کی جو کتب ستہ اور مسند احمد میں نہیں پائے جاتے، اپنے استاذ ابوالحسن ہیثمی کی کتاب سے تلخیص کی ہے، مسند کا ایک جامع ومکمل اور صحیح نسخہ حافظ ہیثمی کے قلم کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے، یہی نسخہ حافظ ابن حجر کے استعمال میں رہا ہے۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی)

Marfat.com

بزار پر غلطی کا الزام:

محدثین کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے کہ بزار روایت حدیث میں غلطی کر جاتے تھے، امام دارقطنی اور حاکم کا بیان ہے کہ وہ متن واسناد دونوں میں غلطی کرتے ہیں، امام نسائی نے بھی ان پر جرح کی ہے اور بعض لوگوں نے ان کے تفرد اور عدم متابعت کا بھی ذکر کیا ہے (لسان المیزان ج ۱ ص ۲۳۸ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۵۹) لیکن ان اعتراضات سے ان کے فضل و کمال میں کوئی فرق نہیں آتا، حافظ ابن حجر نے بزار کے بعض تفردات ذکر کر کے ان کا جواب دیا ہے اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اکثر میں وہ منفرد نہیں ہیں، دوسرے ان کے ثقہ و ثابت ہونے میں کسی کو کلام نہیں، خود ان ائمہ سے بھی جنہوں نے ان کی تضعیف کی ہے، توثیق منقول ہے، امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ ''وہ ثقہ ہیں اور ان سے غلطی بھی سرزد ہوتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ عموماً اپنے حافظہ اور یادداشت پر اعتماد کرتے تھے اور روایت بیان کرتے وقت صحیح نسخہ کو پیش نظر نہیں رکھتے تھے۔

اور مجرد غلطی راوی کے متروک وساقط الروایت ہونے کی دلیل نہیں، اس پر پہلے مفصل بحث گزر چکی ہے۔

Marfat.com

امام ابو مسلم کشی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۹۲ھ)

نام ونسب:

ابراہیم نام، ابو مسلم کنیت، نسب نامہ یہ ہے، ابراہیم بن عبداللہ بن مسلم بن ماعز، (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۵) خطیب نے ماعز کے بعد مہاجر اور سمعانی نے کش لکھا ہے۔ (تاریخ بغداد جلد ۶ ص ۱۲۰ و کتاب الانساب ورق ۴۷۶)

ولادت:

خطیب نے لکھا ہے کہ "بیان کیا گیا ہے کہ وہ ۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے" (تاریخ بغداد ج ۶ ص ۱۲۱) لیکن ذہبی نے ان کی عمر ۱۰۰ سال کے لگ بھگ بتائی ہے اور ان کا سن وفات ۲۹۲ھ ہے، اس لحاظ سے ان کی پیدائش ۲۰۰ھ سے پہلے ہوئی ہوگی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۶)

خاندان ووطن:

وہ بصری اور کشی کی نسبتوں سے زیادہ مشہور ہیں، بعض کا خیال ہے کہ بصرہ کے باشندہ تھے لیکن مقدسی کا بیان ہے کہ وہ بصرہ میں معماری کا کام کرتے تھے، اس لیے ان کو بصری کہا جاتا ہے، دوسری نسبت کش کی جانب ہے جو جرجان کے ایک گاؤں کا نام ہے لیکن سمعانی نے ان کے جد اعلیٰ کا نام کش لکھا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کش فارسی لفظ کج (کچ) کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کے معنی چونے کے ہیں اور چونکہ وہ بصرہ میں معماری کا کام کرتے تھے اور اکثر ھات الکج (چونا لاؤ) کہا کرتے تھے، اس لیے یہی لقب پڑ گیا تھا، محمد بن طاہر مقدسی اور علامہ ابن ندیم نے اسی کو ترجیح دی ہے، ابن ندیم لکھتے ہیں کہ ان کے باپ بصرہ میں منتقل ہو گئے تھے اور یہ وہاں معماری کرتے تھے اور اکثر مزدوروں سے کج کج کہا کرتے تھے، اس لیے ان کو کجی کہا جاتا ہے' حافظ ابو موسیٰ کے نزدیک کج خوزستان کے ایک گاؤں کا نام ہے جس کو زیر کج کہا جاتا ہے، ابو مسلم اسی کی جانب منسوب ہیں، علامہ سمعانی نے ان کی ایک نسبت لیثی بھی بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نسبی تعلق بنو لیث سے تھا۔ (کتاب الانساب ورق ۴۷۶، معجم البلدان ج ۲ ص ۲۵۴، الفہرست ص ۳۲۴ و الرسالۃ المستطرفہ ص ۳۶)

اساتذہ وشیوخ:

امام ابو مسلم کشی نے جن نامور علماء ومحدثین سے کسب فیض کیا تھا، ان کے نام یہ ہیں:
ابو عاصم نبیل، ابو الولید طیالسی، بدل بن محبر، حجاج بن نصیر فساطیطی، سلیمان بن حرب، عبداللہ بن رجاء غدانی، عبداللہ بن

Marfat.com

مسلم قعنبی، عبدالرحمٰن بن حماد شعبی، عبدالملک بن قریب اصمعی، عمرو بن مرزوق، محمد بن عبداللہ انصاری، محمد بن عرعرہ، مسلم بن ابراہیم، معاذ بن عبداللہ عوذی وغیرہ۔

تلامذہ:

ان سے جن لوگوں نے استفادہ کیا ہے، ان کی تعداد بے شمار ہے، چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر شافعی، ابوبکر مالک بن قطیعی، ابوسہیل بن زیاد، ابوعمر بن سماک، ابوالقاسم بغوی، ابومحمد بن مالسی، احمد بن سلیمان نجاد اسماعیل خطبی، اسماعیل بن محمد صفار، جعفر خالدی حبیب قزار، عبدالباقی بن قانع، فاروق خطابی، محمد بن جعفر آدمی اور خود ان کے صاحبزادے ابوالحسن محمد بن ابراہیم کشی وغیرہ۔ (تاریخ بغداد جلد ۶ ص ۱۲۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۵)

سفر:

ان کے صرف بغداد جانے اور وہاں حدیثیں بیان کرنے کا ذکر ملتا ہے۔

حفظ و ثقاہت:

امام ابومسلم کے علم و فضل، حفظ و ضبط اور ثقاہت و اتقان پر علمائے فن کا اتفاق ہے، علمائے طبقات و سیر نے ان کو الحافظ کان محدثا حافظا اور من حفاظ الحدیث لکھا ہے، موسیٰ بن ہارون اور امام دارقطنی نے ان کو ثقہ صدوق قرار دیا ہے، محمد بن علی صوری کا بیان ہے کہ میں نے حافظ عبدالغنی بن سعید سے ابومسلم کجی کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ ثقہ اور نہایت ذکی تھے، علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ وہ عالم، ثقہ اور جلیل القدر محدث تھے، ابن ندیم لکھتے ہیں کہ وہ ان اجلہ محدثین میں تھے جن کی سندیں نہایت عالی ہوتی ہیں، علامہ سمعانی رقمطراز ہیں کہ وہ ثقہ اور اکابر محدثین میں تھے اور انہوں نے بے شمار حدیثیں بیان کیں، خطیب کا بیان ہے کہ وہ صاحب علم و فضل اور امین تھے۔ علامہ ذہبی فرماتے ہیں، وہ احادیث کے واقف کار اور بقیۃ الشیوخ میں تھے، ابن عماد لکھتے ہیں، وہ صاحب سنن اور مسند وقت تھے۔

(تاریخ بغداد جلد ۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۵ و الفہرست ص ۳۲۴ و کتاب الانساب ورق ۴۷۶ و شذرات الذہب جلد ۲ ص ۲۱۰)

مرجعیت و مقبولیت:

ابومسلم کے علم و فضل نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنا دیا تھا، ان کے درس میں ہزاروں اشخاص شریک ہوتے تھے، مؤرخین کا بیان ہے کہ جب وہ بغداد تشریف لائے تو تشنگان علم کا جم غفیر ان کے گرد اکٹھا ہو گیا تھا، غسان کے میدان میں جو بغداد کا سب سے وسیع اور کشادہ مقام تھا، جب ان کی مجلس درس آراستہ ہوئی تو سامعین کا بڑا اژدحام تھا، حاضرین کا تخمینہ ۴۰-۵۰ ہزار لگایا گیا۔ (تاریخ بغداد ج ۶ ص ۱۲۱ و ۱۲۲ و البدایہ ج ۱۱ ص ۹۹ و تذکرہ ج ۲ ص ۱۹۶)

امارت و شکوہ اور جود و سخاوت:

اللہ تعالیٰ نے علم و فضل اور عزت و شہرت کے ساتھ مال و دولت اور جاہ و حشمت سے بھی نوازا تھا، طبعاً بڑے فیاض تھے، مؤرخین نے ان اوصاف و کمالات کے ذکر میں، انہیں صاحب حشمت، کبیر الشان، ذی جاہ اور سخی و فیاض بتایا ہے، جب

Marfat.com

انہوں نے اپنی سنن کی جمع وتالیف کا کام ختم کر کے لوگوں کے سامنے اس کو پہلی مرتبہ پیش کیا اور پڑھا تو ایک ہزار درہم فقراء ومساکین میں تقسیم کیے اور محدثین وائمہ فن کے علاوہ دوسرے اعیان وعمائد کی ایک پُرتکلف دعوت کی اور اس میں تقریباً ایک ہزار دینار صرف کیے، خطیب کا بیان ہے کہ:

انہوں نے نذر مانی تھی کہ جب حدیث بیان کرنا شروع کریں گے تو دس ہزار دینار صدقہ کریں گے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جب جب وہ دس ہزار حدیثیں بیان کر لیتے تو کچھ نہ کچھ صدقہ ضرور کرتے، جب پہلی مرتبہ حدیث بیان کی تو خود بھی صدقہ وخیرات کیا اور اپنے شریک تجارت کو بغداد خط لکھا کہ تم ساری کھجوریں صدقہ کردو، اور اگر فروخت کر چکے ہو تو ان کی قیمت غریبوں میں تقسیم کردو۔ (تاریخ بغداد ج ۶ ص ۱۲۱ و ۱۲۲ والبدایہ ج ۱۱ ص ۹۹ وتذکرہ ج ۲ ص ۱۹۶)

پیشہ:

شروع میں وہ معماری کا کام کرتے تھے، پھر تجارت کرنے لگے تھے اور بصرہ سے بغداد کھجوریں بھیجتے تھے، وہاں ان کی طرف سے ایک وکیل تھا جو ان کو فروخت کرتا تھا، ابو مسلم بعض سرکاری مناصب پر بھی فائز رہے، اسی لیے مشہور شاعر بحتری نے ان کی شان میں مدحیہ اشعار کہے ہیں۔ (تاریخ بغداد ج ۶ ص ۱۲۲)

وفات:

تقریباً ایک سو سال کی عمر میں ۲۳/محرم الحرام ۲۹۲ھ بروز یکشنبہ بغداد میں انتقال کیا اور وہاں سے ان کی لاش بصرہ لائی گئی اور یہیں تجہیز وتکفین ہوئی۔ (ایضاً ص ۱۲۴ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۶)

تصنیفات:

علامہ ابن ندیم نے ان کی دو کتابوں السنن والمسند کا ذکر کیا ہے، ان میں سنن زیادہ مشہور ہے، اس کی اکثر حدیثیں ثلاثی ہیں اور قلمی نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں پایا جاتا ہے۔ (الفہرست ص ۳۲۴ ومقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۶)

Marfat.com

امام محمد بن نصر مروزی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۹۴ھ)

نام ونسب:

نام محمد، ابوعبداللہ کنیت، شیخ الاسلام لقب، نسب نامہ کتابوں میں مذکور نہیں ہے۔

ولادت، خاندان وطن:

ان کی زبانی منقول ہے کہ "میں بغداد میں پیدا ہوا، میرے والد مروزی تھے، میری نشوونما نیشاپور میں ہوئی اور اب سمرقند میں رہتا ہوں۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا آبائی وطن خراسان کا مشہور شہر مرو ہے، اسی لیے وہ مروزی کی نسبت سے مشہور ہیں لیکن انہوں نے سمرقند میں بودوباش اختیار کرلی تھی۔ (تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۵، تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۸۹)

اساتذہ:

محمد بن نصر کو جن اکابر محدثین سے استفادہ کا موقع ملا، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن منذر خزامی، ابوقدامہ سرخسی، اسحٰق بن راہویہ، ربیع بن سلیمان، سعید بن عمر اشعثی، شیبان بن فروخ، صدقہ بن فضل، عبدان بن عثمان مروزی، عبیداللہ بن معاذ عنبری، علی بن بحر قطان، علی بن حجر، عمرو بن زرآرہ، محمد بن بشار بندار، محمد بن عبداللہ بن نمیر، محمد بن عبدالملک بن ابی الشوارب، ہدبہ بن خالد، ہشام بن عمار، یحییٰ بن یحییٰ نیشاپوری، یزید بن صالح، یونس بن عبدالاعلیٰ وغیرہ۔

تلامذہ:

ان کے چند تلامذہ اور منتسبین کے نام یہ ہیں:

ابوحامد بن شرقی، ابوالعباس سراج، ابوعبداللہ بن اخرم۔ ابوعلی اللہ بن محمد بن علی بلخی، عثمان بن جعفر لبان، محمد بن منذر سکر، محمد بن یعقوب بن اخرم اور عزیزوں میں ان کے صاحبزادہ اسماعیل بن محمد کو ان سے روایت کرنے کا موقع ملا۔

(تہذیب التہذیب ج ۹ ص وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱)

رحلت وسفر:

ان کو علم وفن سے فطری ذوق تھا اور ہمیشہ علمی مسائل پر بحث وگفتگو کرتے تھے، عبداللہ بن محمد ثقفی کا بیان ہے کہ

Marfat.com

''میرے دادا جوان کے ساتھ چار سال رہے، بیان کرتے ہیں کہ میں نے انھیں غیر علمی باتیں کرتے نہیں دیکھا، اس شوق کی تکمیل کے لیے انہوں نے طلب علم کے لیے مختلف شہروں کا سفر کیا، خطیب لکھتے ہیں: ''رحل الی سائر الامصار فی طلب العلم'' علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ انہوں نے طلب علم کے لیے مختلف شہروں کا سفر کیا اور خراسان، عراق، حجاز، شام و مصر کے علما سے استفادہ کیا۔ (تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۶ و المنتظم ج ۶ ص ۶۴)

حدیث میں درجہ:

حدیث میں ان کی جلالت قدر کا اندازہ ان بیانات سے ہوگا۔ علامہ ذہبی نے ان کو برع فی هذا الشان اور رأسا فی الحدیث لکھا ہے، حاکم کا بیان ہے کہ ''وہ حدیث کے بحر زخار تھے'' اکابر علمائے جرح و تعدیل نے ان کے ضبط و ثقاہت اور حفظ و اتقان کا اعتراف کیا ہے، حافظ ابن حجر نے ان کو الحافظ، الثقہ اور ابن حبان نے ثقات میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ ان جامعین و مصنفین حدیث میں تھے جو مرتبہ امامت پر فائز تھے، ابو محمد بن حزم کا بیان ہے کہ وہ سنن کے جامع و ضابط صاحب علم اور احادیث کے مطالب کے حافظ اور مدافع تھے۔ (تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۴ و المنتظم ج ۶ ص ۶۴)

فقہ و خلافیات:

فقہ و خلافیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، ان کے سوانح نگاروں نے ان کے نام کے ساتھ الفقیه احد ائمة الفقهاء اور رأسا فی الفقه وغیرہ لکھا ہے۔

وہ نیشاپور کے مفتی سمجھے جاتے تھے، محمد بن یحییٰ سے جب کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو وہ اس کو ابو عبد اللہ مروزی کے پاس بھیج دیتے، خطیب بغدادی تحریر فرماتے ہیں کہ ان کو صحابہ اور مابعد کے علما کے اختلاف سے بڑی واقفیت تھی، ابو محمد بن حزم کا بیان ہے کہ وہ اجماع اور خلافیات کے بڑے عالم تھے۔

(تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۹ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۴ و المنتظم ج ۶ ص ۶۴ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱)

مذہب و مسلک:

امام شافعیؒ سے ان کو بڑا تعلق تھا، ان کے نامور تلامذہ سے فقہ کی تحصیل کی تھی اور اسی مسلک فقہ سے وابستہ تھے، ابن عماد کا بیان ہے کہ ان کے زمانہ کے شوافع میں کوئی شخص ان کا ہمسر نہیں تھا۔ (شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۱۷)

مقبولیت:

ان کو بڑی مقبولیت حاصل تھی، عوام و خواص و امراء و حکام سب ان کا بڑا احترام کرتے تھے، امیر اسماعیل بن احمد کے پاس تشریف لے جاتے تو وہ احتراما کھڑا ہو جاتا تھا۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۵)

امامت:

علمائے طبقات و تراجم نے ابو عبد اللہ مروزی کو ائمہ مسلمین میں شمار کیا ہے اور احد الاعلام، احد اعلام الامة، احد ائمة الاسلام اور الامام الجلیل وغیرہ القاب سے موسوم کیا ہے، سلیمانی اور ابوبکر ضبعی نے ان کو امام بتایا ہے، محمد بن

Marfat.com

عبداللہ بن عبدالحکم کا جوان کے استاذ الفقہ تھے، بیان ہے کہ جب وہ مصر میں ہم لوگوں کے درمیان مرتبہ امامت پر فائز ہیں تو خراسان میں کسی کو انکی امامت میں کلام ہوسکتا ہے؟، ابوبکر احمد ابن اسحاق کا بیان ہے کہ میں نے دو ائمۂ مسلمین دیکھے، ابوحاکم رازی اور ابوعبداللہ مروزی۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۵ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱ و ۲۲ و تاریخ ج ۳ ص ۳۱۷ و تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۹۰)

زُہد و عبادت:

زہد و تقویٰ میں بھی ان کا درجہ بہت بلند تھا، علمی اشغال سے جو وقت بچتا، اس کو عبادت اور یادِ الٰہی میں صرف کرتے تھے، نمازیں بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھتے تھے، ابوبکر ضبعی کا بیان ہے کہ میں نے ان سے بہتر کسی کی نماز نہیں دیکھی، ابن اخزم فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ان کی نماز کا حسن اور خشوع و خضوع دیکھ کر سخت متعجب ہوتے تھے، استغراق و محویت کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ نماز میں بھڑ نے ڈنک مار دیا اور جسم سے خون جاری ہوگیا مگر انہوں نے کوئی حرکت اور جنبش نہیں کی، وہ جب نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے تو ایک بے حس و حرکت لکڑی کی طرح معلوم ہوتے تھے، (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۵ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱ و ۲۲ و تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۷ و تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۹۰) اس انہماک کی وجہ سے ان کا شمار اکابر صلحا اور مشہور عباد و زہاد میں ہوتا تھا۔ (صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۱۲۳ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱) ان کی بعض کرامتیں بھی بیان کی جاتی ہیں۔

ذریعہ معاش اور جود و سخا:

ان کی مستقل آمدنی بارہ ہزار سالانہ تھی، چار ہزار اسماعیل بن احمد امیر خراسان اور اسی قدر اس کے بھائی اسحاق اور اہل سمرقند کی جانب سے ان کو وظیفہ ملتا تھا لیکن ان کے مزاج میں بڑی سخاوت و فیاضی تھی، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

وقد کان من اکرم الناس و اسخاھم نفسا۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۰۲) وہ بڑے کریم اور سخی تھے۔

اس لیے یہ کل رقم محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور جو کچھ بچتا اسی معمولی رقم میں گزر بسر کر لیتے، جب ناگہانی ضرورت کے لیے کچھ پس انداز کرنے کے لیے کہا جاتا تو کوئی توجہ نہ کرتے، اپنے ایک شریک کو مضاربت پر اپنا مال تجارت کے لیے بھی دیتے تھے۔ (تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۷ و ۳۱۸ و تذکرہ ج ۲ ص ۲۲۵)

اولاد:

عرصہ تک لاولد رہے، آخری عمر میں اولاد کی آرزو بہت بڑھ گئی، اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے جو قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ایک صالح فرزند عطا کیا جب بچہ کے تولد کی ان کو اطلاع ہوئی بے ساختہ ان کی زبان سے دعائے ابراہیمی نکل گئی، الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسماعیل، اس بچہ کا انہوں نے اسماعیل ہی نام بھی رکھا۔

(المنتظم ج ۶ ص ۶۴)

حلیہ:

صورت نہایت حسین اور چہرہ گلاب کی طرح شاداب اور شگفتہ تھا، سپید داڑھی نے چہرہ کو اور زیادہ پُرنور بنا دیا تھا۔

Marfat.com

وفات:

محرم ۲۹۴ھ میں سمرقند میں وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۵و۲۲۶ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۲)

تصنیفات:

انہوں نے متعدد کتابیں تالیف کیں، خطیب کا بیان ہے کہ: "صاحب التصانیف الکثیرۃ والکتب الجمۃ" یعنی وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، ان کی کتابیں بڑی مفید اور بیش قیمت تھیں، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ: وصنف الکتب المفیدۃ الحافلۃ النافقۃ یعنی نہایت مفید کتابیں لکھیں۔

ان کی جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

مسند:

یہ ان کی سب سے اہم اور مشہور کتاب ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں عبدالقادر بن عبدالعزیز کے قلم کا لکھا ہوا ہے ۲۶۸، اوراق میں موجود ہے' سن کتابت ۲۵۶ھ ہے، اس کے شروع میں ایک باب نماز کا بھی ہے، اس کا عنوان ہے: باب فی تعظیم قدر الصلوٰۃ وتفضیلھا علی سائر الاعمال۔ (فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۴۲۰) جو بجائے خود ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، بعض علما نے اس کا مستقل تصنیف کی حیثیت سے ذکر کیا ہے، حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "وصنف کتابا عظیما فی الصلوٰۃ۔ (البدایہ ج ۱۱ ص ۱۰۲) (نماز پر ایک مہتم بالشان کتاب لکھی)۔

کتاب القسامۃ:

مروزی کی یہ دوسری اہم تصنیف ہے، ابوبکر صیرفی اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"اگر انہوں نے صرف یہی کتاب لکھی ہوتی تو بھی ان کے ایک بڑے اور عظیم فقیہ ہونے کے لیے کافی تھی۔"

(تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۶)

علامہ ابن سبکی نے ان کی ایک اور کتاب کا ذکر کیا ہے، اس میں امام ابوحنیفہؒ نے حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے مسلک سے جن باتوں میں اختلاف کیا ہے اس کا ذکر ہے۔ (طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱)

قیام اللیل اور کتاب رفع الیدین کے نام سے بھی دو رسالے لکھے تھے، جو طبع ہو چکے ہیں۔ (خاتمہ سیرۃ الامام البخاری ص ۲۶)

Marfat.com

امام ابو محمد ابن جارود رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۲۹۹ھ)

نام ونسب:

عبداللہ نام، ابومحمد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: عبداللہ بن علی بن جارودؒ۔

وطن:

سن ولادت اور خاندانی حالات معلوم نہیں ہو سکے، وطن نیشاپور ہے، مکہ میں مجاورت اختیار کرلی تھی۔

اساتذہ:

چند مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابوسعید بن اشج، احمد بن ازہر، احمد بن یوسف سلمی، اسحاق کوسج، بحر بن نصر، زیاد بن ایوب، عبداللہ بن ہاشم طوسی، عبد الرحمٰن بن بشر، علی بن خشرم، محمد بن ابی عبدالرحمٰن مقری، محمد بن آدم، محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم، محمد بن عثمان بن کرامہ، محمد بن یحییٰ، یعقوب بن ابراہیم دورقی وغیرہ۔

تلامذہ:

حافظ ذہبی نے ان کے چار تلامذہ ابوحامد بن شرقی، دعلج سنجری، محمد بن نافع مکی اور یحییٰ بن منصور کا نام تحریر کیا ہے۔

ضبط واتقان:

اور ان کے علم وفضل کے بارے میں لکھتے ہیں:

ھو الحافظ الامام الناقد کان من ثقہ العلماء المتقنین المجودین۔

وہ حدیث کے حافظ، امام ناقد، ثقہ وضابط اور جید علمائے اسلام میں تھے۔

وفات:

ان کا سن وفات ۳۰۷ھ ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۶)

تصنیفات:

ابن جارود کی کتاب ''المنتقی'' احکام وسنن سے متعلق روایات واحادیث کا ایک منتخب ومختار مجموعہ ہے جو ایک جلد میں اور

Marfat.com

تقریباً آٹھ سو حدیثوں پر مشتمل ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

''یہ کتاب گویا صحیح ابن خزیمہ پر مستخرج ہے لیکن اس میں صرف اس کے اصول احادیث پر اکتفا کیا گیا ہے، اسی لیے اس کا نام منتقی ہے۔'' (بستان المحدثین ص ۸۵)

صاحب الرسالۃ المستطرفہ کتانی فرماتے ہیں کہ:

یہ کتاب گویا صحیح ابن خزیمہ پر مستخرج ہے لیکن اس میں صرف اس کے اصول احادیث پر اکتفا کیا گیا ہے، اسی لیے اس کا نام منتقی ہے۔ (الرسالۃ المستطرفۃ ص ۲۳)

صاحب الرسالۃ المستطرفہ کتانی فرماتے ہیں کہ:

اس کے استقصا سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بہت کم حدیثوں میں صحیحین سے تفرد کیا گیا ہے۔ (تدریب الراوی ص ۳۲)

ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ:

''صحیحین کے بعد ابن سکن، ابن جارود اور ابن صبغ کی کتابوں کا درجہ ہے، اس کے بعد ابوداؤد ونسائی کی کتابوں کا نمبر آتا ہے۔''

(تدریب الراوی ص ۳۲)

منتقی ابن جارود پہلی مرتبہ حیدر آباد دکن سے ۵۰۴ صفحات میں شائع ہوئی ہے، شروع میں جن چھ طرق سے اس کی روایت کی گئی ہے، ان کا ذکر ہے، حواشی مختصر مگر مفید مطالب پر مشتمل ہیں، ہر حدیث کے سامنے حاشیہ میں اس کے ماخذ حروف تہجی کے ذریعہ ظاہر کیے گئے ہیں، مثلاً (ط) سے مؤطا (حم) سے مسند احمد، (خ) سے بخاری، اور (م) سے مسلم وغیرہ۔

ابو عمرو اندلسی نے المرتقی فی شرح المنتقی کے نام سے اس کی شرح لکھی تھی۔ (الرسالۃ المستطرفۃ ص ۲۳)

Marfat.com

امام ابوعبدالرحمٰن نسائی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۳۰۳ھ)

نام ونسب:

احمد نام اور ابوعبدالرحمٰن کنیت تھی، سلسلہ نسب یہ ہے: احمد بن شعیب بن علی بن سنان بن بحر بن دینار۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۲ و تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۲ و طبقات الشافعیہ سبکی ج ۲ ص ۸۳)

پیدائش:

عام مورخین کے بیان کے مطابق امام نسائی ۲۱۴ھ یا ۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے لیکن بعض نے سن پیدائش ۲۲۵ھ لکھا ہے (حسن المحاضرہ سیوطی ج ۱ ص ۱۴۷ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۴۰) جو صحیح نہیں ہے۔

وطن:

امام نسائی نے بعد میں مصر میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی لیکن ان کی پیدائش اور نشوونما خراسان کے مشہور شہر نساء میں ہوئی، (کتاب الانساب ورق ۵۵۹) قدیم زمانہ میں نساء علم وفن اور ارباب کمال کا مرکز رہ چکا ہے اور اس کی خاک سے بہت سے نامور علماء وفضلا پیدا ہوئے، اسی کی نسبت سے وہ نسائی کہلاتے ہیں، نسوی سے بھی اسی کی جانب نسبت ہے، مگر وہ زیادہ مشہور نہیں، نساء خراسان میں ہے، اسلئے امام صاحب کو خراسانی بھی کہا جاتا ہے۔

(ایضاً و وفیات الاعیان ج ۱ ص ۳۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۶)

اساتذہ اور شیوخ:

امام نسائی کے اساتذہ کی تعداد بے شمار ہے، بعض مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابویزید جرمی، احمد بن عبدہ، اسحاق بن راہویہ، حسین بن منصور، حمید بن سعدہ، سوید بن منصور، ابوالحسن علی بن حجر بن ایاس، علی بن حشرم، عمران بن موسیٰ، عمرو بن زرارہ عیسیٰ بن حماد، ابورجا قتیبہ بن سعید بلخی، مجاہد بن موسیٰ، محمد بن بشار، محمد بن رافع، ابوکریب محمد بن علاء، محمد بن نصر مروزی، ہشام بن عمار اور یونس بن عبدالاعلیٰ وغیرہ افاضل اور اساطین حدیث سے احادیث نبوی کا سماع کیا اور احمد بن نصر نیشاپوری اور ابوشعیب سوسی سے فن قراءت کی تحصیل کی۔

ائمہ صحاح میں امام بخاری اور امام ابوداؤد سے بھی ان کو شرف تلمذ حاصل ہے۔

(طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۳ و تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۷ و الحطہ ص ۱۲۷)

Marfat.com

تلامذہ:

ان کے تلامذہ کے ناموں کا استقصا دشوار ہے، بعض مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن محمد بن صالح، ابوبشر دولابی، ابوعلی حسین محمد نیشاپوری، ابوالقاسم طبرانی، ابوالقاسم حمزہ بن محمد کتنانی، ابوعلی حسن بن خضر سیوطی، ابوبکر احمد بن اسحاق السنی، محمد بن معاویہ، حسن بن رشیق، ابوالحسن محمد بن عبداللہ حیویہ، محمد بن قاسم اندلسی، ابوبکر احمد بن محمد، ابوعوانہ، ابوجعفر طحاوی، ابوبکر احمد بن حداد، ابوجعفر عقیلی، ابوعلی محمد بن ہارون اور آپ کے صاحبزادے عبدالکریم وغیرہ، ان میں سے اکثر حضرات نے آپ کی کتاب سنن کی روایت کی ہے۔

(تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۷ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۴)

تعلیم و تحصیل حدیث کے لیے سفر:

امام نسائی کی ابتدائی تعلیم کے حالات نہیں ملے، مگر اتنا معلوم ہے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق انہوں نے مختلف ملکوں اور شہروں کا سفر کیا تھا، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ''دور دراز شہروں میں جا کر سماع حدیث میں مصروف رہے اور ان ائمہ فن اور مشائخ کبار سے ملے جن سے بالمشافہ انہوں نے روایت کی ہے۔'' علامہ سیوطی کا بیان ہے کہ ''رجال فی البلاد'' یعنی مختلف ملکوں کا سفر کیا، تذکرہ و طبقات کی کتابوں میں ان کے حجاز، عراق، مصر، شام، جزائر اور خراسان جانے اور وہاں کے ائمہ کمال سے استفادہ کرنے کی تصریح ملتی ہے، امام صاحب کا خود بیان ہے کہ ''وہ پندرہ سال کی عمر میں قتیبہ کی خدمت میں حدیث سیکھنے کی غرض سے بغداد گئے اور ایک سال دو ماہ تک وہاں قیام کیا۔''

(تہذیب ج ۱ ص ۳۷ طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۴ و البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۲۳ و حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۴۷)

علم حدیث میں امتیاز:

علم حدیث کی تاریخ میں تیسری صدی ہجری کا زمانہ بڑی اہمیت اور خاص امتیاز رکھتا ہے، اس زمانہ میں ہر گھر میں علم حدیث کا چرچا تھا اور اسلامی ملکوں کا ہر بڑا شہر اس کا مرکز تھا، اس دور سے زیادہ بڑے محدثین اور کسی دور میں بھی نہیں پیدا ہوئے، امام نسائی بھی اسی دور کمال میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے قدرتی طور پر ان کی توجہ کا مرکز علم حدیث ہی قرار پایا اور اس میں ان کو جو تبحر اور کمال حاصل ہوا وہ ان کے دوسرے معاصرین کے حصہ میں نہیں آیا، امام دارقطنی کا بیان ہے کہ ''امام نسائی اپنے دور کے تمام علمائے حدیث میں یکتا اور سب سے زیادہ افضل و برتر تھے۔''

حفظ و ثقاہت:

قدرت نے امام صاحب کو حفظ کی غیر معمولی قوت عطا کی تھی، ابن یونس صاحب تاریخ مصر کا بیان ہے کہ وہ احادیث کے ایک نامور حافظ تھے، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ ''میں نے اپنے استاذ علامہ ذہبی سے دریافت کیا کہ حافظہ کے لحاظ سے امام مسلم اور امام نسائی میں کون بڑھا ہوا تھا؟ انہوں نے نسائی کا نام لیا، میں نے اپنے والد سے اس کو بیان کیا تو انہوں نے بھی اس کی تائید کی، سیوطی نے الحافظ، احد الحفاظ المتقنین کے القاب سے ان کا ذکر کیا ہے، ان کی ثقاہت و اتقان پر بھی اتفاق ہے، ابن یونس کہتے ہیں ''وہ نہایت ثقہ و ثابت تھے''۔ (ایضا)

Marfat.com

جرح وتعدیل:

وہ فن جرح وتعدیل کے بھی ماہر تھے، ان کا شمار مشہور نقادانِ حدیث میں ہے، اس لحاظ سے بعض محدثین نے ان کو امام بخاری وامام مسلم سے بھی فائق قرار دیا ہے، حافظ حدیث ابوعلی کا بیان ہے ''رجال کے باب میں امام نسائی کے شرائط امام مسلم سے بھی زیادہ سخت تھے'' ابن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ ''میں نے سعد بن علی زنجانی سے ایک شخص کے متعلق استفسار کیا تو انہوں نے اس کی توثیق کی، میں نے کہا امام نسائی تو تضعیف کرتے ہیں، یہ سن کر انہوں نے کہا'' صاحبزادے ابوعبدالرحمٰن کی رجال کے بارے میں امام بخاری اور امام مسلم سے بھی زیادہ سخت شرطیں ہیں، احادیث کے سقم وصحت میں ان کی بصیرت ومعرفت کے بارے میں دارقطنی اور حاکم کی رائے یہ ہے کہ ''وہ اپنے معاصرین میں صحیح وسقم روایات وآثار اور رجال کی معرفت وتمیز میں سب سے زیادہ واقف کار تھے'' ابوبکر حداد کثیر الحدیث ہونے کے باوجود امام نسائی کے علاوہ اور کسی سے روایت نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ میرے اور خدا کے درمیان حجت ہیں، مامون مصری کا بیان ہے کہ ''جب ہم طرسوس آئے اور حفاظ حدیث کی خدمت میں حاضر ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان سب نے امام نسائی کے انتخاب کے مطابق حدیثیں لکھی ہیں۔''

(تذکرہ ج ۲ ص ۲۶۸ والبدایہ ج ۱۱ ص ۱۲۳ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۴)

فقہ وتفسیر:

امام نسائی کا اصلی فن علم حدیث ہے لیکن دوسرے علوم دینیہ میں بھی ان کو درک تھا، قراءت وتفسیر میں ان کو پوری دستگاہ حاصل تھی اور فقہ وفقہی احکام کے استنباط میں بھی ان کا پایہ نہایت بلند تھا، امام دارقطنی اور حاکم صاحب مستدرک کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں مصر کے سب سے بڑے فقیہ تھے'' ابن یونس اور دوسرے علما نے بھی ان کے فقیہ ومجتہد ہونے کا اعتراف کیا ہے، ان کی سنن سے بھی ان کے اس کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔ (بستان المحدثین ص ۱۱۱ والحطہ ص ۱۲۷)

عہدۂ قضا:

فقہ واجتہاد میں ان کے کمال کی بنا پر حمص کے قضا ولایت کا منصب ان کو تفویض کیا گیا تھا۔

زہد وتقویٰ اور عبادت:

امام نسائی کی عملی زندگی بھی نہایت پاکیزہ تھی، ان کا دل خشیت الٰہی سے لبریز قلب ذکر الٰہی سے معمور اور دماغ فکر عقبیٰ میں مصروف رہتا تھا، وہ بڑے عبادت گزار، متبع سنت اور صاحب ورع وتقویٰ تھے، رد بدعات واحیاء سنت ان کا خاص مشن اور نصب العین تھا، رات ودن کا بڑا حصہ خدا کی عبادت اور ذکر وفکر میں گزرتا تھا، تہجد کے پابند تھے، صوم داؤدی کے مطابق ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار کرتے تھے، حج بھی اکثر کرتے تھے، جہاد کا ولولہ بھی تھا، ایک مرتبہ امیر مصر کے ساتھ جہاد میں نکلے تو اتنی شجاعت وبہادری دکھائی کہ لوگوں کو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوگئی۔

(تہذیب ج ۱ ص ۳۸ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۸ والبدایہ ج ۱۱ ص ۱۲۳)

Marfat.com

اخلاقی کمالات:

صبر و رضا، ضبط و تحمل، شجاعت و بہادری اور عزم و استقلال وغیرہ اخلاقی فضائل سے بھی آراستہ تھے، طبیعت میں بڑا استغنا اور بے نیازی تھی، کبھی عزت نفس کا سودا نہیں کیا، امیر مصر کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے لیکن اس کی مجلس اور ہمنشینی سے ہمیشہ دور رہے، ایک مرتبہ اہل شام نے ان سے امیر معاویہؓ کے فضائل بیان کرنے کا مطالبہ کیا، انہوں نے انکار کر دیا، ان کے انکار پر ان کو بے دردی کے ساتھ پیٹا گیا، انہوں نے اس کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا، مگر ان کے استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا، احمد بن نصر کا بیان ہے کہ ''امام نسائی کی طرح کون صبر کر سکتا ہے، حالانکہ ان کے پاس امیر معاویہؓ کی فضیلت میں ابن لہیعہ کی حدیث موجود تھی لیکن انہوں نے اس کو نہیں بیان کیا، کیونکہ وہ ابن لہیعہ کو ضعیف سمجھتے تھے۔ (ایضاً)

امامت وتقدم:

ان کمالات کی بنا پر دوسرے اصحاب علم و کمال آپ کو مسلمانوں کا امام و مقتدا مانتے تھے، ابن عدی کا بیان ہے کہ میں نے منصور فقیہ اور احمد بن محمد طحاوی کی زبانی سنا کہ ''وہ مسلمانوں کے اماموں میں سے ایک ہیں'' حافظ ابو الحسین محمد بن مظفر فرماتے ہیں کہ ''میرے کانوں نے اپنے مصری اساتذہ کی زبان سے امام نسائی کے فضل و مرتبت اور امامت و تقدم کا اعتراف کرتے ہوئے سنا'' محمد بن سعد باوردی فرماتے ہیں کہ ''وہ مسلمانوں کے اماموں مین تھے، میں نے چار ائمہ حدیث دیکھے، ان میں سے ایک مصر کے امام نسائی بھی تھے۔'' (تہذیب ج ا ص ۸ ۳ و تذکرۃ ج ص ۶۸ ۲ و البدایہ ج ۱۱ ص ۱۲۳)

فقہی مذہب:

علامہ ابن سبکی نے طبقات شافعیہ میں ان کا ذکر کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب اور نواب صدیق حسن خاں صاحب نے بھی ان کو شافعی بتایا ہے لیکن بعض حنابلہ نے ان کو حنبلی قرار دیا ہے، ہمارے خیال میں وہ کسی خاص فقہی مسلک کے پابند نہ تھے، بلکہ وہ خود فقیہ و مجتہد تھے اور جزئیات مسائل میں محدثین کی طرح ظواہر احادیث کے مطابق عمل کرتے تھے اور جن ائمہ کے مسلک کو کتاب و سنت سے زیادہ قریب پاتے تھے اسی کی تائید فرماتے تھے''۔

عقیدہ:

امام نسائی اعتقاد میں اہل سنت والجماعت کے ہمنوا تھے لیکن ان پر شیعیت کا الزام لگایا جاتا ہے، عام مؤرخین اور اصحاب سیر نے اس الزام کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، اس کی شہرت غالباً ابن خلکان کے ایک بیان سے ہوئی ہے بعض دوسرے مؤرخین نے بھی ابن خلکان ہی کی روایت کو مآخذ بنایا ہے، اس لیے ان کے بیان کا جائزہ لیا جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

قال محمد بن اسحاق الاصبهانی سمعت مشائخنا بمصر یذکرون ان ابا عبد الرحمان فارق مصر فی آخر عمره و خرج الی دمشق فسئل عن معاویة و ماروی فی فضائله فقال اما یرضی معاویة ان یخرج رأسا برأس حتی یفضل و فی روایة اخری ما اعرف له فضیلة الا لا اشبع الله بطنه و کان یتشیع فما زالوا یدفعون فی حصنه حتی اخرجوه من المسجد و فی روایة اخری یدفعون فی خصیه۔

(وفیات الاعیان ج ا ص ۳۵ و ۳۶)

Marfat.com

محمد بن اسحاق اصبہانی فرماتے ہیں کہ میں نے مصر میں اپنے استادوں سے سنا کہ ابو عبدالرحمٰن نسائی آخر عمر میں مصر چھوڑ کر دمشق چلے گئے وہاں ان سے حضرت معاویہؓ اور ان کے فضائل کے متعلق روایات کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ کیا معاویہؓ کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ سر بسر نجات پا جائیں، ان کے فضائل کہاں ہیں جو بیان کیے جائیں، ایک دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے جواب دیا کہ میں ان کی کوئی فضیلت اس کے علاوہ نہیں جانتا کہ ''اللہ اس کو شکم سیر نہ کرے، ان میں شیعیت تھی لوگوں نے یہ جواب سن کر ان کی کمر اور کوکھ میں مارنا شروع کیا اور مسجد سے نکال دیا، دوسری روایت میں ہے کہ ان کے خصیتین میں مارنا شروع کیا تھا''۔

اس روایت کی صحت محل نظر ہے، متقدمین علما میں سے کسی نے اس کو قابل اعتنا نہیں سمجھا ہے اور نہ اس کی سند مسلسل ہے، ابن خلکان اور امام نسائی کے درمیان کئی صدیوں کا فرق ہے، امام نسائی کا انتقال ۳۰۳ھ میں ہوا ہے اور ابن خلکان کا ۶۸۱ھ یعنی دونوں کے درمیان تقریباً چار صدیوں کا فرق ہے، ایسی حالت میں امام نسائی کے بارے میں ابن خلکان کی روایت بغیر کسی سند کے کیسے قبول کی جاسکتی ہے، اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ امام نسائی حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، یا ان کو ان کے فضائل کی روایات کا علم نہ تھا اور حضرت علیؓ کے مقابلہ میں حضرت امیر معاویہ کے فضائل کا انکار شیعیت نہیں ہے، بہت سے اکابر کا یہ مسلک رہا ہے، پھر ابن خلکان نے ''کان شیعیا'' نہیں بلکہ ''کان یتشیع'' لکھا ہے، یعنی ان میں شیعیت کا اثر تھا۔

اس روایت کی صحت کی صورت میں واقعہ کی شکل یہ معلوم ہوتی ہے کہ شام بنی امیہ کا مرکز حکومت رہ چکا تھا اور وہ حضرت امیر معاویہؓ کا سب سے سنگین قلعہ تھا، یہاں کے تمام قبائل حضرت علیؓ کے مقابلہ میں ان کے حامی و مداح تھے، اس لیے بنی امیہ کی حکومت مٹنے کے بعد بھی مدتوں یہ اثر قائم رہا اور حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے اختلافات کی صدائے بازگشت یہاں صدیوں گونجتی رہی، امام نسائی کے زمانہ میں بھی یہی صورت حال رہی ہوگی، جیسا کہ خود اہل شام کے سوال سے ظاہر ہوتا ہے، اس لیے امام موصوف نے اس کی اصلاح اور حضرت علیؓ سے شامیوں کا سوءِ ظن دور کرنے کے لیے یہ جواب دیا ہوگا مگر اہل شام کے دل و دماغ پر حضرت امیر معاویہؓ کا اتنا اثر تھا کہ وہ آمادۂ پیکار ہو گئے اور امام صاحب کی توہین میں بھی باک نہیں کیا اور ان پر شیعیت کا الزام لگا دیا، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

> ''امام نسائی کی موت کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ حضرت علیؓ کے مناقب لکھ کر فارغ ہوئے تو چاہا کہ جامع دمشق میں لوگوں کے سامنے اس کتاب کو بیان کریں تاکہ وہاں کے لوگ جو بنی امیہ کی مدت مدید تک شام میں سلطنت کے باعث نواصب کے مذہب کی طرف مائل ہو گئے ہیں، ہدایت یافتہ ہو جائیں، اس کتاب کا تھوڑا ہی حصہ بیان کیا تھا کہ ایک شخص نے پوچھا کہ امیر المؤمنین معاویہؓ کے فضائل میں بھی آپ نے کچھ تحریر کیا ہے، امام نسائی نے کہا معاویہؓ کے لیے تو اتنا بس ہے کہ انھیں سر بسر نجات مل جائے، ان کے فضائل ہی کہاں ہیں بعض کہتے ہیں کہ آپ نے یہ بات بھی فرمائی تھی کہ میرے نزدیک ان کے مناقب میں کوئی صحیح روایت ثابت نہیں سوائے: الا لا اشبع اللہ بطنہ کے (یہیں سے) عوام الناس نے ان پر تشیع کا الزام جڑ دیا۔۔۔۔اور چند ضربیں ان کے خصیتین میں لگیں جن کی وجہ سے وہ نیم جان ہو گئے۔'' (بستان المحدثین ص ۱۱۱)

ابن کثیر کا طرز بیان اس سے کسی قدر مختلف ہے، مگر ان کا دار و مدار بھی ابن خلکان ہی کی روایت پر ہے، لکھتے ہیں:

وقد قیل عنہ: انہ کان ینسب الیہ من التشیع۔ (البدایہ ج ۱۱ ص ۱۲۳)

Marfat.com

ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی جانب کچھ شیعیت بھی منسوب ہے۔

اس کے بعد انہوں نے وہی ابن خلکان والی روایت نقل کی ہے مگر ''قیل'' کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ انتساب والزام ابن کثیر کے نزدیک مشکوک اور مشتبہ ہے، پھر ''کان ینسب الیہ'' میں صیغۂ مجہول کا استعمال بھی یہی بتاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ راوی کے نزدیک بھی یہ الزام مشتبہ ہے اور ''شیء من التشیع'' سے جس تقلیل کا اظہار ہوتا ہے وہ بھی قابل غور ہے۔

ان باتوں سے قطع نظر امام نسائی کے شیعہ نہ ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ وہ حضرت علیؓ سے فرطِ عقیدت کے باوجود دوسرے صحابہ کے فضائل وکمالات کے بھی قائل تھے اور مسائل میں ان کے عمل سے استفادہ کرتے تھے، شیعہ سب سے زیادہ شیخین (حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) کو مطعون کرتے ہیں مگر امام نسائی ان کے آرا واقوال سے حجت واستدلال کرتے ہیں، کتاب البیوع میں ابن ابی اوفی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ''ہم رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں، گیہوں، جو اور کھجور کی بیع سلم ان لوگوں سے کرتے تھے، جن کے متعلق ہم کو معلوم نہیں کہ یہ چیزیں ان کے پاس ہوتی تھیں یا نہیں، (سنن نسائی ج ۲ ص ۲۲۶) ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں ''ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے یہ فیصلہ کیا۔'' (ایضاً ص ۲۳۲) ایک اور مقام پر یہ فرماتے ہیں کہ اس چیز کا ابوبکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم نے یہ فیصلہ کیا، (ایضاً ص ۲۳۲) خلفائے راشدین میں اسی ترتیب کے وہ بھی قائل تھے، جو اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے، چنانچہ باب امامۃ اہل العلم والفضل میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ''جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو انصار نے کہا ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک تم لوگوں (مہاجرین) میں سے، حضرت عمر نے ان سے کہا کیا تم لوگوں کو نہیں معلوم کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر کو حکم دیا تھا کہ وہ نماز پڑھائیں، ایسی صورت میں کون شخص یہ پسند کرے گا کہ وہ امامت اور خلافت میں ان سے سبقت لے جائے، انہوں نے جواب دیا کہ ہم ابوبکرؓ پر اپنے کو ترجیح دینے سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ (سنن نسائی ج ۱ ص ۷۹)

یہ مثالیں ان کی شیعیت کی تردید کے لیے کافی ہیں، البتہ دو باتیں قابل بحث ہیں، ایک حضرت علیؓ کی محبت وعقیدت میں غلو، دوسرے حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق سخت الفاظ کا استعمال، پہلے کا جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی محبت میں کوئی ایسا غلو ناپسندیدہ نہیں ہے جو شریعت کے خلاف نہ ہو، بلکہ اہل بیت کی محبت تو جزو ایمان ہے، امام شافعی اور امام احمد کا بھی یہی مسلک تھا، امام احمد کی حضرت علیؓ سے عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے شیخ ابوزہرہ مصری تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس معاملہ میں ان کا وہی مسلک تھا جو ان کے استاذ امام شافعی کا تھا، امام شافعی حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب میں روایت کرتے تھے اور ان سے بڑی عقیدت ومحبت رکھتے تھے لیکن حضرت ابوبکرؓ کے مقابلہ میں جب تفضیل کا سوال آتا تھا تو وہ حضرت ابوبکرؓ کو سب پر ترجیح دیتے تھے، ان کا قول ہے کہ ''معاملہ ہمارے جذبات کا تابع نہیں ہے۔''
>
> (احمد بن حنبل ترجمہ رئیس احمد جعفری ص ۲۴۳)

امام شافعی ہی کی جانب یہ شعر بھی منسوب ہے:

ان کان رفضا حب آل محمد   فلیشھد الثقلان انی رافض

ترجمہ: اگر اہل بیت سے محبت کرنا شیعیت ہے تو جن وانس دونوں گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں۔

حضرت امیر معاویہؓ کی شان میں امام نسائی کے الفاظ اور سخت ہیں، وہ بہرحال صحابی ہیں اور ان کے فضائل میں بھی

Marfat.com

روایتیں ہیں اور اگر نہ بھی ہوتیں تو صحابیت کے عموم میں جو روایتیں ہیں ان کے بھی رو سے ان کی فضیلت مسلّم ہے لیکن امام نسائی کے قول کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے۔

ا۔ حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کی فضیلت مسلّم ہے، ان کو کسی حیثیت سے بھی حضرت علیؓ کے ہم پایہ قرار نہیں دیا جا سکتا، یہ جمہور امت کا متفقہ فیصلہ ہے، امام نسائی نے شام کے لوگوں کو اس کے برخلاف دیکھا، اس لیے جناب امیرؓ کے فضائل و مناقب بیان کرنے میں غلو سے کام لیا، ایسے حالات میں قدرتی طور پر تشدد اور غلو پیدا ہو ہی جاتا ہے، اس سلسلہ میں حضرت معاویہؓ کی شان میں ان سے بعض نامناسب الفاظ بھی نکل گئے۔

۲۔ امام نسائی کو حضرت علیؓ سے غیر معمولی محبت و عقیدت تھی مگر جب وہ شام گئے تو وہاں ان کے خلاف سوءِ ظن کی عام فضا دیکھ کر ان کے فضائل و مناقب بیان کرنا شروع کر دیئے جو بنی امیہ کے حامیوں کو ناگوار معلوم ہوئے اور انہوں نے امام نسائی سے حضرت امیر معاویہؓ کے فضائل بیان کرنے کی فرمائش کی، امام صاحب نے یہ سمجھا کہ جناب امیر سے بدگمانی کا اصل سبب حضرت امیر معاویہؓ سے فرطِ عقیدت اور غیر معمولی شیفتگی ہے اس کو دور کرنے کے لیے انہوں نے ان کی شان میں مذکورہ بالا باتیں کہہ دیں، جن سے ان کا منشا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی مذمت نہ تھا بلکہ حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب کا پوری طرح اظہار اور امیر معاویہؓ کے مقابلہ میں ان کی اہمیت و عظمت کا اثبات تھا۔

۳۔ حافظ ابن حجر وغیرہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام نسائی کے نزدیک حضرت امیر معاویہؓ کے فضائل میں کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں اس لیے انہوں نے لوگوں کے مطالبہ پر بھی ایسی کوئی حدیث نہیں بیان کی مگر جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو ان کو غصہ آ گیا اور ان کی زبان سے بعض سخت الفاظ نکل گئے لیکن غیظ و غضب کی حالت میں جو باتیں مُنہ سے نکل جاتی ہیں، ان کا کوئی اعتبار نہیں۔

غذا اور لباس:

امام نسائی بڑے خوش خوراک و خوش لباس تھے، رنگین اور قیمتی کپڑے پہنتے تھے اور کھانا نہایت پُرتکلف کھاتے تھے، مرغ خرید کر پالتے تھے، جب خوب فربہ ہو جاتے ذبح کراتے روزانہ مرغ کھانے کے بعد نبیذ حلال پیتے تھے، (تذکرہ ج ۲ ص ۲۶۷ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۲۴) ان کا رہن سہن نہایت اعلیٰ اور معاشرتی زندگی بڑی پُرشکوہ تھی۔

خاندانی وجاہت:

امام صاحب کی معاشرت اور رکھ رکھاؤ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک معزز اور صاحب حیثیت گھرانے کے چشم و چراغ تھے، ابن عماد کا بیان ہے کہ "وہ نہایت نجیب و شریف، رئیس، خوش وضع اور عظیم المرتبت تھے۔ (شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۳۹)

وفات:

امام نسائی کو شامیوں کی مار پیٹ سے اتنا صدمہ پہنچا کہ اسی کے اثر سے ۳۰۳ھ میں اٹھاسی سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا، جب ان کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تو انہوں نے اپنے اصحاب و رفقا سے خواہش ظاہر کی کہ انھیں مکہ لے چلیں، بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ راستہ میں مرو کے مقام میں ان کی وفات ہو گئی اور وہیں دفن کیے گئے لیکن بعض نے لکھا ہے کہ وفات

Marfat.com

مکہ میں ہوئی اور صفا و مروہ کے درمیان دفن کیے گئے۔ علامہ ابن کثیر نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ بیت المقدس میں دفن کیے گیے، مہینہ کی تعیین میں اختلاف ہے، بعض نے شعبان اور بعض نے صفر کا مہینہ لکھا ہے۔

(تاریخ ابن خلکان ج ا ص ۳۶ و تذکرہ ج ۲ ص ۲۶۹ و البدایہ ج ۱۱ ص ۱۲۴)

ازواج و اولاد:

ان کی چار بیویاں اور دو لونڈیاں تھیں، (ایضاً) حافظ ابن حجر نے ان کے تلامذہ کے تذکرہ میں ایک صاحبزادے عبدالکریم کا نام بھی تحریر کیا ہے۔

حلیہ:

بڑے وجیہ و شکیل تھے، چہرہ نہایت شاداب اور شمع کی طرح پر نور تھا، بڑھاپے میں بھی جسم اور چہرے کی تر و تازگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ (ایضاً)

تصنیفات:

امام نسائی کی جن تصنیفات کا علم ہو سکا وہ حسب ذیل ہیں:

ا۔ خصائص سیدنا علیؓ: اس رسالہ میں حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب بیان کیے گئے ہیں، اس کی تالیف کا مقصد امام صاحب نے خود یہ بیان کیا ہے کہ ''میں جب دمشق آیا تو حضرت علیؓ سے لوگوں کو بیزار پایا، اس لیے یہ رسالہ تالیف کیا تاکہ اس کی بدولت اللہ تعالیٰ لوگوں کو ہدایت سے سرفراز کرے (بستان المحدثین ص ۱۱۱) مگر لوگوں نے بدبختی سے اس کو سخت ناپسند کیا اور امام صاحب کو زدوکوب کر کے مسجد سے نکال دیا۔

۲۔ مسند علی، ۳۔ مسند مالک، ۴۔ کتاب الضعفاء والمتروکین، اس میں ضعیف و متروک الحدیث رواۃ کا حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق ذکر کیا گیا ہے۔

یہ رسالہ امام بخاری کی التاریخ الصغیر اور کتاب الضعفاء الصغیر کے ساتھ مطبع انوار احمدی الہ آباد سے ۱۳۲۵ھ میں شائع ہو چکا ہے۔

۵۔ کتاب الجمعہ، ۶۔ کتاب التمییز، ۷۔ کتاب المدلسین، ۸۔ فضائل الصحابہؓ۔

السنن: امام صاحب نے سنن میں دو کتابیں لکھی تھیں، سنن کبریٰ اور سنن صغریٰ، آخر الذکر کتاب زیادہ مشہور اور صحاح ستہ میں شامل ہے اور یہ امام صاحب کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف اور ان کا سب سے بڑا اور اہم علمی و دینی کارنامہ ہے، اس لیے اس کا مفصل ذکر کیا جاتا ہے۔

سنن صغریٰ کے دوسرے نام المجتبیٰ اور المجتنیٰ بھی ہیں کیونکہ امام صاحب جب سنن کبریٰ کی تالیف کا کام انجام دے چکے تو امیر رملہ نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ کی پوری کتاب صحیح حدیثوں پر مشتمل ہے؟ آپ نے جواب دیا نہیں، امیر نے درخواست کی کہ آپ میرے لیے اس میں سے اعلیٰ درجہ کی حدیثیں الگ کر دیجیے، اس درخواست پر امام صاحب نے یہ دوسری کتاب لکھی جس کا نام مجتبیٰ رکھا اور اب یہی سنن نسائی کے نام سے مشہور ہے۔ (بستان المحدثین ص ۱۱۱)

Marfat.com

سنن کبریٰ کے راوی ابن الاحمر ابوبکر محمد بن معاویہ متوفی ۳۵۸ھ اور سنن صغریٰ کے راوی ابن السنی ابوبکر احمد بن محمد م ۳۶۴ھ ہیں، علامہ ذہبی نے مجتبیٰ کو امام صاحب کے شاگرد ابن السنی ہی کا اختصار بتایا ہے لیکن خود امام صاحب نے اس کی تردید کی ہے۔

سنن نسائی کی اہمیت:

کتب صحاح میں جو مقبولیت صحیحین کو حاصل ہوئی وہ دوسری کتابوں کو نصیب نہیں ہو سکی، اور عام طور پر سنن نسائی کو ابو داؤد اور ترمذی کے بعد جگہ دی گئی ہے، تاہم اس کا نام بھی ان دونوں کے ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے، اس لیے قریب قریب یہ بھی ان کے ہم پایہ ہے اور اس کا صحاح ستہ میں شامل ہونا ہی اس کی اہمیت وعظمت کا ثبوت ہے اور جس طرح صحاح کی ہر کتاب بعض خصوصیات کے لحاظ سے دوسری کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے، اسی طرح نسائی کی بھی بعض خصوصیات سے دوسری کتابیں خالی ہیں۔

بعض علمائے فن نے صحیحین کے بعد اسی کا درجہ بتایا ہے، کیونکہ اس میں سب سے کم ضعیف روایتیں ہیں اور اس کے رجال زیادہ قوی ہیں، قبول روایت کے معاملہ میں امام نسائی کے شرائط کی سختی اس قدر مشہور ہے کہ بعض علما کا خیال ہے کہ ان کے شرائط امام بخاری وامام مسلم سے بھی زیادہ شدید ہیں، (تذکرہ ج ۲ ص ۲۶۸ وشروط الائمۃ الستہ) ابوالحسن معافری کا بیان ہے کہ ”اگر عام محدثین اور امام نسائی کی احادیث کا موازنہ کیا جائے تو امام نسائی کی حدیثیں دوسروں کے مرویات کے مقابلہ میں صحت سے زیادہ قریب نظر آئیں گی“ علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ ”بعض مغاربہ کے نزدیک اس کو صحیح بخاری پر فوقیت حاصل ہے“ ابن احمر کا بیان ہے کہ ”اس فن کی جملہ تصنیفات میں سنن نسائی سب سے زیادہ افضل واشرف ہے اور اسلام میں ایسی بے نظیر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی“ (مقدمہ زہر الربی فتح المغیث ص ۱۲) حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ”فن رجال کے ماہرین کی ایک جماعت نے ان کو امام مسلم سے برتر قرار دیا ہے اور امام دار قطنی وغیرہ نے ان کو فن حدیث اور فن رجال میں امام الائمہ ابوبکر بن خزیمہ پر ترجیح دی ہے“ ان اقوال کو اگر مبالغہ پر بھی محمول کیا جائے تو ان سے کم از کم اتنا ثابت ہوتا ہے کہ امام نسائی نے ضعیف ومتروک اشخاص سے کوئی روایت نہیں لی ہے بلکہ امام بخاری اور امام مسلم کی طرح صرف صحیح الاسناد حدیثیں درج کی ہیں اور اس اعتبار سے ان کی تصنیف ان دونوں بزرگوں کے طریقوں کی جامع ہے، ابوعبداللہ بن رشید فرماتے ہیں کہ:

وھو جامع بین طریقتي البخاري ومسلم مع حظ کثیر من بیان العلل۔ (مقدمہ زہر الربی)

سنن نسائی بخاری ومسلم دونوں کے طریقوں کی جامع ہے اور علل حدیث کا بیان اس پر مستزاد ہے۔

خود امام نسائی سے منقول ہے کہ ”کتاب السنن کا صحیح“ یعنی میری کتاب السنن تمام تر حدیثوں پر مشتمل ہے، امام صاحب نے اس کی تالیف میں جو اہتمام واحتیاط کی ہے، اس کا اندازہ ابوالحسن احمد بن محبوب رملی کے اس بیان سے ظاہر ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ”میں نے خود امام صاحب سے سنا کہ وہ فرماتے ہیں جب میں نے سنن کی جمع وتالیف کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ سے بعض ایسے رواۃ کے متعلق استخارہ کیا جن کے بارے میں مجھ کو تھوڑا تردد تھا، اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق دی کہ ان لوگوں سے میں روایت نہ کروں، اس طرح میں نے عالی سندوں کی حدیثیں ذکر کی ہیں“۔ (شروط الائمۃ الستہ ص ۱۸ ومقدمہ فتح الباری ص ۸)

Marfat.com

خصوصیات:

۱۔ سنن نسائی کی سب سے اہم خصوصیت اس کی شرائط ہیں، جن کے متعلق کہا گیا کہ: "ان لابی عبدالرحمان شرطا اشد من شرط البخاری و مسلم" یعنی امام نسائی کے شرائط امام بخاری و مسلم سے بھی سخت ہیں اور حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ امام نسائی نے نہ صرف بعض ان رواۃ کو نظر انداز کر دیا ہے جن سے امام ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کی ہے بلکہ امام بخاری و مسلم تک کے راویوں کی ایک جماعت سے حدیث کی تخریج میں اجتناب کیا ہے۔

۲۔ علل حدیث کا بیان امام نسائی کا خاص وصف سمجھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو جرح و تعدیل اور نقد و نظر کا غیر معمولی ملکہ عطا کیا تھا اور روایت کا سقم فوراً ان کی نگاہ کے سامنے آجاتا تھا، علامہ ذہبی فرماتے ہیں "امام نسائی حدیث، علل حدیث اور علم الرجال میں امام مسلم، ترمذی اور ابوداؤد سے زیادہ ماہر ہیں اور امام بخاری و ابوزرعہ کے ہمسر ہیں، ابن رشید کا یہ بیان گزر چکا ہے کہ سنن نسائی، بخاری و مسلم دونوں کے طریقہ کی جامع ہے، علاوہ ازیں اس میں علل حدیث کے بھی ایک خاصے حصہ کا ذکر ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۸ و مقدمہ زہر الربی) رواۃ کے اسماء والقاب وکنیتوں کی تشریح، راوی کے شذوذ و تفرد، حذف و اضافہ عدم متابعت، شک، سہو اور غلطی وغیرہ کا ذکر، دور اویوں کے اختلاف و تضاد، عدم سماع و عدم لقاء، راویوں کی توثیق و تضعیف، موقوف و مرسل، مسند و مرفوع، صحیح و ضعیف روایات کی نشاندہی، اسناد کی قوت و ضعف، اختلاف و تعدد طرق کا بیان، غریب الفاظ اور مشکل و مبہم چیزوں کی توضیح جس قدر اس کتاب میں پائی جاتی ہے، اس سے دوسری کتابیں خالی ہیں، امام صاحب نے راویوں اور روایات کا موازنہ کر کے صحیح روایات کی بھی نشاندہی کی ہے۔

۳۔ متعدد فوائد کے پیش نظر ایک ہی روایت کو کئی جگہوں میں ذکر کیا ہے۔

۴۔ وہ بلند پایہ مجتہد و فقیہ بھی تھے اور ان کی سنن فقہ و اجتہاد اور نظر و استدلال کی حیثیت سے بھی نہایت جامع ہے، اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے، خمس کی تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ .... (الانفال: ۴۱)

"جان لو کہ جو غنیمت کا مال تم کو ملا ہے، اس کا پانچواں حصہ اللہ، رسول، قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے......"

اس آیت میں اللہ کا ذکر ابتدائے کلام کے لیے آیا ہے، کیونکہ ساری چیزیں تو اللہ ہی کی ہیں، یا خدا نے فئی اور خمس میں اپنی ذات کو اس لیے شریک کیا ہے کہ در حقیقت یہ دونوں بہترین قسم کی کمائی ہیں اور صدقہ کو اپنی طرف اس لیے منسوب نہیں کیا کہ وہ اموال کی ناپاکی اور گندگی کا نام ہے، ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ غنیمت کا کچھ حصہ خانہ کعبہ پر خرچ کیا جائے گا اور اسی حصہ کو اللہ نے اپنا بتایا ہے، نبی کا حصہ امام وقت کی جانب منتقل کیا جائے گا اور وہ اس سے اسلحہ اور جنگی سامان خریدے گا، اس میں سے وہ ان لوگوں کو بھی دے سکتا ہے جن کو مناسب سمجھے مثلاً مسلمانوں کی فائدہ رسانی کے کاموں یا علم دین، فقہ و حدیث

Marfat.com

اور قرآن وغیرہ کی تحصیل میں صرف کرے گا اور ایک حصہ رسول اللہ کے قرابتداروں یعنی بنو ہاشم اور بنو مطلب میں تقسیم کیا جائے گا، خواہ وہ امیر ہوں یا فقیر، ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ کے قرابت داروں میں صرف فقرا یعنی یتیموں اور مسافروں وغیرہ ہی کو دیا جائے گا اور یہی قول میرے نزدیک زیادہ صحیح ہے، واللہ اعلم، بڑے چھوٹے اور مرد و عورت کے درمیان برابر تقسیم کیا جائے گا کیونکہ حدیث میں اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی کہ نبی اکرم ﷺ نے کسی کو کسی سے زیادہ دیا ہو اور اس بارے میں مجھ کو علما کے کسی اختلاف کا بھی علم نہیں ہے، کیونکہ اگر کوئی شخص کسی کی اولاد کے حق میں اپنے تہائی مال کی وصیت کردے تو ان میں سے مرد و عورت سب کو برابر حصہ ملے گا، اسی اصول پر ان تمام چیزوں کو قیاس کرنا چاہیے جو کسی کے قرابتداروں اور خاندان والوں کے لیے متعین کردی گئی ہو، الا یہ کہ شارع علیہ السلام نے اس سلسلہ میں کوئی واضح اور صریح حکم دیا ہو یا اس کی تخصیص کردی ہو، اسی طرح مسلمانوں کے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کو ایک ایک حصہ دیا جائے گا اور مسکین و مسافر کا حصہ کسی دوسرے کو نہیں دیا جاسکتا، باقی خمس کے چار اور حصوں کو امام المسلمین ان بالغ مسلمانوں میں تقسیم کرے گا جو جنگ میں شریک رہے ہوں۔'' (سنن نسائی کتاب قسم الفئ ص ۶۳۸، ۶۳۹)

امام نسائی نے بعض ابواب کے عنوانات اس طرح قائم کیے ہیں جن سے ان کا تفقہ و استدلال ظاہر ہوتا ہے اور بعض عنوانات سے وہ اپنے مخالف مسلک کی تردید بھی کرتے ہیں، ان کے فقہ و اجتہاد کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی حدیث کو متعدد ابواب میں نقل کر کے اس سے مختلف مسائل کا استنباط کرتے ہیں۔

۵۔ ترتیب و تالیف میں حسن و موزونیت کے لحاظ سے بھی سنن کا پایہ بلند ہے، ابن رشید کا بیان ہے کہ ''یہ تمام کتب سنن میں تصنیف و ترتیب کے لحاظ سے زیادہ بہتر اور عمدہ ہے۔ (مقدمہ زہر الربی)

شروح و تعلیقات:

سنن نسائی کے ساتھ اس قدر اعتنا نہیں کیا گیا جس کی وہ مستحق تھی، اس لیے دوسری کتابوں کے مقابلہ میں اس کی شروح، حواشی اور تعلیقات کی تعداد کم ہے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۲۶) ذیل میں ان کے نام درج کیے جاتے ہیں:

شرح ابن ملقن: مشہور مصنف و شارح حدیث علامہ ابن ملقن (م ۸۰۴ھ) نے زوائد النسائی علی الاربعہ کے نام سے سنن نسائی کی شرح لکھی اور اس میں ان حدیثوں سے تعرض کیا جو بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد میں نہیں ہیں۔

زہر الربی: یہ علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی تعلیق اور شرح ہے جو نہایت مشہور و معروف ہے، اس میں متن کے مشکل مسائل اور دشوار مقامات کو نہایت خوبی سے حل کیا گیا ہے، ۱۳۱۲ھ میں مصر کے مطبع میمنہ سے سنن اور حاشیہ سندھی کے ساتھ دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور غالباً الگ سے بھی چھپی ہے۔

حاشیہ سندھی: محمد بن عبدالہادی سندھی (م ۱۱۳۸ھ) نے جملہ کتب صحاح کی طرح امام نسائی کی سنن کا بھی حاشیہ اور تعلیق تحریر کی جو بہت مقبول و متداول ہے، یہ حاشیہ سیوطی کی شرح سے زیادہ جامع اور مفصل ہے، اس میں متن کے ضروری اور اہم مقامات کا حل، اعراب کی تحقیق اور غریب الفاظ و مشکل لغات کی تشریح کی گئی ہے، یہ حاشیہ، سنن اور اس کی شرح زہر الربی کے ساتھ ۱۳۱۲ھ میں مطبع میمنہ مصر سے شائع ہوا ہے۔

Marfat.com

حافظ ابن کثیرؒ کی تنقید:

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ "نسائی کے بعض رجال مجہول اور مجروح ہیں، ان کے یہاں ضعیف، معلل اور منکر حدیثیں بھی ہیں"، (اختصار علوم الحدیث والحطہ ص ۱۰۹ بحوالہ شرح الفیہ بقاعی) لیکن امام نسائی کی حزم واحتیاط کے بارے میں جو اقوال نقل کیے گئے ہیں، وہ ابن کثیر کی تردید کے لیے کافی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ رجال واحادیث کی تمیز میں امام نسائی کو خاص کمال حاصل تھا، ان کی سختی اور شدت کا یہ حال تھا کہ امام بخاری، امام مسلم، امام مالک اور یحییٰ بن سعید القطان جیسے اکابر محدثین وائمہ فن کے بعض رواۃ سے نقل وروایت میں بھی انہوں نے احتیاط ملحوظ رکھی ہے، ان کا خود بیان ہے کہ "سنن کی جمع وتالیف کے سلسلہ میں جن مشائخ کے بارے میں میرے دل میں کچھ شک وتردد ہوا میں نے ان کو ترک کر دیا، عام محدثین کے نزدیک وہ اپنے عدم تساہل اور فرطِ احتیاط کے لیے نہایت مشہور مانے جاتے ہیں، اس کے باوجود ان کے یہاں ضعیف ومنکر روایات کا سرے سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا، جبکہ صحاح کی اہم ترین کتابوں کے بارے میں بھی مطلق اور مجرد صحت کے دعویٰ کو بعض علما نے تسلیم نہیں کیا ہے، ایسی صورت میں ابن کثیر کا الزام اور بھی بے حقیقت ہو جاتا ہے، صحاح کے دوسرے مصنفین کے مقابلہ میں امام نسائی نے التزام صحت اور رجال کے متعلق زیادہ شدت اور احتیاط برتی ہے اور مجموعی حیثیت سے صحیحین کے بعد یہی زیادہ معتبر اور مستند کتاب مانی جاتی ہے، علامہ سیوطی اور شارح سندھی دونوں کا بیان ہے کہ "فی الجملہ نسائی کی کتاب السنن میں صحیحین کے بعد سب سے کم ضعیف روایتیں ہیں اور اس کے رجال بھی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ مجروح نہیں ہیں۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب اس اعتراض کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"میرے خیال میں ان کا مقصود سنن کبریٰ سے ہے کیونکہ سنن صغریٰ میں تو امام نسائی نے صحیح ترین حدیثیں منتخب اور جمع کی ہیں اور ان روایتوں کو ترک کر دیا ہے جن کی سندوں میں کلام کیا گیا ہے چونکہ ابن کثیر سے امام نسائی اور ان کی سنن کی توثیق کے متعلق بھی اقوال منقول ہیں، اس لیے اس توجیہ کے بعد ان کی دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں رہ جاتا، حقیقت یہ ہے کہ صحاح ستہ میں صحیحین کے بعد صحت میں سب سے اہم اور مقدم امام نسائی کی سنن ہے۔" (اتحاف النبلاء ص ۱۹۱)

Marfat.com

امام ابو یعلی موصلی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۳۰۷ھ)

نام و نسب:

احمد نام، ابو یعلی کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: احمد بن علی بن مثنیٰ بن یحییٰ بن عیسیٰ بن ہلال:

ولادت، خاندان و وطن:

مشہور روایت کے مطابق وہ ۲۰۷ھ میں اپنے وطن موصل میں پیدا ہوئے، حافظ ذہبی نے شوال ۲۱۰ھ کی روایت کی ہے، انکا خاندانی تعلق قبیلہ بنی تمیم سے تھا، اس لیے تمیمی کہلاتے ہیں، ان کا وطن موصل، دجلہ و فرات کا درمیانی علاقہ جزیرہ تھا۔
(کتاب الانساب ورق ۵۴۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۷۶ و معجم البلدان ج ۸ ص ۱۹۸)

اساتذہ:

امام ابو یعلی کے چند مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

احمد بن حاتم طویل، احمد بن حنبل، شیبان بن فروخ، علی بن جعد، غسان بن لیث، محمد بن منہال ضریر یحییٰ حمانی اور یحییٰ بن معین وغیرہ۔

تلامذہ:

ان کے بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابن حبان، ابوبکر اسماعیلی، ابوبکر بن مقری، ابو حاتم، ابو علی نیشاپوری، ابو عمرو بن حمدان، حمزہ بن محمد کنانی، محمد بن نصر نخاس اور نصر بن احمد مرجی۔

طلب علم کے لیے سفر:

پندرہ سال کی عمر میں انہوں نے طلب حدیث کے لیے سفر کیا اور قیاس ہے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق مختلف مراکز حدیث کے ارباب کمال سے استفادہ کیا ہوگا۔

حفظ و ثقاہت:

حافظ ابو یعلی مشہور حفاظ حدیث اور نامور محدثین اسلام میں شمار کیے جاتے ہیں، اپنے غیر معمولی حافظہ کی بنا پر، الحافظ اور الحافظ المشہور کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، ان کی عدالت و ثقاہت میں بھی کوئی کلام نہیں کیا گیا ہے، حافظ ذہبی اور ابن

Marfat.com

عماد حنبلی لکھتے ہیں ''وہ ثقہ و متقن تھے'' ابن حبان نے ان کو ائمہ ثقات میں ذکر کیا ہے، حاکم کا بیان ہے کہ ''وہ ثقہ و مامون تھے'' ابوعلی ان کے اتقان اور حفظ احادیث کے بڑے مداح و معترف تھے اور فرماتے تھے کہ ''ان سے بہت کم حدیثیں مخفی تھیں'' علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں ''وہ اپنے مرویات میں ثقہ و عادل اور احادیث میں حافظ و ضابط تھے۔''

(العبر ج ۲ ص ۱۳۵ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۵۰ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۷۵ و البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۳۰)

زہد و اتقا:

امام ابویعلیٰ تدین و تقویٰ میں عالی مرتبہ اور فضائل اخلاق سے آراستہ تھے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ ''وہ صدق و دیانت، امانت، حلم، تقویٰ اور دوسرے تمام عمدہ اوصاف و کمالات کے جامع تھے'' ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ تدین و اتقان سے متصف تھے، حافظ ابن کثیر نے ان کو صاحب خیر اور صاحب شذرات نے صاحب صلاح بتایا ہے۔ (ایضاً)

اخلاص:

وہ زیادہ نمود کو برا سمجھتے تھے، ہر کام خالصتاً لوجہ اللہ کرتے تھے، مؤرخین کا بیان ہے کہ وہ تصنیف و تالیف، تعلیم حدیث اور تحصیل علوم میں محض حسبۃً للہ اور اخلاص کی بنا پر مشغول ہوئے تھے، ایک مرتبہ ابوعمر حیری نے ان کو حسن بن سفیان پر ترجیح دی، ایک شخص نے کہا یہ غلط ہے، حسن کی مسند ضخیم اور ان کے شیوخ اعلیٰ ہیں، حیری نے جواب دیا کہ ابویعلیٰ حسبۃً للہ حدیث بیان کرتے تھے اور حسن کا یہ پیشہ تھا۔ (بستان المحدثین ص ۵۳ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۷۵)

شہرت و مقبولیت:

امام ابویعلیٰ کو اپنے حسن نیت اور اخلاص کی برکت کی وجہ سے بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، ان کی ذات عوام و خواص کی عقیدت کا مرکز بن گئی، ان کے انتقال کے دن موصل کے بازار بند ہو گئے تھے اور لوگوں کا جم غفیر اُن کے جنازہ میں شریک تھا۔

وفات:

تقریباً سو سال کی عمر میں ۳۰۷ھ میں اپنے وطن موصل میں انتقال کیا۔ (بستان المحدثین ص ۳۵)

تصنیفات:

امام ابویعلیٰ صاحب تصنیف تھے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ وہ عمدہ اور بہتر تصنیفات کے مالک تھے لیکن ان کی تین ہی کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں:

معجم: شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں ''انہوں نے ترتیب شیوخ پر ایک کتاب لکھی تھی۔ (ایضاً)

مسند کبیر و مسند صغیر: حافظ ابویعلیٰ نے دو مسندیں لکھی تھیں، ایک کبیر، دوسری صغیر، مشہور مسند صغیر ہے جو ۳۶ اجزا پر مشتمل ہے، اس کو ترتیب ابواب کے لحاظ سے جامع بھی کہا جا سکتا ہے، (ایضاً والرسالۃ المستطرفۃ ص ۶۱) یہ حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں میں سمجھی جاتی ہے، اس میں ثلاثی حدیثیں بھی ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کو حدیث کی کتابوں کے تیسرے طبقہ

Marfat.com

میں شامل کیا ہے، حافظ اسماعیل تمیمی فرماتے ہیں کہ میں نے کئی مسانید، مسند عدنی اور مسند ابن منیع وغیرہ پڑھیں، ان کی حیثیت نہروں کی ہے اور مسند ابی یعلیٰ بحرِ زخار کی طرح تمام نہروں کا سنگم ہے۔"

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۷ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۷۶)

اس کی اہمیت کی وجہ سے علمائے فن نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، حافظ ابن کثیر نے جامع المسانید والسنن میں اور محمد بن سلیمان (م ۱۰۹۴ھ) نے جمع الفوائد من جامع الاصول و مجمع الزوائد میں اس کی حدیثیں درج کی ہیں، نور الدین ہیثمی نے اس کے زوائد مرتب کیے اور حافظ ابن حجر نے اتحاف المہرہ میں اور شہاب الدین بوصیری نے اطراف المسانید العشرۃ میں اس کے مرویات نقل کیے ہیں۔

(مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۴۰ و ۱۴۴ و الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۴۳ و ۱۴۴)

مسند ابی یعلیٰ کے قلمی نسخے حیدر آباد کے دائرۃ المعارف العثمانیہ اور کتب خانہ آصفیہ کے علاوہ مکتبہ سندیہ اور جرمنی کے کتب خانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ (تذکرۃ النوادر ص ۳۹ و فہرست کتب خانہ آصفیہ ج ۱ ص ۶۷۰، ۶۷۱)

Marfat.com

امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۳۱۱ھ)

نام ونسب:

محمد نام، ابوبکر کنیت، شیخ الاسلام لقب اور نسب نامہ یہ ہے: محمد اسحاق بن خزیمہ بن مغیرہ بن صالح بن بکر۔

ولادت، خاندان ووطن:

ماہ صفر ۲۲۳ھ میں نیشاپور میں پیدا ہوئے، مجشر بن مزاحم سے ولاء کا تعلق تھا۔ (المنتظم ابن جوزی ج ۶ ص ۱۸۴)

اساتذہ:

شیوخ واساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابوقدامہ سرخسی، ابوکریب، احمد بن منیع، اسحاق بن موسیٰ خطمی، بشر بن معاذ عقدی، عبدالجبار بن علاء، عتبہ بن عبداللہ محمدی، علی بن حجر، علی بن خشرم، محمد بن ابان مستملی، محمد بن اسلم زاہد، محمد بن حرب، محمد بن مہران، محمود بن غیلان، نصر بن علی جہضمی، یونس بن عبدالاعلیٰ۔

اسحاق بن راہویہ اور محمد بن حمید رازی سے بھی ان کو ملاقات اور سماع کا شرف حاصل ہوا، مگر اس وقت کم سن تھے، اس لیے احتیاط کی بنا پر ان بزرگوں سے حدیثیں نہیں بیان کرتے تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۸۷ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۰)۔

تلامذہ:

جن لوگوں سے ان کی روایات کا زیادہ حصہ منقول ہے، ان کے نام یہ ہیں:

ابوبکر احمد بن مہران مقری، ابوحامد احمد بن محمد بن مالویہ، ابوعلی نیشاپوری، ابوعمرو بن حمدان اسحاق بن سعید نسوی، محمد بن بصیر اور پوتے محمد بن فضل۔

ان کے تلامذہ میں ابراہیم بن ابی طالب اور ابوعمرو احمد بن مبارک مستملی بھی تھے، جو عمر میں ان سے بڑے تھے۔
(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۸۷ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۰)

رحلت وسفر:

علم وفن کی تحصیل اور حدیث وفقہ کی تکمیل کے لیے انہوں نے مختلف مقامات کے سفر کیے، بچپن میں اپنے وطن کے علماء ومشائخ سے استفادہ کیا، اس کے بعد رے، بغداد، بصرہ، کوفہ، شام، حجاز، عراق، مصر اور واسط وغیرہ تشریف لے گئے۔
(البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۴۹ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۱)

Marfat.com

حفظ وثقاہت:

علامہ ابن حبان فرماتے ہیں کہ حدیثوں کے اسناد ومتون کا ان سے بہتر کوئی حافظ میں نے نہیں دیکھا، ابو احمد دارمی نے خود ابن خزیمہ سے ان کے حافظہ کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ''میں جس چیز کو تحریر کرتا ہوں وہ مجھے زبانی یاد ہو جاتی ہے'' ابو علی نیشا پوری فرماتے ہیں کہ جس طرح قراء کو قرآن کی سورتیں زبانی یاد ہوتی ہیں اسی طرح ابن خزیمہ کو فقہیات حدیث زبانی یاد ہیں، امام دار قطنی وغیرہ نے ان کو ثقہ وثابت بھی قرار دیا ہے۔ ابن حبان فرماتے ہیں کہ روئے زمین پر احادیث وسنن کے صحیح الفاظ اور زیادات کی یادداشت رکھنے والا ان کے مانند کوئی اور شخص نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنن واحادیث کا تمام ذخیرہ ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۸۹ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۱ و ۱۳۴)

حدیث میں درجہ ومرتبہ:

ابن خزیمہ کا شمار اکابر محدثین اور نامور ائمہ فن میں ہوتا ہے، احادیث پر ان کی نظر نہایت وسیع اور گہری تھی، وہ کم سنی ہی میں امام اور حافظ حدیث کی حیثیت سے مشہور ہو گئے تھے، ایک دفعہ امام شافعیؒ کے نامور شاگرد اور فقہ شافعیؒ کے جامع ومدون امام مزنی سے ایک عراقی شخص نے دریافت کیا کہ جب قرآن مجید نے قتل کی صرف دو ہی صورتیں بیان کی ہیں، عمد وخطا، تو آپ لوگ تیسری قسم شبہ عمد کو کس طرح مانتے ہیں، انہوں نے جواب میں ایک حدیث پیش کی، اس نے کہا کہ آپ علی بن زید بن جدعان کی روایت سے استدلال کرتے ہیں، یہ سن کر مزنی خاموش ہو گئے اور ابن خزیمہ نے جواب دیا شبہ عمد کی روایتیں دوسرے طرق سے بھی مروی ہیں، عراقی نے کہا اور کس کے واسطہ سے مروی ہیں، امام ابن خزیمہ نے فرمایا ایوب سختیانی اور خالد حذاء سے، اس نے ایک راوی عقبہ بن اوس کے متعلق شک وتردد کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ ایک بصری شیخ ہیں اور ابن سیرین جیسے جلیل القدر بزرگ نے بھی ان سے روایت کی ہے، معترض نے امام مزنی سے عرض کیا کہ آپ مناظرہ کر رہے ہیں یا یہ؟ انہوں نے فرمایا کہ یہ احادیث کے بارے میں مجھ سے زیادہ واقف کار ہیں، اس لیے جب حدیثوں پر گفتگو ہوتی ہے تو میں خاموش رہتا ہوں اور یہ بحث ومناظرہ میں حصہ لیتے ہیں۔ (طبقات الفقہا لابی اسحاق شیرازی ص ۸۷)

امام ابن خزیمہ مسائل وفتاوے کا جواب بھی احادیث کی روشنی میں دیتے تھے، امیر اسماعیل بن احمد نے ایک مرتبہ فئ و غنیمت کا فرق دریافت کیا تو انہوں نے سورہ انفال کی آیت: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ ... پڑھنے کے بعد چند حدیثیں بیان کیں، پھر سورہ حشر کی آیت: وَمَآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلٰي رَسُوْلِهٖ ... پڑھ کر احادیث سے مسئلہ کی وضاحت کی، ابو زکریا یحییٰ بن محمد کا بیان ہے کہ اس موقع پر انہوں نے تقریباً ۷۰ حدیثیں بیان کی ہوں گی۔ (طبقات الشافعیہ سبکی ج ۲ ص ۱۳۴)

احادیث سے استنباط مسائل میں ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا، ابن سریج کا بیان ہے کہ وہ بڑی چھان بین اور محنت سے احادیث کے نکات ومطالب کا استخراج کرتے تھے۔ (ایضاً ص ۱۳۲ وطبقات الفقہا شیرازی ص ۸۷)

حدیث کی نقل وروایت میں ان کے فضل وامتیاز کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ: وکان مبرزا فی علم الحدیث یعنی وہ علم حدیث میں بہت ممتاز اور نہایت فاضل تھے۔ (ج ۶ ص ۱۸۴)

Marfat.com

انہوں نے سنن کی اشاعت واحیاء کا مقدس فرض بھی انجام دیا، ایک مرتبہ ان کے ایک پڑوسی نے خواب دیکھا کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے شبیہ مبارک کو صیقل کر رہے ہیں، معبرین نے بتایا کہ ابن خزیمہ احیاء سنت اور اشاعت حدیث کا کام انجام دیں گے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۹۴ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۴)

فقہ واجتہاد:

فقہ میں بھی ان کا درجہ نہایت بلند تھا، بویطی اور مزنی جیسے اساتذہ وقت سے اس کی تحصیل کی تھی لیکن فقہ کے عام مذاہب میں سے وہ کسی خاص مذہب سے وابستہ نہیں تھے بلکہ ان کا شمار مجتہدین مطلق میں ہوتا ہے، علامہ ابن سبکی نے ان کو المجتہد المطلق اور علامہ ابن کثیر نے: وھو من المجتھدین فی دین الاسلام لکھا ہے، ان کا خود بیان ہے کہ سولہ سال کی عمر کے بعد میں نے کسی کی تقلید نہیں کی۔

ابوزکریا بن محمد عنبری فرماتے ہیں کہ میں نے ابن خزیمہ سے سنا کہ رسول اللہ ﷺ کے صحیح فرمان کی موجودگی میں کسی شخص کی بات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، (ایضا والبدایہ ج ۱۱ ص ۱۴۹ وطبقات الفقہا شیرازی ص ۸۷) بعض علما کا خیال ہے کہ وہ خود صاحب مذہب اور مستقل امام فقہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے فتاوے بھی ایک زمانہ میں بعض اسلامی ملکوں میں رائج تھے، ان کے بعض فقہی مسائل کتابوں میں ملتے ہیں مثلاً:

وہ رفع یدین کو نماز کا اہم اور ضروری رکن سمجھتے تھے، صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھنے والے کے لیے اعادہ لازمی سمجھتے تھے۔

حافظ ابن قیم لکھتے ہیں کہ "محمد بن اسحاق امام الائمہ کے لقب سے موسوم کیے جاتے تھے، ان کے متبعین ان کے مذہب کی پیروی کرتے تھے، وہ مقلد کے بجائے خود امام مستقل اور صاحب مذہب تھے، بیہقی نے یحییٰ بن محمد عنبری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اصحاب حدیث کے پانچ طبقے ہیں: ۱۔ مالکیہ، ۲۔ شافعیہ، ۳۔ حنبلیہ، ۴۔ راہویہ اور ۵۔ خزیمیہ۔

(اعلام الموقعین ص ۳۶۲)

کلام وعقائد کے بعض مسائل:

بدعات کو سخت ناپسند کرتے تھے اور عام محدثین کی طرح کلام وعقائد کے غیر ضروری مسائل میں بحث وتدقیق احتیاط و تقویٰ کے منافی خیال کرتے تھے، اپنے تلامذہ اور منتسبین کو سخت تاکید کردی تھی کہ اس قسم کے مسائل میں پڑنے سے پرہیز کریں، بعض تلامذہ کے متعلق جب ان کو معلوم ہوا کہ وہ ایسے مباحث ان کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں تو سخت برہمی ظاہر کی اور اعلان کردیا کہ یہ لوگ میرے حوالہ سے جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ غلط ہے۔

عقائد وکلام کے متعلق انہوں نے جو کتابیں لکھی تھیں، ان میں اہل سنت والجماعت کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ہے، بعض مسائل میں عام اہل سنت سے بھی زیادہ متشدد تھے، چند مسائل کے متعلق ان کے آراو خیالات طبقات وتراجم کی کتابوں سے نقل کیے جاتے ہیں:۔

قرآن مجید خدا کا کلام ہے، اس کی وحی وتنزیل اور وہ خود غیر مخلوق ہے، وہ خدا کی صفات میں ایک ذاتی صفت اور مستقل بالذات ہے، اس کو مخلوق، محدث اور فعلی صفت سمجھنے والے جہمی، بدعتی اور گمراہ ہیں، بعض جاہل کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مکرر کلام

Marfat.com

نہیں کرتا، یہ لوگ کلام الٰہی سے ناآشنا اور اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں، اللہ نے کئی مقامات پر تخلیق آدم کا ذکر کیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ مکرر بیان کیا ہے: فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۱۳﴾ بار بار کہا گیا ہے، یہ کسی مسلمان کا عقیدہ نہیں ہوسکتا اور جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ ازل میں کلام کرنے کے بعد اللہ پھر کلام نہیں کرتا وہ جہمی ہے، اللہ عرش پر بلا کیف مستوی و متمکن ہے۔

ان مسائل میں وہ اتنے متشدد تھے کہ جہمیہ وغیرہ کو کافر بھی کہہ دیتے تھے، فرماتے ہیں: اللہ ازل سے متکلم ہے، جو شخص یہ گمان کرے کہ اللہ ایک ہی بار کلام کرتا ہے وہ کافر ہے، اسی طرح جو اس کا اقرار نہ کرے کہ اللہ عرش پر ساتویں آسمان کے اوپر متمکن ہے وہ کافر ہے، اس کا خون مباح اور مال حلال ہے، قرآن کو کلام الٰہی کے بجائے مخلوق سمجھنے والا کافر ہے، اس سے توبہ کرائی جائے گی اگر توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے گا اور وہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا، جہمیہ اور کلامیہ ملعون اور اپنے عقائد و خیالات میں جھوٹے ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۹۲ تا ۲۹۴)

فضل و کمال کا اعتراف:

ان کے معاصرین علما اور ارباب کمال ان کے علم و کمال کے معترف تھے، امام دارقطنی نے ان کو عدیم النظیر اور علامہ ذہبی نے فرید العصر اور حافظ ابن کثیر نے بحر من بحور العلم لکھا ہے، ابو علی نیشاپوری فرماتے ہیں کہ ”میں نے ان سے زیادہ صاحب کمالات آدمی نہیں دیکھا“ ان کے استاذ ربیع بن سلیمان کا بیان ہے کہ ”ابن خزیمہ نے ہم سے جتنا استفادہ کیا، ہم نے اس سے زیادہ ان سے استفادہ کیا“ علامہ ابن سبکی ان کی جامعیت و فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”وہ مختلف علوم کے جامع اور مرتبہ کمال پر فائز تھے، نیشاپور میں جو علم و فن کا گہوارہ اور فضلا و ارباب کمال کا مرکز تھا، یکتائے روزگار تھے، ان کی علمی شان سب سے بالا و برتر تھی، ان کے گرد طلباء و مستفیدین کا ہجوم رہتا تھا، ان کے فتاوے تمام روئے زمین میں نقل ہوتے تھے، عقل و فطانت میں بے مثال تھے، بحث مناظرہ میں انھیں زیر نہیں کیا جا سکتا تھا، درحقیقت علم و فضل کا ایسا بحر زخار تھے جس سے تشنگان علوم سیراب ہوتے تھے، ان کی اس علمی ضیا باری سے ایک عالم کو بصیرت حاصل ہوتی تھی، علماء و اساطین فن بھی ان کی جانب رجوع کرتے تھے، ان کے فیض کا یہ حال تھا۔

كالبحر يقذف للقريب جواهرا ۔۔۔ كرما ويبعث للغريب صحائبا

(طبقات الشافعیہ ابن سبکی ج ۲ ص ۱۳۰)

”یعنی ابن خزیمہ سمندر کی طرح اپنے قریب کے لوگوں کو موتی اور جواہرات سے مالا مال کرتے ہیں اور دور والوں کے لیے باران رحمت کی طرح سامان فیض کرتے ہیں۔“

اتباع سنت:

اتباع سنت میں بڑا اہتمام تھا، چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی وہ سنت کا لحاظ رکھتے تھے، ایک مرتبہ ان سے حمام میں بال منڈانے کے لیے کہا گیا تو فرمایا کہ میرے نزدیک رسول اللہ ﷺ کا حمام میں داخل ہو کر بال منڈانا ثابت نہیں ہے، ابو عمرو بن اسماعیل کا بیان ہے کہ میں ابن خزیمہ کے درس میں شریک ہوتا تھا اور وہ اکثر معمولی کاموں میں مدد لیا کرتے تھے۔

Marfat.com

ایک دفعہ میرا داہنا ہاتھ روشنائی سے سیاہ ہوگیا، اس لیے میں نے ان کو بائیں ہاتھ سے قلم دینا چاہا تو انہوں نے نہیں لیا، میرے رفقا نے داہنے ہاتھ سے قلم دینے کے لیے کہا، جب میں نے داہنے ہاتھ سے دیا تو انہوں نے لے لیا۔

(طبقات الشافعیہ ابن سبکی ج ۲ ص ۱۳۱)

بزرگی و کرامت:

وہ صاحب کرامت بھی تھے، لوگ ان کی ذات کو نہایت بابرکت خیال کرتے تھے، ابو عثمان زاہد کا بیان ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نیشاپور کے مصائب و آلام ابن خزیمہ کی برکت سے دفع کردے گا۔

محمد بن ہارون طبری روایت کرتے ہیں کہ وہ اور محمد بن نصر مروزی، محمد بن علویہ وزان اور محمد بن اسحاق بن خزیمہ چاروں آدمی تحصیل علم و سماع حدیث کے لیے ربیع بن سلمان کے پاس گئے، وہاں ہم لوگوں کا ساز و سامان ختم ہوگیا، جب تین دن اور تین رات تک فاقہ کرنا پڑا تو ہم نے آپس میں کہا ایسی حالت میں تو ہمارے لیے سوال کرنا جائز ہے لیکن ہر شخص سوال کرنے میں عار محسوس کرتا تھا، اس لیے قرعہ اندازی کی گئی، اتفاق سے قرعہ ابن خزیمہ کے نام نکلا، انہوں نے کہا، پہلے مجھے دو رکعت استخارہ کی نماز پڑھ لینے دو، ابھی وہ نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ کھولا گیا تو امیر مصر احمد بن طولون کا خادم اجازت لے کر اندر داخل ہوا اور سلام کر کے بیٹھ گیا، پھر ایک پرزہ نکال کر پوچھا کہ محمد بن نصر کون صاحب ہیں؟ ہم لوگوں نے ان کی طرف اشارہ کر دیا، اس نے پچاس ہزار کی ایک تھیلی دی اور کہا، امیر نے سلام عرض کیا ہے اور آپ کے اخراجات کے لیے یہ رقم پیش کی ہے، ختم ہونے کے بعد مزید رقم پیش کی جائے گی، اسی طرح ہم چاروں کو تھیلیاں دے کر یہی پیغام پہنچایا، ہم لوگوں نے اس سے کہا، پہلے اس واقعہ کا سبب بتاؤ ورنہ ہم یہ تھیلیاں نہیں قبول کریں گے، اس نے کہا آج دوپہر میں امیر قیلولہ کر رہے تھے کہ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ کل خدا کے یہاں حاضر ہو کر کیا جواب دوگے جب وہ تم سے ان چاروں علما کے متعلق سوال کرے گا جو تین روز سے بھوکے ہیں، اس خواب سے امیر گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور آپ لوگوں کا نام لکھوا کر یہ تھیلیاں بھیجیں، میں اسی وقت سے آپ لوگوں کی تلاش میں تھا، اب جا کر آپ لوگ ملے ہیں''۔

(المنتظم ابن جوزی ج ۶ ص ۱۸۵ و ۱۸۶)

قناعت:

زندگی بڑی سادہ و درویشانہ اور تکلف و آرائش سے بالکل پاک تھی، ایک معمولی رقم میں گزر بسر کر لیتے تھے، پہننے کے لیے ہمیشہ ایک ہی قمیص ہوتی تھی، جب دوسری قمیص بنواتے تو پرانی کسی ضرورت مند کو دیدیتے تھے، لوگ درخواست کرتے کہ کچھ زیادہ کپڑے بنوا لیجئے، فرماتے کہ مجھے اپنے نفس کے آرام و راحت کا کوئی خیال نہیں۔ (طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۱)

سخاوت:

بڑے فیاض اور مہمان نواز تھے، ان کے پوتے محمد بن فضل کا بیان ہے کہ میرے دادا بخل سے نا آشنا اور مال جمع نہیں کرتے تھے، ان کا کل مال و دولت اہل علم اور ضرورت مندوں کے لیے وقف تھا، ایک مرتبہ بڑی پر تکلف دعوت کی، مختلف قسم کے لذیذ کھانوں اور حلوے، میوے اور فواکہ سے دسترخوان آراستہ تھا، امراء و اعیان کے ساتھ اہل علم اور فقہاء و

Marfat.com

محدثین بھی مدعو تھے، ہر شخص نے شکم سیر ہو کر کھایا، لوگوں کا بیان ہے کہ ایسی شاندار دعوت اور اس کا اہتمام صرف سلطان ہی کر سکتا تھا۔ (طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۵)

صاف گوئی:

ان کے اخلاقی اوصاف میں سب سے نمایاں وصف صاف گوئی ہے، امراء واعیان دولت کے سامنے بھی وہ اس میں باک نہ کرتے تھے، ایک دفعہ امیر اسماعیل بن احمد نے اپنے والد کے واسطہ سے ایک حدیث بیان کی جس کی سند میں ان کو وہم ہو گیا تھا، ابن خزیمہ بھی وہاں موجود تھے، انہوں نے فوراً اس کی تصحیح کی جب واپس ہوئے تو قاضی ابوذر نے بتایا کہ ہم لوگ بیس سال سے یہ غلط روایات سنتے تھے مگر تصحیح کی جرأت نہ ہوتی تھی، ابن خزیمہ نے کہا میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں خطاء وتحریف جان کر خاموش رہنا گوارا نہیں کر سکتا۔ (طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۱)

امامت وشہرت:

اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی مرجعیت اور شہرت عطا فرمائی تھی، امام الائمہ ان کے نام کا جزو بن گیا تھا، اسنوی کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں خراسان کے امام تھے، امام دارقطنی نے ان کو اور ابن ابی حاتم نے امام ومقتدا کہا ہے، (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۹۵) مقبولیت کا یہ حال تھا کہ ان سے استفادہ کرنے کے لیے علماء وطلبہ کا ہجوم لگا رہتا تھا، بڑے بڑے ارباب کمال دور دراز سے مشقتیں برداشت کر کے استفادہ کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مستفیدین کے قافلے ہر وقت خیمہ زن رہتے تھے، امراء اور ارباب حشمت بھی ان کے اعزاز واکرام کو ملحوظ رکھتے تھے، پہلی مرتبہ جب امیر اسماعیل بن احمد سے آپ کی ملاقات ہوئی تو اس نے ناواقفیت کی وجہ سے شایانِ شان التفات نہیں کیا، بعد میں جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ ابن خزیمہ ہیں تو اس نے بڑی معذرت اور شرمندگی کا اظہار کیا اور نہایت گرمجوشی کے ساتھ ملا۔ (طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۴)

وفات:

۲/ ذی قعدہ ۳۱۱ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا، (ایضاً وتذکرہ ج ۲ ص ۲۹۵) اور اپنے گھر کے ایک کمرہ میں دفن کیے گئے، بعد میں پورا گھر مقبرہ میں تبدیل ہو گیا تھا، علامہ ابن جوزی نے ۸/ ذی قعدہ اور ابواسحاق شیرازی نے ۳۱۲ھ سن وفات بتایا ہے، (المنتظم ج ۶ ص ۱۸۶ وطبقات الفقہاء ص ۸۷) ایک شاعر کے مرثیہ کے دو اشعار یہ ہیں:

یا ابن اسحاق قد مضیت حمیدا ۔۔۔ فسقی قبرک السحاب الهتون

ما تولیت لا بل العلم ولی ۔۔۔ ما دفناک بل هو المدفون

(طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۳)

اے ابن اسحٰق آپ کی زندگی نہایت قابل ستائش تھی، آپ کی قبر کو ہمیشہ برسنے والے بادل سیراب کرتے رہیں، آپ دنیا سے رخصت نہیں بلکہ علم رخصت ہو گیا، ہم نے آپ کے بجائے علم کو دفن کیا ہے۔

Marfat.com

تصنیفات:

ابن خزیمہ نامور مصنف بھی تھے، ان کی تصنیفات کی تعداد حاکم نے ۱۴۰ سے زیادہ بتائی ہے، ان کے علاوہ ان کے مسائل کا مجموعہ بھی سو جزوں کے بقدر تھا، ابن کثیر کا بیان ہے: فکتب الکثیر و صنف و جمع یعنی بے شمار کتابیں تصنیف کیں، ابن خزیمہ تصنیف شروع کرنے سے قبل استخارہ کی نماز پڑھتے تھے، اگر استخارہ نکل آتا تھا تب تصنیف کی ابتدا کرتے تھے، (ایضاً ص ۱۳۴ و ۱۳۵ و تذکرۃ ج ۲ ص ۲۹۴ و البدایہ ج ۱۱ ص ۱۴۹) جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

فقہ حدیث بریرہ:

یہ تین جزوں پر مشتمل ہے، اس میں ایک حدیث کی فقاہت کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

کتاب التوحید والصفات:

یہ بڑی اہم اور مشہور کتاب ہے اور کئی اجزا پر مشتمل ہے، اس کا موضوع کلام وعقائد ہے، امام رازی اس کو کتاب الاشراک کے نام سے موسوم کرتے تھے، یورپ کے بعض کتب خانوں میں اس کے نسخے پائے جاتے ہیں، ابونعیم نے المستخرج علی التوحید لکھی تھی۔ (فوائد جامعہ ص ۱۴۴ و کشف الظنون ج ۲ ص ۲۰۷ و تذکرۃ النوادر ص ۶۴ و تدریب الراوی ۳۵)

صحیح ابن خزیمہ:

یہ علامہ ابن خزیمہ کی سب سے اہم کتاب ہے، اس کا شمار حدیث کی اہم اور معتبر کتابوں میں ہوتا ہے، مستند مصنفین اور ثقہ علما اس کی حدیثوں سے اخذ و استناد کرتے ہیں، کتب صحاح کے علاوہ جن محدثین نے اپنی کتابوں میں صحت کا زیادہ التزام کیا ہے، ان کے مجموعے صحیح کہلاتے ہیں، شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں "جن دیگر علما نے صحاح کے مجموعے لکھے ان میں ابن خزیمہ کی صحیح بعض حیثیتوں سے زیادہ مشہور ہے،" اس کی اہمیت کا اندازہ ابن کثیر کے اس بیان سے بھی ہوتا ہے:

من انفع الکتب و اجلھا: (البدایہ ج ۱۱ ص ۱۴۹ و حواشی سعدی ص ۱۵ و تدریب الراوی ص ۳۱) یعنی صحیح ابن خزیمہ نہایت مفید اور اہم کتابوں میں ہے، علامہ سیوطی نے بخاری و مسلم کے بعد جن کتابوں کو زیادہ معتبر بتایا ہے، ان میں کتب صحاح کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا ہے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ صحیح ابن خزیمہ کا پایہ صحیح ابن حبان سے زیادہ ہے، کیونکہ ابن خزیمہ نے صحت کی جانب زیادہ توجہ کی ہے، وہ ادنیٰ شبہ پر بھی توقف سے کام لیتے ہیں، چنانچہ اکثر: ان صح الخبر و ان ثبت وغیرہ قسم کے الفاظ لکھے ہیں، یہ صحت میں صحیح مسلم کے قریب قریب ہے، اس کے نسخے یورپ کے بعض کتب خانوں اور جرمنی میں موجود ہیں، حافظ ابن حجر نے صحیح ابن خزیمہ پر مفید حواشی بھی لکھے تھے۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۳)

Marfat.com

امام ابو عوانہ اسفرائینی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۳۱۶ھ)

نام ونسب:

یعقوب نام، ابو عوانہ کنیت، اور سلسلہ نسب یہ ہے: یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم بن یزید۔ بعض اہل سیر نے یزید کے بجائے زید لکھا ہے۔ (تاریخ ابن خلکان ج ۳ ص ۴۴۳ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳۲۱)

وطن:

وہ اسفرائن کے باشندہ تھے لیکن آخر عمر میں نیشاپور میں سکونت کرلی تھی، اس لیے اسفرائینی اور نیشاپوری دونوں نسبتوں سے مشہور ہیں، اسفرائین نواحی نیشاپور میں زرخیز اور شاداب شہر تھا، قدیم زمانہ میں اس کا نام مہرجان تھا، اس شہر کی جانب علماء واعیان کی ایک کثیر جماعت منسوب ہے، سمعانی کا بیان ہے کہ قدیم اور جدید ہر دور میں جملہ فنون کے ماہرین علما اور فضلا کی ایک جماعت یہاں پیدا ہوئی، ان میں ابو عوانہ بھی ہیں۔ (بستان المحدثین ص ۷۳، کتاب الانساب ص ۳۴)

اساتذہ:

ابو عوانہ کے شیوخ واساتذہ کی تعداد بے شمار ہے، ان میں سے اکثر بڑے نامور اور کامل الفن ہیں، بعض شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابو حاتم، ابوزرعہ، احمد بن ازہر، احمد بن سعید دارمی، اسماعیل بن محمد بن قیراط، حسن زعفرانی، سعد بن عبدالحکم، سعدان بن نصر، علی بن اسکاب، علی بن حرب، عمر بن شیبہ، محمد بن رجاء سندی، محمد بن عبدالحکم، محمد بن یحییٰ ذہلی، مسلم بن حجاج قشیری، یزید بن محمد بن عبدالصمد، یعقوب بن سفیان اور یونس بن عبدالاعلیٰ وغیرہ سے علم حدیث کی اور امام شافعیؒ کے ارشد تلامذہ ابو ابراہیم مزنی اور ربیع بن سلیمان سے فقہ میں تکمیل بہم پہنچائی۔

تلامذہ:

ان کے تلامذہ اور مستفیدین کا حلقہ بھی بڑا وسیع ہے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

ابو احمد علی، ابوبکر اسماعیلی، ابو علی نیشاپوری، ابوالید فقیہ، احمد بن علی رازی، حسین بن علی، سلیمان طبرانی، عبداللہ بن عدی، عبدالملک بن حسن اسفرائینی، [1] محمد بن ابو عوانہ، [2] محمد بن یعقوب بن اسماعیل، یحییٰ بن منصور قاضی وغیرہ۔

---

[1] (یہ ابو عوانہ کے بھتیجے تھے) [2] (یہ ابو عوانہ کے فرزند تھے)

Marfat.com

طلب حدیث کے لیے سفر:

ابوعوانہ نے علم حدیث کی طلب وجستجو میں متعدد مقامات کے سفر کیے، اس حیثیت سے بھی وہ دوسرے محدثین میں ممتاز ہیں، ان سے زیادہ کسی اور کے سفر کی تفصیل نہیں ملتی، علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ''ابوعوانہ نے طلب حدیث کے لیے سفر کیے اور اس کے جمع کرنے اور اس کی تحریر وکتابت میں بڑی مشقت اٹھائی'' حاکم کا بیان ہے کہ ''وہ کثیر الاسفار تھے اور انہوں نے احادیث کی تحصیل کے لیے روئے زمین کا گوشہ گوشہ چھان ڈالا'' ابن خلکان کا بیان ہے کہ:

احد الحفاظ الجوالین و المحدثین المکثرین۔ (کتاب الانساب ورق ۳۴ وفیات الاعیان ج ۲ ص ۳۴۵، مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۲۷۰)

وہ ان حفاظ اور محدثین میں تھے جنہوں نے بڑے سفر کیے اور بکثرت حدیثیں جمع کیں۔

مؤرخین اور اصحاب سیر کا بیان ہے کہ انہوں نے خراسان، عراق، یمن، حجاز، شام، جزیرہ، فارس، اصفہان، ثغور، ری، واسط، بصرہ اور کوفہ وغیرہ مختلف ملکوں اور شہروں کا تحصیل علم اور طلب حدیث کے لیے سفر کیا۔

حفظ وثقاہت:

ان کا حافظہ بے مثال تھا، علمائے فن نے ان کو الحافظ الکبیر الجلیل، احد الحفاظ، احد حفاظ الدنیا اور من اکابر حفاظ الحدیث لکھا ہے اور ثقہ جلیل اور الثقۃ الکبیر وغیرہ کے الفاظ میں ان کی توثیق کی ہے۔

اعتراف کمال:

دوسرے علما و محدثین ان کے کمالات کے معترف تھے، حاکم لکھتے ہیں کہ ''ابوعوانہ بلند پایہ محدثین اور اصحاب کمال میں تھے'' ابن خلکان فرماتے ہیں کہ ''وہ نامور محدثین اور بلندترین علمائے اسلام میں تھے''۔

(تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۳۴۵ وتذکرہ ج ۳ ص ۲ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳۲۲)

فقہ واجتہاد:

فقہ میں بھی ان کا پایہ بلند تھا، ذہبی کا بیان ہے کہ ''وہ حافظ ومحدث ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہ اور امام بھی تھے'' ابن خلکان نے ان کے مزار کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس مقام میں امام شافعیؒ کے مذہب ومسلک سے تعلق رکھنے والے چالیس ۴۰ ایسے ائمہ مجتہدین اور فقہا مدفون ہیں جو اگر اپنی رائے واجتہاد سے فتویٰ دیتے تو بلاشبہ وہ اس کے مستحق تھے''۔

مذہب ومسلک:

انہوں نے فقہ کی تعلیم شافعی مذہب کے ائمہ سے حاصل کی تھی، اس لیے ان کو اس مذہب سے بڑا تعلق تھا، مصر سے واپس آنے کے بعد انہوں نے شوافع کی کتابوں سے پہلی مرتبہ اسفرائن کے لوگوں کو روشناس کرایا اور انہی کی بدولت اسفرائن میں امام شافعیؒ کے مذہب کی ترویج واشاعت ہوئی۔ (تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۳۴۵ وتذکرہ ج ۳ ص ۲ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳۲۱)

زہد واتقا:

زہد وتقویٰ کے زیور سے بھی آراستہ تھے، علامہ سمعانی بیان کرتے ہیں کہ ''وہ زاہد، عبادت گزار، عفیف، پاکدامن اور

Marfat.com

کم خور تھے اور پانچ مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔

وفات: اپنے وطن اسفرائن میں ۳۱۶ھ میں انتقال کیا، ایک روایت ۳۱۳ھ کی بھی ہے لیکن وہ ضعیف ہے۔

تصنیفات:

امام ابوعوانہ کی تصنیفات میں ایک مسند صحیح ان کی یادگار ہے جو دراصل صحیح مسلم پر مستخرج ہے، محدثین کی اصطلاح میں مستخرج اس کتاب کو کہا جاتا ہے جس میں کسی دوسری کتاب کی حدیثوں کو اس کی ترتیب متون اور طرق اسناد کے مطابق نقل کیا جاتا ہے، مسند ابوعوانہ میں امام مسلم کے طرق واسانید کے علاوہ دوسرے طرق اسناد اور بعض متون کا اضافہ بھی کیا گیا ہے، اس لیے اس کو صحیح بھی کہا جاتا ہے اور اس حیثیت سے دراصل یہ خود ایک مستقل تصنیف بن گئی ہے۔ (بستان المحدثین ص ۳۵، ۳۶)

خصوصیات:

اس کی پہلی خصوصیت تو یہی ہے کہ صحیح مسلم کی مستخرج ہونے کے باوجود اس میں بعض اضافے بھی ہیں، علامہ ذہبی کا بیان ہے۔

صاحب الصحیح المسند المخرج علی صحیح مسلم و له فیه زیادات عدة۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲)

ابوعوانہ صاحب صحیح مسند ہیں، ان کی کتاب امام مسلم کی صحیح پر تخریج کی گئی ہے لیکن اس میں متعدد اضافے بھی ہیں۔

مثلاً: باب الدلیل علی ایجاب الوضوء میں تین حدیثیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قال ابو عوانة من هنا لم یخرجه اصحابنا۔

یعنی یہاں سے جو روایتیں نقل کی جارہی ہیں ان کی ہمارے اصحاب نے تخریج نہیں کی ہے۔

اسی طرح آٹھ حدیثیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قال ابو عوانة الی هنا زدت من عندی۔ (مسند ابو عوامہ ج ۱ ص ۲۳۵، ۲۳۷)

یعنی یہاں تک میں نے خود اضافہ کیا ہے۔

۲۔ مختلف اسانید اور متعدد احادیث تحویل نظائر وشواہد کے ساتھ درج کیے ہیں اور اختلاف متن کی بحث کرتے ہوئے ایسے اقوال اور صحیح مرویات جمع کیے ہیں جو دوسری متداول کتابوں میں نہیں ملتے۔

۳۔ امام ابوعوانہ نے احادیث کے معنی کی صحیح تعبیر اور بلیغ تشریح بھی کی ہے۔

۴۔ فقہی ابواب پر مسند کو مرتب کرنے کے باوجود انہوں نے اس میں مختلف فصول قائم کیے ہیں جو ان کی طباعی کا ثبوت ہے۔

اس مسند کو پہلی مرتبہ مولانا محمد ہاشم ندوی نے ایڈٹ کر کے دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد سے ۱۳۶۲ھ و ۱۳۶۳ھ میں دو جلدوں میں شائع کیا ہے اور مفید تعلیقات اور مختصر حواشی بھی لکھے ہیں، دونوں جلدوں کے آخر میں ابواب وفصول کی مفصل فہرست، اسماء واعلام کی انڈکس اور پہلی جلد میں مصنف اور تصنیف کے متعلق مفید معلومات بھی درج ہیں، مسند کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں (مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۴ وتذکرۃ النوادر ص ۴۰) اور علمائے فن نے اس کے ساتھ اعتنا کیا ہے، علامہ ذہبی نے المنتقیٰ کے نام سے اس کی ۲۳۰ حدیثوں کو منتخب کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے اتحاف المهرة باطراف العشرة میں مستخرج ابی عوانہ کی حدیثیں درج کی ہیں۔ (بستان المحدثین ص ۷۳ وذیل طبقات الحفاظ ص ۳۲۳)

Marfat.com

امام ابو جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۳۲۱ھ)

نام ونسب:

احمد نام، ابوجعفر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: احمد بن محمد بن سلامہ بن سلمہ بن سلیم بن سلیمان بن حباب۔

(الجواہر المضیہ ج ۱ ص ۱۰۲)

ولادت:

مشہور روایت کے مطابق وہ یکشنبہ کے دن ۱۰/ ربیع الاول ۲۳۹ھ میں پیدا ہوئے، ۲۳۷ھ و ۲۳۸ھ بھی سن ولادت بیان کیا جاتا ہے۔ (تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۵۵ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۳)

خاندان ووطن:

امام طحاوی کا خاندانی تعلق یمن کے مشہور قبیلہ ازد کی شاخ حجر سے تھا، اسلامی فتوحات کے بعد ان کے خاندان والوں نے مصر میں سکونت اختیار کر لی تھی، اور یہیں ایک گاؤں طحا میں امام صاحب کی ولادت ہوئی۔ (ایضاً وکتاب الانساب ورق ۱۵۷ و ۱۵۸ والجواہر المضیۂ ج ۱ ص ۱۰۲) اس لیے وہ ازدی، حجری اور مصری وطحاوی کہلاتے ہیں، یاقوت کا بیان ہے کہ طحا کے قریب ہی طحطوط نام کے ایک گاؤں کو ان کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے لیکن انہوں نے اس کے بجائے طحا کی جانب ہی اپنی نسبت کو پسند کیا، علامہ سیوطی نے بھی اسی روایت پر اعتماد کیا ہے۔ (معجم البلدان ج ۶ ص ۳۰ والرسالۃ المستطرفۃ ص ۳۸)

اساتذہ:

ان کے اساتذہ کی تعداد بیشمار ہے، عبدالعزیز بن طاہر تمیمی نے ایک مستقل رسالہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے، (الحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص ۶) طحاوی کے اکثر شیوخ کو مشہور محدث ابن وہب اور سفیان بن عیینہ سے شرف تلمذ حاصل ہے، (العبر ج ۲ ص ۵۵) بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

بحیر بن نصر، سلیمان بن شعیب کیسانی، عبدالغنی بن رفاعہ، عیسٰی بن مثرود، محمد بن عبدالحکم، ہارون بن سعید ایلی، یونس بن عبدالاعلی صدفی وغیرہ۔

فقہ واجتہاد کی تحصیل کے لیے پہلے امام شافعیؒ کے ممتاز ترین شاگرد اور فقہ شافعیؒ کے جامع ومرتب امام مزنی کی جانب جو ان کے ماموں تھے متوجہ ہوئے لیکن بعد میں قاضی ابوحازم اور احمد بن عمران وغیرہ سے اس کی تکمیل کی۔

(الجواہر ج ۱ ص ۱۰۳، ابن عساکر ج ۲ ص ۵۵ وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۴۷)

Marfat.com

تلامذہ:

ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، بعض علما نے ان پر مستقل رسالہ لکھا ہے، چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں۔
احمد بن عبدالوارث زجاج، احمد بن قاسم خشاب، ابومحمد حسن بن قاسم مصری، ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی، ابوالقاسم عبداللہ بن علی داؤدی، ابوسعید عبدالرحمن بن احمد، ابوبکر محمد بن ابراہیم مصری، ابوالحسن محمد بن احمد اخمیمی، محمد بن بکر محمد بن مظفر، یوسف بن قاسم میانجی۔ (الجواہر المضیۃ ج ۱ ص ۱۰۴ والحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص ۷)

طلب علم کے لیے سفر:

مورخین نے صرف ۲۶۸ھ میں امام صاحب کے شام تشریف لے جانے کا ذکر کیا ہے، مگر ان کے اساتذہ میں مصر، یمن، کوفہ، بصرہ، حجاز، شام، خراسان اور مغرب وغیرہ مختلف اسلامی ملکوں کے ارباب کمال شامل ہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ انہوں نے ان میں سے اکثر مقامات کا سفر بھی کیا ہوگا، انکے شوق و جستجو کا یہ حال تھا کہ جب کوئی محدث یا صاحب کمال مصر آتا تو اسکی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کی کوشش کرتے۔ (تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۵۴ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰ والحاوی ص ۱۸ و ۱۹)

حفظ وثقاہت:

ابن یونس صاحب تاریخ مصر کا بیان ہے کہ ”امام طحاوی ثقہ وثابت اور صاحب عقل وفراست تھے“ مسلمہ بن قاسم قرطبی فرماتے ہیں، ”وہ ثقہ اور نہایت جلیل القدر تھے“ علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ثقہ وثابت اور ماہر حفاظ حدیث میں ایک امام طحاویؒ بھی ہیں۔ بدرالدین عینی فرماتے ہیں کہ ”ان کی ثقاہت، دیانت، امانت اور فضیلت پر سب کا اتفاق ہے۔“ صاحب مرآۃ الزمان تحریر فرماتے ہیں کہ ”لوگ ان کے علم وفضل کی طرح ان کے صدق وثقاہت کے بھی معترف ہیں۔“
(الجوہر المضیۃ ج ۱ ص ۱۰۲ و کتاب الانساب ورق ۱۵۸، ۳۶۹ و البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۷۴ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۵۵)

اعتراف کمال:

تمام اکابر علماء ومحدثین ان کے علمی کمالات کے معترف تھے، مورخین کا بیان ہے کہ ”ان کے بعد ان کا کوئی ہمسر اور جانشین نہیں پیدا ہوسکا۔“ ابن ندیم فرماتے ہیں کہ ”وہ علم وفضل میں بے مثال اور یکتائے روزگار تھے“ علامہ عینی کہتے ہیں کہ ”جن محدثین اور مورخین نے ان کا تذکرہ کیا ہے، وہ سب ان کی مدح وتوصیف میں متفق ہیں، متقدمین میں طبرانی، خطیب، حمیدی اور متاخرین میں حافظ مزی، ابن کثیر اور ذہبی وغیرہ نے ان کے کمال کا اعتراف کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ کوئی واقف کار اور منصف مزاج شخص ان کے علم وفضل اور اوصاف وکمالات کا منکر نہیں ہوسکتا۔“ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ”ان کی تصنیفات ان کی وسعت نظر اور علمی تبحر پر شاہد ہیں۔“
(الفہرست ص ۲۹۲ والحاوی ص ۱۲ و ۱۳ و بستان المحدثین ص ۸۸)

جامعیت:

امام طحاوی کو جملہ اسلامی علوم اور ان کے متعلقات میں مہارت حاصل تھی، مورخین اور علمائے سیر نے تفسیر، کلام،

Marfat.com

عربیت، ادب، لغت، نحو اور انساب وغیرہ میں ان کی ژوف نگاہی کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض علوم میں انہوں نے مستقل کتابیں لکھیں اور ان کی فقہی وحدیثی کتابوں میں بھی ان علوم پر بحثیں ہیں، حدیث وفقہ اور اصول وشروط کے خاص طور پر بڑے ماہر تھے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ''انہوں نے شروط میں کتاب لکھی اور وہ اس فن میں ممتاز و ماہر تھے'' علامہ زاہد الکوثری فرماتے ہیں ''امام طحاوی فضائل وکمالات کے جامع تھے، حدیث اور اس کے متعلقہ علوم اور فقہ اور اس کے اصول و ضوابط میں علمائے امت میں بہت کم لوگ ان دونوں فنون میں ایسے جامع پیدا ہوئے، اس کا ان تمام لوگوں کو اعتراف ہے، جو اس سرچشمۂ فیض سے سیراب ہوئے ہیں۔ (العبر ج ص ۱۸۶ و ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲ و البدایہ ج ۱۱ ص ۱۷۴ و الحاوی ص ۳)

زہد واتقاء:

زہد واتقاء میں بھی ان کا درجہ نہایت بلند تھا، ابن ندیم فرماتے ہیں کہ وہ زہد وورع میں یکتائے زمانہ تھے، صاحب مرآۃ الزماں کا بیان ہے کہ ''ان کے زہد وتقویٰ پر لوگوں کا اتفاق ہے'' علامہ عینی نے ان کی دیانت، ثقاہت، امانت اور راست بازی وغیرہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔ (الفہرست ص ۲۹۲ و الحاوی ص ۱۲)

فقہی مسلک:

شروع میں وہ شافعی مذہب سے وابستہ تھے، پھر حنفی مذہب اختیار کرلیا اور اس سے ایسا مستحکم تعلق ہوا کہ اس کے اکابر فقہا اور ائمہ مجتہدین میں شمار کیے جاتے ہیں، ان کے تمام سوانح نگاروں نے ابن یونس کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ مصر میں حنفی مذہب کی ریاست وسیادت ان پر تمام ہوگئی'' حافظ ذہبی وغیرہ نے ان کو شیخ الحنفیہ لکھا ہے، (تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۵۵ و تذکرہ ج ۳ ص ۳۰ والعبر ج ۲ ص ۱۸۶) گو اس مذہب میں بڑے بڑے جلیل القدر علما اور بکثرت اربابِ کمال پیدا ہوئے لیکن ان سب میں امام طحاوی کو امتیازی درجہ حاصل ہے، انہوں نے اپنی تصنیفات سے اس مذہب کی بڑی اہم خدمات انجام دیں اور اس کی ترویج واشاعت اور تائید وحمایت میں اپنی عمر صرف کردی، جس کا اعتراف خود علمائے احناف کو بھی ہے، ابن قطلو بغا کا بیان ہے، وکان اماما فقیھا من الحنفیین۔ (الجواہر المضیہ ج ۱ ص ۱۰۳ و حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۴۷) حنفی مذہب سے شدید تعلق کے باوجود انہوں نے بعض مسائل میں اس سے اختلاف بھی کیا ہے اس لیے ان کو مجتہد منتسب وغیرہ کہا گیا ہے۔

شافعی مذہب ترک کرنے کا سبب:

امام طحاویؒ کے شافعی مسلک چھوڑنے کے متعلق مؤرخین نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ''ابتداء میں وہ اپنے ماموں اسماعیل بن یحییٰ مزنی ۲۶۴ھ کے درس میں جو امام شافعیؒ کے ممتاز ترین شاگرد اور فقہ شافعیؒ کے بانیوں میں تھے، شریک ہوتے تھے، ایک دن انہوں نے کوئی مسئلہ بیان کیا، جس کو طحاوی بار بار سمجھانے کے باوجود بھی نہیں سمجھ سکے، اس پر انہوں نے بلادت وغباوت کا طعنہ دیا اور کہا کہ ''بخدا تم کو کچھ نہیں آسکتا'' امام طحاوی اس واقعہ سے اتنا متاثر ہوئے کہ مزنی کے درس میں جانا ہی ترک کردیا اور ابو جعفر احمد بن ابی عمران کے حلقۂ درس میں جو مصر میں حنفی مذہب کے قاضی تھے، شریک ہونے لگے اور پوری محنت سے فقہ میں مشق ومہارت بہم پہنچائی اور مختصر تصنیف کرکے اپنے تمام معاصرین پر گوئے سبقت لے گئے، ایک روز وہ امام مزنی کی قبر سے گزرے تو فرمایا کہ خدا تعالیٰ ان پر رحم کرے اگر یہ زندہ ہوتے تو اپنی قسم کا کفارہ ادا کرتے۔'' (تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۵۵ و

Marfat.com

تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۳ ولسان المیزان ج ۱ ص ۲۷۵) علامہ ابن خلکان نے ایک دوسری وجہ یہ بھی تحریر کی ہے کہ محمد بن احمد شروطی نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اپنے ماموں کا مسلک کیوں ترک کیا تو فرمایا کہ میں نے خود ان کو دیکھا کہ وہ اکثر امام ابوحنیفہ کے مسلک کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کی جانب مراجعت کرتے ہیں، اس لیے میں نے حنفیہ کا مذہب اختیار کر لیا اور اپنے ماموں اور استاذ کا مسلک ترک کر دیا۔ (تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲)

وفات:

پنجشنبہ کے دن غرۂ ذوالقعدہ ۳۲۱ھ کو مصر میں انتقال کیا اور قرافہ میں امام شافعیؒ کے مزار کے متصل ہی دفن کیے گئے۔
(ایضاً ص ۳۲)

اولاد:

ایک صاحبزادہ ابوالحسن علی اور پوتے ابوعلی حسن بن علی کا نام ضمناً ملتا ہے۔

تصنیفات:

امام طحاوی جلیل القدر عالم اور بلند پایہ مصنّف تھے، ان کو ان کی تصنیفات اور اہم علمی خدمات کی بنا پر بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں "وہ نہایت مفید اور بیش بہا تصنیفات کے مالک تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ "ان کی تصنیفات بڑی انوکھی ہیں" علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں "انہوں نے متعدد مفید کتابیں لکھیں" (البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۷۴ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲) جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ کتاب الاشربہ، ۲۔ کتاب التاریخ الکبیر، ۳۔ کتاب التسویہ بین حدثنا واخبرنا، ۴۔ رسالۃ حکم اراضی مکہ، ۵ رسالہ فی الرزیہ، ۶۔ کتاب الشروط الاوسط، ۷۔ کتاب العزل، ۸۔ کتاب الفرائض، ۹۔ قسم الفیئ والغنائم، ۱۰۔ کتاب المحاضرہ والسجلات، ۱۱۔ کتاب الوصایا، ۱۲۔ مناقب ابی حنیفہ یا اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ، ۱۳۔ اختلاف الروایات علٰی مذہب الکوفیین (دو جزوں میں) ۱۴۔ الرد علی عیسی بن ابان (دو جزوں میں)، ۱۵۔ النوادر الفقھیہ (دس جزوں میں)، ۱۶۔ النوادر والحکایات (بیس جزوں میں)، ۱۷۔ کتاب فی النحل واحکامھا (چالیس جزوں میں)۔

۱۸۔ کتاب نقض المدلسین: ابوعلی حسین بن علی کرابیسی کی کتاب المدلسین کے رد و جواب میں ہے۔

۱۹۔ کتاب الرد علی ابی عبید: ایک جزو پر مشتمل ہے، اس میں ابوعبید کی ان غلطیوں کی تردید کی گئی ہے جو انساب کے متعلق انہوں نے کی ہیں۔

۲۰۔ سنن شافعی: یہ ان حدیثوں پر مشتمل ہے جو امام مزنی کے واسطہ سے امام شافعیؒ سے مروی ہیں۔

۲۱۔ شرح الجامع الصغیر: امام محمد بن حسنؒ کی مشہور و معرکہ آراء کتاب الجامع الصغیر فی الفروع کی جو ۱۵۲۲ مسائل پر مشتمل ہے، شرح ہے۔

۲۲۔ شرح الجامع الکبیر: یہ بھی امام محمدؒ صاحب کی مشہور کتاب الجامع الکبیر فی الفروع کی شرح ہے۔

۲۳۔ کتاب الشروط الصغیر: اس کا نام مختصر الشروط بھی ہے، یہ پانچ جزوں میں ہے اور مکتبہ شیخ الاسلام فیض اللہ میں

Marfat.com

موجود ہے۔

۲۴۔ کتاب الشروط الکبیر: چالیس اجزا پر مشتمل ہے، یورپ سے اس کا ایک جزو چھپ چکا ہے اور بعض اجزا مکتبہ علی پاشا شہید اور استنبول کے مکتبہ ملا مراد میں ہیں۔ (دیکھئے الفہرست ابن ندیم ص ۲۹۲ والجواہر المضیۃ ج ۱ ص ۱۰۴ وکشف الظنون باختلاف صفحات وفوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ ص ۹۷ والحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص ۳۵ تا ۳۷)

۲۵۔ احکام القرآن: ۲۰ جزوں پر مشتمل ہے، قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ تفسیر قرآن کے موضوع پر امام طحاویؒ نے ایک ہزار اوراق لکھے تھے، علامہ زاہد الکوثری کے خیال میں احکام القرآن ان ہی اوراق کا مجموعہ ہے لیکن بعض لوگوں کے نزدیک یہ دوسری اور مستقل کتاب ہے۔

۲۶۔ بیان السنۃ والجماعۃ: اس کے مختلف نام ہیں اور اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، یہ رسالہ کئی بار چھپ چکا ہے، ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء میں قازان سے عمر بن اسحاق ہندی کی شرح کے ساتھ ۴۷ صفحات میں شائع ہوا تھا، (الجواہر المضیۃ ج ۱ ص ۱۰۴ والحاوی ص ۳۵) مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اسی نسخہ کی مدد سے اس کا ایک ایڈیشن دیوبند سے عقیدۃ الطحاوی کے نام سے شائع کیا ہے، اس میں اہل سنت والجماعت کے عقائد، امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم کے مذاہب، اصول اور معتقدات کی روشنی میں تحریر کئے گئے ہیں۔ (اکتفاء القنوع ص ۱۲۵ ومعجم المطبوعات کالم ۱۲۳۳)

۲۷۔ اختلاف العلماء: ۳۰ سے زیادہ اجزا پر مشتمل ہے، ابن ندیم نے اس کا نام کتاب الفقہاء لکھا ہے اور یہ تصریح کی ہے کہ یہ نہایت ضخیم کتاب ہے، امام طحاوی اس کو مکمل نہیں کر سکے تھے، ابوبکر جصاص رازی متوفی ۳۷۰ھ نے اس کا مختصر لکھا تھا جو استنبول کے مکتبہ جار اللہ ولی الدین میں موجود ہے، علامہ کوثری کی نظر سے یہ مختصر گزرا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "اس میں ائمہ اربعہ کی طرح دوسرے قدیم مجتہدین اور فقہاء امصار مثلاً ابراہیم نخعی، عثمان بتی، امام اوزاعی، سفیان ثوری، لیث بن سعد، ابن شبرمہ، ابن ابی لیلیٰ اور حسن بن حی وغیرہ کے اقوال ومذاہب بھی نقل کئے گئے ہیں، (کشف الظنون ج ۱ ص ۶۴ والفہرست ص ۲۹۲ والطحاوی ص ۳۵) اگر آج امام طحاوی کی اصل کتاب موجود ہوتی تو اکابر علمائے متقدمین اور فقہائے امصار کے مسالک معلوم کرنے میں بڑی آسانی بھی ہوتی اور یہ کتاب ان کے اقوال کا اچھا اور عمدہ ماخذ بھی ہوتی۔

۲۸۔ کتاب المختصر فی الفقہ یا مختصر الطحاوی: اس کو امام مزنی کی مختصر کے انداز پر مرتب کیا گیا ہے، یہ حنفی فقہ کے فروع و جزئیات پر ایک مختصر اور جامع متن ہے اور اس میں اس مذہب کے اکابر یعنی امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام زفرؒ اور حسنؒ بن زیاد کے اقوال وآرا نقل کئے گئے ہیں۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۰۰) امام طحاوی نے اقوال مختلفہ کے درمیان ترجیح بھی دی ہے، ائمہ کے اختلاف کی صورت میں غیر جانبدارانہ طور پر کبھی امام ابوحنیفہؒ اور کبھی صاحبین اور کبھی ان دونوں میں سے کسی ایک کے مسلک کو راجح قرار دیا ہے، بعض مواقع پر ان تینوں بزرگوں کے بجائے امام زفر یا حسن بن زیاد کے قول کی تائید کی ہے، اور چند مقامات پر ان سب بزرگوں کے قول کو مرجوح سمجھ کر اپنی رائے واجتہاد کا ذکر بھی کیا ہے، جس مسئلہ میں ائمہ کے اقوال معلوم ومنقول نہیں ہوتے تو اشارات نصوص اور دوسری دلالتوں سے ان کے اقوال مستنبط کرتے ہیں، انہی خصوصیات کی وجہ سے ان کو علمائے مجتہدین میں شمار کیا جاتا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حنفی مذہب کے مقلد ہی نہ تھے بلکہ مجتہد منتسب بھی تھے، چنانچہ انہوں نے حنفی مذہب

Marfat.com

کے خلاف بھی کچھ باتیں لکھی ہیں' صاحب دراسات اللبیب کا بیان ہے ''امام طحاوی حنفی مذہب سے شغف رکھنے اور اس کے ماخذ مرفوع وموقوف کی تخریج کرنے کے باوجود جب اسکو حدیث کے خلاف پاتے تو رد کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے تھے۔

(بستان المحدثین ص ۸۸ واتحاف النبلاء المتقین ص ۱۹۲)

یہ مختصر متن حنیفہ کی صحیح وقوی روایات اور مفتی بہ ومرجح اقوال کا بڑا مستند ماخذ اور اتنے گونا گوں مسائل کا مجموعہ ہے جو دوسرے متون اور مطول کتابوں میں نہیں ملتے، علاوہ ازیں اس میں ترجیح کے وجوہ اور کتاب وسنت اور قیاس وغیرہ سے دلائل بھی فراہم کئے گئے ہیں، اس لیے اس کو ہمیشہ مقبول اور معتبر سمجھا گیا ہے، اس کتاب کی اہمیت اس لیے اور زیادہ ہے کہ علمائے احناف میں سب سے پہلے امام طحاویؒ کو مختصر لکھنے کا شرف حاصل ہوا، اس کی اہمیت کی وجہ سے اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، جن کی تعداد گیارہ سے متجاوز ہے، یہ کتاب دائرۃ المعارف حیدر آباد سے چھپ چکی ہے۔

مشکل الآثار:

یہ امام طحاوی کی بڑی مشہور اور اہم کتاب ہے، اس کا مقصد تصنیف بیان کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں:

''ثقہ وثابت رواۃ سے مروی مسند ومقبول حدیثوں کی معرفت وغیرہ کے متعلق لوگوں کی ناواقفیت دیکھ کر میں نے ان پر غور کیا، اس کے نتیجہ میں جو مشکلات اور حدیثوں سے جو مسائل واحکام اور اہم نکات وحقائق مستنبط ہوئے، انکو بیان کر کے ان پر عائد ہونے والے اعتراضات واشکالات کو اس میں دفع کرنے کی کوشش کی ہے'' (مشکل الآثار ج ا ص ۳) اسکی ترتیب وتصنیف میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے ایک حدیث ذکر کر کے اسکے متابعات اور مؤید روایتیں نقل کی گئی ہیں، پھر اس کا صحیح مدلول ومنشاء متعین کر کے اس پر عائد ہونے والے شکوک کا جواب یا دوسری حدیثوں سے اس کے اختلاف کی نوعیت وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، ثبوت واستدلال اور بحث وتحقیق میں قرآنی آیات، احادیث نبوی، آثار صحابہ وتابعین، ائمہ مجتہدین کے اقوال وآرا بیان کیے گئے ہیں اور نحوی ولغوی مسائل کی تحقیق بھی کی گئی ہے، اور کلام عرب سے بھی کہیں کہیں شواہد پیش کیے گئے ہیں، اسناد ومتون اور رجال وغیرہ کے متعلق بھی مفید اور ضروری معلومات نقل کیے گئے ہیں، مشکل الآثار کی بعض اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:

ا۔ اس کی سب سے اہم اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اصلاً مشکلات حدیث کا تعین کر کے ان کا محققانہ جواب دیا گیا ہے، جس سے مشکلات اور دقت طلب امور بھی حل ہو گئے ہیں اور شکوک وشبہات بھی دفع ہو گئے ہیں۔

۲۔ اس کتاب میں یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ احادیث کے اندر تضاد وتناقض نہیں ہوتا۔

۳۔ استدلال وتحقیق کی حیثیت سے بھی اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے، امام طحاوی تحقیق وتنقیح اور بحث واستدلال کا پورا حق ادا کر دیتے ہیں، اس کتاب میں جو اہم اور گونا گوں مسائل ومباحث بیان کیے گئے ہیں ان کے متعلق ماہرین فن اور ائمہ کے خیالات اور اہم کتابوں کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔

۴۔ فقہی واجتہادی حیثیت سے بھی مشکل الآثار کا پایہ بہت بلند ہے، امام طحاویؒ نے فقہائے صحابہؓ وتابعینؒ، ائمہ کبار اور مجتہدین اسلام کے اختلافات بھی بیان کیے ہیں اور انکے درمیان توجیہ وتطبیق اور ترجیح بھی دی ہے، نیز وجوہ ترجیح بھی بیان کیے ہیں، انکے تفقہ واجتہاد کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بعض مسائل میں ائمہ احناف کے اقوال سے اختلاف کیا ہے۔

۵۔ تفسیر مباحث اور قرآنی علوم مثلاً آیتوں کی تشریح، ان کے مفہوم ومنشا کی توضیح، قرآن کے مشکل الفاظ وکلمات کی تحقیق

Marfat.com

اور بعض استعمالات کی توضیح، سبب نزول وشان نزول کی وضاحت اور تجوید وقراءت کے مسائل پر اس میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

۶۔ حدیث کی فنی بحثوں، اصول حدیث کے مباحث اور رجال واسناد وغیرہ پر بھی عالمانہ گفتگو کی گئی ہے، امام صاحب جب کوئی حدیث نقل کرتے ہیں تو پہلے یہ واضح کرتے ہیں کہ حدیث صحیح ہے یا غلط، اگر صحیح ہے تو اس کے اسباب اور غلط ہے تو اس کے وجوہ وعلل بیان کرتے ہیں، اسی طرح حدیث منقطع ہے یا متصل، موقوف ہے یا مرفوع، مرسل ہے یا مسند، غریب و منکر ہے یا مقبول ومشہور، ضعیف اور فاسد الاسناد ہے یا قوی، حسن اور صحیح الاسناد، راوی ثقہ وضابط ہے یا غیر ثقہ اور مجہول الحال، مدلس ہے یا غیر مدلس، شذوذ وتفرد سے اس نے کام لیا ہے یا دوسرے راویوں نے اس کی متابعت وموافقت کی ہے، اس کو وہم وشک ہوا ہے یا نہیں ونفس روایت کے اندر اس سے کیا سہو وخطا ہوئی ہے، راوی نے کوئی اضافہ یا کمی کی ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے، راوی کے ابہام، دوسرے راوی سے سماع وعدم سماع اور اسماء واعلام کے متعلق وضاحتیں کرتے ہیں، ایک قسم کی متعدد حدیثیں اس لیے بیان کرتے ہیں کہ ان کا باہمی فرق واختلاف اور کمی بیشی نمایاں ہوجائے۔

۷۔ حدیث کے مشکل وغریب الفاظ اور بعض اصطلاحی الفاظ پر ایک ماہر فن کی حیثیت سے داد تحقیق دی گئی ہے، نحو، بلاغت، معانی اور زبان کے استعمالات واسالیب پر بھی بعض اچھی بحثیں کی گئی ہیں۔

مشکل الآثار کی سات جلدیں استنبول کے مکتبہ فیض اللہ میں موجود ہیں، دائرۃ المعارف حیدرآباد نے صرف ۴ جلدیں شائع کی ہیں جو تقریباً ۱۶۳۳ صفحات پر مشتمل ہیں، ہر جلد کے آخر میں فہرست مضامین ہے جس کے صفحات کی مجموعی تعداد ۵۰ ہے، مرتبین نے مختصر حواشی بھی لکھے ہیں جو الفاظ ولغات کی تشریح اور اسماء ورواۃ کے متعلق معلومات پر مشتمل ہیں، اصل متن میں جو مختصر حدیثیں ہیں، ان کو حاشیہ میں مکمل درج کیا گیا ہے۔

محدث ابوالولید بن رشد مالکی نے اس کا مختصر تحریر کیا ہے، جو دائرۃ المعارف سے شائع ہوا ہے، اس میں امام طحاوی پر بعض اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، اس کا قاضی القضاۃ جمال الدین یوسف بن موسیٰ الملطی نے المعتصر من المختصر کے نام سے مختصر کیا ہے، یہ کتاب بھی دائرۃ المعارف سے ۱۳۱۷ھ میں لمبی تقطیع کے ۴۶۷ صفحات میں شائع ہوئی ہے، چونکہ مشکل الآثار میں ترتیب وتبویب نہیں تھی، اس لیے ابن رشد نے اس کو ابواب پر مرتب کیا تھا، قاضی ملطی کے مختصر میں پہلے آنحضرت ﷺ کے ناموں اور اوصاف وخصوصیات کی حدیثیں ہیں، پھر معجزات اور سن وفات کی روایتیں ہیں، اس کے بعد احکام وشرائع کے ابواب جدا جدا عنوانات کے تحت ہیں، پھر تفسیر قرآن اور اسباب نزول کے ابواب ہیں، باجی کے اعتراضات کا اس میں جواب بھی دیا گیا ہے، پورے مجموعہ میں ۹۳۳ حدیثیں ہیں، صاحب معتصر نے طویل سندیں حذف کردی ہیں، متعدد طرق واسناد کی وہی حدیثیں نقل کی ہیں، جن میں نمایاں فرق واختلاف تھا، دو مختلف روایتوں کے صرف اسی حصہ کو نقل کیا ہے، جس سے ان کے اصل مدلول اور روایت کا خاص فرق وتضاد ظاہر ہوتا ہے۔

معانی الآثار:

اس کا نام شرح معانی الآثار بھی ہے، یہ امام صاحب کی سب سے اہم اور بلند پایہ کتاب سمجھی جاتی ہے، اس میں فقہ و حدیث دونوں قسم کے مباحث ہیں، اس کی اہمیت کا اندازہ علمائے فن کے ان اقوال سے ہوتا ہے۔

علامہ ابن حزم ظاہری نے اس کو سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کے ہم پایہ قرار دیا ہے، (الحاوی ص ۲۹) شارح ہدایہ

Marfat.com

امیر تقانی کا بیان ہے کہ اگر کسی شخص کو طحاوی کی عظمت وشان اور بلند پائیگی میں کلام ہو تو اسے معانی الآثار کا مطالعہ کرنا چاہیے، حنفی مذہب کا کیا ذکر؟ جملہ مذاہب میں بھی ایسی بے مثال اور بے نظیر کتاب نہیں مل سکتی، (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۵۹ و ۴۶۰) علامہ عینی فرماتے ہیں "امام طحاوی کی جملہ تصنیفات نہایت عمدہ اور پراز منفعت ہیں، خصوصاً معانی الآثار کو اگر کوئی منصف مزاج شخص بغور دیکھے تو وہ اس کو حدیث کی اکثر مشہور ومقبول کتابوں سے برتر وراجح پائے گا، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ اور اس قسم کی دوسری کتابوں پر اس کی فوقیت اور برتری بالکل عیاں ہے، کیونکہ اس کے اندر وجوہ استنباط اور معارضات کی شکلیں بیان کی گئی ہیں اور ناسخ ومنسوخ میں امتیاز کیا گیا ہے اور اس قسم کے بہت سے مباحث ہیں اور یہی چیزیں معرفت حدیث کی اصل بنیاد ہیں، بعض لوگ طحاوی کی مرجوحیت کا یہ سبب بتاتے ہیں کہ اس کے کچھ رجال ضعیف اور مرتبۂ ثقاہت سے فروتر ہیں، حالانکہ سنن مذکورہ کا بھی یہی حال ہے بلکہ ان کی بعض روایات کو باطل اور موضوع بھی کہا جاتا ہے اور ضعیف حدیثوں کی تو کثرت ہے، سنن دار قطنی، بیہقی اور دارمی وغیرہ کا اس سے کوئی مقابلہ ہی نہیں، اس کتاب کی اہمیت و عظمت کے مخفی رہ جانے کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ عام لوگوں میں مروج نہ تھی، اس لیے اس کے عجائب کا نہ تو استخراج کیا جاسکا اور نہ غرائب سے واقفیت حاصل کی گئی، یہ کتاب ایک طویل عرصہ تک گوشۂ گمنامی میں پڑی رہی اور عام لوگ اس سے بے خبر تھے۔" (ماتمس الیہ الحاجہ ص ۳۰) مولانا انور شاہ کشمیری کا بیان ہے کہ "ہمارے نزدیک طحاوی کی مشہور کتاب معانی الآثار کا پایہ ابوداؤد کے قریب قریب ہے، کیونکہ اس کے تمام رواۃ معروف ومشہور ہیں، گو بعض کے متعلق کلام بھی کیا گیا ہے، اس کے بعد ترمذی اور ابن ماجہ کا درجہ ہے۔" (فیض الباری ج ۱ ص ۵۷ و ۵۸)

اس کا مقصد تالیف خود امام طحاویؒ نے یہ بیان کیا ہے:

"مجھ سے میرے بعض احباب نے رسول اللہ ﷺ کی احکامی روایات وآثار کا ایک مجموعہ مرتب کرنے کی فرمائش کی تاکہ ناسخ ومنسوخ اور واجب العمل روایات سے قلت واقفیت کی بنا پر ملحدین اور ضعیف الاسلام لوگوں کا یہ وہم دور ہوجائے کہ ان میں تضاد واختلاف ہے، اس لیے اس کتاب میں ناسخ ومنسوخ، مطلق ومقید اور واجب العمل روایات نیز علما کی تاویل و توجیہ ان کے دلائل وشواہد اور مرجح ومختار مسلک کی تفصیل بیان کی گئی ہے، ترجیح کے دلائل ووجوہ بھی نقل کیے گئے ہیں اور ثبوت وتائید میں کتاب وسنت، صحابہؓ وتابعین کے آثار اور اجماع وغیرہ کو پیش کیا گیا ہے۔ (معانی الآثار ج ۱ ص ۶)

امام طحاوی نے اس کتاب میں مختلف حیثیتوں سے احادیث کا تضاد واختلاف دُور کیا ہے اور ان کے محمل کی ایسی تعیین کی ہے، جو روایات وقیاس کے عین مطابق معلوم ہوتی ہے، طریقۂ تصنیف یہ ہے کہ پہلے اختلافی امور ومسائل میں مرجوح مسلک کی مؤید روایات نقل کی ہیں، اس کے بعد اس سے مختلف اور راجح مسلک کی حدیثیں اور ان کے مؤیدات ذکر کرکے دونوں میں محاکمہ اور ہر مذہب کے دلائل وشواہد اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ روایات کا ظاہری اختلاف بھی رفع ہوگیا ہے اور ان میں مکمل تطبیق بھی ہوگئی ہے، انہوں نے توجیہ وتوفیق کے مندرجہ ذیل اصول اختیار کیے ہیں۔

۱۔ دو قسم کی متضاد سمجھی جانے والی حدیثوں میں ایک قسم کو اولویت پر اور دُوسری قسم کو غیر اولویت پر محمول کرکے فرق و تضاد کی نفی کی گئی ہے۔

۲۔ احادیث مختلفہ کو مطلق ومقید، مجمل ومفصل اور خاص وعام وغیرہ پر محمول کرکے ثابت کیا گیا ہے کہ ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

Marfat.com

۳۔ ناسخ ومنسوخ روایات کی تعیین اوران میں امتیاز کر کے تعارض کو دفع کیا گیا ہے۔
۴۔ اگر صحیح الاسناد اور قوی روایات ضعیف اور کمزور حدیثوں کے معارض ہوں تو پہلی قسم کی حدیثوں کو قابل اختیار سمجھا جائے گا اور دوسری قسم کی حدیثوں کی یا تو توجیہ کی جائے گی یا مناسب توجیہ نہ ہونے کے وقت ان کو رد کر دیا جائے گا۔
۵۔ اگر کوئی روایت کسی متواتر حدیث کے خلاف ہو تو متواتر کے مقابلہ میں غیر متواتر روایت کو ساقط قرار دیا جائے گا۔
۶۔ اصول وکلیات شرع کے معیار پر حدیثوں کا جائزہ لے کر ان کی ایسی توجیہ کی گئی ہے کہ ظاہری اختلاف ختم ہو گیا ہے۔

معانی الآثار میں اکابر ائمہ احناف یعنی امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کے آرا و مسالک کو نقل کرنے کا زیادہ التزام کیا گیا ہے اور ان بزرگوں کے اقوال کی حدیثوں سے مطابقت بھی دکھائی گئی ہے، تاہم دوسرے اکابر فقہا امام مالک، امام اوزاعی، سفیان ثوری، ابن ابی لیلیٰ اور فقہائے احناف میں امام زفر کے مذاہب کی بھی کہیں کہیں تصریح کی گئی ہے' اور فقہائے صحابہ وتابعین کے مذاہب بھی نقل کیے گئے ہیں۔

اس کتاب کی اہمیت کا سب سے اہم اور نمایاں پہلو اس کی تحقیقی واستدلالی شان اور فقیہانہ ومجتہدانہ رنگ ہے، امام صاحب حنفی ہونے کے باوجود خود بھی مجتہد اور صاحب فقہ تھے، اس لیے انہوں نے مختلف فیہ امور ومسائل میں محاکمہ کر کے مرجح ومختار مسلک کی نشاندہی کی ہے اور عموماً نہایت تنقیح اور پوری تحقیق کے بعد ہی کسی مسلک کو مرجح قرار دیا ہے، یہاں تک کہ اپنے ائمہ سے بھی بعض مواقع پر اختلاف کیا ہے۔

روایات کی چھان بین اور تحقیق وتفتیش میں بھی بڑی دیدہ ریزی اور دقت نظر سے کام لیا گیا ہے، ان کے متون وطرق کی معرفت، اسناد کا جائزہ، رجال اور رواۃ کی تحقیق، رطب ویابس حدیثوں میں امتیاز، ارسال، انقطاع وقف اور رفع واتصال کی نشاندہی اور روایت کے علاوہ درایت کے لحاظ سے بھی حدیثوں کو پرکھا گیا ہے۔

معانی الآثار میں حدیث وفقہ کے علاوہ تفسیر وقراءت کی بعض لطیف بحثیں بھی ہیں، مشہور مفسرین صحابہ وتابعین اور ائمہ تفسیر وقراءت کے اقوال، مختار ومرجح قراءت وتفسیر کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور سنت وحدیث کی طرح قرآنی آیات سے استنباط مسائل کیا گیا ہے، سیر، انساب اور ایام ومشاہد کا بھی ایک حد تک حسب موقع ذکر ملتا ہے، ابواب کی ترتیب ومطالب کی افادیت اور انداز بیان کے لحاظ سے بھی یہ ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

خصوصیات:

۱۔ اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں احادیث وآثار کا تضاد ثابت کیا گیا ہے اور جو حدیثیں بظاہر باہم مختلف ومتناقض معلوم ہوتی ہیں، ان کی نہایت مناسب اور دلنشیں توجیہ وتطبیق بیان کی گئی ہے۔
۲۔ گو اساطین احناف کے مسالک کے نقل کا زیادہ التزام کیا گیا ہے لیکن دوسرے فقہاء ومجتہدین کے اقوال اور خصوصاً صحابہؓ وتابعینؒ کے آثار وفتاوے کی بھی صراحۃً نشاندہی کی گئی ہے۔
۳۔ اقوال مختلفہ میں تطبیق اور ان کے دلائل کی تشریح کر کے مرجح مسلک کی تعیین کی گئی ہے۔
۴۔ مختلف طرق، تعدد اسناد، روایت اور راوی کی قوت وضعف کے اسباب، ناسخ ومنسوخ، مطلق ومقید اور خاص وعام کی وضاحت نیز علمائے جرح وتعدیل کے اقوال کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

Marfat.com

۵۔ معانی الآثار کی بعض حدیثوں سے دوسری کتب احادیث خالی ہیں۔
۶۔ وضع وترتیب کی خوبی، انداز بیان اور طرزِ ادا کا حسن ودلآویزی۔

معانی الآثار پر اعتراض اور اس کا جواب:

معانی الآثار کی ان خصوصیات اور اہمیتوں کے باوجود اس پر بعض اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور اعتراض امام بیہقیؒ کا ہے کہ امام طحاویؒ نے ان حدیثوں کی جو عام محدثین کے نزدیک صحیح ہیں مگر احناف کے مسلک کے خلاف ہیں تضعیف اور ان روایتوں کی جو محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں مگر احناف کے مسلک کی مؤید ہیں، تصویب کی ہے لیکن ایہ اعتراض صحیح نہیں ہے، اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے کہ امام طحاویؒ حنفی ہونے کے باوجود مجتہد بھی تھے اور اپنی انصاف پسندی کی وجہ سے بعض مسائل میں احناف کے مسلک کو مخالف حدیث ہونے کی وجہ سے مرجوح سمجھتے ہیں اور اگر کہیں ایسا واقعی ہوا ہے تو اسکی مثالیں دوسرے مذاہب کے ائمہ کے یہاں بھی ملتی ہیں، اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے "امام بیہقی کی اس امام عظیم کی شان میں جس پر اکابر علماء ومشائخ نے اعتماد کیا ہے، یہ کھلی ہوئی زیادتی ہے" حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں "امام طحاوی کی شان سے یہ بعید اور انکی عظمت کے منافی ہے، بخدا مجھ کو اس کتاب میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جو امام بیہقی نے اسکے بارے میں کہی ہے" علامہ عینی فرماتے ہیں کہ "کسی عاقل ومنصف مزاج شخص کو اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ امام طحاوی نے قرآن واحادیث نبویہ سے استنباطِ احکام کیا ہے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۶۰ ۱۴ و ماتمس الیہ الحاجہ ص ۳۰ و ۳۱)
امام بیہقی کی تردید میں علاؤالدین ترکمانی نے الجواہر النقی والرد علی البیہقی کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔
(تقریظ معانی الآثار ج ۲ ص ۵)

معانی الآثار پر اعتراض کرنے والوں میں ایک ممتاز نام شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کا بھی ہے، ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ صحاح کے مقابلہ میں اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، اس سلسلہ میں مولانا عبدالحی لکھنوی کی یہ رائے نقل کردینا کافی ہے کہ: میں ابن تیمیہؒ کے متعلق وہی بات عرض کروں گا جو شیخ صالح نے حافظ ابن حجرؒ کے بارے میں کہی ہے کہ "ان کا مؤطا اور صحیح بخاری میں تفریق اور مؤطا کی صحت سے انکار صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے مؤطا میں اس امعان نظر سے کام نہیں لیا ہے، جس امعان نظر سے بخاری میں کام لیا ہے، ورنہ ان کو مؤطا کی اہمیت سے انکار نہ ہوتا، اسی طرح اگر امام ابن تیمیہؒ نے بھی صحاح ستہ کی طرح معانی الآثار پر گہری نظر ڈالی ہوتی تو وہ طحاویؒ اور ائمہ صحاح کے درمیان اس طرح تفریق روا نہ رکھتے، بلکہ ابن حزم کی طرح جو اگرچہ اپنے تفت کے لیے مشہور ہیں اس کی عظمت کا اعتراف کرتے۔ (ماتمس الیہ الحاجہ ۳۱)

معانی الآثار کی صحت اور اس کے رجال وغیرہ کے بارے میں بعض لوگوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے شارح ہدایہ امیر اتقانی لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک امام طحاوی پر ان لوگوں کے اعتراض وانکار کے کوئی معنی نہیں ہیں، اس لیے کہ وہ معتمد وثقہ ہیں اور متہم نہیں ہیں، اس کے علاوہ ان کا علمی پایہ بلند اور مرتبہ اجتہاد مسلم ہے، ورع وتقویٰ کے لحاظ سے بھی وہ فائق تھے اور مذاہب فقہ سے واقفیت میں بھی شرح وتقدم رکھتے تھے...... اگر تم کو ابوجعفر کے فضل وکمال میں شک ہو تو ان کی کتاب شرح معنی الآثار کا مطالعہ کرو، اس کی حنفی مذہب تو کجا کسی مذہب میں بھی کوئی نظیر اور مثال تم کو نظر نہ آئے گی۔" (مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۹۲)

Marfat.com

شروح و تلخیصات:

معانی الآثار کی اہمیت کی بنا پر ہر زمانہ کے علمانے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، وہ نصاب درس میں شامل کی گئی، اس کے شروح وحواشی لکھے گئے اور تلخیص بھی کی گئی، ذیل میں اس کی شرحوں اور تلخیصات کی فہرست درج کی جاتی ہے۔

ا۔ علامہ بدرالدین عینی (۸۵۵ھ) کو اس کتاب سے بڑا شغف تھا، انہوں نے ایک عرصہ تک اس کا درس بھی دیا اور اس کی دو شرحیں مبانی الاخبار اور نخب الافکار کے نام سے لکھیں، دونوں کے نسخے دار الکتب المصریہ میں موجود ہیں، پہلی کتاب آٹھ جلدوں میں اور دوسری چھ جلدوں میں ہے، ان کے علاوہ انہوں نے طحاوی کے رجال پر بھی ایک مستقل کتاب معانی الاخبار فی رجال معانی الآثار دو جلدوں میں لکھی، اس کا ناقص نسخہ بھی دار الکتب المصریہ میں پایا جاتا ہے، (الحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص ۳۲ و ۳۳ و فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۴۴۳) زاہدی کا بیان ہے کہ عینی نے طحاوی پر بخاری سے کم کام نہیں کیا ہے۔ (الحاوی ص ۳۳، ۳۴)

۲۔ شیخ قاسم بن قطلو بغا حنفی (م ۸۷۹ھ) نے الایثار برجال معانی الآثار لکھی جو طحاوی کے رجال پر نہایت مفید کتاب ہے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۶۰ و مقدمہ تحفۃ الحوذی ص ۹۲)

۳۔ ابوالحسین محمد بن باہلی مالکی (م ۳۲۱ھ) کی شرح تصحیح معانی الآثار جس کے متعلق بروکلمان نے لکھا ہے کہ بنکاک میں محفوظ ہے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۶۰ و مقدمہ تحفۃ الحوذی ص ۹۲)

۴۔ حافظ ابومحمد علی بن زکریا منبجی مؤلف لباب (م ۶۹۸ھ) بھی اس کے مشہور شارحین میں ہیں، ان کی شرح ایک جز آستانہ کے مکتبہ ایا صوفیا میں موجود ہے۔ (الحاوی ص ۳۳)

۵۔ حافظ عبدالقادر قرشی (م ۷۷۵ھ) نے الحاوی فی تخریج الاحادیث معانی الآثار لکھی جو بڑی عمدہ اور مفید شرح ہے، اس میں مصنف نے طحاوی کی حدیثوں اور سندوں کا صحاح، مشہور مسانید اور مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ سے تعلق اور نسبت ظاہر کی ہے، اس کا ایک جز دار الکتب المصریہ میں موجود ہے۔ (الحاوی ص ۳۱، ۳۲ و فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۳۴)

۶۔ حافظ ابوعمر بن عبدالبر (م ۴۶۳ھ) نے جو طحاوی کے بڑے عظمت شناس اور اکثر اپنی کتابوں میں ان کا حوالہ دیتے ہیں تلخیص کی ہے۔ (الحاوی ص ۳۳)

۷۔ حافظ ابومحمد عبداللہ بن یوسف زیلعی صاحب نصب الرایہ (م ۷۶۲ھ) کی تلخیص مکتبہ رواق اتراک اور مکتبہ کوبریلی میں محفوظ ہے۔ (ایضا)

۸۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ) نے اتحاف المہرہ میں اس کے اطراف کو جمع کیا ہے۔ (ماتمس الیہ الحاجہ ص ۳۰)

۹۔ شیخ التبلیغ مولانا محمد یوسف صاحب دہلوی نے عربی میں شرح امانی الاخبار فی شرح معانی الآثار لکھی ہے، اس کی دو جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں۔

معانی الآثار کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے، ۱۳۰۲ھ میں مطبع مصطفائی لکھنؤ نے اس کو لمبی تقطیع کی دو جلدوں میں شائع کیا ہے، دونوں جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۹۰۰ ہے، مولانا وصی احمد دہلوی نے اس پر مختصر حواشی تحریر کیے ہیں، ان میں الفاظ ولغات کی تحقیق، اسماء واعلام کی مختصر تشریح اور دوسرے نسخوں کے اختلاف کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

Marfat.com

نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا حَدِيثًا فَبَلَّغَهُ

تذکرۃ المحدثین

حصہ دوم

اس میں چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے اکثر مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات وسوانح اور ان کی علمی و حدیثی خدمات حدیث کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

مرتبہ: ضیاء الدین اصلاحیؒ

مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)
اقرا سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون: 042-37224228-37355743
MAKTABA-E-REHMANIA

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

MAKTABA-E-REHMANIA

مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)

نام کتاب: ---------- تذکرۃ المحدثین (دوم)

مرتبہ: ---------- ضیاء الدین اصلاحی

ناشر: ---------- مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)

مطبع: ---------- لٹل سٹار پرنٹرز لاہور

ضروری وضاحت

ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کے لیے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لیے پھر بھی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرما دیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہوسکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم محمدن الامین وعلی الہ واصحابہ اجمعین۔

صاحب تصانیف محدثین کرامؒ کے حالات میں ایک کتاب کی تالیف عرصہ سے دارالمصنفین کے پیش نظر تھی، حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی زندگی میں دوسرے ضروری کاموں کی وجہ سے اس کا موقع نہ ملا، ان کے لائق جانشین مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم نے یہ خدمت مولوی ضیاء الدین اصلاحی کے ذمہ کی، اس کی پہلی جلد ان کی راہنمائی میں شائع ہوئی، اس میں ان کا فاضلانہ مقدمہ بھی شامل ہے، دوسری جلد کا بھی زیادہ حصہ ان کی زندگی میں مرتب کیا جاچکا تھا اور انہوں نے اس کے بعض حصے معارف میں شائع بھی کئے تھے، اب جبکہ یہ جلد چھپ رہی ہے تو ان کی یاد برابر آ رہی ہے یقیناً اس کی اشاعت سے وہ بہت خوش ہوتے۔

پہلے خیال تھا کہ دو جلدوں میں یہ سلسلہ مکمل ہوجائے گا لیکن دوسری جلد کے بعد بھی کئی ممتاز محدثینؒ کے تذکرے رہ گئے اور اب اندازہ ہے کہ تین جلدوں میں یہ سلسلہ مکمل ہوگا اور مزید ایک اور جلد ہندوستان کے محدثینؒ کے لئے مخصوص کرنی ہوگی، قدردانوں کا اصرار ہے کہ پہلے ہی جلد مرتب کی جائے، ان کی خواہش کے مطابق آئندہ پہلے ہندوستانی محدثین سے متعلق جلد کی تالیف عمل میں آئے گی، اس کے بعد ان شاء اللہ بیرونی ممالک کے محدثین کے متعلق تیسری جلد شائع ہوگی۔

اس جلد میں چوتھی صدی سے آٹھویں صدی کی ابتداء تک کے صاحب تصانیف محدثین کے حالات تحریر کیے گئے ہیں، حدیث کی جمع وتدوین کی تاریخ میں تیسری صدی ہجری کو زرّیں عہد سمجھا جاتا ہے، صحاحِ ستہ کے مصنفین اسی دور میں گزرے ہیں لیکن اس کے بعد کی صدیاں بھی صاحب کمال محدثین سے خالی نہیں ہیں، حدیث کے بڑے بڑے شارحین ان ہی صدیوں میں پیدا ہوئے، ان کے اہم کارنامے فن حدیث کی تاریخ میں ہمیشہ یادر کھے جائیں گے، اس جلد میں ان میں سے اکثر کے تذکرے اور ان کی خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

اس میں جن محدثین کا ذکر ہے ان کے زمانے میں عقائد واحکام کی بنیاد پر مسلمانوں میں متعدد فرقے پیدا ہوگئے تھے، محدثین عموماً اہلسنت والجماعت کے ہمنوا تھے، وہ کوئی ایسی بات انگیز کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے جو بظاہر کتاب وسنت کے خلاف ہوتی، اس سلسلہ میں بعض کے یہاں شدت پسندی بھی آ گئی تھی، جو نیک نیتی اور حق پسندی ہی کا نتیجہ تھی لیکن اس کی وجہ سے ان کو مخالفتوں اور آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا اور اعتراضات کا نشانہ بھی بننا پڑا، ان اعتراضات سے کہیں کہیں سرسری گزر جانا ممکن نہ تھا لیکن ان کے بارہ میں جو کچھ تحقیق سے درست معلوم ہوا ہے وہی لائق مرتب نے پیش کیا ہے اور جانبداری سے پرہیز کیا ہے۔

Marfat.com

کاپی اور پروف کی تصحیح پر پوری توجہ صرف کی گئی ہے مگر اس کے بعد بھی کہیں کہیں غلطیاں رہ گئی ہیں جن کی ناظرین اپنے ذوق سے خود تصحیح کر سکتے ہیں، اس کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ ہر محدث کے حالات نئے صفحے سے شروع کیے جائیں، مگر ایک جگہ آگے کے صفحات چھپ جانے کی وجہ سے اس کا التزام نہیں ہو سکا اور مجبوراً یہ خامی انگیز کرنی پڑی [1]۔ لائق مرتب نے جس محنت و کاوش اور سلیقہ سے یہ کتاب مرتب کی ہے، اسے پڑھ کر ناظرین ضرور محظوظ ہوں گے، اس کی اشاعت سے دارالمصنفین کے سلسلۂ مطبوعات میں ایک اچھی اور قابل قدر تصنیف کا اضافہ ہوا ہے، ناظرین دعا کریں کہ مرتب کو رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کی بیش از بیش توفیق نصیب ہو۔ آمین

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

۷/ ربیع الاول ۱۳۹۷ھ، ۲۶ فروری ۱۹۷۷ء

---

[1] الحمد للہ نئے ایڈیشن میں یہ خامی دور ہو گئی ہے اور کہیں کہیں جو تحقیقی فروگزاشتیں ہو گئی تھیں ان کو بھی درست کر دیا گیا ہے۔ والعصمۃ للہ وحدہ۔ (ض)

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال اور آپ ﷺ کے واقعات وحالاتِ زندگی کو ضبط وتحریر میں لانے کا کام محدثین نے انجام دیا ہے، انہوں نے اپنی عمریں اسی کام کے لیے وقف کردیں اور نہایت محنت، کاوش، تحقیق اور صحت کے ساتھ حدیثوں کی تحریر وتدوین بھی کی اور پوری چھان بین سے راویوں کے حالات بھی جمع کیے، جس کی بدولت اسماء الرجال کا عظیم الشان فن تیار ہوا، جو مسلمانوں کا بڑا قابل فخر کارنامہ ہے۔

اس زمانہ کے مجتہدین دین ومذہب کی بندشوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے حدیث کے سارے ذخیرہ کو مشکوک اور ناقابل اعتبار قرار دے رہے ہیں، اس بنا پر محدثین کرامؒ کے حالات میں ایک مستند کتاب کی تالیف عرصہ سے دارالمصنفین کے پیش نظر تھی، الحمدللہ کہ اس کی پہلی جلد چند سال پہلے اور دوسری جلد اب شائع ہورہی ہے، اس میں چوتھی صدی سے آٹھویں صدی ہجری تک کے اربابِ کمال محدثین کے حالات اور کارنامے تحریر کیے گئے ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ اس مقدس جماعت نے کس جانکاہ محنت سے اور کتنی تحقیق واحتیاط کے ساتھ حدیثوں کو جمع ومرتب کیا، اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو مفید ومقبول بنائے، آمین۔

ضیاء الدین

۲۷/ربیع الاول ۱۳۹۷ھ

Marfat.com

امام عبدالباقی بن قانع رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۳۵۱ھ)

نام ونسب:

عبدالباقی نام، ابوالحسین کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، عبدالباقی بن قانع بن مرزوق بن واثق۔
(تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۸۷ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۹)

ولادت، خاندان اور وطن:

خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ وہ ۲۵/ ذوالقعدہ ۲۶۵ھ کو پیدا ہوئے، دوسرے مؤرخین نے بھی یہی سن تحریر کیا ہے مگر ایک روایت ۲۶۶ھ کی بھی ہے۔ (لسان المیزان ج ۳ ص ۳۸۳)

امام ابن قانع بنوامیہ کے موالی تھے اور بغداد ان کا وطن تھا، اس لیے اموی اور بغدادی کہلاتے تھے۔
(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۹ و تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۸۸)

اساتذہ:

ان کو جن اصحاب کمال اور ائمہ حدیث سے شرف تلمذ حاصل تھا ان کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن احمد وکیعی، ابراہیم بن اسحاق حربی، ابراہیم بن ہیثم بلدی، احمد بن اسحاق وزان، احمد بن علی خراز، احمد بن یحییٰ حلوانی، اسحاق بن حسن حربی، اسماعیل بن فضل بلخی، حارث بن ابی اسامہ، حسن بن عباس رازی، محمد بن مسلم واسطی، عبید بن شریک بزار، علی بن محمد بن ابی الشوراب وغیرہ۔

تلامذہ:

ان کے چند ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوالحسن بن رزقویہ، ابوالحسن دارقطنی، ابوالحسین بن فضل قطان، احمد بن علی بادی، ابوعلی بن شاذان، ابوالقاسم بن بشران، عبدالعزیز بن محمد بن شبان اور مرزبانی وغیرہ۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۹ و تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۸۸)

رحلت وسفر:

طلب علم کے لیے ان کے سفر کی تفصیلات تو معلوم نہیں ہو سکیں لیکن علامہ ذہبی لکھتے ہیں: و کان واسع الرحلۃ (کثیر

Marfat.com

الاسفار تھے) اور شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کا بیان ہے "ورحلت بسیار کردہ۔" (تذکرہ ج ۳ ص ۹۹ و بستان المحدثین ص ۸۶)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے متعدد مقامات کے علمی سفر کیے تھے۔

حفظ وثقاہت:

امام ابن قانع بغداد کے مشہور حفاظ حدیث میں تھے، کثیر الحفظ ہونے کی وجہ سے الحافظ ان کا لقب پڑ گیا تھا، عام علمائے فن سے ان کی توثیق بھی منقول ہے، ابن ناصر الدین فرماتے ہیں کہ علما کی ایک جماعت سے ان کی توثیق منقول ہے، حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ وہ حافظ، ثقہ اور امین تھے، علامہ خطیب کا بیان ہے کہ ہمارے عام اساتذہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، ابن جوزی، علامہ ذہبی اور دوسرے علمانے بھی ان کی ثقاہت کا تذکرہ کیا ہے۔ (حوالہ مذکورہ)

حدیث میں درجہ:

وہ بڑے نامور علما اور مشہور حفاظ حدیث میں شمار کیے جاتے تھے، اس فن میں ان کی عظمت اور بلند پائیگی کا اندازہ علامہ ذہبی کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ ابن قانع کثیر الحدیث تھے۔

روایت کی طرح درایت میں بھی امتیاز رکھتے تھے، خطیب لکھتے ہیں کہ وہ اہل علم اور اصحاب فہم و درایت میں تھے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۹ و تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۸۸)

رجال:

حدیث کی طرح رجال پر بھی ان کی اچھی نظر تھی، اسماء الرجال کی کتابوں میں ان کے اقوال درج ہیں۔

فقہ و قضا:

فقہ میں ان کا درجہ بلند تھا، اسی لیے قضا کے منصب پر فائز کیے گئے، احکام و مسائل پر ان کی وسعت نظر کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ابوبکر جصاص رازی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں ان سے بے شمار روایتیں نقل کی ہیں۔ (الجواہر المضیہ ج ۱ ص ۲۹۳)

مذہب و مسلک:

مسلکاً حنفی تھے اور ان کا شمار فقہائے حنفیہ میں ہوتا ہے، حافظ ابن حجر نے بھی ان کے حنفی اور اصحاب رائے میں ہونے کا ذکر کیا ہے اور عبدالقادر قرشی اور صاحب تاج التراجم نے ان کا طبقات الحنفیہ میں ذکر کیا ہے۔

(ایضاً و تاج التراجم فی طبقات الحنفیہ ص ۳۴ و لسان المیزان ج ۳ ص ۳۸۴)

وفات:

۸۶ سال کی عمر میں اپنے وطن بغداد میں ۷/ شوال ۳۵۱ھ کو انتقال کیا، ابن ماکولا نے ۳۴۵ھ کی روایت کی ہے مگر حافظ ابن حجر نے اس کی تضعیف کی ہے۔ (لسان المیزان ج ۳ ص ۳۸۴) ان کے ازواج و اولاد و دیگر اہل خاندان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے، عبدالقادر قرشی نے الجواہر میں ان کے ایک بھائی احمد کا ذکر کیا ہے جو نامور قاضی، ممتاز فقیہ اور علم الفرائض کے ماہر تھے۔

Marfat.com

تصنیفات:

حافظ ابن قانع بڑے صاحب علم تھے، اس کا ثبوت ان کی متعدد تصنیفات ہیں، مورخین نے ان کو کئی کتابوں کا مصنف بتایا ہے لیکن ان میں سے صرف ایک کا نام معلوم ہوسکا اور یہ معجم الصحابہ ہے جو حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہے، حافظ ابن حجر نے مجمع الموسس میں (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۶۵) اور دوسرے علمائے سیر وتراجم نے بھی اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے، حافظ ذہبی اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس کی ایک روایت نقل کی ہے جو یہ ہے:

عن کعب بن عیاض قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکل امة فتنة وفتنة امتی المال۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۹ و بستان المحدثین ص ۸۸ و ۸۹)

کعب بن عیاض ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر امت کے لیے ایک نہ ایک چیز موجب فتنہ ہوتی ہے اور میری امت کے لیے مال باعث فتنہ ہے۔

مشہور فقیہ ابویعلیٰ صدفی نے اس معجم کی ان حدیثوں کی جو وہم وتصحیف پر مشتمل ہیں وضاحت کے لیے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام الاعلام والتعریف مما لابن قانع فی معجمه من الاوهام والتصحیف تھا۔ (لسان المیزان ج ۳ ص ۳۸۴)

غالباً انہوں نے رجال پر بھی کوئی کتاب لکھی تھی کیونکہ رجال کی تمام معتبر کتابوں میں ان کے اقوال ملتے ہیں۔

ابن قانع پر بعض اعتراضات:

عام علمائے فن نے ان کی توثیق کی ہے لیکن بعض علما نے ان پر اعتراضات بھی کیے ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱ ان کے مشہور شاگرد امام دارقطنی کا بیان ہے کہ ان کا حافظہ اگرچہ نہایت عمدہ تھا لیکن وہ خطا بھی کرتے تھے اور بعض روایتوں میں ان سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ خطا پر اصرار کرتے تھے، مشہور محدث برقانی کا بیان ہے کہ اہل بغداد ان کو ثقہ بتاتے ہیں لیکن میرے نزدیک وہ ضعیف ہیں۔

۲ علامہ ابن حزم نے ان کو منکر الحدیث کہا ہے اور لکھا ہے کہ عام محدثین نے ان سے روایت کرنے میں بالکل احتراز کیا ہے اور ابن فتحون سے منقول ہے کہ حفاظ حدیث میں ان سے زیادہ کثیر الاوہام اور منکر المتون شخص میں نے نہیں دیکھا، مگر اس کے باوجود جلیل القدر اشخاص نے ان سے روایت کی ہے اور ان کے حافظہ کی تعریف کی ہے مثلاً امام دارقطنی وغیرہ، مگر یہ دونوں اعتراضات مطلقاً صحیح نہیں ہیں، اصل حقیقت یہ ہے جیسا کہ خطیب نے ابوالحسن بن فرات سے نقل کیا ہے کہ وفات سے دوسال پہلے وہ سوء حفظ اور اختلال عقل کے عوارض میں مبتلا ہوگئے تھے، اس لیے ہم لوگوں نے ان سے سماع و روایت کا سلسلہ موقوف کردیا تھا، لیکن بعض لوگوں نے اس وقت اس حالت میں بھی ان سے سماع جاری رکھا، خطیب برقانی کے اعتراض پر حیرت ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ برقانی کی تضعیف کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، ابن قانع اصحاب علم وفہم ودرایت میں تھے اور ہمارے عام شیوخ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، البتہ آخر عمر میں وہ اختلال اور نسیان کے عوارض میں مبتلا ہوگئے تھے۔

علامہ ابن حزم کا اعتراض ناواقفیت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اور اگر اس کو صحیح مانا جائے تو اس کا بھی وہی جواب ہے جو پہلے گزر

Marfat.com

چکا، حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ آخر عمر میں اختلال میں مبتلا ہو گئے تھے، اس لیے لوگوں نے ان سے روایت کرنا ترک کر دیا تھا۔

(تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۸۹ و میزان الاعتدال ج ۲ ص ۹۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۹۹ و لسان المیزان ج ۳ ص ۳۸۳ و ۳۸۴)

ان تفصیلات سے واضح ہو گیا کہ ابن قانع کی ثقاہت مسلّم ہے، البتہ آخر عمر میں بعض عوارض میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے علمائے فن نے ان سے اس وقت روایت کرنے میں احتیاط برتا ہے، ابن جوزی کا بیان ہے:

وان کان من اهل العلم والفهم والثقة غير انه تغير في آخر عمره۔

وہ اگرچہ صاحب علم و فہم اور ثقہ تھے لیکن آخر عمر میں مختل ہو گئے تھے۔ (المنتظم ج ۷ ص ۱۴)

Marfat.com

امام سعید بن السکن رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۳۵۳ھ)

نام ونسب:

سعید نام، ابوعلی کنیت اور نسب نامہ حسب ذیل ہے:

سعید بن عثمان بن سعید بن السکن۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۹)

اپنے جداعلیٰ کی نسبت سے ابن السکن کہلاتے ہیں اور اسی نام سے مشہور ہیں۔

ولادت ووطن:

۲۹۴ھ ان کا سن ولادت ہے، اصلی وطن بغداد تھا، لیکن مصر میں سکونت اختیار کر لی تھی، (ایضاً وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۴۷) اسی لیے بغدادی اور مصری دونوں نسبتوں سے مشہور ہوئے، خاندانی حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

اساتذہ وشیوخ:

ان کے جن شیوخ کا نام معلوم ہوسکا وہ یہ ہیں:

ابن جوصا، ابوعروبہ حرانی، ابوالقاسم البغوی، سعید بن عبدالعزیز حلبی، محمد بن محمد بن بدر باہلی اور محمد یوسف فربری۔

تلامذہ:

بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں:

ابوجعفر بن عون، ابوعبداللہ بن مندہ، عبداللہ بن محمد بن اسد قرطبی، عبدالغنی بن سعید، علی بن محمد دقاق، ابوعبداللہ محمد بن یحییٰ بن مفرج۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۹)

طلب علم کے لیے سفر:

علم کی تحصیل اور احادیث کی طلب کے لیے اس زمانہ کے مشہور مراکز حدیث کا سفر کیا علامہ ذہبی نے العبر میں عراق، شام، جزیرہ خراسان اور ماوراء النہر کے علماء سے اور تذکرہ میں جیحون سے فرات تک کے ارباب کمال سے استفادہ کا ذکر کیا ہے۔ (تذکرہ والعبر ج ۳ ص ۲۹۷)

Marfat.com

حفظ وثقاہت:

امام ابن السکن کا مشہور حفاظ اور معتبر محدثین میں شمار ہوتا ہے، مؤرخین نے ان کو الحافظ اور الحافظ الکبیر لکھا ہے اور ان کی عدالت وثقاہت پر بھی اتفاق ہے، ابن عماد نے ثقہ وحجت اور سیوطی نے الحافظ الحجہ لکھا ہے۔

(شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۲ وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۴)

حدیث میں درجہ:

علامہ سیوطی نے مصر کے اعلیٰ طبقہ کے محدثین اور نقادانِ فن میں ان کا تذکرہ کیا ہے، علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ابن السکن نے فن حدیث کی جانب خاص توجہ کی اس میں کتابیں لکھیں اور حدیثیں جمع کیں، ان کی حدیث میں بصیرت اور ژرف نگاہی کا یہ حال تھا کہ اکثر علما اس باب میں انکی جانب رجوع کرتے اور ان کی رایوں پر پورا اعتماد کرتے، ایک دفعہ کچھ محدثین انکی خدمت میں حاضر ہوئے، انہوں نے کہا کہ ہمارے سامنے حدیث کی بہت سی کتابیں آ گئی، آپ ان میں سے چند ایسی کتابوں کی نشاندہی کر دیں جن پر ہم اکتفاء کر سکیں، وہ یہ سن کر گھر میں داخل ہوئے اور کتابوں کے چار بستے لا کر اوپر تلے رکھ دیئے پھر فرمایا:

هذه قواعد الاسلام كتاب مسلم و كتاب البخاري و كتاب ابى داؤد و كتاب النسائى۔

(شروط الائمة الستہ ص ۸)

یہ اسلام کی بنیادیں ہیں یعنی صحیح مسلم، صحیح بخاری، سنن ابی داؤد اور سنن نسائی۔

امامت وشہرت:

اپنے کمالات اور عظمت کی وجہ سے ان کا شمار ائمہ میں ہوتا ہے، علامہ ذہبی نے العبر میں احد الائمہ لکھا ہے اور تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں کہ ان کی شہرت کا دور دور چرچا تھا، ان کی کتاب الصحیح المنتقیٰ اندلس میں پہنچ چکی تھی۔

(العبر ج ۲ ص ۲۹۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۹)

وفات:

۵۹ سال کی عمر میں محرم ۳۵۳ھ میں انتقال کیا۔ (العبر ج ۲ ص ۲۹۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۹)

تصنیفات:

اہل سیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے متعدد کتابیں لکھی تھیں جو معدوم ہیں صرف دو کتابوں کے نام معلوم ہو سکے۔

ا۔ مصنف:

اس کا صاحب کشف الظنون اور صاحب تحفۃ الاحوذی نے ذکر کیا ہے (کشف الظنون ج ۲ ص ۱۵۱۴ ومقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۶) مگر اور کسی قسم کی معلومات نہیں لکھی ہیں۔

Marfat.com

۲۔ الصحیح المنتقیٰ:

یہ احکامی احادیث وسنن کا مجموعہ ہے، گو ان کی سندیں مصنف نے حذف کردی ہیں تاہم اس میں صحت کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے، اسی لیے اسکا نام منتقیٰ رکھا ہے، اور اپنے خیال میں انہوں نے صرف صحیح روایتیں ہی اس میں شامل کی تھیں اور ضروری مسائل واحکام کے ابواب قائم کر کے ان کے تحت حدیثیں درج ہیں، اس کتاب کی حدیثوں کی تین نوعیتیں ہیں، میں نے اس کتاب میں جن حدیثوں کا مجملاً بیان کیا ہے یعنی انکے صحت وسقم کی کوئی تشریح نہیں کی ہے وہ بالاتفاق صحیح ہیں، دوسرے نمبر پر ایسی حدیثیں ہیں جو کسی نہ کسی امام کی مختار و معمول بہا ہیں لیکن بعض ایسی حدیثیں بھی نقل کی ہیں جن کے ناقلین انکی روایت میں منفرد ہیں مگر میں نے اسکی علت اور راوی کے انفراد کا ذکر کر دیا ہے (الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۴ بحوالہ شفاء السقام سبکی) ابن حزم کا بیان ہے کہ صحیحین کے بعد اسی کتاب کا درجہ ہے۔ (تدریب ص ۳۲)

Marfat.com

امام ابوبکر شافعی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۳۵۴ھ)

نام ونسب:

محمد نام، ابوبکر کنیت اور بزار لقب تھا، نسب نامہ حسب ذیل ہے:

محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن عبدویہ۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۶ و بستان المحدثین ص ۵)

ولادت ووطن:

امام ابوبکر شافعی کی ولادت ۲۶۰ھ میں واسط کے قریب ایک مقام جبل (جبل) میں ہوئی لیکن انہوں نے بغداد میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی، اسی لیے بغدادی کی نسبت سے مشہور ہوئے، علمائے سیر اسی بنا پر ان کو محدثین عراق میں لکھتے ہیں۔

(ایضاً و کتاب الانساب ورق ۳۲۶)

اساتذہ:

ان کے مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر بن ابی الدنیا، ابوقلابہ رقاشی، قاضی اسماعیل، عبداللہ بن روح مدائنی، محمد بن جہم سمری، محمد بن شداد مسمعی، محمد بن فرج ازرق اور موسیٰ بن سہل وشاء۔

موسیٰ بن سہل وشاء نے اسماعیل بن علیہ جیسے عظیم محدث سے اور محمد بن شداد مسمعی نے یحییٰ بن قطان سے اکتساب فیض کیا تھا۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۶)

تلامذہ:

ابوبکر کے حلقۂ فیض سے وابستہ لوگوں میں بعض کے اسماء حسب ذیل ہیں:

ابوعلی بن شاذان، احمد بن عبداللہ بن محاملی، امام دارقطنی، عبدالملک بن بشران، عمر بن شاہین، ابوالحسن محمد بن احمد، ابوعبد اللہ محمد بن عبداللہ حافظ اور ابوطالب محمد بن محمد بن ابراہیم بن غیلان۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۶)

حصول علم کے لیے سفر:

انہوں نے ۱۶ سال کی عمر میں ۲۷۶ھ میں حدیث کی تحصیل شروع کی، اس کے بعد فن سے اس قدر اشتغال ہوا کہ متعدد مقامات کا سفر کیا، مصر و جزیرہ جانے کی تصریح ملتی ہے۔ (بستان المحدثین، ص: ۵)

Marfat.com

ضبط وثقاہت:

محدثین اور علمائے فن نے ان کی توثیق کی ہے، حافظ ذہبی نے الامام الحجۃ المفید اور خطیب نے ثقہ وثبت لکھا ہے، امام دارقطنی کا بیان ہے کہ وہ ثقہ ومامون تھے، علامہ سمعانی لکھتے ہیں کہ وہ ایسے ثقہ ومامون تھے، جن کی نظر احادیث کے معاملہ میں کبھی نہیں چوکتی تھی، ان کے زمانہ میں ان سے زیادہ معتبر اور ثقہ آدمی کوئی نہیں تھا۔

(تذکرہ ج ۳ ص ۹۶ والعبر ج ۲ ص ۳۰۱ وکتاب الانساب ورق ۳۲۶ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۱۶)

حدیث میں درجہ ومرتبہ:

حدیث میں ان کا درجہ ومرتبہ اتنا بلند تھا کہ امام دارقطنی نے ان کو جبل حدیث اور ذہبی نے امام ومحدث عراق کہا ہے، علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں۔ کہ وہ حدیثوں کے عالم اور ان کی سندیں نہایت عالی ہوتی تھیں، علامہ سمعانی لکھتے ہیں۔

ما رأیت له الا اصو صا صحیحة متقنة۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۶، ۹۷ وکامل ابن اثیر ج ۷ ص ۱۸۶ وکتاب الانساب ورق ۳۲۶)

میں نے ان کے اصول حدیث نہایت صحیح اور قوی پائے۔

مذہب ومسلک:

ان کے فقہی مذہب کی باقاعدہ تصریح نہیں ملتی لیکن شافعیت کی نسبت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شافعی رہے ہوں گے۔

کارنامہ:

امام ابوبکر بڑے صاحب عزیمت اور نہایت راسخ العقیدہ بزرگ تھے، ان کے زمانے میں شیعیت کا بڑا غلبہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ علی الاعلان صحابہؓ کے فضائل کی حدیثیں بیان کرتے تھے، علامہ ابن اثیر نے ۳۵۱ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ اہل دیلم نے لوگوں کو فضائل صحابہ بیان کرنے سے روک دیا اور جامع اعظم اور دوسری مسجدوں کے صدر دروازوں پر تبرا لکھوایا تو یہ اس وقت بھی علی الاعلان صحابہ کے فضائل بیان کرتے تھے اور جامع اعظم اور باب الشام میں حسبۃ للہ اس قسم کی روایات کا املا کراتے تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۶، ۹۷ وکامل ابن اثیر ج ۷ ص ۱۸۶، المنتظم ج ۷ ص ۳۲، البدایہ ج ۱۱ ص ۲۶۰)

وفات:

انہوں نے ۹۵ سال کی طویل عمر میں ذی الحجہ ۳۵۴ھ میں انتقال کیا۔

پیشہ:

ان کا ذریعہ معاش کپڑوں کی تجارت تھا، اسی لیے بزاز لقب پڑ گیا تھا۔ (تذکرہ ج ۳ ص ۹۷ والعبر ج ۲ ص ۳۰۱)

تصنیفات:

مورخین نے ان کو صاحب تصانیف لکھا ہے، خطیب کا بیان ہے کہ ان کی تصنیفات نہایت عمدہ تھیں لیکن ان کے ایک ہی

Marfat.com

مجموعۂ حدیث کا پتہ چلتا ہے جو فوائد ابوبکر یا غیلانیات اور اجزاء الغیلانیات کے نام سے مشہور ہے، اس مجموعہ کو غیلانیات اس لیے کہا جاتا ہے کہ امام ابوبکر کے مشہور شاگرد شیخ ابوطالب محمد بن محمد بن ابراہیم بن غیلان م ۴۴۰ھ نے اس کی ان سے روایت کی ہے، ان کے نام کی نسبت کی وجہ سے اس کو غیلانیات وغیرہ کہتے ہیں، یہ گیارہ اجزا پر مشتمل ہے اس کی ترتیب ابواب وشیوخ پر ہے اور حدیث کی اعلیٰ واحسن کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، امام دارقطنی نے اس کی رباعی حدیثوں کی ایک مستقل رسالہ میں تخریج کی ہے، علامہ ذہبی اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس کی ایک ایک حدیث نقل کی ہے۔

(بستان ص ۴۷ وتذکرہ ج ۳ ص ۷۹ وکشف الظنون ج ۲ ص ۶۶۶)

Marfat.com

امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۳۵۴ھ)

نام ونسب:

محمد نام، ابوحاتم کنیت اور ابن حبان لقب تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے:

محمد بن حبان بن احمد بن حبان بن معاذ بن معبد بن شہید بن ہدبہ بن مرۃ بن سعد بن یزید بن مرۃ بن زید بن عبداللہ بن دارم بن حنظلہ بن مالک بن زید بن مناۃ بن تمیم۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۳)

نسب نامہ میں قدرے اختلاف منقول ہے۔

خاندان:

ابن حبان عربی النسل تھے، جیسا کہ نسب نامہ سے ظاہر ہے، عرب کے مشہور قبیلہ تمیم کی شاخ دارم سے ان کا نسبی تعلق تھا، اسی لیے دارمی اور تمیمی کہلاتے ہیں۔

وطن:

بست کو ان کے مولد ہونے کا فخر حاصل ہے، یہ سیستان میں غزنین اور ہرات کے درمیان دریائے ہلمند کے کنارے واقع تھا، محب الدین خطیب کا بیان ہے کہ غالب گمان یہ ہے کہ ان کے آباؤ اجداد میں سے کوئی بزرگ مجاہدین اسلام کے اس دستہ میں شامل رہے ہوں گے جو پہلی صدی ہجری میں محمد بن قاسم ثقفی کی سرکردگی میں ہندوستان آیا تھا اور ملتان کی فتح کے بعد ان ہی علاقوں میں آباد ہو گئے ہوں گے، انہی کی نسل سے محمد بن حبان بست میں پیدا ہوئے، یہ اس زمانہ میں صوبہ بحستان (نسیستان) کا ایک اہم پُررونق اور سرسبز وشاداب مقام سمجھا جاتا تھا اور خرما اور انگور کی پیداوار کے لیے مشہور تھا، غالباً باغوں کی کثرت کی بنا پر اس کا نام بست پڑ گیا تھا، جو بوستان یا بستان کی بگڑی ہوئی شکل معلوم ہوتا ہے، یہ شہر اسلامی فتوحات سے پہلے اور اس کے بعد بھی کئی صدیوں تک آباد رہا، یاقوت کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ابن حبان کے بعد تقریباً تین صدیوں تک یہ آباد رہا مگر چھٹی صدی کے آخر یا ساتویں صدی کے شروع میں ویران ہو گیا، اس کی خاک سے متعدد نامور محدثین اور اکابر علما پیدا ہوئے، عربی کا مشہور ادیب وشاعر ابوالفتح بستی (متوفی ۴۰۱ھ) کا وطن یہی علاقہ ہے اور سنن ابی داؤد کے مشہور شارح اور عظیم محدث امام ابوسلیمان خطابی (م ۳۸۸ھ) کا تعلق بھی اسی مردم خیز سرزمین سے ہے۔ (کتاب الانساب ورق ۸۱ معجم البلدان ج ۲ ص ۱۷۰، ۱۷۱ و جغرافیہ خلافت مشرقی ص ۲۸۱-۵۱۹) امام ابن حبان بست کے گل سرسبد تھے اور امام خطابی سے زیادہ کوئی باکمال شخصیت

Marfat.com

یہاں نہیں پیدا ہوئی۔

ولادت:

مؤرخین نے ان کے سن ولادت کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن ذہبی کا بیان ہے کہ وفات (۳۵۴ھ) کے وقت ان کی عمر تقریباً اسی سال تھی (العبر جلد ۲ ص ۳۰۰) اسی لحاظ سے لگ بھگ ۲۷۵ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

شیوخ و اساتذہ:

ابن حبان کے شیوخ کی تعداد بے شمار ہے، حافظ ذہبی اور علامہ ابن سبکی تحریر فرماتے ہیں:

وانہا لایحصون من مصر الی خراسان۔

مصر سے خراسان تک کے بے شمار لوگوں سے ابن حبان نے کسب فیض کیا۔

ان کا خود کا بیان ہے کہ:

لعلنا قد کتبنا عن الفی شیخ مابین الشاس والاسکندریہ۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۴۱)

شاید ہم نے شاس واسکندریہ کے درمیان کے دوہزار بزرگوں سے حدیثیں لکھیں۔

اگر ان کی مختلف علوم میں جامعیت اور رحلت وسفر کی کثرت کو مدنظر رکھا جائے تو اس بیان میں کوئی مبالغہ نہ معلوم ہوگا۔

بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر بن خزیمہ، ابوخلیفہ جمحی، ابوعبدالرحمٰن نسائی، ابویعلی موصلی، احمد بن حسن صوفی قاضی ابو احمد اسحاق بن ابراہیم بستی جعفری، احمد دمشقی، حسن بن سفیان شیبانی، حسین بن ادریس ہروی، ابویعلی زکریا ساجی، عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمٰن بن شیرویہ ازدی، ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز بغوی، عمر بن محمد، عمران بن موسیٰ بن مجاشع، محمد بن ابراہیم خلدی ہروی، محمد بن اسحاق بن ابراہیم سراج ثقفی، ابوالحسن محمد بن عبداللہ بن جنید بستی، محمد بن عثمان بن سعد دارمی، محمد بن یحییٰ مدینی، محمد بن یزید دورتی، ابو عوانہ یعقوب بن اسحاق وغیرہ۔

امام الائمہ ابوبکر بن خزیمہ سے غیر معمولی تعلق تھا، سفر ہو یا حضر ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے اور وہ جو کچھ فرماتے تھے اسے قلمبند کر لیتے تھے، فقہ، حدیث، اصول اور فرائض وغیرہ کی ان ہی سے تعلیم حاصل کی تھی۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۴۱)

تلامذہ:

ان کے تلامذہ کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی، چند مشہور شاگردوں کے نام ملاحظہ ہوں:

ابوعبداللہ حاکم، ابوعبداللہ بن مندہ اصبہانی، جعفر بن شعیب بن محمد سمرقندی، حسن بن منصور، ابوعبداللہ محمد بن احمد غنجار بخاری، ابومعاذ عبدالرحمٰن محمد بن رزق اللہ سجستانی محمد بن احمد بن منصور بوقانی، ابوالحسن محمد بن احمد بن ہارون عبدون زوزنی، ابو سلمہ محمد بن محمد بن داؤد شافعی، ابوعلی منصور بن عبداللہ خالد ذہلی وغیرہ۔ (ایضاً)

Marfat.com

طلب علم کے لیے سفر:

امام ابن حبانؒ نے علم وفن کی تحصیل کے لیے متعدد اسلامی ملکوں کا سفر کیا تھا، مؤرخین کا بیان ہے کہ انہوں نے شاس واسیجاب (مشرقی ترکستان) سے اسکندریہ (مصر) اور مصر سے خراسان کا چپہ چپہ چھان ڈالا تھا، علمائے سیر نے ان کے مرو، نیشاپور، اہواز، ابلہ، بصرہ، واسط، بغداد، کوفہ، مکہ، موصل، حلب، انطاکیہ، حمص، بخارا، نسا، ماوراء النہر، جرجان، عراق، حجاز، شام مصر اور جزیرہ جانے کی تصریح کی ہے اور لکھا ہے کہ ان میں سے بعض جگہ تو وہ متعدد بار تشریف لے گئے تھے۔
(طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۴۱ اولسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۵ و بستان المحدثین ص ۴۰)

حفظ وثقاہت:

ان کو غیر معمولی ذکاوت اور بے نظیر حافظہ ملا تھا، ابوسعد ادریسی صاحب تاریخ سمرقند فرماتے ہیں کہ ''وہ آثار واحادیث کے نامور حفاظ میں تھے'' حافظ ابن حجر نے ان کی غیر معمولی ذہانت اور قوت حافظہ کا اعتراف کیا ہے، دوسرے اصحاب سیر وتراجم نے بھی ان کو الحافظ الجلیل اور احد الحفاظ الکبار وغیرہ لکھا ہے۔

ان کی ثقاہت پر بھی ائمہ فن کا اتفاق ہے، تمام مؤرخین نے خطیب کے حوالہ سے ان کو ثقہ ومتقن لکھا ہے، علامہ ابن عماد حنبلی فرماتے ہیں کہ وہ حافظ ثابت اور امام وحجت تھے۔ (ایضاً والبدایہ والنہایہ جلد ۱۱ ص ۲۵۹ وشذرات الذہب ج ۳ ص ۱۶)

حدیث میں بلند پائیگی:

حدیث میں ان کو زیادہ امتیاز اور برتری حاصل تھی اور وہ اس فن کے باکمال ائمہ میں شمار کئے جاتے ہیں، مؤرخین اور ارباب سیر نے ان کو حدیث میں مکثر اور معرفت حدیث میں امام قرار دیا ہے، متون واسانید حدیث پر ان کی نظر وسیع اور گہری تھی، ماہرین فن کا بیان ہے کہ: وہ متون واسانید کے عالم اور واقف کار تھے، حدیث میں ان کے کارنامے غیر معمولی ہیں، انہوں نے علوم حدیث کی حیرت انگیز خدمات انجام دی ہیں، حاکم فرماتے ہیں کہ ''حدیث میں ان سے بے نظیر کتابیں یادگار ہیں۔'' (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ و اعلام ج ۳ ص ۸۸۰) حدیث میں ان کی مہارت اور ژرف نگاہی یہ بھی ہے کہ وہ جرح وتعدیل کے امام تھے اور اس فن میں ان کی تصنیفات بڑی اہم خیال کی جاتی ہیں۔

فقہ:

اپنے جامع کمالات استاذ امام ابن خزیمہ کی طرح وہ بھی فقہ وحدیث دونوں میں ممتاز تھے اور انہیں سے اس فن کی تکمیل و تحصیل کی تھی، علمائے سیر لکھتے ہیں کہ ''ابن حبان فقہ کے عالم وعارف اور فقہائے دین میں ہیں'' سمرقند والوں میں فقہی ذوق پیدا کرنا ان ہی کا کارنامہ ہے، حاکم کا بیان ہے کہ ''وہ علم فقہ کا خزانہ تھے۔'' (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۴۷)

دیگر علوم:

دینی علوم کی طرح وہ اس زمانہ کے مروّجہ علوم اور جدید فنون سے بھی اچھی طرح واقف تھے، حاکم کا بیان ہے کہ لغت، عربیت، نحو وادب کے علاوہ فلسفہ وکلام، طب ونجوم اور جغرافیہ میں بھی دستگاہ رکھتے تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

Marfat.com

سوائے علم حدیث علوم دیگر ھم داشت فقہ ولغت وطب ونجوم فلک وہندسہ رانیک می دانست۔ (ایضاً و بستان المحدثین ص ۴۰)

وہ علم حدیث کے علاوہ دوسرے علوم میں درک رکھتے تھے، فقہ ولغت، طب ونجوم، فلکیات وہندسہ سے خوب واقف تھے۔

جامعیت:

ان گونا گوں علوم سے واقفیت ومعرفت ابن حبان کی جامعیت کا ثبوت ہے، ادریسی کا بیان ہے کہ ''وہ متعدد علوم میں جامع تھے'' حاکم فرماتے ہیں کہ ''وہ علوم وفنون کا خزانہ تھے۔'' حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ انہوں نے ہر ہر فن میں کتابیں لکھی تھیں، علمائے اسلام میں ایسے جامع کمالات لوگ کم گزرے ہیں جن کو اتنے گونا گوں اور متنوع علوم میں اس قدر رسوخ اور ایسی مکمل مہارت حاصل رہی ہو، ان ہی کمالات اور جامعیت کی وجہ سے مؤرخین نے انہیں امام عصر، فاضل متقن، العالم ابحر اور العلامۃ المتبحر وغیرہ لکھا ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ ولسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴)

فہم وفراست:

اللہ تعالیٰ نے علم وفضل کی طرح ان کو فہم وفراست اور عقل ودانش سے بھی نوازا تھا، حاکم نے ان کو عقلائے رجال میں بتایا ہے اور خطیب نے بھی ان کی فہم وفراست کا اعتراف کیا ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴)

علم کا شوق وذوق:

ابن حبان کو علم وفن سے غیر معمولی شغف تھا، سفر کی زیادتی اسی دلچسپی کا نتیجہ تھی، وہ ابن خزیمہ کی خدمت میں رہ کر اپنی تشنگی علم بجھاتے تھے، علم سے تعلق اور دلچسپی کا یہ حال تھا کہ اپنے وطن بست میں ایک مدرسہ اور کتب خانہ قائم کیا تھا اور اپنی زندگی ہی میں اپنا مکان ان دونوں پر وقف کر دیا تھا، یہ مدرسہ اہل علم، محدثین اور فقہا سے معمور رہتا تھا اور کتب خانہ کا نہایت معقول انتظام کیا گیا تھا، اس کی نگرانی باقاعدہ ایک شخص کے متعلق کر دی گئی تھی، اس کی کشش لوگوں کو دور دراز سے یہاں کھینچ لاتی تھی، ان کو قیام اور کتب خانہ سے استفادہ اور کتابوں کے نقل کی پوری سہولت بہم پہنچائی جاتی تھی، کتابوں کی حفاظت کا بھی معقول انتظام تھا، چنانچہ کتب خانہ سے باہر کتابیں لے جانے کی کسی کو اجازت نہیں دی جاتی تھی، اس مدرسہ اور کتب خانہ کا فیض ابن حبان کے بعد بھی جاری رہا۔ (لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴)

منصب قضا:

دینی علوم میں بصیرت اور پختگی کی وجہ سے انہیں قضا کا منصب تفویض کیا گیا تھا اور وہ ایک عرصہ تک سمرقند، نسا، نیشاپور اور خراسان کے بعض شہروں کے قاضی رہے۔ (ایضاً و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ و کتاب الانساب ورق ۸۱)

مقبولیت وشہرت:

ابن حبان کے علم وفضل اور جامعیت وکمال کی بنا پر چار دانگ عالم میں ان کی شہرت ہو گئی تھی، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ''شہروں اور ملکوں میں ان کی غیر معمولی شہرت تھی اور وہ بالاتفاق ائمہ امت میں شمار کیے جاتے تھے'' علامہ سمعانی نے ان کو امام العصر اور حافظ ذہبی نے ان کو ائمہ زمانہ میں محسوب کیا ہے، ان کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ جب سیر وسیاحت کے بعد اپنے وطن

Marfat.com

بست تشریف لائے تو ان کے گھر پر شائقین علم اور طالبین فیض کا اژدحام رہتا تھا اور ان کی تصنیفات بڑے شوق وذوق سے پڑھی اور سنی جاتی تھیں۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ص ۲۳۴ وکتاب الانساب ورق ۸۱)

فقہی مسلک:

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ شافعی المذہب تھے لیکن عام اصحاب طبقات وتراجم نے اس باب میں سکوت اختیار کیا ہے، اس سے گمان ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص مسلک فقہ سے وابستہ نہ تھے، بلکہ اپنے استاذ امام ابن خزیمہ کی طرح تقلید کے بجائے تفقہ واجتہاد سے کام لیتے رہے ہوں گے حافظ ابن کثیر نے بھی ان کو مجتہدین میں شمار کیا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج۱۱ص ۲۵۹)

جرح وتعدیل:

اوپر گذر چکا ہے کہ وہ حدیث کی طرح اس کے متعلقہ علوم کے بھی ماہر تھے، جرح وتعدیل ان کا خاص موضوع تھا، اس میں انہوں نے کئی کتابیں لکھی تھیں۔

فکروخیال میں جدت:

امام صاحب کے بعض افکار وخیالات میں بڑی جدت اور ندرت پائی جاتی ہے اس قسم کی ایک عجیب اور دلچسپ رائے ذیل میں تحریر کی جاتی ہے:

حضرت انسؓ سے صوم وصال کی جو روایت منقول ہے، اس میں آپؐ کے اس ارشاد مبارک:

انی لست کاحدکم انی اطعم واسقی۔

میں تم لوگوں کی طرح نہیں ہوں، مجھے (خداوند کی طرف سے) کھلایا پلایا جاتا ہے۔

کے متعلق اپنی صحیح میں لکھتے ہیں:

''اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حدیثیں صحیح نہیں ہیں جن میں آنحضور ﷺ کے بھوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر باندھ لینے کا ذکر ہے، دراصل ان حدیثوں میں حجر (پتھر) کے بجائے حجز کا لفظ ہوگا، جس کے معنی طرف الازار یعنی نیفہ ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ مسلسل روزہ رکھنے کی صورت میں بھی اپنے رسول (ﷺ) کھلاتا پلاتا تھا تو اس وقت بھلا وہ کیسے آپ ﷺ کو بھوکا چھوڑ دیتا، جب آپ ﷺ روزے سے نہیں ہوتے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ کو اپنے پیٹ پر پتھر رکھنا پڑتا تھا، جبکہ واقعہ یہ ہے کہ بھوک میں پیٹ پر پتھر باندھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔''

علامہ ابن سبکی نے اس رائے پر جو ایراد کیا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمایئے:

علامہ کا یہ قول محل نظر ہے کیونکہ خود انہوں نے اپنی اسی کتاب میں چند ورق پہلے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے واسطہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپؐ نے ایک دفعہ فرمایا:

Marfat.com

والذی نفسی بیدہ ما اخرجنی الا الجوع۔[1]

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں بھی بھوک ہی کی وجہ سے نکلا ہوں۔

اسی طرح متعدد روایتوں میں آپ ﷺ کی بھوک کا ذکر ہے، درحقیقت بھوک کو نقص اور عیب خیال کرنا ہی غلط ہے بلکہ اسی سے نبی کے درجات کی بلندی کا پتہ چلتا ہے، ان حدیثوں اور وصال کی روایت میں تطبیق کی صورت بالکل واضح ہے، اللہ کی مشیت اور مرضی سے نبی کے مختلف احوال ہوتے ہیں، کبھی وہ بھوکا ہوتا ہے، کبھی روزے سے ہوتا ہے، اور کبھی یہ حال ہوتا ہے کہ روزے میں بھی اس کو بھوک اور پیاس کی تکلیف کا مطلقاً احساس نہیں ہوتا اور یہ سب صورتیں اور مختلف حالتیں اپنے اپنے محل اور وقت کے اعتبار سے بالکل موزوں اور مناسب ہوتی ہیں۔'' (طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۴۲)

اخلاق وعادات:

افسوس ہے کہ تذکرہ وتراجم کی کتابیں ابن حبان کے اخلاق کے ذکر سے خالی ہیں لیکن ان کی فیاضی اور سخاوت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخر عمر میں جب انہوں نے اپنے وطن میں مدرسہ اور کتب خانہ قائم کیا تو شائقین علم کے لئے ان کا گھر لنگر خانہ بنا ہوا تھا، دور دراز کے لوگوں کے طعام کے مصارف وہی برداشت کرتے تھے۔ (لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴)

الحاد اور بدعقیدگی کا الزام اور اس کا جواب:

ابن حبان پر بدعقیدگی، الحاد اور زندقہ کا الزام عائد کیا گیا ہے اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ جلاوطن کر دیئے گئے تھے، ذیل میں اس الزام کو نقل کر کے اس کی حقیقت واضح کی جاتی ہے۔

اس الزام کا دارومدار ان دو روایتوں پر ہے جو مشہور صوفی ابو اسماعیل عبداللہ بن محمد انصاری ہروی (متوفی ۴۸۱ھ) سے مروی ہیں، ان میں پہلی روایت یہ ہے:

قال سألت یحیی بن عمار عن ابی حاتم بن حبان فقال رأیته، و نحن اخرجناہ من سجستان کان له علم کثیر ولم یکن له دین کبیر قدم علینا فانکر الحد لله فاخرجناہ۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۴ و ۱۲۵ ومیزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ وطبقات الشافعیة الکبری ج ۲ ص ۱۴۱ ولسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۳)

ابو اسماعیل ہروی کا بیان ہے کہ میں نے یحییٰ بن عمار سے ابوحاتم بن حبان کے بارہ میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ میں نے انہیں دیکھا ہے اور ہم ہی لوگوں نے ان کو سیستان سے جلاوطن کیا تھا، وہ کثیر العلم ضرور تھے مگر ان کا دینی پایہ زیادہ بلند نہ تھا، وہ ہمارے پاس آئے اور اللہ کے بارے میں حد کا انکار کیا تو ہم نے ان کو شہر بدر کر دیا۔

دوسری روایت ہے:

قال ابو اسماعیل الانصاری سمعت عبد الصمد بن محمد یقول سمعت ابی یقول انکروا علی ابن حبان

---

[1] امام مالک نے اس روایت کی اس طرح تخریج کی ہے کہ آپ ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے وہاں حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پہلے سے موجود تھے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھوک سے بے قرار ہو کر اپنے گھروں سے نکلے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: (وانا اخرجنی الجوع) یعنی میں بھی اسی وجہ سے بے چین ہو کر نکلا ہوں، چنانچہ حضرت ابوالہیثم انصاری ان سب کو اپنے گھر لائے اور کھلایا پلایا۔ (موطا امام مالک ص ۱۷۱ اور ۱۷۲، مطبوعہ احمدی پریس دہلی)

Marfat.com

قولہ (النبوۃ العلم والعمل) وحکموا علیہ بالزندقۃ وھجروہ وکتب فیہ الی الخلیفۃ فامر بقتلہ وسمعت غیرہ یقول لذلک اخرج الی سمرقند۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۵ ومیزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ ولسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۳)

ابو اسماعیل انصاری کہتے ہیں کہ میں نے عبدالصمد سے اور انہوں نے اپنے والد محمد سے سنا کہ لوگوں نے ابن حبان کے قول (النبوۃ العلم والعمل یعنی نبوت علم وعمل ہے)[1] کی وجہ سے ان پر نکیر کی ہے، الحاد وزندقہ کا الزام لگایا اور ان سے قطع تعلق کر کے خلیفہ سے ان کی شکایت کی، خلیفہ نے ان کے قتل کا حکم دیا، (ابو اسماعیل کہتے ہیں مگر) میں نے عبدالصمد کے علاوہ دوسرے شخص سے یہ سنا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ جلاوطن کر کے سمرقند بھیج دیئے گئے تھے۔

مذکورہ بالا دونوں روایتوں میں عائد کردہ الزامات کی نوعیت مختلف ہے، پہلی روایت میں ابن حبان کی فضیلت و برتری میں کلام کیا گیا ہے اور دوسری روایت میں ان کے الحاد وزندقہ کا ذکر ہے، اسی طرح دونوں روایتوں میں الزام کے اسباب اور وجہیں مختلف بتائی گئی ہیں، پہلی روایت میں صرف جلاوطنی کا تذکرہ ہے اور دوسری میں اس کے بجائے خلیفہ کی طرف سے قتل کے فرمان کا ذکر ہے، مگر اس سے پتہ نہیں چلتا کہ واقعتاً وہ قتل کیے گئے تھے یا نہیں؟[2] پھر فرمانِ قتل کے بارہ میں خود راوی نے شک وتذبذب ظاہر کر کے روایت کو مشکوک بنا دیا ہے، علاوہ ازیں اس سے اس کا سوئے حفظ اور نسیان بھی ثابت ہوتا ہے۔

ابو اسماعیل انصاری کا زہد وتقدس اور تصوف میں ان کا کمال مسلّم ہے مگر روایت و درایت میں ضبط وتیقظ ثابت نہیں ہے، عموماً صوفیہ روایات کی صحت اور سندوں کی قوت کا زیادہ لحاظ نہیں کرتے علاوہ ازیں وہی تنہا ان دونوں روایتوں کے راوی ہیں ان احتمالات کی موجودگی میں ابن حبان جیسے جلیل القدر محدث کے بارہ میں اتنے اہم اور سنگین الزام کو کیسے صحیح مانا جا سکتا ہے؟ ہروی کی پیدائش اور ابن حبان کی وفات کے درمیان چالیس بیالیس سال کا فرق ہے۔ (طبقات ابن رجب ص ۳۹) اگر یہ الزام کچھ بھی وزنی ہوتا تو اس عرصہ میں پوری طرح مشہور ہو چکا ہوتا اور اس کو بیان کرنے والے متعدد افراد اور ابن حبان کے معاصرین بھی ہوتے کیونکہ ان کا شمار ائمہ حدیث اور جرح وتعدیل کے ماہرین میں ہوتا ہے، اس لیے دوسرے ارباب فن محدثین اور رجال واسناد کے ماہرین ان کے بارہ میں چھان بین ضرور کرتے لیکن اتنے اہم الزام کے بعد بھی ان کی شہرت واہمیت وثوق واعتبار اور عظمت وبلند پائیگی میں فرق نہ آنا اور ان کی ذات کا محدثین اور ائمہ فن کا مرکز توجہ بنا رہنا اور رجال کی کتابوں کا ان کے اقوال سے معمور ہونا اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ان پر الزام ثابت و متحقق نہیں۔[3]

ان روایتوں کے ناقابل یقین ہونے ہی کی بنا پر ان کو بعض ارباب سیر وتذکرہ نے نقل کرنے سے پرہیز کیا ہے اور جن مؤرخین نے ان کو نقل کیا ہے انہوں نے بھی ان پر نقد وتعقب کیا ہے۔

درحقیقت ایسے سنگین الزام محض مشکوک روایتوں کی بنیاد پر تسلیم نہیں کیے جا سکتے جب تک کہ متعدد افراد کے بیانات،

---

[1] اس سے التباس ہوتا ہے کہ ابن حبان کے نزدیک نبوت علم وعمل کا نام ہے یعنی جس میں یہ اوصاف پائے جائیں وہ نبی ہو سکتا ہے گویا نبوت وہبی نہیں کسبی ہے۔

[2] شاہ عبدالعزیز صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قتل نہیں کیے گئے تھے بلکہ بعض ثقہ محدثین نے درمیان میں پڑ کر اس کو رفع دفع کرا دیا تھا۔

[3] (اس سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ بالا روایت میں ابن حبان سے تعلقات اور روایات وغیرہ ترک کرنے کا جو ذکر ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے ممکن ہے ان کے بعض مخالفین نے ان سے روایت کرنا چھوڑ دیا ہو لیکن عام طور سے ثقہ اور معتبر سمجھے جاتے رہے۔

Marfat.com

معاصرین کی شہادتوں اور دوسرے قرائن سے ان کی پوری تصدیق نہ ہو جائے۔

دونوں روایتوں کے اختلاف واضطراب اور ان میں خطاء وتحریف کے احتمالات کو نظر انداز کر کے اگر انہیں صحیح بھی مان لیا جائے تو ابن حبان پر الحاد اور بدعقیدگی کا الزام ثابت نہیں ہوتا اس کی تفصیل یہ ہے:

اوپر گزر چکا ہے کہ پہلی روایت میں الحاد اور بے دینی کا سرے سے کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ اس میں محض ابن حبان کی دینی عظمت وجلالت کے بارہ میں کلام کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے حدوحیز کی نفی کرتے تھے، ظاہر ہے کہ یہ کوئی الحاد اور بے دینی کی بات نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کو بلا حدومکان ماننا ہی اسلامی عقائد کے مطابق اور صحیح نقطہ نظر ہے، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں:

انظر ما اجهل هذا الجارح وليت شعري من المجروح مثبت الحد لله او نافيه۔

ذرا غور کرو کہ یہ جارحانہ الزام لگانے والا بھی کس قدر ناواقف ہے کاش میں بھی جانتا کہ دونوں میں قابل الزام کون ہے؟ آیا وہ جو اللہ کے لیے حد کو مانتا اور ثابت کرتا ہے یا وہ جو اس کی نفی کرتا ہے۔

حافظ صلاح الدین خلیل بن کیکلدی کا بیان ہے:

بالله العجب من احق بالاخراج والتبديع وقلة الدين۔ (طبقات الشافعیہ الکبریٰ ج ۲ ص ۱۴۱، ۱۴۲)

بخدا سخت تعجب ہے آخر جلاوطنی کی سزا بدعت اور دین میں ضعف کے الزام کا کون زیادہ مستحق ہے؟

حافظ ابن حجر نے بڑے صریح الفاظ میں علامہ ابن حبان کے مؤقف کو صحیح قرار دیا ہے، ان کے بیان کا خلاصہ ہے:

''معترض کا یہ کہنا کہ ابن حبان سے کوئی ایسی لغزش سرزد ہو گئی تھی جس کی وجہ سے لوگوں نے ان پر طعن کیا ہے اگر اس سے اس کی مراد پہلی روایت والا قصہ ہے جس میں ابن حبان کی جانب حد کی نفی کی نسبت کی گئی ہے تو دراصل اس میں کوئی لغزش نہیں ہے بلکہ انصاف کی بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں ابن حبان ہی کا موقف برحق ہے۔'' (لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴)

ان اقوال سے ظاہر ہو گیا کہ حد کے مسئلہ میں علامہ ابن حبان کی رائے میں کوئی غلطی اور قابل اعتراض بات نہ تھی بلکہ ان ہی کا نقطہ نظر صحیح تھا، البتہ اس پر اس پہلو سے اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے خواہ مخواہ ایک غیر ضروری مسئلہ کو چھیڑا، کیونکہ محتاط علما اس قسم کے کلامی مسائل میں غور وخوض کو پسند نہیں کرتے، ان کے نزدیک خدائے تعالیٰ کی صفات وغیرہ میں بحث وتدقیق فضول اور لایعنی بات ہے اور ان مباحث میں سکوت افضل اور سوال وتفتیش اور بحث وجستجو بدعت ہے، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

''ابن حبان کا اللہ کے لیے حد ہونے کا انکار کرنا اور تم لوگوں کا اس کے لیے حد کا ثابت کرنا دونوں ہی فضول باتیں ہیں، ان کے متعلق خاموشی افضل واولیٰ ہے، اس لیے کہ نفی واثبات کے بارہ میں کوئی نص وارد نہیں ہے اور اللہ کی شان یہ ہے کہ ''اس کے مانند کوئی چیز بھی نہیں''، پس جو شخص حد کا قائل ہے اس کا مخالف اس سے کہے گا کہ تم نے تو رائے وقیاس سے اللہ کے لیے حد بنائی ہے، اس کے لیے تمہارے پاس کوئی ثبوت اور نص نہیں ہے (نتیجہ کے اعتبار سے اس قول سے اللہ کا محدود ہونا ثابت ہوتا ہے، حالانکہ) محدود مخلوق ہے اور اللہ کی شان اس سے بہت اعلیٰ وارفع ہے مگر حد کو ماننے والا نہ ماننے والے سے یہ کہے گا کہ تم نے تو خداوند کو معدوم

Marfat.com

چیزوں کے برابر کر دیا ہے۔[1] کیونکہ معدوم چیزوں کے لیے کوئی حد نہیں ہوتی، پس ایسی حالت میں جو لوگ اللہ کو منزہ سمجھتے اور ان امور کے بارہ میں خاموشی اختیار کرتے ہیں، وہی سلف صالحین کے متبع ہیں اور انہیں کا طریقہ احتیاط اور سلامتی پر مبنی ہے۔''

(میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ و لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴)

اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ حد کے مثبت و منکر دونوں نے ایک غیر ضروری اور بے سود مسئلہ کو موضوع بنا کر غلطی کا ارتکاب کیا ہے اور ان دونوں کا طریقہ احتیاط و تورع کے منافی ہے، علامہ ذہبی دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''اثبات و انکار دونوں کے قائلین غلطی کرتے ہیں کیونکہ حد کی نفی و ثبوت کے متعلق کوئی نص وارد نہیں ہے، اور آدمی کے حسن اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ لایعنی باتیں چھوڑ دے۔'' (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۵)

اوپر جو لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

1. حد کے بارہ میں ابن حبان کا موقف صحیح اور اسلامی عقائد کے مطابق تھا۔
2. ان کی غلطی اتنی ہے کہ انہوں نے ایک ایسے غیر ضروری اور لاطائل مسئلہ کو موضوع بحث بنایا جس میں سکوت افضل اور بہتر تھا لیکن اس کو عقیدہ کے بگاڑ اور دین میں فتور سے کوئی تعلق نہیں۔

مگر مزید غور و فکر سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن حبان نے بلا ضرورت اس مسئلہ میں کلام نہیں کیا تھا، ذیل میں اس کی توضیح کی جاتی ہے:

بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ مسئلہ صفات میں غور و خوض نامناسب اور خلاف احتیاط ہے لیکن یہ اس صورت میں جب خواہ مخواہ اور بلا ضرورت غور و خوض اور بحث و کلام کیا جائے مگر ضرورۃً اور ناگزیر حالات میں خاموشی کے بجائے اظہار خیال ہی مناسب ہے، علامہ ابن حبان نے ضروری اور ناگزیر حالت ہی میں اس کے متعلق اظہار خیال فرمایا تھا، ان کے زمانہ میں یہ مسئلہ بحث و نظر کا موضوع بنا ہوا تھا اور کچھ لوگ شد و مد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے حد و حیز ثابت کر رہے تھے، اس لیے انہوں نے اس مسئلہ میں اظہار خیال ضروری سمجھا اور وہ بات کہی جو عقائد صحیحہ کے مطابق تھی اس لیے انہوں نے کوئی خلاف احتیاط کام نہیں کیا، خلق قرآن کے مسئلہ میں امام احمدؒ کے طرز عمل میں بھی اس کی مثال ملتی ہے، اس کے بارے میں علمائے حق کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ اس میں بحث و تفتیش فضول، سوال و تجسس بدعت اور خاموشی افضل و اولیٰ ہے، چنانچہ امام بخاریؒ سے جب اس کے متعلق استفسار کیا گیا تو انہوں نے یہی جواب دیا اور خود امام احمدؒ سے بھی جب لوگوں نے عام حالات میں اس کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے اس کو فضول اور لایعنی مشغلہ قرار دیا اور اس میں بحث اور کرید کرنے سے منع کیا۔ (احمد بن حنبل والمحنۃ ص ۳۳) مگر جب معتزلہ کے استیلا و تسلط اور خلفائے عباسیہ کے جبر و تشدد نے اس کو فتنہ کی شکل دیدی تو اس وقت خاموشی کے بجائے انہوں نے اظہار خیال کو ضروری سمجھا اور ابتلاء و آزمائش کی پروا کیے بغیر بڑی جرأت و بے باکی سے یہ اعلان کیا کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے، وہ کسی طرح بھی مخلوق نہیں ہوسکتا، اس کے نتیجہ میں انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں اور سخت قسم کی جسمانی سزائیں برداشت کیں، ابن حبان نے اس اسوہ پر عمل کیا۔

---

[1] حافظ ابن حجر نے اس کی تردید میں لکھا ہے کہ یہ بات قابل تسلیم نہیں ہے کیوں کہ اللہ کے وجود کے تحقق کے بعد ان کے لیے حد کی نفی ان کو معدوم اشیاء کے برابر کر دینا نہیں ہوسکتا۔

Marfat.com

رہی دوسری روایت تو اس میں الحاد و زندقہ کا ضرور ذکر ہے مگر اس کی جو وجہ بیان کی گئی ہے اس سے اس کا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوتا، کفر و ایمان کا معاملہ نہایت نازک ہے، محققین اور علمائے حق کا معمول رہا ہے کہ وہ اس میں ہمیشہ توقف و تامل سے کام لیتے ہیں اور پوری تحقیق کے بغیر الزام عائد نہیں کرتے اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا توجیہ و تاویل سے کام لیتے تھے، محدثین اور نقادانِ فن نے ابن حبان کے بارہ میں بھی اس اصول کو مدنظر رکھا ہے، ان کی توجیہ و تاویل سے یہ الزام پوری طرح رفع ہو جاتا ہے، ذیل میں ان کے اقوال درج کیے جاتے ہیں۔

علامہ ذہبی رقمطراز ہیں:

"دوسرا اعتراض بھی درست نہیں ہے کیونکہ اس کی عمدہ توجیہ ممکن ہے درحقیقت ابن حبان کی مراد مبتدا کو خبر میں محصور و محدود کرنا نہیں ہے جس طرح رسول اکرم ﷺ کے ارشاد (الحج عرفة، یعنی حج عرفہ ہے) کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حج کی ادائیگی کے لیے صرف عرفہ میں قیام کر لینا کافی ہے اور تنہا عرفہ میں قیام سے حج کے تمام ارکان و مناسک ادا ہو جائیں گے، بلکہ آپ کا مقصد حج کے سب سے اہم ضروری اور مقدم رکن کو بیان کرنا ہے، اسی طرح ابن حبان کے قول (النبوة العلم والعمل یعنی نبوت علم و عمل ہے) کا منشا یہ ہے کہ نبوت کی اہم اور ضروری حقیقت علم و عمل میں نبی کا کمال و امتیاز ہے اور کوئی شخص ان میں درجہ کمال کو پہنچے بغیر نبی نہیں ہو سکتا یہ صحیح ہے کہ نبوت وہ مخصوص موہبت الٰہی اور عطیہ ربانی ہے جس کے لیے اللہ اپنے علم و عمل والے بندے کا انتخاب کرتا ہے اس میں آدمی کے کسب اور حیلہ و تدبیر کا کوئی دخل نہیں ہوتا اور نہ وہ ریاضت اور محنت شاقہ سے حاصل کی جا سکتی ہے، اسی سے علم نافع اور عمل صالح کا سرچشمہ پھوٹتا ہے اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ابن حبان کے مذکورہ بالا قول میں کوئی خرابی اور قباحت نظر نہیں آئیگی، البتہ مطلق شکل میں ان سے جو کچھ منقول ہے وہ صحیح نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک فلسفیانہ رائے و خیال کی ہے۔"

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۵)

علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر دونوں نے یہ توجیہ بھی تحریر کی ہے:

"ابن حبان کے اس قول (النبوة العلم والعمل) کی ایک مناسب توجیہ یہ ہے کہ اگر ان کی مراد یہ ہو کہ نبوت کا دار و مدار علم و عمل پر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نبوت و وحی سے اسی شخص کو سرفراز کرتا ہے جو ان دونوں اوصاف سے متصف ہو اور نبی وحی کی وجہ سے علم والا ہوتا ہے اور علم الٰہی عمل صالح کو مستلزم ہے تو اس اعتبار سے ان کا قول صحیح ہے کیونکہ نبوت علم لدنی اور اعمال کا نام ہے جو قربت الٰہی کا ذریعہ ہیں، پس نبوت ان دونوں چیزوں کے بتمام و کمال پائے جانے کا نام ہے اور وحی الٰہی کے بغیر ان دونوں کا بدرجہ کمال حصہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وحی الٰہی ایسا یقینی علم ہے جس میں ظن و تخمین کو دخل نہیں ہوتا مگر غیر انبیا کا علم یقینی کم اور ظنی زیادہ ہوتا ہے، پھر نبوت عصمت کو مستلزم ہے اور انبیا کے علاوہ کسی شخص کے لیے عصمت نہیں خواہ وہ علم و عمل کے کتنے ہی اعلیٰ مدارج اور بلند مراتب کیوں نہ طے کرے، دوسری بات یہ ہے کہ جب کسی چیز کے بارے میں خبر دی جاتی ہے تو وہ اس کے ضروری مقاصد اور اہم اجزا کے لحاظ سے دی جاتی ہے جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ (الحج عرفة یعنی حج تو عرفہ ہے)

تاہم کسی کے لیے اس طرح کی بات مطلقاً اور بلا قرینہ کہنا درست نہیں ہے اور اگر ابن حبان کا مقصد حصر ہو یعنی نبوت صرف علم و عمل ہی کا نام ہے تو بلاشبہ یہ زندقہ اور فلسفیانہ موشگافی ہوگی۔" (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ و لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۳ و ۱۱۴)

ان کے متعلق شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کی تقریر بھی قابل ملاحظہ ہے وہ فرماتے ہیں:

"بگر انصاف کی بات یہ ہے کہ ابن حبان کا یہ قول (النبوة العلم والعمل) عقائد صحیحہ کے چنداں خلاف نہیں، کیونکہ ان کا مطلب یہ نہیں

Marfat.com

تھا کہ نبوت کوئی کسبی چیز ہے جو علم وعمل کی ریاضت سے حاصل ہو سکتی ہے جیسا کہ فلاسفہ کا مذہب ہے بلکہ ان کی غرض یہ ہے کہ نبوت کے لیے انسان میں اس نفس ناطقہ کا پایا جانا لازمی ہے جو علم وعمل میں نمایاں زیادتی رکھتا ہو، اس کے بعد ہی اس کو وہبی طور پر نبوت عطا کی جاتی ہے، قرآن مجید کی اس آیت میں اسی کی جانب اشارہ کیا گیا ہے:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ۔ (انعام: ۱۲۴) اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت ونبوت سے کس کو سرفراز کرے۔

رہا یہ عقیدہ کہ انبیا علیہم السلام کو علمی وعملی استعداد میں دوسرے افراد پر برتری حاصل نہیں ہوتی بلکہ خدا تعالیٰ محض اپنے حکم و فیصلہ سے برابر برابر صلاحیت رکھنے والے لوگوں میں سے کسی ایک شخص کو زبردستی نبوت سے سرفراز کرتا ہے تو یہ بات ہرگز دین و شریعت سے ثابت نہیں ہے۔

یا ابن حبان کا منشا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انبیا علیہم السلام کو نبوت عطا کیے جانے کے بعد علم وعمل دونوں اعتبار سے فوقیت اور برتری حاصل ہو جاتی اس لیے وہ معصوم اور گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں تو یہ ایسی بات ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔"

(بستان المحدثین ص ۴۰)

ان توجیہات سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن حبان کے قول (النبوۃ العلم والعمل) میں بھی الزام واعتراض اور الحاد و بد عقیدگی کی کوئی بات نہیں، زیادہ سے زیادہ اس کو سوءِ تعبیر کہا جا سکتا ہے، البتہ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے بڑے محدث اور ایسی جلیل القدر شخصیت پر محض سوءِ تعبیر کی وجہ سے اتنا بڑا اور ناروا الزام کیوں عائد کیا گیا ہے؟ اس کے مختلف اسباب معلوم ہوتے ہیں۔

۱ ایک سبب یہ ہے کہ ابن حبان علم وفن میں نہایت ممتاز اور بڑے ذہین وطباع شخص تھے، ان کے غیر معمولی کمالات نے بعض لوگوں میں ان کو محسود بنا دیا تھا اور وہ ان کو مطعون ومتہم کرنے کی فکر میں رہتے تھے، ان کے اس قول نے ان کے لیے اس کا موقع فراہم کر دیا اور انہوں نے ان کی تعبیری غلطی سے فائدہ اٹھا کر اور اس کو سیاق وسباق سے جدا کر کے اسے ان کا الحاد و زندقہ قرار دیا حاکم فرماتے ہیں:

"ابوحاتم نہایت عالی مرتبہ تھے، اس بنا پر ان سے حسد کیا جاتا تھا۔" (لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۵)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

"بجز عناد وتعصب کے ان پر اس الزام کے عائد کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی وہ یگانہ روزگار اور غیر معمولی ذہین وطباع تھے ان کا حافظہ بے مثال تھا۔" (ایضاً ص ۱۱۴)

۲ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ فلسفہ وکلام کے ماہر اور فلسفیانہ ومتکلمانہ مذاق رکھتے تھے اور فلسفہ وکلام میں انہماک بعض لوگوں کے عقائد وخیالات میں فساد پیدا کر دیتا ہے۔ اس بنا پر متقشف علما کو ابن حبان سے بدگمانی ہوگئی اور وہ ان پر طعن و تشنیع کرنے لگے، علامہ سیوطی کا بیان ہے کہ "وہ فلسفہ وکلام وغیرہ کے بڑے واقف کار تھے، اس لیے ان پر الحاد و زندقہ کا الزام لگایا جاتا ہے" حالانکہ فلسفہ وکلام سے فسادِ عقیدہ ضروری نہیں ہے، ایسے بہت سے علما ہیں جو ان فنون سے غیر معمولی اشتغال رکھنے کے باوجود دینی حیثیت سے نہایت ممتاز اور بلند تھے، فلسفہ وکلام میں انہماک نے ان کے عقائد میں کوئی خرابی نہیں پیدا کی، اس لیے ابن حبان کے فلسفہ وکلام کی دلچسپی کو بھی ایمان وعقیدہ کے فساد اور بگاڑ کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا

Marfat.com

تا آنکہ اس کا پورا ثبوت موجود نہ ہو۔

ابن حبان پر اتہام والزام کی روایت کرنے والے ابو اسماعیل انصاری ہروی جلیل القدر صوفی اور عارف باللہ تھے، صوفیہ کا ان مسائل میں تشدد مشہور ہے، اس لیے وہ ابن حبان سے ان کے فلسفہ وکلام میں اشتغال کی بنا پر خوش نہ رہے ہوں گے، اس فروگذاشت نے ان کا رویہ اور سخت بنا دیا ہوگا اور انہوں نے ان پر الحاد وزندقہ کا الزام لگا دیا اس لیے یہ الزام درحقیقت ان کے غایت تورع اور تصوف میں غلو کا نتیجہ ہے جو حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔

وفات:

ابن حبان نے جمعہ کا دن گزار کر ۲۴/شوال ۳۵۴ھ کی شب میں اپنے وطن بست میں انتقال کیا، انہوں نے اپنے مکان کے قریب ایک چبوترہ بنایا تھا، اسی میں دفن کیے گئے۔ (لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴ وطبقات الشافعیہ الکبری ج ۲ ص ۱۴۱)

تصنیفات:

امام ابن حبان ان علمائے اسلام میں تھے جن سے بیشمار کتابیں یادگار ہیں، ان کی تصنیفات کیفیت وکمیت دونوں اعتبار سے اہم اور علمائے فن اور محدثین کا عمدہ ماخذ ومرجع ہیں، سمعانی اور حاکم کا بیان ہے کہ ''ابن حبان نے فن حدیث وغیرہ میں بیش قیمت اور عدیم الامثال کتابیں لکھی تھیں'' (کتاب الانساب سمعانی ورق ۸۱ و ۱۷۴) مگر افسوس کہ چند کے علاوہ اکثر تصنیفات اب ناپید ہیں، خطیب نے ان کی بربادی کا ماتم کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ عظیم الشان کتابیں اس لائق تھیں کہ ان کی زیادہ سے زیادہ نقل واشاعت ہوتی، اہل علم ان کو ہاتھوں ہاتھ لیتے، ان کی نقل وکتابت کرتے اور جلدوں میں باندھ کر محفوظ کر دیتے لیکن افسوس کہ امام صاحب کے اہل وطن ان کے مرتبہ فضل وکمال سے ناآشنا تھے اور وہ اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے ان کی اہم اور بلند پایہ تصنیفات کی اشاعت سے غافل رہے۔'' (مقدمہ موارد الظمآن)

جن کتابوں کا علم ہو سکا ہے ان کی فہرست اور بعض کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ کتاب الصحابہ (۵ جزو) ۲۔ کتاب التابعین (۱۲ جزو) ۳۔ کتاب اتباع التابعین (۱۵ جزو) ۴۔ کتاب تبع الاتباع (۷ جزو) ۵۔ کتاب تباع التبع (۲۰ جزو) ۶۔ کتاب الفصل بین النقلیۃ (۱۰ جز) ۷۔ کتاب علل اوہام الزہری (۲۰ جزو) ۸۔ کتاب علل حدیث مالک (۱۰ جزو) ۹۔ کتاب علل اوہام اصحاب التواریخ (۱۰ جزو)۔ ۱۰ کتاب علل مناقب ابی حنیفہ ومثالبہ (۱۰ جزو) ۱۱۔ کتاب علل مااستند الیہ ابو حنیفہ (۱۰ جزو) ۱۲۔ کتاب ماخالف الثوری شعبۃ (۳ جزو) ۱۳۔ کتاب ماانفرد بہ اہل المدینہ من السنن (۱۰ جزو) ۱۴۔ کتاب ماانفرد بہ اہل مکۃ من السنن (۱۰ جزو) ۱۵۔ کتاب ماعند شعبۃ عن قتادہ ولیس عند سعید عن قتادہ (۲۰ جزو) ۱۶۔ کتاب غرائب الاخبار (۲۰ جزو) ۱۷۔ کتاب مااغرب الکوفیون عن البصریین (۱۰ جزو) ۱۸۔ کتاب مااغرب البصریون عن الکوفیین (۱۰) ۱۹۔ کتاب اسامی من یعرف بالکنی (۳ جزو) ۲۰۔ کتاب کنی من یعرف بالاسامی (۳ جزو) ۲۱۔ کتاب الفصل والوصل (۱۰ جزو) ۲۲۔ کتاب التمیز بین حدیث النضر الحدانی والنضر الخزار (۲ جزو) ۲۳۔ کتاب الفصل بین حدیث اشعث بن مالک واشعث بن سوار (۲ جزو) ۲۴۔ کتاب الفصل بین حدیث منصور بن معتمر ومنصور بن زاذان (۳ جزو) ۲۵۔ کتاب الفصل بین مکحول الشامی والازدی (ایک جزو) ۲۶۔ کتاب موقوف مارفع (۱۰ جزو)

Marfat.com

۲۷۔کتاب آداب الرحالۃ (۲جزو) ۲۸۔کتاب ما اسند جنادہ عن عبادۃ (ایک جزو) ۲۹۔کتاب الفصل بین حدیث ثور بن یزید وثور بن زید (ایک جزو) ۳۰۔کتاب ما جعل عبداللہ بن عمر عبیداللہ بن عمر (۲جزو) ۳۱۔کتاب ما جعل شیبان سفیان و سفیان شیبان (۳جزو) ۳۲۔کتاب مناقب مالک بن انس (۲جزو) ۳۳۔کتاب مناقب الشافعی (۲جزو) ۳۴۔کتاب المعجم علی المدن (۱۰جزو) ۳۵۔کتاب المقلین من الحجازیین (۱۰جزو) ۳۶۔کتاب المقلین من العراقیین (۲۰جزو) ۳۷۔کتاب الابواب المتفرقہ (۳۰جزو) ۳۸۔کتاب الجمع بین الاخبار المتضادۃ (۲جزو) ۳۹۔کتاب وصف العدل والمعدل (۲جزو) ۴۰۔کتاب الفصل بین حدثنا واخبرنا (ایک جزو) ۴۱۔کتاب وصف العلوم وانواعہا (۳۰جزو) ۴۲۔کتاب الحجۃ المبتدئین ۴۳۔کتاب حفظ اللسان ۴۴۔کتاب مراعات العشرۃ ۴۵۔کتاب الثقۃ باللہ ۴۶۔کتاب التوکل ۴۷۔کتاب مراعاۃ الاخوان ۴۸۔الفصل بین الغنی والفقر ۴۹۔کتاب السخاوالبذل ۵۰۔کتاب صفۃ الصلوٰۃ (مقدمہ موارد الظمآن ص ۱۵ تا ۱۸ واعلام ج ۳ ص ۸۸۰) ۵۱۔کتاب شعب الایمان۔اس موضوع پر امام بیہقی (۴۵۸ھ) کی کتاب زیادہ مشہور ومتداول ہے لیکن ابن حبان کو اولیت اور تقدم کا شرف حاصل ہے۔ (ایضاً ص ۱۵) ۵۲۔روضۃ العقلاء ونزہۃ الفضلاء، اسلام اور عربوں کے اخلاق وآداب پر یہ عمدہ کتاب ہے اس کا ایک حصہ قاہرہ سے ۱۳۲۸ھ میں شائع ہوا تھا، اس میں مصنف نے اپنی متعدد کتابوں کا ذکر اور حوالہ دیا ہے۔ (ایضاً ص ۱۷) ۵۳۔کتاب التاریخ یہ ضخیم کتاب کئی حصوں میں ہے، اس کا پہلا حصہ مولانا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی کے کتب خانہ میں موجود تھا اس حصہ میں ام ورقہ تک کے واقعات درج ہیں یہ حصہ ۱۲۹۴ھ کا لکھا ہوا ہے۔ (ایضاً ومعارف اکتوبر ۱۹۲۹ء)

۵۴۔کتاب الہدایۃ الی علم السنن، یہ حدیث وفقہ دونوں کی جامع اور عمدہ تصنیف ہے، اس میں ترجمۃ الباب کے بعد حدیث نقل کر کے اس کے اسناد کے تمام ناموں (صحابہ سے لے کر اپنے شیخ تک) کے عام حالات، فضل وکمال، نسبتوں، کنیتوں، قبائل، اوطان اور سنین ولادت ووفات وغیرہ تحریر کیے گئے ہیں، پھر حدیث کی حکیمانہ اور فقہی تشریح کی گئی ہے متضاد و متعارض حدیثوں میں جمع وتطبیق کی صورتیں اور روایات میں کمی بیشی اور فرق واختلاف کی صراحت بھی کی گئی ہے۔
(معجم البلدان ج ۲ ص ۱۷۵)

۵۵۔کتاب الجرح والتعدیل: اس کا نسخہ کتب خانہ ایا صوفیا میں ہے، بعض لوگوں نے اس کو اور کتاب الضعفاء کو جس کا ذکر آگے آرہا ہے، ایک ہی کتاب قرار دیا ہے، اس میں رواۃ کے درجہ ومرتبہ کو واضح کرنے کے لیے وہ تمام اقوال درج کیے گئے ہیں جو ان کے ضعف وجرح یا ضبط وعدل کے بارہ میں اصحاب فن سے منقول ہیں، اس کو کتاب الثقات کا تکملہ بھی بتایا جاتا ہے، عبدالعزیز خولی کا بیان ہے کہ یہ دس جلدوں میں ہے، حافظ ابن حجر کی نظر سے یہ کتاب گزری تھی، لسان المیزان کے مقدمہ میں انہوں نے اس پر نقد بھی کیا ہے۔ (مقدمہ موارد الظمآن ص ۱۵ ومفتاح السنۃ ص ۱۵۲ ومقدمہ لسان المیزان ص ۶)

۵۶۔کتاب الثقات: یہ رجال کی مبسوط، اہم اور شہرۂ آفاق کتاب ہے، اس کی اہمیت کے لیے یہ کافی ہے کہ اس کے بعد رجال میں جو کتابیں لکھی گئیں ان سب میں اس کے حوالے ملتے ہیں، اس کی ابتدا میں سنت واتباع سنت کی اہمیت بیان کی گئی ہے اور مقدمہ میں حدیث کے راویوں کی بتیس ۳۲ قسمیں گنائی گئی ہیں۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۱۷۳ وبستان المحدثین ص ۴۰) اس میں پہلے رسالت مآب ﷺ اور خلفائے راشدین کا تذکرہ ہے اس کے بعد عام صحابہ تابعین وتبع تابعین سے لے کر اپنے عہد

Marfat.com

تک کے علمائے حدیث وروایت کا حروف کی ترتیب کے مطابق ذکر کیا گیا ہے، مصنف نے اس میں صرف ثقات کا ذکر کیا ہے، مگر ان کے نزدیک اس میں قدرے وسعت ہے یعنی جو راوی منکر الحدیث، مجروح اور مدلس نہیں ہے، وہ ثقہ ہے وہ خود فرماتے ہیں:

''اس میں صرف انہی ثقات کا ذکر ہے جن کی روایتوں سے احتجاج جائز ہے، جن راویوں کی بعض لوگوں نے تضعیف کی ہے وہ بھی اس میں شامل کئے گیے ہیں بشرطیکہ وہ میرے معیار کے مطابق ثقہ ہوئے، میں نے اپنے اصول اور معیار کو کتاب الفصل بین النقلیہ میں تحریر کیا ہے جو لوگ اس معیار واصول کے مطابق ضعیف ہیں یا جن کی روایت سے استدلال روا نہیں ہے، میں نے ان کو اس میں شامل نہیں کیا ہے، ان لوگوں کا کتاب الضعفا میں ذکر ہوگا۔'' (فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ ص ۸۱ وتذکرۃ النوادر ص ۹۱)

کتاب الثقات کے قلمی نسخے حیدر آباد کے کتب خانہ آصفیہ اور سعدیہ اور مکتبہ ایا صوفیہ اور مکتبہ سندیہ میں موجود ہیں۔ (تذکرۃ النوادر ص ۹۱)

۵۷۔ کتاب الضعفاء: یہ بھی رجال کی مشہور اور ضخیم کتاب ہے اور اس کو حروف معجم پر مرتب کیا گیا ہے، صاحب شرح الفیہ لکھتے ہیں کہ اس کے مبسوط مقدمہ میں حدیث کے راویوں کی بیس قسمیں بیان کی گئی ہیں، بعض لوگوں نے اس کو اور کتاب الثقات کو مصنف کی تاریخ کبیر کا خلاصہ بتایا ہے جو طلبہ اور معلمین کی سہولت کے لیے انہوں نے خود علیحدہ تیار کیا تھا۔

کتاب الضعفاء کا مختصر، کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں مختصر اسماء المجروحین کے نام سے موجود ہے۔

(ایضاً وکشف الظنون ج ۲ ص ۸۴ وفہرست کتب خانہ آصفیہ ج ۱ ص ۷۸۰ و ۷۸۹)

۵۸۔ صحیح ابن حبان: اس کا نام التقاسیم والانواع بھی ہے، یہ پانچ جلدوں میں ہے، اس کو حدیث کی مشہور اور اہم کتاب خیال کیا جاتا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ نے حدیث کے تیسرے طبقہ کی کتابوں میں اس کا بھی نام لیا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱) اس کی بعض اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:

1. صحیح ابن حبان کی سب سے اہم خصوصیت اس کی صحت ہے، صحیح میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ابن خزیمہ کی کتاب کے بعد اسی کا درجہ ہے، بعض محدثین نے اس کو سنن ابن ماجہ سے زیادہ صحیح روایتوں کا مجموعہ بتایا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ صحیحین کے بعد بہتر اور عمدہ مجموعے ابن خزیمہ اور ابن حبان کے ہیں۔
2. اس کو نہایت دلچسپ انداز اور نرالے ڈھنگ پر مرتب کیا گیا ہے یعنی فقہی ابواب اور مسانید پر احادیث مرتب کرنے کے مشہور اور مروج طریقوں کے بجائے اس کو اقسام وانواع پر مرتب کیا گیا ہے۔
3. ہر حدیث کے آخر میں رجال واسناد کی تحقیق، حدیث کے مفہوم کی تعیین ووضاحت اور اسناد ومتون کی فنی بحثیں اور دوسرے مفید ولطیف معلومات بیان کئے گئے ہیں۔
4. کتاب کے عنوانات سے ابن حبان کی فقہی بصیرت، عالمانہ ژرف نگاہی اور سنت واثر سے مکمل واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

(اعلام ج ۳ ص ۸۰۰، شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۶، الرسالۃ المستطرفہ ص ۹۱ ومقدمہ موارد الظمآن ص ۱۳ و ۱۴)

مختصرات وزوائد:

صحیح ابن حبان کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس کی جانب اعتنا کیا گیا اور اس کے زوائد، اطراف، حواشی اور مختصرات

Marfat.com

ترتیب دیئے گئے۔

1 انواع واقسام پر مرتب کئے جانے کی وجہ سے اس سے استفادہ مشکل اور دشوار تھا اس لیے امیر علاؤ الدین ابوالحسن علی فارسی (م ۷۳۷ھ) نے اس کو فقہی ابواب پر ''الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان'' کے نام سے مرتب کیا، اس میں اصل کی تمام خصوصیات کو برقرار رکھا گیا ہے اسکی پہلی جلد احمد محمد شاکر مرحوم کی تصحیح، تعلیقات اور مقدمہ کے ساتھ دارالمعارف قاہرہ سے بڑے اہتمام کے ساتھ دیدہ زیب ٹائپ اور عمدہ کاغذ پر ۳۱۵ صفحے میں شائع ہوئی ہے۔ (مقدمہ موارد الظمآن ص ۱۴)

2 حافظ ابن حجر نے اس پر مفید حواشی لکھے تھے۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی، از مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارک پوری ص ۱۶۳)

3 ابوالفضل عراقی نے اس کے اطراف لکھے۔

4 سراج الدین عمر بن علی معروف بابن ملقن (۸۰۴ھ) نے اس کو مختصر ابواب پر مرتب کیا۔

5 ابوالحسن نور الدین ہیثمی نے موارد الظمآن الیٰ زوائد ابن حبان کے نام سے اس کے زوائد لکھے، اس میں ان حدیثوں جمع کیا گیا ہے جو صحیحین میں نہیں ہیں اس کا نسخہ مدینہ کے کتب خانہ میں تھا، اس کی مدد سے دارالحدیث مکہ کے مدیر شیخ محمد عبد الرزاق حمزہ نے اس کو ایڈٹ کر کے مطبعہ سلفیہ سے شائع کیا ہے، اس کی ترتیب فقہی ابواب پر ہے، ہیثمی نے صحیحین کی بعض روایتوں سے اس کی عدم مطابقت وفرق اور حواشی میں حدیث کی بعض اور کتابوں سے اس کی روایتوں کی مطابقت دکھائی ہے اور کہیں کہیں راویوں کے ناموں کی تصحیح کی ہے۔

صحیح ابن حبان کے نسخے متعدد کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں اس کی ایک جلد مدینہ منورہ کے کتب خانہ محمودیہ میں بھی ہے، اس پر حافظ ابن حجر کے حواشی بھی ہیں۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۲۳)

ایک شبہ کا جواب:

اوپر جرح میں ابن حبان کے تشدد اور تعدیل میں نرمی کا ذکر کیا جا چکا ہے اسی بنا پر ان پر تساہل کا الزام عائد کیا گیا ہے، مگر یہ مطلق صورت میں قابل تسلیم نہیں ہے، اس لیے اس کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس شبہ اور الزام کی بنیاد ممتاز محدث علامہ نوویؒ کے اس قول پر ہے:

یقارب صحیح الحاکم فی حکمہ صحیح ابی حاتم بن حبان۔ (تدریب الراوی ص ۳۱ و ۳۲)

قریب ترین صحیح حاکم ہی کے حکم میں ابوحاتم ابن حبان کی صحیح بھی ہے۔

عام محدثین کے نزدیک حاکم کا تساہل مشہور ہے اس لیے نووی کے اس بیان سے خیال ہوتا ہے کہ ابن حبان کے یہاں بھی اسی قسم کا تساہل پایا جاتا ہے جس کے لیے حاکم کو شہرت ہے لیکن ارباب فن نے اس قول کی وضاحت میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اس شبہ کی تردید ہو جاتی ہے علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

''اس بیان سے بظاہر حاکم کی کتاب کی ترجیح معلوم ہوتی ہے مگر ایسا واقعتاً نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد حاکم کے تساہل میں ابن حبان کی قربت ومماثلت کا اظہار ہے ابن حبان کی جانب اس کی نسبت اس لیے صحیح نہیں کہ وہ صرف حسن کو صحیح سے موسوم کر دیتے ہیں باقی جن شرطوں کو انہوں نے بیان کیا ہے ان کا پوری طرح لحاظ رکھا ہے اور حاکم کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔''

حافظ ابن حجر رقمطراز ہیں:

Marfat.com

''حاکم کے مقابلہ میں ان کا تساہل کم درجے کا ہے۔''

حازمی کا بیان ہے کہ:

''حاکم سے زیادہ ان کو حدیثوں میں درخور حاصل ہے، اگر ان کی جانب تساہل کی نسبت اس وجہ سے کی گئی ہے کہ ان کی کتاب میں حسن روایتیں موجود ہیں تو یہ بجا ہے کیونکہ انہوں نے اس کو صحیح کے نام سے موسوم کیا ہے لیکن اگر اس سے شرطوں میں تخفیف وتساہل کی جانب اشارہ مقصود ہے تو یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ اپنی صحیح میں انہیں ثقات اور غیر مدلس اشخاص کی حدیثیں بیان کرتے ہیں جنھوں نے اپنے شیوخ سے ان کو اور ان سے روایت کرنے والوں نے ان سے ان کا سماع کیا ہو اور ان میں کسی قسم کا ارسال وانقطاع نہ ہو حقیقت یہ ہے کہ رواۃ کی ثقاہت کے متعلق ان کا ایک خاص نظریہ ہے، اسی کے مطابق کتاب الثقات مرتب کی گئی ہے لیکن اس اصول سے ناواقفیت کی بنا پر ان پر اعتراض کیا جاتا ہے۔'' (مقدمہ موارد الظمآن ص ۱۴)

Marfat.com

امام ابوبکر آجری رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۳۶۰ھ بمطابق ۹۷۰ء)

نام ونسب:

محمد نام، ابوبکر کنیت اور سلسلہ نسب یہ ہے: محمد بن حسین بن عبداللہ۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۸)

ولادت ووطن:

وہ بغداد میں پیدا ہوئے، سن پیدائش کا مؤرخین نے ذکر نہیں کیا ہے، آجری کی نسبت سے زیادہ مشہور ہیں، انساب کے ماہر علامہ سمعانی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیشہ کی جانب نسبت ہے، یعنی وہ اینٹیں بناتے اور ان کو فروخت کرتے تھے۔ (کتاب الانساب ورق ۱۴) لیکن علامہ ابن خلکان نے اس نسبت کے سبب سے لاعلمی ظاہر کی ہے اور کتاب الصلہ کے حاشیہ کے حوالہ سے یہ تحریر فرمایا ہے کہ آجر بغداد کے ایک گاؤں کا نام تھا اور یہ اسی کی جانب نسبت ہے۔ (وفیات الاعیان ج ۳ ص ۲۹۱)

آخر عمر میں مکہ معظمہ میں آباد ہو گئے تھے اور ۳۰ سال تک جوار بیت اللہ میں رہ کر حج بیت اللہ کو آنے والوں اور بلادِ مغرب کے لوگوں کی تشنگی علم بجھاتے رہے، ابن خلکان اور ابن جوزی وغیرہ نے لکھا ہے کہ آجری جب مکہ معظمہ تشریف لائے تو یہ شہر انہیں بہت پسند آیا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس میں ایک سال تک قیام کرنے کی دعا کی، ہاتف غیب نے صدا دی کہ ابو بکر ایک ہی سال کی تمنا کیوں کرتے ہو تم کو تیس سال تک یہاں قیام کرنے کا موقع ملے گا، چنانچہ ان کی حیاتِ مستعار کے بقیہ دن یہیں گزرے اور ۳۰ سال کے بعد جب داعی اجل کا پیام آیا تو وہ اسی کی خاک میں پیوند کئے گئے۔

(وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۹۱ وصفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۲۶۶)

اساتذہ وشیوخ:

ابوبکر آجری کے بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابوشعیب حرانی، ابومسلم ابراہیم بن عبداللہ کجی، احمد بن حسن بن عبدالجبار صوفی، احمد بن عمر بن زنجویہ قطان، احمد بن یحییٰ حلوانی، جعفر بن محمد فریابی، خلف بن عمرو عکبری، قاسم بن زکریا مطرز، مفضل بن محمد جندی، ہارون بن یوسف بن زیاد۔

(تاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۴۳ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۸)

Marfat.com

تلامذہ:

بعض مشہور شاگردوں کے نام حسب ذیل ہیں:

حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی، عبدالرحمن بن عمر بن نحاس، ابوالحسن علی بن محمد عبداللہ بشران سکری، ابوالحسن علی بن احمد بن عمر حمامی مقری، (ان کے بھائی) ابوالقاسم عبدالملک محمد بن حسین بن فضل قطان، محمود بن عمر وعکبری۔

(ایضاً و کامل ابن الاثیر ص ۲۰۴)

حفظ وضبط اور حدیث میں درجہ:

مورخین اور علمائے فن نے بالاتفاق ان کی توثیق کی ہے اور حدیث میں ان کے کمال کا اعتراف کیا ہے، حافظ ذہبی ان کو ''الامام المحدث القدوہ'' لکھتے ہیں، علامہ ابن اثیر کا بیان ہے کہ ''طبرانی اور آجری کبارِ محدثین وحفاظ میں تھے'' خطیب، ابن جوزی اور ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ''وہ ثقہ تھے'' علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ''آجری ثقہ وصدوق تھے'' حافظ ذہبی اور ابن عماد کہتے ہیں کہ ''وہ ثقہ وضابط محدث اور صاحب سنت تھے۔'' (العبر ج ۲ ص ۲۱۸)

فقہ:

فقہ واجتہاد میں بھی آجری کا درجہ بلند تھا اور وہ الفقیہ کے لقب سے موسوم کیے جاتے تھے، اس فن میں کئی کتابیں بھی ان سے یادگار ہیں۔

تدین وتقویٰ:

علم وفضل کی طرح زہد وتقویٰ بھی ان کا شعار تھا، ابن ندیم کا بیان ہے کہ ''وہ صلحائے عباد میں تھے۔'' حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ''وہ عالم باعمل، صاحب سنت اور متبع شریعت تھے۔'' مورخ خطیب اور علامہ سمعانی وغیرہ نے بھی ان کے صلاح وتدین کا اعتراف کیا ہے۔ (الفہرست ص ۳۰۱ و ۳۰۲، تذکرہ ج ۳ ص ۱۴۸ انساب ورق ۱۴)

فقہی مسلک:

گو ان کے شافعی المذہب ہونے پر اتفاق ہے چنانچہ ابن ندیم لکھتے ہیں: وکان علی مذہب الشافعی (وہ امام شافعی کے مسلک فقہ سے وابستہ تھے) لیکن ابن عماد حنبلی کا بیان ہے کہ:

کان حنبلیا وقیل شافعیا وبہ جزم الاسنوی وابن الاھدل۔ (الفہرست ص ۳۰۲ وشذرات الذہب ج ۳ ص ۳۵)

آجری حنبلی تھے مگر یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ شافعی تھے اور اسنوی وابن اہدل نے اسی کو قطعی بتایا ہے۔

وفات:

یکم محرم الحرام ۳۶۰ھ کو مکہ معظمہ میں وفات ہوئی اور یہیں سپرد خاک کیے گئے۔

(ابن خلکان ج ۲ ص ۲۹۱ و تاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۴۳)

Marfat.com

تصنیفات:

امام ابوبکر آجری کثیر التصانیف تھے، فقہ، حدیث اور زہد و رقاق وغیرہ میں انہوں نے متعدد کتابیں لکھی تھیں مگر اب وہ سب نایاب اور معدوم ہیں جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں:

ا۔ کتاب احکام النساء، ۲۔ کتاب مختصر الفقہ، ۳۔ کتاب النصیحۃ: یہ تینوں کتابیں فقہ میں ہیں، ابن ندیم نے ان کا ذکر کیا ہے، ۴۔ کتاب الشریعۃ: یہ سنت و حدیث میں تھی، حاجی خلیفہ نے اس کا نام لکھا ہے۔

۵۔ کتاب الاربعین: یہ امام صاحب کی سب سے مشہور تصنیف ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب کتب حدیث کے طبقات واقسام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اربعینیات میں چالیس حدیثیں ایک باب یا مختلف ابواب میں ایک سند یا متعدد سندوں سے جمع کی جاتی ہیں، اربعینیات بیشمار ہیں۔'' (بستان المحدثین)

حاجی خلیفہ لکھتے ہیں کہ ''اربعینیات کی جمع و تالیف کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں چنانچہ بعض میں توحید و اثبات صفات، بعض میں احکام و عبادات، بعض میں مواعظ و رقاق اور بعض میں فضائل و مناقب کے متعلق روایتیں درج ہوتی ہیں، اربعینیات کے بعض مجموعے صحیح الاسناد اور طعن و قدح سے خالی اور بعض نہایت عالی سندوں اور طویل متن والی حدیثوں پر مشتمل ہیں۔''
(کشف الظنون ج ۱ ص ۶۷ و اتحاف النبلاء المتقین ص ۷)

ابن سبکی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آجری کی اربعین کی سندیں عالی اور بلند تھیں، حاجی خلیفہ اور دوسرے اصحاب فہارس نے اس موضوع کی اکثر کتابوں کے نام لکھے ہیں، اس فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ اربعینیات میں سب سے قدیم مجموعہ یہی ہے گو اس کو نووی وغیرہ کی اربعین جیسی شہرت نہیں ملی تاہم قدامت اور اسناد کی قوت کے اعتبار سے اس کی اہمیت مسلم ہے۔
(ایضاً طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۵۰)

Marfat.com

امام ابوالقاسم طبرانی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۳۶۰ھ)

نام ونسب:

سلیمان نام، ابوالقاسم کنیت اور سلسلۂ نسب یہ ہے: سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر۔

ولادت:

امام ابوالقاسم ماہ صفر ۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۶)

خاندان:

ان کا قبیلہ لخم سے نسبی تعلق تھا، اس لیے لخمی کہلاتے تھے، لخم دراصل یمن کا ایک قبیلہ ہے، اس کی ایک شاخ شام میں آباد ہوگئی تھی، اس قبیلہ سے متعدد نامور لوگ منسوب ہیں، امام صاحب کے والد بزرگوار کو علم وفن سے بڑی دلچسپی تھی، اس لیے وہ اپنے فرزند کو بھی علم کی تحصیل وتکمیل کی تلقین کرتے رہتے تھے۔

وطن:

ان کا اصلی وطن طبریہ ہے مگر آخر عمر میں انہوں نے اصبہان میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، طبریہ اردن کے قریب واقع ہے ۱۳ھ میں شرحبیل بن حسنہ نے اس کو اسلامی سلطنت کے زیرنگیں کیا تھا، اس کی نسبت سے وہ طبرانی کہلاتے ہیں، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ عکا میں پیدا ہوئے یہاں سے طبریہ کی مسافت دو روز میں طے ہوتی تھی۔

(کتاب الانساب ورق ۳۶۶،۴۹۵، ابن خلکان ج ۱ ص ۲۸۳، کتاب المنتظم ج ۷ ص ۵۴ و معجم البلدان ج ۶ ص ۲۳ تا ۲۵)

اساتذہ:

امام طبرانی نے ایک ہزار سے زیادہ باکمال محدثین سے استفادہ کیا تھا، بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن ابی سفیان قیسرانی، ابراہیم بن محمد بن عرق حمصی، ابراہیم بن مؤید شیبانی، ابوزرعہ دمشقی، ابوعبدالرحمن نسائی، ابومسلم کجی، احمد بن انس، احمد بن عبدالرحیم حوطی، احمد بن عبدالقاہر، احمد بن معلی، احمد بن یحییٰ، ادریس بن جعفر عطار، اسحاق بن ابراہیم دبری، ابوعلی اسماعیل بن محمد بن قیراط، بشر بن موسیٰ، حسن بن سہل، حسن بن عبدالاعلیٰ بوسی، حفص بن عمر، عبداللہ بن محمد بن سعید بن

Marfat.com

ابی مریم، علی بن عبدالعزیز بغوی، ابوخلیفہ فضل بن حباب جمحی ابوسعید بن ہاشم بن مرثد طبرانی اور یحییٰ بن ایوب علاف وغیرہ۔
(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۶ وغیرہ)

تلامذہ:

ان کے تلامذہ و منتسبین کی تعداد بھی بے شمار ہے اور ان سے استفادہ کرنے والوں میں ان کے بعض شیوخ بھی شامل ہیں، بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابن عقدہ، ابوبکر بن زبدہ، ابوبکر بن مردویہ، ابواحمد بن عبداللہ بن عدی جرجانی، ابوالحسن بن قادیہ، ابوعمر محمد بن حسین بسطامی، حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ، احمد بن محمد صحاف، حسین بن احمد بن مرزبان، عبدالرحمٰن بن احمد صفا، ابوبکر عبدالرحمٰن بن علی ذکوانی، ابوالفضل محمد بن احمد جارودی، ابوعمر محمد بن حسین بسطامی، محمد بن عبیداللہ بن شہریار۔

امام طبرانی کے حلقہ فیض سے دو صاحب کمال وزرا بھی وابستہ تھے، ان میں ابن عمید لغت و عربیت اور شعر و ادب میں سر آمد روزگار تھا، اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دیلمی حکومت میں اس لیاقت و قابلیت کا کوئی اور وزیر نہیں گزرا اور دوسرا وزیر صاحب بن عباد بھی ممتاز ادیب و انشا پرداز اور امام طبرانی کا شاگرد اور تربیت یافتہ تھا۔
(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۷ و بستان المحدثین ص ۵۵ و کتاب الانساب ورق ۳۶۶)

تحصیل علم کے لیے سفر:

امام طبرانی ۲۷۳ھ میں علم و فن کی تحصیل میں مشغول ہوئے تھے، اس وقت ان کی عمر تیرہ سال تھی، پہلے انہوں نے اپنے وطن طبریہ کے اصحاب کمال سے استفادہ کیا، ۲۷۴ھ میں قدس اور ۲۷۵ھ میں قیساریہ تشریف لے گئے، اس کے بعد انہوں نے دوسرے اسلامی ملکوں کے اہم مقامات اور مشہور مراکز حدیث کا رخ کیا اور حمص، جبلہ، مدائن، شام، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، یمن، مصر، بغداد، کوفہ، بصرہ، جزیرہ، فارس اور اصبہان وغیرہ تشریف لے گئے، اصبہان کی مرکزیت کی وجہ سے یہیں بود و باش بھی اختیار کر لی تھی، علم کی تلاش و جستجو اور احادیث کی تحصیل میں ان کو سخت مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان کے ذوق و شوق اور سرگرمی و انہماک میں کبھی کمی نہیں آئی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

"۳۰ سال تک ان کو بستر پر سونا نصیب نہ ہوا مگر وہ آرام و آسائش کا خیال کیے بغیر حدیث کی تحصیل میں مشغول اور بوریا پر سوتے رہے۔" (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۱۷ و بستان المحدثین ص ۵۵ و کتاب الانساب ورق ۳۶۶ و العبر ج ۲ ص ۳۱۶)

حفظ و ثقاہت:

حفظ و ثقاہت، ضبط اور اتقان میں ان کا مرتبہ بلند تھا، ان کے معاصرین فضلا اور ارباب کمال محدثین نے ان کے حافظہ اور ثقاہت کا اعتراف کیا ہے، علمائے سیر و تراجم نے ان کو الحافظ الکبیر، احد الحفاظ، الحافظ العلم، واسع الحفظ، الحجۃ اور من الثقات الاثبات المعدلین وغیرہ لکھا ہے، ابراہیم بن محمد بن حمزہ کا بیان ہے کہ "میں نے ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں دیکھا۔" ابن خلکان لکھتے ہیں کہ: "وہ اپنے عہد کے ممتاز حافظ تھے" علامہ ابن جوزی رقمطراز ہیں کہ "امام سلیمان کا حافظہ نہایت قوی تھا، صاحب بن عباد ان کے حافظہ کی قوت اور یادداشت کی زیادتی کے معترف تھے۔" ان کے صدق و ثقاہت کے

Marfat.com

بارے میں بھی علمائے فن کا اتفاق ہے، حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ وہ ضبط و ثقاہت اور صدق و امانت کے ساتھ بڑے عظیم رتبہ اور شان کے محدث تھے، احمد بن منصور اور ابن ناصر الدین کہتے ہیں کہ ''وہ ثقہ تھے'' علامہ ابن حجر نے ان کو ثابت و ضابط لکھا ہے، یافعی اور ابن عماد تحریر فرماتے ہیں کہ طبرانی ثقہ و صدوق اور حدیثوں کے علل، رجال و ابواب کے اچھے واقف کار تھے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۶ و ۱۳۰، لسان المیزان ج ۳ ص ۷۳، مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۳۷۲ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۳۰)

حدیث میں درجہ:

امام طبرانی علم و فضل کے جامع اور فن حدیث میں نہایت ممتاز تھے، علامہ ذہبی نے انہیں ''الامام العلامہ اور مسند الدنیا'' اور یافعی و ابن عماد نے ''مسند العصر'' لکھا ہے، ابن ناصر الدین کہتے ہیں کہ وہ مسند الآفاق تھے، ایک دفعہ ابن عقدہ سے ایک اصبہانی شخص نے کوئی مسئلہ دریافت کیا، انہوں نے پوچھا کہ تم نے سلیمان بن احمد لخمی سے سماع کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں ان سے واقف نہیں، ابن عقدہ نے حیرت سے سبحان اللہ کہا اور فرمایا کہ ان کے ہوتے ہوئے تم لوگ ان سے حدیثیں نہیں سنتے اور ہم لوگوں کو خواہ مخواہ دق کرتے ہو میں نے طبرانی کا کوئی مثیل اور نظیر نہیں دیکھا، ابوبکر بن علی کا بیان ہے کہ وہ بڑے وسیع العلم تھے، حدیث میں ان کی وسعت نظر اور کمال کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ احمد بن منصور شیرازی نے ان سے تین لاکھ حدیثیں لکھی تھیں، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ حدیث کی کثرت اور علوئے اسناد میں ان کی ذات نہایت ممتاز تھی اور حدیث میں ان کی بالغ نظری کا پوری دنیائے اسلام میں چرچا تھا شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ حدیث میں وسعت اور کثرت روایت میں وہ یکتا اور منفرد تھے۔ (ایضاً و بستان المحدثین ص ۵۴)

فقہی مذہب:

قیاس ہے کہ امام طبرانی کا فقہی مسلک وہی رہا ہوگا جو محدثین اور ائمہ سنت کا ہے، مولانا عبدالحلیم چشتی نے انہیں شافعی بتایا ہے۔ (فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ ص ۱۸۰)

ابوبکر جعابی سے ایک دلچسپ مناظرہ:

امام طبرانی کے علم و فضل اور حدیث میں عظمت و کمال کا اندازہ اس مناظرہ سے بھی ہوتا ہے جو ان کے اور ابوبکر جعابی کے درمیان ہوا تھا، صاحب بن عباد بیان کرتے ہیں۔

مجھے دنیا میں وزارت سے زیادہ کوئی چیز مرغوب اور عزیز نہ تھی اور میں اس سے زیادہ کسی منصب کو اعلیٰ اور برتر نہیں خیال کرتا تھا، کیونکہ اسی کی بدولت مجھے ہر طرح کا اعزاز اور ہر طبقے میں مقبولیت حاصل تھی لیکن ایک روز میرے سامنے مشہور محدث ابوبکر جعابی اور ابوالقاسم طبرانی میں حدیث کے بارے میں ایک مباحثہ ہوا، حفظ و ضبط میں طبرانی اور ذہانت و فطانت میں جعابی فائق معلوم ہوتے تھے، یہ مباحثہ دیر تک ہوتا رہا، دونوں طرف سے بڑے جوش و خروش کا اظہار اور پرزور آوازیں بلند ہو رہی تھیں، اسی اثنا میں جعابی نے کہا میرے پاس ایک حدیث ایسی ہے جو اور کسی کو معلوم نہیں، طبرانی نے اسے بیان کرنے کے لیے کہا تو انہوں نے فرمایا:

حدثنا ابو خلیفۃ قال حدثنا سلیمان بن ایوب ابو القاسم۔

Marfat.com

ہم سے ابوخلیفہ نے حدیث بیان کی انہوں نے کہا ہم سے سلیمان بن ابوالقاسم نے روایت کی۔

طبرانی نے کہا حضرت سلیمان بن ایوب تو میں ہی ہوں اور ابوخلیفہ میرے شاگرد ہیں اگر آپ اس حدیث کو میرے واسطہ سے بیان کریں تو آپ کی سند زیادہ عالی ہوگی، اس سے بے چارے ابوبکر جعابی بہت نادم ہوئے، ان کی ندامت اور طبرانی کی فتح ومسرت دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ کاش میں طبرانی ہوتا تو آج وہی سرور وانبساط اور غلبہ وکامرانی جو انہیں حاصل ہوئی ہے، مجھے حاصل ہوتی، یہ منظر دیکھ کر میرے دل سے وزارت کی اہمیت جاتی رہی کیونکہ علم وفضل کی بدولت اس سے کہیں بڑھ کر اعزاز واکرام اور جاہ ومرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۹)

بعض مؤرخین نے صاحب بن عباد کے بجائے ابن عمید کی نسبت سے یہ واقعہ تحریر کیا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز نے اس پر کتنا دلچسپ اور بہتر تبصرہ فرمایا ہے وہ لکھتے ہیں:

ایں تمناو آرزوے ہم از بقائے وزارت وریاست او بود والاعلمائے ربانیین راسبب ایں غلبہ ہائے تغیرے نمی شود ونفس ایشاں بحرکت نمی آید ولکن المرء یقیس علی نفسہ۔ (بستان المحدثین ص ۵۵)

صاحب بن عباد کا اس قسم کی آرزو وتمنا کرنا درحقیقت وزارت وریاست ہی کے اثر کا نتیجہ تھا، ورنہ علمائے ربانی کے اندر اس طرح کی فتح وکامرانی کے بعد بھی کوئی عجیب تبدیلی نہیں آتی اور نہ ان کی طبیعتیں اس قسم کے واقعات سے متاثر ہوتی ہیں مگر آدمی دوسروں کو بھی اپنے ہی اوپر قیاس کرتا ہے۔

دینی غیرت وحمیت:

امام طبرانی میں بڑی دینی غیرت وحمیت تھی، ابن جوزی کا بیان ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں نہایت سخت تھے (المنتظم ج ۷، ص ۵۴) ان کو صحابہ کرامؓ سے غیر معمولی محبت وعقیدت تھی، اس لیے ان کی کوئی مذمت اور تنقیص گوارا نہیں کرتے تھے، بعض مصنفین کا بیان ہے کہ وہ پہلی دفعہ اصبہان تشریف لے گئے تو ابوعلی زنیم نے جو زکوۃ وخراج کا عامل تھا، ان کی بڑی آو بھگت کی امام صاحب اس کے یہاں برابر تشریف لے جاتے تھے، اس کی وفات کے بعد اس کے لڑکے نے امام صاحب کے لیے پانچ سو درہم ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا لیکن جب اس نے حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے بارہ میں مخالفانہ رویہ اختیار کیا تو امام طبرانی اس سے سخت آزردہ ہوگئے یہاں تک کہ اس کے یہاں آمدورفت بھی بند کر دی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۸ و ۱۲۹)

اس زمانہ میں قرامطہ اور فرقہ اسماعیلیہ کا بڑا زور واثر تھا، یہ لوگ محدثین سے بڑی کدورت اور سخت عناد رکھتے تھے، ان لوگوں نے امام صاحب کی دینی معاملات میں شدت پسندی کی وجہ سے ان پر سحر کر دیا تھا، اس کی وجہ سے ان کی آنکھوں کی بصارت ختم ہوگئی تھی۔ (بستان المحدثین ص ۵۴)

وفات:

امام طبرانی نے بروز شنبہ ۲۸ / ذوالقعدہ ۳۶۰ھ کو سو سال کی عمر میں انتقال کیا اور ایک صحابی حضرت حمدوسی کے مزار کے پہلو میں دفن کیے گئے، حافظ ابونعیم اصبہانی نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۰ و ابن خلکان ج ۱ ص ۲۱۳ و المنتظم ج ۷ ص ۵۴)

Marfat.com

تصنیفات:

امام طبرانی کثیر التصانیف تھے لیکن قدیم مصنفین کی طرح ان کی بھی اکثر کتابیں محفوظ نہیں، ذیل میں ان کی تصنیفات کے نام اور بعض کے متعلق مختصر معلومات درج ہیں:

۱۔ کتاب الاوائل، ۲۔ کتاب التفسیر، ۳۔ کتاب المناسک، ۴۔ کتاب عشرۃ النساء، ۵۔ کتاب السنۃ، ۶۔ کتاب الطوالات، ۷۔ کتاب النوادر، ۸۔ کتاب دلائل النبوۃ، ۹۔ کتاب مسند شعبہ، ۱۰۔ کتاب مسند سفیان، ۱۱۔ کتاب حدیث الشامیین، ۱۲۔ کتاب الرمی، ۱۳۔ مسند العشرۃ، ۱۴۔ معرفۃ الصحابہ، ۱۵۔ فوائد معرفۃ الصحابہ، ۱۶۔ مسند ابی ہریرہؓ، ۱۷۔ مسند عائشہؓ، ۱۸۔ حدیث الاعمش، ۱۹۔ حدیث الاوزاعی، ۲۰۔ حدیث شیبان، ۲۱۔ حدیث ایوب، ۲۲۔ مسند ابی ذرؓ، ۲۳۔ کتاب الرؤیۃ، ۲۴۔ کتاب الجود، ۲۵۔ العلم الالویہ، ۲۶۔ فضل رمضان، ۲۷۔ کتاب الفرائض، ۲۸۔ کتاب الرد علی المعتزلہ، ۲۹۔ کتاب الرد علی الجہمیۃ، ۳۰۔ مکارم اخلاق العزاء، ۳۱۔ الصلوٰۃ علی الرسول ﷺ، ۳۲۔ کتاب المامون، ۳۳۔ کتاب الغسل، ۳۴۔ کتاب فضل العلم، ۳۵۔ کتاب ذم الرای، ۳۶۔ کتاب تفسیر الحسن، ۳۷۔ کتاب الزہری عن انس، ۳۸۔ کتاب ابن المنکدر عن جابر، ۳۹۔ مسند ابی اسحاق السبیعی، ۴۰۔ حدیث یحییٰ بن کثیر، ۴۱۔ حدیث مالک بن دینار، ۴۲۔ کتاب ماروی الحسن عن انس، ۴۳۔ حدیث ربیعہ، ۴۴۔ حدیث حمزۃ الزیاتؒ، ۴۵۔ حدیث مسعر، ۴۶۔ حدیث ابی سعد البقال، ۴۷۔ طرق حدیث من کذب علی، ۴۸۔ کتاب النوح، ۴۹۔ مسند ابی بجادہ، ۵۰۔ کتاب من اسمہ عطاء، ۵۱۔ کتاب من اسمہ شعبہ، ۵۲۔ کتاب اخبار عمر بن عبد العزیزؒ، ۵۳۔ کتاب اخبار عبد العزیز بن رفیع، ۵۴۔ مسند روح ابن القاسم، ۵۵۔ کتاب فضل عکرمہ، ۵۶۔ کتاب امہات النبیؐ، ۵۷۔ مسند عمارۃ بن غزیہ، ۵۸۔ مسند طلحہ بن مسرف وجماعۃ، ۵۹۔ مسند العبادلہ، ۶۰۔ احادیث ابی عمرو بن العلاء، ۶۱۔ کتاب غرائب مالک، ۶۲۔ جزو ابان بن تغلب، ۶۳۔ جزء حدیث ابن ابی مطر، ۶۴۔ وصیۃ ابی ہریرہؓ، ۶۵۔ مسند الحارث العکلی، ۶۶۔ فضائل الاربعۃ الراشدین، ۶۷۔ مسند ابن عجلان، ۶۸۔ کتاب الاشربۃ، ۶۹۔ کتاب الطہارۃ، ۷۰۔ کتاب الامارۃ، ۷۱۔ مسند ابی ایوب الافریقی، ۷۲۔ مسند زیاد الجصاص، ۷۳۔ مسند زافر، ۷۴۔ حدیث شعبہ، ۷۵۔ کتاب من اسمہ عباد۔[1]

۷۶۔ کتاب الدعا: یہ طبرانی کی مشہور اور ضخیم کتاب ہے، اس کی اہمیت و استناد اور ترتیب کی خوبی کا اندازہ ان کے اس بیان سے پوری طرح ہو جاتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"میری یہ کتاب رسول اللہ ﷺ کی دعاؤں کا مجموعہ ہے، چونکہ میں نے دیکھا کہ اکثر لوگوں نے ان دعاؤں کو اختیار کر لیا ہے جو مسجع عبارتوں میں اور روزمرہ کے لیے وضع کی گئی ہیں، اور ان کو وراقوں (واعظین) نے جمع کیا ہے، یہ خود آنحضور ﷺ یا کسی صحابی اور تابعی سے مروی نہیں ہیں بلکہ آپ سے دعا میں سجع قافیہ بندی اور تعدی کی کراہت وارد ہے، اس لیے میں نے یہ کتاب تالیف کی جو ان دعاؤں پر مشتمل ہے جن کی سندیں رسول اللہ سے منقول ہیں، اس میں پہلے دعا کے فضائل و آداب

---

[1] ان رسائل کا ذکر متفرق کتابوں میں ملتا ہے، مولانا عبد الحلیم چشتی نے عجالہ کے فوائد میں ان کو جمع کر دیا ہے۔ (ص ۸۰ و ۸۱)

Marfat.com

بیان کئے گئے ہیں، پھر آپ جس حال میں جو دعائیں کرتے تھے ان کو علیحدہ علیحدہ ابواب میں درج کیا گیا ہے، اس کے آخری باب میں آیت کریمہ: (ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ) کی تفسیر کی گئی ہے۔'' (بستان المحدثین ص ۵۴)

معاجم ثلاثہ:

امام طبرانی نے معجم میں تین کتابیں لکھیں، یہ ان کی مشہور اور اہم اور حدیث کی بلند پایہ کتابیں سمجھی جاتی ہیں، شاہ ولی اللہ دہلوی نے ان کو حدیث کے تیسرے طبقہ کی کتابوں میں شامل کیا ہے، ان کی بدولت امام طبرانی کو لازوال شہرت ملی۔

معجم کی تعریف:

محدثین کی اصطلاح میں ان کتابوں کو معجم کہا جاتا ہے جن میں شیوخ کی ترتیب پر حدیثیں درج کی گئی ہیں، اس طرح کی بعض کتابوں میں شیوخ کی وفات اور بعض میں ان کے علم و تقویٰ کے تقدم کا لحاظ کیا گیا ہے لیکن عموماً حروفِ تہجی کی تریب کو ملحوظ رکھا گیا ہے، شیوخ کے بجائے صحابہ یا بلاد و امصار کی ترتیب پر بھی معاجم مرتب کیے گئے ہیں۔

۷۷۔ معجم کبیر:

یہ دراصل مسند ہے کیونکہ اس میں صحابہ کی ترتیب پر ان کے مرویات شامل کئے گئے ہیں لیکن اس کی شہرت معجم کے نام سے ہوئی، مشہور اور کثیر الروایت صحابی حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیثیں اس میں شامل نہیں ہیں، طبرانی ان کے مرویات کو علیحدہ ایک کتاب میں جمع کرنا چاہتے تھے لیکن یا تو وہ اسے مرتب نہیں کر سکے یا مرتب کیا تو اس کی شہرت نہیں ہو سکی، ابن عابدین کا بیان ہے کہ یہ بارہ جلدوں میں ہے اور اس میں ساٹھ ہزار حدیثیں شامل ہیں، ابن دحیہ کا بیان ہے کہ کتب معاجم مین سب سے بڑی یہی ہے اور جب محدثین مطلق معجم کہتے ہیں تو ان کی مراد اسی کتاب سے ہوتی ہے لیکن محدثین میں اس کے زیادہ متداول نہ ہونے کی وجہ سے امیر علاؤ الدین علی بلبن (م ۷۳۱ھ) نے اس کی از سر نو تہذیب و ترتیب کی تھی، حافظ ابو الحسن ہیثمی نے اس کے ان مرویات کو جو صحاح میں نہیں ہیں، تین جلدوں میں جمع کیا تھا، مکتبہ شرقیہ دار العلوم پشاور میں اس کا نسخہ موجود ہے۔

(کشف الظنون ج ۲ ص ۴۶۵ و بستان المحدثین ص ۵۳ و الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۱۲ و فہرست مکتبہ شرقیہ دار العلوم پشاور ۷۴)

۷۸۔ معجم اوسط:

اس کو شیوخ کے ناموں پر مرتب کیا گیا ہے، اس میں طبرانی نے اپنے تقریباً ایک ہزار شیوخ کے افراد و غرائب جمع کیے ہیں، محدثین کے نزدیک افراد و غرائب ان حدیثوں کو کہا جاتا ہے جو ایک ہی شیخ کے پاس ہوں اور دوسرے شیوخ ان سے واقف نہ ہوں، یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے میں نفیس، عزیز اور منکر ہر قسم کی حدیثیں شامل ہیں لیکن اس کی ترتیب و تالیف میں امام طبرانی نے بڑی کاوش سے کام لیا تھا، ان کو خود بھی یہ کتاب بہت زیادہ عزیز تھی، اس سے حدیث میں ان کی فضیلت و کمال اور کثرت واقفیت کا پتہ چلتا ہے، اس کے باب میں تفرد ثقہ کا ذکر ہے۔

یہ چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، ابو الحسن ہیثمی نے اس کے زوائد بھی علیحدہ مرتب کیے تھے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۶ بستان المحدثین ص ۵۳ و الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۱۲)

Marfat.com

۷۹۔ معجم صغیر:

یہ سب معاجم میں مختصر ہونے کی وجہ سے زیادہ مقبول اور متداول ہے، اس کی ترتیب بھی شیوخ کے ناموں پر ہے اور اس میں انہوں نے حروفِ تہجی کے مطابق ایک ہزار سے زیادہ شیوخ کی ایک ایک حدیث درج کی ہے، آخر میں بعض خواتین کی بھی حدیثیں ہیں ان کی حدیثوں کی تعداد دو ہزار بتائی گئی ہے لیکن بعض نے ڈیڑھ ہزار بھی کہا ہے، اس کے زوائد بھی ابوالحسن ہیثمی نے علیحدہ مرتب کئے تھے، معجم صغیر کے نسخے کئی کتب خانوں میں موجود ہیں، ۱۳۱۱ھ میں یہ مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی ہے، اس کی بعض خصوصیات ملاحظہ ہوں، اس میں روایت اور راوی کے متعلق مختلف قسم کی تصریحات کی گئی ہیں، مثلاً حدیث کے ضعف وقوت، رفع واتصال تفرد، شہرت اور غرابت، راویوں کے ضبط وثقاہت یا وہم وضعف، کنیت، نسبت، نام، لقب، قبیلہ، وطن اور بعض کے نسب نامے اور روایتوں میں فرق واختلاف اور کمی بیشی کی تصریح کی گئی ہے، جس سن اور مقام پر جو روایت سنی یا لکھی گئی ہے کہیں کہیں اس کی اور بعض راویوں کی صحابیت وتابعیت کا ذکر کیا گیا ہے، بعض روایتوں کے کسی خاص لفظ یا فقرہ کے متعلق یہ وضاحت کردی گئی ہے کہ وہ صرف اسی حدیث میں مذکور ہے، بعض شیوخ کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے فلاں شیخ سے کتنی حدیثیں بیان کیں یا اس نے اور کن مشہور شیوخ سے سنیں یا اس سے کن مشہور اشخاص اور اہم راویوں نے حدیثیں روایت کی ہیں اسی طرح اکثر راویوں کے وہ نمایاں اوصاف بیان کئے گئے ہیں جن سے ان کی زیادہ شہرت ہے۔

۲۔ حدیث کے بارے میں اہل علم کے بیان کردہ مفہوم ومنشاء کو ذکر کرنے کے علاوہ خود بھی کہیں کہیں اس کی مراد واضح کی ہے اور راوی نے حدیث کے بعض الفاظ کی جو وضاحت کی ہے، اس کو اور کہیں کہیں خود بھی مشکل اور غریب الفاظ کے معنی لکھے ہیں۔

۳۔ امام طبرانی نے ائمہ فقہ اور محدثین کے فقہی اقوال اور رائیں بھی نقل کی ہیں اور خود بعض روایتوں کی اس طرح تشریح کی ہے جن سے کسی خاص فقہی مسلک کی تائید اور وضاحت ہوتی ہے، مثلاً ایک حدیث ہے کہ:

عن ابن عباسؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یا بنی عبد مناف یا بنی عبد المطلب ان ولیتم هذا الامر فلا تمنعوا احدا طاف بهذا البيت ان يصلی اية ساعة شاء من ليل ونهار۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے بنی عبد مناف، اے بنی عبد المطلب! اگر تم اس معاملہ کے ذمہ دار ہونا تو خانہ کعبہ کا طواف کرنے والے کسی شخص کو رات اور دن کے کسی حصہ میں نماز پڑھنے سے منع نہ کرنا۔

امام طبرانی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

یعنی الرکعتین بعد الطواف السبع ان یصلی بعد صلاۃ الصبح قبل طلوع الشمس وبعد صلاۃ العصر قبل غروب الشمس وفی کل النهار۔ (معجم صغیر ص ۱۰۲)

آپ ﷺ کی مراد سات پھیرے طواف کے بعد کی دو رکعتوں سے ہے کہ وہ فجر کی نماز کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے اور عصر کی نماز کے بعد غروب سے پہلے اور اسی طرح دن کے ہر حصہ میں پڑھی جاسکتی ہیں یعنی ممنوع ومنہی عنہا اوقات میں بھی ان کو پڑھ لینے میں حرج نہیں ہے۔

۴۔ انہوں نے بعض حدیثوں کے متعلق شبہات کے جوابات دیئے ہیں، مثلاً ایک حدیث ہے کہ:

Marfat.com

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے چار کام کیے اس کو چار چیزیں عطا کی جاتی ہیں، اس کا ذکر کتاب اللہ میں بھی ہے:

ا۔ جس نے اللہ کو یاد کیا اللہ بھی اسے یاد کرتا ہے۔

فَاذْكُرُونِيٓ اَذْكُرْكُمْ (بقرہ: ۱۵۲)

سو مجھے یاد کرو تو میں تمہیں یاد کروں گا۔

۲۔ جس نے دعا کی اس کی دعا قبول کی جاتی ہے، اللہ کا ارشاد ہے:

ادْعُوْنِيٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (مؤمن: ۶۰)

مجھ سے مانگو تو میں تمہیں دوں گا۔

۳۔ شکر کرنے والے پر اللہ مزید فضل وانعام کرتا ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراھیم: ۷)

اگر تم میرا شکر کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ نوازوں گا۔

۴۔ جو اللہ سے استغفار کرتا ہے، اللہ اس کی مغفرت کرتا ہے، اس کا فرمان ہے:

اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا (نوح: ۱۰)

اپنے خداوند سے مغفرت چاہو بلاشبہ وہ بہت بخشنے والا ہے۔

اس حدیث کے سلسلہ میں پہلے انہوں نے بعض لوگوں کے اس شبہ کا ذکر کیا ہے کہ ''ہم لوگ دعائیں کرتے ہیں مگر وہ قبول نہیں ہوتیں'' پھر اس کا جواب یہ دیا ہے کہ:

گویا یہ اعتراض خدا پر ہے کیونکہ اس نے کہا ہے اور یقیناً اس کی بات برحق ہے کہ:

ادْعُوْنِيٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (مؤمن: ۶۰)

مجھے پکارو میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔

نیز:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (بقرہ: ۱۸۶)

اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق پوچھیں تو (انہیں بتاؤ کہ) میں (ان کے) نزدیک ہوں اور پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

مگر اس حقیقت اور مفہوم سے اہل علم اور ارباب بصیرت ہی واقف ہو سکتے ہیں، ایک اور حدیث میں بھی اس کی وضاحت کی گئی ہے، حضرت ابو سعید خدریؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ سے مروی ہے کہ:

ما من مسلم یدعو اللہ بدعوۃ الا استجاب لہ فھو من دعوتہ علی احدی ثلاث اما ان یعجل لہ فی الدنیا واما ان تدخر فی الاخرۃ واما ان یدفع عنہ من البلاء مثلھا۔ (معجم صغیر ص ۲۱۲)

جو مسلمان بھی اللہ سے دعا کرتا ہے اس کی دعا قبول ہوتی ہے، اس کی تین صورتیں ہیں، یا تو دنیا ہی میں کو ملت عطا کی جاتی ہے، یا اس

Marfat.com

کی دعا آخرت کے لیے مؤخر کی جاتی ہے اور ذخیرہ بنتی ہے یا دعا مانگنے والے کی اس طرح کی کوئی مصیبت دفع کر دی جاتی ہے۔

معجم صغیر کے مطبوعہ ایڈیشن میں مختصر تشریحی حواشی بھی شامل ہیں جن میں نسخوں کے فرق و اختلاف متن کی تصحیح، راویوں کے ناموں کی تحقیق، اعراب کی تعیین، لغات کی تشریح، حدیث کے مشکل جملوں کی وضاحت، اختلاف قراءت، ثلاثی حدیثوں کی نشاندہی اور دوسری کتب حدیث سے اس کی حدیثوں کی مطابقت اور غیر مطابقت اور دوسری بحثیں درج ہیں، شارح نے محدثین کے مسلک کی تائید کی ہے، مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا صلوة بعد الصبح حتى تطلع الشمس و لا بعد العصر حتى تغرب الشمس۔ (معجم صغير حواشي ص ۲۲)

اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ فجر اور عصر کے بعد طلوع و غروب آفتاب سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔

''یہ حکم بلا سبب پڑھی جانے والی نفل نمازوں کے بارے میں ہے لیکن فوت شدہ فرائض و نوافل یا کسی وجہ سے پڑھی جانے والی نفل نمازوں کو ان وقتوں میں بھی پڑھنا جائز ہے جیسا کہ متعدد حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے، اس کی تفصیل کے لیے مشہور محدث علامہ شمس الحق عظیم آبادی کے رسالہ اعلام اہل العصر باحکام رکعتی الفجر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔'' (ایضاً حواشی ص ۲۲)

اس مطبوعہ نسخہ کے آخر میں مندرجہ ذیل چار رسالے شامل ہیں۔

۱۔ غنیۃ الالمعی: صاحب عون المعبود مولانا ابو الطیب محمد شمس الحق عظیم آبادی نے اس میں اصول حدیث اور بعض فقہی مسائل کے بارے میں سوالات کا جواب قلمبند کیا ہے۔

۲۔ التحفۃ المرضیہ فی حل بعض مشکلات الحدیثیہ: یہ شیخ حسین بن محسن انصاری (م ۱۳۲۷ھ) کا رسالہ اور امام ترمذی کی بعض اصطلاحوں کی تحقیق پر مشتمل ہے۔

۳۔ رفع الیدین فی الدعاء: یہ علامہ محمد بن عبد الرحمٰن بن سلیمان بن یحییٰ زبیدی یمانی کی تالیف ہے، اس میں فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کو مدلل طور پر مسنون بتایا گیا ہے۔

۴۔ الکشف من مجاوزۃ ہذہ الامۃ الالف: یہ امام جلال الدین سیوطی کا رسالہ ہے، اس میں اس حدیث (ان النبی ﷺ لا یمکث فی قبرہ الف سنۃ) کے متعلق گفتگو کر کے اس کو باطل قرار دیا گیا ہے۔

امام طبرانی پر بعض اعتراضات اور ان کا جواب:

امام طبرانی کی عظمت و جلالت کے باوجود ان پر بعض اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، ذیل میں دو اعتراضات نقل کیے جاتے ہیں:

۱ پہلا اعتراض ان کے تفرد کے بارے میں ہے، اسماعیل بن محمد بن فضل تیمی نے ان کے افراد و غرائب پر مشتمل حدیثوں کو جمع کرنے پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان حدیثوں میں نکارت پائی جاتی ہے اور یہ موضوع اور طعن و قدح سے خالی نہیں ہیں۔

Marfat.com

۴ ان پر وہم وخطا اور نسیان کا بھی الزام عائد کیا گیا ہے، اس کی مثال یہ دی گئی ہے کہ انہوں نے مغازی وسیر کے باب میں مصر کے احمد بن عبداللہ بن عبدالرحیم برقی سے روایت کی ہے، اس نام میں ان کو وہم ہوا ہے، اصل میں راوی احمد کے بجائے ان کے بھائی عبدالرحیم ہیں کیونکہ احمد طبرانی کے مصر جانے سے دس سال پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔

ابن مندہ نے بھی اس کی وجہ سے ان پر طعن کیا ہے اور ابوبکر بن مردویہ نے اسی بنا پر انہیں لین قرار دیا ہے، ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ طبرانی کی جانب سے صاف نہ تھے، ابن مردویہ کی جانب سے خفگی کی ایک وجہ یہ بھی منقول ہے کہ انہوں نے بغداد جا کر جب ان حدیثوں کی تحقیق وتفتیش کی جن کو ان سے طبرانی نے ادریس سے اور ادریس نے یزید بن ہارون سے اور انہوں نے روح بن عبادہ کے واسطہ سے بیان کیا تھا تو انہیں بہت کم حدیثوں کا پتہ چلا، علاوہ ازیں یہ معلوم ہوا کہ اہل بغداد کے نزدیک ادریس کا زیادہ پایہ بلند نہ تھا، اس لیے وہ ان سے زیادہ حدیثیں روایت نہیں کرتے تھے مگر امام طبرانی کے نزدیک ادریس مغتنم لوگوں میں تھے۔

اسی نوعیت کا ایک اور اعتراض حاکم نے علوم الحدیث میں تحریر کیا ہے کہ ابوعلی نیشاپوری امام طبرانی کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، اس کا سبب یہ تھا کہ طبرانی نے شعبہ کی ایک حدیث بیان کی اور کہا کہ یہ ان کو غندر اور شبابہ کے واسطہ سے ملی ہے، ابوعلی نے سوال کیا کہ آپ سے اس کی کس نے روایت کی ہے؟ انہوں نے کہا عبداللہ بن احمد نے اپنے والد سے انہوں غندر اور شبابہ سے، حالانکہ یہ غندر کی حدیث نہ تھی۔ (لسان المیزان جلد ۳ ص ۷۳)

ان اعتراضات کا نمبروار جواب یہ ہے کہ:

۱ امام طبرانی کو طویل عمر ملی اور ان سے بیشمار حدیثیں منقول ہیں، اس لیے ان کے یہاں تفرد کی بھی کثرت ہے لیکن ارباب فن نے ان کے تفرد کو منکر نہیں قرار دیا ہے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ کثرت روایت کی وجہ سے امام طبرانی کے تفرد کو منکر نہیں قرار دیا جاتا، حافظ ابن حجر نے تیمی کے مذکورہ بالا اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

''افراد وغرائب جمع کرنے کا معاملہ صرف طبرانی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، اکثر قدیم محدثین کا یہی حال تھا کہ وہ تفرد کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور اپنی ذمہ داری سے برأت کے لیے احادیث کو ان کی اصل سندوں کے ساتھ بیان کرنے پر اکتفا کرتے تھے۔''

شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

''معجم اوسط افراد وغرائب کا مجموعہ ہے، محدثین کے نزدیک اس میں بہت سی منکر روایتیں ہیں لیکن اس کی حقیقت اور منشایہ ہے کہ غرابت اسی کی مقتضا ہے ورنہ تفرد ثقہ کا جس کو غریب صحیح کہا جاتا ہے، ایک علیحدہ باب ہے۔''

(میزان الاعتدال ج ۱ ص ۴۰ ولسان المیزان ج ۳ ص ۷۳ وبستان المحدثین ص ۵۳)

۲ دوسرے اعتراض میں بعض ناموں کے بارے میں امام طبرانی کے سہو ونسیان کا ذکر ہے، اس کتاب میں یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ وہم ونسیان علمائے فن کے نزدیک مانع ثقاہت اور قابل اعتراض نہیں چنانچہ حافظ ذہبی اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

''یہ زیادہ اہم بات نہیں احمد بن منصور شیرازی فرماتے ہیں کہ ''میں نے ان سے تین لاکھ حدیثیں لکھیں، وہ ثقہ تھے، البتہ مصر کے ایک شیخ سے انہوں نے حدیث لکھی اور غلطی سے اس کو ان کے بجائے ان کے بھائی کی جانب منسوب کر دیا''۔''

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۰)

Marfat.com

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن مردویہ نے جو روایت کی اس کی بنیاد پر بھی طبرانی کو مجروح اور قابل طعن قرار دینا زیادتی ہے،
رہی یہ بات کہ وہ طبرانی کی جانب سے صاف نہ تھے تو یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ وہ خود ان کے حلقۂ فیض سے وابستہ تھے اور ان سے حزم و احتیاط کے ساتھ حدیثیں بھی نقل کرتے تھے، چنانچہ حافظ ابو نعیم نے ان سے پوچھا کہ آپ نے طبرانی سے حدیثیں روایت کی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں میں ان سے احتیاط کے ساتھ روایتیں کرتا ہوں۔ حافظ ضیاء کا بیان ہے کہ ابن مردویہ نے خود اپنی تاریخ میں طبرانی کا ذکر کیا ہے لیکن ان کی تضعیف نہیں کی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ طبرانی ثقہ و ثابت تھے اور ابن مردویہ کے نزدیک بھی ان کی ثقاہت مسلّم تھی۔ (ایضاً)

لیکن اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ ابن مردویہ کو واقعی ان سے بدگمانی تھی تو تنہا ان کی ذاتی رائے کی وجہ سے طبرانی کو ضعیف اور غیر معتبر نہیں قرار دیا جا سکتا۔

ابو علی نیشاپوری کے بیان میں بھی وہم و نسیان کا ذکر ہے، اس کا جواب بھی مندرجہ بالا توضیح سے ہو گیا لیکن حافظ ابن حجر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں طبرانی کو کوئی وہم نہیں ہوا تھا، چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

ابو نعیم نے ابو علی کا تعاقب کرتے ہوئے غندر کی حدیث کو ابو علی بن صواف سے اور انہوں نے عبد اللہ بن احمد سے اسی طرح بیان کیا ہے جس طرح طبرانی نے بیان کیا ہے، اس سے طبرانی کا بری الذمہ ہونا ظاہر ہوتا ہے، حافظ ضیاء نے طبرانی کے دفاع میں ایک رسالہ لکھا تھا، جس میں وہ اس اعتراض کی تفصیل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

لو کان کل من وھم فی حدیث او حدیثین اتھم لکان ھذا لا یسلم منہ احد۔ (لسان المیزان ج ۳ ص ۷۴)

اگر اسی طرح ہر شخص کو محض ایک یا دو حدیثوں میں وہم کی وجہ سے متہم قرار دیا جائے تو کوئی شخص بھی الزام و اعتراض سے بچ نہیں سکتا۔

اس تفصیل سے ان اعتراضات کی حقیقت واضح ہو گئی اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ اگر یہ صحیح بھی ہوں تو ان سے ان کی عظمت و اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

Marfat.com

امام ابو عمرو بن نجید رحمۃ اللہ علیہ

(التوفی ۳۶۵ھ یا ۳۶۶ھ)

نام ونسب:

اسماعیل نام، ابوعمرو کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: اسماعیل بن نجید بن احمد بن یوسف ابن خالد۔

(کتاب الانساب ورق ۳۰۲ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۸۹)

پیدائش، خاندان ووطن:

۲۷۲ یا ۲۷۳ھ میں پیدا ہوئے، عرب کے مشہور قبیلہ سلیم سے خاندانی تعلق تھا، اسی لیے سلمی کہلاتے تھے۔

اساتذہ وشیوخ:

امام ابوعمرو بن نجید نے ابراہیم بن ابوطالب، ابومسلم ابراہیم بن عبداللہ، عبداللہ بن احمد بن علی بن حسین بن جنید، ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم بوشنجی، محمد بن ایوب رازی وغیرہ سے حدیث روایت کی اور جنید بغدادی اور ابوعثمان جیسے اجل صوفیہ سے تصوف کی تعلیم حاصل کی۔

تلامذہ:

جن لوگوں نے ان سے علم ظاہر وباطن کی تحصیل کی تھی ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

ابوحفص بن مسرور، ابونصر احمد بن عبدالرحمن صفار، ابوعبداللہ حاکم، صاعد بن محمد قاضی عبدالقاہر بن طاہر فقیہ، ابوعبدالرحمن محمد بن حسین وغیرہ۔ (ایضاً)

حدیث میں درجہ:

ابوعمرو بن نجید کا روایت وحدیث میں درجہ بلند تھا، علمائے سیر وطبقات نے ان کی کثرتِ روایت، احادیث میں انہماک واشتغال اور ثقاہت کا اعتراف کیا ہے، ابن جوزی، ابن کثیر، شعرانی اور مولانا جامی وغیرہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، حاکم صاحب مستدرک کا بیان ہے (اسند من بقی بخراسان فی الروایۃ) یعنی خراسان کے محدثین میں ابن نجید سب سے زیادہ بلند پایہ اور مستند ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں: در علو اسناد در خراسان مشہور ومشار الیہ آفاق۔

Marfat.com

زہد و تصوف:

وہ عمل، اخلاص اور زہد و تقویٰ میں نہایت کامل تھے، حدیث سے زیادہ ان کو تصوف میں اشتغال تھا اور اسی حیثیت سے زیادہ مشہور بھی ہیں، اس زمانہ کے مشائخ و کبار صوفیہ اور اوتاد و ابدال میں شمار کیے جاتے تھے، مورخین نے ان کو الزاہد العابد، شیخ الصوفیہ اور صاحب احوال و مناقب لکھا ہے، ابن نجید ابو عثمان حیری کے اجل خلفا میں تھے، انہیں خود اپنے مسترشد پر بڑا ناز تھا اور فرماتے تھے کہ ابو عمرو میرے جانشین ہیں، لوگ ان سے محبت کرنے پر میری ملامت کرتے ہیں، حالانکہ ان سے زیادہ کسی کو میرے طریقہ اور مشرب کا علم نہیں، گو وہ جنید و ابو عثمان کے صحبت نشین اور فیض یافتہ تھے لیکن تصوف میں ان کا اپنا خاص طریقہ بھی تھا، مولانا جامی لکھتے ہیں:

''وے را طریقہ خاص بود از تلبیس حال و نگاہ داشت وقت۔'' (نفحات الانس جامی ص ۲۱۶)

انفاق فی سبیل اللہ:

اللہ تعالیٰ نے ان کو علم ظاہر و علم باطن کی طرح دنیوی جاہ و حشمت سے بھی نوازا تھا لیکن ان میں بڑی بے نیازی اور استغنا تھا اور مال و دولت کی حرص و طمع سے ان کا دل پاک تھا، ان کو اپنے والد سے کافی مال و دولت وراثت میں ملی تھی لیکن خود کفاف پر بسر کرتے تھے اور باقی سب خدا کی راہ میں اور علما و مشائخ پر خرچ کر دیتے تھے۔

اخلاص:

دنیا کے ارباب جاہ و حشمت کی طرح ان کو نام و نمود اور شہرت سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ ریاکاری کو سخت ناپسند کرتے تھے، ہر کام خالصتاً لوجہ اللہ کرتے، ان کا اخلاص بے مثال تھا، ایک روز ابو عثمان حیری کو سرحدوں پر مجاہدین کے اخراجات کے لیے کچھ رقم کی ضرورت ہوئی لیکن حاضرین کی تہی دستی کی وجہ سے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی، اس سے ان کا دل بھر آیا، وہ ضبط نہ کر سکے اور رو پڑے، رات میں عشاء کی نماز کے بعد ابو عمرو بن نجید نے دو ہزار درہم کی ایک تھیلی پیش کی، ابو عثمان بہت خوش ہوئے اور ان کے لیے دعائے خیر فرمائی، پھر انہوں نے مجلس میں یہ اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ ابو عمر کو جزائے خیر دے، انہوں نے دو ہزار درہم دے کر میری خواہش پوری کر دی، ابو عمرو نے اسی وقت فوراً مجمع میں کھڑے ہو کر کہا حضرات! میں جو رقم لایا تھا وہ میری ماں کی تھی وہ اسے دینے کے لیے راضی نہ تھیں، اس لیے تھیلی واپس کر دی جائے تاکہ میں اسے لے جا کر اپنی ماں کو دیدوں، چنانچہ ابو عثمان نے تھیلی منگا کر واپس کر دی۔ جب رات کا سناٹا ہوا اور سارا مجمع منتشر ہو گیا تو ابو عمرو نے دوبارہ وہی رقم شیخ کی خدمت میں نذر کی اور کہا آپ اسے اس طور پر خرچ کریں کہ ہمارے علاوہ کسی اور شخص کو اس کی اطلاع نہ ہو، ابو عثمان آبدیدہ ہو گئے اور ان کی بڑی ستائش و تحسین کی۔ (نفحات الانس جامی ص ۱۱۶ کتاب ورق ۳۰۳و۳۰۴ کتاب المنتظم ج ۷ ص ۸۴و۸۵)

حکیمانہ و صوفیانہ اقوال:

ابو عمرو بن نجید سے بڑے حکیمانہ و صوفیانہ اقوال منقول ہیں، چند ملاحظہ ہوں۔

1. بعض سکوت (خاموشی) گفتگو سے زیادہ بلیغ و موثر ہوتا ہے۔

Marfat.com

۲ جو شخص اپنے نفس کو معزز و مکرم سمجھتا ہے اس کا دین اسے حقیر و ہین معلوم ہوتا ہے۔

۳ غیر اللہ سے انسیت رکھنا اصلی وحشت ہے۔

۴ پوچھا گیا کس چیز سے بندہ کو چارہ نہیں، فرمایا سنت کے مطابق بندگی کا التزام اور ہمیشہ دل کی نگرانی و پاسبانی۔

۵ حال اگر علم کا نتیجہ نہ ہو تو صاحب حال کے لیے اس کا ضرر نفع سے زیادہ ہے۔

۶ تصوف امر و نہی کے تحت صبر کرنے کا نام ہے۔

۷ بندہ کے لیے سب سے بڑی آفت اس کا اپنے نفس سے مطمئن ہو جانا ہے۔

۸ جس شخص کو دیکھنے کے بعد تمہاری اصلاح نہ ہو وہ شخص مصلح نہیں ہے۔

۹ آدمی عبادت میں اسی وقت مخلص ہو سکتا ہے جب اس کو اپنے تمام افعال ریا اور تمام احوال و اقوال ادعا معلوم ہوں۔

۱۰ پوچھا گیا، ادعاء کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ فرمایا دھوکا سے، اس کی ابتدا ہی بگاڑ سے ہوتی ہے، جس شخص کی ابتدا صحیح ہو اس کی انتہا بھی صحیح ہوتی ہے اور جس کی ابتدا فاسد ہو وہ کسی وقت ہلاک و برباد ہو سکتا ہے۔

۱۱ ملامتی [1] میں کبھی ادعا نہیں ہوتا کیونکہ اسے اپنے اندر کوئی چیز ادعا کی نظر نہیں آتی۔

۱۲ جب اللہ اپنے بندہ کی بھلائی چاہتا ہے تو اسے صلحا و اخیار کی خدمت و صحبت اور ان کے ارشادات قبول کرنے کی توفیق عطا کرتا ہے اور اس کے لیے نیکیوں کی راہیں آسان کر دیتا ہے۔

۱۳ عام مسلمانوں کا احترام کرو اور غیر ممکن کام کے درپے نہ بنو، سب سے اپنے کو حقیر سمجھو جس قدر تمہارا تعلق لوگوں سے زیادہ ہو گا اسی قدر خدا کے احکام میں تمہارا حصہ کم ہو گا۔

۱۴ جو شخص نفع و ضرر نہ پہچاننے والے کے سامنے اپنے محاسن ظاہر کرتا ہے وہ در اصل جہل کا اظہار کرتا ہے۔

۱۵ جو شخص واقعتاً درست ہو گیا، اسے کوئی بگاڑ نہیں سکتا اور جو کج ہو گیا اسے کوئی سیدھا نہیں کر سکتا۔

(الرسالۃ القشیریہ ۲۴ ص طبقات شعرانی ص ۱۰۳ نفحات الانس ص ۲۱۶)

وفات:

سن وفات میں اختلاف ہے، ربیع الاول ۳۶۵ھ اور ۳۶۶ھ کی روایتیں ملتی ہیں، صاحب الرسالۃ القشیریہ نے تصریح کی ہے کہ مکہ معظمہ میں اور بعض مورخین کے بیان کے مطابق ۹۳ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

(کتاب الانساب ورق ۳۰۲ المنتظم ج ۷، ص ۸۴ طبقات شعرانی ص ۱۰۲، الرسالۃ القشیریہ ص ۲۴)

اولاد و احفاد:

اولاد و احفاد میں ایک نواسہ ابو عبد الرحمن محمد بن حسین بن محمد بن موسیٰ سلمی کا ذکر ملتا ہے جو بڑے صاحب کمال بزرگ اور بلند پایہ صوفی تھے، تصوف میں ان سے کئی کتابیں یادگار ہیں، ان کی سب سے مشہور کتاب طبقات الصوفیہ ہے، یہ صوفیہ

---

[1] (یہ صوفیہ کا اصطلاحی لفظ ہے، اس کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں، مولانا جامی لکھتے ہیں، الملامتی ھو الذی لا یظھر خیرا و لا یضمر شرا (نفحات الانس) یعنی ملامتی وہ شخص ہے جو اپنی نیکی کا اظہار اور برائی کو پوشیدہ نہیں رکھتا)۔

Marfat.com

کے حالات پر مشتمل اور قاہرہ سے چھپ چکی ہے، مولانا جامی کی نفحات الانس کا اصل ماخذ یہی کتاب ہے، تفسیر میں بھی ایک کتاب لکھی تھی جس میں صوفیانہ نقطہ نگاہ سے قرآن کی تفسیر کی گئی ہے، حدیث سے بھی اشتغال تھا، مرو، نیشاپور، عراق وحجاز کے علماء سے حدیثوں کی تحصیل کی تھی لیکن محدثین نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے، امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ یہ صوفیہ کی مفید مطلب حدیثیں وضع کرتے تھے۔ (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۴۶) ۳/شعبان ۴۱۲ھ کو انتقال ہوا اور نیشاپور میں اپنی خانقاہ کے اندر دفن کئے گئے۔

تصنیفات:

ان کی تصنیفات میں صرف جزء ابن نجید کا ذکر ملتا ہے لیکن اس کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں ہوسکا، جزء کتب حدیث کی ایک قسم ہے، محمود محمد خطاب سبکی لکھتے ہیں:

الجزء یطلق علی ماھو اعم من الجامع والمسند وقد یطلق علی ما الف فی نوع خاص۔

جزء کا اطلاق اس کتاب پر ہوتا ہے جو جامع اور مسند دونوں سے عام ہوتی ہے اور کبھی اس پر بھی ہوتا ہے جو کسی خاص موضوع پر تالیف کی جاتی ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"جزء حدیث کی اس کتاب کو کہا جاتا ہے جس میں صرف ایک خاص شخص کی بیان کردہ حدیثوں کو جمع کیا جاتا ہے، چاہے وہ شخص صحابہ کے طبقہ سے ہو یا ان کے بعد کے طبقہ سے مثلاً جزء حدیث ابوبکر و جزء حدیث مالک۔"

اس قسم کا بھی محدثین میں بڑا رواج ہے، کبھی ایسا کرتے ہیں کہ جامع میں مذکور آٹھ موضوعوں [1] میں کسی خاص موضوع کو اختیار کر لیتے ہیں اور اس پر ایک نہایت مبسوط کتاب مرتب کرتے ہیں چنانچہ باب النیۃ پر ابوبکر بن ابی الدنیا نے ایک مبسوط کتاب لکھی تھی، علی ہذا القیاس مذکورہ بالا آٹھ مطالب میں سے ہر ہر موضوع پر مستقل اور جداگانہ رسالے لکھے گئے ہیں جن کا احاطہ وشمار دشوار ہے، حافظ ابن حجر اور علامہ سیوطی کی تصانیف میں رسالوں کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔

(عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۱۶ اور ۱۰۳)

---

[1] (جوامع میں حسب ذیل موضوع سے متعلق احادیث ہوتی ہیں عقائد، احکام، رقاق، آداب، تفسیر، تاریخ وسیر فتن وملاحم، فضائل ومناقب)

Marfat.com

امام ابوبکر اسماعیلی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۳۷۱ھ)

نام ونسب:

احمد نام، ابوبکر کنیت، اسماعیلی نسبت اور سلسلہ نسب یہ ہے: احمد بن ابراہیم بن اسماعیل بن عباس بن مرداس۔
(کتاب الانساب ورق ۳۶، تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹، طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۷۹)

پیدائش، خاندان اور وطن:

وہ امام بخاری کی وفات کے اکیس سال بعد ۲۷۷ھ میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان علمی حیثیت سے ممتاز تھا، ان کے بعد اس میں متعدد فضلا اور ارباب کمال گزرے، (ایضاً و بستان المحدثین ص ۳۷) ان کا وطن جرجان تھا۔

شوقِ علم اور طلب حدیث کے لیے سفر:

علم وفن سے ان کو فطری مناسبت تھی، بچپن میں لوگ عموماً پڑھنے لکھنے سے بیزار ہوتے ہیں لیکن اسماعیلی کو اسی زمانہ میں اس سے دلچسپی ہوگئی تھی، چھ سال کی عمر میں یعنی ۲۸۳ھ میں انہوں نے حدیثوں کی تحریر وکتابت شروع کردی تھی، اور ۲۸۹ھ میں باقاعدہ اس فن کی تحصیل میں مشغول ہوگئے تھے، اسی زمانہ میں وہ اس مقدس اور مبارک علم کی تحصیل کے لیے اپنے وطن سے نکل جانا چاہتے تھے، مگر ان کی کمسنی کی وجہ سے ان کے اعزہ نے سفر کی اجازت نہیں دی اور جب ان کا شوق اور اصرار حد سے بڑھ جاتا تو وہ لوگ مختلف حیلوں اور بہانوں سے انہیں باز رکھنے کی کوشش کرتے، ایک دن ان کو اس زمانہ کے مشہور محدث محمد بن ایوب رازی کی موت کی اطلاع ملی تو ان کا عجیب حال ہوگیا، وہ گھر سے باہر آکر رونے دھونے، چیخنے چلانے لگے، کپڑے چاک کرنے اور سر پر خاک ڈالنے لگے، یہ کیفیت دیکھ کر ان کے تمام اعزہ جمع ہوگئے اور اس کا سبب دریافت کیا، اسماعیلی نے کہا آج دنیا ایسے عظیم المرتبت اور صاحب کمال شخص سے خالی ہوگئی، آپ لوگوں کی بندشوں اور رکاوٹوں نے مجھے اس کے فیوض و برکات سے متمتع نہیں ہونے دیا، اعزہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، اب بھی خدا کے فضل سے بہت سارے نامور علماء و مشائخ اور اساطین فن موجود ہیں، یہ حالت دیکھ کر اب ان کو سفر سے مزید روکنا مشکل تھا، اس لیے ان کے ماموں کو ان کے ہمراہ کردیا گیا، اس طرح وہ پہلی مرتبہ ۲۹۴ھ میں ابوالحسن بن سفیان کی خدمت میں نسا تشریف لے گئے، ان کا خود بیان ہے کہ یہ سفر میں نے اس وقت کیا تھا جب نہ تو میری مسیں بھیگی تھیں اور نہ داڑھی کے بال نکلے تھے، ۲۹۶ھ میں بغداد گئے، اس سفر میں بھی ان کا کوئی عزیز ان کے ساتھ تھا، پھر حجاز، عراق، فارس، کوفہ، بصرہ، انبار، موصل، جزیرہ، نیشاپور وغیرہ

Marfat.com

تشریف لے گئے، نیشاپور کئی بار تشریف لے گئے۔

(کتاب الانساب ورق ۳۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۰)

اساتذہ وشیوخ:

جس شخص کے شوق وجستجوئے علم کا یہ حال رہا ہو اس کے اساتذہ وشیوخ کی تعداد وشمار نہیں کی جاسکتی، بعض نامور محدثین اور ارباب کمال کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن زہیر حلوانی، ابراہیم بن عبداللہ مخرمی، ابویعلی احمد بن علی بن مثنیٰ موصلی، احمد بن محمد بن مسروق، بہلول بن اسحاق تنوخی انباری، جعفر بن محمد فریابی، حسن بن سفیان شیبانی، حمزہ بن محمد بن عیسیٰ کاتب، عبداللہ بن ناجیہ، عبدان بن احمد عسکری، عمران بن موسیٰ سختیانی، ابوخلیفہ فضل بن حباب جمحی، ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ، محمد بن حسن بن سماعہ، ابوجعفر محمد بن عبداللہ بن سلیمان حضرمی، محمد بن عثمان بن ابی شیبہ، شیخ زاہد محمد بن عثمان مقابری، محمد بن یحییٰ بن سلیمان مروزی، یحییٰ بن محمد حنائی، قاضی یوسف بن یعقوب۔ (ایضاً)

تلامذہ:

ان کے تلامذہ میں اس دور کے ائمہ اور نامور فضلا شامل تھے، بعض کے نام یہ ہیں:

ابوالقاسم عبدری، ابوبکر بن محمد بن غالب برقانی، حسین بن محمد باسانی، حمزہ بن یوسف سہمی صاحب تاریخ جرجان، ابوعمرو عبدالرحمن بن ؂ محمد فارسی، عبدالواحد بن منیر معدل، ابوجعفر محمد بن احمد حجاجی، ابوبکر محمد بن ادریس جرجانی، ابوعبداللہ محمد بن عبد اللہ حاکم، ابوعلی محمد بن علی بن سہل، ابوالحسن محمد بن علی طبری۔

حفظ وضبط:

حفظ وضبط میں ممتاز اور مشہور حفاظ میں شمار کیے جاتے تھے، بہت ساری کتابیں ان کو زبانی یاد تھیں۔ حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ میں ان کے کمال حفظ سے مبہوت ہو گیا اور میرا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ متقدمین کے علم وحافظہ کا متاخرین مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ضبط و احتیاط کا یہ حال تھا کہ فن حدیث میں غیر معمولی امتیاز اور امام فن ہونے کے باوجود انہوں نے مستقل کتاب لکھنے کے بجائے مستخرج بخاری لکھنے پر اکتفا کیا۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ وہ رفع اسناد اور علوئے تفرد میں ممتاز تھے۔ (تذکرہ ج ۳ ص ۱۶۰ و ۱۶۱)

حاکم کا بیان ہے کہ ان کے ضبط وثقاہت میں کوئی اختلاف نہیں کیا گیا ہے۔

حدیث میں درجہ:

اسماعیلی منقولات کے متبحر عالم اور کامل الفن محدث تھے، وہ حدیث میں امام، مرجوع اور مقتدیٰ کی حیثیت رکھتے تھے، حاکم نے ان کو شیخ المحدثین اور امام اہل جرجان کہا ہے، ان کی عظمت وبلند پائیگی کا یہ عالم تھا کہ امام دارقطنی جیسے صاحب کمال اور جلیل القدر محدث نے کئی بار ان کی بارگاہ فضل وکمال میں حاضر ہونے کا قصد کیا لیکن مقدور نہ ہوسکا اور زندگی بھر اپنی اس محرومی

؂ یہ اسماعیلی کے نواسے تھے۔ (تذکرہ ج ۳ ص ۱۵۹)

Marfat.com

پر حسرت و افسوس ظاہر کرتے رہے، حافظ حسن بن علی فرماتے ہیں کہ اسماعیلی اس پایہ کے محدث تھے کہ حدیث و سنن میں مستقل کتابیں لکھتے مگر انہوں نے مستخرج مرتب کرنے پر اکتفا کیا، ان کو اکثر کتابیں ازبر تھیں اور اللہ تعالیٰ نے علم وافر اور ذہن رسا سے نوازا تھا۔ (تاریخ جرجان ص ۷۰ و کتاب الانساب ورق ۳۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۰، ۱۶۰)

مسند درس:

اسماعیلی کے حدیث میں کمال کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علم کی تکمیل کے بعد جب وہ مسند درس پر رونق افروز ہوئے تو انکو بڑا عروج نصیب ہوا اور انکے درس میں طلبہ و مستفیدین کا جم غفیر شریک ہوتا تھا، حمزہ سہمی اور علامہ سمعانی نے روزانہ کے شرکا کی تعداد چالیس اور پچاس.... کے لگ بھگ بتائی ہے، یہ لوگ اسماعیلی کی زبان سے جو بات نکلتی تھی اس کو قلمبند کر لیتے تھے۔
(تاریخ جرجان ص ۷۰ و کتاب الانساب ورق ۳۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ و ۱۶۰)

فقہ و اجتہاد:

وہ فقہ و اجتہاد میں بھی صاحب کمال اور امام و مقتدیٰ سمجھے جاتے تھے، علامہ سمعانی لکھتے ہیں کہ اسماعیلی اہل جرجان کے امام اور فقہ و حدیث میں مرجع تھے، حاکم نے انہیں شیخ المحدثین والفقہا کہا ہے، ان کے صاحبزادے ابو سعید اور بعض علمائے جرجان نے فقہ کی ان سے تحصیل کی تھی۔

قراءت:

فن قراءت میں اسماعیلی کو مہارت اور اچھی دستگاہ تھی، ابو الحسن محمد بن مظفر نے قراءت میں ان کی جودت کا اعتراف کیا ہے، حمزہ سہمی فرماتے ہیں کہ وہ ہر مجلس میں پیش پیش رہتے تھے، ان کے سامنے کسی کو قراءت کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، ابو القاسم بغوی کا بیان ہے کہ میں نے ان سے بہتر قاری نہیں دیکھا۔ (ایضاً)

تدین و اخلاق:

اسماعیلی متدین اور ستودہ صفات تھے، حاکم نے ان کی مروت و سخاوت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور حمزہ سہمی کا بیان ہے کہ وہ اپنے والدین کے نہایت مطیع اور فرمانبردار تھے، ان کے طرز عمل سے ان کے والدین اس قدر خوش تھے کہ ہمیشہ ان کے لیے خیر و برکت کی دعا کرتے رہتے تھے۔ (ایضاً)

دولت و ثروت:

اللہ تعالیٰ نے ان کو علمی و دینی کمالات کی طرح مال و دولت کی فراوانی اور دنیوی جاہ و منزلت سے بھی نوازا تھا، مورخین کا بیان ہے کہ وہ دینی و دنیاوی وجاہت اور ہر قسم کی خوبیوں کے جامع تھے۔
(تاریخ جرجان ص ۷۰ و کتاب الانساب ورق ۳۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ و ۱۶۰)

Marfat.com

شہرت ومقبولیت:

ان کو بڑی شہرت اور غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی، وہ امام اور مرجع خلائق تھے، درس میں حاضرین کی بڑی تعداد ہوتی تھی، جو نہایت عقیدت کے ساتھ ان کا ایک ایک لفظ نقل کرتے تھے، ابن فرات کا بیان ہے کہ:

لقد رزق من العلم والجاہ والصیت الحسن۔

ان کو علم وجاہ اور اچھی شہرت نصیب ہوئی۔

بغداد میں جب ان کی موت کی خبر ہوئی تو اکابر محدثین اور فقہاء نے کئی دنوں تک جمع ہو کر ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔
(تاریخ جرجان ص ۷۰، ۷۱، وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۶۰)

فقہی مسلک:

اسماعیلی شافعی المذہب تھے اور شوافع کے ائمہ میں خیال کئے جاتے تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ وہ اپنے خطہ کے اکابر شافعیہ میں تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹)

کلامی عقائد:

وہ اہل سنت والجماعت اور محدثین کے ہمنوا تھے، اس لیے ان کے اعتقادات بھی وہی تھے، ان کے بعض کلامی عقائد یہ ہیں:
اہل حدیث کا مسلک یہ ہے کہ اللہ اس کے ملائکہ، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کا اقرار کیا جائے، کتاب اللہ اور صحیح حدیثوں کے منطوق کو قبول کیا جائے اور ان سے انحراف نہ کیا جائے، محدثین کا عقیدہ ہے کہ اللہ کو اس کے اچھے ناموں سے پکارنا اور ان صفتوں سے متصف ماننا چاہیے جن سے اس نے اور اس کے رسول نے اس کو متصف کیا ہے، مثلاً اللہ نے آدم کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اس کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں، وہ عرش پر متمکن ہے وغیرہ، ان ساری باتوں کو محض تسلیم کرنا ضروری ہے، ان کی حقیقت اور کیفیت معلوم کرنے کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۶۰ و ۱۶۱)

وفات:

عام مورخین کے بیان کے مطابق ۹۴ سال کی عمر سنیچر کے دن غرہ رجب ۳۷۱ھ میں انتقال ہوا اور اتوار کو تدفین ہوئی، ان کے صاحبزادے ابونصر نے جنازہ کی نماز پڑھائی، ابن سبکی اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے کہ صفر ۳۷۱ھ میں وفات پائی۔
(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۶۰، ۱۶۱، وتاریخ جرجان ص ۶۹ کتاب الانساب ورق ۳۶ المنتظم ص ۱۰۸ طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۰)

اولاد:

انتقال کے وقت پانچ اولادیں تھیں، تین لڑکیاں اور دو لڑکے، ایک لڑکے کا نام ابونصر محمد اور دوسرے کا ابوسعد اسماعیلی تھا، دونوں علم وفضل میں اپنے والد کے جانشین تھے، ابونصر اپنے والد کی موجودگی ہی میں مسند درس پر فروکش ہو چکے تھے اور دوسرے صاحبزادے ابوسعد اپنے زمانے کے ممتاز فقیہ اور صاحب علم خیال کئے جاتے تھے۔ (تاریخ جرجان ص ۷۴)

Marfat.com

تصنیفات:

امام اسماعیلی کی جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ مسند عمر: یہ دو جلدوں میں تھی اور حافظ ذہبی کی نظر سے گزری تھی، انہوں نے اسکی تعلیق بھی لکھی تھی۔ (بستان المحدثین ص ۳۸)

۲۔ مسند کبیر: یہ نہایت ضخیم کتاب اور تقریباً سو جلدوں پر مشتمل تھی، مگر اس کو زیادہ شہرت نہیں ملی۔

۳۔ مستخرج: اس کا نام صحیح اسماعیلی بھی ہے، یہ صحیح بخاری پر مستخرج ہے۔[1] حافظ ابن کثیر کے اس بیان سے اس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے، وہ فرماتے ہیں: کہ انہوں نے صحیح بخاری پر مستخرج لکھا، یہ بیشمار فائدوں اور معلومات پر مشتمل ہے۔

حافظ ابن حجر نے اس کا انتخاب کیا تھا، جو مشتی ابن حجر کے نام سے مشہور ہے، اسماعیلی نے بخاری کی تعلیقات کو یکجا کر دیا تھا لیکن حافظ نے ان کا جدا جدا ذکر کیا ہے۔ (بستان المحدثین ص ۳۷)

۴۔ معجم: اسماعیلی کی یہ اہم تصنیف ہے، اس کے متعلق حافظ ابن حجر نے مصنف کے حوالہ سے مجمع المؤسس میں یہ تصریح نقل کی ہے۔

میں نے جن شیوخ سے حدیثیں سنیں اور لکھی ہیں یا جن کے سامنے قراءت کی ہے ان کے ناموں کے حصر اور حروف معجمہ پر تخریج کے متعلق اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا تا کہ طلبہ کو اس سے سہولت ہو اور ناموں میں التباس و اشکال کے وقت وہ اس کی جانب رجوع کر سکیں، ہر شیخ کی صرف ایک ہی حدیث نقل کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے، اس کا مقصد فی الواقع مفید حدیثوں کو جمع کرنا ہے، جن راویوں کی طرف میرے خیال میں کذب و اتہام یا عام محدثین سے تفرد کی بنا پر ناپسندیدہ ہیں، ان کی حقیقت اس میں اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے لیکن جن لوگوں کا قدح و طعن بالکل واضح اور ظاہر ہے، ان کی حدیث کی تخریج کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، میں نے تیمناً و تبرکاً اس کو احمد کے نام سے شروع کیا ہے اور جمادی الاولیٰ ۳۶۱ھ میں اس کی جمع و تالیف کی ابتدا کی ہے۔
(بستان المحدثین ص ۳۷ و اتحاف ابتلاء المتقین ص ۱۵۷)

---

[1] مستخرج کی تعریف کے لیے ملاحظہ ہو تذکرۃ المحدثین ج ۱ آخری صفحات۔

Marfat.com

امام ابوالحسن دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۳۸۵ھ)

نام ونسب:

ابوالحسن کنیت، علی نام اور نسب نامہ یہ ہے: علی بن عمر بن احمد بن مہدی بن مسعود بن نعمان بن دینار بن عبد اللہ۔
(تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴ کتاب الانساب ورق ۲۱۷، المنتظم ج ۷ ص ۸۳)

ولادت ووطن:

صحیح روایت کے مطابق امام دار قطنی ۵ / ذوالقعدہ ۳۰۶ھ کو بغداد کے ایک محلہ دار قطن میں پیدا ہوئے، یہ محلہ کرخ اور نہر عیسیٰ بن علی کے درمیان واقع اور متعدد اکابر کا مولد تھا لیکن بعد میں ویران ہوگیا، علامہ سمعانی کے بغداد تشریف لانے کے زمانہ میں یہ اجڑ چکا تھا۔ (ایضاً وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۹۹)

اساتذہ:

امام صاحب کے بعض مشہور شیوخ واساتذہ کے نام یہ ہیں:

قاضی ابراہیم بن حماد، ابن درید، ابن زیاد نیشاپوری، ابن نیروز، ابوبکر بن ابی داؤد سجستانی، ابوحامد بن ہارون حضرمی، ابوسعید عدوی، ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز، ابوجعفر احمد بن اسحاق بن بہلول، احمد بن عیسیٰ بن مسکین بلدی، احمد بن قاسم فرائضی، ابوطالب احمد بن نصر، عبداللہ بن ابی حیہ، علی بن عبداللہ بن بشر، فضل بن احمد زبیدی، ابوعلی محمد بن سلیمان مالکی، محمد بن قاسم محاربی، محمد بن نوح جندیسابوری، ابوعمر محمد بن یوسف قاضی ازدی، یحییٰ بن محمد بن صاعد، یوسف بن یعقوب نیشاپوری۔
(ایضاً)

تلامذہ:

ان کے بعض مشہور تلامذہ کے نام حسب ذیل ہیں:

ابوبکر احمد بن محمد برقانی، ابوبکر بن بشران، ابوحامد اسفرائینی، ابوالحسن بن الآبنوسی، ابوالحسین ابن مہتدی باللہ، ابوذر عبدابن احمد ہروی، ابوطالب بن عشاری، ابوطاہر بن عبدالرحیم، قاضی ابوالطیب طبری ابوالقاسم بن بشران، ابوالقاسم بن محسن، ابومحمد جوہری، ابومحمد خلال، ابونعیم اصفہانی صاحب حلیۃ الاولیاء ابوالقاسم ازہری، تمام رازی صاحب فوائد مشہورہ، ابوعبداللہ حاکم

Marfat.com

صاحب المستدرک، ابوالقاسم حمزۃ بن محمد طاہر، ابوالقاسم حمزہ بن یوسف سہمی، ابوالقاسم عبدالصمد بن مامون ہاشمی، عبدالعزیز ازجی، حافظ عبدالغنی ازدی منذری صاحب ترغیب وترہیب، ابوعبدالرحمٰن محمد بن حسین سلمی۔

(تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴ وکتاب الانساب ورق ۱۷۱ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۹۹)

طلب حدیث کے لیے سفر:

امام دارقطنی کو علم وفن خصوصاً احادیث نبویؐ سے غیر معمولی شغف تھا، وہ نہایت کمسنی میں اس فن کی تحصیل میں مشغول ہو گئے تھے، ابویوسف قواس کا بیان ہے کہ ''جب ہم بغوی کے پاس جاتے تھے تو دارقطنی بہت چھوٹے تھے، ان کے ہاتھ میں روٹی اور سالن ہوتا تھا'' امام صاحب کے زمانہ میں بغداد علمی حیثیت سے نہایت ممتاز اور نامور علما ومحدثین کا مرکز تھا، مگر وہ اپنی تشنگی علم کو بجھانے کے لیے بغداد کے علاوہ، کوفہ، بصرہ، واسط، شام اور مصر وغیرہ متعدد مقامات میں تشریف لے گئے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۲)

حفظ وذکاوت:

امام دارقطنی کا حافظہ غیر معمولی اور بے نظیر تھا، نہ صرف احادیث بلکہ دوسرے علوم کا بھی ان کا سینہ مخزن تھا، بعض شعرا کے دواوین ان کو ازبر تھے، قدیم عربوں کی طرح وہ تحریر وکتابت کے بجائے اکثر اپنے حافظہ ہی سے کام لیتے تھے، اپنے تلامذہ کو کتابیں زبانی املا کراتے تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کو الحافظ الکبیر، الحافظ المشھور، کان عالماً حافظاً وغیرہ لکھا ہے، ذہبی نے ان کو حافظ الزمان کہا ہے، حاکم فرماتے ہیں کہ ''وہ حافظہ میں یکتائے روزگار تھے'' سمعانی کا بیان ہے کہ ''دارقطنی کا حافظہ ضرب المثل تھا'' علامہ ابن جوزی رقمطراز ہیں کہ ''وہ حافظہ میں منفرد اور یگانہ عصر تھے'' حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ''بچپن ہی سے دارقطنی اپنے نمایاں اور غیر معمولی حافظہ کے لیے مشہور تھے'' ابوالطیب طاہری کا بیان ہے کہ ''بغداد میں جو بھی حافظ حدیث آتا وہ امام دارقطنی کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا اور اس کے بعد اس کے لیے ان کی علمی بلند پائیگی اور حافظہ میں برتری اور تقدم کا اعتراف کرنا لازمی ہو جاتا تھا'' ان کے حافظہ اور ذہانت کا یہ حال تھا کہ ایک ہی نشست میں ایک ہی روایت کی بیس بیس سندیں برجستہ بیان کر دیتے تھے، حافظ ذہبی نے اس طرح کے ایک واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کو دیکھ کر دارقطنی کی بے پناہ ذہانت، قوتِ حفظ اور غیر معمولی فہم ومعرفت کے سامنے سرنگوں ہو جانا پڑتا ہے، شباب کے زمانہ میں ایک روز وہ اسماعیل صفار کے درس میں شریک ہوئے، وہ کچھ حدیثیں املا کرا رہے تھے، امام دارقطنی کے پاس کوئی مجموعہ حدیث تھا، یہ بیک وقت اس کو نقل بھی کرتے جاتے تھے اور صفار سے حدیثیں بھی سن رہے تھے، اس پر کسی شریک مجلس نے ان کو ٹوکا اور کہا تمہارا سماع صحیح اور معتبر نہیں ہو سکتا، کیونکہ تم لکھنے میں مشغول ہو اور شیخ کی مرویات کو ٹھیک سے سمجھنے اور سننے کی کوشش نہیں کرتے، امام دارقطنی نے جواب دیا کہ املا کو سمجھنے میں میرا طریقہ آپ سے مختلف ہے، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرت شیخ نے اب تک کتنی حدیثیں املا کرائی ہیں؟ اس شخص نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا کہ اب تک اٹھارہ حدیثیں املا کرائی ہیں، شمار کرنے پر وہ واقعی اٹھارہ ہی نکلیں، پھر آپ نے ایک ایک حدیث کو بے تکلف بیان کر دیا اور اسناد ومتون میں وہی ترتیب بھی قائم رکھی جو شیخ نے بیان کی تھی، پورا مجمع اس حیرت انگیز ذہانت اور غیر معمولی حافظہ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

Marfat.com

بعض مؤرخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شریک مجلس کے بجائے خود شیخ اسماعیل صفار نے ان کو تنبیہ فرمائی تھی۔

ابوبکر برقانی کا بیان ہے کہ میں اکثر ابومسلم بن مہران کے سامنے دارقطنی کی تعریف کیا کرتا تھا، ایک دن انہوں نے کہا تم دارقطنی کی تعریف میں افراط اور غلو سے کام لیتے ہو، ذرا ان سے رضراض کی وہ حدیث دریافت کرو جو ابن مسعودؓ سے مروی ہے میرے دریافت کرنے پر امام صاحب نے نہ صرف وہ حدیث بلکہ اس کے اختلافِ وجوہ اور امام بخاری کی اس روایت کے بارے میں خطا بھی واضح کردی اور میں نے اس کو بھی علل میں شامل کرلیا۔

(تاریخ بغداد صفحات ۳۶ تا ۳۸ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۹۹ تا ۲۰۱ و بستان المحدثین ص ۴۶)

ثقاہت:

حافظہ کی طرح ان کی ثقاہت بھی مسلّم ہے، خطیب نے ان کے مناقب میں راست بازی، امانت اور عدالت کا ذکر کیا ہے صاحب مشکوٰۃ نے اپنے دیباچہ میں امام دارقطنی کو اکابر محدثین اور ائمہ متقنین میں شمار کیا ہے۔

علل و اسماء الرجال:

وہ روایت کی طرح درایت کے بھی ماہر اور جرح و تعدیل کے فن میں امام تھے، ان کا شمار مشہور نقادانِ حدیث میں کیا جاتا ہے، ممتاز محدثین اور ائمہ فن نے ان کے اس کمال کا اعتراف کیا ہے، رجال کی تمام معتبر و متداول کتابوں میں ان کے نقد و جرح کے اقوال موجود ہیں، حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ''امام کی عظمت و براعت شان دیکھنی ہو تو ان کی علل کا مطالعہ کرو، تم مبہوت ہوجاؤ گے'' سعد بن علی زنجانی سے چار ہم عصر محدثین، بغداد کے دارقطنی، مصر کے عبدالغنی بن سعید، اصبہان کے ابوعبداللہ بن مندہ اور نیشاپور کے ابوعبداللہ حاکم کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ دارقطنی علل سے واقفیت میں ان سے فائق ہیں، خطیب کا بیان ہے: ''احادیث و آثار، علل حدیث، اسماء الرجال اور احوال و رواۃ کا علم ان پر ختم ہوگیا، حافظ ابن جوزی کا ارشاد ہے کہ: ''امام دارقطنی کی علم حدیث، اسماء الرجال اور علل حدیث میں معرفت مسلّم ہے'' حافظ ابن کثیر نے نہایت شاندار الفاظ میں ان کی ناقدانہ بصیرت و ژرف نگاہی کا اعتراف کیا ہے، فرماتے ہیں ''احادیث پر نظر علل و انتقاد کے اعتبار سے وہ نہایت عمدہ تھے، اپنے دور میں فن اسماء الرجال، علل اور جرح و تعدیل کے امام اور فن درایت میں مکمل دستگاہ رکھتے تھے۔'' ان کے معاصر و شاگرد حاکم کا بیان ہے کہ ''میں قیام بغداد کے زمانہ میں اکثر ان کی صحبتوں سے لطف اندوز ہوتا تھا، یہ واقعہ ہے کہ میں نے ان کی جس قدر تعریفیں سنی تھیں ان سے بڑھ کر ان کو پایا، میں ان سے شیوخ، رواۃ اور علل حدیث کے متعلق سوالات کرتا تھا اور وہ ان کا جواب دیتے تھے، میری شہادت ہے کہ روئے زمین پر ان کی کوئی نظیر موجود نہیں۔'' (تدریب الراوی ص ۷۷ ۲ تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۷ و تذکرۃ ج ۳ ص ۲۰۰ کتاب الانساب ورق ۲۱۷، المنتظم ج ۷ ص ۱۸۳ و البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷) شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ ''فقہی احکام و مسائل اور حلال و حرام کی معرفت میں جو حیثیت مالک، سفیان ثوری، اوزاعی اور شافعی وغیرہ ائمہ فقہ کے رایوں اور اقوال کی ہے وہی حیثیت رجال اور صحیح و ضعیف احادیث کے بارے میں یحییٰ بن معین، بخاری، مسلم، ابوحاتم، ابوزرعہ، نسائی، ابن عدی اور امام دارقطنی وغیرہ جہابذہ محدثین و نقادانِ فن کے کلام کی ہے۔'' (الرد علی البکری ص ۱۳) ان کی عظمت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علل میں ان کی تصنیف سب سے بہتر اور جامع خیال کی جاتی ہے اور اس فن میں ان کے بعض اولیات بھی ہیں، مثلاً

Marfat.com

مدبج (روایت اقران) کی ایجاد کا فخر ان ہی کو حاصل ہے، عراقی کا بیان ہے کہ "میرے علم کے بموجب دار قطنی نے سب سے پہلے اس اصطلاح کو وضع کیا ہے۔" (تدریب الراوی ص ۲۱۷)

ازہری کا بیان ہے کہ ایک دفعہ کسی حدیث کی علت یا کسی راوی کے متعلق محمد بن ابی الفوارس کو جواب دیتے ہوئے فرمایا: "اے ابو الفتح! مشرق ومغرب کے درمیان اس فن کا جاننے والا میرے سوا کوئی نہیں۔" حمزہ بن محمد بن طاہر دقاق نے مندرجہ ذیل شعروں میں ان کے کمال فن کا اعتراف کیا ہے:

جعلناک فیما بیننا ورسولنا	وسیطا فلم تظلم ولم تتحرب
فانت الذی لولاک لم یعرف الوری	ولو جهدوا ما صادق من مکذب

"اے امام حدیث! آپ ہمارے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان بہترین اور عمدہ واسطہ ہیں اگر آپ کی پُر کمالات ذات نہ ہوتی تو لوگ انتہائی کوششوں کے باوجود بھی سچے اور جھوٹے راویوں اور صحیح وغلط حدیثوں میں تمیز نہیں کر سکتے تھے۔"

حدیث واسماء الرجال سے ان کی گہری واقفیت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے جملوں میں معمولی غلطی بھی کرتا تو وہ فوراً اس کو تاڑ جاتے اور بروقت اس کی اصلاح کر دیتے تھے، ایک مرتبہ خلال نے یہ حدیث پڑھی: اللھم انک عفو تحب العفو فاعف عنی، اس میں انہوں نے عفو کو مخفف پڑھا تو امام صاحب نے فوراً ٹوکا کہ عفو مشدد ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں "علل حدیث ورجال کی معرفت میں یگانہ روزگار اور عدیم المثال تھے،" حاکم اور اس فن کے دوسرے ممتاز ائمہ نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ (تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۸ و ۳۹ و تذکرہ ج ۳ ص ۲۰۱ و بستان المحدثین ص ۴۶)

حدیث میں درجہ:

امام دار قطنی کو اصل شہرت حدیث میں امتیاز کی بنا پر حاصل ہے، ان کے حفظ وضبط، ثقاہت واتقان، روایت ودرایت میں مہارت اور علل کی معرفت وغیرہ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا، اس سے بھی ان کے حدیث میں کمال، بلند پائیگی اور تبحر کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے، ائمہ فن اور نامور محدثین نے ان کے عظیم المرتبت اور صاحب کمال محدث ہونے کا اعتراف کیا ہے، خطیب کا بیان ہے کہ "احادیث وآثار کا علم ان پر ختم ہو گیا، وہ حدیث میں یکتائے روزگار، عجوبہ دہر اور امام فن تھے،" امام بخاری کی طرح امام دار قطنی کو بھی ان کے زمانہ میں امیر المؤمنین فی الحدیث (اقلیم حدیث کے تاجدار) کا خطاب ملا تھا، عبدالغنی بن سعید کا بیان ہے کہ "حدیث پر بحث وگفتگو میں تین اشخاص اپنے اپنے زمانہ میں نہایت ممتاز تھے، علی بن مدینی، موسیٰ بن ہارون اور علی بن عمر دار قطنی؛" علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں، "وہ علم حدیث میں منفرد اور امام تھے، ان کے معاصرین میں کوئی اس رتبہ اور پایہ کا شخص نہیں گزرا، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں، روایت کی وسعت وکثرت کے اعتبار سے وہ امام دہر تھے، ابن عماد حنبلی کہتے ہیں: "حدیث اور اس کے متعلق فنون میں وہ منتہی تھے اور اس میں امیر المؤمنین کہلاتے تھے؛" ابوبکر بن ہبۃ اللہ صاحب طبقات الشافعیہ لکھتے ہیں کہ "وہ اپنے دور میں حدیث کے امام تھے؛" ابو الطیب طبری کا بیان ہے کہ امام صاحب کی مجلس میں ایک روز مس ذکر کی حدیث پڑھی جا رہی تھی، امام صاحب نے اس کے بے شمار طرق جمع کر کے اس کے فوائد پر عمدہ تقریر کی اور اس کے بعد فرمایا کہ اگر امام احمد بھی اس وقت موجود ہوتے تو وہ اس معاملہ میں مجھ سے استفادہ کرتے۔" (تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴، ۳۶)

Marfat.com

۳۸ و ابن خلکان ج ۲ ص ۵ و البدایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷ طبقات الشافعیہ لابی بکر ص ۳۳، شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۱۶ و کتاب الانساب ورق ۲۱۷)

امام صاحب کے اس فن میں مقام و مرتبہ کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ صحاح ستہ کے مصنفین کے بعد جن مصنفین کو معتبر اور جن کی تصنیفات کو مستند اور زیادہ پر منفعت خیال کیا گیا ہے، ان میں ان کا نام نامی بھی ہے، ابن صلاح، نووی، صاحب مشکوۃ اور علامہ سیوطی نے اس حیثیت سے ان کا ذکر و اعتراف کیا ہے۔ (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۹۲ تدریب الراوی ص ۲۶۰ مقدمہ کمال ص ۱۷)

فقہ و خلافیات:

امام صاحب فقہ میں ممتاز فقہا کے مذاہب و مسالک کے نہایت واقف کار اور خلافیات کے بڑے ماہر تھے، ان کی سنن بھی اس پر شاہد ہے، خطیب لکھتے ہیں کہ "حدیث کے علاوہ مذاہب فقہا کی معرفت میں بھی ان کا درجہ نہایت بلند ہے" کتاب السنن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو فقہ سے بڑا اعتنا و اشتغال تھا، کیونکہ کتاب کے محتویات و مشمولات کو وہی شخص جمع اور مرتب کر سکتا ہے جس کو احکام و مسائل اور فقہا کے اختلافات سے اچھی اور پوری طرح واقفیت ہو، اس فن کو انہوں نے ابو سعید اصطخری اور ایک روایت کے مطابق ان کے کسی خاص شاگرد سے حاصل کیا تھا، مؤرخین اور سوانح نگاروں کا متفقہ بیان ہے کہ:

وکان عارفا باختلاف الفقهاء۔ (تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۵ التاج المکلل ص ۴۵)

فقہی مذہب:

اگرچہ امام دارقطنی شافعی المذہب تھے لیکن ان کا شمار اس مذہب کے صاحب وجوہ فقہا میں ہوتا ہے، صاحب وجوہ وہ فقہا کہلاتے ہیں جنھوں نے اپنے ائمہ کے مذاہب کی تکمیل اور ان سے منسوب مختلف روایتوں کے درمیان تطبیق و ترجیح اور ان کے وجوہ و علل واضح کیے ہیں اور جن مسائل کے متعلق ان کے ائمہ کی تصریحات موجود نہیں تھیں، ان کو ان کے اصول و علل پر قیاس کر کے فتویٰ دیا ہے۔" ابن خلکان نے دارقطنی کو فقیہا علی مذہب الشافعی اور یافعی نے صاحب الوجوہ فی المذہب لکھا ہے۔

(تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۵ و مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۴۲۵)

نحو، تفسیر، قراءت و تجوید:

امام صاحب کو علم نحو، فن قراءت و تجوید میں ید طولیٰ حاصل تھا اور تفسیری و قرآنی علوم سے بڑا شغف تھا، ابو الفدا کا بیان ہے کہ "وہ قرآنیات کے امام تھے" حاکم کہتے ہیں کہ وہ نحاۃ و قراء کے امام اور تجوید و قراءت میں بلند پایہ تھے، انہوں نے حروف و مخارج کی تصحیح و ادائیگی کا علم بچپن میں ابو بکر بن مجاہد سے سیکھا اور محمد بن حسین نقاش طبری، احمد بن محمد دیباجی ابو سعید قزاز وغیرہ ماہرین فن سے اس کی باقاعدہ تکمیل کی اور آخر عمر میں خود اس فن میں مرتبہ امامت و اجتہاد پر فائز ہو گئے اور اس میں ایک رسالہ بھی لکھا، اس میں قدیم قراء سے مختلف ایک نیا طرز انہوں نے ایجاد کیا تھا، یہ طرز بعد میں مقبول ہوا اور لوگوں نے اسے اختیار کیا۔

(تاریخ ابو الفدا ج ۲ ص ۱۳۰ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۰ و ۲۰۳ و تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴ و ۳۵)

شعر و ادب:

امام دارقطنی شعر و ادب کا بھی عمدہ ذوق رکھتے تھے، بعض شعراء کے دواوین ان کو زبانی یاد تھے، عربی زبان و ادب پر ان کو

Marfat.com

اس قدر قدرت اور کامل عبور تھا کہ ایک دفعہ مصر تشریف لے گئے تو وہاں علوی خاندان کے ایک شخص مسلم بن عبداللہ موجود تھے، یہ ادب، فصاحت وبلاغت اور زبان دانی کے بڑے ماہر تھے، ان کے پاس زبیر بن بکار کی کتاب الانساب تھی جس کو حضر بن داؤد نے ان سے روایت کیا تھا اور جو انساب کے علاوہ اشعار اور ادبی فکاہات ولطائف کا بھی بہترین مجموعہ تھی، لوگوں نے امام دارقطنی سے اس کی قراءت کی فرمائش کی، امام صاحب نے سب کے شدید اصرار کی وجہ سے اس کو منظور کر لیا، چنانچہ اس تقریب کے لیے ایک مجلس کا اہتمام کیا گیا، اس میں مصر کے نامور علما وفضلا اور اساطین شعروادب بھی شریک ہوئے تا کہ امام دارقطنی کی غلطیوں کی گرفت کر سکیں لیکن ان لوگوں کو ناکامی ہوئی، امام کے حیرت انگیز کمال کو دیکھ کر سب دنگ رہ گئے، خود مسلم کو بھی ان کے ادبی مذاق کی پختگی وبلندی اور عربی زبان پر غیر معمولی قدرت اور دسترس کا اعتراف کرنا پڑا۔ (تذکرۃ الحفاظ وتاریخ بغداد حوالہ مذکورہ)

جامعیت:

ان گوناگوں کمالات سے ان کی جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے، گو ان کو اصل شہرت حدیث میں امتیاز کی وجہ سے ہے تاہم وہ کسی فن میں بھی عاجز وقاصر نہ تھے، خطیب کا بیان ہے کہ "حدیث کے علاوہ بھی متعدد علوم وفنون میں ان کو درک ومہارت تھی" ازہری کا بیان ہے کہ امام دارقطنی بڑے ذہین وطباع تھے، ان کے سامنے کسی علم کا بھی تذکرہ کیا جاتا تو اس کے متعلق معلومات کا بیشمار ذخیرہ ان کے پاس ہوتا، محمد بن طلحہ بغالی ایک روز ان کے ساتھ کسی دعوت میں شریک تھے، جب کھانے پر گفتگو چھڑی تو دارقطنی نے اس کے اتنے واقعات وحکایات اور نوادر وعجائب بیان کئے کہ رات کا اکثر حصہ ختم ہو گیا، حاکم سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ نے دارقطنی کی طرح کوئی جامع کمالات شخص دیکھا ہے؟ تو انہوں نے نفی میں جواب دیا، ابوالفدا کا بیان ہے کہ وہ متعدد علوم میں جامع تھے۔ (تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۰ وتاریخ ابوالفدا ج ۲ ص ۱۳۰)

فہم ودانش:

اللہ تعالیٰ نے ان کو فہم ودانش سے بھی سرفراز کیا تھا، حاکم کا بیان ہے کہ امام دارقطنی اس حیثیت سے بھی یکتائے روزگار تھے، خطیب نے ان کے فقہ وفہم کی تعریف کی ہے۔ (تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴ وتذکرہ حوالہ مذکورہ)

ورع وتقویٰ:

حاکم کا بیان ہے کہ وہ ورع وتقویٰ میں بے مثال تھے، خلال کا بیان ہے ایک روز میں اپنے ایک استاد کے یہاں گیا وہاں ابوالحسین بن مظفر، قاضی ابوالحسن جراحی اور امام دارقطنی وغیرہ ائمہ فن واصحاب کمال موجود تھے، جب نماز کا وقت ہوا تو دارقطنی نے امامت کی، حالانکہ اس مجلس میں ان سے زیادہ معمر مشائخ موجود تھے، امام صاحب دین کے معاملہ میں کسی مصلحت، نرمی اور مداہنت کو پسند نہیں کرتے تھے، ان کے زمانہ میں شیعیت کا زور تھا لیکن انہوں نے شیعوں کے علی الرغم حضرت عثمانؓ کو حضرت علیؓ سے افضل قرار دیا۔ (تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۸)

شہرت ومقبولیت:

امام صاحب اپنے بے شمار کمالات کی وجہ سے نہایت مقبول ومحترم سمجھے جاتے تھے امام اور شیخ الاسلام ان کے نام کا جزو ہو

Marfat.com

گیا تھا، جب مسند درس پر رونق افروز ہوتے تو تشنگانِ علوم کا ہجوم اردگرد رہتا تھا، آپ کی مجلس درس نہایت باوقار اور پُر ہیبت ہوتی تھی، نامور محدثین کو بھی احترام کی وجہ سے لب کشائی کی جرأت نہیں ہوتی تھی، ابن شاہین ایک مرتبہ ان کے درس میں شریک ہوئے تو ان پر اس قدر ہیبت طاری ہوئی کہ ایک کلمہ بھی زبان پر نہ لا سکے کہ مبادا کوئی غلطی ہو جائے، آپ کے تلامذہ ہمیشہ آپ کا نام عزت واحترام کے ساتھ لیتے تھے، عبدالغنی جو خود بھی نامور اور صاحب کمال محدث تھے اور بقول برقانی دارقطنی کے بعد میں نے ان سے بڑا کوئی حافظ حدیث نہیں دیکھا لیکن جب کبھی وہ دارقطنی کے حوالہ سے کوئی بات بیان کرتے تو: قال استاذی، سمعت استاذی وغیرہ ضرور کہتے، اس کا سبب دریافت کیا گیا تو نہایت فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا کہ ہم نے یہ جو دو چار حروف سیکھے ہیں وہ ان ہی امام دارقطنی کا فیض ہے۔ (تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۹۶)

لطائف وظرائف:

امام صاحب بڑے پُر مذاق اور شگفتہ مزاج تھے، اس لیے لطف وتفریح، مزاح وتفنن اور دلچسپی کی باتیں بھی کرتے تھے، ایک روز ابوالحسن بیضاوی آپ کی خدمت میں ایک شخص کو لے کر آئے اور آپ سے کچھ حدیثیں املا کرانے کی فرمائش کی، امام صاحب نے پہلے معذرت کی اور کہا مجھے فرصت نہیں ہے لیکن بیضاوی نے اصرار کیا اور کہا کہ یہ مسافر ہیں اور دور دراز سے محض حدیث کی تلاش وتحصیل کے لیے آئے ہیں، امام صاحب نے اسی وقت اپنی یادداشت سے ایک حدیث بیس طرق اور سندوں سے بیان کی، سب کا متن یہ تھا: نعم الشی الھدیۃ امام الحاجۃ۔ یعنی حاجت اور غرض پیش کرنے سے پہلے ہدیہ کرنا بہت عمدہ بات ہے، جب دوسرے دن یہ صاحب پھر تشریف لائے تو اپنے ساتھ کچھ مناسب ہدیہ بھی لائے، امام دارقطنی نے ان کو اپنے قریب بیٹھایا اور ایک حدیث سترہ طرق سے زبانی املا کرائی جس کا متن یہ تھا:

اذا اتاکم کریم قوم فاکرموہ۔ جب کسی قوم کا سردار یا شریف آدمی تمہارے پاس آئے تو اس کی تعظیم کرو۔

ان کی شگفتگی مزاج کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ ایک دن نفل پڑھ رہے تھے، اتفاقاً ان کے پاس ہی ایک شخص کسی مجموعۂ حدیث کے مطالعہ میں مشغول تھا، اس نے ایک راوی نسیر (بنون وسین مصغر) کو بشیر (بیائے موحدہ وشین معجمہ) پڑھا، امام دارقطنی نے نماز ہی میں ان کو متنبہ کرنے کے لیے سبحان اللہ کہا وہ سمجھ گئے لیکن دوبارہ بھی غلط ہی پڑھا اور نسیر کہنے کے بجائے یسیر (بضم یا وسین مصغر) کہا، امام صاحب نے دیکھا کہ اب بھی وہ صحیح نہیں پڑھ رہا ہے تو یہ آیت تلاوت کی: (نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝) تب قاری نے سمجھا کہ یہ نسیر ہے۔[1]

اسی قسم کا ایک لطیفہ اور بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن وہ نفل ادا کر رہے تھے کہ ابوعبداللہ کاتب نے عمرو بن شعیب کا نام غلطی سے عمرو بن سعید پڑھا، امام دارقطنی نے سبحان اللہ کہا قاری سمجھ گیا کہ میں نے غلط پڑھا ہے، اس لیے سند دہرا کر خاموش ہو گیا، امام صاحب نے اس کی تصحیح کے لیے یہ آیت پڑھی: (يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ)۔

(تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۹ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۱، بستان المحدثین ص ۴۶ و اتحاف النبلاء المتقین ص ۳۱۷)

یہ واقعات محض لطائف ہی نہیں ہیں بلکہ ان سے امام صاحب کی ذہانت، قوتِ حفظ، استحضارِ علم اور حدیث میں بالغ نظری اور مہارت کا پتہ چلتا ہے۔

---

[1] (امام دارقطنی شافعی المذہب تھے، شوافع کے یہاں نماز میں اس طور پر تلقین کرنا جائز ہے مگر امام ابوحنیفہ کے یہاں جائز نہیں ہے)

Marfat.com

اخلاق وعادات:

امام صاحب کے اخلاق وعادات کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا لیکن بعض واقعات اور مورخین کے ضمنی بیانات سے ان کی طبعی شرافت اور حسن اخلاق کا پتہ چلتا ہے، مثلاً وہ فضول باتوں کو سخت ناپسند کرتے تھے اور خاموشی کو پسند کرتے تھے، طبیعت میں نرمی اور انکساری تھی، لوگوں کی دل آزاری سے پرہیز کرتے تھے، طلبہ کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے، ان کی علمی امداد واعانت بھی کرتے، امام صاحب کی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی سے بھی ان کے حسن اخلاق کا پتہ چلتا ہے۔

عقائد:

وہ بڑے صحیح العقیدہ تھے، مذہبی واعتقادی مسائل میں ان کا مسلک وہی تھا جو اہلسنت والجماعت کا ہے، مورخ خطیب لکھتے ہیں کہ وہ فہم وفراست، حفظ وذکاوت، صدق وامانت اور ثقاہت وعدالت وغیرہ اوصاف کی طرح صحت اعتقاد اور سلامتی مذہب سے بھی متصف تھے، (تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴) دوسرے مورخین نے بھی ان کے عقیدہ کی صحت ودرستگی کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان پر شیعیت کا الزام عائد کیا جاتا ہے، اس پر آگے بحث کی جائے گی۔

وفات:

مشہور روایت کے مطابق ان کا انتقال ۸ / ذوالقعدہ ۳۸۵ھ کو ہوا، مشہور فقیہ ابوحامد اسفرائنی نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور مشہور بزرگ معروف کرخی کے مزار کے متصل باب حرب میں سپرد خاک کئے گئے، ابونصر بن ماکولا کا بیان ہے کہ میں نے رمضان کی ایک رات میں خواب دیکھا کہ کسی سے امام دارقطنی کے اخروی انجام کے بارے میں سوال کر رہا ہوں اور وہ یہ جواب دے رہے ہیں کہ جنت میں دارقطنی امام کہلاتے ہیں۔ (تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۰ وابن خلکان ج ۲ ص ۵ و ۶)

امام دارقطنی پر بعض اعتراضات:

امام دارقطنی کی عظمت شان اور زہد واتقا میں امتیاز کے باوجود ان پر چند اعتراضات کئے گئے ہیں اس لئے ذیل میں ان کو نقل کر کے ان کا جواب تحریر کیا جاتا ہے۔

شیعیت کا الزام:

ان پر سب سے بڑا الزام شیعیت کا لگایا گیا ہے لیکن اس کی حقیقت صرف اس قدر بیان کی جاتی ہے کہ ان کو مشہور شیعی شاعر سید حمیری [1] کا دیوان زبانی یاد تھا، چنانچہ خطیب لکھتے ہیں کہ "میں نے حمزہ بن محمد بن طاہر دقاق کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ

---

[1] (اسکا نام اسماعیل، کنیت ابوالہاشم اور نسب نامہ یہ ہے: اسماعیل بن محمد بن یزید بن ربیعہ بن مفرغ حمیری، اس کی ماں قبیلہ ازد کی تھی، یہ بڑا مشہور اور با کمال پر گو شاعر تھا لیکن نہایت دریدہ دہن، بدزبان اور غالی شیعہ تھا، ہجو گوئی کے لیے مشہور تھا، زیاد کی ہجو کی تو اس کے لڑکے عبید اللہ نے اس کو قید کر لیا اور سخت سزا ئیں دیں لیکن حضرت معاویہ نے اسے آزاد کر دیا، صحابہ کرامؓ اور ازواج مطہراتؓ کی شان میں طعن وتشنیع، سب وشتم اور گستاخی ودریدہ دہنی اس کا شعار بن گیا تھا، اللہ کی شان دیکھئے کہ اس کے کمالات کے باوجود اس کی یاوہ گوئی اور دریدہ دہنی کی وجہ سے اس کا نام ونشان وکلام سب مٹ گیا۔
(کتاب الاغانی ج ۷ ص ۲)

Marfat.com

ابوالحسن دار قطنی کو منجملہ اور دواوین کے سید حمیری کا دیوان بھی زبانی یاد تھا، اسی وجہ سے ان کی طرف شیعیت کی نسبت کی جاتی ہے، ابن خلکان کا بیان ہے کہ ان کو جن عرب شعرا کے دواوین یاد تھے ان میں سید حمیری کا دیوان بھی تھا، اسی لیے ان پر شیعیت کا الزام لگایا گیا ہے (تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۵ و تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۶) دوسرے مؤرخین نے بھی اسی چیز کو نقل کیا ہے اس کے علاوہ امام صاحب کی شیعیت کا اور کوئی ثبوت نہیں بیان کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے محض اتنی سی بات پر امام صاحب کو شیعیت سے متہم کرنا غلط اور سراسر خلاف انصاف ہے، یہ پہلے گزر چکا ہے کہ ان کو زبان وادب اور شعر وسخن کا عمدہ ذوق تھا، اپنے اس ذوق کی تسکین کے لیے وہ ادب ومحاضرات کی کتابیں اور شعرا کے دواوین کا دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے، ان کا حافظہ نہایت قوی تھا، اس لیے اکثر چیزیں ان کے لوح قلب پر نقش ہو جاتی تھیں، سید حمیری یا وہ گو اور شیعہ ہونے کے باوجود ایک باکمال شاعر تھا، اس کا کلام ادبی لطائف ورعنائی سے معمور ہوتا تھا، اس کی خوبیوں اور لطف زبان کی وجہ سے امام صاحب کو اس سے دلچسپی رہی ہوگی اور یہ ان کو زبانی یاد ہو گیا ہوگا لیکن اس کا شیعیت سے کیا تعلق؟ یہ تو درحقیقت فن اور اہل علم کی قدردانی ہے لیکن تاریخ اسلام میں جس طرح بے شمار مقدس اور برگزیدہ علمائے اسلام کو بے بنیاد اعتراضات اور بے سروپا الزامات کا نشانہ بنایا گیا ہے، اسی طرح امام صاحب پر بھی یہ الزام عائد کر دیا گیا اور اکابر پر ممکن ہے اس قسم کے الزامات کے کچھ وجوہ رہے ہوں لیکن امام دار قطنی کو شیعیت سے متہم کرنے کی معمولی وجہ بھی موجود نہیں ہے، چنانچہ حافظ ذہبی نے اس الزام کا ذکر کرنے کے فوراً بعد ہی اس کی پرزور تردید بھی کی ہے: ما ابعد من التشیع یعنی ان کا شیعیت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ (تذکرہ ج ۳ ص ۲۰۰)

امام صاحب کے حالات وواقعاتِ زندگی سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے، کیونکہ بعض ایسے صریح قرائن اور واضح شواہد موجود ہیں جن سے امام صاحب کی شیعیت سے بیزاری کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً:

ابن طاہر کا بیان ہے کہ بغداد میں ایک بار تفضیل علیؓ کے متعلق اختلاف ہوا لوگ امام دار قطنی کی خدمت میں استفسار کے لیے آئے، انہوں نے پہلے تو خاموشی اختیار کی مگر پھر فوراً ان کو خیال ہوا کہ یہ ایک مذہبی واعتقادی مسئلہ ہے اس میں مصالح کو دخل دینا اور کتمانِ حق سے کام لینا نامناسب ہوگا، اس لیے بلا جھجک یہ فرمایا کہ حضرت عثمانؓ افضل ہیں کیونکہ صحابہؓ کا اس پر فی الجملہ اتفاق ہے اور یہی اہلسنت والجماعت کا مسلک ہے (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۲) ایسے زمانہ میں جب شیعیت کا اس قدر غلبہ رہا ہو اس قسم کی بات کہنا حق گوئی، جرأت اور بیباکی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

امام دار قطنی کے اساتذہ میں ایک شخص کا نام ابوالعباس احمد بن محمد بن سعید کوفی الملقب با بن عقدہ ہے، یہ اگرچہ جلیل القدر محدث ہیں لیکن ان کا شیعیت کی جانب رجحان تھا، اس لیے امام صاحب ان کو ناپسند کرتے تھے، چنانچہ ایک موقع پر ان کے متعلق فرمایا:

حافظ محدث ولم یکن فی الدین بقوی لا ازید فیه علی هذا۔

وہ حافظ ومحدث تھے لیکن دین میں زیادہ قوی نہیں تھے، اس سے زیادہ میں ان کے بارے میں اور کچھ نہیں کہوں گا۔

لیکن حمزہ بن محمد بن طاہر فرماتے ہیں کہ امام دار قطنی نے ان کے بارے میں کسی قدر سخت الفاظ بھی کہے ہیں، حافظ ذہبی لکھتے ہیں: کانه یشیر الی الرفض (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۲ و ۵۹ ومیزان الاعتدال ج ۱ ص ۶۵) (گویا اس سے ان کی شیعیت کی

Marfat.com

طرف اشارہ تھا)۔

ان واضح اور صریح واقعات کی موجودگی میں یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ان کا شیعیت سے ادنیٰ تعلق بھی رہا ہوگا، ان کے فضل وکمال تدین وتقویٰ اور عقیدہ میں صحت وپختگی کا پہلے جو ذکر ہو چکا ہے اس کے بعد ان کے متعلق اس قسم کے الزام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

تدلیس:

دوسرا اعتراض تدلیس کا ہے، ذہبی نے اس کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے بغوی سے جو روایتیں نہیں سنیں ہیں ان کو اس طرح بیان کرتے تھے: ”قرء البغوی ابی القاسم حدثکم فلان۔“ اس اعتراض کی بنیاد اس امر پر ہے کہ بغوی کی وفات کے وقت امام صاحب کمسن تھے، ابو یوسف قواس کا بیان ہے کہ ”ہم لوگ بغوی کے پاس جاتے تھے تو دارقطنی بھی ہمارے پیچھے پیچھے جاتے تھے، یہ اس وقت اتنے چھوٹے تھے کہ ان کے ہاتھ میں روٹی اور سالن ہوتا تھا لیکن اس بیان سے خود دارقطنی کی بغوی سے ملاقات اور سماع کا ثبوت ملتا ہی کیونکہ مشہور روایت کے مطابق امام دارقطنی ۳۰۶ھ میں پیدا ہوئے اور ابو القاسم عبداللہ بن محمد عبدالعزیز بغوی نے ۳۱۷ھ میں انتقال کیا، دوسرے ان دونوں بزرگوں کا وطن بغداد تھا، اس اعتبار سے گیارہ سال کی عمر میں اپنے وطن کے شیخ سے سماع واستفادہ میں دشواری کی کوئی بات معلوم نہیں ہوتی رہا تدلیس کا معاملہ تو اس کا ذہبی کے علاوہ کسی اور نے ذکر نہیں کیا اگر تنہا ذہبی کی حکایت صحیح مان لی جائے تو بھی محض نفس تدلیس ثقاہت کے لیے مانع نہیں ہے۔

خودستائی:

امام دارقطنی نے بعض مواقع پر خود اپنی ہی زبان سے اپنی تعریف کی ہے، اس کو پہلے لکھا جا چکا ہے مگر اس کا جائزہ لینے کے لیے اس کو دوبارہ نقل کرنا ضروری ہے۔

ایک موقع پر آپ نے اپنے کو سب سے جامع اور افضل قرار دیا، ایک موقع پر کچھ حدیثوں کا املا کرانے اور ان کے فوائد پر تقریر کرنے کے بعد فرمایا کہ اگر امام احمد بھی موجود ہوتے تو استفادہ کرتے، اسی طرح ایک دفعہ ایک حدیث کی علت کے متعلق سوال کا جواب دیتے ہوئے ابن ابی الفوارس سے یہ کہا کہ ”شرق وغرب میں اس فن کا مجھ سے بہتر کوئی جاننے والا نہیں۔“

بلاشبہ اپنی تعریف خود ہی کرنا معیوب ضرور ہے۔ لیکن اگر یہ خلاف واقعہ نہ ہو تو بعض حالات جیسے تحدیث نعمت، طلبہ کی ترغیب وتشویق اور لوگوں کی خواہش واصرار یا اور کسی ضرورت ومجبوری کی بنا پر اس میں قباحت نہیں رہ جاتی ہے، دوسرے یہ کوئی ایسی معصیت نہیں ہے جس کی کسی حال میں بھی گنجائش نہ ہو، امام صاحب کے جو اوصاف وکمالات پہلے بیان کیے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی جانب کوئی خلاف واقعہ بات منسوب نہیں کی ہے اور آپ کی عظمت وبلند پایگی اور شان زہد وورع سے یہ بعید بھی ہے کہ بلا کسی خاص ضرورت اور وجہ کے خودستائی سے آپ کی زبان آلودہ ہوئی ہو چنانچہ اپنی جامعیت کا تذکرہ کرنے سے پہلے آپ نے سوال کو ٹالنے کی پوری کوشش کی، یہاں تک کہ قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی:

فَلَا تُزَكُّوٓا أَنفُسَكُمْ ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ ٱتَّقَىٰٓ (النجم: ۲)

Marfat.com

سوئم (بہت) اپنی پاکیزگی (جتایا) نہ کرو پرہیزگاروں کو وہی خوب جانتا ہے۔

لیکن اس پر بھی سائل خاموش نہ ہوا اور مصلحت داعی ہوئی تو آپ نے مناسب اور جائز وصف کا تذکرہ کیا، اسی پر دوسرے مواقع کو بھی قیاس کرنا چاہیے۔ (تاریخ بغداد ج ۱۲ ص وتذکرۃ ج ۳ ص ۲۰۱ وابن خلکان ج ۲ ص ۵)

یافعی کا اعتراض:

امام دارقطنی طلبہ کی حوصلہ افزائی اور اہل علم کے علمی و تصنیفی کاموں میں ان کی امداد کرتے تھے، ان کے شاگرد عبدالغنی کی کتاب المؤتلف والمختلف درحقیقت ان ہی سے استفادہ کا نتیجہ تھی، اسی طرح کافور اخشیدی کے وزیر ابوالفضل جعفر المعروف بابن خزابہ کے بارے میں آپ کو معلوم ہوا کہ وہ مسند تالیف کرنا چاہتے ہیں تو بغداد سے مصر تشریف لے گئے اور مسند کی تالیف تک وہاں قیام پذیر رہ کر اس کی امداد فرماتے رہے، ابوالفضل نے آپ کی خوب پذیرائی اور بڑا اعزاز واکرام کیا اور واپسی کے وقت اس قدر مال و دولت آپ کے ہمراہ کیا کہ آپ کو ایک حد تک فراغت میسر آ گئی۔ (یہ واقعہ تمام کتابوں میں مذکور ہے)

بظاہر اس واقعہ میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے، بلکہ یہ درحقیقت امام صاحب کی علم دوستی کا ثبوت ہے لیکن یافعی صاحب مرآۃ الجنان نے اس کو ان کی شان کے منافی اور خلاف اولیٰ قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں: امام صاحب نے اگرچہ ابن خزابہ کو مسند کی تخریج میں مدد پہنچانے کے لئے یہ سفر کیا تھا لیکن علمائے متدینین کے لئے میں اس کو مناسب نہیں سمجھتا، اگر اس قسم کا معاملہ وزرا و امرا کے بجائے اصحاب علم ودین کے ساتھ کیا گیا ہوتا اور اس میں حصول دنیا کی کوئی آرزو شامل نہ ہوتی تو البتہ یہ ایک اچھی بات ہوتی اور اس کو اشاعت علم اور اعانت فی الخیر پر محمول کیا جاتا۔ (مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۴۲)

اس اعتراض کا تجزیہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب نے مسند کی تالیف میں مدد پہنچا کر وزیر سے اپنے علم وفن کا معاوضہ قبول کیا، حالانکہ اولاً تو معاوضہ قبول کرنے کی اکثر علما کے یہاں گنجائش ہے، دوسرے یہ معاملہ سرے سے معاوضہ میں داخل ہی نہیں ہے کیونکہ امام صاحب نے پہلے سے اس قسم کا کوئی مطالبہ یا معاملہ نہیں کیا تھا بلکہ اس نے خود اور بلا طلب آپ کی امداد کی تھی، امام صاحب کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی، اس لیے آپ نے اس کے انعام واکرام سے مستفید ہونا قبول کر لیا، کہیں اس قسم کی کوئی تصریح موجود نہیں ہے کہ آپ نے حرص ولالچ کی وجہ سے یہ سفر کیا تھا۔

تعصب:

امام دارقطنی پر یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ وہ متعصب تھے، شافعی مذہب میں ان کو غیر معمولی غلو تھا اور اس کے برعکس وہ حنفی مذہب سے سخت عناد رکھتے تھے، پہلی بات کے ثبوت میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے مصر کے لوگوں کی فرمائش پر ایک رسالہ تحریر کیا، اس میں انہوں نے جہری نمازوں میں زور سے بسم اللہ پڑھنے کے متعلق حدیثیں جمع کی تھیں لیکن جب ان سے ان حدیثوں کی صحت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے اعتراف کیا کہ "جہر بالبسملہ کے متعلق نبی اکرم ﷺ سے کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہے، البتہ صحابہ کرام سے اس کے متعلق صحیح اور ضعیف دونوں قسم کی روایتیں ملتی ہیں۔

(فتاوی ابن تیمیہ ج ۱ ص ۷۷ ونصب الرایہ ج ۱ ص ۳۵۸ و ۳۵۹، کبیری ص ۳۶)

اس واقعہ سے امام دارقطنی پر دو شبہات عائد ہوتے ہیں:

Marfat.com

1. انہوں نے جان بوجھ کر ضعیف اور غیر ثابت حدیثیں جمع کیں۔
2. اس علم و واقفیت کے باوجود بھی کہ صحیح حدیثوں سے جہر بالبسملہ کی تائید نہیں ہوتی، انہوں نے اس سے رجوع نہیں کیا۔

پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ امام صاحب کا مقصد اس باب کی تمام احادیث کا استقصا اور ایک جامع رسالہ تالیف کرنا تھا، اس لیے انہوں نے اس میں ضعیف حدیثیں بھی درج کر دی ہیں چنانچہ سنن میں تحریر فرماتے ہیں:

''ان لوگوں کے علاوہ جن کا یہاں ہم نے نام لیا ہے، صحابہ کرامؓ اور ازواج مطہراتؓ کی ایک جماعت نے جہر بالبسملہ کی حدیثیں بیان کی ہیں، ان کی اس نوعیت کی حدیثوں کو ہم مستقلاً کتاب الجہر میں لکھ چکے ہیں، یہاں اختصار کی وجہ سے ان ہی چند لوگوں کی روایتوں پر اکتفا کیا گیا ہے، اس رسالہ میں ان صحابہ و تابعین کے مرویات بھی جمع کیے گئے ہیں جو بسم اللہ زور سے پڑھنے کے قائل ہیں اور ان کے بھی جو ان کے مخالف یعنی آہستہ سے پڑھنے کے قائل ہیں۔'' (سنن دار قطنی ج ۱ ص ۱۱۷)

اس کا جماعتی عصبیت سے کوئی تعلق نہیں، اگر امام دار قطنی کے پیش نظر جماعتی عصبیت ہوتی تو وہ اس میں اور سنن میں صرف جہر کی مؤید حدیثیں ہی شامل کرتے لیکن انہوں نے مؤید کے ساتھ مخالف حدیثیں بھی درج کر کے درحقیقت انصاف اور حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے، اس معاملہ میں انہوں نے مصر کے جو شوافع کا مرکز تھا لوگوں کی خواہش اور مرضی کی بھی کوئی پروا نہ کی، جو چاہتے تھے کہ امام صاحب صرف جہر کی مؤید حدیثیں جمع کریں، مگر امام صاحب نے استقصاء و جامعیت کے پیش نظر ہر قسم کی حدیثیں جمع کیں اور لوگوں کے سوال پر صاف صاف اقرار بھی کر لیا کہ جہر کے متعلق کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں، اسی طرح سنن میں بھی اس نوعیت کی بعض حدیثوں کے ضعف و وہن کی وضاحت کی ہے۔

رہا رجوع کا معاملہ تو وہ خالی از امکان نہیں، کیونکہ امام صاحب نے جس وقت یہ رسالہ تالیف کیا تھا، ممکن ہے اس وقت زیر بحث مسئلہ ان کی نگاہ میں منقح نہ رہا ہو لیکن بعد میں جب رسالہ کے بارے میں سوالات کیے گئے اور امام صاحب کو اس معاملہ میں زیادہ توجہ سے غور کرنے کا موقع ملا تو اس وقت یہ مسئلہ ان کی نگاہ میں منقح ہو گیا، جیسا کہ ان کے جواب سے معلوم ہوتا ہے، اس تنقیح کے بعد ممکن ہے، انہوں نے رجوع بھی کر لیا ہو لیکن اس کی کوئی تصریح موجود نہیں ہے، اس لیے محض امکان و قیاس کی بنیاد پر اس کو تسلیم کرنا محال ہے لیکن رجوع نہ کرنے سے یہ خیال کرنا کہ ان کی رائے ضد اور عصبیت پر مبنی ہے، صحیح نہیں کیونکہ امام صاحب اور ان لوگوں کے جو جہری نمازوں میں زور سے بسم اللہ پڑھنے کے قائل ہیں، متعدد دلائل موجود ہیں، ان سے تعرض کرنے کا یہ محل نہیں ہے، فقہی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے، ان دلائل سے کسی کو اتفاق ہو یا اختلاف لیکن ان کی گنجائش سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ امام صاحب کے غلو اور بے جا عصبیت کا اس واقعہ سے کوئی پتہ نہیں چلتا، ان کا شافعی مذہب کی طرف میلان ضرور تھا لیکن وہ مجتہد فی المذہب تھے، مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم لکھتے ہیں کہ:

''امام دار قطنی شافعی مذہب کی طرف مائل تھے، مگر وہ مجتہدین اور ائمہ حدیث و سنت میں تھے، ان کا حال اپنے مابعد کے اکابر محدثین کی طرح نہیں جو سوائے چند گنے چنے مسائل کے عموماً تقلید کو لازمی سمجھتے تھے، امام دار قطنی فقہ و اجتہاد اور علم میں لوگوں سے فائق و برتر تھے۔'' (مقدمہ فتح الملہم شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۰۱ بحوالہ توجیہ النظر)

اعتراض کے دوسرے جز و یعنی حنفی مذہب سے تعصب و عناد کے سلسلہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے امام ابو حنیفہ پر طعن

Marfat.com

کیا ہے، اسکی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے سنن میں امام صاحب پر حدیث میں ضعف، تفرد اور ثقہ راویوں کی مخالفت وعدم متابعت کا الزام لگایا ہے۔

بلاشبہ امام دارقطنی کے نزدیک امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا پایہ فقہ واجتہاد کی طرح روایت حدیث میں زیادہ بلند نہیں تھا اور انہوں نے سنن میں ان کو ضعیف بھی کہا ہے اور مشہور حدیث: (من کان له امام فقرأة الامام قرأة له) کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ تمام معتبر وثقہ راویوں نے حضرت جابرؓ کا نام لیے بغیر اس کو مرسل روایت کیا ہے لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو مسند بیان کیا ہے اور اس کے سلسلہ اسناد میں حضرت جابرؓ کا بھی ذکر کیا ہے۔ (سنن دارقطنی ج ا ص ۱۲۳)

اسی طرح دوسری جگہ وہ کہتے ہیں کہ وضو میں حضرت خالد بن علقمہ کے واسطہ سے تین دفعہ سر کا مسح کرنے کو صرف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے، جبکہ دوسرے ثقہ راویوں نے خالد بن علقمہ ہی کے واسطہ سے اس میں صرف ایک دفعہ مسح کرنے کو بیان کیا ہے۔

اس موقع پر امام دارقطنی نے امام صاحب پر ایک اعتراض اور کیا ہے اور وہ یہ کہ تین دفعہ مسح کرنے کی روایت بیان کرنے کے باوجود وہ ایک ہی دفعہ مسح کرنے کو مسنون سمجھتے ہیں۔ (سنن دارقطنی ج ا ص ۱۳۳)

لیکن ان سب اعتراضات میں امام دارقطنی منفرد نہیں ہیں، بعض اور محدثین کا بھی یہی خیال ہے اور وہ بھی امام صاحب کو ضعیف الحدیث سمجھتے تھے اور مذکورہ بالا حدیثوں کے سلسلہ میں انہوں نے بھی امام صاحب پر ثقہ راویوں کی مخالفت کا الزام لگایا ہے لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو ضعیف الحدیث سمجھنا غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے مگر ان غلط فہمیوں کے بعض وجوہ واسباب بھی تھے جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے، اس لیے محدثین کو ان اسباب کی بنا پر معذور سمجھنا چاہیے، وہ کسی غلط جذبہ، بدنیتی، مخالفت اور تعصب کی وجہ سے امام صاحب سے سوئے ظن نہیں رکھتے تھے، بلکہ ایک اعتبار سے درحقیقت اس سے ان لوگوں کی صاف گوئی اور حق پسندی کا پتہ چلتا ہے کہ بڑے بڑے ائمہ کا علم وفضل اور زہد واتقا بھی ان کی حق پسندی میں مانع نہ ہوا اور انہوں نے اس رائے کو جسے وہ صحیح سمجھتے تھے، دیانت داری کے ساتھ ظاہر کر دیا۔

لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو ضعیف الحدیث قرار دینے والے محدثین بہت تھوڑے ہیں، اکثر ائمہ فن سے ان کی تعریف وتوثیق منقول ہے، علامہ ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو ثقہ قرار دینے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔

(حواشی سنن دارقطنی ج ا ص ۲۳)

رہیں وہ حدیثیں جن کے سلسلہ میں امام صاحب پر عدم متابعت اور ثقہ راویوں کی مخالفت کا الزام لگایا گیا ہے تو چونکہ ان کی ثقاہت محدثین کی ایک بڑی جماعت کے نزدیک مسلم ہے، اس لیے ان کا اضافہ مقبول ومعتبر ہوگا۔

پہلی حدیث: (من کان له امام الخ) کے سلسلہ میں امام صاحب کی جانب سے یہ جواب دیا گیا ہے کہ اس کو محمد بن منیع نے اپنی مسند اور امام محمد نے موطا اور کتاب الآثار میں مسند بیان کیا ہے اور ابن ہمام کا بیان ہے کہ ان کی سندیں صحیحین کے شرائط کے مطابق صحیح ہیں اور محمد بن منیع کی روایت میں سفیان وشریک نے جو صحیحین کے رجال میں ہیں حضرت جابر کا نام لینے اور حدیث کو مسند بیان کرنے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی متابعت کی ہے۔

(حاشیہ نصب الرایہ ج ۲ ص ۷، ۸ وحاشیہ معانی الآثار طحاوی ج ا ص ۱۲۸ وفیض الباری ج ۲ ص ۲۷۷ و ۲۷۸)

Marfat.com

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کو حضرت جابرؓ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انس بن مالکؓ نے بھی روایت کیا ہے اور گو بعض کے طرق میں ضعف بھی ہے تاہم صحیح اور تعدد و کثرتِ طرق نے اس کو قوی کر دیا ہے۔ (نصب الرایہ)

تثلیث مسح کے متعلق بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی زیادتی کو ثقہ کی زیادتی سمجھ کر قبول کیا جائے گا، دوسرے اس حدیث کے بھی شواہد و متابعات موجود ہیں اور ان میں سے بعض کو خود امام دارقطنی نے بھی بیان کیا ہے، اس لیے اس کے بارے میں بھی امام دارقطنی کا اعتراض بے معنیٰ معلوم ہوتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جب خود ہی تین دفعہ سر کا مسح کرنے کی روایت کی ہے تو ان کے نزدیک ایک دفعہ مسح کرنا کیوں مسنون ہے، گو امام دارقطنی کا یہ اعتراض صحیح ہے لیکن کسی چیز کی روایت کر دینے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ خود راوی کا اس کے مطابق عمل اور فتویٰ بھی ہو، امام دارقطنی اور دوسرے محدثین نے کتنی ایسی حدیثیں روایت کی ہیں جن کے مطابق ان کا عمل نہیں ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ امام دارقطنی کو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کوئی عناد اور تعصب نہ تھا، انہوں نے نہایت فراخدلی سے حنفی مذہب کے ایک اہم رکن امام محمد کو ثقہ محدثین میں شمار کیا ہے، (امام ابن ماجہ اور علم حدیث از عبدالرشید نعمانی بحوالہ غرائب مالک دارقطنی) البتہ بعض اور اکابر محدثین کی طرح وہ امام صاحب کا پایہ حدیث میں زیادہ بلند نہیں سمجھتے تھے اور اپنی حق پسندی کی وجہ سے انہوں نے امام صاحب کی عظمت و جلالت کے باوجود اپنی اس رائے کو جسے وہ صحیح سمجھتے تھے، بیان بھی کر دیا، یہ الگ بات ہے کہ ان کی رائے غلط فہمی پر مبنی ہے لیکن اس میں وہ معذور تھے اور ان کی عظمت شان سے اس قسم کا تعصب بعید ہے جو بیان کیا جاتا ہے۔

تصنیفات:

امام دارقطنی نے بے شمار کتابیں یادگار چھوڑیں جو سب مفید، بلند پایہ اور حسن تالیف کا نمونہ ہیں (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۰ والبدایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷) ان میں سے اکثر حدیث، اصول حدیث اور رجال کے موضوع پر لکھی گئیں تھیں، مگر اب زیادہ تر نایاب ہیں، ذیل میں ان کی تصنیفات کے نام اور بعض کے بارے میں مختصر معلومات تحریر کیے جاتے ہیں۔

۱۔ کتاب الرؤیۃ (پانچ جزوں میں)، ۲۔ کتاب المستجاد، ۳۔ کتاب معرفۃ مذاہب الفقہاء، (کشف الظنون ج ۲) ۴۔ غریب اللغۃ: محمد بن طاہر مقدسی المعروف بابن القیسرانی (م ۵۰۷ھ) نے اس کے اطراف لکھے تھے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۱۵۸)

۵۔ اختلاف الموطآت:

اس میں موطا امام مالک کی روایتوں اور اس کے مختلف نسخوں پر بحث کی گئی ہے۔ (حیات امام مالک مولانا سید سلیمان ندوی ص ۱۰۲)

۶۔ غرائب مالک:

اس میں امام مالکؒ کی ان غریب حدیثوں کا ذکر ہے جو موطا میں شامل نہیں ہیں، ممکن ہے یہ وہی کتاب ہو جو امام دارقطنی

Marfat.com

کی جانب کتاب الغرائب کے نام سے منسوب ہے، ابن عبدالہادی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضخیم کتاب تھی۔
(الرسالۃ المستطرفہ ص ۹۴،۹۵)

۷۔ الاربعین:

نام سے ظاہر ہے کہ اس میں چہل حدیثیں درج ہوں گی، یہ اس فن کی قدیم کتابوں میں ہے۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۸۷)

۸۔ کتاب الضعفاء:

یہ دراصل امام دارقطنی کے ان حواشی پر مشتمل ہے جو علامہ ابن حبان کی کتاب الضعفاء پر انہوں نے لکھے تھے، (تدریب الراوی ص ۲۶۱ و الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۱۸،۱۱۹) اس میں ضعیف راویوں کا حال اور ان کی معرفت کا ذکر ہے، رجال کی اکثر کتابوں میں امام دارقطنی کے جو اقوال درج ہیں وہ غالباً اسی سے ماخوذ ہوں گے، اس لحاظ سے یہ اہم کتاب ہے۔

۹۔ اسماء المدلسین:

اس موضوع پر امام حسین بن علی کرابیسی (م ۲۴۵ھ) اور امام نسائی (م ۳۰۳ھ) نے پہلے کتابیں لکھی تھیں، یہ غالباً اس فن کی تیسری مشہور کتاب ہے۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۹۸)

۱۰۔ اسئلۃ الحاکم:

اس میں ان سوالات کا جواب دیا گیا ہے جو غالباً حاکم صاحب مستدرک نے دارقطنی سے حدیث و رجال وغیرہ کے بارے میں کئے ہوں گے، زین الدین قاسم بن قطلوبغا حنفی (م ۸۷۹ھ) نے اس کو جمع کیا تھا۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۱۰۰)

۱۱۔ باب القضاء بالیمین مع الشاہد:

حدیث کی بعض کتابوں میں صرف ایک ہی باب کی روایتیں شامل ہوتی ہیں، یہ کتاب اسی قسم کی ہے اور اس میں صرف ایک ہی باب کی حدیثیں درج ہیں۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۵۳، الرسالۃ المستطرفہ ص ۴۲)

۱۲۔ کتاب الجہر:

یہ بھی اسی نوعیت کی کتاب ہے، اس میں نماز میں بسم اللہ کو زور اور آہستہ سے پڑھنے کے بارے میں حدیثیں اور آثار درج ہیں۔ (سنن دارقطنی ص ۱۱۷)

۱۳۔ رسالہ قراءت:

فن قراءت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ ہے، اس کے شروع میں اس فن کے اصول و قاعدے اور پھر فنی بحثیں تحریر کی گئی ہیں، اس کی ترتیب و تبویب اور طریقہ تالیف کو اتنا پسند کیا گیا کہ بعد کے مولفین نے اسی ڈھنگ پر اپنی کتابیں مرتب کیں، ابن الجزری طبقات القراء میں لکھتے ہیں کہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔
(تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴،۳۵ و حاشیہ العبر ج ۳ ص ۲۹)

Marfat.com

۱۴۔ الرباعیات:

اس میں مشہور محدث ابوبکر محمد بن عبداللہ بن ابراہیم المعروف بزار (۳۵۴ھ) کی تصنیف رباعیات کی جو غیلانیات کے نام سے مشہور ہے تخریج کی گئی ہے اور امام بخاری کی رباعیات کو علیحدہ ایک رسالہ میں مرتب کیا گیا ہے، یہ ایک زمانہ میں بہت متداول تھی۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۵۴۳)

۱۵۔ کتاب المجتبیٰ من السنن الماثورہ:

یہ غالباً امام دارقطنی کی شہرۂ آفاق سنن کا انتخاب ہے، کتب خانہ خدیویہ مصر میں اس کی دوسری جلد کا قلمی نسخہ موجود ہے جو کتاب الزکوٰۃ سے آخر تک کے ابواب پر مشتمل ہے، کاتب کا نام عبداللہ بن محمد بن حسن موصلی المعروف بابن ترکیہ اور سن کتابت ۶۳۸ھ ہے۔ (الاعلام ج ۲ ص ۶۲۳ وفہرست کتب خدیویہ مصر ۱ ص ۳۹۸)

۱۶۔ کتاب الاخوۃ: [1]

اس فن میں امام دارقطنی سے پہلے اور ان کے بعد متعدد کتابیں لکھی گئیں، اس کو اہم اور مفید کتابوں میں خیال کیا جاتا ہے۔

۱۷۔ کتاب الافراد: [2]

یہ کتاب بڑی جامع اور سو اجزا پر مشتمل ہے، ابوالفضل بن طاہر نے اس کے اطراف لکھے تھے۔

(البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷ والرسالۃ المستطرفہ ص ۹۵)

۱۸۔ کتاب التصحیف: [3]

اس فن میں یہ ایک مفید اور جامع کتاب ہے، علامہ سیوطی کا بیان ہے:

اورد الدارقطنی فی کتاب التصحیف کل تصحیف وقع للعلماء حتی فی القرآن۔

(تدریب الراوی ص ۱۹۶)

امام دارقطنی نے کتاب التصحیف میں ان سب تصحیفات کا ذکر کیا ہے جو علما کو پیش آئی ہیں، یہاں تک کہ حدیث کے علاوہ قرآن کی

---

[1] (اس فن میں علی بن مدینی، امام نسائی اور ابوالعباس سراج وغیرہ متقدمین کی کتابیں اہم ہیں، اس کو ضبط کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دو شخصوں کی ولدیت میں اشتراک کی وجہ سے ان کو عینی بھائی نہ خیال کیا جائے۔ (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۵۵ وتدریب الراوی ص ۲۱۸)

[2] (یہ بڑا اہم اور مشکل موضوع ہے، اسلئے اس میں ماہر محدثین ہی نے کتابیں لکھی ہیں، ارباب فن کے نزدیک فرد کی دو قسمیں ہیں، مطلق اور نسبی، اول الذکر میں ایک شخص تمام رواۃ سے تفرد کرتا ہے، موخر الذکر میں کسی خاص پہلو اور حیثیت سے تفرد ہوتا ہے جیسے کسی روایت میں کسی خاص مقام کے راویوں کا تفرد۔

(مقدمہ ابن صلاح ص ۲۲۱ و ۲۲۲)

[3] (تصحیف وخطا سے محفوظ رہنا بہت مشکل ہے امام احمد فرماتے ہیں کہ اس سے کون بچ سکتا ہے، یہ اسناد ومتون دونوں میں ہوتی ہے، اسناد کی مثال یہ ہے کہ یحییٰ بن معین نے عوام بن مراجم (بالراء والجیم) مزاحم کر دیا اور متن کی مثال یہ ہے کہ ابن لہیعہ نے: ان النبی ﷺ احتجر فی المسجد میں احتجر کو احتجم کر دیا۔ (تدریب الراوی ص ۱۹۶)

Marfat.com

تصحیف بھی بیان کی ہے۔

۱۹۔ کتاب المؤتلف والمختلف: [1]

اس فن میں ابن ماکولا کی کتاب الاکمال زیادہ اہم اور مشہور ہے تاہم دارقطنی کی کتاب بھی جامع اور پر از معلومات ہے، سیوطی کا خیال ہے کہ اس موضوع پر پہلی کتاب دارقطنی کے شاگرد عبدالغنی بن سعید نے لکھی اور امام دارقطنی کی کتاب اس کے بعد لکھی گئی لیکن نواب صدیق حسن خان صاحب لکھتے ہیں کہ ''ابوعبداللہ محمد بن علی کا بیان ہے کہ عبدالغنی نے المؤتلف والمختلف لکھنے کے بعد جب اس کو امام دارقطنی کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے عبدالغنی سے پڑھنے کے لیے کہا، عبدالغنی نے کہا ''میں اسے کیا پڑھوں، میں نے تو اس کو آپ ہی سے استفادہ کر کے لکھا ہے۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالغنی کی تصنیف درحقیقت امام دارقطنی کے افادات پر مشتمل ہے، اس لحاظ سے گویا اس فن میں تقدم واولیت کا شرف انہی کو ہے، امام دارقطنی کی کتاب کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ اسکے بعد اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے اکثر کی اساس وبنیاد اسی پر ہے، علاوہ ازیں اسکے مختلف ذیول واستدراک بھی لکھے گئے ہیں۔ (مقدمہ ابن صلاح ص ۲۷ وتدریب الراوی ص ۲۳۵ واتحاف النبلاء المتقین ص ۱۳۷)

۲۰۔ کتاب العلل: [2]

یہ کتاب اس موضوع پر متقدمین کی کتابوں کا نچوڑ اور بڑی جامع ہے، ابوعبداللہ حمید اندلسی کا بیان ہے کہ فن حدیث کی تین اہم چیزوں میں ایک العلل بھی ہے اور اس میں سب سے عمدہ کتاب امام دارقطنی کی ہے، (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۹۰) ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ''اس میں صحیح وغلط، متصل، مرسل اور منقطع ومعضل وغیرہ کی وضاحت کی گئی ہے۔'' اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علل کے طرق کی کثرت وتعدد کو جمع کیا گیا ہے، یہ مسانید کی ترتیب پر ہے، امام دارقطنی نے اس کا املا کرا دیا تھا اور ان کے شاگرد ابوبکر برقانی نے اس کو جمع وترتیب دیا تھا۔

(البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷ والمنتظم ج ۷ ص ۸۳ وتدریب الراوی ص ۸۸ و ۸۹ و ۹۱ ورسالہ مستطرفہ ص ۱۲۲)

حافظ ابن حجر کے ہاتھ کا لکھا ہوا، اس کا ایک قلمی نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے (مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۶) اور خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی اس کا مخطوطہ ہے، جو تین جلدوں پر مشتمل ہے، (فہرست خدا بخش خان لائبریری ص ۵۵) ہر جلد کے متعلق علیحدہ علیحدہ مندرجہ ذیل تعارفی نوٹ درج ہیں:

المجلد الثانی:

اس میں مسند احادیث کی خامیوں اور نقائص کو بتایا گیا ہے، یہ حدیثیں اکابر صحابہؓ یعنی حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی مرتضیٰ، طلحہ زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل اور حضرت ابو

---

[1] (اگر راویوں کے نام تحریر وکتابت میں یکساں اور ہمشکل ہوں لیکن تلفظ وتکلم میں مختلف ہوں تو اسے اصطلاح میں مؤتلف ومختلف کہا جاتا ہے۔
(مقدمہ ابن صلاح ص ۱۷۲)

[2] (معلل ان مسند حدیثوں کو کہا جاتا ہے جن کے متن یا اسناد میں کوئی ایسی پوشیدہ علت اور مخفی عیب ہوتا ہے جس کی صحت بآسانی نہ ہو سکے تاوقتیکہ تمام سندوں اور صحیح متن کا ٹھیک طور پر پتہ نہ ہو۔ (تدریب الراوی ص ۸۹)

Marfat.com

ذر (رضوان اللہ علیہم اجمعین) وغیرہ سے منسوب ہیں اور تھوڑی حدیثیں جو حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ ہیں ان میں بھی کچھ نقائص وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، یہ قلمی نسخہ بہت نایاب ہے اور کسی کتب خانہ کی فہرست میں نہیں دیکھا گیا، خط نسخ میں خوشخط لکھا ہوا ہے، اس پر کوئی تاریخ وغیرہ نہیں ہے مگر آٹھویں صدی ہجری کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

المجلد الثالث:

یہ علل الحدیث کی تیسری جلد ہے، باقی ماندہ اسناد حدیث جو حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہیں، ان کی خامیوں اور نقائص پر بحث کی گئی ہے، ۱۳۰۹ھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔

المجلد الخامس:

کتاب علل الحدیث کا یہ آخری حصہ ہے، اس میں ان مسند حدیثوں پر تنقید کی گئی ہے جو آنحضرت ﷺ کے کچھ اصحاب وصحابیات سے مروی ہیں، کاتب نے اس نسخہ کے آخر میں تحریر کیا ہے کہ یہ نسخہ اس نے ۱۳۰۹ھ کے ایک مکتوبہ نسخے سے نقل کیا ہے، مگر اپنا نام نہیں لکھا ہے، یہ نسخہ اور اس کے اور سب حصے جن کا ذکر ہو چکا ہے، ایک ہی کاتب کے تحریر کردہ معلوم ہوتے ہیں، (نوادر خدا بخش لائبریری ج ۱ ص ۹۳ تا ۹۵) تیسری اور پانچویں جلدوں کے مخطوطے کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں بھی پائے جاتے ہیں، تیسری جلد ۱۳۱۰ھ کی لکھی ہوئی ہے، (فہرست کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد ج ۱ ص ۶۴۶ و ۶۴۷) اسی طرح مکتبہ سندیہ میں بھی علل کا نسخہ ہے۔

۲۱۔ کتاب الاسخیاء:

اس میں جود و سخاوت کی فضیلت اور اسخیا کے محامد و محاسن کے متعلق حدیثیں اور بعض واقعات سنداً بیان کئے گئے ہیں، اس کا ایک قلمی نسخہ ۶۰۰ھ کا نسخ میں لکھا ہوا خدا بخش لائبریری میں موجود تھا، (فہرست کتب خانہ خدا بخش لائبریری جلد اول ص ۳۹) ۱۹۳۴ء میں مولانا سید وجاہت حسین صاحب استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ نے اس کو تصحیح و مقابلہ کے بعد حواشی و مقدمہ کے ساتھ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال سے شائع کیا ہے، مقدمہ میں امام دارقطنی کے حالات و کمالات اور اس کتاب کے بارے میں مفید معلومات لکھی گئی ہیں۔

۲۲ و ۲۳۔ کتاب الالزامات والتتبع:

صحیح کی اہمیت و مقبولیت مسلّم ہے لیکن بعض حیثیتوں سے ان پر محدثین کی ایک جماعت نے کچھ ایرادات بھی کئے ہیں، ان لوگوں میں امام دارقطنی کا نام زیادہ ممتاز ہے، ان کی علل حدیث سے گہری واقفیت اور دقت نظر کا اہل فن کو اعتراف ہے، ان کے اعتراضات اور شکوک دو طرح کے ہیں، پہلے کو انہوں نے کتاب الالزامات میں ذکر کیا ہے، اس کے متعلق وہ خود تحریر فرماتے ہیں:

مما اخرجه البخاری و مسلم او احدهما من حدیث بعض التابعین و ترکا من حدیثه شبیهابه ولم یخرجاه او من حدیث نظیر له من التابعین الثقات یلزم اخراجه علی شرطهما و مذهبهما فیما نذکره ان شاء الله۔
(دیباجہ کتاب الالزامات)

Marfat.com

امام بخاری و مسلم دونوں یا ان میں سے ایک بزرگ نے کسی تابعی کی ایک حدیث کی تخریج کی ہے اور اسی تابعی کی دوسری حدیث کو چھوڑ دیا یا بعض ایسی حدیثوں کی تخریج نہیں کی ہے جو ثقہ تابعین سے مروی تھیں، حالانکہ ان حضرات کے اصول و شرائط کے مطابق ان کی تخریج لازمی تھی، ان شاء اللہ آگے ہم اس پر گفتگو کریں گے۔

علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

الزم الا مام الحافظ ابو الحسن علی بن عمر الدار قطنی رحمہ اللہ وغیرہ البخاری ومسلما رضی اللہ عنہما اخراج احادیث ترکا اخراجہا مع ان اسانیدھا اسانید قد اخرجا لرواتہا فی صحیحہما بہا وذکر الدار قطنی وغیرہ ان جماعۃ من الصحابۃ رضی اللہ عنہم رووا عن رسول اللہ ﷺ ورویت احادیثہم من وجوہ صحاح لا مطعن فی ناقلیہا ولم یخرجا من احادیثہم شیئا فلیلزمہما اخراجہا علی مذہبیہما۔

(مقدمہ مسلم نووی ص ۲۴)

امام دارقطنی نے امام بخاری اور امام مسلم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے بہت سی ایسی حدیثیں چھوڑ دی ہیں جن کے راویوں کی سندوں سے خود انہوں نے صحیحین میں روایت کی ہے، امام دارقطنی وغیرہ کا بیان ہے کہ ان حضرات نے ایسی حدیثیں بھی نظر انداز کی ہیں جن کو صحابہ کی ایک جماعت نے رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا ہے اور جو بعد میں صحیح طریقوں سے بیان کی گئی ہیں اور ان کے راویوں میں کسی قسم کا کوئی طعن بھی نہیں پایا جاتا حالانکہ ان لوگوں کے اصول و مذہب کے مطابق ان کی تخریج لازم تھی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام دارقطنی نے اپنے اس رسالہ میں ان صحیح حدیثوں کو جمع کیا ہے جو صحیحین کی شرطوں کے مطابق ہونے کے باوجود ان میں شامل نہیں ہیں، اس حیثیت سے اس کی وہی نوعیت ہے جو حاکم کی المستدرک کی ہے۔

دوسرے رسالہ التتبع میں امام بخاری و مسلم پر نقد و تعقب کیا گیا ہے، صاحب کشف الظنون کا بیان ہے۔

وھو ما اخرج فی الصحیحین ولہ علۃ۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۲۶۸)

یہ رسالہ صحیحین کی ان حدیثوں کا مجموعہ ہے جن کے اندر علت پائی جاتی ہے۔

یعنی اس میں امام بخاری و مسلم کے اوہام و علل پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، حافظ ابن حجرؒ نے ان حدیثوں کی جن کو امام دارقطنی نے موضوع بحث بنایا ہے، تعداد ایک سو دس بتائی ہے، ان میں بتیس حدیثیں متفق علیہ ہیں اور اٹہتر صرف صحیح بخاری کی ہیں۔

عام طور سے علمائے فن نے امام دارقطنی کے اعتراضات کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری کے مقدمہ میں کتاب التتبع کی ہر ہر حدیث پر مفصل اور محققانہ بحث کر کے امام دارقطنی کے اعتراضات کا جواب دیا ہے، امام نووی نے بھی شرح مسلم اور شرح بخاری کے مقدمہ میں ان شبہات کا ازالہ کیا ہے جن کو امام دارقطنی نے تحریر کیا ہے، اسی طرح علامہ عینی اور قسطلانی کی شروح بخاری میں بھی دارقطنی کے الزامات کا جواب دیا گیا ہے، ان محققین کے جوابات کا ماحصل یہ ہے کہ امام بخاری و مسلم کی کتابوں کو صحیح حدیثوں کا مجموعہ اس لیے کہا گیا ہے کہ ان کی سب حدیثیں صحیح اور منقح ہیں، باقی جو صحیح روایتیں ان میں شامل نہیں ہیں، اس کی وجہ سے ان پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا کیونکہ ان دونوں کتابوں کا مقصد تمام صحیح حدیثوں کا حصر نہیں ہے۔

لیکن یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ ان حضرات نے امام دارقطنی کے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ تمام تر درست ہی ہے، اور ان کے سارے اعتراضات بالکل ہی بے معنی ہیں، کیونکہ جواب میں بعض جگہ تکلف سے بھی کام لیا گیا ہے، مولانا انور

Marfat.com

شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

''امام دارقطنی نے سو سے زیادہ مقامات میں امام بخاری پر تعاقب کیا ہے لیکن ان کا نقد و کلام محض اسانید کے وصل و ارسال تک محدود ہے، سوائے ایک جگہ یعنی (اذا جاء احدکم والامام یخطب فلیصل رکعتین ولیتجوز فیھما) کے، یہاں انہوں نے حدیث کے متن پر بھی کلام کیا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ دارقطنی محدثین کے مرتب قاعدوں پر چلنے کے عادی ہیں اور اسی حیثیت سے وہ اعتراض کرتے ہیں لیکن امام بخاری کی شان اس سے بہت بلند ہے، وہ اپنی بصیرت، اجتہاد اور وجدان پر اعتماد کرتے ہیں، قاعدے تو ناواقفین اور عوام کے لیے بنائے گئے ہیں تاکہ غیر محدود کو محدود کیا جا سکے اور امام بخاری و مسلم کا مرتبہ سب سے بڑھ کر ہے۔''

(مقدمہ فیض الباری ص ۵۷)

امام دارقطنی کی ایرادات کے بے نتیجہ اور بلا وزن نہ ہونے کا ثبوت یہ بھی ہے کہ ان کی بنا پر صحیحین کی اس قسم کی حدیثوں کا قطعی الصحت ہونا محتمل قرار دیا گیا ہے، چنانچہ علامہ ابن صلاح لکھتے ہیں:

القول بان ما انفرد به البخاری او مسلم مندرج فی قبیل مایقطع بصحته لتلقی الامة کل واحد من کتابیهما بالقبول علی الوجه الذی فصلناه عن حالهما فیما سبق سوی احرف یسیرة تکلم فیها بعض اهل النقد من الحفاظ کالدارقطنی وغیره وهی معروفة عند اهل هذا الشان والله اعلم۔ [1]

امام بخاری یا امام مسلم نے تنہا جن حدیثوں کو بیان کیا ہے وہ بھی قطعی الصحت حدیثوں میں شامل ہیں کیونکہ امت میں ان دونوں کتابوں کو تلقی بالقبول حاصل ہے جیسا کہ پہلے اس کی تفصیل گزر چکی ہے، بجز ان چند حدیثوں کے جن پر نقادانِ فن اور ائمہ حدیث جیسے دارقطنی وغیرہ نے کلام کیا ہے اور یہ حدیثیں ماہرین فن کے نزدیک مشہور و معروف ہیں۔

درحقیقت امام دارقطنی کے اعتراضات کی وہی حیثیت ہے جو حاکم صاحب مستدرک کے استدراکات کی ہے، شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک حیثیت سے صحیح اور دوسری حیثیت سے غلط ہیں، (حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۰۶ و ۱۰۷) صحیح اس حیثیت سے ہیں کہ امام دارقطنی کی حدیثیں شیخین کے رجال اور شرائط کے مطابق ہیں لیکن غلط اس بنا پر ہیں کہ شیخین اسی

[1] (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۴ و ۱۵ مگر علامہ ابن صلاح کے اس بیان کے پہلے حصہ یعنی بخاری یا مسلم کی حدیثوں کا قطعی الصحت ہونا جمہور کے نزدیک قابل تسلیم نہیں ہے، چنانچہ علامہ نووی لکھتے ہیں کہ ''جمہور علمائے محققین نے ابن صلاح کے قول سے اختلاف کیا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ اگر حدیث متواتر نہ ہو تو اس سے قطعیت کے بجائے صرف ظن کا فائدہ حاصل ہوگا)'' البتہ حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن حجر اور مولانا انور شاہ کشمیری، علامہ ابن صلاح کے ہمنوا ہیں شاہ لکھتے ہیں:

واختلفوا فی ان احادیث الصحیحین جعل تفید القطع ام لا فالجمهو الی انها تفید القطع وذهب الحافظ الی انها تفید القطع والیه جنح شمس الائمة السرخسی من الحنفیة والحافظ ابن تیمیة من الحنابلة والشیخ عمرو بن صلاح وهولاء وان کانوا اقل عددا الا ان رأیهم هو الرای))ثم صرح الحافظ رضی الله عنه ان افادتها القطع نظری هذا۔ (مقدمہ فیض الباری ص ۴۵)

صحیحین کی حدیثوں کے مفید قطعی ہونے میں اختلاف ہے جمہور ان کو مفید قطعی نہیں مانتے لیکن حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان سے قطعیت کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، حنفیہ میں امام سرخسی اور حنابلہ میں حافظ ابن تیمیہ نیز شیخ عمرو بن صلاح کا رجحان اسی جانب ہے، ان لوگوں کی تعداد اگرچہ کم ہے لیکن یہی رائے صحیح ہے۔۔۔۔۔ پھر حافظ ابن حجر نے تصریح کی ہے کہ یہ مفید قطعی نظری ہوتی ہیں)۔

Marfat.com

حدیث کو ذکر کرتے ہیں جس کی صحت پر بحث مباحثے کے بعد ان کے شیوخ کا اجماع ہو گیا ہے اور مشائخ وائمہ حدیث نے اس کی صحت تسلیم کرلی ہے، پس صحیحین کی خصوصیت اور امتیاز یہ ہے کہ وہ صرف قاعدہ اور اصولوں سے حدیث تسلیم نہیں کرتے بلکہ ہر ہر حدیث کے وصل وانقطاع، رفع وارسال، شذوذ ونکات وغیرہ پر مستقل طور سے بحث کر کے صحت کا فیصلہ صادر کرتے ہیں اور انہی حدیثوں کو صحیحین میں نقل کرتے ہیں جن کی صحت پر پہلے محدثین نے تحقیقات کے بعد اتفاق کرلیا ہے لیکن امام دارقطنی وغیرہ محض اصول وقواعد ہی کی بنا پر حدیث کو صحیح قرار دے دیتے ہیں۔

امام دارقطنی کے اعتراضات اہم ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کی دقت نظر، کثرت تدبر اور اخلاص ونیک نیتی کا ثبوت ضرور ہیں، امام بخاری کے ایک بڑے مداح مولانا عبدالسلام مبارک پوری لکھتے ہیں:

"امام دارقطنی بڑے پایہ کے ناقد تسلیم کئے گئے ہیں، انہوں نے صحیح کو بلاتقلید احد حرفاً حرفاً جانچا اور بلاتردد دل کھول کر لیکن دیانت سے جو شکوک ان کے ذہن میں آئے سب کو رسالہ کی صورت میں جمع کیا، خواہ وہ شکوک متن سے لگاؤ رکھتے ہوں، سلسلہ اسناد سے یا راویوں سے۔" (سیرت البخاری ص ۹۶)

امام دارقطنی کے یہ دونوں رسالے کمیاب تھے اور عموماً ان کو ایک ہی کتاب خیال کیا جاتا ہے، حیدرآباد کے کتب خانہ آصفیہ اور بہار شریف کے مکتبہ علم وحکمت میں ان کے قلمی نسخے موجود ہیں، مولانا ابوسلمہ شفیع احمد بہاری استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ کی مہربانی سے بہار شریف کے نسخہ کی نقل دارالمصنفین کے کتب خانہ میں بھی ہے، یہ خود مولانا کے قلم سے شعبان المعظم ۱۳۵۶ھ میں نقل ہوا ہے لیکن اصل نسخہ کا سن تحریر معلوم نہیں ہوسکا، پہلا رسالہ بڑی تقطیع کے آٹھ اور دوسرا ۳/۸ ۳ صفحے پر مشتمل ہے، آخر میں ۱۳ صفحے کا ایک اور رسالہ بھی ان کے ساتھ شامل ہے، یہ امام دارقطنی کے معاصر ابومسعود محمد بن ابراہیم بن عبیداللہ دمشقی (۴۰۱ھ) کی تالیف ہے، انہوں نے امام دارقطنی کے بعض تعقبات کو صحیح تسلیم کیا ہے لیکن اکثر کو غلط اور بعض کو غور وفکر کی کمی کا نتیجہ قرار دیا ہے، ایک حدیث کے بارے میں امام دارقطنی نے لکھا ہے کہ اس کی امام مسلم نے تخریج کی ہے لیکن دمشقی کا بیان ہے کہ ان کی امام مسلم نے سرے سے تخریج ہی نہیں کی ہے، (رسالہ دمشقی قلمی ۵۵) تلاش کے بعد دمشقی کا بیان صحیح معلوم ہوا۔

۴۔ سنن دارقطنی:

یہ امام دارقطنی کی سب سے اہم اور شہرۂ آفاق تصنیف ہے، ذیل میں اس کی اہمیت اور خصوصیات بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سنن کی اہمیت اور کتب حدیث میں اس کا درجہ:

صحاح ستہ کے بعد جو کتابیں شہرت وقبول اور وثوق واعتبار کے لحاظ سے ممتاز اور اہم مانی جاتی ہیں ان میں سنن دارقطنی بھی ہے، بعض اہل علم نے اس کو تقریباً صحاح ستہ ہی کے ہم پایہ قرار دیا ہے، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:

"فن حدیث میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں مگر علمائے سلف وخلف کا اتفاق ہے کہ قرآن مجید کے بعد سب سے زیادہ صحیح اور معتبر کتاب صحیح بخاری ہے، پھر صحیح مسلم اور موطا امام مالک ہیں، ان کے بعد امام ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارقطنی کی کتابوں اور مشہور مسانید کا درجہ ہے۔" (کشف الظنون ج ۱ ص ۴۲۶)

Marfat.com

صحاح ستہ میں تمام صحیح حدیثوں کا حصر واستقصا نہیں ہے، ان کے علاوہ جو کتابیں صحیح اور مستند حدیثوں کے لیے مشہور خیال کی جاتی ہیں ان میں سنن دارقطنی کا نام سرفہرست ہے، علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں:

''صحیحین پر وہ صحیح اضافے مقبول ہیں جن کو امام ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن خزیمہ اور دارقطنی وغیرہ میں سے کسی نے اپنی مشہور ومعتبر کتاب میں بیان کیا ہو اور اس کی صحت کی تصریح کی ہو'' (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۱)

یہی خیال علامہ نووی اور سیوطی کا بھی ہے، (تدریب الراوی ص ۱۰۰ و ۱۰۱) سیوطی اور امام بغوی نے اپنی کتابوں میں صحاح اور مستند کتب حدیث کی طرح سنن دارقطنی کی حدیثوں کی بھی تخریج کی ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ سنن دارقطنی کا درجہ صحاح سے کمتر ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نے اس کو حدیث کے تیسرے طبقہ کی کتابوں میں شمار کیا ہے، (عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۵) البتہ اس طبقہ کی کتابوں میں اس کو یک گونہ خصوصیت ضرور ہے، چنانچہ ابن صلاح، نووی اور سیوطی نے مصنفین صحاح کے بعد کے جن سات نامور محدثین کی تصنیفات کو عمدہ اور زیادہ نفع بخش بتایا ہے ان سب میں امام دارقطنی کا نام سرفہرست گنایا ہے، (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۹۲ و تدریب الراوی ص ۲۶۰) دراصل حدیثوں کی جمع وترتیب کا زیادہ اہم اور مبارک زمانہ تیسری صدی ہجری کا ہے، اس عہد میں روایات کی چھان بین اور راویوں کے نقد وتحقیق کا جو اعلیٰ اور بلند معیار قائم کیا گیا، اس کی مثال بعد کے دور میں نہیں ملتی لیکن تیسری صدی ہجری کا یہ امتیاز مجموعی اعتبار سے ہے کیونکہ اس کے بعد بھی حدیث کے ایسے مجموعے تیار کیے گئے جو صحاح ستہ سے کمتر ہونے کے باوجود اس دور کی دوسری کتابوں کے برابر یا ان سے بڑھ کر ہیں، سنن دارقطنی چوتھی صدی ہجری کی ایسی ہی اہم اور مشہور کتاب ہے جو بعض حیثیتوں سے صحاح کے بعد حدیث کی سب سے اہم کتاب ہے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں ''دارقطنی کی یہ مشہور کتاب اس فن کی بہترین کتابوں میں ہے''۔
(البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷)

خصوصیات:

سنن کی بعض اہم خصوصیات یہ ہیں:

۱ امام دارقطنی کو کثرت وتعدد طرق میں بڑا کمال تھا، سنن میں اسانید وطرق کا انہوں نے استقصا کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ امام صاحب نے سنن کے شروع میں قلتین والی حدیث کے طرق واسانید میں مبالغہ سے کام لیا ہے، چنانچہ اس کی ۵۴ سندیں بیان کی ہیں، اس سے ان کی قوت حفظ اور وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے۔ (بستان المحدثین ص ۴۵) اسی طرح دباغ میتہ کے سلسلے میں ستائیس (۲۷) اور ماء بحر کے متعلق سولہ (۱۶) سندوں اور طرق سے حدیث بیان کی ہے۔
(سنن دارقطنی ص ۵ تا ۱۷ اور ۱۳ اور ۱۴)

۲ وہ فن جرح وتعدیل کے امام تھے، علل اور رجال حدیث پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، اس لیے سنن نقد وجرح کے اقوال کا عمدہ اور مفید ذخیرہ ہے، امام دارقطنی نے حدیثوں کے اکثر طرق واسانید بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر مفصل کلام کر کے ان کی قوت وضعف کا فیصلہ، حدیث کے درجہ ومرتبہ کی تعیین، اس کے صحیح، مرفوع ومسند یا ضعیف، سقیم، موقوف، مرسل، غریب اور منکر ہونے کی تصریح اور ایک قسم کی متعدد حدیثوں میں مرجح اور اصح مافی الباب کی نشاندہی کی ہے، راویوں اور حدیثوں کے بیان کے فرق واختلاف، کی بیشی، متابعت وعدم متابعت اور راوی کے متروک، مجہول، منکر، غیر

Marfat.com

ثابت، واضع، کذاب، سئی الحفظ، مضطرب الحدیث اور نا قابل حجت ہونے یا ثقہ وثابت، قوی وحجت اور عادل وضابط ہونے کی تصریح، ان کے تفرد، دوسرے سے عدم ملاقات وعدم سماع، شک، اضطراب، اختلاف اور حدیث کے متن یا سند میں وہم وخطا پر مفصل کلام کیا ہے اور اس بارے میں اہل علم اور ارباب فن کے اقوال بھی بیان کیے ہیں، اس طرح سنن ترمذی کی طرح اس سے بھی حدیث کا صحیح، حسن اور ضعیف ہونا معلوم ہو جاتا ہے، علامہ ابن صلاح نے اس کی اس خصوصیت کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

ونص الدار قطنی فی سننه علی کثیر من ذالک۔ (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۸)

امام دار قطنی نے سنن میں اکثر حدیثوں کے حسن یا ضعیف ہونے کو واضح کر دیا ہے۔

۳ امام دار قطنی فقہ وخلاف کے ماہر تھے، اس لیے اس کتاب سے فقہی آرا و مذاہب اور اجتہادی مسائل بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔

۴ راوی کے نام وکنیت، وطن ومسکن اور بعض مشکل وغریب الفاظ کی مختصر وضاحت اور تفسیری بحثیں بھی کی گئی ہیں۔

۵ روایت کے حسن وقبح کے ضمن میں بعض واقعات اور تاریخی حالات بھی زیر بحث آ گئے ہیں، مثلاً ایک جگہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے لیلۃ الجن میں شریک نہ ہونے کا ذکر ہے۔ (سنن دار قطنی ص ۲۸)

۶ سنن دار قطنی چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر کی تصنیف ہے، اس لیے اس کی سب سے اعلیٰ اور عمدہ سند خماسی ہے۔

(بستان المحدثین ص ۴۵)

سنن کے نسخے:

امام دار قطنی سے جن لوگوں نے سنن کی روایت کی تھی ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ ابو بکر محمد بن عبد الملک بن بشران، ۲۔ ابو طاہر محمد بن احمد بن محمد بن عبد الرحیم کاتب، ۳۔ ابو منصور محمد بن محمد توقانی، ۴۔ ابو بکر محمد بن احمد بن غالب برقانی، (م ۴۲۵ھ)، ۵۔ ابو طیب طاہر بن عبداللہ بن طاہر طبری (م ۴۴۵ھ)، ۶۔ شریف ابوالحسن محمد بن علی عبداللہ بن عبد الصمد بن مہتدی باللہ۔ (مقدمہ حاشیہ سنن دار قطنی از مولانا شمس الحق عظیم آبادی ص ۳ و ۴) (م ۴۶۵ھ)

اس طرح سنن کے چھ نسخے تھے مگر اول الذکر تین اشخاص کے نسخے زیادہ مقبول ہوئے، ہندوستان میں ابن بشر، ان کا نسخہ متداول ہے، متداول نسخوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ معمولی ہے، یعنی تقدیم وتاخیر یا بعض راویوں کے نسب ونسبت کی کمی وبیشی کا، کہیں کہیں الفاظ میں بھی قدرے اختلاف ہے لیکن نفس حدیث میں فرق واختلاف نہیں ہے، ابن عبد الرحیم کے نسخہ میں کتاب السبق درج نہیں ہے۔ (بستان المحدثین ص ۴۵ و اتحاف النبلاء ص ۹۶)

سنن کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، ۱۳۱۰ھ میں دہلی کے مطبع انصاری سے یہ ۵۵۴ صفحات میں شائع ہوئی ہے، متن کے ساتھ حاشیہ میں مولانا شمس الحق عظیم آبادی غایۃ المقصود عون المعبود کی تعلیقات بھی ہیں اور آخر میں مولانا حسین بن محسن انصاری یمانی کے دو مختصر رسالے ہیں، ایک میں شاذ ومعلل حدیثوں کی تحقیق اور ان کے درمیان فرق کی وضاحت اور دوسرے میں صرف داہنے ہاتھ سے مصافحہ کرنے کو مسنون ثابت کیا گیا ہے۔

Marfat.com

سنن کے حواشی، تعلیقات اور زوائد:

سنن دارقطنی کے ساتھ علمائے فن کے شغف و اعتنا سے بھی اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

۱ علامہ بغوی اور حافظ سیوطی نے اس کی حدیثوں کی تخریج کی ہے۔

۲ حافظ ابن حجر نے اتحاف المہرۃ باطراف العشرۃ میں اس کے اطراف لکھے ہیں۔

۳ ابوالفضل بن طاہر نے سنن کے غرائب و افراد کے اطراف حروف معجم کی ترتیب پر لکھے ہیں۔

۴ علامہ ابن ملقن اور عراقی نے اس کے رجال کی بحث و تحقیق کی ہے۔

۵ شیخ زین الدین قاسم بن قطلوبغا حنفی نے ایک جلد میں اس کے زوائد جمع کیے ہیں۔

(تدریب الراوی ص ۲۹ و الرسالۃ المستطرفہ ص ۳۹ و ۱۴۱)

۶ مولانا شمس الحق عظیم آبادی نے سنن کی مختصر شرح اور تعلیق لکھی ہے جو سنن کے ساتھ حاشیہ میں چھپی ہے، اس میں حدیثوں کی تحقیق و تنقید، ان کے علل، مصالح، مطالب اور بعض مشکل مقامات کو حل کیا گیا ہے اور ائمہ فقہ و اجتہاد کے مذاہب و مسالک، راوی کے ناموں، کنیتوں اور بلاد و اماکن کی وضاحت اور لغوی و تفسیری مباحث پر بھی ان فنون کی اہم کتابوں کے حوالہ سے بقدرِ ضرورت گفتگو کی گئی ہے، حواشی کی ابتدا میں سنن و صاحب سنن کا تعارف، اس کے نسخوں اور مؤلف کتاب تک اپنی سند کا سلسلہ بیان کیا گیا ہے۔

سنن پر اعتراض:

اوپر سنن کی اہمیت اور بلند پایگی پر مختصر اظہار خیال کیا گیا ہے، آخر میں اس پر ایک اعتراض کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ سنن دارقطنی پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں ضعیف، غریب، موضوع اور منکر حدیثیں بھی شامل ہیں، علامہ ابن عبد الہادی کا بیان ہے۔

الدارقطنی یجمع فی کتابه غرائب السنن ویکثر فیه من روایة الاحادیث الضعیفة و المنکرة بل والموضوعة۔ (الصارم المنکی فی الرد علی السبکی ص ۱۲ طبع مصر)

امام دارقطنی نے اپنی سنن میں غریب حدیثیں اور ضعیف و منکر بلکہ موضوع روایتیں تک بھی کثرت سے جمع کی ہیں۔

علامہ عینی لکھتے ہیں:

وقد روی فی مسنده احادیث سقیمة و معلولة و منکرة و غریبة و موضوعة۔

(البنایہ فی شرح الہدایہ ج ۱ ص ۷۰۹)

انہوں نے اپنی مسند [1] میں سقیم، معلل، منکر، غریب اور موضوع حدیثیں بیان کی ہیں۔

اسی خیال کو علامہ زیلعی نے بھی نصب الرایہ میں نقل کیا ہے۔ (نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۴۰ و ۳۵۶)

لیکن یہ اعتراض اس وقت صحیح ہوتا جب سنن دارقطنی کو تمام تر صحیح، منتخب اور مستند حدیثوں کا مجموعہ مانا جاتا مگر ان کا دعویٰ تو

---

[1] امام دارقطنی کی کتاب سنن کے نام سے مشہور ہے، معلوم نہیں علامہ عینی نے اس کو مسند کیوں لکھا ہے۔

Marfat.com

خود امام دارقطنی نے بھی نہیں کیا ہے، بلکہ انہوں نے جا بجا سنن کے اندر احادیث کی نوعیت اور اس کی صحت و سقم کی حقیقت واضح کردی ہے، نیز علمائے فن نے بھی اس کو صحاح ستہ سے کمتر اور تیسرے طبقہ کی کتابوں میں شامل کیا ہے، اس طبقہ کی کتابوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ دہلوی نے تحریر فرمایا ہے کہ یہ صحیح، حسن، ضعیف، معروف، منکر، غریب، شاذ خطاء وصواب، ثابت ومقلوب ہر قسم کی حدیثوں پر مشتمل ہیں۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۰۷)

نیز شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں ''اس طبقہ کے مصنفین نے دوسرے طبقہ کے مصنفین کی جیسی صحت کا التزام نہیں کیا ہے اور نہ ان کی کتابیں شہرت وقبول اور وثوق واعتبار کے لحاظ سے دوسرے طبقہ کی کتابوں کے برابر ہیں، تاہم دارقطنی علوم حدیث میں تبحر، ضبط ووثوق اور ثقاہت وعدالت سے متصف تھے لیکن ان کی کتابوں میں صحیح، حسن، ضعیف اور موضوع ہر قسم کی حدیثیں شامل ہیں اور ان کے کچھ رجال تو عدالت سے متصف ہیں لیکن بعض مستور و مجہول ہیں۔'' (عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۵)

انصاف کی بات یہ ہے کہ خود صحاح ستہ بھی ضعیف حدیثوں سے خالی نہیں ہیں، اس لیے یہ اعتراض امام دارقطنی کی طرح دوسروں پر بھی عائد ہوسکتا ہے، علاوہ ازیں انہوں نے کثرت اسناد تعدد طرق اور شواہد ومتابعات وغیرہ کے خیال سے ہر طرح کی حدیثیں نقل کی ہیں مگر ان کی نوعیت وحقیقت بھی واضح کردی ہے، شواہد ومتابعات وغیرہ کے لحاظ سے امام مسلم اور ارباب صحاح نے بھی ضعیف اور غریب حدیثیں نقل کی ہیں۔

رہا یہ شبہ کہ اس طرح کی حدیثوں کی سنن دارقطنی میں زیادتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حدیثوں کا ضخیم مجموعہ ہے اور امام صاحب نے کثرت وتعدد طرق اور متابعات وشواہد کو درج کرنے کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے، اس لیے اس میں ضعیف وغریب حدیثوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہوگئی ہے، پھر بھی صحیح حدیثوں کے مقابلہ میں ان کی تعداد بہت کم ہے۔

اس توجیہ کے بعد نہ اس اعتراض کی کوئی اہمیت رہ جاتی ہے اور نہ سنن کے مرتبہ میں کوئی فرق آتا ہے۔

Marfat.com

امام ابوسلیمان حمد خطابی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۳۸۸ھ)

نام ونسب:

حمد نام، ابوسلیمان کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: حمد بن محمد ابراہیم بن خطاب۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۳)

بعض ارباب سیر وتذکرہ نے ان کا نام احمد لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے، علامہ ذہبی نے اس کو وہم قرار دیا ہے اور علامہ مقدسی وابن خلکان لکھتے ہیں کہ ''ابوسلیمان کا نام احمد بھی بیان کیا گیا ہے لیکن صحیح حمد ہے، حاکم نے ابوالقاسم ظفر بن طاہر بن محمد بستی فقیہ سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ میں نے خود خطابی سے سنا ہے کہ میرا اصلی نام حمد ہے لیکن بعض لوگ احمد بھی کہتے ہیں، میں نے ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا۔

(ایضاً وکتاب الانساب مقدسی ص ۴۹ وتاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۹۷)

ولادت ووطن:

وہ ماہ رجب ۳۱۹ھ میں کابل کے مشہور شہر بست میں جو غزنین اور ہرات کے درمیان واقع ہے پیدا ہوئے۔

(ایضاً وکتاب الانساب سمعانی ورق ۸۱)

نسبتیں:

امام ابوسلیمان اپنے وطن کی نسبت سے بستی کہلاتے ہیں لیکن ان کی مشہور نسبت خطابی ہے، جو ان کے پردادا خطاب کے نام کی طرف ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امام صاحب کا خاندانی تعلق خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بھائی زید بن خطاب سے ہے اور یہ نسبت اسی کی جانب ہے، مگر اکثر لوگوں کے نزدیک پہلا قول صحیح ہے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۳ وتاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۹۷ وکتاب الانساب سمعانی ورق ۸۱)

اساتذہ:

ان کے اساتذہ وشیوخ کی تعداد زیادہ ہے، حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ انہوں نے بیشمار لوگوں سے حدیثیں سنیں لیکن متداول تذکروں میں چند ہی اساتذہ کا نام مذکور ہے۔

ابوبکر بن داسہ، ابوسعید بن اعرابی اور ابوالعباس اصم سے علم حدیث، ابوعلی بن ابی ہریرہؒ اور قفال شاشی سے فقہ وافتا اور ابوجعفر رزاد، ابوعلی اسماعیل صفار اور ابوعمر زاہد وغیرہ سے لغت وعربیت کی تحصیل کی۔

Marfat.com

تلامذہ:

امام خطابی کے بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابو حامد اسفرائنی، ابو عبداللہ حاکم، ابو مسعود حسین بن محمد کرابیسی، ابوذر عبد بن احمد ہروی، ابو عبید ہروی، عبدالغفار[1] بن محمد فارسی، ابوالقاسم عبدالوہاب بن ابی سہل خطابی، ابونصر محمد بن احمد بن سلیمان بلخی، ابو عمر و محمد بن عبداللہ زرجاہی۔

(کتاب الانساب سمعانی ورق ۸۱ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۹۶ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱۸)

رحلت و سفر:

امام خطابی کے زمانہ میں عراق، حجاز، خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ دینی علوم خصوصاً حدیث و روایت کا مرکز تھے، انہوں نے علم و فن کی تکمیل اور احادیث کی تحصیل کے لیے ان سب مراکز کا سفر کیا، نیشاپور میں طویل عرصہ تک قیام کر کے وہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے اور طلبہ و شائقین علوم کو فیض یاب بھی کیا۔

(کتاب الانساب ورق ۲۰۳ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۴)

جامعیت:

امام خطابی بڑے جامع کمالات تھے، ان کو اپنے زمانہ کے تمام علوم میں کامل دستگاہ حاصل تھی، مؤرخین کا بیان ہے کہ وہ جامعیت کے اعتبار سے ابو عبید قاسم بن سلام کی طرح تھے، دونوں علم و ادب، زہد و ورع، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں ممتاز تھے، علاوہ ازیں امام خطابی کو یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ وہ اچھے شاعر تھے۔ (تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۹۷)

اعتراف کمالات:

مؤرخین نے انکی جامعیت، وفور علم اور کمالات کا پوری طرح اعتراف کیا ہے۔ علامہ ذہبی نے انکو علامہ، محقق اور علم کا خزانہ، سمعانی نے فاضل، کبیر الشان اور جلیل القدر لکھا ہے، حافظ ابن جوزی کا بیان ہے کہ ان کا علم نہایت وافر تھا اور ابن سمعانی کا بیان ہے کہ وہ علم میں عظیم حیثیت اور بلند مرتبہ کے مالک تھے، ابن عماد نے ان کو ان کے تمام معاصرین سے فائق قرار دیا ہے۔

حدیث میں درجہ:

گو امام خطابی کو گونا گوں علوم میں کمال حاصل تھا لیکن ان کا اصلی اور امتیازی فن علم حدیث ہے، ان کا شمار اس فن کے ائمہ اور نامور محدثین میں کیا جاتا ہے، حفظ و ضبط، عدل و اتقان اور فہم و درایت میں ان کا درجہ بلند تھا، علامہ ذہبی نے ان کو ثقہ و ثبت، سمعانی نے حجت و صدوق اور علامہ ابن سبکی نے امام حدیث لکھا ہے۔

(تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۹۷ و کتاب الانساب ورق ۸۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۳ و العبر ج ۳ ص ۳۹ و المنتظم ج ۶ ص ۳۹۷ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱۸)

---

[1] (بعض مورخین نے ان کا نام عبدالغافر لکھا ہے)

Marfat.com

فقہ:

فقہ واجتہاد کی معرفت میں بھی بے نظیر تھے، مورخین نے انکو فقیہ لکھا ہے اور حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ "وہ فقہائے مجتہدین میں تھے۔"

لغت وعربیت:

لغت وعربیت، نحو وادب اور معانی وغیرہ میں بھی صاحب کمال تھے، حافظ ابن جوزی نے لغت ومعانی میں ان کی معرفت کا اور دوسرے مورخین نے ادب وعربیت میں مہارت کا ذکر کیا ہے۔ (ایضاً) اسی لیے ادبا ونحاۃ اور اہل لغت کے حالات میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی امام خطابی کا تذکرہ موجود ہے۔

شعر وسخن:

ان کو شعر وسخن سے بھی دلچسپی تھی اور وہ خود مشق سخن بھی کرتے تھے، چند اشعار درج ذیل ہیں:

کم معشر سلموا لم یوذھم سبع ۔۔۔ وما نری بشرا لم یوذہ بشر

کتنے لوگ درندوں کے ضرر سے محفوظ رہتے ہیں، لیکن ہم نے آدمی کو آدمی کی اذیت سے محفوظ نہیں دیکھا۔

وما غمة الانسان فی شقة النوی ۔۔۔ ولکنھا واللہ فی عدم الشکل

وانی غریب بین بست واھلھا ۔۔۔ وان کان فیھا اسرتی وبھا اھل

انسان کی کلفت وپریشانی مسافرت اور غریب الوطنی میں نہیں ہے بلکہ ہم مذاق اور ہم جنسوں کے نہ ہونے میں ہے، اسی لیے میں بست اور اہل بست کے درمیان رہ کر بھی غریب الوطن ہوں، حالانکہ یہ میرا وطن ہے اور یہاں میرے اہل وعیال اور اعزہ واقارب موجود ہیں۔

لعمرک ما الحیاة وان حرصنا ۔۔۔ علیھا غیر ریح مستعارة

وما للریح دائمة ھبوب ۔۔۔ ولکن تارة تجری وتارة

زندگی جس پر ہم اس قدر ریجھے ہوئے ہیں، بخدا اس مستعار ہوا کی طرح ہے جو ہمیشہ نہیں چلتی بلکہ کبھی کبھی چلتی ہے۔

تغنم سکون الحادثات فانھا ۔۔۔ وان سکنت عما قلیل تحرک

وبادر بایام السلامة انھا ۔۔۔ رھون وھل للرھن عندک مترک

حوادث کے رکنے کو غنیمت سمجھو کیونکہ یہ جلد ہی متحرک بھی ہوجاتے ہیں اور سکون وسلامتی کے دنوں کو غنیمت سمجھو کیونکہ یہ تمہارے پاس رہن ہیں اور جو چیز رہن ہو وہ تمہارے پاس چھوڑی نہیں جاسکتی۔

تسامح ولا تستوف حقک کلہ ۔۔۔ وابق فلم یستقص قط کریم

ولا تغل فی شیء من الامر واقتصد ۔۔۔ کلا طرفی قصد الامور ذمیم

(یتیمۃ الدہر ج ۴ ص ۲۳۲ ومعجم الادباء ج ۲ ص ۸۴ وج ۴ ص ۱۴۲ و ۲۴۳)

Marfat.com

نرمی اور آسانی سے کام لو اور اپنا حق پورا لینے کے بجائے کچھ باقی رکھو کیونکہ شریف آدمی کبھی آخری حد کو نہیں پہنچتا، کسی معاملہ میں غلو سے کام نہ لو بلکہ میانہ روی اختیار کرو کیونکہ اعتدال کے دونوں سروں (افراط وتفریط) پر ذمیم ہوتا ہے۔

ارض للناس جمیعا — مثل ما ترضی لنفسک
انما الناس جمیعا — کلھم ابناء جنسک
فلھم نفس کنفسک — ولھم حس کحسک

(مقدمہ معالم السنن ص ۱۹)

اپنے لیے جو پسند کرتے ہو، وہی سب لوگوں کے لیے بھی پسند کرو، تمام لوگ تمہاری ہی جنس کے ہیں، تمہاری طرح وہ بھی صاحب نفس واحساس ہیں۔

زہد واتقا:

علمی کمالات کی طرح ورع وتقویٰ میں بھی ممتاز تھے، مؤرخین نے ان کے زہد واتقا کا ذکر کیا ہے۔

امامت ومرجعیت:

ان گوناگوں کمالات اور مختلف النوع خصوصیات کی وجہ سے ان کی ذات لوگوں کا مرکز بن گئی تھی اور وہ امام ومقتدیٰ کہلاتے تھے، ابن سمعانی لکھتے ہیں کہ وہ لائق اقتدا اور ائمہ سنت وحدیث میں تھے۔

(کتاب الانساب ورق ۲۰۲ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱۸)

مسلک:

امام خطابی گو خود اجتہادی بصیرت اور فقہی ژرف نگاہی میں ممتاز تھے تاہم وہ امام شافعی کے مسلک پر کاربند تھے۔

اخلاق وعادات:

ان کے اخلاق وعادات کے ذکر سے کتابیں خاموش نہیں مگر ان کی سخاوت وفیاضی اور فہم ودانش کا اعتراف کیا گیا ہے، وہ اپنی کمائی کا بیشتر حصہ اپنے دوستوں اور نیک لوگوں پر خرچ کر ڈالتے تھے، ان سے متعدد حکیمانہ اقوال بھی منسوب ہیں اور ان کے شعروں میں بھی حکمت واخلاق اور فہم ودانائی کی باتیں ملتی ہیں۔

پیشہ:

امام خطابی تجارت پیشہ تھے اور اپنے زہد وورع کی وجہ سے ہمیشہ حلال اور طیب رزق کماتے تھے۔

انتقال:

مشہور اور صحیح قول کے مطابق بروز شنبہ ۱۶ / ربیع الآخر ۳۸۸ھ کو وفات پائی، بعض مورخین نے ۱۶ / ربیع الآخر اور بعض نے ربیع الاول کا مہینہ لکھا ہے، ایک قول کے مطابق ان کی وفات ۳۸۶ھ میں ہوئی۔

(کتاب الانساب ورق ۲۰۲ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱۸ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۲ وبستان المحدثین ص ۱۲۳)

Marfat.com

تصنیفات:

امام خطابی کو تصنیف و تالیف کا بڑا عمدہ ذوق تھا اور چونکہ ان کو گونا گوں علوم سے مناسبت اور اشتغال تھا، اس لیے ان کتابوں کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے، ان سے بیشمار کتابیں یادگار ہیں اور ان میں اکثر کتابیں بیش قیمت اور حسن تالیف اور دلکش طرز تصنیف کا نمونہ ہیں، ذیل میں ان کی تصنیفات کی فہرست اور بعض کے متعلق مختصر معلومات پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ کتاب الجہاد، ۲۔ کتاب شان الدعا یا بیان الدعا، ۳۔ کتاب الشجاج یا کتاب النجاح، ۴۔ کتاب شرح الادعیۃ الماثور، ۵۔ کتاب شرح دعوات لابی خزیمہ، ۶۔ کتاب العروس، ۷۔ کتاب العزلہ، ۸۔ کتاب الغنیہ عن الکلام واہلہ، ۹۔ کتاب اصلاح الغلط (بعض نے اس کا نام اصلاح غلط المحدثین لکھا ہے)

۱۰۔ کتاب تفسیر اسامی الرب عزوجل:

غالباً شرح الاسماء الحسنیٰ اور شرح اسماء اللہ الحسنیٰ بھی اسی کتاب کے نام ہیں، اس موضوع پر علمائے اسلام کی متعدد تصنیفات کی فہرست صاحب کشف الظنون نے تحریر کی ہے، امام خطابی کی تصنیف اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔

۱۱۔ اعلام السنن:

اسی کا نام اعلام الحدیث اور شرح البخاری بھی ہے، اس میں بخاری شریف کی حدیثوں کی شرح کی گئی ہے، امام صاحب جب سنن ابی داؤد کی شرح لکھ چکے تو اہل بلخ کی فرمائش پر انہوں نے بخاری شریف کی بھی ایک جلد میں شرح لکھی جو لطیف نکات اور مفید مطالب پر مشتمل ہے لیکن یہ معالم السنن کی طرح طویل نہیں ہے بلکہ اس میں اختصار سے کام لیا گیا ہے، امام محمد تیمی اور ابوجعفر احمد بن سعید داؤدی نے اپنی شرحوں میں ان چیزوں کا ذکر کیا ہے جن کو امام خطابی نے نظر انداز کر دیا ہے، ان کتابوں میں خطابی کے بعض مسامحات کا بھی ذکر ہے۔ اعلام السنن کا ایک نسخہ موصل کے جامع سلطان اویس میں ہے، داؤد چلپی نے مخطوطات موصل کے ص ۹۴ پر اس کا ذکر کیا ہے، حلب کے مکتبہ شیخ محمد سلطان مرحوم میں اس کتاب کا نصف آخر موجود ہے جو ۷۸۴ھ کا لکھا ہوا ہے۔

۱۲۔ غریب الحدیث:

اس کا شمار امام خطابی کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہوتا ہے، ان سے پہلے اور بعد میں اس فن میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں ابوعبید، ابن قتیبہ اور امام خطابی کی کتابیں بہت اہم اور بہتر خیال کی جاتی ہیں، بعض علما کا خیال ہے کہ امام خطابی کی کتاب کا پایہ ان سب میں بلند ہے، انہوں نے ابن قتیبہ کی کتاب کا ذیل بھی لکھا ہے اور ان کی غلطیوں اور اوہام کی نشاندہی بھی کی ہے، ابوالحسن عبدالغافر نے ان سے اس کتاب کی روایت کی تھی، غالباً یہ بیش قیمت اور اہم کتاب اب معدوم ہے۔

۱۳۔ معالم السنن:

یہ ان کی سب سے اہم اور مشہور کتاب ہے، اس میں سنن ابی داؤد کی حدیثوں کی شرح، ان کے اہم مطالب کی توضیح اور اس کے مشکلات کو نہایت عالمانہ اور محققانہ انداز اور دلنشین و دلکش پیرایہ میں حل کیا گیا ہے، اس کی چار جلدیں اعلام النبلاء کے

Marfat.com

فاضل مصنف محمد راغب طباخ نے بعض مخطوطہ نسخوں کی مدد سے ایڈٹ کر کے مطبع علمیہ حلب سے ۱۳۵۱ھ و ۱۳۵۳ھ میں شائع کیا تھا اور اس کے شروع میں امام ابوداؤد اور امام خطابی کے حالات و کمالات بھی تحریر کیے ہیں، ان چاروں جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد تقریباً ڈیڑھ ہزار ہے، شہاب الدین ابومحمود احمد بن محمد بن ابراہیم مقدسی (م ۷۶۹ھ) نے عجالۃ العالم من کتاب المعالم کے نام سے اس کی تلخیص کی تھی، (کشف الظنون) اس شرح کے بعض اہم خصوصیات یہ ہیں:[1]

۱ یہ سنن ابوداؤد کی سب سے اہم، مستند اور قدیم شرح ہے، اس کے بعد جو شرحیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر اسی سے ماخوذ ہیں۔

۲ احادیث کی تشریح و تفسیر اور بحث و تحقیق کا معیار نہایت بلند اور طرزِ استدلال بہت دلکش اور دلنشیں ہے، جن چیزوں سے عموماً لوگ سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ امام صاحب نے ان سے بڑے دقیق مسائل، گہرے معانی و حقائق اور دلچسپ نتائج و نکات مستنبط کیے ہیں اس ضمن میں احادیث کے اندر پیدا ہونے والے شکوک و اعتراضات کا بھی بہت مفصل اور عالمانہ جواب دیا گیا ہے۔

۳ امام خطابی کا شمار ان علمائے اسلام میں ہوتا ہے جو شرعی احکام کے علل و مصالح بیان کرنے میں زیادہ ممتاز سمجھے جاتے ہیں، اس لیے انہوں نے معالم السنن میں حدیثوں کے اسرار و حکم بیان کرنے پر خاص توجہ کی ہے۔

۴ حدیثوں کے باہمی اختلاف و تضاد کو رفع کرنے اور ان میں جمع و تطبیق دینے کی پوری کوشش کی ہے۔

۵ امام خطابی کا پایہ جرح و تعدیل میں بھی نہایت بلند تھا، اس لیے معالم السنن میں حدیث کی فنی بحثوں اور اصول حدیث پر بڑی ماہرانہ گفتگو کی گئی ہے۔

۶ معالم السنن فقہی حیثیت سے بھی نہایت اہم کتاب خیال کی جاتی ہے، امام صاحب فقہ و خلاف میں ممتاز اور خود بھی صاحب تفقہ و اجتہاد تھے، چنانچہ اس میں صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور اس زمانہ تک کے تمام ائمہ و مجتہدین کے آراء و مسالک کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور مختلف اقوال میں محاکمہ کر کے مرجح قول کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، علاوہ ازیں بعض مسائل سے امام صاحب کی فقہی ژرف نگاہی اور اجتہادی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

۷ وہ لغت و عربیت میں بھی ممتاز تھے، اس لیے لغوی، نحوی و صرفی بحثیں کلام کی بلاغت، طرزِ ادا اور اسلوب بیان کی بھی اس میں وضاحت کی گئی ہے۔

غرض حدیثوں کی تفسیر، ان کے مواقع استنباط، وجوہ معانی کی دلالت، مشکل الفاظ، دقیق متون کی شرح، فقہی مباحث، احکام و مسائل کے استنباط اور علما کے اقوال و اختلافات کی تفصیل وغیرہ کے لحاظ سے یہ بے نظیر اور متعدد گوناگوں فوائد، مختلف النوع مباحث اور حدیث سے متعلق اہم تحقیقات پر مشتمل نہایت جامع و مدلل کتاب ہے۔

---

[1] (اس شرح کی خصوصیات پر راقم نے معارف کے تین نمبروں (دسمبر ۶۹ء تا فروری ۷۰ء) میں ایک مفصل مضمون لکھا ہے)

Marfat.com

امام ابن جمیع رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۴۰۲ھ)

نام ونسب:

محمد نام، ابوالحسین کنیت، نسب نامہ یہ ہے: محمد بن احمد بن محمد بن احمد بن عبدالرحمٰن بن یحییٰ بن جمیع، (بستان المحدثین ص ۸۶) اپنے جدامجد جمیع کے نام پر ابن جمیع کے لقب سے مشہور ہوئے۔

ولادت، خاندان ووطن:

امام ابن جمیع کا قبیلہ ازد کی مشہور شاخ غسان سے جو شام میں آباد تھی، خاندانی تعلق تھا اور وطن شام کا ایک شہر صیدا ہے، یہیں ۳۰۵ھ میں وہ پیدا ہوئے، علامہ سمعانی نے سن ولادت ۳۰۶ھ لکھا ہے۔ (کتاب الانساب ورق ۳۵۸)
وطن کی نسبت سے صیداوی اور صیدانی اور خاندان کی نسبت سے غسانی کہلاتے تھے۔

رحلت وسفر:

اس عہد کے دستور کے مطابق امام ابن جمیع نے علم کی تحصیل اور احادیث کی طلب کے لیے مختلف اسلامی ملکوں اور شہروں جیسے دمشق، بغداد، مکہ، بصرہ، کوفہ، عراق، مصر اور فارس وغیرہ کا سفر کیا اور ان مرکزی مقامات کے علما ومحدثین سے اکتساب فن کیا، کثرت سفر کی وجہ سے ابن جمیع ''الجوال'' اور ''ذوالرحلۃ الکثیرۃ'' یعنی بہت بڑے سیاح کہلاتے تھے۔
(ایضاً و بستان المحدثین ص ۸۶)

اساتذہ:

ابن جمیع کے چند نامور شیوخ کے نام یہ ہیں: ابوسعید بن الاعرابی، ابوالعباس بن عقدہ، ابوعبداللہ محاملی، ابورزق ہزانی۔

تلامذہ:

بعض ممتاز شاگردوں کے نام یہ ہیں:
حافظ عبدالغنی بن سعید، تمام رازی (صاحب فوائد) محمد بن علی صوری، ابوسعد احمد بن محمد بن عبداللہ مالینی، ابونصر عبدالرحمٰن بن ابی عقیل الصوری، ابونصر حسین بن محمد بن احمد خطیب دمشقی اور حسن بن جمیع وغیرہ۔
(کتاب الانساب ورق ۳۵۸ و بستان المحدثین ص ۸۶)

Marfat.com

حفظ وضبط اور حدیث میں درجہ ومرتبہ:

ابن جمیع کے حفظ وضبط، عدالت وثقاہت اور حدیث میں بلند پائیگی کے علمائے فن اور محدثین معترف ہیں، الحافظ ان کا لقب تھا اور خطیب بغدادی وغیرہ نے ان کی توثیق وتعدیل کی ہے، خطیب کا بیان ہے کہ هو اسند من بقی من الشام۔ حدیث میں ان کے کمال اور رسوخ کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسند الشام و محدثہ یعنی شام کے محدث ومسند کے نام سے موسوم کئے جاتے تھے۔ (ایضاً والعبر ج ۳ ص ۸۰)

مداومت عمل اور ذوق عبادت:

ابن جمیع کے عام حالات وواقعات معلوم نہیں ہو سکے، اس لیے ان کی سیرت وکردار اور عام اوصاف وخصائل کے متعلق بھی کچھ نہیں لکھا جا سکتا، تاہم ان کے ذوق بندگی، کثرتِ عبادت اور معمولات وغیرہ میں اہتمام اور پابندی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اٹھارہ سال کی عمر سے انہوں نے مسلسل روزہ رکھنا شروع کیا تو کبھی عمر بھر ان کے روزے فوت نہ ہوئے اور نہ اس معمول میں کوئی فرق آیا۔ (العبر ج ۳ ص ۸۰ وبستان المحدثین ص ۸۶)

وفات:

۹۷ سال کی عمر میں ماہ رجب ۴۰۲ھ کو انتقال کیا (ایضاً) لیکن علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ۳۷۴ھ کے بعد انکا انتقال ہوا۔ (کتاب الانساب ورق ۳۵۸)

مسند یا معجم:

ابن جمیع کی صرف ایک تصنیف کا پتہ چلتا ہے، بعض لوگوں نے اس کا نام مسند اور بعض نے معجم بتایا ہے، غالباً اس میں مسند و معجم دونوں کی خصوصیات موجود تھیں، اس کا مکمل قلمی نسخہ حافظ ابن حجر کے ہاتھ کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے اور ان کے قلم سے اس پر مفید حواشی بھی تحریر ہیں۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۵) اس معجم کے ایک قدیم مستند اور نایاب نسخے کا ایک جزو جو سات حدیثوں پر مشتمل ہے، خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی ہے، اس کے خاتمہ کے ایک نوشتہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس اصل نسخہ سے یہ نسخہ نقل کیا گیا ہے، اس سے بعد میں عبارت لفظ بلفظ ملا کر دیکھ لی گئی ہے، ایک اور کرم خوردہ عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس نسخہ کا چند محدثین نے اپنے نسخوں سے بھی موازنہ کیا ہے یہ جزو ۶۰۶ھ یا اس سے قبل کا نوشتہ ہے۔

(نوادر خدا بخش لائبریری ص ۹۷ و ۹۸)

Marfat.com

امام ابوعبداللہ حاکم

(متوفی ۴۰۵ھ)

نام ونسب:

محمد نام، ابوعبداللہ اور ابن بیع کنیت اور حاکم لقب ہے، پورا نسب نامہ یہ ہے:

محمد بن عبداللہ بن محمد بن حمدویہ بن نعیم بن حکم۔

(تاریخ بغداد ج ۵ ص ۴۷۳ و ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ و المنتظم ج ۷ ص ۲۷۴ و تبیین کذب المفتری ص ۲۲۷ و الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۴)

امام ابوعبداللہ کے اجداد میں کوئی بزرگ تجارتی کاروبار کرنے کی بنا پر بیع (بیوپاری) کہلاتے تھے، اس نسبت سے امام صاحب کو ابن بیع کہا جاتا ہے، منصب قضا پر فائز ہونے کی وجہ سے حاکم کے لقب سے ملقب کئے گئے، (ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ وبستان المحدثین ص ۴۶) ابوالفدا نے ابن الحاکم لقب تحریر کیا ہے، (تاریخ ابوالفداء ج ۲ ص ۴۴) یہ غالباً اس لیے کہ ان کے جدامجد کا نام حکم تھا ممکن ہے بعد میں ابن حذف ہو کر صرف حاکم رہ گیا ہو۔

ولادت:

امام صاحب دوشنبہ ۳/ ربیع الاول ۳۲۱ھ کو نیشاپور میں پیدا ہوئے۔

(الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۴ و تبیین کذب المفتری ص ۲۲۰)

خاندان ووطن:

امام صاحب کے مرزبوم ہونے کا فخر عراق عجم کے مشہور مردم خیز شہر نیشاپور کو حاصل ہے، اس لیے وہ نیشاپوری کہلاتے ہیں لیکن ضبی اور طہمانی کی نسبتوں سے ان کا عربی قبائل سے خاندانی تعلق ظاہر ہوتا ہے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ "حاکم کی دادی سبطہ، عیسیٰ بن عبدالرحمٰن ضبی کی صاحبزادی تھیں، طہمانی کی نسبت ابراہیم بن طہمان کی جانب ہے جو صاحب فضل وکمال تھے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۴۶)

امام صاحب ایک علمی خانوادے کے چشم وچراغ تھے، ان کے والد اور ماموں علم وفن کے دلدادہ تھے، ان دونوں بزرگوں کے فیض توجہ سے وہ بچپن ہی میں علم وفن کی تحصیل میں مشغول ہو گئے تھے اور سب سے پہلے اپنے والد ماجد سے اکتساب فیض کیا، ان کے والد بزرگوار کو امام مسلم کو دیکھنے کا شرف بھی حاصل ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۴۶، الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۵)

Marfat.com

اساتذہ:

مورخین کا بیان ہے کہ امام صاحب کو تقریباً دو ہزار فضلا اور محدثین سے استفادہ کرنے کا موقع ملا تھا، خاص نیشاپور کے اساتذہ کی تعداد ایک ہزار بتائی ہے، اپنے والد کے علاوہ جن ممتاز محدثین سے انہوں نے حدیثوں کی روایت کی ہے ان کے نام یہ ہیں:

ابن ابی سبرہ، ابن درستویہ، ابوحامد بن حسنویہ مقری، ابوسہل بن زیاد، ابوبکر احمد بن سلمان نجاد، حسن بن یعقوب بخاری، ابوعلی حسین بن علی الحافظ نیشاپوری، ابوصالح خلف بن محمد بن اسماعیل خیام، ابومحمود دعلج بن احمد سجزی، ابومحمد عبدالرحمن بن حمدان جلاب، ابوعمرو عثمان بن محمد بن سماک، علی بن محمد بن عقبہ شیبانی، ابوالعباس محمد بن احمد بن محبوب التاجر محبوبی، ابوجعفر محمد بن صالح بن ہانی، محمد بن عبداللہ صفار اصبہانی، ابوجعفر محمد بن علی بن رحم شیبانی، محمد بن علی بن عمر، ابونصر محمد بن محمد بن یوسف، ابوالعباس محمد بن یعقوب الاصم، ابوعبداللہ محمد یعقوب بن الاخرم شیبانی۔

فقہ کی تحصیل اس زمانہ کے مشہور فقہا، ابوسہل محمد بن سلیمان صعلوکی، ابوعلی بن ابی ہریرہ ابوالولید حسان بن محمد اور ابوبکر احمد بن اسحاق ضبی وغیرہ سے کی، قراءت کا فن محمد بن ابومنصور صرام ابن امام، علی بن علی نقار کوفی اور ابوعیسیٰ بکار بغدادی وغیرہ قراء سے سیکھا اور تصوف واسرار دین کی تکمیل کے لیے ابوعمرو بن نجید، ابوالحسن بوشنجی، ابوسعید احمد بن یعقوب ثقفی، ابونصر صفار، ابو القاسم رازی جعفر بن نصیر، ابوعمرو الزجاجی، جعفر بن ابراہیم خدا شیخ ابوعثمان مغربی اور ابوعمر بن محمد بن جعفر خلدی وغیرہ مشائخ وصوفیہ کی صحبت اختیار کی۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۲، الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۵ و کتاب الانساب ورق ۱۰۰، کذب المفتری ص ۲۲۹)

تلامذہ:

امام حاکم کے بعض مشہور تلامذہ کے نام حسب ذیل ہیں:

ابوذر ہروی، ابوصالح موذن، ابویعلی خلیلی، ابوبکر احمد بن حسین بیہقی، ابوبکر احمد بن علی بن خلف شیرازی، ابوعثمان اسماعیل بن عبدالرحمن صابونی، زکی عبدالحمید بجیری، ابوالقاسم بن عبداللہ ابن احمد ازہری، ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیری، عثمان بن محمد جحمی، ابوالفتح محمد بن احمد بن ابی الفوارس، محمد بن احمد بن یعقوب، ابوبکر محمد بن علی بن اسماعیل قفال شاشی اور ابوالعلا محمد بن یعقوب واسطی۔ (تاریخ بغداد ج ۵ ص ۴۷۳)

ان کے شیوخ میں امام ابوالحسن دارقطنی، احمد بن ابوعثمان حیری اور ابواسحاق مزکی نے بھی ان سے سماع کیا تھا، امام دارقطنی سے ان کی برابر مصاحبت اور ہم نشینی رہتی تھی، خطیب بغدادی ایک واسطہ سے حاکم کے شاگرد ہیں۔

شوق علم:

امام حاکم بچپن ہی میں تعلیم وتعلم میں مشغول ہو گئے تھے اور نو سال کی عمر میں باقاعدہ حدیث کا سماع کیا، علم سے شغف کا یہ حال تھا کہ ان کو اپنے سے کمتر اور کمسن لوگوں سے بھی روایت کرنے میں کسی طرح کا عار نہ ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے اساتذہ کی تعداد بے شمار ہے۔

Marfat.com

رحلت وسفر:

اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے انہوں نے سب سے پہلے اپنے وطن نیشاپور کے جو اس وقت علمائے فن اور محدثین کا مرکز بنا ہوا تھا، ارباب کمال کی جانب رجوع کیا، بیس سال کے ہوئے تو دوسرے علمی شہروں اور مراکز حدیث کا رخ کیا اور عراق، بغداد، مکہ، کوفہ، مرو، بخاری، ماوراء النہر، ہمدان اور اصبہان وغیرہ تشریف لے گئے، اسفار کی کثرت کی وجہ سے مورخین ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ طاف الآفاق، رحل الکثیر، بغداد دوبار گئے، تھے پہلی بار عین شباب کے زمانہ میں اور دوسری دفعہ گئے تو اُن کا سن ہو چکا تھا۔ (تاریخ بغداد ج ۵ ص ۴۷۳)

حدیث وروایت میں کمال وامتیاز:

علم حدیث میں غیر معمولی کمال وامتیاز کی بنا پر وہ الحافظ الکبیر اور امام المحدثین وغیرہ القاب سے یاد کیے جاتے تھے، ابو حازم عبدوی کا بیان ہے کہ "حاکم اپنے زمانہ میں محدثین کے امام تھے" یافعی لکھتے ہیں "حدیث اور اس کے متعلق علوم کی معرفت میں انکو بڑی مہارت حاصل تھی،" علامہ ذہبی فرماتے ہیں "نہ صرف خراسان بلکہ ساری دنیا میں اقلیم حدیث کی تاجداری ان پر ختم ہوگئی" علامہ ابن صلاح اور حافظ نوویؒ نے صحاح ستہ کے مصنفین کے بعد جن سات محدثین کو نہایت صاحب کمال قرار دیا ہے، میں امام دارقطنی کے بعد دوسرا نام حاکم ہی کا بتایا ہے، انکے زمانہ کے جن چار محدثین کو خصوصیت سے سرآمد روزگار سمجھا جاتا اُن میں ایک یہ بھی تھے، عبدالغافر کہتے ہیں وہ اپنے زمانہ میں اہل حدیث کے امام اور فن حدیث سے بخوبی واقف تھے۔

حفظ وثقاہت:

حدیث میں ان کے کمال کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے حفظ وضبط اور ثقاہت وعدالت پر تمام ائمہ فن اور محدثین کا اتفاق ہے، اہل سیر نے الحافظ الکبیر من اہل الحفظ اور من اکابر حفاظ الحدیث وغیرہ کہہ کر ان کے حافظہ کی توثیق کی ہے، ابو عبد الرحمن سلمی کا بیان ہے کہ میں نے امام دارقطنی سے حاکم اور ابن مندہ کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ابن بیع حافظہ میں زیادہ مستند اور اتقن ہیں۔

کلامی مذہب:

کلام وعقائد میں اشاعرہ کے ہمنوا تھے، ابن سبکی نے ان کے اشعری المذہب ہونے کی تصریح کی ہے اور علامہ ابن عساکر نے تبیین میں اشاعرہ کے دوسرے طبقہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اس طبقہ میں ان لوگوں کے ترجمے درج ہیں جو امام ابوالحسن اشعری کے تلامذہ کے صحبت یافتہ اور ان کے اصول پر کاربند تھے۔

تدین وتقویٰ:

وہ زہد واتقا اور دیانت وامانت میں ممتاز تھے، حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ "حاکم متدین، امین، صاحب حزم وورع اور اللہ کی جانب مائل ومتوجہ رہتے تھے۔" (البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۵۵) حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے، تصوف سے اشتغال اور اکابر صوفیہ ومشائخ سے وابستگی بھی ان کے تدین کا ثبوت ہے۔

Marfat.com

سیاسی واجتماعی مشاغل:

پہلے گزر چکا ہے کہ امام صاحب عہدۂ قضا پر متمکن ہونے کی بنا پر حاکم کہلاتے تھے، بعض مؤرخین نے ان کونسا کا لیکن اکثر نے نیشاپور کا قاضی بتایا ہے، یہ ۳۵۹ھ کا واقعہ ہے، اس زمانہ میں دولت سامانیہ کی طرف سے نیشاپور میں ابوالنصر محمد بن عبد الجبار عتبی کی ولایت قائم تھی، امام صاحب محکمۂ قضا کے فرائض سے اس قدر خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے کہ دوبارہ ان کو جرجان کا عہدۂ قضا پیش کیا گیا لیکن انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا مگر بعض مؤرخین نے ان کے جرجان کے قاضی مقرر کیے جانے کی تصریح کی ہے۔

امام صاحب پر دولت سامانیہ اور اس کے امراء وحکام کو بڑا اعتماد تھا، امیر ابوالحسن ان سے مشورے طلب کرتا تھا اور بنی بویہ کے پاس سفارت کے لیے بھیجتا تھا، امام صاحب نے بنی بویہ اور سامانی حکومت کے درمیان سفارتی فرائض بڑی اچھی طرح انجام دیے۔

ان کو ملی واجتماعی کاموں سے بھی یک گونہ دلچسپی تھی، ایک زمانہ میں مدرسہ دار السنت کے انتظام وانصرام کی ذمہ داری انہی کے سپرد تھی، ان کے استاذ احمد بن اسحاق ضبی نے اپنی وفات کے بعد مدرسہ کے امور ومعاملات کی نگرانی اور اوقاف کی تولیت واہتمام کے بارے میں ان کو وصیت کی تھی۔

(تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۳۸۵ والطبقات الکبری ج ۳ ص ۶۵ وتبیین کذب المفتری ص ۲۲۹ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۶)

مقبولیت ومرجعیت:

امام صاحب اپنے گوناگوں کمالات کی وجہ سے مسلمانوں کے مقتدا وامام اور ان کی عقیدت وتوجہ کا مرکز بن گئے تھے اور خواص وعوام سب میں یکساں مقبول اور ہردلعزیز تھے، علامہ ابن سبکی کا بیان ہے کہ ان کی عظمت شان، جلالت قدر اور امامت فن پر سب کا اتفاق ہے، وہ ان ائمہ اعلام میں تھے جن کے ذریعہ اللہ نے اپنے دین مبین کی حفاظت کا کام لیا ہے، لوگ دور دراز سے ان کی خدمت میں آکر اپنی علمی تشنگی بجھاتے تھے، وہ جس بزم میں پہنچ جاتے اس کی رونق بڑھ جاتی، لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے اور شایان شان استقبال کرتے، اکابر محدثین ونامور ائمہ فن کے مجمع میں بھی تشریف لے جاتے تو لوگوں کو اپنے علمی تبحر اور خوش کلامی سے متاثر کرلیتے تھے، عبدالغافر امام حاکم کی مدح وستائش میں نہایت رطب اللسان رہتے تھے، ان کا بیان ہے کہ ہمارے اساتذہ فرماتے ہیں کہ اس زمانہ کے اکثر فضلا اور ارباب کمال جیسے صعلوکی اور ابن فورک وغیرہ ان کو اپنے سے فائق اور مقدم سمجھتے تھے اور ان کے حفظ ومعرفت حدیث میں انفرادیت کی بنا پر ان کی فضیلت وبرتری کے معترف اور ان کی عزت واحترام کا پورا خیال رکھتے تھے، ان کی تصنیفات، طرق حدیث میں ان کے علم ونظر، علمی مباحث واَمالی وغیرہ میں ان کے تصرفات وکمالات کا جو جائزہ لے گا وہ ان کے فضل وکمال کا ضرور اعتراف کرے گا اور اس کو اندازہ ہوجائے گا کہ وہ اپنے سے پہلے کے علما پر بھی فوقیت رکھتے تھے، حاکم اپنے کمالات کی وجہ سے اس بلند مقام پر فائز تھے، جہاں پہنچنا دوسروں کے لیے ممکن نہیں تھا، وہ اپنے زمانہ میں بے نظیر تھے، ان کی موت سے جو خلا ہوا ہے وہ پر نہیں ہوسکتا۔

(تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۳۸۵ والطبقات الکبری ج ۳ ص ۶۵ وتبیین کذب المفتری ص ۲۲۹ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۶)

Marfat.com

وفات:

امام صاحب نے اپنے وطن نیشاپور میں منگل یا بدھ ۳/صفر ۴۰۵ھ کو دفعتاً انتقال کیا حمام سے غسل کرکے نکل رہے تھے اور صرف تہد باندھے ہوئے تھے کہ ایک آہ کھینچی اور روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی، عصر کے بعد تجہیز و تکفین کی گئی، قاضی ابو بکر حیری نے جنازہ کی نماز پڑھائی، خلیل بن عبداللہ نے ارشاد میں ۴۰۳ھ سن وفات لکھا ہے لیکن علامہ ابن سبکی وغیرہ نے اس کی تردید کی ہے۔

حسن بن اشعث قرشی نے خواب دیکھا کہ حاکم نہایت اچھی وضع قطع میں ایک گھوڑے پر سوار ہو کر کہہ رہے ہیں کہ مجھے نجات مل گئی، میں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ حدیث کی تحریر و کتابت کی وجہ سے اللہ نے مجھ کو نجات دی ہے۔

(تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۳۸۵ و الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۵ و تبیین کذب المفتری ص ۲۲۹ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۶)

تصنیفات:

امام ابوعبداللہ حاکم کی تصنیفات کمیت و کیفیت دونوں حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں، ان کا خود بیان ہے کہ ''میں نے زمزم کا پانی پی کر خدا سے حسن تصنیف کی دعا کی تھی، ان کی دعا مقبول ہوئی، ارباب سیر کا اتفاق ہے کہ تصنیفی حیثیت سے ان کا مرتبہ نہایت بلند تھا، سعد بن علی زنجانی سے جب چار ہم عصر محدثین کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے ہر ایک کی جدا جدا خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ان سب میں حاکم سب سے بہتر تصنیف والے تھے، علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ ''حاکم نے علوم حدیث میں بے نظیر تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں' سمعانی کا بیان ہے کہ انہوں نے علوم حدیث اور دیگر فنون میں بڑی عمدہ کتابیں لکھیں، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں'' حاکم را در فن تصنیف و ترتیب دخل تمام بود''

ان کی تصنیفات کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے، بعض لوگوں نے پانچ سو، بعض نے ایک ہزار اور بعض نے ڈیڑھ ہزار جزو کے بقدر تعداد بتائی ہے، (تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ والطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۷ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۸ و بستان المحدثین ص ۱۴۱) لیکن قدما کی طرح ان کی بھی اکثر کتابیں اب معدوم اور ناپید ہیں، جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ الاربعین، ۲۔ الامالی، ۳۔ امالی العشیات، ۴۔ تراجم الشیوخ، ۵۔ تراجم المسند علی شرط الصحیحین، ۶۔ التلخیص، ۷۔ فضائل الامام الشافعی، ۸۔ فضائل العشرۃ المبشرۃ، ۹۔ فضائل فاطمہ، ۱۰۔ فوائد الخراسانیین، ۱۱۔ فوائد الشیوخ، ۱۲۔ فوائد العراقیین، ۱۳۔ ماتفرد باخراجہ کل واحد من الامامین، ۱۴۔ کتاب المبتدامن اللالکی، ۱۵۔ مناقب الصدیق۔

۱۶۔ کتاب العلل:

علل میں امام مسلم اور دار قطنی کی کتابیں اہم سمجھی جاتی ہیں، حاکم کی کتاب کا بھی ان ہی کے ساتھ نام لیا جاتا ہے۔

Marfat.com

۱۷۔ تفسیر القرآن:

علامہ سیوطی اور صاحب کشف الظنون نے تیسری اور چوتھی صدی ہجری کی اہم کتب تفسیر میں اس کو شمار کیا ہے، سیوطی لکھتے ہیں ''پھر ابن ابو حاتم، ابن ماجہ، حاکم، ابن مردویہ، ابن حبان اور ابن منذر وغیرہ کی تفسیریں ہیں، ان میں صحابہؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے آثار سنداً بیان کئے گئے ہیں۔'' (الاتقان ج ۲ ص ۱۹۰)

۱۸۔ تخریج الصحیحین

اس کا نام المدخل الی معرفۃ الصحیحین بھی ہے اور غالباً حاکم نے رسالہ المدخل میں اسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''حجاز، عراق اور شام کے لوگ صحیح حدیثوں کی معرفت میں اہل خراسان کی برتری اور تقدم کے معترف ہیں، اس کی وجہ شیخین (بخاری و مسلم رحمہما اللہ) کی اس فن میں مہارت وانفرادیت ہے، اللہ ان دونوں بزرگوں کو اسلام کی اس خدمت کی جزائے خیر عطا کرے، میں نے ان کی کتابوں کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے، اس میں ان کی صحیح وسقیم حدیثوں کی متفق علیہ اور مختلف فیہ شرطوں کا ذکر ہے، (المدخل الی علم الحدیث ص ۶) اس کی ابتدا میں حدیثوں کی حفظ واشاعت کے بارے میں حدیثیں اور آثار اور جھوٹی حدیثیں گھڑنے کے متعلق وعیدیں بیان کی گئی ہیں، پھر ان لوگوں کے نام تحریر کئے گئے ہیں جن کا صحیحین یا ان میں سے کسی ایک کے اندر ذکر ہے، اس کے بعد ان اشخاص کا ذکر ہے جن سے امام بخاری نے روایتیں کی یا سنی ہیں، حافظ محمد طاہر مقدسی نے اس کتاب کے اکثر مباحث المجمع بین رجال الصحیحین میں درج کئے ہیں۔

۱۹۔ مزکی الاخبار:

معرفۃ علوم الحدیث کے بعض قلمی نسخوں میں اس کا نام کتاب المزکین لرواۃ الاخبار لکھا ہوا ہے، حاکم خود اس کے متعلق لکھتے ہیں ''اس میں راویوں کے دس طبقوں کا ذکر ہے، ہر طبقہ میں ایک دور کے چار بلند پایہ روات شامل کئے گئے ہیں، اس طرح کل چالیس راویان حدیث کا اس میں ذکر ملتا ہے، پہلے طبقہ میں حضرت ابو بکر وعمر، علی اور زید بن ثابت (رضی اللہ عنہم) کا ذکر ہے، کیونکہ ان بزرگوں نے راویوں کی جرح وتعدیل اور روایات کی صحت وسقم کی بحث وتحقیق کی ہے، دسویں طبقہ میں ابو اسحاق ابراہیم بن حمزہ اصبہانی، ابو علی نیشاپوری، ابو بکر محمد بن عمر بن سالم بن بغدادی اور ابو القاسم حمزہ بن علی کتانی مصری کا ذکر ہے۔''
(معرفۃ علوم الحدیث ص ۵۲)

۲۰۔ کتاب الاکلیل:

بعض مصنفین نے اس کا نام اکلیل فی الحدیث لکھا ہے، یہ کتاب انہوں نے بعض امرا کی فرمائش پر لکھی تھی، اس کے بعد انہوں نے اصول حدیث میں اپنی مشہور تصنیف المدخل الی الاکلیل کے نام سے بھی ایک رسالہ لکھا، اس کے آخر میں وہی باتیں مذکور ہیں جو اکلیل میں بیان کی گئی ہیں، یعنی صحیح حدیثوں کے رموز وطبقات (کشف الظنون ج ۱ ص ۱۳۵) وغیرہ، شاہ عبد العزیز صاحب لکھتے ہیں کہ ''یہ بڑی مفید کتاب ہے اور مفسر[1] کو اس کے بغیر چارہ نہیں، علامہ ابن عساکر نے حاکم کی ایک کتاب کا

[1] (مفسر کا لفظ یہاں کتابت کی غلطی معلوم ہوتا ہے صحیح محدث ہوگا)

Marfat.com

نام "الاکلیل فی دلائل النبوۃ" بھی بتایا ہے، غالباً یہ کوئی اور کتاب ہوگی یا ممکن ہے نام میں تصحیف ہوگئی ہو۔

۲۱۔المدخل الی علم الحدیث:

المدخل الی معرفۃ الصحیح والسقیم من الاخبار اور المدخل الی علم الصحیح بھی اسی کے نام ہیں اور غالباً علامہ ابن صلاح اور صاحب کشف الظنون نے المدخل الی اکلیل بھی اسی کا نام تحریر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب الاکلیل کا مقدمہ ہے، خود امام صاحب کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں میں نے اس کو امیر مظفر کی استدعا پر کتاب الاکلیل کی صحیح وسقیم حدیثوں کی نشاندہی کے لیے لکھا تھا۔" (المدخل الی علم الحدیث ص ۳۴) اس میں پہلے علم اسناد وروایت کی اہمیت، محدثین کی فضیلت اور کتب حدیث کے بعض طبقات کا اجمالاً ذکر کرنے کے بعد صحیح حدیثوں کی دس قسمیں بیان کی گئی ہیں، ان میں پانچ قسمیں متفق علیہ اور پانچ مختلف فیہ ہیں، پھر نقد وجرح پر گفتگو کی گئی ہے اور آخر میں اکلیل کی حدیثوں کے متعلق ان امور کا ذکر ہے، جن سے ان کی صحت وضعف کا پتہ چل جاتا ہے لیکن حاکم نے اس میں متفق علیہ اور مختلف فیہ حدیثوں کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے، بعض علما نے اس پر اعتراضات بھی کئے ہیں، شیخ محمد راغب طباخ نے مطبع علمی حلب سے جمادی الاول ۱۳۵۱ھ میں اس مفید رسالہ کو شائع کیا ہے۔

۲۲۔تاریخ نیشاپور:

یہ بڑی ضخیم کتاب ہے، اس میں خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد کی طرح علما و مشاہیر فن کے تراجم درج ہیں اور حوادث وواقعات کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، (کشف الظنون ج ۱ ص ۵۴۴) اسی لیے اس کا نام تاریخ علمائے نیشاپور بھی ہے، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ "حاکم کے اس عظیم الشان کارنامہ کے سامنے نامور محدثین وفقہا کو سرنگوں ہوجانا پڑا جو اس کا بغور مطالعہ کرے گا، اس کو ان کے گوناگوں کمالات اور مختلف علوم میں جامعیت کا پورا اندازہ ہوجائے گا۔" ابوالفضل بن فلکی ہمدانی فرماتے ہیں کہ "میرے نیشاپور کا سفر کرنے اور وہاں اقامت اختیار کرنے کی ایک وجہ حاکم کی اس تاریخ کو دیکھنا بھی تھا۔"

عبدالغافر بن اسماعیل فارسی نے اس کا ذیل لکھا تھا، اس میں ۵۱۸ھ تک وفات پانے والے لوگوں کا ذکر ہے اور علامہ ذہبی نے "مختصر تاریخ حاکم" کے نام سے اس کا اختصار لکھا تھا۔ (کشف الظنون ص ۲۳۴)

۲۳۔معرفۃ علوم الحدیث:

یہ علوم حدیث پر ایک اہم اور مفید کتاب ہے، امام حاکم کو اپنے زمانہ میں بدعتوں کی کثرت، سنن سے عام ناواقفیت اور حدیثوں کے ضبط وتحریر میں اہمال اور لاپرواہی کی وجہ سے اس کی ترتیب وتصنیف کا خیال ہوا تھا۔" (مقدمہ حاکم ص ۱و۲) اس سے پہلے علوم حدیث میں جو کتابیں لکھی گئیں تھیں، ان کی حیثیت متفرق اجزا کی تھی، ابو محمد حسن بن عبدالرحمن بن خلاد رامہرمزی (م ۳۶۰ھ) کی کتاب المحدث الفاصل بین الراوی والواعی، اس موضوع کی پہلی باقاعدہ کتاب ہے لیکن اس میں مکمل استیعاب واستقصا نہیں کیا گیا تھا، (تدریب الراوی ص ۹ ونخبۃ الفکر فی شرح نزہۃ النظر ص ۳) حاکم کے بعد خطیب بغدادی اور علامہ ابن صلاح کی کتابیں فوائد ومعلومات کے لحاظ سے اہم ہیں لیکن حاکم کا شرف وتقدم مسلم ہے، مگر حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "حاکم اپنی کتاب کی باقاعدہ ترتیب وتہذیب نہیں کرسکے۔" (تدریب الراوی ص ۹ ونخبۃ الفکر فی شرح نزہۃ النظر ص ۳) لیکن یہ بیان محل نظر ہے، علامہ ابن

Marfat.com

خلدون رقمطراز ہیں کہ "علوم حدیث میں لوگوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں لیکن اس فن کے یگانہ روزگار ائمہ وعلمائے فحول میں ابو عبداللہ حاکم ہیں، ان کی کتابیں مشہور ہیں، انہوں نے اس فن کو باقاعدہ مرتب ومہذب کیا اور اس میں بعض انواع کا اضافہ کیا اور اس کے محاسن اچھی طرح منقح اور نمایاں کئے (مقدمہ ابن خلدون ص ۴۸۵) اور ملا چلپی لکھتے ہیں کہ "اس فن کی جانب سب سے پہلے ابوعبداللہ حاکم نے اعتناء کیا، اس کے بعد علامہ ابن صلاح نے علوم الحدیث کے نام سے بڑی اہم اور قابل ذکر کتاب لکھی جو مقدمہ ابن صلاح کے نام سے مشہور ہے، اس میں انہوں نے بعض انواع کا مفید اضافہ کیا ہے لیکن حاکم کی حیثیت متقدم ومتبوع کی ہے اور ابن صلاح ان کے تابع ہیں انہوں نے اکثر چیزیں حاکم کے حوالہ سے لکھی ہیں۔" (کشف الظنون ج ۲ ص ۱۲۹)

اس تفصیل سے ثابت ہوگیا کہ اس موضوع پر یہ دوشرح باقاعدہ اور پہلی مکمل وجامع کتاب ہے، جو پانچ اجزا اور باون انواع پر مشتمل ہے، اس میں مصنف نے حدیث کے اسناد ومتون وغیرہ گوناگوں انواع واقسام اور راویوں کے مختلف درجات و طبقات، ان کے مراتب اور اصول حدیث کے مہمات مسائل پر سیر حاصل اور عمدہ بحثیں کی ہیں، ہر بحث کی تعریف، اہمیت، نوعیت اور ضرورت کو مثالوں سے واضح کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں متقدمین کے کاموں کا ایک حد تک ذکر بھی آ گیا ہے، ہر بحث میں پہلے احادیث وآثار سنداً بیان کئے گئے ہیں اور آخر میں ان سے مصنف نے جو حقائق اور معنی خیز نتائج اخذ کیے ہیں، ان کا ذکر ہے۔ ضمناً اکثر صحابہؓ وراویانِ حدیث کے بعض خصوصیات سنین وفات اور ان کے بارے میں دوسرے مختلف النوع معلومات بھی تحریر کئے گئے ہیں۔

معرفۃ علوم الحدیث کے قلمی نسخے، یورپ، ترکی، مصر، شام اور ہندوستان کے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں، ان سب کی مدد ومقابلہ وتصحیح کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات وعربی کے سابق صدر ڈاکٹر سید معظم حسین نے اس کو ایڈٹ کیا تھا جو ۱۹۳۵ء میں مصر سے دائرۃ المعارف حیدرآباد کے اہتمام میں شائع ہوا ہے، اس کے شروع میں فاضل مرتب نے ایک جامع و مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے، اس میں مصنف کے حالات وکارنامے اور اصول حدیث کی امہات کتب کا تذکرہ کیا گیا ہے اور حواشی میں نسخوں کے فرق واختلاف اور کمی بیشی کی تصریح کی ہے۔

حافظ ابونعیم اصبہانی نے اس پر مستخرج لکھا تھا اور علامہ طاہر جزائری نے توجیہ النظر میں اس کا ملخص شامل کیا ہے۔ (مقدمہ تصحیح)

۲۔ المستدرک علی الصحیحین:

یہ حاکم کی سب سے اہم اور شہرہ آفاق کتاب ہے، ذیل میں اس کے متعلق ضروری معلومات پیش کئے جاتے ہیں۔

مستدرک کی تعریف:

محدثین کی اصطلاح میں حدیث کی وہ کتابیں مستدرک کہلاتی ہیں جن میں ان حدیثوں کو نقل کیا جاتا ہے جو حدیث کی کسی اور کتاب کی شرط کے مطابق ہونے کے باوجود اس میں درج ہونے سے رہ گئی ہوں۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۷۳ و ۱۰۳) اس طرح کی حدیث کی جو کتابیں لکھی گئیں ہیں ان میں ابوعبداللہ حاکم کی المستدرک علی الصحیحین زیادہ مشہور ومتداول ہے، جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم پر مستدرک ہے، یعنی اس میں ان حدیثوں کو شامل کیا گیا ہے جو حاکم کے خیال

Marfat.com

میں صحیحین کے معیار و شرائط کے مطابق ہونے کے باوجود ان میں شامل نہیں کی گئی ہیں۔

مستدرک کی تالیف کی وجہ:

حاکم نے مستدرک کے شروع میں اس کی جمع و تالیف کا سبب و مقصد اور ان حالات کا ذکر کیا ہے جو اس کی ترتیب و تصنیف کا باعث ہوئے تھے، وہ لکھتے ہیں:

''ائمہ حدیث میں ابوعبداللہ محمد اسماعیل جعفی ابوالحسین، مسلم بن حجاج قشیری نے صحیح حدیثوں کے دو نہایت عمدہ اور بیش قیمت مجموعے مرتب کیے ہیں، ان دونوں کتابوں کی چار دانگ عالم میں شہرت ہے لیکن دونوں بزرگوں میں سے کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ بجز ان حدیثوں کے جن کی انہوں نے تخریج کی ہے اور کوئی حدیث صحیح نہیں ہے مگر ہمارے زمانہ کے بعض مبتدعین اور اہل اہوا جو محدثین پر سب وشتم کرنے میں بہت جری واقع ہوئے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ صحیح حدیثوں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں ہے، رہے وہ اسانید جو ایک ہزار یا اس سے کچھ کم و بیش اجزا پر مشتمل ہیں سب کے سب سقیم اور غیر صحیح ہیں، اس صورت حال کے پیش نظر اس شہر کے کچھ اعیان و مشاہیر اہل علم نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ایسی کتاب مرتب و مدون کروں جو ان حدیثوں پر مشتمل ہو جن کے اسانید اسی طرح کے ہوں جس طرح کے اسانید کو شیخین نے صحیح اور قابل احتجاج قرار دیا ہو اس لیے کہ جو حدیث علت قادحہ سے خالی ہو اس کو صحیح سے خارج کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔'' (المستدرک ج ا ص ۲ و ۳)

مستدرک کی اہمیت:

مستدرک کا شمار حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہوتا ہے اور بعض حیثیتوں سے اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے، شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی نے کتب حدیث کے تیسرے طبقہ میں اس کو محسوب کیا ہے۔ (عجالہ نافعہ فوائد جامعہ) اس طبقہ میں مسند دارمی، سنن دارقطنی، مسند ابوداؤد طیالسی اور مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ جیسی اہم اور بلند پایہ کتابیں ہیں بعض محدثین نے اس کا پایہ صحیح ابن حبان کے قریب قریب بتایا ہے، (مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۸) اور اس کا نام بھی صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان کے ساتھ لیا جاتا ہے، حافظ ابن صلاح اور علامہ نووی نے صحاح کے بعد حدیث کی جن کتابوں کو زیادہ اہم، قابل اعتماد اور پر از منفعت قرار دیا ہے، ان میں امام دارقطنی کی سنن کے بعد اسی کا نام لیا ہے۔ (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۹۲ و تدریب الراوی ص ۳۰ او ۳ و ۲۶۰)

مستدرک کی حدیثوں کی نوعیتیں:

اوپر حاکم کا جو بیان گزرا ہے، اس سے اور حاکم کی دوسری تصریحات سے مستدرک کی حدیثوں کی مندرجہ ذیل نوعیتوں کا پتہ چلتا ہے۔

1. مستدرک میں شیخین (امام بخاری و امام مسلم) کی ان متروک حدیثوں کو جو ان کے معیار و شرائط کے مطابق ہیں جمع کیا گیا ہے۔
2. دونوں بزرگوں میں سے صرف ایک کی متروک حدیثوں کو بھی درج کیا گیا ہے۔
3. مستدرک میں ایسی حدیثیں بھی شامل ہیں جو صحیحین کے اصول و شرائط کے مطابق تو نہیں ہیں لیکن امام حاکم کی تحقیق میں وہ صحیح اور علل و اسقام سے پاک ہیں۔ (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۱)

Marfat.com

۴ حاکم کے [1] بیان کے مطابق بعض ایسی حدیثیں بھی مستدرک میں ہیں جن پر کلام کیا گیا ہے اور وہ انکے معیار و شرائط کے مطابق بھی نہیں ہیں لیکن انہوں نے انکو شواہد و متابعات کی حیثیت سے یا اور کسی خاص اضطرار وغیرہ کی بناء پر نقل کیا ہے۔

حاکم نے مستدرک میں کہیں کہیں ایک مقدمہ کا حوالہ دیا ہے جس میں انہوں نے ان اصول و خصوصیات اور شرائط کا مفصل ذکر کیا تھا جن کو مستدرک کی تالیف و ترتیب میں مدنظر رکھا تھا لیکن یہ مقدمہ مستدرک کے مطبوعہ نسخے میں شامل نہیں ہے، وہ یا تو محفوظ نہیں رہا یا حاکم نے اس کو مرتب ہی نہ کیا ہو اور اس بنا پر کہ اس کو لکھنے کا ارادہ تھا، اس کا حوالہ دے دیا ہو، اگر یہ مقدمہ موجود ہوتا تو اس سے مستدرک کے اصول و شرائط اور اس کی حدیثوں کی نوعیت اور خصوصیات معلوم کرنے میں بڑی آسانی ہوتی جہاں انہوں نے اس کے حوالے دیئے ہیں، ان میں سے بھی مستدرک کی حدیثوں کی نوعیت اور خصوصیت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، اس ذیل میں مستدرک کی حدیثوں کی بعض نوعیتیں ان حوالوں کی مدد سے لکھی جاتی ہیں۔

۵ مستدرک میں ایک صحابی کی حدیث دوسرے صحابی سے بشرطیکہ وہ صحیح طرق سے ثابت ہو درج کی جائے گی۔

(المستدرک ج ۱ ص ۱۱۸ و ۱۱۹)

۶ اگر کسی صحابیؓ سے کسی ایک ہی معروف تابعی کی روایت کا پتہ چل سکا ہو تو اس کو بھی مستدرک میں بطور حجت پیش کیا جائے گا اور اس کو صحیح قرار دیا جائے گا۔ (ایضاً ص ۲۳)

۷ ثقات کے تفرد اور اضافے کی تخریج بھی کی جائے گی، بشرطیکہ وہ مرتب کے خیال میں علتوں سے خالی ہوں کیونکہ ثقہ کا اضافہ مقبول ہوتا ہے۔ (ایضاً ص ۴۲ و ج ۵۸)

۸ کسی موصول و مسند حدیث کو اگر ارسالاً اور موقوفاً بھی روایت کیا گیا ہو تو موصول و مسند حدیث کو محض دوسری حدیث کے وقف و ارسال کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جائے گا، کیونکہ ہمارے اصول اور قاعدے کے مطابق ایسی صورت میں مسند و موصول روایت کرنے والے کی حدیث قابل قبول ہوگی۔ (ایضاً ج ۱ ص ۱۷۲)

۹ حلال و حرام کے متعلق احادیث میں زیادہ احتیاط اور سختی برتی جائے گی، مگر فضائل اعمال کے سلسلہ کی حدیثوں میں زیادہ سختی سے کام نہ لیا جائے گا، اس اصول کے متعلق انہوں نے کتاب الدعوات میں شیخین کی متروک حدیثوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ابو سعید عبدالرحمٰن بن مہدی کا یہ قول بھی تحریر کیا ہے کہ:

> "ہم لوگ جب رسول اللہ ﷺ کی حلال و حرام سے متعلق حدیثیں روایت کرتے ہیں تو اسانید و رجال کو پرکھنے میں زیادہ شدت برتتے ہیں اور پوری احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہیں مگر فضائل اعمال اور ثواب و عقاب، مباحات و دعوات سے متعلقہ روایات کے اسانید میں تساہل سے کام لیتے ہیں۔" (المستدرک ج ۱ ص ۴۹۰)

المدخل میں اس قول کے ساتھ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی اسی طرح کا ایک قول نقل کیا ہے:

> "جب ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے مرویات بیان کرتے ہیں تو حلال و حرام اور سنن و احکام کے سلسلہ میں تشدد سے اور فضائل اعمال اور غیر احکامی حدیثوں میں لینت اور نرمی سے کام لیتے ہیں۔" (المدخل ص ۴)

---

[1] (یہ خود حاکم کا بیان ہے ورنہ عام اہل فن نے تو مستدرک میں ضعیف اور موضوع حدیثوں کی کثیر تعداد بتائی ہے)

Marfat.com

تلاش و تفحص:

امام ابوعبداللہ نے ان ہی اصول و شرائط کے مطابق مستدرک میں حدیثیں جمع کی ہیں اور جو حدیثیں ان کے بیان کے مطابق نہیں ہیں، ان کو نقل کرنے سے احتراز کیا ہے، چنانچہ کہیں کہیں مستدرک میں اس کی تصریح و توضیح کی ہے، اس سے مستدرک کی جمع و تالیف اور ترتیب و تدوین میں ان کی تلاش و محنت اور چھان بین کا پتہ چلتا ہے، بعض مواقع پر انہوں نے خود بھی اس تلاش و تحقیق کا ذکر کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں نے مشہور حدیث: ''من سئل عن علم فکتمه جيئ به يوم القيامة وقد الجم بلجام من نار۔' کے متعلق جو متعدد طرق و اسانید سے مروی ہے، امام دارقطنی سے دریافت کیا کہ عطار کی روایت کے متعدد اسناد میں کوئی سند صحیح ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں میں نے وجہ دریافت کی تو کہا کہ عطا نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع نہیں کیا ہے لیکن جب میں نے اس کی مزید تحقیق کی تو متعدد لوگوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ انہوں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے عطا کے سماع کا ذکر کیا ہے، اس سے ثابت ہوگیا کہ یہ حدیث صحیح سندوں سے مروی ہے اور اس میں کوئی سقم نہیں ہے، میری اس تحقیق کو امام دارقطنی نے بھی پسند کیا اور اس بارے میں وہ میرے معترف اور ہمنوا ہوگئے۔'' (المستدرک ج ۱ ص ۱۰۱)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''زکوۃ کی تفسیر و توضیح کرنے والی حدیثوں کی تخریج میں جس قدر ممکن ہوسکا ہے، میں نے اپنی غیر معمولی محنت و کاوش صرف کردی ہے اور ان کی صحت کے بارے میں خلفائے اربعہؓ، صحابہؓ اور تابعینؒ کے صحیح اسناد، ان کے تعامل اور شہرت و قبول سے استدلال بھی مہیا کر دیا ہے جو غور و فکر کرنے والوں کے لیے کافی ہے۔'' (المستدرک ج ۱ ص ۳۹۷)

حاکم کی کاوش کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے مستدرک میں ایسی حدیثیں جمع کی ہیں جن سے حدیث کی دوسری کتابیں خالی ہیں۔

مستدرک کی خصوصیات:

مستدرک کی بعض اہم خصوصیات یہ ہیں:

1 حاکم نے اس کی ترتیب، ابواب کی تبویب اور احادیث کے نقل و انتخاب میں حسن و موزونیت کے علاوہ بعض مقامات میں جدت و اختراع سے بھی کام لیا ہے، اس سے ان کی محنت اور جانفشانی کا اندازہ ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک تلاش و اجتہاد نے میری رسائی کی ہے میں نے خلفائے اربعہ کے فضائل سے متعلق وہ تمام حدیثیں جمع کردی ہیں جو صحیح سندوں سے مروی ہیں اور جن کو شیخین نے ترک کر دیا ہے، پھر میں نے اس کتاب کے نظم و ترتیب کے لحاظ سے یہ مناسب سمجھا کہ ان بزرگوں کے مناقب کے بعد دیگر صحابہ کے فضائل و فیات کی ترتیب پر جمع کروں۔'' (ایضاً ج ۳ ص ۱۸۰)

عام محدثین کے برخلاف انہوں نے کتاب الفتن والملاحم کے بعد کتاب الاہوال کا بھی ایک علیحدہ باب علامہ ابن خزیمہ کے تتبع میں قائم کیا ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے مبلغ علم کے مطابق آخری زمانہ کے فتن کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ مروی تھا، وہ سب میں نے اس کے اندر بہتر سندوں کے ساتھ بیان کر دیا ہے، شیخین نے قیامت اور حشر و نشر کے اہوال کی حدیثیں کتاب الفتن ہی میں شامل کردی ہیں لیکن

Marfat.com

میں نے اس سلسلہ میں ابوبکر بن محمد بن اسحٰق بن خزیمہ کے انداز پر اس کو باب الفتن سے علیحدہ ذکر کیا ہے۔''

(المستدرک ج ۴ ص ۵۵۸)

امام بخاری وغیرہ محدثین نے کتاب البیوع میں متعدد مستقل ابواب مثلاً کتاب السلم، شفعہ اور اجارہ وغیرہ قائم کئے ہیں لیکن حاکم نے کتاب البیوع کے جامع عنوان ہی میں ان سب ابواب کو بھی جمع کر دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

''میں نے اسی کتاب (کتاب البیوع) کے ضمن میں ان کتب کو بھی درج کر دیا ہے جن کے لیے امام بخاری نے کتاب البیوع کے آخر میں مستقل عنوانات قائم کئے ہیں، یہ وضاحت اس لیے کر دی گئی تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ میں نے کتاب البیوع کو ان ابواب سے خالی رکھا ہے۔'' (ایضاج ۲ ص ۶۵و۶۶)

فضائل صحابہ میں صرف صحابہ کے مناقب وفضائل ہی بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان کے سنین اور مختصر حالات بھی تحریر کئے ہیں۔

۲ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ امام بخاری وامام مسلم کی کتابوں کی بھی بعض خصوصیات واصول اور اس کے متعلق مفید معلومات اس سے معلوم ہو جاتے ہیں، مثلاً:

(ا) شیخین نے بعض غیر معلل حدیثوں کو نقل کرنے سے اس لیے احتراز کیا ہے کہ ان کے رواۃ میں کوئی راوی قلیل الروایت رہا ہو، چنانچہ ایک حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''اس حدیث کے ازاول تا آخر رواۃ سے بجز یوسف بن ابی بردہ کے شیخین نے حجت قائم کی ہے اور جو کچھ اس سلسلہ میں مجھ کو معلوم ہوا ہے، وہ یہ کہ ان دونوں حضرات نے کسی جرح وضعف کی وجہ سے ان کو نہیں چھوڑا ہے بلکہ ان کی قلت روایت کی وجہ سے چھوڑا ہے۔''

(المستدرک ج ا ص ۳۲)

(ب) شیخین نے بعض صحیح حدیثوں کو کسی ایک راوی کے تفرد یا اس حدیث کے دوسرے رواۃ کی کسی مخالفت وعدم متابعت کی وجہ سے اس کو نظرانداز کر دیا ہے، حاکم اس کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت عثمانؓ سے وضو کے متعلق جو حدیث مروی ہے، اس کے طرق کی تخریج پر شیخین نے بھی اتفاق کیا ہے لیکن ان کی روایات میں داڑھی کے تین بار خلال کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے، حالانکہ یہ بھی صحیح اسناد سے ثابت ہے اور ان دونوں بزرگوں نے عامر بن شقیق کے سوا اس کے تمام رواۃ سے حجت قائم کی ہے لیکن عامر کے متعلق مجھ کو کسی طعن کا کوئی علم نہیں۔'' (ایضاص ۱۴۹)

(ج) شیخین کے غیر معمولی حزم واحتیاط کی بنا پر روایت ترک کر دینے کا اصول بھی اس سے معلوم ہوتا ہے، مثلاً لکھتے ہیں:

''یہ حدیث صحیح الاسناد ہے لیکن ان دونوں بزرگوں نے عبداللہ بن محمد بن عقیل ابن ابی طالب کے تفرد اور ان کی جانب سوء حفظ کی نسبت کی وجہ سے اس کی تخریج نہیں کی ہے مگر ہمارے ائمہ متقدمین کے نزدیک وہ ثقہ ومامون شخص ہیں۔''

(د) شیخین کے کسی راوی سے استشہاد کا حال معلوم ہوتا ہے۔ (المستدرک ج ا ص ۷۱و۲۷)

(ہ) شیخین یا ان میں سے ایک کے بارے میں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ انہوں نے حاکم کے کن کن رواۃ سے احتجاج کیا ہے۔

(و) حدیثوں کے شیخین کے شرائط کے مطابق ہونے کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض حدیثوں کو انہوں نے مکمل یا مختصر صورت میں یا قدرے فرق واختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے، چنانچہ کتاب العلم کی ایک حدیث کے متعلق لکھتے ہیں:

Marfat.com

''اس کو شیخین نے مفصل ومختصر دونوں طرح ذکر کیا ہے، میں نے اس کا اعادہ اس وجہ سے کیا ہے کہ اس کے سوا مجھے ان کے یہاں اجماع کی حجیت ثابت کرنے والی اور کوئی حدیث نہیں ملی، باقی ان ابواب میں اس موقع پر میں نے متعدد ایسی حدیثیں نقل کی ہیں جن کی ان لوگوں نے تخریج نہیں کی ہے۔'' (المستدرک ج ۱ ص ۱۱۴)

۳ مستدرک میں فقہی مسائل سے کم تعرض کیا گیا ہے تاہم ان کے ذکر سے یکسر خالی نہیں ہے اور حاکم نے بعض فقہی اختلافات میں مرجح واولیٰ کی نشاندہی بھی کی ہے، جس سے ان کی اجتہادی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۴ مستدرک کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بعض حدیثوں کے مراجع ومصادر کی نشاندہی بھی کی ہے، اس سلسلہ میں جامع بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، موطا امام مالک، المبسوط امام شافعی اور صحیح ابن خزیمہ کے نام لیے ہیں لیکن بعض کتب ومسانید ووحدان کا نام لیے بغیر بھی ذکر کیا ہے۔

۵ بعض ابواب اور مضامین کی حدیثوں کو جمع کرنے میں بڑا اہتمام کیا ہے اور بعض حدیثوں کے اسناد وطرق کو جمع کرنے میں بڑے استقصا سے کام لیا ہے، اسی لیے مستدرک میں بکثرت ایسی حدیثیں ہیں جن سے دوسری کتب حدیث خالی ہیں۔

۶ حدیثوں کی تصحیح وتصویب، ان کے قوی عزیز، ضعیف وشاذ اور غریب ہونے کی نشاندہی، وقف وارسال، رفع واتصال اور علوے اسناد کی تصریح، حفظ وضبط اور اتقان کے لحاظ سے ان کے اولیٰ واحسن ہونے اور علت وضعف اور سقم وعیب سے خالی ہونے کا ذکر، راویوں کی توثیق، دو روایتوں اور راویوں میں باہمی موازنہ، راوی کے شک ووہم، اس کے تفرد، مخالفت، عدم متابعت اور سماع ولقا یا عدم سماع بقا کی توضیح اور بعض حدیثوں کے بارے میں یہ بھی بتایا ہے کہ اس کو کس جگہ کس وقت اور کس ماہ وسن میں انہوں نے روایت کیا ہے، اسی طرح روایات کے شواہد ومتابعات، فنی مباحث کے متعلق علمائے جرح وتعدیل کے اقوال، روایات ورواۃ کی صحت وقوت یا ضعف وجرح کو واضح کر کے اس کے دلائل بھی بیان کئے ہیں اور حدیث کے مفہوم وغیرہ کے سلسلہ میں بھی مختلف النوع وضاحتیں کی ہیں جن کو آگے لکھا جائے گا۔

طرزِ استدلال:

مستدرک کے محاسن وخصوصیات کا اندازہ اس کے طرز استدلال سے بھی ہوتا ہے، لیکن اکثر دلائل خالص فنی نوعیت کے ہیں، اس لیے جب تک ان کا اصل پس منظر اور پوری تفصیل سامنے نہ ہو ان کو نقل کرنا نہ زیادہ مفید ہوگا اور نہ عام لوگوں کے لیے اس میں دلچسپی کا کوئی سامان ہے لیکن حاکم کے استدلال کی خصوصیات اور ان کے نقد ونظر کا اندازہ کرنے کے لیے یہاں ان کے ان انتقادات کا ذکر کیا جاتا ہے جو انہوں نے شیخین پر کیے ہیں، شیخین پر حاکم کے نقد وتبصرہ دو طرح کے ہیں، ایک تو وہ جن میں کسی حدیث کے بارے میں صرف شیخین کی عدم تخریج کا ذکر ہے، دوسرے وہ ہیں جن میں شیخین کے عدم تخریج کے وجوہ واسباب کا ذکر کرنے کے بعد ان پر تنقید کی گئی ہے، ان میں سے دوسری نوع کی بعض تنقیدیں یہاں درج کی جاتی ہیں:

''یہ حدیث صحیح اور ثقہ محدثین کے یہاں متداول ہے لیکن ان دونوں بزرگوں نے اس لفظ کے ساتھ اس کی تخریج نہیں کی ہے، میرے خیال میں ان لوگوں نے اس کے راوی حسان بن کاہل (یا کاہن) کی وجہ سے اس کو چھوڑ دیا ہے، کیونکہ ان سے روایت کرنے والے معروف شخص محض حمید بن ہلال عدوی ہیں لیکن ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ ان سے قرہ بن خالد نے بھی روایت کیا ہے، علاوہ ازیں خود شیخین نے بھی بعض ثقہ لوگوں سے ایسی روایتوں کی تخریج کی ہے جن سے صرف ایک شخص نے روایت کیا

Marfat.com

ہے، اس اصول کے بموجب ان دونوں بزرگوں کو اسی جیسی دوسری حدیث کی تخریج بھی کرنی چاہیے تھی۔'' (المستدرک ج ۱ ص ۸)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''شیخین اجلح بن عبداللہ کندی کے ترک اور عدم احتجاج پر متفق ہیں اور ان سے ان کی ناراضگی کی وجہ محض عبداللہ بن بریدہ کی ایک حدیث کی روایت ہے، حالانکہ اس میں تین ثقہ راویوں نے ان کی متابعت کی ہے، پس یہ حدیث صحیح ہے لیکن ان دونوں بزرگوں نے اس کی تخریج نہیں کی ہے۔'' (ایضاً ج ۲ ص ۷۷)

امام دارقطنی نے بھی کتاب الالزامات علی الشیخین کے نام سے مستدرک ہی کی طرح ایک کتاب لکھی تھی، امام حاکم نے اس حوالہ سے بھی شیخین پر نقد کیا ہے، اس کی ایک مثال یہ ہے:

''یہ صحیح حدیث ہے، اس میں کوئی علت نہیں پائی جاتی لیکن شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی ہے کیونکہ عروہ، کرز بن علقمہ سے روایت کرنے میں منفرد ہیں اور کرز بن علقمہ صحابی ہیں اور ان کی حدیث ائمہ کے مسانید میں درج ہے۔ میں نے علی بن عمر سے سنا ہے کہ امام بخاری و مسلم کے لیے کرز کی اس حدیث کی تخریج لازم تھی، کیونکہ اس کو عروہ بن زبیر نے اور ان سے زہری و عبدالواحد جیسے اکابر نے روایت کیا ہے، امام ابوالحسن کے بیان کی واضح دلیل یہ ہے کہ شیخین عتبان ابن مالک جن کے گھر میں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی تھی حدیث پر متفق ہیں، حالانکہ ان سے روایت کرنے والے تنہا محمود بن ربیع ہیں۔''

(المستدرک ج ۱ ص ۴۳)

حزم واحتیاط:

امام حاکم کے اصول و شرائط اور بحث و استدلال سے مستدرک کی تالیف میں ان کی احتیاط کا بھی اندازہ ہوتا ہے، انہوں نے وہی احادیث و روایات نقل کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کے اصول و معیار کے مطابق غیر معلل اور ضعف و سقم سے خالی ہیں، اس لیے حدیث نقل کرنے کے بعد عموماً انہوں نے اس کی صراحت بھی کر دی ہے کہ وہ قدح و علت اور سقم و عیب سے پاک ہے لیکن حاکم کا عام رجحان یہ ہے کہ کوئی صحیح اور غیر معلل حدیث چھوٹنے نہ پائے، اس لیے احتیاط کے باوجود بھی مستدرک میں لینت و مداہنت کو راہ مل گئی ہے، اس پر آگے مستقل بحث کی جائے گی۔

احادیث کے متعلق وضاحتیں:

امام عبداللہ حاکم نے احادیث کے بارے میں مختلف النوع وضاحتیں کی ہیں، ان سے احادیث کے متعلق مفید معلومات فراہم ہوتے ہیں، یہ وضاحتیں مختلف طرح کی ہیں۔

۱ کسی حدیث کے متداول ہونے یا کسی خاص مقام میں مروج ہونے کا ذکر۔

۲ بعض حدیثوں کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ کسی خاص مسئلہ میں اصل و بنیاد اور حجت و دلیل ہیں۔

۳ بعض حدیثوں کے کسی باب میں نقل کرنے کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔

۴ حاکم نے بعض حدیثوں کی اپنے زمانہ کے حالات کے لحاظ سے خاص اہمیت و ضرورت واضح کی ہے، مثلاً احتکار کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''عسرت اور تنگی کے موقع پر مسلمانوں کی مواسات سے احتراز کے زجر و توبیخ کے بارے میں جو اخبار و احادیث وارد ہیں، ان کا ذکر

Marfat.com

یہاں بہت ضروری ہے، کیونکہ اس وقت مسلمان ان ہی حالات سے دوچار ہیں۔'' (المستدرک ج ۲ ص ۱۱)

آ گے چل کر مزید لکھتے ہیں:

''یہ حدیثیں نہایت تلاش وجستجو کے بعد یہاں نقل کی گئی ہیں، گو یہ ہماری اس کتاب کی شرط کے موافق نہیں ہیں تاہم چونکہ لوگ اس ضیق میں مبتلا ہیں (اللہ اس کو ختم کرے) اس لیے یہاں ہم نے ان کو نقل کر دیا ہے۔'' (مستدرک ج ۲ ص ۱۳)

۵ انہوں نے کہیں کہیں ابواب کے شروع یا درمیان میں نوٹ لکھے ہیں جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں مثلاً فضائل صحابہؓ کے ابواب کے شروع میں لکھتے ہیں:

''ہم نے صحابہؓ کے ذکر میں پہلے ان کے نسب ووفات کا ذکر کیا ہے، پھر ان کے مناقب میں وہ حدیثیں درج کی ہیں جو شیخین کی شرطوں کے مطابق ہیں لیکن انہوں نے ان کی تخریج نہیں کی، ہم کو اعتراف ہے کہ ہم اس باب میں محمد بن عمرو واقدی اور ان کے جیسے لوگوں کی روایات سے صرف نظر نہیں کر سکے ہیں۔'' (ایضاج ۳ ص ۶۱)

اصحاب صفہ کے بیان میں حاکم نے ان کے متعلق روایات کی مدد سے ان کے ناموں کی مفصل فہرست دی ہے، ان کے طبقات وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور ان کے اشغال ومعمولات اور امتیازی خصوصیات کے سلسلہ میں ان سے اصحاب تصوف کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ (ایضا کتاب الہجرۃ ص ۱۶ تا ۱۸)

مستدرک کی تلخیصات:

جن علما نے مستدرک کے ساتھ اعتنا کیا، ان میں علامہ ذہبی (م ۷۴۸ھ) کا نام زیادہ مشہور ہے، انہوں نے مستدرک کی تلخیص لکھی جو بہت مشہور ہے، اس کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود ان کی اور بعض دیگر علما کی رائے میں اس کو دیکھے بغیر مستدرک کی تصحیح پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں ذہبی نے طویل حدیثوں اور اسناد کا اختصار ہی نہیں کیا ہے بلکہ جا بجا حاکم پر نقد وتعقب بھی کر کے احادیث کی تصحیح میں ان کے تساہل، روایتوں کے ضعف ونکارت اور وضع نیز راویوں کے جرح وسقم وغیرہ کو بھی واضح کیا ہے۔

علامہ ذہبی نے اپنی تلخیص میں بعض مواقع پر حاکم کے استدراک کی توثیق وتائید اور بعض مواقع پر سکوت اختیار کیا ہے، یہ بھی حاکم کی رائے سے اتفاق ہی ہے، رہا ان کا نقد وتعقب تو اس کی مختلف نوعیتیں ہیں:

(ا) حاکم نے کسی حدیث کو شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی شرائط کے مطابق بتایا ہے اور ذہبی نے اس کی تردید کی ہے۔

(ب) حاکم نے کسی حدیث کو دونوں بزرگوں کے شرائط کے مطابق قرار دیا ہے لیکن ذہبی کی تحقیق میں وہ صرف ایک ہی کی شرط کے مطابق ہے۔

(ج) حاکم نے احادیث کی صحت اور رجال واسناد کی قوت کا ذکر کیا ہے اور ذہبی نے ان کا ضعف ووضع، جرح وقدح اور سقم ونکارت ثابت کیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ذہبی نے بڑی دقت نظر سے مستدرک کی تلخیص کی تھی اور ان کے نقد وتعقب کا زیادہ حصہ صحیح ہے لیکن کہیں کہیں اس میں بھی فروگذاشتیں ہیں مثلاً کسوف کے بیان میں ایک حدیث نقل کرنے کے بعد حاکم نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ (ولم یخرجاہ) یعنی شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی ہے۔ ذہبی نے اس پر یہ تنقید کی ہے۔

Marfat.com

واسنادہ حسن وماھو علی شرط واحد منھما۔ (المستدرک کتاب الھجرۃ ج ۱ ص ۳۲۵)

اس کے اسناد حسن ہیں لیکن وہ شیخین میں سے کسی کی شرط کے مطابق نہیں ہے۔

حالانکہ حاکم نے یہاں سرے سے حدیث کے شیخین کی شرط کے مطابق ہونے کا ذکر ہی نہیں کیا ہے بلکہ صرف یہ لکھا ہے کہ انہوں نے اس کی تخریج نہیں کی تھی، اس بنا پر ذہبی کا یہ نقد صحیح نہیں ہے۔

مستدرک اور تلخیص کے مصححین نے بھی علامہ ذہبی کے نقد پر تعقب کیا ہے، مثلاً ایک جگہ حاکم نے ایک حدیث کو صحیح الاسناد قرار دیا ہے، اس پر نقد کرتے ہوئے ذہبی نے لکھا ہے:

عبدالرحمان لم یسمع من ابیہ وعبدالرحمن ومن بعدہ سوا بحجۃ۔

عبدالرحمٰن نے اپنے والد سے سماع نہیں کیا تھا اور عبدالرحمٰن اور ان کے مابعد کے راوی حجت نہیں۔

مصحح لکھتے ہیں:

''تقریب التھذیب میں عبدالرحمٰن کو ثقہ اور صغار تابعین میں بتایا گیا ہے، ان کا انتقال ۷۹ھ میں ہوا تھا، انہوں نے اپنے والد سے سماع کیا ہے لیکن بہت کم، اسی طرح عبدالرحمٰن کے صاحبزادے قاسم کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ وہ ثقہ وعابد اور طبقہ رابعہ میں ہیں، پس ذہبی کا ان لوگوں کو مطلقاً عدم حجت قرار دینا کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟'' (المستدرک مع تلخیص ج ا ص ۵۰۹)

ذہبی ایک جگہ ایک راوی ابوالصہباء کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''صحیح بخاری میں ان سے روایت نہیں کی گئی ہے گو واقعہ کے لحاظ سے یہ بات درست ہو لیکن علامہ ذہبی کا منشا حاکم پر نقد اور اس راوی کو ضعیف قرار دینا ہے، جو صحیح نہیں ہے، تقریب ہی کے حوالہ سے مصحح لکھتے ہیں کہ وہ طبقہ رابعہ اور مقبول رواۃ میں ہیں۔ (ایضاً ص ۵۲۵)

بعض مقامات پر اصل اور تلخیص میں معمولی فرق بھی ہے مثلاً روزے کے بیان میں حاکم نے ایک حدیث میں صرف ''وابتلت العروق'' لکھا تھا مگر ذہبی نے اس کو تلخیص میں ''وابتلت العروق بالماء'' لکھا ہے، (المستدرک مع تلخیص ج ا ص ۴۲۲) ایک اور جگہ نے ''اغار'' لکھا ہے، ذہبی نے اس کو ''اغان'' کر دیا ہے، (ایضاً ج ۲ ص ۳) ایک جگہ حاکم نے ''ثنا یعقوب بن ابراہیم'' لکھا ہے، ذہبی نے اس کو بدل کر ''رواہ یعقوب الدورقی'' (ایضاً ج ا ص ۱۱۵) کر دیا ہے، گو یعقوب بن ابراہیم اور یعقوب الدورقی ایک ہی شخص ہیں لیکن اس تصرف سے اشتباہ ہوسکتا ہے، دوسرے ذہبی نے ثنا کو جو خود مختصر تھا رواہ کر دیا ہے۔

مستدرک کی یہ تلخیص بھی اس کے ساتھ چار ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

۲۔ امام سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے توضیح المستدرک فی تصحیح المستدرک لکھی تھی جو ایک جلد میں ناتمام ہے، اس میں بھی حدیثوں کی تلخیص ہے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۲۷)

۳۔ مستدرک کی موضوع حدیثوں کو بھی ایک جزو میں جمع کیا گیا تھا جو تقریباً ایک سو حدیثوں پر مشتمل ہے۔ (ایضاً) بعض لوگوں نے اس کو بھی ذہبی کی تصنیف بتایا ہے۔

مستدرک کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں، دائرۃ المعارف حیدرآباد نے جس کے اسلامی علوم وفنون کی خدمت اور علمائے اسلام کی بیش قیمت اور کمیاب کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں کارنامے اظہر من الشمس ہیں، اس شہرۂ آفاق کتاب کو بھی اس کے کئی مخطوطات کی مدد سے چار ضخیم جلدوں میں شائع کیا تھا، پہلی جلد ۱۳۳۴ھ اور باقی جلدیں بالترتیب

Marfat.com

۱۳۴۰ھ تا ۱۳۴۲ھ میں تصحیح و تحشیہ کے بعد شائع کی ہیں۔
فاضل مصحح نے مستدرک اور تلخیص پر کہیں کہیں مختصر مگر مفید نوٹ لکھے ہیں' مستدرک کی اشاعت کے بعد دارالمصنفین کے سابق رفیق اور مشہور صاحب علم و قلم مولانا ابوالجلال ندوی نے اس پر ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا، اس میں مستدرک کے ناشرین کو بعض مشورے دیئے تھے، اس کے جواب میں دائرۃ المعارف کے رکن مولانا ہاشم ندوی کا مضمون بھی اسی زمانہ میں چھپا تھا۔[1]

صحیح مستدرک اور حاکم پر بعض اعتراضات کا جائزہ:

حاکم اور ان کی مستدرک پر چند اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، ان میں سے بعض تو غلط ہیں اور بعض اگرچہ غلط نہیں ہیں تاہم وہ بحث و تنقیح طلب ضرور ہیں، اس لیے مستدرک کی اہمیت و خصوصیت بیان کرنے کے بعد ان کا جائزہ لینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

امام حاکم اور ان کی مستدرک پر سب سے مشہور الزام تساہل کا ہے، اس سلسلہ میں چند اور ضمنی الزامات بھی عائد کیے گئے ہیں، گو ان کا اصل تعلق بھی تساہل ہی سے ہے لیکن ان پر علیحدہ علیحدہ اور مستقلاً گفتگو کرنا زیادہ مفید و مناسب ہوگا۔

مستدرک اور صحیحین:

پہلے گزر چکا ہے کہ مستدرک کی تالیف کا مقصد صحیحین کی ان متروک حدیثوں کو جمع و مدون کرنا ہے جو حاکم کے خیال میں ان کی شرطوں کے مطابق صحیح ہونے کے باوجود ان میں شامل نہیں کی گئیں، اس سلسلہ میں بحث طلب امر یہ ہے کہ حاکم نے جن حدیثوں کے صحیحین کی شرطوں کے مطابق صحیح ہونے کا دعویٰ کیا ہے وہ واقع میں صحیح ہیں یا نہیں۔

1. ابوسعید مالینی کا بیان ہے کہ "میں نے مستدرک کا مطالعہ کیا تو مجھ کو اس کی ایک حدیث بھی شیخین کے شرائط کے مطابق نہیں ملی۔"
(طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۹ و بستان المحدثین ص ۴۲)

2. دوسرے علمائے فن کے نزدیک مستدرک کی تمام حدیثیں تو نہیں متعدد ایسی ضرور ہیں جن کے متعلق حاکم کا یہ دعویٰ خلاف واقعہ ہے کہ وہ شیخین کی شرائط کے مطابق صحیح ہیں، ابراہیم بن محمد ارموی کا یہ بیان اکثر کتابوں میں مذکور ہے کہ:

"ابوعبداللہ حاکم نے مستدرک میں بہت سی ایسی حدیثیں جمع کی ہیں جن کے بارے میں گو ان کا خیال ہے کہ وہ شیخین کی حدیثوں کی طرح صحیح ہیں جیسے: من کنت مولاہ الخ اور حدیث طیر وغیرہ لیکن علمائے کبار نے اس سلسلہ میں حاکم کو غلط ٹھہرایا ہے اور ان پر سخت نکیر کی ہے۔" (طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۹ و بستان المحدثین ص ۴۳)

پہلی رائے کو عام طور پر حقیقت سے بعید اور زیادتی پر محمول کیا گیا ہے، علامہ ذہبی نے اس کی نہایت پرزور تردید کی ہے، ان کی تردید اس لیے قابل لحاظ ہے کہ انہوں نے مستدرک کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اس کی تلخیص لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"مستدرک کے متعلق مالینی کی رائے سراسر زیادتی، صریح ناانصافی اور سخت غلو پر مبنی ہے، انصاف کی بات یہ ہے کہ مستدرک کا تقریباً نصف حصہ ایسی حدیثوں پر مشتمل ہے جو شیخین یا کسی ایک بزرگ کے شرائط کے مطابق ہے، البتہ اس کے چوتھائی حصہ میں ایسی حدیثیں ہیں جن کے اسناد تو بظاہر صحیح ہیں لیکن وہ شیخین کی شرطوں کے مطابق نہیں ہیں، بقیہ چوتھائی حصے میں ضعیف و منکر بلکہ موضوع

---

[1] (پہلا مضمون معارف کے جولائی و اگست ۲۶ء، دوسرا نومبر و دسمبر ۲۶ء کے شماروں میں شائع ہوا تھا)

Marfat.com

حدیثیں بھی شامل ہیں، میں نے اپنی تلخیص میں ان کی تصریح وتنبیہ کی ہے۔"

(طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۹ و بستان المحدثین ص ۴۲)

اس سے دوسری رائے رکھنے والوں کی تائید ہوتی ہے یعنی مستدرک کی بعض حدیثوں کے بارے میں حاکم کا دعویٰ صحیح نہیں ہے لیکن اکثر کے متعلق صحیح ہے۔

اس مسئلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت مناسب اور حقیقت پسندانہ توجیہ کی ہے وہ لکھتے ہیں:

حاکم نے صحیحین پر مستدرک لکھا ہے، اس کی حدیثوں کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ شیخین کی شرطوں کے مطابق ہیں لیکن انہوں نے ان کی تخریج نہیں کی ہے، میں نے جب مستدرک کا تتبع اور چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ ایک حیثیت سے حاکم کا بیان صحیح ہے لیکن دوسری حیثیت سے صحیح نہیں ہے، اس کی تفصیل وتوجیہ یہ ہے۔

مستدرک میں ایسی حدیثیں ہیں جو شیخین کے رجال واسناد اور ان کی شرائط صحت واتصال کے مطابق ہیں، اس پہلو سے حاکم کا شیخین پر استدراک صحیح ہے لیکن دوسرے پہلو سے صحیح نہیں ہے کیونکہ شیخین اسی حدیث کا ذکر کرتے ہیں جس کی صحت پر ان کے شیوخ نے نقد وجرح کر کے اجماع کر لیا ہو، امام مسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی صحیح میں وہی حدیثیں لکھی ہیں جن کی صحت پر محدثین کا اتفاق ہے لیکن مستدرک کی اکثر متفرد حدیثیں ایسی ہیں جو شیخین کے زمانہ کے شیوخ اور محدثین پر مخفی اور مستور رہ گئی تھیں، گو بعد میں ان کی شہرت ہو گئی ہو یا ایسی حدیثیں ہیں جن کے رجال کے بارے میں محدثین نے اختلاف کیا ہے کیونکہ شیخین محض قاعدہ واصول سے حدیث کی صحت تسلیم نہیں کرتے بلکہ اپنے شیوخ کی طرح احادیث کے وصل وانقطاع وغیرہ کی باقاعدہ بحث وتحقیق کرتے ہیں اور اس میں انہوں نے اس قدر شدت برتی ہے کہ صحت واستناد کا مسئلہ پوری طرح ظاہر ہو گیا ہے، اس کے برخلاف امام حاکم کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ صرف محدثین کے عام قواعد وضوابط پر اعتماد کر کے حدیثوں کو صحیح قرار دیتے ہیں، مثلاً یہ قاعدہ کہ ثقہ راوی کی زیادتی مقبول ہوتی ہے، یا جب اہل فن وصل وارسال یا وقف ورفع میں مختلف الرائے ہوں تو اس راوی کا قول حجت مانا جائے گا، جس کے بیان میں اضافہ ہو اور اس نے اس کو یاد رکھا ہو، یہ حقیقت ہے کہ محدثین کے یہاں احادیث کی تصحیح اور جانچ کے اس معیار کی بنا پر خرابی اور خلل پیدا ہوا ہے اور اسی حیثیت سے شیخین اور حاکم کے یہاں فرق پایا جاتا ہے، واللہ اعلم۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص ۱۰۶ و ۱۰۷)

علامہ زیلعی حنفی کا بھی ایک بصیرت افروز بیان اس سلسلہ میں قابل غور ہے، وہ جہر یا بسملہ کی حدیثوں پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کسی شخص کے بارے میں مجرد کلام سے اس کی حدیث کو ساقط نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ اس طرح تو سنت وحدیث کا بیشتر سرمایہ ہی متروک ہو جائے گا، اس لیے کہ جرح وکلام سے اس شخص کے علاوہ جس کو خود اللہ نے معصوم ومحفوظ بنا دیا ہو کہ کوئی شخص بھی محفوظ نہیں ہے، صحیحین تک میں ایسے لوگوں کی روایتوں کی تخریج کی گئی ہے جن پر کلام کیا گیا ہے، جیسے جعفر بن سلیمان ضبعی، حارث بن عبد الایادی، ایمن بن نابل حبشی، خالد بن مخلد قطوانی، سوید بن سعید حدثانی اور یونس بن ابی اسحٰق سبیعی وغیرہ لیکن شیخین نے ایسے متکلم فیہ لوگوں کی ان ہی روایات کی تخریج کی ہے جن کی متابعت بھی کی گئی ہے اور جن کے شواہد ظاہر و باہر ہیں اور جن کی اصل معروف ومعلوم ہے لیکن اس طرح کے راویوں کے تفرد کو نہیں بیان کیا اور قبول کیا ہے، خصوصاً ایسے مواقع پر جہاں ان راویوں نے ثقات کی مخالفت

Marfat.com

کی ہے، جیسے امام مسلم نے ابو اویس کی حدیث: "قسمت الصلوۃ بینی و بین عبدی" کی اس لیے تخریج کی ہے کہ وہ اس کو بیان کرنے میں متفرد نہیں ہیں بلکہ دوسرے ثقہ و ثابت رواۃ مالک، شعبہ اور ابن عیینہ نے بھی اس کو بیان کیا ہے، اس لیے یہ حدیث متابع ہوگئی ہے، یہ علامت صحیحین پر استدراک کرنے والوں کے یہاں بھی راہ پا گئی ہے، اس لیے ان کے استدراک میں تساہل پایا جاتا ہے، ان لوگوں میں سب سے زیادہ تساہل ابو عبداللہ حاکم نے مستدرک میں کیا ہے، وہ جن کی حدیثوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ شیخین کی یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کے مطابق ہیں ان میں یہ علت موجود ہوتی ہے، صحیحین میں کسی راوی کی روایت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ راوی جس حدیث میں بھی پایا جائے وہ حدیث صحیحین کی شرط کے مطابق ہو جائے گی، حاکم عموماً ایسی حدیث بھی نقل کرتے ہیں جس کے رواۃ کی وجہ سے صحیحین میں اس کی تخریج نہیں کی گئی ہے، اب اگر اس طرح کی کوئی حدیث حضرت عکرمہؒ سے مروی ہو اور انہوں نے اس کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہو تو محض اس بنا پر کہ شیخین نے بھی عکرمہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے مرویات کی تخریج کی ہے، اس لیے اس کو بھی صحیحین کے شرائط کے مطابق قرار دیا جائے تو یہ سراسر تساہل ہے، اسی طرح وہ ایسی حدیث بھی نقل کرتے ہیں جس کے بعض رجال بخاری کے اور بعض مسلم کے ہوتے ہیں اور وہ ان کو شیخین کے شرائط کے مطابق قرار دیتے ہیں جو تساہل ہے یا کبھی ایسی حدیث بیان کرتے ہیں جس میں کوئی ایسا راوی ہوتا ہے جس سے شیخین نے اس کی وہ روایت کی ہے جس کو اس نے اپنے کسی خاص استاذ اور متعین شیخ سے سنا ہے کیونکہ راوی کا اپنے خاص استاذ سے زیادہ اہم تعلق ہوتا ہے اور وہ اس کی حدیث کے حفظ و ضبط میں مشہور ہوتا ہے لیکن وہی راوی جب اپنے دوسرے شیخ سے کوئی روایت کرتا ہے تو اس کی شیخین تخریج نہیں کرتے کیونکہ اس شیخ سے روایت کرنے میں وہ ضعیف، غیر ضابط اور غیر مشہور یا اسی قسم کی کوئی اور وجہ مانع ہوتی ہے لیکن حاکم نے اس راوی کی ایسی حدیثیں بھی جن کو اس نے اپنے مخصوص و متعین شیخ کے بجائے کسی اور شیخ سے بیان کیا ہے، تخریج کی ہے اور کہا ہے کہ روایت شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کے مطابق ہے، یہ بھی ان کے تساہل ہی کا نتیجہ ہے، کیونکہ شیخین اس راوی پر صرف اس صورت میں اعتماد کرتے ہیں جب اس نے حدیث کو اپنے مخصوص و متعین شیخ سے روایت کیا ہو مگر جب وہ اپنے دوسرے شیوخ سے روایت کرتا ہے تو اس پر اعتماد نہیں کرتے، مثلاً انہوں نے خالد بن مخلد قطوانی کی ایک حدیث کی جس کو انہوں نے سلیمان بن بلال سے روایت کیا ہے، تخریج کی ہے لیکن ان کی اس روایت کی تخریج نہیں کی ہے جس کو انہوں نے عبداللہ بن مثنیٰ کے واسطہ سے روایت کیا ہے، کیونکہ خالد، ابن مثنیٰ سے روایت کرنے میں معروف نہیں ہیں ایسی صورت میں اگر کوئی شخص خالد کی اس روایت کے بارے میں جو وہ ابن مثنیٰ سے بیان کریں یہ کہے کہ وہ شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کے مطابق ہے تو یقیناً متساہل کہا جائے گا، اسی طرح حاکم ایسی حدیث بھی بیان کرتے ہیں جس کے اسناد میں کوئی راوی ضعف یا کذب سے متہم ہوتا ہے، مگر اس کے اکثر رجال صحیح و قوی ہوتے ہیں، اس کے باوجود وہ اس کے متعلق بھی کہہ دیتے ہیں کہ وہ شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کے مطابق ہے، یہ بھی سخت قسم کا تساہل ہے، جو شخص مستدرک کا بغور مطالعہ کرے گا اس پر یہ سب باتیں جو ہم نے بیان کی ہیں خود منکشف ہو جائیں گی۔" (نصب الرایہ جلد اول ص ۳۴۲ طبع جدید)

علامہ زیلعی حنفی نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی مثالیں ضرور مستدرک میں ملتی ہیں لیکن ایسے بعض مواقع پر جن کا ذکر زیلعی نے کیا ہے، حاکم نے خود بھی تصریح کر دی ہے، مثلاً جس سند کے تمام رجال صحیح ہوں اور کوئی ایک راوی ضعیف ہو اس کے بارے

Marfat.com

میں حاکم نے یہ بتا دیا ہے کہ شیخین نے اس حدیث کو فلاں راوی کی وجہ سے ترک کر دیا ہے، پھر انہوں نے اس راوی کو صحیح و ضابطہ قرار دینے کی کوشش کی ہے، یا اس کے بارے میں علمائے جرح و تعدیل کا اختلاف بیان کر کے لکھ دیا ہے کہ اگر اس کا قوی ہونا ثابت ہو جائے تو یہ روایت بالکل صحیح ہوگی، یہی حال دوسری مثالوں کا ہے، حاکم نے عموماً شیخین کی عدم تخریج کے اسباب بھی بیان کر دیے ہیں، جن سے ان کے استدراکات کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے، تاہم اس میں شبہ نہیں کہ زیلعی کی اکثر مثالیں صحیح ہیں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ شیخین کے متعلق حاکم کے سب دعوے خواہ صحیح نہ ہوں لیکن سب غلط بھی نہیں ہیں، حافظ ذہبی نے اپنی تلخیص میں غلط دعووں کی وضاحت کے ساتھ صحیح کی توثیق بھی کی ہے اور جن کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے، اس سے بھی حاکم کی تصویب ظاہر ہوتی ہے۔

ضعیف و موضوع حدیثیں:

دوسرا ضمنی اعتراض یہ ہے کہ مستدرک میں ضعیف اور موضوع حدیثیں بھی ہیں، چنانچہ علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ مستدرک میں ایسی حدیثیں بھی ہیں جو شرائط صحت کے خلاف ہیں، بلکہ موضوع حدیثیں بھی ہیں جو اس کے شایان شان نہیں۔" (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۹)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"گو حاکم حدیث میں امام صدوق تھے، تاہم انہوں نے مستدرک میں ساقط حدیثوں کی بھی تصحیح کر دی ہے۔"

اوپر ان کا یہ بیان گزر چکا ہے کہ مستدرک کا تقریباً چوتھائی حصہ منکر وواہی اور موضوع حدیثوں پر مشتمل ہے، انہوں نے تلخیص میں بھی حدیث کا ضعف و نکارت اور وضع دکھایا ہے اور حاکم کی موضوع حدیثوں کو ایک مستقل جزو میں جمع کیا گیا تھا جو تقریباً ایک سو حدیثوں پر مشتمل تھا، حافظ ابن جوزی نے بھی ان کی ساٹھ موضوع حدیثوں کا ذکر کیا ہے گو اس کو محدثین نے مکمل طور پر تسلیم نہیں کیا ہے، اکثر تذکرہ نگاروں مستدرک کی ضعیف و موضوع حدیثوں کی مثال دیتے ہوئے: "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" اور "حدیث طیر" وغیرہ کو پیش کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس کا شمار حدیث کے تیسرے طبقہ کی کتابوں میں کیا ہے اور اس طبقہ کے متعلق ان کا اور ان کے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا یہ بیان ہے کہ:

"اگرچہ کتابوں کے مولفین علوم حدیث میں ماہر، ثقہ اور ضبط و عدالت کی صفات سے متصف تھے لیکن ان میں صحیح، حسن اور ضعیف ہر قسم کی حدیثیں پائی جاتی ہیں، بلکہ ان کی بعض حدیثیں موضوع بھی ہیں، گو ان کے اکثر رواۃ عدالت کی صفت سے متصف تھے تاہم بعض مستور اور مجہول الحال ہیں۔" (عجالہ نافعہ فوائد جامعہ ص ۵)

ان سب بیانات سے مستدرک میں ضعیف و منکر بلکہ موضوع حدیثوں کا بھی یقینی طور پر پایا جانا ثابت ہو جاتا ہے لیکن موضوع حدیثوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، حافظ ابن جوزی نے ساٹھ حدیثوں کی نشاندہی کی ہے لیکن ان میں سے اکثر کو محدثین نے تسلیم نہیں کیا ہے، رہی ضعیف حدیثیں تو وہ موضوع کے ساتھ شامل ہو کر چوتھائی حصہ کے بقدر رہوں گی، ضعیف حدیثوں سے کوئی کتاب بھی خالی نہیں ہے لیکن مستدرک میں ان کی تعداد اس لیے زیادہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ خود ضخیم کتاب ہے اور اس کی ضخامت کے اعتبار سے یہ تعداد زیادہ نہیں، اس کا زیادہ حصہ جیسا کہ ذہبی کے بیان سے ظاہر ہے، صحیح حدیثوں پر مشتمل ہے، علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں:

Marfat.com

''مستدرک میں جونہایت ضخیم کتاب ہے، صحیحین کی متروک حدیثوں کوشامل کیا گیا ہے، گواس کی بعض حدیثوں کے بارے میں کلام کیا گیا ہے لیکن اس کا بڑا حصہ صحیح ہے۔'' (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۰)

گومستدرک کی ضعیف وموضوع حدیثوں کی وجہ سے اس کا پایہ گھٹ ضرور گیا ہے، تاہم ان سے حاکم کے علوئے مقام اور عظمت شان میں فرق نہیں آتا، علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:

''حاکم کا درجہ ومرتبہ نہایت بلند ہے، وہ کسی طرح ضعفا میں شمار کئے جانے کے مستحق نہیں ہیں، ان کی جانب سے یہ معذرت کی جائے گی کہ مستدرک ان کی آخری عمر کی تصنیف ہے، جب ان کی حالت متغیر ہوگئی تھی اور اس وقت ان پر ذہول ونسیان بھی طاری رہتا تھا، اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اس میں بعض ایسے راویوں کو بھی صحیح قرار دے دیا ہے اور ان لوگوں کی حدیثیں بھی درج کر لی ہیں جن کا وہ اپنی کتاب الضعفا میں تذکرہ کر چکے ہیں اور جن کے ناقابل حجت ہونے اور جن کی حدیثوں کے ترک کر دینے کا فیصلہ کر چکے تھے، مثلاً عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کی ایک حدیث کی تخریج کی ہے، حالانکہ ان کا ضعفا میں تذکرہ کیا ہے اور ان کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے والد کے واسطہ سے ایسی موضوع حدیثیں بیان کی ہیں جن کا ضعف ووضع غور وتامل کرنے والے اہل فن سے مخفی اور پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔'' (لسان المیزان تذکرہ حاکم)

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ حاکم نے مستدرک کی بعض حدیثوں کو ضعیف سمجھنے کے باوجود شواہد ومتابعات کی حیثیت سے یا اور کسی مصلحت کی بنا پر نقل کیا ہے اور ایسے مواقع پر انہوں نے ان اسباب کی صراحت بھی کر دی ہے جو ضعیف حدیث کی روایت ذکر کرنے کا باعث ہوئے ہیں، علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

وربما اورد فیہ مالم یصح عندہ منبہا علی ذلک۔ (تدریب الراوی ص ۳۱)

بعض اوقات وہ غیر صحیح روایت لائے ہیں مگر اس کے متعلق تنبیہ کر دی ہے۔

یہ بھی ہے کہ حاکم خود صاحب فن تھے، ان کی تحقیق میں بعض حدیثیں اور رواۃ قوی وصحیح تھے لیکن دوسرے اہل فن نے ان کو ساقط الاعتبار قرار دیا ہے۔

تساہل کا الزام:

اب تک جن الزامات کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی دراصل تساہل ہی کے تحت آتے ہیں لیکن اب اس کا مستقل طور سے ذکر کیا جاتا ہے، پہلے جو باتیں نقل کی گئی ہیں ان کے علاوہ بعض مزید تفصیلات ملاحظہ ہوں۔

علامہ ابن صلاح کا مشہور بیان ہے۔

ہو واسع الخطو فی شرط الصحیح، متساہل فی القضاء۔ (مقدمہ ابن صلاح ۱۱)

وہ صحیح روایت کے شرائط کے بارے میں بڑے توسع پسند اور صحیح حکم لگانے میں نہایت متساہل تھے۔

علامہ زیلعی کا بیان ہے کہ:

فالحاکم عرف تساہلہ وتصحیحہ بالاحادیث الضعیفۃ بل الموضوعۃ۔ (نصب الرایہ اص ۳۶۰)

پس حاکم کا تساہل اور ضعیف بلکہ موضوع حدیثوں کی تصحیح مشہور ومعروف ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری لکھتے ہیں:

Marfat.com

"حدیث کی تصحیح میں حاکم کا تساہل اسی طرح مشہور ہے جس طرح علامہ ابن جوزی کا تضعیف حدیث میں تساہل مشہور ہے، شیخ الاسلام علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان دونوں کے تساہل نے ان کی کتابوں کا فائدہ معدوم کر دیا ہے۔

(مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۷۷)

ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ محدثین کے نزدیک حاکم کا تساہل مشہور و مسلم ہے مگر یہ بحث توضیح و تنقیح طلب ہے۔

حاکم پر جس شدومد کے ساتھ یہ الزام عائد کیا گیا ہے، اس سے بظاہر حاکم کا احادیث میں زیادہ غیر محتاط و مداہن ہونا ثابت ہوتا ہے جو صحیح نہیں ہے اور نہ تساہل کا یہ مطلب ہے کہ انہوں نے رطب و یابس ہر قسم کی روایات بلا تحقیق و تفتیش نقل کر دی ہیں، ان کی تلاش و تفحص، حزم واحتیاط اور احکامی روایتوں میں شدت کا ذکر پہلے آچکا ہے، ان کا بلند پایہ محدث اور علوم حدیث میں ماہر ہونا مسلم ہے، روایات کے قبول و رد کے اصول و ضوابط کی وہ پابندی بھی کرتے تھے اور ان کے بارے میں غیر محتاط نہ تھے البتہ جہاں انہوں نے ان اصولوں کو ترک کیا ہے، اس کی صراحت کر دی ہے، جرح و تعدیل حاکم کا خاص فن تھا، اس میں انہوں نے ایسی مہتم بالشان کتابیں لکھی ہیں جن کے حوالوں سے رجال کی کوئی کتاب خالی نہیں ہے، ان باتوں سے ان کے حزم واحتیاط کا پتہ چلتا ہے، اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:

"حدیث کے طالب علم کو محدث کے حالات کی بحث و تفتیش کرنی ضروری ہے، اس کو سب سے پہلے محدث کے متعلق یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ عقیدہ توحید کو مانتا ہے یا نہیں؟ اور انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کا پابند ہے یا نہیں؟ پھر یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ وہ صاحب ہوی تو نہیں ہے جو لوگوں کو اپنی خواہشات کے مطابق دعوت دیتا ہے کیونکہ داعی بدعت کی حدیث قبول نہ کرنے پر ائمہ مسلمین کا اجماع ہے، اس کے بعد سن وسال کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ اس کا اپنے ان شیوخ سے جن سے وہ حدیثیں روایت کرتا ہے، سماع ممکن ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہم نے ایسے شیوخ دیکھے ہیں جنھوں نے اپنے شیوخ سے ایسے سن میں حدیثیں بیان کی ہیں جس سن میں ان کی ان شیوخ سے ملاقات ممکن ہی نہیں۔" (معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۵و۱۶)

اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"صحیح حدیث کی معرفت مجرد روایت سے نہیں ہوتی بلکہ اس کو عقل و فہم، حفظ وضبط اور کثرت سماع وغیرہ سے معلوم کیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں اہل علم و معرفت کے مذاکرہ سے بڑھ کر کوئی چیز معاون نہیں ہے، اسی سے مخفی علت ظاہر ہوتی ہے پس جب اس طرح کی کوئی حدیث صحیح اسانید سے پائی جائے اور وہ شیخین کی کتابوں میں مروی نہ ہو تو ایسی صورت میں حدیث کے طالب علم کو اس کی تحقیق اور کرید کرنا نیز اس کی معرفت لکھنے والوں سے مذاکرہ لازم ہے تاکہ اس کی علت کا پتہ چل سکے۔"

جس امام کے یہ خیالات ہوں اور جس کا روایات کے رد و قبول میں یہ معیار ہو، اس کو غیر محتاط یا حاطب اللیل کس طرح کہا جا سکتا ہے، اس لیے ان کے تساہل کا صرف یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ دوسرے محدثین نے جو غیر معمولی تشدد روا رکھا تھا اور جس کے نتیجہ میں بے شمار صحیح حدیثیں ان کے معیار پر پوری نہ اُتریں اور نہ اُن کے انتخاب میں آسکیں۔ حاکم نے اس طرح کا تشدد اس لیے روا نہیں رکھا تا کہ کوئی صحیح و ثابت حدیث محفوظ ہونے سے نہ رہ جائے، اسی نیک جذبہ نے ان کے یہاں قدرے نرمی اور مداہنت پیدا کر دی ہے، اس لیے حدیث کی تصحیح میں حاکم کا تساہل اگرچہ مسلم ہے لیکن اس کی نوعیت وہ نہیں ہے جو غلو و اغراق کی وجہ سے اس کو دے دی گئی ہے۔

حاکم کے تساہل کے چند اسباب تھے جن کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے:

Marfat.com

۱ خودان کا یہ بیان گزر چکا ہے کہ مستدرک منکرین حدیث، اہل اہوا اور مبتدعین کے اس الزام اور مغالطہ کے جواب میں لکھی گئی ہے کہ صحیح حدیثوں کی تعداد بہت کم ہے، حاکم نے اس شبہ کی تردید میں یہ بھی لکھا ہے کہ صحیح حدیثیں صرف صحیحین ہی میں منحصر نہیں ہیں، جیسا کہ خود شیخین نے بھی اس کی صراحت کی ہے اور ابن صلاح، نووی اور دوسرے اساطین فن کا بھی بیان ہے، اس بنا پر حاکم نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ اپنے علم و امکان بھر زیادہ سے زیادہ صحیح روایات کا مجموعہ مرتب کر دیں اس کی وجہ سے مستدرک میں تساہل ہو گیا ہے۔

۲ حاکم نے حدیثوں کی تائید و توثیق کے لیے کثرت سے شواہد و متابعات نقل کئے ہیں، ان میں اور فضائل اعمال کی حدیثوں میں انہوں نے زیادہ شدت اور احتیاط نہیں برتی ہے، چنانچہ مستدرک کی اس قسم کی حدیثوں میں زیادہ تساہل پایا جاتا ہے۔

۳ حافظ ابن حجر وغیرہ نے لکھا ہے کہ مستدرک حاکم کے آخر عمر کی تصنیف ہے، اس زمانہ میں ان کی حالت دگرگوں ہو چلی تھی، ان کو نظر ثانی اور حک و اصلاح کا موقع بھی نہیں ملا تھا، اس لیے مستدرک میں تساہل زیادہ پایا جاتا ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "حاکم کے یہاں تساہل کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کتاب کا مسودہ تو مکمل کر لیا تھا لیکن اس کی تنقیح نہیں کر سکے تھے، مستدرک کے چھ جزوں میں صرف ڈیڑھ جزو تک مجھ کو حاکم کا املا ملا ہے، بقیہ اجزا کی حاکم کی بطریق اجازت روایت کی گئی ہے اور ان اجزا میں ان جزوں کے مقابلہ میں جن کا حاکم نے خود املا کرایا ہے، زیادہ تساہل پایا جاتا ہے۔
(کشف الظنون ج ۲ ص ۲۴۲ و تدریب الراوی ص ۳۱)

حاکم کا تساہل تو متعارف و مسلّم ہے لیکن الزام سے بعض اکابر محدثین بھی بری نہیں ہیں، چنانچہ بعض محدثین کے نزدیک تساہل کے اعتبار سے صحیح ابن حبان بھی مستدرک ہی کے لگ بھگ ہے، ابن خزیمہ کی عظمت شان میں کس کو کلام ہو سکتا ہے، ان کا اور ان کی صحیح کا پایہ ان دونوں سے بہت بلند ہے لیکن علامہ سخاوی لکھتے ہیں:

وکم فی کتاب ابن خزیمة ایضا من حدیث محکوم منه بصحته وهو لا یرتقی عن رتبة الحسن۔
(فتح المغیث ص ۱۴)

ابن خزیمہ کی کتاب میں کتنی ایسی حدیثیں ہیں جن کی صحت کا حکم لگایا گیا ہے، حالانکہ وہ حسن کے مرتبہ سے اوپر کی نہیں ہیں۔

امام دارقطنی اور امام ترمذی پر بھی (اول الذکر حاکم کے استاذ اور موخر الذکر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز شاگرد اور ائمہ صحاح میں ہیں) یہی الزام عائد کیا گیا ہے، علامہ ذہبی جیسے نقادِ فن کا بیان ہے:

ان العلما لا یعتدون بتصحیح الترمذی ولا الحاکم۔ (الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۰)

علمائے فن ترمذی اور حاکم کی تصحیح کو زیادہ قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔

علامہ زیلعی فرماتے ہیں:

حتی قیل ان تصحیحه دون تصحیح الترمذی والدار قطنی۔ (نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۵۳)

یہاں تک کہا گیا ہے کہ حاکم کی تصحیح امام ترمذی و دارقطنی کی تصحیح سے بھی کم تر ہے۔

حافظ سخاوی کہتے ہیں:

Marfat.com

بل وفیما صححہ الترمذی من ذالک جملۃ مع انہ ممن یفرق بین الصحیح والحسن۔ (فتح المغیث ص ۱۴)
بلکہ امام ترمذی کی تصحیح میں بھی تساہل کا بڑا حصہ شامل ہے، حالانکہ وہ ان لوگوں میں ہیں جو صحیح وحسن میں امتیاز کرنے والے ہیں۔

اسی طرح ضیاء مقدسی، ابن عوانہ، ابن سکن اور جارود وغیرہ نامور محدثین کی تفصیلات اگرچہ صحیح کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں لیکن ایک جماعت نے ان پر بھی انصافاً یا تعصباً نقد کیا اور تساہل کا الزام لگایا ہے۔ (فتح المغیث ص ۱۴)

اس لیے جس طرح ان ائمہ کی تصنیفات کی خامیوں کی وجہ سے ان کی جلالت قدر میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح حاکم کی عظمت میں بھی ان کے تساہل کی بنا پر کلام نہیں کیا جاسکتا۔

حاکم کی تصحیح کا حکم:

حاکم کا تساہل تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان کی توثیق وتصحیح کا کیا حکم ہوگا؟ محدثین اور علمائے فن کے نزدیک چند صورتوں کو چھوڑ کر عام طور پر حاکم کی تصحیح کا لحاظ کیا جائے گا، یہ مستثنیٰ صورتیں حسب ذیل ہیں:

(ا) جس حدیث کی حاکم نے توثیق کی ہو وہ کسی دوسری صحیح وثابت حدیث کے خلاف ہو، علامہ زیلعی جہر بالبسملہ کے بیان میں لکھتے ہیں:

وتصحیح الحاکم لا یعتد بہ سیما فی ھذا الموضع فقد عرف تساھلہ فی ذالک ـــــ وتوثیق الحاکم لا یعارض ما یثبت فی الصحیح خلافہ لما عرف من تساھلہ۔ (نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۴۴)

حاکم کی تصحیح کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، خصوصاً اس مقام پر، کیونکہ ان کا تساہل یہاں معروف ومعلوم ہے اور حاکم کی توثیق کو اگر وہ صحیح وثابت حدیث کے خلاف ہو، اس کے معارض نہیں قرار دیا جائے گا، کیونکہ ان کا تساہل معروف ہے۔

زیلعی کے اس بیان سے حاکم کی تصحیح کا سرے سے نا قابل اعتبار ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

حتی قیل ان تصحیحہ دون تصحیح الترمذی والدار قطنی بل تصحیحہ کتحسین الترمذی واما ابن خزیمۃ وابن حبان فتصحیحھما ارجح من تصحیح الحاکم بلا نزاع۔ (نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۵۴)

یہاں تک کہا گیا ہے کہ حاکم کی تصحیح کا درجہ امام ترمذی اور دارقطنی کی تصحیح سے کم تر ہے، بلکہ ان کی تصحیح کی حیثیت امام ترمذی کی تحسین کی طرح ہے، رہے ابن خزیمہ اور ابن حبان تو ان کی تصحیح بلا اختلاف حاکم کی تصحیح سے راجح ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیلعی کے نزدیک حاکم کی تصحیح بالکل ساقط اور نا قابل اعتبار نہیں ہے، بلکہ جب وہ صحیح حدیث کے معارض ہو تو نا قابل اعتبار ہوگی۔

(ب) حاکم نے جس حدیث کی تصحیح کی ہو اگر اس کے بارے میں دوسرے محدثین کا فیصلہ اس کے برعکس ہو تو حاکم کی تصحیح کا لحاظ نہیں ہوگا، علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ حاکم کی تصحیح کا اسی وقت اعتبار کیا جائے گا جب کہ اس کے بارے میں دوسرے ائمہ کی اس کے خلاف کوئی تصریح موجود نہ ہو۔

(س) جس حدیث کی حاکم نے تصحیح کی ہو اس میں ضعیف کر دینے والی کوئی علت موجود ہو، ابن صلاح اور نووی نے اس کی تصریح کی ہے۔

Marfat.com

ان صورتوں کے سوا حاکم کی تصحیح کو معتبر اور حجت سمجھا جائے گا، البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ ان کی تصحیح کے بارے میں کس قسم کا حکم لگایا جائے گا، ابن صلاح اور حافظ نووی کے نزدیک اس کو حسن پر محمول کیا جائے گا، ابن صلاح فرماتے ہیں:

فالاولی ان نتوسط فی امره فنقول ماحکم بصحته و لم نجد ذالک فیه لغیره من الائمة ان لم یکن من قبیل الصحیح فهو من قبیل الحسن یحتج به ویعمل به الا ان تظهر فیه علة توجب ضعفه۔ (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۱)

ہمارے نزدیک حاکم کی تصحیح کے بارے میں بیچ کی راہ اختیار کرنا زیادہ مناسب ہے پس جس حدیث کے صحیح ہونے کا انہوں نے فیصلہ کیا ہو اور اس میں دوسرے ائمہ کی کوئی تصریح موجود نہ ہو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ اگر وہ صحیح کے قبیل سے نہیں ہے تو حسن کے قبیل سے ہے، اس کو لائق حجت اور قابل اعتبار سمجھا جائے گا، بشرطیکہ اس میں کوئی ایسی علت نہ ہو جو ضعف کی موجب ہو۔

نووی لکھتے ہیں:

فما صححه ولم نجد فيه لغيره من المعتمدين تصحيحا و لا تضعيفًا حكمنا بانه حسن الا ان يظهر فيه علة توجب ضعفه۔ (تدریب الراوی ص ۳۱)

جس حدیث کی حاکم نے تصحیح کی ہو اور اس کی صحت یا ضعف کے متعلق دوسرے معتبر محدثین کی تصریح موجود نہ ہو تو ہم اس کو حسن قرار دیں گے، بشرطیکہ اس کو ضعیف قرار دینے والی علت موجود نہ ہو۔

زیلعی کے اوپر کے بیان میں بل تصحیحه کتحسین الترمذی سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ جزائری نے محدث ابن صلاح کے بیان ''وان لم یکن من قبیل الصحیح فهو من قبیل الحسن'' کا دوسرا مفہوم بتایا ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

''جس حدیث کی تصحیح میں حاکم منفرد ہوں اور دوسرے محدثین کا اس کے بارے میں کوئی فیصلہ موجود نہ ہو تو اس کو احتیاطاً صحیح و حسن کے درمیان دائر سمجھا جائے گا لیکن لوگوں نے ان کے بیان کا یہ مطلب لیا ہے کہ اس پر محض حسن کا حکم لگایا جائے گا۔''

(مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۷۸)

لیکن متاخرین کے نزدیک حاکم کی تصحیح کے بارے میں اقتضائے حال کے مطابق حکم لگایا جائے گا، جزائری کا بیان ہے کہ:

''اکثر محدثین کی رائے یہ ہے کہ جس حدیث کی تصحیح میں حاکم منفرد ہوں اس کے متعلق بحث و تحقیق کی جائے گی اور اس پر اس کے اقتضائے حال کے مطابق صحت یا حسن یا ضعف کا حکم لگایا جائے گا۔'' (ایضاً)

بدر بن جماعہ سے بھی یہی منقول ہے اور عراقی، سخاوی (الفیہ ص ۷ و فتح المغیث ص ۱۳ و ۱۴) اور سیوطی وغیرہ نے بھی اسی کی تائید کی ہے، علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

''صحیح طریقہ یہ ہے کہ حاکم کی تصحیح کی تحقیق کر کے اس کے اعتبار سے حسن، صحیح یا ضعیف ہونے کا حکم لگایا جائے، عراقی نے بھی ان کی موافقت کی ہے اور کہا ہے کہ اس پر محض حسن ہی کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔'' (تدریب الراوی ص ۳۱)

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری لکھتے ہیں:

''غالباً ابن صلاح نے یہ مسلک اس لیے اختیار کیا ہے کہ ان کے خیال میں اب لوگ تصحیح کے اہل نہیں رہے، اس لیے ان کا قصہ ہی ختم ہو گیا جو درست نہیں ہے، تصحیح کا معاملہ ختم نہیں ہوا ہے، بلکہ اب بھی اگر کسی شخص میں اس کی اہلیت موجود ہو اور اس میں اس کے اوصاف و شرائط موجود ہوں تو وہ تصحیح کا فیصلہ کر سکتا ہے۔'' (مقدمہ تحفہ ص ۷۸)

باقی رہی حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کی یہ تحریر کہ:

Marfat.com

”ذہبی نے یہ کہا ہے کہ کسی شخص کو میری تلخیصات وتعقبات دیکھے بغیر حاکم کی تصحیح سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔“

(بستان المحدثین ص ۴۱)

اور:

”محدثین کا فیصلہ یہ ہے کہ ذہبی کی تلخیص دیکھے بغیر مستدرک حاکم پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔“ (ایضاً ص ۴۳)

اوپر کے بیانات کے معارض نہیں ہے اور نہ اس سے حاکم کی تصحیح کا مطلقاً باطل ہونا ہی ثابت ہوتا ہے۔

رفض و تشیع کا الزام:

امام ابوعبداللہ حاکم پر سب سے بڑا الزام رفض و تشیع کا عائد کیا گیا ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ محمد بن طاہر روایت کرتے ہیں کہ میں نے ابو اسماعیل انصاری سے حاکم کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ ”وہ حدیث میں ثقہ مگر سخت رافضی تھے۔“ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۷)

۲۔ دوسری جماعت ان کے رفض کی نفی وتردید کرتی ہے لیکن وہ بھی ان کو شیعیت سے متہم کرتی ہے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں، وہ شیعیت میں ضرور مشہور تھے لیکن شیخین کے مسئلہ میں تعرض نہیں کرتے تھے، ابو اسماعیل انصاری کا قول خلاف انصاف ہے، درحقیقت حاکم رافضی نہ تھے، بلکہ شیعی تھے۔“ (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۸۵)

مگر خود ابن طاہر کے بیان سے جنھوں نے حاکم کے رافضی ہونے کی ابو اسماعیل سے روایت کی ہے، رفض کا کوئی پتہ نہیں چلتا، چنانچہ وہ کہتے ہیں حاکم اندرونی طور [1] سے تو شیعوں سے ہمدردی رکھتے تھے لیکن خلافت و تقدیم کے مسئلہ میں وہ تسنن کا اظہار کرتے تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۸)

حاکم کی شیعیت کے بارے میں سب سے مشہور روایت وہ ہے جس کو خطیب بغدادی نے اور ان کے حوالہ سے بعض دوسرے ارباب سیر و تذکرہ نے نقل کیا ہے کہ:

”حاکم ثقہ تھے مگر تشیع کی جانب میلان رکھتے تھے، مجھ سے ابراہیم بن محمد ارموی نے جو ایک صاحب علم اور صالح شخص تھے بیان کیا کہ حاکم نے ایسی حدیثیں جمع کی ہیں جن کے بارے میں ان کا گمان ہے کہ وہ صحیحین کے شرائط کے مطابق ہیں اس لیے شیخین پر ان کی تخریج ضروری تھی، چنانچہ اسی قسم کی حدیثوں میں حدیث طیر اور من کنت مولاہ فعلی مولاہ بھی ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب میں وارد ہیں اور ان کی وجہ سے محدثین نے ان پر نکیر و ملامت کی ہے۔“ (تاریخ بغداد ج ۵ ص ۴۷۴)

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ حاکم پر رفض کا الزام صحیح نہیں ہے بلکہ سراسر بے بنیاد ہے، علامہ ذہبی کے مذکورہ بالا بیان کے علاوہ دوسرے بیانات سے بھی جو آگے نقل کیے جائیں گے اس کی پوری تردید ہوتی ہے، علامہ ابن سبکی نے بھی اس کی پرزور تردید کی ہے، یہ الزام محض ابو اسماعیل انصاری سے مروی ہے، بعض دوسرے محدثین کے متعلق بھی ان کے اس قسم کے غیر معروف اور منفرد اقوال مروی ہیں جن کو محققین اور ناقدین فن نے خلاف واقعہ اور مطرود قرار دیا ہے، حاکم پر بھی ان کے الزام کی یہی نوعیت ہے، اس لیے اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

---

[1] یہاں اس بیان پر کوئی تبصرہ کرنا مقصود نہیں ورنہ کسی کے باطن کے متعلق اس قسم کا فیصلہ کرنا بجائے خود کتنا درست اور مقتضائے انصاف ہے، فقہا کا عام قاعدہ ہے کہ نحن نحکم بالظاہر۔

Marfat.com

البتہ شیعیت کا الزام بظاہر قوی معلوم ہوتا ہے، اس لیے اس کا یہاں مفصل جائزہ لیا جاتا ہے:
جن لوگوں نے حاکم پر شیعیت کا الزام عائد کیا ہے، ان کے اقوال کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حاکم کی شیعیت کا خلفائے ثلاثہ اور دیگر صحابہ کرام کے سب و شتم یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تفضیل اور خلافت میں ان کی تقدیم سے کوئی تعلق نہیں تھا، ابن طاہر جیسے مخالف شخص کو بھی اعتراف ہے کہ تقدیم و خلافت کے مسئلہ میں وہ تسنن کا اظہار کرتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی فرماتے ہیں:

''بعض علما سے منقول ہے کہ ان کے تشیع کا مطلب یہ ہے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت [1] کے قائل تھے جو اسلاف کی ایک جماعت کا بھی مذہب ہے۔'' (بستان المحدثین ص ۱۴)

اس لیے یہ امر بھی مسلّم ہے کہ امام ابوعبداللہ حاکم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہ شیخین سے افضل مانتے تھے اور نہ ان کو ان بزرگوں کے مقابلہ میں خلافت کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے اس لیے اب صرف دو چیزیں لائق بحث رہ جاتی ہیں۔

1. پہلی چیز حضرت علیؓ کی محبت و عقیدت میں غیر معمولی غلو و افراط ہے، جس کا ثبوت خطیب کی روایت میں ملتا ہے کہ حاکم نے حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب میں ضعیف و موضوع حدیثیں روایت کی ہیں۔
2. دوسری چیز حضرت امیر معاویہ سے ان کی برہمی ہے، چنانچہ علامہ ذہبی رقمطراز ہیں:

''ان کا حضرت علیؓ کے مخالفین سے انحراف اگرچہ کھلا ہوا ہے لیکن وہ شیخین کو ہر حال میں فائق و معظم سمجھتے تھے، اس لیے وہ شیعی ضرور تھے لیکن رافضی نہیں تھے۔'' (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۸)

اور ابن طاہر کا یہ بیان نقل کیا ہے:

''حاکم حضرت امیر معاویہؓ اور ان کی اولاد سے برگشتہ تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے اور اس کے متعلق کوئی معذرت نہیں کرتے تھے۔'' (ایضاً)

ابن عماد کا بیان ہے کہ:

''علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ حاکم خلفائے ثلاثہ خصوصاً شیخین کی پوری تعظیم کرتے تھے، البتہ حضرت معاویہؓ کے بارے میں انہوں نے کلام کیا ہے، اس کی وجہ سے ان کو زدوکوب بھی کیا گیا تھا۔'' (شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۷۷)

حافظ ابن جوزی اور علامہ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں:

''ابوعبدالرحمٰن سلمی کا بیان ہے کہ ابوعبداللہ بن کرام کے اصحاب نے حاکم کو عبث تنگ کر رکھا تھا، ان کا منبر توڑ ڈالا تھا اور ان کے لیے گھر سے نکلنا اور مسجد میں جانا تک دشوار کر دیا تھا، میں نے یہ حالت دیکھ کر ان سے کہا کہ اگر آپ حضرت امیر معاویہؓ کے مناقب میں کسی حدیث کی تخریج یا املا کرا دیں تو اس مشقت و ابتلا سے آپ کو چھٹکارا مل جائے، حاکم نے اس کے جواب میں تین دفعہ کہا کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔'' (المنتظم ج ۷ ص ۲۷۵ و البدایۃ و النہایۃ ج ۱۱ ص ۵۵)

جہاں تک حضرت علیؓ کی محبت میں افراط و غلو کا معاملہ ہے تو اس کو اعتراض و ملامت یا شیعیت کی بنیاد قرار دینا صحیح نہیں ہے، بہت سے اکابر اور ائمہ اسلام کو حضرت علیؓ اور اہل بیت کی محبت میں غلو رہا ہے، اس لیے حاکم کا غلو اسی وقت قابل اعتراض

[1] (حضرت شاہ صاحب کا یہ بیان محل نظر ہے، آئندہ مباحث سے اس کی تردید ہو جائے گی)

Marfat.com

ہوسکتا ہے جب دوسرے صحابہ کی عظمت وجلالت کا انہوں نے پاس ولحاظ رکھا نہ ہو، یا وہ حضرت علیؓ کو اجلۂ صحابہؓ پر فضیلت دیتے ہوں لیکن خود حاکم کو شیعی قرار دینے والوں کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ وہ شیخین کی تنقیص نہیں کرتے تھے بلکہ عام اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق وہ ان کو حضرت علیؓ سے افضل اور خلافت کے لیے اقدم وانسب سمجھتے تھے، اس لیے ان کا غلو نہ قابل اعتراض ہے اور نہ شیعیت کا ثبوت، حاکم کے حالات وواقعات زندگی اور تصنیفات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انہوں نے خلفائے ثلاثہ پر حضرت علیؓ کو ترجیح دی، یا کم از کم ان بزرگوں کی کوئی تنقیص کی ہے لیکن اس بارے میں علامہ ابن سبکی کے ان اصولوں کی رہنمائی میں فیصلہ زیادہ مناسب ہے، وہ لکھتے ہیں:

”اگر کسی شخص کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا جائے یا اس پر کوئی الزام عائد کیا جائے تو انصاف پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کے شیوخ واساتذہ اور رفقاء وتلامذہ وغیرہ کے متعلق بحث وتفتیش کی جائے، اس کے بعد اس کے ماحول اور ان حالات کا جائزہ لیا جائے جن میں اس کی نشوونما ہوئی ہے، پھر ان معاصرین، ہم وطنوں اور اعزہ واقربا کے اقوال وآرا معلوم کئے جائیں جو اس کے حالات وواقعات زندگی سے زیادہ واقف اور باخبر ہوتے ہیں، معاصرین کے متعلق اس کی تحقیق ضرور کرلینی چاہیے کہ ان کے متہم شخص سے تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ وہ اس کے موافق، حمایتی اور دوست تھے، یا معاند ومخالف اور معترض ونکتہ چیں یا بالکل غیر جانبدار لیکن غیر جانب دار بہت کم ہوتے ہیں۔

ان اصولوں کی روشنی میں امام حاکم کے تشیع وتفضیل علیؓ کے الزام پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے، یہ تو مسلّم ہے کہ وہ جلیل القدر محدث تھے، ان کی اس حیثیت میں ان کے مخالفین کو بھی کوئی کلام نہیں اور محدثین میں ایسے عقائد شاذ ونادر ہی ہوتے ہیں۔

اس کے بعد حاکم کے ان شیوخ پر غور کیا جائے جن سے انہوں نے علم وفن کی تحصیل کی ہے، خصوصاً ان لوگوں کو دیکھا جائے جن سے ان کو زیادہ تعلق اور قربت رہی ہے، تو معلوم ہوگا کہ ان کے شیوخ میں اکابر اہل سنت اور ایسے لوگ ہیں جو عقائد میں امام ابوالحسن اشعری سے وابستہ تھے جیسے ابوبکر بن اسحٰق ضبعی، ابوبکر بن فورک اور ابوسہل صعلوکی وغیرہ، یہی وہ لوگ ہیں جن سے حاکم کی مجالست تھی اور اصول ودیانات وغیرہ میں مباحثے اور مجادلے رہتے تھے۔

اسی طرح حاکم نے اپنی تاریخ میں اہل سنت کے جو تراجم لکھے ہیں، ان میں ان کی پوری توصیف وتعریف کی گئی ہے کہیں بھی ان کے عقائد پر طنز وتعریض نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ابن عساکر نے ان کو ان اشاعرہ کے زمرہ میں شامل کیا ہے جو اہل رفض وتشیع کو متبدع کہتے اور ان کے عقائد سے تبری ظاہر کرتے ہیں۔

یہ چیزیں حاکم پر لگائے جانے والے الزام کو مشکوک بنا دیتی ہیں، آگے جو تفصیلات بیان کی جائیں گی ان سے یہ شکوک و شبہات سراسر یقین واذعان میں تبدیل ہوجائیں گے اور پوری طرح ثابت ہوجائے گا کہ حاکم کا دامن رفض وتشیع کے الزام سے بالکل پاک ہے۔ (طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۷ و ۶۸)

آگے علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں:

”حاکم کے اندر تشیع کی جانب میلان کا ذکر کیا جاتا ہے، اگر یہ شریعت کے مطلوب واقتضا سے بھی بڑھ کر رہا ہو تو بھی یہ اس حد انتہا کو نہیں پہنچا ہوا تھا کہ وہ شیخین کی مذمت وتنقیص کرتے رہے ہوں یا حضرت علیؓ کو ان سے افضل مانتے رہے ہوں بلکہ میں تو اس کو

Marfat.com

بالکل بعید سمجھتا ہوں کہ وہ حضرت عثمان پر حضرت علی رضی اللہ عنہما کو فوقیت دیتے رہے ہوں کیونکہ میری نظر سے ان کی کتاب الاربعین میں ایک باب خلفائے ثلاثہ کی عظمت و تفضیل پر گزرا ہے، اس میں انہوں نے جملہ صحابہ کے مقابلہ میں ان ہی تینوں حضرات کی عظمت کا خصوصیت سے تذکرہ کیا ہے، اسی طرح مستدرک میں انہوں نے حضرت علی سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا ذکر کیا ہے اور اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت نقل کی ہے کہ:

اول حجر حمله النبی صلی الله علیه وسلم لبناء المسجد ثم حمل ابوبکر حجرًا آخر ثم حمل عثمان حجرا آخر فقلت یارسول الله الا تزی الی هؤلاء کیف یساعدونک فقال یاعائشة هولاء الخلفاء من بعدی۔

مسجد (نبوی) کی تعمیر کے لیے پہلا پتھر خود آنحضور ﷺ نے رکھا پھر دوسرا حضرت ابوبکرؓ نے، تیسرا حضرت عمرؓ نے اور چوتھا پتھر حضرت عثمانؓ نے رکھا، میں نے کہا اے اللہ کے رسول ادیکھیے کس طرح یہ لوگ آپ کی معاونت کر رہے ہیں، آپ نے فرمایا اے عائشہ یہی لوگ میرے بعد میرے خلفا اور جانشین ہوں گے۔

گو اس روایت کی صحت میں علامہ ذہبی وغیرہ نے کلام کیا ہے لیکن قابل غور امر صرف یہ ہے کہ جو شخص اعتراضات کی پروا کئے بغیر ایسی حدیث کی تخریج کر سکتا ہے جو خلفائے ثلاثہ کی خلافت کے متعلق تقریباً ایک منصوص اور قطعی امر کی حیثیت رکھتی ہے، کیا اس کے بارے میں رفض و تشیع کا گمان کیا جا سکتا ہے۔

حضرت عثمانؓ کے فضائل میں انہوں نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ:

عن جابر بن عبد الله رضی الله عنهما قال بینما نحن فی بیت ابن حشفة فی نفر من المهاجرین فیهم ابوبکر وعمر وعثمان وعلی وطلحة والزبیر وعبد الرحمان بن عوف وسعد بن ابی وقاص رضی الله عنهم فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم لینهض کل رجل منکم الی کفؤه فنهض النبی صلی الله علیه وسلم الی عثمان فاعتنقه وقال انت ولیی فی الدنیا والآخرة۔

حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ مہاجرین کی ایک جماعت کے ساتھ جس میں حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہم تھے، ابن حشفہ کے گھر میں تھے (اس موقع) پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر شخص کو اپنے ہمسر کے ساتھ ہو جانا چاہیے اور آپ نے خود حضرت عثمانؓ کے ساتھ ہو کر ان سے معانقہ کیا اور فرمایا کہ تم میرے دنیا و آخرت میں ولی ہو۔

اس حدیث میں بھی کلام کیا گیا ہے، حاکم نے ان کے علاوہ اور بھی متعدد حدیثیں حضرت عثمانؓ کی فضیلت میں بیان کی ہیں، جن میں سے بعض کو صحیح مانا گیا ہے اور بعض پر استدراک و اعتراض کیا گیا ہے، اسی طرح حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرہ کے فضائل و مناقب کی حدیثیں بھی جمع کی ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علی کی جانب میلان اور عقیدت میں وہ ایسے غلو و اغراق سے کام نہیں لیتے تھے، جو بدعت یا دوسرے صحابہ کے سب و شتم کا باعث ہو۔
(طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷۰، ۷۱)

غرض حاکم کا حضرت علیؓ کے بارے میں غالی و مفرط ہونا اولاً تو ثابت ہی نہیں ہے اور اگر کسی درجہ میں ثابت بھی ہو جائے جب بھی قابل اعتراض اور موجب تشیع نہیں ہے کیونکہ:

Marfat.com

۱ انہوں نے خلفائے اربعہؓ کا جہاں ایک ساتھ تذکرہ کیا ہے، وہاں اسی ترتیب کے مطابق کیا ہے جو اہل سنت نے ان بزرگوں کے درمیان قائم کی ہے، چنانچہ مستدرک کے فضائل صحابہؓ کے ابواب میں یہی ترتیب ہے، یعنی پہلے بالترتیب خلفائے ثلاثہ کا اور ان کے بعد حضرت علیؓ تذکرہ ہے۔

ایک جگہ معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:

النوع السابع من هذا العلم معرفة الصحابة على مراتبهم۔

اس علم وفن کی ساتویں نوع صحابہ کرام کے مراتب کے لحاظ سے ان کی معرفت ہے۔

اس نوع میں انہوں نے مراتب ہی کے اعتبار سے صحابہ کے بارہ طبقوں کا ذکر کیا ہے، پہلے طبقہ میں خلفائے اربعہ کے نام اس ترتیب کے ساتھ لیے ہیں۔

فاولهم قوم اسلموا بمكة مثل ابى بكر و عمر و عثمان و على و غيرهم رضى الله عنهم۔

(معرفة علوم الحديث ص ۲۲)

اول طبقہ میں وہ لوگ ہیں جو مکہ میں اسلام لائے جیسے ابوبکر و عمر و عثمان و علی وغیرہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

محدثین کے سنین اور عمروں کے بیان میں بھی انہوں نے خلفائے ثلاثہ کے بعد حضرت علیؓ کا سن وفات تحریر کیا ہے۔

(ایضاً ص ۲۰۲ و ۲۰۳)

۲ عام اہل سنت کی طرح حاکم بھی ان چاروں بزرگوں کو خلیفہ برحق سمجھتے تھے اور اپنی تصنیفات میں خلفا کی حیثیت سے ان کا ذکر بھی کیا ہے۔

۳ ان بزرگوں کے مناقب میں جو حدیثیں اور آثار جمع کیے ہیں ان سے بھی ان کی وہی فضیلت وعظمت اور ان کا وہی درجہ ومرتبہ ثابت ہوتا ہے جو عام امت نے ان کو دیا ہے، یعنی حضرت ابوبکرؓ متفقہ طور پر امت میں سب سے برگزیدہ وبرتر ہیں، حاکم نے بھی احادیث وآثار سے یہی ثابت کیا ہے، یہاں تک کہ خود جناب امیرؓ کے ایسے اقوال نقل کیے ہیں جن سے حضرت ابوبکرؓ کا سب سے فائق وبرتر ہونا ثابت ہوتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں جناب امیر کی تاخیر اور آپ کی آزردگی کا مسئلہ آج تک امت کے درمیان بحث ونزاع کا موضوع بنا ہوا ہے لیکن حاکم جناب امیر ہی کی زبانی اس کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال على والزبير ماغضبنا الا لا ناقد اخرنا عن المشاورة وانا نرى ابا بكر احق الناس بها بعد رسول الله ﷺ انه لصاحب الغار وثانى اثنين وانا نعلم بشرفه و كبره ولقد امره رسول الله ﷺ بالصلوة بالناس وهو حى۔ (المستدرک ج ۳ ص ۶۶ و ۶۷)

حضرت علیؓ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم کو غصہ اس وجہ سے تھا کہ ہم لوگوں کو مشورہ میں نظر انداز کیا گیا تھا، ورنہ ہم لوگ بھی رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کو سب سے زیادہ خلافت کا مستحق سمجھتے تھے، وہ غار میں آپ کے ساتھ اور دو میں کے دوسرے تھے، ہم کو ان کا فضل وشرف خوب معلوم ہے، رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں ان کو حکم دیا تھا کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

Marfat.com

جہاں تک شیخین کی عظمت کا معاملہ ہے، اس میں معترضین کو بھی اعتراف ہے کہ حاکم نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے، البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا معاملہ ضرور مختلف فیہ ہے حالانکہ یہ بھی خلاف واقعہ ہے، حاکم حضرت عثمان غنی کو تیسرا اور برحق خلیفہ مانتے تھے اور ان کے قتل کو ناحق سمجھتے تھے، معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:

قتل عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ صبرا۔ (معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۰۳)

حضرت عثمان مظلوم قتل کیے گئے تھے۔

خلافت میں حضرت عثمانؓ کی ترتیب کے متعلق جو اشارات بعض حدیثوں میں ملتے ہیں وہ مستدرک میں بھی ہیں ابن سبکی نے اس قسم کی دو حدیثیں مستدرک سے نقل کی ہیں یہاں دو اور روایتیں ملاحظہ ہوں:

"حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رات ایک صالح شخص نے خواب دیکھا کہ حضرت ابوبکر رسول اللہ ﷺ سے اور ابوبکر سے حضرت عمر اور حضرت عمرؓ سے حضرت عثمان جڑ گئے، راوی حضرت جابر کہتے ہیں کہ جب ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے اٹھے تو یہ بات چیت کر رہے تھے کہ صالح آدمی سے خود رسول اللہ ﷺ مراد ہیں اور جڑ جانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ نبی ﷺ کے بعد آپ کے امور کے ذمہ دار ہوں گے۔ (مستدرک ج ۳ ص ۷۱ و ۷۲)

دوسری حدیث حضرت انس بن مالکؓ کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

"بنی مصطلق کے لوگوں نے مجھ کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ ہم لوگ آپ کے بعد کس کو صدقات دیں، آپ نے فرمایا کہ حضرت ابوبکر کو ان لوگوں نے کہا جا کر پوچھو ابوبکر کے بعد کس کو ہم دیں گے، آپ نے حضرت عمرؓ کا نام لیا، تیسری دفعہ بھیجا تو آپ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کو دینا۔" (المستدرک ج ۳ ص ۷۷)

اسی طرح حاکم نے حضرت علی کے مناقب میں جو روایتیں نقل کی ہیں ان سے خلفائے ثلاثہ اور عام صحابہ کی کوئی تنقیص نہیں ہوتی۔

عام محدثین کی طرح حاکم کا بھی یہ مسلک ہے کہ صحابہ کرام کی عدالت میں طعن اور ان کی تنقیص کرنے والے کی روایت قبول نہیں کی جائے گی، مذاہب محدثین کی معرفت کے بیان میں لکھتے ہیں:

"علی بن مدینی فرماتے ہیں کہ ابو اسرائیل ملائی کا پایہ حدیث میں بلند نہیں تھا کیونکہ وہ حضرت عثمانؓ کا برائی کے ساتھ ذکر کرتے تھے۔"

اسی طرح علی بن حسین سے روایت ہے کہ حسین نے سدی کے یہاں جانا اس لیے ترک کر دیا تھا کہ وہ شیخین کو سب و شتم کرتے تھے۔ (معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۳۷)

درحقیقت متقدمین کے نزدیک حاکم صحابہؓ کے معاملہ میں جادۂ حق اور مسلک اعتدال سے منحرف نہیں تھے جن لوگوں نے ان کو شیعی قرار دیا ہے، انہوں نے بھی اس کے ثبوت میں کوئی واقعہ یا ان کی تصنیفات سے کوئی مثال نہیں پیش کی ہے، رہیں وہ دونوں روایتیں جو صاحب مستدرک کے رفض و تشیع کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں، تو ان سے بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

پہلی حدیث یعنی "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کی حاکم نے تین طرق سے تخریج کی ہے، اور سب کی تصحیح و تصویب کی ہے، (ملاحظہ ہو المستدرک ج ۳ ص ۱۰۹ و ۱۱۰) امام ترمذی نے اپنی جامع میں، امام ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور امام احمد نے مسند

Marfat.com

میں بھی اس حدیث کی تخریج کی ہے، ان کے علاوہ طبرانی نے معجم میں ضیاء مقدسی نے مختارہ میں اور امام نسائی نے خصائص علی میں اس کی تخریج کی ہے گو حاکم کے بعض رجال پر کلام کیا گیا ہے اور ان کی روایتوں میں بعض ایسے اضافے ہیں جو صحاح اور مسند احمد بن حنبل میں نہیں ہیں، تاہم روایت کے جس حصہ کو قابل بحث، وجہ اعتراض اور شیعیت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، یعنی "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" وہ سب میں مشترک ہے، اسی لیے اکثر محدثین نے اس حدیث کو ضعیف اور بے اصل نہیں قرار دیا ہے، علامہ ذہبی نے جنھوں نے مستدرک کی تلخیص میں جا بجا حاکم پر نقد و تعقب کیا ہے اور اسی باب یعنی فضائل علیؓ کی متعدد ضعیف و واہی حدیثوں پر تنبیہ کی ہے، جس میں بعض جگہ ان کا لہجہ بہت تیز و تند ہو گیا ہے مثلاً:

العجب من الحاکم و جراتہ فی تصحیح ھذا و امثالہ من البواطیل۔ (تلخیص مستدرک ج ۳ ص ۱۲۷)

حاکم پر اور ان کی ایسی اور اس جیسی باطل حدیثوں کی تصحیح کی جرأت پر سخت حیرت ہے۔

لیکن زیر بحث روایت کے صرف ایک طریق کے ایک راوی محمد کے علاوہ انہوں نے کسی پر کلام نہیں کیا ہے اور تذکرہ میں اس صراحت کے باوجود کہ مستدرک میں غیر صحیح حدیثیں پائی جاتی ہیں، اس حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ:

و اما حدیث من کنت مولاہ الخ فلہ طرق جیدۃ و قد افردت ذالک۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۵)

رہی حدیث: من کنت مولاہ الخ تو اس کے طرق جید ہیں اور میں نے اس کے لیے علیحدہ رسالہ لکھا ہے۔

ذہبی نے میزان الاعتدال میں اور حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں، مستدرک میں حاکم کی ساقط روایات کی تصریح کی ہے لیکن اس حدیث کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، ضعاف و موضوعات میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے، علامہ سیوطیؒ نے اس کو حدیث حسن قرار دیا ہے۔ (الجامع الصغیر ج ۲ ص ۵۵) البتہ امام ترمذی نے اس کو غریب بتایا ہے، مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری لکھتے ہیں:

"امام ترمذی نے اس کو حدیث حسن غریب بتایا ہے لیکن امام احمد، نسائی اور ضیاء نے بھی اس کی تخریج کی ہے، اس باب میں امام احمد نے حضرت بریدہؓ سے اور انہوں نے اور ابن ماجہؒ نے براء بن عازبؓ سے امام ابن ماجہؒ نے سعد بن ابی وقاصؓ سے اور امام احمد نے حضرت علیؓ سے روایتیں کی ہیں۔"

(جامع ترمذی مع شرح تحفۃ الاحوذی الاحوذی ج ۴ ص ۳۲۶ و ۳۲۷)

اور علامہ اسماعیل بن محمد عجلونی (م ۱۱۶۳ھ) نے تو اس کے متعلق یہاں تک لکھا ہے کہ:

"حدیث من کنت مولاہ کی امام طبرانی، احمد اور ضیاء نے مختارہ میں زید بن ارقم، حضرت علی اور تیس صحابہ سے اس لفظ: "اللھم وال من والاہ و عاد من عاداہ" کے ساتھ تخریج کی ہے، پس یہ حدیث مشہور یا متواتر ہے۔"

(کشف الخفاء و مزیل الالباس ج ۲ ص ۲۷۴)

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ بعض علمائے فن اور محدثین نے اس روایت کی تضعیف کی ہے، علامہ زیلعی نے اس کے ضعیف ہونے کی نصب الرایہ میں صاف تصریح کی ہے، تاہم یہ حدیث چاہے صحیح ہو یا ضعیف و موضوع، مجرد اس کو نقل کرنے کی بنا پر حاکم کو شیعی قرار دینا یا ان کو مطعون کرنا سراسر زیادتی اور ناانصافی ہے جب مستدرک میں اور بھی ضعیف و موضوع حدیثیں موجود ہیں اور ان کی بنیاد پر حاکم کے عقیدہ و مسلک کے بارے میں کوئی خاص رائے نہیں قائم کی گئی ہے، یہاں تک کہ خود خلفائے ثلاثہ اور دیگر صحابہ کرام کے مناقب میں بھی کمزور اور ساقط روایتیں درج ہیں لیکن ان کی بنیاد پر کسی نے حاکم پر ان بزرگوں کی عقیدت

Marfat.com

میں غلو و افراط کا الزام عائد نہیں کیا ہے، اس لیے اس روایت کو ان کے عقیدہ و مسلک کی بنیاد اور حضرت علی کی محبت میں بے جا افراط و غلو کی دلیل کس طرح ثابت کیا جاسکتا ہے، پھر جب اس کی تخریج متعدد ائمہ کبار نے کی ہے اور اس کی وجہ سے ان کو رفض و تشیع سے متہم نہیں کیا گیا تو آخر حاکم ہی کو ہدف طعن اور شیعی قرار دینے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔

اگر اس حدیث کی حجیت یقینی اور مسلّم بھی مان لی جائے جب بھی اس کے مفہوم سے رفض و شیعیت کی کوئی تائید نہیں ہوسکتی، عربی زبان میں مولیٰ کا لفظ کئی معنوں میں آتا ہے اور جیسا کہ شارحین نے لکھا ہے یہاں مولیٰ اور ولی کا لفظ دوست اور ساتھی کے معنی میں ہے، ملا علی قاری کا بیان ہے کہ: من کنت مولاہ الخ من کنت تولاہ کے مفہوم میں ہے، یعنی یہ ولی سے ہے جو عدو کا ضد ہے اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ "میں جس سے محبت کرتا ہوں علی بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔" دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "جو مجھ سے محبت کرتا ہے اس سے علی رضی اللہ عنہ بھی محبت کرتا ہے۔" (تحفۃ الاحوذی مع جامع ترمذی ج ۴ ص ۳۲۶) پہلے مفہوم کی تائید ان حدیثوں سے بھی ہوتی ہے، جن میں حضرت علی سے محبت کرنے والے کو مومن اور بغض و نفرت کرنے والے کو منافق کہا گیا ہے۔

دوسرے اس قسم کے الفاظ بعض اور صحابہ کرام کے بارے میں بھی حدیثوں میں آئے ہیں، خود حاکم نے حضرت عثمانؓ کے متعلق ایک روایت نقل کی ہے جو پہلے گزر چکی ہے کہ آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو دنیا و آخرت دونوں میں اپنا ولی بتایا ہے، اس طرح یہ حضرت علی کی کوئی ایسی اہم اور خاص خصوصیت نہیں ہے جس میں دوسرے صحابہ شریک نہ ہوں۔

تیسرے بریدہ اسلمی اور عمران بن حصین کی حدیثوں سے جو مستدرک اور مذکورہ بالا کتابوں میں مذکور ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب امیر کے متعلق یہ الفاظ ایک خاص موقع پر فرمائے تھے، جب بعض لوگوں نے ان کے کسی طرز عمل سے آزردہ ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی شکایت کی تھی، اس پر آپؐ نے ناگواری ظاہر فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ "علی سے بغض و نفرت کا اظہار کر کے تم لوگ مجھ سے نفرت کا اظہار کر رہے ہو، کیونکہ جس کا میں دوست ہوں علی بھی اس کے دوست ہیں۔"

اس واقعہ کی روشنی میں یہ حدیث صحیح ہو یا ضعیف، اس سے شیعیت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

رہی دوسری حدیث تو اس کو حاکم نے دو طرق سے مستدرک میں نقل کر کے صحیح اور شیخین کے شرائط کے مطابق قرار دیا ہے، بلکہ پہلے طریق کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ اس کو حضرت انس سے ان کے تیس شاگردوں نے روایت کیا ہے، اور یہ حضرت علی، ابو سعید خدری اور سفینہ سے بھی صحت کے ساتھ مروی ہے۔ (ملاحظہ ہو المستدرک ج ۳ ص ۱۳۰ تا ۱۳۲) "حدیث طیر" کا معرفۃ علوم الحدیث میں بھی انہوں نے ذکر کیا ہے لیکن وہاں اس کی صحت و سقم کے بارے میں کوئی رائے نہیں ظاہر کی ہے۔

"حدیث طیر" کو حاکم کے علاوہ امام ترمذی نے اپنی جامع [1] میں اور امام نسائی نے خصائص علی [2] میں نقل کیا ہے۔

---

[1] (تحفۃ الاحوذی مع ترمذی ج ۴ ص ۳۲۸)

[2] یہ سالہ ۱۳۰۸ھ میں مصر سے شائع ہوا ہے، اس میں یہ حدیث موجود نہیں ہے لیکن مولوی سید اولاد حسین صاحب نے جو نواب رام پور کے مصاحب خاص و واعظ دربار تھے، خصائص مرتضوی کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا جو محلہ جوہری لکھنؤ سے شائع ہوا تھا، اس میں حدیث طیر کا متن اور اردو ترجمہ موجود ہے" ملاحظہ ہو خصائص مرتضوی ص ۴)

Marfat.com

حاکم کی دونوں روایتوں میں ایسی تفصیلات اور اضافے ہیں جو امام ترمذی وغیرہ کی روایتوں میں نہیں ہیں، حاکم کے مقابلہ میں امام ترمذی ونسائی کی حدیثیں بہت مختصر ہیں، مسئلہ کی وضاحت وتنقیح کے خیال سے یہاں ترمذی کی روایت نقل کی جاتی ہے۔

عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ کان عند النبی ﷺ طیر فقال اللهم ائتنی باحب خلقک الیک یا کل معی هذا الطیر فجاء علی فاکل معه۔

حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک چڑیا تھی، آپ نے فرمایا کہ اے اللہ تو اس شخص کو میرے پاس بھیج دے جو تیرے نزدیک، تیری مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہے تا کہ وہ میرے ساتھ یہ چڑیا کھائے، چنانچہ حضرت علیؓ تشریف لائے تو انہوں نے آپ کے ساتھ اس کو تناول فرمایا۔

امام نسائی کی روایت میں ہے کہ پہلے ابو بکرؓ پھر حضرت عمرؓ تشریف لائے، مگر ان کو باریابی کی اجازت نہیں ملی، تیسری دفعہ جب پھر حضرت علی تشریف لائے تو آپ نے اجازت مرحمت فرمائی، حاکم کی دونوں حدیثیں نہایت طویل ہیں، ان کا ملخص اور ماحصل یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کی دعا: "اللهم ائتنی الخ" سن کر حضرت انس نے دعا کی کہ اے اللہ! یہ محبوب بندہ قبیلہ انصار کا کوئی آدمی ہو، چنانچہ جب دو دفعہ حضرت علی ہی تشریف لائے تو حضرت انس نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ رسول اللہ ﷺ ضرورت سے تشریف لے گئے ہیں مگر جب تیسری دفعہ بھی حضرت علی ہی آئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان کو لے آؤ، تم پر ہی موقوف نہیں ہے، ہر شخص کو اپنی قوم سے محبت ہوتی ہے۔

امام ترمذی نے اپنی روایت کے متعلق فرمایا ہے کہ:

هذا حدیث غریب لا نعرفه من حدیث السدی الا من هذا الوجه وقد روی هذا الحدیث من غیر وجه عن انس.

یہ حدیث غریب ہے، سدی سے صرف اسی سند اور طریق سے ان کی حدیث کا ہم کو علم ہے حالانکہ یہ حضرت انس سے متعدد وجوہ طرق سے مروی ہے۔

علامہ ذہبی تلخیص میں حدیث طیر کے پہلے طریق کے بارے میں لکھتے ہیں:

ابن عیاض لا اعرفه ولقد کنت زمانا طویلا اظن ان حدیث الطیر لم یجسر الحاکم ان یودعه فی مستدرکه فلما علقت هذا الکتاب رأیت الهول من الموضوعات التی فیه فاذا حدیث الطیر بالنسبة الیها سماء قال وقد رواه عن انس جماعة اکثر من ثلاثین نفسا ثم صحت الروایة عن علی وابی سعید وسفینة۔

(تلخیص مع مستدرک ج ۳ ص ۱۳۱)

ابن عیاض کے بارے میں مجھ کو واقفیت نہیں ہے، میرا ایک زمانہ تک خیال تھا کہ حاکم نے حدیث طیر کو مستدرک میں نقل کرنے کی جسارت نہ کی ہوگی لیکن جب میں نے یہ تعلیق لکھی تو مجھ کو ایسی ہولناک موضوع حدیثیں اس میں ملیں جن کے مقابلہ میں حدیث طیر بلند پایہ ہے، کیونکہ اس کے متعلق خود حاکم نے کہا ہے کہ اس کو حضرت انسؓ سے تیس سے زیادہ اشخاص نے بیان کیا ہے اس کے علاوہ یہ حضرت علی، ابو سعید اور سفینہ سے بھی صحت کے ساتھ مروی ہے۔

اور دوسرے طریق کے ایک راوی ابراہیم بن ثابت کو ساقط قرار دیا ہے۔ (ایضاً ص ۱۳۲)

تذکرہ میں اس حدیث کے متعلق ذہبی کا رویہ مزید نرم ہو گیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

Marfat.com

واما حدیث الطیر فلہ طرق کثیرۃ جداافردتہابمصنف وبمجموعھایوجب ان یکون الحدیث لہ اصل۔
(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۵)

رہی حدیث طیر تو یہ بکثرت طرق سے مروی ہے، میں نے ان سب کو ایک مستقل رسالہ میں جمع کیا ہے، ان سب کے مجموعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بے اصل نہیں ہے۔

ذہبی کے ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو حدیث طیر کے ضعیف یا موضوع ہونے کے بارے میں شرح صدر نہیں تھا اور امام ترمذی نے اگر چہ اس کو غریب بتایا ہے تاہم انہوں نے اس کے کثرت طرق وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی یہ موضوع اور ضعیف نہیں ہے۔

لیکن عام علما نے حدیث طیر کو صحیح تسلیم نہیں کیا ہے جیسا کہ حاکم پر ان کے اعتراضات سے ظاہر ہوتا ہے، البتہ بعض کے نزدیک ضعیف ہے اور بعض کے نزدیک موضوع، علامہ ابن سبکی نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''حدیث طیر پر وضع کا الزام لگانا صحیح نہیں ہے، ہمارے دوست حافظ صلاح الدین خلیل بن کیکلدعلائی نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے متعلق صحیح فیصلہ یہ ہے کہ اس کے بعض طرق حسن کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ اس کو ضعیف کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے تمام طرق کا موضوع ہونا ثابت نہیں ہوتا، انہوں نے اس کی سند کے تمام رجال کو بجز احمد بن عیاض کے، ثقہ ومعرف بتایا ہے لیکن میری نظر سے ان کی جرح یا توثیق کے بارے میں کوئی قول نہیں گزرا ہے۔''
(طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷۱ و ۷۲)

علامہ زیلعی نے بھی جن کی رائے آگے نقل کی جائے گی، اس کو ضعیف ہی قرار دیا ہے۔

لیکن جن لوگوں نے اس کو موضوع قرار دیا ہے، ان کی تعداد زیادہ ہے، علامہ ابن جوزی نے اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے، وہ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

''حاکم نے حدیث طیر کو صحیح بتایا ہے لیکن ابن ناصر کہتے ہیں کہ یہ موضوع ہے اور اہل کوفہ میں سے ساقط الاعتبار قسم کے لوگوں نے کچھ مشہور اور کچھ مجہول راویوں کے واسطہ سے اس کو حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت کیا ہے۔''
(المنتظم ج ۷ ص ۲۷۵)

علامہ ابن کثیر نے بھی یہی لکھا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۵۵)

علامہ شوکانی فرماتے ہیں:

قال فی المختصر لہ طرق کثیرۃ کلھا ضعیفۃ وقد ذکرہ ابن جوزی فی الموضوعات واما الحاکم فاخرجہ فی المستدرک وصححہ واعترض علیہ کثیر من اھل العلم ومن اراد استیفاء البحث فلینظر ترجمۃ الحاکم فی النبلاء۔ (الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ ص ۲۰۸)

مختصر میں کہا گیا ہے کہ اس کے بہت سے طرق ہیں جو سب ضعیف ہیں اور علامہ ابن جوزی نے اس کا موضوعات میں تذکرہ کیا ہے مگر حاکم نے مستدرک میں اس کی تخریج کر کے اسے صحیح قرار دیا ہے اس کی وجہ سے اکثر علما نے ان پر اعتراضات کئے ہیں جن کو اس کی

Marfat.com

مفصل بحث دیکھنی ہو وہ سیر النبلا [1] میں حاکم کا ترجمہ دیکھے۔

علامہ محمد بن طاہر پٹنی نے بھی اس کو موضوع بتایا ہے۔ (تذکرۃ الموضوعات ص ۹۵، ۹۶)

حاکم نے مستدرک میں اس کی صحت ثابت کرنے کے لیے کثرت طرق کا سہارا لیا ہے مگر علامہ زیلعی فرماتے ہیں:

وکم من حدیث کثرت رواته وتعددت طرقه وهو حدیث ضعیف کحدیث الطیر وحدیث الحاجم والمحجوم وحدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ (نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۶۰)

کتنی حدیثیں ایسی ہیں جن کے رواۃ زیادہ اور طرق متعدد ہوتے ہیں لیکن وہ حدیثیں ضعیف ہوتی ہیں حدیث طیر، حدیث حاجم ومحجوم اور حدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔

امام دارقطنی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب ان کے سامنے اس حدیث کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے مستدرک اور حاکم پر اظہار نکیر کیا، خود حاکم کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بعد میں اس حدیث کو موضوع سمجھ کر مستدرک سے خارج کر دیا تھا، ابو محمد بن سمرقندی کا بیان ہے کہ حاکم کو "حدیث طیر، کے متعلق جب امام دارقطنی کی نکیر و ملامت کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اس کو مستدرک سے خارج کر دیا"۔ (طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۸)

علامہ ذہبی کے ایک بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"حاکم شاگرد ابو عبدالرحمٰن شاذیاجی کہتے ہیں کہ سید ابوالحسن کی مجلس میں ہم لوگوں نے حاکم سے حدیث طیر کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ "یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر اس کو صحیح مانا جائے تو رسول اللہ کے بعد کوئی شخص حضرت علیؓ سے افضل نہ ہوگا، مگر میرا خیال ہے کہ اس کے متعلق بعد میں حاکم کی رائے بدل گئی تھی اور انہوں نے اس کو مستدرک میں شامل کر دیا تھا، اس طرح یہ حدیث مستدرک میں باقی رہ گئی"۔ [2]

---

[1] (افسوس ہے کہ سیر النبلا کی یہ جلد ہماری نظر سے نہیں گزری)۔

[2] (دیکھو تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۵، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں "ہمارے استاذ ذہبی کا بیان درست اور بجا ہے، مستدرک میں حدیث طیر کا رہ جانا تسامح کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، پہلے تو میں نے خیال کیا کہ ممکن ہے حاکم کے تخریج نہ کرنے کے باوجود اس حدیث کو مستدرک میں شامل کر دیا گیا ہو، اس لیے میں نے اس کی تحقیق کے لیے مستدرک کے قدیم نسخوں کا جائزہ لیا لیکن مجھ کو اس سلسلہ میں شرح صدر نہ ہوا مگر جب امام دارقطنی کے استدراک ونکیر سے حاکم نے مطلع ہونے کے بعد اس کو خارج نہیں کیا تو خیال ہوا کہ ممکن ہے حاکم نے اس کی پہلے تخریج کی ہو اور بعد میں خارج کر دیا ہو لیکن بعض نسخوں میں یہ تصحیح رہ گئی ہو، اگر یہ ثابت ہو جائے تو دونوں روایتیں درست ہو جائیں گی اور صورت واقعہ یہ ہوگی کہ حاکم نے اس حدیث کی تخریج کی تھی، مگر جب ان کو اس کا باطل ہونا قطعیت کے ساتھ معلوم ہو گیا تو انھوں نے اس کو مستدرک سے خارج کر دیا، جیسا کہ اس روایت سے جس کی سندوں کو ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے، معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود بعض نسخوں میں یہ حدیث یا تو کتاب کے مشتہر اور شائع ہو جانے کی وجہ سے باقی رہ گئی ہو یا حاکم کے مخالفین اور نکتہ چینوں نے اس کو اس میں شامل کر دیا ہو (طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷۱) علامہ ابن سبکی نے مخالفین کے بارے میں جس شبہ کا اظہار کیا ہے، وہ بے بنیاد نہیں ہے، خود ابن طاہر کا بیان ہے کہ میں نے حاکم کے قلم سے ایک ضخیم مجموعہ میں حدیث طیر دیکھی تو ان کو تعجب کی وجہ سے نقل کر لیا ممکن ہے اسی طرح بعض دوسرے لوگوں نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہو، اس طرح اس کو عام شہرت ہوگئی ہو اور جن لوگوں کو حاکم کی بعد کی رائے کی اطلاع نہ ہو سکی ہو انھوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ حدیث مستدرک میں شامل ہے اور مستدرک کے بعض نسخوں میں یہ حدیث موجود تھی، اس لیے جامعین و مرتبین سے عدم امتیاز کی بنا پر تسامح ہو گیا، اس طرح وہ مستدرک کے متداول نسخوں میں بھی باقی رہ گئی ہے)" "ض"

Marfat.com

بہر حال حاکم نے چاہے حدیث طیر کو مستدرک سے خارج کیا ہو یا نہ کیا ہو، اس کا موضوع اور باطل ہونا اکثر علمائے فن اور محدثین کے نزدیک مسلّم ہے۔

گو محدثین اور اصحابِ فن کے نزدیک اس حدیث کا موضوع ہونا مسلّم ہے لیکن اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے جب بھی اس سے شیعیت کی تائید نہیں ہوتی کیونکہ اس سے حضرت علی کا علی الاطلاق سب سے افضل و برتر ہونا یقینی طور پر ثابت نہیں ہوتا۔

شافعیت میں غلو اور تعصب کا الزام:

امام حاکم شافعی المذہب تھے، ان پر الزامات کی فہرست میں ایک الزام یہ بھی ہے کہ ان کو اس مذہب میں بے جا غلو اور تعصب تھا لیکن اس الزام کا ان کے سوانح نگاروں نے ذکر نہیں کیا ہے، اس کو مشہور عالم اور ندوۃ المصنفین دہلی کے سابق رفیق مولانا عبدالرشید نعمانی نے زیادہ شدومد سے لکھا ہے، وہ اپنی ایک عربی تصنیف: **ماتمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ** میں تحریر فرماتے ہیں:

”علامہ ابن صلاح نے ائمہ خمسہ (بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی اور نسائی) کے بعد جن اکابر محدثین کا ذکر کیا ہے، یعنی دارقطنی، حاکم، عبدالغنی بن سعید مصری، ابونعیم اصبہانی اور ان کے بعد کے طبقہ میں ابن عبدالبر بیہقی اور خطیب، یہ سب کے سب عبدالغنی بن سعید اور ابن عبدالبر کے علاوہ ائمہ شافعیہ میں ہیں اور ان لوگوں کو اس مذہب کے بارے میں شدید تعصب تھا۔“

حافظ ابن جوزی المنتظم میں لکھتے ہیں:

”......اسماعیل بن ابوالفضل قومسی اصبہانی سے یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ وہ تین محدثین کو ان کے سخت تعصب اور انصاف کی کمی کی وجہ سے ناپسند کرتے تھے۔ ۱۔ حاکم ابوعبداللہ۔ ۲۔ ابونعیم اصبہانی۔ ۳۔ ابوبکر خطیب، اسماعیل نے بالکل صحیح کہا ہے، وہ ثقہ و صدوق اور کبار محدثین میں تھے، ان کو رجال و متون کی اچھی اور عمدہ معرفت حاصل تھی اور وہ بڑے متدین تھے۔

(ماتمس الیہ الحاجۃ ص ۱۲ بحوالہ المنتظم ج ۸ ص ۲۶۹)

مولانا نے آگے چل کر ان محدثین میں سے بعض کے تعصب کی مزید وضاحت کی ہے لیکن حاکم کے متعلق یہاں صرف اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کیا ہے مگر حاکم کے رسالہ المدخل الی علم الحدیث پر ان کا ایک طویل مضمون ماہنامہ برہان دہلی کے کئی نمبروں میں شائع ہوا ہے، اس میں المدخل کے بعض مختصر مباحث کی توضیح و تفصیل کے علاوہ اس پر نقد و تعقب بھی کیا گیا ہے، اس مضمون کے شروع میں کسی قدر تفصیل اور تیز لہجہ میں اس الزام کا اعادہ کیا گیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

”حاکم کی تصانیف کے مطالعہ کے وقت دو باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں، اولاً ان کا نقد و نظر میں تساہل، ثانیاً تعصب، ان کا تساہل تو ایک متعارف چیز ہے، مگر تعصب پر ممکن ہے، ظاہر بینوں کو یقین نہ آئے لیکن یہ صرف ہمارا بیان نہیں بلکہ ائمہ فن کی تصریح ہے، حافظ عبدالرحمن بن جوزی نے بسند صحیح حافظ اسماعیل بن ابی الفضل قومسی کا یہ قول نقل کیا ہے،[1] المدخل میں بھی ائمہ احناف کا جس طریقہ پر ذکر کیا ہے، اس سے حافظ اسماعیل کے بیان کی توثیق ہو جاتی ہے، ضعفائے روایت کے باب میں جہاں ائمہ کا نام لیا ہے، امام مالک کا ذکر اس عظمت شان کے ساتھ کیا ہے: وھذا مالک بن انس امام اھل الحجاز بلا مدافعۃ۔ اسی طرح امام شافعی کا نام لینے کے بعد لکھتے ہیں: ”وھو الامام لاھل الحجاز بعد مالک“ لیکن امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے صرف نام بتانے پر

[1] (یہ بیان پہلی تحریر میں گزر چکا ہے، اس لیے اس کو یہاں حذف کر دیا گیا ہے)

Marfat.com

اکتفا کیا ہے، چنانچہ تحریر ہے: وھذا ابوحنیفہ ثم بعدہ ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم القاضی ومحمد بن الحسن الشیبانی اور ابو عصمہ نوح بن ابی مریم پر جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں سے ہیں اور فقہا میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، وضع حدیث کا الزام لگایا ہے اور ایک مجہول شخص کے بیان سے استدلال کیا ہے۔" (ماہنامہ برہان فروری ۱۹۶۲ء ص ۱۰۴ و ۱۰۵)

مذکورہ بالا دونوں تحریروں کا تجزیہ کرنے سے حاکم کے تعصب کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں:

1. رسالہ المدخل میں حاکم نے امام مالک اور امام شافعی کا جس عظمت شان کے ساتھ ذکر کیا ہے اس عظمت کے ساتھ امام ابو حنیفہ کا نہیں کیا ہے۔
2. حاکم نے امام ابوحنیفہ کے ایک شاگرد ابو عصمہ نوح بن ابی مریم پر جو فقہ میں امتیاز رکھتے تھے، ایک مجہول شخص کے بیان پر اعتماد کر کے وضع حدیث کا الزام لگایا ہے۔

پہلا تجزیہ یقیناً صحیح ہے، المدخل میں حاکم نے ان ائمہ کا اسی حیثیت سے ذکر کیا ہے، (المدخل ص ۵) لیکن غالباً اس کو امام اعظم تنقیص اور شافعیت میں غلو و تعصب کا نتیجہ قرار دینا صحیح نہیں ہے، کیونکہ:

1. امام اعظم کے بارے میں معتدل محدثین کو اگرچہ پوری طرح تسلیم تھا کہ فقہ و اجتہاد میں ان کا پایہ نہایت بلند تھا لیکن حدیث میں وہ ان کا پایہ زیادہ بلند نہیں مانتے تھے، بلکہ بعض کا تو یہاں تک خیال ہے کہ روایت و حدیث کے معاملہ میں وہ ضعیف اور کمتر تھے۔ یہ خیال خواہ تمام تر غلط یا سراسر غلط فہمی پر مبنی ہو لیکن واقعہ یہی ہے، ان کے مقابلہ میں وہ ائمہ ثلاثہ خصوصاً امام مالکؒ اور امام احمدؒ کو حدیث میں نہایت بلند پایہ اور عالی مرتبہ سمجھتے تھے، اسی لیے محدثین ائمہ ثلاثہ سے امام اعظم کے مقابلہ میں زیادہ قریب بھی ہیں اور ان کے زیادہ ہم نوا بھی اور وہ ان ائمہ کا جس عظمت شان کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اس عظمت کے ساتھ امام ابوحنیفہ کا نہیں کرتے لیکن محض اس بنا پر محدثین کی پوری جماعت کو امام اعظمؒ کا مخالف و معاند اور ان ائمہ کا بیجا ہمنوا اور حمایتی نہیں قرار دیا جا سکتا، اس لیے حاکم کا بھی ان ائمہ کا مقابلہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اس عظمت شان کے ساتھ ذکر نہ کرنا جس عظمت شان کے ساتھ کرنا چاہیے، درحقیقت شافعیت میں غلو اور تعصب کا نتیجہ نہیں ہے۔
2. حاکم عام محدثین کے برخلاف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو صرف فقہ و اجتہاد ہی میں امام اور بلند پایہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ حدیث و روایت میں بھی ان کی اہمیت کے قائل تھے چنانچہ یہاں بھی سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے امام مالک اور امام شافعی کی طرح ان کا اور صاحبین کا بھی ذکر ائمہ محدثین ہی کی حیثیت سے کیا ہے، جیسا کہ ابتداءً فمن الائمۃ الماضین" اور صاحبین کا نام لینے کے بعد و کذالک من بعدھما من ائمۃ المسلمین" سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو ان بزرگوں کی امامت فن اور معرفت حدیث سے انکار نہیں تھا لیکن امام شافعی اور امام مالک کے ساتھ انہوں نے جو توصیف و تکریم کا انداز اختیار کیا ہے اس کا غالباً سبب یہ ہے کہ ان کو بالاتفاق محدثین کی جماعت بھی حدیث و روایت میں امام سمجھتی تھی لیکن امام ابوحنیفہ کا معاملہ اس سے کچھ مختلف ہے۔

حاکم کے نزدیک حدیث میں امام ابوحنیفہؒ کی اہمیت اور درجہ کا اندازہ خود مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب کی اس تحریر سے

---

[1] (اس کے متعلق مفصل بحث کے لیے راقم کا مضمون "کیا امام دارقطنی، امام ابوحنیفہؒ سے تعصب رکھتے تھے"۔ (مطبوعہ معارف ستمبر ۶۹ء ملاحظہ کیجیے)

Marfat.com

بھی ہوتا ہے:

''حاکم اپنے مستدرک میں امام ابوحنیفہ سے استشہاد بھی کرتے ہیں اور ان کو ائمہ اسلام میں بھی شمار کرتے ہیں، انہوں نے ان کا اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث کی انچاسویں نوع میں ان مشہور ثقہ ائمہ تابعین وتبع تابعین میں ذکر کیا ہے جن کی حدیثیں حفظ ومذاکرہ اور تبرک کے لیے لکھی جاتی ہیں اور جن کا مشرق ومغرب میں شہرہ ہے۔'' (ماتمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ ص ۳۲)

۳ حاکم شافعی المذہب تھے، اس لیے ظاہر ہے کہ ان کو غلو، جیسا کہ مولانا نے بھی لکھا ہے، اسی مذہب میں ہوگا لیکن یہ بھی قابل غور ہے کہ انہوں نے امام مالک کا جس عظمت شان کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس عظمت شان کے ساتھ امام شافعی کا ذکر نہیں کیا ہے، ایسی صورت میں ان پر اگر کوئی الزام عائد ہوسکتا ہے تو وہ مالکیت میں غلو کا نہ کہ شافعیت میں، حقیقت یہ ہے کہ حدیث وروایت میں امام مالک کا درجہ امام شافعی سے بڑھ کر تھا، اس لیے حاکم نے اپنے امام مذہب کے مقابلہ میں ان کا اگر زیادہ عظمت شان کے ساتھ ذکر کیا ہے تو یہ دراصل ان کے تعصب کا نہیں بلکہ انصاف پسندی کا نتیجہ ہے۔

۴ اس عبارت میں جس طرح انہوں نے امام اعظم اور صاحبین کے ناموں کے ساتھ امام وغیرہ کا لفظ نہیں لکھا ہے، اسی طرح کتاب کے دوسرے مقامات ومباحث میں حدیث وروایت کے کئی اساطین واکابر جیسے امام احمد، امام بخاری اور امام مسلم وغیرہ کا صرف سادہ نام دے دیا ہے اور عموماً عربی مصنفین کا یہی قاعدہ بھی ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ صحیح ہے کہ حاکم کو امام مالک اور امام شافعی کی طرح امام اعظم اور صاحبین کا بھی اسی تعریف و تکریم کے ساتھ ذکر کرنا چاہیے تھا ممکن ہے انہوں نے ایسا کیا ہو مگر بعد میں جب حق پسندی کی جگہ عصبیت نے لے لی تو ناقلین نے اسے حذف کر دیا ہو۔

رہا دوسرا جز تو واقعہ کے اعتبار سے وہ بھی صحیح ہے، حاکم نے ابوعصمہ کے متعلق المدخل میں یہ ضرور لکھا ہے کہ:

''بعض لوگوں نے ثواب کے خیال سے بھی حدیثیں وضع کیں، ان لوگوں نے خود ہی بیان کیا ہے کہ انہوں نے لوگوں کو فضائل اعمال کی دعوت وتلقین کرنے کے لیے ایسا کیا جیسے ابوعصمہ نوح بن ابی مریم مروزی، محمد بن عکاشہ کرمانی، احمد بن عبداللہ جوباری، محمد بن قاسم طائکانی اور مامون بن عبداللہ ہروی وغیرہ۔ میں نے محمد بن یونس مقری سے، انہوں نے جعفر بن احمد بن نصر سے اور انہوں نے ابوعمارہ مروزی سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ابوعصمہ سے کہا گیا کہ آپ کو عکرمہ کی وہ حدیث کیسے ملی ہے، جس کو انہوں نے عباسؓ سے قرآن کے فضائل کے سلسلہ میں روایت کیا ہے، تو انہوں نے کہا کہ میں نے لوگوں کو قرآن سے بے نیاز اور روگرداں ہو کر امام ابو حنیفہؒ کی فقہ اور محمد بن اسحاق کے مغازی میں مشغول پایا تو ثواب کے خیال سے یہ حدیث وضع کر ڈالی۔''[1]

مگر ابوعصمہ کے متعلق حاکم کی یہ منفرد رائے نہیں ہے، کم وبیش تمام ائمہ جرح وتعدیل نے ان کو غیر ضابط، منکر الحدیث اور وضاع وکذاب تک کہا ہے، ان کے بارے میں سب سے نرم رائے ابن عدی کی ہے، مگر وہ کہتے ہیں ہم نے ان سے جو روایتیں کی ہیں وہ سب عموماً ایسی ہیں جن میں ان کی متابعت نہیں کی گئی ہے لیکن ان کے ضعف کے باوجود ان کی حدیثیں لکھی جائیں گی اور سب سے سخت رائے ابن مبارک کی ہے وہ ان پر نکیر کرتے، ان کی حدیثوں کو ناپسند کرتے اور انہیں وضعی اور جعلی قرار دیتے

[1] (المدخل ص ۱۹ و ۲۰، شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ، نوح کا یہ بیان نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں ''وایں عذر او بدتر از گناہ است زیرا کہ احادیث صحیحہ کہ در فضائل قرآن وارد شدہ برائے ترغیب کافی بودہ'' ملاحظہ ہو (عجالہ نافعہ مع فوائد ص ۲۵)

Marfat.com

تھے، ایک بار وکیع سے انہوں نے فرمایا کہ ہمارے یہاں ایک شیخ ہیں، ان کا نام ابوعصمہ ہے، یہ اسی طرح حدیثیں وضع کرتے ہیں جس طرح معلی بن ہلال کرتے تھے۔

ابوعصمہ کے متعلق ذیل میں متعدد نقادانِ فن کے اقوال اور جرحیں درج کی جاتی ہیں:

امام احمد: وہ حدیث میں بلند پایہ نہ تھے، بلکہ منکر حدیثیں بیان کرتے تھے۔

یحییٰ بن معین: نہ حدیث میں ان کی کوئی اہمیت ہے اور نہ ان کی حدیثیں لکھی جائیں گی۔

وکیع: ان کا کیا اعتبار؟ ابن مبارک ان سے روایت نہیں کرتے۔

امام بخاری: ان کی حدیثیں غیر صحیح اور وہ منکر الحدیث وذاہب الحدیث ہیں۔

ابوحاتم: دولابی، امام مسلم اور امام دار قطنی: متروک الحدیث۔

ابوزرعہ: ضعیف الحدیث۔

امام نسائی: ابوعصمہ غیر ثقہ وغیر مامون اور ساقط الحدیث ہیں، ان سے حدیث نہیں لکھی جائے گی۔

جوزجانی: ساقط الحدیث۔

ابن حبان: ابوعصمہ سندوں کو الٹ پلٹ دیتے تھے اور ثقہ لوگوں کی جانب منسوب کر کے حدیثیں بیان کرتے تھے، وہ کسی حال میں بھی اعتبار واحتجاج کے لائق نہیں، ان کا لقب اگرچہ جامع تھا، مگر وہ صدق کے سوا ہر چیز کے جامع رہے ہوں گے۔

ابن عیینہ وابوعلی نیشاپوری: وہ کذاب تھے۔

خلیلی: ان کے ضعف پر محدثین کا اجماع ہے۔

ساجی: متروک الحدیث ہیں، ان کے پاس باطل حدیثیں ہوتی تھیں۔

ابوسعید النقاش: انہوں نے موضوعات کی روایت کی ہے۔

حافظ ذہبی وابن عماد: متروک الحدیث، ذہبی نے ان کی بعض ضعیف اور واہی حدیثوں کی مثالیں بھی دی ہیں۔

حافظ ابن حجر: لوگوں نے حدیث میں ان کو کاذب قرار دیا ہے، انہوں نے زہری اور ابن منکدر کو ضرور پایا تھا، مگر ان سے حدیثیں بیان کرنے میں تدلیس سے کام لیتے تھے، ابن مبارک نے ان کی ایک طویل حدیث کو بے اصل قرار دیا ہے، واقعۃً اس میں وضع کے آثار وعلامات بالکل ظاہر وواضح ہیں، ابوجعفر طبری نے اپنی تاریخ کی ابتدا میں بدء الخلق کے سلسلہ میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس کی عدم صحت کی جانب اشارہ بھی کیا ہے۔

علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے حاکم کا مذکورہ بالا بیان بلا نقد وتبصرہ نقل کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک حاکم کا بیان قابل اعتراض نہیں ہے۔[1]

ائمہ جرح وتعدیل کے ان متفقہ آراء واقوال کے بعد یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ امام حاکم نے بربنائے تعصب نوح کو واضع حدیث قرار دیا ہے، اگر ان کی روایت مجہول شخص کے واسطہ سے بھی ہو تو ان آرا کی موجودگی میں اس کے صحیح ہونے میں کیا

---

[1] (ائمہ جرح وتعدیل کے ان بیانات کے لیے میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۴۵ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۸۷ تا ۴۸۹ تقریب التہذیب ص ۳۶۲ خلاصہ تذہیب ص ۴۰۵ العبر ج ۱ ص ۲۶۳ تاریخ الصغیر امام بخاری اور کتاب الضعفاء والمتروکین امام نسائی ملاحظہ ہو)

Marfat.com

شبہ ہوسکتا ہے، آخر ابن حجر اور ذہبی نے بھی تو حاکم کے بیان پر کوئی رد و کد نہیں کیا ہے اسی طرح مولانا عبدالحلیم چشتی نے جو اس دور کے مشہور فاضل اور اچھے اہل قلم ہیں، ابوعصمہ نوح ابن ابی مریم کے ضعیف و متروک ہونے کا اعتراف کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''ابوعصمہ نوح نے امام زہری، ثابت بنانی، یحییٰ بن سعید انصاری اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہم سے حدیث پڑھی اور ان سے شعبہ اور عبداللہ بن مبارک رحمہما اللہ راوی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ ثقہ تھے لیکن اور محدثین کی نظر میں متروک ہیں ان پر زہد کا بڑا غلبہ تھا۔۔۔۔۔۔ حافظ ذہبی کتاب العبر میں لکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔ وھو متروک الحدیث۔۔۔۔

(فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ ص ۵۲۴ و ۵۲۵)

مولانا عبدالرشید صاحب نے اپنے خیال کی تائید و توثیق میں اسماعیل بن ابوالفضل قومسی کا ایک بیان بھی نقل کیا ہے جس کا صرف حافظ ابن جوزی جیسے متشدد شخص نے المنتظم میں خطیب بغدادی کے تذکرہ میں ذکر کیا ہے لیکن ان تمام سوانح نگاروں کے اقوال کے مقابلہ میں اس شاذ اور منفرد قول کی اہمیت ہوسکتی ہے؟ جنھوں نے حاکم کے مفصل ترجمے لکھے اور ان پر عائد کیے جانے والے الزامات گنائے، مگر اس الزام کا ذکر تک نہیں کیا، مولانا کو چاہیے تھا کہ وہ دیگر ائمہ اور ناقلین خصوصاً حاکم کے اساتذہ، تلامذہ اور معاصرین وغیرہ کے اقوال سے ثبوت اور سندیں پیش کرتے یا پھر احکام و مسائل میں حاکم کے غلو و تعصب کی مثالیں بیان کرتے تو ممکن ہے، ''ظاہر بینوں'' کو بھی حاکم کے تعصب کا یقین ہوجاتا۔

مستدرک کے بعض مقامات میں حاکم نے ضرور شافعی مذہب کی تائید و حمایت کی ہے لیکن اس کا غلو و تعصب سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا، بلکہ اسی طرح کے بعض مواقع پر انہوں نے امام شافعیؒ کے بجائے بعض دوسرے ائمہ جیسے ابن خزیمہ وغیرہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے ظاہر ہے کسی کے اپنے فقہی مسلک کی ترجیح اور اپنے امام مذہب کی تائید کو اس کے غلو و تعصب پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔

Marfat.com

امام ابوالقاسم تمّام رازی

(متوفی ۴۱۴ھ)

نام ونسب:

تمام نام، ابوالقاسم کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: تمام بن محمد بن عبداللہ بن جعفر بن عبداللہ بن جنید۔

(تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۳۴۲)

ولادت، خاندان اور وطن:

امام ابوالقاسم تمام کا اصل آبائی وطن رے تھا لیکن اسلامی عہد میں ان کا خاندان دمشق میں آباد ہو گیا تھا، یہیں وہ ۳۳۰ھ میں پیدا ہوئے، اسی لیے رازی اور دمشقی کہلاتے ہیں، بجلی کی نسبت سے بھی مشہور ہیں، کیونکہ ان کے خاندان کا عرب کے مشہور قبیلہ بجیلہ سے ولا کا تعلق تھا، ان کے والد بزرگوار ابوالحسین محمد بھی بلند پایہ محدث تھے۔ [1]

اساتذہ:

اپنے والد ماجد کے علاوہ جن محدثین سے ان کو شرف تلمذ حاصل ہے، ان کے نام یہ ہیں:

ابوالحسن احمد بن حزام، ابوعلی احمد بن محمد بن فضالہ، ابومیمون بن راشد، ابویعقوب اذرعی، ابوعلی حسن بن حبیب حصائری، خثیمہ بن سلیمان طرابلسی، محمد بن حمید بن جواربی وغیرہ۔

ابوعمرو بن العلاء، علی غلام سباک سے فن قراءت کی تحصیل کی تھی۔

تلامذہ:

ان کے تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوالحسن [2] میدانی، ابوعلی اہوازی، احمد بن عبدالرحمن طرائفی، احمد بن محمد عتیقی، حسن بن علی الباد، عبدالعزیز بن احمد کتانی اور عبدالوہاب کلابی وغیرہ۔ (تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۳۴۲ و تذکرہ ج ۳ ص ۲۵۸ و بستان المحدثین ص ۹۲)

---

[1] (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۵۸) شاہ عبدالعزیز صاحب نے حسن بصلت حصائری لکھا ہے (بستان ص ۹۲) (حافظ ذہبی نے ان کا نام علی احمد بن عثمان غلام لکھا ہے)

[2] (ذہبی نے ابوالحسن کے بجائے ابوالحسین لکھا ہے (تذکرہ ج ۳ ص ۲۵۸)

Marfat.com

حفظ وضبط:

وہ حفظ حدیث میں بے نظیر تھے، ابوبکر حداد کا بیان ہے کہ حفظ وروایت میں ہم نے ان سے زیادہ جامع اور باکمال شخص نہیں دیکھا، عبدالعزیز کتانی فرماتے ہیں کہ اہل شام کی روایتوں کے یہ سب سے بڑے اور اچھے حافظ وضابط تھے۔

ثقاہت:

ان کی عدالت وثقاہت بھی مسلّم ہے، کتانی نے اس کا اعتراف کیا ہے، حافظ ابن عساکر لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ ومامون تھے۔

علل واسماء الرجال میں مہارت:

علل اور رجال حدیث کے ماہر تھے، اہوازی کا بیان ہے کہ تمام فن حدیث میں تبحر، علل سے واقف اور رجال کی معرفت میں بڑا درخور رکھتے تھے، میں نے ایسا ماہر فن نہیں دیکھا۔ (ایضاً)

حدیث میں درجہ:

ان تصریحات سے حدیث میں ان کی اہمیت وعظمت کا اندازہ ہوتا ہے، علمائے فن نے ان کو عارف وعالم بالحدیث اور محدث الشام وغیرہ کہا ہے۔

وفات:

چوراسی ۸۴ سال کی عمر میں ۳/محرم الحرام ۴۱۴ھ کو انتقال کیا۔ (ایضاً)

تصنیفات:

ان کی صرف ایک ہی کتاب فوائد کا نام معلوم ہوسکا ہے، یہ تیس جزؤں پر مشتمل تھی۔ (الرسالۃ المستطرفہ ص ۷۹)

Marfat.com

امام ابوبکر بن مردویہ الکبیر اصبہانی

(م۴۱۶ھ)

نام ونسب:

احمد نام، ابوبکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: احمد بن موسیٰ بن مردویہ بن فورک۔ (المنتظم ج ۷ ص ۲۹۴ والبدایہ ج ۱۲ ص ۸)

اپنے دادا مردویہ کے نام پر ابن مردویہ کے لقب سے معروف ہیں، الکبیر بھی ان کے نام کا جزو ہے، کیونکہ ان کے پوتے ابوبکر احمد بن محمد بھی ابن مردویہ کے لقب سے مشہور ہیں اور ان کو ابن مردویہ الصغیر کہا جاتا ہے، ابن مردویہ صغیر کی اپنے دادا ابن مردویہ کبیر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، ان کا انتقال ۴۹۸ھ میں ہوا۔

ولادت ووطن:

۳۲۳ھ میں اصبہان میں پیدا ہوئے۔ (تذکرہ ج ۳ ص ۲۵۳)

اساتذہ:

بعض اساتذہ شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوسہل بن زیاد القطان، احمد بن عبداللہ بن دلیل، احمد بن عیسیٰ خفاف، احمد بن محمد بن عاصم کرمانی، اسحاق بن محمد بن علی کوفی، اسماعیل خطی، محمد بن احمد بن علی اسواری، محمد عبداللہ بن علم الصفار، محمد بن علی بن دحیم شیبانی اور میمون بن اسحاق خراسانی۔

تلامذہ:

ابن مردویہ کبیر کے ممتاز شاگردوں کے نام حسب ذیل ہیں:

ابوعبداللہ ثقفی، ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن مندہ، عبدالوہاب بن مندہ، ابوالخیر محمد بن احمد ردا، ابوبکر محمد بن حسن، ابومنصور محمد بن سکرویہ، ابومطیع محمد بن عبدالواحد مصری۔ (ایضا)

سفر:

حدیث کی تحصیل اور علوم وفنون کی تکمیل کے لیے ان کے عراق وغیرہ تشریف لے جانے کا ذکر ملتا ہے۔

Marfat.com

حدیث میں درجہ:

حدیث میں بلند مرتبت تھے، علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ وہ اس فن کے ممتاز ماہر اور رجال کی اچھی پرکھ رکھتے تھے، ابن عماد کا بیان ہے کہ وہ حدیث میں امام اور اس کے واقف کار تھے، ان کا حفظ و اتقان اور ضبط و ثقاہت بھی مسلّم ہے، حافظ ذہبی نے الحافظ الثبت لکھا ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۵۳ و شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۹۰)

وفات:

مشہور روایت کے مطابق ۲۴ / رمضان ۴۱۶ھ کو انتقال ہوا لیکن ابن اثیر، ابن جوزی اور ابن کثیر نے ۴۱۰ھ سن وفات تحریر کیا ہے۔ (تذکرہ و بستان المحدثین ۳۰، تاریخ ابن اثیر ج ۹ ص ۱۰۸، المنتظم ج ۷ ص ۲۹۴، البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۸)

تصنیفات:

ابن مردویہ کی حسب ذیل تصنیفات کا علم ہو سکا ہے۔

1. المستخرج علی جامع الصحیح البخاری۔
2. تفسیر ابن مردویہ۔
3. تاریخ اصبہان۔ [1]

---

[1] (مولانا عبدالحلیم چشتی نے غلطی سے اس کی ایک تصنیف الجامع المختصر فی الطب کا ذکر کیا ہے، فوائد جامعہ ص ۸۴ حالانکہ یہ احمد بن عبدالرحمن مندویہ اصبہانی کی تصنیف ہے، دیکھئے کشف الظنون ج ۱ ص ۳۸۵)

Marfat.com

امام ابوبکر احمد بن محمد برقانی خوارزمی

(متوفی ۴۲۵ھ)

نام ونسب:

احمد نام، ابوبکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: احمد بن محمد بن احمد بن غالب۔

ولادت ووطن:

امام ابوبکر برقانی ۳۳۶ھ میں خوارزم کے نواح کے ایک گاؤں برقان میں پیدا ہوئے، اسی لیے برقانی اور خوارزمی کی نسبتوں سے مشہور ہیں، برقان دریائے جیجون کے مشرقی ساحل پر ایک زرخیز اور شاداب مقام تھا پھر ویران ہو گیا۔ (کتاب الانساب ورق ۷۵، معجم البلدان ج ۲ ص ۱۳۱) اور امام برقانی نے دریائے بغداد میں سکونت اختیار کر لی اور اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

اساتذہ:

ان کے شیوخ کی تعداد بے شمار ہے، بعض کے نام یہ ہیں:

ابن نحاس مصری، ابواحمد الحافظ، ابوبحر بن کوثر البربھاری، ابوبکر احمد بن ابراہیم اسماعیلی، احمد بن ابراہیم بن حباب، احمد بن جعفر بن سلمہ، ابوالعباس احمد بن محمد بن حمدان نیشاپوری، ابوبکر ابن ابی الحدید، ابوبکر بن مالک قطیعی، ابومحمد بن ماسی، ابومنصور ازہری، ابوسہیل بشر بن احمد، ابومحمد عبدالغنی ابن سعید ازدی مصری، عبداللہ بن احمد بن صدیق، عبداللہ بن عمر بن علک، ابوالحسن علی بن عمر دارقطنی، ابوعلی محمد بن احمد بن حسین بن صواف، ابوعمر و محمد بن احمد بن حمدان، محمد بن جعفر بن ہثیم بندار، ابوالفضل محمد بن عبد اللہ خمیر ویہ، محمد بن علی حسانی، ابوصخر محمد بن مالک، السعدی، ابوحاتم محمد بن یعقوب۔

(تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۷۳ و ۳۷۴، کتاب الانساب ورق ۷۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۷۴ و الطبقات الکبری ج ۳ ص ۱۹)

تلامذہ:

ان کے تلامذہ میں ابواسحاق شیرازی، امام بیہقی اور خطیب جیسے مشاہیر شامل ہیں، چند اور شاگردوں کے نام یہ ہیں:

ابوطاہر احمد بن حسن کرجی، ابوعبداللہ صوری، ابوالفضل بن خیرون، ابوالقاسم بن ابوالعلاء ابوالمعالی ثابت بن بندار مقری، ابومسعود سلیمان بن ابراہیم الحافظ، ابویعلی محمد بن احمد العبدی البصری، ابوالفضل محمد بن عبدالسلام شافعی انصاری۔

(تذکرہ ج ۳ ص ۲۷۴ و انساب سمعانی ورق ۷۵)

Marfat.com

رحلت وسماعِ حدیث کی ابتدا:

۳۵۰ھ کے بعد انہوں نے حدیث کے سماع کی ابتدا کی اور اس کے بعد بغداد، جرجان، ہرات، دمشق، مصر اسفرائن، مرو اور نیشاپور وغیرہ تشریف لے گئے اور ان مقامات کے اکابر شیوخ سے کسب فیض کیا، علم وفن کے اس قدر شوقین تھے کہ اس کے لیے ہر قسم کی صعوبت اور مشقت برداشت کرتے تھے، اسفرائن میں صرف ایک درہم ان کے پاس تھا، اسی پر پورا مہینہ گزار دیا اور تیس جزو کے بقدر حدیثیں لکھیں۔ (ایضاً والعبر ج ۳ ص ۱۵۶)

حفظ وثقاہت:

امام برقانی احادیث کے حافظ اور نہایت عادل وضابط شخص تھے، خطیب کا بیان ہے کہ وہ ثقہ، متورع، متقن، متثبت اور ذی فہم تھے، ہمارے شیوخ میں ان سے زیادہ ثقہ وثابت شخص کوئی نہیں تھا، میں نے ازہری سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے برقانی سے بڑھ کر متقن کسی شخص کو دیکھا؟ انہوں نے جواب دیا نہیں، ابوالولید باجی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ حافظ تھے، ذہبی، ابن عساکر، ابن سبکی، اسنوی اور ابن عماد وغیرہ نے ان کو الحافظ الکبیر اور الحافظ الامام وغیرہ لکھا ہے۔ (حوالہ سابقہ)

فن حدیث میں امتیاز اور اس سے غیر معمولی اشتغال:

امام برقانی نے اس فن کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنالیا تھا، ان کا خود بیان ہے کہ مجھ کو اس فن سے اس قدر غیر معمولی لگاؤ ہو گیا تھا کہ اور چیزوں کی طرف دھیان دینے کا موقع نہیں ملتا تھا، اسی لیے ان کا کتب خانہ حدیث کی کتابوں کا دفتر بن گیا تھا اور ان کو بے شمار حدیثیں بھی ازبر تھیں، خطیب کا بیان ہے کہ وہ کثیر الحدیث تھے، اس سے اس فن میں ان کی عظمت اور بلند پائیگی کا اندازہ ہوتا ہے، تمام مؤرخین نے حدیث میں ان کی فہم وبصیرت، ژرف نگاہی اور علم ونظر کی وسعت کا اعتراف کیا ہے، خطیب کا بیان ہے کہ برقانی حدیث کی اچھی فہم وبصیرت رکھتے تھے، ابن عساکر اور سمعانی کا بیان ہے کہ وہ حدیث کی فہم ومعرفت میں ممتاز تھے، ابواسحاق شیرازی فرماتے ہیں کہ جب وہ اس فن کی جانب متوجہ ہوئے تو اس کے امام بن گئے، ذہبی نے ان کو شیخ بغداد اور شیخ المحدثین کا لقب دیا ہے، ازہری کا بیان ہے کہ برقانی امام حدیث ہیں اور ان کی وفات کے بعد اس فن کی عظمت شان باقی نہیں رہے گی۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۳۶)

تفسیر وقرآنیات:

قرآن مجید کے حافظ اور علوم قرآنی کے واقف کار تھے۔

(تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۷۴ و ۳۷۵ وتاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۳۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۷۴ و ۲۷۵ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۹)

فقہ:

فقہ کے ماہر اور ممتاز فقیہ تھے، حدیث سے پہلے اس فن کی تحصیل شروع کی تھی اور اس موضوع پر بعض کتابیں بھی لکھیں، خطیب نے عارف بالفقہ، ابن کثیر نے عالم بالفقہ اور ذہبی نے شیخ الفقہاء لکھا ہے، ابوبکر اسماعیلی اپنے پاس آنے والے طلبہ کے سامنے ایک ورق خود پڑھنے کے بعد ان سے پڑھواتے تھے لیکن برقانی کے سامنے دو ورق پڑھتے اور فرماتے کہ تم لوگوں پر ان

Marfat.com

کو اس لیے ترجیح دیتا ہوں کہ یہ فقیہ بھی ہیں، فقہ واجتہاد میں امام شافعی کے مذہب سے وابستہ تھے۔ (ایضاً)

نحو وعربیت:

وہ عربی ادب اور علم نحو میں اچھی دسترس رکھتے تھے۔ (تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۷۵ و ۳۷۶)

شعر وسخن:

شعر وسخن کا ذوق تھا اور کبھی کبھی اشعار کہتے تھے، خطیب نے ان کے آٹھ اشعار نقل کیے ہیں، (ایضاً) ان کے شعروں سے بھی حدیث سے ان کی مناسبت کا پتہ چلتا ہے۔

ورع وتقویٰ:

ان گوناگوں علمی کمالات کے ساتھ ہی وہ نہایت متدین اور بڑے عبادت گزار بھی تھے، خطیب کا بیان ہے کہ وہ صاحب ورع وتقویٰ تھے، میں نے محمد بن یحییٰ کرمانی فقیہ سے سنا ہے کہ محدثین کی جماعت میں برقانی سے زیادہ عبادت کرنے والا نہیں دیکھا، ابن سبکی فرماتے ہیں کہ وہ مجموعہ فضائل اور عابد شخص تھے۔ (تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۷۵ و ۳۷۶)

وفات:

یکم رجب ۴۲۵ھ کو بدھ کے دن انتقال ہوا اور پنجشنبہ کو تدفین ہوئی، ابو علی بن ابی موسیٰ ہاشمی نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور بغداد کے مقبرہ جامع میں باب سکہ خرقی کے قریب دفن کئے گئے۔

محمد بن علی صوری کا بیان ہے کہ میں برقانی کی وفات سے چار روز پہلے ان کی عیادت کے لیے گیا تو انہوں نے کہا آج ۲۶/ جمادی الاخریٰ ہے، میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ رجب کا چاند ہونے کے بعد میرا خاتمہ ہو، کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ (ان للہ عتقاء من النار) ممکن ہے اللہ کی رحمت سے میں بھی اس زمرہ میں شامل ہو جاؤں، یہ بات انہوں نے سنیچر کو کہی تھی اور اللہ کی شان دیکھئے کہ بدھ کو رجب کا چاند ہونے کے بعد ان کا انتقال ہوا۔ (ایضاً)

تصنیفات:

برقانی نے علم حدیث میں کئی مفید کتابیں لکھیں، تذکرہ نگاروں نے ان کو کثیر التصانیف بتایا ہے اور لکھا ہے کہ وفات تک وہ تصنیف وتالیف اور علمی اشغال میں منہمک رہے، ان کی تصنیفات میں مسند مشہور ہے جو مسند خوارزمی کہلاتی ہے، مسند خوارزمی دراصل صحیحین کی حدیثوں پر مشتمل اور مستخرج ہے، (ایضاً والرسالۃ المستطرفۃ ص ۲۷) حمیدی نے اپنی الجمع بین الصحیحین کے نقل میں اس کی حدیثوں پر اعتماد کیا ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ ۱۱۷۸ھ کا لکھا ہوا دار العلوم اسلامیہ پشاور کے اور ایک یحییٰ بن ناصر کے ہاتھ کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں ہے۔ (لباب المعارف فہرست دار العلوم پشاور ص ۵۲ ومقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۵)

مسند کے علاوہ انہوں نے امام ثوری، شعبہ، ایوب، سعید، عبداللہ بن عمر، عبدالملک بن عمیر، بیان بن بشر اور مطر الوراق کی حدیثوں کے جمع وتالیف کا کام انجام دیا۔ (تاریخ بغداد وتاریخ ابن عساکر وتذکرہ ذہبی)

Marfat.com

امام ابونعیم اصفہانی

(متوفی ۴۳۰ھ)

نام ونسب:

احمد نام، ابونعیم کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، احمد بن عبداللہ بن احمد بن اسحاق بن موسیٰ بن وائل بن مہران۔

ولادت:

رجب ۳۳۶ھ میں اصفہان میں پیدا ہوئے، ایک روایت ۳۳۴ھ کی بھی ہے۔

خاندان:

گو عجم نژاد تھے تاہم ان کے خاندان کو خانوادہ نبوت سے ولاء کا شرف حاصل ہے، ان کے جد اعلیٰ مہران کو اس خاندان میں سب سے پہلے مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہوا، یہ عبداللہ ابن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر بن ابوطالب کے مولیٰ تھے، ابونعیم کے والد عبداللہ علم وفن کے بڑے دلدادہ تھے، انہوں نے اپنے فرزند کو نہایت کم سنی ہی میں تحصیل علم اور سماع حدیث کے مقدس اور بابرکت مشغلہ میں لگا دیا تھا، چنانچہ ۳۴۴ھ میں ابونعیم نے جبکہ سات یا آٹھ ہی سال کے تھے، احادیث کا باقاعدہ سماع شروع کر دیا تھا، ان کے نانا محمد بن یوسف بناء مشہور زاہد اور ممتاز صوفی تھے۔

(تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۱ و طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷ و ۸)

اساتذہ:

ابونعیم کے اساتذہ اور تلامذہ دونوں کی فہرست بڑی طویل ہے، ارباب سیر کا بیان ہے کہ انہوں نے بیشمار فضلا سے اور بے شمار فضلا نے ان سے استفادہ کیا تھا، حافظ ذہبی ان کے چند شیوخ کا نام گنانے کے بعد لکھتے ہیں:

وخلائق بخراسان والعراق فاكثر وتهياء له من لقى الكبار مالم يقع حافظ۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۲)

(ان کے علاوہ) انہوں نے خراسان وعراق کے بے شمار لوگوں سے کسب فیض کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان کو جس قدر اکابر شیوخ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اس سے اور محدثین محروم ہیں۔

ابونعیم کو یہ خصوصیت بھی حاصل تھی کہ چھ سال کی عمر ہی میں بعض مشہور ومعتبر محدثین نے تبرکاً ان کو اجازت حدیث مرحمت کر دی تھی۔ (بستان المحدثین ص ۴۳) حافظ ذہبی اور علامہ ابن سبکی نے لکھا ہے کہ شام کے خیثمہ بن سلیمان بغداد کے جعفر خالدی اور

Marfat.com

ابوسہل بن زیاد واسط کے عبداللہ بن عمر بن شوذب اور نیشاپور کے ابوالعباس اصم نے ان کو اجازت عطا کی تھی۔
(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۱ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷)

ان حضرات کے علاوہ ابونعیم نے مندرجہ ذیل شیوخ سے بھی روایت کی ہے:

ابراہیم بن عبداللہ ابوالعریم کوفی، ابواحمد محمد بن احمد بن عسال، ابومحمد بن کوشی، ابوبکر آجری، ابوبکر جعانی، ابوبکر بن خلاد نصیبی، ابوبکر بن ہیثم بندار، ابوشیخ بن حیان، ابوعلی بن صواف، ابوالقاسم طبرانی، ابومحمد بن فارس، احمد بن بندار عشار، احمد بن حسن ملی، احمد بن محمد قصار، احمد بن معبد سمسار، حبیب قزاز، عبداللہ بن جعفر جابری، عبداللہ بن حسن بن بندار فاروق بن عبدالکبیر خطابی۔ (ایضاً)

تلامذہ:

معاصرین واقران کے علاوہ ان کے تلامذہ کی فہرست میں بے شمار ایسے لوگ بھی تھے جو سن وسال میں ان سے بڑے اور مدتوں پہلے فوت ہو چکے تھے، ابوعبدالرحمٰن سلمی نے جو اکابر صوفیہ میں اور ابونعیم سے معمر تھے، طبقات الصوفیہ میں ایک شخص کے واسطہ سے ان سے روایت کی ہے چند تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر خطیب (یہ نہایت مخصوص تلامذہ میں تھے) ابوبکر بن علی ذکوانی، ابوسعید مالینی ابوصالح مؤذن، ابوعلی المقری، ابوعلی وحشی، ابوالفضل احمد الحداد، ابوعلی حسن بن احمد حداد، سلیمان بن ابراہیم، قاضی عبدالسلام بن احمد کوشیار بن لیالیروزجیلی، ابوبکر محمد بن ابراہیم عطار، ابومنصور محمد بن عبداللہ شروطی، ابوسعید محمد بن محمد بن مطرز، ہبۃ اللہ بن محمد شیرازی، یوسف بن حسن تفکری۔
(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۲ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۸)

رحلت وسفر:

ان کے شیوخ مختلف اسلامی ملکوں اور شہروں سے تعلق رکھتے تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے عراق، حجاز، خراسان، شام، بغداد، واسط، نیشاپور، مکہ، بصرہ اور کوفہ وغیرہ کا سفر کیا ہوگا۔

حفظ وضبط اور ثقاہت:

ابونعیم کے حفظ وضبط اور ثقاہت وعدالت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مورخین اور ارباب سیر نے ان کو الحافظ المشہور، الحافظ الکبیر اور من اکابر الحفاظ الثقات وغیرہ لکھا ہے، خطیب کا بیان ہے کہ ابونعیم اور ابوحازم عبدوی ہی کے لیے حفظ کا لفظ مطلقاً بولا جاسکتا ہے، ابن مردویہ فرماتے ہیں کہ اس وقت روئے زمین پر ابونعیم سے بڑا حافظ ومسند کوئی نہیں، وہ حافظ الدنیا ہیں، ابن سبکی تحریر فرماتے ہیں کہ وہ حفظ وضبط میں مرتبہ کمال پر فائز تھے۔ (ایضاً وتاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۵)

ابونعیم صدق وثقاہت میں بھی بلند پایہ تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ان کے بارے میں جو کچھ کلام کیا گیا ہے اس کی کوئی دلیل وبنیاد نہیں بلکہ اس کی تمامتر وجہ وہ مخاصمت ہے جو ان کے اور ابن مندہ کے درمیان تھی۔ (میزان الاعتدال ج ۱ ص ۵۲)

حدیث میں درجہ ومرتبہ:

وہ فن حدیث میں بڑا درخور رکھتے تھے، علمائے سیر نے ان کو محدث العصر اور من اعلام المحدثین والرواۃ کے لقب سے

Marfat.com

موسوم کیا ہے، ابن نجاد کا بیان ہے کہ ''وہ محدثین کے سرتاج اور اعلام دین میں تھے'' حدیث کی جمع و روایت کی طرح اس کی معرفت و درایت میں بھی شہرت و امتیاز رکھتے تھے، ابن سبکی کا بیان ہے کہ ''وہ ان ممتاز لوگوں میں تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے روایت میں علو کے ساتھ درایت میں بھی حد کمال پر فائز کیا تھا،'' حافظ ذہبی لکھتے ہیں ''وہ علوئے اسناد، حفظ حدیث اور جملہ فنون حدیث میں تبحر کے لحاظ سے پوری دنیا میں ممتاز تھے۔'' ابن عساکر فرماتے ہیں کہ ''ابونعیم جمع و معرفت حدیث میں یکتا اور فضائل و کمالات کا مجموعہ تھے۔''

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۱ و ۲۹۲ و ۲۹۳ و طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷، ۸ و تبیین کذب المفتری ص ۲۴۶ و العبر ج ۳ ص ۱۷۰)

فقہ و تصوف میں بلند پائیگی:

حدیث کے علاوہ فقہ و تصوف میں بھی جامع کمال تھے (طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷، اور مسلکاً شافعی تھے، تصوف و سلوک سے ان کی دلچسپی خاندانی تھی، ان کے نانا محمد بن یوسف کے متعلق پہلے گزر چکا ہے کہ وہ مشہور اہل اللہ اور اکابر صوفیہ میں تھے، ابونعیم کو بھی اس میں کمال حاصل تھا، اس پر ان کی شہرۂ آفاق کتاب حلیۃ الاولیا شاہد ہے۔

عقیدہ:

عقائد میں اشاعرہ کے ہم نوا تھے، حافظ ابن عساکر نے تبیین میں دوسرے طبقہ میں ان کا ذکر کیا ہے، (تبیین کذب المفتری ص ۲۴۶) حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ وہ اشعری مذہب کی جانب شدید میلان رکھتے تھے۔ (المنتظم ج ۸ ص ۱۰۰)

شہرت و مقبولیت اور مجلس درس کی وسعت:

ابونعیم کے علمی کمالات اور غیر معمولی فنی شہرت نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنادیا تھا، اس لیے ان کی مجلس درس بڑی وسیع تھی، لوگ دور دراز کا سفر کر کے ان کے پاس آتے، طلبہ کا جم غفیر ہر وقت استفادہ کے لیے موجود رہتا تھا، ہم عصر لوگوں کے علاوہ وہ لوگ بھی ان سے استفادہ کرنے کے لیے آتے تھے جو عمر میں ان سے بڑے تھے، ابن مردویہ کا بیان ہے کہ وہ ان فضلائے روزگار میں تھے جن کے پاس لوگ قصد و ارادہ سے سفر کر کے آتے اور مستفید ہوتے تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ جب ان کی مجلس درس آراستہ ہوتی تو ارباب فن اور محدثین عجز و نیاز کے ساتھ ان کے دولت کدہ پر حاضر ہو کر بڑی رغبت اور مکمل انہماک کے ساتھ اکتساب فیض کرتے تھے کیونکہ ان کے علوئے اسناد جودت حفظ اور وفور علم کا چرچا تھا۔

درس کا سلسلہ صبح سے شروع ہو کر ظہر کے وقت تک جاری رہتا تھا اور مجلس درس ہمیشہ طلبہ و مستفیدین سے معمور رہتی تھی، روزانہ باری باری ایک شخص قراءت کرتا تھا، ظہر کے وقت جب مجلس برخاست ہوتی اور وہ گھر آنے لگتے تو شائقین راستے میں بھی ایک جزو کے بقدر پڑھ لیتے تھے، اس سے ان کو کوئی آزردگی اور ناگواری نہیں ہوتی تھی، کیونکہ علم حدیث سے ان کا اشتغال اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ بقول حافظ ذہبی۔

لم یکن لہ غذاء سوی التسمیع والتصنیف۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۲ و بستان المحدثین ص ۴۴)

حدیثیں سننا اور سنانا اور ان کی جمع و تالیف ہی ان کی غذا تھی۔

Marfat.com

ابونعیم کے خلاف شورش وہیجان:

اس زمانہ میں حنابلہ کا زور واثر بہت بڑھ گیا تھا، ان کی سخت گیری اور تشدد کے بعض واقعات بھی تاریخوں میں مذکور ہیں، ان کے اور اشاعرہ کے درمیان سخت کشمکش اور آویزش رہتی تھی، اوپر گزر چکا ہے کہ ابونعیم کا میلان اشعریت کی جانب تھا، اس کے نتیجہ میں ان کے خلاف شورش وہنگامہ برپا ہوا اور ان کو شدائد ومحن سے دوچار ہونا پڑا، محمد بن عبدالجبار فرسانی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ ابوبکر بن ابوعلی معدل کی مجلس درس میں ایک شخص نے کہا کہ ابونعیم کی صحبت میں جانے والوں کو یہاں سے اٹھ جانا چاہیے کیونکہ وہ اپنے اعتقادات کی وجہ سے ان لوگوں میں غیر مقبول اور مبغوض تھے۔

ابونعیم کے خلاف اس قدر ہیجان برپا ہوگیا تھا کہ اہل صفہان نے اس کا جامع مسجد میں داخلہ تک بند کردیا تھا، (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۳ و ۲۹۴ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۹) حنابلہ کی شدت پسندی کے علاوہ اس کا یہ سبب بھی ہوسکتا ہے کہ ابونعیم کے فضل وکمال اور غیر معمولی شہرت ومقبولیت نے ان کی ذات کو محسود ومبغوض بنادیا ہو۔

وفات:

۹۴/سال کی عمر میں محرم الحرام ۴۳۰ھ میں انتقال کیا، ابن خلکان نے محرم کے بجائے صفر کا مہینہ لکھا ہے، تاریخ وفات ۱۸، ۲۰ اور بعض نے ۲۱ محرم الحرام لکھی ہے، ظہر کے بعد تجہیز وتکفین ہوئی۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۳ و ۲۹۴ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۹ وتاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۵ والمنتظم ج ۸ ص ۱۰۰)

تصنیفات:

ابونعیم سے بے شمار کتابیں یادگار ہیں، جن کتابوں کے نام معلوم ہوسکے وہ یہ ہیں:

۱۔ کتاب الاربعین، ۲۔ تثبیت الرؤیا، ۳۔ جزء فضل سورۃ الاخلاص، ۴۔ کتاب حرمۃ المساجد، ۵۔ رسائل مختصرہ، ۶۔ ریاضۃ المتعلمین یا ریاض المتعلم، ۷۔ کتاب الریاضۃ والادب، ۸۔ کتاب صفۃ الجنۃ، ۹۔ کتاب الطب یا کتاب الطب النبوی، ۱۰۔ طرق حدیث (ان اللہ تسعا وتسعین)، ۱۱۔ عمل الیوم واللیلہ، [1] ۱۲۔ کتاب الفتن، ۱۳ [2]۔ کتاب فضائل الخلفاء، ۱۴۔ کتاب فضائل الصحابہ، ۱۵۔ فضل السواک، ۱۶۔ کتاب فضل العالم العفیف، ۱۷۔ کتاب الفوائد، ۱۸۔ کتاب مختصر الاستیعاب، ۱۹۔ کتاب المستخرج علی البخاری، ۲۰۔ کتاب المعتقد، ۲۱۔ کتاب معرفۃ الصحابہ، ۲۲۔ کتاب معجم الشیوخ: ۳ جلدوں پر مشتمل تھی، ۲۳۔ کتاب معجم الصحابہ: حافظ ابن کثیر کے پاس اس کا ایک نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔

(البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۴۵)

۲۴۔ کتاب علوم الحدیث: حاکم کی اصول حدیث میں مشہور تصنیف کتاب معرفۃ علوم الحدیث پر مستخرج ہے۔

۲۵۔ کتاب المستخرج علی التوحید: علامہ ابن خزیمہ کی مشہور کتاب التوحید والصفات پر مستخرج ہے۔

---

[1] (امام نسائی اور ان کے شاگرد ابن سنی کی بھی اس نام کی کتابیں ہیں۔

[2] (کتاب الفتن والملاحم کے نام سے امام ابوعبداللہ نعیم بن حماد خزاعی کی کتاب بہت مشہور ہے)

Marfat.com

۲۶۔ کتاب المہدی: اس میں امام مہدی کے اوصاف وخصائص اور ان کے خروج کی حقیقت وغیرہ کا ذکر ہے، حافظ ابن قیم کی بھی اس نام کی ایک کتاب ہے۔ (روضات الجنات ص ۷۶ وکشف الظنون ج ۲ ص ۳۰۴)

۲۷۔ کتاب تاریخ اصبہان: اصبہان کی تاریخ میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ ان سب میں زیادہ اہم اور مشہور سمجھی جاتی ہے، اس کے قلمی نسخے مکتبہ شیخ الاسلام مدینہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد مکتبہ سندیہ اور کتب خانہ رام پور میں موجود ہیں، رام پور کا مخطوطہ مکتبہ سندیہ کے مخطوطہ سے منقول ہے۔ (تذکرۃ النوادر ص ۸۳)

یہ غیر مطبوعہ کتابوں کے نام تھے، ذیل میں مطبوعہ کتابوں کا مختصر تعارف اور ان کی خصوصیات درج ہیں۔

۲۸۔ دلائل النبوۃ: اس کتاب میں وہ تمام واقعات وروایات سنداً بیان کی گئی ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے خصائص و کمالات اور فضائل ومکارم نیز دلائل نبوت اور معجزات وغیرہ سے متعلق ہیں، پہلے قرآن مجید کی روشنی میں رسول اکرم ﷺ کے اوصاف وخصوصیات بیان کئے گئے ہیں اور تائید میں روایات بھی پیش کی گئی ہیں، پھر آپ کے حسب ونسب کی فضیلت اور قدیم کتابوں اور انبیا علیہم السلام کے صحیفوں میں آپ کے بارے میں جو پیشینگوئیاں ہیں ان کو ذکر کیا ہے اور اس کے بعد آپ کی ولادت سے وفات تک کے تمام حیرت انگیز واقعات اور معجزات اور آپ کی پیشینگوئیاں اور امور غیب سے متعلق خبروں کا مفصل ذکر ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید اور خود آپ کی پاکیزہ زندگی اور عمدہ سیرت واخلاق تھے، ان دونوں کی حیرت انگیز تاثیر نے بے شمار لوگوں کے قلوب کو مسخر کر کے ان کو حلقہ بگوش اسلام کر دیا تھا، امام ابونعیم نے اس طور پر ایمان لانے والے متعدد افراد کے مکمل واقعات تحریر کئے ہیں، اس حیثیت سے یہ صرف دلائل ومعجزات نبوی ہی کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ عہد نبوی کے مختلف النوع اہم واقعات وحالات اور بعض غزوات وسرایا کا مکمل مرقع بھی ہے، مصنف نے بعض واقعات کی تفصیل اور ان کے دلائل وعلائم کی نوعیت وغیرہ بھی بیان کر دی ہے اور بعض شبہات واشکالات کو بھی رفع کیا ہے، آخر میں بعض مشہور انبیائے کرام اور رسول اللہ ﷺ کے معجزات کا تقابلی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے، اس میں بعض جلیل القدر انبیاء کے خاص اور اہم معجزات کا تذکرہ کرنے کے بعد دکھایا گیا ہے کہ آنحضور ﷺ کو بھی اسی نوعیت کے معجزات عطا کئے گئے تھے۔ گوفنی حیثیت سے اس کی تمام حدیثوں اور روایتوں کا معیار یکساں نہیں ہے، تاہم اس کا شمار معتبر کتابوں میں ہوتا ہے اور اس کے اکثر اہم واقعات حدیث وسیر کی کتابوں میں موجود ہیں۔

دلائل النبوۃ کا پہلا ایڈیشن ۱۳۲۰ھ میں اور دوسرا زیادہ جامع اور مکمل صورت میں ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۵۰ء میں دائرۃ المعارف حیدر آباد سے شائع ہوا ہے، اس کی ترتیب وتصحیح میں بعض قلمی نسخوں کے علاوہ حدیث، سیر وتاریخ اور اسماء الرجال کی مشہور کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔

۲۹۔ حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء: یہ ابونعیم کی سب سے مشہور ومقبول عمدہ اور بے نظیر کتاب ہے، علامہ ابن خلکان نے اس کو بہترین اور صاحب کشف الظنون نے عمدہ اور معتبر کتاب بتایا ہے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ ایسی عمدہ کتاب نہیں لکھی گئی، علامہ ذہبی نے اس کو عدیم النظیر کتاب بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ مصنف کی زندگی ہی میں ان کو پوری شہرت اور غیر معمولی حسن قبول واعتبار حاصل ہو گیا تھا اور یہ اسی زمانہ میں جب نیشاپور پہنچی تو لوگوں نے چار سو دینار میں اسے خریدا، شاہ عبد العزیز

Marfat.com

صاحب لکھتے ہیں کہ اسلامیات میں ایسی نادر اور بے مثال کتاب نہیں لکھی گئی، حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ اس سے مصنف کی وسعت نظر، ان کے شیوخ کی کثرت اور مخارج وطرق حدیث سے پوری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ طبقات صوفیہ میں یہ نہایت اہم عمدہ کتاب ہے، اس سے پہلے جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کو ایسی شہرت وقبولیت نصیب نہیں ہوئی، بعد کی کتابوں میں حافظ ابن جوزی کی صفوۃ الصفوہ گو اہم اور مشہور کتاب ہے لیکن دراصل اس کی بنیاد و ماخذ یہی ہے۔

حلیۃ الاولیاء میں ان صحابہ کرام، تابعین عظام، تبع تابعین اور مابعد کے ائمہ اعلام ومتقین کا ذکر ہے جو زہد ونسک اور معرفت وتصوف میں ممتاز اور صاحب کمال تھے، مصنف نے ان بزرگوں کے فضائل ومناقب خصوصاً ان کے زہد ونسک سے متعلق واقعات وحکایات جمع کر کے ان کا تصوف میں درجہ ومرتبہ بھی دکھایا ہے اور ان سے مروی حدیثیں اور ان کے عارفانہ اقوال وملفوظات بھی درج کئے ہیں، پہلے خلفائے اربعہ اور بقیہ صحابہ مبشرہ اور ان کے بعد دوسرے عارف وزاہد صحابہ کرامؓ کا تذکرہ ہے، پھر اصحاب صفہ اور عابدہ وزاہدہ صحابیات کا علیحدہ علیحدہ ذکر ہے، صحابہ کے بعد تابعین وتبع تابعین وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے، اس میں اولیاء اللہ کے فضائل ومحامد، ان کے اوصاف وکمالات اور تصوف کی حقیقت وغیرہ پر لطیف بحث ہے، اصحاب فن نے اس کے طول اسناد، روایات وحکایات کے تکرار اور موضوع سے غیر متعلق بعض چیزوں کے ذکر کیے جانے پر نقد کیا ہے، (کشف الظنون ج ۱ ص ۴۵۲ و ۴۵۳) اس میں امام ابوحنیفہؒ کا تذکرہ شامل نہ کیے جانے کی وجہ سے ان پر تعصب کا الزام عائد کیا گیا ہے، علاوہ ازیں یہ صحیح، حسن، ضعیف اور بعض موضوع روایتوں پر بھی مشتمل ہے۔

(مستطرفہ ص ۱۱۵)

حلیۃ الاولیاء کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ بعد میں لکھی جانے والی اکثر کتابوں کا یہی ماخذ ہے اور اس کے زوائد ومختصرات بھی لکھے گئے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

١. ابوالحسن نورالدین ہیثمی نے حدیث کی متعدد کتابوں کی طرح اس کے زوائد بھی ایک ضخیم جلد میں جمع کئے تھے۔

(تدریب الراوی ص ۲۹ والمستطرفہ ص ۱۴۱)

٢. ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی جوزی (م ۵۹۷ھ) نے صفوۃ الصفوہ کے نام سے اس کا نہایت عمدہ اختصار اس طرح کیا ہے کہ وہ مستقل کتاب ہوگئی ہے، اس میں انہوں نے ابونعیم پر نقد وتعقب بھی کیا ہے، اس کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، اس کا بھی احاسن المحاسن کے نام سے اختصار کیا گیا تھا۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۴۵۲ و ۴۵۳)

٣. محمد بن حسن شافعی (م ۶۷۷ھ) نے مجمع الاخبار فی مناقب الاخیار کے نام سے اختصار کیا اس میں نہ حلیہ کی طرح زیادہ طوالت ہے اور نہ صفوہ کی طرح زیادہ اختصار، اس کی ترتیب میں حلیہ کا تتبع کیا گیا ہے اور بعض تراجم کا اضافہ بھی ہے۔

ابن مرزوق ابوالمعالی سعد بن علی وراق خطیری (م ۵۲۸ھ) نے بھی مختصرات لکھے تھے۔

(کشف الظنون ج ۲ ص ۳۸۱ و ۴۰۹)

ابونعیم پر بعض اعتراضات:

امام ابونعیم پر بعض اعتراضات بھی کیے گئے ہیں گو یہ زیادہ اہم نہیں ہیں، تاہم ان کا ذکر کیا جاتا ہے، ان پر سب سے اہم

Marfat.com

اعتراض تساہل کا عائد کیا گیا ہے، خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ ''میں ان میں تساہل کی بعض چیزیں پاتا ہوں، جیسے اجازت کے سلسلہ میں ان کا تساہل اور مسموع کو مجاز سے ممیز و واضح نہ کرنا۔ عبدالعزیز نخشی کا بیان ہے کہ ''ابوبکر بن خلاد سے حارث بن ابی اسامہ کی مکمل مسند کا سماع نہ کرنے کے باوجود وہ اس کے تمام حصوں کی روایت کرتے تھے۔'' (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۴ و ۲۹۵ والمنتظم ج ۸ ص ۱۰۰ والبدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۴۵) حافظ ذہبی نے ان بیانات کا جائزہ لے کر ان کی مکمل تردید کی ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۴)

۱۲ ابونعیم پر ان کی معاصر اور بلند پایہ محدث امام ابوعبداللہ بن مندہ نے سخت تنقیدیں کی ہیں لیکن محدثین اور علمائے فن نے ان کو معاصرت پر جو منافرت کی اصلی بنیاد ہے، محمول کر کے ان کو نا قابل اعتنا قرار دیا ہے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

''ان دونوں بزرگوں میں باہم رنجش تھی، اس لیے ابونعیم پر ابن مندہ کی تنقید لائق التفات نہیں ہو سکتی، وہ ان علمائے اعلام اور ثقہ و معتبر لوگوں میں تھے جن پر دلیل و حجت کے بغیر ہی کلام کیا گیا، غالباً ابن مندہ کی تنقید کی وجہ یہ ہے کہ خود ابونعیم نے بھی ان پر تنقید کی ہے۔'' (میزان الاعتدال ج ۱ ص ۶۵۲)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

''گو ابن مندہ کے اعتراضات نہایت سخت ہیں مگر ان دونوں میں کسی کی بات بھی دوسرے کے حق میں قابل قبول نہیں ہو سکتی، دونوں کے اعتبار و وثوق میں کلام نہیں لیکن معاصرین کی ایک دوسرے پر نکتہ چینی قابل اعتنا نہیں ہوتی کیونکہ وہ حسد و عداوت پر مبنی ہوتی ہے، انبیاء و صدیقین کے علاوہ کسی زمانہ کے لوگ بھی اس فتنہ سے محفوظ نہیں رہے۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ۔ (لسان المیزان ج ۱، ص ۲۰۱، ۲۰۲)

خداوندا! تو ایمان والوں کے لیے ہمارے دلوں میں کھوٹ نہ بنائیو، خداوندا: تو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

۱۳ صاحب روضات الجنات نے شیعیت کو بھی ان کی جانب منسوب کیا ہے (روضات ص ۷۶) لیکن اس بیان میں وہ منفرد ہیں، علاوہ ازیں وہ خود بھی اسی مسلک سے وابستہ تھے، اس لیے ان کا بیان صحیح نہیں ہو سکتا، ابونعیم کی کتابوں سے بھی اس کی کوئی تصدیق نہیں ہوتی۔

Marfat.com

ابو محمد حسن خلال رحمۃ اللہ علیہ

(م ۴۳۹ھ)

نام ونسب:

حسن نام، ابو محمد کنیت اور خلال لقب ہے، نسب نامہ یوں ہے: حسن بن محمد بن حسن بن علی۔
(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰۷، والمنتظم ج ۸ ص ۱۳۲ و بستان المحدثین ص ۹۵)

ولادت:

۳۵۲ھ میں پیدا ہوئے۔

وطن:

دارالسلام بغداد کو ان کے مولد ومنشا ہونے کا فخر حاصل ہے، شروع میں ان کا قیام یہاں کے ایک مشہور اور بڑے محلہ نہر القلائین میں تھا لیکن بعد میں باب البصرہ میں منتقل ہو گئے تھے۔ (ایضاً)

اساتذہ:

خلال کے مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:
ابوبکر بن شاذان، ابوبکر قطیعی، ابوبکر وراق، ابوالحسن بن لولو وراق، ابوالحسین بن مظفر ابوسعید حرقی، ابو عبداللہ بن عسکری، ابوعمر بن حیویہ، ابوالفتح قواس، ابوحفص عمر بن محمد زیات، ابوعلی محمد بن احمد عطشی۔

تلامذہ:

بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:
ابوبکر خطیب، ابوالحسین بن طیوری، ابوسعید احمد بن طیوری، جعفر بن احمد سراج، جعفر بن محسن سلماسی، علی بن احمد دینوری اور معمر بن ابی عمامۃ الواعظ وغیرہ۔ (ایضاً)

حفظ وثقاہت:

خلال حدیث کی معرفت، اس کے حفظ وضبط اور عدالت وثقاہت میں ممتاز تھے، خطیب کا بیان ہے کہ ہم نے خلال سے

Marfat.com

روایتیں نقل کی ہیں، وہ ثقہ وضابط اور معرفت حدیث میں ممتاز تھے، ابن جوزی لکھتے ہیں وہ ثقہ اور عادل تھے اور حدیث کے معاملہ میں واقف کار اور بیدار مغز تھے، محمد بن علی صوری سے مروی ہے کہ میری آنکھوں نے عبدالغنی بن سعید کے بعد ابومحمد خلال بغدادی سے بڑھ کر حدیثوں کا حافظ نہیں دیکھا، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ:

''درحفظ حدیث سرآمد ابنائے روزگار بود۔''

وہ اپنے زمانہ کے لوگوں میں حفظ حدیث کے لحاظ سے نہایت فائق و برتر تھے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰۷ والمنتظم ج ۸ ص ۱۳۲ اور بستان المحدثین ص ۹۵)

وفات:

۸۷/سال کی عمر میں جمادی الاولیٰ ۴۳۹ھ میں خلال کی وفات ہوئی اور باب حرب کے مقبرہ میں دفن کیے گئے۔

(ایضاً)

تصنیفات:

۱۔خلال کی تصنیفات میں ان کی مسند زیادہ مشہور ہے، یہ دراصل صحیحین پر متخرج ہے۔ (الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۷)

حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

خرج المسند علی الصحیحین و جمع ابوابا و تراجم کثیرۃ۔

(العبر ج ۳ ص ۱۸۹)

خلال نے صحیحین پر متخرج لکھی اور بیشمار ابواب وتراجم جمع کیے۔

(بستان المحدثین ص ۹۵)

۲۔کرامت اولیاء: شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے خلال کی تصنیفات میں اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ (بستان المحدثین ص ۹۵)

Marfat.com

امام ابوعبداللہ قضاعی

(المتوفی ۴۵۴ھ)

نام ونسب:

محمد نام، ابوعبداللہ کنیت، شہاب الدین لقب اور نسب نامہ یہ ہے: محمد بن سلامہ بن جعفر بن علی بن حکمون بن ابراہیم بن محمد بن مسلم۔ (طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۳)

وطن وخاندان:

قبیلہ بنوقضاعہ سے جومعد بن عدنان یا حمیر کی شاخ ہے خاندانی تعلق اور مصر وطن تھا، خاندان کی نسبت سے قضاعی کہلاتے تھے، سمعانی کا بیان ہے کہ اس نسبت سے بے شمار لوگ مشہور ہیں، متاخرین میں امام ابوعبداللہ قضاعی کا نام قابل ذکر ہے۔
(ایضاً وکتاب انساب ورق ۴۵۷)

اساتذہ وشیوخ:

امام قضاعی کے چند اساتذہ کے نام یہ ہیں:
ابوالحسن بن جہضم، ابوعبداللہ تمیمی، ابومحمد بن نحاس، احمد بن بربال، احمد بن عمر جیری، ابومسلم محمد بن احمد کاتب۔ (ایضاً)

تلامذہ:

ان سے استفادہ کرنے والوں میں ابوبکر خطیب، ابونصر بن ماکولا اور حمیدی صاحب الجمع بین الصحیحین جیسے مشاہیر ارباب کمال کے علاوہ ابوعبداللہ رازی، سہیل بن بشر اسفراینی، ابوسعد عبدالجلیل نیشاپوری اور محمد بن برکات سعید وغیرہ شامل ہیں، سمعانی کہتے ہیں، ابوبکر محمد بن عبدالباقی انصاری نے امام قضاعی سے اجازۃً روایت کی ہے۔ (ایضاً وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۳)

رحلت وسفر:

طلب علم کے لیے ان کے سفر کا حال معلوم نہیں ہوسکا لیکن وہ مصریوں کے سفیر کی حیثیت سے روم تشریف لے گئے تھے، ابن سبکی لکھتے ہیں کہ یہ عجیب لطف کی بات ہے کہ اس سفر میں ان کی قسطنطنیہ میں ایک شیخ سے ملاقات ہوئی، ان سے انہوں نے سماع وروایت کی۔ (طبقات سبکی وابن خلکان ج ۲ ص ۲۴۳)

Marfat.com

حدیث:

علمائے سیر نے لکھا ہے کہ وہ صاحب کمال محدث تھے، سلفی کا بیان ہے کہ وہ ثقات واثبات میں تھے۔ (ایضا)

فقہ:

فقہ میں زیادہ دستگاہ رکھتے تھے، ان کا فقہائے شافعیہ میں شمار ہوتا ہے، فقہ میں کمال کی بنا پر وہ عہدہ قضا پر فائز تھے۔

تاریخ وتراجم:

حدیث وفقہ کی طرح تاریخ وطبقات اور رجال پر بھی اچھی نظر تھی، ان فنون میں ان سے بعض کتابیں یادگار ہیں۔

فضل وکمال:

ابن ماکولا کا یہ بیان تمام ارباب سیر نے ذکر کیا ہے کہ وہ متعدد علوم میں جامع تھے، میں نے مصر میں ان کے پایہ کا کوئی شخص نہیں دیکھا۔ (ایضا)

عہدہ قضا:

اپنے فضل وکمال کی وجہ سے وہ مصر کے قاضی مقرر کئے گئے اور پھر ترقی کر کے قاضی القضاۃ ہوگئے۔

امامت ومقبولیت:

علمائے انساب وطبقات نے ان کو امام لکھا ہے اور ابن سبکی نے مرضی الجملہ کہا ہے، اس سے ان کی مقبولیت ومحبوبیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ (ایضا)

مسلک:

اوپر گزر چکا ہے کہ وہ فقہائے شافعیہ میں تھے، ابن سبکی نے اسی حیثیت سے طبقات میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

وفات:

انہوں نے ۴۵۴ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا، ابن خلکان نے ۱۶/ ذوالقعدہ اور سیوطی نے ۱۷/ ذوالقعدہ تاریخ وفات لکھی ہے، مگر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ذی الحجہ کا مہینہ بتایا ہے، وفات مصر میں جمعرات کو ہوئی اور جمعہ کے دن عصر کے بعد مصلیٰ نجار میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ (ابن خلکان ج ۲ ص ۲۴۴ و حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۶۹ وبستان المحدثین ص ۸۴)

تصنیفات:

امام قضاعی کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں:

شہاب الاخبار: اس کا پورا نام شہاب الاخبار فی الحکم والامثال والآداب من الاحادیث النبویہ ہے، یہ کتاب مسند قضاعی اور الشہاب المواعظ والاداب کے نام سے بھی موسوم ہے، اس میں حکم وامثال، وصایا وآداب اور مواعظ وغیرہ سے متعلق ایک

Marfat.com

ہزار چھوٹی چھوٹی حدیثیں بلاسند نقل کی گئی ہیں اور خاتمہ میں ادعیہ کے متعلق دوسو کلمات حدیث درج کئے گئے ہیں، یہ کتاب دس جزوں پر مشتمل اور کلماتِ حدیث پر مرتب کی گئی تھی لیکن حروف میں ترتیب کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے، اس عمدہ اور لطیف کتاب کی کئی شرحیں اور خلاصے لکھے گئے ہیں اور بعض علما نے تو بعینہ اسی طرز پر اپنی کتابیں مرتب کی ہیں، ان کتابوں میں فردوس الاخبار دیلمی، مشارق الانوار صغانی اور جامع صغیر سیوطی بہت مشہور ہیں، شرحوں اور مختصرات کے نام یہ ہیں:

۱ شیخ نجم الدین الغیطی محمد بن احمد بن اسکندری (م ۹۸۴ھ) نے شہاب کا خلاصہ کیا۔

۲ ابن اثیر نے ضوء الشہاب کے نام سے مختصر لکھا۔

۳ امام حسن بن محمد صغانی (م ۶۵۰ھ) نے مشارق کی طرح کشف الحجاب عن احادیث الشہاب کے نام سے بھی اس کی عمدہ ترتیب کی۔

۴ امام سیوطی نے جامع صغیر کی ترتیب پر ایک اور کتاب اسعاف الطلاب بترتیب الشہاب کے نام سے لکھی جو اس کا خلاصہ تھی۔

۵ ابوالمظفر محمد بن اسعد معروف بابن حکیم حنفی (م ۵۶۷ھ) نے شہاب کی شرح کی۔

۶ شیخ عبدالرؤف مناوی نے ایک ممزوج شرح لکھی، اس کا نام رفع النقاب عن کتاب الشہاب ہے، امینی نے امعان الطلاب بشرح ترتیب الشہاب نام بتایا ہے لیکن بعض فہرستوں میں اسعاف الطلاب بترتیب الشہاب بھی نام درج ہے۔

۷ وحشی محمد بن حسین موصلی کی شرح کا ابراہیم بن عبدالرحمٰن وادیاسی (۵۷۰ھ) نے خلاصہ کیا۔

۸ اُستاد ابوالقاسم بن ابراہیم وراق عالی نے بھی ایک شرح لکھی۔

۹ ایک شرح کا نام حل الشہاب ہے۔

۱۰ صاحب کشف الظنون نے ایک اور شرح کا بھی ذکر کیا ہے مگر اس کا اور شارح کا نام نہیں لکھا ہے۔

(کشف الظنون ج ۲ ص ۲۷ و الرسالۃ المستطرفہ ص ۶۴)

۱ شہاب کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں ہے۔ (فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۶۷)

۲ خطط مصر: اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، پہلی کتاب ابو عمر محمد بن یوسف کندی کی اور دوسری قضاعی کی بتائی جاتی ہے۔

۳ دستور الحکم۔

۴ مختصر التاریخ: یہ تراجم القضاعی کے نام سے بھی مشہور اور پانچ جزوں پر مشتمل ہے اس میں مصنف نے ابتدا سے اپنے دور تک کے حالات اختصار کے ساتھ تحریر کیے ہیں۔

۵ کتاب الانباء عن الانبیاء و تواریخ الخلفاء: نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں انبیاء و خلفا کے حالات و واقعات درج ہوں گے۔

۶ کتاب مناقب الشافعی و اخبارہ۔

۷ معجم الشیوخ۔

Marfat.com

امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی

(متوفی ۴۵۸ھ)

نام ونسب:

احمد نام، ابو بکر کنیت، نسب نامہ یہ ہے: احمد بن حسین بن علی بن عبداللہ بن موسیٰ۔

(تاریخ ابن خلکان ج ا ص ۳۵ وکتاب الانساب ورق ۱۰۱)

ولادت ووطن:

امام ابو بکر بیہقی شعبان المعظم ۳۸۴ھ میں بیہق میں پیدا ہوئے، بیہق خراسان کے مشہور مردم خیز شہر نیشاپور کے مضافات میں اس سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، (ایضاً) یاقوت کا بیان ہے کہ یہ بڑا زرخیز، نہایت آباد اور وسیع مقام اور تقریباً تین سو اکیس گاؤں پر مشتمل ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ بیہق چند گاؤں کا نام ہے، جو باہم متصل اور نیشاپور سے تیس کوس کے فاصلہ پر واقع ہیں، یہ اسی طرح ہے جس طرح نواح دہلی میں بارہ وہریانہ ہیں، ان دیہاتوں میں سب سے بڑا گاؤں خسروجرد ہے۔

(بستان المحدثین ص ۵۱)

خسروجرد کو سب سے بڑا گاؤں ہونے کی وجہ سے مرکزیت حاصل تھی، امام بیہقی کے زمانہ تک اس کی مرکزیت قائم رہی لیکن بعد میں سبزہ وار مرکزی مقام بن گیا تھا۔ (کتاب الانساب ورق ۱۹۹ ومعجم البلدان ج ۲ ص ۳۴۶ وج ۳ ص ۴۳۷)

ظہیر الدین بیہقی کا بیان ہے کہ اگر چہ امام بیہقی کے اسلاف کا تعلق شامکان اور نوبہار سے تھا لیکن ان کی ولادت اور نشو ونما بیہق میں ہوئی۔ (تاریخ بیہق مطبوعہ حیدر آباد ص ۳۱۸)

امام ابو بکر ان مقامات کی نسبت سے بیہقی، خسروجردی اور نیشاپوری کہلاتے ہیں لیکن ان کی مشہور نسبت بیہقی ہے۔

اساتذہ وشیوخ:

امام بیہقی کے شیوخ کی تعداد سو سے متجاوز تھی، ان میں چند مشہور کے نام یہ ہیں:

ابن یعقوب ایادی، ابو بکر بن فورک، ابوزکریا مزکی، ابوعبداللہ بن لطیف، ابوعبدالرحمٰن سلمی، ابوعلی روذباری، ابوالحسن بن بشران، جناح بن تدیر محاربی، حسن بن احمد بن فراس، عبداللہ ابن یوسف نامویہ، ابوالحسن محمد بن حسین علوی، ابوعبداللہ محمد بن عبد اللہ حاکم، ابوطاہر محمد بن زیادی، ہلال بن محمد حفار۔

Marfat.com

فقہ کی تعلیم و تحصیل مشہور فقیہ ابوسہل صعلوکی اور ابوالفتح ناصر بن محمد عمری مروزی سے کی تھی۔

بیہقی کو اپنے اساتذہ میں ابوالحسن محمد بن حسین علوی اور ابوعبداللہ حاکم سے زیادہ استفادہ کا موقع ملا، خصوصاً حاکم کے جلیل القدر تلامذہ میں شمار کئے جاتے ہیں اور عرصہ دراز تک ان کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۸ و ۳۲۹ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۳ وتاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۵)

تلامذہ:

امام بیہقی سے بیشمار لوگوں نے روایت اور تحصیل علم کی ہے، بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

اسماعیل بن احمد (امام بیہقی کے فرزند) حسین بن احمد بن علی ابوالقاسم زاہر بن طاہر سحامی، عبدالجبار بن عبدالوہاب دھان، عبدالجبار بن محمد خواری، عبدالحمید بن محمد خواری، ابوالحسن عبداللہ بن محمد بن احمد (امام بیہقی کے پوتے) عبدالمنعم قیشری، ابوعبداللہ محمد فراوی، ابوالمعالی محمد بن اسماعیل فارسی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳۳۰)

شیخ الاسلام ابواسماعیل انصاری کو بھی امام بیہقی سے اجازت حاصل تھی اور علامہ سمعانی لکھتے ہیں:

ادرکت عشرة نفر من اصحابه الذين حدثونی عنه۔ (کتاب الانساب ورق)

میری امام بیہقی کے دس تلامذہ سے ملاقات تھی، انہوں نے مجھ سے ان کے واسطہ سے حدیثیں بیان کی ہیں۔

طلب حدیث کے لیے سفر:

امام بیہقی بچپن ہی سے حدیث کے مبارک علم کی تحصیل و تکمیل اور اس کی جمع و تحریر میں مشغول ہو گئے تھے اور انہوں نے اس کے لیے متعدد مقامات اور علمی مرکزوں کا سفر بھی کیا تھا، پہلے بیہق سے نیشاپور تشریف لے گئے، خراسان کے اکابر علما و محدثین سے استفادہ کرنے کے بعد انہوں نے عراق، جبال اور حجاز کے مختلف اہم شہروں بغداد، مکہ اور کوفہ وغیرہ کا سفر کیا۔

(تبیین کذب المفتری ص ۲۶۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۹

حفظ و ثقاہت:

امام بیہقی کے حفظ و ضبط اور ثقاہت و اتقان پر ائمہ فن اور محدثین کا اتفاق ہے، ابوالحسن عبدالغافر فارسی کا بیان ہے کہ "وہ اپنے زمانہ میں حفظ میں یکتا اور اپنے تمام معاصرین میں ضبط و اتقان کے اعتبار سے یگانہ تھے، حافظ ذہبی نے ان کو حافظہ میں قوی بتایا ہے، ابن ناصر الدین فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ اور قابل اعتماد تھے، اہل سیر اور ارباب تذکرہ نے ان کو الحافظ الکبیر المشہور کے لقب سے موسوم کیا ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۹ وشذرات الذہب ج ۳ ص ۳۰۴)

حدیث میں درجہ و مرتبہ:

حفظ و ضبط کی طرح معرفت حدیث میں بھی عدیم المثال تھے اور احادیث کے علل و اسقام کی تمیز میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے جمع و تطبیق حدیث ان کی امتیازی خصوصیت تھی، حدیث اور اس کے متعلقات میں اس درجہ عبور ہونے کی بنا پر ان کا شمار نامور محدثین اور اکابر فن میں ہوتا ہے، علامہ ابن عساکر نے ان کو شیخ السنہ (تبیین کذب المفتری ص ۲۶۶) اور ابن عماد نے شیخ

Marfat.com

خراسان (شذرات الذہب ج ۳ ص ۳۰۵) لکھا ہے، ظہیر الدین بیہقی لکھتے ہیں کہ فن حدیث میں ان کا کوئی ہمسر اور ثانی نہ تھا، ان کے زمانہ میں خراسان کے اندر کسی کو ان کی مرضی و سند کے بغیر کوئی حدیث بیان کرنے یا اس میں کسی قسم کا تصرف کرنے کی مجال نہ تھی۔

وہ ایک روز اپنے استاذ حاکم کی مجلس میں جہاں متعدد علما و اصحاب فضل و کمال موجود تھے، حاضر ہوئے، حاکم نے ایک حدیث بیان کرتے ہوئے اس کے کسی راوی کا نام ترک کر دیا، امام بیہقی نے فوراً اعتراض کیا، حاکم کو غصہ آ گیا لیکن جب اصل سے مقابلہ کیا گیا تو بیہقی کی بات درست نکلی۔ (تاریخ بیہقی ص ۱۱۷)

گو حدیث کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی ان کو دستگاہ حاصل تھی، تاہم اس فن میں ان کو زیادہ نمایاں مقام اور بلند درجہ حاصل تھا، اسی لیے ان کی شہرت اسی کی نسبت سے ہے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں:

غلب علیہ علم الحدیث واشتھر بہ۔ (ابن خلکان ج ۱ ص ۳۵)

ان پر علم خاص طور سے غالب تھا اور اس میں ان کو نہایت نمایاں شہرت حاصل ہوئی۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ نہ تو امام بیہقی کے شیوخ کی تعداد اور محدثین کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھی اور نہ حدیث کی کئی اہم اور بلند پایہ کتابیں ہی ان کی نظر سے گزری تھیں لیکن اس کے باوجود وہ اس فن میں یگانہ روزگار اور یکتائے زمانہ تھے اور ان سے بے شمار حدیثیں مروی ہیں، نیز اس فن میں ان سے متعدد بے نظیر کتابیں بھی یادگار ہیں۔ (کتاب الانساب ورق ۱۰۱) علامہ سمعانی فرماتے ہیں کہ ان کے پاس احادیث کا بڑا وسیع ذخیرہ تھا اور انہوں نے متعدد بے مثال تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں، علامہ یافعی تحریر کرتے ہیں کہ: ''بعض لوگوں کا بیان ہے کہ ان کے شیوخ کی تعداد تقریباً ایک سو ہے اور یہ تعداد درحقیقت بیہقی کے علوم و کمالات کے اعتبار سے زیادہ نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے کاموں میں خاص برکت عطا کی تھی، گو ان کو متعدد کتب حدیث کے سماع کا شرف حاصل تھا تاہم بعض کتابوں کے استفادہ سے وہ محروم بھی رہ گئے تھے، چنانچہ مسند امام احمد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ اور جامع ترمذی وغیرہ کتابیں ان کے پاس نہیں تھیں۔'' (مرآۃ الجنان ج ۳ ص ۸۲ وطبقات الشافعیۃ ج ۳ ص ۴)

علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ ''علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ بیہقی کا دائرہ علم حدیث میں زیادہ وسیع نہیں تھا تاہم خدا نے ان کے مرویات میں بڑی برکت عطا کی تھی اور وہ حدیث کے ابواب و رجال کے بارے میں پوری مہارت اور مکمل واقفیت رکھتے تھے،

شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی فرماتے ہیں:

باوجود اس تبحر اور علوے اسناد کے امام بیہقی کے پاس سنن نسائی، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ نہیں تھیں، اس لیے ان تینوں پر جیسی اطلاع ہونی چاہیے تھی ان کو نہیں تھی، مگر حق تعالیٰ نے ان کے علم میں غیر معمولی برکت اور فہم میں نہایت بصیرت عطا کی تھی، ان کی یادگار ایسی عجیب تصنیفات ہیں جو ان سے پہلے کے لوگ بھی نہیں لکھ سکے تھے۔ (بستان المحدثین ص ۵۱)

فقہ:

امام بیہقی کو فقہ و اصول میں بھی پورا درک حاصل تھا، فقیہ جلیل اور اصولی ان کے نام کا جزو بن گیا تھا، ان کی تصنیفات حدیث میں گوناگوں فقہی معلومات و مسائل موجود ہیں اسی لیے ان کو علم حدیث و فقہ کا جامع کہا جاتا ہے، حافظ ابن عساکر لکھتے ہیں:

Marfat.com

انہوں نے اپنی کتابوں میں علم حدیث وفقہ دونوں کے مسائل و معلومات جمع کئے ہیں اسی کے ساتھ علل حدیث، صحیح وسقیم روایتوں کی نشاندہی، احادیث کے درمیان جمع وتطبیق کے وجوہ اور فقہ واصول وغیرہ مختلف النوع مباحث بیان کئے ہیں۔

(تبیین کذب المفتری ص ۲۶۶)

عربیت وشعر وسخن:

ان کو عربیت اور شعر وسخن کا اچھا ذوق تھا، ان کی تصنیفات سے ان کے حسن ذوق کا اندازہ ہوتا ہے اور ان سے منقول بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

من عز بالمولی فذاک جلیل ومن رام عز سواہ ذلیل

جس شخص کو خدا نے عزت دی وہ بزرگ ہے اور جس نے خدا کے سوا کسی دوسرے سے عزت طلب کی وہ ذلیل ہے۔

ولو ان نفسی مذ برأہا ملیکہا مضی عمرہا فی سجدۃ لقلیل

اگر میرا نفس اس وقت سے لے کر جب سے کہ خدا نے اسے پیدا کیا ہے، عمر بھر خدا کی عبادت کرتا ہے تو بھی یہ بہت کم ہے۔

احب مناجاۃ الحبیب باوجہ ولکن لسان المذنبین کلیل

(بستان المحدثین ص ۲۵۱)

میں عمدہ طور سے اپنے حبیب کی مناجات پسند کرتا ہوں لیکن گنہگار کی زبان گونگی ہے۔

گو حدیث، فقہ، اصول فقہ اور عربیت وغیرہ میں امام صاحب کو امتیازی شہرت حاصل تھی تاہم دوسرے علوم وفنون میں بھی وہ عاجز نہ تھے، علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں "وہ علوم وفنون میں اپنے زمانہ میں اپنے معاصرین میں یکتا اور بے نظیر تھے۔

(تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۵)

تحقیق وانصاف پسندی:

امام بیہقی کی ایک خصوصیت حقیقت بینی اور انصاف پسندی بھی ہے، مورخین واصحاب سیر نے علمی وفنی مباحث میں امام صاحب کی غیر معمولی تحقیق وتدقیق اور انصاف پسندی کا ذکر کیا ہے۔ صاحب تاریخ بیہق کا بیان ہے۔

وتحقیقات در علوم بسیار دارد و در مباحثہ ومناظرہ علوم غایت انصاف مرعی میداشت۔ (تاریخ بیہقی واتحاف النبلاء ص ۱۹۰)

علوم میں بڑی تحقیق سے کام لیتے تھے اور مباحثہ ومناظرہ میں انصاف کو پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے۔

امامت ومرجعیت:

امام بیہقی کے گوناگوں کمالات نے ان کی ذات کو مسلمانوں کا امام ومقتدیٰ اور اصحاب علم وفن کا مرجع بنادیا تھا، تمام ارباب سیر وتذکرہ نے ان کی امامت فن کا اعتراف کیا ہے، امام صاحب کی مرجعیت ومقبولیت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب وہ علوم کی تحصیل سے فارغ ہوکر اپنے وطن بیہق میں درس وافادہ اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہوئے تو بڑے بڑے ائمہ فن اور نامور اصحاب کمال نے ان سے نیشاپور تشریف لانے کی فرمائش کی تاکہ اس مرکزی مقام میں لوگوں کو ان سے استفادہ میں سہولت اور ان کی کتابوں کے سماع کا زیادہ موقع ملے، لوگوں کی اس طلب وخواہش کو دیکھ کر آپ ناحیہ سے ۴۴۱ھ میں نیشاپور پہنچے، وہاں

Marfat.com

کے شائقین نے امام صاحب کا شایانِ شان استقبال کیا اور جب مجلس درس آراستہ کی گئی تو اس میں جہابذۂ فن اور نامور اصحاب کمال شریک ہو کر آپ کی کتابوں کا سماع کرتے اور آپ سے استفادہ کرتے تھے اور آپ کے لیے دعائے خیر و برکت کرتے تھے، یہ تمام لوگ آپ کے ذوقِ علم اور کثرتِ استحضار کے معترف تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۳ و تبیین کذب المفتری ص ۲۶۶)

اعترافِ کمالات:

امام بیہقی کے اوصاف و کمالات کا ان کے معاصرین، ارباب کمال اور مؤرخین و اصحاب سیر نے اعتراف کیا، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ "امام بیہقی مسلمانوں کے ائمہ ہداۃ اور دین متین کے داعیوں میں تھے، وہ علم و فضل کا پہاڑ اور اپنے پورے دور میں عدیم المثال، یکتائے روزگار، میدان علم کے شہ سوار، حاذق الفن محدث، سرعت فہم، جودت طبع اور ذہن کی دراکی میں بے نظیر تھے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ اپنے زمانہ میں یکتا اور اپنے معاصرین میں بے مثال تھے، ظہیر الدین بیہقی کا بیان ہے کہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جن سات آدمیوں کی تصنیفات اسلامی کتابوں کا بہترین ذخیرہ خیال کی جاتی ہیں ان میں ایک امام بیہقی بھی ہیں اور ان سے مسلمانوں کو بڑا فیض پہنچا ہے اور امام حاکم کے اجل تلامذہ میں ہونے کے باوجود بعض حیثیتوں سے ان سے فائق و برتر سمجھے جاتے تھے، ابن خلکان ذہبی اور ابن عساکر کا بیان ہے کہ "گو وہ امام ابوعبداللہ حاکم کے تلامذہ میں تھے، تاہم متعدد علوم و فنون میں یکتا ہونے کی بنا پر ان سے بڑھ کر تھے" امام سیوطی فرماتے ہیں کہ محدثین کا اتفاق ہے کہ حاکم کے شاگرد امام بیہقی حدیث کی طلب میں ان سے فائق تھے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۳ و تبیین کذب المفتری ص ۲۶۶ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۵۳ و طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۴ و تدریب الراوی ص ۳۱)

فقہی مذہب:

امام بیہقی شافعی المذہب تھے، ان کو اس مذہب سے غیر معمولی شغف تھا، اس کی نشر و اشاعت اور تہذیب و تنقیح میں انہوں نے اہم اور نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں، اس مذہب کو ان کی ذات سے بڑا فائدہ پہنچا، ابن سبکی کا بیان ہے کہ کوئی شافعی المذہب ان کی تصنیفات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، امام الحرمین ابوالمعالی جوینی سے منقول ہے کہ "امام بیہقی کے علاوہ کوئی ایسا شافعی المذہب نہیں ہے جس پر امام شافعی کے احسانات نہ ہوں لیکن امام بیہقی کا خود امام شافعی پر احسان ہے کیونکہ ان کی تصنیفات سے ان کے مذہب و مسلک کی بڑی تائید و اشاعت ہوئی ہے، وہ تمام شوافع میں اس مذہب کے اصول و فروع کی حمایت میں نہایت پیش پیش رہے اور اس کی تفریع و تخریج اور اس کے مختصر مجمل کی توضیح و تشریح کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔

ابن خلکان اور ذہبی نے لکھا ہے کہ وہ امام شافعیؒ کے نصوص جمع کرنے والے پہلے شخص ہیں"، لیکن علامہ ابن سبکی اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں "یہ خلاف واقعہ ہے، درحقیقت جامعین نصوص میں وہ بالکل آخری شخص ہیں، انہوں نے متقدمین کے تمام مباحث اور ان کی کتابوں کے اکثر امور و مسائل کا استیعاب کر لیا ہے، ان کے بعد کسی اور شخص کے بارے میں مجھ کو نہیں معلوم کہ اس نے امام شافعی کے نصوص جمع کیے ہوں کیونکہ امام بیہقی اس کو اس قدر جامع اور مکمل طور پر مرتب کر چکے تھے کہ بعد والوں کے لیے مزید کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔" (طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۴ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۵)

Marfat.com

کلامی مذہب:

امام صاحب اشعری المذہب اور اہل سنت والجماعت میں تھے، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ انہوں نے اشعری مذہب کے مطابق علم کلام پڑھا اور حافظ ابن عساکر نے تبیین کذب المفتری میں ان کا اشاعرہ کے تیسرے طبقہ میں ذکر کیا ہے، بعض اکابر محدثین کی طرح ان کی جانب بھی شیعیت کی نسبت کی گئی ہے لیکن یہ سراسر غلط الزام ہے۔

زہد وورع:

امام بیہقی زہد وورع میں بھی ممتاز تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کو دیندار، صاحب ورع، زاہد، قانت اور عفیف وغیرہ لکھا ہے، حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے، ان کے متعلق یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وفات سے ۳۰/سال پہلے سے انہوں نے مسلسل روزے رکھنا شروع کردیئے تھے۔ (شذرات الذہب ج ۳ ص ۳۰۵)

عادات واخلاق:

اصحاب سیر تذکرہ کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے عادات وخصائل نہایت پاکیزہ تھے، عفت وقناعت ان کی سیرت کا اہم جوہر تھی، زہد وورع اور شمائل واخلاق میں وہ سلف صالحین اور علمائے ربانیین کے اوصاف کے حامل تھے، علامہ ابن عبدالغافر کا یہ بیان تمام کتابوں میں ملتا ہے۔

کان البیہقی علی سیرۃ العلماقانعامن الدنیا بالیسیر متحملافی زہدہ وورعہ وبقی کذالک الی ان توفی۔

(تبیین کذب المفتری ص ۲۶۷)

امام بیہقی علمائے سلف کی طرح معمولی اور تھوڑی چیز پر قانع اور زہد وورع میں ممتاز تھے، وفات تک ان کا یہی حال تھا۔

وفات:

امام بیہقی نے ۷۴/سال کی عمر میں شنبہ ۱۰/جمادی الاولیٰ ۴۵۸ھ کو نیشاپور میں انتقال کیا، ان کی نعش مبارک وہاں سے بیہق لائی گئی اور یہیں سپرد خاک کئے گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

(ابن خلکان ج ۱ ص ۳۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۰ و المنتظم ج ۸ ص ۲۸۲)

اولاد:

ان کی اولاد میں ابو علی اسماعیل اور محمد کا ذکر ملتا ہے، اول الذکر صاحب کمال محدث اور عہدۂ قضا پر فائز تھے، امام صاحب کے تلامذہ کے ضمن میں ان کا نام گزرا ہے، دوسرے صاحبزادے محمد کے بیٹے ابوالحسن عبداللہ بھی جلیل القدر محدث تھے، ان کو اپنے دادا سے روایت وسماع کا فخر حاصل تھا۔ (طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۳ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۳)

تصنیفات:

امام بیہقی مایہ ناز مصنف تھے، ان کے فضل وکمال کا سب سے بڑا ثبوت ان کی تصنیفات ہیں جو ایک ہزار جزو کے بقدر

Marfat.com

ہوں گی، ان کے علمی کاموں میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت دی تھی، اس لیے ان کی تصنیفات کی تعداد زیادہ ہے اور وہ کیفیت کے اعتبار سے بھی بہت اہم ہیں، مورخین اور اصحاب سیر کا بیان ہے کہ ان کی تمام تصنیفات نہایت جامع، پُرمغز، مفید، بے نظیر اور عدیم المثال ہیں، امام بیہقی کا شماران علمائے اسلام میں ہوتا ہے جن کی کتابوں سے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچا ہے، کتب صحاح کی شہرت وعلوئے منزلت کے بعد جن محدثین کی تصنیفات کو عالم اسلام میں بقائے دوام حاصل ہوا اور جن کی علمی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، ان میں امام الحدیث وشیخ السنۃ ابوبکر بیہقی بھی ہیں، ان کا شماران ائمہ وحفاظ سبعہ میں ہوتا ہے جن کے متعلق ابن صلاح کا بیان ہے کہ انہوں نے عمدہ اور مفید کتابیں تصنیف کیں۔'' (ایضاً)

بالخصوص شافعی مذہب کو ان سے زیادہ کسی اور مصنف کی تصنیفات سے فائدہ نہیں ہوا، اس مذہب کی تائید وحمایت، اس کی تفریع وتخریج نیز ضبط وتحقیق اور شرح وبسط ان کا خاص اور اہم کارنامہ ہے، اوپر گزر چکا ہے کہ کوئی شافعی المذہب نہ ان کے احسانات سے سبکدوش ہو سکتا ہے اور نہ ان کی کتابوں سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔

علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ ''امام بیہقی کی امانت، تدین فضل وکمال اور ضبط واتقان کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کی کتابوں سے چہار جانب کے لوگوں کو نفع بخشا، حافظ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں ان کی کتابوں کو مختلف شہروں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، وہ اپنے زمانہ کے لوگوں میں تصنیف وتالیف میں یکتا تھے، ان کی چھوٹی بڑی تمام کتابیں بے نظیر اور مفید ہیں، علامہ ابن سبکی کہتے ہیں کہ ان کی تمام تصنیفات بیش قیمت بلند پایہ اور ترتیب وتالیف میں عمدہ ہیں، متقدمین کی کتابیں بھی اس درجہ کی نہیں ہیں۔

ذیل میں ان کی تصنیفات کے نام اور بعض کے متعلق مختصر معلومات درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ کتاب البعث والنشور (ایک جلد)، ۲۔ بیان خطاء من اخطاء علی الشافعی، ۳۔ ترغیب الصلاۃ، ۴۔ کتاب الترغیب والترتیب (ایک جلد)، ۵۔ جامع ابواب وجوہ قراءۃ قرآن، ۶۔ کتاب الرؤیۃ، ۷۔ کتاب فضائل الاوقات، ۸۔ فضائل الصحابہ یا المصنف فی فضائل الصحابہ، ۹۔ کتاب القدر، ۱۰۔ کتاب مناقب احمد، ۱۱۔ کتاب مناقب الشافعی، (رسالہ معارف ج ۱۸، ص ۳۴۳) ۱۲۔ کتاب المعارف، ۱۳۔ کتاب ینابیع الاصول، ۱۴۔ کتاب اثبات عذاب القبر، اس کا قلمی نسخہ مدینہ کے کتب خانہ شیخ الاسلام میں ہے۔

۱۵۔ کتاب الاسرار: ذہبی نے اس کا نام کتاب الاساری اور صاحب کشف الظنون نے کتاب الاسرار لکھا ہے۔

۱۶۔ کتاب المعرفۃ: معرفۃ العلوم، معرفۃ الحدیث اور معرفۃ علوم الاحادیث بھی اس کے نام تحریر کیے گئے ہیں، غالباً اس میں علم حدیث کے مصطلحات بیان کیے گئے ہیں۔

۱۷۔ کتاب الآداب: ایک جلد، مکارم اخلاق، بروصلہ اور آداب وغیرہ سے متعلق احادیث پر مشتمل ہے۔
(العبر ج ۳ ص ۲۴۲، البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۹۴ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۴)

۱۸ و ۱۹۔ کتاب الدعوات الصغیر وکتاب الدعوات الکبیر: دونوں امام بیہقی کی اہم اور عمدہ کتابیں ہیں۔
(کشف ج ۲ ص ۷۶۰ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۴)

۲۰۔ کتاب الاربعین: یہ اخلاق سے متعلق ۱۰۰ احادیث کا مجموعہ اور چالیس ابواب پر مرتب کی گئی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب نے اربعین صغریٰ واربعین کبریٰ کے نام سے دونوں کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ (کشف ج ۱ ص ۷۷ وبستان المحدثین ص ۵۱)

Marfat.com

۲۱۔ کتاب احکام القرآن: احکام القرآن کے نام سے کئی کتابیں لکھی گئی ہیں سب سے پہلی کتاب امام شافعی کی بتائی جاتی ہے، بیہقی نے اس میں ان کے اقوال کی تلفیق کی ہے، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ شیخ الاسلام مدینہ میں ہے۔

(کشف ج ا ص ۵۶ و معارف ج ۱۸ ص ۲۳۱)

۲۲۔ کتاب الخلافیات: دو جلدوں میں ہے، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں کہ ایسی فاضلانہ کتاب وہی لکھ سکتا ہے جو فقہ وحدیث دونوں میں جامع اور نصوص کا ماہر ہو۔ صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ اس میں ان مسائل کا ذکر ہے جو امام اعظم اور امام شافعی کے درمیان مختلف فیہ ہیں۔ (کشف الظنون ج ا ص ۳۷۴ و طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۴)

۲۳۔ نصوص الشافعی: یہ دس جلدوں میں ہے، (ابن خلکان ج ا ص ۴۹۵) لیکن حافظ ذہبی نے تین جلدیں بتائی ہیں، ابن خلکان اور ذہبی کا خیال ہے کہ امام شافعی کے نصوص جمع کرنے میں اولیت کا شرف بیہقی کو حاصل ہے لیکن ابن سبکی نے اس کی تردید کی ہے۔

۲۴۔ دلائل النبوۃ: یہ تین جلدوں میں ہے، علامہ ابن سبکی نے اس کو بے نظیر کتاب کہا ہے اور ذہبی فرماتے ہیں کہ اس کی تحصیل ضروری ہے، مدینہ منورہ کے کتب خانہ محمودیہ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے، سراج الدین عمر بن علی المعروف بابن ملقن نے اس کا مختصر لکھا ہے۔ (معارف ج ۱۸ ص ۴۱۰ کشف الظنون ج ۲ ص ۴۹۵)

۲۵۔ کتاب ماوردفی حیات الانبیاء بعد وفاتہم ۱۳۴۹ھ میں یہ حیاۃ الانبیا کے نام سے محمد بن محمد خانجی کی تعلیق کے ساتھ مصر سے پندرہ صفحات میں شائع ہوئی ہے، (ایضاً ص ۲۹۸ و فوائد جامعہ ص ۷۷ و ۸۷) صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ یہ ایک ہزار مسائل پر مشتمل ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مطبوعہ رسالہ اصل کتاب کا مختصر ہے۔

۲۶ و ۲۷۔ کتاب الزہد: اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، امام احمد اور ابن مبارک کی کتابیں زیادہ اہم اور مشہور ہیں، امام بیہقی نے زہد میں کتاب الزہد الکبیر اور کتاب الزہد الصغیر کے نام سے دو کتابیں لکھی تھیں، کتاب الزہد الکبیر کا ایک قلمی نسخہ مدینہ کے کتب خانہ شیخ السلام میں اور دوسرا مکتبہ سندیہ میں ہے۔

(کشف الظنون ج ۲ ص ۲۱۹ و الرسالۃ المستطرفہ ص ۴۴ و معارف ج ۱۸ ص ۳۲ و تذکرۃ النوادر ص ۱۹۱)

۲۸۔ کتاب الاعتقاد: اس میں عقائد کے وہ اصول و فروع بیان کئے گئے ہیں جن کو جاننا اور ان پر اعتقاد رکھنا مکلف لوگوں کے لیے ضروری ہے، اس کی ترتیب ابواب پر ہے، امام برہان الدین ابراہیم بن عمر بقائی (م ۸۸۵ھ) نے خیر النزاد المنتقی من کتاب الاعتقاد کے نام سے اس کا انتخاب کیا تھا، اس کا مکمل نام کتاب الاعتقاد والہدایہ الی سبیل الرشاد ہے بعض نے کتاب المعتقد بھی لکھا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ "یہ بڑی نفیس اور عمدہ کتاب ہے۔"

(کشف الظنون ج ۲ ص ۲۶۳ و الرسالۃ المستطرفہ ص ۴۰ و بستان المحدثین ص ۶۴)

۲۹۔ کتاب المبسوط: یہ عظیم الشان کتاب بیس جلدوں میں ہے، امام بیہقی خود فرماتے ہیں کہ امام شافعی کے قدیم قول نقل کرنے اور ان کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں نے توفیق الٰہی سے ان کے دلائل تحریر کئے ہیں اور اس کو امام مزنی کی مختصر کی ترتیب پر اس لیے مدون کیا گیا ہے کہ جو لوگ مفصل اور مبسوط مباحث دیکھنے کے خواہش مند ہوں وہ اس کی جانب رجوع کرسکیں۔

Marfat.com

۳۰۔ کتاب القراءۃ خلف الامام: یہ رسالہ مولانا تلطف حسین مرحوم کے زیر اہتمام مئی ۱۹۱۵ء میں مطبع پرنٹنگ ورکس دہلی سے متوسط تقطیع کے ۱۷۶ صفحات میں شائع ہوا تھا، اصل کتاب ۱۶۰ صفحوں پر مشتمل ہے، سولہ صفحات میں مضامین اور اغلاط کی فہرست ہے، اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ امام، مقتدی اور منفرد سب کو خواہ سری نماز ہو یا جہری سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی، مصنف نے اس بحث کی تمام روایات واحادیث جمع کر کے شوافع کے مسلک کو قوی اور مرجح ثابت کیا ہے اور دوسرے فقہا کے مسالک اور ان کی مؤید حدیثیں بھی ذکر کی ہیں، حدیث ورجال کی فنی بحثیں اور اہل لغت وادب کے بیانات بھی جہاں ضروری معلوم ہوئے ہیں دیدیئے گئے ہیں۔

۳۱۔ کتاب الاسماء والصفات: بیہقی کی اس مفید اور جامع کتاب کو علامہ ابن سبکی نے عدیم النظیر اور بے مثال بتایا ہے، ۱۳۱۳ھ میں پہلی مرتبہ مطبع انوار احمدی الہ آباد اور پھر مصر سے شیخ محمد زاہد کوثری کے حواشی وتعلیقات کے ساتھ شائع ہوئی ہے، اس میں خدا کے ناموں اور صفتوں پر مبسوط بحث کی گئی ہے اور ہر مبحث کے متعلق حدیثیں جمع کی گئی ہیں، ضمناً تفسیر وکلام اور حدیث ورجال کی بعض فنی بحثیں بھی آ گئی ہیں، علامہ کوثری اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''مصنف نے ہر باب سے متعلق جتنی حدیثیں مروی ہیں ان سب کو اکٹھا کر دینے کی کوشش کی ہے اور صحیح وغیر صحیح حدیث کی تصریح اور اسماوصفات سے متعلق وارد نصوص کی توجیہ وتاویل، ماہرین فن اور اہل نظر کے بیان کردہ مرادی معانی بھی بیان کیے ہیں۔''

چند مقامات سے قطع نظر مصنف کی اکثر بحثیں نہایت عمدہ اور خوب ہیں۔'' (بحوالہ فوائد جامعہ برعجالۂ نافعہ ص ۱۴۴ و ۱۴۵)

۳۲۔ کتاب المدخل: یہ دراصل کتاب السنن الکبیر کا مقدمہ ہے، اسی لیے اس کا پورا نام المدخل الی السنن ہے، اس میں امام بیہقی نے فن حدیث کے نکات اور ضروری اصولی مباحث کی تشریح کی ہے تاکہ سنن سے استفادہ کرنے والوں کو سہولت ہو، یہ مقدمہ بعض حیثیتوں سے خود ایک مستقل کتاب ہے جو کئی ابواب پر مشتمل ہے، راقم کو اس کے صرف ایک ہی قلمی نسخہ کا علم ہوسکا ہے، جو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ کی زینت ہے مگر ناقص الاول ہے اور صرف ۵۷ ورقوں پر مشتمل ہے، اس کے متعلق مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی کا ایک مبسوط مقالہ معارف اپریل ومئی ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا ہے، اس کی ترتیب ابواب پر کی گئی ہے اور بارہ جزوں پر مشتمل ہے، ہر باب کے مطابق سردروایات کے بعد نتائج کا استنباط بھی کیا گیا ہے، کتاب معرفۃ السنن میں اس کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں، علامہ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) نے کتاب المدخل کی تلخیص کی تھی، انہوں نے مقدمہ ابن صلاح کے مختصر میں جن فوائد کا اضافہ کیا ہے، ان میں سے بعض کے متعلق خود یہ بیان کیا ہے کہ وہ بیہقی کی کتاب المدخل سے ماخوذ ہیں، اسی طرح امام سیوطی کی تدریب الراوی میں بھی اس کے حوالے موجود ہیں۔

۳۳۔ شعب الایمان: اس کتاب کا پورا نام الجامع المصنف فی شعب الایمان ہے، یہ بیہقی کی مفید ومشہور کتاب ہے جو دو جلدوں اور ۷۷ ابواب پر مشتمل ہے، امام صاحب کے پوتے ابوالحسن عبید اللہ اور ابوالقاسم زاہر بن طاہر شحامی اس کے راوی ہیں، (مختصر شعب الایمان ص ۵ و ۶) اس میں مصنف نے صحیحین وغیرہ کی مشہور حدیث الایمان بضع وسبعون شعبة الخ کے مطابق ایمان کے ستر شعبوں کی تفصیل تحریر کی ہے، نیز ہر ہر شعبہ کے متعلق دوسری روایتیں اور قرآنی آیتیں بھی استشہاد میں پیش کر کے ان کی شرح وتوضیح کی گئی ہے۔

شمس الدین تونوی اور معین الدین محمد بن حمویہ نے اس کے مختصر اور جلال الدین سیوطی نے ایک جلد میں زوائد تحریر کیے

Marfat.com

ہیں، (کشف الظنون ج ۱ ص ۳۸۵) اس کا مختصر مصر سے عربی میں اور اردو ترجمہ کارخانہ تجارت کتب کراچی سے شائع ہوا ہے۔

۳۴۔ کتاب معرفۃ السنن والآثار: یہ امام بیہقی کی معرکہ آراء کتاب ہے، امام صاحب ابھی اس کی ترتیب و تالیف سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ بعض لوگوں نے اس کی اہمیت اور مقبولیت کے خواب دیکھے، اس کے شروع میں حدیث و سنت کی اہمیت روایت، اسناد میں احتیاط اور بعض ضروری فنی مباحث، اجماع، اجتہاد، قیاس، عام و خاص، امر و نہی دلیل خطاب اور ناسخ و منسوخ وغیرہ کی نوعیت، امام شافعی کے حالات و کمالات اور اجتہادی مرتبہ پر لطیف بحث کی گئی ہے، اس کے بعد فقہی ابواب کی ترتیب پر احکام و مسائل سے متعلق روایات جمع کی گئی ہیں، روایات کے نقل میں سرد و استقصا سے کام لیا گیا ہے اور ایک نوع کی روایتوں کے متعدد طرق و اسناد کی تخریج، ان کی صحت و سقم، ان سے استنباطات کا ذکر اور امام شافعی کے آراء و اقوال کی تصریح کی گئی ہے، علامہ ابن سبکی کا بیان ہے کہ کوئی شافعی المذہب اس کتاب سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ یہ کتاب کئی اجزاء پر مشتمل ہے، اس کا جزو جو طہارت اور نماز کے ابواب پر مشتمل ہے مولانا ابو سلمہ شفیع احمد بہاری کے ہاتھ کا لکھا ہوا دار المصنفین کے کتب خانہ میں ہے، موصوف نے اس کا ایک مختصر جز بانکی پور پٹنہ سے شائع کیا ہے، اس میں طہارت کے اکثر ابواب آگئے ہیں۔

۳۵ و ۳۶۔ کتاب السنن: امام بیہقی کی سنن میں دو کتابیں ہیں، ایک السنن الکبیرہ یا سنن کبریٰ اور دوسری السنن الصغیرہ یا سنن صغریٰ کے نام سے موسوم ہے اور جیسا کہ ناموں سے ظاہر ہے، احکامی احادیث پر مشتمل ہے، ان کو امام مزنی کی مختصر کی طرح پر فقہی ابواب پر مرتب کیا گیا ہے، دونوں کی ابوالقاسم زاہر بن طاہر شحامی نے امام صاحب سے روایت کی ہے، بعض علمائے اسلام کا بیان ہے کہ اسلامیات کے ذخیرہ میں ایسی عظیم الشان کتابیں نہیں لکھی گئیں، سنن صغریٰ ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے، اس کے ناقص قلمی نسخے کتب خانہ خدیویہ مصر میں ہیں۔ (فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۵۱ و ۳۵۲) سنن کبریٰ مکمل دس جلدوں میں دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے، اس کا مختصر تعارف اور اس کے متعلق بعض معلومات درج ذیل ہیں:

سنن کبریٰ، امام بیہقی کی مایہ ناز اور شہرۂ آفاق تصنیف ہے جو نہ صرف بیہقیات بلکہ پورے ذخیرۂ حدیث کی ممتاز اور اہم کتاب ہے، اس کی عظمت اور اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ صحاح ستہ کے بعد جن کتابوں کو غیر معمولی شہرت اور بقائے دوام نصیب ہوا، ان میں یہ بھی ہے۔ حافظ ابن صلاح نے صحاح ستہ کے بعد کی عمدہ اور پر منفعت اور علامہ سیوطی نے معتبر و مستند کتابوں میں اس کو شمار کیا ہے اور شاہ ولی اللہ دہلوی اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کتب حدیث کے تیسرے طبقہ میں اس کو محسوب کیا ہے، اس کی اہمیت کی بنا پر بعض اساطین فن کا بیان ہے کہ ''اسانید، علل، اسماء الرجال اور صحاح کے متون کے علاوہ جن متون کا علم و سماع ایک محدث اور طالب فن کے لیے ضروری ہے، ان میں کتاب السنن الکبیر کا متن بھی ہے، اس کو مصنف کی زندگی ہی میں پوری شہرت و مقبولیت اور مکمل اعتبار و استناد حاصل ہوگیا تھا، ان کے استاذ امام ابو محمد عبداللہ بن یوسف جوینی نے بہ صرف کثیر اس کا نسخہ حاصل کر کے بڑے شوق سے ملاحظہ فرمایا اور اپنی مسرت و اطمینان کا اظہار کیا، (معرفۃ السنن والآثار مطبوعہ ص ۵۵) امام بیہقی نے اس کی ترتیب و تالیف اور متون و اسناد کی صحت و جودت میں بڑی احتیاط اور نہایت چھان بین سے کام لیا ہے، اہل فن کو اعتراف ہے کہ سنن میں دیدہ و دانستہ کوئی موضوع حدیث شامل نہیں کی گئی ہے۔

Marfat.com

خصوصیات:

سنن بیہقی کی چند اہم اور نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

١ جامعیت، ضخامت اور حجم وغیرہ سے قطع نظر اس میں متعدد ایسی حدیثیں شامل ہیں جو حدیث کی معروف و معتبر کتابوں میں نہیں ہیں اور بے شمار ایسی حدیثیں بھی ہیں جو اگرچہ دوسری کتابوں میں موجود ہیں لیکن بیہقی کے اسناد و متون میں بعض مفید اضافے ہیں، چنانچہ جو حدیثیں دوسری کتابوں میں مختصر و مجمل یا عام و مطلق مروی ہیں وہ اس میں مطول و مفسر اور خاص و مقید نقل کی گئی ہیں، اسی طرح جو کتابیں دوسری کتابوں میں ضعیف سندوں یا موقوف، مرسل اور منقطع نقل ہوئی ہیں، وہ اس میں صحیح سندوں سے مرفوع، مسند اور متصل درج کی گئی ہیں۔

درحقیقت وجوہ و طرق کی کثرت اور تعدادِ اسناد کو محدثین کے نزدیک بڑی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ یہ حدیث کی قوت کا موجب ہے، سنن بیہقی اس اعتبار سے بڑا امتیاز رکھتی ہے، امام بیہقی نے تعدد طرق، کثرت اسانید اور متحد المعنی روایات کو جمع کرنے کی طرف خاص دھیان دیا ہے۔

٢ تراجم کی کثرت بھی سنن بیہقی کی امتیازی شان ہے، انہوں نے ہر ہر مسئلہ کے لیے مستقل اور جداگانہ ابواب قائم کیے ہیں، اس کی وجہ سے ایک روایت کے گوناگوں پہلو اور مختلف گوشے سامنے آگئے ہیں۔

٣ معانی و مطالب کی وسعت و تنوع اور استدلال، استنباط اور استخراج کے لحاظ سے سنن بیہقی بے نظیر کتاب مانی جاتی ہے، عنوانات اور ابواب قائم کر کے آیات و احادیث سے لطیف استنباط کئے گئے ہیں جن کی طرف عموماً ذہن منتقل نہیں ہوتا، اسی طرح استدلال میں بھی نہایت دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے، اس خصوصیت کا آگے مزید ذکر آئے گا۔

٤ علامہ ابن سبکی نے اس کو ترتیب و تہذیب اور جودت تصنیف وغیرہ کے لحاظ سے بے نظیر کتاب قرار دیا ہے، مصنف نے اس کی تالیف و ترتیب میں نہایت لطیف اسلوب اور عمدہ پیرایہ بیان اختیار کیا ہے، طرزِ استدلال، تقسیم ابواب اور حدیثوں کی وضع و ترتیب میں ندرت کے باوجود بڑی موزنیت اور مناسبت پائی جاتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ابواب کے تفنن اور اسالیب کے تنوع کے اعتبار سے اس کا درجہ اکثر کتب سنن و مسانید سے بڑھا ہوا ہے، امام بخاریؒ کی طرح امام بیہقی کے ابواب بھی حدیث سے ماخوذ ہوتے ہیں کہیں کہیں مناسبت کا پہلو دقیق اور کہیں کہیں نہایت معمولی ہوتا ہے، بعض ابواب کے آخر میں ایسی حدیثیں درج کی ہیں جن کی آنے والے باب و ترجمہ سے مناسبت بالکل واضح ہوتی ہے، جیسے باب قتل الرجل بالمرأۃ کے خاتمہ کی حدیث میں ایک یہودی کے ایک مسلمان بچی کے قتل و قصاص کا ذکر ہے اور اس کے بعد فیمن لا قصاص بینہ باختلاف الدینین لائے ہیں، (السنن الکبریٰ ج ۸ ص ۴) بعض ابواب ظاہری مفہوم کے لحاظ سے باہم دگر مختلف معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل ان مختلف ابواب سے امام صاحب کا مقصد کسی خاص مسلک کو جو ان کے نزدیک بالکل متحقق ہوتا ہے، الفاظ اور عبارتوں کے تنوع، تجدید، ابواب اور تخریج احادیث کے ذریعہ مدلل طور پر ثابت کرنا ہوتا ہے۔

٥ امام بیہقی نے حوالے اور حدیثوں کے مآخذ کی نشاندہی کر دی ہے، اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ حدیث اور کن کن کتب حدیث میں مذکور ہے، صحیحین کے حوالے اس کثرت سے دیئے ہیں گویا سنن بیہقی المستخرج علی الصحیحین بن گئی ہے، حوالہ دینے کے ساتھ انہوں نے اس فرق و اختلاف کو بھی واضح کر دیا ہے جو ان کی اور دوسری کی روایت کے سند و متن میں پایا

Marfat.com

جاتا ہے۔ ؎۱

۶ سنن بیہقی فقہی مسائل و معلومات کا گنجینہ ہے، اس کے ابواب و تراجم فقہی مسائل ہی کے لحاظ سے قائم کیے گئے ہیں، علاوہ ازیں ایک ایک حدیث سے مختلف مسائل کو مستنبط اور متعدد ابواب کی تفریع کی گئی ہے، اس سے امام بیہقی کے فقہی کمال اور اجتہادی مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے، صحابہ و تابعین کے آثار اور ائمہ مابعد کے اقوال و مسالک بھی جمع کئے گئے ہیں اور ضعیف وقوی اور مرجوح اور راجح اقوال میں محاکمہ بھی کیا گیا ہے، امام شافعی کے قدیم و جدید اقوال، شوافع کے مذہب، اصول اور دلائل خصوصیت سے ذکر کئے گئے ہیں، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب لکھ کر انہوں نے امام شافعی پر احسان کیا ہے، اس ضمن میں ان کی یہ خصوصیت بھی قابلِ ذکر معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے مختلف فیہ امور و مسائل کے متعلق صرف اپنے فقہی مسلک کی مؤید روایات و احادیث نقل کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ دوسرے مذہب کی مؤید حدیثوں کو بھی بیان کیا ہے۔

۷ امام بیہقی جرح و تعدیل کے بھی امام تھے، اس لیے اس میں اسانید و متون کے متعلق مبسوط و مفصل کلام کیا گیا ہے اور احادیث و رجال کی قوت و ضعف، جرح و عدالت صحت و سقم اور ترجیح و تضعیف وغیرہ کے متعلق بڑا وافر مواد جمع کر دیا گیا ہے، اس سلسلہ میں ناقدین و مبصرین فن کے اقوال خاص اہتمام سے منضبط کئے گئے ہیں، اس طرح اسناد و رجال اور روایات و متون کے بارے میں اس کے اندر مختلف النوع مفید اور معلومات افزا وضاحتیں اور تصریحات آ گئی ہیں۔

۸ بعض کتب و ابواب کے شروع میں ان کی مناسبت اور محل کے اقتضا کے لحاظ سے کلام مجید کی آیتیں اور حدیثوں کے ٹکڑے بھی نقل کئے گئے ہیں جو معنی خیز ہونے کے علاوہ امام بیہقی کی وسعت علم و نظر اور قوت استدلال کا نمونہ بھی ہیں۔

۹ امام بیہقی نے احادیث کی مناسب توجیہ و تطبیق، ان کے مصالح و حِکم، ان کی کسی خاص دلالت، ان سے ثابت ہونے والے

؎۱ (صحیحین کے حوالوں کے سلسلہ میں یہ واضح رہنا چاہیے کہ امام بیہقی نے الفاظ و معانی اور متون وغیرہ کی ہو بہو اور بالکل ٹھیک ٹھیک مطابقت کا التزام نہیں کیا ہے کیوں کہ انھوں نے اپنی روایت میں ان الفاظ و اسناد کا ذکر کیا ہے جو ان کو اپنے شیوخ سے ملے ہیں، اس لیے ان کے اور صحیحین کے الفاظ و معانی میں اکثر معمولی اور خفیف سا فرق ہوتا ہے اور اس کی انھوں نے عمدہ تصریح و وضاحت کر دی ہے، علامہ ابن صلاح لکھتے ہیں:

وھکذا ماخرجه المولفون فی تصانیفھم المستقلة کالسنن الکبیر للبیھقی وشرح السنة لابی محمد البغوی وغیر ھما مما قالوا فیه اخرجه البخاری او مسلم فلا یستفاد بذالک اکثر من ان البخاری او مسلما اخرجا اصل ذالک الحدیث مع احتمال ان یکون بینھما تفاوت فی اللفظ وربما کان تفاوتا فی بعض المعنی فقد وجدت فی ذالک ما فیه بعض تفاوت من حیث المعنی واذا کان الامر فی ذالک علی ھذا فلیس لک ان تنقل حدیثا منھا وتقول ھو علی ھذا الوجه فی کتاب البخاری او کتاب مسلم الا ان تقابل لفظه او یکون الذی خرجه قد قال اخرجه البخاری بھذا اللفظ) (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۲، مطبع قیم بمبئی ۱۳۵۷ھ)

اسی طرح جن مصنفین نے جیسے امام بیہقی اور ابو محمد بغوی نے اپنی مستقل تصنیفات سنن کبیر و شرح السنۃ وغیرہ میں جو کہا ہے کہ "اس حدیث کی امام بخاری و مسلم نے تخریج کی ہے" تو اس سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ اس کی اصل شیخین کے یہاں موجود ہے، ورنہ دونوں کے درمیان لفظ اور بعض اوقات معنی میں بھی فرق و تفاوت کا احتمال رہتا ہے، ایسی حالت میں تم اس طرح کی کتابوں سے کوئی حدیث نقل کر کے یہ نہیں کہہ سکتے ہو کہ وہ بعینہٖ اسی شکل میں بخاری یا مسلم کی کتابوں میں بھی موجود ہے، تا آنکہ تم دونوں کے الفاظ کا مقابلہ نہ کر لو یا یہ کہ خود تخریج کرنے والا اس کے متعلق یہ واضح کر دے کہ اس کی ان ہی لفظوں کے ساتھ امام بخاری نے تخریج کی ہے۔

Marfat.com

مخصوص مسئلہ اور ان سے استدلال واستنباط کے کسی اہم نکتہ اور پہلو کا تذکرہ کیا گیا ہے، بعض بحثوں کے سلسلہ میں شارحین حدیث کے آرا اور اہل لغت کے اقوال بھی نقل کئے ہیں، کہیں کہیں فنی اور اصطلاحی تشریحات بھی کی گئی ہیں، سنن بیہقی کے ان گوناگوں خصوصیات اور جامعیت نے اسکو حدیث کی امہات کتب کی صف میں جگہ دی ہے، درحقیقت یہ امام بیہقی کا ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جس کے سامنے ارباب کمال اور ائمہ سرنگوں نظر آتے ہیں چنانچہ ان کو اعتراف ہے کہ متاخرین کا خصوصاً چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں امام دارقطنی کے بعد اس پایہ اور مرتبہ کا کوئی اور محدث نہیں گزرا ہے، علامہ ابن صلاح سنن کی عظمت واہمیت اور جامعیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ماتم کتاب فی السنة اجمع للادلة من کتاب السنن الکبری للبیهقی کانه لم یترک فی سائر اقطار الارض حدیثا الا وقد وضعه فی کتابه۔ (مقدمہ ابن صلاح)

دلائل کے لحاظ سے بیہقی کی سنن کبریٰ سے زیادہ جامع اور مکمل تصنیف حدیث وسنت کے ذخیرہ میں موجود نہیں گویا امام صاحب نے تمام حدیثوں کو چھان بین کر کے اس میں جمع کر دیا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ تمام ترصحیح وثابت حدیثوں کا ہی ذخیرہ نہیں ہے، جب ضعیف اور غیر معتبر روایتوں سے حدیث کی مشہور ومتداول کتابیں بھی یکسر خالی نہیں ہیں تو اتنے ضخیم مجموعہ میں ضعیف اور کمتر درجہ کی حدیثوں کا شامل ہو جانا نہ تو تعجب انگیز ہے اور نہ ہی اس سے سنن بیہقی کی اہمیت وعظمت میں کوئی فرق آسکتا ہے، امام بیہقی نے استقصا تعدد طرق اور کثرت اسانید کے پیش نظر بھی ضعیف ومتروک حدیثیں درج کی ہیں اور امکان کی حد تک ان کے سقوط وضعف کی تصریح کر دی ہے۔

امام بیہقی کی اس عظیم الشان اور شہرۂ آفاق تصنیف کو پہلی دفعہ شائع کرنے کا فخر دائرۃ المعارف حیدرآباد کے حصہ میں آیا، دائرہ نے اس کو دس جلدوں میں (۱۳۴۴ھ تا ۱۳۵۶ھ) مختصر مفید حواشی کے ساتھ اہتمام سے شائع کیا ہے، ہر جلد کے آخر میں ابواب (مضامین) اور ناموں (راویوں) کے لحاظ سے دو مفصل فہرستیں دی گئی ہیں، ترتیب وتصحیح کی خدمت دائرہ کے مشہور رکن مولانا محمد ہاشم ندوی مرحوم نے اپنے بعض رفقائے کار کے تعاون سے انجام دی ہے۔

ان سب جلدوں کی تصحیح میں مصر، حضرموت، سندھ، مدراس، بمبئی اور رام پور وغیرہ کے نو قلمی نسخوں سے مدد لی گئی ہے۔

قاضی القضاۃ شیخ علاؤالدین علی بن عثمان ترکمانی (م ۷۵۰ھ) نے سنن کا ایک ضخیم حاشیہ لکھا تھا، یہ الجواہر النقی فی الرد علی البیہقی کے نام سے موسوم اور سنن کے مطبوعہ نسخہ کے حاشیے پر دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہوا ہے۔

علامہ ترکمانی اپنے زمانہ کے مشہور حنفی فاضل تھے، فقہ واصول میں ماہر اور حدیث ورجال میں تبحر رکھتے تھے، الجواہر النقی میں انہوں نے سنن بیہقی پر بطریق معارضہ مناقشات اور بیہقی کے نقد ونظر اور رجال اور روایات کی تصحیح میں تساہل اور استدلال واستنباط کی بعض خامیوں کا تذکرہ اور اسی نوع کے بعض دوسرے تعقبات کئے ہیں، یہ حاشیہ دو حصوں میں ہے، ترکمانی کے بعض استدراکات اور تنقیدیں ضرور اہم ہیں لیکن بعض میں بحث وکلام کی گنجائش ہے، زین الدین قاسم بن قطلوبغا حنفی نے ترصیع الجواہر النقی کے نام سے حروف معجم پر اس کی تلخیص کی تھی مگر وہ ناتمام رہ گئی تھی۔

(کشف الظنون ج ۲ ص ۳۶ والرسالۃ المستطرفہ ص ۳۰)

Marfat.com

بیہقی و سنن بیہقی پر اعتراض:

امام بیہقی پر کئے جانے والے اعتراضات میں تعصب اور شافعیت میں غلو کا اعتراض اہم اور قابل ذکر ہے، ان کے زمانہ میں شخصی تقلید کی بنیاد بھی پڑ چکی تھی اور فقہی و جماعتی عصبیت میں بڑی شدت بھی پیدا ہو گئی تھی، چنانچہ بعض اکابر علما کی طرح ان کا دامن کمال بھی اس سے آلودہ نظر آتا ہے، ان کی کتابوں میں شافعیت کی پرزور وکالت اور امام شافعی سے پرجوش عقیدت بہت نمایاں ہو گئی ہے، اس حد تک بھی مضائقہ نہ تھا لیکن بعض مسائل میں ان کا رویہ انصاف اور حق پسندی پر مبنی نہیں معلوم ہوتا، علاوہ ازیں انہوں نے معرفۃ السنن والآثار میں حنفی مذہب کے ممتاز فقیہ و مجتہد امام طحاوی پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ''انہوں نے بعض کمزور حدیثوں کو جو ان کی رائے کے موافق تھیں تصویب اور بعض صحیح حدیثوں کی اپنی رائے و مسلک کے خلاف ہونے کی وجہ سے تردید کی ہے۔'' یہ اعتراض بے جا ہے، اس کتاب کی پہلی جلد میں امام طحاوی کے تذکرہ میں اس پر تبصرہ گزر چکا ہے۔

تاہم امام بیہقی نے سنن میں بعض جگہ شوافع کے مسلک اور امام شافعی کے آرا کو مرجوح بھی قرار دیا ہے، کہیں کہیں امام شافعی کے ان اقوال کو صحیح اور اولیٰ قرار دیا ہے، جو متعارف اور مشہور قول کے خلاف ہوتے ہیں جیسے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ امام شافعی مسح میں تکرار کے قائل تھے، لیکن امام بیہقی نے اس کی تردید کی ہے، بعض جگہ انہوں نے امام شافعی کے قول کی تردید کر کے ان کی جانب سے توجیہ پیش کی ہے، جیسے: صیام عن المیت کے باب میں مختلف روایتیں اور حدیثیں بطور دلیل نقل کر کے ان کے قول کی تردید کی ہے، مگر آخر میں ان کی جانب سے یہ عذر بھی پیش کیا ہے کہ:

> ولو وقف الشافعی رحمہ اللہ علی جمیع طرقھا و نظائرھا لم یخالفھا ان شاء اللہ۔ (سنن بیہقی ج ۴ ص ۲۵۷)
>
> اور اگر امام شافعی ان تمام حدیثوں کے طرق سے واقف ہوتے تو ان کی مخالفت نہ کرتے۔

اسی طرح انہوں نے سنن میں اپنے مسلک و مذہب کے مخالف اقوال اور دوسرے فقہا کے مذاہب کی مؤید حدیثیں بھی اسی فراخدلی کے ساتھ بیان کی ہیں، جس طرح خود اپنے مذہب و مسلک کی مؤید روایتیں نقل کی ہیں، یہ الگ بحث ہے کہ ان کے نزدیک روایات کا پایہ اور درجہ کیا ہے۔

Marfat.com

حافظ ابن عبدالبر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۴۶۳ھ)

نام ونسب:

یوسف نام، ابوعمر و کنیت اور ابن عبدالبر عرفیت ہے، صحیح شجرۂ نسب یہ ہے: یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر بن عاصم۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۳۶)

ولادت:

بروز جمعہ ۲۵/ ربیع الآخر ۳۶۸ھ کو پیدا ہوئے۔ (ابن خلکان ج ۳ ص ۱۷۴ و تدریب الراوی ص ۲۶۱)

خاندان ووطن:

ابن عبدالبر کا وطن قرطبہ ہے جو اندلس کا پایہ تخت اور دنیائے اسلام کا عظیم الشان اور ممتاز شہر ہے، گو آپ کا مولد بلادِ مغرب ہے لیکن آبا و اجداد عرب نژاد اور قبیلہ نمر بن قاسط سے تعلق رکھتے تھے، آپ کے والد بزرگوار ابومحمد عبداللہ (متوفی۔ ۳۸۰ھ) قرطبہ کے اکابر علما و فقہاء اور ممتاز لوگوں میں تھے، ان کو شعر وادب سے بھی شغف تھا، (الدیباج الذہب ص ۳۵۹) ابن عبدالبر کی نشو ونما اسی صاحب کمال باپ کی آغوش میں ہوئی تھی، وہ وطن کی نسبت سے قرطبی اور خاندان کی نسبت سے نمری کہلاتے ہیں۔

اساتذہ:

حافظ ابن عبدالبر نے جن ائمہ کمال سے استفادہ کیا تھا ان کے نام یہ ہیں:

ابوزکریا اشعری، ابوسعید نصر، ابوعمر باجی، ابوعمر طلمنکی، ابوالقاسم بن ابوجعفر، ابومحمد بن اسد، ابوالولید بن فرضی، ابراہیم بن نصر، ابوعمر احمد بن حسور، احمد بن فتح الرسان، احمد بن قاسم نزار، حسین بن یعقوب، خلف بن سہل، ابوالقاسم خلف بن قاسم، سعد بن نصر، سعید بن قزاز، ابوزید عبدالرحمٰن بن یحییٰ، عبداللہ بن محمد جہنی، ابومحمد عبداللہ بن محمد بن عبدالمؤمن، ابوعبداللہ محمد بن عبدالملک بن ضیغون، عبدالوارث بن سلیمان، یحییٰ بن وجہ الحیۃ۔

دور دراز کے حسب ذیل علمانے ان کو روایت حدیث کی اجازت تحریراً عطا کی تھی۔

ابوذر ہروی، ابوالفتح بن سی بخت، عبدالغنی منذری مصری، ابوالقاسم عبداللہ بن سقطی، مصری اور ابومحمد نحاس مصری وغیرہ ان کو حافظ ابوالولید بن فرضی کی خدمت میں رہنے اور استفادہ کرنے کا زیادہ موقع ملا، ان سے حدیث، رجال اور ادب وغیرہ علوم

Marfat.com

حاصل کیے۔ (کتاب الانساب ورق ۴۴۷ و ۵۶۹ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۶ و ابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۷ والدیباج ج ا ص ۳۵۷)

تلامذہ:

ابن عبدالبر سے جن لوگوں نے استفادہ کیا تھا ان کے نام یہ ہیں:

ابوالعباس والائی، ابوعبداللہ حمیدی، ابومحمد بن ابی قحافہ، ابواحمد جعفر بن حجاف (امیر بلنسیہ) ابوعلی حسین بن احمد غسانی، ابوبحر سفیان بن عاصی، ابوداؤد سلیمان بن ابوالقاسم مقری، ابوالحسن طاہر بن مفوز، محمد بن فتوح انصاری۔

(تذکرہ والدیباج، حوالہ سابقہ)

رحلت و روایت کی ابتدا:

ان کے علم و فن کی تحصیل اور سماع حدیث کی ابتدا کب ہوئی؟ اس کا پتہ نہیں چلتا، تاہم وہ اپنے معاصر خطیب کی ولادت کے وقت علم حدیث کی تحصیل میں مشغول ہو چکے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بچپن ہی میں اس فن کی تحصیل شروع کر دی تھی، بعض مورخین کا بیان ہے کہ وہ نہ اندلس سے باہر تشریف لے گئے اور نہ ان ستر علما کے علاوہ جو اس زمانہ میں یکتا تھے، کسی کو دیکھا اور نہ انکے علاوہ کسی سے علم حاصل کیا لیکن صحیح یہ ہے کہ گو انکا قیام عموماً زیادہ اندلس ہی میں رہا اور انہوں نے بلادِ مغرب کے باہر قدم نہیں نکالا، مگر اندلس کے شرق و غرب اور مغرب کے اکثر شہروں میں تشریف لے گئے، چنانچہ مختلف وقتوں میں دانیہ، بلنسیہ اور شاطبیہ میں سکونت اختیار کی، ان پر علم کا شوق ہمیشہ مستولی رہا اور وہ کبھی علم کی طلب و تحصیل سے غافل نہیں ہوئے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۶ و ابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۸ والدیباج المذہب ص ۳۵۷ و بستان المحدثین ص ۶۹)

حفظ و ضبط اور ثقاہت:

علامہ ابن عبدالبر کے حفظ و ضبط اور ثقاہت و اتقان پر محدثین اور علمائے فن کا اتفاق ہے، حفظ و اتقان میں سر آمد روزگار اور تمام معاصرین سے فائق ہونے کی بنا پر حافظ اندلس کہلاتے تھے، ابوالولید باجی فرماتے ہیں کہ اہل مغرب میں ان سے بڑھ کر نامور اور ممتاز حافظ حدیث کوئی اور نہ تھا، صاحب دیباج لکھتے ہیں کہ اندلس کی سرزمین میں وہ سنن ماثورہ کے سب سے بڑے حافظ تھے، اہل سیر نے ان کی توثیق و تعدیل کرتے ہوئے ان کو ثقہ و حجت بتایا ہے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۶ و ابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۸ والدیباج المذہب ج ۷ ص ۳۵ و بستان المحدثین ص ۶۹)

حدیث میں درجہ و مرتبہ:

تمام علمائے فن نے حدیث میں ان کے کمال و امتیاز کا اعتراف کیا ہے، گو ان کو متعدد علوم سے مناسبت تھی لیکن زیادہ اور اصلی اشتغال و انہماک اسی فن سے تھا، اس لیے حدیث و رجال میں وہ نہایت ممتاز تھے، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مغرب کے باہر قدم نہیں نکالا مگر اس کے باوجود بقول شاہ عبدالعزیز صاحب ان کا پایہ خطیب بیہقی اور ابن حزم جیسے ارباب کمال و اساطین فن سے کمتر نہیں تھا بلکہ وہ بعض حیثیتوں سے ان سب میں ممتاز تھے، ابن خلکان کا بیان ہے کہ وہ حدیث و اثر کے حافظ اور ان کے متعلقہ علوم میں امام عصر تھے، ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ مکثر حفاظ میں تھے، نیز علم حدیث و رجال کے ممتاز عالم تھے، انہوں نے فن

Marfat.com

حدیث میں ایسی مہارت اور پختہ استعداد بہم پہنچائی کہ متقدمین میں علمائے اندلس پر گوئے سبقت لے گئے، ابوالولید باجی کا بیان ہے کہ اندلس میں ابوعمرو سے زیادہ حدیث میں کوئی بلند پایہ شخص نہیں تھا، صاحب دیباج رقمطراز ہیں کہ وہ علمائے اندلس کے شیخ اور محدث کبیر تھے، غسانی فرماتے ہیں کہ ابن عبدالبر کہتے تھے ہمارے شہر میں قاسم بن محمد اور احمد بن جلد حباب کے ہم پایہ اور ہمسر کوئی شخص نہیں، حالانکہ وہ خود ان لوگوں سے کمتر نہ تھے۔

حدیث میں ان کی عظمت و بلند پائیگی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن صلاح اور نووی نے ائمہ صحاح کے بعد کے سات اہم اور برگزیدہ محدثین کی فہرست میں ان کا نام بھی لکھا ہے اور شاہ عبدالعزیز نے مالکیہ میں ان کو سب سے بڑا صاحب کمال شارح حدیث قرار دیا ہے، ان کے علوئے اسناد سے بھی ان کے کمال کا پتہ چلتا ہے، تمام محدثین نے ان کی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں امامت فن کی طرح علوئے اسناد کا بھی ان پر خاتمہ ہوگیا، ان کے علوئے اسناد کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ (و کان سنده مما یتنافس فیه) یعنی ان کی سندیں قابل رشک ہوتی ہیں، ان کے عوالی اسناد میں ابوداؤد کی سنن اور زعفرانی کی کتاب کا خصوصیت سے ذکر کیا جاتا ہے، کیونکہ ان کے اور مصنفین کے درمیان صرف دو ہی واسطے ہیں۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۵ و ۳۲۶ و ابن خلکان ج ۲ ص ۱۷، ۴۱۷ و ۴۱۸ والدیباج ص ۳۵۷، ۳۵۸)

رجال اور جرح و تعدیل میں امتیاز:

حافظ ابن عبدالبر کی حدیث میں جلالت قدر کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ اسماء الرجال اور جرح و تعدیل کے ماہر تھے، محدثین اور علمائے رجال نے حدیث کی طرح اسماء الرجال سے بھی ان کے شغف کا ذکر کیا ہے، ابوعبداللہ حمیدی فرماتے ہیں "وہ علوم حدیث و رجال کے عالم اور قدیم السماع تھے۔" محمد بن عبدالباقی زرقانی (م ۱۰۹۹ھ) لکھتے ہیں کہ وہ حدیث و رجال کے عالم تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ ان کی سند عالی اور وہ توثیق و تضعیف کے ماہر تھے، انہوں نے مؤطا کی جو شرحیں لکھی ہیں، ان سے ان کی حدیث اور جرح و تعدیل دونوں میں مہارت کا پتہ چلتا ہے، بعض اہل علم کا خیال ہے کہ ابن عبدالبر نے متن و سند کی تصحیح، مرسل و مسند کی تمیز موصول و منقطع میں تفریق اور ضعفاء و ثقات میں امتیاز کر کے صحیح و سقیم کو پوری کوشش سے الگ کر دیا اور مخفی و مستور حدیثوں کا کھوج لگا کر ان کے علل کی نشاندہی اور اسقام و عیوب پر متنبہ کر دیا، مؤطا کے شروح میں سندوں کی وضاحت پر خاص توجہ مبذول کی ہے اور مرسل و منقطع اور ملاقات مؤطا پر لطیف بحث و کلام کیا ہے۔

(تذکرہ ج ۳ ص ۳۲۵ و ۳۲۶ و ابن خلکان ج ۲ ص ۴۱۰ و ۴۱۸ والدیباج ص ۳۵۵ و ۳۵۸ فہرس الفہارس ص ۲۰۰)

تفقہ و اجتہاد:

فقہ میں بھی نہایت ژرف نگاہ اور صاحب بصیرت تھے، ابوعلی غسانی فرماتے ہیں کہ ہمارے استاد ابن عبدالبر قرطبی نے اپنے وطن میں فقہ کی تحصیل کی اور اس میں نمایاں قابلیت اور بصیرت پیدا کی اور مشہور فقیہ ابوعمر احمد بن عبدالملک ابن ہاشم اشبیلی کی صحبت اختیار کی اور ان سے مسائل کی تحصیل کی۔ ابن خلکان اور ذہبی نے علم حدیث و اثر کی طرح فقہ میں بھی ان کے تقدم اور فقہی بصیرت کا ذکر کیا ہے، ابوعبداللہ حمیدی فرماتے ہیں کہ وہ فقیہ اور خلافیات کے عالم تھے۔

ابن عبدالبر اپنے فقہی کمالات کے اعتبار سے مرتبہ اجتہاد پر فائز تھے، حافظ سید عبدالحی کتانی تحریر فرماتے ہیں کہ وہ ائمہ

Marfat.com

مجتہدین کے مقام ومرتبہ پر فائز تھے اور مالکی ہونے کے باوجود بعض مسائل میں دوسرے ائمہ کے ہمنوا اور بعض میں منفرد رائے رکھتے تھے۔ (ایضاً)

دیگر علوم:

اوپر گزر چکا ہے کہ ابن عبدالبر تنہا فقہ وحدیث ہی میں ممتاز نہ تھے، بلکہ ان کو متعدد علوم وفنون سے مناسبت تھی، چنانچہ قراءت وتفسیر، تاریخ وانساب، سیر واخبار اور ادب وعربیت وغیرہ مختلف علوم میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، ان کے سوانح نگاروں کا بیان ہے کہ علم انساب واخبار میں ید طولیٰ رکھتے تھے، ذہبی نے ان کی عربیت، ادب اور معانی و بیان میں تبحر کا ذکر کیا ہے اور صاحب مطمع الانفس کا بیان ہے کہ فن ادب میں ان کا تبحر مسلم ہے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۶ وابن خلکان ج ۳ ص ۲۱۸ والدیباج ص ۵۸ ۳ ومطمح الانفس ص ۷۰)

شعر وسخن:

شعر وسخن کی طرف بھی میلان تھا، چند شعر ملاحظہ ہوں:

تذکرت من یبکی علی مداوما — فلم ار الا العلم بالدین والخبر

علوم کتاب اللّٰہ والسنن التی — اتت عن رسول اللّٰہ مع صحۃ الاثر

وعلم الاولی من ناقدیہ وفہمنا — لما اختلفوا فی العلم بالرای والنظر

میں نے اس چیز کو یاد کیا جو مجھ پر ہمیشہ بکا کرتی رہے تو دین وحدیث کے علم کے سوا اور کوئی چیز نظر نہیں آئی یعنی اللہ کی کتاب اور رسول اللہؐ سے بطریق صحت مروی حدیثوں اور نقادانِ فن کے علوم اور خود ہماری فہم وبصیرت سے ان چیزوں کے بارے میں جن کے علم میں لوگوں نے اختلاف رائے کیا ہے۔

یہ دو شعر بھی ان سے منسوب ہیں:

مقالۃ ذی نصح وذات فوائد — اذا من ذوی الالباب کان استماحہا

علیکم بآثار النبی فانہ — من افضل اعمال الرشاد اتباعہا

عقلمندوں کی پر موعظت اور فائدہ مند گفتگو کو سن لو، رسول اللہؐ کے آثار وحدیث کی پیروی کو لازم سمجھو کیونکہ تمام اعمال رشد سے بڑھ کر اس کا اتباع ہے۔

دو اشعار اور ملاحظہ ہوں:

اذا ھان حر عند قوم اتاھم — ولم ینأ عنھم کان اعمی واجھلا

ولم تضرب الامثال الا لعالم — وما عوتب الانسان الا لیعقلا

جب کوئی شریف آدمی کسی قوم کے نزدیک ذلیل ہو جائے اور پھر بھی یہ ان سے دور نہ ہو تو وہ اندھا اور جاہل ہے اور مثالیں تو عالم ہی کے لیے بیان کی جاتی ہیں اور انسان کو فہمائش ہی کے لیے جھڑکا جاتا ہے۔ (بستان المحدثین ص ۷۰، ۷۱)

Marfat.com

اعتراف کمالات:

علامہ ابن عبدالبر کی عظمت شان، بلند پائیگی اور علمی کمالات کا تمام معاصرین فضلاء، ائمہ فن اور ارباب سیر نے اعتراف کیا ہے، ذہبی نے احد الاعلام اور صاحب شذرات نے العلامۃ العلم لکھا ہے، سمعانی کا بیان ہے کہ وہ جلیل القدر امام فاضل تھے، صاحب تذکرہ نے ان کو الامام وشیخ الاسلام بتایا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اندلس میں وہ بڑے عظیم مقام ومرتبہ کے مالک تھے، ان کی شہرت کا ساری دنیائے اسلام میں غلغلہ تھا، لوگ ان کے پاس سماع کے لیے سفر کر کے آتے اور تمام علمائے زمانہ ان کے علمی کمالات کے سامنے سرنگوں ہو جاتے، سید عبدالحیٔ کتانی فرماتے ہیں کہ ان کی تصنیفات ان کی وسعت علم، قوت فہم اور ابتکار ذہن کا ثبوت ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ وہ بلادِ مغرب کے کبار اور منتخب علما میں تھے، ان کا علمی پایہ خطیب، بیہقی اور ابن حزم سے کمتر نہیں تھا، حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے علمی کمالات کی وجہ سے نہایت مقبول، مرجع انام، یگانۂ روزگار اور امام وقت سمجھے جاتے تھے۔

(کتاب الانساب ورق ۷۴۴، العبر ج ۳ ص ۲۵۵ شذرات ج ۳ ص ۳۱۴ تذکرہ ج ۳ ص ۲۴۳ فہرس الفہارس ص ۲۰۱ و بستان المحدثین ص ۶۹)

فقہی مذہب:

بلادِ مغرب کے اکابر وفضلا کی طرح وہ بھی امام دارالہجرت کے مکتب فقہ واجتہاد سے وابستہ تھے، عبدالحی کتانی لکھتے ہیں کہ وہ مالکی تھے اور مالکیہ کے لیے قابل فخر تھے، اوپر گزر چکا ہے کہ ان میں اجتہادی شان تھی، اس لیے مسائل میں آزادانہ غور وفکر کر کے مستقل رائیں رکھتے تھے، پہلے وہ اثری اور ظاہری تھے، پھر مالکی ہوئے اور آخر تک اسی پر قائم رہے مگر مالکی ہونے کے باوجود اس مذہب کے جامد مقلد نہ تھے، چنانچہ بعض مسائل میں وہ شافعیہ کے ہم نوا تھے، حافظ ذہبی اور عبداللہ حمیدی وغیرہ نے امام شافعی کے اقوال ومذاہب کی طرف ان کے میلان کا ذکر کیا ہے، ان کے اس میلان کی وجہ سے ابن کثیر نے ان کا طبقات الشافعیہ میں تذکرہ کیا ہے، ان کی بعض تصنیفات میں بھی شافعی مذہب کی جانب میلان کی جھلک موجود ہے، مثلاً مالک وشافعی کے اختلاف پر انہوں نے جو کتاب تالیف کی ہے، اس میں شافعی مذہب کی طرف ان کا رجحان نظر آتا ہے، اسی طرح رسالۂ الجہر بالبسملہ میں بھی انہوں نے شوافع کے مذہب کی تائید کی ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ مالکی تھے، البتہ ان میں اجتہادی بصیرت تھی اور ان کا شمار صاحب اختیار فقہا میں ہوتا ہے، اسی لیے اپنے مذہب کے خلاف شوافع کی جانب ان کے میلانات کو قابل رد وانکار نہیں قرار دیا گیا ہے، سید عبدالحی کتانی لکھتے ہیں کہ ابن عبدالبر کی تصنیفات کے تتبع واستقرا سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اندھی تقلید سے دور تھے اور امام مالک کے مذہب واصول سے مراجعت کر کے اپنے اعتماد پر کوئی قول اختیار کرتے تھے۔

(تذکرہ ج ۳ ص ۳۲۶ و بستان المحدثین ص ۷۰ و فہرس الفہارس ص ۲۰۱، ۲۰۲)

عہدۂ قضا:

فقہی جامعیت اور اجتہادی بصیرت کی وجہ سے محکمۂ قضا بھی ان کے سپرد کیا گیا، چنانچہ مظفر ابن افطس کے زمانۂ امارت میں وہ اشبونہ اور دشترین کے قاضی رہے۔ (ابن خلکان ج ۲ ص ۴۱۸ و تذکرہ ج ۳ ص ۳۲۶)

Marfat.com

امراء و وزراء سے تعلقات:

امراء وسلاطین سے تعلقات بھی تھے اور ان کے ہدایا وتحائف ابن عبدالبر کے پاس آتے تھے، شاطبیہ کے زمانہ قیام میں کچھ لوگوں نے سلطان کے دسترخوان پر کھانا کھانے اور اس کے ہدایا وتحائف قبول کرنے کی وجہ سے اعتراض کیا تو انہوں نے اس کے رد میں اشعار کہے اور متعدد صحابۂ کرام، تابعین اور فقہائے امصار کا اس کے متعلق طرز عمل بیان کر کے واضح کیا کہ یہ حضرات بھی امراء وسلاطین کے تحائف قبول کرتے تھے۔ (نفح الطیب ص۱۶۱)

تدین:

علم وفضل کی طرح ورع وتدین میں بھی ممتاز تھے، مؤرخین نے ان کے صدق دیانت، حسن عقیدہ، عفت، پاکدامنی اور اتباعِ سنت کا ذکر کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ جو صدق و دیانت، حسن عقیدہ اور اتباعِ سنت ان کے حصہ میں آیا وہ کسی اور کے حصہ میں کم آیا ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج۳ ص۳۲۶ و بستان المحدثین ص۶۹، ۷۰)

ابتلاء وآزمائش:

حافظ ابن عبدالبر کو ابتلاء وآزمائش سے بھی دوچار ہونا پڑا، چنانچہ وہ اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر اندلس اور مغرب کے دوسرے علاقوں میں چلے گئے، ابن خلکان اور صاحب دیباج لکھتے ہیں کہ:

رحل عن وطنه فی الفتنة فجال الغرب الاندلس۔ (تاریخ ابن خلکان ج۳ ص۴۱۸ والدیباج ص۳۵۷)

فتنہ کے وقت وہ اپنے وطن سے رحلت کر کے مغربی اندلس چلے گئے۔

لیکن اس کی مزید تفصیل معلوم نہیں ہو سکی کہ ان کو کس بنا پر ابتلا کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

وفات:

اسی غریب الوطنی میں اندلس کے ایک شہر شاطبیہ میں داعی اجل کا پیغام آ گیا اور ۹۵/سال سے زیادہ عمر میں جمعہ کا دن گزار کر ربیع الآخر کی آخری تاریخ کو ۴۶۳ھ میں انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(تذکرہ ج۳ ص۳۲۶، العبر ج۳ ص۲۵۵، ابن خلکان ج۳ ص۴۱۲)

اولاد:

آپ کی اولاد میں ابومحمد عبداللہ بن یوسف کا ذکر ملتا ہے، یہ بھی ذی کمال اور صاحب تصنیفات تھے، ارباب سیر لکھتے ہیں کہ یہ ادب وبلاغت کے فن کے عارف اور شاعر تھے، سن وفات ۴۸۰ھ بتایا جاتا ہے۔ (تاریخ ابن خلکان ج۳ ص۴۲۱)

تصنیفات:

وہ ممتاز اور بلند پایہ مصنف تھے، تصنیف وتالیف کا ان کو فطری اور عمدہ ذوق تھا، علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ ''تصنیف وتالیف میں توفیق الٰہی اور تائید ایزدی ان کے شامل حال تھی''۔ ''اللہ تعالیٰ نے ان کی کتابوں سے بڑا فائدہ پہنچایا'' علامہ ابن حزم

Marfat.com

کا بیان ہے کہ ''ان کی کتابیں مختلف حیثیتوں سے اہم اور بے مثال ہیں۔'' حافظ ابن کثیر رقمطراز ہیں کہ ''ابن عبدالبر عمدہ اور عظیم الشان کتابوں کے مصنف تھے۔'' (ایضاً ونفح الطیب ج ۲ ص ۱۳۱ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۵ والبدایہ ج ۱ ص ۱۰۴) سید عبدالحئی کتانی لکھتے ہیں کہ وہ عدیم النظیر مصنف تھے، ان کی تصنیفات کو بڑی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی جن کتابوں کے نام معلوم ہوسکے وہ یہ ہیں:

۱۔ البستان فی الاخدان، ۲۔ البیان عن تلاوۃ القرآن یا البیان فی تاویلات القرآن، (کشف الظنون ج ۱) ۳۔ کتاب اخبار ائمۃ الامصار (سات جزوں کے بقدر)، ۴۔ اختصار تاریخ احمد بن سعید، ۵۔ اختصار التحریر، ۶۔ اختصار التمییز لمسلم، ۷۔ کتاب اختلاف اصحاب مالک ابن انس واختلاف روایاتہم عنہ (چوبیس جزوں میں)، ۸۔ کتاب الاستظہار فی حدیث عمار، ۹۔ کتاب الشواہد فی اثبات خبر الواحد (ایک جزو میں)، ۱۰۔ کتاب الفرائض، ۱۱۔ کتاب المدخل فی القرآت یا کتاب التجوید والمدخل الی علم القرآت بالتجرید (۲ جزوں میں)، ۱۲۔ فہرست الشیوخ۔

۱۳۔ کتاب جمہرۃ الانساب: یہ عربی قبائل وانساب کے بیان میں ہے۔ (ابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۸)

۱۴۔ الاحتیال بمافی شعرابی العتاہیۃ من الامثال، کتب خانہ شیخ الاسلام (مدینہ) میں اس کا قلمی نسخہ ہے۔ (مقالات سلیمان ج ۲ ص ۳۶۴)

۱۵۔ الاجوبۃ المرعیۃ علی المسائل المستغربیۃ من صحیح البخاری بھی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں صحیح بخاری کے مشکلات حل کیے گئے ہوں گے۔

۱۶۔ کتاب العقل والعقلا: موضوع نام سے ظاہر ہے، اس میں عقل اور عقلا کے بارے میں علما، حکما کے ملفوظات ایک جزو میں درج ہیں۔

۱۷۔ کتاب الکنیٰ: اس میں ان رواۃ کا ذکر ہے جو ناموں کے بجائے کنیتوں سے مشہور ہیں، اسی لیے بعض لوگوں نے اس کا نام کتاب اسماء المعروفین بالکنیٰ لکھا ہے، یہ سات جزوں میں ہے۔

۱۸۔ کتاب الاکتفاء فی قراءۃ نافع وابی عمرو: اس میں قرائے سبعہ کے ان دونوں ائمہ کے اختلافات کی توجیہ اور ان کے دلائل بیان کیے گئے ہیں، یہ ایک جزو میں ہے۔

۱۹۔ کتاب الدرر فی اختصار المغازی والسیر: اس میں رسول اللہ ﷺ کے حالات اور غزوات کے واقعات تحریر کیے گئے ہیں، یہ دراصل ابن اسحاق وابن عقبہ کی کتابوں کا خلاصہ ہے، کتب خانہ خدیویہ مصر میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے (فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۵ ص ۵۳ وتذکرۃ النوادر ص ۸۰) اور اب شائع بھی ہوچکی ہے۔

۲۰۔ کتاب بہجۃ المجالس وانس المجالس: اس میں ادب ومحاضرات کی بلند پایہ کتابوں سے نادر واقعات، دلچسپ حکایتیں، منتخب اشعار اور حکیمانہ اقوال جمع کیے گئے ہیں، ایک سو چوبیس ابواب (ابن خلکان ج ۳ ص ۴۱۸) پر مشتمل یہ رسالہ دو یا تین جلدوں میں ہوگا، ابن خلکان نے اس کتاب کے مندرجہ ظریفانہ واقعات نقل کیے ہیں، اس کے بعض اجزا چھپ گئے ہیں۔

۲۱۔ کتاب الکافی: صاحب کشف الظنون نے اس کا نام کافی فی فروع المالکیہ لکھا ہے، یہ فقہ مدینہ اور مذہب مالکی کے فروع وجزئیات میں ایک مبسوط کتاب ہے جو پندرہ یا سولہ جزوں پر مشتمل ہے، اس میں ان باتوں کا ذکر ہے، جن کی معرفت مفتی کے

Marfat.com

لیے ضروری ہے، مدینہ کے کتب خانہ سیدنا عثمان میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ (مقالات سلیمان ج ۲ ص ۳۷۴)

۲۲۔القصد والامم: پورا نام القصد والامم فی التعریف باصول انساب العرب والعجم ومن اول تکلم بالعربیۃ من الامم ہے، اس سے موضوع کا پتہ چل جاتا ہے، یعنی بعد وطن، مرور ایام اور امتداد زمانہ کی وجہ سے عربی وعجمی قبائل واقوام کے حسب ونسب میں گڈمڈ اور خلط ملط ہو جانے کا ذکر ہے، (مقدمہ القصد والامم) ابتدا میں یہ بحث کی گئی ہے کہ سب سے پہلے کس شخص نے عربی میں بات چیت کی، یہ رسالہ ۱۳۵۰ھ میں قاہرہ سے چھپا ہے۔

۲۳۔الانباہ علی قبائل الرواۃ: یہ دراصل استیعاب کا دیباچہ ہے، اس میں ان اہم قبائل کا ذکر ہے جن کو رسول اکرم ﷺ سے قربت واتصال اور روایت کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے، مصنف کا خود بیان ہے کہ اس میں انہوں نے مندرجہ ذیل اصحاب کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

۱۔ابوبکر محمد بن اسحاق، ۲۔ابو منذر ہشام بن محمد بن سائب کلبی، ۳۔ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ، ۴۔محمد بن عبدہ بن سلیمان، ۵۔محمد بن حبیب، ۶۔ابو عبداللہ احمد بن محمد بن عبید عدوی، ۷۔زبیر بن بکار، ۸۔مصعب بن عبداللہ زبیری، ۹۔علی بن کیسان کوفی، ۱۰۔علی بن عبدالعزیز جرجانی، ۱۱۔عبدالملک بن حبیب اندلسی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب بڑی محنت ومطالعہ کا نتیجہ ہے، اس میں مذکورہ بالا حضرات کے اقوال کے علاوہ احادیث وآثار اور اہل اخبار وسیر کے بیانات بھی شامل ہیں، (ملاحظہ ہو مقدمہ کتاب ہذا) اور عرب کے مختلف قبائل کے انساب اور علم انساب کی اہمیت کا تذکرہ کیا گیا ہے، القصد والامم کے ساتھ یہ کتاب بھی ۱۳۵۰ھ میں شائع ہوئی ہے، جلال الدین سیوطی نے اس کا ذیل لکھا تھا۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۱۵۳)

۲۴۔الانصاف فیما فی بسم اللہ من الخلاف: اس میں بسم اللہ کے متعلق صحابہ وتابعین، ائمہ سلف اور فقہا کے مذاہب، ان کے مسالک واختلافات نقل کیے گئے ہیں کہ وہ سورۂ فاتحہ کی آیت ہے یا نہیں؟ اور نماز میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ اس کو بھی پڑھنا چاہیے یا نہیں اور اگر پڑھنا چاہیے تو زور سے یا آہستہ سے، نیز وہ تمام قرآنی سورتوں کی آیت ہے یا صرف سورۂ نمل کی؟ مصنف نے ان امور کے متعلق تین مستقل مذاہب تحریر کیے ہیں، کہیں کہیں ان مذاہب کے جزوی اختلافات کا ذکر بھی آ گیا ہے، ہر ہر مذہب کے دلائل اور اس کی مؤید حدیثیں بھی جمع کی گئی ہیں، اس سے مصنف کی غیر جانب داری کا اندازہ ہوتا ہے، یہ رسالہ ۱۳۴۳ھ میں مصر سے شائع ہوا تھا۔

۲۵۔الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الفقہاء ومالک والشافعی وابی حنیفہ:

یہ فقہ اسلامی ائمہ ثلاثہ کے فضائل ومناقب اور اوصاف وکمالات کا مجموعہ اور تین جزوں پر مشتمل ہے، پہلے جزو میں امام مالک کا دوسرے میں امام شافعی کا اور تیسرے میں امام ابوحنیفہ کا تذکرہ ہے، مصنف نے ان اساطین فقہ کے تذکرہ میں ضمناً ان کے نامور تلامذہ اور ممتاز اصحاب کا بھی مختصر تذکرہ شامل کر دیا ہے، یہ رسالہ مکتبہ قدسی قاہرہ سے ۱۳۵۰ھ میں شائع ہوا ہے، شروع میں مصنف کے مختصر حالات بھی درج ہیں۔

۲۶۔جامع بیان العلم وفضلہ: یہ علم کی حقیقت، علما کی فضیلت وعظمت اور ان کے فرائض وغیرہ کے متعلق ایک اور جامع

Marfat.com

کتاب ہے، اس میں طلب علم کی اہمیت اس کے ضروری آداب، طلبہ، شیوخ اور علما کے اوصاف اور دین میں علم ونظر، فکر واستدلال، قیاس واجتہاد، فہم وبصیرت اور دلیل وبرہان کی ضرورت اور تقلید واتباع کا فرق واضح کیا گیا ہے اور بحث ومباحثہ، قیاس ورائے اور تقلید کی مختلف قسموں پر گفتگو کر کے یہ دکھایا گیا ہے کہ ان کی کون سی صورتیں پسندیدہ اور کون سی ناروا اور ناپسندیدہ ہیں، مصنف نے ان امور کے متعلق روایات وآثار اور سلف صالحین کے اقوال کا عمدہ ذخیرہ جمع کر دیا ہے اور روایتوں کی صحت وسقم اور سندوں کی قوت وضعف پر فنی کلام بھی کیا ہے، یہ کتاب ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی تھی، احمد بن عمر محمصانی بیروتی ازہری نے اس کا مختصر شائع کیا ہے، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ایما سے اس مختصر کا اردو ترجمہ کر کے ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع کیا تھا، اس کے مقدمہ میں انہوں نے اسلام سے پہلے اور بعد کی علمی حالت، اسلام میں علم کی اہمیت اور مسلمانوں کے علم وفن میں اشتغال وانہماک کا ذکر کیا ہے۔

علامہ ابن عبدالبر نامور محدث تھے، خصوصاً حدیثوں کی شرح وتوجیہ میں وہ بڑے ممتاز سمجھے جاتے تھے، مالکیہ میں اس پایہ کا اور کوئی شارح حدیث نہیں گزرا، انہوں نے مؤطا امام مالک کی کئی شرحیں لکھی تھیں، ذیل میں ان شرحوں کے متعلق معلومات درج کئے جاتے ہیں۔

۲۷۔ کتاب الاستذکار: اس کا پورا نام الاستذکار بمذاہب علما الامصار فیما تضمنہ المؤطا من معانی الرای والآثار ہے، یہ مصنف کی عظیم الشان شرح تمہید کا خلاصہ اور اسی طرح شروح حدیث میں بڑی اہم کتاب خیال کی جاتی ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

''یہ مؤطا کی بہترین اور عمدہ شرحوں میں ہے، اس کے ابواب کی تنسیق میں بڑی فنی مہارت سے کام لیا گیا ہے اور مختصر ہونے کی وجہ سے نہایت مقبول ومتعارف ہے۔'' (بستان المحدثین ص ۷۰)

مدینہ کے کتب خانہ محمودیہ اور سیدنا عثمانؓ کے علاوہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔
(مقالات سلیمان جلد دوم ص ۳۰۷ و ۴۷ و فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر جلد اص ۲۶۷)

۲۸۔ التقصی بحدیث الموطا، ۲۹۔ التقصی بحدیث المؤطا: بعض لوگوں نے ان دونوں کو ایک ہی تصنیف قرار دیا ہے لیکن یہ دو مستقل کتابیں معلوم ہوتی ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا بیان ہے کہ التقصی مؤطا کی احادیث مسند ومتصل کے انتخاب وترتیب وبیان اور التقصی اور موطا کی منقطع، مرسل، منفصل اور بلاغات کے وصل ورفع واسناد پر مشتمل ہے، (حیات امام مالک ص ۱۰۳ و ۱۰۵) صاحب کشف الظنون کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ (کشف الظنون جلد دوم ۵۷۲)

التقصی امام مالک کے شیوخ کے ناموں پر مرتب کی گئی ہے، باجی اور ابوعمران فارسی نے اس کو قابسی کے ملخص پر ترجیح دی ہے، مدینہ کے کتب خانہ شیخ الاسلام عارف حکمت بے میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ (مقالات سلیمان جلد دوم)

التقصی کے متعلق کتانی نے لکھا ہے کہ یہ مرسل، منقطع اور معضل روایات کے وصل میں ہے، مؤطا میں جو حدیثیں بلغنی عن الثقۃ کہہ کر مسند بیان کی گئی ہیں، ان کی تعداد اکسٹھ ہے، ان میں سے چار کے علاوہ سب دوسرے طرق سے مروی ہیں۔
(الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۴ و ۱۵)

۳۰/۴۔ کتاب التمہید کا دیباچہ یا مختصر ہے جو ۱۳۵۰ھ میں مکتبہ قدسی قاہرہ سے چھپی ہے، اس کا نام ٹائٹل پر تجرید

Marfat.com

التمہید لما فی المؤطا من المعانی والاسانید او التقصی لحدیث المؤطا و شیوخ مالک'' درج ہے اور ناشر نے اس کو تمہید کا خلاصہ بتانے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا دونا موں تجرید التمہید او التقصی سے موسوم کیا جانا عجیب نہیں ہے، کیونکہ پہلے زمانہ میں مصنفین عموماً اسی طور پر نام رکھتے تھے۔ (تجرید ص ۳)

اس بیان سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ تمہید اور تقصی ایک ہی کتاب ہے، کیونکہ تجرید کے مقدمہ سے بداہتاً ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمہید کا مقدمہ یا خلاصہ ہے چنانچہ مصنف لکھتے ہیں:

''تمہید کی طوالت کی وجہ سے ہم نے مؤطا کی احادیث و سنن کو اس میں علیحدہ جمع کر دیا ہے اور مسند، مرسل، متصل و منقطع کو ممیز کر دیا ہے، کیونکہ یہ سب امام مالک اور ان کے اتباع کے نزدیک حجت و واجب العمل ہیں، پس اس کو کتاب التمہید کا ایک ایسا آسان مدخل (مقدمہ) خیال کرنا چاہیے جس میں امام مالک کے رواۃ کے وصل وارسال پر مختصراً تنبیہ کی گئی ہے۔''

(ایضاً ص ۱۰ و ۱۱)

اس کی ترتیب حروف معجم کے مطابق ہے اور اس میں امام مالک کے شیوخ کے نام و نسب، کنیت، سنین وفات، روایت میں ان کا درجہ، ضبط و ثقاہت، ان سے امام مالک کی مرویات کی تعداد، حدیثوں کے رفع و اتصال اور وقف و انقطاع اور اسناد وارسال پر بحث کی گئی ہے اور حدیثوں کا متن بھی دیا گیا ہے اور آخر میں بلاغات و مراسیل کا علیحدہ باب ہے مطبوعہ نسخہ کے اخیر میں تمہید کے بعض اجزا بھی شامل کیے گئے ہیں۔

امام مالک کے رواۃ کے متعلق تجرید ایک عمدہ کتاب ہے۔

۵/ ۱۳۱۔ التمہید لما فی المؤطا من المعانی والاسانید: یہ مؤطا کی ضخیم اور عظیم الشان شرح ہے، اس کو حدیث کی عمدہ اور بہترین شرحوں میں خیال کیا جاتا ہے، اسی کی بدولت حافظ ابن عبدالبر کو ممتاز محدث اور مالکیہ میں سب سے بلند پایہ شارح حدیث قرار دیا گیا ہے، ابن خلکان نے اس کو ستر جزوں پر مشتمل بتایا ہے، بعض علما کا خیال ہے کہ یہ پندرہ یا بیس جلدوں میں تھی، اس کی اہمیت کا اندازہ علمائے فن کے ان بیانات سے ہوتا ہے۔

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ ''فقہ حدیث میں ایسی عمدہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔''

علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ ''عبدالبر سے پہلے کسی نے ایسی عظیم الشان کتاب نہیں لکھی تھی۔''

شاہ عبدالعزیز صاحب رقمطراز ہیں: یہ فقہ حدیث میں نادرۂ روزگار اور روشن ضمیر مجتہدوں کے لیے سرمۂ بصیرت ہے۔ مذہب مالکی کے متعلق تنہا یہی کتاب کافی ہے۔

(نفح الطیب ج ۳ ص ۱۳۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۵ و ابن خلکان ج ۳ ص ۳۱۸ و الدیباج المذہب ص ۳۵۷ و بستان المحدثین ص ۶۹)

مولانا محمد سورتی مرحوم اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں ''شروح حدیث میں ابن عبدالبر کی قابل قدر اور بہترین کتاب ہے جس کی نظیر اب تک کوئی شرح نہیں دیکھی گئی، ابن حزم نے اس کی بے حد تعریف کی ہے اور یہ اس کا استحقاق بھی رکھتی ہے۔ یہ کتاب اپنے فن میں لاجواب اور اعلیٰ ترین علمی کارنامہ ہے۔'' (معارف فروری ۳۲ء)

اس کی ترتیب بھی امام مالک کے رواۃ اور شیوخ کے ناموں پر کی گئی ہے اور اس میں مؤطا کی حدیثوں کی تشریح، ان کے معانی و مطالب کی وضاحت اور ان کی اسانید کی تحقیق کے علاوہ فقہ و حدیث کے گوناگوں فوائد و نکات تحریر کیے گئے ہیں، مصنف

Marfat.com

کا خود بیان ہے کہ:

''ہم نے تمہید میں سنن وروایات کے معانی و وجوہ اور ان کی بابت علما کے آراء و مذاہب تفصیل سے لکھے ہیں، اس لیے یہ شرح بہت طویل ہوگئی ہے، علاوہ ازیں اس میں شواہد و ادلہ کی کثرت ہے، شروع میں امام مالک کے فضائل و کمالات، نقل و روایت حدیث میں ان کی احتیاط اور چھان بین اور حدیث کے اصول وضوابط بیان کئے گئے ہیں، مؤطا کے مراسیل کا وصل بھی ثقہ راویوں کے طرق سے بیان کر دیا گیا ہے، تاکہ مراسیل کی صحت پوری طرح ظاہر ہوجائے۔'' (تجرید ص ۹ و ۱۰)

شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی لکھتے ہیں کہ ''اس ترتیب وتصحیح میں ابن عبدالبر نے مؤطا کے بارہ مستند اور مشہور نسخوں سے مدد لی تھی، (مصفی ص ۷) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے کتنی جانفشانی اور کس قدر اہتمام سے یہ شرح لکھی تھی۔

تجرید کے مطبوعہ ایڈیشن کے آخر میں اس کے جو اجزاء شائع کئے گئے ہیں، ان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بڑی مفید، محققانہ اور معلومات افزا شرح ہے، مگر غالباً ابھی تک یہ بے نظیر شرح شائع نہیں ہوئی ہے، تمہید کے قلمی نسخے ہندوستان، حجاز اور مصر کے بعض کتب خانوں میں موجود ہیں مگر وہ ناقص ہیں، تمہید کی اہمیت اور ضخامت کی وجہ سے اس کے مختصرات لکھے گئے ہیں، خود مصنف نے استذکار و تجرید کے نام سے اس کے دو خلاصے لکھے تھے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے صاحب کشف الظنون نے ابوالولید، سلیمان بن خلف باجی (م ۴۷۴ھ) شیخ زین الدین عمر حلبی اور ابوعلی حسن ابن رشیق قیروانی (م ۴۵۶ھ) کے مختصرات کا ذکر کیا ہے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۲۷۳)

۳۲۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: یہ نہایت مفید اور اہم کتاب ہے اور مغرب کی طرح بلاد مشرق میں بھی اس کا آوازۂ شہرت پوری طرح بلند تھا اور لوگ اس کو بڑی قدر و عظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس میں ۲۵۸۵ صحابہ کرام کے حالات و مناقب بیان کئے گئے ہیں، اس سے پہلے بھی صحابہ کرام کے حالات میں کئی مستقل کتابیں لکھی جاچکی تھیں مگر استیعاب کو ان میں یک گونہ اہمیت حاصل ہے، اہل فن کے نزدیک طبقات صحابہ میں ابوعبداللہ بن مندہ، حافظ ابونعیم اور قاضی ابوعمر بن عبدالبر کی کتابیں زیادہ مشہور و مقبول خیال کی جاتی ہیں جو متاخرین کی کتابوں کا ماخذ ہیں۔''

علامہ ابن اثیر جزری متوفی ۶۳۰ھ لکھتے ہیں:

''صحابہ کے حالات میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر سب میں جامع ابن مندہ، ابونعیم اور ابن عبدالبر قرطبی کی کتابیں ہیں، اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے ان کی تصنیفات عمدہ اور سعی بلیغ کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے میں نے ان کے مواد محتویات کو یکجا کر کے ان میں بعض اضافے کرنے کا ارادہ کیا ہے۔'' (مقدمہ اسد الغابہ ص ۳ و ۴)

حافظ ذہبی ابن اثیر کی کتاب کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

''اسد الغابہ ان تمام صحابہؓ کے ناموں پر مشتمل ہے جو معرفت صحابہؓ میں لکھی جانے والی چاروں کتابوں میں مذکور ہیں، یہ ابن مندہ اور ابوعمر بن عبدالبر کی کتابوں کا ذیل ہونے کے باوجود بعض اہم اور مفید اضافوں پر مشتمل ہے۔'' (تجرید اسماء الصحابہ ص ۲ و ۳)

اس موضوع کی عظیم الشان اور معرکہ آراء کتاب حافظ ابن حجر کی الاصابہ فی تمیز الصحابہ ہے جو بعد میں لکھی جانے کی وجہ سے بڑی جامع اور مکمل ہے، تاہم قدما کی تصنیفات خصوصاً ابن عبدالبر کی کتاب اس کا ماخذ ہے، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:

جمع فیه مافی الاستیعاب و ذیله۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۱۰۱)

Marfat.com

جو کچھ استیعاب میں ہے اصابہ اس کی جامع بھی ہے اور اس پر ذیل بھی۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ معرفت صحابہ میں لکھی جانے والی اہم کتابوں میں استیعاب بھی ہے، بلکہ ابن مندہ اور ابونعیم کی کتابوں پر اس کو یک گونہ ترجیح حاصل ہے۔ علامہ ابن حزم کا بیان ہے کہ ''معرفت صحابہ میں بے شمار کتابیں لکھی گئی لیکن متقدمین میں کسی کی کتاب ابن عبدالبر کی کتاب کے ہم پایہ نہیں ہے۔'' باجی سے منقول ہے کہ اس موضوع پر کوئی کتاب استیعاب کے برابر نہیں ہے، ابن خلکان اور صاحب دیباج لکھتے ہیں کہ ''اس فن میں یہ مفید اور بلند پایہ کتاب ہے۔''

(وفیات الاعیان ج ۳ ص ۲۱۸ والدیباج المذہب ص ۳۵۷)

دوسرے متقدمین کی طرح اب ابن مندہ اور ابونعیم کی کتابیں بھی معدوم اور ناپید ہیں مگر ابن عبدالبر کی کتاب موجود ہے، اس کے بعد جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ابن اثیر اور حافظ ابن حجر کی کتابیں جو محفوظ رہ گئی ہیں، بڑی اہم اور جامع ہیں، تاہم استیعاب کو زمانی تقدم حاصل ہے۔

ترتیب:

استیعاب کو حروف معجم کی ترتیب کے مطابق علیحدہ علیحدہ ابواب پر مرتب کیا گیا ہے لیکن مصنف کا تعلق بلادِ مغرب سے ہے اور اہل مغرب کے یہاں حروف معجم کی ترتیب اہل مشرق سے مختلف ہے، اس لیے اس میں اسی کا لحاظ کیا گیا ہے، پہلے ناموں اور کنیتوں کے لحاظ سے صحابہ کرام کا اور آخر میں ناموں اور کنیتوں کے اعتبار سے صحابیات کا ذکر ہے، ہر حرف کے خاتمہ کے بعد جداگانہ فصل قائم کر کے اسی حرف کے باقی ماندہ اسماء کو بلا ترتیب باب الافراد کے عنوان کے تحت جمع کیا ہے۔

صحابہ کرام سے پہلے شروع میں مصنف نے تبرک کے خیال سے رسول اللہ ﷺ کا بھی مختصر اور جامع تذکرہ لکھا ہے۔

مقصد تصنیف:

ابن عبدالبر نے استیعاب کی تصنیف کی یہ وجہ لکھی ہے:

''کتاب اللہ کی مراد کو واضح کرنے کا اصل ذریعہ اور اس کے بعد سب سے اہم اور مقدس چیز سنن نبوی کا علم ہے اور سنت کے حفظ و ضبط میں سب سے زیادہ مفید و معاون چیز رسول اللہ ﷺ کے حواری و صحابہؓ کی معرفت ہے، کیونکہ انہی لوگوں کے نقل و بیان سے سنتیں ہم تک پہنچی ہیں، پس یہ لوگ نبی ﷺ اور امت کے درمیان واسطہ ہیں ان کی فضیلت، تعدیل اور تزکیہ کا خود خدا اور رسول نے ذکر کیا ہے۔'' (مقدمہ استیعاب ج ۱ ص ۱ و ۹)

شرائط:

صحابہ کی تعریف میں محدثین اور علما کا اختلاف ہے، مصنف نے جس معیار اور شرط کے مطابق صحابہ کے ناموں کو اس میں جمع کیا ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

''صحابی کی تعریف میں ہم نشینی صحبت اور مجالست وغیرہ کی جو قید بیان کی گئی ہے، ہم نے اس پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس میں مزید وسعت دے کر ان لوگوں کو بھی شامل کر لیا ہے جنہوں نے حالت ایمان میں آپ ﷺ سے ملاقات کی تھی، خواہ ان کی ملاقات

Marfat.com

ایک ہی دفعہ کی رہی ہو، اسی طرح جن لوگوں نے آپ کو ایک بار دیکھا تھا یا آپ سے کوئی ایک لفظ سن کر بیان کیا ہے اور یہ اصول روایت کے مطابق ہم تک پہنچا ہے یا جو لوگ آپ کے عہد میمون میں مسلمان والدین کے یہاں پیدا ہوئے اور آپ نے ان کو دیکھ کر ان کے لیے خیر و برکت کی دعا فرمائی یا جن لوگوں نے آپ پر ایمان لا کر آپ کی خدمت میں صدقات بھجوائے مگر خود آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکے، ان سب کا ہم نے تذکرہ کیا ہے۔" (ایضاً ص ۱۰ و خاتمہ ج ۲ ص ۸۰۶)

خصوصیات:

استیعاب کی بعض نمایاں اور اہم خصوصیات یہ ہیں:

1. قدما کی کتابوں کی غیر ضروری تفصیل اور واقعات کے تکرار نے صحابہؓ کے صحیح مقام و مرتبہ، ان کے اصلی واقعات و کارنامے اور حقیقی فضائل و کمالات کو اوجھل کر دیا ہے لیکن استیعاب میں اختصار کے باوجود ضروری نکات اور مفید مباحث ہی درج کئے گئے ہیں تاکہ قاری غیر متعلق بحثوں میں الجھے بغیر اصل مقصود سے خاطر خواہ واقف ہو جائے۔

2. یہ ان کتابوں کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، جو اس سے پہلے لکھی گئی تھیں مگر اختصار کے باوجود اس قدر جامع ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد ان طویل و ضخیم کتابوں کو پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، اس اعتبار سے قدما کی ناپید کتابوں کی اس سے تلافی ہو گئی ہے، اس میں ان کے مختلف بیانات نقل کر کے مشہور و مرجح قول کی تعیین و تصریح بھی کی گئی ہے۔

3. گو اس کتاب کا اصل مقصد صحابہ کرام کے سادہ واقعات زندگی بیان کرنا ہے تاہم اس ضمن میں ان کے انساب و احساب کے متعلق معلومات اور روایات و اسناد پر اصول روایات کے مطابق محققانہ بحث و کلام بھی کیا گیا ہے وہ خود لکھتے ہیں کہ میں نے صحابہ کرامؓ کے ناموں اور اہم واقعات کو اس طرح ذکر کیا ہے کہ ان سے واقف ہو جانے کے بعد علم و معرفت حدیث میں بھی پورا ادرک حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں مرسل و مسند وغیرہ کے متعلق مفید معلومات ہیں۔
(خاتمہ ج ۲ ص ۸۰۶)

4. استیعاب نہایت معتبر و مستند کتاب ہے، مصنف کا خود بیان ہے کہ میں نے اس کی تالیف میں علمائے سیر و انساب کے مشہور اقوال کو نقل کرنے میں ان معروف و معتبر کتابوں پر اعتماد کیا ہے، جن پر علما نے اسلامی عہد کے وقائع و احوال اور اہل اسلام کے سیر و سوانح کی معرفت کے سلسلہ میں اعتماد کیا ہے، اسی طرح اس میں پہلے کی تمام کتابوں یا سماعی روایات سے جو کچھ مصنف کو معلوم ہو سکا اس کو تحقیق و انتخاب کے بعد شامل کیا ہے، مصنف نے مقدمہ میں ان تمام کتابوں کا ذکر کیا ہے جو ان کا ماخذ تھیں، اس سے ان کی محنت و تحقیق اور وسعت علم و نظر اور کثرت مطالعہ وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بعد میں یہ تمام کتابوں کا ماخذ بن گئی ہے۔

تلخیصات و ذیول:

استیعاب کی اہمیت کی وجہ سے اس کے مختصر و ذیول بھی لکھے گئے اور دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے بھی کیے گئے، بعض خلاصوں کے نام یہ ہیں:

Marfat.com

۱ شہاب الدین احمد بن یوسف بن ابراہیم اذرعی مالکی نے روضۃ الاحباب فی مختصر الاستیعاب لکھا۔
(فہرست کشف الظنون ج ۱ ص ۹۳)

۲ محمد بن یعقوب بن محمد بن احمد خلیلی نے اعلام الصحابہ باعلام الصحابہ کے نام سے اختصار و تلخیص کی۔ (الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۶۵)

۳ شیخ ابومحمد زکی الدین بن عبدالقوی منذری شافعی مصری (م ۶۵۶ھ) نے استیعاب کے مختصر کا مختصر لکھا، اس کا قلمی نسخہ رام پور کے کتب خانہ میں ہے۔ (فہرست کتب خانہ خانہ رام پور ج ۱ ص ۱۳۸)

۴ ابن ابی طی یحییٰ بن حمیدہ حلبی (م ۶۳۰ھ) نے استیعاب کی تہذیب و تنقیح کی تھی۔

۵ سلطان احمد خاں عثمانی نے اپنے امام مولیٰ مصطفیٰ کو اس کے ترجمہ کا حکم دیا لیکن وہ حرف ح تک مکمل کرنے کے بعد انتقال کر گئے، ان کے بعد مولیٰ کمال الدین محمد بن احمد المعروف بطاش کبریٰ زادہ نے اس کو شروع کر کے حرف را تک مکمل کیا تھا کہ سلطان کی وفات ہو گئی اور ترجمہ ناقص رہ گیا۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۹۳ و ۹۴)

جامعیت کے باوجود استیعاب میں بعض صحابہ کے حالات رہ گئے تھے، اس لیے بعض اصحاب علم نے اس کے ذیول لکھے۔

۱ ابوبکر بن فتحون مالکی اندلسی (متوفی ۵۱۹ھ) نے جو قاضی عیاض کے شیوخ میں ہیں ایک عمدہ اور سیر حاصل ذیل لکھا، اس میں ابوعمر کے شرائط کے مطابق ان پر استدراک کر کے متعدد ناموں کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۲ ابن فتحون کے معاصر ابواسحاق بن امین نے بھی ذیل لکھا تھا۔

۳ ابوالقاسم محمد بن عبدالواحد غافقی غرناطی (متوفی ۶۱۹ھ) نے ذیل لکھا۔

۴ ابوالحجاج یوسف بن محمد مقلد، جماہری (متوفی ۵۵۸ھ) نے الارتجال فی اسماء الرجال کے نام سے ذیل لکھا، اس میں استیعاب پر استدراک بھی کیا گیا ہے۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۹۳ والرسالۃ المستطرفہ ص ۱۶۵)

اس گراں مایہ کتاب کو دائرۃ المعارف حیدر آباد نے پہلی دفعہ دو جلدوں میں ۱۹، ۱۳۱۸ھ میں شائع کیا، دونوں جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۸۰۸ اور ۹۶ صفحے فہرست کے ہیں، مولانا احسن بن احمد حنفی نے تصحیح کی اور مختصر حواشی لکھے ہیں، دوسری مرتبہ اس کو ابن حجر کی اصابہ کے حاشیہ پر مصر سے ۱۳۲۸ھ میں چار جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

حافظ ابن حجر اصابہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> "ابن عبدالبر نے اس خیال سے کہ انہوں نے متقدمین کی کتابوں کے تمام مواد و معلومات کو اس میں شامل کر دیا ہے، اس کا نام استیعاب رکھا ہے لیکن اس میں بہت سارے صحابہ کا ذکر نہیں آسکا ہے، اسی لیے اس کے متعدد ذیول لکھے ہیں۔"

اس بیان سے استیعاب کی عظمت و اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا اور نہ فی الواقع اس کے اندر کوئی خاص اعتراض کی بات ہے، کیونکہ اس کا تجزیہ کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱ چونکہ یہ متقدمین کی کتابوں کے مباحث و معلومات پر مشتمل ہے اس لیے اس کا نام استیعاب رکھا گیا ہے۔

۲ اس میں بہت سارے صحابہ کا تذکرہ نہیں ہے۔

Marfat.com

پہلے جزو سے اعتراض ثابت نہیں ہوتا، دوسرے جزو میں جو اعتراض کی بات معلوم ہوتی ہے، وہ اسی وقت درست ہوسکتی ہے جب ابن عبدالبر نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ انہوں نے اس میں تمام صحابہ کے ناموں کا احاطہ کرنے کی وجہ سے اس کا نام استیعاب رکھا ہے لیکن جب ان کا یہ دعویٰ ہی نہیں ہے، بلکہ انہوں نے اس کا نام استیعاب اس لیے رکھا ہے کہ یہ متقدمین کی کتابوں کے مباحث کو حاوی ہے، علاوہ ازیں ان کا یہ خود بیان بھی ہے کہ "مجھے امید ہے کہ میری یہ کتاب ان لوگوں کی نسبت سے جن کا اس میں تذکرہ ہے، نیز دوسرے فوائد کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر ثابت ہوگی اور اس کے مطالعہ میں ترتیب و بیان وغیرہ کے لحاظ سے دشواری بھی کم پیش آئے گی تاہم میں احاطہ واستقصا کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ اس تقصیر کا اعتراف کرتا ہوں جو انسان کا خاصہ ہے، (مقدمہ استیعاب ص۹) اس بنا پر یہ بیان بطور واقعہ تو صحیح ہوسکتا ہے لیکن بطور اعتراض درست نہیں ہوسکتا۔

Marfat.com

امام ابوبکر خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۴۶۳ھ)

نام ونسب:

احمد نام، ابوبکر کنیت، خطیب لقب اور سلسلہ نسب یوں ہے: احمد بن علی بن ثابت بن احمد بن مہدی بن ثابت۔

(ابن خلکان ج ۱ ص ۴۶)

ولادت ووطن:

امام ابوبکر خطیب کی ولادت پنجشنبہ کے دن ۲۴ / جمادی الاخریٰ ۳۹۲ھ کو عراق کے قریب درزیجان میں ہوئی، یہ بغداد کے قریب اس کے مغرب کی جانب دریائے دجلہ کے کنارے ایک بڑا گاؤں تھا (معجم البلدان ج ۴ ص ۵۲) لیکن امام صاحب کی اصل نشوونما دنیائے اسلام کے مشہور شہر دار السلام بغداد میں ہوئی، اسی لیے وہ بغدادی کہلاتے ہیں، ان کے والد بزرگوار کو علم وفن خصوصاً حدیث سے اشتغال ومناسبت تھی اور وہ درزیجان میں خطیب تھے، اسی لیے یہ ان کے اور ان کے فرزند کے نام کا جزو ہو گیا تھا، امام سمعانی لکھتے ہیں کہ خطیب کی نسبت منبر پر خطبہ دینے کی طرف ہے، اس نسبت سے جو علما ومحدثین منسوب ہیں ان میں ابوبکر احمد زیادہ مشہور ہیں۔

اپنے صاحب علم وکمال باپ کی توجہ سے ابوبکر خطیب بچپن ہی سے علم وفن کی تحصیل میں منہمک ہو گئے تھے۔

(کتاب الانساب ورق ۲۰۴ طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۲ تذکرہ ج ۳ ص ۳۲۱)

اساتذہ:

خطیب کے اساتذہ میں مختلف اسلامی ملکوں اور مرکز حدیث کے فضلا شامل ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن مخلد باقرحی، ابونصر احمد بن حسین کسار، ابونعیم احمد بن عبد اللہ اصبہانی، ابوبکر حیری ابوحازم عبدوی، ابوسعید مالینی، ابوعمر بن مہدی فارسی، ابوالفتح بن ابوالفوارس، ابوالحسن بن رزقویہ، ابوالحسن بن صلت اہوازی، ابوالحسن بن عبدکویہ، ابوالحسن بن بشران، ابوالحسین بن تیم، حسین بن حسن جوالیقی، ابوالقاسم عبد الرحمٰن بن سراج، ابوعمر قاسم بن جعفر ہاشمی، محمد بن عبد اللہ بن شہریار، محمد بن عیسیٰ اور ہلال حفار وغیرہ۔

علوم فقہ کی تحصیل ابوالحسن محاملی، قاضی ابوالطیب طاہر بن عبد اللہ طبری اور ابونصر بن صباغ اور شیخ ابواسحاق وغیرہ سے کی، امام ابوداؤد صاحب سنن کے وہ دو واسطوں سے شاگرد ہیں۔

Marfat.com

تلامذہ:

خطیب کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے، ان میں بعض وہ ہیں جن سے خود خطیب کو شرف تلمذ حاصل ہے، احمد بن احمد متوکلی، ابوبکر احمد بن محمد برقانی، ابوبکر بن خاصیہ، ابوعبداللہ حمیدی، ابوالفضل بن خیرون، ابوالقاسم ازہری، ابومنصور بن خیرون، ابونصر بن ماکولا، طاہر بن سہل اسفرائنی، عبداللہ ابن احمد سمرقندی، عبدالرحمٰن بن محمد شیبانی، عبدالعزیز بن احمد کتانی، عبدالکریم ابن حمزہ، عبیداللہ بن احمد بن عثمان، علی بن احمد بن قیس غسانی، مبارک بن طیوری، محمد بن علی بن ابوالعلا مصیصی، محمد بن مرزوق زعفرانی، ابوالفتح نصراللہ بن محمد مصیصی، ہبۃ اللہ بن عبداللہ شروطی، یوسف بن ایوب ہمدانی۔

علامہ سمعانی فرماتے ہیں کہ میں نے خطیب کے پندرہ تلامذہ سے سماع کیا ہے اور حافظ ابن عساکر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو چوبیس شاگردوں سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ (کتاب الانساب ورق ۲۰۴، طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۲ و تذکرہ ج ۳ ص ۲۳۱)

رحلت وسفر:

خطیب اپنے علم وفن کے دلدادہ والد ماجد کی ترغیب وتشویق سے بچپن ہی میں تحصیل علم میں لگ گئے تھے، ۴۰۳ھ میں گیارہ سال کے ہوئے تو ان کے والد نے باقاعدہ حدیث کا سماع شروع کرایا، اس کے بعد بیس سال کی عمر تک وہ اپنے وطن ہی کے علما و اساطین فن سے کسب فیض کرتے رہے، اس کے بعد بصرہ، کوفہ، نیشاپور، اصفہان، دینور، ہمدان، رے، مکہ، مدینہ، قدس، دمشق اور صور تشریف لے گئے۔

خطیب کو علم وفن سے اشتغال اور مطالعۂ حدیث کا شوق اتنا زیادہ تھا کہ راستہ میں چلتے تھے تو ان کے ہاتھ میں کسی نہ کسی کتاب کا جز ہوتا تھا اور وہ اس کو پڑھتے رہتے تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۱۶ و المنتظم ج ۸ ص ۲۶۷)

حدیث میں درجہ ومرتبہ:

خطیب کی حدیث میں متعدد تصنیفات ہیں گو یا ان کا پایہ زیادہ بلند نہیں ہے تاہم خطیب کا شمار محدثین اور حفاظ میں ہوتا ہے، علمائے فن نے ان کے حفظ وضبط، ثقاہت واتقان اور روایت ودرایت میں اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔

ابوسعد بن سمعانی فرماتے ہیں کہ "وہ ثقہ، حجت اور کثیر الضبط تھے اور ان پر حفظ وضبط کا خاتمہ ہو گیا، ابوالعینان روای کا بیان ہے کہ وہ اس فن میں امام تھے، ان کے جیسا با کمال شخص میں نے نہیں دیکھا، خطیب کے نامور شاگرد ابن ماکولا جو علم حدیث ورجال میں بہت ممتاز تھے، فرماتے ہیں کہ "حدیث رسول کی معرفت، حفظ وضبط، اتقان اور فنون علل واسناد، صحیح وغریب، فرد ومنکر اور سقیم وغیرہ نیز روایتوں کی شناخت اور تمیز میں وہ آخری اور نامور محدث تھے، جن کو ہم نے دیکھا ہے، درحقیقت اہل بغداد میں امام دارقطنی کے بعد ان کے جیسا صاحب کمال محدث پیدا نہیں ہوا، میں نے صوری سے خطیب اور ابونصر سجزی کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے واضح طور پر خطیب کو افضل وبرتر قرار دیا، ہم کو اس فن میں جو کچھ حاصل ہوا وہ دراصل اسی امام فن کے فیض وبرکت کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اس کی جزائے خیر عطا فرمائے۔"

موتمن ساجی فرماتے ہیں کہ "بغداد میں امام دارقطنی کے بعد خطیب سے بڑا حافظ حدیث پیدا نہیں ہوا، ابوعلی بردانی کا بیان ہے کہ "شاید خطیب نے بھی اپنے جیسا صاحب فن نہ دیکھا ہو، ابواسحاق شیرازی فرماتے ہیں کہ خطیب معرفت وحفظ حدیث میں

Marfat.com

دارقطنی اور ان کے ہم پایہ لوگوں کے ہم سر تھے۔'' ابو اسحاق شیرازی خطیب کے اساتذہ میں تھے لیکن وہ ان کی مہارت فن اور احادیث میں بلند پائیگی کی وجہ سے ان کے نہایت مداح و معترف تھے، ایک دفعہ خطیب ان کے درس میں حاضر ہوئے تو شیخ نے ایک حدیث بحر بن کثیر سقاء کے واسطہ سے بیان کر کے کہا کہ ان کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ خطیب نے ادب سے ان کا حال بیان کرنے کی استاذ سے اجازت لی، اس وقت شیخ ان کے سامنے سنبھل کر نہایت ادب سے شاگرد کی طرح بیٹھ گئے، جب خطیب نے شرح و بسط سے ان کا حال بیان کیا تو شیخ ابو اسحاق نے بے اختیار آفریں کہا اور فرمایا کہ ''خطیب اپنے وقت کے دارقطنی ہیں۔'' علامہ سمعانی لکھتے ہیں کہ وہ متقدمین حفاظ اور ائمہ کبار یحییٰ بن معین، علی بن مدینی اور احمد بن ابی خیثمہ وغیرہ کے ہم پایہ اور علامہ عصر تھے اور اپنے اقوال و منقولات اور تصنیفات کے جمع و انتخاب میں ثقہ، حجت، صدوق اور معتمد تھے۔''

ابن عبدالبر کی طرح جو خطیب کے معاصر، نہایت بلند پایہ محدث اور اپنے کمالات کی وجہ سے حافظ مغرب کہلاتے تھے، یہ بھی اپنے زمانہ میں حافظ مشرق کہلاتے تھے۔'' شجاع ذہلی کا بیان ہے کہ وہ بے نظیر محدث تھے۔'' سعید مؤدب فرماتے ہیں کہ وہ کثیر الروایات اور جمع و تحریر حدیث پر خاص دھیان دینے والے ثقہ، ضابط، متقن اور نہایت باخبر محدث تھے، علامہ ابن صلاح اور حافظ نووی نے ائمہ صحاح کے بعد جن سات اکابر محدثین کا ذکر کر کے ان کی تصنیفات کو بیش قیمت اور پُر منفعت قرار دیا ہے، ان میں طبقہ ثانیہ کے لوگوں میں خطیب کا نام بھی لیا ہے، علامہ ابن کثیر ان کو مشاہیر محدثین میں بتاتے ہیں اور ابن خلکان فرماتے ہیں کہ ''وہ حفاظ متقنین میں تھے، ابوالحسن ہمدانی نے خطیب کی وفات کو ''علم حدیث کی موت قرار دیا ہے،'' ابن جوزی کا بیان ہے کہ ''وہ فنون حدیث میں فائق تھے، ان پر یہ علم تمام ہو گیا۔'' حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ''وہ امام و حافظ کبیر اور شام و عراق کے محدث تھے، ضبط و اتقان اور حفظ حدیث کا ان پر خاتمہ ہو گیا۔'' علامہ ابن سبکی اور ابوبکر بن ہبۃ اللہ نے بھی ان کی مہارت فن، عظمت شان اور حدیث میں امامت و جلالت کا ذکر کیا ہے۔

خطیب کی حدیث میں عظمت و بلند پائیگی کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جرح و تعدیل کے فن میں یکتا اور روایات و احادیث کی شناخت و تمیز میں ماہر تھے، حدیث، رجال، جرح و تعدیل اور اصول اسناد و روایات میں ان کی کئی کتابیں ہیں، حدیث کے متعلقہ علوم میں شاید ہی کوئی ایسا فن ہو جس میں انہوں نے کتابیں نہ لکھی ہوں، حدیث میں ان کے وثوق و اعتبار کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ بادشاہ وقت نے یہ فرمان جاری کر دیا تھا کہ ''واعظین، علما اور محدثین ان کے سامنے پیش کیے بغیر کوئی حدیث نہ بیان کریں، جس حدیث کی روایت کی خطیب اجازت دیں، وہ بیان کی جائے اور جس کی ممانعت کریں لوگ اس کو بیان کرنے سے باز رہیں۔''

حدیث میں ان کی غیر معمولی بصیرت، گہری تحقیق اور وسیع نقد و نظر کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ کچھ یہودیوں نے جو خیبر میں رہتے تھے اور حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں شام کے اطراف و جوانب میں آباد ہو گئے تھے، خلیفہ کے سامنے ایک خط پیش کیا اور اس کے متعلق دعویٰ کیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کا ہے، جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لکھا ہے، اس پر آنحضور ﷺ کی مہر اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی شہادتیں بھی ثبت تھیں اس خط کا مضمون یہ تھا کہ ''ہم نے یہود کے فلاں فلاں قبیلے سے جزیہ معاف کر دیا'' خلیفہ نے خط کی اصلیت کا پتہ لگانے کے لیے اس کو خطیب کے پاس بھیجا، انہوں نے اس کو بالکل جعلی اور من گھڑت قرار دیا، وجہ دریافت کرنے پر بتایا کہ اس میں حضرت امیر معاویہؓ اور سعد بن معاذؓ کی گواہیاں بھی درج ہیں، حالانکہ

Marfat.com

فتح خیبر کے وقت حضرت معاویہؓ مسلمان نہیں ہوئے تھے اور حضرت سعدؓ کو غزوۂ خندق میں ایسا کاری زخم لگا کر جانبر نہ ہو سکے اور ان کی وفات غزوۂ بنی قریظہ کے قریبی زمانہ میں ہوگئی تھی، اس لیے وہ فتح خیبر کے وقت زندہ ہی نہ تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۳۶ وطبقات الشافعیہ ج ۳ والمنتظم ج ۸ مختلف صفحات وابن خلکان ج ۱ ص ۳۶ وکتاب الانساب ورق ۲۰۴ والبدایہ ج ۱۲ ص ۱۰۱ ومقدمہ ابن صلاح ص ۱۹۲ وبستان المحدثین وغیرہ)

فقہ:

خطیب ممتاز اور نامور فقیہ بھی تھے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ وہ اصلاً فقیہ تھے لیکن فن حدیث و تاریخ سے ان کو زیادہ سروکار رہا، اسی لیے ان علوم کا ان پر غلبہ ہوگیا، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں کہ وہ اکابر و اعیان فقہا میں تھے اور جید و نامور فقہا سے اس فن کی تحصیل و تکمیل کی تھی، ان کی تحقیقات سے ان کی فقہی جزرسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

تاریخ:

حدیث کی طرح تذکرہ و تراجم اور تاریخ بھی ان کا خاص موضوع تھا، اس پر ان کی تصنیفات شاہد ہیں ان کے سوانح نگاروں نے ان کو بلند پایہ مؤرخ بتایا ہے، حافظ ابن کثیر فن تاریخ میں ان کے کمال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

مازلت تدأب فی التاریخ مجتھدا ★ حتی رأیتک فی التاریخ مکتوبا

(البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۱۰۳)

قراءت و علم قرآن:

فن قراءت و تجوید اور علوم قرآنی میں بھی ممتاز تھے، بڑے خوش الحان تھے اور قرآن مجید نہایت ترتیل کے ساتھ پڑھتے تھے، مؤرخین نے ان کے حسن قراءت اور فصیح اللہجہ ہونے کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ (المنتظم ج ۸ ص ۲۶۷)

شعر و ادب:

خطیب اسلامی علوم ہی کے یگانہ و فاضل نہ تھے، بلکہ شعر و ادب میں بھی صاحب کمال تھے، ان کی تصنیفات، ادبی شکوہ، حسن تحریر، لطافت بیان اور سلاست کلام سے معمور ہیں، ان کو لغت و اعراب کے فن سے پوری واقفیت تھی، احادیث صحیح اعراب کے ساتھ پڑھتے تھے، شعر و ادب کے بڑے عارف تھے اور اس پر ان کی اچھی نظر تھی، خود بھی داد سخن دیتے تھے، یاقوت نے معجم الادبا میں اسی حیثیت سے ان کا مفصل تذکرہ لکھا ہے، ابن جوزی کہتے ہیں کہ ادب کے واقف کار اور اچھے شاعر تھے تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں ان کے متعدد اشعار درج ہیں، چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ان کنت تبغی الرشاد محضا ★ لامر دنیاک والمعاد

فخالف النفس فی ھواھا ★ ان الھوی جامع الفساد

اگر دنیا و عقبیٰ کے معاملہ میں خالص ہدایت کے طلب گار ہو تو ہوائے نفس کی مخالفت کرو کیونکہ یہ مفاسد اور برائیوں کا سرچشمہ ہے۔

Marfat.com

لا تغبطن اخا الدنيا لزخرفها ولا للذة وقت عجلت فرحا

فالدهر اسرع شيء في تقلبه وفعله بين للخلق قد وضحا

كم شارب عسلا فيه منيته وكم تقلد سيفا من به ذبحا

دنیا کی رعنائی و دلفریبی کی وجہ سے دنیا والوں پر رشک نہ کرو اور نہ عارضی لذت و آسودگی پر اتراؤ، کیونکہ زمانہ کا انقلاب نہایت تیز اور اس کا برتاؤ لوگوں کے ساتھ بہت کھلا ہوا ہوتا ہے (دنیا کی بے ثباتی اور تدبیر کی درماندگی کا یہ حال ہے کہ) شہد کا شربت پینے والے کتنے لوگوں کی اسی سے موت ہو جاتی ہے۔ اور کتنے ایسے لوگ ہیں جو اپنی گردنوں میں (حفاظت کے خیال سے) تلواریں لٹکائے ہوئے ہوتے ہیں مگر وہ انہی سے موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں۔

طلبت اخا صحيح الود محضا سليم الغيب مامون اللسان

فلم اعرف من الاخوان الا نفاقا في التباعد والتلافي

وعالم دهرنا لا خير فيه ترى صورا تروق بلا معاني

میں نے پرخلوص آپ کی محبت کرنے والے اور ایسے دوستوں کو تلاش کیا جن کا ظاہر و باطن یکساں قابل اعتماد ہو تو مجھے اپنے تمام دوستوں میں نفاق اور دورخے پن کے علاوہ کوئی اور چیز نظر نہیں آئی اور ہمارے زمانے کے علماء اس قدر بے فیض ہیں کہ ان کی صورتیں تو چمکدار ہیں لیکن ان میں کوئی کیفیت و معنی نہیں ہے۔

تو پندو نصائح اور دنیا کی بے ثباتی وغیرہ کے متعلق حکیمانہ اشعار تھے، اب تغزل کی رنگینی و رعنائی ملاحظہ ہو۔

الشمس تشبهه والبدر يحكيه والدر يضحك والمرجان من فيه

من سري وظلام الليل معتكر فوجهه عن ضياء البدر يغنيه

میرے ممدوح کا حسن و جمال شمس و قمر سے بڑھ کر ہے اسی لیے وہ اس کے جمال کی نقل کرتے ہیں، اس کے دانت اتنے آبدار، چمکدار اور خوبصورت ہیں کہ جب وہ ہنستا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موتی و مرجان ہنس رہے ہیں، اگر کوئی شخص گھٹاٹوپ اندھیری رات میں سفر کرے تو محبوب کے جلوۂ جمال آرا اور رخ زیبا کی تابناکی اس کو بدر کامل کی روشنی سے مستغنی کر سکتی ہے۔

وكم حكيم راه ظنه ملكا وردد الفكر فيه انه بشر

بعض دانشوروں نے (اس کی عفت و معصومیت کی وجہ سے) اس کو فرشتہ خیال کیا لیکن جب انہوں نے اس کو بغور دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ انسان ہے۔ (بستان المحدثین ص ۳۷)

دیگر کمالات:

اس گوناگوں کمالات کے ساتھ ان کا خط نہایت عمدہ اور پاکیزہ تھا اور وہ خطاطی اور خوشنویسی کے لیے مشہور تھے، بڑے فصیح البیان تھے، آواز اتنی بلند تھی کہ جامع منصور میں حدیث بیان کرتے تو آخری کونے میں سنائی دیتی تھی۔

ذہانت و فطانت اور مطالعہ سے دلچسپی:

ان کی دماغی قوت و صلاحیت بڑی حیرت انگیز اور ذہانت و ذکاوت نہایت غیر معمولی تھی، ہر وقت علم و مطالعہ کا شغل جاری

Marfat.com

رکھتے تھے، صبر آزما اور مشقت طلب کاموں میں لگے رہنے کے باوجود علمی مشاغل میں بھی مصروف تھے، حج کے زمانہ میں پورا قرآن مجید غروبِ آفتاب کے وقت تک ختم کر دیتے۔ اس کے بعد لوگ ان کے پاس آتے اور حدیثیں بیان کرنے کی فرمائش کرتے تو ذرا بھی کبیدہ خاطر نہ ہوتے بلکہ پورے انشراحِ صدر کے ساتھ ان کو حدیثیں سناتے۔

مکہ کے زمانہ قیام میں کریمہ بنت احمد مروزی ستی سے جو مرو کے ایک گاؤں کشمیہن کی صالح، عبادت گزار اور صاحب فضل وکمال خاتون اور صحیح بخاری کی مشہور راویہ تھیں، صحیح بخاری کو صرف پانچ روز میں ختم کر دیا، اسی طرح بخاری کے ایک راوی اور مشہور راوی ابو عبد الرحمٰن اسماعیل بن احمد فربری سے تین مجلس میں اس کو ختم کیا، دو روز مغرب کے وقت سے پڑھنا شروع کیا اور فجر تک پڑھتے رہے، تیسرے روز چاشت کے وقت سے شروع کر کے مغرب کے وقت تک مکمل کر لیا، علامہ ذہبی نے اس حیرت انگیز دماغی قوت اور ذہانت کو بالکل عجوبہ بتایا ہے۔ (بستان المحدثین ص ۷۳)

اعزاز و مقبولیت:

علمی حیثیت سے خطیب کا پایہ بہت بلند تھا، ابن خلکان نے ان کو علمائے متبحرین میں بتایا ہے، ان کے علمی کمالات اتنے متنوع اور گوناگوں تھے کہ بقول سمعانی (فضلہ اشہر من ان یوصف) ان کو شمار اور بیان نہیں کیا جا سکتا ان کمالات نے ان کو امامت و مقبولیت کا درجہ عطا کیا تھا، خصوصاً فنون حدیث میں تو وہ مسلم امام عصر تھے، سمعانی کا بیان ہے کہ وہ بلا پس و پیش امام عصر اور حافظ دہر تھے، انہوں نے اپنی مقبولیت اور اعزاز کے لیے اللہ تعالیٰ سے حرم کی حاضری کے موقع پر زمزم کا پانی پی کر دعا کی تھی، ان کی یہ دعا ایسی مقبول ہوئی کہ بغداد میں کسی کو ان کے سامنے پیش کئے بغیر حدیث بیان کرنے کی اجازت نہ تھی۔
(تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۳۶)

شکوہ و دبدبہ اور وقار و متانت:

علمی کمالات کے ساتھ ان میں شان و شوکت، ظاہری وجاہت اور رعب و داب بھی تھا اور بڑے وقار، متانت اور سنجیدگی سے رہتے تھے،

علامہ سمعانی لکھتے ہیں:

وکان مھیبا وقورا نبیلا خطیرا ثقۃ۔ (کتاب الانساب ورق ۲۰۴)

ذی ہیبت، باوقار، پر عظمت اور ثقہ و سنجیدہ آدمی تھے۔

ان کی مجلس درس بھی نہایت آراستہ ہوتی تھی، بغداد کی سب سے اچھی اور عمدہ جگہ کو درس کے لیے منتخب کیا تھا۔

زہد و تدین:

خطیب زہد و تقویٰ میں بھی نمایاں تھے، عبادت و تلاوت قرآن سے بڑا شغف تھا اور انفاق فی سبیل اللہ کا ذوق بہت بڑھا ہوا تھا، تصنیف و تالیف، درس و تدریس اور مطالعہ حدیث سے جو وقت بچتا وہ عبادت اور تلاوت قرآن میں بسر ہوتا، ہر روز و شب میں ایک قرآن ختم کرنے کا معمول تھا، اس میں فرق نہیں آنے دیتے، غیر معمولی اوقات، حالات اور سفر میں بھی یہ معمول جاری رہتا، چنانچہ حج بیت اللہ کے سفر میں بھی ہر روز غروب آفتاب کے وقت تک الحان و ترتیل کے ساتھ قرآن مجید ختم کر دیتے تھے۔

Marfat.com

مستجاب الدعوات تھے، ایک دفعہ زمزم کا پانی پی کر خدا سے تین باتوں کی دعا مانگی، اول یہ کہ میری کتاب ''تاریخ بغداد'' کو شرفِ قبول اور حسن اعتبار حاصل ہو، دوسرے بغداد کی جامع منصور میں سب سے عمدہ اور مقدس جگہ میں حدیث کی تعلیم واملا میں مشغول رہنے کی مجھ کو توفیق وسعادت میسر آئے اور آخری دعا یہ تھی کہ بشر حافی کی قبر کے متصل ان کے پہلو میں دفن کیا جاؤں، خدا نے ان کی تینوں دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا۔ (تبیین کذب المفتری ص ۲۶۸ و تذکرہ ج ۲ ص ۳۲۴)

دولت وثروت کی فراوانی اور جذبہ خیر وخیرات:

اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیوی اعزاز و وجاہت اور مال و دولت سے بھی اچھی طرح نوازا تھا، بڑے دولتمند شخص تھے لیکن ان کی دولت وثروت غریبوں اور ناداروں کے لیے وقف تھی، اصحاب علم اور محدثین کی خدمت کے لیے خطیر رقمیں خرچ کرتے تھے، حافظ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ وہ حدیث کے طلبہ کو زروجواہر سے نوازتے تھے، ابوزکریا تبریزی کا بیان ہے کہ ''میں جامع دمشق کے منارہ میں رہتا تھا اور خطیب سے ادب ومحاضرات کی کتابیں پڑھتا تھا، ایک روز وہ خود مجھ سے ملنے کے لیے اوپر تشریف لائے اور کچھ دیر تک باتیں کرنے کے بعد مجھے ایک کاغذ دیا اور کہا یہ اچھا تحفہ ہے، اس کو لے کر قلم خرید لو، میں نے دیکھا تو اس میں چار دینار تھے، پھر دوسری دفعہ بھی وہ اوپر آئے اور اسی طرح کا برتاؤ میرے ساتھ کیا۔

وفات سے پہلے بیماری کے زمانہ میں اپنا سارا مال واثاثہ محدثین، فقہا اور فقرا میں تقسیم کر دیا اور اپنا کتب خانہ مسلمانوں کے لیے وقف کر گئے، یہ وصیت بھی کی کہ مرنے کے بعد جسم کا کپڑا صدقہ وخیرات کر دیا جائے۔

(تبیین کذب المفتری ص ۲۶۸ و تذکرہ ج ۳ ص ۳۲۴)

امراء ووزراء سے تعلقات:

خطیب کے بعض امرا واعیان دولت سے بھی تعلقات تھے اور وہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے، عزالدولہ کے زمانہ میں جو نہایت سخی وفیاض تھا، خطیب صور تشریف لے گئے، تو اس نے بڑا اعزاز واکرام کیا اور مال وزر سے نوازا، حدیث کے استناد کے سلسلہ میں خلیفہ بغداد کو ان پر جس قدر اعتبار تھا، اس کا حال پہلے گزر چکا ہے، جب حج بیت اللہ سے بغداد واپس آئے تو ابوالقاسم بن مسلمہ سے بڑے گہرے تعلقات ہو گئے تھے اور اس نے امام صاحب کی قدر وعظمت شناسی کا خوب حق ادا کیا۔

(المنتظم ج ۸ ص ۲۵۶)

استغناء وبے نیازی:

امراء ووزراء سے قربت وتوسل کے باوجود مزاج میں نہ تو تملق تھا اور نہ حرص وجاہ کی طلب کا جذبہ، مال ودولت سے ہمیشہ بے نیاز اور کنارہ کش رہتے، فضل ابن عمر نسوی کا بیان ہے کہ ایک روز میری موجودگی میں جامع منصور کے اندر ایک علوی شخص ان کے پاس کچھ دینار لے کر آیا اور کہا فلاں شخص نے آپ کو سلام کہا ہے اور یہ ہدیہ دیا ہے تاکہ آپ اس کو اپنی ضرورت میں صرف کریں خطیب نے کہا مجھے ضرورت نہیں، اس نے کہا غالباً آپ اس کو کم سمجھ رہے ہیں، اس لیے اس نے تھیلی کھول کر مصلیٰ پر بکھیر دیا، اس میں تین سو دینار تھے، خطیب برافروختہ ہو گئے اور مصلیٰ اٹھا کر دیناروں کو نہایت تمکنت سے زمین پر جھٹک دیا اور خود مسجد سے باہر چلے آئے، اس پر وہ شخص بہت خفیف ہوا۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۲۳ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۴)

Marfat.com

فقہی مسلک:

خطیب شافعی المذہب تھے، حافظ ذہبی نے ان کو اکابر شافعیہ میں بتایا ہے، اسی لیے مذہب میں ان کے غلو و تعصب کا ذکر بھی کیا جاتا ہے، اس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

عقیدہ:

محدثین اور اصحاب روایت کی طرح وہ عقائد میں امام ابوالحسن اشعری کے ہمنوا تھے، حافظ ابن عساکر تبیین میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

وکان یذھب فی الکلام الی مذھب ابی الحسن الاشعری۔ (تبیین کذب المفتری ص ۲۷۱)

وہ کلام و عقیدہ میں مذہب اشعری پر کاربند تھے۔

ابتلاء و آزمائش:

امام ابوبکر خطیب کے زمانہ میں اسلامی ممالک خصوصاً بغداد میں سخت خلفشار اور ہیجان برپا تھا، ایک طرف شیعی و سنی تصادم اور فقہی مذاہب کے ماننے والوں کے باہمی اختلاف نے ملت اسلامی کا شیرازہ درہم برہم کر دیا تھا اور دوسری طرف حکام و امرا کے اقتدار کی باہمی کشمکش اور افتراق نے حکومت و سلطنت کے نظام کو تہ و بالا کر دیا تھا، ان حالات کا اثر خطیب کی زندگی پر بھی پڑا، ان کے بعض اعیان دولت سے تعلقات کا پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے، قائم بامر اللہ کے دور حکومت میں ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے کچھ امراء و وزراء ان کے درپے آزار ہو گئے اور ان پر بغداد کی سرزمین تنگ ہو گئی اور وہ بغداد چھوڑ کر قید و بند کی زندگی گزارنے کے لیے مجبور ہو گئے۔

۴۴۰ھ اور ۴۵۰ کے درمیان بغداد میں ارسلان المعروف بہ بساسیری نے جو دیالمہ کا ایک ترکی غلام اور بغداد کے ترکوں کا سردار تھا، اتنا عروج و اقتدار حاصل کر لیا کہ خلیفہ قائم بامر اللہ کے خلاف بغاوت کر دی، یہ اگرچہ آخر میں طغرل بک کے ہاتھوں مارا گیا لیکن ایک زمانہ میں وہ دولت عباسیہ کا مختار کل بن گیا تھا اور امراء اور حکام اس سے لرزہ براندام رہتے تھے، عراق و خوزستان میں اس کے نام کا خطبہ بھی پڑھا جانے لگا تھا، غرض عباسی حکومت کے اکثر علاقوں پر اس کا قبضہ و تصرف ہو گیا تھا، قائم بامر اللہ کو اس نے اتنا زیر اور مجبور کر لیا تھا کہ وہ اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا تھا، یہ شخص باطنی شیعہ تھا لیکن بغداد کا رئیس الرؤساسنی تھا، اس لیے دونوں میں اندرونی کشمکش اور مخاصمت رہتی تھی بساسیری نے ۴۵۰ھ میں قبضہ کر کے مستنصر علوی کا خطبہ جاری کر دیا، اس کا یہ عروج و اقبال اور شیعی غلبہ و تسلط دیکھ کر خطیب بغداد سے دمشق چلے گئے لیکن وہاں بھی ان کو سکون نہ ملا، وہاں کا حکمران بھی شیعی تھا، اس کے بعض افعال پر خطیب نے ناراضگی کا اظہار کیا تو اس نے ان واقعات کو بہانہ بنا کر ان کو قتل کر دینا چاہا اور پولیس کو گرفتاری کا حکم بھی دے دیا مگر وہ شریف زینبی کی پناہ میں آ گئے، شریف نے خوبصورتی سے معاملہ کو رفع دفع کر دیا تاہم امیر نے دمشق سے خطیب کی جلاوطنی کا فرمان جاری کر دیا اور یہ پہلے صور پھر حلب و طرابلس ہوتے ہوئے عراق واپس آئے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۳۶ و طبقات الشافعیہ لابی بکر ص ۵۷)

بعض مورخین کا بیان ہے کہ خطیب نے جامع دمشق میں حدیث کا درس دینا شروع کیا، ان کی آواز اتنی بلند تھی کہ مسجد کے

Marfat.com

آخری حصے میں سنائی دیتی تھی، ایک روز اسی شان سے انہوں نے حدیث کا درس دیتے ہوئے فضائل عباس کی حدیثیں بیان کرنا شروع کیں تو روافض اور فاطمیہ سخت مشتعل ہو گئے، یہاں تک کہ انہوں نے خطیب کو قتل کر دینے کا ارادہ کیا لیکن وہ پھر شریف زینبی کی پناہ میں آ گئے، ان کی کوشش وسفارش سے اگرچہ لوگ ان کے قتل کے ارادہ سے باز آ گئے مگر وہ جلاوطن کر دیے گئے۔

(البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۱۰۲)

ان دونوں بیانوں میں معمولی اختلاف کے باوجود خطیب کے آلام ومصائب اور شدائد ومحن میں مبتلا ہونے کی تصریح موجود ہے۔

خطیب کو اپنی فقہی اور جماعتی عصبیت کی وجہ سے بھی ابتلاء ومحن سے دو چار ہونا پڑا، وہ شافعی المذہب تھے اور متکلمین واشاعرہ سے ان کے تعلقات بھی تھے، اس کی وجہ سے حنابلہ نے ان کو زدوکوب کیا۔

وفات:

خطیب رمضان المبارک ۴۶۳ھ میں بیمار ہوئے، بیماری بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ذی الحجہ کی ابتدائی تاریخوں میں ان کی حالت زیادہ خراب ہوگئی اور بالآخر دوشنبہ ۷/ ذی الحجہ کو اکہتر سال کی عمر میں داعی اجل کا پیام آ گیا، بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ شوال ہی میں انتقال ہوا۔

دوسرے روز یعنی منگل کو تجہیز وتکفین کی گئی، جنازہ اٹھانے اور کندھا دینے والوں میں خطیب کے استاذ اور مشہور شافعی فقیہ شیخ ابواسحٰق شیرازی بھی تھے، جنازہ میں ایک جم غفیر شریک تھا، ایک جماعت یہ منادی کر رہی تھی۔

هذا الذی کان یذب عن رسول الله ﷺ هذا الذی کان ینفی الکذب عن رسول الله ﷺ هذا الذی کان یحفظ حدیث رسول الله ﷺ۔

یہ اس شخص کا جنازہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی جانب سے سینہ سپر ہو کر آپ کی طرف سے کذب وافترا کی تردید کرتا تھا اور آپ ﷺ کی حدیثوں کو یاد کرتا تھا۔

ابوالحسین بن مہتدی باللہ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور ان کی آرزو کے مطابق باب حرب میں بشر حافی کی قبر کے پہلو میں دفن کیے گئے، تکفین وتدفین کے بعد کئی قرآن ختم کیے گئے اور بعض لوگوں نے ان کی عنداللہ مقبولیت اور بخشش کے خواب بھی دیکھے۔ (تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۶ تبیین کذب المفتری ص ۲۶۹ و ۲۷۰ وتذکرہ ج ۳ ص ۳۳۹)

حلیہ:

خطیب بڑے وجیہ وشکیل تھے، اہل سیر لکھتے ہیں کہ:

وکان فی درجة الکمال والرتبة خلقا وخلقا وهیئة ومنظرا۔ (تبیین کذب المفتری وکتاب الانساب)

وہ خلق وخلقت (صورت وسیرت) اور ہیئت ومنظر ہر اعتبار سے نہایت کامل تھے۔

اولاد:

مورخین نے تصریح کی ہے کہ ان کے کوئی اولاد نہ تھی، چنانچہ مرض الموت میں اپنا سارا مال واسباب جو آئندہ بیت المال

Marfat.com

کی ملکیت ہونے والا تھا، خلیفہ سے اجازت لے کر فقرا اور اہل علم میں خرچ کر دیا۔

تصنیفات:

خطیب کی تصنیفات کی تعداد ایک سو کے قریب بتائی جاتی ہے، ان میں بہت سی معدوم اور نایاب ہیں، ان کی اکثر کتابیں فنون حدیث سے متعلق گوناگوں مسائل و مباحث اور مفید و متنوع معلومات پر مشتمل ہیں، ان میں ادب وانشاء، حسن تحریر، سلاست وروانی اور طرز ادا و طریقہ بیان کی دلکشی بھی ہے، حافظ ابن جوزی ان کی تصنیفات گنانے کے بعد لکھتے ہیں "جو شخص ان کا بغور مطالعہ کرے گا وہ خطیب کی قدر وعظمت اور عدیم المثال کارنامے کا اعتراف کرے گا، انہوں نے ایسا عظیم الشان علمی ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے جوان سے پہلے کے ان سے کہیں فائق محدثین ائمہ مثلاً دارقطنی وغیرہ بھی نہیں انجام دے سکے۔
(المنتظم ج ۸ ص ۲۶۶)

خطیب کی معلوم کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ ابطال النکاح بغیر ولی، ۲۔ الاسماء المتواطئة والانساب المتکافئه، ۳۔ امالی الخطیب، ۴۔ بیان اہل الدرجات العلی، ۵۔ کتاب التبیین لاسماء المدلسین یا کتاب اسماء المدلسین، ۶۔ کتاب البسملة وانہا جزء من الفاتحہ، بعض لوگوں نے اس کا نام کتاب نہج الصواب فی ان البسملة من فاتحہ الکتاب اور بعض نے نہج الصواب فی ان البسملة آیة من فاتحہ الکتاب بھی لکھا ہے، ۷۔ کتاب الجہر بالبسملة (ایک جز میں)، ۸۔ کتاب التفصیل لمبہم المراسیل یا کتاب مبہم المراسیل، ۹۔ کتاب تمییز المزید فی متصل الاسانید، ۱۰۔ کتاب التنبیہ والتوقیف علی فضائل الخریف، ۱۱۔ کتاب الاجازۃ للمعلوم والمجہول یا اجازۃ المجہول والمعدوم، ۱۲۔ کتاب الاحتجاج بالشافعی فیما اسند الیہ والرد علی الطاغین بعظم جہلہم علیہ، ۱۳۔ جزء حدیث اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الا المکتوبة، ۱۴۔ جزء حدیث الامام ضامن والموذن موتمن، ۱۵۔ جزء حدیث الستة من التابعین وطرقه واختلاف وجوہه، ۱۶۔ جزء حدیث طلب العلم فریضة، ۱۷۔ جزء حدیث النزول، ۱۸۔ جزء حدیث عبدالرحمٰن بن سمرۃ وطرقه، ۱۹۔ کتاب الدلائل والشواہد علی صحة العمل بخبر الواحد، ۲۰۔ کتاب الرحلة یا الرحلة فی طلب الحدیث (ایک جزو میں)، ۲۱۔ کتاب الرواۃ عن مالک، ۲۲۔ کتاب روایات الصحابة عن التابعین، ۲۳۔ کتاب روایة الابناء عن الآباء یا کتاب روایة الآباء عن الابناء، ۲۴۔ کتاب السابق واللاحق، ۲۵۔ کتاب الاسماء والالقاب، ۲۶۔ صلوٰۃ التسبیح والاختلاف فیہا (ایک جز میں)، ۲۷۔ کتاب صوم یوم الشک یا کتاب النہی عن صوم یوم الشک (ایک جزو میں)، ۲۸۔ کتاب طرق حدیث قبض العلم (تین جزوں میں)، ۲۹۔ عوالی مالک بن انس، ۳۰۔ کتاب غسل الجمعة تین جزوں میں۔ ۳۱ کتاب الفصل للوصل والمدرج فی النقل، ۳۲۔ کتاب الفقیہ والمتفقہ، ۳۳۔ کتاب الفنون یا کتاب الفتون، ۳۴۔ الفوائد للصحاح والغرائب، ۳۵۔ القضاء بالیمین مع الشاہد (۲ جزوں میں)، ۳۶۔ کتاب القنوت والآثار لمرویة فیہ (تین جزوں)، ۳۷ کتاب القول فی النجوم یا کتاب القول فی علم النجوم، ۳۸۔ کشف الاسرار، ۳۹۔ کتاب المتفق والمفترق، ۴۰۔ کتاب المسلسلات للرباعیات (تین جزوں میں)، ۴۱۔ مسند ابی اسحاق الشیبانی (۳ جزوں) ۴۲۔ مسند ابی بکر الصدیق علی شرط الصحیحین (ایک جزو میں)، ۴۳۔ مسند بنان بن بشر، ۴۴۔ مسند صفوان بن

Marfat.com

سلیم، ۴۵۔ مسند صفوان غسانی، ۴۶۔ مسند محمد بن حجادہ، ۴۷۔ مسند محمد بن سوقۃ، ۴۸۔ مسند مسعر بن کدام یا مسند مطر الوراق، ۴۹ مسند نعیم بن حماد الغطفانی، ۵۰۔ کتاب معجم الرواۃ عن مالک، ۵۱۔ کتاب معجم الرواۃ عن شعبۃ، ۵۲ کتاب المھمل فی بیان المھلل (ایک جلد میں)، ۵۳۔ مناقب احمد بن حنبل، ۵۴۔ مناقب الشافعی، ۵۵۔ کتاب من حدث ونسی، ۵۶۔ کتاب من واقفت کنیۃ اسم ابیہ مما لا یومن وقوع الخطاء فیہ، ۵۷۔ کتاب الموضح یا کتاب موضح اوہام الجمع والتفریق، ۵۸۔ الاسماء المبہمہ فی الانباء المحکمۃ، ایک جزمیں، حروف معجم کے مطابق مرتب کی گئی ہے، ۵۹۔ کتاب البخلاء اس کا قلمی مصحف بریطانی میں ہے اور تین جزوں پر مشتمل ہے، ۶۰۔ کتاب تقیید العلم تین جزوں کے بقدر ہے اور اس کا مخطوطہ برلن میں ہے، ۶۱۔ کتاب الحیل تین جز میں ہے، بعض مصنفین نے سہواً اس کا نام کتاب الخیل لکھا ہے، جو دراصل ابوجعفر محمد بن حبیب بغدادی (م ۲۴۵ھ) کی تصنیف ہے۔
(کشف الظنون ج ۲ ص ۲۷۶)

۶۲۔ کتاب رافع الارتیاب فی المقلوب من الاسماء والالقاب یا کتاب مقلوب الاسماء (ایک جلد میں رجال حدیث کے متعلق لکھی گئی ہے) (ایضاج ا ص ۵۳۲)

۶۳۔ کتاب المؤتلف والمختلف: یہ ضخیم کتاب امام دارقطنی کی المؤتلف والمختلف فی اسماء الرجال سے ماخوذ ہے، مگر اس میں بکثرت اضافے بھی ہیں، برلن میں قلمی نسخہ موجود ہے۔

۶۴۔ کتاب المؤتنف، کتاب المؤتلف والمختلف کا تکملہ ہے، اسی لیے اس کا نام المؤتنف لتکمۃ المؤتلف والمختلف بھی ہے۔

۶۵۔ کتاب اقتضاء العلم: اس کے متعلق شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ''یہ نہایت عمدہ کتاب ہے، بعض محدثین نے اس کا انتخاب کیا ہے، جو ملک عرب میں مشہور ہے اور اکثر جگہ تحصل واجازت کے وقت اس منتخب کو پڑھاتے ہیں۔
(بستان المحدثین ص ۶۵)

۶۶۔ کتاب الجامع فی ادب الراوی والسامع یا کتاب الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع: الجامع اور جامع خطیب کے نام سے بھی موسوم کی جاتی ہے، اس میں اصول حدیث کے مباحث اور راوی وسامع کے آداب وشرائط کا ذکر ہے۔ (کشف الظنون ج ا ص ۳۸۶)

۶۷۔ کتاب التطفیل یا کتاب الطفیلیین: دمشق سے ۱۳۴۶ھ میں چھپ گئی ہے، خطیب نے اپنے کسی دوست کی فرمائش پر اس میں طفیلیوں کے واقعات وحکایات اور نادر اقوال واشعار جمع کیے ہیں، اس کا شمار ادب ومحاضرات کی عمدہ اور دلچسپ کتابوں میں ہوتا ہے، اس کے شروع میں ناشر نے خطیبؒ کے مختصر حالات وسوانح بھی لکھے ہیں۔

۶۸۔ کتاب شرف اصحاب الحدیث: اس کا مخطوطہ برلن اور مدینہ میں موجود ہے، جماعت اہل حدیث کے ایک صاحب علم مولانا محمد صاحب مدرس مدرسہ محمدیہ وایڈیٹر اخبار محمدی نے حج بیت اللہ کے سفر میں مدینہ کے نسخہ کی نقل لے کر ۱۳۴۵ھ میں محبوب المطابع دہلی سے اس کو شائع کیا تھا، عربی متن کے ساتھ اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے، اس میں حدیث کے ناقلین اور راویوں کے مراتب وفضائل کے متعلق احادیث وآثار اور علمائے اسلام کے اقوال درج کیے گئے ہیں۔

Marfat.com

۶۹۔ کتاب غنیة المقتبس فی تمییز الملتبس: اس کا ایک قلمی نسخہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں ہے، اس کو ۱۳۴۵ھ میں مولانا حمید الدین فراہیؒ نے حیدر آباد میں نقل کرایا تھا، یہ کسی شخص کے استفسار میں لکھی گئی ہے اور اس میں مشتبہ ناموں کے بارے میں اشتباہات کو رفع کیا گیا ہے، ۱۲ جزوں پر مشتمل ہے اور رجال پر مفید کتاب ہے۔

۷۰، ۷۱۔ کتاب تلخیص المتشابه فی الرسم وحمایة ما اشکل منه عن نوادر التصحیف والوهم: یہ رجال پر ایک ضخیم کتاب ہے، علاؤ الدین بن علی بن عثمان ماردینی نے اس کا مختصر لکھا تھا، راویوں کے نام ونسب اور ان کے واقعات واخبار کی تحقیق کے لحاظ سے یہ بڑی مفید کتاب ہے، اس کا قلمی نسخہ سات سو صفحے میں کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہے مگر ناقص الآخر ہے، (کشف الظنون ج ۱ ص ۳۲۳ و جلد ۲ ص ۷۹ و تاریخ آداب اللغة العربیة ج ۲ ص ۳۲۵) خود مصنف نے تالی التلخیص یا باقی التلخیص کے نام سے اس کا ایک ضمیمہ بھی لکھا تھا۔

۷۲۔ کتاب الکفایة: تیرہ جزوں پر مشتمل مصطلحاتِ حدیث میں اہم کتاب ہے، اس میں روایات واحادیث کے اصول وضوابط کے متعلق اصحاب فن اور محدثین کے اقوال سنداً بیان کیے گئے ہیں جن مباحث میں علمائے جرح وتعدیل کے اختلافات منقول ہیں، ان کو درج کر کے ان کے متعلق اپنی ترجیحی رائے تحریر کی اور بعض مبہم اقوال کا مفہوم اور دقیق استدلال کی تشریح بھی کر دی ہے، اس کی جامعیت واہمیت کے متعلق حافظ ابن حجر جیسے ماہر فن کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

"مصطلحات حدیث میں قاضی ابو محمد رامہرمزی نے سب سے پہلے المحدث الفاصل لکھی لیکن اس میں استیعاب سے کام نہیں لیا گیا ہے، اس کے بعد ابو عبد اللہ حاکم کی تصنیف ہے لیکن یہ مہذب ومرتب نہیں، ابو نعیم نے حاکم کی کتاب کا مستخرج لکھا لیکن اس میں بھی آئندہ آنے والے کے لیے بعض چیزیں چھوڑ دی گئی ہیں، ان لوگوں کے بعد خطیب نے قوانین روایت میں کفایہ اور آداب روایت میں الجامع لآداب الراوی والسامع لکھی، حدیث سے متعلق شاید ہی کوئی ایسا فن ہو جس میں ان کی علیحدہ تصنیف نہ ہو، ابو بکر بن نقطہ کا بیان ہے کہ جو شخص انصاف سے ان کی کتابیں پڑھے گا اس کو معلوم ہوگا کہ خطیب کے بعد کے محدثین ان کی کتابوں کے محتاج ہیں۔"

اس کے قلمی نسخے برلین، لیڈن، مصر اور ہندوستان میں حیدر آباد، سندھ اور پٹنہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں، خدا بخش لائبریری پٹنہ کا نسخہ بڑا گرانقدر ہے، یہ سلطان صلاح الدین کے بیٹے احمد کی ملکیت میں رہ چکا ہے، اس پر شہزادہ کی خود نوشتہ تحریر ہے، یہ بہت سے محدثین اور علما کے استعمال میں بھی رہا ہے۔

حیدر آباد کے دائرۃ المعارف نے ۱۳۵۷ھ میں اس کا متن مختصر حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے، تعداد ۴۱۵ ہے، چند صفحوں میں خطیب کے حالات وکمالات دیئے گئے ہیں، تصحیح ومقابلہ کا کام مولانا سید ہاشم ندوی مرحوم نے اپنے بعض رفقا کی معاونت سے انجام دیا ہے۔

۷۳۔ تاریخ بغداد: خطیب کی سب سے ضخیم، عظیم الشان اور شہرۂ آفاق کتاب ہے، علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ اگر ان کی اور تصنیفات نہ بھی ہوتیں تو تنہا یہی کتاب ان کے فخر وشرف اور فضل وکمال کے لیے کافی تھی اور اس سے ان کے علمی تبحر و وسعت مطالعہ اور دقت نظر وغیرہ کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے، خطیب کو خود بھی اس کتاب پر بجا طور سے فخر تھا، پہلے گزر چکا ہے کہ انہوں نے اس کی مقبولیت کے لیے خدا سے جو دعا مانگی تھی وہ قبول ہوئی اور تاریخ بغداد کو بے نظیر اور حیرت انگیز حسن قبول حاصل

Marfat.com

ہوا، بغداد کی متعدد تاریخیں لکھی گئیں، خطیب کو اولیت کا شرف بھی حاصل نہیں ہے تاہم اس کے جیسی شہرت و مقبولیت کسی کے حصہ میں نہیں آئی، خطیب اس کے موضوع و محتویات کے بارے میں خود لکھتے ہیں:

''یہ کتاب مدینۃ السلام (بغداد) کی تاریخ ہے، اس میں اس کی آبادی اور تعمیر کا ذکر اور یہاں کے مشاہیر و اعیان، وار دین، علما و فضلا کا تذکرہ ہے۔

(تاریخ بغداد ج ۱ ص ۳)

دوسری جگہ اس کی نوعیت و ترتیب وغیرہ کے متعلق مزید تحریر فرماتے ہیں:

''اس میں دارالسلام بغداد کے خلفا، اشراف، کبرا، قضات، فقہا، محدثین، قرا، زہاد، صلحا اور ارباب شعروادب کا ذکر ہے جو لوگ یہاں پیدا ہوئے، یا پیدا تو کسی دوسری جگہ ہوئے لیکن یہاں سکونت اختیار کرلی یا جو یہاں کی سکونت ترک کر کے دوسری جگہ فوت ہوئے، یا دوسرے مقامات کے جو لوگ یہاں آئے، ان سب کا نیز بغداد کے مضافات اور نواح میں رہنے والوں کا اس میں تذکرہ ہے، ان کی کنیت، حسب ونسب، ان کے مشہور واقعات، مناقب وفضائل، مدت عمر، تاریخ وفات اور عام حالات غرض ان لوگوں کے بارے میں جو روایتیں بزرگوں سے محفوظ ومنقول چلی آرہی ہیں سب جمع کردی گئی ہیں، خواہ ان کا تعلق مدح وقبول اور تعدیل سے ہو یا ذم وقدح یا جرح سے، ترتیب حروف معجم کے مطابق ہے لیکن جن لوگوں کا نام محمد ہے، ان کا تبرک کے خیال سے میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔'' (تاریخ بغداد ج ۱ ص ۱۲ و ۲۱۳)

اس زمانہ کے دستور کے مطابق خطیب نے حالات وواقعات بسلسلہ روایت واسناد لکھے ہیں، اس کے اسلوب وطریقہ بیان کے متعلق نامور مبصر و فاضل اجل مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم لکھتے ہیں:

''تاریخ خطیب جس طرح بہترین زمانہ کی تاریخ ہے، اسی طرح طرز بیان کے لحاظ سے مسلمان مؤرخین کی تصنیف کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے، الفاظ بقدر معانی استعمال کیے ہیں، عبارت آرائی، مدح طرازی کا نام نہیں، بیان صاف اور متین ہے، جرح وتعدیل دونوں بے لاگ ہیں، اگرچہ بعض معرکہ آراء مقامات میں قوت فیصلہ کی کمی نمایاں ہے، محدثانہ روایات ہیں، ادیبانہ مبالغہ، منطقیانہ تذبذب پاس نہیں۔'' (معارف ج ۲۳ عدد ۲ ص ۱۰۸)

پہلی جلد کا نصف حصہ بغداد کے متعلق مختلف النوع علمی، فقہی، کلامی اور تاریخی معلومات پر مشتمل ہے، مثلاً بغداد کی زمین کی بیع وشرا اور اس کی پیداوار کا کیا حکم ہے، چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سواد (عراق) کی زمین کو مسلمانوں کے لیے وقف فرمادیا تھا، اس لیے اس پر مالکانہ قبضہ وتصرف فقہا کے ایک گروہ کے نزدیک ناجائز ومکروہ ہے، بعض علما کو اسی لیے بغداد کی سکونت میں کلام تھا، خطیب نے اس مبحث پر موافق ومخالف دونوں پہلوؤں سے مبسوط بحث کی ہے اور فیصلہ جواز کے حق میں دیا ہے، دوسرے باب میں یہ بحث ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارض سواد فاتحین میں تقسیم کیوں نہیں فرمایا، اسی سلسلہ میں عہد فاروقی کے بندوبست اراضی کا ذکر آتا ہے، اس بیان میں بندوبست شدہ اراضی کی شرح لگان، پیداوار کی قسمیں، تعداد رقبہ وغیرہ سب کچھ آگیا ہے، آگے ایک باب میں ان روایتوں کا ذکر ہے جو بغداد کی مذمت سے متعلق ہیں، مصنف نے ان روایتوں کو نقل کرنے کے بعد ان پر بحث وتنقیح کر کے ان کو ضعیف وسقیم قرار دیا ہے، اس کے بعد بغداد کے مناقب اور اہل بغداد کے اوصاف کا تذکرہ ہے، اس سلسلہ میں بغداد کی معتدل آب وہوا اور ساکنین بغداد کی عقل واخلاق کی تعریف اور ان کے علمی کارناموں اور خدمات حدیث کا تذکرہ ہے، پھر بغداد کی دو مشہور نہروں دجلہ وفرات کے فوائد ومنافع کا ذکر ہے، اس کے بعد بغداد کی وجہ تسمیہ کا بیان شروع ہوتا ہے اور بانی بغداد، ابوجعفر منصور عباسی کے حالات ومناقب، بغداد کی بنا، سن تعمیر، مصارف تعمیر، طریقہ تعمیر، پایہ تخت حکومت، محل

Marfat.com

شاہی، بازاروں، محلات، شوارع، مساجد، مقابر اور پلوں کا ذکر ہے، تعمیر میں جو ترمیمات اور اضافے ہوئے ان کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

بغداد سے متصل ہی چونکہ مدائن واقع ہے، اس لیے اس کے متعلق بھی معلومات بیان کیے گئے ہیں اور مدائن کا تذکرہ ان پچاس صحابہ کرام کی تقریب بن گیا ہے، جن کے قدوم سے مدائن مشرف ہوا تھا، مدائن کے اسی شرف ومزیت کی بنا پر اس کا بغداد سے متصل دیگر قصبات نہروان وانبار وغیرہ سے پہلے ذکر کیا گیا ہے، اس تاریخ میں مدائن ہی کے تعلق ومناسبت سے صحابہ کرام کا تذکرہ شامل ہے، ورنہ بغداد میں کسی صحابی کا آنا ثابت نہیں ہے، اس کے بعد بغداد کے ساکنین، واردین وصادرین کے تراجم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو چودہ جلدوں پر جا کر تمام ہوتا ہے۔

تاریخ بغداد صرف رجال بغداد کا ترجمہ وتذکرہ ہی نہیں ہے بلکہ رجال کے حالات کے ضمن میں علمی دقائق اور مجتہدانہ مباحث بھی محدثانہ قوت کے ساتھ حل کیے گئے ہیں، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:

فکتب علی طریقۃ المحدثین جمع فیہ رجالھا و من ورد بھا وضم الیہ فوائد جمۃ فصار کتابا عظیم الحجم والنفع۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۲۲۱)

اس میں محدثین کے انداز اور طریقہ کے مطابق بغداد کے رجال وواردین کا تذکرہ اور دیگر بے شمار فوائد شامل کیے ہیں، اس لیے یہ کتاب نہایت ضخیم اور پر منفعت ہوگئی ہے۔

بغداد کے لوگوں کے تذکرہ کی ابتدا تبرکاً محمد کے نام سے کی ہے اور سب سے پہلے محمد بن اسحاق صاحب سیرت کا ذکر کیا ہے اور اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ ان سے زیادہ کوئی کبیر السن، عالی الاسناد اور قدیم العہد شخص نہ تھا۔ (تاریخ بغداد ج ۱ ص ۲۱۴)

ان کو تاریخ بغداد کی ترتیب اور اہل بغداد کا تذکرہ لکھنے کا خیال غالباً حافظ ابوالفضل صالح بن احمد تمیمی کے اس قول کی وجہ سے ہوا کہ ''طالب حدیث کے لیے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اپنے شہر کی کتب حدیث اور ان کے مؤلفین کے حال سے آغاز کرے اور انکی فہم میں ملکہ بہم پہنچائے تاکہ صحیح وسقیم کی مکمل معرفت حاصل ہو، اس کے بعد دوسرے شہروں کو لے۔'' (ایضاً)

پہلے گزر چکا ہے کہ خطیب نے رجال کی مدح وثنا، ذم وقدح، قبول ورد اور جرح وتعدیل کے بارے میں جو کچھ منقول ہے، سب جمع کر دیا ہے، اس لیے بعض ائمہ واساطین فن کے مناقب وفضائل کے ساتھ ساتھ ان کے متعلق نقد وجرح کے اقوال بھی تحریر کیے ہیں، اسی حیثیت سے حنفی مذہب کے اساطین ثلاثہ امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین کے بارے میں بھی مدح ومنقبت اور دو جرح پر مشتمل اقوال نقل ہوئے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ خطیب کی اپنی رائے نہیں ہے بلکہ وہ ان حضرات کے عظمت شناس اور کمالات کے معترف تھے، رہے مخالفانہ اقوال تو وہ محض مورخانہ فرض ادا کرنے کے لیے جمع کیے گئے ہیں۔

تاریخ بغداد سات ہزار آٹھ سو کتالیس مشاہیر رجال کا جو مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں تذکرہ ہے، یہ مصر سے مختصر حاشیوں کے ساتھ ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۱ء میں چودہ جلدوں میں شائع ہوئی ہے، رجال کی فہرست اور صفحے پر سطروں کا شمار بھی دیا گیا ہے، صفحات کی تعداد ۶۷۹ ہے، اس میں فہرست کے صفحے بھی شامل ہیں۔

ذیول:

اس تاریخ کی اہمیت کی وجہ سے اس کے متعدد ذیول لکھے گئے ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

Marfat.com

۱ امام ابوسعد عبدالکریم سمعانی صاحب کتاب الانساب (م ۵۶۲ھ) نے خطیب کے نہج و اسلوب پر پندرہ جلدوں میں ذیل لکھا۔

۲ عماد الدین ابوعبداللہ محمد بن حامد کاتب و وزیر (م ۵۹۷ھ) نے سمعانی کے ذیل پر تین جلدوں میں ذیل لکھا، اس میں اس پر بعض اضافے کیے ہیں۔

۳ ابوعبداللہ محمد بن سعید المعروف بابن الدبیثی وسطی (م ۶۳۷ھ) کے ذیل میں بھی سمعانی کے ذیل پر اضافے ہیں۔

۴ ابن قطیعی نے ابن دبیثی کے ذیل پر ایک ضمیمہ لکھا۔

۵ حافظ شمس الدین ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے ابن دبیثی کے ذیل کی تلخیص و اختصار کیا اور اس کا نام المختصر المحتاج الیہ من تاریخ بغداد رکھا۔

۶ تاریخ خطیب کا سب سے طویل و ضخیم ذیل حافظ محب الدین محمد بن محمود المعروف بابن النجار بغدادی (م ۶۴۳ھ) نے لکھا اس میں مذکورہ بالا تمام ذیول کے مقابلہ میں زیادہ اضافے ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ تیس جلدوں میں ہے۔

۷ ابن نجار کے ذیل پر تقی الدین محمد بن رافع متوفی ۷۷۴ھ نے عمدہ اور بہتر ذیل لکھا۔

۸ ابن نجار کے ذیل پر ابوبکر مارستانی کا بھی ایک ذیل ہے۔

۹ مارستانی کے ذیل پر تاج الدین علی بن انجب شاعر بغدادی نے ایک ذیل لکھا۔

۱۰ خطیب کے شاگرد ابوالیمن مسعود بن محمد بخاری (م ۴۹۱ھ) نے تاریخ کا مختصر اور خلاصہ لکھا، اس کا قلمی نسخہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے کتب خانہ میں ہے، جو فل سکیپ سائز کے ۳۸۱ صفحے پر مشتمل ہے [1]۔

۱۱ مشہور مستشرق (Salomon) نے تاریخ خطیب کے شروع کے حصہ کو جس میں بغداد کے نام اور تاریخ بناء وغیرہ کا ذکر ہے اور جس کی حیثیت مقدمہ کی ہے، ۱۹۰۴ء میں پیرس سے فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ شائع کیا تھا۔

۱۲ تاریخ خطیب جب پہلی دفعہ شائع ہوئی تو نواب صدر یار جنگ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم نے معارف کے کئی نمبروں میں اس پر ایک مبسوط، پُرمغز اور معلومات افزا تبصرہ لکھا جو ۱۹۳۷ء میں کتابی صورت میں بھی شائع ہو گیا ہے، اس میں پہلے خطیب کے مختصر و جامع حالات ہیں، اس کے بعد تاریخ بغداد کے خصوصیات اور اس کے مندرجات مشمولات کا تعارف اور آخر میں اس کے بعض حصوں پر مدلل اور جامع تبصرہ کیا گیا ہے۔

۱۳ امام محمدی: مولوی محمد صاحب اڈیٹر اخبار محمدی دہلی نے اس میں تاریخ بغداد سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ و سوانح حیات کا حصہ علیحدہ جمع کر کے اردو ترجمہ کے ساتھ ۱۳۴۵ھ میں دہلی سے شائع کیا تھا، یہ امام صاحب کے رد و قدح اور مناقب و مثالب دونوں پر مشتمل ہے، معلوم نہیں اس کی اشاعت کی ضرورت ہی کیا تھی؟

تاریخ بغداد کی غیر معمولی شہرت اور حیرت انگیز مقبولیت کے باوجود اس پر بعض اعتراضات کیے گئے ہیں اور اس کے رد میں مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، ان کتابوں میں اکثر کا تعلق ان جرحوں سے ہے جو رجال خصوصاً امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے متعلق اس میں نقل کی گئی ہیں۔

[1] (یہ کتب خانہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی منتقل ہو گیا ہے)

Marfat.com

۱ السہم المصیب فی رد الخطیب: اس کو سلطان [1] عیسیٰ بن ابوبکر ایوبی نے ۶۲۱ھ میں خطیب کے رد اور امام ابو حنیفہؒ کی تائید کے لیے تالیف کیا تھا، طرزِ بیان الجھا ہوا ہے، مولانا اعزاز علی دیوبندی مرحوم نے جدہ کے قلمی نسخہ سے نقل کر کے اس کو ۱۳۵۰ھ میں مطبع جامعہ ملیہ دہلی سے شائع کیا تھا۔

۲ الانتصار لامام ائمۃ الامصار: ابوالمظفر یوسف بن عبداللہ المعروف بسبط ابن الجوزی نے دو جلدوں میں امام ابوحنیفہؒ کی تائید اور خطیب کی تردید کی ہے۔

۳ جامع المسانید: اس کے مقدمہ میں ابوالمؤید الخوارزمی نے خطیب کا رد لکھا ہے۔

۴ تانیب الخطیب: یہ مصر کے مشہور محقق و نامور فاضل محمد زاہد بن حسن کوثری کی تصنیف ہے، اس میں امام ابوحنیفہ اور مذہب حنفی کے اساطین ابویوسف، محمد بن حسن اور حسن بن زیاد کے متعلق خطیب کے بیانات کا محققانہ جائزہ لیا گیا ہے اور ان روایتوں کو جو ان بزرگوں کے رد و قدح اور جرح و ذم سے متعلق ہیں، غیر صحیح قرار دیا گیا ہے، مصنف نے ان روایتوں کو جن کو خطیب نے مؤرخانہ فرض و دیانت سمجھ کر نقل کیا تھا اور ان کے بارے میں معذرت کردی تھی، خود خطیب کی رائے قرار دیا ہے، اسی غلط فہمی نے ان کی تحریر میں مناظرانہ رنگ پیدا کردیا ہے اور انہوں نے خطیب پر بعض ناروا ذاتی تنقیدیں بھی کی ہیں، خطیب کا تعصب مسلّم سہی مگر ان کو امام ابوحنیفہؒ کی عظمت شان میں کلام نہ تھا۔

کوثری صاحب نے خطیب کے بارے میں اس انصاف سے بھی کام نہیں لیا جو خطیب نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کیا تھا، چنانچہ انہوں نے خطیب کے ترجمہ میں صرف ان کے مثالب ہی بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اس ضمن میں بعض غیر معتبر واقعات کو زیادہ نمایاں طور پر پیش کر کے تاریخ کو جھوٹ پوٹ کا انبار اور خطیب کی بدنیتی پر مبنی قرار دے کر ان کے علمائے جرح و تعدیل میں شمار کیے جانے کو خلاف انصاف قرار دیا ہے، اس کتاب کے جواب میں بھی بعض کتابیں لکھی گئی ہیں، دائرۃ المعارف النعمانیہ کے ایک مصحح مولانا عبدالرحمٰن بن یحییٰ معلمی یمانی نے بھی جواب تحریر کیا تھا، جو ہماری نظر سے نہیں گزرا مگر کوثری صاحب کا جواب الجواب ہم نے دیکھا ہے، تانیب الخطیب دو سو صفحے پر مشتمل ہے اور ۱۹۴۲ میں مصر سے شائع ہوئی ہے۔

خطیب پر بعض اعتراضات:

دوسرے اکابر علما کی طرح خطیب اور ان کی تصنیفات پر بھی اعتراضات ہوئے ہیں، ذیل میں ان کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

۱۔ تعصب: خطیب پر زیادہ اہم اعتراض یہ ہے کہ ان کو حنبلی و حنفی مذہب سے سخت کد تھا، حنبلی مذہب سے عناد کا ذکر حافظ ابن جوزی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''خطیب پہلے حنبلی تھے لیکن مبتدعین [2] کے بارے میں نرم اور ان کی جانب مائل تھے، اس لیے حنابلہ ان کے درپے آزار ہوئے،

---

[1] (صاحب کشف الظنون نے اس کا نام عیسیٰ بن ابوبکر ایوبی حنفی (م ۶۲۴ھ) لکھا ہے) (جلد ۲)

[2] (غالباً اس سے اشاعرہ متکلمین مراد ہیں جن کے متعلق خطیب کی نرمی و مداہنت کا ذکر کیا جاتا ہے اور اگر اہل بدعت و اقتصام مراد ہیں تو خطیب کے ان کی جانب میلان کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ یہ حنابلہ کی غلط فہمی اور شدت پسندی کا نتیجہ ہے)

Marfat.com

اس کا ردِعمل یہ ہوا کہ انہوں نے شافعی مسلک اختیار کر لیا اور اپنی کتابوں میں جہاں ممکن ہوا ہے، اشارۃً وصراحۃً امام احمدؒ، ان کے تلامذہ اور حنبلی مذہب کے خلاف تعصب سے کام لیا ہے،

مثلاً: انہوں نے امام احمدؒ کو سید المحدثین اور امام شافعیؒ کو تاج الفقہا لکھا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ امام احمد کے تفقہ واجتہاد کے معترف نہ تھے، حسین کرابیسی کے ترجمہ میں امام احمد کے متعلق ان کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

ایش نعمل بهذا الصبی ان قلنا لفظنا بالقرآن مخلوق قال بدعة وان قلنا غیر مخلوق قال بدعة۔

(المنتظم ج ۸ ص ۲۶۷ و ۲۶۸)

آخر ہم کیا کریں! اگر ہم کہتے ہیں کہ ہمارا تلفظ بالقرآن مخلوق ہے تو یہ (امام احمد) اس کو بدعت کہتے ہیں اور اگر ہم اس کو غیر مخلوق کہتے ہیں تب بھی وہ اس کو بدعت بتاتے ہیں۔

اسی طرح امام احمد کے بعض اصحاب وتلامذہ کے بارے میں بھی خطیب کے ردوقدح کی بعض مثالیں تحریر کی ہیں جن کو طوالت کی وجہ سے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور حنفی مذہب کے خلاف خطیب کے تعصب کا مولانا عبدالرشید نعمانی نے اس طرح ذکر کیا ہے:

''امام ابوحنیفہ سے سخت عداوت ونفرت رکھنے والوں میں خطیب بھی ہیں، علامہ محمد معین سندھی دراسات اللبیب میں لکھتے ہیں:

''امام دارقطنی کی طرح خطیب بغدادی بھی امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں مفرط وغالی تھے لیکن ان کی اور ان کے تبعین کی رائے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی توثیق، جلالت قدر اور عظیم مرتبہ ومنقبت پر مکمل اتفاق ہے۔''

حافظ محمد بن یوسف صالحی شافعی عقود الجمان میں لکھتے ہیں:

''امام ابوحنیفہؒ کی عظمت شان کو مجروح کرنے والے ان بیانات سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے، جو خطیب بغدادی نے نقل کیے ہیں، انہوں نے امام صاحب کے مداحوں کی رائیں بھی تحریر کی ہیں، لیکن آخر میں مذمت کرنے والوں کے اقوال ذکر کر کے اپنی کتاب میں زبردست دھبہ لگا دیا ہے۔''

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

''ابن القطان خطیب کی طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے معاملہ میں مفرط تھے، اس لیے امام صاحب کے بارے میں ان دونوں کی جرحیں خواہ مفسر ہی کیوں نہ ہوں قبول نہیں کی جائیں گی، درحقیقت یہ دونوں خود اسی غلو اور افراط تشنیع کی وجہ سے مجروح ہو گئے ہیں۔

(ماتمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ ص ۳۲ بحوالہ ذب ذبابات الدراسات ص ۴۴۴)

تعصب کے متعلق ان بیانات کی تنقیح سے پہلے یہ وضاحت کر دینا مناسب ہوگا کہ خطیب کے زمانے میں فقہی وجماعتی عصبیت میں قدرے شدت پیدا ہو گئی تھی، بلکہ ان کے بعد بغداد حنابلہ اور شوافع کی معرکہ آرائیوں کا مرکز بھی بن گیا تھا، اگر حافظ ابن جوزی کا یہ بیان صحیح مان لیا جائے کہ وہ ابتداءً حنبلی تھے تو اس مذہب کے خلاف ان کا ردعمل بالکل قدرتی امر ہے لیکن یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ ان جیسے صاحب علم وکمال شخص نے محض حنابلہ کی سختیوں سے تنگ آ کر اپنی رائے کو تبدیل کر دیا ہو، یہی وجہ ہے کہ عام مؤرخین نے اس کی کوئی تصریح نہیں کی ہے، البتہ یہ ضرور مسلم ہے کہ شافعی ہونے کی بنا پر حنابلہ نے خطیب کو زدوکوب کیا تھا اور یہ بات بھی درست ہے کہ حنابلہ سخت گیری اور تشدد کے لیے مشہور ہیں، اس کے برخلاف خطیب کے مزاج

Marfat.com

میں نرمی، اعتدال اور توسع پسندی تھی، اس لیے حنابلہ سے ان کی ہم آہنگی مشکل تھی۔

ان حالات میں خطیب کے اندر اگر اشتعال پیدا ہو گیا ہو اور وہ دوسرے مذاہب کے خلاف یک گونہ عصبیت سے کام لیتے رہے ہوں تو یہ بعید نہیں ہے لیکن اس کی جو مثالیں بیان کی گئی ہیں، ان سے خطیب کا تعصب ثابت نہیں ہوتا، اس کی وجہیں حسب ذیل ہیں:

خطیب کو امام احمد کے فقیہ و مجتہد ہونے میں کوئی کلام نہیں تھا، انہوں نے امام احمد کے ترجمہ میں کئی جگہ ان کے تفقہ و اجتہاد کا ذکر کیا ہے، خود امام شافعی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''میں نے جب بغداد چھوڑا تو وہاں اس وقت امام احمد سے بڑا صاحب ورع و تقویٰ اور فقیہ و عالم شخص کوئی نہیں تھا۔'' اسی طرح اور بھی متعدد اصحاب علم و فن کے ایسے بیانات نقل کیے ہیں جن سے امام احمد کی فقہ و اجتہاد میں عظمت و مرتبت پوری طرح واضح ہوتی ہے، اس بنا پر یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ امام احمد کے تفقہ و اجتہاد کے معترف نہیں تھے، البتہ یہ ممکن ہے کہ اکثر متقدمین کی طرح خطیب کو ان کے امام فقہ و صاحب مذہب ہونے میں کلام رہا ہو، کیونکہ چوتھی صدی ہجری تک امام صاحب کی اس حیثیت سے شہرت نہیں ہوئی تھی، علامہ ابن جریر نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ (انما ھو رجل حدیث لا رجل فقه) خطیب کے معاصر اور مشہور مالکی محدث علامہ ابن عبدالبر نے انتقاد میں صرف ائمہ ثلاثہ کے تذکرہ پر اکتفا کیا ہے، بشاری مقدسی نے ان کو فقہا کے بجائے محدثین کے زمرہ میں شامل کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شروع میں امام احمد کی اصل شہرت محدث کی حیثیت سے زیادہ تھی لیکن بعد میں وہ امام فقہ اور صاحب مذہب کی حیثیت سے بھی مشہور ہوئے اور یہ شہرت اس قدر بڑھی کہ اب لوگ ان کو محدث کے بجائے فقیہ و مجتہد ہی کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہیں، چنانچہ ساتویں صدی میں فقہائے ثلاثہ کے ساتھ ان کا بھی نام لیا جانے لگا اور وہ ان چار مشہور ائمہ اسلام اور فقہائے مجتہدین میں شمار کیے جانے لگے، جن کے فقہی و اجتہادی مذاہب پر مسلمانوں کا اب تک عمل ہے، اس کی تفصیل اس کتاب کی پہلی جلد میں امام احمد کے تذکرہ میں گزر چکی ہے، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ پس خطیب کا امام احمد کو امام فقہ و اجتہاد کی حیثیت سے ذکر نہ کرنا ان کی عظمت شان کے منافی نہیں ہے اور نہ اس سے ان کا مقصد امام احمد کا استخفاف ہے، رہی وہ رد و قدح جو مثالاً پیش کی گئی ہے تو اس کی حقیقت ملاحظہ ہو۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ ''خطیب نے واقعات و اقوال کو ذکر کرنے میں مورخانہ فرض و دیانت سے کام لیا ہے، اس لیے جہاں ائمہ اور رجال کے مناقب سے متعلق اقوال جمع کیے ہیں وہیں مخالفانہ اور نقد و جرح سے متعلق آرا بھی تحریر کیے ہیں، اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ خود خطیب اس کے قائل تھے یا یہ واقعی ان کی رائے تھی۔

اس حیثیت سے حسین کرابیسی کا قول امام احمد کے متعلق صرف بطور واقعہ نقل کیا گیا ہے، اس کا مقصد ان کی مذمت و تنقیص نہیں ہے، امام احمد اور کرابیسی کے درمیان عقائد کے سلسلہ میں شدید اختلافات تھے، اس سلسلہ میں دونوں میں بعض مناقشات بھی ہوئے، امام احمد ان کے سخت نکتہ چیں تھے، دوسرے محدثین نے بھی کلام سے دلچسپی کی وجہ سے کرابیسی کے بارے میں رد و قدح کی ہے، امام احمد خلق قرآن کے باب میں جس قدر متشدد تھے، اس کا حال پہلی جلد میں گزر چکا ہے لیکن کرابیسی پر خلق قرآن کا الزام عائد کیا گیا ہے، خطیب نے مورخ کی حیثیت سے ان باتوں کا تذکرہ کیا ہے، اسی سلسلہ میں انہوں نے ایک واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شخص نے کرابیسی سے دریافت کیا کہ قرآن کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

Marfat.com

انہوں نے کہا وہ غیر مخلوق ہے، اس شخص نے پوچھا کہ جو قرآنی الفاظ آپ کے منہ سے ادا ہوتے ہیں ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کرابیسی نے جواب دیا کہ وہ مخلوق ہیں، اس شخص نے امام احمد سے یہ واقعہ بیان کیا تو انہوں نے اس پر ردو نکیر کرتے ہوئے کہا کہ یہ بدعت ہے، سائل نے دوبارہ کرابیسی سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے تلفظ بالقرآن کو غیر مخلوق قرار دیا، چنانچہ اس شخص نے امام احمد کو کرابیسی کے رجوع کی خبر دی، انہوں نے ناگواری ظاہر کرتے ہوئے اس کو بھی بدعت قرار دیا ہے۔[1]

شخص مذکور نے جب کرابیسی سے امام صاحب کی رائے کو بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ آخر ہم کیا کریں؟ اس شخص کا منشا کیا ہے، ہم اگر کہتے ہیں کہ تلفظ بالقرآن مخلوق ہے تو وہ اس کو بدعت قرار دیتا ہے اور اگر غیر مخلوق کہتے ہیں تب بھی بدعت ہی قرار دیتا ہے، جب امام احمد اور انکے تلامذہ کو اسکی اطلاع ہوئی تو وہ لوگ بہت برہم ہوئے اور ان لوگوں کی حسین پر نکتہ چینی کی یہی وجہ ہے۔

(تاریخ بغداد ج ۸ ص ۶۵)

ظاہر ہے اس واقعہ کا امام احمد کی تنقیص سے کوئی تعلق نہیں ہے، خطیب کا اگر واقعی کوئی جرم ہے تو وہ محض نقل حکایت اور بیان واقعہ، اب واقعہ کی صحت وعدم صحت تو قابل بحث ہو سکتی ہے لیکن مجرد اسکے نقل کو اعتراض کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا، اگر دقت نظر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کرابیسی اور امام احمد کے اختلافات کے درمیان خطیب کا رجحان امام احمد کے مؤقف کی جانب تھا، اگرچہ انہوں نے کرابیسی کے بعض کمالات کا اعتراف کیا ہے لیکن کلام کے متعلق انکی رایوں کو وہ پسند نہیں کرتے تھے، اسی لیے خاص طور پر اسکے متعلق محدثین اور اہل فن کی جرحیں اور کرابیسی کے بارے میں بعض علما کے سخت آرا تحریر کیے گئے ہیں۔ (ایضاً)

اس کے مقابلہ میں امام احمد کی تعریف میں وہ نہایت رطب اللسان نظر آتے ہیں، چنانچہ ان کے ترجمہ میں ان کے جملہ محامد وفضائل اور خدمات حدیث کا مفصل تذکرہ کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا دل امام احمد کی محبت وعقیدت سے معمور وسرشار تھا، جس شخص نے امام احمد کے متعلق اس قسم کے اقوال نقل کیے ہیں:

من سمعتموہ یذکر احمد بن حنبل بسوء فاتھموہ علی الاسلام۔

اگر کسی شخص کو امام احمد کا تذکرہ برائی سے کرتے ہوئے سنو تو اس کے اسلام پر تہمت عائد کرو۔

آگے لکھتے ہیں:

"امام احمد کی ذات مبارک ایسی کسوٹی ہے جس پر مسلم و کافر کو پرکھا جا سکتا ہے، ان کی مذمت کرنے والا فاسق ہے۔"

نیز فرماتے ہیں:

اضحی ابن حنبل محنۃ مامونۃ — وبحب احمد یعرف المتنسک
واذا رأیت لاحمد متنقصا — فاعلم بان ستورہ ستھتک

---

[1] (غالباً امام احمد نے یہ جواب اس لیے دیا ہوگا کہ محدثین اور متدین علما ان مباحث میں غور و خوض سے بھی محترز رہتے تھے اور اس کو سخت ناپسند کرتے تھے، چنانچہ امام بخاری جب نیشاپور تشریف لے گئے اور وہاں لوگوں نے اس کے متعلق استفسار کیا تو انھوں نے تلفظ بالقرآن کو مخلوق بتایا، اس پر سخت ہنگامہ برپا ہو گیا اور امام ذہلی نے جن کو اس مسئلہ میں بڑا غلو تھا یہاں تک کہا کہ "جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ میرے منہ سے نکلنے والے قرآنی الفاظ مخلوق ہیں وہ بدعتی ہے، نہ اس کے پاس بیٹھنا چاہیے اور نہ اس سے گفتگو کرنی چاہیے)" (طبقات الشافعیہ ترجمہ بخاری)

Marfat.com

(یعنی امام ابن حنبل کی ذات درحقیقت ایک ابتلاء وآزمائش ہے، ان کی محبت زہد وتقویٰ کی علامت ہے، اگر کوئی شخص ان پر نکتہ چینی کرے تو سمجھ لو کہ اس کا پردہ چاک ہو کر رہے گا۔) (تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۲۰ و ۴۲۱)

اس کے دل میں اس امام جلیل کے استخفاف اور نکتہ چینی کا خیال بھی کس طرح آسکتا ہے، اگر واقعی ایسا ہوتا تو وہ ان کی مذمت کے متعدد واقعات واقوال تحریر کرتے لیکن معترضین کو تاریخ بغداد جیسی ضخیم کتاب میں خوردہ گیری کے باوجود اس کے سوا اور کوئی مثال نہیں مل سکی جو بالکل بے بنیاد ہے، یہی حال ان الزامات کا بھی ہے جو ان پر امام احمد کے تلامذہ کی نکتہ چینی کے بارے میں لگائے گئے ہیں، اس لیے ان کی بحث وتنقیح کو غیر ضروری سمجھ کر ہم نے نظر انداز کر دیا، کتاب الکفایہ کے آخر میں خطیب کے سوانح نگار نے لکھا ہے۔

ثم ذکر امثلة مما زعمه تعصبا من الخطیب علی الحنابلة ومن نظر بعینی الانصاف لم یجد فیھا مثالاً واحدا یظھر منه التعصب۔ (خاتمہ کتاب الکفایہ ترجمة المؤلف)

ابن جوزی نے اپنے گمان کے مطابق خطیب کے حنابلہ کے بارے میں تعصب کی جو مثالیں بیان کی ہیں، اگر ان پر کوئی شخص انصاف سے غور کرے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ ان میں سے کسی مثال سے بھی ان کا تعصب ظاہر نہیں ہوتا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف خطیب کے تعصب کی بنیاد تاریخ بغداد کے ان بیانات کو قرار دیا گیا ہے۔ جو ان کے ترجمہ میں درج ہیں، لیکن اس کے متعلق یہ وضاحت پہلے کی جا چکی ہے کہ خطیب نے ایک مورخ کی حیثیت سے وہ سب اقوال وبیانات جمع کر دیے ہیں جو انہوں نے سنے تھے یا جن کا ان کو علم ہوا تھا، خواہ ان کا تعلق مناقب ومحامد سے ہو یا مثالب ومعائب سے، علاوہ ازیں انہوں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو جرحیں تحریر کی ہیں ان کے بارے میں پہلے ہی معذرت کر دی ہے، نیز انہوں نے کہیں سے اس کو ظاہر نہیں ہونے دیا ہے کہ یہ ان کی اپنی رائے بھی تھی، بلکہ اس کے برعکس وہ امام صاحب کی جلالت قدر کے پوری طرح معترف معلوم ہوتے ہیں، البتہ چونکہ محدثین کی ایک جماعت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو حدیث میں زیادہ بلند پایہ نہیں سمجھتی تھی، اس لیے اس سے ان کے متعلق بعض سخت رائیں منقول ہیں، ممکن ہے، خطیب پر اس کا اثر رہا ہو، نیز چونکہ ان کے زمانہ میں جماعتی عصبیت کا رجحان پیدا ہو رہا تھا، اس کی وجہ سے ممکن ہے ان کے اندر بھی عصبیت کا شائبہ آ گیا ہو لیکن تاریخ کے ان بیانات کو اس کا ثبوت قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ ۲۔ اشاعرہ ومتکلمین سے تعلق، حافظ ابن جوزیؒ نے خطیب پر اس اعتراض کا بھی ذکر کیا ہے کہ:

''ان کو اشاعرہ ومتکلمین سے بڑی شیفتگی تھی، حالانکہ یہ محدثین کے شایان شان نہیں، حدیث میں کلام کی مذمت کی گئی ہے اور خود امام شافعی سے بھی اس کی تردید منقول ہے۔'' (المنتظم ج ۸ ص ۲۶۹)

اس کا جواب یہ ہے کہ اشاعرہ ومتکلمین سے دلچسپی اہل بدعت کی جانب میلان کا نتیجہ نہیں ہے، جیسا کہ حنابلہ نے غلطی سے سمجھا ہے، عقائد وصفات کے بارے میں خطیب کی رائے سلف کے موافق تھی، رہی امام ابوالحسن اشعری کی ہمنوائی تو یہی قدیم وجدید محدثین کا مذہب تھا، محتاط اور ثقہ علماء نے کلام وعقائد میں غور وخوض کو ممنوع اس لیے قرار دیا ہے کہ ان مسائل میں توغل وانہماک سے لوگ مہمات دین سے غافل ہو جاتے تھے۔

۳۔ عامیانہ جرح وتعدیل کا اعتراض: حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ ''جرح وتعدیل کے معاملہ میں خطیب کا حال ان عام محدثین کی طرح ہے جو قلت فہم کی وجہ سے خلاف واقعہ جرحیں کرتے ہیں، خطیب نے کتاب الجہر وکتاب القنوت میں

Marfat.com

غیر صحیح حدیثیں بیان کی ہیں اور مسئلہ صوم یوم الغیم کے بارے میں ایک موضوع حدیث ذکر کر کے اس سے استدلال کیا ہے اور اس کے سقم و جرح اور وضع کے بارے میں اصحاب فن کے بیانات نہیں نقل کیے ہیں، حالانکہ آنحضورؐ سے صحت کے ساتھ ثابت ہے کہ جس نے جان بوجھ کر جھوٹی حدیث بیان کی وہ بھی جھوٹا ہے۔" (ایضاً ص ۲۶۸و۲۶۹)

عامیانہ جرح و تعدیل کا الزام خطیب پر اس لیے عائد کیا گیا ہے کہ ان کو جو کچھ معلوم ہوا اور انہوں نے جو کچھ سنا اس کو بلا نقد و تبصرہ اور بلا بحث و تحقیق جمع کر دیا ہے لیکن دراصل اس معاملہ میں انہوں نے ایک مؤرخ کا فرض ادا کیا ہے، باقی غیر صحیح حدیثوں کے نقل و احتجاج کا جہاں تک معاملہ ہے تو اس کے بارے میں ہم کچھ تیقن کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان کی تصنیفات ہماری نظر سے نہیں گزریں ممکن ہے کہ انہوں نے کچھ غیر صحیح حدیثیں ذکر کی ہوں لیکن اس میں قصد و ارادہ کو دخل نہیں اور نہ وہ جان بوجھ کر موضوع حدیث سے استدلال کر سکتے ہیں کیوں یہ ان کے اصول و مذہب کے خلاف ہے، غیر صحیح حدیثوں سے حدیث کی کوئی کتاب خالی نہیں اور خطیب کی عظمت شان اگرچہ مسلم ہے لیکن پہلے گزر چکا ہے کہ ان کی تصنیفات حدیث کا پایہ زیادہ بلند نہیں ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے ان کو چوتھے طبقہ کی کتب حدیث میں محسوب کیا ہے، اس لیے ان میں ضعیف و ساقط الاعتبار ہر قسم کی حدیثیں شامل ہیں۔

۴ ناصبیت کا الزام: خطیب پر ایک الزام ناصبیت کا بھی ہے، اس کی وجہ پہلے گزر چکی ہے کہ جامع دمشق میں حدیث کا درس دیتے ہوئے انہوں نے فضائل عباس کی روایتیں بیان کی تھیں، (البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۱۰۲ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۴۷) مگر یہ ناصبیت کا کوئی ثبوت نہیں ہے کیونکہ وہ صحابہ کے فضائل اور مراتب و درجات کے قائل اور اہل بیت سے محبت رکھتے تھے، البتہ یہ ممکن ہے کہ فضائل عباس کی حدیثیں بیان کرنے کی وجہ سے چونکہ روافض اور فاطمیہ اس قدر مشتعل ہو گئے تھے کہ وہ خطیب کو قتل کر دینا چاہتے تھے، اس لیے اس اشتعال اور ان کے زمانہ میں دمشق میں شیعیت کے استیلا اور فاطمیوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کے ردعمل میں خطیب میں نمایاں جوش و خروش پیدا ہو گیا ہو اور انہوں نے اس معاملہ میں شدت سے کام لیا ہو جس کا ان کو خمیازہ بھگتنا پڑا تھا لیکن یہ ناصبیت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

۵ تصنیفات کے متعلق اعتراض: ایک اعتراض یہ ہے کہ ان کی اکثر کتابیں حافظ محمد بن عبداللہ ساحلی صوری (م ۴۴۱ھ) کی تصنیفات سے ماخوذ ہیں، صوری جن کتابوں کو شروع کرنے کے بعد مکمل نہیں کر سکے تھے، خطیب نے انہی کی تکمیل کی اور صوری کی کتابوں کی بنیاد پر اپنی کتابیں مرتب کیں۔ (المنتظم ج ۸ ص ۲۶۶)

گو خطیب کی بعض کتابیں واقعتاً صوری کی کتابوں کی تخریج ہیں تاہم اس کی وجہ سے ان کی سب کتابوں کو صوری کی کتابوں کا چربہ قرار دینا صحیح نہیں ہے، اس کے متعلق ابن جوزی کا یہ بیان قابل غور ہے:

"ایک شخص کی نکالی ہوئی راہ پر لامحالہ دوسرے لوگ بھی چلنے ہی لگتے ہیں، اس لیے خطیب کا کسی ڈھانچہ کو اصلی قالب اور نیا رنگ و روپ دے دینا کوئی عیب کی بات نہیں ہے، اصل میں یہ چیز دیکھنی چاہیے کہ ان کے کارناموں کی نوعیت کیا ہے؟ سو اس حیثیت سے خطیب کسی طرح قاصر نظر نہیں آتے، ان کی تصنیفات عدیم المثال اور بے نظیر ہیں، ان کا بغور مطالعہ کرنے سے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ دارقطنی وغیرہ کی تصنیفات بھی اس معیار اور پایہ کی نہیں ہیں۔"

(المنتظم ج ۸ ص ۲۶۶)

Marfat.com

ابو عبداللہ محمد ابو نصر فتوح حمیدی

(متوفی ۴۸۸ھ)

نام ونسب:

محمد نام، ابوعبداللہ کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: محمد بن ابونصر فتوح بن عبداللہ بن فتوح بن حمید بن یصل۔
(تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۷ و ابن خلکان ج ۲ ص ۸۵ وکتاب الانساب ورق ۵۴۸)

ولادت:

حمیدی سے منقول ہے کہ میں ۴۲۰ھ سے پہلے پیدا ہوا، عام مورخین نے اسی بیان پر اعتماد کر کے لکھا ہے کہ وہ ۴۲۰ھ سے پہلے پیدا ہوئے تھے، (ایضا) لیکن صاحب اعلام نے تصریح کی ہے کہ وہ ۴۹۸ھ (مطابق ۱۰۲۷ء) میں پیدا ہوئے، (اعلام ج ۳ ص ۹۶۳) ابن عماد کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ”حمیدی کا انتقال تقریباً ستر سال کی عمر میں ہوا، (شذرات الذہب ج ۳ ص ۳۹۲) ان کا سن وفات ۴۸۸ھ ہے، اس لحاظ سے سن ولادت ۴۱۸ھ ہوگا۔

وطن:

حمیدی کا اصل وطن رصافہ ہے لیکن ان کے والد میورقہ میں جو شرق اندلس کے قریب ایک جزیرہ ہے، آباد ہو گئے تھے، یہیں حمیدی کی ولادت ہوئی، اس جزیرہ کی نسبت سے جو اکابر منسوب ہیں ان میں حمیدی کا نام زیادہ ممتاز ہے، آخر عمر میں وہ بغداد چلے آئے تھے اور اسی کو اپنا وطن بنالیا تھا۔
(ابن خلکان ج ۲ ص ۸۵ و تذکرہ ج ۴ ص ۷ و المنتظم ج ۹ ص ۹۶ و معجم البلدان ج ۸ ص ۲۲۹ و بستان المحدثین ۸۲ و نفح الطیب ج ۱ ص ۳۷۵)

نسبتیں:

ان کی سب سے مشہور نسبت حمیدی ہے جو ان کے پردادا حمید بن یصل کی جانب ہے، بعض مورخین نے اس کی نسبت مشہور صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے صاحبزادے حمید کی جانب بتائی ہے مگر ابن خلکان نے اس کی تردید کی ہے۔
ان کی دوسری معروف نسبت میورقی ہے جو ان کے مولد میورقہ کی جانب ہے، ایک نسبت ازدی بھی ہے، یہ غالباً خاندان کی جانب ہوگی، وہ ظاہری بھی کہلاتے تھے، اس سے ان کے فقہی مذہب کا پتہ چلتا ہے۔
مغربی اور اندلسی کی نسبتوں سے ان کا اندلسی اور مغربی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

Marfat.com

اساتذہ:

انہوں نے جن اساتذہ سے علم وفن کی تحصیل کی تھی، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

ابوبکر احمد بن علی خطیب، ابوجعفر بن سلمہ، ابوعبداللہ قضاعی، ابوعمر بن عبدالبر، ابوغالب ابن بشران اموی، ابوالقاسم جیانی دمشقی، ابوالحسن عبدالدائم بن حسن ہلالی، ابوزکریا عبدالرحیم بخاری، عبدالصمد بن مامون، عبدالعزیز بن احمد کتانی، ابومحمد عبدالعزیز بن حسن ضراب، ابومحمد بن حزم علی بن احمد، ابوتمام علی بن محمد واسطی۔

صحیح بخاری کی مشہور راویہ کریمہ مروزیہ سے انہوں نے مکہ معظمہ میں ملاقات کی تھی، ارباب سیر نے تصریح کی ہے کہ ان کا ابن حزم سے خاص تعلق تھا اور وہ ان کے اجل تلامذہ میں تھے۔

(ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ و تذکرہ ج ۴ ص ۷ او کتاب الانساب ورق ۵۴۸ و بستان المحدثین ص ۸۲)

تلامذہ:

حمیدی کے مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابواسحٰق بن نبہان رمی، ابوعامر عبدری، اسماعیل بن سمرقندی، اسماعیل بن محمد طلحی، حسین بن حسن مقدسی، ابوعبداللہ حسین بن نصر، صدیق بن عثمان بربری علی بن علی امینی، ابوالفتح محمد بن بطی، محمد بن طرخان، محمد بن علی خلال، محمد بن ناصر، یوسف بن ایوب نہرانی زاہد۔

ان کے شیوخ میں خطیب نے بھی ان سے روایت کی ہے۔

(ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ و تذکرہ ج ۴ ص ۱۷ کتاب الانساب ورق ۵۴۸ و بستان المحدثین ص ۸۲)

طلب علم اور سماعِ حدیث کے لیے سفر:

حمیدی نے مشہور ممالک اسلامیہ اور مراکز حدیث کا دورہ کر کے علم وفن کی تحصیل کی اور حدیث اور اس کے متعلقہ فنون میں درک ومہارت بہم پہنچائی، اس سلسلہ میں انہوں نے اندلس، عراق، قیروان، حجاز، شام، افریقہ اور مصر وغیرہ کا سفر کیا اور ان مقامات کے علمائے فن اور اربابِ کمال سے استفادہ کیا، شروع میں وہ بلادِ مغرب میں مقیم رہے، ۴۴۸ھ میں بلادِ مشرق کا سفر کیا اور پہلی دفعہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے، یہیں ان کی کریمہ مروزیہ سے ملاقات ہوئی، وہ نہایت کم سنی میں علم وفن کی تحصیل اور حدیث کی روایت وسماع میں مشغول ہو گئے تھے، ان کا خود بیان ہے کہ سب سے پہلے میں نے ۴۲۵ھ میں فقیہ اصبغ بن راشد سے سماع کیا، گو اس وقت میری عمر کم تھی تاہم ان کے سامنے جو کچھ پڑھا جاتا تھا، اس کو سمجھ لیتا تھا، (تذکرہ ج ۴ ص ۳۲۳، ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵) صاحب نفح الطیب لکھتے ہیں کہ ''وہ لوگوں کے دوش پر بیٹھ کر سماع کے لیے جاتے تھے۔'' (نفح الطیب ج ۱ ص ۳۷۵)

اشتغال علم:

ان کو علم وفن سے بڑا تعلق تھا اور وہ برابر اس کی طلب وتحصیل اور نشر واشاعت میں منہمک رہتے تھے، ابن ماکولا کا بیان ہے کہ ان سے زیادہ میں نے علم سے اشتغال رکھنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔'' یافعی کا بیان ہے کہ وہ علم اور تحصیل علم کے دلدادہ تھے،

Marfat.com

ہمیشہ پورے شوق اور نہایت توجہ ومحنت سے علمی کاموں میں مصروف رہتے تھے، یہاں تک کہ گرمی کی تکلیف وہ راتوں میں بھی وہ علمی اشغال کوانہماک کے ساتھ جاری رکھتے تھے، علم سے تعلق اوراس کی نشرواشاعت سے ان کی دلچسپی کاایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انہوں نے کتابوں کاایک وسیع ذخیرہ جمع کیا تھااوران کا کتب خانہ طلبہ اور شائقین علم کے لیے وقف رہتا تھا۔ (نفح الطیب ج ۱ ص ۵۷۵ و ۵۷۶، ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵، تذکرہ ج ۴ ص ۱۸، المنتظم ج ۹ ص ۹۶، مراۃ الجنان ج ۳ ص ۱۴۹، شذرات ج ۳ ص ۳۹۲، تاریخ ابن اثیر ج ۱ ص ۸۸)

ضبط وثقاہت:

ان کے حفظ وضبط اور عدالت وثقاہت میں کوئی کلام نہیں کیا گیا ہے، ان کے معاصرین، تلامذہ اور سوانح نگاروں نے ان کو حافظ المشہور، الحافظ الکبیر، احد، حفاظ عصرہ، ثقہ، ثبت حجت، قدوہ اور متقن وغیرہ کہا ہے۔

حدیث میں درجہ ومرتبہ:

حمیدی کا درجہ حدیث وروایت میں مسلّم ہے، ارباب فن نے ان کو صاحب حدیث اور حافظ مکثر کہا ہے جو اس فن میں ان کی عظمت وجلالت کا ثبوت ہے، ابن ماکولا نے ان کے تیقظ کی تعریف کی ہے، یحییٰ بن ابراہیم سلماسی فرماتے ہیں کہ ''وہ حدیث اوراس کے علل ورواۃ کے عارف وامام اوراس کے ضبط وتحقیق اور تطبیق واصول میں ماہر تھے۔'' ذہبی کا بیان ہے کہ ان کو حدیث سے ویسی ہی واقفیت تھی جیسی ہونی چاہیے تھی، صاحب نفح الطیب لکھتے ہیں کہ وہ حدیث کے حفظ وضبط اور معرفت، نیز ثقاہت واتقان اور صدق وغیرہ میں امام تھے، ان کی یہ خصوصیت بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ حدیثیں بڑے دلکش اور عمدہ انداز میں پڑھتے تھے۔ (تذکرہ ج ۴ صفحات ۱۸، ۱۹، ۲۰، ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ وبستان ص ۸۲، نفح الطیب ج ۱ ص ۵۷۵ و ۵۷۶)

علم رجال:

حدیث کی طرح اس کے متعلقہ علوم یعنی علل حدیث اور فن رجال میں بھی ماہر تھے علم حدیث کے سلسلہ میں اسماء الرجال کے فن کو جو اہمیت حاصل ہے حمیدی کو اس کا پورا اندازہ تھا، چنانچہ فرماتے ہیں کہ علم حدیث کے سلسلہ میں تین چیزوں پر خاص طور سے دھیان دینے اوران کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک کتاب العلل اس میں سب سے عمدہ تصنیف امام دارقطنی کی ہے، دوسری موتلف ومختلف، اس فن میں امیر ابن ماکولا کی اکمال سب سے عمدہ کتاب ہے، تیسری وفیات مشائخ، اس میں کوئی کتاب نہیں ہے، اسلیے میں نے اسکو مرتب کرنے کا ارادہ کیا ہے لیکن ابن ماکولا کا بیان ہے کہ وہ صحیحین میں اشتغال کی وجہ سے اس کی جانب اعتنا نہیں کرسکے اوران کی وفات ہوگئی۔ (تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ و ۲۸۶ و تذکرہ ج ۴ ص ۱۹ و مراۃ الجنان ج ۳ ص ۱۴۹)

ذہانت ووسعت علم:

مؤرخین نے حمیدی کی ذہانت وفطانت، وسعت علم ومطالعہ اور کثرت معلومات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ علوم کا مخزن تھے، ابوعامر حیدری نے ان کو علمی حیثیت سے عدیم المثال بتایا ہے، یحییٰ بن ابراہیم سلماسی فرماتے ہیں کہ ''وہ فضل و

Marfat.com

شرافت اور وفور علم میں بے نظیر تھے، میں نے علم و فن کی اشاعت کا ان سے زیادہ حریص شخص نہیں دیکھا۔''
(نفح الطیب ج ۱ ص ۲۷۵، تذکرہ ج ۴ ص ۱۸، و مرأۃ الجنان ج ۳ ص ۱۴۹

فقہ:

فقہ میں بھی امتیاز رکھتے تھے، اپنے والد اور مشہور فقیہ محمد بن ابوزید سے اس فن کی تحصیل کی تھی، ان سے انہوں نے الرسالہ و مختصر مدونہ کی روایت بھی کی ہے، ابو عامر حیدری کا بیان ہے کہ وہ فقہ و حدیث دونوں میں جامع تھے۔
(تذکرہ ج ۴ ص ۱۷ و ۱۸ و نفح الطیب ج ۱ ص ۲۷۵)

سیر و تاریخ:

حمیدی کی اخبار، سیر، تاریخ اور وقائع پر بھی گہری نظر تھی، اس پر ان کی تصنیفات شاہد ہیں۔

ادب و عربیت:

دینی علوم کی طرح ادبیات سے بھی شغف تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

در علم عربیت و ادب و حل تراکیب قرآن و دریافت لطافت بلاغت آن دستگاہی کلی نصیب دارد۔ (بستان المحدثین ص ۸۲)

علم عربیت و ادب، قرآن کی ترکیبوں کے حل اور اس کے بلاغت و لطائف کی دریافت میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔

صاحب نفح الطیب کا بیان ہے کہ وہ علم و ادب و عربیت میں متبحر تھے۔ (ج ۱ ص ۲۷۵)

شعر و سخن:

حمیدی نے موزوں طبیعت پائی تھی، اس لیے شعر و شاعری بھی کرتے تھے، ان کے اشعار وعظ و پند اور حکمت و موعظت پر مشتمل ہوتے تھے، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

لقاء الناس لیس یفید شیئا — سوی الھذیان من قیل و قال

فاقلل من لقاء الناس الا — لاخذ العلم او اصلاح حال

لوگوں سے میل جول بے فائدہ ہے، اس سے بکواس اور لایعنی قیل و قال کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، اس لیے علم کی تحصیل یا اپنی اصلاح کے علاوہ لوگوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کردو۔

کتاب اللہ عزوجل قولی — وما صحت بہ الآثار دینی

وما اتفق الجمیع علیہ بدأ — وعودا فھو عن حق مبین

فدع عد ما صد عن ھذا وخذھا — تکن منھا علی عین الیقین
(بستان المحدثین ص ۸۲ و اتحاف النبلاء ص ۳۸۳)

اللہ کی کتاب اور صحیح روایت و آثار میرا مسلک و دین ہے اور جن چیزوں پر امت اول سے آخر تک متفق ہو وہ بھی بجا طور پر حق مبین ہے، اس لیے اگر تم بھی ان کو اختیار کرلو اور جو چیزیں ان میں مانع ہوں ان کو چھوڑ دو تو عین یقین پر فائز ہو جاؤ گے۔

Marfat.com

ورع وتقویٰ:

علم وفضل کی طرح تقویٰ کے زیور سے بھی آراستہ تھے، ان کے ورع وعفاف، عفت وتدین اور پاکبازی کا تمام ارباب سیر نے ذکر کیا ہے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ وہ نباہت ومعرفت، اتقان، تدین اور ورع سے متصف تھے، ان کے معاصر اور دوست امیر ابن ماکولا فرماتے ہیں کہ مجھ کو پاکی، نزاہت، عفت اور پرہیزگاری میں حمیدی کا کوئی مثیل نظر نہیں آیا، اتباع سنت ان کا خاص شعار تھا، حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے، شرم وحیا کے پیکر تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز ابوبکر بن میمون نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا، حمیدی نے غفلت کی وجہ سے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ سمجھے کہ غالباً مجھ کو اندر جانے کی اجازت ہے، چنانچہ وہ کمرے کے اندر داخل ہو گئے، اس وقت حمیدی کی ران کھلی تھی، وہ شرم سے پانی پانی ہو گئے اور دیر تک ان پر رقت طاری رہی، انہوں نے کہا جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے اس وقت سے آج تک کسی نے میری ران کو برہنہ نہیں دیکھا تھا۔

(ابن خلکان ج ۳ ص ۲۸۵ و تذکرہ ج ۴ ص ۱۸)

دُنیا سے بیزاری:

ورع وتدین کی بنا پر وہ دنیا سے نہایت بے زار اور کنارہ کش رہتے اور دنیا اور اس کے زخارف کے تذکرہ سے کبھی ان کی زبان آلودہ نہ ہوتی اور نہ ان کی مجلسوں میں مال ومتاع دنیا کا کوئی چرچا ہوتا تھا، ان کی زندگی نہایت سادہ اور صبر وقناعت کی تھی، صرف کفاف پر گزربسر کرتے تھے، ابوبکر بن خاضیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کو کبھی دنیا کا تذکرہ کرتے ہوئے نہیں پایا، شاہ عبد العزیز صاحب فرماتے ہیں کہ لوگوں نے ان کی مجلسوں اور گھر وغیرہ میں بارہا ان کا امتحان لینا چاہا لیکن ان کی زبان پر دنیا اور اس کی جاہ وحشمت کا کوئی ذکر نہیں آیا، ان کی شاعری بھی نہایت پُراز حکمت اور دنیا کی مذمت پر مشتمل ہوتی تھی۔

(تذکرہ ج ۴ ص ۸ و بستان المحدثین ص ۸۲)

فقہی مذہب ومسلک:

وہ امام ابن حزم کے اخص تلامذہ میں تھے، اس لیے ان کا رجحان بھی اپنے استاذ کی طرح ظاہری مذہب کی طرف تھا، غالباً ان کے زمانہ میں اہل ظاہر کے خلاف یک گونہ شورش وہیجان پایا جاتا تھا، اس لیے وہ اپنی ظاہریت کو مخفی رکھتے تھے، قاضی عیاض کا بیان ہے کہ اس کے باوجود ان کو فتنوں سے دوچار ہونا پڑا اور بعض علماء نے ان کے ساتھ سختی اور شدت کا معاملہ کیا، اس سے تنگ آ کر بلادِ مشرق کی طرف چلے گئے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۹، ۲۰)

وفات:

حمیدی نے منگل کی شب میں ۱۷/ ذی الحجہ ۴۸۸ھ کو اس جہان فانی کو الوداع کہا اور بدھ کے روز باب ابرز میں شیخ ابو اسحٰق شیرازی کے مزار کے پاس دفن کئے گئے۔ مشہور شافعی فقیہ محمد بن احمد بن حسین نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔

مدفن:

مشہور ہے کہ انہوں نے وفات سے پیشتر بغداد کے افسر اعلیٰ مظفر کو وصیت کی تھی کہ مجھ کو بشر حافی کے مزار کے پاس دفن کیا

Marfat.com

جائے لیکن اس نے اس وصیت کا خیال نہیں کیا اس لیے وہ پہلے شیخ ابو اسحاق کے مقبرہ کے قریب دفن کیے گئے، مگر کچھ دنوں کے بعد مظفر نے خواب دیکھا کہ حمیدی اس بارے میں اس سے گلہ وشکایت کر رہے ہیں، اس کا اثر یہ ہوا کہ ماہ صفر ۹۱۱ھ میں اس نے ان کو سابق مدفن سے منتقل کر کے بشر حافی کے مقبرہ کے پاس دفن کرا دیا، کہا جاتا ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود ان کا کفن تروتازہ اور جسم صحیح وسالم تھا اور دور تک اس کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی، بعض مؤرخین نے اس واقعہ کو ان کی کرامت میں شمار کیا ہے۔
(ایضاً و بستان المحدثین ص ۸۲ و نفح الطیب ج ۱ ص ۲۷۶)

تصنیفات:

حمیدی سے جو تصنیفات یادگار ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ کتاب الجمع بین الصحیحین: یہ حمیدی کی سب سے اہم اور مشہور تصنیف ہے، اس کو انہوں نے صحابہؓ کے ناموں پر ان کے فضل وتقدم کے اعتبار سے مرتب کیا ہے، اس لیے اس میں سب سے پہلے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور اس کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم پھر عشرہ مبشرہؓ کی حدیثیں ہیں اور اس کے بعد دیگر صحابہ کے مرویات ان کے مراتب کے اعتبار سے درج ہیں، اس موضوع پر اور علما نے بھی کتابیں لکھی ہیں لیکن حمیدی کی تصنیف کو خاص امتیاز حاصل ہے اور وہ بڑی مستند ومعتبر خیال کی جاتی ہے، علامہ ابن اثیر جزری لکھتے ہیں:

> واعتمدت فی النقل من الصحیحین علی ماجمعه الحمیدی فی کتابه فانه احسن فی ذکر طرقه واستقصی فی ایراد رواته والیه المنتهی فی جمع هذین الکتابین۔
>
> میں نے صحیحین کی حدیثیں (اپنی کتاب جامع الاصول میں) نقل کرنے میں حمیدی کی کتاب پر اعتماد کیا ہے، کیونکہ انہوں نے روایات کے طرق بیان کرنے میں بڑی خوبی سے کام لیا ہے اور رواۃ کا بھی نہایت استقصا سے ذکر کیا ہے، پس ان دونوں کتابوں کے بارے میں یہی کتاب اصل مرجع ہے۔

اس کتاب کی اہمیت کی وجہ سے اس کی شرحیں اور تلخیصات بھی کی گئی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ الایضاح عن معانی الصحاح: یہ عون الدین ابو المظفر یحییٰ بن محمد المعروف بابن ہبیرۃ وزیر حنبلی (م ۵۶۰ھ) کی شرح ہے، اس میں حکم نبوی کی شرح ووضاحت کی گئی ہے، اور یہ چند جلدوں پر مشتمل ہے، اس کی پہلی جلد کو لوگوں نے کتاب الافصاح کے نام سے علیحدہ اور مستقل کتاب قرار دیا ہے۔

۲۔ الحجۃ: ابو علی حسن بن خطیر نعمانی الظہیر فارسی (م ۵۸۹ھ) کی شرح ہے، جو کتاب الافصاح کا مختصر ہے تاہم اس میں بعض اضافے بھی ہیں۔

۳۔ حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) نے الجمع کی تلخیص کی ہے، الجمع کے قلمی نسخے شیخ الاسلام مدینہ، خدیویہ مصر اور خدا بخش خان پٹنہ کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔
(مقالات سلیمان ج ۲ ص ۵۷ و فہرست خدیویہ مصر ج ۲ ص ۲۲۵ و فہرست کتب خانہ خدا بخش پٹنہ ج ۱ ص ۴۷)

Marfat.com

ایک اعتراض اور اس کا جواب:

عراقی کا بیان ہے کہ حمیدی نے اس میں بعض ایسے الفاظ اور تتمے بڑھائے ہیں جو صحیحین میں موجود نہیں ہیں، اس بنا پر اصل واضافہ میں تمیز مشکل ہوگئی ہے لیکن بقائی نے اس کا جواب دیتے ہوئے خود حمیدی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ گو میں نے اس میں تتمے کے طور پر صحیحین کے ساتھ اعتنا کرنے والے بعض لوگوں مثلاً اسماعیلی و برقانی وغیرہ کے بیانات الفاظ حدیث کی تشریح وغیرہ کے ضمن میں نقل کیے ہیں مگر اصل واضافہ میں امتیاز کے لیے اس قسم کے الفاظ بھی لکھے ہیں۔

الی ھھنا انتھت روایة البخاری او من ھنا زادہ البرقانی او کذا زادہ فلان۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۴۰۰ و ۴۰۱)

یہاں بخاری کی روایت تمام ہوگئی یا یہاں سے برقانی کا اضافہ شروع ہوتا ہے یا یہ فلاں شخص کا اضافہ ہے۔

۲۔ کتاب تاریخ اندلس: اس کا اصل نام جذوۃ المقتبس فی تاریخ علما الاندلس یا جذوۃ المقتبس فی اخبار علما الاندلس ہے، اس کے شروع میں مصنف نے لکھا ہے کہ انہوں نے اس کو اپنی یادداشت سے مرتب کیا ہے۔

(ایضاً ج ۱ ص ۳۹۰ و بستان المحدثین ص ۸۲)

۳۔ کتاب الامانی الصادقہ، ۴۔ کتاب تسہیل السبیل الیٰ علم الترسیل، ۵۔ کتاب ماجاء من النصوص والاخبار فی حفظ الجار، ۶۔ کتاب ذم النمیمہ، ۷۔ کتاب الذہب المسبوک فی وعظ الملوک، ۸۔ کتاب الرسل، ۹۔ جمل تاریخ الاسلام یا تاریخ الاسلام، ۱۰۔ کتاب مخاطبات الاصدقاء فی المکاتبات واللقاء، ۱۱ کتاب من ادعی الامان من اہل الایمان۔ (ایضاً و نفح الطیب ج ۱ ص ۴۷۵)

Marfat.com

حافظ شیرویہ بن شہردار دیلمی

(م ۵۰۹ھ)

نام ونسب:

شیرویہ نام ابوشجاع کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: شیرویہ بن شہردار شیرویہ ابن فناخسرو۔

ولادت ووطن:

۴۴۵ھ میں ہمدان میں پیدا ہوئے۔

خاندان:

وہ نسباً عجمی تھے اور ان کا سلسلۂ نسب رسول اللہ ﷺ کے صحابی فیروز دیلمیؓ سے ملتا ہے، حضرت فیروز دیلمیؓ کو مدعی نبوت اسود عنسی کے قاتل ہونے کا فخر حاصل ہے۔ (طبقات الشافعیہ ج ۴ ص ۲۳۰ وشذرات الذہب ج ۴ ص ۲۴)

شیوخ:

شیرویہ کے بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابوالقاسم بن السری (یا البسری) احمد بن عیسیٰ بن عباد دینوری، سفیان بن حسین بن فنجویہ، ابومنصور عبدالباقی بن محمد (یا علی) العطار، عبدالحمید بن حسن قفائی، ابوعمرو عبدالوہاب بن مندہ، ابوالفرج علی بن محمد حریری بجلی ابوالفضل محمد بن عثمان قومسانی (یا قوسانی) محمد بن عیسیٰ دینوری اور یوسف بن محمد بن یوسف مستملی وغیرہ۔

(طبقات الشافعیہ ج ۴ ص ۲۳۰ وتذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۵۵و۵۶)

تلامذہ:

چند تلامذہ کے نام ملاحظہ ہوں:

حافظ ابوموسیٰ مدائنی، حافظ ابوالعلا احمد بن حسن عطا، حافظ ابوالعلا احمد بن محمد بن فضل اسفرائنی، محمد بن قاسم ساوی۔

شیرویہ کے خاص تلامذہ میں ان کے نامور فرزند شہردار دیلمی بھی ہیں، (طبقات الشافعیہ ج ۴ ص ۲۳۰ تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۵۵ و۵۶) ان کے مختصر حالات آگے درج ہیں۔

رحلت وسفر:

ذہبی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمدان کے علاوہ انہوں نے اصفہان، بغداد اور قزوین کے اہل علم اور محدثین سے

Marfat.com

کسب فیض کیا تھا، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ان جگہوں کے علاوہ دوسرے اسلامی شہروں میں بھی سیر وسیاحت کی اور ابن صلاح نے ان کے متعلق واسع الرحلہ لکھا ہے۔ (تذکرہ ج ۴ ص ۵۶ و بستان ص ۶۲ و شذرات الذہب ج ۴ ص ۲۴)

حدیث میں درجہ:

وہ مشہور حفاظ اور صاحب تصنیف محدثین میں تھے، اہل سیر نے ان کو المحدث والحافظ لکھا ہے، ذہبی نے ان کے حسن معرفت کا بھی ذکر کیا ہے، تاہم ضبط واتقان میں زیادہ بلند پایہ نہ تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

اما در اتقان، معرفت و علم او قصوریست در سقیم و صحیح احادیث تمیز نمی کند ولہذا در یں کتاب او موضوعات و واہیات تودہ تودہ مندرج۔ (بستان المحدثین ص ۶۲)

اتقان معرفت اور علم میں کچھ قصور تھا سقیم اور صحیح حدیثوں میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے لہٰذا ان کی اس کتاب (فردوس الاخبار) میں موضوعات اور غیر مستند چیزیں درج ہیں۔

تاریخ وسیر:

حدیث کی طرح سیر و تاریخ بھی ان کا موضوع تھا اور ان فنون پر ان کی اچھی نظر تھی اور مورخ ہمدان کہلاتے تھے۔

ذہانت:

وہ غیر معمولی ذہین تھے، ذہبی نے ذکی القلب، ابن صلاح نے ذکی اور یحییٰ ابن مندہ نے کیس کہہ کر ان کی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔

عقیدہ ومسلک:

شیرویہ صحیح العقیدہ اور مذہب اہل سنت کے بڑے حامی اور فرق باطلہ سے متنفر تھے، ابن صلاح اور ابن مندہ نے ان کو مذہب سنت میں متصلب اور اعتزال سے دور بتایا ہے۔

فقہی مذہب:

فقہ میں امام شافعی کے مذہب کے پیرو تھے، ابن شہبہ اور تاج الدین نے طبقات الشافعیہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔

اخلاق واوصاف:

حسن خلق سے بھی متصف تھے، ابن مندہ وابن صلاح نے ان کے خلیق، دلیر اور کم گو ہونے کا ذکر کیا ہے۔

شکل وشباہت:

سیرت کی طرح عمدہ صورت بھی پائی تھی اور بڑے وجیہ وشکیل آدمی تھے، ابن مندہ وابن صلاح نے کہا ہے کہ وہ صورت وسیرت دونوں میں ممتاز تھے۔

وفات:

رجب ۵۰۹ھ میں وفات ہوئی۔ (یہ تفصیلات تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۵۶ طبقات الشافعیہ ج ۴ ص ۲۳۰ شذرات الذہب ج ۴ ص ۲۴ اور بستان المحدثین ص ۶۲ سے ماخوذ ہیں)

Marfat.com

اولاد:

انکے ایک صاحب زادہ ابو منصور شہر دار کا ذکر ملتا ہے، یہ بھی صاحب فضل وکمال تھے، اسلئے انکے مختصر حالات درج ہیں۔
شہر دار نے اپنے والد کے علاوہ متعدد اساتذۂ فن سے علم حدیث کی تحصیل کی تھی، ان کو علم حدیث کی فہم ومعرفت کا بڑا ملکہ تھا، سمعانی نے ان کے فہم ومعرفت کی شہادت دی ہے، لوگوں کا خیال ہے کہ ضبط واتقان اور فہم ومعرفت حدیث میں اپنے والد سے بہتر تھے، طلب علم میں یہ ان کے ساتھ ساتھ رہتے تھے، ۵۰۵ھ میں ان کے ہمراہ اصفہان گئے اور ۵۳۷ھ میں تنہا بغداد تشریف لے گئے، زیادہ وقت درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں بسر کرتے، علم وادب سے اچھی واقفیت تھی، زہد واتقاء کے زیور سے آراستہ اور بڑے عبادت گزار تھے، مسجد ہی میں رہ کر تالیف وتصنیف اور درس وتدریس کا کام بھی انجام دیتے تھے، اپنے والد شیرویہ کی کتاب فردوس الاخبار کو ازسرنو مرتب کیا اور جب اس کی تہذیب وتنقیح سے فارغ ہوئے تو ان کے لڑکے اور شیرویہ کے پوتے ابو مسلم احمد اور دوسرے شاگردوں نے ان سے اس کی روایت کی، ۵۵۸ھ میں انتقال کیا۔
(شہردار کے حالات کے لیے طبقات الشافعیہ ج ۴ ص ۲۳۰ و بستان المحدثین ص ۶۲ ملاحظہ ہو)

تصنیفات:

حافظ شیرویہ کا خاص مشغلہ درس وتدریس اور تالیف وتصنیف تھا، ان کی جن کتابوں کے نام معلوم ہوسکے ہیں وہ یہ ہیں۔
۱۔ کتاب الفردوس: یہ قضاعی کی کتاب الشہاب پر متخرج ہے، اسی لیے اس کا نام فردوس الاخبار بماثور الخطاب المخرج علی کتاب الشہاب ہے، یہ دس ہزار چھوٹی چھوٹی حدیثوں پر مشتمل ہے، شاہ عبد العزیز صاحبؒ نے کتب حدیث کے چوتھے طبقہ میں اس کا ذکر کیا ہے، اس کی ترتیب مشارق اور جامع صغیر کی طرح حروف تہجی پر ہے، اس میں سندوں کا ذکر نہیں ہے لیکن رواۃ کا ذکر ہے، حوالہ اور مخرج کے لیے علامتیں اور رموز دیئے گئے ہیں، سیوطی کی جامع صغیر میں بعینہٖ اس کا تتبع کیا گیا ہے، یہی کتاب مسند الفردوس کے نام سے مشہور ومتداول ہے، جس کو مصنف کے فرزند (محدث شہردار) نے چار جلدوں میں ازسرنو صحابہؓ کے ناموں پر مرتب کیا ہے اور ہر ہر حدیث کو سنداً بیان کیا ہے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۱۸۶ والرسالۃ المستطرفۃ ص ۶۴ و بستان المحدثین ص ۶۲)
حافظ ابن حجر نے تہدیس القوس فی مختصر مسند الفردوس کے نام سے اس کا مختصر کیا ہے، (ایضا) اور سیوطی کا بیان ہے کہ حافظ نے اس کے زوائد ایک جلد میں جمع کیے ہیں۔ (تدریب الراوی ص ۲۹)
اس کے قلمی نسخے مدینہ، جرمنی، مصر، حیدرآباد اور رام پور کے کتب خانوں میں ہیں۔ (مقالات سلیمان ج ۲ ص ۳۵۸، مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۴ فہرست خدیویہ مصر ج ۱ ص ۱۹، ۴۱۹، ۱۹ ۴ و فہرست کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد ج ۱ ص ۶۵۴ و ۶۵۵ و فہرست انگریزی رضا لائبریری رام پور ج ۱ ص ۶۴ ۲ تا ۲۶۶)

۲۔ تاریخ ہمدان، شیخ محمد بن عبد الملک ہمدانی (م ۵۲۱ھ) نے اس کا ذیل لکھا ہے۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۲۳۵)
۳۔ کتاب حکایات المنامات، ۴۔ ریاض الانس لعقلاء الانس فی معرفۃ احوال النبی ﷺ وتاریخ الخلفاء: اس میں نبی ﷺ کی سیرت مبارکہ کے علاوہ خلفائے راشدینؓ، خلفائے بنی امیہ وعباس کا تذکرہ بھی آگیا ہے، یہ کتاب عباسی خلیفہ مستظہر باللہ ابو العباس احمد بن عبد اللہ المقتدی بامر اللہ (۴۸۷ھ تا ۵۱۲ھ) کے تذکرہ پر تمام ہوئی ہے، اس کا قلمی نسخہ مصر کے کتب خانہ میں ہے۔ (تذکرۃ النوادر ص ۸۰ و ۸۱)

Marfat.com

امام ابو محمد حسین فراء بغوی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۵۱۹ھ)

نام ونسب:

حسین نام، ابو محمد کنیت، محی السنہ ورکن الدین لقب اور الفراء وابن الفراء عرفیت ہے، نسب نامہ یہ ہے: حسین بن مسعود بن محمد بن الفراء۔

فراء وابن الفراء کی عرفیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرو (پوستین) سینا اور فروخت کرنا ان کا خاندانی پیشہ تھا۔
(تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۵۴ وبستان المحدثین ص ۵۲)

ولادت ووطن:

امام بغوی ۴۳۶ھ یا اس سے کچھ پہلے بغ میں پیدا ہوئے، یہ ہرات اور مرو کے درمیان خراسان کا ایک مقام ہے، اس کا اصلی نام بغشور جو باغ کور کا معرب ہے بتایا جاتا ہے "شور" حذف ہو جانے سے بغ ہو گیا، بغوی کی نسبت اسی کی طرف ہے، ابوسمعانی (م ۵۶۲ھ) کو کئی بار یہاں جانے کا اتفاق ہوا، ان کے زمانے تک یہ آباد اور معمور تھا لیکن یاقوت حموی کا بیان ہے کہ ۶۱۶ھ میں یہ اجڑنا شروع ہو گیا تھا، اس شہر کو جن اکابر علمائے اسلام کا مولد ہونے کا شرف حاصل ہے ان میں فراء بغوی بھی ممتاز اور قابل ذکر ہیں۔ (ایضاً وابن خلکان ج ۱ ص ۲۶۰ وکتاب الانساب ورق ۸۶ ومعجم البلدان ج ۲ ص ۲۴۵ و۲۴۶)

اساتذہ:

ان کے بعض مشہور شیوخ کے نام ملاحظہ ہوں:
احمد بن نصر توقانی، حسان بن محمد منیعی، قاضی حسین، ابوالفضل زیاد بن محمد حنفی، ابوالحسن عبدالرحمٰن بن محمد داؤدی، ابو عمر عبدالواحد بن احمد ملیحی، ابوالحسن علی بن یوسف جوینی، ابوالحسن محمد بن محمد شیرازی، ابوبکر محمد بن ہیثم ترابی اور ابوبکر یعقوب بن احمد صیرفی۔

قاضی حسین صاحب تعلیقہ فقہ میں بڑے صاحب کمال تھے، ان کا شمار اجل شوافع میں ہوتا ہے، بغوی ان کے خاص تلامذہ میں تھے اور فقہ کی تحصیل ان ہی سے کی تھی۔

تلامذہ:

ابو منصور محمد بن اسعد عطاردی المعروف بابن حفدہ، ابوالفتوح محمد بن محمد طائی وغیرہ ان کے مشہور شاگرد ہیں، بغوی کے

Marfat.com

آخری شاگرد جن کو ان سے روایت کی اجازت حاصل تھی، ابوالمکارم فضل اللہ بن محمد توقانی تھے، یہ چھٹی صدی ہجری تک طالقان میں بقید حیات رہے اور علامہ ذہبی کے شیخ فخرالدین علی مقدسی کو ان سے اجازت حاصل تھی۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۵۴ و ۵۵ وطبقات الشافعیہ (ابن سبکی) ج ۴ ص ۲۱۴ و ۲۱۵)

سماعِ حدیث کی ابتدا:

بغوی کے سوانح نگاروں نے ان کے رحلت وسفر کی تصریح نہیں کی ہے لیکن اس عہد کے محدثین کی طرح انہوں نے بھی سماع حدیث اور تحصیل علم کے لیے اسلامی ممالک کا سفر ضرور کیا ہوگا، علامہ ابن سبکی کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ۴۶۰ھ کے بعد حدیث کے سماع کا آغاز کیا تھا۔ (طبقات الشافعیہ ج ۴ ص ۲۱۴)

حدیث میں درجہ:

ان کا درجہ حدیث میں مسلم ہے، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ اس فن میں ان کا مقام نہایت بلند ہے، ابن خلکان نے محدث اور ذہبی نے الحافظ کہہ کر ان کے حدیث میں کمال وامتیاز کا ذکر کیا ہے، ابن ہبۃ اللہ بغوی کو فن حدیث میں امام اور صاحب روضات عدیم النظیر بتاتے ہیں، شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ وہ بے نظیر محدث اور معتبر ومعتمد شارحین حدیث میں تھے، شوافع میں احادیث کی شرح وتوجیہ کے لیے جو علماء ممتاز سمجھے جاتے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہیں۔ (طبقات الشافعیہ ابن سبکی ج ۴ ص ۲۱۴ و ابن خلکان ج ۱ ص ۲۵۹ و ۲۶۰ وطبقات الشافعیہ لابن ہبۃ اللہ ص ۴۷ بستان المحدثین ص ۵۲ وعجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۵۴) ان کا لقب محی السنہ اس فن میں ان کی عظمت وکمال کا ثبوت ہے۔

تفسیر:

کلام رسول کی طرح کلام الٰہی سے بھی ان کو خاص شغف اور لگاؤ تھا، چنانچہ حدیث کی طرح قرآن مجید کی تشریح وتفسیر میں بھی وہ ممتاز مانے جاتے ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ان کو بے عدیل اور صاحب روضات نے عدیم النظیر مفسر کہا ہے اور ابن سبکی نے علم تفسیر میں عالی وبلند پایہ اور ابن ہبۃ اللہ نے امام بتایا ہے، (طبقات الشافعیہ ابن سبکی ج ۴ ص ۲۱۴ و ابن خلکان ج ۱ ص ۲۵۹ و ۲۶۰ وطبقات الشافعیہ لابن ہبۃ اللہ ص ۴۷ بستان المحدثین ص ۵۲ وعجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۵۴) حدیث کی طرح تفسیر میں بھی ان کی کتاب نہایت اہم خیال کی جاتی ہے، کلام اللہ کے سلسلہ میں وہ قراءت وتجوید کے فن کے ماہر بھی تھے، اپنی تفسیر میں انہوں نے قراءت کے متعلق مفید بحثیں کی ہیں۔

فقہ:

وہ فقہ کے ماہر اور مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے، اسی لیے علامہ ذہبی نے ان کو المجتہد کہا ہے، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں۔

''ان کو فقہ میں ید طولا حاصل تھا اور اس میں ان کی معلومات کا دائرہ نقل وتحقیق ہر اعتبار سے وسیع تھا، ان کے اختیار کردہ مسائل پر جب بحث کی گئی تو وہ ان اقوال کے مقابلہ میں جن کو انہوں نے ترک کیا تھا، قوی اور مرجح تھے، ابن ہبۃ اللہ کا بیان ہے کہ وہ فقہ میں امام تھے، قاضی حسین صاحب تعلیقہ سے تلمذ ان کے بلند پایہ فقیہ ہونے کا ثبوت ہے۔''

Marfat.com

بغوی مجتہدانہ اوصاف کے باوجود شافعی المذہب تھے اوران کا شمار اکابر شوافع میں ہوتا ہے۔ (ایضاً)

جامعیت واعتراف سے کمالات:

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس بغوی کی جامعیت، گوناگوں کمالات اور اسلام کے تین اہم اور بنیادی علوم یعنی تفسیر، حدیث اور فقہ میں امامت وعظمت شان پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، چنانچہ علامہ ابن سبکی وابن ہبۃ اللہ کا بیان ہے کہ وہ قرآن وسنت اور فقہ کے علوم کے جامع، امام اور یکتائے روزگار تھے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ بغوی ان تینوں علوم کے فاضل تھے، شاہ عبد العزیز صاحب لکھتے ہیں کہ وہ ان تینوں فنون میں جامع اور ہر ایک میں مرتبہ کمال پر فائز تھے، ان کی پوری زندگی انہی علوم کے پڑھنے پڑھانے اور ان سے متعلق کتابیں لکھنے میں بسر ہوئی، ابن اہدل کا بیان ہے کہ انہوں نے مختلف الفنون مفید تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں، علامہ ابن سبکی کا بیان ہے کہ بغوی جلیل القدر امام تھے، وہ بغداد نہیں جاسکے ورنہ ان کا بڑا مبسوط تذکرہ لکھا جاتا، شیخ امام (صاحب شرح مہذب) ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان کی تحقیقات کی تعریف کرتے تھے، ذہبی نے ان کو امام، حافظ، مجتہد اور محی السنۃ اور ابن خلکان نے علوم کا سمندر بتایا ہے اور یافعی وابن عماد نے امام اور عالم خراسان لکھا ہے۔

(طبقات الشافعیہ ج ۴ ص ۲۱۴ و ۲۱۵، البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۱۹۳، بستان المحدثین ص ۵۲ وتذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۵۴ ومرآۃ الجنان ج ۳ ص ۲۱۳ وشذرات الذہب ج ۴ ص ۴۹)

شغل:

اوپر گزر چکا ہے کہ وہ تفسیر، حدیث اور فقہ تینوں علوم کے جامع تھے اور ان ہی مبارک علوم سے متعلق تصنیف وتالیف اور درس وتدریس میں عمر گزار دی (تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۵۹ وبستان المحدثین ص ۵۲) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم وفن کی خدمت وتحقیق ہی ان کا خاص معمول تھا اور شب وروز وہ اسی میں مشغول ومنہمک رہتے تھے۔

زہد وعبادت:

عملی اور دینی حیثیت سے بھی ممتاز اور بلند پایہ تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ قائم اللیل وصائم النہار علمائے ربانیین میں تھے، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں کہ بغوی علم وعمل کے جامع، متبع سلف اور دینی لحاظ سے عالی مقام تھے، دوسرے ارباب سیر وتذکرہ نے بھی ان کے زہد وورع، صلاح وتقویٰ اور نسک وعبادت کا ذکر کیا ہے۔

(تذکرہ ج ۴ ص ۵۴ طبقات ج ۴ ص ۲۱۴، والبدایہ ج ۱۱ ص ۱۹۳ وبستان ص ۵۲)

سادگی وقناعت:

ان کی زندگی تکلف وآرائش سے خالی اور نہایت سادہ تھی، قناعت اور سادگی کا یہ حال تھا کہ ہمیشہ روکھا سوکھا کھاتے اور موٹا جھوٹا پہنتے تھے اور کفاف پر گزر بسر کرتے تھے، افطار میں صرف روٹی کا ایک خشک ٹکڑا ان کے لیے کافی ہوتا تھا، لوگوں نے اصرار سے کہا کہ خشک روٹی سے دماغ میں خشکی پیدا ہو جائے گی مگر اس پر بھی انہوں نے سالن نہیں استعمال کیا، البتہ روغن زیتون سے روٹی کھانے لگے، مال ودولت کی ذرہ برابر حرص وہوس نہ کرتے، ان کی بیوی کا انتقال ہوا تو انہوں نے ان کے ترکہ سے اپنا حصہ نہیں لیا۔ (ایضاً وابن خلکان ج ۱ ص ۲۵۹ و ۲۶۰)

Marfat.com

طہارت ونظافت:

صفائی اور ستھرائی کا بڑا خیال رکھتے، طہارت اور وضو کے بغیر درس نہیں دیتے تھے۔ (ایضاً)

وفات:

مرورود میں شوال ۵۱۶ھ میں وفات پائی اور اپنے استاذ قاضی حسین کے مقبرہ کے پاس طالقان میں دفن کئے گئے، ان کی قبر عرصہ تک زیارت گاہ خلائق بنی ہوئی تھی، ایک روایت کے مطابق انہوں نے ۵۱۰ھ میں انتقال کیا۔ (ایضاً)

تصنیفات:

امام بغوی نامور مصنف تھے، تفسیر، قراءت، حدیث اور فقہ جیسے اسلامی علوم میں ان سے مفید اور بلند پایہ کتابیں یادگار ہیں، علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ان کی نیک نیتی کی وجہ سے ان کی تصنیفات میں بڑی برکت ہوئی، ذیل میں تصنیفات کے نام اور بعض کا تعارف درج ہے۔

معالم التنزیل:

یہ تفسیر کی مشہور و متداول کتاب ہے، اس میں صحابہ و تابعین اور متقدمین علمائے تفسیر کے اقوال و آثار نقل کرنے کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے، اس لیے اس کی حیثیت ماثوری تفسیروں کی ہے، مصنف نے مقدمہ میں کلام مجید کی اہمیت، اس کے نزول کا مقصد اور اس کی تفسیر و تاویل کی ضرورت اور ائمہ سلف کے تفسیری خدمات وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ گو قدیم اکابر مفسرین کے کارناموں پر اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا ہے لیکن قدیم کی تجدید کے لیے ان میں کاوش و جدوجہد کا سلسلہ برابر جاری رکھنا چاہیے، اس لیے میں نے لوگوں کی فرمائش پر ایک متوسط درجہ کی کتاب مرتب کی ہے جو اطناب ممل اور اختصار مخل سے خالی ہے اور مجھے امید ہے کہ اس فن سے اشتغال رکھنے والوں کے لیے یہ مفید ثابت ہوگی۔'' (مقدمہ معالم التنزیل)

اس میں اسباب نزول کی تعیین، ناسخ و منسوخ کی تصریح، فقہا کے احکام شرعی کے استنباطات کا ذکر اور اعراب و قراءت کے اختلاف اور نحو وصرفی اشکالات کو حل کرنے پر خاص توجہ کی گئی ہے، ان مباحث کی توضیح کے لیے احادیث اور صحابہ و تابعین کے آثار اور مابعد کے ائمہ تفسیر کے اقوال سے مدد لی گئی ہے۔

خازن کا بیان ہے کہ علم تفسیر میں بغوی کی معالم التنزیل بڑی اہم اور بلند پایہ کتاب ہے، یہ صحیح اقوال کا مجموعہ، شکوک و تصحیف سے پاک، احادیث و آثار سے مزین اور عجیب واقعات پر مشتمل ہے۔ (مقدمہ تفسیر خازن ج ۱ ص ۳)

مقدمہ میں مشہور مفسر صحابہ و تابعین سے مصنف نے اپنے اسناد اور فضائل قرآن کی حدیثیں جمع کی ہیں، اس کی اہمیت کی بنا پر بعض علمانے اس کے خلاصے اور مختصرات لکھے ہیں۔

۱ مشہور مفسر علاؤ الدین علی بن محمد بن ابراہیم بغدادی کی تفسیر لباب التنزیل جو تفسیر خازن کے نام سے معروف ہے، دراصل معالم ہی کا ملخص ہے، وہ خود لکھتے ہیں کہ ''چونکہ تفسیر بغوی نہایت عمدہ خصوصیات پر مشتمل تھی، اس لیے میں نے اس کا انتخاب کیا ہے اور دوسری تفسیروں کی مدد سے بعض اضافے کیے ہیں، نیز طلبۂ فن کے فائدہ کے لیے غریب حدیثوں کی

Marfat.com

شرح کردی اور اس کی سندوں اور بعض زوائد کو حذف کر دیا۔ (مقدمہ تفسیر خازن ج ۱ ص ۷۳)

۲ دوسرا مختصر شیخ تاج الدین ابونصر عبدالوہاب بن محمد حسینی (م ۸۷۵ھ) کا ہے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۲۵۸)

معالم التنزیل ہندوستان اور مصر سے شائع ہو چکی ہے، مصر سے تفسیر خازن کے حاشیے پر ۱۳۳۱ و ۱۳۳۲ھ میں سات جلدوں میں چھپی ہے۔

۳ مصابیح السنۃ: یہ حدیث کی اہم اور مشہور کتاب ہے جو بڑی معتبر اور مستند خیال کی جاتی ہے، اس کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خطیب تبریزی کی مشہور و متداول کتاب مشکوٰۃ المصابیح جو عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہے، اس کا تکملہ ہے، صاحب مشکوٰۃ کے درج ذیل بیان سے اس کی نوعیت اور اہمیت وغیرہ ثابت ہوتی ہے۔

محی السنۃ قاطع البدعت امام ابومحمد حسین بن مسعود فراء بغوی کی (اللہ ان کے درجات بلند کرے) کتاب المصابیح نہایت جامع کتاب ہے لیکن اس میں اختصار کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے اور سندیں حذف کر دی گئی ہیں، اس لیے بعض ناقدین فن نے اس میں کلام کیا ہے، حالانکہ فی نفسہ اس کے نقل اسناد میں کوئی کلام نہیں ہے، مصنف علمائے ثقات میں ہیں تاہم اس حیثیت سے اس میں یک گونہ کمی تھی کیونکہ نہ تو صحابہ کا اس میں ذکر ہے اور نہ حدیثوں کا جس سے اصل مخرج معلوم ہوتا ہے، کتب و ابواب کے سرد و ترتیب میں میں نے بغوی کا ٹھیک تتبع کیا ہے، البتہ ہر باب کو دو کے بجائے تین فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔
(مقدمہ مشکوٰۃ المصابیح)

نام:

یہ مصابیح السنۃ اور کتاب المصابیح کے نام سے مشہور ہے لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ نام خود مصنف کا رکھا ہوا نہیں ہے، بلکہ ان کے دیباچہ کی اس عبارت سے ماخوذ ہے۔ (ایضاً)

ان احادیث ھذا الکتاب مصباح۔

اس کتاب کی حدیثیں چراغ ہیں۔

تقسیم و ترتیب:

یہ کتاب ابواب و فصول میں منقسم ہے، ہر باب کی حدیثیں دو فصلوں میں صحاح و حسان کے عنوان کے تحت شامل کی گئی ہیں، صحاح کے اندر بخاری و مسلم اور حسان کے اندر ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی وغیرہ کی حدیثیں درج ہیں، شاہ عبد العزیز صاحب لکھتے ہیں کہ "یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ کتاب نیت والی حدیث سے شروع ہوتی ہے اور نیت ہی ہر کام کا سرا ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ آخرت کے لفظ پر ہوا ہے، جو کتاب کے حسن خاتمہ کی خبر دیتا ہے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۴۲)

تعداد احادیث:

مصابیح میں لگ بھگ ساڑھے چار ہزار حدیثیں ہیں، ان میں نصف سے کچھ کم صحاح (صحیحین کی) اور نصف سے کچھ زیادہ حسان (سنن کی) ہیں۔ (بستان المحدثین ص ۱۳۲)

Marfat.com

خصوصیات:

مصابیح کی بعض خصوصیتیں یہ ہیں:

1. ائمہ صحاح اور اکابر محدثین کی روایات کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے اس کی حدیثیں نہایت معتبر و مستند ہیں گو اصحاب صحاح کے یہاں بھی بعض ضعیف و غریب اور منکر حدیثیں پائی جاتی ہیں، اس لیے یہ بھی ان سے یکسر خالی نہیں ہے، تاہم فی الجملہ یہ صحیح اور مستند حدیثوں کا مجموعہ ہے اور بغوی نے غریب و ضعیف روایتوں کی نشاندہی کر دی ہے، اس حیثیت سے کتب حدیث میں اس کا پایہ نہایت بلند ہو گیا ہے، صاحب روضات لکھتے ہیں، اکثر علما نے اس کی حدیثوں کو نقل کیا ہے اور یہ صحیح و عمدہ روایات پر مشتمل ہے کیونکہ ان کو ثقہ و عادل راویوں نے عادل و ضابط راویوں سے نقل کیا ہے۔

(کشف الظنون ج ۲ ص ۴۴۲)

2. مختلف کتب حدیث کی روایات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے یہ بڑی جامع کتاب ہے اس لیے اس کا مطالعہ ایک حد تک حدیث کی طویل اور ضخیم کتابوں سے مستغنی کر دیتا ہے۔
3. مختصر اور سندوں کے نقل نہ کرنے کی وجہ سے اس سے استفادہ بہت آسان ہے۔
4. یہ ایمانیات، اعتقادیات اور اعمال و احکام ہر قسم کی روایتوں کا مجموعہ ہے، اس لیے ہر طرح کا ذوق رکھنے والے اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔
5. اس کی ترتیب عمدہ ہے، صاحب الانوار نے حمیدی، ابن اثیر، صغانی، قضاعی، نووی اور مدینی وغیرہ متعدد نامور مصنفین کی کتابوں کے مقابلہ میں اس کی ترتیب کو عمدہ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ جو حدیث جہاں رکھی گئی ہے اس سے زیادہ موزوں جگہ اس کی اور نہیں کوئی ہو سکتی تھی۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۴۴)
6. مصنف نے چونکہ احادیث کو صحاح و حسان میں تقسیم کیا ہے اور ضعیف و غریب کی نشاندہی کی ہے اس لیے عموماً اس سے ہر روایت کی صحت و قوت اور ضعف وغیرہ کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔

بعض اعتراضات:

صاحب مشکوۃ کا جو بیان اوپر گزرا ہے، اس میں مصابیح میں مکمل سندیں حذف کرنے کا ذکر ہے، اس میں شبہ نہیں کہ روایات میں اسناد کو بڑی اہمیت حاصل ہے، مصنف مصابیح کو بھی اس کا پورا اندازہ تھا تاہم انہوں نے طوالت کے خوف اور اختصار کی بنا پر سندیں حذف کی ہیں، دوسرے اس میں ائمہ فن اور جہابذۂ محدثین کی حدیثیں نقل کی گئی ہیں، جن کی احتیاط میں کوئی شبہ نہیں اس لیے ان کے نقل پر اعتماد کر کے سندیں چھوڑ دی گئی ہیں۔

نووی نے بغوی کی صحاح و حسان پر تقسیم کے متعلق لکھا ہے:

واما تقسیم البغوی الی حسان و صحاح مریدا بالصحاح مافی الصحیحین و بالحسان مافی السنن فلیس بصواب لان فی السنن الصحیح والحسن والضعیف والمنکر۔ (تقریب مع شرح تدریب الراوی ص ۵۴)

بغوی نے صحاح و حسان کی تقسیم کر کے جو صحاح سے صحیحین کی اور حسان سے سنن کی حدیثیں مراد لی ہیں وہ درست نہیں ہے کیونکہ سنن

Marfat.com

میں تو صحیح، حسن، ضعیف اور منکر ہر طرح کی حدیثیں ہیں۔
نووی کے اعتراضات کا منشا یہ ہے کہ جو کتب سنن صرف حسن روایات ہی پر مشتمل نہیں ہیں بلکہ ان میں دوسری قسم کی حدیثیں بھی ہیں تو ان کی تمام مرویات کو حسان سے موسوم کرنا صحیح نہیں ہے۔
اس اعتراض کے جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ بغوی کی خاص اصطلاح ہے، اس لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں، چنانچہ تاج تبریزی کا بیان ہے کہ ''بغوی پر ابن صلاح اور نووی کے اس اعتراض پر مجھے سخت تعجب ہے کیونکہ اصطلاح کے بارے میں ایسا کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔
عراقی کے مذکورہ جواب کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ ''بغوی کی مدافعت میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہر ہر حدیث کے آخر میں اس کے صحیح یا حسن اور غریب ہونے کو واضح کر دیتے ہیں تو یہ واقعہ کے خلاف ہے کیونکہ انہوں نے سنن سے جن حدیثوں کی تخریج کی ہے ان میں صحیح و حسن کے درمیان امتیاز کرنے کے بجائے سکوت اختیار کیا ہے، البتہ انہوں نے زیادہ تر غریب و ضعیف کی توضیح کر دی ہے، اس لیے سنن کے مرویات میں صحیح کو حسن سے خلط ملط کر دینے کا اعتراض اپنی جگہ باقی رہتا ہے، شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ ''ابن صلاح کا منشا یہ ہے کہ بغوی نے خاص اپنے لیے سنن کی حدیثوں کو حسان کہنے کی ایک اصطلاح وضع کی ہے تا کہ ہر حدیث کے خاتمہ پر ان کو یہ واضح نہ کرنا پڑے کہ اس کی اصحابِ سنن نے تخریج کی ہے لیکن یہ ایک نئی اصطلاح ہے جو عرفی اصطلاح پر جاری نہیں ہو سکتی ہے۔ (تقریب مع شرح تدریب الراوی ص ۵۴)
مصابیح کی اہمیت اور خصوصیات کی وجہ سے اسکی متعدد شرحیں اور کئی مختصرات لکھے گئے ہیں، ذیل میں ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

1. قاضی ناصر الدین عبداللہ بن عمر بیضاوی (م ۶۸۵ھ) کی شرح کا نام تحفۃ الابرار بتایا جاتا ہے۔
2. شہاب الدین فضل اللہ بن حسین تورپشتی حنفی کی شرح جو المیسر کے نام سے موسوم ہے۔
3. شمس الدین محمد بن مظفر خلخالی (م ۷۴۵ھ) کی شرح التنویر ہے۔
4. علاؤ الدین علی بن محمد الشہیر بمصنفک (المتوفی ۸۷۵ھ) کی شرح۔
5. محمد بن محمد واسطی بغدادی، مدرس مستنصریہ معروف با بن عاقولی (م ۷۹۷ھ) کی شرح۔
6. شمس الدین محمد جزری (م ۸۳۳ھ) نے تین جلدوں میں تصحیح المصابیح کے نام سے شرح لکھی۔
7. ظہیر الدین محمود بن عبد الصمد فاروقی کی شرح۔
8. قرۃ بن یعقوب بن ادریس حنفی رومی قرمانی (م ۸۳۳ھ) کی شرح۔
9. قطب الدین محمد ازنیقی (م ۸۴۴ھ) کی شرح۔
10. علی بن عبداللہ احمد المعروف بزین العرب نے تین دفعہ میں تین شرحیں لکھیں، ان میں سے جو درمیان میں لکھی گئی وہ زیادہ مشہور و متداول ہے۔
11. مظہر الدین حسین بن محمود بن حسن زیدانی کی شرح کا نام المفاتیح فی شرح المصابیح ہے، اس کے شروع میں ایک مقدمہ ہے،

Marfat.com

اس میں حدیث کے مصطلحات وانواع علوم پر بحث کی گئی ہے۔

۱۲ مصابیح کی شرحوں میں ازہار بھی ہے لیکن اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں۔

۱۳ شیخ عبدالمؤمن بن ابی بکر بن محمد زعفرانی کی شرح۔

۱۴ خلیل بن مقبل حلبی کی بسیط شرح۔

۱۵ شیخ ابوعبداللہ اسماعیل بن محمد بن اسماعیل المدعو بالاشرف الفقاعی۔

۱۶ شیخ صدرالدین ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم سلمی منادی شافعی کی شرح کا نام المناہج والتفاتیح فی شرح احادیث المصابیح ہے، اس میں مصابیح کی حدیثوں کی تخریج کی ہے اور اگر کوئی حدیث کتب صحاح کی نہیں ہے تو مؤطا امام مالک اور مسند شافعی وغیرہ سے اس کی تخریج کی ہے۔

۱۷ قطب الدین محمد نکیدی ارنیقی نے **تلفیقات المصابیح** کے نام سے شرح لکھی ہے، اس میں امام نووی کی شرح سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے، شروع میں اصول حدیث پر ایک مقدمہ بھی ہے۔

۱۸ منہل الینابیع کے شارح کا نام معلوم نہیں۔

۱۹ غیاث الدین محمد بن محمود واسطی (م ۷۱۸ھ) کی شرح۔

۲۰ ابوذر احمد بن ابراہیم حلبی کی شرح جو نا تمام ہے۔

۲۱ محمد بن عبداللطیف المعروف بابن الملک کی شرح جو لطیف اور ممزوج ہے،[1] ایک جلد میں ہے، اس کے خاتمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۰۰ھ میں لکھی گئی۔

۲۲ عثمان بن محمد ہروی کی مختصر شرح: یہ بیضاوی کی شرح کے بعد لکھی گئی۔ شرحوں کے علاوہ تکملے اور مختصرات بھی لکھے گئے۔

۲۳ شیخ مجدالدین ابوطاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی (م ۸۱۷ھ) نے التخاریج فی فوائد متعلقۃ باحادیث المصابیح لکھی۔

۲۴ شیخ ولی الدین ابوعبداللہ خطیب ۷۳۷ھ کی مشہور و متداول تصنیف مشکوٰۃ المصابیح، مصابیح کا تتمہ ہے۔

۲۵ مفتاح الفتوح: صاحب کشف الظنون نے مصنف کا نام نہیں لکھا ہے، مگر یہ بتایا ہے کہ اس میں شرح السنۃ اور نہایہ وغیرہ سے بعض چیزوں کا اضافہ کیا ہے اور ۷۰۷ھ میں لکھی گئی۔

۲۶ شیخ ابوالنجیب عبدالقاہر بن عبداللہ سہروردی متوفی ۵۶۳ھ نے مختصر لکھا ہے۔

۲۷ شیخ تقی الدین علی بن عبدالکافی سبکی (م ۷۵۶ھ) نے ضیاء المصابیح کے نام سے خلاصہ لکھا۔

(ان شرحوں کا ذکر کشف الظنون ج ۲ ص ۴۴۴ و ۴۴۵ اور اتحاف النبلاء المتقین ص ۱۵۱ اور ۱۵۲ میں ہے)

[1] (ممزوج وہ شرح کہلاتی ہے جس میں متن اور شرح کی عبارتیں ملی جلی ہوتی ہیں اور امتیاز کے لیے "م" اور "ش" کے حروف لکھ دیے جاتے ہیں یا متن کے اوپر نشان کھینچ دیا جاتا ہے)۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۳۲)

Marfat.com

۱۸ شرح السنۃ: یہ بھی امام بغوی کی مشہور اور اہم تصنیفات میں ہے۔ اس میں مشکلات وغرائب حدیث اور فقہی مسائل وغیرہ کا مفصل ذکر ہے، مصنف خود مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"یہ اخبار وروایات کے گوناگوں علوم وفوائد پر مشتمل ہے، اس میں حدیثوں کی مشکلات کو حل اور غریب کی تفسیر کی گئی ہے، نیز ان سے مستنبط ہونے والے فقہی احکام اور ان کے سلسلہ میں علما وفقہا کے اختلافات بیان کئے گئے ہیں، یہ شرح احکام کے سلسلہ میں مرجع اور ایسی اہم باتوں اور ضروری نکتوں پر مشتمل ہے، جن سے واقفیت نہایت ضروری ہے، میں نے اس میں وہی باتیں لکھی ہیں جن پر ماہرین فن ائمہ سلف کا اعتماد واعتبار ہے اور ان چیزوں کو چھوڑ دیا ہے جن کو ان بزرگوں نے چھوڑ دیا ہے۔"
(کشف الظنون ج ۲ ص ۵۶)

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں:

"امام نووی، محی السنۃ بغوی اور ابوسلیمان خطابی شرح حدیث کے سلسلہ میں تمام شوافع میں زیادہ قابل اعتماد ہیں، ان لوگوں کے قول محکم اور بحثیں پرمغز ہوتی ہیں، خصوصاً شرح السنۃ بغوی فقہ حدیث اور توجیہ مشکلات میں نہایت کافی وشافی ہے، گویا کہ مصابیح اور مشکوٰۃ کی شرح اسی سے ہوجاتی ہے۔" (عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۱۷)

مصابیح کی طرح اس کے ساتھ بھی اعتنا کیا گیا ہے، صاحب کشف الظنون نے اس کے چند مختصرات کا ذکر کیا ہے:

۱۔ صفی الدین محمود بن ابوبکر ارموی قرافی کا مختصر، ۲۔ ابوالقاسم ہبۃ اللہ طبری اسکافی کا مختصر، ۳۔ ابوالقاسم عبداللہ بن حسن بن عبدالملک واسطی، شافعی نے لباب شرح السنۃ فی معرفۃ احکام الکتاب والسنۃ کے نام سے مختصر لکھا اور سندوں کو حذف کر دیا ہے۔

۴۔ شیخ علاؤالدولہ احمد بن محمد بن احمد البنا مالکی نے الفلاح کے نام سے مختصر لکھا۔

۵۔ رضی الدین ابراہیم بن محمد طبری (م ۷۲۲ھ) کا مختصر جوالجنۃ فی مختصر شرح السنۃ کے نام سے موسوم ہے۔
(کشف الظنون ج ۳ ص ۵۵و۵۶)

۶۔ بغوی نے خود اس شرح کی تجرید کی ہے، دونوں کے قلمی نسخے رضا لائبریری رام پور میں ہیں۔
(فہرست انگریزی رضا لائبریری رام پور، مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی ج ۱ ص ۲۶۶ و ۲۶۷)

۴۔ التہذیب فی الفقہ: اس میں امام شافعی کے مذہب کے فقہی فروع وجزئیات کی تہذیب کی ہے۔ صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ اس میں دلائل نہیں بیان کیے گئے ہیں، غالباً اس میں اپنے شیخ قاضی حسین کے تعلیقہ میں کچھ کمی بیشی کر کے اس کی تلخیص کی ہے۔

حسین بن محمد مروزی ہروی شافعی نے لباب التہذیب کے نام سے اس کی تلخیص اور شہاب احمد بن محمد مروزی ہروی شافعی ہے۔ لباب التہذیب کے نام سے اس کی تلخیص اور شہاب احمد بن محمد بن منیر اسکندری (م ۶۸۳ھ) نے مختصر کیا ہے، (کشف الظنون ج ۱ ص ۳۵۲) یہ دس جلدوں میں ہے، آٹھ جلدیں (تیسری اور چوتھی کو چھوڑ کر) کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہیں۔
(فہرست کتب خانہ ج ۳ ص ۲۱۲)

۵۔ الجمع بین الصحیحین

Marfat.com

۶۔ تعلیقات فتاویٰ قاضی حسین: اس میں اپنے شیخ اور مشہور فقیہ کے فتاویٰ پر تعلیقات لکھی ہیں۔

۷۔ فتاویٰ بغوی: یہ خود ان کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔

۸۔ ارشاد الانوار فی شمائل النبی المختار، ۹۔ ترجمۃ الاحکام فی الفروع، ۱۰۔ الکفایہ فی القراءۃ، ۱۱۔ الکفایۃ فی الفقہ، ۱۲۔ معجم الشیوخ، (فوائد جامعہ مع عجالہ نافعہ ص ۱۹۵) ۱۳۔ تجرید، مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اس کو شرح السنہ کی تجرید بتایا ہے۔

(فہرست انگریزی رضا لائبریری رام پور ج ۱ ص ۶۶۷)

۱۴۔ شرح ترمذی: مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنے مضمون ''حجاز کے کتب خانے'' میں اس کا ذکر کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ اس کے جزو ثانی کا نسخہ مدینہ کے کتب خانہ محمودیہ میں ہے۔ (مقالات سلیمان ج ۲ ص ۳۷۰)

Marfat.com

ابوالحسن رزین بن معاویہ عبدری سرقسطی رحمۃ اللہ علیہ

(م ۵۳۵ھ)

نام ونسب:

رزین نام، ابوالحسن کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: رزین بن معاویہ بن عمار۔ (الدیباج المذہب ص ۱۱۸)

خاندان ووطن:

قبیلۂ قریش کے مشہور بطن عبدالدار بن قصی سے ان کا خاندانی اور اندلس کے شہر سرقسطہ سے وطنی تعلق ہے، اس لیے عبدری اور سرقسطی کی نسبتوں سے مشہور ہیں۔ (انساب ورق ۳۸۱ واعلام ج ۱ ص ۳۲۱)

اساتذہ:

رزین نے ابومکتوم عیسیٰ بن ابی ذر ہروی سے صحیح بخاری اور حسین طری سے صحیح مسلم کی روایت کی ہے۔

(شذرات الذہب ج ۴ ص ۱۰۶)

سفر ومجاورت مکہ:

انہوں نے بلادِ مشرق کا سفر کیا اور عرصۂ دراز تک مکہ معظمہ میں قیام کیا، حرمین میں قیام کی وجہ سے امام الحرمین کہلاتے تھے، بعض تذکرہ نگاروں نے تصریح کی ہے کہ ان کی وفات بھی مکہ معظمہ میں ہوئی تھی۔ (الدیباج ص ۱۱۸ وشذرات الذہب ج ۴ ص ۱۰۶)

حدیث میں درجہ:

گوسلفی نے ان کو نازل الاسناد کہا ہے، (ایضا) تاہم حدیث میں ان کا کارنامہ اور درجہ مسلّم ہے۔

اعتراف کمالات:

سلفی نے ان کو شیخ عالم اور ابن بشکوال نے عالم، فاضل اور عالم بالحدیث کہا ہے۔ (الدیباج ص ۱۱۸)

فقہی مسلک:

بلادِ مغرب کے لوگوں کی طرح امام رزین بھی امام دارالہجرت کے مسلک سے وابستہ تھے، صاحب دیباج کا بیان ہے کہ

Marfat.com

وہ مالکیہ کے امام تھے۔ (الدیباج المذہب ص ۱۱۸ اور روضات الجنات ص ۲۸۶)

صلاح وتقویٰ:

مؤرخین اور علمائے سیر نے ان کو صالح آدمی کہا ہے۔ (ایضاً)

وفات:

اکثر لوگوں نے ان کا سن وفات ۵۳۵ھ لکھا ہے لیکن بعض نے ۵۲۵ھ بتایا ہے، شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ امام رزین نے ۵۲۰ھ کے بعد انتقال کیا۔ (ایضاً ومقدمہ شرح مشکوٰۃ ص ۱۳، واتحاف النبلاء ص ۱۵۷)

تصنیفات:

امام رزین کی دو کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔

۱۔ تجرید الصحاح الستہ یا کتاب الجمع بین الصحاح الستہ: یہ حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں میں خیال کی جاتی ہے، اس کی اہمیت اس بنا پر زیادہ ہے کہ اس سے پہلے جو کتابیں لکھی گئیں وہ صرف صحیحین کی روایات کی جامع ہیں لیکن یہ حدیث کی ان چھ اہم کتابوں کی جامع ہے جو اپنے وثوق واعتبار کی وجہ سے اُمت میں متداول اور علما وفقہا کا ماخذ اور احکام وشرائع کا مرجع ہیں اور ان کے مصنفین بھی حفاظ ومحدثین کی پوری جماعت میں ممتاز ہیں، اس حیثیت سے اس کی نوعیت یک گونہ مختلف ہے، اس کتاب کے بعد اس نوعیت کی اور کتابیں بھی لکھی گئیں، ان میں امام ابن اثیر جزری کی کتاب زیادہ مشہور ہے لیکن اس میں دراصل اس کی ازسرنو ترتیب وتہذیب کی گئی ہے، فالفضل للمتقدم۔

چونکہ چھٹی صدی اور اس کے بعد بھی صحاح ستہ میں سنن ابن ماجہ کے بجائے موطا امام مالک کو محسوب کیا جاتا تھا، اس لیے امام رزین نے صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کے ساتھ مؤطا ہی کی روایتوں کو جمع کیا ہے۔

(کشف الظنون ج ۱ ص ۴۲۵ والرسالۃ المستطرفہ ص ۲۸۶)

۲۔ اخبار مکہ: اوپر گزر چکا ہے کہ امام رزین نے مدت دراز تک مکہ میں قیام کیا، اس لیے غالباً ان کو اس کتاب کو مرتب کرنے کا خیال ہوا ہوگا اور اس میں یہاں کے واقعات واخبار جمع کیے ہوں گے۔

Marfat.com

ابو بکر محمد بن عبد اللہ بن العربی رحمۃ اللہ علیہ

(م ۵۴۳ھ)

نام ونسب:

ابو بکر کنیت، ابن العربی لقب وعرفیت اور نام ونسب یہ ہے: محمد بن عبد اللہ بن محمد بن عبد اللہ بن احمد۔
(ابن خلکان ج ۲ ص ۲۹۲ بستان المحدثین ص ۱۲۷)

ولادت:

مشہور روایت کے مطابق جمعرات ۲۲/ شعبان ۴۶۸ھ کو پیدا ہوئے، ابن خلکان نے ۴۶۹ھ کی بھی روایت کی ہے، شاہ عبد العزیز صاحب نے ۴۴۸ھ سن پیدائش لکھا ہے لیکن یہ کتابت وطباعت کی غلطی معلوم ہوتی ہے اور پہلی روایت صحیح ہے کیونکہ ابن بشکوال نے خود ان سے اس کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ میں شعبان ۴۶۸ھ میں پیدا ہوا تھا، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب وہ ۴۸۵ھ میں بلادِ مشرق کی سیاحت کے لیے گئے تو اس وقت مؤرخین کے بیان کے مطابق ان کی عمر سترہ سال تھی۔ (ایضاً والدیباج المذہب ص ۲۸۱)

خاندان:

امام ابو بکر بن العربی کا خاندانی تعلق یمن کے قبیلہ معافر سے ہے، اسی لیے وہ معافری کہلاتے ہیں، ان کے والد ابو محمد عبد اللہ کو علمی ودنیاوی وجاہت حاصل تھی اور وہ اشبیلیہ کے ممتاز علما اور رؤسا میں تھے، فقہ وادب کے ماہر اور شعر وسخن کا عمدہ ذوق رکھتے تھے، دولت عبادیہ میں ان کو بڑا رسوخ حاصل تھا اور وہ بنو عباد کی جانب سے بعض اعلیٰ مناصب پر فائز تھے، جب آل عباد کا زوال شروع ہوا تو یہ اپنے لڑکے ابو بکر کے ساتھ بلادِ مشرق کی سیاحت کے لیے تشریف لے گئے، واپسی میں مصر میں ۴۹۳ھ میں انتقال ہو گیا، ان کی پیدائش ۴۳۵ھ میں ہوئی تھی۔
(ابن خلکان ج ۲ ص ۲۹۲، بستان المحدثین ص ۱۲۷، الدیباج المذہب ص ۲۸۱)

وطن:

بلادِ مغرب میں اقلیم اندلس کے مشہور اور بڑے شہر اشبیلیہ کو ان کے مولد ومنشا ہونے کا فخر حاصل ہے، یہ شہر آل عباد کا پایہ تخت اور ایک زمانہ میں قرطبہ کے بجائے یہی اندلس کا دار السلطنت تھا، اس کی نسبت سے وہ اشبیلی اور اندلس اور بلادِ مغرب سے

Marfat.com

تعلق کی وجہ سے اندلسی اور مغربی کہلاتے ہیں۔ (الدیباج المذہب ص ۲۸۱ و معجم البلدان ج ۱ ص ۳۵۴ و اللباب ج ۱ ص ۴۹)

اساتذہ:

اپنے والد ابو محمد اور ماموں ابو القاسم حسن ہوزنی کے علاوہ انہوں نے بے شمار اساتذہ فن سے تحصیل علم اور روایت حدیث کی ہے، بعض شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابو الحسن خلعی، ابو الحسن بن مشرف، ابو الحسن محمد بن عبد اللہ بن داؤد الفارسی، ابو نصر مقدسی، ابو الفتح نصر بن ابراہیم قرشی، ابو سعید زنجانی، ابو سعید رہاوی، ابو القاسم بن ابو الحسن القدسی، ابو محمد ہبۃ اللہ احمد اکفانی، فضل بن فرات دمشقی، ابو الحسن مبارک بن عبد الجبار صیرفی المعروف بابن الطیوری، ابو الحسن علی بن ایوب بزاز، ابو بکر بن طرفان ابو الفوارس طراد بن محمد زینبی، جعفر بن احمد سراج، ابو الحسن بن عبد القادر، ابو المعالی ثابت بن بندار مکی بن عبد السلام رملی، ابو عبد اللہ حسین طبری، ابو عبد اللہ بن طلحہ نعالی، ابو عبد اللہ سر قسطی، ابو عبد اللہ کلاعی، ابو الحسن بن حداد خولانی، مہدی وراق۔

امام ابو حامد غزالی، ابو بکر شاشی، ابو بکر طرطوسی، اور ابو زکریا تبریزی وغیرہ کی صحبت میں زیادہ رہے اور ان سے فقہ و اصول اور ادب وغیرہ کی تحصیل کی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۹۰ و الدیباج المذہب ص ۲۸۱ و ۲۸۲ و نفح الطیب ج ۱ ص ۳۳۶)

تلامذہ:

ان کے تلامذہ کی تعداد بھی زیادہ ہے، چند کے نام یہ ہیں:

"محمد بن یوسف بن سعادہ، حافظ ابو القاسم سہیلی، شحنہ بن یحییٰ رعینی، عبد الخالق بن احمد یوسفی ابن صابر دمشقی، احمد بن خلف اشبیلی، حسن بن علی قرطبی، ابو بکر محمد بن عبد اللہ بن الجد فہری، محمد بن ابراہیم بن فخار، محمد بن علی کتانی محمد بن جابر ثعلبی، عبد المنعم بن یحییٰ بن خلوف غرناطی، علی بن احمد شریشی، ابو الحسن علی بن احمد سقوری اور احمد بن عمر خزرجیؒ وغیرہ۔

قاضی ابو الفضل عیاض جیسے صاحب کمال اور ابن بشکوال کو بھی ان سے تلمذ کی نسبت حاصل ہے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۹۰ و الدیباج المذہب ص ۲۸۱ و ۲۸۲ و نفح الطیب ج ۱ ص ۳۳۶)

رحلت و سفر:

سترہ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد کے ہمراہ بلادِ مشرق کی سیاحتؒ کے لیے روانہ ہوئے اور شام، بغداد و حجاز تشریف لے گئے، دوبارہ پھر بغداد ہوتے ہوئے مصر و اسکندریہ پہنچے اور ان مقامات کے ارباب کمال اور ائمہ فن سے مستفید ہوئے، بلادِ مشرق کی روانگی سے قبل وہ اپنے وطن میں فن قراءت و ادب وغیرہ میں کمال حاصل کر چکے تھے۔ (الدیباج المذہب ص ۲۸۱)

حدیث میں درجہ:

ابن العربی اندلس کے محدثین اور نامور حفاظ میں تھے، ابن بشکوال نے لکھا ہے کہ وہ متبحر حافظ حدیث اور اندلس کے ائمہ اور خاتمۃ المحدثین میں تھے، ان کی بدولت اندلس میں احادیث و اسناد کے علم کو بڑا فروغ ہوا صاحب دیباج لکھتے ہیں کہ انہوں نے حدیثیں قلم بند کیں اور وہ بڑے وسیع الروایت اور کثیر الخبر تھے، ابن ناصر الدین کہتے ہیں کہ "وہ ثقات و اثبات اور مشہور ائمہ میں

Marfat.com

تھے۔ دوسرے مؤرخین واصحاب سیر نے انکے حفظ وضبط اور ذکاوت وذہانت کا اعتراف کیا ہے اور انکو متبحر عالم حدیث بتایا ہے۔
(ایضاً و نفح الطیب ج ۱ ص ۳۳۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۹۰)

فقہ:

حدیث سے پہلے وہ فقہ کی تحصیل کر چکے تھے اور اس میں ان کو بڑا درک تھا، اصول فقہ اور فن خلاف کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور ان فنون کا درس بھی دیتے تھے، ذہبی کا بیان ہے کہ وہ ان لوگوں میں تھے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ مرتبہ اجتہاد پر فائز تھے، تفقہ واجتہاد میں کمال کی بنا پر محکمہ قضا انکے سپرد کیا گیا تھا۔ (ایضاً نفح الطیب ج ۱ ص ۳۳۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۹۰)

تفسیر:

علم تفسیر اور قرآنیات پر بھی اچھی نظر تھی اور اس میں ان سے بعض اہم کتابیں یادگار ہیں۔ (ایضاً)

ادب وبلاغت نحو وکلام اور علم تاریخ وغیرہ میں مہارت:

خالص اسلامی علوم کے علاوہ اور نوعیت کے بھی متعدد علوم میں ان کو مہارت اور دسترس تھی، ادب وبلاغت میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور نحو وکلام اور فن تاریخ سے شغف تھا اور ان علوم میں ان سے بعض مفید کتابیں یادگار ہیں۔

شعر وسخن:

موزوں طبع اور شعر وسخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے، فی البدیہہ اشعار کہہ لیتے تھے، ایک دفعہ ایک خوش رو امیر زادہ کے ساتھ شکار کو گئے، راستے میں اس نے تفریحاً ابن العربی کی جانب نیزہ کر کے ہلانا شروع کیا تو انہوں نے فی الفور یہ قطعہ کہا:

یهـز علـی الـرمح ظـبی مهفهـف لعـوب بالبـاب البریـة عابـث

فلو کـان رمحـا واحـدا لاتقیتـه ولکنـه رمـح وثـان فثالـث

مجھ پر ایک پھد کنے والے چھریرے بدن کا ہرن نیزہ کو حرکت دے رہا ہے، اگر ایک ہی نیزہ ہوتا تو میں اس سے بچتا لیکن یہاں تو دوسرا اور تیسرا نیزہ بھی تھا۔

شارحین کا اختلاف ہے کہ ثانی اور ثالث سے کیا مراد ہے؟ بعض نے اس سے قد وقامت اور نگاہ مراد لی ہے اور بعض لوگوں نے کچھ اور مراد لیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ واحد سے نیزہ کی ایک بار کی تحریک اور ثانی وثالث سے اس کی تکرار مراد ہے۔ (بستان المحدثین ص ۱۳۷)

نفح الطیب، مطمح الانس اور مسرح التانس اور بستان المحدثین وغیرہ میں ان کے اور بھی متعدد اشعار نقل کئے گئے ہیں جن سے ان کی قوت طبع اور شعر وسخن سے مناسبت کا اندازہ ہوتا ہے۔

جامعیت اور اعتراف کمال:

ان متنوع علوم اور گوناگوں فنون میں ان کے درک ومہارت سے ان کی جامعیت کا پتہ چلتا ہے، اسی بنا پر اہل سیر نے ان کو جامع کمالات، متبحر عالم، علوم ومعارف میں متقدم، فنون اور انواع علوم میں بحث وکلام کرنے والا اور صحیح وثواب کے امتیاز میں

Marfat.com

ثاقب الذہن قرار دیا ہے، صاحب نفح الطیب فرماتے ہیں کہ وہ اصول وفروع میں امام تھے، ان کے تمام سوانح نگاران کے فضل وکمال پر متفق ہیں، مؤرخین نے ان کو علم وفن میں یکتا، علامہ، حافظ متبحر، احدالاعلام، مسند وعالم اندلس لکھا تھا، ابن سعید نے ان کو امام، قاضی اور فخر مغرب کہا ہے، صاحب نفح الطیب لکھتے ہیں کہ وہ فضل وکمال سے متصف تھے، ابن بشکوال نے ان کی بڑی توصیف کی ہے، ابو یحییٰ یسع بن حزم نے ان کا تذکرہ غیر معمولی تعظیم وتوقیر کے ساتھ کیا ہے، حجازی کا بیان ہے کہ انہوں نے شام وعراق وغیرہ کو اپنے فوائد اور امتیازی کمالات سے معمور کر دیا تھا، مؤرخین کا متفقہ بیان ہے کہ علمائے مغرب میں مشرق کی سیاحت کرنے والوں میں ان سے زیادہ علم سے مالا مال ہو کر آنے والا کوئی اور شخص نہ تھا۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۹۰ و ۹۱، الدیباج ص ۲۸۱ و ۲۸۲ و نفح الطیب ج ۱ ص ۲۳۶)

درس وتدریس اور شہرت ومقبولیت:

مشرق کی سیاحت سے اپنے وطن اشبیلیہ میں واپس آئے تو ان کی ذات طلبۂ علم وفن کا مرکز بن گئی تھی، لوگ دور دراز سے ان کے پاس سماع کے لیے آتے اور استفادہ کرتے، عہدۂ قضا سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ محض تصنیف وتالیف اور درس وتدریس کا کام انجام دیتے تھے، درس وتدریس اور گوناگوں کمالات کی وجہ سے وہ نہایت مشہور ومقبول ہو گئے تھے اور مسلمانوں کے امام کہلاتے تھے۔ (الدیباج المذہب ص ۲۸۲)

فقہی مذہب:

بلادِ مغرب کے علماء وفضلا کی طرح وہ بھی امام دار الہجرت کے فقہی مذہب ومسلک سے وابستہ تھے۔

اخلاق وعادات:

سیرت وشمائل اور اخلاق وعادات میں ممتاز تھے، ضبط وتحمل، نرمی ومروت، شرافت نفس، حسن عہد، خلوص ووفا اور دوستوں سے بہتر اور عمدہ سلوک کے لیے مشہور تھے، حسن اخلاق اور عمدہ خصائل وعادات کی وجہ سے وہ لوگوں میں نہایت مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ (ابن خلکان ج ۲ ص ۲۹۳)

ظرافت:

خوش طبع اور ظریف تھے، اس لیے مجلس میں تفنن اور مزاح کی باتیں بھی کرتے تھے۔ (نفح الطیب ج ۱ ص ۲۳۷)

ثروت وامارت:

اللہ تعالیٰ نے ان کو علم وفضل کی طرح دنیوی اعزاز ووجاہت اور مال ودولت سے بھی نوازا تھا، اور وہ نہایت فارغ البال تھے، طبیعت میں سخاوت اور فیاضی تھی اس لیے داد ودہش بھی کرتے رہتے تھے اور خیر خیرات کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ اشبیلیہ کی فصیل انہوں نے اپنے خرچ سے بنوائی تھی، دولت وثروت کی فراوانی اور جود وسخاوت کی عادت نے بھی ان کو لوگوں کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ (ایضاً ص ۲۳۰ و تذکرہ ج ۴ ص ۹۱)

Marfat.com

زہد و عبادت:

زہد و تقویٰ اور ورع و تدین کے بھی جامع تھے، ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ عابد و زاہد تھے، (البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۲۲۸) حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے۔

منصب قضا:

تفقہ و اجتہاد میں کمال کی وجہ سے وہ اشبیلیہ کے قاضی مقرر کیے گئے، انہوں نے اس ذمہ داری کو اس قدر خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ وہ عوام و خواص میں نہایت مقبول ہو گئے لیکن چونکہ انکے فیصلے بے لاگ ہوتے تھے اور وہ معاملات قضا میں شدت بھی برتتے تھے، اس لیے غالباً اس منصب سے معزول کر دیئے گئے۔ (تذکرہ ج ۸ ص ۹۱ و الدیباج ص ۲۸۳ و نفح الطیب ج ۱ ص ۳۳۶)

ابتلاء و آزمائش:

غالباً وہ اپنے کمالات کی وجہ سے محسود ہو گئے تھے، اس لیے ان کو شدائد و محن سے بھی دوچار ہونا پڑا اور بعض مورخین کا بیان ہے کہ موحدین نے ایک سال تک ان کو مراکش میں قید و بند میں رکھا تھا، ان کے ابتلاء و آزمائش کی کئی وجہیں بیان کی گئی ہیں۔

۱ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ بعض فقہائے اشبیلیہ ابن مرجی وغیرہ اور ابن عربی کسی مجلس میں یکجا تھے، ایک حدیث کا ذکر آیا تو ابن مرجی نے کہا کہ یہ اس کے محض ایک ہی طریق کو جو مالک عن الزہری سے مروی ہے، جانتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ ہم لوگوں کو بھی مستفید کیجئے، انہوں نے وعدہ کیا مگر وہ وفا نہ کر سکے، اسی لیے ایک شاعر نے کہا ہے:

یا اھل حمص ومن بھا اوصیکم	بالبر والتقوی وصیۃ مشفق
فخذوا عن العربی اسمار الدجی	وخذوا الروایۃ عن امام متقی
ان الفتی حلو الکلام مھذب	ان لم یجد خبرا صحیحا یخلق

اے اہل حمص! میں آپ لوگوں کو ایک مشفق کی طرح نیکی اور تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں، ابن العربی سے رات کے قصے کہانیاں سنو اور صاحب زہد و اتقا امام سے احادیث و روایات نقل کرو، شیریں سخن نوجوان صحیح اور معتبر خبر و روایت نہ پانے کی صورت میں خود ہی روایتیں گھڑ لیتا ہے۔ (تذکرہ حضرت ج ۲ ص ۱۹۲)

۲ صاحب نفح الطیب لکھتے ہیں:

"وہ بڑے مکرم و معظم تھے، منصب قضا پر فائز کیے گئے، اسی زمانہ میں اشبیلیہ کی فصیل کی مرمت و اصلاح کی ضرورت پیش آئی، عید قربان کا زمانہ تھا ابن العربی نے لوگوں سے جبراً قربانی کی کھالیں جمع کرائیں، اس کی وجہ سے عوام میں شورش اور ہیجان برپا ہو گیا اور انہوں نے ان کا گھر لوٹ لیا اور وہ قرطبہ چلے گئے۔"

۳ ایک اور وجہ قاضی عیاض سے یہ منقول ہے کہ کثرت حدیث و اخبار اور غریب حکایات و روایات کی وجہ سے اکثر لوگوں نے ان پر نکتہ چینی کی ہے۔

Marfat.com

مگر یہ وجہیں صحیح نہیں معلوم ہوتیں، پہلی وجہ کی صحت میں علامہ ذہبی نے کلام کیا ہے، دوسری وجہ اس لیے غلط ہے کہ مؤرخین کا عام بیان یہ ہے کہ انہوں نے فصیل کی مرمت خود اپنی رقم سے کرائی تھی، آخری وجہ ممکن ہے صحیح ہو مگر اس میں قید ومحن کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

مؤرخین کے متفقہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو شدائد ومحن کا سامنا کرنا پڑا مگر انہوں نے اس کی کوئی صحیح وجہ نہیں لکھی ہے، قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقدمے اور فیصلوں میں غیر معمولی شدت برتنے کی وجہ سے بعض لوگ ان کے درپے آزار ہوئے ہوں گے، علاوہ ازیں امراء وسلاطین سے ان کے توسل کو بھی پسند نہیں کیا جاتا تھا، چنانچہ ابوعبداللہ بن مجاہد اشبیلی تقریباً تین ماہ تک مسلسل ان کی خدمت میں رہے، اس کے بعد انہوں نے وہاں جانا موقوف کر دیا، لوگوں نے وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ ابن العربی درس دیتے ہیں اور ان کے دروازے پر سلطان کے یہاں جانے کے لیے سواری کھڑی رہتی ہے، (نفح الطیب ج ۱ ص ۳۳۶) حافظ ذہبی نے بھی لکھا ہے کہ سلاطین سے وابستگی کی وجہ سے لوگ ان کے خلاف برافروختہ رہتے تھے اور وہ دوسرے علماء ومحدثین کی طرح ان کے سامنے جرأت وبے باکی سے کام نہیں لیتے تھے، بلکہ نرمی اور مداہنت برتتے تھے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۹۱)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہوں کے تقرب اور معاملات قضا میں شدت اور غریب حکایات وروایات کے نقل نے ان کی مقبولیت کو کم اور بعض لوگوں میں محسود بنا دیا تھا، ان ہی باتوں کی وجہ سے ان کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

وفات:

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ۵۵۳ھ سن وفات لکھا ہے لیکن یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، ۵۴۶ھ، ۵۴۵ اور ۵۴۴ھ کی روایتیں بھی کی گئی ہیں مگر صحیح قول یہ ہے کہ وہ ۵۴۳ھ میں فوت ہوئے، بیان کیا جاتا ہے کہ مراکش سے اپنے وطن واپس آرہے تھے کہ فاس کے قریب ان کا انتقال ہو گیا، ان کی لاش فاس لائی گئی اور باب المحروق کے قریب دفن کئے گئے، بعض لوگوں کا بیان ہے کہ مقبرہ جیلانی میں دفن کئے گئے، ان کے ایک شاگرد ابوالحکم بن حجاج نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔

(ایضاً ص ۹۲، وابن خلکان ج ۲ ص ۲۹۳ والدیباج المذہب ص ۲۸۴)

تصنیفات:

ابن العربی کثیر التصانیف تھے، ان کی کتابیں مفید اور بلند پایہ ہیں جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں ذیل میں ان کی فہرست درج کی جاتی ہے۔

۱۔ انوار الفجر: یہ فن تفسیر میں عمدہ کتاب ہے، ان کا خود بیان ہے کہ میں نے اسے بیس سال میں مرتب کیا تھا، اور یہ اسی ہزار ورقوں پر مشتمل ہے، ابوعیان فارس بن علی بن یوسف کے کتب خانہ میں جو مراکش میں ہے اس کا ایک نسخہ بیس جلدوں میں تھا۔ (بستان المحدثین ص ۱۳۸، الدیباج المذہب ص ۲۸۳ ونفح الطیب ج ۱ ص ۳۳۹)

۲۔ کتاب احکام القرآن: یہ فن تفسیر میں ایک اچھی کتاب ہے، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں ہے، ۱۹۱۳ء میں مطبع سعادۃ سے دو جزوں میں شائع ہوئی ہے۔ (معجم المطبوعات کالم ۱۷۵)

Marfat.com

۳ کتاب الناسخ والمنسوخ۔

۴ قانون التاویل: یہ دونوں بھی فن تفسیر کی کتابیں ہیں اور قرآنیات کے موضوع پر عمدہ خیال کی جاتی ہیں۔ (کشف الظنون)

۵ کتاب المشکلین: اس میں کتاب وسنت کے بعض مشکلات کا ذکر ہے۔ (بستان المحدثین ص ۱۳۸ و نفح الطیب ص ۳۳۹)

۶ کتاب شرح حدیث الافک۔

۷ کتاب شرح حدیث ام زرع۔

۸ کتاب شرح حدیث جابر فی الشفاعۃ: یہ سب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، بعض حدیثوں کی شرح میں مستقل رسالے ہیں۔

۹ کتاب الکلام علی مشکل حدیث السحاب والحجاب۔

۱۰ کتاب السبا۔

۱۱ کتاب المسلسلات بالمسلسلات: یہ دونوں بھی فن حدیث سے متعلق رسائل معلوم ہوتے ہیں۔

۱۲ کتاب النیرین فی شرح الصحیحین: یہ صحیحین کی شرح ہے۔

۱۳ کتاب ترتیب المسالک: یہ مؤطا امام مالک کی شرح ہے۔ (ان سب کتابوں کے لیے بھی مذکورہ بالا حوالہ ملاحظہ ہو)

۱۴ کتاب القبس: یہ بھی مؤطا کی شرح ہے، اس میں مصنف نے مؤطا کے متعلق لکھا ہے کہ یہ شرائع اسلام میں اول وآخر کتاب ہے، ایسی کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی، کیونکہ امام مالکؒ نے اس کو فروغ کے اصول کے لیے تمہید بنایا ہے، اور اس میں انہوں نے فقہ کے ایسے اہم اور بڑے اصولوں پر متنبہ کیا ہے جن کی جانب مسائل وفروع میں رجوع کیا جاتا ہے، شرح ترمذی میں لکھتے ہیں کہ مؤطا ہی اولین اصل اور خلاصہ ہے اور صحیح بخاری اصل ثانی اور ان ہی دونوں کتابوں پر تمام کتب حدیث مسلم وترمذی وغیرہ کی بنیادیں رکھی گئی ہیں، امام خطابی نے اس کا انتخاب اور ابو الحسن فاسی نے ملخص ترتیب دیا تھا جو ملخص المؤطا کے نام سے موسوم ہے۔ (کشف الظنون جلد ۲ ص ۵۷۲، مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۸۴، ۸۵)

۱۵ عارضۃ الاحوذی: یہ جامع ترمذی کی مشہور ومقبول شرح ہے، اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ علامہ سیوطیؒ کے زمانہ تک اس کے علاوہ ترمذی کی کوئی مکمل شرح متداول نہ تھی، وہ فرماتے ہیں کہ:

لا نعلم انه شرحه احد کاملا الا القاضی ابو بکر بن العربی فی کتابه عارضة الاحوذی۔

ہم کو ابو بکر بن العربی کی عارضۃ الاحوذی کے علاوہ ترمذی کی اور کسی کامل شرح کا علم نہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری رقم طراز ہیں:

''یہ ترمذی کی مشہور شرحوں میں ہے، حافظ ابن حجر وغیرہ مشاہیر علمائے اسلام نے اپنی کتابوں میں اس سے استفادہ کیا ہے اور اس کے اقتباسات نقل کیے ہیں۔''

ٹونک کے کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ ہے، اس کا ایک جزو ترمذی اور اس کے بعض شروح کے ساتھ ہند کے مطبع نظامی نے شائع کیا تھا اور مصر سے یہ مکمل شرح چھپ چکی ہے۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۵۷۳ و مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۸۳)

۱۶ شرح غریب الرسالۃ۔

Marfat.com

۱۸ الانصاف فی مسائل الخلاف: یہ بیس جلدوں میں ہے۔

۱۹ تخلیص یا تخلیص التخلیص: صاحب کشف الظنون نے اس کا بھی علم الخلاف کے ضمن میں تذکرہ کیا ہے۔

۲۰ المحصول فی اصول الفقہ یا کتاب المحصول فی علم الاصول، نام سے موضوع ظاہر ہے۔

۲۱ کتاب المتکلمین۔

۲۲ تبیین الصحیح فی تعیین الذبیح۔

۲۳ تفصیل التفضیل بین التحمید والتہلیل۔

۲۴ کتاب التوسط فی المعرفۃ لصحۃ الاعتقاد والرد علی من خالف السنۃ من ذوی البدع والالحاد۔

۲۵ سراج المریدین۔

۲۶ سراج المہتدین۔

۲۷ عواصم وقواصم۔

۲۸ نواہی ودواہی۔

۲۹ کتاب ملجاء المتفقہین الی معرفۃ غوامض النحویین۔ (ان سب کتابوں کے لیے الدیباج ص ۲۸۲ و نفح الطیب ص ۳۴۰ وبستان المحدثین ص ۱۳۸ ملاحظہ ہو) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ فن نحو کی کتاب ہے۔

۳۰ کتاب الرحلۃ یا کتاب ترتیب الرحلۃ: اس کے بعض دلچسپ اور مفید اقتباسات صاحب نفح الطیب اور شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نے نقل کیے ہیں، ان میں سے بعض کو دلچسپی کے خیال سے یہاں بھی درج کیا جاتا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں ایک دن بغداد میں ابوالوفا کی مجلس میں حاضر تھا، قرآن کی تفسیر ہو رہی تھی، قاری نے یہ آیت تلاوت کی کہ: (تَحِیَّتُهُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ) میں نے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے ایک شخص سے آہستہ سے کہا کہ یہ آیت عالم آخرت میں رویت الٰہی کی صریح دلیل ہے، کیونکہ اہل عرب (لقیت فلانا) رویت ہی کے موقع پر کہتے ہیں، ابوالوفا نے یہ سن لیا اور مذہب اعتزال کی تائید میں یہ آیت تلاوت کی:

(فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ الخ) اور کہا کہ منافقین کے بارے میں اجماع ہے کہ ان کو رویت نہ حاصل ہوگی، میں اس وقت پاس ادب اور مجلس عام کی وجہ سے کچھ عرض نہ کرسکا، حالانکہ کتاب المتکلمین میں اس آیت کے ضمن میں میں نے لکھا ہے کہ (یَلْقَوْنَهٗ) کی ضمیر کا مرجع نفاق ہے، جس کی تقدیر جزاء نفاق ہے'' ایک اور موقع پر رقم طراز ہیں کہ:

''محدثین کا قول ہے کہ حدیث کی طلب وتحصیل کرنے والے شخص کے چہرے پر شادابی اور تازگی ہوتی ہے، کیونکہ سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا ہے:

نضر الله امرأ سمع مقالتي فوعاها فاداها كما سمعها.

اللہ تعالیٰ اس آدمی کو تروتازہ کرے جس نے میری بات کو سن کر محفوظ کیا اور اس کو اسی طرح جس طرح سنا تھا دوسرے کو پہنچایا۔

حاملین علم کے لیے یہ نبی ﷺ کی دعا ہے، اس لیے اللہ کے فضل وکرم سے یہ برکت ضرور حاصل ہوگی۔

(نفح الطیب ج ا ص ۳۴۰ تا ۳۴۳ و بستان المحدثین ص ۱۳۸ و ۱۳۹)

Marfat.com

مندرجہ ذیل کتابوں کا صرف نفح الطیب کے مصنف نے ذکر کیا ہے:

- کتاب الخلافیات: یہ غالباً وہی کتاب ہے جس کا ذکر نمبر ۱۸ میں ہوا ہے۔
- کتاب الامد الاقصیٰ باسماء اللہ الحسنی وصفاتہ العلا۔
- کتاب العقد الاکبر للقلب الاصغر۔
- کتاب اعیان الاعیان۔
- رسالۃ الکافی فی ان لا دلیل علی النامی۔
- کتاب ستر العورۃ: صاحب کشف الظنون نے ابو عبداللہ احمد بن سلیمان زبیری (م ۳۱۷ھ) کی اسی نام کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے۔
- کتاب مراقی الزلف: صاحب کشف الظنون نے مراقی الزلفی کے نام سے امام غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے۔

Marfat.com

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی ۵۴۴ھ)

نام ونسب:

عیاض نام، ابوالفضل کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: عیاض بن موسیٰ بن عیاض بن عمرو بن موسیٰ بن عیاض بن محمد بن موسیٰ بن عیاض، (المعجم فی اصحاب القاضی ابوعلی الصدفی لابن ابار ص ۲۹۴ و ابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۶) بعض لوگوں نے عمرو کا نام عمرون لکھا ہے۔
(الدیباج ص ۱۶۸ و بستان المحدثین ص ۱۳۱)

ولادت وخاندان:

یہ وسط شعبان ۴۷۶ھ میں پیدا ہوئے، بعض نے ۴۷۶ھ سن ولادت لکھا ہے، یمن کے مشہور قبیلہ حمیر سے خاندانی تعلق تھا، اس خاندان کے ایک شخص یحصب ابن مالک کی نسبت سے یحصبی کہلاتے ہیں۔ (ابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۷ و ۱۱۸)
قاضی عیاض کا خاندان علمی حیثیت سے ممتاز تھا، اس میں ان سے پہلے اور ان کے بعد کئی اصحاب علم وفن گزرے ہیں۔

وطن:

قاضی صاحب کے اجداد بسطہ سے فاس منتقل ہو گئے تھے اور پھر سبتہ آئے یہیں ان کی ولادت ہوئی، یہ ساحل سمندر پر واقع مغرب کا ایک مشہور شہر ہے، اس کے تعلق سے وہ سبتی کہے جاتے ہیں۔
(ایضاً المعجم ص ۲۹۴ و کتاب الانساب ورق ۲۸۹ و الدیباج ص ۱۶۸)

اساتذہ:

مشہور استاذوں کے نام یہ ہیں:
قاضی ابوالولید بن رشد، قاضی ابوعبداللہ بن حمید بن ابومحمد بن عتاب عتابی محمد بن احمد بن الحاج، ابوعلی بن حسین محمد صدفی، عبداللہ بن محمد بطلیوسی، عبداللہ بن محمد خشنی، ابوعلی حسن بن محمد بن سکرہ، ابوالقاسم عبدالرحمن بن بقی بن مخلد، ابوالحسین ابن سراج بن عبدالملک، ابومحمد بن عثمان، ہشام بن احمد، قاضی ابوبکر بن عربی، ابوعلی حسن بن علی طریف، ابوالقاسم خلف بن ابراہیم بن نحاس، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ مسلی، عبدالرحمن بن محمد بن عجوز، ابوعبداللہ محمد بن عیسیٰ تمیمی، ابوحامد محمد بن اسماعیل، سفیان بن عاص فقیہ، قاضی ابوعبداللہ تمیمی، ابوالولید ہشام بن احمد المعروف ابن العواد اور ابن مغیث وغیرہ۔

Marfat.com

جن شیوخ سے ان کو شرف اجازت حاصل تھا ان کے نام یہ ہیں:
ابو علی غسانی، شیخ ابو بکر طرطوشی، خلیص بن عبد اللہ، ابو زید بن منتال، ابن السید ابو زید بن وراق، ابو عبد اللہ خولانی، ابو الولید بن طریف، ابو الاصبح بن عیسیٰ بن ابی البحر الشتر ینی، ابو نصر نہاوندی، ابو طاہر احمد بن محمد سلفی اور ابو عبد اللہ مازری وغیرہ۔

تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ ان کے اساتذہ اور اجازت دینے والے شیوخ کی تعداد سو سے متجاوز ہے۔
(المعجم ص ۲۹۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۹۹ و ۱۰۰ و الدیباج ص ۱۶۹)

تلامذہ:

ان کے تلامذہ کا حلقہ بھی بڑا وسیع تھا، چند مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں:
ابو القاسم خلف بن بشکوال، ابو جعفر بن قصیر غرناطی، عبد اللہ بن احمد عصیری ابو محمد عیسیٰ بن الحجری، محمد بن حسن الحاثری۔
(تذکرہ ج ۴ ص ۱۰۱)

طلب علم کے لیے رحلت وسفر:

اپنے وطن کے علما و مشائخ سے استفادہ کرنے کے بعد ۵۰۷ھ میں اندلس تشریف لے گئے، اور قرطبہ کے علمائے فن سے کسب فیض کیا، علم کی تحصیل کے لئے انہوں نے بلادِ مشرق کا بھی سفر کیا۔
(ابن خلکان ج ۲ ص ۱۰۷ و تذکرہ ج ۴ ص ۱۰۰ و الدیباج ص ۶۹ و بستان المحدثین ص ۱۳۱)

حفظ و ذکاوت:

قاضی عیاض کے حفظ و ضبط، فہم و تیقظ اور ذکاوت و ذہانت کا علمائے سیر نے ذکر و اعتراف کیا ہے، ان کی غیر معمولی فطانت کا یہ حال تھا کہ ۳۰ سال کی عمر میں ارباب فن سے مناظرہ اور ۳۵ سال کی عمر میں عہدۂ قضا پر متمکن ہو چکے تھے۔
(الدیباج ص ۶۹ و تذکرہ ج ۴ ص ۱۰۰)

علم حدیث میں درجہ:

ان کو علم حدیث سے بڑا شغف اور خاص اشتغال تھا، اور اس فن میں مکمل مہارت اور درک رکھتے تھے، ابن خلکان کا بیان ہے کہ حدیث اور علوم حدیث میں یکتائے روزگار اور امام وقت تھے، اور حدیثوں کے ضبط و تحریر اور جمع و کتابت پر پوری توجہ مبذول کرتے تھے، اسلئے انکے پاس روایات و احادیث کا وسیع ذخیرہ تھا۔ (ابن خلکان ج ۲ ص ۱۰۶ و ۱۰۷ و الدیباج ص ۱۶۸ و ۱۶۹)

تفسیر و فقہ:

علوم قرآن اور فقہ و خلاف میں بھی ممتاز تھے، صاحب دیباج لکھتے ہیں کہ "وہ تفسیر اور اس کے متعلقہ علوم و فنون کے عالم، مبصر، فقیہ اور احکام و شرائع کے بڑے واقف کار تھے۔" (الدیباج ص ۱۶۸)

دیگر علوم:

وہ خالص دینی علوم ہی میں ممتاز اور فائق نہ تھے، بلکہ نحو، لغت، کلام عرب اور انساب و وقائع کے بھی نامور عالم تھے، علامہ

Marfat.com

ابن خلکان نے بھی علوم حدیث کے علاوہ نحو، لغت، کلام عرب، انساب اور ایام و وقائع میں ان کو امام العصر قرار دیا ہے۔
(ایضاً و ابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۶ و تذکرہ ج ۴ ص ۱۰۰ و بستان ص ۱۳۱)

شعر و سخن:

شعر و سخن کا عمدہ ذوق تھا، ان کے جو اشعار ارباب سیر نے نقل کیے ہیں وہ فراق و جدائی کی بے قراری، حکیمانہ مضامین اور مناظر قدرت کی مصوری وغیرہ پر مشتمل ہیں، تذکرہ نگاروں نے ان کے اشعار کی بلندی کا اعتراف کیا ہے۔
(ایضاً و ابن خلکان ج ۲ ص و تذکرہ ج ۴ ص ۱۱۶ و بستان ص ۱۳۱)

خطابت:

صاحب دیباج لکھتے ہیں، وہ بلیغ خطیب تھے۔ (الدیباج ص ۱۶۹)

قضا:

ان کے کمسنی ہی میں قضا جیسے اہم اور ذمہ دارانہ منصب پر فائز ہونے کا ذکر اوپر گزرا ہے، پہلے اپنے وطن سبتہ کے برسوں قاضی رہے، پھر غرناطہ میں اس عہدہ پر مامور کیے گئے، مگر جلد ہی وہاں سے سبکدوش ہو کر دوبارہ سبتہ کے قاضی ہوئے، اس عہدہ پر مدتوں متمکن رہنے کی وجہ سے قاضی ان کے نام کا جزو ہو گیا تھا۔

وہ محکمہ قضا کے فرائض نہایت خوش اسلوبی اور ذمہ داری سے انجام دیتے تھے اور عدل و انصاف سے سرمو انحراف نہیں کرتے تھے۔ (الدیباج ص ۱۶۹ و ابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۷ و تذکرہ ج ۴ ص ۱۰۰)

جامعیت و اعتراف کمالات:

قاضی صاحب گوناگوں اوصاف و کمالات سے متصف، مختلف علوم و فنون کے جامع، امام وقت، علامہ دہر اور عالم مغرب تھے، ابن خلکان کا بیان ہے کہ "وہ اکابر ائمہ حفاظ و محدثین اور افاضل فقہا و ادبا میں تھے ان کی تصنیفات اور اشعار اس پر شاہد ہیں۔" صاحب معجم لکھتے ہیں، قاضی عیاض کی علمی خدمات متنوع اور گوناگوں ہیں، فن حدیث میں ان کا انہماک غیر معمولی اور بے مثال تھا، وہ مختلف علوم اور معانی و اصطلاحات کی فہم و معرفت میں یکتا، نظم و نثر دونوں پر قادر اور فقہ، لغت، عربیت و ادب کے ماہر تھے، درحقیقت انکی ذات لائق فخر اور سرمایۂ کمال تھی اور وہ نہ صرف اندلس بلکہ مغرب کے علما اور رجال کے صدر الصدور تھے۔
(ابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۷ و تذکرہ ج ۴ ص ۱۰۰ و المعجم ص ۲۱۶)

شہرت و مقبولیت:

ان اوصاف و کمالات کی بدولت ان کی شہرت و مقبولیت میں بڑا اضافہ ہو گیا تھا، صاحب دیباج فرماتے ہیں کہ ان کی شہرت عظیم تھی، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ خود اپنے شہر میں جو بلند مرتبہ، غیر معمولی عظمت اور عظیم الشان وقار ان کو حاصل ہوا وہ یہاں کے کسی اور شخص کو نہ ان سے پہلے حاصل ہوا تھا اور نہ ان کے بعد ہوا۔ (الدیباج ص ۱۷۰ و تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۰۰)

Marfat.com

فقہی مذہب:

مالکی مذہب کے اکابر میں شمار کئے جاتے تھے، اس کے اصول وفروع پر ان کی نظر وسیع تھی اور وہ اس مذہب کی جزئیات کے حافظ تھے۔ (الدیباج ص ۱۶۹)

اخلاق وعادات:

انکسار، تواضع، نرم خوئی، خوش معاملگی، صبر وضبط، عفو وتحمل اور سخاوت وفیاضی وغیرہ عمدہ خصائل کے مالک تھے، صاحب دیباج لکھتے ہیں کہ وہ لوگوں سے اچھا سلوک اور خوب صدقہ وخیرات کرتے تھے۔ (الدیباج ص ۱۶۹)

خشیت وحق پسندی:

خوف وخشیت الٰہی، عمل صالح میں مداومت اور حق کے معاملہ میں شدت پسندی کے لیے مشہور تھے، ذہبی کا بیان ہے کہ ان کے شہر میں ایسی عظیم الشان شہرت کا حامل کوئی نہ تھا، مگر اس چیز نے عجب وکبر کے بجائے ان کے عجز وانکسار اور خوف وخشیت الٰہی میں مزید اضافہ کر دیا تھا، ان پر خوف الٰہی اس قدر غالب تھا کہ قضا کے معاملات میں کبھی ناانصافی نہیں کرتے اور نہ اپنے اور پرائے کے معاملہ میں انصاف اور حق پسندی سے دامن کش ہوتے۔ (الدیباج ص ۱۶۹ تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۰۰)

اس طرح نہایت متقی، زاہد، عبادت گزار اور صحیح العقیدہ اور بدعات سے سخت متنفر رہتے۔ (مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۹)

جلاوطنی اور وفات:

موحدین[۱] کی تحریک کا ظہور ہوا تو قاضی صاحب بھی اس میں شامل ہو گئے، ۵۴۳ھ کے انتشار اور طوائف الملوکی کے زمانہ میں ان کو جلاوطن ہو کر مراکش جانا پڑا، یہیں ان کا جمعہ کے دن جمادی الاخری ۵۴۴ھ میں انتقال ہوا اور باب ایلان میں سپرد خاک کئے گئے۔ (الدیباج ص ۱۷۰، تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۰۱، ابن خلکان ج ۴ ص ۱۱۸، الرسالۃ المستطرفہ ص ۸۹) بعض لوگوں کا بیان ہے کہ کسی یہودی کے زہر دینے سے ان کی وفات ہوگئی تھی۔ (المعجم ص ۲۹۶ والدیباج ص ۱۷۱ و ۱۷۲)

اولاد واحفاد:

قاضی عیاض کے خاندان کی بدولت اندلس اور بلادِ مغرب میں مدتوں علم وفن کی قندیلیں فروزاں رہیں اور ان کی اولاد واحفاد میں بڑے ممتاز اور بلند پایہ اصحاب علم وکمال پیدا ہوئے، فرزند ابو عبداللہ دانیہ کے قاضی اور مشہور صاحب علم تھے اور پوتے عیاض بن محمد ممتاز ادیب وشاعر تھے۔ (ابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۷ و ۱۱۸ والدیباج ص ۱۷۲)

---

[۱] اس تحریک کے بانی محمد تومرت سوس پیدا ہوئے، یہ نہایت لائق وقابل اور عالم وفاضل شخص اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں تھے، ۵۱۵ھ میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی دعوت کا آغاز کیا، جب ان کا حلقۂ اثر زیادہ ہوا تو انھوں نے مہدویت کا دعویٰ کر دیا، عبدالمومن کو جو ان کا خاص معتقد ومرید تھا، ۵۲۰ھ میں اپنی وفات سے پہلے اپنا جانشین مقرر کر گئے، اس نے اندلس اور بلادِ مغرب سے مرادِ بطین کی حکومت کا خاتمہ کر کے ان کو اپنے زیر نگین کر لیا، ۶۲۰ھ تک الموحدین کی حکومت ان علاقوں میں رہی۔

Marfat.com

تصنیفات:

قاضی عیاض صاحب کمال اور نامور مصنف بھی تھے اور ان کی تصنیفات کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے اہم، بلند پایہ اور علم وفن کے ذخیرہ میں بیش قیمت خیال کی جاتی ہیں، اس لیے ان کو بڑی شہرت و اعتبار حاصل ہوا اور وہ ہر زمانہ کے اہل علم میں مقبول و متداول رہی ہیں، مورخین نے ان کو مفید، معلومات افزا اور تحریر و انداز بیان کے لحاظ سے انوکھی اور دلکش بتایا ہے، ابن الانباری لکھتے ہیں ان کی مفید کتابوں کو نقل کر کے لوگ ان سے خوب فیض یاب ہوئے اور وہ ہر طبقہ کے لوگوں میں نہایت مقبول ہوئیں، علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ان کی اہم تصنیفات کا چار دانگ عالم میں شہرہ ہے، ان کی بدولت مصنف کا نام روشن ہوا اور ان کی دور دور شہرت ہوئی، ان کے وطن سبتہ میں ان کے زمانہ میں کسی شخص نے اتنی زیادہ کتابیں نہیں لکھی تھیں۔''

(المعجم ص ۲۹۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۰۰)

جن کتابوں کے ناموں کا علم ہوا ہے، ان کی فہرست اور بعض اہم کتابوں کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ کتاب اجوبۃ القرطبیین، ۲۔ کتاب الاجوبۃ المجھرۃ علی الاسئلۃ المتخیرہ یا عن الاسئلۃ المحیرۃ، ۳۔ کتاب الاعلام بحدود قواعد الاسلام یا الاعلام فی حدود الاحکام، ۴۔ کتاب سر السراۃ فی ادب القضاۃ، ۵۔ کتاب العقیدہ، ۶۔ کتاب العیون الستۃ فی اخبار سبتہ، ۷۔ کتاب مسئلۃ الاھل المشروط بینھم التزاور، ۸۔ مطامح الافھام فی شرح الاحکام، ۹۔ معجم شیوخ ابی علی الصدفی، ۱۰۔ المقاصد لحسان فیما یلزم الانسان، ۱۱۔ کتاب نظم البرھان علی صحۃ (یاحجۃ) جزم الاذان۔

۱۲۔ کتاب اجوبۃ عما نزل فی ایام قضائہ من نوازل الاحکام: ایک سفر میں ہے (الدیباج ص ۱۷۱) اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ان کے عہدۂ قضا کے زمانہ میں پیش آنے والے حوادث و مسائل کے بارے میں استفسارات کے جوابات اور فیصلوں پر مشتمل ہے۔

۱۳۔ کتاب الالماع فی ضبط الروایۃ وتقیید السماع: یہ اصول حدیث میں ہے، (فہرست لباب المعارف پشاور ص ۶۱ و ۶۲) اس کا ایک قلمی نسخہ مکتبہ سندیہ میں اور دوسرا کتب خانہ ایا صوفیہ میں ہے۔ (تذکرۃ النوادر ص ۴۶)

۱۴۔ کتاب بغیۃ الرائد لما تضمنہ حدیث ام زرع من الفوائد یا کتاب شرح حدیث ام زرع: یہ حدیث مذکور کی مبسوط شرح ہے۔ (ابن خلکان ج ۲ ص ۱۱ و کشف الظنون ج ۲ ص ۵۵)

۱۵۔ کتاب ترتیب المدارک وتقریر المسالک لمعرفۃ اعلام مذھب مالک یا کتاب ترتیب المدارک وتقریب المسالک فی ذکر فقھاء مذھب مالک: اس میں مذہب مالکی کے مشاہیر و اعلام کا ذکر ہے اور یہ بڑی عمدہ اور انوکھی کتاب ہے، اس سے پہلے ایسی عمدہ کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی، (کشف الظنون ج ۱ ص ۲۷۶) اس کا ایک قلمی نسخہ دو جلدوں میں کتب خانہ خدیویہ مصر میں اور دوسرا کتب خانہ ٹونک میں ہے۔ (تذکرۃ النوادر ص ۹۹)

۱۶۔ کتاب التنبیھات المستنبطۃ علی الکتب المدونۃ یا المستنبط فی شرح کلمات مشکلۃ و الفاظ مغلقۃ مما اشتملت علیہ الکتب المدونۃ و المختلطۃ: مذہب مالکی کی مشہور کتاب مدونہ کے مشکل و مغلق الفاظ و کلمات کی شرح اور نادر و غریب فوائد کا خزانہ ہے، (ایضاً ۲ ص ۴۱۱) اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی ہے، یہ اصل نام کے بجائے

Marfat.com

تنبیہات ستہ کے نام سے زیادہ مشہور ہے، بعض لوگوں نے اس کی اشعار میں تعریف کی ہے۔

۱۷۔ جامع التواریخ: اس مبسوط اور جامع تاریخ میں اندلس اور بلادِ مغرب کے ملوک اور سرزمین سبتہ کے واقعات اور اس کے علما کے حالات درج ہیں۔ (تذکرہ ج ۴ ص ۱۰۰)

۱۸۔ کتاب الخطب: مصنف کے بلیغ خطبوں کا مجموعہ ہے۔ (الدیباج ص ۱۷۱)

۱۹۔ کتاب الغنیہ فی شیوخہ: اس میں اپنے شیوخ کا ذکر ہے۔ (الدیباج ص ۱۷۱ و کشف الظنون ج ۲ ص ۱۶۱ و بستان المحدثین ص ۱۳۱)

۲۰۔ کتاب غنیۃ الکاتب وبغیۃ الطالب فی الصدور والترسل: (الدیباج ص ۱۷۱) یا غنیۃ الکاتب وبغیۃ الطالب فی صدور الرسائل (کشف الظنون ج ۲ ص ۱۶۰) یا علۃ الکاتب وبغیۃ الطالب۔ (بستان المحدثین ص ۱۳۱)

۲۱۔ کتاب المعجم فی شیوخ ابن سکرہ: ابو علی حسین بن محمد سرقسطی صدفی المعروف بابن سکرہ کے مشائخ کے ناموں کی تخریج کی ہے شروع کے چند صفحے میں ابو علی کا ترجمہ اور اس کی صراحت کی گئی ہے کہ انہوں نے ۱۶۰ شیوخ سے اخذ واستفادہ کیا تھا۔
(کشف الظنون ج ۲ ص ۴۶۵ و اتحاف النبلاء ص ۱۵۶)

۲۲۔ اکمال المعلم فی شرح صحیح المسلم: یہ صحیح مسلم کی شرح اور ابو عبداللہ محمد بن علی مازری (م ۵۳۶ھ) کی مشہور شرح مسلم کتاب المعلم بفوائد کتاب مسلم کا تکملہ ہے۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۴۷۴)
صحیح مسلم کی مشہور و معتبر شرحوں میں اس کا شمار ہوتا ہے اور متاخرین نے اس سے اپنی شرحوں میں بڑا استفادہ کیا ہے، ابو عبد اللہ محمد بن خلفہ وشتانی (م ۶۲۷ھ) نے اپنی شرح اکمال اکمال المعلم میں مازری، عیاض، قرطبی اور نووی کی شرحوں کو بعض اضافوں اور تنبیہات کے ساتھ جمع کیا ہے، اسی طرح ابو الفرج عیسیٰ بن مسعود زواری (م ۷۴۴ھ) نے بھی اپنی شرح معلم، اکمال اور مفہم و منہاج کی مدد سے مرتب کی ہے۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۴۷۴) اس کی اہمیت مالک بن مرجل کے ان اشعار سے ظاہر ہے۔

من قرأ الاکمال کان کاملا ۔۔۔ فی علمہ وزین المحافلا
وکتب العلم کنوز انہا ۔۔۔ تفید نفعا عاجلا وآجلا
ولیس من کتب عیاض عوض ۔۔۔ فانہ کان اماما فاضلا
(بستان المحدثین ص ۱۳۰)

جس نے اکمال کو پڑھا وہ اپنے علم میں کامل ہو گیا اور اس نے محفلوں کو مزین کر دیا اور علمی کتابیں درحقیقت خزانہ ہیں جو جلد یا بدیر ضرور ضرور فائدہ دے گا، مگر عیاض کی کتابوں کا بدل نہیں ہے کیونکہ وہ امام فن اور فاضل یگانہ تھے، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں ہے۔ (فہرست)

۲۳۔ مشارق الانوار: اس کا پورا نام مشارق الانوار علی صحاح الآثار ہے، یہ حدیث کی تین اہم اور طبقہ اولیٰ کی کتابوں موطا امام مالک، صحیح بخاری و صحیح مسلم کی شرح ہے، اس میں ان کی حدیثوں کے مشکل اور غریب الفاظ کی تحقیق و تشریح، معانی و مطالب کی توضیح، راویوں کے ناموں کا ضبط اور ان کے اغلاط، اوہام اور تصحیفات وغیرہ پر تنبیہ کی گئی ہے۔
(الدیباج ص ۱۷۰ و کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۵)

Marfat.com

۲۴۔ کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ: یہ قاضی عیاض کی بڑی مفید، مقبول اور بے نظیر کتاب ہے، اس کی جدت و ندرت، ہر طبقہ و مسلک کے لوگوں میں شہرت و مقبولیت اور انداز تحریر کی دلکشی و دلآویزی وغیرہ کا قاضی عیاض کے معاصرین، ارباب سیر اور علمائے فن نے اعتراف کیا ہے، صاحب دیباج لکھتے ہیں:

''مصنف کی انفرادیت، جدت اور سبقت و تقدم کا شرف و مزیت مسلم ہے، لوگوں نے اس کتاب کی نقل و روایت کر کے اس سے بڑا استفادہ کیا ہے اور شرق و غرب ہر جگہ اس کا غلغلہ بلند ہے۔'' (الدیباج المذہب ص ۱۷۰)

صاحب کشف الظنون فرماتے ہیں:

''یہ نہایت بیش قیمت اور مفید کتاب ہے، اس سے پہلے ایسی عمدہ کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔'' (کشف الظنون ج ۲ ص ۶۲)

صاحب روضات کا بیان ہے:

''ہمارے اصحاب یعنی فرقہ امامیہ کے لوگوں نے بھی اس کے بکثرت اقتباسات نقل کیے ہیں، درحقیقت اس میں بے شمار فوائد، بلند تحقیقات اور رسول اللہ ﷺ کی ولادت سے وفات تک کے حالات و واقعات کے متعلق حدیثیں شامل ہیں، مصنف نے اس میں اکابر شیوخ سے روایتیں نقل کی ہیں۔'' (روضات الجنات ص ۵۱۶)

شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''غرض یہ بڑی اہم، عجیب اور نہایت مقبول کتابوں میں ہے، بعض شاعروں نے اس کی منظوم تعریفیں کی ہیں۔''
(بستان المحدثین ص ۳۰ و اتحاف النبلاء ص ۱۰۰)

کتاب الشفا میں رسول اکرم ﷺ کی عظمت شان اور آپ کے جلیل القدر منصب و مقام کو قرآن مجید، حدیث نبوی اور ائمہ کے اقوال کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے، مصنف کا بیان ہے کہ:

''تم نے مجھ سے رسول اللہ ﷺ کی قدر و منزلت، آپ کے اوصاف و محامد، آپ کی توقیر و احترام کا تذکرہ کرنے اور ان امور میں کمی اور کوتاہی کرنے والوں کے احکام بیان کرنے کے لیے مسلسل اصرار کیا ہے، یہ بڑا دقت طلب اور مشکل کام ہے اور اس میں لغزش کا بھی اندیشہ ہے لیکن چونکہ اس سے ثواب اور اللہ کے فضل و انعام کی توقع ہے اور اس کو ترک کرنا کتمانِ علم کا موجب ہے، جس کے متعلق سخت وعیدیں آئی ہیں، اس لیے میں نے یہ کتاب لکھی ہے۔'' (مقدمہ الشفاء)

یہ چار حصوں میں ہے اور ہر حصہ کئی ابواب و فصول پر مشتمل ہے۔

پہلے حصہ میں آپ ﷺ کی اس ثنا و توصیف، عظمت شان و فضائل و کمالات میں جامعیت اور معجزات و کرامات وغیرہ کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہیں۔

دوسرے حصہ میں دکھایا گیا ہے کہ لوگوں پر آپ ﷺ کے کیا حقوق عائد ہوتے ہیں، جیسے آپ ﷺ پر ایمان لانا، آپ ﷺ کی مکمل اطاعت، آپ ﷺ سے محبت و عقیدت رکھنا، آپ ﷺ کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھنا اور آپ ﷺ پر درود و سلام بھیجنا وغیرہ۔

تیسرے حصہ میں یہ بحث کی گئی ہے کہ کن بشری اوصاف و خصائل کی نسبت آپ کی جانب صحیح و مناسب ہے اور کیا اوصاف آپ ﷺ کی شان و عظمت کے منافی ہیں غرض ان تمام باتوں کی اس میں تفصیل کی گئی ہے جو آپ کی شان میں روا اور جائز ہیں اور ان کی بھی جو ناروا اور ممنوع ہیں۔

Marfat.com

چوتھا حصہ آپ ﷺ کی تنقیص اور سب وشتم کرنے والوں کے احکام پر مشتمل ہے، اس کے آخر میں اللہ تعالیٰ، ملائکہ، عام انبیاء ورسل اور رسول اللہ ﷺ کے آل واصحاب کی شان میں گستاخی اور سب وشتم کرنے والوں کے احکام کا ذکر ہے۔

مصنف نے تیسرے حصے کو سب سے اہم مہتم بالشان اور اس کتاب کے لکھنے کی اصل غرض وغایت بتایا ہے جو شروع کے حصوں کا دیباچہ وتمہید اور آخر کے مباحث کا تکملہ ہے۔ (مقدمہ کتاب الشفاء)

قرآنی آیات کی تفسیر وتاویل کے ضمن میں اعراب وقراءت کے اختلافات اور مفسرین کے تفسیری اقوال بھی نقل کئے ہیں۔

کتاب الشفا بڑی بابرکت کتاب سمجھی جاتی ہے، قاضی عیاض کے برادر زادہ کہتے ہیں کہ میں نے خواب دیکھا کہ میرے چچا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سونے کے ایک تخت پر فروکش ہیں، یہ منظر دیکھ کر مجھ پر ہیبت ودہشت طاری ہوگئی، انہوں نے میری پریشانی اور گھبراہٹ دیکھ کر فرمایا کہ کتاب الشفاء کو مضبوطی سے اختیار کرو۔ یہ گویا اس امر کی جانب اشارہ تھا کہ یہ بلند مرتبہ واعزاز اسی کتاب کی کرامت کا نتیجہ ہے۔" (بستان المحدثین ص ۱۳۰)

مختصرات وشروح:

اس کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے اس کی شرحیں، تعلیقات اور مختصرات وغیرہ لکھے گئے ہیں، ذیل میں ان کا اور ان کے مصنفین کا نام درج کیا جاتا ہے۔

۱ المنہل الاصفیٰ فی شرح ماتمس الحاجۃ الیہ من الفاظ الشفاء لابی عبداللہ محمد بن ابی شریف حسنی تلمسانی، یہ الشفا کی بہترین شرحوں میں ہے، ۹۱۷ھ میں اس کی تصنیف سے مصنف فارغ ہوئے۔

۲ الاصطفا لبیان معانی الشفا: لشیخ شمس الدین محمد بن محمد دلجی شافعی عثمانی، (م ۹۴۷ھ) یہ ۹۳۵ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

۳ شیخ امام ابوالحسن علی بن محمد بن اقبرس شافعی متوفی ۸۶۲ھ نے شرح لکھی۔

۴ عمر عرضی نے ۴ جلدوں میں شرح لکھی۔

۵ ابوذر احمد بن ابراہیم حلبی (م ۹۸۴ھ) کی شرح، یہ ناتمام ہے۔

۶ مناہل الصفا فی تخریج احادیث الشفاء: اس میں حافظ جلال الدین سیوطی نے شفا کی حدیثوں کی تخریج کی ہے۔

۷ مزیل الخفاعن الفاظ الشفا: شیخ تقی الدین ابوالعباس احمد بن محمد شمنی (م ۸۷۶ھ) نے اس میں شفا کے حواشی وتعلیقات لکھے ہیں، ۸۴۷ھ میں اس کی تالیف سے فارغ ہوئے تھے۔

۸ برہان الدین ابراہیم بن محمد حلبی سبط ابن العجمی نے ایک جلد میں تعلیق لکھی اور ۷۹۰ھ میں مکمل کی۔

۹ المقتفی فی حل الفاظ الشفا: یہ سبط ابن العجمی کے ایک شاگرد محمد بن خلیل حنفی کی شرح ہے، اس میں انہوں نے اپنے استاد کے افادات مذکورۂ بالا نام سے اور اس پر اضافے زبدۃ المقتفی فی تحریر الفاظ الشفا کے نام سے جمع کئے ہیں، اس کی تالیف ۸۱۰ھ میں ہوئی۔

۱۰ شہاب الدین احمد بن حسین بن رسلان رملی شافعی (م ۸۴۴ھ) نے ایک مفید تعلیق لکھی۔

Marfat.com

۱۱ عماد الدین ابو الفدا اسماعیل بن ابراہیم بن جماعہ کنانی قدسی (م ۸۶۷ھ) نے شفا کے بعض الفاظ کی تشریح کی ہے۔

۱۲ شیخ ابو عبداللہ محمد بن حسن بن مخلوف راشدی کی شرح۔

۱۳ کمال الدین محمد بن ابی شریف قدسی (م ۸۱۷ھ) کی شرح۔

۱۴ ابو عبداللہ احمد بن محمد بن مرزوق تلمسانی مالکی (م ۸۱۷ھ) کی شرح۔

۱۵ شیخ عبداللہ قرشی یمانی کے حواشی۔

۱۶ الشفا المسمی بالوفا: ابن الاخضر کی تلخیص ہے۔

۱۷ القفا تحریر الشفا: قطب الدین محمد بن محمد بن خیضری (م ۸۹۴ھ) کی تلخیص۔

۱۸ الاکتفا فی شرح الفاظ الشفا: امام ابوالمحاسن عبدالباقی یمانی کی شرح۔

۱۹ نسیم الریاض فی شرح شفاء القاضی عیاض: یہ مبسوط، ضخیم اور محققانہ شرح شہاب الدین احمد خفاجی (م ۱۰۱۹ھ) نے لکھی ہے اور ۴ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

۲۰ ملا علی قاری (م ۱۰۱۶ھ) نے دو جلدوں میں شرح لکھی۔

۲۱ شیخ الاسلام مولیٰ اسحاق بن شیخ الاسلام اسماعیل آفندی (م ۱۱۴۷ھ) نے شفا کا ترکی میں ترجمہ کیا ہے۔

۲۲ حرمین کے مفتش مولیٰ ابراہیم جعف نے بھی ترکی ترجمہ کیا ہے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۶۳ و ۶۴)

۲۳ المدد الفیاض بنور الشفا: شیخ ہمام حسن عدوی خمراوی (م ۱۲۷۶ھ) کی شرح۔ (ہادی المسترشدین ص ۳۸۷)

۲۴ بعض مصنفین نے اس کی ساٹھ مسند حدیثوں کو ایک علیحدہ جز میں جمع کیا ہے۔ (الرسالۃ المستطرفہ ص ۸۹)

ایک اعتراض:

علامہ ذہبی نے الشفا کے متعلق لکھا ہے کہ یہ موضوع اور واہی روایتوں اور حدیثوں سے پر ہے، مصنف نے اس کی روایات میں زیادہ چھان بین اور نقد و تحقیق سے کام نہیں لیا ہے۔

شہاب الدین نے اس اعتراض کو تسلیم نہ کرنے کے باوجود اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس میں بعض ضعیف اور موضوع حدیثیں ہیں، حافظ سیوطی نے اپنی کتاب مناہل الصفا فی تخریج احادیث الشفا میں ان سب کی نشاندہی کر کے تنبیہ کی ہے۔

(مقدمہ الشفا)

ذہبی کا بیان گو غلو پر مبنی ہے تاہم اس کی صداقت یک گونہ مسلم ہے، قاضی عیاض نے احادیث واخبار کے نقد و تحقیق پر پورا دھیان نہیں دیا ہے۔

Marfat.com

ابوالسعادات مبارک بن اثیر جزری رح

(متوفی ۶۰۶ھ)

نام ونسب:

مبارک نام، ابوالسعادات کنیت، مجدالدین لقب اور نسب نامہ یہ ہے: مبارک بن محمد بن محمد بن عبدالکریم بن عبدالواحد۔ (ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۳ و طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۵۲

ان کے والد محمد اثیر کہلاتے تھے، اس لیے ان کی اور ان کے دو اور بھائیوں کی ابن اثیر کے نام سے شہرت ہوئی۔

ولادت ووطن:

ربیع الاول یا ربیع الثانی ۵۴۴ھ میں جزیرہ ابن عمر میں پیدا ہوئے اور یہیں نشوونما پائی، پھر اپنے بھائی اور دیگر خاندانی متعلقین کے ساتھ موصل تشریف لائے اور وہاں مستقل بودوباش اختیار کرلی، واقدی کا بیان ہے کہ اہل برقعید میں سے ایک شخص عمر بن عبدالعزیز نے اس کو آباد کرایا تھا، اس لیے اس کو جزیرہ ابن عمر کہا جاتا ہے، ابن خلکان لکھتے ہیں کہ مجھ کو ابن عمر کے بارے میں واقفیت نہیں ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جزیرہ امیر عراقین یوسف بن عمر ثقفی کی جانب منسوب ہے، بعد میں مجھ کو معلوم ہوا کہ اس کا تعلق برقعید کے عمر بن عبدالعزیز سے ہے، بعض تاریخوں میں اس کو عمر نامی ایک شخص کے دو بیٹے اوس وکامل کا جزیرہ بتایا گیا ہے لیکن ان دونوں کے متعلق بھی مجھ کو کوئی تحقیق نہیں ہوسکی، ابن المتوفی اپنی تاریخ میں عزالدین ابن اثیر کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ اوس وکامل کے جزیرہ سے تعلق رکھتے تھے اور وہ دونوں عمر بن ارس ثعلبی کے بیٹے تھے، (ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۵ و ۳۶۶) یاقوت کا بیان ہے کہ اس کے اولین بانی حسن بن عمر بن خطاب تھے۔ (معجم البلدان ج ۳ ص ۱۰۳)

خاندان:

ابن اثیر کا خاندان علم وفضل کا گہوارہ تھا، ان کے والد ماجد کو علم وفن سے اشتغال تھا اور ان کے دو بھائی بھی ان ہی کی طرح علمی حیثیت سے ممتاز اور صاحب کمال تھے، ضیاء الدین بن اثیر صاحب المثل السائرہ نامور ادیب وانشاپرداز اور عزالدین صاحب ''تاریخ کامل'' بے نظیر مؤرخ تھے:

Marfat.com

نسبتیں:

شیبانی، اربلی، موصلی اور جزری ان کی نسبتیں ہیں، (شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۴ وبغیۃ الوعاۃ ص ۳۸۵) ان میں اول الذکر خاندان کی جانب اور باقی شہروں کی جانب ہیں لیکن جزری سب نسبتوں سے زیادہ مشہور ہے، یہ جزیرۂ ابن عمر کی جانب نسبت ہے۔

اساتذہ:

چند مشہور استادوں کے نام یہ ہیں:

ابوالقاسم صاحب ابن الخل بغدادی، ابومحمد سعید بن مبارک بن ذہان، ابوالفضل عبداللہ بن احمد الخطیب الطوسی موصلی، عبد المؤمن بن کلیب، عبدالوہاب بن سکینہ یحییٰ بن سعدون قرطبی۔ (ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۳ وطبقات ابن سبکی ج ۵ ص ۱۳۵)

تلامذہ:

ان کے فرزندوں کے علاوہ شہاب قوصی اور فخر الدین بن بخاری وغیرہ کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ (ایضاً)

طلب علم کے لیے سفر:

انکے بغداد اور مختلف ولایات میں جانے اور وہاں کے علماء وفضلا سے استفادہ کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ (بغیۃ الوعاۃ ص ۳۸۵)

حدیث میں بلند پائیگی:

ابن اثیر نامور محدث اور فقہ ومعرفت حدیث میں یکتا تھے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ انہوں نے بے شمار حدیثیں سنیں اور ان کی روایت کی حدیثوں کے نقد وتمیز کے ماہر اور رجال وعلل کے واقف کار تھے، تذکرہ نگاروں نے اس فن اور اس کے متعلقہ علوم میں ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ (الکامل ج ۱۲ ص ۱۳ والبدایہ ج ۱۳ ص ۵۴)

قرآنی علوم:

تفسیر اور قرآنی علوم کے بھی ماہر تھے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

وقرأ القرآن واتقن علومه وحررها۔ (البدایہ ج ۱۳ ص ۵۴)

قرآن مجید کا مطالعہ کیا اور اس کے علوم میں مہارت بہم پہنچائی اور ان کو قلم بند کیا۔

فقہ:

ان کے چھوٹے بھائی مؤرخ ابن اثیر نے ان کو فقہ کا عالم بتایا ہے اور دوسرے ارباب سیر نے بھی اس میں ان کے کمال وامتیاز کا ذکر کیا ہے۔ (الکامل ص ۱۳ ج ۱۲ وابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۳ وشذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲)

لغت، عربیت اور نحو:

لغت، عربیت اور نحو وغیرہ میں بھی صاحب کمال تھے، مؤرخ ابن اثیر لکھتے ہیں:

Marfat.com

وکان عالما فی عدۃ علوم منہا الفقہ والاصولان والنحو والحدیث واللغۃ۔

وہ متعدد علوم جیسے فقہ، اصول، نحو، حدیث اور لغت وغیرہ کے متبحر عالم تھے۔

ابن عماد فرماتے ہیں، انہوں نے حدیث کا سماع اور فقہ وحدیث اور ادب کی تحصیل کی۔ (شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲)

ادب وانشا:

ادب وانشا کے فن سے خاص مناسبت تھی اور ان کا شمار مشہور وممتاز ادیبوں اور انشا پردازوں میں ہوتا ہے، ان کے بھائی مورخ ابن اثیر کا بیان ہے کہ وہ ماہر کاتب اور انشا پرداز تھے، ابن سبکی نے ان کو انشا پردازی میں بارع کہا ہے، ابن خلکان وغیرہ نے بھی انشا پردازی میں ان کی جودت کا ذکر کیا ہے، اس کمال کی بنا پر مدتوں امرا کے دربار میں کتابت وانشا کے فرائض ان کے متعلق رہے۔ (الکامل ج ۱۲ ص ۱۱۳ و ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۳ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۲)

شعر وسخن:

موزوں طبع بھی تھے اور کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔

حساب وریاضی:

حساب وریاضی جیسے خشک فن سے بھی ان کو اشتغال تھا اور اس میں کئی رسائل وتصنیفات ان سے یادگار ہیں، علامہ ابن خلکان کا بیان ہے کہ وہ فن حساب وانشا کے عالم تھے۔ (الکامل ج ۱۲ ص ۱۱۳ و ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۳ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۲)

جامعیت واعتراف کمالات:

مندرجہ بالا تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گوناگوں علوم وفنون کے جامع تھے، مورخ ابن اثیر لکھتے ہیں کہ ان کو متعدد علوم سے واقفیت تھی، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ وہ سارے علوم میں جامع اور مختلف فنون میں صاحب تصنیفات تھے، علمائے فن اور ارباب سیر نے ان کی جامعیت، فضل وکمال، عظمت وبلند پائیگی اور گوناگوں علوم میں مہارت وغیرہ کا اعتراف کیا ہے، ابو البرکات بن مستوفی کا بیان ہے کہ وہ معتمد ترین علمائے مشاہیر ویگانۂ روزگار فضلا، نامور ارباب فن اور جلیل القدر اصحاب کمال میں تھے، ان کے انہی کمالات اور گوناگوں محاسن نے ان کی ذات کو مرجع خلائق اور شائقین علوم کا مرکز بنا دیا تھا، ابن خلکان کا بیان ہے کہ گوشہ نشینی اور معذوری کے زمانہ میں ان کے گھر پر علما وفضلا کا ازدحام رہتا تھا۔ (ایضا)

فقہی مذہب:

شافعی المذہب تھے، علامہ ابن سبکی نے ان کا اپنی کتاب طبقات میں ذکر کیا ہے۔

تدین وتقویٰ:

علمی کمالات کے ساتھ ہی وہ زہد واتقا سے بھی متصف تھے، حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، ان کے بھائی کا بیان ہے کہ وہ متدین اور جادۂ مستقیم پر گامزن تھے اور ان کا گھر صوفیہ کی سرائے اور عبادت گزاروں کے لیے وقف رہتا تھا۔
(الکامل ج ۱۲ ص ۱۱۳)

Marfat.com

حسن خلق:

اوصافِ حمیدہ اور اخلاقِ فاضلہ کے پیکر تھے اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی اور حسن سلوک سے پیش آتے تھے، ابن عماد لکھتے ہیں:

وکان ذابر واحسان۔ (شذرات الذھب ج ۵ ص ۲۲) وہ لوگوں کے ساتھ نیک اور عمدہ برتاؤ کرتے تھے۔

امراء سے تعلقات اور شاہی درباروں سے توسل:

ابن اثیر امراء سلاطین کے دربار سے بھی متوسل رہے اور ان کو اپنے زمانہ کے موصل کے تمام امرا کے یہاں رسوخ حاصل تھا، پہلے وہ امیر مجاہد الدین قایماز [1] کے دربار سے وابستہ اور اس کے منشی رہے، امیر کی وفات تک اس خدمت پر مامور رہنے کے بعد صاحب عزالدین مسعود بن مودود نے ان کو دیوان رسائل کا محکمہ دیا، جب عزالدین کی وفات ہوئی اور اس کا لڑکا نور الدین ارسلان امیر ہوا تو وہ اس کے دربار سے متعلق ہو گئے، ارسلان ان کو بہت مانتا اور انعام واکرام سے نوازتا رہا، اس کے یہاں بھی وہ کتابت وانشا کے محکمہ پر فائز تھے لیکن جب معذور ہو گئے اور کام کرنے کے لائق اور چلنے پھرنے کی سکت نہ رہی تو اس خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔ (ایضاً ص ۲۰۴) ابن کثیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نور الدین کی امارت کے شروع زمانہ ہی میں انہوں نے سبکدوشی حاصل کر لی تھی، چنانچہ پہلے اس نے اپنے غلام لولو سے کہلایا کہ وہ وزارت انشا کے محکمہ کا چارج لے لیں، انکار کرنے پر وہ خود گیا، مگر انہوں نے معذرت کی کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور اس کام کے لیے ایک گونہ سخت گیری اور شدت سے کام لینا پڑتا ہے، جواب میرے لیے ممکن نہیں ہے، اس عذر کی بنا پر اس نے ان کو معاف کر دیا۔

(البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۵۴)

غالباً آخر عمر میں وہ امرا کی صحبت سے متنفر اور کنارہ کش ہو گئے تھے۔

سرائے کی تعمیر:

موصل کے قریب ایک گاؤں میں انہوں نے ایک سرائے بنوائی، اس کا نام قصر حرب تھا، اس پر انہوں نے اپنی املاک اور جائداد کا بڑا حصہ وقف کر دیا۔ (ابن خلکان ج ۲ ص ۴۰۳ وطبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۵۴)

بیماری اور خانہ نشینی:

آخر عمر میں ان کو ایک مزمن مرض نقرس (گھٹیا) لاحق ہو گیا تھا، اس کی وجہ سے ہاتھ پاؤں مفلوج اور بیکار ہو گئے تھے، اور وہ چلنے پھرنے اور لکھنے پڑھنے سے بھی بالکل معذور ہو گئے تھے، بعض مورخین کا بیان ہے کہ پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوا، اس سے ان کا نصف جسم شل ہو گیا، پھر گھٹیا کی بیماری ہوئی اور ہاتھ پاؤں حرکت اور جنبش کے لائق نہیں رہ گئے، اس زمانہ میں وہ مستقل خانہ نشین ہو گئے تھے، علما اور طلبہ فن ان سے استفادہ کے لیے یہیں تشریف لاتے تھے، اگر کہیں جانا ہوتا تو ڈولی میں بیٹھ

[1] (قایماز گو امیر موصل الدین غازی بن مودود کا نائب تھا، مگر عملاً وہی سلطان تھا، کیونکہ سیف الدین نے اس کی قابلیت ولیاقت، حسن خدمت اور عمدہ کارگزاری کی وجہ سے تمام معاملات اسی کو سپرد کر دیے تھے۔ (دیکھو ابن خلکان ج ۳ ص ۱۲۷)

Marfat.com

کر جاتے۔

ان کے بھائی عزالدین کا بیان ہے کہ بیماری کے ایام میں بلادمغرب سے ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہنے لگا میں آپ کا علاج کروں گا، اور دوا کی قیمت اس وقت لوں گا جب آپ کو مکمل فائدہ ہو جائے گا، ہم لوگ اس پر راضی ہو گئے، چنانچہ اس نے ایک تیل تیار کر کے علاج شروع کیا، جب قدرے افاقہ ہوا اور ہاتھ پاؤں میں کچھ لچک اور نرمی ہو گئی اور وہ پھیلنے لگے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ ''اسے کچھ معاوضہ دے کر واپس کر دو'' میں نے عرض کیا کہ جب علاج سے فائدہ ہو رہا ہے تو ایسا کیوں کیا جائے؟ انہوں نے کہا کہ ''اس بیماری کی وجہ سے مجھے بڑا آرام وسکون ملا ہے، امراء و روساکے یہاں آمدورفت سے نجات مل گئی ہے، اس سے پہلے ان لوگوں کے یہاں حاضری دینی پڑتی تھی اور خودداری اور عزت نفس کے خلاف کام کرنا پڑتا تھا، مگر اب میں اپنے گھر میں راحت سے بیٹھا ہوں اور نفس کی ذلت و رسوائی سے چھٹکارا مل گیا ہے، حکام و امرا کو ضرورت پڑتی ہے تو خود آکر مجھ سے صلاح ومشورہ کر جاتے ہیں، میرے اس آرام وسکون کا سبب یہی بیماری ہے، اس لیے میں اس کا ازالہ اور علاج کرانا پسند نہیں کرتا، اب عمر ہی کتنی باقی ہے جو کچھ رہ گئی ہے، اسے تو آزادی اور اطمینان کے ساتھ بسر کرنے دو، مجھے اپنی ذلت و محکومی کا پورا پورا بدلہ اور فائدہ مل چکا ہے، ان کی اس تقریر کو سن کر مجھے قائل ہو جانا پڑا اور میں نے ان کے علاج کا ارادہ ترک کر کے اور معالج کو صلہ دے کر واپس کر دیا۔ (تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۴)

وفات:

اسی معذوری اور خانہ نشینی کے زمانہ میں ۶۰۶ھ میں ذی الحجہ کی آخری تاریخ جمعرات کو موصل میں انتقال کیا اور اپنی رباط میں دفن کئے گئے۔ (ایضاو شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۳)

تصنیفات:

علامہ ابن اثیر نے متعدد کتب و رسائل تالیف کئے، ان کی تمام تصنیفات اسلوب بیان اور حسن تحریر کے لحاظ سے دلکش ہیں، بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنی تمام کتابیں معذوری اور خانہ نشینی کے زمانہ میں تالیف کیں، اس زمانہ میں ان کو پوری یکسوئی حاصل تھی، اور طلبہ کا جم غفیر رہتا تھا، ان کو وہ املا کرا دیتے تھے اور طلبہ کتابوں کی مراجعت اور حوالوں کے نقل واقتباس میں ان سے پورا تعاون کرتے تھے۔ (تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۴ و شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۳)

ابن اثیر کی کتابوں کے نام یہ ہیں:

ا۔ کتاب الاذواء والذوات:

اس کا نام کتاب البنین والبنات والآباء والامہات والاذواء والذوات اور المرصع وغیرہ بھی ہے، فن رجال کی کتاب ہے، اس میں ان ناموں کا ذکر اور تشریح ہے جن کی جانب اب، ابن اور ذو وغیرہ منسوب ہیں۔

- یہ کتاب ۱۸۹۶ء میں ویما سے مفصل فہرست کے ساتھ شائع ہوئی ہے، سیوطی نے اس کی تلخیص کی تھی۔
(تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۳ ص ۱۰۱ و معجم المطبوعات کالم ۳۴)
- کتاب الانصاف فی الجمع بین الکشاف: یہ چار جلدوں میں کلام مجید کی ضخیم تفسیر ہے۔ اس میں ابو اسحٰق احمد بن ابراہیم ثعلبی

Marfat.com

(م ۴۳۰ھ) کی تفسیر الکشف والبیان اور ابو القاسم جار اللہ محمود بن عمر (زمخشری (م ۵۲۸ھ) کی الکشاف عن حقائق التنزیل کا ماحصل جمع کر دیا۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۱۵۹ وابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۳)

۳ کتاب الباہر فی الفروق فی النحو: یا الفروق والابنیہ، فن نحو میں ہے۔

۴ کتاب البدیع: یہ بھی فن نحو میں ہے اور تہذیب فصول ابن الدہان یا شرح فصول ابن الدھان بھی اس کے نام ہیں، ابو محمد سعید بن مبارک نحوی نے ایک مختصر اور دوسری ضخیم اور مبسوط کتاب لکھی تھی، ابن اثیر نے ان کی تہذیب وتشریح کی ہے، یہ واقعی اسم بامسمّٰی ہے اور اس کی ترتیب وتبویب نہایت عمدہ اور عجیب ہے، (کشف الظنون ج ۲ ص ۱۹۳) طاش کبریٰ زادہ نے البدیع اور تہذیب فصول الدہان کو دو کتابیں بتایا ہے۔ (مفتاح السعادہ ج ۱ ص ۱۱۰)

۵ تحفۃ الرسائل: یہ غالباً فکاہات اور ادبی ظرائف وغیرہ سے متعلق رسائل ہیں جو مختلف النوع اجتماعی وتاریخی فوائد و معلومات پر مشتمل ہیں، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں ۳۵۲ صفحے کا ہے۔ (تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ ص ۱۰۱)

۶ دیوان رسائل: غالباً یہ اور تحفۃ الرسائل ایک ہی رسالہ ہے۔

۷ رسائل فی الحساب: حساب وریاضی میں رسالوں کا مجموعہ ہے۔

۸ کتاب الشافی فی شرح مسند الشافعی: امام شافعی کی مسند کی حدیثوں کی شرح، ان کے معانی کی وضاحت، ان سے مستنبط ہونے والے احکام ومسائل اور لغوی تحقیق اور نحوی مباحث وغیرہ کا ذکر ہے اور تقریباً ایک سو کراسہ پر مشتمل ہے۔
(کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۳)

۹ شرح غریب الطوال: صرف ابن سبکی نے اس کا نام لکھا ہے۔

۱۰ کتاب صنعۃ الکتابۃ: فن انشا میں ہے۔

۱۱ کتاب المختار فی مناقب الاخیار: یہ چار جلدوں میں ہے اور غالباً ابرار واخیار کے مناقب وحالات پر مشتمل ہوگی۔

۱۲ کتاب المصطفیٰ والمختار فی الادعیۃ والاذکار: اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ادعیہ واذکار کا مجموعہ ہے ممکن ہے اس میں وہ دعائیں اور کلمات اذکار ذکر کیے گئے ہوں جو حدیثوں میں وارد ہیں۔

۱۳ النہایہ فی غریب الحدیث والاثر: یہ غریب الحدیث میں مشہور اور بلند پایہ کتاب ہے، علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ اس فن کی مشہور ومتداول اور عمدہ وجامع کتابوں میں النہایہ بھی ہے۔'' (تدریب الراوی ص ۱۹۳) طاش کبریٰ زادہ لکھتے ہیں کہ ''اس موضوع پر ایسی عمدہ اور بے نظیر کتاب نہیں لکھی گئی۔'' (مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۱۱۰) اس میں متقدمین کی کتابوں کا ماحصل جمع کر کے اس پر مفید اضافہ کیا گیا ہے، خصوصاً ہروی اور ابو موسیٰ مدینی اصفہانی کی کتابوں سے جو اس فن کی امہات کتب میں ہیں، یہ ماخوذ ومنقول ہے، ابن اثیر نے ان کتابوں کے حوالے بھی دیے ہیں۔

النہایہ کو لغت کی کتابوں کے انداز پر حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق مرتب کیا گیا ہے اور اس میں حدیثوں کے مشکل اور غریب الفاظ کو ذکر کر کے ان کے معانی بیان کیے گئے ہیں اور ہر لفظ کی تشریح سے پہلے حدیث کا وہ ٹکڑا بھی نقل کیا گیا ہے جس میں یہ لفظ آیا ہے، لغات کی تحقیق وتشریح کے لیے دوسری حدیثوں سے نظائر اور ائمہ لغت اور شارحین حدیث کے بیانات بھی نقل کیے گئے ہیں۔

Marfat.com

اس میں صرف صحاح کی حدیثوں ہی کے مشکل الفاظ کی تشریح نہیں کی گئی ہے بلکہ سنن، جوامع، مسانید اور مصنفات وغیرہ کی حدیثوں کے غریب الفاظ بھی درج ہیں، شروع میں ایک مقدمہ ہے، اس میں الفاظ حدیث کی معرفت کی ضرورت رسول اکرم ﷺ کی فصاحت و بلاغت، فتوحات کے بعد اہل عرب کے دوسری قوموں سے اختلاط کے نتیجہ میں غیر زبانوں کے الفاظ کے عربی زبان میں داخل ہونے اور اس فن کی مشہور اور اہم کتابوں کے خصوصیات وغیرہ کا ذکر ہے۔ (مقدمہ النہایہ ص ۲ تا ۴)

النہایہ ۱۲۶۹ھ میں طہران سے ایک ضخیم جلد میں چھپی تھی، ۱۳۰۸ھ میں قاہرہ سے چار جلدوں میں شائع ہوئی، اس ایڈیشن میں حاشیہ پر امام راغب اصفہانی کی مفردات اور ابو احمد عسکری کی تصنیفات المحدثین بھی شامل تھیں، ۱۳۱۱ھ میں مصر کے مطبع عثمانیہ نے اس کو چار جلدوں میں عبد العزیز بن اسماعیل طحطاوی انصاری کی تصحیح کے بعد شائع کیا ہے، اس کے حاشیہ پر علامہ سیوطی کی تلخیص الدر النثیر بھی چھپی ہے اور ۱۳۲۲ھ میں مطبع خیریہ نے اس کو چار جلدوں میں شائع کیا ہے، (معجم المطبوعات ج ۱ کالم ۳۵ و اکتفاء القنوع ص ۱۳۱) اس کی بعض تلخیصوں اور مختصر کے نام یہ ہیں:

۱ محمود بن ابو بکر ارموی (م ۷۲۳ھ) نے اس کا ذیل لکھا جو دراصل النہایہ کا تکملہ ہے۔

۲ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے اس کی تلخیص کی، اس کا نام الدر النثیر ہے، یہ النہایہ کے حاشیہ پر مطبع عثمانیہ سے ۱۳۱۱ھ میں شائع ہو چکی ہے، اس میں اصل کے حشو و زوائد اس طرح حذف کیے گئے ہیں کہ متن کی کوئی بات چھوٹنے نہیں پائی ہے، علاوہ ازیں ابن اثیر نے جن باتوں کو نظر انداز کر دیا تھا، اس میں ان کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔

۳ علامہ سیوطی نے النہایہ کا ذیل بھی لکھا تھا۔

۴ عیسیٰ بن محمد صفوی (م ۹۵۳ھ) نے مختصر لکھا تھا جو اصل کتاب کے نصف حجم کے برابر ہے۔

۵ شیخ علی بن حسام الدین الہندی المعروف بالمتقی نے مختصر لکھا۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۶۲۱)

۱۴۔ جامع الاصول فی احادیث الرسول: یہ علامہ ابن اثیر کی سب سے مشہور و مقبول کتاب ہے، اس میں انہوں نے حدیث کی چھ امہات کتب کی روایتوں کو جمع کیا ہے، اور یہ دس جزوں پر مشتمل ہے، ان سے پہلے رزین بن معاویہ نے بھی اسی نوعیت کی کتاب مرتب کی تھی اور اس کو بڑی شہرت و قبولیت بھی حاصل ہوئی تھی، ابن اثیر کی کتاب دراصل اس کا تکملہ ہے، علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں، اس میں صحاح ستہ کی روایتوں کو جمع کیا گیا ہے، یہ اگرچہ رزین بن معاویہ کی کتاب کی طرح ہے، مگر اس میں بے شمار اضافے کیے گئے ہیں، (ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۳) خود ابن اثیر لکھتے ہیں۔

"امام رزین کی کتاب بڑی جامع اور نہایت مفید ہے، کیونکہ انہوں نے اس میں امہات کتب یعنی صحاح ستہ کی روایات کو جمع کیا ہے، اس لیے مجھ کو اس سے بڑا اشتغال ہو گیا، لیکن تتبع سے معلوم ہوا کہ اس میں بعض حدیثیں ایسے ابواب میں ذکر کی گئی ہیں جن کو دوسرے باب میں ذکر کرنا زیادہ بہتر تھا اور بعض حدیثوں کے نقل میں تکرار سے کام لیا گیا ہے اور بعض کو سرے سے نقل ہی نہیں کیا گیا ہے، علاوہ ازیں بعض ایسی حدیثیں بھی مجھ کو ملیں جو اصل ماخذ یعنی صحاح میں موجود نہیں ہیں، اس کی وجہ نسخوں کا فرق، حدیثوں کے طرق کا اختلاف اور مصنف کا اپنی کتاب کی ترتیب میں صحیح بخاری پر اعتماد ہے، ان ہی اسباب کی بنا پر مجھ کو رزین کی کتاب کی ترتیب و تہذیب اور اس میں صحاح کی ان روایتوں کا اضافہ کر دینے کا خیال ہوا جو اس میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں۔"
(کشف الظنون ج ۲ ص ۳۵۹)

Marfat.com

اس لحاظ سے اس کی نوعیت گویا خود ایک مستقل کتاب کی ہوگئی ہے اور گورزین کو تقدم کا شرف ضرور حاصل ہے مگر ابن اثیر کی کتاب اس کے مقابلہ میں زیادہ جامع اور مستند ہے، چنانچہ صاحب تیسیر الوصول لکھتے ہیں:

"میں قدیم وجدید ائمہ فن کی اکثر کتب حدیث سے واقف ہوں مگر مجھ کو جامع الاصول سے زیادہ جامع اور عمدہ کوئی کتاب نظر نہیں آئی، مصنف نے اس کو بڑی خوبی اور عمدہ ڈھنگ سے مرتب کیا ہے اور یہ گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے۔ (مقدمہ تیسیر الاصول)

جامع الاصول کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ یہ حدیث کی چھ مستند و معتبر کتابوں کی جامع ہے، یعنی مؤطا امام مالک،[1] صحیحین، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور سنن نسائی وغیرہ کی روایات واحادیث کا یہ مجموعہ ہے، اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کو اسلامیات کی اہم اور حدیث کی بنیادی کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے، بعض علما کا خیال ہے کہ اس طرز پر ایسی عمدہ کتاب نہ پہلے لکھی گئی ہے اور نہ آئندہ لکھی جائے گی۔ (مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۱۱۰)

ابن اثیر نے محض صحاح ستہ کی حدیثوں کو جمع کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان کی شرح بھی کی ہے اور ان کے فنی مسائل ومشکلات اور ان سے متعلقہ مباحث کی جانب بھی اعتنا کیا ہے اور حدیثوں سے مستنبط ہونے والے احکام بھی تحریر کیے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

"ابن اثیر نے جامع الاصول میں صحاح ستہ کی حدیثوں کو جمع کیا ہے اور غریب الفاظ کی شرح اور مشکلات کو ضبط بھی کیا ہے، اور روایان حدیث کے ناموں اور دوسرے متعلقات فن کو بھی بیان کیا ہے، اس لحاظ سے یہ گویا صحاح ستہ کی شرح ہے جس طرح مشارق الانوار طبقہ اولیٰ کی تینوں کتابوں (مؤطا اور صحیحین) کی شرح ہے۔" (عجالہ نافعہ مع فوائد ص ۴)

خود ابن اثیر فرماتے ہیں:

"رزین کی کتاب کی تہذیب وترتیب ابواب اور اس پر اضافے کے علاوہ اس میں غریب الفاظ کی شرح اور اعراب ومعانی کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔" (کشف الظنون ج ۱ ص ۳۵۹)

جامع الاصول مندرجہ ذیل تین حصوں میں ہے: ۱۔ مبادی، ۲۔ مقاصد، ۳۔ خاتمہ۔

پہلے حصہ میں چار فصلیں اور ایک مقدمہ ہے، مقدمہ میں علم حدیث کے اصول وقواعد اور اصطلاحات وغیرہ کا ذکر ہے اور فصلوں میں علم حدیث کی نشرواشاعت اور جمع وتدوین، کتب حدیث کی تصنیف وتالیف کے اغراض ومقاصد، متاخرین کے متقدمین محدثین کی کتابوں کے خلاصے مرتب کرنے اور جامع الاصول کے مقصد تصنیف وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔

کتاب کی تبویب وترتیب کے متعلق مصنف کا خود بیان ہے کہ:

"میں نے مسانید کے بجائے اس کو ابواب پر مرتب کیا ہے اور ابواب معانی کے لحاظ سے قائم کیے گئے ہیں، پس جو حدیث کسی ایک ہی معنی پر دلالت کرتی ہے اس کو میں نے اسی کے باب میں شامل کیا ہے لیکن اگر حدیث گوناگوں معانی پر مشتمل ہے تو اس کو میں نے آخر میں ایک مستقل کتاب کے اندر ذکر کیا ہے اور اس کا نام کتاب اللواحق رکھا ہے، میں نے جملہ کتب کو ابواب وفصول میں احادیث کے معانی کے اختلاف کے اعتبار سے تقسیم کر دیا ہے اور چونکہ کتب کی تعداد زیادہ ہے، اس لیے ان کو میں نے حروف پر مرتب کیا ہے، چنانچہ کتاب الایمان والاسلام اور کتاب الایلا کو الف کے بیان میں رکھا ہے، حرفوں کے آخر کے لحاظ سے ایک ایسی

[1] (ابن اثیر نے سنن ابن ماجہ کے بجائے مؤطا امام مالک کو صحاح ستہ میں شامل کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں والحق معہ، یعنی صحیح قول ابن اثیر کا ہے، اس کے متعلق مفصل بحث اس کتاب کی پہلی جلد میں امام ابن ماجہ کے تذکرہ میں گزر چکی ہے)۔

Marfat.com

فصل قائم کی گئی ہے جس سے کتاب کے ابواب کے مواضع ومقامات پر استدلال کیا جاسکتا ہے، ہر اثر وحدیث کے راوی کا نام بھی کتاب کے حاشیہ پر حدیث کے مقابل میں اس کے شروع ہی میں دے دیا ہے، پھر ائمہ صحاح میں سے جس نے اس روایت کی تخریج کی ہے، اس کے نام کو ظاہر کرنے والی علامت بھی دیدی ہے، متن کے محتاج تشریح الفاظ وکلمات کو حاشیہ پر ذکر کر کے ان کی تشریح کردی ہے، میں نے حدیثوں کی سندوں کو حذف کردیا ہے اور محض صحابی کے نام لکھنے پر اکتفا کیا ہے اور آثار کے سلسلہ میں اس شخص کا نام ذکر کیا ہے جس نے صحابی سے اس کی روایت کی ہے، ہر کتاب کے آخر میں ایک علیحدہ باب کے اندر تمام مذکورین کے ناموں کو حروف تہجی کے مطابق جمع کیا گیا ہے، رہا متن تو اس میں صرف حدیث یا اثر ہی کو درج کیا گیا ہے، تابعین اور ائمہ کے اقوال شاذ ونادر ہی نقل کیے گئے ہیں، البتہ امام رزین نے اپنی کتاب میں امام مالک کی فقہ کا ذکر کیا ہے۔ (کشف الظنون ج ا ص ۳۵۹)

جامع الاصول کی اہمیت کی وجہ سے اس کے کئی مختصرات لکھے گئے ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

۱ ابو جعفر محمد مروزی استر آبادی نے ۶۸۲ھ میں جامع الاصول کو مختصر کیا تھا، اس وقت ان کی عمر ۶۹ سال تھی، اس کی ترتیب اصل کتاب ہی کے نہج کے مطابق ہے۔

۲ شرف الدین ابو القاسم ہبۃ اللہ بن عبد الرحیم بازری حموی شافعی (م ۷۳۸ھ) کا مختصر جو تجرید جامع الاصول کے نام سے موسوم ہے، مصنف نے اس میں غریب کی شرح، اعراب کی وضاحت اور تکرار وغیرہ کو حذف کردیا ہے، یہ ربع کتاب کے بقدر ہوگی اور حسن اختصار اور قابل استناد ہونے کی وجہ طلبہ سے فن میں متداول ہے۔

۳ شیخ صلاح الدین خلیل بن کیلکلدی علائی دمشقی (م ۷۶۱ھ) کا مختصر جو تہذیب الاصول کے نام سے مشہور ہے۔

۴ شیخ عبد الرحمٰن بن علی الشہیر بابن الربیع الشیبانی (م ۹۴۴ھ) نے تیسیر الوصول الیٰ جامع الاصول کے نام سے اس کا مختصر لکھا، یہ مختصر ہونے کے باوجود نہایت عمدہ ہے، مصنف کا خود بیان ہے کہ "یہ اصل کے ثلث کے بقدر ہے اور اختصار کے ساتھ ساتھ حسن بیان اور لطف عبارت کو مدنظر رکھا گیا ہے، مصنف نے جن مباحث کو مفصل اور زیادہ شرح وبسط کے ساتھ لکھا تھا، ان کا میں نے خلاصہ بیان کردیا ہے۔" اس کی تالیف سے ۹۱۶ھ میں فراغت ہوئی، یہ دو جلدوں میں ہے اور اس کو حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق مرتب کیا گیا ہے، کلکتہ سے ۱۲۵۲ھ میں چھپی تھی، لکھنو کے مطبع منشی نولکشور سے بھی یہ کئی دفعہ چھپی ہے اور ۱۸۹۶ء میں مطبع نولکشور کانپور نے اس کو شائع کیا تھا، نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

"غرض یہ مختصر تعریف وتوصیف سے مستغنی ہے، میرا ارادہ ہے کہ اس کی شرح فارسی زبان میں لکھوں تاکہ اس بہانہ سے پروانہ نجات حاصل کروں اور اللہ کے ہاتھ میں توفیق ہے۔" (اتحاف النبلاء ص ۴۷)

لیکن غالباً نواب صاحب کو اس کی شرح لکھنے کا موقع نہیں ملا۔

۵، ۶ شیخ احمد بن رزق اللہ انصاری حنفی اور علامہ محمد بن طاہر پٹنی نے بھی اس کے مختصر لکھے تھے۔

۷ شیخ مجد الدین ابو طاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی (م ۸۱۷ھ) نے اس کے زوائد مرتب کیے، اس کا نام تسہیل طریق الوصول الیٰ الاحادیث الزائدہ علی جامع الاصول ہے، اس کو ناصر بن اشرف صاحب یمن کے لیے تالیف کیا تھا۔

۸ جامع الاصول کے غریب کے متعلق ایک کتاب محب الدین احمد بن عبد اللہ طبری (م ۶۹۴ھ) نے لکھا تھا۔

(کشف الظنون ج ا ص ۳۶۰ والرسالۃ المستطرفہ ص ۱۲۳)

Marfat.com

امام ضیاء مقدسی

(م ۶۴۳ھ)

نام ونسب:

محمد نام، ابوعبداللہ کنیت اور ضیاء الدین لقب تھا، نسب نامہ یہ ہے: محمد بن عبدالواحد بن عبدالرحمٰن بن اسماعیل بن منصور۔

(شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲۴)

ولادت ووطن:

۵ جمادی الاخریٰ ۵۶۹ھ کو بیت المقدس میں پیدا ہوئے، اسی لیے مقدسی کہلاتے تھے، وہ سعدی اور صالحی کی نسبتوں سے بھی مشہور ہیں مگر اس کی تحقیق نہیں ہوسکی کہ یہ قبائل واشخاص کی جانب نسبتیں ہیں یا مقامات کی طرف۔ (ایضاً)

اساتذہ:

شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابن الاخضر، ابن جوزی، ابن سکینہ، ابوجعفر صیدلانی، ابوالقاسم بوصیری، ابوالمجد البانیاسی، ابوالمظفر سمعانی، ابوالمعالی بن صابر، احمد بن موزینی، عبدالباقی بن عثمان، حافظ عبدالغنی، عبدالمعز بن محمد بزاز، عمر بن علی جوینی، فاطمہ بنت سعد الخیر، مبارک بن معطوس، مؤید طوسی، یحییٰ ثقفی۔

حافظ عبدالغنی کے خاص شاگردوں اور حافظ سلفی، شہدہ اور ابن بری وغیرہ نے ان کو روایت کی اجازت دی تھی۔

(ایضاً وتذکرہ ج ۴ ص ۱۹۷ واتحاف النبلاء ص ۳۶۷ و ۳۶۸)

تلامذہ:

ابن نجار، ابن نقطہ، شرف بن نابلسی، عمر بن حاجب اور فخر بخاری وغیرہ ان کے تلامذہ میں تھے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۹۷ وشذرات الذہب ج ۵ ص ۳۶۵)

رحلت وسفر:

بغداد، دمشق، مصر، ہمدان، اصبہان، مرو، حلب، حران، موصل اور مکہ معظمہ وغیرہ کا سفر کیا اور ان جگہوں کے علماء واصحاب کمال سے استفادہ کیا، اصبہان دو دفعہ گئے اور وہاں کے علماء سے فیضیاب ہوئے، بے شمار اہم کتابیں نقل کیں اور گوناگوں اصول

Marfat.com

وفوائد کی تحصیل کی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۹۷ و شذرات الذہب ج ۵ ص ۳۲۴)

علم وفن سے اشتغال:

ضیاء مقدسی کو علم وفن سے غیر معمولی اشتغال تھا، ابن نجار کا بیان ہے کہ میں نے علم کی طلب و تحصیل کا ان سے زیادہ شوقین کسی کو نہیں پایا۔ ابن رجب فرماتے ہیں کہ انہوں نے پانچ سو سے زیادہ شیوخ کی کتابیں نقل کیں، علم وفن سے غیر معمولی انہماک کی بنا پر انہوں نے کتب خانہ اور ایک مدرسہ قائم کیا تھا، اس کا ذکر آگے آئے گا۔ (ایضاً)

حفظ وضبط:

ان کے حافظ وضابط اور ثقہ وثابت ہونے پر علمائے فن کا اتفاق ہے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ "محدثین نے ان کے حافظہ کی تعریف کی ہے اور زکی برزالی نے ان کو ثقہ، ابن نجار نے متقن، ثابت، ثقہ، حجت، صدوق اور نبیل کہا ہے، ان کے شاگرد عمر بن حاجب کا بیان ہے کہ وہ حفظ وثقاہت میں یکتائے روزگار تھے۔ (ایضاً)

حدیث میں درجہ:

ضیاء مقدسی کا پایہ حدیث میں اس قدر بلند تھا کہ محدث الشام اور شیخ السنۃ کہلاتے تھے، ابن عماد لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے صاحب کمال محدثین اور ائمہ فن میں تھے، متعدد مجموعے اور تخریجات ان سے یادگار ہیں، شریف ابوالعباس حسینی فرماتے ہیں کہ وہ عرصہ دراز تک حدیث کے درس وتدریس کی مسند پر متمکن رہے، اور بے شمار حدیثیں روایت کیں، عمر بن حاجب کہتے ہیں کہ ہمارے استاذ ابوعبداللہ شیخ وقت اور حدیث سے واقفیت میں یکتائے روزگار تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ انہوں نے روایت حدیث میں غیر معمولی طلب وتحری سے کام لیا، مزی کا بیان ہے کہ وہ حافظ عبدالغنی سے حدیث ورجال کے بڑے عالم تھے اور ان کے زمانہ میں ان کے مثل کوئی نہ تھا۔ (تذکرہ ج ۴ ص ۱۹۷ و ۱۹۸ و شذرات ج ۵ ص ۲۲۴)

جرح وتعدیل:

حدیث میں مہارت اور بلند پائیگی کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ جرح وتعدیل کے امام، فن رجال کے ماہر اور احادیث کے علل واسقام اور صحیح وغلط روایات میں نقد وامتیاز کی پوری صلاحیت رکھتے تھے، ابن نجار کا بیان ہے کہ وہ حدیث وفن رجال کے عالم اور رواۃ کے حالات سے باخبر تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ضیاء جرح وتعدیل کے ممتاز عالم، رواۃ ورجال کے احوال کے واقف کار اور روایات واحادیث کے مبصر تھے۔ (تذکرہ ج ۴ ص ۱۹۷ و ۱۹۸ و شذرات ج ۵ ص ۲۲۴)

فقہ وعلوم قرآن:

فقہ اور قرآنی علوم کا ذوق بھی تھا، اہل سیر نے ان کو فقیہ ومجتہد لکھا ہے، قرآنیات میں انہوں نے بعض کتابیں بھی لکھیں۔

فضل وکمال:

ضیاء مقدسی علم وفضل میں نہایت ممتاز تھے، تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ "وہ یگانہ وقت اور ہم عصروں میں فائق وبرتر تھے،

Marfat.com

عمر بن حاجب ان کے بعض علمی کمالات بیان کر کے لکھتے ہیں کہ ”میں ان جیسے بلند پایہ شخص کے کمالات بیان کرنے سے قاصر ہوں۔“ شرف بن نابلسی کہتے ہیں کہ ہمارے استاذ ضیاء کے مانند کوئی شخص صاحب فضل و کمال نہ تھا، صاحب شذرات کا بیان ہے کہ وہ ”یکتائے روزگار تھے، ان کی شہرت محتاجِ بیان نہیں۔“ (شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲۴)

زہد وورع:

زہد وورع، تدین وتقویٰ اور عبادت وریاضت میں بھی ممتاز تھے، محدثین اور علمائے رجال نے ان کے زہد واتقاء، تدین وانقطاع الی اللہ کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ ان علمائے ربانیین میں تھے جو ذکر وعبادت میں اکثر مشغول رہتے تھے، زکی برذالی کا بیان ہے کہ وہ متدین تھے، ابن حاجب فرماتے ہیں کہ وہ ورع وتقویٰ، زاہد، عابد، اکل حلال میں محتاط اور مجاہد فی سبیل اللہ تھے، میری آنکھوں نے عفت، نزاہت اور پاکبازی میں ان کے جیسا آدمی نہیں دیکھا۔ (ایضاً والبدایہ ج ۱۳ ص: ۱۷۰)

سیرت واخلاق:

ان کی طبیعت میں بڑی سادگی اور بے تکلفی تھی اور وہ نہایت متواضع اور خلیق تھے، ابن نجار کا بیان ہے کہ وہ حسن سیرت میں ممتاز اور بے نظیر تھے۔ (ایضاً والبدایہ ج ۱۳ ص ۱۷۰)

مدرسہ کا قیام:

دمشق میں انہوں نے کوہ قاسیون کے دامن میں جامع مظفری کے دروازے پر ایک مدرسہ کی داغ بیل ڈالی، ایک روایت کے مطابق اس مدرسہ کی بناء وتعمیر میں وہ خود کام کرتے اور اس کے لیے تبرعاً کسی سے کوئی چیز قبول نہ کرتے، انہوں نے اپنے کتب خانہ کی کتابیں اس پر وقف کر دی تھیں۔ یہ مدرسہ حدیث کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا تھا اور محتاج وضرورت مند طلبہ اور دور دراز سے آنے والے اس میں تعلیم حاصل کرتے تھے، ان کے بعد بھی یہ قائم رہا اور بعض لوگوں نے اس کے لیے اپنی جائیدادیں وقف کر دی تھیں۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۹۸ وشذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲۵)

فقہی مسلک:

حافظ ابن رجب نے طبقات حنابلہ میں ان کا ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حنبلی المذہب تھے۔

وفات:

۷۴ سال کی عمر میں دوشنبہ ۱۸ / جمادی الاخریٰ ۶۴۳ھ کو انتقال کیا اور جبل قاسیون کے اندر دفن کیے گئے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۹۸ وشذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲۶)

تصنیفات:

ضیاء مقدسی جلیل القدر مصنف تھے، انہوں نے متعدد مفید، عمدہ اور بلند پایہ کتابیں لکھیں، جو ان کے وسعت علم ونظر اور علوم حدیث میں تبحر کی دلیل ہیں جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

Marfat.com

۱۔ کتاب الاحکام: تین جلدوں میں ہے مگر ناتمام ہے، ۲۔ الحکایات المستطرفہ: کئی جزوں میں ہے، ۳۔ الرواۃ عن البخاری ایک جز میں ہے، ۴۔ الطب والرقیات کئی جزوں میں ہے، ۵۔ افراد الصحیح ایک جزو میں ہے، ۶۔ الموبقات کئی جزوں میں ہے، ۷۔ النہی عن سب الصحابہ، ۸۔ الہجرۃ الی الارض الحبشۃ ایک جزو میں ہے، ۹۔ دلائل النبوۃ والالہیات تین جزوں پر مشتمل ہے، ۱۰۔ ذم المسکر ایک جزو، ۱۱۔ سیر المقادسۃ چند جلدوں میں ہے، صاحب شذرات نے غالباً اسی کتاب کا نام سبب ہجرۃ المقادسۃ الی دمشق وکرامات مشائخہم لکھا ہے اور تصریح کی ہے کہ تقریباً دس جزوں میں ہے، اس میں وہاں کے اکابر علما کے حالات وتراجم درج ہیں۔

۱۲۔ شفاء العلیل (ایک جزو) ۱۲۔ صفۃ الجنۃ (تین جزوں میں)، ۱۳۔ صفۃ النار (۲ جزوں میں)، ۱۴ غرائب الحدیث (۹ جزوں میں)، ۱۵۔ فضائل الاعمال (ایک جلد اور چار جزوں میں ہے، اس میں احادیث کی سندیں حذف کر کے ان کے لیے ائمہ کی کتابوں کا حوالہ دیدیا ہے) ۱۶۔ فضائل الشام (تین جزوں میں ہے)، ۱۷۔ فضائل القرآن، ابن عماد نے غالباً اسی کا نام فضائل القراءۃ لکھا ہے، ۱۸۔ قصہ موسیٰ (ایک جزو)، ۱۹۔ کلام الاموات (ایک جزو)، ۲۰۔ مناقب اصحاب الحدیث (شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۲۵ بعض کتاب کا اتحاف النبلاء اعلام اور کشف الظنون میں بھی ذکر ہے) ۴ جزوں میں ہے)، ۲۱۔ المختارۃ فی الحدیث اصل نام الاحادیث الجیاد المختارۃ مما لیس فی الصحیحین او احدھما ہے، یہ بڑی ضخیم کتاب اور تقریباً نوّے اجزا پر مشتمل ہے، مگر مصنف اس کی تکمیل نہیں کر سکے تھے، یہ صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان اور صحیح مستدرک کی طرح کی کتاب اور ان صحیح حدیثوں پر مشتمل ہے جو صحیحین میں درج نہیں ہیں، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں اس میں صحت التزام اور ان صحیح روایتوں کو نقل کیا گیا ہے، جن کی پہلے تصحیح نہیں کی گئی تھی، شاہ عبدالحق صاحب کا بیان ہے کہ ائمہ صحاح کے علاوہ دوسرے علما نے بھی صحیح حدیثوں کے مجموعے مرتب کئے، ضیاء مقدسی کی المختارہ اسی نوعیت کی کتاب ہے، اس میں ان صحیح حدیثوں کی تخریج کی گئی ہے، جو صحیحین میں نہیں ہیں۔

اس کی ترتیب ابواب کے بجائے حروف معجم کے مطابق مسانید پر کی گئی ہے، گو ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم کی کتابوں کی جیسی شہرت المختارہ کو حاصل نہیں ہوئی مگر اس کا نام ان کتابوں کے ساتھ ہی لیا جاتا ہے، بعض علما کے نزدیک مستدرک سے زیادہ اہم اور بلند پایہ ہے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ''یہ عمدہ علوم اور حدیثی فوائد پر مشتمل ہے اور مستدرک حاکم سے بھی بڑھ کر ہے، ہمارے بعض مشائخ اس کو اس پر ترجیح دیتے ہیں کاش یہ مکمل ہوگئی ہوتی۔''

حافظ ابن تیمیہ اور علامہ زرکشی سے منقول ہے کہ ضیاء مقدسی کی تصحیح حاکم کی تصحیح سے عمدہ واعلیٰ ہے، اور زرکشی نے یہ بھی کہا ہے کہ ان کی تصحیح ترمذی وابن حبان کی تصحیح کے قریب قریب ہے۔

علامہ ابن عبدالہادی سے بھی اسی طرح کا بیان منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ''المختارہ میں غلطیاں کم ہیں وہ حاکم کی مستدرک کی طرح نہیں ہے جس میں بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جن کا کذب وموضوع ہونا ظاہر ہے، اسی وجہ سے اس کا درجہ دوسری کتابوں سے کمتر ہے۔'' صحت کے التزام کے باوجود بھی مختارہ میں ضعیف اور کم درجہ کی حدیثیں شامل ہوگئی ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہے، صاحب الرسالۃ المستطرفہ لکھتے ہیں:

Marfat.com

''اس کی اکثر روایتیں مسلم ہیں، اور بہت کم حدیثوں پر تعقب کیا گیا ہے۔''

علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ ''المختارہ کی جو روایتیں صحیحین یا ان میں سے کسی ایک کتاب میں نہیں ہیں اسی طرح صحیح ابو عوانہ میں جو صحیح مسلم پر مستخرج ہے، بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جو اصل کتاب میں نہیں ہیں چونکہ ان زائد حدیثوں میں صحیح، حسن بلکہ ضعیف حدیثیں بھی شامل ہیں اس لیے ان زوائد کے بارے میں حکم لگانے میں احتیاط کرنی چاہیے، المختارہ کا قلمی نسخہ ابن کثیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

(کشف الظنون ج ۲ ص ۳۹۸، البدایہ ج ۱۳ ص ۱۷۰، الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۲ و ۲۳ فتح المغیث ص ۱۴ مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۷۹ و ۱۶۶)

Marfat.com

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۶۷۶ھ)

نام ونسب:

یحییٰ نام، ابوزکریا کنیت اور لقب محی الدین تھا، ان کا نسب نامہ یہ ہے: یحییٰ بن شرف بن مری بن حسن بن حسین بن جمعہ بن حزام۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۲۷۸)

ولادت ووطن:

وہ محرم ۶۳۱ھ میں نوا میں پیدا ہوئے، یہ ملک شام میں حوران کا ایک گاؤں تھا، (ایضاً وتذکرہ ج ۴ ص ۲۶۰) اسی کی نسبت سے وہ نواوی اور نووی مشہور ہیں اور حوران کے تعلق سے حورانی کہلاتے ہیں، حزامی ان کے جداعلیٰ حزام کی جانب نسبت ہے۔ (اتحاف النبلاء المتقین ص ۴۳۹)

اساتذہ:

امام نووی نے جن ارباب کمال سے مختلف علوم کی تحصیل کی تھی ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

ابن مالک، ابواسحاق ابراہیم بن عیسیٰ مرادی، شیخ احمد مصری، تقی الدین بن ابی الیسر، جمال الدین بن صیرفی، رضی بن برہان، زین الدین خلف بن یوسف، زین الدین بن عبدالدائم، شمس الدین بن ابی عمر، شمس الدین عبدالرحمٰن بن نوح، عبد العزیز بن محمد انصاری حموی، عبدالغنی علاؤ الدین، عزالدین بن خالد، عزالدین عمر بن سعد اربلی، عماد الدین عبدالکریم الخرستانی، شیخ کمال بن احمد، قاضی تفلیسی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۰ و ۲۶۱)

تلامذہ:

ان سے سماع اور تخریج کرنے والے کچھ مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں:

ابن ابی الفتح، شیخ ابوالحجاج مزی، شہاب الدین احمد بن جعوان، خطیب صدر سلیمان جعفری، شمس الدین بن نقیب، شہاب الدین اربدی، علاؤالدین بن عطار شیخ مبارک ناسک، جبریل کردی، قاضی محی الدین مزرعی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۰)

سیروسیاحت:

امام نووی پہلے (۶۴۹ھ) میں دمشق تشریف لے گئے اور رواحیہ میں قیام کر کے باقاعدہ علم وفن کی تحصیل شروع کی، دو

Marfat.com

سال بعد وہ اپنے والد کے ہمراہ حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے اور ڈیڑھ ماہ تک مدینہ کے فضلا سے استفادہ کرتے رہے، پھر وہ وہاں سے واپسی کے بعد اپنے وطن میں پورے انہماک کے ساتھ تعلیم میں مشغول ہو گئے، آخر میں بیت المقدس کی زیارت کی۔ (ایضاً)

حفظ وضبط:

ائمہ فن اور تذکرہ نگاروں نے ان کے حفظ وضبط اور عدالت وثقاہت کا اعتراف کیا ہے اور ان کو متقن، حجت اور ثقہ وثبت لکھا ہے۔

حدیث میں بلند پائیگی:

امام نووی کو علم حدیث اور اس کے متعلقات سے غیر معمولی شغف تھا اور وہ اکابر محدثین اور ممتاز شراح حدیث میں شمار کیے جاتے ہیں، علمائے طبقات وتراجم نے ان کو حدیث میں ماہر فن اور امام وغیرہ بتایا ہے۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ''وہ حدیث وفنون حدیث کے حافظ وتبحر عالم، رجال واسناد اور صحیح وسقیم حدیثوں کی پرکھ کے ماہر تھے، یافعی نے انہیں حدیث میں وسیع النظر اور کثیر المعرفت لکھا ہے، حدیث میں ان کی بلند پائیگی اور عظمت کی بنا پر ان کو حافظ ابوشامہ جیسے جلیل القدر محدث کا جانشین مقرر کیا گیا اور ان کی وفات کے بعد دار الحدیث دمشق کی تولیت وصدارت کے منصب پر فائز کیا گیا، اس ذمہ داری کو وہ عمر بھر انجام دیتے رہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۲ ومرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۲، ۱۸۲)

فقہ وافتاء:

حدیث ہی کی طرح فقہ وافتاء میں بھی ممتاز تھے اور اس میں ان کی معلومات وسیع اور نظر گہری تھی، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے اکابر فقہا اور شوافع کے شیوخ میں تھے، یافعی کا بیان ہے کہ ان کو فقہ کی معرفت میں امتیاز حاصل تھا اور وہ معتمد اور لائق اعتبار مفتی تھے، ابن ناصر الدین نے ان کو فقیہ الامت کہا ہے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ''امام شافعی کے مذہب کی انہوں نے گوناگوں خدمات انجام دی ہیں، اس کی تحقیق وتصحیح، ضبط وتنقیح، تحریر وتدوین اور ترتیب وتہذیب میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے اور اس مذہب کے وہ چوٹی کے علما میں تھے، رافعی کے بعد اس مذہب میں ان سے زیادہ صاحب کمال اور ممتاز شخص کوئی نہیں گزرا۔''

امام نووی شافعی المذہب ہونے کے باوجود درجہ اجتہاد پر فائز تھے اور بعض مسائل میں ان کے اقوال اپنے مذہب کے علما سے مختلف ہوتے تھے، جن مسائل میں انہوں نے رافعی سے اختلاف کیا ہے، ان میں سے اکثر میں ابن سبکی اور یافعی نے ان کو مصیب بتایا ہے۔ (ایضاً وطبقات الشافعیہ سبکی ج ۵ ص ۱۶۷ والبدایہ ج ۱۳ ص ۲۷۸)

قرآنیات:

بچپن ہی سے ان کو کتاب الٰہی سے خاص انس تھا اور انہوں نے اسے زبانی یاد کر لیا تھا، ہر وقت اس کی تلاوت کرتے اور دنیوی کاموں میں مشغولیت کے وقت بھی قرآن مجید زبانی پڑھا کرتے تھے، قراءت وتجوید اور علم تفسیر کی مشاہیر فضلا سے تحصیل

Marfat.com

کی تھی۔ (طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۳۵۷، البدایہ ج ۱۳ ص ۲۷۱)

لغت، عربیت اور نحو وصرف:

گو امام نووی کی اصل توجہ حدیث وفقہ اور ان سے متعلقہ علوم کی جانب مرکوز رہی لیکن لغت وعربیت، نحو وصرف اور منطق وفلسفہ وغیرہ سے بھی اشتغال رکھتے تھے اور ان فنون کے ماہرین سے ان کی تحصیل کی تھی۔

جامعیت:

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جامع کمالات اور متعدد علوم پر دسترس رکھتے تھے، فخر حنبلی کا بیان ہے کہ وہ تمام علوم میں پختہ تھے، یافعی کا بیان ہے کہ فقہ وحدیث کے علاوہ دیگر فنون کے بھی وہ ماہر وواقف تھے۔

(تذکرہ ج ۴ ص ۲۶۴ ومرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۴)

انہماک فی العلم:

وہ شب وروز علم کی تحصیل اور درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور اشاعت علم وفن میں مشغول رہتے، ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتے، راستہ چلتے وقت بھی پڑھنے کا سلسلہ موقوف نہ کرتے، مدتوں اس حال میں گزرا کہ پہلو زمین پر رکھ کر اطمینان اور چین سے سونا نصیب نہ ہوا، بچپن میں بھی ان کو لکھنے پڑھنے کی دھن کے سوا اور کسی چیز سے کوئی رغبت نہ تھی، ان کے ہم سن لڑکے ان کو کھیلنے کے لیے مجبور کرتے تو وہ بھاگنے کی کوشش کرتے اور اگر مجبوراً ان کے ساتھ رہنا پڑتا تو قرآن مجید زبانی پڑھا کرتے، ایک دفعہ ان کے والد نے انہیں ایک دکان پر کردیا مگر بیع وشرا کی مشغولیت کے باوجود ان کے علمی ذوق وشوق میں کمی نہ آئی، ان کے اسی شوق اور دلچسپی کی وجہ سے یاسین بن یوسف زرکشی نے بچپن ہی میں ان کے متعلق یہ پیشینگوئی کی تھی کہ آئندہ یہ بچہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا عالم وزاہد ہوگا اور لوگوں کو اس سے بڑا فیض پہنچے گا، ان کے علمی انہماک کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ امام نووی روزانہ بارہ فنون کا سبق لیتے تھے، پہلا سبق حدیث کی شرح وتحقیق کا ہوتا اور بقیہ اسباق کی تفصیل یہ ہے:

دو سبق کتاب الوسیط کے، ایک سبق مہذب کا، ایک الجمع بین الصحیحین کا، چھٹا سبق صحیح مسلم کا، ساتواں ابن جنی کی کتاب اللمع کا، آٹھواں ابن السکیت کی اصلاح المنطق کا، نواں صرف کا، دسواں اصول فقہ کا، گیارہواں اسماء الرجال کا اور بارہواں اصول دین کا ہوتا تھا۔

اسباق اس شوق ومحبت سے پڑھاتے کہ کسی قسم کا کوئی اشکال باقی نہیں رہ جاتا تھا۔

اس سے ان کی غیر معمولی ذہانت وفطانت کا بھی پتہ چلتا ہے، ان کے کثرتِ اشتغال اور ذہانت ہی کی وجہ سے ان کے کاموں میں بڑی برکت ہوئی اور ۴۵ سال کی مختصر عمر میں انہوں نے متنوع علمی کمالات اور گوناگوں اہم خدمات انجام دیئے، ساڑھے چار مہینہ کے اندر شافعی مذہب کی اہم اور جامع کتاب التنبیہ کو نہ صرف ختم کردیا بلکہ زبانی یاد بھی کر ڈالا۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۰، ۲۶۱ و ۲۷۰، مرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۳، طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۶۶ وشذرات الذہب ج ۵ ص ۳۵۵، ۳۵۰)

Marfat.com

درس وتدریس:

انہوں نے مختلف مدارس میں درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دیئے اور دارالحدیث اشرفیہ کے منصب صدرات پر بھی فائز رہے، اسی طرح مدرسہ اقبالیہ میں ابن خلکان کے جانشین مقرر کئے گئے اور ان کی وفات کے بعد درس وتدریس کی خدمت انجام دی۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۲۷۹)

زہد واتقاء:

امام نووی بڑے متدین اور عابد وزاہد شخص تھے، برابر عبادت، ذکر الٰہی اور اوراد ووظائف میں مشغول رہتے تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ تصنیف وتالیف کے ساتھ انہوں نے مجاہدہ وتزکیہ نفس، مراقبہ وتصفیۂ باطن تقویٰ، طہارت اور معمولی اور جزئی باتوں میں احتیاط کو اپنے اوپر لازم کر لیا تھا اور اپنی خواہشات نفس کو یکسر پامال کر دیا تھا، یافعی کا بیان ہے کہ وہ عابد وزاہد، متورع، باعمل، شب بیدار، حامی دین اور ناصر سنت تھے، عبادت وطاعت، تلاوت قرآن اور تصنیف وتالیف میں ان کا تمام وقت بسر ہوتا، دنیا اور اس کے تعیشات سے بالکل دست کش رہتے اور تمام تر توجہ دین بنانے پر مرکوز رکھتے تھے، زہد وقناعت، اتباع سنت، اقتدائے سلف، نیکی وصلاح اور خیر خیرات کے کاموں میں لگے رہنا ان کی زندگی کا دستور تھا، ورع وتقویٰ میں بے مثال تھے، راتیں عبادت میں گزرتیں اور اس قدر روتے کہ داڑھی اور چہرہ تر بتر ہو جاتا ان کی طرح کسی شخص کو زہد وعبادت، حزم واحتیاط اور لوگوں سے حذر واجتناب پر قابو نہیں ہو سکتا فخر حنبلی کا بیان ہے کہ وہ بڑے متقی اور پرہیز گار تھے، اکثر روزے رکھتے اور دوبار حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، اسی دینی جذبہ اور تورع کی وجہ سے انہوں نے اپنی زندگی اسلامی علوم خصوصاً حدیث و سنت کی خدمت واشاعت میں گزاری اور ان کی اصل دلچسپی کا مرکز فقہ وحدیث تھا، دوسرے علوم سے عدم رغبت ہی نہیں ایک گونہ انقباض ہوتا تھا جیسا کہ وہ خود بیان کرتے ہیں۔

ایک دفعہ مجھ کو طب پڑھنے کا خیال ہوا، اس لیے میں نے شیخ کی قانون خریدی مگر میرے دل پر ایسی ظلمت چھائی اور میرا حال ایسا ہوا کہ مجھ کو اس سے کسی قسم کا اشتغال ہی نہ ہو سکا، میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا سبب میرا طب کی جانب اعتنا ہے، یہ خیال آتے ہی میں نے کتاب قانون فروخت کر دی اور پھر میرا قلب منور ہو گیا۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۰ و ۲۶۱ و مرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۱ تا ۱۸۶)

سادگی وقناعت:

زہد واتقاء کی بنا پر وہ نہایت صبر وقناعت کی زندگی گزارنے کے عادی ہو گئے تھے، کھانے، پینے رہنے سہنے، لباس اور پوشاک ہر چیز میں سادگی پسند کرتے تھے، تکلف، آرائش اور دنیاوی تعیشات سے ان کو سخت نفرت تھی، حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

"وہ بڑی عسرت وشقت کی زندگی گزارتے اور بالکل موٹا جھوٹا کھاتے پہنتے تھے، ان کی پوشاک کورا لٹھا اور چھوٹا سا شیخانیہ عمامہ تھا۔"

ابن عماد کا بیان ہے کہ وہ نہایت قانع اور تھوڑے پر گزر اوقات کرنے والے تھے، اللہ کا دیا جو کچھ میسر آ جاتا اسی پر راضی رہتے، معمولی لباس، موٹا جھوٹا کھانا اور مختصر ساز وسامان پر اکتفا کر لیتے تھے، قطب الدین یونینی فرماتے ہیں کہ تقلیل وقناعت اور عسرت وتنگی میں ان کی کوئی مثال نہ تھی۔

Marfat.com

کم خوری کے اس قدر عادی تھے کہ اکثر روزے رکھتے اور شب و روز میں صرف ایک دفعہ عشا کے بعد کھانا کھاتے اور سحر کے وقت پانی پیتے، کبھی ان کے کھانے میں دو قسم کا سالن نہیں ہوتا تھا، پھل اور میوہ جات اہل دمشق کی مرغوب غذا تھی، مگر بعض قباحتوں کی وجہ سے وہ تورعاً ان کا استعمال نہیں کرتے تھے، دارالحدیث کے منصب صدرات پر فائز ہونے کے باوجود اس کے معاوضہ میں ایک حبہ بھی نہیں لیا بلکہ ان کے والد جو روٹی اور انجیر وغیرہ بھیج دیتے اسی پر قناعت کرتے تھے، فخر حنبلی کا بیان ہے کہ مرغوب اور لذیذ کھانا چھوڑ کر محض اپنے والد کی بھیجی ہوئی روٹی اور انجیر کھاتے تھے، کسی کا ایک درہم بھی قبول نہ کرتے، معمولی اور پیوند لگے کپڑے اور پھل نہیں کھاتے تھے، کم خوری کے اس لیے عادی تھے کہ رات میں نیند نہ آئے اور اطمینان وسکون کے ساتھ خدا کی عبادت کر سکیں، علامہ ذہبی اپنے شیخ رشید ابن معلم سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے شیخ محی الدین کو حمام میں نہ جانے، موٹا جھوٹا کھانے اور پہننے اور سخت کوشی اور تنگی و ترشی کی زندگی بسر کرنے پر ملامت کی اور کہا کہ اس سے آپ کو بیماری لاحق ہوجائے گی اور آپ علمی اشغال کے لائق نہ رہ سکیں گے تو وہ کہتے کہ اللہ کے فلاں بندے کا بھی تو مسلسل روزہ رکھنے کی وجہ سے جسم زرد ہوگیا تھا۔

نووی کا بیان ہے کہ میں جسم کی تروتازگی اور نیند کی زیادتی کے ڈر سے پھل، ترکاری، سبزی اور عمدہ کھانے سے پرہیز کرتا ہوں، ابن عطار نے فواکہ استعمال نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ دمشق کی اراضی کے بارے میں مجھ کو بعض شبہے ہیں، اس لیے ان کے استعمال میں تردد ہوتا ہے۔

چونکہ ان کی زندگی بڑی سادہ تھی اور وہ کوئی اہتمام و تکلف پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے ان کو دوسرے لوگوں کو اپنے یہاں کھانے کے لیے مدعو کرنے میں زحمت اور تکلف ہوتا تھا، چنانچہ ایک دفعہ شیخ برہان الدین اسکندرانی نے ان کے یہاں افطار کرنے کی خواہش کی تو انہوں نے ان سے بڑی صفائی اور بے تکلفی سے کہہ دیا کہ آپ اپنے یہاں سے کھانا لے کر آجایئے گا، ہم سب لوگ مل کر افطار کرلیں گے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۱ تا ۲۶۴، مرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۴ شذرات الذہب ج ۵ ص ۳۵۶)

ہدیے اور تحفے نہ قبول کرنا:

ہدایا اور تحائف قبول نہ کرتے تھے، خصوصاً غیر متعلق لوگوں کے ہدیے لینے میں انہیں سخت پس و پیش ہوتا تھا، البتہ جن لوگوں سے واقفیت ہوتی تھی اور ان کے ہدایا کے بارے میں اطمینان ہوتا، ان کو لینے میں زیادہ پرہیز نہ کرتے، چنانچہ ایک دفعہ ایک فقیر نے ہدیہ کیا تو اس کو قبول کرلیا، احتیاط اور تورع کی بنا پر ہدیے کی طرح معاوضہ لینے سے بھی پرہیز تھا، مدرسہ کی ملازمت کے باوجود وہاں سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۲)

صبر و استقلال:

صبر و استقلال میں بے مثال تھے، مصائب اور مشقتوں کو خندہ پیشانی سے انگیز کرتے اور زبان سے اف نہ کرتے، جن چیزوں کو انہوں نے اپنا معمول بنالیا تھا ان پر ہمیشہ سختی سے قائم رہے اور ان میں کبھی کوئی فرق نہ آنے دیا، انہوں نے سخت تکلیفیں جھیلیں مگر ان کے شوق و انہماک اور علم کی طلب و جستجو میں کوئی کمی نہ آئی۔ (ایضاً مرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۲ و ۱۸۵)

Marfat.com

اخلاق وعادات:

سیرت وکردار کے لحاظ سے بھی بڑے ممتاز تھے، یافعی فرماتے ہیں کہ بخدا وہ بہترین اوصاف وخصائل اور پاکیزہ سیرت واخلاق سے متصف اور محاسن وکمالات میں عدیم النظیر تھے۔ (ایضاً ص ۱۸۵ و۱۸۶)

تصوف:

امام نوویؒ بادۂ معرفت کے لذت شناس اور مشہور صوفی یٰسین بن یوسف زرکشی کے حلقہ بگوش اور عقیدت مند تھے، سلوک کے آداب اور طریقت کے اشارات ان ہی سے سیکھتے تھے، صوفیہ ومشائخ سے بڑی محبت وعقیدت رکھتے تھے، پورے شوق سے ان کی صحبتوں میں حاضر ہوتے تھے، تصوف اور صوفیہ کے مخالفین پر برہمی کا اظہار کرتے تھے، کتاب الاذکار میں صوفیہ کی جماعت کے گوناگوں فضائل بیان کر کے دکھایا ہے کہ یہی اس امت کے منتخب اور عمدہ لوگ ہیں، نووی کی کرامت اور بزرگی کے بعض واقعات بھی منقول ہیں۔ (ایضاً ص ۱۸۵ و۱۸۶)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر:

وہ فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ادائیگی سے کبھی غافل نہیں رہے، امراء وسلاطین کو بھی معروف کی تلقین کرتے اور منکر سے روکتے تھے، اس معاملہ میں بڑے جری اور بے باک تھے اور اس میں کسی مصلحت ومداہنت کے قائل نہ تھے، حق گوئی کی پاداش میں ان کو امرا کے غیظ وغضب کا نشانہ بھی بننا پڑا، علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ''وہ گوناگوں مصروفیتوں اور علمی اشتغال کے باوجود اصلاح خلق اور امر بالمعروف کا فریضہ بھی انجام دیتے، بادشاہوں اور ظلم وجفا پرور لوگوں کے روبرو حق بات کہتے اور ان کے غلط کاموں پر سخت ردونکیر فرماتے، انہوں نے سلاطین وامرا کو خطوط لکھ کر امور خیر کی تلقین اور معاصی سے بچنے کی دعوت دی۔'' ایک دفعہ ملک ظاہر کو ایک خط لکھا تو وہ سخت برہم ہوا اور گرفتار کرنا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے تشدد سے ان کو بچا لیا، بعد میں یہی ملک ظاہر ان کا معتقد ہوگیا اور بڑی تعظیم وتکریم کرنے لگا۔

(مرأۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۳ و شذرات الذہب ج ۵ ص ۳۵۶)

متانت ووقار:

بڑے سنجیدہ وباوقار تھے، بچپن ہی سے نہایت متین اور شائستہ تھے، کھیل کود اور لہو ولعب سے کوئی رغبت نہ تھی، یاسین بن یوسف فرماتے ہیں کہ میرے دل میں نووی کی عظمت کا نقش اس وقت سے ثبت ہے جب وہ دس سال کے تھے، بچے ان کو کھیل کود کے لیے مجبور کرتے مگر یہ بھاگنے کی فکر میں رہتے، بحث ومباحثہ اور مناظرہ وغیرہ میں بھی متانت، اور وقار سے کام لیتے۔

(طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۶۶ و شذرات الذہب ج ۵ ص ۳۵۶ و اتحاف النبلاء ص ۴)

اعتراف فضل وکمال:

امام نووی کی عظمت وکمال اور جامعیت کے بارے میں علمائے فن اور مورخین کا اتفاق ہے، حافظ ذہبی نے ان کو امام، حافظ یکتائے روزگار، قدوہ، شیخ الاسلام اور سرتاج اولیاء وغیرہ کہا ہے، ابن فرح فرماتے ہیں، ان میں تین خوبیاں تھیں، جن میں

Marfat.com

سے اگر ایک بھی کسی کے اندر ہو تو لوگ اس کے پاس سفر کر کے آئیں اور وہ مرجع خلائق بن جائے، یعنی علم، زہد اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر، امام نووی میں یہ تینوں خصوصیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں، شیخ قطب الدین یونینی کا بیان ہے، وہ علم و ورع، ریاضت و عبادت کم خوری اور پُر مشقت زندگی بسر کرنے میں بے مثال تھے، شمس الدین ابن فخر حنبلی فرماتے ہیں، وہ ماہر فن امام، زبردست حافظ حدیث اور گوناگوں علوم میں پختہ تھے، انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں اور بڑے متقی و زاہد تھے، مرغوبات و لذائذ سے بالکل دست کش ہو گئے اور معمولی پیوند لگے کپڑے پہنتے تھے، علامہ ابن سبکی نے شیخ، علامہ شیخ الاسلام، متاخرین کے استاذ، اللہ کی حجت و برہان، طریقۂ اسلاف کے داعی اور سید حصور کے شاندار القاب سے ان کا تعارف کرانے کے بعد لکھا ہے کہ وہ مختلف علوم فقہ، متن حدیث، اسماء الرجال اور لغت و صرف وغیرہ کے جامع تھے، یافعی ان کے کمالات کا ان الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں ''شیخ الاسلام المحقق، المدقق، النجیب، الحبر، المفید، گوناگوں فضائل و محاسن کے جامع، علوم میں متبحر، حدیث، فقہ اور لغت میں واسع المعرفت عالم و فاضل، یگانہ، ولی کبیر، سید شہیر، تمام معاصرین سے فائق و برتر، ہر سو ان کے محاسن کا چرچا اور فضائل کی شہرت ہے، ابن کثیر ان الفاظ میں ان کی ثناخوانی کرتے ہیں، شیخ محی الدین علامہ وقت، مذہب شافعی کے شیخ اور اپنے زمانہ کے جلیل القدر فقیہ اور زہد و اتقاء میں بے مثال تھے، ابن عماد اور ابن ہبۃ اللہ لکھتے ہیں ''وہ نامورانِ اسلام اور عظیم الشان لوگوں میں تھے، انہوں نے کئی سال تک اس قدر ذوق و شوق اور ایسے غیر معمولی انہماک اور دلچسپی سے علم و فن کی تحصیل کی کہ اپنے تمام اہل زمانہ اور معاصرین سے آگے ہو گئے تھے، طاش کبریٰ زادہ لکھتے ہیں، نووی اپنے زمانہ کے امام اور فاضل و عالم تھے، حافظ سید مرتضیٰ زبیدی رقمطراز ہیں، شیخ الاسلام استاذ المتاخرین بعد کے لوگوں پر اللہ کی حجت و برہان، اپنے زمانے کے قطب، سید دوراں اور اللہ کی مخلوقات کے درمیان اس کا راز تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۵۹، ۲۶۳، ۲۶۴، طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۶۶، مرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۲۷۸، شذرات الذہب ج ۵ ص ۳۵۴، ۳۵۵، طبقات الشافعیہ ابن ہبۃ اللہ ص ۸۷ و تاج العروس)

فقہی مذہب اور انصاف پسندی:

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، وہ شافعی المذہب تھے، ان کا شمار اس مذہب کے اساطین اور اکابر میں ہوتا ہے، ان کے مزاج میں حق پسندی اور انصاف تھا، اس لیے ان کو اپنے مذہب کے علما سے اختلاف کرنے اور دوسرے مذہب کے ائمہ کے اقوال نقل کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہوتا تھا۔

عقیدہ و مسلک:

وہ سلف صالحین اور اہل سنت والجماعت کے مذہب پر سختی سے عمل پیرا تھے، حدیث وسنت کی اتباع اور سلف کے مسلک کی ہم نوائی اور اس کی دعوت و تلقین ان کا اصلی طغرائے امتیاز تھا، ابن سبکی و یافعی کا بیان ہے کہ ''طریقۂ اسلاف کے داعی اور متقدمین اہل سنت والجماعت کے متبع تھے۔ (طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۶۶ و مرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۶۴)

خلوت پسندی:

وہ طبعاً خلوت پسند تھے، زہد و تقشف اور دنیا بیزاری نے ان کو اور زیادہ عزلت گزیں بنا دیا تھا، جلوت سے نفرت تھی، اور ہجوم و ازدحام قطعاً پسند نہیں کرتے تھے، زندگی تجرد میں گزاری، اور شادی نہیں کی، اس لحاظ سے وہ اپنے ہم نام پیغمبر حضرت

Marfat.com

یحییٰ علیہ السلام کے مثنیٰ تھے، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں ”امام نووی سید وحصور تھے۔“ (ایضاً)

وفات:

۴۵ سال کی عمر میں چہار شنبہ ۲۴ رجب ۶۷۶ھ کو انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنے وطن میں دفن کئے گئے، ان کی قبر ایک زمانہ میں زیارت گاہ تھی، متعدد شعرا نے ان کے مرثیے کہے ہیں۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۳ مرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۶ ومفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۳۹۸)

تصنیفات:

امام نوویؒ نے اگرچہ کم عمر پائی تھی، مگر اللہ نے ان کے علمی کاموں میں برکت دی، علاوہ ازیں وہ زندگی بھر علم وفن کی خدمت میں لگے رہے، اس لیے ان سے متعدد مفید، عمدہ اور بلند پایہ کتابیں یادگار ہیں، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں:

”اہل بصیرت سے یہ مخفی نہیں کہ امام نووی اور ان کی تصنیفات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت اور توجہ شامل رہی ہے۔“

یافعی کا بیان ہے کہ ”امام نووی پر خدا کی برکتیں ان کی کتابوں کے ذریعہ ظاہر ہوئیں، چنانچہ ان سب کو بڑا قبول حاصل ہوا اور ہر ملک میں ان کی شہرت ہوئی اور لوگ ان سے خوب متمتع اور فیض یاب ہوئے۔“

طاش کبریٰ زادہ کا بیان ہے کہ ”نووی سے بے شمار مشہور اور بیش قیمت کتابیں یادگار ہیں اور فن حدیث میں ان کی کتابوں کی تعداد زیادہ ہے۔ (طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۶۷ و مرآۃ الجنان ج ۴ ص ۱۸۵ ومفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۳۹۸)

امام نووی کی کتابوں کے ناموں کی فہرست اور بعض کا مختصر تعارف ملاحظہ ہو:

۱۔ التحقیق والترخیص فی الاکرام بالقیام لذوی الفضل والمزیۃ من اہل الاسلام غالباً اسی کتاب کا نام الترخیص فی الاکرام بالقیام لذوی الفضل والمزیۃ من اہل الاسلام اور فضل القیام لاہل العلم والحدیث والزہاد والعباد والصلحاء والفقرا من اہل الاسلام بھی لکھا گیا ہے، یہ مصر میں چھپ گئی ہے۔ (معجم المطبوعات کالم ۱۸۷۷)

۲۔ بستان العارفین، ۳۔ تحفۃ الوالد وبغیۃ الرائد، ۴۔ خلاصۃ الاحکام فی مہمات السنن وقواعد الاسلام، ۵۔ روح المسائل فی الفروع: یہ دو متوسط جلدوں میں ہے، اس میں مسائل کی اصلوں اور دلائل کا ذکر ہے، (کشف الظنون ج ۱ ص ۵۷۸) ۶۔ غیث النفع فی القراءات السبع، ۷۔ مناقب الشافعی، ۸۔ عمل الیوم واللیلہ، اس میں اوراد و ماثورہ کا بیان ہے۔

(فہرست کتب خانہ پشاور ص ۵۵)

۹۔ مرآۃ الزمان فی تاریخ الاعیان: مختصر ہونے کے باوجود اس حیثیت سے اہم ہے کہ اس میں ابتدائے آفرینش سے واقعات درج کیے گئے ہیں۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۱۳)

۱۰۔ عیون المسائل المہمہ: یہی مجموعہ فتاویٰ یا فتاوی النووی کے نام سے بھی مشہور ہے، اس میں امام نووی سے جو فقہی سوالات کیے گئے تھے، ان کا جواب مذکور ہے، شیخ علی بن ابراہیم عطار دمشقی (م ۷۲۴ھ) نے اس کو فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے، امام نووی کی ترتیب میں فقہی ابواب کا لحاظ نہیں کیا گیا تھا، مصر اور حیدرآباد کے کتب خانہ آصفیہ میں قلمی نسخے موجود ہیں۔

(ایضاً ص ۴۵ و تذکرۃ النوادر ص ۲۳، ۶۳)

Marfat.com

۱۱۔المنثورات وعیون المسائل المہمات: صاحب کشف الظنون کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عیون المسائل المہمہ کے بجائے ایک مستقل کتاب ہے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۵۴۲)

۱۲۔طبقات الشافعیہ علامہ ابن صلاح کی کتاب طبقات الشافعیہ کا مختصر ہے مصنف نے اس میں کسی قدر اضافے بھی کئے ہیں۔ (ایضاً ص ۹۲ واعلام ج ۳ ص ۱۱۵۰)

۱۳۔الاصول والضوابط فی المذہب: ان اہم فقہی اصول وقواعد اور مفید مطالب ومقاصد پر مشتمل ہے، جو اس فن کے طلبہ کے لیے ضروری ہیں۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۱۱۷)

۱۴۔الارشاد فی علوم الحدیث: یہ اصول حدیث میں ہے اور علامہ ابن صلاح کی مشہور ومعتبر کتاب مختصر علوم الحدیث کا خلاصہ ہے، اس کی مندرجہ ذیل شرحیں لکھی گئیں۔

۱۔شرح علامہ ابن ابی شریف المقدسی، ۲۔شرح برہان جوہری، ۳۔شرح ابوالقاسم انصاری۔ (ایضاً ص ۸۷)

۱۵۔التقریب والتیسیر فی مصطلح الحدیث: یہ کتاب الارشاد کا مختصر ہے، اسی لیے اس کا نام تقریب الارشاد بھی ہے، اس کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں۔

۱۔حافظ زین الدین عبدالرحیم بن حسین عراقی (م ۸۰۶ھ) کی شرح۔

۲۔برہان الدین ابراہیم محمد بن محمد حلبی (م ۷۵۱ھ) کی شرح۔

۳۔شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی (م ۹۰۲ھ) کی شرح۔

۴۔شیخ عبدالرحمٰن بن ابی بکر سیوطی (۹۱۱ھ) نے تدریب الراوی کے نام سے شرح لکھی، یہ بہت مشہور ومتداول اور گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے، سیوطی نے اس کے علاوہ التذنیب فی الزوائد علی التقریب بھی لکھی۔ (کشف الظنون ص ۳۱۸ والرسالۃ المستطرفہ ص ۷۴)

۱۶۔الاشارات الیٰ بیان اسماء المبہمات: خطیب بغدادی کی کتاب کا خلاصہ ہے، نووی نے حدیثوں کے اسناد حذف کر کے اس میں بعض اضافے کئے ہیں اور اس کو صحابہؓ کے ناموں کے اعتبار سے حروف معجم پر مرتب کیا ہے، خطیب کی کتاب کے مقابلہ میں اس سے استفادہ سہل ہے، اس میں متن حدیث کے مبہم ناموں کا ذکر ہے۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۱۰۴ وج ۲ ص ۱۸۶)

۱۷۔الایضاح فی المناسک: یہ آٹھ ابواب پر مشتمل اور ابن صلاح کی مبسوط کتاب المناسک کا خلاصہ ہے، تاہم ان میں مناسک کے جملہ ضروری مسائل ومقاصد کا ذکر آ گیا ہے، البتہ دلائل حذف کر دیئے گئے ہیں، رجب (۶۶۷ھ) میں وہ اس کی تالیف وتصنیف مکمل کر چکے تھے، نور الدین علی سمہودی نے اس کی شرح لکھی تھی، بعض اہل سیر نے مناسک میں نووی کی تین اور بعض نے چار کتابیں بتائی ہیں۔ (ایضاً ج ۲ ص ۱۸۶)

۱۸۔شرح البخاری: اس کو وہ صرف کتاب الایمان ہی تک لکھ سکے تھے، شرح صحیح مسلم میں اسکے بارے میں تحریر فرماتے ہیں ''میں نے شرح بخاری میں گوناگوں معلومات جمع کئے ہیں، یہ مختصر ہونے کے باوجود مفید ومتنوع علوم وفوائد پر مشتمل ہے۔ (مقدمہ شرح مسلم للنووی ص ۴)

۱۹۔کتاب التبیان: یہ دس ابواب میں ہے، اس کا نام التبیان فی آداب حملۃ القرآن بھی ہے، اس میں قرآن کی تلاوت

Marfat.com

کے فضائل، قراءت وتجوید کے آداب، قرآن واہل قرآن کی عظمت وجلالت، معلم ومتعلم قرآن کے آداب اور قرآنی الفاظ کے ضبط وتحقیق وغیرہ کے گوناگوں مسائل ومباحث بیان کیے گئے ہیں، مصنف نے مختصر البیان یا مختار البیان کے نام سے اس کا خلاصہ اور شیخ محمد بن محمد ابو سعید ایجی نے حدیقۃ البیان کے نام سے فارسی ترجمہ کیا تھا، (کشف الظنون ج ۱ ص ۲۴۶) احمد بن عبد الکریم اشمونی کی کتاب منار الہدی فی بیان الوقف والابتدا کے حاشیہ پر یہ کتاب ۱۳۰۷ھ میں قاہرہ سے شائع ہوچکی ہے۔

۲۰۔ مقاصد النووی: توحید، عبادات اور تصوف پر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، ۱۳۲۴ھ میں بیروت سے اور پھر مصر سے شائع ہوا ہے۔ (معجم المطبوعات کالم ۱۸۷۸)

۲۱۔ ریاض الصالحین: ترغیب وترہیب اور زہد وریاضت نفس سے متعلق صحیح حدیثوں کا مختصر مجموعہ ہے، (ایضاً) معتبر اور مفید ہونے کی وجہ سے اس کو بڑی شہرت نصیب ہوئی اور یہ مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔

۲۲ و ۲۳۔ التحریر فی شرح التنبیہ: یہ شیخ ابو اسحاق ابراہیم بن محمد شیرازی، (م ۴۷۶ھ) کی کتاب التنبیہ کی شرح ہے، التنبیہ فروع وجزئیات پر مشتمل اور فقہ شافعی کی پانچ مشہور ومتداول کتابوں میں ہے، [1] اس کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں، امام نووی نے دو شرحیں لکھی تھیں جو اہم ہیں، ایک میں مفتی بہ اور متروک مسائل کی توضیح اور مصنف کے غلط بیانات کی تصحیح کی گئی ہے اور دوسری میں الفاظ ولغات کے ضبط وحل کی جانب خاص توجہ کی گئی ہے، غالباً اسی لیے اس کو تصحیح التنبیہ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، امام نووی نے اس میں تنبیہ کی حدیثوں کے مفید نکات بھی بیان کیے ہیں، دوسری شرح ۱۳۲۹ھ میں مصر سے کتاب التنبیہ کے حاشیہ پر شائع ہوچکی ہے۔ (ملاحظہ ہو مقدمہ شرح ص ۲)

۲۴۔ شرح المہذب: یہ بھی امام ابو اسحاق شیرازی کی مشہور اور عظیم الشان کتاب المہذب فی الفروع کی شرح ہے، المہذب کی اہمیت کی بنا پر اکثر فقہا نے اس کی جانب اعتنا کیا اور شرحیں لکھیں، امام نووی کی شرح گونا مکمل ہے تاہم احکام و مسائل میں یہ بڑی جامع اور پُر از معلومات ہے، امام نووی نے شرح مسلم میں جابجا اس کا حوالہ دیا ہے، علامہ ابن اکثیر کا بیان ہے کہ مصنف نے اس میں غیر معمولی جدت واختراع اور نقد وتحقیق سے کام لیا ہے، غریب الفاظ کی تحقیق، فقہی وحدیثی معلومات اور گوناگوں دوسرے اہم امور ومسائل ایسے جمع کردیے ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتے، مجھے اس سے بہتر فقہی کتاب کا علم نہیں، امام نووی نے ایک علیحدہ جز میں اس کی حدیثوں کی تلخیص بھی کی تھی، یہ الخلاصہ فی الحدیث کے نام سے موسوم ہے۔

(کشف الظنون ج ۲ ص ۵۷۵، البدایہ ج ۱۳ ص ۲۷۹ و شذرات الذہب ج ۵ ص ۳۵۶)

۲۵۔ اربعین: اس حدیث کے بموجب جس میں چالیس حدیثوں کے جمع کرنے کی فضیلت وارد ہے، اکثر محدثین نے چالیس حدیثوں کے مجموعے مرتب کرنے کی جانب اعتنا کیا ہے، گو یہ روایت پایۂ اعتبار سے ساقط ہے تاہم فضائل وترغیبات میں توسع کی بنا پر اس نوعیت کی بے شمار کتابیں لکھی گئیں اور اربعینیات بھی کتب حدیث کی ایک مشہور قسم ہے۔

مختلف علما نے مختلف اغراض ومقاصد کے تحت اربعینیات مرتب کیے ہیں، بعض نے توحید وصفات الٰہی کی چالیس حدیثوں کو جمع کیا، بعض نے اصول ومہمات دین کی روایتیں اکٹھا کیں، بعض نے جہاد کی اور بعض نے زہد ومواعظ اور بعض نے

[1] رہمیہ کے قلمی نسخے لیڈن اور آکسفورڈ میں موجود ہیں اور ۱۸۷۹ء میں لیڈن سے جوینبول کے اہتمام چھپ چکی ہے۔ (اکتفاء القنوع ص ۱۵۵)

Marfat.com

آداب واخلاق اور فضائل اعمال وغیرہ کے متعلق چالیس حدیثیں جمع کیں، امام نووی نے اپنی اربعین میں ان سب امور کا لحاظ رکھا ہے، اس لیے ان کا مجموعہ اربعین ان گوناگوں اغراض وامور کا جامع ہے، نووی کا خود بیان ہے۔

علی جمیع ذالک و کل حدیث منها قاعدة عظیمة من قواعد الدین۔

یہ چالیس حدیثیں ان سب امور کو شامل ہیں اور ان میں سے ہر ہر حدیث دین کے کسی عظیم الشان قاعدہ پر مبنی ہے۔

امام نووی نے اپنی اربعین میں صحیح وثابت حدیثوں ہی کو جمع کرنے کا التزام کیا ہے، ان کی اکثر روایات صحیح بخاری وصحیح مسلم سے ماخوذ ہیں، اختصار کے خیال سے سندیں حذف کردی ہیں اور چالیس کے بجائے بیالیس حدیثوں پر مشتمل ہے۔

اربعین نووی کی اہمیت ان سے بھی ظاہر ہے کہ اس کی بے شمار شرحیں لکھی گئی ہیں، ایک شرح خود انہوں نے بھی لکھی تھی، (کشف الظنون ج ۱ ص ۸۰) اس کا قلمی نسخہ رام پور کے کتب خانہ میں ہے، (فہرست کتب عربیہ ج ۲ ص ۱۰۹) دوسری شرحوں اور ان کے شارحین کے نام یہ ہیں:

۲۔ امام زین الدین عبدالرحمٰن بن احمد المعروف بابن رجب بغدادی حنبلی متوفی ۹۵۰ھ نے ایک طویل شرح لکھی اس کا نام جامع العلوم والحکم ہے۔

۳۔ نجم الدین سلیمان بن عبدالقوی طوفی حنبلی (م ۷۱۰ھ) کی شرح۔

۴۔ تاج الدین عمر بن علی فاکہی (م ۷۳۱ھ) کی شرح۔

۵۔ جمال الدین یوسف بن حسن بن محمود سرانی اشبیلی (م ۶۹۹ھ) کی شرح۔

۶۔ ابوحفص عمر الہلیسی شافعی کی شرح فیض المعین کے نام سے موسوم ہے۔

۷۔ برہان الدین ابراہیم بن احمد خجندی (م ۸۵۱ھ) کی شرح۔

۸۔ شہاب الدین احمد بن محمد ابی بکر الشیر ازی الکازرونی کی ممزوج شرح کا نام ہادی المسترشدین ہے۔

۹۔ شیخ زین الدین سریحا بن محمد ملطی (م ۷۸۸ھ) کی شرح نثر فوائد الاربعین النوویہ، چار جزوں میں ہے۔

۱۰۔ شیخ ولی الدین کی شرح کا نام الجواہر البہیہ ہے۔

۱۱۔ حافظ مسعود بن منصور بن امیر سیف الدین عبداللہ علوی کی شرح کا نام الکافی ہے، یہ ممزوج شرح ہے۔

۱۲۔ معین بن صفی کی شرح مختصر ہے۔

۱۳۔ مصلح الدین محمد سعدی عبادی (م ۹۷۶ھ) نے وزیر علی پاشا کے لیے ایک شرح مرتب کی تھی۔

۱۴۔ شہاب الدین احمد بن حجر ہیثمی مکی (۹۷۳ھ) کی ممزوج شرح فتح المبین کے نام سے مشہور ہے اور قاہرہ سے ۱۳۰۷ھ میں چھپی ہے، اس پر حسن علی مدابغی کا حاشیہ ہے۔

۱۵۔ نورالدین محمد بن الایجی کی شرح سراج الدین الطالبین ومنہاج العابدین فارسی میں ہے۔

۱۶-۱۷۔ ملا علی قاری: (م ۱۰۱۴ھ) نے دو شرحیں لکھیں، ان میں ایک نہایت مبسوط، جامع اور گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے، صاحب کشف الظنون نے اس کو سب میں بہتر اور عمدہ شرح بتایا ہے۔

۱۸۔ شیخ سراج الدین عمر بن علی بن ملقن شافعی (۸۰۴ھ) کی شرح۔

Marfat.com

۱۹۔ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) نے اربعین نووی حدیثوں کی تخریج کی تھی۔

(کشف الظنون ج ۱ ص ۸۰ و ۸۱)

۲۰۔ ابراہیم بن مرعی بن عطیہ الشبر خیتی مالکی کی شرح الفتوحات الوہبیہ قاہرہ سے ۱۳۰۷ھ میں شائع ہوئی۔

(اکتفاء القنوع ص ۱۳۱ و ۱۳۲)

۲۱۔ علامہ عبدالہادی بن عبداللہ بن احمد کی شرح کا قلمی نسخہ رام پور میں ہے، یہ ۱۱۹۹ھ کا لکھا ہوا ہے، (فہرست عربیہ مجلد دوم ص ۱۷۴) اربعین نووی بولاق سے ۱۳۹۴ھ میں چھپی ہے اور مصر سے بھی شائع ہوئی ہے، مصری ایڈیشن میں شیخ ہاشم شرقاوی کی شرح بھی ہے۔ (معجم المطبوعات العربیہ جلد ۲ کالم ۱۸۷۷)

۲۲۔ کتاب الاذکار: کتاب الاذکار المنتخب من کلام سید الابرار امام نووی کی مفید اور مشہور کتابوں میں ہے، یہ ایک جلد میں ساڑھے تین سو سے زیادہ ابواب پر مشتمل ہے، اس میں حدیث کی کتابوں سے شب و روز کے اشغال و اذکار اور دعائیں نقل کی گئی ہیں، ابتدا میں چند اہم ضروری فصلیں ہیں، ان میں اخلاص عمل اور حسن نیت کی اہمیت کا تذکرہ اور بطور تمہید اذکار کے عام اور مطلق فضائل بیان کئے گئے ہیں، پھر اصل کتاب اور خاتمہ پر استغنا کا بیان ہے، سب سے آخر میں تیس اہم حدیثیں درج ہیں۔

امام نووی نے احادیث و روایات سے اذکار و ادعیہ نقل کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ ان سے متعلق آیتیں اور متقدمین کے اقوال بھی نقل کیے ہیں۔

اس موضوع پر پہلے جو کتابیں لکھی گئی تھیں، ان سے تکرار و طوالت وغیرہ کی بنا پر استفادہ آسان نہیں تھا، امام نووی نے تکرار و طوالت سے بچ کر اس کو عمدہ اور آسان پیرایہ میں اس جذبہ سے لکھا ہے کہ ان کے بقول: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (البقرۃ: ۱۵۲)

سو مجھ کو یاد کرو تو میں تم کو یاد کروں گا۔

نیز دوسری جگہ ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿٥٦﴾ (الذاریات: ۵۶)

اور میں نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔

ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ بندہ کی سب سے عمدہ اور بہتر حالت وہی ہے جب وہ اللہ رب العالمین کو یاد کرتا اور ان اذکار و اعمال میں مشغول رہتا ہے جو رسول اللہ ﷺ سے وارد ہیں۔ اس لیے میں نے یہ مختصر کتاب تالیف کی۔ (کتاب الاذکار ص ۲)

اس میں اختصار و سہولت کے خیال سے عموماً سندیں حذف کردی گئی ہیں اور حدیثوں کے حسن، ضعیف اور منکر ہونے کی نشاندہی کردی گئی ہے اور کم علم و واقفیت رکھنے والوں کی رعایت سے غیر معروف صحابہؓ کے صحابی ہونے کی تصریح کردی گئی ہے، نیز علم حدیث کے عمدہ مسائل، فقہی مباحث اور اہم اصول و آداب وغیرہ اس قدر واضح انداز میں لکھے گئے ہیں کہ عوام اور اہل علم و فقہ سب کے لیے ان کی معرفت آسان ہوگئی ہے۔

کتاب الاذکار کی زیادہ حدیثیں صحاح خمسہ (صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داود، ترمذی و نسائی) سے ماخوذ و مستنبط ہیں، اجزاء و مسانید وغیرہ میں موطاء امام مالک، مسند احمد بن حنبل، مسند ابی عوانہ، سنن ابن ماجہ، دارقطنی و بیہقی کی حدیثیں بھی کہیں کہیں

Marfat.com

نقل کی گئی ہیں اور صحاح کی ضعیف روایتیں بھی شاذ و نادر آ گئی ہیں، مگر ضعیف کی تصریح کے ساتھ، اس لیے صحت، وثوق اور اعتبار وغیرہ کی حیثیت سے کتاب الاذکار کا پایہ بلند ہے۔

اس کی حسب ذیل شرحیں لکھی گئیں:

[١] الفتوحات الربانیۃ علی الاذکار النوویہ۔ یہ شیخ محمد بن علی محمد بن علان مکی شافعی (م ۱۰۵۷ھ) کی شرح ہے۔

[۲، ۳] اذکار الاذکار۔ شیخ جلال الدین سیوطی کی تلخیص اور دو کراسوں کے بقدر ہے، اس خلاصہ کی سیوطی نے شرح بھی لکھی تھی۔

[۴] تحفۃ الابرار بنکت الاذکار: یہ بھی سیوطی کی تالیف ہے۔

[۵] مختصر الاذکار: شیخ شہاب الدین احمد بن حسین رملی (م ۸۲۴ھ) کی تصنیف ہے۔

[٦] اتحاف الاخبار فی نکت الاذکار: یہ تعلیق شمس الدین محمد بن طولون دمشقی کی ہے۔

[۷] اذکار کے فارسی ترجمے بھی کیے گئے ہیں، ایک ترجمہ ۶۷۷ھ کا کیا ہوا ہے، اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں۔

(کشف الظنون ج ا ص ۴۵۲)

۲۵۔ تہذیب الاسماء واللغات: اس میں ان اسماء واعلام کے الفاظ ولغات کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے، جو مندرجہ ذیل چھ کتابوں میں مذکور ہیں، ا۔ مختصر مزنی، ۲۔ مہذب، ۳۔ تنبیہ، ۴۔ وسیط، ۵۔ وجیز، ٦۔ اور روضہ۔

مزید افادہ کے خیال سے مصنف نے بعض ایسے ناموں اور لفظوں کا ذکر بھی کر دیا ہے جو ان کتابوں میں موجود نہیں ہیں، یہ کتاب دو قسموں میں ہے پہلی میں اسماء اور دوسری میں لغات واماکن کا ذکر ہے، اس اعتبار سے پہلی قسم کی حیثیت ابتدائی اسلامی عہد کے مشاہیر واصحاب کمال کے سیر وتراجم کی اور دوسری قسم کی نوعیت لغوی قاموس کی ہے۔

دونوں قسموں کو حروف معجم پر مرتب کیا گیا ہے، مگر قسم اول میں تبرک کے خیال سے محمد نام کے لوگوں کا پہلے ذکر کیا گیا ہے، اس قسم میں ذکور واناث کا علیحدہ علیحدہ ذکر ہے، اسی طرح جو لوگ کنیتوں یا انساب وقبائل کی نسبتوں سے مشہور ہیں، ان کا بھی ناموں سے الگ ذکر کیا گیا ہے۔

اسماء والفاظ کی حرکات وغیرہ کو ضبط کرنے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

تہذیب الاسماء واللغات بڑی تحقیق سے لکھی گئی ہے اور اس میں مندرج تمام چیزیں معتبر ومستند کتابوں سے ماخوذ ہیں، گو مصنف نے مشہور باتوں اور عام اقوال کے حوالے تو نہیں دیئے ہیں مگر غیر معروف اور غریب اقوال کے حوالے دیدیئے ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں تاریخ، طبقات، رجال، تراجم، انساب مغازی، سیر، تفسیر، حدیث، اصول وشروح حدیث، فقہ وکلام، لغت وادب اور صرف واشتقاق وغیرہ گوناگوں فنون کی کتابوں سے مدد لی ہے، ان میں سے اکثر کتابوں کا اس کے دیباچہ میں ذکر بھی ہے، اس لیے یہ عظیم فوائد ومطالب اور گوناگوں مسائل ومباحث کا مجموعہ ہے اور اس میں رجال وطبقات اور لغت کے علاوہ حدیث وتفسیر وغیرہ متعدد علوم بھی شامل ہو گئے ہیں۔

تہذیب الاسماء کی دونوں قسمیں مصر کے مطبع منیریہ نے دو، دو جزوں میں شائع کی ہیں اور اہل علم نے نووی کی بعض اور کتابوں کی طرح اس کی جانب بھی اعتنا کیا ہے، ملاحظہ ہو:

Marfat.com

[۲،۱] شیخ کمال الدین محمد بن محمود حنفی (م ۷۸۶ھ) اور شیخ محی الدین عبدالقادر بن محمد قرشی حنفی (م ۷۷۵ھ) نے اس کو نئے ڈھنگ اور انداز پر مرتب کیا ہے۔

[۳، ۴] شیخ عبدالرحمٰن بن محمد بسطامی نے الفوائد السنیہ کے نام سے تلخیص اور شیخ جلال الدین سیوطی نے اس کا مختصر لکھا۔
(کشف الظنون ص ۵۰۴ والرسالۃ المستطرفہ ص ۱۶۷)

۲۶۔الروضہ: یہ فقہی فروع وجزئیات پر مشتمل ہے، بعض مصنفین نے اس کا نام روضۃ الطالبین وعمدۃ المتقین فی الفروع لکھا ہے، اس میں رافعی کی وجیز کی شرح وتلخیص کی گئی ہے، یہ کتاب بڑی اہم اور شوافع میں نہایت مقبول ہے، اس کی جانب بڑا اعتنا کیا گیا ہے، صاحب کشف الظنون نے اس کی دو درجن سے زیادہ شروح ومختصرات اور حواشی کا ذکر کیا ہے۔

۲۷۔منہاج الطالبین وعمدۃ المفتین: محرر، امام ابوالقاسم عبدالکریم بن محمد رافعی قزوینی (م ۶۲۳ھ) کی فروع شافعیہ میں نہایت مشہور ومقبول اور بڑی معتبر ومستند کتاب خیال کی جاتی ہے، امام نووی کی یہ کتاب اس کا مختصر ہے، وہ فرماتے ہیں کہ "ہمارے ہم مسلک علما نے متعدد کتابیں لکھی ہیں لیکن محرر کا متن گوناگوں فوائد کا حامل اور تحقیق مذہب کے باب میں نہایت معتبر ومستند ہے مگر اس کا حجم اس قدر زیادہ ہے کہ موجودہ زمانے کے تن آسان اور سہولت پسند لوگوں کے لیے اس سے استفادہ آسان نہیں تھا، اس لیے میں نے اس کا مختصر لکھا جو اصل کتاب کے نصف کے بقدر ہے، میں نے اس میں بعض مفید اور عمدہ مسائل و مباحث کا اضافہ بھی کیا ہے۔" (کشف الظنون ج ۳ ص ۵۵۰ تا ۵۵۲)

منہاج بڑی اہم کتاب ہے اور یہ شوافع میں مشہور ومتداول بھی ہے، اس کی جانب بڑا اعتنا کیا گیا اور پچاس سے زیادہ شرحیں اور حواشی لکھے گئے۔

۲۸۔شرح صحیح مسلم: اس کا اصل نام المنہاج شرح صحیح مسلم ہے مگر یہ شرح صحیح مسلم کے نام سے مشہور اور علامہ نووی کی سب سے اہم اور شہرۂ آفاق تصنیف ہے، صحیح مسلم کی متعدد شرحیں لکھی گئیں مگر ان میں سے کوئی بھی شہرت ومقبولیت اور اعتبار و وثوق کے لحاظ سے اس کے ہم پایہ نہیں، شوافع میں جو علما ومحدثین حدیث کی شرح وتحقیق میں بے نظیر خیال کیے جاتے ہیں، ان میں ایک علامہ نووی بھی ہیں، ان کی شرح نہ مطول ومفصل ہے اور نہ بہت مختصر ومجمل، بلکہ متوسط ہے، اس کے شروع میں ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں صحیحین خصوصاً صحیح مسلم کی اہمیت وخصوصیت، امام مسلم کی حدیث میں عظمت و بلند پائیگی، غیر معمولی احتیاط وکاوش اور دقت نظر وغیرہ کے علاوہ اصول روایت اور فن حدیث کے مباحث ومصطلحات تحریر کیے گئے ہیں، اس شرح کی بعض اہم خصوصیات یہ ہیں:

- یہ متوسط اور جامع شرح ہے، اس لیے حشو وزوائد اور تکرار واطناب سے خالی اور فنی نکات ومتنوع مطالب وحقائق اور مختلف احکام وآداب، نیز حدیث سے مستنبط ہونے والے مفید مسائل ومباحث پر مشتمل ہے۔
- یہ تحریر وتصنیف کی خوبی ودلکشی سے بھی معمور ہے، عبارت میں سلاست وروانی اور پیرایہ بیان میں دلآویزی ہے۔
- جو حدیثیں بظاہر مختلف ومتضاد نظر آتی ہیں، ان میں جمع وتطبیق کی صورتیں بیان کی گئی ہیں اور سند ومتن ہر ایک کے فرق واختلاف کو دور کیا گیا ہے۔
- حدیثوں کے مصالح وحکم اور ان سے مستنبط احکام کے اسرار وعلل بیان کیے گئے ہیں۔

Marfat.com

۵ اسناد و رجال کی دقیق بحثیں، ان کے لطائف اور رواۃ کے متعلق گوناگوں معلومات تحریر کیے گئے ہیں۔

٦ ایک حدیث کی شرح اسی نوعیت کی دوسری حدیثوں سے کی گئی ہے اور کہیں کہیں قرآن مجید کی آیتوں سے بھی مدد لی ہے اور دکھایا ہے کہ حدیث فلاں آیت کے موافق ہے، جن حدیثوں میں قرآن مجید کی آیات مذکور ہیں، ان کی شرحیں و تفسیر بھی کی ہے اور اس سلسلہ میں مفسرین کے آرا بھی تحریر کیے ہیں، الفاظ حدیث کی وضاحت کے لیے قرآنی آیات سے استدلال بھی کیا گیا ہے۔

٧ مشکل الفاظ کے ضبط و تحقیق، دقیق فقروں اور جملوں کی وضاحت اور کلام کے اسالیب وغیرہ کا ذکر بھی ہے۔

٨ متقدمین علما کے اقوال نقل کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کا محققانہ جائزہ لے کر ان کی قوت و ضعف اور صحت و سقم کی نشاندہی کی گئی ہے اور جو اقوال قوی و مرجح معلوم ہوئے ہیں ان کے وجوہ ترجیح بھی تحریر کیے ہیں، امام نووی، ابن صلاح اور قاضی عیاض جیسے اکابر فن پر بھی جن کی کتابوں سے انہوں نے بڑا استفادہ کیا ہے، نقد و جرح کرتے ہیں اور محدثین و شارحین حدیث کے علاوہ فقہا اور دوسرے طبقہ و فن کے علما پر بھی انہوں نے نقد و تعقب کیا ہے، خود امام مسلم بھی ان کی گرفت سے نہیں بچ سکے ہیں، چنانچہ کہیں کہیں ان کے خیالات اور لغوی و فنی مسامحات کا بھی ذکر کیا ہے۔[1]

٩ حدیثوں کا مفہوم ایسے عمدہ اور دلنشیں پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ کوئی اشتباہ و اشکال باقی نہیں رہ گیا ہے، امام نووی کی

---

[1] (اس سے یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اکابر علما اور امام مسلم وغیرہ کی عظمت کے قائل نہ تھے، بلکہ ان کو ان حضرات کی جلالت قدر کا پورا اعتراف تھا اور انھوں نے امام مسلم کی مہارت و حذاقت فن، دقت نظر اور حدیث میں احتیاط و تیقظ کی جا بجا تحسین کی ہے، جمہور امت کی طرح وہ بھی امام بخاری کی عظمت اور ان کی صحیح کی تمام کتب حدیث میں برتری کے قائل ہیں، اس شرح میں انھوں نے جا بجا صحیح بخاری کے افضل و برتر ہونے کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کے نزدیک بعض مغاربہ کا خیال صحیح نہیں ہے کہ صحیح مسلم حدیث کی سب سے بہتر اور صحیح کتاب ہے مگر اس کے باوجود وہ یہ کہتے ہیں)

ع: ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

مجموعی حیثیت سے نہ سہی لیکن بعض حیثیتوں سے صحیح مسلم کو صحیح بخاری پر ترجیح حاصل ہے۔

چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

صحیح مسلم کی بعض منفرد اور امتیازی خصوصیات بھی ہیں، مثلاً سہل اور آسان ہونے کی وجہ سے استفادہ میں سہولت، امام مسلم ہر حدیث کو اس کے مناسب موقع و محل اور موزوں جگہ پر بیان کرتے ہیں اور اس کے تمام مختار طرق، متعدد سندیں اور مختلف الفاظ وغیرہ بھی نقل کرتے ہیں، اس سے طالبین فن کے لیے اس کے تمام وجوہ پر نظر کرنا اور استفادہ سہل ہو گیا ہے، اس کے برخلاف امام بخاری مختلف وجوہ و طرق کو جدا جدا ابواب میں بیان کرتے ہیں اور اکثر حدیثیں ایسے ابواب میں لاتے ہیں جن کی طرف ذہن منتقل بھی نہیں ہوتا، گو اس سے ان کے پیش نظر ایک خاص غرض و حکمت ہوتی ہے، مگر طلبۂ حدیث کے لیے اس کے جملہ طرق کو جمع کرنا دشوار ہوتا ہے، اسی بنا پر متاخرین محدثین کی ایک جماعت کو غلط فہمی ہوئی، اور انھوں نے صحیح بخاری کی بعض حدیثوں کے بارہ میں یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ اس میں نہیں ہیں، حالانکہ وہ موجود ہوتی ہیں" (مقدمہ بر شرح مسلم ص ۱۴، ۱۵)

نیز لکھا ہے کہ کوئی شخص بھی علم الاسناد کی ان دقیق باتوں میں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے امام مسلم کا شریک و سہیم نہیں ہے۔۔۔۔ ان کی کتاب میں صنعت اسناد کی بعض ایسی خصوصیات ہیں جو اس کو صحیح بخاری سے بھی ممتاز کر دیتی ہیں"

جس طرح امام مسلم کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اسی طرح جہاں ان کو امام مسلم پر کیے جانے والے اعتراضات غلط اور بے وزن معلوم ہوئے ہیں، ان کی پرزور تردید کر کے امام مسلم کے نقطۂ نظر کی حمایت کی ہے، ان سے ان کے زور استدلال اور نقطۂ نظر کی قوت کا بھی اندازہ ہوتا ہے)

Marfat.com

بحث کا طریقہ اور شرح کا انداز یہ ہے کہ پہلے وہ زیر بحث ابواب کی روایتوں کے مختلف وجوہ وطرق نقل کر کے ان کے اور متن کے فرق واختلاف کی تصریح، رجال وروایت پر گفتگو، مشکل اسماء ولغات کی ضبط وتحقیق، راویوں کے مختصر حالات اور فن حدیث میں ان کا درجہ ومرتبہ واضح کرتے ہیں اور حدیث کے اہم نکات اور اس سے مستنبط ہونے والے احکام وآداب وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں، جن امور ومسائل میں اہل فن اور ائمہ فقہ وحدیث کا نقطہ نظر مختلف ہوتا ہے، ان کے متعلق اختلافات ذکر کر کے دلائل وشواہد سے مختار ومرجح قول ومسلک کی نشاندہی کرتے ہیں۔

فن حدیث کے علاوہ اس میں اصول وشروح میں حدیث، فقہ واحکام تفسیر وتاریخ، کلام وعقائد، سیر وتراجم، رجال وانساب، لغت وادب، صرف ونحو، اعراب وامالی اور قراءت وتجوید کے مسائل ومباحث بھی تحریر کیے گئے ہیں اور ان میں سے ہر ہر فن کی کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں، فنی مباحث سے قطع نظر دوسرے امور ومسائل پر بھی نووی کی بحثیں محققانہ اور پُرمغز ہوتی ہیں، یہ کتاب متعدد بار چھپ چکی ہے اور اس کے بعض خلاصے بھی لکھے گئے ہیں۔

بعض اعتراضات:

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کو شافعیت میں غلو تھا، اس لیے وہ مذہب شافعی کو شرح میں زیادہ اہتمام سے نقل کرتے ہیں اور اسی کو قوی اور مرجح بھی قرار دیتے ہیں، مگر نووی کے حامیوں نے اس الزام کو سراسر غلط قرار دیا ہے، چنانچہ نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں:

> منزہ بود از تعصب شافعیت ومتصف بانصاف ونقل می کرد در کتب خود از اقوال ابوحنیفہ۔
>
> شافعی مذہب کی عصبیت سے پاک اور انصاف پسند تھے اور اپنی کتابوں میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال ومسالک بھی بیان کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے فقہی مذہب کا ذکر زیادہ اہتمام سے کرتے ہیں اور عموماً اسی کو مرجح بھی ثابت کرتے ہیں، ممکن ہے زمانہ کے عام اثر کی وجہ سے ان میں یک گونہ عصبیت بھی رہی ہو تاہم ان میں رواداری اور حق پسندی بھی تھی، اس لیے وہ اپنے مرجح مسلک کے دلائل وشواہد بھی بیان کرتے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ ہی کسی مسلک کے قوی اور ضعیف ہونے کے قائل رہے ہوں گے، وہ دوسرے ارباب مذہب اور ائمہ فقہ کے مسالک نقل کرنے سے اغماض بھی نہیں برتتے، مشہور فقہائے صحابہ وتابعین اور ائمہ ثلاثہ کے علاوہ انہوں نے فقہائے امصار کے مذاہب بھی نقل کیے ہیں، بلکہ ان کی وسیع النظری اور رواداری نے فرق ضالہ، خوارج، معتزلہ اور روافض کے مذاہب واقوال نقل کرنے سے بھی ان کو باز نہیں رکھا ہے، اس لیے وہ ان کے اقوال ذکر کر کے ان کی تردید کرتے ہیں۔

Marfat.com

امام ابو محمد عبد المؤمن دمیاطی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۷۰۵ھ)

نام ونسب:

عبد المؤمن نام، ابو محمد کنیت، شرف الدین لقب اور نسب نامہ یہ ہے:

عبد المؤمن بن خلف بن ابی الحسن بن شرف بن خضر بن موسیٰ۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۴ ص ۴۰ وشذرات الذہب ج ۶ ص ۱۲)

ولادت ووطن:

۶۱۳ھ کے اواخر میں تونہ میں پیدا ہوئے اور دمیاط میں نشوونما پائی، (الدرر الکامنہ ۲/۴۱۷) مگر بعض لوگوں نے ان کا مولد بھی دمیاط ہی بتایا ہے، (بستان المحدثین ص ۹۳) اس لیے وہ تونی اور دمیاطی دونوں کہلاتے ہیں، تونہ دمیاط اور تینس کے قریب ایک گاؤں کا نام ہے اور دمیاط ساحل سمندر کے کنارے مصر کا ایک بڑا مشہور اور سرسبز وشاداب شہر ہے، بعض لوگوں نے اس کا تلفظ دال مہملہ کے بجائے ذال معجمہ سے (ذمیاط) لکھا ہے، مگر یہ خود دمیاطی کی تصریح کے خلاف ہے اور علامہ سمعانی نے بھی اس کی تردید کی ہے۔ (ایضاً وکتاب الانساب ورق ۲۳۰)

اساتذہ:

دمیاطی کے شیوخ کی تعداد بے شمار ہے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

ابن قمیرہ، ابن مسلمہ، ابن مقیر، ابو القاسم بن رواحہ، ابو نصر بن علیق، ابراہیم بن خیر، زکی الدین عبد العظیم منذری، صفیہ قرشی، ظافر بن شحم، عبد الخالق البسری، علم بن صابونی، علی بن زید انساری، علی بن مختار، عیسیٰ خیاطی، منصور بن دباغ، موہوب بن جوالیقی، یوسف بن خلیل، یوسف بن عبد المعطی المخلی وغیرہ، حافظ زکی الدین منذری اور یوسف بن خلیل سے ان کو زیادہ اور خاص تعلق تھا۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۸ والدرر الکامنہ ج ۲ ص ۴۱۷)

تلامذہ:

تلامذہ کی تعداد بھی بے شمار ہے، چند کے نام یہ ہیں:

ابو الحسین یونینی ابو حیان اندلسی، شیخ تقی الدین سبکی، صاحب کمال الدین بن عدیم، قاضی علم الدین اخنائی، علم الدین برزالی، فتح الدین ابو الفتح بن سید الناس یعمری، فخر الدین نویری قطب الدین عبد الکریم، شیخ محمد بن محمد ابیوردی، محی الدین نووی۔

Marfat.com

دمیاطی کے تلامذہ کی فہرست میں ان کے معاصرین واقران اور بعض شیوخ بھی شامل ہیں، اور ان کے بعض تلامذہ جیسے شیخ ابیوردی اور ابن عدیم وغیرہ ان سے سن وسال میں کافی بڑے تھے، اور دمیاطی سے مدتوں پہلے ان کی وفات بھی ہوگئی تھی۔ (ایضاً)

طلب علم کے لیے سفر:

دمیاط میں علم کی تحصیل کے بعد انہوں نے مصر، اسکندریہ، بغداد، حلب، حماۃ ماردین حران، دمشق، عراق، حرمین، اور جزیرہ کا سفر کیا، عراق دوبار تشریف لے گئے، اور دمشق میں عرصہ دراز تک قیام کیا۔

شوقِ علم:

ان کو علم وفن سے اشتغال وتعلق تھا اور اس کے لیے مشقت جھیل کر متعدد شہروں کا سفر کیا اور ابن خلیل اور صغانی کی بے شمار کتابیں لائے، انہوں نے علوم وفنون کی تحصیل کے بعد ان کی نشر واشاعت کا کام بھی بڑی دلچسپی اور شوق سے انجام دیا۔

(تذکرہ ج ۴ ص ۲۶۸، الدرالکامنہ ج ۲ ص ۱۷ ،۴ والبدایہ والنہایہ ج ۱۴ ص ۴۰)

حفظ وثقاہت:

ان کے ضبط وثقاہت، حفظ واتقان اور عدالت ودیانت پر سب کا اتفاق ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ''صدق ودیانت اور حفظ واتقان میں سرآمد روزگار تھے'' سیوطی کا بیان ہے کہ ''وہ حاذق، حافظ اور متقن تھے، ذہبی نے ان کو ''الحافظ الحجۃ'' ابن اکثیر نے ''الحافظ الکبیر'' ابن حجر نے ''حافظ للحدیث'' اور یافعی وابن عماد نے'' حافظ الوقت'' کہا ہے، ابوالحجاج مزی فرماتے ہیں کہ ''میں نے حفظ حدیث میں ان سے بلند پایہ شخص نہیں دیکھا'' ابوحیان جب ان کے واسطہ سے کوئی روایت بیان کرتے تو کہتے کہ ''ہم سے حافظ مشرق ومغرب نے روایت کی ہے۔''

(البدایہ ج ۱۴ ص ۴۰ وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۵۰ وبستان المحدثین ص ۹۳)

حدیث میں درجہ ومرتبہ:

حدیث میں دمیاطی کی بلند پائیگی اور عظمت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ سیوطی نے مصر کے اکابر حفاظ وناقدین حدیث میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور علامہ ذہبی نے ان کو شیخ المحدثین لکھا ہے، حافظ ابن کثیر نے ان کے کمالات گناتے ہوئے ان کے علوئے اسناد، کثرت روایت اور جودتِ درایت وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے، نواب صدیق حسن خاں صاحب صاحب فوات کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ ''علامہ دمیاطی کثرتِ روایت اور حسن مذاکرہ وغیرہ میں ممتاز تھے'' برزالی کا بیان ہے کہ ''وہ بلند پایہ اصحاب روات ودرایت اور نامور حفاظ ومحدثین میں آخری شخص تھے۔'' صاحب شذرات نے ان کو ''بقیۃ نقاد الحدیث'' بتایا ہے، حافظ ابن حجر حدیث میں ان کی امامت فن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس فن میں ان کے کمال پختگی، تبحر اور عظمت کا ثبوت یہ ہے کہ وہ حدیثوں کی طلب وجستجو اور جمع وتخریج کرنے کے بعد مسند درس پر متمکن ہوئے اور اپنے شیوخ واساتذہ کی زندگی ہی میں درس واملا کرانے لگے تھے اور ان کے رفقا ومعاصرین کی ایک بڑی تعداد نے ان سے حدیثیں لکھیں اور روایت کی ہیں۔

(تذکرہ ج ۴ ص ۲۶۸ والدرالکامنہ ج ۲ ص ۱۷ ،۴ والبدایہ والنہایہ ج ۱۴ ص ۴۰ وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۵۰ وبستان المحدثین ص ۹۳)

Marfat.com

فقہ:

تفقہ و اجتہاد میں ممتاز اور اکابر فقہائے شافعیہ میں شمار کیے جاتے تھے، تمام مؤرخین نے ان کے فقہی کمالات اور اجتہاد شان کا ذکر کیا ہے، انہوں نے پہلے اپنے وطن میں اس فن کی تحصیل کی اور اس میں مہارت بہم پہنچانے کے بعد علم حدیث کی جانب اعتنا کیا، مزی کا بیان ہے کہ ان کا مطالعۂ فقہ اور فقہی معلومات وسیع تھے۔ (ایضاً)

قراءت:

علوم قراءت و تجوید میں بھی درک رکھتے تھے اور قراءت سبعہ کے ماہر تھے، ان کی تحصیل مشہور صاحب فن کمال ضریر سے کی تھی، صاحب فوات کا بیان ہے کہ وہ مقری سریع القراءۃ اور مجود بارع تھے۔

(تذکرہ ج ۴ ص ۲۶۹ والدرر الکامنہ ج ۲ ص ۴۱۸ و اتحاف النبلاء ص ۳۰۸)

نحو، لغت و عربیت:

ان کو نحو، لغت اور عربیت میں بھی عبور حاصل تھا، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ عربی میں صاحب کمال و جید اور الفاظ و لغات کے وسیع النظر عالم تھے، صفدی کا بیان ہے کہ "وہ لغوی، نحوی اور فصیح تھے۔"

(تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۹ والدرر الکامنہ ج ۲ ص ۴۱۸ و اتحاف النبلاء ص ۳۸۰)

انساب:

نسب دانی میں بھی معروف و ممتاز تھے، مؤرخین نے ان کو النسابہ اور رأس فی النسب لکھا ہے، حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ "علم انساب میں علامہ دمیاطی متقدمین پر فوقیت رکھتے تھے۔" (الدرر الکامنہ و حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۵۰)

شعر و سخن:

نثر کی طرح اقلیم شعر و سخن کے تاجدار بھی تھے، علم حدیث کی فضیلت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

علم الحدیث لہ فضل و منقبۃ نال العلاء بہ من کان معتنیا

علم حدیث کی بڑی فضیلت و اہمیت ہے، اس کی جانب اعتنا کرنے والا بلندی سے ہم کنارہ ہوجاتا ہے۔

ما حازہ ناقص الا و کملہ او حازہ عاطل الا بہ حلیا

ناقص اور زیور کمال سے عاری شخص بھی اس کی جمع و تدوین کرکے کامل اور مزین ہوجاتا ہے۔

کتاب و سنت کے علم کی برتری اور منطق و کلام کی مذمت میں فرماتے ہیں:

وما العلم الا فی کتاب و سنۃ وما الجہل الا فی کلام و منطق

علم صرف کتاب و سنت کے اندر ہے، اور کلام و منطق تمامتر جہالت کا نام ہے۔

وما الخیر الا فی سکوت بحسبۃ وما الشر الا فی کلام و منطق

Marfat.com

بھلائی اس خاموشی میں ہے جو نیکی کے خیال سے اختیار کی جائے اور شر و فساد گفتگو اور گویائی میں ہے۔
(الدرر الکامنہ و حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۵۰)

جامعیت:

غرض وہ علامۂ دہر اور مختلف علوم و فنون کے ماہر و جامع تھے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ''وہ مختلف چیزوں میں یگانہ و یکتا اور بے مثل تھے'' اور صفدی کا بیان ہے کہ ''وہ کثیر الفنون تھے'' ابن عماد لکھتے ہیں کہ ''ان کے کمالات نہایت متنوع اور گوناگوں تھے۔'' (بستان المحدثین ص ۱۳)

امامت و مرجعیت:

ان گوناگوں کمالات اور مختلف علوم میں جامعیت نے ان کی شخصیت کو بڑا پُرعظمت اور نہایت جلیل القدر بنا دیا تھا، اس لیے وہ مقبول و مرجع انام ہو گئے تھے اور امام و مقتداء کہلاتے تھے، ابن عماد کہتے ہیں کہ وہ ائمہ اعلام میں تھے، مزی کا بیان ہے کہ وہ عالی قدر اور بلند پایہ تھے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ''دور دراز علاقوں سے علم و فن کے شائقین اور طلبہ ان کی خدمت میں جوق در جوق آ کر ان سے فیض یاب ہوتے تھے۔'' حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ ''وہ طلبہ فن کے محبوب اور ہر دلعزیز اور بڑی محترم، باوقار اور پُرجلال شخصیت کے مالک تھے۔'' (شذرات الذہب ج ۶ ص ۱۲ والبدایہ ج ۱۴ ص ۲۰۰ و تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۸)

تدین و تقویٰ:

علم و فضل کے ساتھ زہد و اتقا اور تدین میں بھی ممتاز تھے، ان کی دیانت اور دینداری کا اہل سیر نے ذکر کیا ہے، حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے، اکثر روزہ رکھتے اور ابن کثیر کا بیان ہے کہ اسی حالت میں انکی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔
(تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۸ والدرر الکامنہ ج ۲ ص ۱۸۴ والبدایہ ج ۱۴ ص)

اخلاق و عادات:

وہ بڑے خلیق، متواضع اور ہنس مکھ تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کی خوش خلقی، شرافت نفس، حسن اخلاق اور تواضع کا ذکر کیا ہے، (تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۸ والدرر الکامنہ ج ۲ ص ۱۸۴ والبدایہ ج ۱۴ ص ۲۰۰ واتحاف النبلاء ص ۳۰۸) ان کی مقبولیت و مرجعیت میں ان کی شرافت، خوش معاملگی اور پاکیزہ خوئی کا بھی دخل تھا۔

لطافت و ظرافت:

مزاج میں خشکی اور تقشف نہ تھا، اس لیے مزاح و تفنن کی باتیں بھی کرتے تھے، ان کی خوش طبعی اور ظرافت کا ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن وہ کسی مجلس میں تشریف لے گئے، لوگ حدیثیں پڑھ رہے تھے، کسی مقام پر عبداللہ ابن سلام کا نام آیا تو قاری نے اس کو سلام کی تشدید کے ساتھ پڑھا، ومیاطی نے فوراً کہا: سلام علیکم، سلام، سلام'' اس طرح قاری کو لفظی غلطی پر تنبیہ ہو گیا۔ (الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۱۸۴ و بستان المحدثین ص ۹۳)

Marfat.com

آسائش وفراغت:

اللہ تعالیٰ نے ان کو فارغ البالی اور کشادگی عطا کی تھی اور وہ بعض اہم عہدوں پر فائز تھے۔
(الدررالکامنہ ج ۲ ص ۱۸۴ و بستان المحدثین ص ۹۳)

فقہی مسلک:

پہلے ذکر آچکا ہے کہ وہ اکابر شوافع میں شمار کیے جاتے تھے لیکن ان کو اس مذہب میں غلو نہ تھا، بلکہ ان کے مزاج میں بڑی انصاف پسندی تھی، سنن شافعی کا وہ اکثر درس دیتے تھے، مگر ان کو اس کے متعلق یہ کہنے میں تامل نہ ہوتا کہ اس کے اکثر الفاظ صحیحین کی روایات کے مطابق نہیں ہیں، امام شافعی کے مذہب و مسلک سے وابستہ ہونے کے باوجود وہ دوسرے ائمہ کی عظمت واحترام کا پورا خیال رکھتے تھے، امام مالکؒ کی مدح وتوصیف میں اس قدر رطب اللسان رہتے کہ بعض لوگ ان کو مالکی المذہب خیال کرتے تھے۔ (بستان المحدثین ص ۹۳)

منطق وکلام سے نفرت وبیزاری:

وہ نہایت راسخ العقیدہ مسلمان اور اہلسنّت والجماعت کے مسلک کے ہمنوا تھے، اسی لئے منطق وکلام میں انہماک وتوغل کو سخت ناپسند کرتے تھے، ان کے زمانہ میں عالم اسلام خصوصاً مصر میں یونانی علوم اور منطق وکلام کا طوطی بول رہا تھا اور کتاب وسنت کے بجائے انہی علوم کے مسائل ومباحث کی جانب لوگوں کی توجہ مرکوز ہوکر رہ گئی تھی، تاتاریوں کے حملہ اور سقوط بغداد کے بعد نصیر الدین طوسی اور ان کے تلامذہ نے منطق وفلسفہ کا غلغلہ اس قدر زور وشور سے بلند کیا کہ کتاب وسنت سے بعد وبے گانگی بڑھنے لگی اور لوگ مذہب کے متعلق شک وتذبذب میں مبتلا ہونے لگے، عام محدثین وفقہا میں اس کے مقابلہ کی قوت نہ تھی، اس کی سرکوبی کے لیے اللہ نے اس صدی کے عظیم الشان عبقری، نامور مجتہد اور مجدد اعظم شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا انتخاب کیا، جنھوں نے یونانی حکمت وفلسفہ کی مدلل تردید وتنقید کو اپنا خاص موضوع بنایا اور ان کے پرزور قلم نے اس فتنہ کی دھجیاں بکھیر دیں۔

جن گنے چنے محدثین نے یونانی افکار وعلوم کی آمیزش سے اسلامی علوم کو اور غیر اسلامی عناصر سے اسلام کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی ان میں امام دمیاطی کا نام بھی ہے، ان کو منطق وکلام سے بڑی نفرت تھی، اس کا نمونہ ان کی شاعری میں بھی ملتا ہے، اس کی مثال پہلے گزر چکی ہے، یہاں منطقیین اور فلاسفہ کے رد میں ان کی ایک تحریر کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

''منطقیوں پر علمائے حق نے اس لیے نکیر کی ہے کہ انہوں نے علوم عقلیہ کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے، وہ ان فضول عقلی علوم میں پڑ کر کتاب وسنت اور علوم عقلیہ سے غافل اور بے پروا ہو گئے ہیں، ان لوگوں کی منطق وفلسفہ سے اس قدر الفت ودلچسپی کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس سے واقفیت کے بغیر آدمی خوش اسلوبی سے گفتگو ہی نہیں کر سکتا، حالانکہ یہ سراسر مضحکہ خیز بات ہے، کیا امام شافعی، امام مالک اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس فن کی تحصیل کی تھی؟ کیا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ایاس بن معاویہؒ کی ذہانت وطباعی اور عمرو بن عاصؓ کی سیاست وفراست منطق ہی کی بدولت تھی، کیا سفیان ثوری کے کمالات اس کے رہین منت تھے اور کیا قس وسحبان کی فصاحت وطلاقت لسانی اس میں مشق ومہارت ہی کا نتیجہ تھی؟ کیا کوئی شخص ان حضرات کو غبی اور بحث وگفتگو میں عاجز وقاصر تصور

Marfat.com

کر سکتا ہے؟ حالانکہ ان لوگوں کو اس فن میں کوئی دخل نہیں تھا، پھر اس لایعنی اور بے سود فن کے درپے ہو کر اس کے لیے غیر معمولی ریاضت و مشقت انگیز کرنا کس قدر حیرت انگیز ہے؟ یقیناً شیطان نے ان لوگوں کو دھوکے اور فریب میں مبتلا کر دیا ہے، اس میں شک نہیں کہ بعض اہل علم کو اس کے مطالعہ میں غلو و انہماک نہیں ہوتا، مگر اس کے باوجود کیا یہ اس کی کم مضرت ہے کہ انسان بے سود باتوں میں الجھ کر رہ جائے جن سے اللہ تعالیٰ نے اس کو مستغنی اور بے نیاز بنایا ہے۔"

عام منطقیوں کا خاص منتہائے نظر اور اہم مرکز توجہ یہی غیر مفید فن ہے اور اس کو ثابت شدہ حقائق و مسلّمات کا آلہ و ذریعہ بنائے ہوئے ہیں، اس لیے وہ اس میں سعی بلیغ سے کام لیتے ہیں اور اس کی تحصیل میں اپنی عمریں ضائع کرتے ہیں، کیا ان لوگوں کو ہادیٔ برحق ﷺ کے اس ارشاد کی خبر نہیں کہ آپ نے حضرت عمرؓ کو تختیوں پر توراۃ لکھ کر محفوظ کرتے دیکھا تو غضبناک ہو کر فرمایا کہ اگر حضرت موسیٰ بھی اس وقت زندہ ہوتے تو ان کے لیے میری اتباع سے مفر کی کوئی صورت نہ ہوتی، جب آپ نے حضرت موسیٰ کی سرتاپا نور کتاب میں حضرت عمرؓ کے توغل اور غیر معمولی انہماک کو پسند نہیں فرمایا تو آخر اس فن کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے جو متشککین اور گم کردہ راہ لوگوں کی وضع و اختراع کا نتیجہ اور تمام تر کذب و افترا کا مجموعہ ہے، کس قدر افسوس اور تعجب ہے ان منطقیوں پر جو ضلالت و تاریکی میں بھٹک رہے ہیں۔" (بستان المحدثین ص ۹۴)

وفات:

امام دمیاطی کا انتقال کبر سنی میں اچانک ہوا، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز درس دینے کے بعد ہی ان پر غشی طاری ہوئی، ان کے شاگردان کو گھر لائے، یہاں پتہ چلا کہ ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے، ابن کثیر کا بیان ہے کہ وہ اس دن روزے سے تھے، تاریخ وفات ۱۰/ یا ۱۵ ذوالقعدہ ۷۰۵ھ بتائی جاتی ہے، دوسرے دن باب النصر کے مقبرہ میں دفن کیے گئے، جنازہ میں بڑا مجمع شریک تھا۔ (بستان المحدثین ص ۹۴ وتذکرہ ج ۴ ص ۲۶۹ وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۵۰ والبدایہ ج ۱۴ ص ۴۰)

حلیہ:

وہ نہایت شکیل و جمیل اور بڑے وجیہ تھے، اس لیے ان کو ابن الماجد کہا جاتا تھا، خوبصورتی کے اظہار کے مواقع پر دمیاط میں یہی کہا جاتا تھا، چنانچہ اگر کسی دلہن کے غیر معمولی حسن و جمال کی تعریف کی جاتی تھی تو کہتے تھے، کانها ابن الماجد (گویا وہ ابن الماجد ہے)۔ (بدر الطالع ج ۱ ص ۴۰۳)

تصنیفات:

دمیاطی کثیر التصانیف تھے، حدیث، عوالی، فقہ اور لغت وغیرہ میں ان سے عمدہ اور بیش قیمت کتابیں یادگار ہیں، ان سب کو ان کے زمانہ میں بڑی شہرت و مقبولیت حاصل تھی مگر اب غالباً سب نایاب ہیں۔

۱۔ کتاب التسلی والاغتباط بثواب من تقدم من الافراط: یہ ایک کراسہ کے بقدر ہے، اس میں حدیثوں کے اسناد و متون دونوں ذکر کیے گئے ہیں۔

۲۔ تساعیات مطلقه، ۳۔ کتاب ذکر ازواج النبی واولاده واسلافه، ۴۔ کتاب الذکر والتسبیح اعقاب الصلوة، ۵۔ العقد المثمن فیمن اسمه عبد المؤمن (ایک جلد)

Marfat.com

۶۔ کتاب فضل الخیل: محدثین کے طریقہ پر ایک جلد میں مرتب کی گئی ہے، مدینہ کے کتب خانہ شیخ الاسلام میں اس کا قلمی نسخہ ہے۔ (مقالات سلیمان ج ۲ ص ۳۵۸)

۷۔ کتاب فضل صوم ست من شوال: حافظ ابن کثیرؒ نے اس کو مفید، جید اور بے نظیر کتاب بتایا ہے۔

۸۔ قبائل الخزرج ولاوس (ایک جلد میں)

۹۔ کشف المغطی فی تبیین الصلٰوۃ الوسطٰی یا کتاب الصلٰوۃ الوسطٰی: ایک جلد میں عمدہ کتاب ہے۔

۱۰۔ المتجر الرابح فی ثواب العمل الصالح، ۱۱۔ مجالس بغدادیہ، ۱۲۔ مجالس دمشقیہ۔

۱۳۔ مختصر السیرۃ النبویہ: (یا سیرت مشہورہ) ایک جلد میں سیرت پر عمدہ کتاب ہے، اس کے بعد اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ ان میں سے اکثر کا ماخذ ہے، اہل تذکرہ کا بیان ہے کہ یہ جمیع علمائے سیرت کے لیے رہبر کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۴۔ معجم: اس میں تیرہ سو سے زائد شیوخ کے ناموں کو چار جلدوں میں جمع کیا گیا ہے مگر صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ یہ ایک ہزار شیوخ کے ناموں پر مشتمل ہے۔

علامہ دمیاطی کی تصنیفات میں چند اربعینات بھی ہیں۔

۱۵۔ اربعین تساعیات الاسناد والا بدال، ۱۶۔ اربعین حلبیه فی احکام النبویہ، ۱۷۔ اربعین فی الجهاد، ۱۸۔ اربعین متباینة الاسناد، ۱۹۔ اربعین موافقات عوالی۔

ان کی بعض تصنیفات سو حدیثوں پر مشتمل ہیں۔

۲۰۔ مأة تساعیه فی الموافقات و ابدال العلیه۔

(بستان المحدثین ص ۹۳ تا ۹۵)

Marfat.com

امام ولی الدین خطیب تبریزی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی بعد ۷۳۷ھ)

نام ونسب:

محمد نام، ابوعبداللہ کنیت اور ولی الدین لقب تھا لیکن خطیب تبریزی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں، باپ کا نام عبداللہ اور دادا کا محمد تھا۔

خاندان ووطن:

آذربائیجان کے مشہور اور بڑے شہر تبریز کو ان کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے، اس کی نسبت سے وہ تبریزی کہلاتے تھے اور خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ سے نسبی تعلق تھا، اس بنا پر عمری بھی کہلاتے تھے۔

اساتذہ:

ان کے ایک ہی شیخ علامہ حسین بن محمد بن عبداللہ طیبی کا نام معلوم ہو سکا، جن کے مشورہ اور ایما سے خطیب نے مشکوٰۃ المصابیح مرتب کی تھی، جس کی خود طیبی نے ایک مبسوط شرح لکھی، حافظ ابن حجر طیبی کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

امر بعض تلامذته باختصار المصابیح علی طریقة نهجها له وسماه بالمشکوٰة وشرح وشرحا حافلا۔

(الدر الکامنہ جلد ۲ ص ۶۹)

طیبی نے اپنے ایک شاگرد کو امام بغوی کی مصابیح کو اسی نہج پر مختصر کرنے کا حکم دیا اور اس کا نام مشکوٰۃ رکھا اور اس کی ایک مبسوط شرح لکھی۔

تلامذہ:

شاگردوں میں بھی صرف ایک ہی نام، امام الدین علی بن مبارک شاہ ساوجی کا ملتا ہے، حافظ مزی کے خاص شاگرد تھے اور مشکوٰۃ ان ہی کی روایت سے رائج اور مشہور ہوئی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے خلف رشید حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے اپنی مشکوٰۃ کی سندیں بیان کرتے ہوئے ان کا نام تحریر کیا ہے۔ (اتحاف النبیہ ص ۷۹ وعجالہ نافعہ ص ۲۳)

علم وفضل:

ملا علی قاری فرماتے ہیں "وہ علم وفضل اور حقائق ودقائق کا بحر بیکراں تھے، ان کی کتابیں ان کے وسعت علم ونظر اور غیر

Marfat.com

معمولی فضل وکمال پر شاہد ہیں۔" (مقدمہ مشکوٰۃ از ابوبکر شاذیش) بلاشبہ مشکوٰۃ تبریزی کے فضل وکمال، علمی تبحر اور حدیث میں عظمت وبرتری کا ثبوت ہے۔

زہد وورع:

جن مصنفین نے خطیب تبریزی کا ذکر کیا ہے، وہ ان کے علم وفضل کی طرح صلاح وتقویٰ کے بھی معترف ہیں، ان کے استاذ علامہ طیبی نے ان کو "بقیۃ الاولیاء قطب الصلحا" اور ملا علی قاری نے "تقی نقی" لکھا ہے۔ (مقدمہ مشکوٰۃ از ابوبکر شاذیش)

فقہی مسلک:

مشکوٰۃ کی ترتیب وتبویب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شافعی المذہب تھے۔

وفات:

خطیب تبریزی کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں، اس لیے ان کے سن ولادت کی طرح سن وفات کا بھی علم نہ ہوسکا مگر یہ مسلم ہے کہ ۷۳۷ھ کے بعد ان کا انتقال ہوا تھا، کیونکہ اسی سال وہ مشکوٰۃ کی ترتیب وتالیف سے فارغ ہوئے تھے۔

تصنیفات:

ان سے دو کتابیں یادگار ہیں، ممکن ہے انہوں نے اور کتابیں بھی لکھی ہوں جواب ناپید ہیں۔

ا۔ مشکوٰۃ المصابیح: یہ حدیث کی بڑی اہم اور مقبول کتابوں میں ہے اور صحاح ستہ اور دوسری مستند کتب حدیث کا مجموعہ ہونے کی بنا پر خود بھی بہت معتبر سمجھی جاتی ہے، اس کی ترتیب اور تالیف میں امام بغوی کی مشہور کتاب مصابیح السنہ پر اعتماد کیا گیا ہے اور یہ دراصل اس کا تکملہ اور ذیل ہے، تبریزی نے اپنے استاذ علامہ طیبی کے مشورہ وایما سے اس کو مرتب کیا تھا، علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں:

"مجھ میں اور میرے دینی بھائی محمد بن عبداللہ خطیب میں ایک مجموعہ احادیث مرتب کرنے کے لیے مشورہ ہوا اور طے پایا کہ مصابیح کا تکملہ لکھا جائے اور اس کو از سر نو مرتب کیا جائے، چنانچہ انہوں نے میری خواہش کے مطابق پوری محنت وجانفشانی سے یہ مجموعہ مرتب کیا۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۴۳)

خود خطیب تبریزی کو بھی اعتراف ہے کہ انہوں نے یہ کتاب اپنے استاذ کی مدد اور مشورہ سے لکھی۔

گو مشکوٰۃ المصابیح، مصابیح السنہ کا تکملہ ہے، تاہم اس میں کہیں کہیں حذف واضافہ سے کام لیا گیا ہے، اس کی وجہ سے دونوں میں کسی قدر فرق بھی ہوگیا ہے اور مشکوٰۃ کی حدیثوں کی تعداد بھی مصابیح سے زیادہ ہوگئی ہے، مشکوٰۃ کے اضافے کی نوعیت حسب ذیل ہے:

ا۔ امام بغوی نے اختصار کے خیال سے سندیں حذف کردی تھیں اور کتابوں کے حوالے بھی نہیں دیے تھے، خطیب تبریزی نے حوالے بھی دیدیئے ہیں اور ان صحابہؓ کے نام بھی تحریر کیے ہیں جن سے حدیثیں مروی ہیں، اس کی وجہ سے ہر حدیث کا ماخذ بھی معلوم ہوجاتا ہے اور اس کی صحت وقوت اور درجہ ومرتبہ کا بھی پتہ چل جاتا ہے، چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:

Marfat.com

''امام ابو محمد حسین بن مسعود فراء بغوی کی کتاب المصابیح اپنے موضوع پر بہت جامع کتاب ہے، اس میں مختلف و متفرق حدیثوں کو نہایت خوبی سے ضبط کیا گیا ہے، مگر اختصار کی بنا پر سندیں حذف کردی گئی ہیں، یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا ہے، حالانکہ بغوی جیسے مستند شخص کا نقل کرنا ہی سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ (دیباچہ مشکوٰۃ)

۲۔ امام بغوی نے ہر ہر باب میں دو ہی فصلیں قائم کی تھیں لیکن امام تبریزی نے عموماً تین فصلیں قائم کی ہیں، پہلی فصل میں تو بغوی کی طرح صرف صحیحین کی روایتیں درج کی ہیں اور دوسری میں ان ائمہ کے علاوہ جن سے بغوی نے روایتیں نقل کی ہیں، بعض دوسرے ائمہ فن کی کتابوں کی حدیثیں بھی شامل کردی ہیں اور تیسری فصل میں جو بغوی کے یہاں نہیں ہے، مرفوع حدیثوں کے علاوہ ابواب کے مناسب آثار صحابہؓ و تابعینؒ نقل کر کے راویوں کے نام اور کتابوں کے حوالے دے دیئے ہیں، جیسا کہ لکھتے ہیں:

''ترتیب و تبویب میں صاحب مصابیح کی پیروی کی گئی ہے، البتہ ہر باب کو عموماً تین فصلوں میں منقسم کیا گیا ہے، پہلی فصل میں شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی حدیثیں جمع کی گئی ہیں اور دوسری فصل میں ائمہ صحاح (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی) کے علاوہ جن سے شیخ نے روایتیں نقل کی ہیں، امام مالک، شافعی، احمد، دارقطنی، بیہقی و رزین بن معاویہ وغیرہ کے مرویات بھی شامل کیے گئے ہیں، تیسری فصل میں مقررہ شرطوں [1] کے مطابق اس کے ابواب کے ہم معنی سلف و خلف سے منقول مناسب الحاقات درج ہیں۔'' (دیباچہ مشکوٰۃ)

۳۔ صاحب مصابیح نے جن حدیثوں کی غرابت یا ضعف و نکارت کی جانب صرف اشارہ کیا ہے، صاحب مشکوٰۃ نے ان کی غرابت یا ضعف و نکارت کے وجوہ بھی بتادیئے ہیں اور جن کے بارے میں انہوں نے سکوت اختیار کیا ہے، ان کے سلسلہ میں صاحب مشکوٰۃ نے بھی سکوت سے کام لیا ہے، البتہ بعض جگہ کسی خاص مصلحت و ضرورت کے تحت بعض وضاحتیں کی ہیں، جیسے ان روایتوں کے سلسلہ میں جن پر کوئی طعن کیا گیا ہے اور امام بغوی نے ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے تو ان کے سکوت کے باوجود امام تبریزی نے ان کی اصل حقیقت واضح کر کے یہ بتایا ہے کہ وہ حسن ہیں یا ضعیف؟

۴۔ جن حدیثوں کو صاحب مصابیح نے مکمل نہیں نقل کیا ہے، امام تبریزی نے کسی خاص مصلحت کے تحت ابواب کی مناسبت سے ان کو مکمل ذکر کیا ہے۔

حذف و اختصار اس طور پر کیا گیا ہے۔

۱۱۔ مصابیح کی مکرر حدیثوں کو مشکوٰۃ میں تکرار کی وجہ سے نظر انداز کردیا گیا ہے۔

۱۲۔ مفصل اور طویل روایتوں کی غیر ضروری طوالت و تفصیل کو حذف کر کے مختصر روایتیں نقل کی گئی ہیں۔

۱۳۔ امام بغوی نے جن طویل حدیثوں کو کسی ایک ہی باب میں تحریر کیا ہے، امام تبریزی نے ان کے کچھ حصے تو اسی باب میں نقل کیے ہیں، مگر دوسرے حصوں کو ان کے مناسب دوسرے باب میں نقل کیا ہے۔

استدراک:

مشکوٰۃ میں کہیں کہیں بغوی پر استدراک بھی کیا گیا ہے، جیسے مصابیح کی پہلی فصل میں بعض ایسی حدیثیں شیخین کی جانب

[1] (مقررہ شرطوں سے صحابہ یا تابعین کے ناموں اور حوالوں کی تخریج مراد ہے)

Marfat.com

منسوب کی گئی ہیں، جو درحقیقت ان کے بجائے دوسرے محدثین کی کتابوں میں مذکور ہیں، اسی طرح دوسری فصل کی بعض حدیثیں جو شیخین کے بجائے اور ائمہ حدیث کی جانب منسوب کی گئی ہیں، حالانکہ وہ شیخین کی کتابوں میں درج ہیں، امام تبریزی نے ان دونوں قسموں کی غلطیوں کی تصحیح کردی ہے، اس کی وجہ سے مشکوٰۃ کی پہلی فصل میں بعض دوسرے ائمہ کی اور دوسری فصل میں شیخین کی حدیثیں بھی شامل ہوگئی ہیں لیکن تبریزی نے اس طرح کے مواقع پر تصریح ووضاحت کردی ہے۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ امام تبریزی نے امام بغوی ہی کی تحقیق پر اعتماد کرلینے کو کافی نہیں سمجھا ہے، بلکہ خود بھی مراجعت کر کے حدیثوں کے بارے میں چھان بین کی ہے،

جیسا کہ تحریر فرماتے ہیں:

''اگر تم کو مشکوٰۃ کی پہلی اور دوسری فصلوں میں اصل کتاب (مصابیح) سے کوئی فرق واختلاف نظر آئے مثلاً پہلی فصل میں شیخین کے علاوہ اور ائمہ حدیث کی یا دوسری فصل میں شیخین کی روایتیں درج ملیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے خود بھی تحقیق و کاوش کی ہے اور حمیدی کی الجمع بین الصحیحین اور ابن اثیر کی جامع الاصول کا تتبع کر کے صحیحین کے متن پر اعتماد کیا ہے۔ (دیباچہ مشکوٰۃ)

ایک اور جگہ اپنی تلاش وتفحص کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:

''میں نے حدیثوں کی تلاش وجستجو اور تحقیق وتفتیش میں اپنے امکان بھر پوری جدوجہد کی ہے۔'' (ایضاً)

شروح وحواشی:

مشکوٰۃ المصابیح کی اہمیت ومقبولیت کا یہ بھی ثبوت ہے کہ محدثین اور علمائے فن نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے اور اس کی متعدد شرحیں، تعلیقات اور حواشی لکھے گئے ہیں اور فارسی، اردو، انگریزی اور ترکی زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے ہیں۔

شرحوں اور حواشی کے نام یہ ہیں:

۱۔ **الاکمال فی اسماء الرجال:** یہ رسالہ خود خطیب تبریزی کی تصنیف ہے، اس میں انہوں نے مشکوٰۃ کے رجال پر گفتگو کی ہے، کہا جاتا ہے کہ اس کو لکھ کر انہوں نے جب اپنے استاذ علامہ طیبی کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے مشکوٰۃ کی طرح اس کو بھی بہت پسند کیا تھا، اس کے قلمی نسخے کئی کتب خانوں میں ہیں اور یہ چھپ بھی گیا ہے۔

۲۔ **الکاشف عن حقائق السنن:** یہ علامہ طیبی کی شرح ہے، خطیب تبریزی کی اس سے بڑھ کر خوش نصیبی اور مشکوٰۃ کی مقبولیت اور اہمیت اور کیا ہوسکتی ہے کہ خود ان کے استاذ نے شرح لکھی، چنانچہ فرماتے ہیں:

''جب وہ مشکوٰۃ کی تالیف مکمل کرچکے تو میں اس کی شرح لکھنے کے لیے کمربستہ ہوا، اس میں مشکوٰۃ کے مشکل مباحث اور غریب الفاظ کو حل کیا گیا ہے اور نکات ولطائف مستنبط کیے گئے ہیں اور نحوی مشکلات اور معانی وبیان کے مسائل سے بھی بقدر ضرورت تعرض کیا گیا ہے، ان مباحث کی تحقیق کے لیے جن ائمہ فن کی کتابوں کا تتبع کیا گیا ہے، ان کے حوالے بھی دیے گئے ہیں، حوالے کے لیے مخصوص علامتیں اور نشان مقرر کیے گئے ہیں، جہاں حوالے نہیں دیے گئے ہیں وہ میرے اپنے نتائج فکر ہیں جو لوگ اس کو انصاف کی نظر سے دیکھیں گے وہ اس کو نہایت مختصر، جامع اور محققانہ کتاب پائیں گے۔'' (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۴۳)

شروع میں حدیث کے اصول واصطلاحات اور اس کے اقسام وانواع، نیز جرح وتعدیل پر مفید بحث کی گئی ہے، یہ مشکوٰۃ

Marfat.com

کی اہم اور مفید شرح ہے جو شرح طیبی کے نام سے مشہور ہے غالباً ابھی تک چھپی نہیں۔

۳۔ حاشیہ سید شریف: علامہ سید شریف علی بن محمد بن علی جرجانی (م ۸۱۶ھ) نے مشکوٰۃ پر ایک مفید حاشیہ قلمبند کیا تھا، اس کا ایک قلمی نسخہ خدابخش خاں لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ (فہرست ج ۱ ص ۴۹)

۴۔ ھدایۃ الرواۃ الی تخریج المصابیح والمشکوٰۃ: یہ حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ) کی تصنیف ہے، اس میں مصابیح ومشکوٰۃ دونوں کی حدیثوں کی تخریج کی گئی ہے، (کشف الظنون ج ۲ ص ۶۴۷) اور یہ دراصل مناوی کی لباب الصدر کا خلاصہ ہے۔
(ایضاً ص ۳۵۰)

۵۔ منہاج المشکوٰۃ: عبدالعزیز بن محمد بن عبدالعزیز ابہری (م ۸۹۵ھ) نے امیر علی شیر کے لئے یہ شرح لکھی تھی۔
(الظنون ج ۱ ص ۴۴۳)

۶۔ فتح الالٰہ فی شرح المشکوٰۃ: یہ علامہ شہاب الدین احمد بن محمد بن محمد بن علی بن حجر ہیثمی شافعی (م ۹۷۴ھ) کی شرح ہے۔ (ایضاً)

۷۔ مرقاۃ المفاتیح: یہ احادیث کے مشہور خادم اور نامور حنفی عالم شیخ نورالدین علی بن سلطان بن محمد ہروی المعروف ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ) جو چار جلدوں پر مشتمل ہے، اس میں پہلے کی تمام شرحوں اور حواشی کے مباحث کے علاوہ دوسرے مفید اور ضروری معلومات تحریر کیے گئے ہیں، اس حیثیت سے اس کو بہت جامع اور اہم خیال کیا جاتا ہے۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۴۴۳) ملا صاحب اس کے متعلق خود تحریر فرماتے ہیں:

”چونکہ مشکوٰۃ المصابیح احادیث نبوی کی ایک جامع کتاب ہے، اس لیے مجھ کو اس کے مطالعہ کا شوق ہوا اور میں نے حرم کے شیوخ سے اس کو پڑھا مگر ان لوگوں کے پاس کوئی صحیح اور مستند نسخہ نہ تھا اور شارحین نے محض بعض لفظوں کو ضبط کیا تھا، اس لیے میں نے مختلف نسخوں سے مقابلہ وتصحیح کر کے ایک صحیح نسخہ تیار کیا اور پھر ایک لطیف شرح لکھی، اس میں الفاظ کو بھی ضبط کیا گیا ہے اور روایتوں کی فنی بحث وتحقیق کر کے ان کے معانی ومطالب کی تشریح بھی کی گئی ہے۔“ (فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۴۱۶)

۸۔ انوار المشکوٰۃ: یہ ملا علی قاری کے بعد کے کسی فاضل کی تصنیف ہے، اس میں مشکوٰۃ کی تین فصلوں پر ایک اور فصل کا اضافہ کر کے چار فصلیں قائم کی گئی ہیں، چوتھی فصل میں ان سات ائمہ حمیدی، ابن اثیر، صغانی، قضاعی، اقلیشی، نووی، اور مدینی کی کتابوں سے ایسی روایتیں درج کی گئی ہیں جو مجتہدین فی المذہب کی مستدل بہا ہیں اور اس طرح یہ مشکوٰۃ اور مرقاۃ دونوں کی شرح ہے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۴۴ و ۴۴۳)

۹۔ لمعات التنقیح: ہندوستان کے نامور محدث حضرت شاہ عبدالحق دہلویؒ (م ۱۰۵۲ھ) نے مشکوٰۃ پر بڑا کام کیا ہے، یہ ان کی عظیم الشان تصنیف اور مشکوٰۃ کی اہم شرح ہے، ان کا بیان ہے کہ:

”حرمین سے واپسی اور وہاں کے شیوخ سے روایت حدیث کی اجازت لینے کے بعد جب حدیث نبویؐ کی خدمت کی سعادت بندہ کو میسر آئی تو خواہش ہوئی کہ مشکوٰۃ المصابیح کی جس کی غیر معمولی شہرت ہے، شرح لکھی جائے اور اس میں علماء نے اپنی کتابوں میں جو فوائد لکھے ہیں یا جو شیوخ وقت سے ہم نے سنے ہیں، یا جو ہمارے دل میں ہیں، ان کو طلبہ کے سامنے بیان کر دیا جائے، بعض مخلص دوستوں کی رائے ہوئی کہ فارسی میں شرح لکھنا زیادہ بہتر اور مفید ہوگا لیکن آغاز کرنے اور اس کے لیے معلومات جمع کرنے کے بعد محسوس ہوا کہ اس کو فارسی میں تحریر کرنا مناسب نہیں تاہم دوستوں کی بات بھی ٹالی نہیں جاسکتی تھی، اس لیے عربی وفارسی دونوں

Marfat.com

میں ساتھ شرح لکھنا شروع کیا، عربی کی شرح پہلے مکمل ہوگئی۔"

لمعات التنقیح دو جلدوں میں عربی شرح ہے، جو بڑی فکر و کاوش اور تحقیق و تدقیق سے لکھی گئی ہے اور گونا گوں علمی مباحث لطیف تحقیقات اور مفید معلومات کا مجموعہ ہے، یہ متوسط اور عمدہ شرح ہے، اس میں نہ زیادہ تفصیل سے کام لیا گیا ہے اور نہ اختصار سے، لغوی ونحوی مشکلات اور فقہی مسائل کو بڑی خوبی سے حل کیا گیا ہے اور احادیث کی فقہ حنفی سے مطابقت دکھانے کی پوری کوشش کی گئی ہے، ۱۰۲۵ھ میں اس کی تالیف مکمل ہوئی تھی، (اتحاف النبلاص ۱۴۹) شروع میں ایک مفید و جامع مقدمہ میں شاہ صاحب نے اصول حدیث کے مباحث تحریر کیے ہیں، یہ مقدمہ مشکوٰۃ کے متن کے ساتھ اور علیحدہ بھی طبع ہو کر بہت مقبول ہوا لیکن اصل شرح ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ (ایضاً) قلمی نسخے ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔

۱۰۔ اشعۃ اللمعات: یہ حضرت محدث دہلویؒ کی فارسی شرح اور چار جلدوں پر مشتمل ہے، اس کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ متعدد بار چھپی، گو عربی شرح میں شاہ صاحب نے زیادہ کدو کاوش کی ہے، تاہم یہ بھی نہایت جامع اور بے نظیر ہے، ۱۰۳۷ھ میں اس کی ترتیب سے فارغ ہوئے تھے، پہلی جلد میں ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں فن حدیث اور اس کے مصطلحات کے علاوہ متعدد اکابر محدثین کا مختصر تذکرہ ہے جو اعظم پریس جونپور سے علیحدہ بھی چھپا تھا، شرح میں لغات و مطالب کو عمدہ طور پر حل کیا گیا ہے اور وہ مفید معلومات پر مشتمل ہے، فقہ حنفی کے مسائل کی وضاحت کے سلسلہ میں یہ بہت عمدہ شرح ہے۔

۱۱۔ جامع البرکات منتخب شرح المشکوٰۃ: شاہ صاحب نے اس کی دو جلدوں میں اپنی شرح مشکوٰۃ کا خلاصہ تحریر کیا ہے۔ (حیات شیخ عبدالحق دہلوی ص ۱۷۰)

۱۲۔ اسماء الرجال والرواۃ المذکورین فی کتاب المشکوٰۃ: یہ اسماء الرجال پر حضرت شیخ کی مشہور تصنیف ہے، اس میں مشکوٰۃ کے تمام رواۃ کی فہرست اور خلفائے راشدین اور اہل بیت کے حالات و مناقب بیان کیے گئے ہیں، اس کا قلمی نسخہ بانکی پور پٹنہ کی لائبریری میں موجود ہے، مگر ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ (ایضاً ص ۱۷۱ و ۱۷۲)

۱۳۔ مظاہر حق: یہ اردو میں مشکوٰۃ کا ترجمہ اور اس کی مختصر شرح ہے، ترجمہ کی ابتدا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی نے کی تھی مگر پھر ان کے ایما اور مشورے سے مولانا قطب الدین خاں دہلوی (۱۲۸۹ھ) نے اس کو شرح کی شکل دی، اردو میں ہونے کی وجہ سے ایک زمانے میں اس سے عوام کو بڑا فیض پہنچا، مظاہر حق کی زبان و طرز بیان کی قدامت کی بنا پر دار العلوم دیوبند کے بعض فضلا نے اس کو موجودہ دور کی سہل اور سلیس زبان میں معارف مشکوٰۃ کے نام سے شائع کیا ہے، پہلی جلد کے جو ۱۹۶۰ء میں چھپی ہے، آغاز میں اصول حدیث کے مسائل و مباحث پر ایک مقدمہ بھی ہے۔

۱۴۔ تنقیح الرواۃ فی تخریج احادیث المشکوٰۃ: یہ مشکوٰۃ پر مختصر مفید حاشیہ ہے، شارح مولانا ابوالوزیر سید احمد حسن دہلوی (م ۱۳۲۸ھ) علامہ میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد تھے، اس کا صرف ابتدائی نصف حصہ ۱۳۳۵ھ میں دہلی کے مطبع انصاری سے شائع ہوا ہے۔

۱۵۔ التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح: یہ شرح مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے تحریر کی ہے، اس کی چار نامکمل جلدیں دمشق سے ۱۳۵۴ھ میں شائع ہوئی ہیں۔

۱۶۔ مشکوٰۃ مع حاشیہ و تعلیق: ۱۳۸۰ھ میں ابوبکر شاویس نے مشکوٰۃ کا متن کئی نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کر کے ناصر الدین

Marfat.com

البانی کے تحشیہ وتعلیقات کے ساتھ دمشق سے شائع کیا ہے، اس میں حدیثوں پر ہندسہ کے دو طرح کے نمبر دیئے گئے ہیں، ایک تو کتاب کی مسلسل حدیثوں کے لحاظ سے ہے اور دوسرے سے ابواب کی حدیثوں کی تعداد ظاہر ہوتی ہے، حواشی میں حدیث کے غریب اور مشکل الفاظ اور وضاحت طلب امور کی تشریح کے علاوہ صاحب مشکوٰۃ کی مسامحتوں کا بھی ذکر ہے، جیسے غلط حوالوں کی تصحیح کی گئی ہے اور جہاں سرے سے حوالے نہیں دیئے گئے ہیں وہاں حوالوں کی تخریج کی گئی ہے اور جہاں ایک ہی حوالہ تحریر کیا گیا ہے، وہاں مزید دوسرے حوالے بھی تحریر کیے گئے ہیں، بعض جگہ مشکوٰۃ میں دو حوالے دے کر الفاظ کو ان میں سے کسی ایک کا بتایا گیا ہے لیکن محشی نے اس کے بجائے دوسری کتاب کے الفاظ بتائے ہیں، بعض حدیثوں کو مشکوٰۃ میں مرفوع، متصل اور مسند بتایا گیا ہے لیکن حاشیہ میں ان کے موقوف، منقطع اور مرسل ہونے کا ذکر ہے، اسی طرح اس میں جن کو موقوف وغیرہ کہا گیا ہے، اس میں ان کے اس کے برعکس ہونے کی تصریح کی گئی ہے، اسی طرح مشکوٰۃ میں اگر امام ترمذی کی روایتیں نقل کر کے ان کی تصحیح وتحسین یا تضعیف وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے تو اس میں اس کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے، جن حدیثوں کو مصنف نے نامکمل نقل کیا ہے، محشی نے اس کو مکمل نقل کر دیا ہے اور جن حدیثوں کے بعض الفاظ اور جملے نقل ہونے سے رہ گئے ہیں یا ان میں کسی طرح کا تغیر ہو گیا ہے تو حاشیہ میں ان کو اصل کے مطابق ٹھیک نقل کیا گیا ہے، اسی طرح جن حدیثوں کی سندیں ضعیف نقل ہوئی ہیں ان کے یا تو صحیح طرق بیان کئے گئے ہیں یا ان کی تقویت کے لیے شواہد ومتابعات بھی ذکر کر دیئے گئے ہیں۔

یہ خوب صورت اور دیدہ زیب ایڈیشن تین جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں کئی فہرستیں بھی دی گئی ہیں، شروع میں امام بغوی اور امام تبریزی کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں اور مصابیح ومشکوٰۃ پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔

۱۷۔ **زجاجة المصابيح:** یہ مولانا سید ابوالحسنات عبداللہ شاہ حیدر آبادی کی تصنیف ہے، اس کو مشکوٰۃ ہی کی طرز پر فقہی ابواب کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے اور عموماً کتب وابواب بھی اسی سے لیے گئے ہیں، البتہ مشکوٰۃ میں جہاں عنوانات میں شافعی مسلک کی رعایت کی گئی ہے، اس میں وہاں فقہ حنفی کی رعایت مدنظر رکھی گئی ہے اور ساتھ ہی حواشی میں حدیثوں کی مختصر تشریح بھی کی گئی ہے، اصل کتاب عربی میں لکھی گئی ہے، بعد میں اس کا اردو ترجمہ بھی شائع کیا گیا ہے۔

۱۸۔ **مرعاة المفاتيح:** جمعیۃ اہل حدیث ہند کے ممتاز عالم ومحدث مولانا ابوالحسن عبیداللہ رحمانی مبارک پوری بھی مشکوٰۃ کی ایک مبسوط شرح لکھ رہے ہیں، اس کی تین جلدیں اب تک شائع ہوئی ہیں، اس میں پہلے کی اکثر شرحوں کا خلاصہ آ گیا ہے، لائق شارح نے حدیثوں کی مفصل تشریح کر کے ان کے معانی ومطالب کی پوری وضاحت کی ہے، اس ضمن میں حدیث کے منکرین اور محدثین پر طعن وتشنیع کرنے والوں اور حدیثوں سے غلط نتائج مستنبط کرنے والوں کا جواب بھی دیا گیا ہے اور ان کے نقض وتضاد کو رفع بھی کیا گیا ہے، فقہی اختلافات نقل کرنے اور ائمہ فقہ واجتہاد کے مذاہب ودلائل بیان کر کے مرجح وقوی مسلک کی تعیین کی گئی ہے، شارح نے عموماً محدثین کے مذہب کی تصویب کی ہے اور مرجوح اقوال پر بعض جگہ رد وکد بھی کی ہے، حدیثوں کی مشکلات لغوی ونحوی مسائل کو حل کرنے پر خاص دھیان دیا گیا ہے اور ان پر نقد وبحث کر کے ان کا درجہ ومرتبہ اور قوت وضعف کی وضاحت بھی کی گئی ہے، رواۃ کے مختصر ترجمے اور بلاد واماکن کے متعلق ضروری معلومات تحریر کیے گئے ہیں، مشکوٰۃ کی پہلی اور تیسری فصل میں صحیحین کی جو حدیثیں نقل کی گئی ہیں اگر ان کی تخریج دوسرے محدثین نے بھی کی ہے تو اس کا ذکر

Marfat.com

کر دیا گیا ہے، اسی طرح دوسری فصل کی حدیثوں کے لیے جو حوالے دیئے گئے ہیں اگر ان کی تخریج ان کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی کی ہے تو اس کی تصریح کر دی گئی ہے، جہاں مصنف نے حوالے تحریر نہیں کیے ہیں وہاں حوالوں کی تخریج کی گئی ہے، اگر مصنف سے الفاظ حدیث کے نقل کرنے میں کوئی مسامحت ہوئی ہے تو اس کی تصحیح کر دی گئی ہے، یا اگر انہوں نے صحیحین کی جو حدیثیں پہلی فصل کے بجائے دوسری فصل میں اور دوسرے محدثین کی حدیثیں دوسری کے بجائے پہلی فصل میں بیان کی ہیں تو ان پر تنبیہ کی گئی ہے اور جن حدیثوں کو مصنف نے مختصر نقل کیا ہے، ان کو اس میں پوری نقل کر دیا گیا ہے، مسلسل حدیثوں پر نمبر دیئے گئے ہیں اور ابواب کی حدیثوں پر علیحدہ بھی نمبر دیا گیا ہے، شروع میں کئی مفصل فہرستیں اور ایک مقدمہ ہے، اس میں اصول حدیث پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

Marfat.com

امام جمال الدین زیلعی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۷۶۲ھ)

نام ونسب:

نام عبداللہ، کنیت ابومحمد اور لقب جمال الدین تھا، سلسلۂ نسب یوں ہے: عبداللہ ابن یوسف بن محمد بن ایوب بن موسیٰ۔
(لحظ الالحاظ ذیل طبقات الحفاظ ص ۱۲۸)

نام میں اختلاف ہے، بعض نے والد کا نام عبداللہ اور ان کا یوسف لکھا ہے۔ (الرسالۃ المستطرفہ ص ۵۱)

ولادت ووطن:

زیلعی کے سن ولادت کا علم نہیں ہو سکا مگر ان کا وطن زیلع نام کا ایک گاؤں ہے جو بحر حبشہ کے ساحل پر ایک بندرگاہ ہے، اس کو دوسرے اکابر علم وفن کا وطن ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔ (معجم البلدان الفوائد البہیہ ص ۹۵) امام فخر الدین زیلعی شارح کنز کا وطن بھی یہی سرزمین ہے، امام جمال الدین اسی کی نسبت سے زیلعی کہلاتے ہیں۔

اساتذہ وشیوخ:

بعض اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابن عقیل، شہاب احمد بن محمد بن فتوح تجیبی، شہاب احمد بن محمد بن قیس انصاری، اسکندر ابن تاج الدین، محمد بن عثمان، تقی الدین بن عبدالرزاق لخمی، جمال الدین عبداللہ بن احمد بوری، ابو محمد فخر الدین عثمان بن علی شارح کنز، قاضی علاؤ الدین بن ترکمانی، جلال الدین ابوالفتوح علی بن عبدالوہاب جریری۔ شیخ محمد بن احمد بن عثمان۔ (لحظ الالحاظ ص ۱۶۹)

حفظ وضبط:

علمائے فن نے زیلعی کے حفظ وضبط اور ثقاہت واتقان کا اعتراف کیا ہے، علامہ سیوطی نے مصر کے حفاظ حدیث اور نقادان فن میں ان کا تذکرہ کیا ہے، ارباب سیر وتذکرہ نے ان کو حافظ متقن اور احد حفاظ الحدیث وغیرہ لکھا ہے۔
(حسن المحاضرہ ج ا ص ۱۵۱ و مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۳۸)

حدیث میں درجہ

وہ حدیث میں بہت باکمال تھے، اس فن کی طلب وتحصیل اور کتب حدیث کی جمع وتالیف اور ہدایہ وکشاف کی حدیثوں کی

Marfat.com

تخریج سے ان کے علمی تبحر، وسعت نظر، حدیث میں کثرت اشتغال اور اس کے مباحث و مطالب پر دسترس اور متون وغیرہ سے مکمل واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

وہ حدیثوں کے متون و مطالب کی طرح ان کے طرق و اسناد پر بھی اچھی نظر رکھتے تھے، اور فن جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کے ماہر تھے، اس پر ان کی تخریج شاہد ہے، مولانا عبدالحئی لکھنوی فرماتے ہیں، زیلعی کی تخریج سے فن حدیث اور اس کی جزئیات و فروع میں ان کی وسعت علم و نظر اور اسماء الرجال میں تبحر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ (الفوائد البہیہ ص ۹۵)

فقہ:

فقہ میں بھی نہایت بلند پایہ تھے، اہل تذکرہ نے ان کی فقہی بصیرت اور تفقہ کا اعتراف کیا ہے، ان کی تخریج سے بھی ان کے فقہی کمال اور علمی جلالت کا اندازہ ہوتا ہے، مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے منقول ہے، کہ ابن ہمام نے ہدایہ کی شرح الفتح القدیر میں حنفی مذہب کے جو دلائل تحریر کئے ہیں وہ زیادہ تر زیلعی کی تخریج سے ماخوذ ہیں۔ (مقدمہ نصب الرایہ ص ۸)

حدیث و فقہ دونوں میں امتیاز کی بنا پر اصحاب طبقات و تراجم نے ان کو امام لکھا ہے، سیوطی نے ان کو ''الامام الفاضل المحدث'' اور ابن فہد نے ''الفقیہ الامام'' کہا ہے، حافظ ابن حجر فقہی مسلک میں اختلاف کے باوجود ان کو امام کے لقب سے موسوم کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ذیول تذکرۃ الحفاظ ص ۱۲ و تلخیص نصب الرایہ ص ۲)

علم و فن سے اشتغال:

زیلعی اصلاً حدیث و فقہ میں زیادہ ممتاز تھے، مگر دوسرے علوم سے بھی ان کی دلچسپی کم نہ تھی، ان کے علمی اشتغال و انہماک کا ذکر تمام ارباب سیر نے کیا ہے۔ (ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۸ و الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۳۱۰ و البدر الطالع ج ۱ ص ۴۱۰)

فقہی مذہب:

وہ مسلکاً حنفی تھے، اور ان کا شمار اجلۂ احناف میں ہوتا ہے، اسی بنا پر وہ حنفی کی نسبت سے بھی مشہور ہیں، لیکن جیسا کہ آگے معلوم ہوگا ان کو اس مذہب میں غلو نہ تھا۔

سیرت و اخلاق:

بڑے ستودہ سیرت اور پاک خو تھے، طبیعت میں نرمی، مروت اور شرافت تھی، اس لئے دوسرے مسلک کے لوگوں کے لئے بھی ان کے قلب میں نہ صرف گنجائش تھی بلکہ وہ ان سے میل جول بھی رکھتے تھے، تواضع اور خاکساری کا یہ حال تھا کہ اپنے سے کمتر درجہ کے لوگوں کے ساتھ مل کر حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کرنے میں ان کو کوئی تکلف نہ ہوتا تھا، سیرت و اخلاق کی بلندی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حنفی مذہب سے وابستہ ہونے کے باوجود ان کی طبیعت میں انصاف پسندی تھی، حدیثوں کی شرح و توجیہ اور ان کے مباحث و مسائل کی تحقیق میں فقہی و جماعتی عصبیت کو راہ نہ دیتے تھے، حافظ ابن حجر کو بھی اعتراف ہے کہ ''امام زیلعی نہایت حق گو و انصاف پسند تھے، ہر باب میں اپنے مذہب کے مخالفین کے دلائل بھی نہایت فراخ دلی سے بیان کرتے ہیں اور ان کو جو کچھ معلوم ہوتا تھا، اس کو بلا رد و کد نقل کرتے تھے۔ (الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۳۱۰)

Marfat.com

مقبولیت:

اپنی اسی شرافت، حسن اخلاق، میانہ روی اور عدل پسندی کی وجہ سے ہر طبقہ ومسلک کے لوگوں میں بہت مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔

عبادت وریاضت:

علمی کمالات کی طرح عبادت وریاضت اور تقویٰ وتدین میں بھی ممتاز تھے، کہا جاتا ہے کہ وہ مشائخ صوفیہ میں تھے اور عبادت وریاضت اور مجاہدات سے بڑا شغف رکھتے تھے، ان کا دل رذائل سے پاک صاف تھا۔

وفات:

مؤرخین کا اتفاق ہے کہ محرم ۷۶۲ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا، بعض نے تاریخ وفات ۱۱/محرم لکھی ہے، قاہرہ میں انتقال ہوا اور یہیں تجہیز وتکفین بھی ہوئی۔ (الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۳۱۰)

تصنیفات:

اوپر گزر چکا ہے کہ زیلعی کو علم وفن سے بڑا اشتغال تھا اور ان کا زیادہ وقت کتابوں کے مطالعہ اور حدیثوں کی جمع وتخریج میں گزرتا تھا، اس لیے ان سے متعدد کتابیں یادگار رہی ہوں گی مگر افسوس کہ ان کے حالات زندگی بہت کم معلوم ہو سکے اور ان کی چند ہی کتابوں کا پتہ چل سکا جو یہ ہیں:

۱۔ مختصر معانی الآثار: یہ امام طحاوی کی مشہور اور بے نظیر کتاب معانی الآثار کا مختصر ہے، کوثری صاحب کا بیان ہے کہ ازہر کے کتب خانہ رواق اتراک اور آستانہ کے کتب خانہ کو بریلی میں اس کے نادر قلمی نسخے موجود ہیں۔

۲۔ تخریج احادیث الکشاف: اس میں علامہ زمخشری کی مشہور تفسیر کشاف کی حدیثوں اور آثار کی تخریج کی گئی ہے، مگر حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ ''جن مرفوع حدیثوں کو زمخشری نے اشارۃً ذکر کیا تھا، ان کی تخریج نہیں کی گئی ہے اور موقوف آثار وروایات سے بھی تعرض نہیں کیا گیا ہے۔'' (الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۳۱۰ وکشف الظنون ج ۲ ص ۱۴۸۳) اس کمی کے باوجود اس کے استیعاب کا انہوں نے اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ مرفوع حدیثوں کی تخریج اور ان کے اسناد وطرق کی وضاحت میں خصوصیت سے بڑا اہتمام کیا گیا ہے اور نہایت دقت نظر سے کام لیا گیا ہے، انہوں نے ''الکافی الشاف فی تحریر احادیث الکشاف'' کے نام سے ایک جلد میں اس کا خلاصہ لکھا تھا اور ایک جلد میں اس پر استدراک بھی لکھا، آخر الذکر میں ان مرفوع حدیثوں کی جن کو صاحب کشاف نے اشارۃً ذکر کیا تھا اور ان موقوف آثار کی جن سے زیلعی نے کوئی تعرض نہیں کیا تھا، تخریج کی گئی ہے، یہ پتہ نہیں کہ اصل وتلخیص چھپیں یا نہیں؟ لیکن کتب خانہ خدیویہ مصر میں ان کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ (فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱)

۳۔ نصب الرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ:

یہ زیلعی کی بڑی مفید اور سب میں اہم اور مشہور کتاب ہے، اگر انہوں نے کوئی اور کتاب نہ لکھی ہوتی تو تنہا یہی کتاب ان کے فضل وکمال اور شہرت ومقبولیت کے لیے کافی تھی، اس میں انہوں نے فقہ حنفی کی مشہور معرکۃ الآراء کتاب الہدایہ کی حدیثوں کی

Marfat.com

تخریج کی ہے اس کی بعض نمایاں اور اہم خصوصیات یہ ہیں:

ا۔ یہ ہدایہ کی سب سے اہم اور پہلی تخریج ہے، اس کی اس سے عمدہ اور بہتر کوئی تخریج نہیں لکھی گئی، پس اس کو ہدایہ کی تمام تخریجات میں مزیت اور اولیت کا شرف حاصل ہے، بعض لوگوں نے علاؤالدین ترکمانی کی بھی جو زیلعی سے پہلے گزرے ہیں، ایک تخریج ہدایہ کا ذکر کیا ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے، انہوں نے ہدایہ کی تخریج کے بجائے اس کی شرح اور خلاصہ لکھا تھا، البتہ ان کے ہم عصر حافظ عبدالقادر قرشی صاحب جواہر مضیہ کی تخریج کا ضرور ثبوت ملتا ہے، مگر یہ نہ تو متداول ہے اور نہ اس کا کوئی مکمل نسخہ ہی موجود ہے، علاوہ ازیں قرشی کا طبقہ زیلعی سے متاخر ہے، اس لیے ان کی تخریج بھی زیلعی کے بعد لکھی گئی ہوگی، اسی طرح حافظ ابن حجر کا زمانہ بھی زیلعی کے بعد کا ہے، ان کی کتاب درایہ دراصل نصب الرایہ کا ملخص ہے۔

۲۔ یہ تخریج لکھ کر مصنف نے جس طرح حنفی مذہب کی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اسی طرح دوسرے فقہی مذاہب کی بھی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے، کیونکہ انہوں نے صرف حنفی مسلک اور اس کے دلائل بیان کرنے ہی پر اس میں اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ دوسرے ائمہ کے مذاہب اور ان کے دلائل، تخریجات وتفریعات بھی تفصیل ووضاحت کے ساتھ بیان کیے ہیں، اس اعتبار سے یہ محض حنفی مذہب ومسلک ہی کا عمدہ اور بیش قیمت ذخیرہ نہیں ہے، بلکہ اس کی حیثیت دائرۃ المعارف اور انسائیکلوپیڈیا کی ہے جس میں تمام ائمہ مجتہدین وفقہائے امصار کے مسالک ودلائل کی مکمل تفصیل موجود ہے۔

مصنف نے جہاں اس میں حنفی ائمہ کی امہات کتب سے معلومات ومسائل نقل کئے ہیں وہیں شوافع میں بیہقی، نووی اور ابن دقیق العید، مالکیہ میں ابن عبدالبر اور حنابلہ میں ابن جوزی اور ابن عبدالہادی وغیرہ اساطین مذہب کی کتابوں کے مباحث ومندرجات کا بھی منتخب حصہ شامل کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ علمائے احناف کی طرح دوسرے مذاہب کے لوگ بھی اس سے نقل واستفادہ کرتے رہے ہیں، زرکشی اور ابن حجر کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

۳۔ اس میں فقہ وحدیث اور رجال کی اکثر کتابوں کے مباحث ومطالب درج ہیں، اس لیے اس کو دیکھنے کے بعد ان کتابوں کی احتیاج باقی نہیں رہتی، متعدد ایسی کتابوں کے مندرجات بھی جمع کیے گئے ہیں جو اب دستبرد حوادث سے معدوم ہو گئی ہیں، یا اگر ہیں تو اتنی کمیاب اور نادر الوجود ہیں کہ ان کا حصول ودسترس ہر شخص کے لیے ممکن نہیں، جیسے صحیح ابوعوانہ، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن السکن اور معاجم، مسانید اور سنن کے دوسرے متعدد مجموعے، ابن عبدالبر کی کتاب الاستذکار والتمہید یا بیہقی، خطیب، ابن عدی ابوحاتم اور ابن جوزی وغیرہ کی علل ورجال کی ناپید کتابیں۔

۴۔ احکامی احادیث وروایات کے استقصا کے لحاظ سے یہ بے نظیر کتاب ہے، علاوہ ازیں حدیثوں سے مستنبط مسائل اور فقہی فوائد ومطالب پر مصنف نے بڑی عالمانہ گفتگو کی ہے اور بحث وتحقیق اور تلاش وجستجو کا حق ادا کر دیا ہے۔

۵۔ اس کی ایک اہم خصوصیت مصنف کی انصاف پسندی اور غیر جانبداری ہے، ان کا اصل مقصد ہدایہ کی حدیثوں کی تخریج اور حنفیہ کے نقطۂ نظر کے دلائل وشواہد پیش کرنا ہے مگر جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، انہوں نے دوسرے فقہی مذاہب اور ائمہ مجتہدین کے اقوال ودلائل بھی نہایت دیانتداری کے ساتھ بیان کیے ہیں، نہ کسی طرح کی عصبیت اور جانبداری سے کام لیا ہے اور نہ اپنے مذہب ومسلک کی بے جا حمایت اور تائید کی ہے۔

Marfat.com

۶۔ صرف فقہی حیثیت ہی سے اس کی اہمیت نہیں ہے، بلکہ یہ حدیث نبویؐ کی بھی نہایت مفید اور عظیم الشان خدمت ہے کیونکہ یہ حدیث کے مباحث و مطالب، متون و اسناد اور اصول حدیث کے بعض مسائل پر نادر تحقیقات اور پر مغز معلومات کا بھی ایک خزانہ ہے، چنانچہ حدیثوں کی صحت و عدم صحت اور اسناد و رجال کی قوت و ضعف کا اس سے مکمل اندازہ ہو جاتا ہے کیونکہ مصنف نے یہ تصریح کر دی ہے کہ اس سند میں فلاں راوی مجروح یا متکلم فیہ ہے، اسی طرح اگر کسی حدیث کے ہم معنی دوسری حدیثیں بھی ہوتی ہیں تو وہ ان کو بھی مع سند و متن ذکر کر دیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جرح و تعدیل کے موضوع پر ائمہ فن، جہابذۂ محدثین اور علم رجال و اسناد کے ماہرین کے اقوال کا یہ ایسا عظیم الشان ذخیرہ ہے جو اصول حدیث اور اسماء الرجال کی موجودہ مروج و متداول کتابوں میں بھی موجود نہیں ہے، اگر ان سب بحثوں کو اکٹھا کر لیا جائے تو یہ فن جرح و تعدیل کا ایک ضخیم مجموعہ بن جائے گا۔

۷۔ اس سے حدیثوں کے ماخذ و مرجع کا علم ہو جاتا ہے کیونکہ زیلعی نے ہر ہر حدیث کے بارے میں یہ تحریر کر دیا ہے کہ اس کو کس محدث نے اپنی کس کتاب میں نقل کیا ہے۔

ان خصوصیات سے نصب الرایہ کی عظمت و اہمیت کا کسی قدر اندازہ کیا جا سکتا ہے، درحقیقت یہ فقہ و حدیث، اصول حدیث اور رجال کا ایسا مفید اور مستند ذخیرہ ہے جس کے مطالعہ سے کوئی محدث و فقیہ بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

حافظ ابن حجر نے الدرایہ فی تلخیص نصب الرایہ کے نام سے اس کا ایک مختصر لکھا تھا، جو ہندوستان میں دوبارہ چھپا ہے اور قاسم بن قطلو بغا حنفی نے "منية الالمعی فیمافات من تخریج احادیث الهدایه للزیلعی" کے نام سے ذیل تحریر کیا تھا۔

تخریج زیلعی کا پہلا ایڈیشن ۱۳۱۰ھ میں مطبع علوی لکھنؤ سے شائع ہوا تھا اور دوسرا ۱۳۵۷ھ (مطابق ۱۹۳۸ء) میں مجلس علمی ڈابھیل نے مصر سے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپا ہے، یہ محققانہ مقدمہ اور مفید حواشی پر مشتمل ہے۔

اختتام حصہ دوم

Marfat.com

بَلِّغُوا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

تذکرۃ المحدثین

حصہ سوم

اس میں چھٹی صدی ہجری سے خانوادۂ شیخ عبدالحق دہلوی تک کے ممتاز اور صاحبِ تصانیف ہندوستانی محدثین کرام کے حالات و سوانح اور ان کی علمی و دینی اور محدثانہ خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

مرتبہ: ضیاء الدین اصلاحیؒ

مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)
اقراء سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون: 042-37224228-37355743
MAKTABA-E-REHMANIA

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

MAKTABA-E-REHMANIA

مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)

نام کتاب: تذکرۃ المحدثین (سوم)

مرتبہ: ضیاء الدین اصلاحیؒ

ناشر: مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)

مطبع: لٹل سٹار پرنٹرز لاہور

ضروری وضاحت

ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کے لیے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لیے پھر بھی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرما دیں تا کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی محمد الامین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

قرآن مجید کے بعد مسلمانوں کا اصلی دارومدار ان احادیث نبویہؐ پر ہے جو آنحضرت ﷺ کے واسطہ سے صحیح اور مستند طریقہ پر ان تک پہنچی ہیں۔ قرآن مجید میں جو اصول وکلیات، بنیادی تعلیمات وہدایات اور مجمل احکام بیان کیے گئے ہیں، رسول اکرم ﷺ نے اپنے اقوال واعمال کے ذریعہ ان کی تشریح وتفصیل کی ہے، اس لیے مسلمانوں کا اصل سرمایہ اور راس المال یہی دونوں چیزیں ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ: ”اگر میرے بعد تم لوگ ان دونوں چیزوں کو مضبوطی سے اختیار کرو گے تو ضلالت میں نہیں پڑو گے۔“

آنحضرت ﷺ کے ساتھیوں اور جانثاروں نے آپؐ کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اور آپؐ کی ایک ایک بات کو نہ صرف یاد رکھا بلکہ آپؐ کی تعلیم وتلقین کے مطابق اسے دوسروں تک بھی پوری احتیاط اور ذمہ داری سے پہنچایا۔ اسی طرح برابر چراغ سے چراغ جلتا رہا اور ہر دور میں احادیث سے مسلمانوں کا شغف وانہماک قائم رہا۔ جس کی بنا پر آپؐ کے اقوال واعمال اور سیرت وزندگی کا کوئی پہلو لوگوں سے مخفی ومستور نہیں رہا۔

ابتداء میں گو تحریر وکتابت کا زیادہ رواج نہیں تھا کیونکہ عربوں کا حافظہ قوی ہوتا تھا نیز قرآن مجید سے احادیث کے خلط ملط ہو جانے کا اندیشہ تھا، تاہم احادیث کی جمع وتدوین کا سلسلہ آپؐ کے عہد مبارک ہی میں شروع ہو گیا تھا، اور بعض صحابہ کرامؓ کے پاس ایسے صحائف اور نوشتے موجود تھے جن میں حدیثیں قلمبند تھیں، صحابہؓ کے آخری دور میں احادیث کی نقل واشاعت کا رواج عام طور پر ہو گیا تھا اور مسلمانوں کی ایک جماعت صرف اسی کام کے لیے مخصوص ہو گئی تھی جس کو محدثین کہا جاتا ہے، ان لوگوں نے صرف احادیث کو نقل وجمع کرنے ہی کا کام انجام نہیں دیا بلکہ ان کا مہتم بالشان کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے حالات وواقعات کو پوری صحت کے ساتھ جمع کیا، حدیثوں اور ان کے راویوں کی مکمل تحقیق اور پوری چھان بین کی۔

احادیث کی باقاعدہ جمع وتدوین کا کام لگ بھگ پہلی صدی ہجری کے آخر میں شروع ہوا۔ مولانا شبلیؒ فرماتے ہیں کہ دوسری قوموں کے یہاں جب کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلمبند کیے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلمبند کر لی جاتی ہیں جن کے راویوں کا نام ونشان تک معلوم نہیں ہوتا اور ان افواہوں میں وہ واقعات انتخاب کر لیے جاتے ہیں جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں۔ یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں لیکن اس معاملہ میں مسلمانوں نے جو معیار قائم کیا وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا، اس کا پہلا اصول روایت کا تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کی زبان سے کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک

Marfat.com

تمام راویوں کا نام، بہ ترتیب بتایا جائے، اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کی جائے کہ جو اشخاص سلسلہ روایت میں آئے وہ کون لوگ تھے، کیسے تھے، کیا مشاغل تھے، چال چلن کیسا تھا، حافظہ کیسا تھا، سمجھ کیسی تھی، ثقہ تھے یا غیر ثقہ، سطحی الذہن تھے یا دقیقہ ہیں؟ عالم تھے یا جاہل؟ ان جزئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل بلکہ ناممکن تھا، سینکڑوں، ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کردیں، ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کی معلومات بہم پہنچائیں، جو لوگ ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کیے، ان تحقیقات کے ذریعہ سے اسماء الرجال (بیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہوگیا جس کی بدولت آج کم از کم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہوسکتے ہیں۔

تحقیق واقعات کا دوسرا اصول درایت کا تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے عقلی شہادت کے مطابق بھی ہے یا نہیں؟ اصول روایت و درایت پر متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ سیرۃ النبیؐ کے مقدمہ اور خطبات مدراس میں بھی اس کی پوری تفصیل موجود ہے، یہاں صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ احادیث کی جمع و تدوین اور راویوں کی چھان بین میں محدثین نے کس قدر کدوکاوش اور محنت و جانفشانی کی ہے جس کی بدولت احادیث و روایات کے صحیح و مستند مجموعے مرتب ہوئے۔ دار المصنفین نے مسلمانوں کے علوم و فنون کی تاریخ مدون کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس میں اس کے پیش نظر محدثین کرام کے حالات و کارناموں پر مبسوط کتاب لکھنا بھی تھا، یہ کتاب اسی سلسلہ کی کڑی ہے جس کی دو جلدیں الحمد للہ اس سے پہلے چھپ کر مقبول ہوچکی ہیں، مگر ان دونوں جلدوں میں ہندوستان کے باہر کے محدثین کا ذکر تھا، غیر ہندوستانی محدثین کا سلسلہ ابھی نامکمل ہی تھا کہ اہل علم کی جانب سے اس کا تقاضا ہونے لگا کہ پہلے ہندوستانی محدثین کا تذکرہ قلمبند کیا جائے۔ یہ اصرار و تقاضا بیجا نہیں تھا اس لیے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اس کے بھروسے پر ہندوستان کے مشہور صاحب تصانیف محدثین پر کام شروع کردیا گیا اور خدا خدا کرکے اس کی ایک جلد مکمل ہوگئی۔

ہندوستان کے محدثین کے حالات کو ایک ہی جلد میں سمیٹنا ناممکن تھا، اندازہ ہے کہ کم از کم ابھی دو جلدوں میں یہ سلسلہ مکمل ہوگا اس کتاب کو اس سلسلہ کی پہلی جلد سمجھنا چاہیے۔ ناظرین اس پورے سلسلہ کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں جو یقیناً ان اوراق کے مرتب کے لیے بھی بڑی خوش قسمتی اور دینی و دنیاوی سعادت کی بات ہوگی۔

یہ جلد محدثین ہند کے لیے مخصوص ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں علم حدیث کی اجمالی تاریخ یہاں بیان کردی جائے۔

مسلمانوں کی علمی تاریخ نہایت زریں اور درخشاں ہے، انہوں نے جس چپہ زمین پر قدم رکھا وہاں علم و ہنر کا ایک تازہ جہان آباد ہوگیا۔ ہندوستان بھی ان کے علم و فن کی برکتوں سے مالامال ہے۔

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان حملہ آور اور فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور اس سے ان کے تعلق کا آغاز محمود غزنوی کے حملہ یا محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے زمانہ سے ہوتا ہے لیکن یہ خیال سراسر غلط ہے، دراصل ہندوستان سے عربوں اور مسلمانوں کا تعلق بہت قدیم ہے، عرب تاجروں اور سواحل ہند کے سوداگروں میں تجارتی تعلقات عرصہ سے چلے آرہے تھے، شمالی ہندوستان میں درہ خیبر سے آنے والے مسلمان ترکوں اور افغانوں کا زمانہ چوتھی صدی ہجری کا آغاز ہے، لیکن جنوبی ہندوستان میں ملیبار اور کارومنڈل سے گجرات تک کے علاقہ میں عربوں کی آمدورفت اور تجارت کا سلسلہ اسلام سے بہت پہلے شروع ہوگیا تھا اور وہ

Marfat.com

ان علاقوں میں آباد ہوگئے تھے جن کی اولاد آج تک وہاں موجود ہے اسی طرح ہندوستان کی بعض قومیں اور جماعتیں بھی عرب کے بعض علاقوں میں مستقل طور سے آباد ہوگئی تھیں جن کے ناموں سے اہل عرب واقف تھے، خود رسول اللہؐ اور صحابہؓ بھی ان کو جانتے تھے، احادیث وسیر کی کتابوں میں ان کے تذکرے بھی پائے جاتے ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کا بیان ہے کہ مسلمان ہندوستان کو اپنا مفتوحہ ملک نہیں بلکہ اپنا موروثی پدری وطن سمجھتے ہیں کیونکہ بعض ضعیف روایتوں میں اس کا ذکر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جب آسمان کی جنت سے نکالے گئے تو وہ اسی زمین کی جنت میں جس کا نام ہندوستان ہے اتارے گئے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام لنکا میں اترے تھے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ''دجنا'' میں اترے، مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق کے مطابق یہ دراصل دکن کا علاقہ ہے جہاں سے ملک عرب میں متعدد قسم کی خوشبوئیں اور مسالے بھیجے جاتے تھے اور پھر عربوں کے ذریعہ وہ تمام دنیا میں پھیلے تھے۔

ترکوں، پٹھانوں اور مغلوں کے آنے سے صدیوں پہلے جو اہل عرب اور مسلمان تاجر کی حیثیت سے سندھ اور ملیبار سے لے کر گجرات اور موجودہ مہاراشٹر تک بحر ہند کے پورے سواحل پر پھیل چکے تھے وہ اپنے ساتھ اپنا دین، اپنا قرآن اور اپنے علوم وفنون بھی لائے تھے، اور یہاں ان کی مختلف آبادیاں اور مسجدیں بھی تعمیر ہوگئی تھیں جو اسلام کی ابتدائی درسگاہیں تھیں، ان میں بیٹھ کر ان کے علماء محدثین قال اللہ وقال الرسول کا آوازہ بلند کرتے تھے۔

۹۳ھ میں سندھ فتح ہوا جس کے بعد سے تیسری صدی ہجری کے شروع تک یہ علاقہ مسلمانوں کے زیر نگیں رہا لیکن سندھ پر مسلمانوں کی تاخت کا سلسلہ حضرت عمرؓ کے عہد ہی سے شروع ہوگیا تھا، اس لیے اسی زمانہ سے یہاں مسلمان بھی آنا شروع ہوگئے جن میں بعض صحابہ کرامؓ بھی تھے، انہوں نے اور ان کے بعد تابعین وتبع تابعینؒ نے بھی اس ملک میں اس عہد کے دستور اور طریقہ کے مطابق حدیث کی روایت کی ہوگی۔

عربوں کی حکومت کے قیام کے بعد سندھ، دیبل، منصورہ اور ملتان وغیرہ علم وفن کا مرکز اور اصحاب علم ودرس سے معمور تھے لیکن اس زمانہ کی علمی ودینی سرگرمیوں اور اشخاص ورجال کا ذکر کم ملتا ہے۔ تاہم علم حدیث سے شغف رکھنے والے والے بعض علماء محدثین کے نام یہاں تحریر کیے جاتے ہیں، ان میں سے بعض عرب سے ہندوسندھ میں آئے اور بعض اپنے وطن ہندوسندھ کو چھوڑ کر ملک عرب میں جا بسے تھے۔

ربیع بن صبیح سعدی بصری (م ۱۶۰ھ) ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندھی (ابومعشر مشہور صاحب مغازی ہیں، ان کے خاندان میں متعدد علماء محدثین گزرے ہیں) (م ۱۷۰ھ) اسرائیل بن موسیٰ بصری (دوسری صدی ہجری) ابوخالد یزید بن عبداللہ، بیسری سندھی (دوسری صدی ہجری) عباس بن عبداللہ سندھی (دوسری صدی ہجری) عبدالرحمٰن ابوامیہ سندھی (دوسری صدی ہجری) ابراہیم بن محمد دیبلی مکی (اوائل تیسری صدی ہجری) ابومحمد (اس خاندان میں بھی کئی اہل علم وفن پیدا ہوئے) رجا بن سندی اسفرائینی (۲۲۱ھ) ابومحمد خلف بن سالم سندھی بغدادی (م ۲۳۱ھ) ابوالحسن محمد بن عبداللہ سندھی بصری (تیسری صدی ہجری) ابومحمد موسیٰ بن سندھی (تیسری صدی ہجری) ابوجعفر سندھی (تیسری صدی ہجری) ابومحمد عبداللہ المنصوری، ابوالعباس احمد بن محمد المنصوری (چوتھی صدی ہجری) شعیب بن محمد بن دیبل

Marfat.com

(۳۱۵ھ کے بعد) ابوجعفر محمد بن ابراہیم دیبلی مکی (۳۲۲ھ) ابوالعباس احمد بن عبداللہ دیبلی نیشاپوری (۳۴۳ھ) ابوالفوارس احمد بن محمد صابونی سندھی مصری (م ۳۴۹ھ) ابوالقاسم منصور بن محمد (م ۳۸۶ھ) ابوبکر محمد بن علی بامیانی (۳۹۰ھ) علی بن موسیٰ دیبلی بغدادی (چوتھی صدی ہجری) خلف بن محمد دیبلی بغدادی (چوتھی صدی ہجری) وغیرہ۔

عربوں کی حکومت کے خاتمہ کے بعد غزنوی اور غوری سلاطین برسر اقتدار آئے اس دور میں اور اس کے بعد کئی صدی تک گجرات اور ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر ہندوستان خصوصاً شمالی ہند میں معقولات کی گرم بازاری رہی اور دینی علوم تفسیر و حدیث سے لوگوں کا اشتغال بہت کم رہا، ایران، خراسان اور ماوراء النہر سے آنے والے اصحاب علم و درس کی ساری توجہ فقہ و خلاف، تصوف و کلام اور معقولات کی جانب مرکوز رہی اور فقہ میں بھی اصل زور فقہ حنفی کے فروع و جزئیات ہی پر دیا جاتا تھا، علم، دانائی و دانشمندی کی جانب رغبت بڑھ جانے کی وجہ سے حدیث کی امہات کتب کے بجائے امام صغانی کی مشارق الانوار داخل درس تھی، اگر کوئی امام بغوی کی مصابیح السنۃ اور مشکوٰۃ المصابیح بھی پڑھ لیتا تھا تو وہ محدث کامل سمجھا جاتا تھا، اس دردناک صورتحال کا ذکر نواب صدیق حسن خاں، مولانا حکیم سید عبدالحئی رائے بریلی سابق ناظم ندوۃ العلما لکھنؤ اور استاذ العلما مولانا سید سلیمان ندوی سابق ناظم دار المصنفین نے اپنے اپنے مضامین و کتب میں دکھ کے ساتھ کیا ہے۔

درۂ خیبر سے آنے والے مسلمانوں نے اپنا قدم شمالی ہند کی طرف بڑھایا، سلاطین غزنہ کا دار السلطنت لاہور تھا، اس لیے اس عہد میں لاہور میں زیادہ اصحاب علم و فن جمع ہوئے، ذیل میں علم حدیث سے شغف رکھنے والے اس دور کے بعض علما کے نام پیش کیے جاتے ہیں۔

ابوالفتح عبدالصمد بن عبدالرحمان اشعثی لاہوری، سمرقندی (م ۴۲۹ھ) شیخ اسماعیل لاہوری (یہ تفسیر و حدیث دونوں میں ممتاز اور مشہور واعظ تھے جن کے ہاتھ پر بے شمار لوگ مسلمان ہوئے، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ پہلے شخص ہیں جو حدیث و تفسیر کا علم لاہور میں لائے) (م ۴۴۸ھ) ابوالحسن علی بن عمر بن حکم لاہوری (۵۲۹ھ) ابوالقاسم محمود بن خلف لاہوری اسفرائینی (م ۵۴۰ھ) ابومحمد بختیار بن عبداللہ ہندی (م ۵۴۱ھ) ابوالحسن بختیار بن عبداللہ ہندی (م ۵۴۳ھ) ابوالمکارم فضل اللہ بن محمد بوقانی سندھی (م ۶۰۰ھ) شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (م ۶۶۶ھ)

امام صغانی بھی اسی دور میں لاہور میں پیدا ہوئے اور ان کی تصنیف مشارق الانوار کو بڑی مقبولیت نصیب ہوئی لیکن ان کا فیض ہندوستان سے باہر زیادہ جاری رہا ان کے بعد گوسناٹا رہا تاہم کوئی کلیہ مستثنیات سے خالی نہیں ہوتا، نویں صدی ہجری تک جو محدثین گزرے ہیں اور جن کو حدیث سے اشتغال رہا ہے، ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا (م ۷۲۵ھ) مولانا شمس الدین یحییٰ اودھی (م ۷۴۷ھ) عمر غزنوی (م ۷۷۳ھ) شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (م ۷۸۲ھ) امیر کبیر سید علی ہمدانی (م ۷۸۶ھ) مولانا فخر الدین زرادی، مولانا برہان الدین محمود دہلوی (م ۷۸۸ھ) مولانا کمال الدین زاہد دہلوی (شاگرد مولانا برہان الدین دہلوی) وغیرہ۔

یہ کساد بازاری نویں صدی ہجری تک قائم رہی، آٹھویں صدی کے آخر میں دکن کی بہمنی سلطنت قائم ہوئی اس نے علم حدیث کی اشاعت کی طرف توجہ کی، گجرات کا علاقہ علم حدیث کے لیے کسی قدر شروع ہی سے زرخیز رہا ہے، نویں صدی کی ابتداء میں

Marfat.com

جب مظفر شاہ نے گجرات کی مستقل حکومت قائم کی تو علم حدیث کا تخم عرب سے ہندوستان کو منتقل ہونے لگا، اکبر کے دور میں گجرات پھر ممالک محروسہ کا جزو بن گیا اس کی وجہ سے اس کا فیض پورے ہندوستان میں پھیلنے لگا لیکن مرکزیت گجرات ہی کو حاصل رہی۔

غرض نویں صدی کے بعد ہندوستان میں نئے سرے سے علم حدیث کا آغاز ہوا، اس زمانہ میں حافظ محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی کے تلامذہ نے ہندوستان میں علم حدیث کو فروغ دینے میں نمایاں حصہ لیا، اس سلسلہ میں مولانا راجح بن داؤد گجراتی (۹۰۴ھ) مولانا وجیہ الدین محمد مالکی (م ۹۲۹ھ) جمال الدین محمد بن عمر حضرمی (م ۹۳۱ھ) اور مولانا علاء الدین احمد نہروالی (م ۹۴۹ھ) کے نام قابل ذکر ہیں، حافظ سخاوی کے ایک اور شاگرد شیخ رفیع الدین شیرازی (م ۹۵۴ھ) سے شمالی اور جنوبی ہند دونوں جگمگا اٹھے۔ وہ سکندر لودھی کے زمانہ میں دہلی آئے اور آگرہ میں درس و تدریس کا بازار گرم کیا، انہی کے شاگرد شیخ ابوالفتح تھانیسری تھے، میر سید عبدالاول زید پوری جون پوری (م ۹۶۵ھ) نے سب سے پہلے صحیح بخاری کی شرح لکھی جن کے شاگرد شیخ طیب محدث سندھی تھے، مولانا عبدالمالک عباسی گجراتی (۹۷۰ھ) کو صحیح بخاری زبانی یاد تھی، حافظ ابن حجر اور ابن حجر مکی کے تلامذہ نے بھی حدیث کے نور سے ہندوستان کی سرزمین کو منور کیا۔ اس عہد کے باکمال لوگوں کی ایک نامکمل فہرست یہاں دی جاتی ہے۔

شیخ محمد بن محمد عبدالرحمٰن مالکی مصری (م ۹۱۹ھ) رکن الدین مخدوم متوٹھوی (م ۹۴۹ھ) شیخ احمد فیاض امیٹھوی، (م ۹۸۱ھ) ملا علی محدث سمرقندی (م ۹۸۱ھ) شیخ احمد فیاض (امیٹھوی (م ۹۸۱ھ) ملا علی محدث سمرقندی (م ۹۸۱ھ) شیخ بھکاری کاکوروی (م ۹۸۱ھ) مولانا میرکلاں محدث اکبرآبادی (م ۹۸۳ھ) شیخ عبدالمعطی بن حسن مکی (۹۸۹ھ) سید عبداللہ عیدروس (۹۹۰ھ) شیخ سعید شافعی (م ۹۹۱ھ) شیخ محمد بن احمد بن علی فاکہی (م ۹۹۲ھ) شہاب الدین احمد بن بدرالدین مصری (م ۹۹۲ھ) حاجی ابراہیم محدث اکبرآبادی، مولانا عبدالرحمٰن محدث سرہندی (استاذ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی) شیخ بہلول بدخشی دہلوی شیخ ابراہیم بن احمد بن حسن بغدادی، شیخ ضیاء الدین مدنی، شیخ حمید سندھی، شیخ عبداللہ بن سعداللہ سندھی، شیخ رحمت اللہ بن عبداللہ سندھی (تینوں بھائی تھے مؤخر الذکر دونوں شیخ علی متقی (م ۹۷۵ھ) کے تلمیذ تھے) شیخ برخوردار سندھی یہ بھی شیخ علی متقی کے شاگرد تھے، شیخ عبداللہ لاہوری اور شیخ محمد بن طاہر پٹنی کا زمانہ بھی یہی ہے جن کا اور شیخ علی متقی کا تذکرہ اس جلد میں درج ہے، گیارہویں صدی کے اوائل میں جن لوگوں نے علم حدیث کی نشر و اشاعت کی ان کے نام یہ ہیں:

شیخ یعقوب صرفی کشمیری (م ۱۰۰۳ھ) شیخ جوہر ناتھ کشمیری (م ۱۰۲۶ھ) حاجی محمد کشمیری، ملا محمد شگرف محدث کشمیری، شیخ عبدالنبی گنگوہی، شیخ عبداللہ بن شمس الدین سلطان پوری، قطب الدین عباسی نہروالی، شیخ احمد بن اسماعیل مندوی اور شیخ علیم الدین مندوی وغیرہ۔

خزاں کے بعد بہار آتی ہے چنانچہ اکبر کے آخری دور میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی پیدا ہوئے اور انہوں نے عہد جہانگیری میں اپنی جہانگیری کا سکہ بٹھا دیا، ان کی اور ان کے خاندان کی بدولت شمالی ہند میں حدیث کا عام چرچا ہو گیا۔ جن کے اولیات اور کارناموں پر اس جلد میں مفصل بحث ملے گی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہی کے معاصر حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی بھی تھے، جن کے اصلاحی و تجدیدی کارناموں کی گونج آج تک پورے ہندوستان میں سنائی دیتی ہے، ان کا پایہ علم حدیث میں بھی بہت بلند تھا، مولانا سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں کہ

Marfat.com

ان کی تعلیم کی بنیاد اتباع سنت پر تھی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ علم حدیث اور شمائل کی طرف لوگوں کی توجہ زیادہ مبذول ہوگئی اور ان کے بعد صوفی محدثوں کا ایک عظیم الشان سلسلہ ہندوستان میں قائم ہوگیا۔

گیارہویں صدی کے خاتمہ کے بعد عبداللہ لاہوری محدث مکہ معظمہ میں، ابوالحسن سندھی (م ۱۱۳۹ھ) مدینہ منورہ میں مسند نشین تھے،۔ اسی زمانہ میں جبکہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا دریائے فیض جاری تھا، ہندوستان کی سرزمین پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی جامع کمالات ہستی نمودار ہوئی، انہوں نے اسلامی علوم وفنون کی از سرنو تجدید کا اہم کارنامہ انجام دیا، ان کا اور ان کی اولاد کا فیض آج تک اس برصغیر ہی نہیں پوری دنیا میں جاری ہے۔ ان شاء اللہ اس کی تفصیل آئندہ جلد میں بیان ہوگی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی بدولت ہندوستان کا کوئی گوشہ بھی قال اللہ وقال الرسول کی دلنواز صدا سے خالی نہیں رہا۔ اس لیے علم حدیث کی مرکزیت بھی کسی مخصوص علاقہ تک محدود نہیں رہی بلکہ ہر صوبہ اور ہر مقام اس کا مرکز ہوگیا، اس کی تفصیل بھی آئندہ جلدوں میں آئے گی جن کی تکمیل کے لیے ناظرین سے مکرر دعا کی درخواست ہے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم۔

ناچیز: ضیاء الدین اصلاحی

۲۵/اکتوبر ۹۰ء بمطابق ۴/ربیع الثانی ۱۴۱۱ھ

Marfat.com

امام حسن صغانی رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی ۶۵۰ھ۔ ۱۲۵۲ء)

نام ونسب:

حسن نام، رضی الدین لقب، ابوالفضائل کنیت اور نسب نامہ یہ ہے:

حسن بن محمد بن حسن بن حیدر بن علی۔ (بغیۃ الوعاۃ ص ۲۲۷ والفوائد البہیہ ص ۲۹)

عبدالقادر قرشی (متوفی ۷۷۵ھ۔ ۱۳۷۳ء) نے علی کے بعد اسماعیل کے نام کا اضافہ کیا ہے۔

(الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ ج ۱ ص ۲۰۱)

خاندان:

امام صغانی عربی النسل تھے، ان کا تعلق قبیلہ قریش کی اس شاخ سے تھا جس میں خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق پیدا ہوئے تھے، اسی لیے عمری وقرشی کی نسبت سے مشہور ہوئے وہ عدوی بھی کہلاتے تھے، یہ حضرت عمر کے دادا عدی بن کعب بن لوی کی طرف نسبت ہے۔

(کتاب الانساب ورق ۳۸۶)

ولادت:

عام مؤرخین کے بیان کے مطابق ان کی ولادت ۵۷۷ھ۔ ۱۱۸۱ء میں ہوئی۔ (بغیۃ الوعاۃ ص ۲۲۷ والفوائد البہیہ ص ۲۹) بعض نے ۱۰ صفر (الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ ص ۲۰۱ وتاج التراجم فی طبقات الحنفیہ ص ۱۸) اور بعض نے (مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۸۱ الاتحاف النبلاء المتقین ص ۲۴۳ وتذکرہ علمائے ہند ص ۴۸) ۱۵ صفر تاریخ لکھی ہے، عبدالقادر قرشی نے روز پیدائش پنجشنبہ لکھا ہے۔ (تاج التراجم ص ۱۸ والجواہر المضیہ ص ۲۰۱) نزہۃ الخواطر میں سن پیدائش ۵۵۷ھ۔ ۱۱۶۱ء درج ہے۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۱ ص ۱۳۷) جو اغلب ہے کہ کتابت کی غلطی ہوگی۔

اس زمانہ کے ایک فاضل مولانا عبدالحلیم چشتی نے جمہور کے بیان پر اپنی بے اطمینانی ظاہر کی ہے اور ثبوت میں تاج العروس (للسید مرتضیٰ زبیدی) کے حوالے سے خود صغانی کا حسب ذیل بیان نقل کیا ہے جو ان کی تصنیف العباب الزاخر سے ماخوذ ہے۔

سمعت والدی المرحوم بغزنۃ فی شہو رنیف وثمانین وخمسمائۃ یقول کنت اقرء کتاب الحماسہ لابی تمام علی شیخی بغزنۃ ففسر لی ہذا البیت۔ بیض مفارقنا تغلی مراجلنا نأسو باموالنا آثار ایدینا۔ واول لی فی قولہ بیض مفارقنا مأتی تاویل فاستغرب ذلک حتی وجدت الکتاب الذی یبین فیہ ہذہ الوجوہ ببغداد فی حدود سنۃ اربعین وستمائۃ والحمد للہ علی نعمہ۔

Marfat.com

میں نے ۵۸۰ھ [1] میں غزنہ میں اپنے والد مرحوم سے سنا تھا، وہ فرماتے تھے کہ جس زمانہ میں اپنے استاد سے ابوتمام کا حماسہ پڑھتا تھا، مجھے یاد ہے [2] کہ انہوں نے اس شعر: ہمارے سر کے بال مشک کے استعمال کی وجہ سے سفید ہو گئے ہیں، ہماری دیگیں (مہمانوں کے لیے) جوش کھا رہی ہیں، ہمارے ہاتھوں کے زخموں کا علاج ہم اپنے اموال سے کرتے ہیں، یعنی ہم سردار ہیں، دیت دیتے ہیں، ہم سے قصاص نہیں لیا جاتا۔ کا مطلب بتایا پھر شاعر کے اس قول بیض مفارقنا کی دو سو تاویلیں بیان کیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ کہیں اتنے سے جملہ کی دو سو تاویلیں کی جا سکتی ہیں تا آنکہ مجھے ۶۴۰ھ میں بغداد میں وہ کتاب مل گئی جس میں اس کے یہ وجوہ مذکور تھے۔

صغانی کے اس بیان کی وجہ سے مولانا کے نزدیک یہ ثابت ہے کہ یہ واقعہ سن شعور کا ہے، لہٰذا سن ولادت ۵۷۷ھ۔ ۱۱۸۱ء ہرگز صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (معارف جلد ۸۳ عدد اص ۱۲) وہ مزید فرماتے ہیں کہ: صغانی نے اپنے قیام غزنہ ۵۸۰ھ۔ ۱۱۸۴ء کا ایک نہایت علمی واقعہ اپنے والد کی زبانی نقل کیا ہے کہ جمہور مؤرخین کے قول پر اس وقت صغانی کی عمر مشکل سے تین سال کی ہوتی ہے، تین برس کا بچہ جو اچھی طرح سے بول بھی نہیں سکتا وہ عربی ادب کی بلند پایہ کتاب حماسہ کو کیا سمجھ سکتا ہے اور اس کے اشعار کو کیونکر یاد رکھ سکتا ہے۔ (ایضاً)

تعجب ہے کہ مولانا نے نیف ثمانین وخمسمائۃ کا ترجمہ ۵۸۰ھ۔ ۱۱۸۴ء کس طرح کیا ہے، ان کی بے اطمینانی اور جمہور کی رائے سے اختلاف میں خود ان کی مسامحت کو بڑا دخل ہے۔

ان کے نزدیک صغانی کا سن پیدائش ۵۵۵ھ۔ ۱۱۶۰ء ہے، انہوں نے علامہ ذہبی کا یہی قول بتایا ہے جسے مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں ذہبی کے حوالہ سے نقل کیا ہے اور تیرہویں صدی ہجری کے عالم و مؤرخ اسماعیل پاشا بن محمد امین البغدادی نے بھی ہدیۃ العارفین میں یہی سن پیدائش نقل کیا ہے۔ مولانا نے اس کی تائید میں بعض اور قرائن بھی پیش کیے ہیں اور لکھا ہے کہ ان سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ جو سال ولادت سید مرتضیٰ زبیدی نے نقل کیا ہے وہی صحیح ہے۔ (معارف ج ۸۳ عدد اص ۱۳ تا ۱۶)

ان مختلف بیانات کی وجہ سے صغانی کے سن ولادت کی صحیح تعیین مشکل ہے تاہم اس قدر مسلم ہے کہ وہ آخری غزنوی فرمانروا خسرو ملک (۵۵۵ھ۔ ۱۱۶۰ء تا ۵۸۲ھ۔ ۱۱۸۶ء) کے دور حکومت میں پیدا ہوئے۔

مولد و وطن:

ان کے آباؤ اجداد صغان میں آباد تھے جو ماوراء النہر میں ترمذ کے قریب دریائے وخش (سرخ آب) کے مغربی اور دریائے جیحون کے جنوبی علاقہ میں واقع تھا۔ یہ ایک سرسبز و شاداب اور زرخیز مقام تھا۔ (معجم البلدان ج ۵ ص ۶۱، ۳، آثار الکرام ص ۱۸۱ و اتحاف النبلاء المتقین ص ۲۴۳) صغان اور صغانیان چغان و چغانیان کا معرب ہے۔ اہل عجم اسے چغان و چغانیان ہی کہتے تھے۔ مگر اہل عرب عموماً جیم فارسی (چ) کو صاد سے بدل دیتے ہیں، اس لیے وہ صغان اور صغانیان کہتے تھے۔ صغانی اسی کی جانب نسبت ہے۔ بعض لوگ صاخان (چاغان) بھی کہتے ہیں اور صغانی کی بجائے صاغانی کی نسبت سے منسوب کرتے ہیں۔ (بغیۃ الوعاۃ ص ۲۲۷ الفوائد البہیہ ص ۳۰ و نزہۃ الخواطر ص ۱۳۷) موجودہ جغرافیہ میں اس جگہ کو سرآسیا کہا جاتا ہے۔

---

[1] مولانا نے شہور نیف وثمانین وخمسمائۃ کا ترجمہ ۵۸۰ھ کیا ہے۔
[2] مولانا نے اپنے خیالات کو درست ثابت کرنے کے لیے کہیں کہیں ترجمہ میں اصل کی رعایت نہیں کی ہے۔

Marfat.com

صغانی کے بزرگ صغان سے ترکِ سکونت کر کے لاہور میں آباد ہوئے۔ مؤرخین نے اس کی صراحت نہیں کی ہے کہ امام صغانی کے بزرگوں میں سے کون پہلے لاہور آیا تاہم اس پر سب متفق ہیں کہ وہ لاہور میں پیدا ہوئے جو غزنویوں کا دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے ایک بڑا سیاسی، تمدنی اور علمی مرکز تھا۔ لیکن صغانی کی پیدائش کے زمانہ میں اس سلطنت کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں، چنانچہ چند ہی سال بعد غوریوں نے غزنویوں کا خاتمہ کر کے اپنی حکومت کی داغ بیل ڈالی اور اس کا مرکز لاہور کے بجائے دہلی کو بنایا۔ اس لیے صغانی بچپن ہی میں غزنہ چلے آئے اور یہیں ان کی نشوونما ہوئی۔

صغانی کے مولد و وطن کے بارہ میں مؤرخین اور تذکرہ نگاروں کے متفقہ بیان کے برخلاف خواجہ نظام الدین اولیاء نے ان کا وطن بدایوں بتایا ہے، فرماتے ہیں: ''او از بداؤں افتاد'' (فوائد الفواد ص ۱۰۳ مطبع اودھ لکھنؤ ۱۸۸۱ء و ص ۱۷۹ مطبوعہ لاہور ۱۳۸۶ھ۔ ۱۹۶۶ء)۔ اس کی وجہ سے مولانا حکیم عبدالحئی صاحب نزہۃ الخواطر کو خیال ہوا کہ یہ صغانی دوسرے شخص ہیں، چنانچہ انہوں نے ان دونوں کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ لکھا ہے۔

مولانا عبدالحلیم چشتی نے بجا طور پر مولانا کے اس خیال کی تردید کی ہے ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ ایک نام کے بیک وقت کئی صاحب کمال ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں لیکن دو ہمعصر مصنف ایک ہی موضوع پر کتابیں لکھیں اور نام بھی ایک ہی رکھیں ایسا نہیں ہوا ہے۔

۲۔ کتاب کی اندرونی شہادتوں سے بھی اس کی تصدیق نہیں ہوتی کہ رضی الدین نام کی کوئی دوسری شخصیت تھی۔

(الف) امیر حسن سنجری حضرت نظام الدین سے ناقل ہیں۔

بعد ازاں نسبت حدیث سخن در فضیلت مولانا رضی الدین صغانی صاحب مشارق الانوار افتاد رحمۃ اللہ علیہ و آنچہ نوشتہ است کہ ایں کتاب حجت است میان من و خدائے۔ (فوائد الفواد ص ۱۰۳)

اس کے بعد حدیث کی مناسبت سے مولانا رضی الدین صغانی صاحب مشارق الانوار کی فضیلت اور ان کی اس تحریر کے متعلق گفتگو ہونے لگی کہ یہ کتاب میرے اور خدا تعالیٰ کے درمیان حجت ہے۔

صغانی نے مشارق الانوار کے مقدمہ میں لکھا ہے:

هذا الكتاب حجة بيني وبين الله تعالى في الصحة والرصانة والاتقان والمتانة۔

(مشارق الانوار مطبع رشادیہ استنبول ۱۳۲۶ھ ص ۴)

یہ کتاب صحت و ثبوت، اتقان و متانت میں میرے اور خدا کے درمیان حجت ہے۔

(ب) خواجہ نظام الدینؒ اولیاء فرماتے ہیں:

اگر چہ حدیث بر او مشکل شدے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام را خواب دیدے و تصحیح کردے۔ (فوائد الفواد ص ۱۰۳)

اگر انہیں کوئی حدیث مشکل معلوم ہوتی تھی تو رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھتے اور آپ سے اس کی صحت فرما لیتے۔

اس وصف میں بھی حسن صغانی لاہوری منفرد ہیں مشارق الانوار میں مندرجہ ذیل حدیث کے ضمن میں لکھتے ہیں:

عن ابن عمر رضي الله عنهما ان الفتنة ههنا من حيث يطلع قرن الشيطان قال الصغاني مؤلف هذا الكتاب سمعه عن النبي صلى الله عليه وسلم قاله وهو يشير الى المشرق۔ (مشارق الانوار ص ۲۱)

Marfat.com

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا فتنہ وفساد ادھر ہے جہاں سے شیطان کا سینگ یعنی آفتاب نکلتا ہے اس کتاب کا مؤلف صغانی کہتا ہے کہ میں نے خواب میں یہ حدیث آنحضرت ﷺ سے سنی اور آپ پورب کی طرف اشارہ کررہے تھے۔

مولانا عبدالحلیم چشتی نے اسی طرح کی متعدد حدیثیں نقل کی ہیں اور آخر میں سید مرتضیٰ زبیدی کی تاج العروس کے حوالہ سے مکہ معظمہ کے کنوئیں ادام کے متعلق نقل کیا ہے:

ادام اسم بئر علی مرحلة من مكة حرسها الله تعالى على طريق السرين كما فى العباب قال الصغانى رأيت النبى صلى الله عليه وسلم وهو يقول ادام من مكة۔

ادام براہ سرین مکہ سے ایک منزل کی مسافت پر واقع ایک کنوئیں کا نام ہے جیسا کہ العباب میں مذکور ہے صغانی کا بیان ہے کہ میں نے رسالت مآب ﷺ کو خواب میں دیکھا، آپ ﷺ فرمارہے تھے ادام مکہ کے حدود میں داخل ہے۔

۳۔ حسن صغانی علم کے مقابلہ میں ہندوستان میں لقب سے زیادہ مشہور ہیں۔ اس وجہ سے اس دور کی کتابوں میں حسن کے بجائے رضی الدین کے نام سے یاد کیے جاتے تھے لہٰذا رضی الدین کو علم کی حیثیت دے کر بدایونی کہنا صحیح نہیں۔ چنانچہ سرور الصدور میں جو فوائد الفواد کے دور کی تالیفات میں ہے شیخ فرید الدین ناگوری نے حسن صغانی کا جہاں بھی ذکر کیا ہے ان کے لقب رضی الدین ہی سے یاد کیا ہے۔

۴۔ مشارق الانوار کی نسبت نے تو صغانی کو لقب تک سے مستغنی کردیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ کمال الدین نے مشارق الانوار کی جو سند خواجہ نظام الدین اولیاء کو دی تھی، اس میں لقب تک کا ذکر ضروری خیال نہیں کیا بلکہ صرف اتنا ہی لکھنا کافی سمجھا۔

وهما يرويانه عن مولفه۔

اور مذکورہ بالا ہر دو شیخ اس کتاب (مشارق الانوار) کو اس کے مؤلف سے روایت کرتے ہیں۔

چشتی صاحب آخر میں تحریر فرماتے ہیں: "ہمارے خیال میں یہ دلائل اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ فوائد الفواد کے رضی الدین صغانی دراصل ابوالفضائل رضی الدین حسن صغانی ہی ہیں نہ کہ رضی الدین بدایونی۔ (معارف جلد ص ۸۳ ص ۲۰ تا ۲۷)

گو مولانا عبدالحیؒ نے رضی الدین بدایونی کو رضی الدین حسن لاہوری سے علیحدہ ایک شخصیت قرار دیا ہے مگر انہوں نے رضی الدین حسن صغانی کو بدایونی تسلیم نہیں کیا ہے مگر اس دور کے بعض فاضل مؤرخین اور اہل قلم نے قدیم محققین اور مستند مؤرخین کے اقوال کو نظر انداز کرکے محض خواجہ نظام الدین کے ایک مختصر ومبہم جملہ کی بنیاد پر ان کا مولد ووطن لاہور کے بجائے بدایوں قرار دیا ہے، مولوی سید ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں:

"وہ سلطان نظام الدین کی طرح بدایوں میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔" (تاریخ ہند کتاب دوم ص ۲۶۲)

اس متن کی مزید وضاحت حاشیہ میں اس طرح کی ہے۔

"امام صغانی کے حالات اور تصانیف کا مآثر الکرام میں ذکر موجود ہے اور اس میں انہیں غلطی سے لاہوری لکھ دیا ہے لیکن سب سے واضح اور معتبر حالات وہ ہیں جنھیں سلطان نظام الدین کی زبانی صاحب فوائد الفواد نے نقل کیا ہے۔" (ایضاً ص ۲۶۳)

حالانکہ صغانی کے لاہوری لکھنے کی غلطی صرف غلام آزاد بلگرامی ہی نے نہیں کی ہے بلکہ ان کے تقریباً تمام سوانح نگاروں نے کی ہے یہاں تک کہ خود صغانی نے بھی کی ہے جیسا کہ علامہ احمد آفندی نے ان کے حوالہ سے تحریر کیا ہے۔

Marfat.com

قرأت فی نسخۃ من العباب انہ ولد فی لاھور احدی مدن الھند الکثیرۃ الخیرات و یقال ایضاً الھاور۔

(الجاموس علی القاموس مطبعۃ الجوائب قسطنطنیہ ۱۲۹۹ھ ص ۳۴ بحوالہ معارف ج ۸۳ ص ۱۹)

میں نے العباب کے نسخہ میں (خود مصنف کا یہ بیان) پڑھا ہے کہ وہ لاہور میں پیدا ہوئے تھے جو ہندوستان (موجودہ پاکستان) کے شہروں میں سے ایک نہایت عمدہ اور آباد شہر ہے اسے لہاور بھی کہتے ہیں۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بھی ہاشمی صاحب کی بات دہرائی ہے، لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا رضی الدین حسن صغانی صاحب مشارق الانوار جن کا نام ہندوستان کے علمائے حدیث میں سرفہرست آتا ہے محمد غوری کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہونے سے تقریباً دس سال قبل بدایوں میں پیدا ہوئے تھے، وہیں انہوں نے دینی تعلیم حاصل کی اور وہیں اپنا ابتدائی زمانہ گزارا، جب بدایوں کا یہ عظیم المرتبت فرزند بغداد پہنچا تو بڑے بڑے عالموں کی گردنیں اس کے آگے جھک گئیں۔'' (تاریخ مشائخ چشت ج اشائع کردہ ادارہ ادبیات دلی ص ۲۰۰)

اس سے زیادہ پرزور انداز میں انہوں نے دوسری جگہ لکھا ہے:

''مولانا رضی الدین حسن صغانی صاحب مشارق الانوار کے متعلق نظام الدین اولیاء کا بیان ہے: او از بداؤں بود۔''

(حیات عبدالحق ص ۱۲)

اس کے حاشیہ میں رقمطراز ہیں:

''شیخ نظام الدین اولیاء کا بیان ان وجوہات کی بنا پر ان سب لوگوں سے زیادہ قابل اعتبار ہے جنہوں نے ان کا وطن لاہور بتایا ہے۔ شیخ نظام الدین خود بدایوں کے تھے اور بدایوں کے متعلق اچھی معلومات رکھتے تھے۔

۲۔ ان کے استاد مولانا کمال الدین زاہد، مولانا برہان الدین بلخی تلمیذ شیخ رضی الدین حسن صغانی تھے، اس بنا پر استاذ الاستاذ کے متعلق ان کا بیان زیادہ معتبر ہے۔ (ایضاً)

اس دور کے ایک اور فاضل مولوی ضیاء احمد بدایونی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

حضرت محبوب الٰہی کی شہادت اور امیر حسن کی روایت کے بعد علامہ کی وطنیت میں شک اور ان کے بدایونی ہونے میں تامل کرنا ایک ایسا وہم ہے جس کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں ہے۔ (مباحث و مسائل، مجلس اشاعت ادب دہلی ص ۴۶۰)

مولانا عبدالحلیم چشتی نے صغانی پر جو مبسوط مقالہ سپرد قلم کیا ہے اس میں اس شبہ کی بھی مدلل تردید کی گئی ہے جس کو یہاں نقل کر دینا کافی ہوگا۔ وہ خواجہ صاحب کے بیان ''او از بداؤں'' کے متعلق فرماتے ہیں:

۱۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہاں تصحیف ہوگئی ہے۔ فوائد الفواد کے اصل نسخہ میں غالباً او از لاہور بود تھا جس کو ناقل نے خط شکست میں ہونے کے باعث ''او از بداؤں بود'' پڑھا اور چونکہ خود نظام الدین اولیاء کا وطن بھی بداؤں تھا، اس کو بداؤں سمجھنے میں کوئی تردد بھی نہ ہوا۔ خط شکست میں لاہور کو بداؤں یا بدایوں سے ایک گونہ تجنیس خطی کی وجہ سے ان میں سے تصحیف ہو جانا چنداں مستبعد نہیں کیونکہ لا کی بد سے اور ہو کی ید سے اور ر کی ن سے مشابہت خط شکست میں ایسی قوی اور اتنی قریب ہے کہ اس تصحیف کے قبول کرنے میں انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، جن لوگوں کی نظر سے مخطوطات کا ذخیرہ گزرا ہے وہ ہماری اس رائے کی تائید کریں گے۔ یہ ایسی قابل قبول توجیہ ہے کہ اس پر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی شہادت بھی غلط قرار نہیں پاتی اور امیر حسن پر بھی خلط ملط اور سہو کا الزام عائد نہیں ہوتا۔ دراصل امیر حسن پر خلط ملط یا سہو ہونے کا الزام کسی طرح درست نہیں کیونکہ

Marfat.com

یہ کتاب بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی ایک زمانہ تک صوفیاء کا دستور العمل رہ چکی ہے۔

۲۔ خلیق صاحب کو حسن صغانی کو بدایونی قرار دینے کے متعلق جو یہ شبہے ہوئے کہ شیخ نظام الدین اولیا خود بدایوں کے تھے اور بدایوں کے متعلق اچھی معلومات رکھتے تھے اس سے ہمارے اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے کہ لاہور کو بداؤں سمجھنے میں کاتب کو بھی یہی شبہے ہوئے ہوں گے اور بہت ممکن ہے کہ وہ بھی بدایوں کا ہو۔

۳۔ خواجہ نظام الدین اولیا بلاشبہ بدایوں میں پیدا ہوئے تھے اور بارہ برس تک بدایوں میں رہے مگر پھر بدایوں سے زیادہ وابستگی نہیں رہی، بدایوں کے متعلق معلومات فراہم کرنا ان کے موضوع اور مسلک سے خارج تھا، نیز یہ حقیقت ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ فوائد الفواد تذکرہ یا تاریخ کی کتاب نہیں ہے، پھر خواجہ نظام الدین صغانی کے بدو واسطہ شاگرد ہیں، شمس الدین ذہبی مشہور مؤرخ اور حافظ الحدیث دمیاطی کے شاگرد ہیں جو صغانی کی جملہ مرویات اور مصنفات کے نہایت ثقہ اور نامور راوی ہیں، خود شمس الدین ذہبی عالم اسلام کے فن رجال اور تاریخ کے نادرہ روزگار ناقد اور وسیع النظر عالم تھے، ان کا بیان ہر لحاظ سے قابل ترجیح تھا اور ہے۔ (ماہنامہ معارف جلد ۸۳ نمبر ا صفحات ۳۸ تا ۴۰)

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا بیان بھی اس ضمن میں نقل کرنے کے لائق ہے، وہ لکھتے ہیں:

''شاید فوائد الفواد کے مرتب امیر حسن سجزی نے سہواً حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کو کچھ خط ملط کر دیا ہو اور اگر خلط ملط نہیں ہوا اور اس کو صاحب مشارق الانوار ہی کا ذکر سمجھا جائے تو پھر، او (یعنی صاحب مشارق) از بداؤں بود کے اجمالی بیان سے وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بدایوں ہی ان کا مولد تھا۔'' (تذکرہ علمائے ہند ص ۴۸)

غرض بداؤں کو صغانی کا مولد منشا ماننا صحیح نہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ولادت کی طرح ان کی نشوونما بھی لاہور میں ہوئی۔ (تذکرہ علمائے ہند ص ۴۸) یہ خیال اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب یہ مانا جائے کہ ان کی ولادت ۵۵۵ھ میں ہوئی تھی لیکن یہ ثابت نہیں ہے۔

اس تفصیل سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ رضی الدین حسن صغانی اور رضی الدین بدایونی کو دو شخصیتیں قرار دینا درست نہیں۔

۲۔ رضی الدین حسن صغانی کا وطن لاہور کے بجائے بدایوں ماننا غلط ہے۔

۳۔ بدایوں کو صغانی کا منشا سمجھنا بھی صحیح نہیں ہے۔

اساتذہ:

پہلے انہوں نے اپنے والد ماجد محمد سے علم و فن کی تحصیل کی جو اپنے دور کے متبحر عالم اور لغت و عربیت میں یکتا تھے، مؤرخین اور ارباب سیر کا خیال ہے کہ وہ اپنے والد ہی سے علوم کی تحصیل و تکمیل کر چکے تھے پھر مزید شوق و جستجوئے علم کی خاطر مختلف جگہوں کے سفر پر روانہ ہوئے اور وہاں کے شیوخ سے احادیث کا سماع اور کسب فیض کیا جن کے نام یہ ہیں:

بغداد: ابو منصور سعید بن محمد رزاز۔

مکہ معظمہ: برہان الدین ابو الفتوح نصر بن ابی الفرج محمد بن علی حصری: ان کی ولادت بغداد میں ہوئی مگر مکہ معظمہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اسی لیے امام الحرم اور امام الحطیم کہلاتے تھے ۶۱۹ھ میں وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۱۷۵ و ۱۷۶)

Marfat.com

عدن: قاضی ابو اسحاق ابراہیم بن احمد قرمطی (خطیب عدن)

ہندوستان: قاضی سعد الدین خلف بن محمد کروری حسنا بادی جو سلطان شمس الدین التمش کے دور کے سب سے بڑے قاضی تھے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۱۶۲)

نظام محمد بن حسن مرغینانی۔ نظام الدین عمر بن علی۔ صاحب ہدایہ کے فرزند۔ فقہ و فتاویٰ میں مرجع اور شیخ الاسلام کہلاتے تھے۔ جواہر الفقہ، الفواد اور کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ (الفوائد البہیہ ص ۶۰)

تلامذہ:

صغانی کے دامن فیض سے جو لوگ وابستہ رہے، ان کے نام یہ ہیں:

شرف الدین ابو محمد عبد المومن دمیاطی [1]، نظام الدین محمود بن عمر ہروی، محی الدین ابو البقا صالح بن عبد اللہ بن جعفر بن علی بن صالح اسدی کوفی معروف بہ ابن صباغ، شیخ برہان الدین محمد بن ابی الخیر اسعد البلخی (شارح آثار النیرین فی اخبار الصحیحین) محمد بن احمد بطال [2] ابو الربیع سلیمان بن بطال، منصور بن حسن، احمد بن علی سرودی، ابو محمد سعد بن مسعود المحیوی، عز الدین ابن الوزیر علقمی۔

شیخ برہان الدین کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے، امام صغانی کے شاگرد مولانا برہان الدین محمود دہلوی تھے، وہ امام مرغینانی صاحب ہدایہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے اور مشارق الانوار کا درس دینا شروع کیا۔ ۶۸۷ھ میں وفات پائی اور دہلی میں حوض شمسی کے پورب میں دفن ہوئے ان کے خاص شاگرد مولانا کمال الدین زاہد دہلوی تھے، انہوں نے مشارق الانوار کی سند مولانا برہان الدین محمود سے حاصل کی اور علم حدیث میں یگانہ روزگار تھے اور دہلی میں اس کا درس دیتے تھے بڑے متقی اور پرہیزگار تھے، سلطان غیاث الدین بلبن نے چاہا کہ ان کو اپنا امام مقرر کرے مگر انہوں نے قبول نہیں کیا، حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء نے حدیث ان ہی سے پڑھی تھی اور مشارق الانوار کا درس بھی انہی سے لیا اور اس کو زبانی یاد کیا۔ (مقالات سلیمان ج ۲ ص ۳۰، ۳۱ بحوالہ اخبار الاخیار ص ۶۸)

جامعیت:

امام حسن مختلف علوم و فنون میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، مولانا آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

در فنون کثیرہ تحصیل نمود و استعداد عالی بہم رساند۔ (مآثر الکرام جلد ۱ ص ۱۸۱)

متعدد فنون کی تحصیل کی اور ان میں عالی استعداد بہم پہنچائی۔

مولانا عبد الحئی فرنگی محلی ان کی جامعیت کا ان لفظوں میں اعتراف کرتے ہیں:

ذا مشارکۃ تامۃ فی العلوم۔ (الفوائد البہیۃ ص ۲۹)

علوم میں مکمل دستگاہ رکھتے تھے۔

لیکن حدیث، فقہ، لغت اور ادب میں زیادہ ممتاز اور صاحب کمالات تھے اور حدیث و لغت میں درجہ امامت پر فائز تھے، آگے

---

[1] تذکرۃ المحدثین جلد دوم میں ان کا مفصل تذکرہ لکھا جا چکا ہے۔

[2] صغانی کو ان سے استادی اور شاگردی دونوں نسبت حاصل تھی۔

Marfat.com

ان سب کی تفصیل قلمبند کی جائے گی۔

فقہ:

فقہ میں درک وکمال حاصل تھا۔ صاحب ہدایہ کے فرزند عمر بن علی سے اس کی تحصیل کی تھی جونہایت باکمال فقیہ تھے، اس فن میں شہرت وامتیاز کی وجہ سے سلطان قطب الدین ایبک نے انہیں لاہور کا قاضی مقرر کرنا چاہا تھا، مگران کی طبیعت میں استغناء و بے نیازی تھی اور عہدہ ومنصب اور جاہ وحشمت سے ان کو کوئی رغبت نہ تھی، اس لیے انہوں نے منصب قضا کی پیشکش ٹھکرادی اور وہاں سے غزنہ چلے گئے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۱۲۷،۱۳۱) فقہ میں ان کی مہارت اور وسعت نظر کا دمیاطی نے بھی اعتراف کیا ہے (الجواہر المضیہ ج ۱ ص ۲۰۱) اور مولوی رحمان علی لکھتے ہیں: ''فقیہ کامل بود'' (تذکرہ علمائے ہند ص ۴۸) یعنی فقہ میں صاحب کمال تھے۔ ابن عماد اور یافعی نے بھی ان کی فقہی بصیرت کا ذکر کیا ہے۔ (شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۵۰)

حدیث:

حدیث سے خاص اشتغال تھا، ہندوستان کے علمائے حدیث میں سرفہرست ان کا نام آتا ہے، جب یہ بغداد پہنچے تو اس فن کے بڑے بڑے علما کی گردنیں ان کے آگے جھک گئیں۔ صغانی کی غیر معمولی شہرت وعظمت کا ایک سبب اس فن میں ان کی بالغ نظری اور امتیاز وکمال بھی ہے۔ مؤرخین اور تذکرہ نگار حدیث میں ان کی بلند پائیگی اور نقد ونظر کے معترف ہیں۔ دمیاطی کا بیان ہے کہ وہ فن حدیث میں امام تھے، حدیث کے متعلقہ علوم ورجال، جرح وتعدیل اور توثیق وتصنیف میں بھی یکتا تھے، حدیث کے علاوہ ان فنون میں بھی ان کی تصنیفات یادگار ہیں موضوعات حدیث پر انہوں نے دو رسالے تحریر کیے تھے۔ آزاد بلگرامی رقمطراز ہیں: در فقہ و حدیث علوم دیگر پایہ عالی داشت (ماثر الکرام ص ۱۸۱)، مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کا بیان ہے کہ وہ ابن جوزی اور صاحب سفر السعادہ کی طرح حدیث کے باب میں متشدد تھے۔ (الفوائد البہیہ ص ۳۰) اصحاب سیر نے ان کو محدث کے لقب سے موسوم کیا ہے۔ (اتحاف النبلاء ص ۲۴۳) مولوی رحمان علی لکھتے ہیں: ''محدث عامل بود'' (تذکرہ علمائے ہند ص ۴۸)

مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں لغت وحدیث میں امام قرار پائے۔ (مقالات سلیمان ج ۲ ص ۴)

خواجہ نظام الدین نے فوائد الفواد میں ایک واقعہ بیان کیا ہے، اس سے بھی ان کی حدیث میں بلند پائیگی اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

جب وہ بغداد سے دہلی پہنچے تو اس زمانہ میں دہلی مختلف فنون کے علمائے کبار اور منتخب لوگوں سے معمور تھی لیکن حدیث میں کوئی شخص صغانی سے زیادہ ممتاز یا ان کے ہم پایہ نہ تھا، یہاں سے وہ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے، اس سے فارغ ہوکر پھر بغداد تشریف لائے۔ اس وقت بغداد میں ایک عالم تھے جو بڑے بلند پایہ محدث تھے۔ انہیں لوگ ابن زہری کہتے تھے، ان کے لیے ایک منبر تیار کیا گیا تھا۔ جس پر بیٹھ کر وہ حدیث کا درس دیتے تھے، جس میں لوگ درجہ بدرجہ شریک ہوتے تھے یعنی لائق اور ذی استعداد سب آگے ان کے سامنے ہوتے اس کے بعد ان لوگوں سے کمتر لوگوں کی صف ہوتی، اسی طرح اس کے بعد اور لوگوں کا حلقہ ہوتا۔ اسی طور پر وہ حدیث بیان کرتے اور لوگ اسے ضبط وتحریر میں لاتے۔ ایک روز مولانا رضی الدین بھی اس مجلس میں حاضر ہوئے

Marfat.com

اور بعید تر حلقہ میں نشست فرمائی، ابن زہری ایک حدیث بیان کر رہے تھے جس کا مفہوم یہ تھا کہ مؤذن جس طرح جو الفاظ کہے سننے والے کو بھی اسی طرح وہی الفاظ کہنے چاہئیں، شیخ نے حدیث کی ابتدا (اذا سکب المؤذن) کے لفظ سے کی۔ سکوب کے اصل معنی اوپر سے پانی گرانا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب مؤذن کی آوازِ تمہارے کان میں پڑے تو تم لوگوں کو بھی اسی طرح کہنا چاہیے جیسے کہ وہ کہہ رہا ہے، جب ابن زہری نے یہ حدیث بیان کی تو مولانا رضی الدین نے اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے آہستہ سے دوسرے لوگوں سے کہا یہ: اذا سکت المؤذن ہے، یعنی جب مؤذن اپنا لفظ کہہ کر خاموش ہو جائے تو اس کی موافقت کرنی چاہیے، جس شخص سے انہوں نے یہ بات کہی تھی، اس نے دوسرے سے کہا، دوسرے نے تیسرے سے کہا، شدہ شدہ یہ بات ابن زہری تک پہنچ گئی، انہوں نے کہا یہ بات کس نے کہی ہے؟ صغانی نے کہا میں نے کہی ہے۔ ابن زہری نے فرمایا کہ دونوں باتوں کا مفہوم نکلتا ہے اس لیے کتاب سے مراجعت کرنی چاہیے، کتاب دیکھی گئی تو اس میں دونوں توجیہات ملیں مگر: و اذا سکت کو زیادہ صحیح بتایا تھا۔ یہ خبر جب خلیفۂ وقت کو ہوئی تو اس نے صغانی کو دربار میں طلب کیا اور ان کا بڑا اعزاز و اکرام کیا۔ (فوائد الفوادص ۱۰۳ تا ۱۰۵)

لغت و ادب:

لغت و ادب میں وہ خصوصیت سے بہت ممتاز تھے، عالم اسلام میں امام لغت کی حیثیت سے زیادہ روشناس اور متعارف ہوئے، اپنے زمانہ میں لغت کے سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے، دمیاطی کا بیان ہے کہ وہ لغت میں امام تھے، سیوطی لکھتے ہیں کہ لغت کی معرفت ان پر تمام ہوگئی، اس میں انہوں نے عظیم الشان کتابیں یادگار چھوڑیں، وہ لغت کا پرچم سربلند کیے ہوئے تھے اور اپنے شاگردوں کو مشہور امام لغت ابوعبید قاسم بن سلام کی غریب یاد کرنے کی تلقین فرماتے تھے اور جو شاگرد اسے یاد کر لیتا تھا اس کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک ہزار دینار انعام دیا کرتے تھے۔ (بغیۃ الوعاۃ ص ۲۲۷ و شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۵۰)

وہ عربی زبان کے مستند ادیب بھی تھے اور شعر بھی موزوں کہہ لیتے تھے، ان کی نثر و نظم مشکل الفاظ پر مشتمل ہونے کے باوجود سلیس اور تکلف و تصنع سے بری ہوتی تھی، درحقیقت ان کے نہاں خانہ میں الفاظ و لغات کا وسیع ذخیرہ تھا، جسے وہ روانی اور بے تکلفی سے استعمال کرتے تھے اس لیے ان کے قلم سے نکلنے والی تحریروں اور اشعار میں خوبی اور دلکشی ہوتی تھی، اس کا اندازہ مشارق الانوار کے دیباچہ سے بھی ہوتا ہے۔ علامہ سیوطی نے ان کی ایک مناجات کے چند ابیات نقل کیے ہیں جس کا قافیہ مرتجی ہے۔ اس نظم کے ہر شعر میں انہوں نے اس لفظ کو جداگانہ معنوں میں استعمال کیا ہے، لغت و عربیت کی تحصیل اور محاورات عرب پر عبور حاصل کرنے کے لیے انہوں نے برسوں نجد میں قیام کیا۔

شعر و سخن:

امام صغانی کو شعر و سخن کا اچھا ذوق تھا، وہ خود بھی شعر موزوں کرتے تھے اور برجستہ اشعار بھی کہتے تھے، ان کے اشعار میں بڑی روانی اور آمد بھی ہوتی تھی اور وہ صنائع و بدائع اور شعری محاسن سے بھی پُر ہوتے تھے، اوپر ان کی مناجات کا ذکر آچکا ہے جو یہ ہے:

یا راحم الطفل الرضیع المزعج　　یا فاتح الباب المنیع المرتج

"اے طفل شیرخوار و زار پر رحم فرمانے والے، اے دشوار اور بند دروازہ کھولنے والے!"

ان کان غیری مبلسا مستیئسا　　فانا الفقیر المسکین المرتجی

Marfat.com

''اگر میرے سوا کوئی نادار، شکستہ دل اور مایوس ہو سکتا ہے تو میں بھی فقیر و مسکین اور خوفزدہ ہوں۔''

او کان غیری آمنا فی سربہ ۔۔۔ فانا المتیح المستجیر المرتجی

''اگر میرے سوا کوئی ایسا ہو جس کی پناہ اپنے سوا کہیں نہیں تو میں بھی ایسا ہی بے نصیب پناہ جو اور امیدوار ہوں۔''

استأت الراحات عنی ولتنأت ۔۔۔ یامن یقرب کل ناء مرتجی

''راحتیں مجھ سے دور ہو گئی ہیں، اے وہ ذات جو تمام دور اور مشکل (مقاصد) کو قریب کرتی ہے۔''

انت الذی فیہ شفاء السقم لا ۔۔۔ قصب الذرینی ولا دواء المرتجی

(بغیۃ الوعاۃ ص ۲۲۷ و ۲۲۸)

''(خداوندا!) تو ہی ان بیماریوں کو شفا بخشتا ہے جن کا علاج نہ نیشکر کر سکتا ہے اور نہ کوئی دوسری مفید دوا۔

انہوں نے ایک طویل قصیدہ میں اپنے ناموافق حالات اور زمانے کی ناسازگاری وغیرہ کا ذکر کیا ہے، یہ پورا قصیدہ صنعت تجنیس میں منفرد نوعیت کا ہے، اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

انسانی الدھر اعطانی واوطانی ۔۔۔ وحطنی ووھاد الخسف اوطانی

''زمانہ نے میرے وطن اور میری قیامگاہ کو میرے دل سے محو کر دیا ہے اور مجھے فقر و ندامت میں گرا کر دھنسا دیا۔''

وکنت افنیت عمری فی رفاھیۃ ۔۔۔ فغطنی ولذیذ العیش انسانی

''حالانکہ میں نے اپنی زندگی عیش و فراغت میں گزاری تھی مگر پھر زمانہ نے مجھے اذیت میں ڈال دیا اور خوشحالی کی زندگی سے غافل کر دیا۔''

وکان دوحۃ عیشی غضۃ زمنا ۔۔۔ غضیرۃ ذات اغصان وافنان

''میرے عیش و عشرت کا درخت جو برگ و بار والا تھا، مدتوں سرسبز و شاداب رہا۔''

حتی اذا ما جنی الدھر الملم فنا ۔۔۔ قدی وقد ادیم العمر افنانی

''یہاں تک کہ جب مصائب پہنچانے والے زمانہ کی زیادتی شروع ہوئی تو میرا قدو قامت فنا ہو گیا اور عمر کے بندھن نے مجھے ہلاک کر دیا۔''

فقلت یا دھر سالمنی مسالمۃ ۔۔۔ فاننی عمری ثم صاغانی

''میں نے زمانہ سے کہا میرے ساتھ صلح کرلے کیونکہ میں حضرت عمرؓ کی اولاد ہوں اور میرا وطن صغان ہے۔''

فانصاع بتقاد اذعانا وسالمنی ۔۔۔ ومد ضبعی وناغانی وصاغانی

چنانچہ وہ میرا مطیع ہو گیا اور اس نے مجھ سے صلح کرلی اور میرے بازو پھیلا دیئے اور مجھ سے قریب ہوا اور میری طرف متوجہ ہو گیا''۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑے قادر الکلام شاعر تھے مگر افسوس کہ ان کا کوئی مجموعہ یادگار نہیں اور کلام کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا صرف متفرق اشعار تذکرہ و تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

Marfat.com

فضل وکمال:

صغانی اپنے دور کے بہت ممتاز علما میں تھے اور علم وفن اور ادب ولغت میں امامت کے درجہ پر فائز تھے۔ (الجواہر المضیہ ص ۲۰۱) آزاد بلگرامی تحریر فرماتے ہیں کہ عالم ربانی ودانائے غوامض معانی بود۔ (مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۸۱) صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں کہ ان کی تصنیفات بہت مشہور ومقبول ہوئیں اور ان کے علم وکمال کے سامنے علمائے زمانہ سرنگوں ہوگئے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۱۳۸) عراق وحجاز کے علما بھی ان کے علم وفضل کا لوہا مانتے تھے۔

ہندوستان میں صغانی کی اہمیت واولیت:

ہندوستانی علما میں امام صغانی پہلے محدث ہیں جن کی بدولت ہندوستان میں علم حدیث کی خدمت واشاعت کی داغ بیل پڑی اور انہوں نے اس فن میں باقاعدہ تصنیف وتالیف کا کام انجام دیا، مولانا سید سلیمان ندوی کے مندرجہ ذیل بیان سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے۔

شیخ اسماعیل کے بعد یہاں ڈیڑھ سو برس تک اندھیرا گھپ چھایا رہتا تھا بالآخر ساتویں صدی کے شروع میں مشارق الانوار کے مصنف صغانی نے یہاں علم حدیث کی روشنی پھیلائی، الغرض امام صاغانی غزنوی لاہوری تنہا محدث ہیں اور مشارق الانوار اس دیار کی تنہا خدمت حدیث ہے جو اس عرصہ دراز میں انجام کو پہنچی۔ (مقالات سلیمان جلد دوم ص ۴و۵)

گو امام صغانی کا قیام ہندوستان میں کم رہا، اس لیے باہر کی طرح ہندوستان میں ان کا فیض واثر بھی کم رہا، سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

ساتویں صدی کے شروع میں مشارق الانوار کے مصنف صغانی نے یہاں علم حدیث کی روشنی پھیلائی مگر یہ روشنی گھر میں کم اور گھر سے باہر زیادہ پھیلی۔ چونکہ امام ممدوح کا تعلق زیادہ تر ملک عرب وعراق سے رہا، اس لیے ان کا اثر اس ملک کے علما پر بہت کم پڑا اور اگر پڑا بھی تو صرف اسی قدر کہ ان کو اپنے نصاب تعلیم کے لیے حدیث میں ایک اپنے ہم وطن کی کتاب مل گئی اور وہ بدستور اپنے علم و دانشمندی وعلم ودانائی میں مصروف رہے، منطق وفلسفہ اور علم کلام کے بعد فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور وہ بھی عقلی طریق سے یہی سبب ہے کہ اصول فقہ جیسا ضروری علم بھی معقولات اور کلامیات کا ایک ضمیمہ ہو کر رہ گیا۔ (مقالات سلیمان جلد دوم ص ۴، ۵)

اس کے باوجود صغانی کی ہندوستان میں اولیت واہمیت میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔

تدین:

علم وفضل کی طرح زہد واتقا، دیانت وامانت اور خیر وصلاح کے بھی جامع تھے، حج بیت اللہ سے کئی بار مشرف ہوئے اور برسوں خانہ کعبہ کے جوار میں قیام پذیر رہے۔ (شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۵۰ وبغیۃ الوعاۃ ص ۲۲۷) اسی لیے اپنے کو الملتجی الی حرم اللہ کہتے تھے، آزاد بلگرامی لکھتے ہیں مولانا حسن صغانی لاہوری ایسے فرشتہ خصال بشر تھے کہ گویا ان کی طینت عناصر فلکی سے ممزوج، عالم تھے۔ ربانی اور صاحب کمالات تھے۔ (نورانی معارف مئی ۷۴ ص ۳۷۹ بحوالہ المرجان)

متانت:

بہت خاموش، متین، سنجیدہ اور باوقار شخص تھے، فضول اور بیکار باتیں نہیں کرتے تھے۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۱ ص ۱۳۸) یاوہ گوئی سے

Marfat.com

سخت نفرت کرتے تھے، جو بات کہتے صحیح کہتے۔

اخلاق،عادات:

طبیعت میں بڑی شرافت اور مزاج میں انکسار اور حلم تھا، ان کے اخلاق و عادات نہایت بلند تھے۔

رحلت و سفر:

امام صغانی کی پیدائش لاہور اور نشو و نما غزنہ میں ہوئی تھی مگر انہوں نے عراق و عرب کو اپنا اصلی وطن بنالیا تھا، اس لیے ان کا زیادہ تر قیام ہندوستان سے باہر ہی رہا اور پر مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ بیان گزر چکا ہے۔

ساتویں صدی کے شروع میں مشارق الانوار کے مصنف صغانی نے یہاں علم حدیث کی روشنی پھیلائی مگر یہ روشنی گھر میں کم اور گھر سے باہر زیادہ پھیلی۔

دوسری جگہ رقمطراز ہیں:

لیکن چونکہ امام ممدوح کا تعلق زیادہ تر ملک عرب و عراق سے رہا، اس لیے ان کا اثر اس ملک (ہندوستان) کے علما پر بہت کم پڑا۔ (ایضاً ص ۵)

انہیں سفر و سیاحت کا بڑا شوق تھا اور چونکہ ان میں علم و فن اور تحقیق و جستجو کا فطری داعیہ بھی تھا۔ اس لیے وہ اکثر سفر و سیاحت میں رہتے تھے۔

۲۸ برس کی عمر میں ۶۱۵ھ (۱۲۱۸ء یا ۱۲۱۹ء) میں بغداد کی کشش ان کو وہاں لے گئی گو اس زمانہ میں عباسیوں کے عروج و اقبال کا ستارہ ماند پڑ گیا تھا اور تاتاریوں کے سیلاب نے عالم اسلام کو تہہ و بالا کر دیا تھا، مگر بغداد ان کی زد سے محفوظ تھا اور اس کی قدیم شان و شوکت باقی تھی اور امام صغانی کئی برس تک یہاں مقیم رہ کر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے مکہ معظمہ بھی پہنچے اور حج و زیارت کعبہ سے مشرف ہونے کے علاوہ برسوں بیت اللہ کے جوار میں قیام کی سعادت حاصل کی، مؤرخین نے عدن و یمن جانے کی صراحت بھی کی ہے۔ (الجواہر المضیہ جلد ۱ ص ۲۰۱، اتحاف النبلاء ص ۲۴۳، مآثر الکرام جلد ۱ ص ۱۸۱) عرب و عراق کے قیام کے زمانہ میں ہندوستان آنے کا اتفاق بھی ہوا، ان کا خود بیان ہے کہ میں ہندوستان اور سندھ کے مشرق و مغرب میں چالیس برس سے زیادہ سیر و سیاحت کرتا رہا، اس کی مزید تفصیل آگے آ رہی ہے۔

سفارت اور دوسرے عہدے:

امام صغانی مختلف بلند عہدوں پر فائز رہے، سب سے پہلے سلطان قطب الدین ایبک نے ان کو لاہور میں عہدۂ قضا پیش کیا مگر انہوں نے انکار کر دیا اور غزنہ چلے گئے۔ ۶۱۵ھ۔ ۱۲۱۸ء میں بغداد میں احتساب کا محکمہ انہیں سپرد کیا گیا۔ جس کی ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے انجام دیں۔ اس کے ساتھ ہی درس و تدریس کی خدمت پر بھی مامور رہے خلیفہ ناصر لدین اللہ نے آپ سے حدیث پڑھی تھی اور آپ کو خلعت سے بھی سرفراز کیا تھا جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ خلیفہ نے ۶۱۷ھ۔ ۱۲۲۰ء میں آپ کو سفیر کی حیثیت سے ہندوستان بھیجا، یہ سلطان شمس الدین التمش کا دور تھا، ۶۲۴ھ۔ ۱۲۲۶ء میں بغداد واپس آئے لیکن اسی سال شعبان میں دوبارہ عباسی خلیفہ مستنصر باللہ نے سفیر بنا کر انہیں ہندوستان بھیجا، وہاں ۶۲۵ھ۔ ۱۲۲۷ء میں پہنچے اس وقت رضیہ بنت التمش فرمانروائے ہند تھی،

Marfat.com

اس دفعہ بھی ان کے درس سے تشنگانِ علوم سیراب ہوئے مگر اس بار ان کی طبیعت ہندوستان میں نہیں لگی اور وہ برابر واپسی کے لیے فکر مند رہے اور جلد ہی بغداد آ گئے۔ (الجواہر المضیہ جلد ا ص ۲۰۲ و شذرات الذہب جلد ۵ ص ۲۵۰ و نزہۃ الخواطر ج ا ص ۱۳۷، ۱۳۸)

فوائد الفواد میں ان کے کول (علی گڑھ) جانے اور نائب مشرف (سررشتہ دار) ہونے کا ذکر ہے۔ (فوائد الفوائد ص ۱۰۳)

صغانی کے امراء و سلاطین سے اچھے تعلقات تھے خصوصاً خلیفہ مستنصر باللہ اور اس کے علم و ادب نواز وزیر ابن العلقمی سے ان کو بڑا تعلق تھا، یہ دونوں ان کا بڑا اعزاز کرتے اور خوب انعام و اکرام سے بھی نوازتے تھے، تاکہ وہ دلجمعی اور جمعیت خاطر کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کام انجام دیں، انہوں نے اپنی اکثر کتابیں ابن العلقمی ہی کے نام معنون کی تھیں۔

(مجلۃ المجمع العلمی العربی دمشق ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ تشرین ۱۹۲۵ء ج ۱۵ ص ۵۲۴)

وفات:

۷۳ برس کی عمر میں جمعہ کے روز ۱۹ شعبان ۶۵۰ھ۔ ۱۲۵۲ء کو بغداد میں وفات ہوئی، ان کا مکان بغداد میں حریم الطاہری میں واقع تھا، پہلے وہیں دفن کیے گئے مگر پھر ان کی وصیت کے مطابق نعش مکہ معظمہ لائی گئی اور وہیں دفن کی گئی۔

(مآثر الکرام جلد ا ص ۱۸۱ و اتحاف النبلاء ص ۲۴۳)

اولاد:

مصنفین اور تذکرہ نگاروں نے صغانی کی اولاد کا تذکرہ نہیں کیا ہے لیکن ان کے ایک صاحبزادے محمد کا نام اس حیثیت سے معلوم ہوا کہ مشارق الانوار کا جو قلمی نسخہ ٹونک کے کتب خانہ میں ہے اس کی محمد نے اپنے والد حسن کے سامنے قراءت کی تھی۔ (قصر علم فہرست کتب خانہ ٹونک ص ۳۰۱) اشعار میں بھی کہیں کہیں انہوں نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی ہے مثلاً ایک شعر میں انہیں یہ تلقین کرتے ہیں:

حاکوا اباکم واحکموا عقدۃ الادب ترقوا مراقی بھوا ھاذوالرتب

اخلاق و عادات میں اپنے والد کے مشابہ بنو اور ادب کی گرہ مضبوطی سے باندھ لو (فنون ادب میں کمال حاصل کرو) تو تم لوگ بلندی کے ایسے زینوں پر چڑھ جاؤ گے جن پر پہنچنے کے لیے بڑے بڑے صاحبان قدر و منزلت خواہاں ہوتے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے کئی لڑکے تھے۔

تصنیفات:

امام صغانی ممتاز اور بلند پایہ محدث تھے، ان کی تصنیفات کمیت و کیفیت دونوں حیثیتوں سے عمدہ اور ان کے فضل و کمال کی شاہد ہیں، آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

وتصانیف غرا پرداخت۔ شاندار اور عمدہ کتابیں تصنیف کیں۔

(مآثر الکرام ج ا ص ۱۸۱)

نواب صدیق حسن خاں مرحوم ان کی تصنیفات کا نام گنانے کے بعد لکھتے ہیں:

وورائے ایں تصانیف دیگر است کہ دلیل بر کمال علم وے است۔ (اتحاف النبلاء ص ۲۴۳)

ان کتابوں کے علاوہ ان کی دوسری تصنیفات بھی ہیں جو ان کے کمال علم کا ثبوت ہیں۔

Marfat.com

یافعی کا بیان ہے کہ لغت میں بلند پایہ کتابیں یادگار چھوڑیں۔(مرأۃ الجنان ج ۴ ص ۱۲۱) ان کی تصنیفات کی تعداد ۳۲ سے متجاوز تھی لیکن ان میں ایک ثلث کے بقدر بالکل نایاب ہیں، صغانی کی سب سے اہم اور عظیم الشان کتاب مشارق الانوار ہے جس کا آخر میں تذکرہ آئے گا۔باقی کتابوں کے نام حروفِ تہجی کے مطابق درج ذیل ہیں اور بعض کا مختصر تعارف بھی کرایا جاتا ہے۔

۱۔اسماء الاسد: اس موضوع پر مختلف اصحاب علم وادب نے کتابیں لکھی ہیں: ان کی فہرست میں امام صغانی کا نام بھی شامل ہے۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۹۷)

۲۔اسماء الذئب: یہ خود ایک مستقل رسالہ ہے۔(بغیۃ الوعاۃ ص ۲۲۷) مگر بعض مصنفین کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اسماء الاسد ہی کا ایک جزو ہے۔(الجواہر المضیۃ ج ۱ ص ۲۰۲ کشف الظنون ج ۱ ص ۹۷، نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۱۴۱)

۳۔اسماء الفارہ: سیوطی نے اس کا نام اسماء الغادہ لکھا ہے۔(بغیۃ الوعاۃ ص ۲۲۷) ممکن ہے یہ تصحیف یا کتابت کی غلطی ہو۔

۴۔بغیۃ الصدیان: بعض نے اس کا نام نقعۃ الصدیان لکھا ہے، (ایضاً ومفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۹۸) جو غالباً صحیح ہے۔

۵۔۶۔التجرید وجمل الصغانی تعریبی الحریری: مولوی سید حسین برنی نے اپنے مضمون میں دونوں کا ذکر کیا ہے، موخر الذکر کا بعض اور مصنفین نے بھی تذکرہ کیا ہے۔(معارف جولائی ۲۹ ص ۱۲)

۷۔دار السحابہ فی وفیات الصحابہ: اس میں تقریباً آٹھ سو صحابہؓ کے مقامات رحلت اور محل وفات کا ذکر ہے، اسی لیے اس کا نام دار السحابہ فی بیان مواضع وفیات الصحابہ بھی لکھا گیا ہے۔(ماہنامہ برہان ۵۳ء اگست ص ۸۵) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام حروفِ تہجی کے مطابق درج ہیں صحابہؓ کے حالات وتراجم میں علامہ ابن عبدالبر (م ۶۳ ۴ھ ۱۰۷۱ء) کی الاستیعاب کے علاوہ علامہ ابن اثیر جزری (م ۶۳۰ھ۔۱۲۳۳ء) کی اسد الغابہ اور حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ۔۱۴۴۸ء) کی الاصابہ نہایت مشہور ہیں، صغانی کی کتاب چاہے ان کتابوں کے ہم پایہ نہ ہوتا ہم وہ ابن اثیر کے ہم عصر اور حافظ ابن حجر سے زماناً متقدم ہیں، اس لیے ان کی کتاب کی اہمیت مسلم ہے، عام خیال یہ ہے کہ یہ ایک مختصر رسالہ ہے جرجی زیدان نے اسے ۶۴ صفحے کا بتایا ہے (تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جلد ۳ ص ۴۹) مگر بعض لوگوں کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک مبسوط کتاب تھی، جس میں صغانی نے اپنی ایک مختصر کتاب اور اس کے ذیل کو جس میں صحابہ کرامؓ کے مقام وفات کو بیان کیا تھا، بترتیب حروفِ تہجی یکجا کر دیا تھا۔(معارف جولائی ۲۹ء ص ۱۳) اس کے قلمی نسخے کتب خانہ خدیویہ مصر مکتبہ شیخ الاسلام اور برلن میں موجود ہیں۔

۸۔الدر الملتقط فی تبیین الغلط: اس کتاب میں صغانی ''الشہاب، والنجم'' کی موضوع حدیثوں کو بیان کیا تھا۔ (بغیۃ الوعاۃ ص ۲۲۷، واعلام جلد ا ص ۲۳۹)

۹۔شرح ابیات المفصل: علامہ سیوطی وغیرہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔(معارف جولائی ۲۹ء ص ۱۳) معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مشہور معتزلی مفسر علامہ جاء اللہ ابو القاسم محمود بن عمر زمخشری (م ۵۳۸ھ۔۱۱۴۳ء) کی فن نحو کی مشہور کتاب المفصل میں وارد اشعار کی شرح کی ہے۔

۱۰۔شرح البخاری: یہ امام بخاریؒ کی صحیح کی مختصر شرح ہے جو ایک جلد میں تھی۔

۱۱۔شرح در السحابہ: معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اپنی کتاب در السحابہ کی شرح لکھی ہے۔آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان میں اس کا ذکر کیا ہے۔(معارف جنوری ۴۸ء ص ۶۱)

Marfat.com

۱۲۔شرح القلادۃ السمطیہ فی توشیح الدریدیہ۔بعض مصنفین نے اس کا نام صرف توشیح الدریدیہ ہی لکھا ہے۔(بغیۃ الوعاۃ ص ۲۲۷ و مفتاح السعادہ ج ۱ ص ۹۸) ۱۳۔الشمس المنیرہ من الصحاح الماثورہ:فن حدیث میں ہے آزاد بلگرامی نے اسے صحیح بخاری کی شرح بتایا ہے۔

(مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۸۱)

۱۴۔کتاب الشوارد:لغت کی اہم کتاب ہے،تمام ارباب سیر وفہارس نے اس کا ذکر کیا ہے۔(الجواہر المضیہ جلد ۱ ص ۲۰۲،بغیۃ الوعاۃ ص ۲۲۷،کشف الظنون جلد ۲ ص ۱۷،مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۹۸ الاعلام ج ۱ ص ۳۹ مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۸۱،الفوائد البہیہ ص ۲۹،اتحاف النبلاء ص ۲۴۳) بعض لوگوں نے اس کا نام الشوارد فی اللغات (معارف جولائی ۲۹ء) اور بعض نے الشوارد فی اللغۃ لکھا ہے۔

(معارف مئی ۷۴ء ص ۳۸۰)

۱۵۔العباب الزاخر:یہ بھی لغت میں مہتم بالشان کتاب تھی،سید حسن برنی نے اس کا نام العباب الزاخر واللباب الفاخر لکھا ہے اور اس کو صغانی کی تصانیف لغت میں سب سے زیادہ ممتاز اور قیمتی کتاب بتایا ہے،وہ لکھتے ہیں:

"عربی لغت کے متعلق متقدمین ائمہ لغت نے بڑے بڑے عظیم الشان کارنامے انجام دیے جو فی الواقع حیرت انگیز ہیں،امام صغانی کی یہ کتاب ان مہتم بالشان کارناموں میں بھی امتیاز خاص رکھتی ہے۔قاموس کے مصنف امام مجد الدین فیروز آبادی (م ۷۲۹ھ۔۸۱۷ھ بمطابق ۱۳۲۹ء۔۱۴۱۴ء) نے جو عربی لغت کے بہت بڑے امام ہیں،عربی لغات میں ایک ضخیم کتاب ساٹھ جلدوں میں لکھی تھی جو زیادہ تر امام صغانی کی العباب اور اندلس کے نابینا علامہ لغت امام ابن سیدہ کی کتاب المحکم پر مبنی تھی، اس کتاب کا نام فیروز آبادی نے "اللامع المعلم العجاب الجامع بین المحکم والعباب" رکھا اور اسی کا خلاصہ دو جلدوں میں "قاموس" میں کر دیا تھا۔کتاب اللامع موجودہ کتاب قاموس سے ضخامت میں تیس گنا زیادہ تھی،فیروز آبادی نے امام صغانی اور ابن سیدہ کی کتاب المحکم کے متعلق قاموس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "فن لغت میں یہ دونوں کتابیں بہترین ہیں لیکن افسوس کہ فیروز آبادی کی اللامع اور امام صغانی کی العباب متقدمین کی بعض دیگر نفیس وبیش بہا تصانیف کی طرح ناپید ہیں،کاش آج العباب بھی ہمارے ہاتھوں میں ہوتی تاکہ ہم دنیا کو بتا سکتے کہ ہندوستان کے اس علامہ متبحر نے عربی لغت میں کیسے نمایاں کارنامے سرانجام دیے تھے۔(معارف جولائی ۲۹ ص ۹)

تاج الدین ابن مکتوم احمد بن عبدالقادر قیسی حنفی (م ۷۴۹ھ۔۱۳۴۸ء) نے اسے اور ابن سیدہ کی محکم کو یکجا کر دیا تھا،یہ کتاب خلیفہ مستنصر کے امیر ابن العلقمی کی فرمائش پر مرتب کرنی شروع کی تھی اور اس میں اصحاب معجم کے تراجم بھی لکھے تھے۔(کشف الظنون جلد ۲ ص ۱۰۵ و تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جلد ۳ ص ۴۹) صحاح جوہری یا قاموس کے انداز پر اسے حروف معجم کے اواخر پر مرتب کیا گیا تھا مگر صغانی اسے مکمل نہیں کر سکے تھے وہ بیس جلدیں لکھ چکے تھے اور حرف میم تک پہنچے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا،آخری لفظ جو اس میں درج ہے وہ "کم" تھا،کسی کا شعر ہے:

ان الصغانی الذی   حاز العلوم والحکم

کان قصاری امرہ   ان انتہی الی بکم

(بغیۃ الوعاۃ ص ۲۲۷ و کشف الظنون جلد ۲ ص ۱۰۵)

بیشک امام صغانی علوم وحکم پر حاوی تھے مگر ان کے کام کی انتہا لفظ کم (کتنا) پر ہوئی۔

Marfat.com

العباب کے غیر مکمل رہ جانے کا اکثر لوگوں نے تذکرہ کیا ہے، مگر صاحب قاموس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مکمل ہوگئی تھی، ممکن ہے اس کے اجزا بعد میں تلف ہوگئے ہوں اور حاجی خلیفہ کی نظر سے نامکمل کتاب گزری ہو۔ صغانی نے اسے لغت کی مشہور کتابوں کی مدد سے مرتب کیا تھا اور اپنے اقوال کی تائید وصحت کے لیے قرآن وحدیث سے اس میں ثبوت وشواہد بھی پیش کیے تھے۔ العباب کا ایک قلمی نسخہ چھ جلدوں پر مشتمل مصر کے کتب خانہ خدیویہ میں موجود ہے۔ یہ ۶۴۲ھ۔ ۱۲۲۴ء کا لکھا ہوا ہے۔ (تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جلد ۳ ص ۳۹) گویا مصنف کی زندگی ہی کا ہے۔ پاکستان کے ڈاکٹر پیر محمد حسن کے کتب خانہ میں بھی اس کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ (کتاب خانہ ہائی پاکستان جلد یکم ص ۶۷)

۱۶۔ فرائض الصغانی (معارف جولائی ۲۹ ص ۱۳): معلوم ہوتا ہے یہ رسالہ علم الفرائض میں تھا۔

۱۷۔ افعال، ۱۸۔ فعلان، ۱۹۔ فعول: یہ تینوں ایک ہی طرح کے رسالے ہیں، غالباً ان میں تینوں کے ہم وزن الفاظ لکھ کر ان کی تشریح کی ہوگی، اول الذکر کے متعلق حال کے بعض اہل قلم نے لکھا ہے کہ اس میں صغانی نے اس کے ہم وزن ۱۳۰ الفاظ جمع کیے تھے۔ (الجواہر المضیہ ص ۲۰۲)

۲۰۔ کتاب الاثر، ۲۱۔ کتاب اسماء الدین، ۲۲۔ کتاب اسماء السعادہ، ۲۳۔ کتاب الاصفار: اول الذکر تینوں کا نام صاحب مفتاح السعادۃ (مفتاح السعادۃ جلد ا ص ۹۸) نے اور آخر الذکر کا صاحب الجواہر المضیہ (الجواہر المضیہ جلد ا ص ۲۰۲) نے لکھا ہے سید حسن برنی نے الاصفار کے بجائے الاصفاد لکھا ہے۔ (معارف جولائی ۲۹ ص ۱۲)

۲۴۔ کتاب الاضداد: یہ ایک صغیر الحجم لیکن کثیر المنافع رسالہ ہے جو ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں عربی کے ۳۳۶ لغات اضداد کے معانی بیان کیے گئے ہیں یعنی وہ الفاظ جمع کیے ہیں جن کے دو مختلف معنی آتے ہیں جیسے الابض کا لفظ لکھ کر اس کے یہ معنی بتاتے ہیں: السکون والحرکۃ اسی طرح الارز کا معنی لکھا ہے: القوۃ والضعف۔ صغانی کا خود بیان ہے کہ محمد بن المستنیر قطرب (م ۲۰۶ھ۔ ۸۲۱ء) کے دور سے خلیفہ عباسی مستنصر کے زمانہ تک کے مختلف مصنفین نے جو لغات اضداد تحریر کیے تھے، ان سب کو میں نے اس کتاب میں بترتیب حروف ہجا نہایت جستجو کے بعد جمع کر دیا ہے۔ آسٹریا کے استاذ کلیۃ الشبر وک ڈاکٹر ہنفر کی سعی سے ۱۹۱۳ء میں بیروت سے یہ رسالہ چھپ گیا تھا، اس کے ساتھ ابن السکیت کی کتاب الاضداد بھی چھپی تھی۔ (معجم المطبوعات جلد ۲ کالم ۱۲۰۹) اس کا قلمی نسخہ برلن میں موجود ہے۔ (تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۳ ص ۵۰)

شیخ محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر رازی متوفی ۶۶۰ھ۔ ۱۲۶۲ء نے ۹ صفحے میں کتاب الاضداد کا مختصر تیار کیا تھا، اس کا قلمی نسخہ رام پور کے کتب خانہ میں ہے۔ (کتب خانہ عربیہ رام پور جلد اول ص ۵۱۷)

۲۵۔ کتاب الافتعال: غالباً صرف واشتقاق یا لغت کی کتاب ہے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص: ۲۶۳)

۲۶۔ کتاب الافعال (کشف الظنون جلد ۲ ص ۲۶۳)۔

۲۷۔ کتاب الانفعال۔ یہ کتاب حال میں ڈاکٹر احمد خان نے ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد سے ایڈٹ کر کے شائع کی ہے مگر ہماری نظر سے نہیں گزری ممکن ہے یہ اور اول الذکر دونوں کتابیں ایک ہی ہوں۔

۲۸۔ کتاب التکملہ: اس کا پورا نام التکملہ والذیل والصلہ ہے، یہ لغت کی کتاب ہے، صغانی کا بیان ہے کہ غریب القرآن، غریب الحدیث، لغت، نحو، اخبار، ایام، واشعار عرب نیز حیوانات اور اسلحہ وغیرہ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے تقریباً ایک ہزار

Marfat.com

کتابوں کی مدد سے میں نے اُسے مرتب کیا ہے۔ یہ دراصل جوہری کی صحاح کا ذیل وتکملہ ہے، اس میں اس کی غلطیوں کی تصحیح کے علاوہ مافات کو بھی شامل کرلیا ہے، آخر میں کتاب کے مراجع ومصادر کی فہرست دی ہے، کتب خانہ خدیویہ مصر کوپریلی اور مکتبہ شیخ الاسلام مدینہ میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔

(کشف الظنون ج ۲ ص ۷۵، الاعلام جلد ا ص ۲۳۹، تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جلد ۳ ص ۵۰ تذکرۃ النوادر ص ۱۲۰)

۲۹۔ کتاب التراکیب: (الجواہر المضیہ ج ا ص ۲۰۲، بغیۃ الوعاۃ ص ۲۲۷ مفتاح السعادہ ج ا ص ۹۸ معارف جولائی ۲۹ ص ۱۲)

۳۰۔ کتاب درجات العلم والعلماء۔ (اتحاف النبلاء ص ۲۴۳)

۳۱۔ کتاب زبدۃ المناسک۔ (ایضا) سید حسن برنی نے مناسک الصغانی نام لکھا ہے۔ (معارف جولائی ۲۹ ص ۱۳)

۳۲۔ کتاب الضعفا: فن رجال کی کتاب ہے، اس میں ضعیف ومتروک راویوں کا تذکرہ ہے۔

(ایضا والجواہر جلد ا ص ۲۰۲ وکشف الظنون ج ۲ ص ۸۴)

۳۳۔ کتاب العروض: (ایضا وبغیۃ الوعاۃ ص ۲۲۷)

۳۴۔ کتاب عقلۃ العجلان۔ (اتحاف النبلاء ص ۲۴۳)

۳۵۔ کتاب یفعول: اس میں امام صغانی نے اس وزن کے تقریبا ۴۰ الفاظ جمع کیے ہیں اس کی ترتیب حروف معجم پہ ہے۔ مصنف نے اس میں لفظوں کی تشریح بھی کی ہے اور عربی نظم ونثر میں ان کے استعمالات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ خلدونیہ کے تاریخ اسلام اور تونس کے مدرسہ علیا کے عربی زبان وادب کے استاد حسن حسنی عبدالوہاب نے اسے تصحیح ومقابلہ کے بعد اپنے مفید محققانہ حواشی و تعلیقات کے ساتھ شائع کیا ہے، شروع میں ان کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ بھی ہے، جس میں منصف کے حالات اور شاعری پر بحث وگفتگو کے علاوہ ان کی کتابوں کے نام لکھے ہیں اور ہر کتاب کے موضوع کی نشاندہی بھی کی ہے، انہوں نے آخر میں ایک استدراک بھی لکھا ہے اس میں یفعول کے وزن پر مزید ۱۴ الفاظ نقل کر کے ان کی تشریح کی ہے۔ امام صغانی نے ان لفظوں کو چھوڑ دیا تھا، یہ کتاب مطبعۃ العرب تونس سے شائع ہوئی ہے۔ (مجلۃ المجمع العلمی العربی دمشق ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ اکتوبر ۱۹۲۵ء ومعجم المطبوعات جلد ۲ کالم ۱۲۰۹)

۳۶۔ کشف الحجاب عن احادیث الشہاب: اس کا نام تخریج الاحادیث للقضاعی بھی ہے، اس میں ابوعبداللہ محمد بن سلامہ قضاعی (م ۴۵۴ھ ۱۰۶۲ء) کی کتاب شہاب الاخبار فی الحکم والامثال والآداب کو ازسرنو مدون کیا ہے اور مشارق الانوار کی طرح اسے بھی ابواب پر مرتب کیا ہے اور صحیح، ضعیف اور مرسل حدیثوں کی تصریح علامتوں سے کردی ہے۔

(کشف الظنون جلد ۲ ص ۲۷ ومعارف جولائی ۱۹۲۹ ص ۱۳)

۳۷۔ مجمع البحرین: یہ لغت کی ضخیم کتاب ہے جو بارہ جلدوں پر مشتمل ہے اس میں مصنف نے جوہری کی صحاح اور اپنی کتاب التکملہ والذیل والصلہ کو جو دراصل صحاح جوہری کا ذیل وتتمہ ہے جمع کردیا ہے اور آخر میں اپنے حواشی کا اضافہ بھی کیا ہے جوہری کی کتاب کے لیے "ص" کا تکملہ کے لیے "ت" کا اور حواشی کے لیے "ح" کا رمز واشارہ دیا ہے۔ (کشف الظنون جلد ۲ ص ۳۸۳ ومفتاح السعادۃ ج ا ص ۹۸ وتاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۳ ص ۵۰) ابن ملک نے اس کی شرح لکھی تھی۔

(معجم المطبوعات جلد ا کالم ۲۵۳)

۳۸۔ مصباح الدجی من صحاح احادیث المصطفٰی: یہ مصباح الدجی فی حدیث المصطفٰی اور مصباح الدجی بھی کہلاتی ہے،

Marfat.com

حدیث کی مفید اور بلند پایہ کتاب ہے، اس میں مصنف نے بلا سند حدیثیں جمع کی تھیں۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۷۴۴) آزاد بلگرامی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صحیح بخاری کی شرح ہے۔ (مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۸۱) مصر کے کتب خانہ خدیویہ اور برلن میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ (تذکرہ النوادر ص ۵۲ و معارف مئی ۷۴ء ص ۳۸۰)

۳۹۔ موضوعات امام حسن صغانی: امام صغانی نے موضوعات میں دو رسالے لکھے تھے، مولانا عبدالحئی فرنگی محلی لکھتے ہیں کہ صغانی کا شمار ابن جوزی وغیرہ جیسے متشدد محدثین میں ہوتا ہے، اس لیے انہوں نے اپنے رسائل میں بہت سی غیر موضوع حدیثوں کو بھی موضوع قرار دے کر شامل کرلیا ہے، علامہ سخاوی کا بیان ہے کہ انہوں نے قضاعی کی الشہاب، اقلیشی کی النجم اور ابن ودعان کی اربعین وغیرہ کی حدیثیں نقل کی ہیں اور ان کے رسالے صحیح و حسن حدیثوں پر بھی مشتمل ہیں اور ان میں ضعیف روایتیں کم ہیں۔ (الفوائد البہیہ ص ۳۰)

مولوی سید حسن برنی نے رسالۃ فی الاحادیث الموضوعات کے نام سے صغانی کے ایک رسالے کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ مکتبہ خدیویہ مصر میں اس نام کے دو رسالے موجود ہیں، (معارف جولائی ۲۹ء ص ۱۳) الموضوعات کا ایک مخطوطہ رام پور کے کتب خانہ میں ۱۴ صفحے کا ہے۔ (فہرست کتب عربیہ ج ۱ ص ۱۲۰)

موضوعات میں امام صغانی کا ایک رسالہ ۱۲ صفحے کا شیخ محمد بن ابی المحاسن قاوقجی کی کتاب "اللؤلؤ المرصوع فیما لا اصل لہ او باصلہ موضوع" کے آخر میں شائع ہوگیا ہے۔ (رجال السند والہند ص ۱۰۳ طبع اول) حال میں موضوعات صغانی نجم عبدالرحمٰن خلف کی تحقیق و تحشیہ کے ساتھ قاہرہ کے دار نافع للطباعۃ والنشر سے ۱۴۰۱ھ بمطابق ۱۹۸۱ء میں بھی شائع ہوئی ہے۔

(مجلۃ الجامعۃ السلفیہ بنارس فروری ۱۹۸۵ء ص ۳۲)

۴۰۔ النوادر فی اللغۃ: یا نوادر فی اللغۃ، صغانی کی کتاب الشوارد کا پہلے ذکر آچکا ہے، ممکن ہے دونوں ایک ہی کتاب ہوں۔

۴۱۔ مشارق الانوار: یہ امام صاحب کی سب سے اہم اور مشہور تصنیف ہے، وہ حدیث سے زیادہ لغت میں ممتاز اور بلند پایہ خیال کیے جاتے ہیں اور انہوں نے فن لغت میں بیش قیمت اور بے نظیر کتابیں یادگار چھوڑی ہیں مگر ان کی تمام تصنیفات میں مشارق الانوار النبویہ من صحاح الاخبار المصطفویہ جیسی شہرت قبول اور اعتبار کسی کتاب کو نصیب نہیں ہوا۔

اب تو اس کا چرچا کم ہوگیا ہے لیکن ایک زمانہ میں یہ کافی مروج تھی اور ہندوستان میں نویں صدی ہجری تک صرف یہی کتاب متداول تھی، اس کے سوا دوسری کتب حدیث یہاں تقریباً عنقا تھیں، درس و تدریس میں سارا زور معقولات کی کتابوں پر صرف کیا جاتا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی کی زبانی یہ صورت حال سننے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:

"نویں صدی ہجری تک صرف مشارق الانوار کا نسخہ ہندوستان میں نظر آتا ہے۔ محمد تغلق جس کے براہ راست تعلقات مصر کی عباسی خلافت سے تھے اور اس کی طرف سے اس کو حکومت کا فرمان اور خلعت اور علم بھی ملا تھا اور عباسی خلیفہ سے اس نے بیعت بھی کی تھی، اس کا قاعدہ تھا کہ جب لوگوں سے بیعت لیتا تھا تو مصر کے خلیفہ عباسی کے فرمان کے ساتھ ساتھ قرآن پاک اور مشارق الانوار کا نسخہ سامنے رکھ لیتا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک ہندوستان میں قرآن پاک کے بعد احادیث میں صرف مشارق الانوار کا وجود تھا، جب شاہی کتب خانہ کا یہ حال تھا تو عام لوگوں کی دسترس کا کیا پوچھنا ہے۔"

الغرض شیخ عبدالحق محدث سے پہلے صرف مشارق الانوار للصاغانی اللاہوری المتوفی ۶۵۰ھ ۱۲۵۲ء کے نسخے اور مصابیح (اصل مشکوٰۃ) للبغوی المتوفی ۶۱۵ھ ۱۲۱۸ء کے نسخے دستیاب ہوتے تھے اور یہی دو کتابیں علما کے درس میں تھیں۔

Marfat.com

(مقالاتِ سلیمانی ج دوم ص ۷۴، ۷۵)

اس لیے ہندوستان میں مدت دراز تک حدیث کی جو کتاب سب سے زیادہ مقبول ومتداول اور نصاب درس میں داخل اور عام طور پر پڑھائی جاتی رہی وہ یہی مشارق الانوار ہے، مولوی سید حسن برنی کا خیال ہے:

''امام صغانی ایک بلند پایہ مصنف تھے۔ان کی تصانیف میں مشارق الانوار جس کا متن اور اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے، بہت زیادہ مشہور ومتداول ہے۔ یہ مجموعہ احادیث نہایت مقبول ہوا اور ہندوستان میں تو عرصہ دراز تک حدیث کی انتہائی تعلیم کا دارومدار ہی اس کتاب پر رہا۔'' (معارف ماہ جولائی ۱۹۲۹ء ص ۷و۸)

ہندوستان کی طرح اس کی شہرت کی گونج دنیائے اسلام میں بھی سنائی دیتی تھی اور وہاں کے علما وفضلا بھی امام صغانی کے فضل و کمال کے معترف اور ان کی اس کتاب کی بلند پائیگی کے قائل تھے، مولانا سید سلیمان ندوی اس کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بغداد میں بیٹھ کر خلیفہ مستنصر باللہ عباسی کے نام سے مشارق الانوار نامی حدیث کی کتاب تصنیف کی۔ علمائے حدیث نے اس کتاب کی بڑی قدر کی اور بے شمار لوگوں نے شرحیں لکھیں اور خود یہ کتاب مدارس کے نصاب میں داخل ہوگئی۔''

(مقالاتِ سلیمانی ج دوم ص ۴، ۵)

اللہ تعالیٰ کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا، صغانی نے یہ کتاب بڑی کدوکاوش اور نہایت محنت اور دیدہ ریزی سے لکھی تھی جس کا صلہ انہیں اس کی غیر معمولی مقبولیت اور حسن قبول کی صورت میں دیا۔

صغانی اپنی عرق ریزی اور محنت شاقہ کا خود یہ حال بیان کرتے ہیں:

کفی باللہ الذی ھو عالم بما عانیت فی تالیفہ و ترتیبہ و قاسیت فی تصنیفہ و تھذیبہ۔

(مقدمہ مشارق الانوار)

اللہ کافی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی ترتیب وتالیف اور تصنیف وتہذیب میں میں نے کس قدر ریاضت کی ہے۔

شہرت، رواج اور قبول ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہ صحیح اور مستند حدیثوں کا مجموعہ ہونے کی بنا پر بھی بڑی اہم اور معتبر کتاب خیال کی جاتی ہے، مولانا خرم علی بلہوری نے ترجمہ وتحشیہ کے لیے مشارق الانوار کا انتخاب اسی لیے کیا تھا، وہ رقمطراز ہیں:

''سو سب کتابوں سے مشارق الانوار حسن صغانی کی بہت پسند آئی، اس واسطے کہ مختصر کتاب ہے اور اس کی احادیث کی صحت پر اتفاق ہے کوئی اس کی ایسی حدیث نہیں جو غیر معتبر ہو، بخلاف مشکوٰۃ کے کہ اس میں ہر جنس کی روایت ہے، صحیح بھی اور ضعیف بھی۔'' (تحفۃ الاخیار طبع نولکشور کان پور ۱۳۰۱ھ ص ۲)

خود مصنف کو بھی یہ کتاب بہت پسند تھی اور وہ اسے صحت ووثوق کے لحاظ سے بڑی اہم اور مستند خیال کرتے تھے، فرماتے ہیں:

ھذا کتاب ارتضیہ واستضیئ بضیائہ والعمل بمقتضاہ۔ (اتحاف النبلاء المتقین ص ۱۴۷)

یہ کتاب مجھے اس قدر پسند ہے کہ میں اس سے روشنی حاصل کرتا ہوں اور اس پر عمل کرتا ہوں۔

مشارق الانوار کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

ھذا الکتاب حجۃ بینی و بین اللہ تعالیٰ فی الصحۃ والرصانۃ والاتقان والمتانۃ وھو انیسی مدۃ حیاتی فی

Marfat.com

الدنیا و شفیعی المشفع ان شاء اللہ فی القیامۃ۔(مقدمہ مشارق الانوار)

یہ کتاب صحت و وثوق اور اعتناء و استناد میں میرے اور اللہ کے درمیان حجت ہے اور یہ دنیا میں مدۃ العمر میری رفیق و انیس ہوگی اور ان شاء اللہ عقبیٰ میں میرے لیے موجب شفاعت بنے گی۔

فن حدیث میں الفاظ کی بحث و تحقیق کی طرح معانی کی بحث و تحقیق بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔جن محدثین نے اس باب میں احتیاط و کاوش سے کام لیا ہے اور احادیث کے متن کی طرح ان کے معنی و مفہوم کی تحقیق میں بھی زیادہ کدوکاوش کی ہے۔ان میں امام صغانی بھی تھے۔شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اس حیثیت سے ان کی تالیف مشارق الانوار کو بڑی اہم کتاب بتایا ہے،فرماتے ہیں:

وامر ثانی یعنی احتیاط در فہم معانی احادیث پس مواد آں نیز از تحقیق امر اول معلوم شد زیرا کہ مشارق الانوار در توضیح معانی احادیث صحیحین و موطا کافی است۔(عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۱۶)

رہا دوسرا معاملہ یعنی احادیث کے معنی فہم میں احتیاط تو اس کی حقیقت بھی پہلے معاملہ کی تحقیق سے واضح ہوگئی کیونکہ مشارق الانوار صحیحین اور موطا کی احادیث کے معانی کی توضیح کے لیے کافی ہے۔

یہ کتاب عباسی خلیفہ مستنصر باللہ (۶۲۳ھ ۱۲۲۶ء۔۶۴۰ھ ۱۲۴۳ء) کی فرمائش پر بغداد میں لکھی گئی تھی،مصنف کا بیان ہے:

الفتہ لمخزانۃ المستنصر بن الظاھر بن المستضیئ العباسی۔(کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۶ و اتحاف النبلاء ص ۱۴۷)

میں نے اسے مستنصر بن ظاہر بن مستضی عباسی کے کتب خانہ میں مرتب کیا۔

اس میں ۲۲۴۶ حدیثیں جمع کی ہیں۔(ایضا) اور یہ بارہ ابواب پر مشتمل ہے اکثر ابواب کے ذیل میں فصول و انواع بھی شامل ہیں جن کی مختصر کیفیت اور مشمولات کا حال ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

پہلا باب: دو فصلوں کا مجموعہ ہے،فصل اول میں وہ حدیثیں درج ہیں جن کی ابتدا من موصولہ یا شرطیہ سے ہوتی ہے اور فصل دوم کی حدیثوں کا آغاز من استفہامیہ سے ہوا ہے۔

دوسرا باب: دس فصلوں پر مرتب ہے،ان میں حرف اِنَّ اور اس سے ملحق ضمیروں سے شروع ہونے والی حدیثیں نقل کی گئی ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱)اِنَّ،(۲)اِنّی،(۳)اِنَّا،(۴)اِنَّہ،(۵)اِنَّھم(۶)اِنّھا،(۷)اِنَّک،(۸)اِنّکم،(۹)اَنَّکُنَّ،(۱۰)اِنَّمَا۔

تیسرا باب: اس میں حرف لا سے شروع ہونے والی حدیثوں کا ذکر ہے۔

چوتھا باب: اس کی فصل اول میں اِذا سے اور فصل ثانی میں اِذ سے شروع ہونے والی حدیثیں نقل کی ہیں۔

پانچواں باب: دو فصلوں کا مجموعہ ہے،پہلی فصل پانچ انواع پر مشتمل ہے ان میں جن کلمات سے شروع ہونے والی حدیثیں ذکر کی گئی ہیں،ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱)ما نافیہ،(۲)ما استفہامیہ،(۳)ما خبریہ،(۴)ما شرطیہ،(۵)ما بین۔

دوسری فصل میں چار انواع ہیں:

(۱) اس میں وہ حدیثیں ہیں جو حرف ندا یا سے شروع ہوئی ہیں اور منادی وہ اشخاص ہیں جن کی کنیتوں یا ناموں کا ذکر ہے جیسے یا ابا

Marfat.com

المنذر، یا ابا بکر اور یا ابن الخطاب یا علی وغیرہ۔

(۲) اس میں بھی حرف ندا یا مذکور ہیں اور منادی جگہوں یا گروہوں یا قبائل کی طرف مضاف ہو کر آیا ہے۔ جیسے: یا اهل الخندق یا اهل المدینة یا معشر الانصار، یا معشر المسلمین، یا معشر الشباب وغیرہ۔

(۳) یہ نوع متفرق اجناس پر مشتمل ہے۔ یعنی اس میں بھی حرف ندا کا ذکر ہے اور منادی کہیں مفرد اور کہیں مضاف و مرکب ہے۔

(۴) اس نوع میں منادی عورتوں کی کنیتوں یا ناموں کے لحاظ سے ہے جیسے: یا ابنة ابی امیه، یا ام حارثة اور یا بریرة، یا عائشة وغیرہ۔

چھٹا باب: بارہ فصلوں پر مرتب ہوا ہے، ہر فصل میں جو حدیثیں درج ہیں ان کی ابتدا مندرجہ ذیل لفظوں سے ہوئی ہے:

(۱) لیس، (۲) نعم و بئس، (۳) بینا و بینه، (۴) لعن الله، (۵) لو، (۶) لو لا، (۷) ان شرطیه، (۸) لفظ خیر، (۹) افعل کے وزن پر صیغہ تفضیل، (۱۰) کل، (۱۱) قد، (۱۲) لقد۔

ساتواں باب: اس میں سترہ فصلیں ہیں جن کی ابتدا درج ذیل صورتوں میں ہوئی ہے۔

(۱) مبتدا معروف باللام جیسے: الآن، الارواح، الاسلام وغیرہ۔ (۲) ایما، (۳) ایکم، (۴) ای، (۵) أ (ہمزہ استفہام)، (۶) الا، (۷) الم، (۸) افلا، (۹) الیس نیز او، (۱۰) أما (مخففہ) (۱۱) مثل (بفتح التا) (۱۲) ایاکم، (۱۳) أنا، (۱۴) اسم الفعل جیسے دونک، علیک وغیرہ، (۱۵) لک، (۱۶) لم حازمہ، (۱۷) أما (مشددہ)۔

آٹھواں باب: چھ فصلوں کا مجموعہ ہے، ہر فصل کے شروع کی حدیث اس طور پر ہے:

(۱) اعداد (گنتیاں)، (۲) واو قسم جس کے بعد الذی آیا ہے جیسے: (والذی نفس محمد بیده) (۳) حرف قسم جس کے بعد اللہ مذکور ہے، مثلاً واللہ، (۴) فعل مستقبل، (۵) مضارع معلوم، (۶) مضارع مجہول۔

نواں باب: ۵ فصلیں، بتفصیل ذیل ہیں:

(۱) فعل ماضی معلوم، (۲) فعل ماضی مجہول، (۳) فعل ماضی صیغہ متکلم کے ساتھ، (۴) ہل، (۵) فعل امر۔

دسواں باب: ۲ فصلیں اس طرح ہیں:

(۱) لام ابتدا، (۲) مختلف النوع، اس کی حدیثیں مختلف لفظوں اور حرفوں سے شروع ہوئی ہیں جن کو کسی خاص قاعدہ سے منضبط نہیں کیا جاسکا۔

گیارہواں باب: یہ باب احادیث قدسی کے لیے خاص ہے۔

بارہواں باب: ادعیہ پر مشتمل ہے۔

اس تفصیل سے کتاب کے مباحث و مندرجات کی نوعیت کے علاوہ اس کی قدر و قیمت اور اس کی ترتیب و تبویب میں امام صغانی کی جودت طبع اور دقت آفرینی کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے، اہل نظر اور ارباب فن نے بھی اس کی ترتیب و تہذیب کی خوبیوں کا اعتراف کیا ہے۔ عزیز الدین عبد اللطیف بن عبد العزیز لکھتے ہیں:

رتب الشیخ هذا الکتاب بترتیب انیق و انتخبه بتهذیب ذلیق۔ (مبارق الازهار ص ۱۹)

شیخ صغانی نے اسے نہایت خوبی سے مرتب کیا ہے اور اس کا بہت عمدہ انتخاب کیا ہے۔

Marfat.com

صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ: ورتبہ بترتیب انیق، صغانی نے اس کو بہت عمدہ طور پر مرتب کیا ہے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۶) نواب صدیق حسن خاں تحریر فرماتے ہیں:

وترتیب ایں کتاب بسیار خوب وانیق واقع شدہ۔ (اتحاف النبلاء ص ۱۴۷)

اس کتاب کی ترتیب بہت اچھے اور خوبصورت طریقہ پر کی گئی ہے۔

کتب حدیث میں اس کی نوعیت مشکوۃ المصابیح جیسی ہے، فرق یہ ہے کہ مشکوۃ مختلف کتابوں کی احادیث کا مجموعہ ہے اور اس کی ترتیب فقہی ابواب پر کی گئی ہے مگر مشارق الانوار اصلاً صحیحین کی حدیثوں کا انتخاب یا انڈکس ہے اور اس کی ترتیب احادیث کے ابتدائی الفاظ پر ہے جس کی کیفیت اوپر بیان کی جا چکی ہے۔

ترتیب سے امام صغانی کی خاص جودت طبع، دقت آفرینی اور ندرت وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے جیسے اس میں احادیث قدسی، دعاؤں اور قسموں کے علیحدہ ابواب قائم کیے گئے ہیں اور اس ضمن میں والذی نفس محمد بیدہ یا والذی نفسی بیدہ کی الگ فصل قائم کی گئی ہے، اسی طرح اعداد کا علیحدہ تذکرہ کرنا بھی امام صغانی کی جودت طبع کا نتیجہ ہے۔

صغانی کی یہ ندرت بھی قابل ذکر ہے کہ مشارق الانوار میں صرف قولی حدیثوں کو جمع کیا ہے۔

مشارق الانوار کی ترتیب کے متعلق ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

مشارق الانوار کی ترتیب حروف ہجا پر کی گئی ہے، اس کا اقتضا تو یہ تھا کہ اس میں پہلے حرف الف کی حدیثیں لاتے مگر اس کے برعکس اس میں پہلے حرف من سے شروع ہونے والی حدیثیں بیان کی گئی ہیں، اس کے بعد ان اور لا کی حدیثیں نقل کی گئی ہیں، ایسی صورت میں حروف تہجی کے مطابق ترتیب کا دعویٰ درست نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا خرم علی اس اشکال کو ذکر کر کے اس کا یوں جواب دیتے ہیں:

جن حدیثوں کے سرے پر حرف من ہے اول باب میں لایا اور ان کی حدیثوں کو دوسرے باب میں اور جن پر حرف لا ہے ان کو تیسرے باب میں اور باوجود اس کے پھر حروف تہجی کی رعایت ہے، خلاصہ یہ کہ اس میں ترتیب معنوی نہیں، ترتیب لفظی ہے۔ لیکن جامع رحمہ اللہ نے باب اول میں من کو مقصود نہیں بلکہ من کے بعد وہ لفظ آئے گا جس کے شروع میں الف ہو، چنانچہ پہلی حدیث ہے۔

ابو ھریرۃ رضی اللہ عنہ من آمن باللہ ورسولہ ﷺ۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لایا۔

اور دوسری حدیث یہ ہے:

زید بن خالد الجھنی ﷺ من آوی ضالہ فھو ضال مالم یعرفھا۔ (تحفۃ الاخیار باب اول ص ۶، ۷)

حضرت زید بن خالدؓ سے مروی ہے کہ جس نے کسی گمشدہ جانور کو پناہ دی تو جب تک اس کی تشہیر نہ کرے وہ اس کا ضامن رہے گا۔

پہلی حدیث میں من کے بعد لفظ آمن اور دوسری میں لفظ آوی کا اعتبار ہے، حروف تہجی کی رعایت کا التزام تمام کتاب میں اسی طرح ہے جیسا کہ حدیث نمبر ۱ و ۲ کے بعد ہے کہ الف ممدودہ کے بعد الف مقصورہ آیا ہے۔

Marfat.com

حوالے:

مشارق الانوار میں حدیثوں کے حوالے بھی ہر حدیث کے ساتھ دیئے گئے ہیں، جس کے لیے خ، م اور ق کی علامتیں اور رموز مقرر کیے گئے ہیں، خ سے بخاری کی جانب اور م سے مسلم کی طرف اشارہ ہے اور ق سے مراد یہ ہے کہ وہ حدیث متفق علیہ ہے یعنی بخاری و مسلم دونوں نے اس کی تخریج کی ہے۔

اختصار:

مشارق الانوار کی ایک اہم خوبی اختصار ہے، مصنف نے طوالت سے بچنے کے لیے سندیں حذف کر دی ہیں اور صرف اس صحابی کا نام دیا ہے جو اس حدیث کے اولین راوی ہیں اس کے بعد اصل مضمون شروع کر دیا ہے اور غایت اختصار کی بنا پر قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہیں کہا ہے، اس سلسلہ میں مولانا خرم علی کا بیان ملاحظہ ہو:

مصنف نے اختصار کے واسطے احادیث کے اسناد یعنی راویوں کے نام کو حذف کیا، فقط صحابی کا نام جو اس حدیث کا اول راوی ہے مذکور کیا، اس طرح ہر حدیث میں اول کتاب کا اشارہ کیا، پھر صحابی کا نام لیا، پھر حدیث کو بیان کیا اور اختصار کے واسطے ہر حدیث پر قال رسول اللہ نہیں کہا۔ (تحفۃ الاخیار باب اول ص ۶، ۷ بحوالہ معارف جون ۷۵ء ص ۴۴۶)

مشارق الانوار کی بعض اور خصوصیات یہ ہیں:

(۱) کہیں کہیں حدیثوں کے موقع و محل کی صراحت کر دینے سے ان کا مفہوم اچھی طرح واضح ہو گیا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے کس موقع پر یا کس سے مخاطب ہو کر یہ بات فرمائی تھی، نیز اگر آپ نے کسی خاص شخص کے سوال کے جواب میں کوئی بات فرمائی تھی تو اس کا بھی اس وضاحت سے پتہ چل جاتا ہے، مثلاً ایک حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قالہ منصرفہ من تبوک۔ (مشارق الانوار ص ۴۲)

آپ ﷺ نے تبوک سے واپسی کے وقت یہ ارشاد فرمایا تھا۔

ایک حدیث یہ نقل کی ہے:

یا ام سلیم ان اللہ قد کفی واحسن۔

اے ام سلیم اللہ ہمارے لیے (دشمنوں کے شر سے) کافی ہے اور اس نے ہمارے ساتھ اچھا کیا۔

اس کی توضیح میں تحریر کرتے ہیں:

قالہ یوم حنین۔ (شرح مبارق الازھار ص ۳۶)

رسول اللہ ﷺ نے حنین کے روز یہ بات فرمائی تھی۔

امّ ہانی کی ایک حدیث نقل کرتے ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے:

قد اجرنا من اجرت وآمنا من آمنت۔

(اے امّ ہانیؓ!) جسے تو نے پناہ دی، امان دی اسے ہم نے بھی پناہ اور امان دی۔

اس کی توضیح اس طرح کی ہے:

Marfat.com

قالہ لھا یوم فتح مکۃ۔ (مبارق الازھار جلد ۲ ص ۱۸۳)

آپ نے ام ہانی سے فتح مکہ کے روز یہ فرمایا تھا۔

گو پوری کتاب میں اس کا التزام نہیں کیا ہے چنانچہ مولانا خرم علی بلہوری لکھتے ہیں: مصنف نے ہر جگہ قصہ حدیث کا نہیں بیان کیا کہ حضرت ﷺ نے یہ حدیث کس وقت کس تقریب سے فرمائی۔ (تحفۃ الاخیار بحوالہ معارف جون ۵۷ء ص: ۴۴۶)

(۲) اوپر گزر چکا ہے کہ مصنف نے اختصار کی وجہ سے سندیں حذف کر دی ہیں اور صرف صحابی کا نام دیا ہے مگر اس کے باوجود اگر کسی حدیث کے متعلق راوی نے کوئی تشریح و وضاحت کی ہے تو اسے نقل کر دیا ہے جیسے ایک جگہ لکھتے ہیں: قال حماد (حماد نے یہ بات کہی ہے)۔

اسی طرح روایت کے الفاظ میں اگر راوی نے شک و تردد کا اظہار کیا ہے تو اسے بھی ظاہر کر دیا ہے اور بتادیا ہے کہ یہ شک و اشتباہ راوی کا ہے جیسے قربانی کے گوشت کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا:

کلوا واطعموا واحبسوا او ادخروا۔

قربانی کا گوشت خود کھاؤ اور دوسروں کو کھلاؤ اور اسے روک یا جمع کر کے رکھو۔

اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ: شک من الراوی۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے احبسوا (روک لو) یا ادخروا (جمع کر لو) میں سے کون سا لفظ فرمایا تھا۔ راوی کو اس میں شک وشبہ ہو گیا ہے۔ (مبارق الازہار جلد ۲ ص ۳۷)

(۳) مصنف نے اس میں کہیں کہیں منامی حدیثیں نقل کی ہیں۔

(۴) بعض حدیثیں دو صحابیوں کی سندوں سے ذکر کی ہیں۔

(۵) احادیث کے سلسلہ میں مختلف قسم کی وضاحتیں کی ہیں مثلاً کہیں کہیں ان کی مبہم باتوں کی توضیح کی ہے بعض جگہ صراحت کی ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہوگئی ہے۔ اسی طرح روایت کے اختلاف، الفاظ و متون کی نشاندہی کی ہے، لفظوں کے اختلاف کی صورت میں بعض جگہ اپنی تصویب، توثیق اور ترجیح دلائل کے ساتھ لکھی ہے۔ نیز دو راویوں کے یہاں الفاظ کی روایت میں جو کمی بیشی یا حذف و اضافہ پایا جاتا ہے اسے بھی بتادیا ہے۔

(۶) رواۃ و اسناد کے سلسلہ میں بھی مختلف توضیحات کی گئی ہیں، مثلاً راویوں کے ناموں میں فرق و اختلاف کی صراحت، ان میں غموض، خفا یا ابہام کی وضاحت و راوی سے حدیث کے بیان میں کوئی چیز ترک ہوگئی یا اس نے اپنی عدم یادداشت یا سوئے حفظ کا اعتراف کیا ہے تو اسے بھی نقل کیا ہے، اسی طرح سندوں کے ارسال و عدم اتصال کا بھی ذکر کیا ہے۔

(۷) متفق علیہ حدیثوں میں جس محدث کے سیاق کا تتبع کیا ہے اس کی صراحت کی ہے۔ اس سلسلہ میں دونوں کی روایتوں کے فرق و اختلاف یا اضافہ و کمی کی نشاندہی بھی کی ہے، کسی روایت کو امام مسلم نے مسند اور امام بخاری نے معلق بیان کیا ہے تو اسے بھی بیان کر دیا ہے، اسی طرح تضاعی کے شیخین سے اختلاف کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

مشارق الانوار متعدد بار طبع ہو چکی ہے اور اس کے قلمی نسخے بھی اکثر کتب خانوں میں موجود ہیں، ٹونک کے کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف کے فرزند محمد بن حسن نے ان کے سامنے اس کی قراءت کی تھی۔ (قصر علم ص ۱۰۱)

Marfat.com

مشارق الانوار کی شرحیں:

مشارق الانوار کی شہرت و مقبولیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس کے بکثرت شروح و حواشی لکھے گئے، اس کی تلخیص کی گئی اور اس کے کئی مختصرات مرتب کیے گئے، مولوی سید احمد ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں:

ان کی تالیف مشارق الانوار حدیث کی نہایت مشہور و معتبر کتاب مانی جاتی ہے اور اس کی مقبولیت کا اس ایک واقعہ سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ بیسویں صدی ہجری تک (تقریباً ساڑھے تین سو برس میں) اس کتاب کی ۲۴، ۲۵ شرحیں اور حواشی ایسے لکھے جا چکے تھے جو بجائے خود مستقل اور بلند پایہ کتابیں ہیں۔ (تاریخ ہند کتاب دوم ص ۲۶۲)

مولوی ابویحییٰ امام خاں نوشہروی رقمطراز ہیں:

صحاح ستہ کے بعد سب سے زیادہ اس کی شرحیں لکھی گئی ہیں: (معارف دسمبر ۱۹۴۷ء ص ۴۳۹)

ہندوستان میں اس کتاب کے رواج و قبول کا ذکر اوپر آچکا ہے اس لیے ہندوستانی علمانے بھی اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا اور اس کی متعدد شرحیں، فوائد اور مختصرات بھی لکھے اور اس کے اردو ترجمے بھی کیے گئے بلکہ حدیث کی یہی وہ کتاب ہے جس کا غالباً سب سے پہلے اردو ترجمہ ہوا اور جس کی حدیثوں کی سب سے پہلے اردو میں شرح و توضیح کی گئی، ذیل میں شرحوں کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے۔ ہندوستانی شرحوں کا ذکر آخر میں آئے گا۔

(۱) تحفۃ الابرار: شارح کا نام شیخ اکمل الدین محمد بن محمود البابرتی الحنفی (م ۷۸۶ھ۔ ۱۳۸۴ء) ہے۔

(کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۶)

(۲) شوارق الاسرار العلیہ: یہ صاحب قاموس شیخ مجد الدین ابوطاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی (م ۸۱۷ھ۔ ۱۴۱۴ء) کی شرح ہے جو چار جلدوں پر مشتمل تھی۔ (ایضاً)

(۳) کشف المشارق: خیر الدین خضر بن عمر طوفی شارح کا نام ہے، وہ دولت عثمانیہ کے علما میں تھے، انہوں نے ۳ جلدوں میں مشارق الانوار کی شرح لکھی تھی۔ (کشف الظنون جلد ۲ ص ۴۳۶)

(۴) المطالع المصطفویہ: یہ مشہور اور اہم شرح ہے جو شیخ امام سعید بن محمد بن مسعود گارزونی (م ۷۵۸ھ۔ ۱۳۵۶ء) نے لکھی تھی ان کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ انہوں نے مشارق الانوار کے ہر باب و فصل کے آخر میں اس باب و فصل کی احادیث کی تعداد بھی لکھی ہے اور آخر میں ان کی مجموعی میزان ۲۲۴۶ دی ہے۔ (ایضاً) مشارق کے موجودہ متداول نسخہ پر گارزونی ہی کے شمار کردہ اعداد ثبت ہیں۔

(معارف دسمبر ۱۹۴۷ء ص ۴۳۹)

(۵) مبارق الازہار: یہ مشارق الانوار کی بڑی مشہور و متداول شرح ہے جو عز الدین عبد اللطیف بن عبد العزیز المعروف بابن الملک نے دو جلدوں میں لکھی تھی اور دولت عثمانیہ سے ۱۳۲۸ھ۔ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی ہے، دور حاضر کے مشہور ہندوستانی محدث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

عبد اللطیف بن ملک یا ابن فرشتہ ایک مشہور مصنف اور نامور عالم ہیں، مشارق الانوار کی شرح مبارق الازہار کو بہت شہرت و مقبولیت حاصل ہے، یہ شرح استنبول سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے، مصنف کی اس کے سوا تصنیفات میں شرح مجمع البحرین فقہ میں اور شرح منار اصول فقہ میں بھی بہت مستند اور علما میں متداول رہی ہے۔ (معارف جنوری ۵۴ ص: ۶۱)

Marfat.com

مبارق الازہار، ان خوبیوں اور خصوصیات سے آراستہ ہے جو قدما کی شرحوں میں پائی جاتی ہیں، ابتداء میں شارح کا مقدمہ ہے پھر مقدمہ مشارق کی شرح کرنے کے بعد دو جلدوں میں اس کے متن کی شرح کی ہے، ابن الملک کے پیش نظر مشارق الانوار کا جو نسخہ تھا اس میں جہاں کہیں انہیں تصحیف یا غلطی نظر آئی اس کو انہوں نے درست کر دیا ہے، لکھتے ہیں:

میں نے التزام کیا ہے کہ شیخین میں اگر کوئی صاحب کسی حدیث میں منفرد ہیں تو اس کا ذکر کروں اور اگر دونوں متفق علیہ ہیں تو اسے لکھ دوں کیونکہ مشارق الانوار کے متداول نسخے میں علامات کے لحاظ سے فرق و اختلاف ہے اور ان سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ زیادہ صحیح کون ہے اور بعض جگہ مصنف کی علامتیں واقعہ کے مطابق نہیں ہیں تو ان پر بھی متنبہ کیا ہے مثلاً مصنف نے حدیث کو صحیحین کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ ان میں سے صرف ایک ہی کتاب میں وہ درج ہے یا اس کی تخریج ان دونوں کے علاوہ کسی کتاب میں کی گئی ہے یا راوی کے نام میں صحیحین سے عدم مطابقت ہے۔ (مبارق الازہار بحوالہ کشف الظنون جلد ۲ ص ۷۴۳) گویا مبارق الازہار میں شرح کے ساتھ مشارق الانوار کی صحت تخریج بھی کی گئی ہے یعنی اگر حدیث بخاری میں ہے تو اس کا ماخذ کتاب و باب لکھ دیا اور مسلم میں ہے تو اس کی کتاب و باب کا ذکر کر دیا اور دونوں میں ہے تو ہر دو کا حوالہ کتاب و باب ضبط فرما دیا ہے، مولوی ابویحییٰ امام خاں نوشہروی تحریر فرماتے ہیں:

معلوم ہوتا ہے کہ ابن الملک نے مشارق کی ایک ایک حدیث کا صحیحین سے مقابلہ کیا ہے اور جو حدیث مقابلہ کے بعد نہیں نہیں ملی، اس کے متعلق صراحت کر دی کہ وہ حدیث بخاری یا مسلم میں یا ان دونوں میں سے کسی میں نہیں ملی۔ ایسی حدیثیں جو صحیحین میں سے کسی میں نہیں ابن الملک کو بے شمار ملی ہیں، نہیں کہا جا سکتا کہ مؤلف مشارق ہی کے پیش نظر صحیحین کے نسخوں میں کوئی کمی تھی، یا انہوں نے بخاری و مسلم کے سوا کسی اور کتاب سے لیا یا امام صغانی کے بعد کے محدثین نے مشارق میں ایسی احادیث کا اضافہ کر دیا جو صحیحین میں نہ تھیں یا ناسخین نسخ کی بے پروائی سے ماخذ کا اندراج غلط ہوتا گیا اور یا ابن الملک صاحب مبارق ہی کے پیش نظر نسخوں میں تصحیف ہو چکی تھی جن پر اعتماد کر کے انہیں لم نجدہ (نہیں ملی) و لم نجدہ لکھنا پڑا۔ (معارف دسمبر ۲۷ء ص ۴۴۱) استنبول کا مجموعہ نسخہ الحاج الحافظ ابومظہر احمد طاہر قنوجی مدرس جامع سلطان بایزید کی تصحیح و تحشیہ کے بعد چھپا ہے، فاضل مصحح نے شرح کے حواشی پر مشارق الانوار کی حدیثوں کے اصل مراجع یعنی صحیحین کے کتب و ابواب کی صراحت کر دی ہے۔

مبارق الازہار کا مصنف:

اوپر گزر چکا ہے کہ شارح کا نام عزالدین عبداللطیف بن عبدالعزیز المعروف بابن الملک ہے مگر قاضی سید نورالدین حسین صاحب نے معارف جولائی ۴۹ء میں اور ڈاکٹر سید باقر علی استاد شعبہ عربی اسماعیل کالج بمبئی نے معارف اکتوبر ۵۰ء میں یہ انکشاف فرمایا ہے کہ وہ ایک ہندوستانی عالم کی تصنیف ہے جو احمد آباد کے باشندے تھے، ان کے والد کا نام عبدالملک جنبانی تھا اور ان کی وفات ۹۱۵ھ ۱۵۰۹ء میں ہوئی۔ ان کے صاحبزادے بھی عالم تھے اور ان کا نام خلیل محمد عباسی تھا۔

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے نزدیک یہ انکشاف معیار تحقیق پر پورا نہیں اترتا مولانا نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ مبارق الازہار عبدالملک بن عبدالعزیز بن امین المعروف بفرشتہ یا عبداللطیف بن الملک کی تصنیف ہے، مولانا نے تحقیق سن وفات ۹۱۵ھ ۱۵۰۹ء کو بھی غلط قرار دیا ہے اور استنبول کے نسخہ پر درج سن وفات ۷۹۷ھ ۱۳۹۵ء کو بھی صحیح تسلیم نہیں کیا ہے اور ابن العماد کے بیان پر اعتماد کر کے لکھا ہے کہ ابن فرشتہ کی وفات تقریباً ۸۸۵ھ ۱۴۸۰ء میں ہوئی ہے، مولانا کے نزدیک مصنف کا ہندوستانی ہونا تحقق نہیں

Marfat.com

ہے، انہوں نے علامہ شوکانی کی البدر الطالع کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مصنف ایک رومی عالم تھے جو سلطان مراد کے زمانہ میں موجود تھے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو معارف جنوری ۱۹۵۴ء مضمون مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی بعنوان مبارق الازہار کس کی تصنیف ہے۔

مبارق الازہار کی اہمیت کی وجہ سے اس کے بھی حواشی لکھے گئے ہیں۔

۱۔ حاشیہ مبارق الازہار: اس کے محشی کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔ (کشف الظنون جلد ۲ ص ۷۳۴)

۲۔ حاشیہ برحاشیہ مذکور: از مولانا ابراہیم بن احمد المعید، اس کا نام صواب الافکار تھا۔ (ایضاً)

۳۔ ایک اور حاشیہ: از محمد بن احمد الارنیقی الشہیر بوجی زادہ (م ۱۰۱۸ھ ۱۶۰۹ء)۔ (ایضاً)

۴۔ انوار البوارق فی ترتیب المشارق: از مولی ابراہیم بن مصطفیٰ: اس میں مبارق الازہار کی ترتیب (مع مشارق) مشکوۃ المصابیح کی طرح کردی ہے، مصنف لکھتے ہیں: میں نے بلاضرورت کہیں کوئی ترمیم وتغیر نہیں کیا ہے البتہ اس میں کہیں کہیں مصابیح سے بھی کچھ چیزیں شامل کردی ہیں۔ (ایضاً)

۶، ۷: مشارق الانوار کی دو شرحیں مولی شمس الدین احمد بن سلیمان المعروف بابن کمال پاشا (۹۴۰ھ۔ ۱۵۳۳ء) نے لکھی تھی، مگر انہیں زیادہ شہرت نصیب نہیں ہوئی۔ (ایضاً)

۸۔ حدائق الازہار: از وجیہ الدین عمر بن عبدالمحسن الارزنجانی: اس میں حسب ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا تھا، شرح السنۃ، نوادر الاصول، الفائق، النہایہ، مجمع الغرائب، مطالع الانوار، شرح البیضاوی، التحفہ لبدر الدین الاربلی۔ (کشف الظنون جلد ۲ ص ۷۳۴)

۹۔ شرح از شمس الدین ابن صائغ محمد بن عبدالرحمٰن الزمردی، حنفی (ایضاً) (م ۷۷۶ھ۔ ۱۳۷۵ء) مولانا عبدالحئی فرنگی محلی لکھتے ہیں کہ:

مصنف متبحر اور جامع العلوم والفنون تھے، مصر وشام میں حدیث کی تحصیل کی اور اس میں بارع وفائق ہوئے۔ درس وافادہ کے علاوہ صاحب تصانیف بھی تھے، مشارق کی شرح لکھی۔

۱۰۔ شرح از مولی محمد بن مصلح الدین قوجوی المعروف شیخ زادہ محشی (م ۹۵۱ھ۔ ۱۵۴۴ء)۔ (الفوائد البہیہ)

۱۱۔ شرح از جلال الدین رسول بن احمد التبانی (م ۷۹۳ھ۔ ۱۳۹۰ء) یہ نامکمل رہ گئی تھی۔ (ایضاً)

۱۲۔ شرح وحید الدین۔ (ایضاً)

۱۳۔ دقائق الآثار: از محمد بن محمد اسدی قدسی (م ۸۰۸ھ۔ ۱۴۰۵ء) یہ مشارق الانوار کی تلخیص ہے۔ (ایضاً)

۱۴۔ ضیاء المشارق الجدید بالوضع علی الفارق: از ضیاء الدین علی بن محمود کرمانی، یہ متعدد جلدوں میں تھی۔ (ایضاً)

۱۵۔ شرح از شمس الدین عطائی: ابن ملک کا بیان ہے کہ طلبہ فن کو اس شرح سے اغماض برتنا مناسب نہیں ہے۔ یہ گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے جو اکثر کتابوں سے استفادہ کر کے لکھی گئی ہے۔ (کشف الظنون ج ۱ ص ۷۳۴)

۱۶۔ حاشیہ از قاسم بن قطلو بغا حنفی (م ۸۷۶ھ۔ ۱۴۷۱ء) (کشف الظنون جلد ۲ ص ۷۳۴)

۱۷۔ مبارق الازہار از علی بن حسن یہ (۹۳۶ھ۔ ۱۵۲۹ء) میں مرتب کی گئی، ابن الملک کی شرح اس سے پہلے لکھی گئی تھی، علی بن حسن نے پہلے مشارق الانوار کو مبوب کیا ہے اس کے بعد ابن الملک کی شرح کو ازسر نو مرتب کیا۔ (ایضاً)

۱۸ و ۱۹: علاء الدین یحییٰ بن عبداللطیف طاوسی قزوینی نے دو شرحیں لکھی تھیں ایک شرح صغیر اور دوسری کبیر تھی۔ شرح صغیر کی

Marfat.com

تالیف سے ۷۷۵ھ۔ ۱۳۷۳ء میں بغداد میں مستنصریہ میں فارغ ہوئے۔ اس میں کہیں کہیں شرح کبیر کے حوالے دیے ہیں۔
(ایضاً)

۲۰: تحفہ حسنا: از عبد الباقی معروف بہ طورسون زادہ، مصنف جس زمانہ میں مشارق الانوار کا درس دیتے تھے اس وقت اکمل الدین اور ابن الملک کی شرحیں ان کے پیش نظر رہتیں اور ان سے بکثرت استفادہ کرتے پھر وہ اسکندریہ کے قاضی مقرر کیے گئے تو انہوں نے مشارق کی سو حدیثوں کی تحفہ حسنا کے نام سے شرح لکھی، بعد میں اس میں ۱۵ اور حدیثوں کی شرحیں بھی شامل کر دی تھیں۔ (ایضاً)

ہندوستانی شروح وتراجم:

مشارق الانوار کی جو شرحیں ہندوستان میں لکھی گئیں وہ یہ ہیں:

۲۱/۱: شرح مشارق الانوار از مولانا شمس الدین یحییٰ اودھی (م ۷۴۷ھ۔ ۱۳۴۶ء) مصنف خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے اجل خلفاء میں تھے، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے شرح مشارق تالیف کی تھی۔ (اخبار الاخیار ص ۹۷ و تذکرہ علمائے ہند ص ۸۶)

۲۲/۲: شرح مشارق الانوار از مولانا مظفر بلخی بہاری (م ۸۰۳ھ۔ ۱۴۰۰ء) مولانا مظفر مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مرید وجانشین اور تبحر عالم تھے۔ حضرت مخدوم الملک انہیں امام کہا کرتے تھے۔ مکتوبات بست وہشت (۲۸) کے مکتوب دوازدھم (۱۲) سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا امام مظفر بلخی نے مشارق الانوار کی شرح لکھی تھی۔ (معارف ج ۳ ص ۲۹۵ تا ۲۹۹)

۲۳/۳: مدارج الاخبار از خواجہ ارزانی محدث جونپوری (م ۹۸۱ھ۔ ۱۵۷۳ء) حضرت شیخ مخدوم ارزانی کے لڑکے اور مرید تھے۔ صاحب زہد وتقویٰ اور تمام علوم وفنون میں ماہر تھے، اپنے زمانہ کے مشہور علمائے محدثین میں سے تھے، احادیث مشارق کی بہ ترتیب حروف تہجی ہیں، حسب ترتیب مصابیح الانوار تالیف کر کے اس کا نام مدارج الاخبار رکھا، شارح عہد شیر شاہی میں درجہ وزارت میں پہنچے، سن وفات ۹۸۱ھ۔ ۱۵۷۳ء ہے۔ (تجلی نور حصہ دوم ص ۵۵ بحوالہ گنج رشیدی ص ۵۵)

مولانا حکیم حبیب الرحمٰن (ڈھاکہ) نے ان کا نام شیخ مبارک بن ارزانی الرہتکی البنارسی لکھا ہے اور بتایا ہے کہ مدارج کا ایک ناقص قلمی نسخہ بانکی پور کے کتب خانہ میں ہے، صحاح ستہ سے مصابیح کی طرح برعایت ابواب فقہی لکھی ہے۔ (معارف فروری ۳۴ ص ۲۲۱) مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے بھی بتحقیق ان کا نام مبارک اور والد کا نام شیخ ارزانی لکھا ہے۔ (برہان فروری ۱۹۵۴ء)

مدارج الاخبار ومعارج الآثار من مشارق الانوار کے نام سے ایک کتاب کتب خانہ ٹونک میں بھی موجود ہے جس میں مشارق کو فقہی تبویب پر مرتب کیا گیا ہے لیکن غالباً اس پر مصنف کا نام درج نہیں ہے یا فہرست نگاروں نے اس کا نام نہیں دیا۔ (معارف فروری ۴۸ ص ۱۳۹ و قصر علم ص ۵۹) خیال ہے کہ یہ مدارج ہی کی شرح ہوگی۔

مولانا اعظمی نے بھی مدارج کی ایک شرح معدن الاسرار کا ذکر کیا ہے اور اسے خود خواجہ مبارک کی شرح قرار دیا ہے۔
(برہان فروری ۵۴ء)

۲۴/۴: تبصرۃ الاخبار فی تخریج الآثار: اس کا تاریخی نام شوارق المشارق ہے، مصنف مولوی الٰہی بخش خان بڑاکری بہاری (م ۱۳۳۴ھ۔ ۱۹۱۵ء) تھے۔ انہوں نے کتاب کے ناشر مولوی محمد عبد الرحمٰن بن حاجی محمد روشن علی خان کی فرمائش پر مشارق کو فقہی ترتیب پر کیا تھا۔ مصنف صاحب کمالات اور جامع الفنون تھے، درس وتدریس سے مدۃ العمر وابستہ رہنے کے باوجود صاحب تصانیف کثیرہ تھے، علاوہ ازیں نہایت متدین تھے، اشاعت سنت وتردید بدعت ہمیشہ شعار رہا۔ (معارف جنوری ۴۸ تا ص: ۵۵)

Marfat.com

۲۵/۵: ملتقط مشارق الانوار: یہ علامہ عبدالغنی کی تلخیص ہے جو ۹۰۳ھ۔۱۴۹۷ء میں کی گئی تھی، اسی سن کا خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا قلمی نسخہ رام پور کے کتب خانہ میں ہے۔ فہرست نگار کے بیان کے بموجب محمد جعدی نے اس کی تصحیح کی تھی، آخر میں قدرے آب رسیدہ ہے۔ (فہرست کتب خانہ عربیہ رام پور ج ۲ ص ۱۷)

۲۶/۶: مشکوٰۃ الانوار لتسہیل مشارق الانوار: یہ شرح مولوی عبدالغفور غزنوی امرتسری (م ۱۳۵۴ھ۔۱۹۲۵ء) نے اردو میں لکھی تھی اور مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ مصنف نے اس میں مشارق کو مشکوٰۃ کے نہج پر مرتب کیا تھا اور اسے کتابتاً بھی فہرست مدونہ کے مطابق بدل دیا تھا، اس کے متعلق ان کا خود بیان ہے کہ:

مناسب بلکہ واجب معلوم ہوا کہ اس کتاب کو ترتیب معنوی پر بنا لیا جائے تاکہ سب مسلمان بھائی اس سے بآسانی تمام فائدہ اٹھا سکیں اور جس حکم کی احادیث مطلوب ہوں بآسانی نکال سکیں۔ چچا مولوی عبداللہ (۱۳۰۰ھ۔۱۸۸۲ء) سے مشورہ کیا تو پسند فرمایا۔ اللہ نے ذہن عالی اور فکر بلند دیا تھا، انہوں نے ترکیب یہ بتائی کہ اس کے ابواب موافق مشکوٰۃ کے ہونے چاہئیں اور ہر باب میں تین فصلیں ہوں، فصل اول میں بخاری اور مسلم دونوں کی حدیثیں ہوں اور دوسری فصل میں حدیث بخاری کی اور تیسری میں فقط مسلم کی حدیثیں ہوں اور جس باب میں تینوں میں سے کوئی فصل نہ ہو اس میں اس طرح رکھنا چاہیے کہ اس باب میں فلاں فصل نہیں ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ والے کا بھی یہی قاعدہ ہے۔ غرض چچا کے ارشاد کے مطابق یہ کتاب بنائی تو گویا یہ کتاب ایک چھوٹی مشکوٰۃ بن گئی ہے بلکہ اس پر بھی فوقیت لے گئی اس واسطے کہ یہ مختصر ہے اور اس کی تمام حدیثوں کی صحت پر اتفاق ہے، اس میں کوئی حدیث ایسی نہیں جو غیر معتبر ہو، بخلاف مشکوٰۃ کے کہ اس میں ہر قسم کی حدیثیں مذکور ہیں، صحیح بھی اور ضعیف بھی۔ (۱۳۰۸ھ۔۱۸۹۰ء) میں حسب دل خواہ کتاب تمام ہوئی۔ (معارف جنوری ۱۹۴۸ء ص ۵۹و۶۰)

۲۷/۷: ترجمہ مشارق الانوار از مولانا محمد احسن نانوتوی: محمد عبدالباقی سہسوانی لکھتے ہیں کہ حافظ سید غلام جیلانی نے مولانا محمد احسن نانوتوی مرحوم مترجم درمختار و مشارق الانوار سے دینیات کی تکمیل فرمائی۔

(حیوۃ العلماء طبع نولکشور ۱۹۱۲ء ص ۱۱۰ بحوالہ معارف جون ۱۹۵۷ء ص ۴۴۴)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نے درمختار کی طرح مشارق الانوار کا بھی اردو ترجمہ کیا تھا مگر یہ شاید طبع نہیں ہو سکا اسی لیے کسی نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ جناب محمد ایوب قادری مرحوم نے مولانا کے حالات و سوانح میں ایک کتاب لکھی ہے لیکن انہوں نے بھی مولانا کے اس ترجمہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔

۲۸/۸: تحفۃ الاخیار: یہ مشارق الانوار کا اردو ترجمہ اور اس کی شرح ہے جو ایک دوسرے سے ممزوج ہیں لیکن شرح و فوائد کو ظاہر کرنے کے لیے "ف" کی علامت مقرر کر دی ہے۔ یہ ترجمہ ۱۲۴۹ھ۔۱۸۳۳ء میں مکمل ہوا اور سن تالیف کے تین سال بعد مطبع محمدی لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ یہ ایڈیشن ایسا خوبصورت چھپا تھا کہ اس زمانہ میں اس کی قیمت پندرہ روپے تھی، مترجم و شارح مولانا خرم علی بلہوری ہیں۔

اردو میں حدیث کا پہلا ترجمہ:

اس ترجمہ کی خاص اہمیت اس وجہ سے ہے کہ یہ اردو میں حدیث کا پہلا ترجمہ ہے، مولوی ابویحییٰ امام خان نوشہروی لکھتے ہیں:
کتب حدیث کا سب سے پہلا اردو ترجمہ یہی تحفۃ الاخیار ہے اس کے نواب قطب الدین خان دہلوی نے مشکوٰۃ المصابیح کا اردو

Marfat.com

ترجمہ وشرح بنام مظاہر حق کیا (مظاہر حق اصلاً شاہ محمد اسحٰق دہلوی مہاجر مکی (م ۱۲۶۲ھ۔۱۸۴۵ء) کا تھا نواب صاحب نے بادنیٰ تغیر مہذب فرمایا (اور اس کا اعتراف بھی کیا) مولانا خرم علی کی وفات کے بعد ۳ سال تک متواتر تین مرتبہ طبع ہوا، اس سے اس کی مقبولیت ظاہر ہوتی ہے۔ (معارف دسمبر ۱۹۴۷ء)

مولوی عبدالحلیم چشتی بھی اردو میں حدیث کا پہلا ترجمہ اسی کو بتاتے ہیں۔ ہندوستان میں اس سے پہلے نہ اردو میں کوئی کتاب چھپی تھی اور نہ عوام میں حدیث کا کچھ چرچا تھا، موصوف نے سب سے پہلے مسلمانوں کو تعلیمات نبوی سے باخبر کرنے کے لیے اس کتاب کا ترجمہ کیا جو بے حد مقبول ہوا۔ (معارف جون ۵۷ء ص ۴۴۴)

اور چونکہ ترجمہ کی اصل غرض یہ تھی کہ عام لوگوں کو اس سے فائدہ ہو اس لیے زبان وطرز بیان اس زمانہ کے لحاظ سے نہایت عام فہم اور آسان اختیار کی گئی تھی اور زیادہ دقیق اور پیچیدہ بحثوں سے صرف نظر کیا گیا تھا، تاہم اکثر دینی حقائق ومطالب کو اس میں مؤثر پیرایہ اور دلنشیں انداز میں بیان کیا گیا تھا۔ مترجم خود لکھتے ہیں:

اصل غرض اس سے یہ ہے کہ اہل اسلام کو فائدہ عام ہو، یہاں تک کہ حرف شناس عوام بھی محروم نہ رہیں، اس واسطے نہایت مشکل مسائل نہیں لکھے۔۔۔ اس کتاب کے خطبے کا ترجمہ نہیں کیا، عوام کو اس سے کچھ فائدہ نہ تھا۔ (معارف جون ۵۷ء ص ۴۴۶)

آگے لکھتے ہیں کہ یہ کتاب اہل اسلام کے واسطے عجیب تحفہ ہے کیونکہ یہ اکثر مطالب دینی کو شامل ہے، جس کے دریافت سے جاہل عالم بنے اور عالم تازہ لطف اٹھائے۔ حضرت مولانا عبدالقادر دہلوی کی ہندی تفسیر اور یہ کتاب طالب خدا کے واسطے کافی ہیں۔ دیندار کے حق میں یہ دونوں کتابیں گویا دو آنکھیں ہیں جن سے دو جہاں کا انجام نظر پڑے یا دو پر ہیں جن سے عرش تک اڑ سکے۔ (معارف جون ۵۷ء ص ۴۴۶)

مولانا خرم علی نے ابتداء میں حدیث کی اہمیت، ہندوستان میں اس سے بے اعتنائی اور اردو ترجمہ کے لیے اس کتاب کے انتخاب کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

علم حدیث اشرف العلوم ہے، اس واسطے کہ اشرف الناس کا کلام ہے مثل مشہور ہے کہ کلام الملوک ملوک الکلام اور سب علوم دینی اس کے محتاج ہیں، علم تفسیر بدون حدیث کے معتبر نہیں اور علم عقائد اور علم فقہ وعلم سلوک اور علم تاریخ بدون اس کے کچھ سند نہیں لیکن باوجود اس کے ہندوستان میں اس علم شریف کا چرچا نہیں، عوام کا تو کیا ذکر اکثر علما کو خبر نہیں اس واسطے نہایت مناسب معلوم ہوا کہ کسی حدیث کی کتاب کا ترجمہ عام فہم اردو زبان میں کیا جائے۔ سو سب کتابوں سے مشارق الانوار حسن صغانی کی بہت پسند آئی اس واسطے کہ مختصر کتاب ہے اور اس کی احادیث کی صحت پر اتفاق ہے، کوئی اس کی ایسی حدیث نہیں جو غیر معتبر ہو بخلاف مشکوۃ کے کہ اس میں ہر جنس کی روایت ہے صحیح بھی اور ضعیف بھی۔ (معارف جون ۵۷ء ص ۴۴۵)

مقدمہ میں میں احادیث کے اقسام اور ان کی تعریف بیان کی ہے، اس کے بعد امام بخاری اور امام مسلم کے حالات وکمالات کا تذکرہ ہے۔ پھر حسن صغانی کے حالات وتصنیفات کا ذکر ہے۔ پھر اپنے ترجمہ کی بابت کچھ ضروری باتیں لکھی ہیں، اصل کتاب کے آغاز سے پہلے حدیث کی اہمیت پر ایک بصیرت افروز نظم ہے، اس کے بعد کتاب کا مع متن ترجمہ ہے اس کے بعد فوائد کے تحت حدیث کا پورا واقعہ اور اہم امور کی وضاحت ہے۔ فوائد اگرچہ مختصر ہیں لیکن بڑے کام کے ہیں۔ (ایضاً)

امام صغانی نے اختصار کی وجہ سے سندیں چھوڑ دی ہیں اور قال رسول اللہ کو بھی حذف کر دیا ہے مگر ترجمہ میں یہ لکھ دیا ہے کہ

Marfat.com

آنحضرت ﷺ نے یوں فرمایا۔ مصنف نے ہر حدیث میں اول کتاب کا اشارہ کیا ہے۔ مترجم نے بھی کتاب کا نام ہر حدیث میں پہلے دے دیا ہے، اختصار کی بنا پر مصنف نے یہ نہیں بتایا کہ یہ حدیث کس وقت کس تقریب سے فرمائی جس سے اس کا مطلب بخوبی نہیں معلوم ہوتا، اس واسطے مترجم نے فائدے میں اس کا پورا قصہ لکھ دیا ہے اور جہاں مطلب مجمل اور مشکل تھا اس کو مفصل کر دیا۔

(تحفۃ الاخیار بحوالہ معارف جون ۵۷ء ص ۴۴۶)

ترجمہ تحت اللفظ نہیں ہے، مترجم رقمطراز ہیں:

''حدیث کا ترجمہ تحت اللفظ نہیں کیا اس واسطے کہ عرب کا محاورہ ہند کے محاورے سے اکثر مطابق نہیں بلکہ محاورہ مقدم رکھا ہے مرادی مطلب جابجا لکھا اور باوجود اس کے حتی المقدور تحت اللفظ ترجمے کی بھی رعایت کی ہے۔'' (ایضاً)

ترجمہ وفوائد کی زبان اس زمانہ کے لحاظ سے گو نہایت سادہ و عام فہم تھی مگر اس زمانہ کے لحاظ سے اب اس میں قدامت آ گئی ہے۔ مترجم کا مآخذ حدیث اور شروح حدیث کی بے شمار کتابیں ہیں مگر انہوں نے علامہ گاذرونی کی شرح مشارق اور علامہ ابن اثیر جزری کی جامع الاصول سے اس میں زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔

مترجم وشارح نے اس میں مصنف کے اغلاط و مسامحات کی نشاندہی کی ہے، چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

اکثر مشارق کی حدیثوں میں اس حدیث پر قاف کی علامت ہے یعنی بخاری و مسلم دونوں میں یہ حدیث بالاتفاق ہے حالانکہ یہ صاف خطا ہے، اس واسطے کہ صاحب جامع الاصول اور شارح گاذرونی نے لکھا ہے کہ حدیث صرف مسلم میں ہے بخاری میں نہیں اور اس عاجز نے بھی صحیح بخاری میں دیکھا۔ زید بن خالد سے اس میں اس مضمون کی حدیث نہیں پائی۔ معلوم ہوا کہ کاتب کی غلطی ہے۔

(تحفۃ الاخیار نولکشور ص ۱۲۸ جون ۵۷ء ص ۴۵۰)

مترجم وشارح نے اس میں شیعہ اور اہل بدعت کے شبہات بھی جابجا دفع کیے ہیں اور چاروں ائمہ کے مذاہب بھی مناسب جگہوں پر لکھے ہیں لیکن فقہی مذہب تحریر کرنے میں بالکل بے تعصبی سے کام لیا ہے۔ (تحفۃ الاخیار نولکشور ص: ۱۲۸ بحوالہ معارف ۵۷ء ص ۴۵۰)

ذیل میں شرح وترجمہ کے دو نمونے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ ان کی اہمیت وخصوصیت کا اچھی طرح اندازہ ہو سکے۔

خ ابوھریرۃ من آمن باللہ و رسولہ و اقام الصلوٰۃ و صام رمضان کان حقًا علی اللہ ان یدخلہ الجنۃ ھاجر فی سبیل اللہ او جلس فی ارضہ التی ولد فیھا۔ (تحفۃ الاخیار ص ۷ بحوالہ معارف جنوری ۴۸ء ص ۵۴)

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ جس نے سچے دل سے خدا کو اور اس کے پیغمبر کو مانا اور نماز کو ٹھیک ادا کیا اور رمضان کا روزہ رکھا کرم اور فضل کی راہ سے ضرور ہو گیا خدا پر اس کو بہشت میں لے جانا خواہ اپنا وطن اس نے خدا کی راہ میں جہاد کے واسطے چھوڑا ہو یا اسی زمین میں ٹھہرا رہا ہو جس میں پیدا ہوا۔

اس حدیث پر یہ فائدہ تحریر کیا ہے:

''اس حدیث کی پوری روایت بخاری میں ہے کہ اصحاب نے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو ہم لوگوں کو خوشخبری سنا دیں کہ بہشت جہاد اور ہجرت پر موقوف نہیں۔ حضرت نے فرمایا بہشت میں ایک سو بلند درجے ہیں کہ خدا نے نمازیوں کے واسطے مقرر کیے ہیں ہر ایک درجے میں اتنا فرق ہے کہ جتنا آسمان و زمین میں، سو جب تم خدا سے مانگو تو فردوس سب بہشتوں کے درمیان ہے اور سب سے اونچی اور اس کے اوپر خدا کا عرش ہے اس سے بہشت کی سب نہریں نکلی ہیں، یعنی ہر چند جہاد پر بہشت موقوف نہیں، اصل نجات

Marfat.com

کے واسطے ایمان اور نماز، روزہ کفایت کرتا ہے لیکن تم ہمت کو پست نہ کرو کہ صرف نجات پر قناعت کرو بلکہ ہمت کو بلند رکھو، جہاد کرو تاکہ فردوس پاؤ جس کے آگے سب بہشتیں پست ہیں۔

اس حدیث میں فرشتوں اور خدا کی کتابوں کا اور تقدیر و قیامت کا ایمان لانا بیان نہیں فرمایا، اس واسطے کہ جب آدمی رسول کا ایمان لایا تو ان کا بھی ضرور ایمان لائے گا کہ تمام قرآن و حدیث میں ان کا بیان موجود ہے اور نماز و روزہ کے ساتھ زکوۃ و حج کا ذکر نہیں فرمایا، اس واسطے کہ زکوۃ و حج صرف مالدار پر فرض ہے، محتاج پر نہیں اور نماز، روزہ سب پر فرض ہے، مالدار ہو یا محتاج، خلاصہ یہ ہے کہ یہاں حکم عام بیان فرمانا منظور ہوا، جو سب مسلمانوں کو شامل ہے، مصنف نے ایمان کی حدیث مقدم کی اس واسطے کہ ایمان سب نیکیوں اور عبادت کی جڑ ہے، بدون ایمان کے کوئی عبادت اور نیکی درست نہیں۔

(تحفۃ الاخیار ص ۷ و ۸ بحوالہ معارف جنوری ۸۴ء ص ۵۴ و ۵۵)

ایک اور حدیث کا ترجمہ اور شرح ملاحظہ ہو:

م سمرة بن جندب و المغيرة بن شعبة من حدث عني بحديث و هو يرى انه كذب فهو احد الكاذبين۔

مسلم میں روایت ہے سمرہ بن جندب اور مغیرہ بن شعبہ سے کہ حضرت نے فرمایا کہ جو میری طرف سے روایت کرے اور وہ جانتا ہو کہ وہ جھوٹی حدیث ہے تو دو جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔

: دو جھوٹے یعنی مسیلمہ کذاب اور مختار یا اسود عنسی جنہوں نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا یا یہ مطلب کہ ایک جھوٹا وہ جس ناپاک نے حضرت پر جھوٹ باندھا، دوسرا جھوٹا یہ کہ اس جھوٹی حدیث کو روایت کرتا ہے، جان بوجھ کے اکثر لوگ جو علم حدیث سے ناواقف ہیں، واہی تباہی حدیثیں نقل کیا کرتے ہیں جن کی کچھ اصل نہیں، مسلمان کو لازم ہے کہ حدیث میں بہت احتیاط کیا کرے، ہر ایک کتاب کی حدیث کو سچا نہ جانے، جو حدیث کی معتبر کتابوں میں ہو اس کو مانے، جیسے کہ یہ کتاب مشارق الانوار ہے کہ سب علمائے اہل سنت اس کو بہت صحیح جانتے ہیں۔ (مشارق الانوار ترتیب فقہی والا ایڈیشن نور محمد اصح المطابع کراچی نمبر ۱ بحوالہ معارف جون ۷۵ء ص ۴۲۸)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محشی و شارح نے حدیث مافی الباب کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو کس خوبصورتی کے ساتھ جوڑ دیا ہے، اس پر فائدہ سونے پر سہاگہ یہ فوائد دراصل علم حدیث کی بے نظیر شرح ہے، شارح ناقل نہیں، صاحب بصیرت ہے، جس طرح ترجمہ تحفۃ الاخیار میں شرح کو سمو دیا ہے۔ اسی طرح شرح میں احادیث متذکرہ فی الباب کے ساتھ ان ٹکڑوں کو جوڑ دیا ہے جو ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کی وجہ سے بکھرے پڑے تھے۔ (معارف جنوری ۸۴ء ص ۵۵)

مولانا خرم علی نے اپنے ترجمہ و فوائد کی مقبولیت کے لیے خداوند قدوس کی بارگاہ میں دعا کی تھی کہ ان کی ایک منظوم دعا بھی تحفۃ الاخیار میں شامل ہے جو اس کے حسن قبول کے لیے کہی گئی تھی، اس کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

یا رب ان اوراق کو مقبول کر	بندہ کو اس فیض سے کر بہرہ ور
خرم افسردہ کو پر ورد کر	الفت دنیا سے اپنے سرد کر
تیری ہی دھن روح کو ہر دم رہے	تیرے غم عشق میں خرم رہے
یا رب اس عاجز کی دعا کر قبول	خاتمہ بالخیر بحق رسول

(تحفۃ الاخیار بحوالہ معارف جون ۷۵ء ص ۴۲۹)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا جو دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی قبول فرمائی اور تحفۃ الاخیار کو غیر معمولی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کتاب کے اب تک بیسیوں ایڈیشن نکل چکے ہیں، ذیل میں بعض کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) سب سے پہلا ایڈیشن سن تالیف ۱۲۴۹ھ۔ ۱۸۳۳ء کے تین سال بعد ۱۲۵۲ھ ۱۸۳۶ء میں مطبع محمدی لکھنؤ سے محمد حسین کے اہتمام میں چھپا جو نہایت دیدہ زیب تھا اور جس کی قیمت اس زمانہ میں ۱۵ روپے تھی۔

(۲) ۱۲۳۶ھ ۱۸۴۶ء میں عبدالملک بن محمد صادق نے مطبع محمدی بمبئی سے اسے شائع کیا، انہوں نے بمبئی سے اس کو تین مرتبہ طبع کرایا جس کی صراحت خود انہوں نے تحفۃ الاخیار کے بمبئی ایڈیشن میں کی ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مطبع محمدی لکھنؤ کا نسخہ بھی ختم ہوا تو نواب ذوالفقار علی مرحوم نے جو مولانا خرم علی کے قدرشناسوں میں تھے اس کو چھپوا کر مفت تقسیم کرایا۔

(۳) ۱۲۶۷ھ۔ ۱۸۵۰ء میں محمد مصطفیٰ خاں (م ۱۲۶۹ھ۔ ۱۸۵۲ء) نے اپنے مطبع مصطفائی کانپور سے اسے چھاپا۔ اس کی قیمت سات روپے تھی۔

(۴) ۱۲۶۹ھ۔ ۱۸۵۲ء میں مطبع مصطفائی کانپور سے دوبارہ دو جلدوں میں طبع ہوا۔

(۵) ۱۲۷۳ھ۔ ۱۸۵۶ء میں مشکوٰۃ المصابیح کے ترجمہ کے حاشیہ پر مطبع محمدی مدراس سے شائع ہوئی۔

(۶) ۱۲۷۷ھ۔ ۱۸۶۰ء میں ایک ایڈیشن مطبع مخدومی بمبئی سے شائع ہوا۔

(۷) ۱۲۸۲ھ۔ ۱۸۶۶ء میں محمد عبدالرحمٰن خان نے اپنے مطبع نظامی کانپور سے یہ ترجمہ مع فہرست فوائد شائع کیا۔

(۸) ۱۲۸۶ھ۔ ۱۸۶۹ء میں انہوں نے پھر اسے شائع کیا۔

(۹) ۱۲۹۰ھ۔ ۱۸۷۳ء میں مطبع حیدری سے طبع ہوا۔

(۱۰) ۱۲۹۱ھ۔ ۱۸۷۴ء میں مطبع نظامی کانپور سے تیسری دفعہ شائع ہوا، ابتداء میں فہرست تبصرۃ الابصار بھی منسلک تھی۔

(۱۱) ۱۲۹۱ھ۔ ۱۸۷۴ء میں یہ کتاب مطبع نولکشور کانپور سے چھپی۔

(۱۲) ۱۳۰۳ھ۔ ۱۸۸۵ء میں محمد تیغ بہادر کے زیر اہتمام مطبع انوار محمد لکھنؤ میں شائع ہوئی۔

(۱۳) ۱۳۰۷ھ۔ ۱۸۸۹ء میں مطبع نولکشور سے دوبارہ چھپی۔

(۱۴) ۱۳۲۱ھ۔ ۱۹۰۳ء میں فخر المطابع لکھنؤ نے شائع کیا۔

(۱۵) ۱۳۳۸ھ۔ ۱۹۱۹ء میں مطبع نولکشور سے شائع ہوئی۔

(۱۶) حال میں نور محمد المطابع کارخانہ تجارت کتب کراچی نے اسے شائع کیا ہے۔ [1]

مولانا حکیم سید عبدالحئی نے مشارق الانوار کی مندرجہ ذیل ہندوستانی شرحوں کا ذکر کیا ہے۔ ۲۸ و ۲۹۔ شرح محمد بن یوسف حسینی دہلوی یہ صوفیانہ طرز کی ایک شرح ہے جو عربی میں لکھی تھی، انہوں نے فارسی میں بھی ایک شرح لکھی تھی۔

(۳۰) منور بن عبدالمجید لاہوری نے بھی ایک شرح لکھی تھی۔

(۳۱) ایک فارسی شرح محی الدین احمد بن محمد حسینی کروی نے تحریر کی تھی۔ (الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند ص ۱۵۵)

---

[1] (ان ایڈیشنوں کا مولانا عبدالحلیم چشتی نے اپنے مضمون مولانا خرم علی شائع شدہ جون ۵۷ء میں کیا ہے، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو صفحات ۴۴۵۰ تا ۴۵۳)

Marfat.com

شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ

(متوفی ۹۷۵ھ تا ۱۵۶۷ء)

نام ونسب:

علی نام اور علاؤالدین لقب تھا۔ نسب نامہ یہ ہے: علی بن حسام الدین بن عبدالملک ابن قاضی خاں۔
(اخبار الاخیار ص ۲۴۱ و النور السافر ص ۳۱۵)

عبداللہ محمد بن عمر آصفی نے علاؤالدین کے بجائے نورالدین لقب تحریر کیا ہے۔ (ظفر الوالہ ج ا ص ۳۱۵)

ولادت ووطن:

ان کے آباؤ اجداد کا وطن شیراز ہند جون پور تھا۔ اسی لئے ارباب تذکرہ انہیں جون پوری الاصل (مآثر الکرام ج ا ص ۱۹۲) لکھتے ہیں مگر ان کا خاندان ان کی ولادت سے قبل برہان پور منتقل ہو گیا تھا۔ یہیں ۸۸۸ھ میں ان کی ولادت ہوئی بعض مؤرخین نے سن پیدائش ۸۸۵ھ لکھا ہے۔ (النور السافر ص ۳۱۷) آخر میں وہ مکہ معظمہ چلے آئے اور بیت اللہ کے جوار میں قیام پذیر ہوئے۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۱)

اساتذہ:

شیخ کی ابتدائی تعلیم کا حال معلوم نہیں ہو سکا اور اس کا بھی پتہ نہیں چل چکا کہ برہان پور کے کن لوگوں کے سامنے انہوں نے زانوئے تلمذ طے کیا۔ مؤرخین نے جن استادوں کے نام لکھے ہیں وہ یہ ہیں:

شیخ حسام الدین متقی ملتانی: یہ شیخ علی متقی کے مرشد بھی تھے جو بڑے عابد وزاہد اور ممتاز عالم تھے۔ شیخ ان کی خدمت میں دو برس رہے اور ان سے ظاہری وباطنی علوم کی تحصیل کی، تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ شیخ حسان الدین سے انھوں نے تفسیر بیضاوی اور کتاب عین العلم[1] کا درس لیا۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۱)

شیخ ابوالحسن بکری شافعی: اپنے زمانہ کے مسلمہ ولی وعارف باللہ تھے، شیخ علی متقی نے مکہ معظمہ میں ان سے استفادہ کیا اور حدیث کا درس لیا۔ ان سے انہیں خلافت بھی ملی تھی۔ (ایضا)

شیخ شہاب الدین احمد بن حجر ہیثمی کی: یہ اپنے دور میں مکہ کے مفتی، بلند پایہ فقیہ اور مشہور عالم تھے، ابتداء میں شیخ علی نے ان سے کسب فیض کیا مگر آخر میں یہ خود شیخ علی کے حلقہ تلمذ میں داخل ہو گئے تھے، اہل تذکرہ لکھتے ہیں۔

---

[1] عین العلم وزین الحلم تصوف کی مشہور کتاب ہے۔ یہ دراصل امام غزالی کی مشہور کتاب احیاء علوم الدین کا مختصر ہے۔ مصنف محمد بن عثمان بن عمر بلخی تھے۔ بعض لوگوں نے مصنف کو ہندی الاصل بتایا ہے۔ ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ۔ ۱۶۰۵ء) نے اس کی شرح لکھی تھی، جو اصل کے ساتھ قسطنطنیہ سے چھپ گئی ہے۔

Marfat.com

''مولانا علی متقی نے ابتداء میں شیخ ابن حجر صاحب صواعق محرقہ سے درس لیا مگر آخر میں خود شیخ ابن حجر نے ان سے استفادہ کیا اور ان کے حلقہ تلمذ میں داخل ہو گئے۔ (ایضاً ص ۲۴۲) ابن حجر کو ان سے ارادت و بیعت کا تعلق بھی ہو گیا تھا۔ آزاد بلگرامی کا بیان ہے:

شیخ ابن حجر مکی مفتی حرم محترم صاحب صواعق محرقہ در ابتداحال استاد شیخ بود آخر خود را تلمیذ می خواند و رسم ارادت بجا آورد و خرقہ خلافت پوشید۔

شیخ ابن حجر مکی مفتی حرم و صاحب صواعق محرقہ ابتداء میں شیخ کے استاد تھے مگر آخر میں وہ اپنے کو ان کا شاگرد کہنے لگے تھے نیز ارادت کی رسم بھی بجا لائے اور شیخ سے خرقہ خلافت بھی پہنا۔ (مآثر الکرام ج ا ص ۱۹۳)

شیخ عبدالحق دہلوی فرماتے ہیں:

وبارہا خود را نسبت بخدمت شیخ تلمیذ حقیقی می خواند و در آخر مرید شد و خرقہ خلافت پوشید۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۲)

شیخ ابن حجر مکی نے بارہا اپنے کو شیخ علی متقی کا شاگرد کہا ہے اور آخر میں وہ ان کے مرید بھی ہو گئے تھے اور ان سے خرقہ خلافت بھی پہنا تھا۔

ان لوگوں کے علاوہ مکہ میں اس وقت جو اصحاب علم و کمال تھے ان سے بھی استفادہ کیا شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں:

''و دیگر علماء و مشائخ عصر را کہ دراں دیار شریف بودند دریافت استفادہ نمود۔ (ایضاً ص ۲۴۱)

ان کے علاوہ اس متبرک علاقہ میں جو علماء مشائخ تھے ان کا پتہ لگا کر ان سے استفادہ کیا۔

تلامذہ:

شیخ علی متقی کے شاگردوں اور مریدوں کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا، تذکرہ نگاروں نے صرف چند لوگوں کے نام لکھے ہیں جو یہ ہیں:

شیخ شہاب الدین احمد ابن حجر مکی ان کا نام استادوں کی فہرست میں گزر چکا ہے، **شیخ عبدالوہاب متقی**: یہ شیخ علی متقی کے خاص مسترشد و خلیفہ تھے جنہوں نے علم ظاہر و علم باطن دونوں کی ان سے تحصیل کی تھی، شاہ عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:

شیخ علی متقی کے خیر و برکت کی سب سے بڑی نشانی اور ان کے کمالات کی زبردست دلیل ان کے سچے خلیفہ اور حقیقی دوست شیخ کامل اور عارف باللہ عبدالوہاب بن ولی اللہ حنفی، متقی، قادری ہیں، اللہ انہیں سلامت رکھے، یہ دائرہ استقامت کے مرکز اور آسمان ولایت کے قطب ہیں، اس زمانہ میں یمن سے شام تک کے فقراء مشائخ کا اتفاق ہے کہ وہ ولایت کبریٰ کے درجہ پر فائز ہیں۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۳)

شاہ عبدالحق صاحب کو ان کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا تھا، اور انہوں نے ان کے حوالہ سے اخبار الاخیار میں شیخ کے بہت سے واقعات لکھے ہیں۔

محمد بن طاہر پٹنی: یہ مشہور محدث اور بحار الانوار جیسی عظیم الشان کتاب کے مصنف تھے۔ ان کا مستقل تذکرہ اس کتاب میں آگے آئے گا۔ شاہ عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:

''علم کی تحصیل کے لئے مکہ معظمہ گئے تو شیخ علی متقی کی صحبت میں رہے ان کے مرید ہوئے اور ان سے خیر و برکت لے کر

Marfat.com

وطن واپس آئے۔ (ایضاً ص ۲۶۴ تذکرہ میاں محمد طاہر)

شیخ چیلہ آصفی: نے تاریخ گجرات میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ شیخ علی متقی کے خاص شاگرد اور معتمد علیہ مرید تھے۔ عبدالصمد آصفی نے ان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ (ظفر الوالہ ج ۱ ص ۳۱۶) اور بتایا ہے کہ شیخ نے گجرات میں انہیں اپنا قائم مقام مقرر کیا تھا۔ (ظفر الوالہ جلد ۱ ص ۳۱۶)

رحلت وسفر

شیخ اپنے وطن برہان پور سے علوم وفنون کی تحصیل اور تصوف وسلوک میں حصول کمال کے لئے پہلے ملتان گئے پھر حرمین شریفین تشریف لے گئے اور مکہ معظمہ میں مستقل بود و باش اختیار کر لی۔ اس کے بعد وہ کئی بار ہندوستان میں گجرات کے علاقہ میں تشریف لائے اور لوگوں کو فیضیاب کیا۔

بعض تذکرہ نگاروں نے تصریح کی ہے کہ وہ ۹۵۳ھ میں حرمین کے لئے روانہ ہوئے تھے، آزاد بلگرامی کا بیان ہے:

آنجناب در ۹۵۳ھ شریفین خرامید و در مکہ معظمہ رحل اقامت افگند (مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۹۳)

شیخ علی متقی ۹۵۳ھ میں حرمین تشریف لے گئے اور مکہ معظمہ میں مستقل قیام پذیر ہو گئے۔

مگر یہ درست نہیں ہے اس لئے کہ شیخ عبدالوہاب شعرانی صاحب طبقات نے ۹۴۷ھ میں مکہ معظمہ میں ان سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

نزیل مکۃ اجتمعت بہ فیہا سنۃ سبع واربعین وتسعمائۃ۔ (الطبقات الکبریٰ ج ۲ ص ۱۶۷)

شیخ علی متقی مکہ میں بود و باش اختیار کیے ہوئے تھے، میں نے وہاں ان سے ۹۴۷ھ میں ملاقات کی تھی۔

یہ تو مسلم ہے کہ وہ مکہ معظمہ سے کئی بار گجرات تشریف لائے، شاہ عبدالحق صاحب دہلوی مکہ معظمہ میں ان کے قیام اور مشاغل کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

بعد ازاں بدیار گجرات قدوم آوردند۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۴)

اسکے بعد علاقہ گجرات میں تشریف لائے۔

پہلی دفعہ وہ سلطان بہادر کے زمانہ میں گجرات وارد ہوئے تھے، شاہ صاحب کا بیان ہے:

وسلطنت ایں دیار دراں زمان بدست تصرف سلطان بہادر بود (ایضاً)

اس زمانہ میں یہ علاقہ سلطان بہادر کے زیر تصرف تھا۔

اس کے بعد بہادر شاہ کا بھتیجا محمود شاہ دوم تخت نشین ہوا جس کے عہد میں شیخ علی متقی دوبار ہندوستان تشریف لائے۔ (ظفر الوالہ ج ۱ ص ۳۱۶) سلطان بہادر جس کے زمانہ میں پہلی دفعہ گجرات آئے ۹۴۳ھ میں شہید کر دیا گیا تھا۔ (ایضاً ص ۲۲۰) اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۹۴۳ھ سے بھی پہلے مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے، ممکن ہے آزاد بلگرامی کے بیان میں کچھ تصحیف ہو گئی ہو۔

شاہ عبدالحق صاحب نے ان کے ملتان کے قیام کے زمانہ کا ایک معمول یہ بیان کیا ہے، کہ وہ ان کے گردونواح کے بعض ایسے شہروں میں چلے جاتے تھے جو نیک لوگوں کا مسکن ہوتا اور جو جگہ مناسب اور بہتر ہوتی اور جہاں آسانی سے عبادت کر سکتے تھے

Marfat.com

چند روز قیام فرماتے، سفر میں دو تھیلے ان کے ساتھ ہوتے تھے ایک میں عام ضرورت کی چیزیں اور کھانے پینے کا سامان چاول دال، تیل، گھی اور نمک نیز کھانا پکانے کے برتن ہوتے، لکڑیاں خود جنگل سے جا کر لاتے اور دو دن کا سامان تین دن تک اور تین دن کا چار دن تک استعمال کرتے، کبھی مسجد میں نہ ٹھہرتے بلکہ کرایہ کے مکان میں رہتے چقماق جلا کر آگ سلگاتے اور ایک لوٹا بھی ساتھ ہوتا جس میں ایک مشک پانی آتا تھا اس سے کھانا پکاتے، وضو اور ضرورت کے وقت غسل فرماتے۔

معمول تھا کہ پاک پانی سے پہلے برتن دھوتے پھر خود ہی کھانا پکاتے اور کسی سے کوئی خدمت نہ لیتے اگر کسی سے کام لینے کی ضرورت پڑ ہی جاتی تو پہلے اسے اجرت دیدیتے تب کام کراتے۔

دوسرے تھیلے میں قرآن مجید اور بعض ضروری کتابیں رہتی تھیں، غرض اس خوبی اور صفائی سے سفر کرتے تھے، اگر کوئی شخص صحبت میں رہنا چاہتا یا خدمت کرنا چاہتا تو اس سے معذرت کر دیتے۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۳ و ۲۴۴)

مجلس درس وافادہ:

شیخ علی متقی دینی علوم کے فاضل و ماہر بھی تھے اور سلوک و تصوف میں بھی ان کا پایہ بلند تھا، ان کا بیشتر وقت علم کی اشاعت اور افادہ و فیضان میں بسر ہوتا تھا۔ ان کے خاص شاگرد و مسترشد شیخ عبدالوہاب متقی فرماتے ہیں۔

غالب اوقات ایشاں بنشر و افادہ علم۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۵)

ان کا زیادہ وقت علم کی اشاعت اور دوسروں کو علمی فائدہ پہنچانے میں صرف ہوتا۔

آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ "شیخ علی متقی کی علوم ظاہر و باطن کی نشر و اشاعت کا غلغلہ ملاء اعلیٰ تک پہنچا ہوا تھا۔

(مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۹۳)

مکہ میں ان کی مجلس درس ظاہری و باطنی علوم کا سرچشمہ تھی شاہ عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

و بآثار افاضت علوم دینی و افاضت معارف یقینی مستنیر و مستفید ساخت۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۲)

انہوں نے دینی علوم اور یقین و معرفت سے (ایک عالم کو) منور اور فیضیاب کیا۔

طالبین کا جم غفیر ان کے بحر علم و معرفت سے سیراب ہونے کے لئے ہر وقت ان کی خدمت میں موجود رہتا تھا۔ شیخ عبدالوہاب شعرانی مکہ میں ان کی قیام گاہ پر طلبہ کی کثرت اور سالکین کے ہجوم کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ مجھے اپنے گھر لے گئے تو میں نے درویشوں اور طالبین کی ایک جماعت دیکھی جوان کے گھر کے اردگرد کے صحن کے کناروں پر بنے ہوئے جھونپڑوں میں رہتی تھی، ہر درویش کے لیے ایک ایک جھونپڑا تعمیر کیا گیا تھا۔ جس میں وہ یادِ الٰہی میں مشغول رہتا تھا کچھ لوگ تلاوت کرتے نظر آئے، بعض ذکر و فکر میں لگے ہوئے تھے چند لوگ مراقبے میں تھے اور بعض حضرات علمی مطالعہ میں منہمک تھے، میں نے مکہ میں اس سے اچھا اور بہتر منظر نہیں دیکھا۔" (الطبقات الکبریٰ ج ۲ ص ۱۶۷)

آصفی تاریخ گجرات میں لکھتا ہے:

"گجراتی بادشاہ محمود شاہ ثانی نے مکہ میں اپنی رباط کے قریب شیخ علی متقی کی رہائش کے لئے ایک گھر تعمیر کرایا تھا جس کے سامنے ایک وسیع، کشادہ، اور بڑا صحن تھا، اس کے کنارے پر چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے، جن میں ان کے مریدین اور

Marfat.com

سندھ سے سلوک وطریقت کی تعلیم وتربیت کے لئے آنے والے قیام کرتے تھے۔'' (ظفر الوالہ ص ۳۱۶)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا حلقہ درس اور دائرہ فیض کتنا وسیع تھا اور ان کا گھر دینی علوم کی تحصیل کرنے والوں اور سلوک وتصوف کے طالبین کا مرکز بنا ہوا تھا۔

ان کے درس کا انداز بہت باوقار تھا، وہ متانت اور سنجیدگی سے مجلس درس میں رونق افروز ہوتے تھے، ان کے شاگرد شیخ عبدالوہاب متقی کا بیان ہے کہ:

''اگر مجلس درس میں حاضرین میں باہم کوئی بحث چھڑ جاتی تب بھی وہ خاموش رہتے اور بلاضرورت ایک فقرہ بھی زبان سے نہیں کہتے تھے، ہاں جب ضرورت محسوس کرتے تو بقدرِ ضرورت کچھ ارشاد فرمادیتے۔'' (اخبار الاخیار ص ۲۴۵)

درس میں کتب حقائق واسرار اور توحید وغیرہ کے مشکل مسائل کی توضیح وتفہیم میں وہی طریقہ وانداز اختیار کرتے جو بزرگوں کا تھا۔ (ایضا)

علم حدیث سے شغف:

شیخ علی متقی بلند پایہ محدث تھے، اور اس حیثیت سے ان کو بڑی شہرت نصیب ہوئی، تذکرہ نگاروں نے انہیں المحدث لکھا ہے، انہوں نے اپنے زمانہ کے کبار محدثین سے اس فن کی تحصیل کی تھی اور خود ان کے درس حدیث سے بیشمار لوگوں کو فیض پہنچا، حدیث سے ان کا اشتغال مدۃ العمر قائم رہا، بڑھاپے میں آدمی کے قویٰ مضمحل ہوجاتے ہیں اور وہ نقل وحرکت سے بھی معذور ہوجاتا ہے۔ مگر وہ اس عمر میں بھی کتب حدیث کی مراجعت، مقابلہ تصحیح، مطالعہ اور تصنیف وتالیف میں شب وروز منہمک رہتے تھے۔ اس لئے فن حدیث پر ان کی نظر نہایت وسیع اور گہری تھی اور اس فن کے نکتوں اور باریکیوں سے انہیں مکمل واقفیت تھی، شاہ عبدالحق صاحب دہلوی نے احادیث سے ان کے اشتغال اور اس میں مہارت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ سنن واحادیث نبویؐ کے تتبع میں آخر عمر تک مشغول رہے، ایام پیری میں جب کہ بتقاضائے عمر جنبش کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا وہ شب وروز کتب احادیث کی تالیف، تصحیح اور مقابلہ کے کام میں منہمک رہتے تھے، لوگ بیان کرتے ہیں کہ دقائق کے فہم ومعرفت اور معانی ونکات کے استنباط واستخراج میں ایسے بلند درجہ پر فائز تھے کہ ماہرین اور علمائے فن بھی حیرت و تحسین ظاہر کیے بغیر نہیں رہتے تھے۔ شیخ ابن حجر مکی کو جو اپنے زمانہ میں مکہ کے بڑے فقہاء وعلماء میں شمار کیے جاتے تھے، اور ابتداء میں شیخ علی متقی کے استاد بھی تھے اگر کسی حدیث کے مفہوم میں تردد وتامل ہوتا تو شیخ کے یہاں کہلا بھیجتے کہ جمع الجوامع کی تبویب میں اس حدیث کو کس باب میں رکھا ہے، تاکہ اس نشاندہی کے بعد قرینہ وقیاس سے انہیں حدیث کا مطلب اخذ کرنے میں آسانی ہو۔'' (اخبار الاخیار ص ۲۴۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث نبویؐ کی خدمت کے لئے ان کی زندگی وقف تھی اس کے درس ومطالعہ کتب حدیث کی تصحیح ومقابلہ نادر ونایاب کتابوں کی تلاش وجستجو اور ان کی اشاعت کے لئے سعی وکوشش کے علاوہ وہ اس فن میں تصنیف وتالیف کا کام بھی برابر سرانجام دیتے تھے، علم الحدیث میں ان کی تصنیفات کا ذکر آگے آرہا ہے۔

Marfat.com

علم وفضل:

وہ نہایت فاضل اور یکتائے روزگار تھے۔ اصول وفروع اور معقولات ومنقولات میں دسترس رکھتے تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے، علامہ آزاد بلگرامی فرماتے ہیں:

''مکہ معظمہ کے عوام وخواص ان کے غیر معمولی فضل وکمال کے معترف تھے۔'' (مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۹۳)

شاہ عبدالحق صاحب رقمطراز ہیں:

''ان کے دور کے تمام اکابر ومشائخ کو ان کے کمال فضل کا اعتراف تھا۔'' (اخبار الاخیار ص ۲۴۲)

محی الدین عیدروسی لکھتے ہیں:

''علماء میں جوان سے ملتا اور جس سے یہ خود ملتے وہ ان کی مدح وتوصیف میں رطب اللسان رہتا تھا۔'' (النور السافر ص ۳۱۷)

حقیقت یہ ہے کہ شیخ علی متقی اپنی علمی عظمت وفضل وکمال اور جامعیت کی بناء پر ''سرمایہ نازش ہندوستان تھے۔

(ایضاً ص ۳۱۹)

علماء وزہاد سے تعلق اور اہلِ علم، مشائخ وطلبہ کی امداد وتکریم:

وہ علماء اور دینداروں سے بڑا تعلق رکھتے تھے، ان کی ملاقات کے لئے خود بھی تشریف لے جاتے اور انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دیتے، شیخ عبدالوہاب شعرانی مشہور صوفی اور صاحب علم تھے، ان کا بیان ہے کہ مکہ معظمہ میں جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو ہم دونوں کی ایک دوسرے کے یہاں آمد ورفت رہتی تھی۔

ترددت الیہ وتردد الی۔ (الطبقات الکبریٰ جلد دوم)

میں ان کے گھر جاتا اور وہ میری قیام گاہ پر تشریف لاتے۔

ان کے مسترشد خاص عبدالوہاب متقی کا بیان ہے۔

''ایک دفعہ مکہ معظمہ میں شیخ کی زندگی میں بلادِ مغرب کے دو اشخاص وارد ہوئے، یہ دونوں باپ بیٹے تھے اور بڑے عبادت گزار اور زاہد مرتاض تھے، شیخ نے جب ان کی تعریف سنی تو ان سے ملنے کا قصد وارادہ کیا مگر اس زمانہ میں ان پر ایسا ضعف طاری تھا کہ پیدل چلنے کی قوت نہ تھی، اس لئے فرمایا کہ اگر ہمارا کوئی دوست ہم کو اپنے کندھوں پر بیٹھا کر لے جائے تو ہم وہاں جاسکتے ہیں یہ سن کر ایک مضبوط اور توانا آدمی اس کے لئے تیار ہوگیا، چنانچہ اسی کے دوش پر سوار ہو کر ان دونوں حضرات کے پاس گئے اور مجھے بھی حکم دیا کہ ان کی کتاب حکم کبیر کا نسخہ لے کر ساتھ چلوں۔'' (اخبار الاخیار ص ۲۴۶)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصحاب علم وزہد سے ملنے کے لئے کس قدر بے چین اور مشتاق رہتے تھے، انہیں علماء اور طلبہ کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی کا بھی خیال رہتا تھا اور ان کی ہر قسم کی امداد واعانت بھی کرتے رہتے تھے، شاہ عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

''علم کی نشر واشاعت اور اہل علم کی امداد واعانت کے لئے ان کی زندگی وقف تھی، وہ طلبہ کے لئے کتابیں مہیا کرتے اور

Marfat.com

ان کی نقل و کتابت کا بندوبست کرتے، اپنے ہاتھ سے روشنائی بناتے اور انہیں دیتے، ملکِ عرب میں جو مفید، نادر اور کمیاب کتاب دستیاب ہو جاتی، اس کی نقلیں کرا کے جسے مناسب خیال کرتے مرحمت فرماتے اور جن شہروں میں وہ کتاب موجود نہ ہوتی وہاں بھی اسے بھجواتے۔'' (اخبار الاخیار ص ۲۴۵)

بیعت وارادت:

وہ ابھی سات آٹھ برس ہی کے تھے کہ ان کے والد بزرگوار انہیں شاہ باجن چشتی کی خدمت میں لے گئے جو برہان پور ہی میں مقیم تھے، اور شیخ علی متقی کو ان کا مرید کرا دیا تھوڑے عرصہ بعد والد کا انتقال ہو گیا، اس وقت عمر کے تقاضے کی بناء پر طبیعت دنیوی لذتوں کی جانب کسی قدر مائل ہوئی مگر توفیق الٰہی نے یاوری کی اور دنیا کی حقارت اور ناپائیداری کا نقش دل میں ایسا جاگزیں ہوا کہ شیخ عبدالحکیم بن شاہ باجن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے مشائخ چشت کا خرقہ پہنا، اس کے بعد ملتان گئے، اور شیخ حسام الدین ملتانی متقی کی صحبت اختیار کی اور ان کی برکت سے ورع وتقویٰ، سلوک ومعرفت اور طریقت کے درجات ومراتب طے کیے، دو برس بعد یہاں سے تقویٰ کا زادِ راہ لے کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور شیخ ابوالحسن بکری کی خدمت میں حاضر ہوئے جن کی ولایت اور بزرگی پر اس زمانہ کے لوگ متفق تھے، ان سے اور ایک اور بزرگ شیخ محمد بن محمد سخاوی سے سلسلہ عالیہ قادریہ وشاذلیہ میں بیعت ہوئے۔'' (ایضاً ص ۲۴۱)

شیخ علی نے خود اپنی بیعت وارادت کا حال اس طرح لکھا ہے:

''میرے والد نے مجھے بچپن ہی میں شیخ باجن رحمہ اللہ کا مرید کرا دیا تھا جن کا طریقہ سماع وصفا اور اہل ذوق ووجد کا تھا، مشائخ کے نزدیک اگر کوئی شخص بچپن میں کسی کا مرید ہو جائے تو سن تمیز ورشد کو پہنچنے کے بعد اسے اختیار ہے کہ چاہے تو اسی شیخ سے وابستہ رہے اور چاہے تو کسی اور شیخ کا انتخاب کر لے، میں نے اپنے والد کی موافقت کی مگر جب ان کا اور میرے شیخ کا انتقال ہو گیا تو میں نے ان کے صاحبزادے شیخ عبدالحکیم سے مشائخ چشت کا خرقہ پہنا، اس کے بعد مجھے ایسے مرشد اور شیخ کی تلاش ہوئی جو راہِ حق وحقیقت کے اہم معاملات میں میری راہنمائی کرے، اس غرض سے میں نے ملتان کا سفر کیا اور شیخ عارف حسام الدین متقی کی خدمت وصحبت میں ایک مدت تک رہا ان کا طریقہ اربابِ تقویٰ کا تھا، اس کے بعد میں حرمین شریفین کے سفر پر روانہ ہوا اور عارف باللہ شیخ ابوالحسن بکری کی خدمت میں پہنچا جن سے سلاسل قادریہ، شاذلیہ اور مدنیہ کے خرقے پہنے، میں نے ان تینوں سلسلوں کے خرقے شیخ محمد بن محمد سے بھی پہنے۔'' (اخبار الاخیار ص ۲۴۲ و ۲۴۳ والنور السافر ص ۳۱۸ و ۳۱۹)

غرض شیخ علی متقی کو تصوف کے مختلف سلسلوں میں بیعت واجازت حاصل تھی پہلے تو وہ شیخ عبدالحکیم بن باجن سے چشتیہ سلسلہ میں بیعت ہوئے پھر قادریہ، شاذلیہ مدینیہ سلسلوں سے وابستہ ہوئے جن کے دو خرقے بزرگوں شیخ ابوالحسن بکری اور شیخ محمد بن محمد سخاوی سے پہنے۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۳)

تصوف کے سلاسل میں قادریہ اور چشتیہ بہت مشہور ہیں شاذلیہ سلسلہ کی نسبت قطب الوقت شیخ نور الدین ابوالحسن علی حسن شاذلی کی طرف ہے اور مدینیہ سلسلہ شیخ ابومدین شعیب مغربی پر منتہی ہوتا ہے۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۱) اسی بنا پر وہ شاذلی، مدنی، چشتی اور قادری کی نسبتوں سے مشہور ہیں، متقی کی نسبت ان کے ملتانی شیخ اور عارف باللہ حضرت حسام الدین متقی کی جانب

Marfat.com

ہوگی، وہ اپنے وصیت نامہ میں لکھتے ہیں۔

فلما وصلت الی الملتان صحبت الشیخ حسام الدین و کان طریقه طریق المتقین۔

(النور السافر ص ۳۱۵)

میں جب ملتان پہنچا تو شیخ حسام الدین کی صحبت اختیار کی ان کا طریقہ متقیوں کا تھا۔

صاحب ظفر الوالہ کہتے ہیں کہ وہ متقی کے لقب سے مشہور تھے اور ناموں کی طرح لقب بھی آسمان (خدا کی طرف) سے اترتا ہے۔

الالقاب تنزل من السماء۔ (ظفر الوالہ ص ۳۱۵)

تصوف و سلوک:

شیخ کا اصلی طغرائے امتیاز تصوف و سلوک میں امتیاز و کمال ہے، ان کی زیادہ شہرت اسی حیثیت سے ہے، تصنیف و تالیف وغیرہ میں تو علمائے ظاہر بھی ممتاز اور صاحب کمال ہوتے ہیں لیکن کشف و کرامات، باطنی کمالات، عبادت و ریاضت اور زہد و اتقا میں وہ اپنی مثال آپ تھے، تمام تذکرہ نگاروں نے ان کی اس خصوصیت کا ذکر کیا اور تصوف میں ان کے درجہ کمال کا اعتراف کیا ہے، عبدالوہاب شعرانی نے انھیں ''الشیخ الکامل'' لکھا ہے۔ (الطبقات الکبریٰ ج ۲ ص ۱۶۷)

صاحب النور السافر رقمطراز ہیں

العالم الصالح الولی الشھیر العارف باللہ تعالیٰ۔ (النور السافر ص ۳۱۵)

عالم صالح، مشہور ولی اور عارف باللہ تھے۔

صاحب ظفر الوالہ کا بیان ہے کہ:

و امامهم فی وقته العابد الذاهد المتصوف الافقه۔ (ظفر الوالہ ج ۱ ص ۳۱۵)

اپنے زمانہ کے امام، عابد و زاہد اور صوفی و فقیہ تھے۔

آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ:

''مکہ معظمہ کے عوام و خواص ان کی ولایت کے معترف تھے۔ (مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۹۳)

شاہ عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''جمیع مشائخ و اکابر آں وقت بکمال فضل و ولایت وے معترف و در رعایت تعظیم و تکریم وے متفق بودند و الآن نیز خواص و عوام آں دیار چنانچہ مشائخ سلف را یاد کنند او را نیز یادی کنند۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۲)

اس زمانہ کے تمام مشائخ اور اکابر علماء ان کے فضل و ولایت میں کمال کے معترف اور ان کی تعظیم و تکریم کی رعایت اور اعتراف میں متفق تھے اور اب بھی مکہ معظمہ وغیرہ کے عوام و خواص انہیں اسی طرح یاد کرتے ہیں جس طرح بزرگانِ سلف کو یاد کرتے ہیں۔

ان کی ولایت اور سلوک و معرفت میں عظمت کے ان کے اساتذہ، شیوخ، معاصرین اور مرشدین بھی پوری طرح معترف تھے۔ شیخ ابن حجر مکی ان کے استاد ہونے کے باوجود ان کی ولایت کے ایسے معترف ہوئے کہ انہی سے بیعت و خلافت حاصل کی جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

شیخ حسام الدین متقی مشہور شیخ طریقت بھی تھے اور صاحب علم و کمال بھی، جن کی خدمت میں شیخ علی متقی دو برس تک رہ کر

Marfat.com

ظاہری و باطنی علوم کی تحصیل کرتے رہے ان کی نسبت، شیخ عبدالوہاب متقی فرماتے ہیں۔

''ان کے یہاں قیام کے زمانہ میں شیخ علی متقی جب خلوت میں رہتے تو شیخ حسام الدین اپنے سر پر کتابیں اٹھائے ہوئے ان کے کمرے کے دروازے تک آتے اور اندر داخل ہونے کے لئے اس طرح اجازت طلب کرتے ''حسام الدین آیا ہے۔ کیا فرماتے ہیں؟'' دو ایک بار اسی طرح فرماتے اگر کمرے کا دروازہ کھلتا تو نشست فرماتے اور اس وقت تک تفسیر بیضاوی کا باہم مذاکرہ کرتے جب تک شیخ کے وقت میں گنجائش ہوتی، لیکن اگر دروازہ نہ کھلتا تو واپس تشریف لے جاتے۔''

(اخبار الاخیار ص ۲۴۳)

یہ بالکل ابتدائی دور کا واقعہ ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ زہد و اتقا ان کی سرشت میں داخل تھا اور رشد و ہدایت اور صلاح و تقویٰ سے انہیں فطری دلچسپی تھی، شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں ''ان کے مزاج میں ورع و تقویٰ کا غلبہ تھا اور صلاح ان کی فطرت میں داخل تھا'' (ایضاً ص ۲۴۱) اس لئے شروع ہی سے خیر و صلاح اور ورع و تقویٰ کے آثار ان میں نمایاں رہے ہوں گے اس کی بنا پر ان کے مرشد بھی ان کا اس قدر خیال کرتے تھے اور احترام سے پیش آتے تھے۔

''شیخ عبدالوہاب متقی شیخ حاجی نظر بدخشی کے بارہ میں فرماتے ہیں۔

''یہ مرد کامل علم و ریاضت کی تحصیل اور ماوراء النہر شام اور مصر کے مشائخ کی دریافت و ملاقات کے بعد اصلاح و تربیت نفس کی تکمیل کے لئے حرمین شریفین پہنچے میرے خیال میں یہ اکابر اولیاء اللہ میں تھے جو نہایت بلند درجات و مراتب پر فائز تھے اور ان سے آثار کمال بھی نمایاں تھے۔ ایسے بزرگ اور اس پایہ کے ولی اللہ بھی شیخ علی متقی سے محبت و عقیدت کا تعلق رکھتے تھے اور بڑی خصوصیت برتتے تھے۔'' (اخبار الاخیار ص ۲۴۷)

یہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ بلادِ مغرب سے آئے ہوئے دو اشخاص سے ملنے کے لئے وہ معذوری کی وجہ سے اپنے ایک عقیدت مند کے کندھے پر سوار ہو کر گئے تھے، جب ان لوگوں کو پتہ چلا کہ اس پایہ کے مشہور بزرگ تشریف لائے ہیں تو اس خیال سے کہ ان کی وجہ سے ہماری شہرت ہو جائے گی اور ملاقات کے لئے لوگوں کا تانتا بندھ جائے گا جس سے وقت برباد ہوگا اور عبادت و ریاضت میں خلل آئے گا اس لئے شروع میں یہ دونوں حضرات شیخ سے زیادہ انشراح و انبساط کے ساتھ نہیں ملے اور کسی قدر بے توجہی بھی اختیار کی شیخ نے محسوس کر لیا اور فرمایا میں نے ایک کتاب جمع کی ہے جو مشائخ کے اقوال کا مجموعہ ہے، پھر شیخ عبدالوہاب متقی کو اس کا کوئی حصہ پڑھنے کا حکم دیا، انہوں نے ابھی تھوڑا ہی سا پڑھا تھا کہ اس کی گرمی و تاثیر سے یہ دونوں حضرات بے اختیار ہو گئے اور فرحت و انبساط ظاہر کرنے لگے اس کے بعد وہ دونوں حضرت شیخ علی متقی کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ ان کی خدمت میں برابر استفادہ کے لئے حاضر ہوتے اور بالآخر ان کے مرید بھی ہو گئے۔ (ایضاً ص ۲۴۶)

قاضی عبداللہ سندھی اہل علم و تقویٰ اور اصحاب صلاح میں تھے، حوادثِ روزگار کی بنا پر وہ اپنے اہل و عیال اور متعلقین سمیت سندھ کی سکونت ترک کر کے مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے تھے، چندے گجرات میں بھی رہے اور شیخ سے بڑی محبت و مؤدت اور عقیدت مندی کا تعلق رکھتے تھے۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۴)

غرض ان کے شیوخ، اساتذہ اور معاصرین اور وہ تمام لوگ جن سے وہ ملے یا جو ان سے ملے سب ہی ان کے گرویدہ اور

Marfat.com

مداح تھے، محی الدین عیدروسی کا بیان ہے۔

''عارفین اور علمائے ربانی میں سے جو بھی ان سے ملایا جس سے وہ خود ملے، وہ سب ان کی بے حد تعریف کرتے تھے، جیسے ہمارے شیخ تاج العارفین ابوالحسن بکری، امام الحرمین شہاب بن حجر شافعی، فقیہ مصر شمس الدین رملی انصاری اور ہمارے شیخ اور فصیح العصر شمس بکری وغیرہ ان کے مداح تھے، اور ان لوگوں سے جو کچھ منقول ہے وہ شیخ علی متقی کی خدمت میں ان کی مدح اور غیر معمولی توصیف کی دلیل ہے۔'' (النور السافر ص ۳۱۷)

عیدروسی ان کے اوصاف ومحامد بیان کرنے کے بعد آخر میں یہ لکھتے ہیں:

وبالجملة فما كان هٰذا الرجل الا من حسنات الدهر وخاتمة اهل الورع ومفاخر الهند و شهرته تغني عن ترجمته و تعظيمه في القلوب يغني عن مدحه۔ (ایضاً ص ۳۱۹)

خلاصہ یہ ہے کہ یہ شخص زمانہ کی خوبیوں اور نیکیوں کا مجموعہ تھا اس کی ذات پر ورع وتقویٰ کا خاتمہ ہو گیا اور اسکی شخصیت ہندوستان کے لئے سرمایۂ فخر وناز تھی، اسکی شہرت تعارف سے مستغنی ہے اور لوگوں کے دلوں میں اسکی جو عظمت وبرتری پیوست ہے وہ اسکی مدح وتوصیف سے بالاتر ہے۔

وہ تصوف میں ممتاز ہونے کے باوجود اسکی بے اعتدالیوں سے پاک تھے، اسی لئے وحدۃ الوجود کے بارہ میں افراط و تفریط پر مبنی خیالات کی اصلاح کی اور شیخ غوث گوالیاری کے رسالہ معراجیہ کی مخالفت بھی کی۔ (رود کوثر ص ۳۵۳ و ۳۵۴)

اصلاح وتربیت کا طریقہ:

طالبین اور مریدین کی تربیت وارشاد اور ان کی اصلاح وتزکیہ کے طریقہ سے بھی شیخ کے تصوف میں کمال کا اندازہ ہوتا ہے، ان کے مرید خاص شیخ عبدالوہاب متقی فرماتے ہیں:

''بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ طالبین کے نقائص اور اندرونی خرابیوں کو دور کرنے کے بجائے انہیں ان کے حال پر چھوڑے ہوئے ہیں مگر باطنی طور پر وہ ان کی تربیت کے کام میں مشغول رہتے تھے اور پوری توجہ اور اہتمام سے اس طرح تربیت فرماتے تھے کہ انہیں اس کا کوئی پتہ بھی نہیں چلتا تھا، یہاں تک کہ ایک مدت کے بعد بالکل نمایاں اور بدیہی طور پر یہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ وہ اب ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں پہلے نہیں تھے، خود اس فقیر کے ساتھ بھی اس طرح کا معاملہ پیش آچکا ہے، جب وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو دو برس تک اسے سرے سے معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ وہ اس کی جانب متوجہ ہیں، اذکار واوراد اور مجاہدات وغیرہ کسی چیز کی تلقین نہیں فرمائی، البتہ جو وقت ان کی خدمت میں گزرتا اس میں زیادہ تر اپنی تصنیفات کی کتابت ونقل اور مقابلہ کا حکم دیتے، لطف یہ ہے کہ سالک ان کے کام میں لگا ہوتا اور وہ خود سالک کا کام کرتے رہتے تھے، اس طرح دو سال کے بعد ہمیں اس وقت اپنے اندر تبدیلی کا احساس ہوا، جب ہم ایسی جگہ پہنچ گئے تھے جہاں پہلے نہیں پہنچے تھے۔

درحقیقت مریدین وطالبین کی اصلاح وتربیت کے معاملہ میں صوفیا ومشائخ کے دو طریقے ہیں۔ بعض صوفیہ کرام سالکین کو ان کے پرانے طور وطریق سے ہٹا کر انہیں دوسرے کاموں کی تعلیم وتلقین کرتے ہیں، لیکن یہ طریقہ مشکل ہے، سلوک و

Marfat.com

تصوف کے ابتدائی مراحل میں خاص طور پر اس سے دشواری پیش آتی ہے، اس لئے دوسرے صوفیہ کا اصول یہ ہے کہ وہ مریدین کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں اور خود ان کے کام، ان کی اصلاح وتزکیہ اور ان کے عادات واطوار کو تبدیل کرنے میں لگ جاتے ہیں، یہاں تک کہ سالک کے کام میں ایسی جلا اور صفائی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ مقصود ومطلوب تک پہنچ جاتا ہے، یہ طریقہ سہل اور آسان ہے۔" (اخبار الاخیار ص ۲۴۴ و ۲۴۵)

ورع وتقویٰ اور کثرتِ عبادت وریاضت:

تصوف وسلوک میں ان کی عظمت اور بلند پایگی اس سے بھی ظاہر ہے کہ وہ بڑے زاہد، متورع، متقی اور عبادت گزار شخص تھے، عبادت وریاضت اور مجاہدہ سے انہیں خاص شغف تھا، ورع وتقویٰ طہارت وعفت ان کے مزاج میں داخل تھی، عبدالوہاب شعرانی نے انہیں صاحب ورع اور زاہد لکھا ہے۔ (الطبقات الکبریٰ ج ۲ ص ۱۶۷) محی الدین عیدروسی کا بیان ہے کہ وہ عالم باعمل، اللہ کے مقبول اور صالح بندے اور ورع وتقویٰ میں نہایت عظیم المرتبت تھے، غیر معمولی عبادت وریاضت ان کا شعار تھی، اور وہ برائیوں سے کنارہ کش رہتے تھے، علامہ فاکہی نے القول النقی فی مناقب المتقی کے نام سے ایک مستقل رسالہ میں ان کی سیرت حمیدہ اور ریاضت عظیمہ کا ذکر کیا ہے اور ان کے ایسے مجاہدات شاقہ بیان کیے ہیں جو عقل کو مبہوت اور حیران کر دیتے ہیں، اس میں انہوں نے یہ کیسی عمدہ بات لکھی ہے کہ "ہمارے شیخ کا نام علی اور لقب متقی واقعی اسم بامسمّٰی اور ان کے عظیم درجہ ومرتبہ کا آئینہ دار ہے۔" (النور السافر ص ۳۱۵ و ۳۱۷)

شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں:

"تصنیف وتالیف اور علوم وفنون کی نشر واشاعت میں تو وہ علمائے ظاہر بھی جن کو خدا توفیق وبرکت عطا کرتا ہے ممتاز ہوتے ہیں لیکن اس سے قطع نظر ریاضات مجاہدات، کرامات، محاسن اخلاق، محامد اوصاف، رزانت افعال، متانت احوال ظاہر وباطن کے آداب کی رعایت اور ورع وتقویٰ کے سلسلہ میں ان کے بارہ میں جو کچھ نقل وبیان کیا جاتا ہے وہی دراصل ان کے باطنی کمالات اور حقیقی احوال کی اصل دلیل ہے۔" (اخبار الاخیار ص ۲۴۲)

آزاد بلگرامی نے بھی ان کی کثرت ریاضت وتقویٰ کا ذکر کیا ہے۔ (مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۹۳)

وہ عبادت وریاضت کی کثرت کی وجہ سے بڑھاپے میں بہت کمزور ہو گئے تھے اس کی وجہ سے خواہش وحوصلہ کے مطابق اور پہلے کی طرح عبادت نہیں کر سکتے تھے جس کا انہیں بڑا قلق رہتا تھا، تاہم شاہ عبدالحق صاحب نے ان کے شاگرد شیخ عبدالوہاب متقی سے اس زمانہ کی ریاضت وعبادت کا حال اور نفل نماز کی تعداد دریافت کی تو انہوں نے بتایا کہ:

"جوانی میں بکثرت نفل نماز پڑھتے تھے لیکن آخر عمر میں زیادہ تر ذکر خفی، تفکر اور دینی علوم پر کتابوں کی تصنیف وتالیف سے سروکار رکھتے تھے، علاوہ ازیں ضعف اور ادرار بول کا عارضہ بھی لاحق تھا جس کی وجہ سے پیشاب کے لیے رات میں دس یا بارہ مرتبہ اٹھنا پڑتا تھا اور جب پیشاب کے لیے اٹھتے تو وضو کر کے ہر ہر دفعہ دو یا چار یا حسب توفیق اس سے زیادہ رکعتیں نماز ادا کرتے تھے۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۵)

Marfat.com

دُنیا سے نفرت اور بے رغبتی:

شیخ علی متقی کی نگاہ میں دنیا کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی، انہوں نے اس کی طلب اور مال و زر کی تحصیل کو کبھی مقصود نہیں بنایا، ابتداء میں کسب معاش کی کچھ فکر دامنگیر رہی اور عمر کے اقتضاء سے دنیاوی لذتوں سے بھی کسی قدر رغبت ہوئی۔ نو جوانی میں مانڈو میں ایک بادشاہ کے یہاں ملازمت کر کے بھی کچھ کمایا مگر بہت جلد خدا کی محبت کی کشش اور اس کی توجہ و عنایت سے دنیا کی نفرت و حقارت اور اس کی بے اعتباری اور ناپائیداری نظر میں رچ بس گئی (ایضاً ص ۲۴۱) چنانچہ دنیا کے مال و متاع سے بے رغبتی کا یہ حال تھا کہ سلطان بہادر کو ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا مگر وہ ملنے سے پہلو تہی کرتے رہے یہاں تک کہ قاضی عبداللہ سندھی کے کہنے سننے سے اس کے لئے تیار ہوئے، بادشاہ جب مل کر واپس گیا تو اس نے دوسرے روز ایک کڑور تنکہ بھیجا (یہ سکہ اس زمانہ میں گجرات میں رائج تھا) مگر شیخ نے یہ ساری رقم قاضی عبداللہ کو دیدی اور فرمایا کہ ”سلطان سے ملاقات اور اس رقم کے حصول کا ذریعہ آپ ہی تھے اس لئے آپ ہی اسکے حقدار ہیں۔“ (ایضاً ص ۲۴۴)

اس سے بڑھ کر دنیا سے نفرت اور بیزاری اور کیا ہو سکتی ہے۔

تصوف کی چار خصوصیات:

کہا جاتا ہے کہ تصوف کا دار و مدار چار چیزوں پر ہے:

قلة الطعام، قلة الكلام، قلة المنام و اعتزال الانام

کم کھانا، کم بولنا، کم سونا، اور لوگوں سے الگ تھلگ رہنا۔

حضرت سہل کا ارشاد ہے کہ ابدال کی چار خصلتیں ہیں:

اخماص البطون و السهر و الصمت و الاعتزال عن الناس۔

پیٹ کا خالی اور پچکا ہوا ہونا، جاگنا، خاموشی اور لوگوں سے علیحدہ رہنا۔

ابدال کے یہ اوصاف بیان کیے جاتے ہیں:

ان اكلهم فاقة و نومهم غلبة و كلامهم ضرورة۔

فاقہ، نیند کا غلبہ اور ضرورۃً بات چیت۔

گو صوفیہ کے نزدیک غذا میں تقلیل اور کمی مستحسن ہے لیکن یہ مقصود نہیں ہے، دراصل غذا میں افراط اور کثرت سے ایسی آفتیں رونما ہوتی ہیں جو دراصل مقصود میں خلل انداز ہوتی ہیں تقلیل کا مقصد نفس کشی قلب کی تقویت اور اس کی جلا اور صفائی ہے، بھوک سے قلب کی چربی پگھلتی اور خون کم ہوتا ہے جس سے قلب میں جلا، صفائی اور گداز پیدا ہوتا ہے، اور وہ ذکر کا نور قبول کرتا ہے نیز اس کے اندر شرعی معاملات اور غیبی واردات کے انوار کا فیضان ہوتا ہے، پھر قلب کے آئینہ سے ان انوار کا پرتو نفس کی زمین پر پڑتا ہے اور وہ نور خداوندی سے جگمگا اٹھتا ہے، اور اس کی آلائشیں اور ظلمتیں کافور ہو جاتی ہیں۔

(النور السافر ص ۳۱۶ و ۳۱۷)

ذیل میں ان چاروں امور کے بارہ میں شیخ علی متقی کا حال بیان کیا جاتا ہے۔

Marfat.com

قلت طعام:

شیخ کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کی غذا بہت کم ہوتی تھی۔ فاکہی کا بیان ہے کہ وہ اتنا کم کھانا کھاتے تھے کہ اس کا لوگوں کو مشکل سے یقین ہوگا اور اس قدر کم خوری کا کسی شخص کے بارہ میں خیال بھی نہیں کیا جاسکتا مگر شیخ اس قدر کم غذا کے اسلئے عادی ہو گئے تھے کہ طول ریاضت کی وجہ سے انہیں اس کا ملکہ حاصل ہو گیا تھا اور اگر انہیں معمول سے کچھ بھی زیادہ غذا دی جاتی تھی تو وہ اسے ہضم نہیں کر سکتے تھے۔ شعرانی کا بیان ہے کہ وہ نحیف البدن تھے اور بھوک کی شدت کی وجہ سے ان کے جسم پر گوشت معلوم نہیں ہوتا تھا۔ شیخ عبدالوہاب متقی سے منقول ہے کہ ان کا کھانا تو صرف اس لئے ہوتا تھا کہ ان کا جسم بحال رہے اور وہ عبادت کر سکیں۔ ان کے لئے جو شوربا بنتا اس میں سے تھوڑا سا چکھ کر دوسروں کو دیدیتے تھے۔

قلت کلام:

وہ کم سخن بھی تھے فضول اور لایعنی باتوں سے پرہیز کرتے اور بلاضرورت کوئی بات چیت نہیں کرتے تھے، مجلس درس میں بھی عموماً خاموش رہتے شعرانی کا بیان ہے کہ وہ بہت زیادہ خاموش رہتے تھے۔

قلت منام:

شیخ سوتے بھی کم تھے، اور شب کا زیادہ وقت ذکر و فکر اور یادِ الٰہی میں گزارتے تھے۔

خلوت پسندی اور عزلت گزینی:

خلوت پسند تھے اس لئے لوگوں سے الگ تھلگ اور کنارہ کش رہتے تھے، محی الدین عیدروسی کا بیان ہے کہ:

موثر اللعزلة من الانام۔

لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔

شیخ عبدالوہاب شعرانی لکھتے ہیں:

''بڑے گوشہ نشیں آدمی تھے اپنے گھر سے صرف جمعہ کی نماز کے لئے حرم جاتے اور صفوں کے کنارے کھڑے ہوتے اور بہت جلد گھر واپس آجاتے۔ (الطبقات الکبریٰ ج ۲ ص ۱۶۷)

شیخ جس زمانہ میں گجرات تشریف لے گئے تھے اس وقت ان کی حالت یہ تھی کہ جس طرف بھی نکلتے، خلقت ان پر اس طرح ٹوٹ پڑتی تھی، جس طرح شمع پر پروانے گرتے ہیں مگر خود ان کی عزلت پسندی کا حال یہ تھا کہ ہجوم سے کنارہ کش رہنے کے لئے اپنے کمرہ کا دروازہ بند رکھتے اور کسی کو اندر آنے کا موقع نہ دیتے بلکہ پوری خاموشی اور یکسوئی سے اپنے کاموں میں مشغول رہتے۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۴)

خوارق و کرامات:

شیخ کی مختلف کرامتیں بیان کی جاتی ہیں، ان کے حالات کے ضمن میں اس طرح کی باتیں پہلے بھی گزر چکی ہیں اور آئندہ

Marfat.com

بھی آئیں گی، یہاں چند واقعات تحریر کیے جاتے ہیں:

عبدالوہاب شعرانی کا بیان ہے کہ مکہ میں میری معذوری دیکھ کر انہوں نے چاندی کا ایک ٹکڑا مجھے دیا اس کی وجہ سے حج میں اللہ نے مجھے ایسی وسعت اور برکت دی کہ میں بے دریغ پیسے خرچ کرتا تھا، مجھے خود بڑی حیرت تھی کہ یہ سب کہاں سے آرہا ہے۔ (الطبقات الکبریٰ ج ۲ ص ۱۶۷)

ان کے شاگرد شیخ عبدالوہاب متقی فرماتے ہیں۔

''ایک روز شیخ کے مخصوص خدام میں سے ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ شیخ ازسرنو جوان ہو گئے ہیں اور نہایت حسین اور دلکش دکھائی دے رہے ہیں۔ اس وقت ان پر عجیب عمدہ اور اچھی حالت طاری ہے، آپ کو طلب فرمایا ہے۔ فقیر حکم کی تعمیل اور اس حالت کا مشاہدہ کرنے کے شوق میں چلا مگر جب پہنچا تو شیخ کی حالت تبدیل ہو چکی تھی، تاہم اب بھی سکر کے اثرات موجود اور باقی تھے، میرا بڑا پرتپاک خیر مقدم کیا اور مخصوص توجہ بھی فرمائی، فرمانے لگے کہ آج مجھ پر عجیب وغریب کیفیت طاری تھی، چونکہ حاضرین کو مزید اطمینان و یقین درکار تھا اس لئے بعض خوارق کا ظہور بھی ہوا، تم کو اس حالت کے مشاہدہ کے لئے بلایا تھا مگر تم ارباب یقین میں ہو تمہیں خوارق کی ضرورت نہیں، اس لئے حالت تبدیل ہوگئی اور میں اُس عالم سے اِس عالم میں چلا آیا۔'' (اخبار الاخیار ص ۲۴۷)

کہتے ہیں کہ سلطان محمود گجراتی کو پانی کے بارہ میں بڑا وسوسہ اور شک لاحق رہتا تھا جو کسی طرح دور نہیں ہوتا تھا، شیخ نے ایک طشت منگوا کر اس میں اپنی ٹوپی دھوئی اور پانی پھینک دیا، اسی طرح انہوں نے تین بار کیا، چوتھی مرتبہ اسی طشت میں نیا اور پاک وصاف پانی رکھوا کر فرمایا بابا محمود! یہ پانی ازروئے شریعت پاک وصاف ہے، اس میں کسی قسم کا شک وشبہ کرنا وسوسہ ہے جو شیطانی کام ہے، تم اس پانی کو پیو اور کوئی وسوسہ اور شک دل میں نہ لاؤ، سلطان شیخ کے ارشاد کے موافق وہ تمام پانی پی گیا جس کے بعد اس کا شک ایسا زائل ہو گیا کہ پھر کبھی اس کے دل میں وسوسہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ (ایضاً ص ۲۴۸)

وجد وحال:

شیخ صاحب وجد وحال بھی تھے، اس کی ایک مثال اوپر نقل ہو چکی ہے، وفات سے پہلے بھی ان پر عجیب جذبہ وحال طاری ہوا جس کی کیفیت ان کے شاگرد عبدالوہاب متقی نے اس طرح بیان کی ہے ''ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے تمام حرکات وسکنات میں ایک تغیر وانقلاب رونما ہو گیا ہے، اسی عالم میں انتقال سے تقریباً تین چار ماہ پیشتر ماہ صفر ۹۷۵ھ کی ایک رات مجھ فقیر سے فرمایا کہ فلاں شاعر کا شعر پڑھو میں اپنی فراست سے تاڑ گیا کہ وہ کون سا شعر پڑھنے کے لئے کہہ رہے ہیں، چنانچہ میں نے یہ شعر پڑھا۔

ہرگز نیامد در نظر نقشے ز رویت خوبتر ☆ شمسے ندانم یا قمر حورے ندانم یا پری

یہ سن کر ان کی عجیب حالت ہوگئی اور زور زور سے فرمانے لگے کہ پڑھتے جاؤ پڑھتے جاؤ چنانچہ فقیر نے یہ شعر کئی بار پڑھا اور وہ محبت آمیز باتیں کہتے اور شور انگیز نالے کرتے رہے، اسی اثنا میں ملازم نے آکر کہا کھانا حاضر ہے، ان کا طریقہ یہ تھا کہ کھانے کو کوٹ اور پیس کر اتنا باریک کرا دیتے تھے کہ اس کے تمام اجزاء ایک دوسرے سے اس قدر مل جاتے تھے کہ ان کو

Marfat.com

پہچاننا مشکل ہو جاتا تھا، چنانچہ جب ملازم نے کھانے کی خبر دی تو اس سے فرمایا کہ اسے پیس کر اتنا باریک کرو کہ اس کی تمام چیزیں اس میں گھل مل جائیں اور اس کا ہر ہر ذرہ باہم اس طرح مل جائے کہ شناخت نہ ہو سکے اور اس کی دوئی اس طرح ختم ہو جائے جیسا کہ اس دھرے سے معلوم ہوتا ہے۔

سُن سہیلی پرم کی باتا ☆ یوں مل رہے جیون دودھ نباتا

تمام رات یہی حالت رہی کہ آپ محبت انگیز کلمات فرماتے رہے اور ہم لوگ بھی ان کے ساتھ جاگتے رہے۔
(اخبار الاخیار ص ۳۴۹)

شاہ عبدالحق صاحب لکھتے ہیں کہ:

''مجھ سے شیخ عبدالوہاب فرماتے تھے کہ شیخ زمانہ قبل از مرگ میں اکثر ذکر بالجہر پوری قوت اور ذوق وشوق سے کرتے تھے، حالانکہ اس وقت ان میں حس وحرکت تک نہ باقی تھی اور وہ بالکل نحیف ہو گئے تھے، ذکر کے وقت ان کی حالت یہ ہوجاتی تھی کہ گویا کوئی مانع اور حائل ہے جسے وہ دفع کرتے جاتے ہیں، اسی حالت میں فرمایا کہ جنت معلیٰ میں قبر کی جگہ تیار کر لینی چاہئے تاکہ رحلت سے پہلے منزل متعین ہو جائے مگر پھر فرمایا کہ یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے کہ ہماری حیاتِ مستعار کب تک باقی ہے؟ اور ہمیں کب موت آئے گی اور یہ مقبرہ عام مسلمانوں کا ہے انتقال سے پہلے ہی قبر کی جگہ پر قبضہ کر کے لوگوں کیلئے تنگی پیدا کرنا مناسب نہیں ہے، وفات کے بعد لوگ جہاں چاہیں دفن کریں۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۹و۲۵۰)

مہدویت سے تعلق وانقطاع:

فرقہ مہدویت [1] سے بھی شیخ کا تعلق بتایا جاتا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ وہ صاحب حال بزرگ تھے، اس کیفیت کے طاری ہونے کے وقت وہ اس طرح کی باتیں بھی کہہ جاتے تھے، چنانچہ مرض الموت میں انہوں نے قطبیت کا دعویٰ کیا تھا، (اخبار الاخیار ص ۲۴۸) اسی طرح وہ فرقہ مہدویہ سے بھی متاثر ہو گئے تھے مگر ان کا یہ تاثر عارضی اور وقتی تھا۔

نواب صدیق حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں:

واز غریب حالات ایشاں دعوی مہدویت است کہ بحث غلبہ وقت وسکر حال بوجود آمدہ وہ مدت بقائے آں پنج روز بود من نمی گویم انا الحق یار میگوید بگو چوں بگویم چوں مرا دلدار میگوید بگو۔ (اتحاف النبلاء ص ۳۲۶)

ان کے عجیب حالات میں مہدویت کا دعوی بھی ہے جو غلبہ حال اور سکر کا نتیجہ تھا مگر اسکی مدت پانچ روز رہی میں خود انا الحق نہیں کہتا بلکہ یہ دوست کہلاتا ہے۔ میں اسی وقت یہ کہتا ہوں جب میرا محبوب مجھ سے یہ کہنے کے لئے کہتا ہے۔

مگر بعد میں مہدویت کے مخالف ہو گئے تھے اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اس کے قلع قمع میں اپنی زندگی صرف کر دی، ان کی تصنیف البرہان فی علامات المہدی آخر الزمان دراصل مہدویت کا رد تھی۔

ردِ مہدویت کے علاوہ شیخ نے اپنے زمانہ کی مختلف بے اعتدالیوں اور فتنوں کی بھی سرکوبی کی اور صوفیہ کے افراط وتفریط پر مبنی بعض نظریات وخیالات کی بھی اصلاح کی۔ اس کی تفصیل شیخ محمد اکرام نے تحریر کی ہے ذیل میں ان کے بعض اقتباسات

---

[1] مہدویت یا فرقہ مہدوی سید محمد جون پوری متوفی ۹۱۰ھ-۱۵۰۵ء کی طرف منسوب ہے۔

Marfat.com

پیش کیے جاتے ہے:

''شروع شروع میں یہ (مہدویت) کی تحریک گجرات، خاندیش اور احمد نگر میں زوروں پر تھی اور بڑے قابل اور مخلص لوگ اس میں شامل تھے، لیکن شیخ علی متقی کی علمی مخالفت اور مخدوم الملک کی سیاسی کوششوں نے اسے شمالی ہند میں پھیلنے پھولنے نہ دیا، گجرات سے یہ تحریک دکن میں منتقل ہوگئی۔'' (رود کوثر ص ۲۸)

شیخ صاحب آگے لکھتے ہیں:

''بلکہ شیخ علی متقی جنھوں نے بالآخر گجرات میں مہدویت اور دوسری غیر راسخ تحریکوں کے قلع قمع میں سب سے زیادہ گرم جوشی دکھائی، بعض روایات کے مطابق ایک زمانے میں مہدوی ہو گئے تھے، لیکن جب مکہ معظمہ میں پہنچ کر انہوں نے زیادہ تحقیق کی تو ان خیالات کو ترک کیا اور ان کے خلاف ٹھوس مدلل کتابیں لکھیں۔''

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''شیخ علی متقی نے سو سے زیادہ کتابیں لکھیں، آپ کی زیادہ دلچسپی علم حدیث اور تصوف سے تھی، لیکن آپ نے معاصرانہ بے اعتدالیوں پر بھی بڑی توجہ دی، شیخ غوث گوالیاری کے رسالہ معراجیہ کی مخالفت کے علاوہ آپ نے مہدی جون پوری کے خیالات کی بڑی مخالفت کی اور نہ صرف اس مقصد کے لئے حکام وقت کی اعانت حاصل کی بلکہ مہدویت کی تردید میں دو مبسوط رسائل لکھے اور ظہور مہدی کے نشانوں کی تفصیلات اور علمائے مکہ کے فتاویٰ درج کر کے مہدی جونپوری کے دعویٰ کی تردید کی، یہ آپ کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ گجرات میں جو مہدویت کا مرکز بن گیا تھا۔ یہ تحریک بالآخر ناکام ہوئی اور اسے اپنا مرکز دکن میں منتقل کرنا پڑا۔

آپ کے شاگردوں میں دوسرے اکابر علماء کے علاوہ مشہور محدث محمد بن طاہر پٹنی تھے جنھوں نے اپنے استاد کی متابعت میں مخالفت بدعت کے لئے اپنی زندگی وقف کردی اور بالآخر اسی کوشش میں شہید ہوئے۔ (رود کوثر ص ۳۵۴)

شیخ کے ممتاز مسترشد اور خلیفہ و جانشین شیخ عبدالوہاب متقی نے بھی رد مہدویت کے کام کو نہ صرف جاری و باقی رکھا بلکہ اسے وسعت بھی دی انکے متعلق شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں۔

''شیخ عبدالوہاب متقی شاید پہلے بااثر ہندوستانی عالم ہیں، جنھوں نے وحدت الوجودیوں کی افراط و تفریط کے خلاف باقاعدہ آواز اٹھائی اور شیخ عبدالحق محدث اور شیخ محمد بن طاہر پٹنی جیسی ہستیوں پر اثر ڈالا۔ (رود کوثر ص ۳۵۲)

شیخ محمد غوث گوالیاری کی تکفیر:

اوپر ذکر آچکا ہے کہ شیخ علی متقی نے شیخ محمد غوث گوالیاری کے رسالہ معراجیہ کی سخت مخالفت کی تھی، ان کو شیخ کی بعض اور تصنیفات اور اورادِ غوثیہ وغیرہ پر بھی اعتراض تھا، ان کی مخالفت میں وہ اس قدر سرگرم ہو گئے تھے کہ ان کی تکفیر اور قتل کا فتویٰ بھی دیا دیا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے ان واقعات کی تفصیل لکھی ہے فرماتے ہیں:

''شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری سلسلہ کے مشہور صوفی تھے اور ان کی بدولت اس سلسلہ کو بڑی شہرت نصیب ہوئی، وہ شیخ فریدالدین عطار کی نسل سے تھے اور سلوک و باطن کی تکمیل شیخ ظہور حاجی حمید سے کی تھی، ان کے ایماء سے کوہ چنار کے

Marfat.com

جنگلات میں تیرہ برس تک بڑی ریاضتیں کرتے اور درختوں کے پتے کھا کر یادِ الٰہی کرتے رہے۔" (منتخب التواریخ جلد سوم ص ۴ تا ۶)

ہمایوں ان کا بڑا معتقد تھا، لیکن شیر شاہ کا جب بول بالا ہوا تو وہ ان کے پیچھے پڑ گیا تھا اس کی وجہ سے شیخ غوث گوالیار سے ہجرت کر کے گجرات تشریف لائے، یہاں شیخ علی متقی نے ان کے کفر وقتل کا فتویٰ دیا۔

سلطان محمود گجراتی نے اس دور کے ایک اور مشہور عالم وصوفی شیخ وجیہ الدین گجراتی سے جب اس مسئلہ میں استصواب کیا تو وہ تحقیق حال کے لئے شیخ محمد غوث کے پاس گئے اور پہلی ہی ملاقات میں ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ فتوے کو چاک کر دیا، شیخ علی متقی کو معلوم ہوا تو انہوں نے شیخ وجیہ الدین سے کہا تم کیوں بدعت کے رواج پر راضی ہو گئے، شرع میں رخنہ ڈالتے ہو، انہوں نے کہا "ہم ارباب قال ہیں اور شیخ اہل حال ہیں، ہمارا ذہن ان کے کمالات کو نہیں سمجھ سکتا اور ظاہر شریعت میں کوئی اعتراض اُن پر نہیں آتا، غرض ان کے اثر سے تمام گجرات کے حکام شیخ محمد غوث کے معتقد ہو گئے اور شیخ نے اس بلا سے نجات پائی۔ (ایضاً ص ۴۴)

معراج نامہ جس پر شیخ علی متقی کو اس قدر شدید اعتراض تھا اس کی تفصیل ملا عبدالقادر بدایونی نے دوسری جگہ تحریر کی ہے:

"جب دوبارہ مغل حکومت قائم ہوئی اور شیخ گجرات سے اکبر آباد (آگرہ) کے لئے روانہ ہوئے تو اس وقت ہمایوں کی وفات ہو چکی تھی اور اکبر اس کا جانشین تھا، امور ملکی بیرم خان کے سپرد تھے اور عہد اکبری کا پہلا صدر شیخ گدائی شیخ کے خلاف تھا اس نے بیرم خان سے کہا کہ رسالہ معراجیہ میں شیخ نے اپنی معراج کا دعویٰ کیا ہے اور کہا ہے کہ مجھے اللہ سے ہم نشینی اور ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا ہے اور اس نے مجھے آنحضرت ﷺ پر فضیلت دی ہے، چنانچہ جب علماء ومشائخ کے جلسہ میں اس پر بحث ہوئی اور شیخ پر اعتراضات کیے گئے تو بالآخر وہ آزردہ ہو کر گوالیار چلے گئے۔"

(منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی جلد دوم ص ۳۴ و ۳۵)

مگر شیخ وجیہ الدین نے جیسا کہ اوپر گزرا اس میں شیخ علی متقی کی نہ صرف یہ کہ تائید نہیں کی بلکہ مسئلہ تکفیر پر ایک مستقل رسالہ بھی تحریر کیا جس میں ابتداءً فقہی کتابوں سے مسئلہ تکفیر پر روشنی ڈالی ہے پھر احادیث سے سند اُسے کو مشرح بیان کیا ہے، آخر میں صوفیائے کرام کے احوال سے بحث کی ہے کہ حالت سکر میں جو کہہ جاتے ہیں وہ قابل مواخذہ نہیں ہوتا۔"

(معارف ج ۳۱ ص ۱۳۱، ۲۴۔ ط فروری ۳۳ء)

اتباعِ سنت:

ان کے کسی شاگرد نے مکہ معظمہ میں رسول اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا تو آپؐ سے عرض کیا کہ "اے اللہ کے رسول! مجھے کس کام کا حکم دے رہے ہیں، ارشاد ہوا کہ "شیخ علی متقی کی اقتدا کرو، وہ جو کچھ کریں تم بھی وہی کرو" محی الدین عیدروسی یہ خواب نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شیخ علی متقی کو نبی ﷺ کی متابعت میں سے حصہ وافر ملا تھا، اسی لئے آپ نے اس زمانہ کے اور لوگوں کے بجائے خاص طور پر ان کا نام لیا اور خواب دیکھنے والے کو ان کی اقتدا کا حکم دیا، اس خواب میں ان کی عظمت کے اور بھی کئی پہلو ہیں، ایک تو یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انہیں شیخ کے نام سے موسوم کیا ہے۔" (النور السافر ص ۳۱۸)

Marfat.com

اس ضمن میں وہ خواب بھی نقل کرنے کے لائق ہے جسے شیخ کے بعض سوانح نگاروں نے ان کے مناقب میں بیان کیا ہے کہ ''انہوں نے ۲۷ رمضان بروز جمعہ نبی ﷺ کی خواب میں زیارت کی تھی، اس وقت انہوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ اس زمانہ میں سب سے افضل شخص کون ہے؟ ارشاد ہوا: تم، پوچھا پھر کون افضل ہے؟ ارشاد ہوا ہندوستان میں محمد بن طاہر۔

کہا جاتا ہے کہ اسی شب میں شیخ کے شاگرد شیخ عبدالوہاب متقی نے بھی خواب میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تو یہی سوال کیا جس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

شیخک ثم محمد بن طاھر بالھند۔

سب سے افضل تمہارے شیخ ہیں پھر ہندوستان کے محمد بن طاہر۔

وہ جب شیخ متقی کے پاس یہ خواب بیان کرنے کے لئے حاضر ہوئے تو شیخ نے ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فرمایا کہ جو کچھ تم نے خواب میں دیکھا ہے وہی میں نے بھی دیکھا ہے۔ (ایضاً ص ۳۱۵ و ۳۱۶)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر:

اہل حق اور علمائے ربانی کی طرح وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ سے غافل نہ رہتے، قاضی عبداللہ سندھی نے جب سلطان بہادر گجراتی کی ملاقات کے لئے سفارش کرتے ہوئے ان سے کہا کہ ''اگر آپ اس سے بات کرنا پسند نہ کریں گے تو ہم لوگ اسے اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول رکھیں گے'' شیخ نے فرمایا'' یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس کا لباس اور وضع قطع غیر اسلامی ہو اور مجھے اس کے اندر کھلا ہوا منکر دکھائی دے، پھر بھی میں چپ رہوں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض سے باز رہوں۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۴) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کس قدر خیال تھا اور وہ کسی منکر اور غیر شرعی فعل وعمل کو دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ جب بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو جو نصیحت مناسب سمجھی اسے کی۔ (ایضاً)

سخاوت وفیاضی:

طبیعت میں سخاوت اور فیاضی تھی، ان کی خانقاہ میں بڑی تعداد میں طالبین مستقل قیام پذیر رہتے، شیخ ان کی کفالت فرماتے تھے اور طلبہ کے کھانے پینے کے علاوہ کتاب، کاغذ اور روشنائی تک وہی مہیا کرتے تھے، جو سائل بھی ان کے پاس آتا اس کی بروقت مدد فرماتے اور کسی کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے، اوپر گزر چکا ہے کہ بہادر شاہ نے ایک کروڑ تنکہ بھیجا تھا مگر انہوں نے یہ پوری رقم قاضی عبداللہ سندھی کو دے دی۔ (ایضاً ص ۲۴۶)

داد و دہش میں نام ونمود اور ناموری کے لئے پُر تکلف دعوتوں کا اہتمام پسند نہ تھا جو کچھ کسی کو دیتے مخفی طریقہ سے دیتے، آخر عمر میں بزرگوں کے عرس میں کھانا کھلانے کے بجائے اندازاً جو رقم اس پر خرچ ہوتی اسے زرنقد کی صورت میں فقراء میں تقسیم کر دیتے تھے اور ہر فقیر کو جتنی رقم مناسب سمجھتے خاموشی سے اس طرح دیتے کہ کسی اور کو پتہ نہ چلتا، فرماتے تھے کہ مجلس

Marfat.com

طعام کا اہتمام و آرائش اور لوگوں کا جمگھٹا موجب تکلیف اور باعث زحمت ہے۔

معیشت میں سادگی اور قناعت:

ان کی زندگی سادہ اور تکلفات سے بری تھی اور ان کا دل مال و زر کی ہوس سے خالی تھا، جو کچھ جائز اور حلال طریقہ پر میسر ہوتا اسی پر قناعت کرتے ابتداء میں اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے کتابت کرتے تھے، اور اسی سے گزر بسر کرتے تھے، عسرت کے باوجود بیوہ عورتوں کی مدد بھی کرتے اور کسی سائل کو محروم نہ کرتے، اگر کہیں سے فتوحات ملتے تو قرض ادا کرتے، کیونکہ اس میں وسعت ہے، مگر فتوحات اپنی ذات پر خرچ نہ کرتے، جن فتوحات کے بالکل حلال ہونے کا یقین ہوتا اسی میں سے اپنی ذات پر خرچ کرتے۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۵ و ۲۴۶)

بہادر شاہ اور محمود شاہ دونوں کو شیخ علی متقی سے بڑی عقیدت تھی اور وہ ان کے اخراجات کے لئے بڑی بڑی رقمیں نذر کرتے مگر شیخ سادہ زندگی کے عادی تھے اس لئے نہ یہ رقم اپنی ذات پر خرچ کرتے اور نہ پس انداز کرتے، بلکہ فقراء و مساکین میں تقسیم کردیتے یا اہل علم، طلبہ اور سلوک و معرفت کے طالبین کی ذات پر خرچ کرتے۔

سادگی کا یہ حال تھا کہ سفر میں دو تھیلے لے کر چلتے تھے، ایک میں کھانے پینے کی چیزیں اور برتن ہوتے تھے کھانے کی جنس کم سے کم مقدار میں خرچ کرتے، دو تین روز کی خوراک تین چار روز کام آتی، پانی کا استعمال بھی کم کرتے، اور سارا کام بھی خود ہی کرتے تھے۔ (ایضاً ص ۲۴۷)

رزق کے معاملہ میں توکل:

سادگی کی بنا پر رزق کے معاملہ میں بڑے متوکل اور اللہ کی ذات پر اعتماد اور بھروسہ کرتے تھے، ان کے خیال میں سبب و واسطہ کے بغیر بھی روزی فراہم ہوجاتی ہے، فرماتے تھے کہ:

اللہ یرزق من حیث لا یحتسب۔

اللہ وہاں سے روزی دیتا ہے جہاں سے بندے کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔

صحرا بیابان میں اکثر اس کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ کنوئیں کے کنارے سے پیاسے ہرن آتے ہیں اور پانی کی طرف حسرت بھری نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کنوئیں کے اندر گہرائی میں ہوتا ہے، دفعتاً کنویں میں جوش آتا ہے اور پانی اُبلنے (اوپر بہنے) لگتا ہے اور ہرن اور دوسرے جانور پانی پی کر خوب سیراب ہوجاتے ہیں اور کلیلیں کرنے لگتے ہیں ہم نے خود بھی اس طرح پانی پیا ہے۔

حلال کمائی ضائع نہیں ہوتی:

ان کے استاد اور شیخ طریقت شیخ حسام الدین رزق حلال کے معاملہ میں بہت محتاط تھے اس بارہ میں ذرا بھی شبہ ہوتا تو اس کے استعمال سے پرہیز کرتے، ان کی غایت احتیاط کے بعض واقعات مشہور ہیں۔ (اخبار الاخیار تذکرہ حسام الدین ملتانی ص ۲۰۱) شیخ علی متقی کا عمل بھی یہی رہا ہوگا اور وہ اکل حلال کا بڑا لحاظ کرتے رہے ہوں گے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ حلال کمائی رائیگاں

Marfat.com

نہیں جاتی۔ چنانچہ ان کے مشہور شاگرد شیخ عبدالوہاب متقی کا بیان ہے کہ جو چیز کسب حلال سے حاصل ہوتی ہے، وہ کبھی ضائع نہیں ہوتی، یہ اگر گم بھی ہو جاتی ہے تو بالآخر مل جاتی ہے، اس کی تائید میں وہ اپنا یہ واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک دفعہ بحری سفر میں طوفان آ گیا، ہم لوگ جس کشتی پر سوار تھے وہ ٹوٹ پھوٹ گئی کئی روز تک ایک تختہ پر بیٹھے رہنے کے بعد جب ہم ساحل پر پہنچے تو ہمارے ساتھ جو کتابیں تھیں وہ بھیگ گئی تھیں آگے ہم لوگوں کو پیدل چلنا تھا اس لئے کتابیں ڈھو کر لے جانے کی ہم میں طاقت نہ تھی چنانچہ ایک صحرا میں انہیں دفن کر دیا گیا اور وہاں نشان بھی بنا دیا گیا پھر مکہ کی طرف روانہ ہوئے راستہ میں پیاس کی شدت سے دوچار ہوئے، صحرائے عرب میں پانی کا نام ونشان نہیں ہوتا، دوستوں نے کہا کہ پانی کے لئے دعا کرنی چاہیے، ممکن ہے اللہ پانی بھیج دے، میں نے کہا میں دعا کرتا ہوں، آپ لوگ آمین کہیں، اللہ نے ہماری دعا سن لی اور بارش ہوئی جس سے ہم لوگ سیراب بھی ہوئے، اور اپنے اپنے مشکیزے بھی بھر لیے کچھ روز کے بعد مکہ پہنچے، طواف وعمرہ کیا اور سعی بین الصفا والمروہ بھی کی، اتفاقاً ایک روز چند بدو گٹھری لئے ہوئے ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہمارے پاس چند کتابیں ہیں، آپ لوگ خریدنا چاہیں تو خرید لیں، انہوں نے جب گٹھری کھولی تو اس میں ہماری وہی کتابیں تھیں جنھیں ہم نے صحرا میں دفن کیا تھا، ہم نے بدوؤں کو قیمت دیکر کتابیں لے لیں۔ ان کے اوراق خشک ہونے کے بعد ایک دوسرے سے ایسا چپک گئے تھے کہ انہیں پھر پانی میں تر کرنا پڑا تاکہ چپکے ہوئے اوراق کھل جائیں، مگر ان سب کے باوجود نہ کتابوں کا کوئی ورق محو ہوا اور نہ ان سے استفادہ کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش آئی۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۷)

اپنے کام خود کرنا:

وہ اپنا کام خود ہی کرتے تھے اوپر گزر چکا ہے کہ سفر میں دو تھیلے ان کے ساتھ ہوا کرتے تھے جنھیں خود ہی لے کر چلتے تھے اور کھانا پکانے کے لئے خود ہی جنگل سے لکڑیاں بھی لایا کرتے تھے، اسی طرح کھانا بھی خود پکاتے اور خود ہی برتن بھی دھوتے، اپنے کام کے لئے دوسروں کو زحمت نہ دیتے تھے، انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اُس کا عہد کیا تھا کہ دوسرے سے کوئی مدد نہ لیں گے اور جو کام خود کر سکتے تھے اس کے لئے کسی اور سے کچھ نہ کہتے اور اگر بالفرض ایسی کوئی ضرورت پیش آ جاتی جس میں دوسروں کی مدد واحتیاج ضروری ہوتی تو پہلے انہیں کچھ پیسے بطور اجرت دیدیتے تب ان سے کام لیتے اور خدمت کراتے۔

(ایضاً ص ۲۴۴)

نوکروں سے اچھا برتاؤ:

اپنے ملازمین اور خادموں سے بھی اچھا برتاؤ کرتے اور ان کی غلطی اور کج خلقی کو نظر انداز کر دیتے، شیخ عبدالوہاب متقی فرماتے ہیں کہ کمال نام کا ان کا ایک نوکر تھا جو نہایت بے ہنگم اور کج خلق تھا۔ اس کے جو جی میں آتا اور انہیں جو چاہتا کہہ دیتا اور ان کی مرضی کی مطلق پروا نہ کرتا مگر اس کے باوجود اسے عزیز رکھتے، اس کے معاملہ میں ضبط وتحمل سے کام لیتے اور اس کی کج خلقی اور ایذا رسانی کو برداشت کرتے، ایک روز وہ ان کے لئے شوربا بنا کر لایا جس میں بہت نمک تھا مگر کوئی برہمی ظاہر کرنے کے بجائے اسے بلا کر یہ کہا، میاں کمال! ذرا بیٹھو پھر تھوڑا سا شوربا دے کر اس سے کہا اسے چکھو، دیکھو کیسا پکا ہے؟ اس نے

Marfat.com

بڑی ڈھٹائی سے درشت لہجہ میں کہا ہاں کچھ نمک تو ضرور زیادہ ہے مگر یہ کتنا عمدہ پکا ہے، آپ اسے کھائیے، کوئی حرج نہیں ہے۔
شیخ نے فرمایا بہت خوب، پھر پانی منگوا کر شوربا میں ڈالا اور تھوڑا سا کھالیا۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۵)

پاکیزہ زندگی اور عمدہ سیرت:

شیخ کے جو حالات وواقعاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں وہ ان کی عظمت پاکیزہ شخصیت، بے داغ زندگی اور عمدہ سیرت کی دلیل ہیں ارباب سیر نے اعتراف کیا ہے کہ ان کے محاسن ومناقب گوناگوں ہیں اور ان کی سیرت پاکیزہ اور واقعات زندگی نہایت محمود اور قابل ستائش ہیں۔ (النور السافر ص ۳۱۵ و ۳۱۷)

اپنی پاکیزہ زندگی اور عمدہ سیرت واخلاق کی بنا پر وہ مذہبی ودینی حیثیت سے بڑے ممتاز شخص سمجھے جاتے تھے، شیخ محمد اکرام تحریر فرماتے ہیں:

"شیخ علی متقی جن کا فیض شیخ عبدالحق کو شیخ عبدالوہاب کی وساطت سے پہنچا، خود ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں اور ایک خاص شان اور پایہ کے بزرگ تھے۔" (رود کوثر ص ۳۵۳)

شیخ عبدالوہاب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ اور ان کے استاد شیخ علی متقی ہماری مذہبی تاریخ میں بڑی باعزت جگہ کے مستحق ہیں۔" (رود کوثر ص ۳۵۲)

غیر معمولی شہرت ومقبولیت:

اپنے گوناگوں اوصاف ومحاملہ، پاکیزہ زندگی، عمدہ سیرت، علمی کمالات اور تصوف واحسان میں بلند درجہ ومرتبہ کی وجہ سے شیخ علی متقی کو چہار دانگ عالم میں بڑی شہرت ومقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ ان کا آوازۂ شہرت ملاءِ اعلیٰ تک بلند تھا۔ (مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۹۳) ان کے سیرت نگار فاکہی کا بیان ہے کہ مکہ معظمہ میں ان کی ایسی دھوم مچی ہوئی تھی کہ لوگ مشعر حرام اور صفا کی طرح ان کے قصد وارادہ سے ان کے پاس آتے تھے اور ان پر پروانوں کی طرح نچھاور ہوتے تھے، یہاں تک کہ سلطان روم تک ان کا آوازۂ شہرت پہنچ گیا تھا۔ (النور السافر ص ۳۱۷)

مکہ سے کہیں زیادہ وہ ہندوستان میں مشہور تھے، سلطان بہادر گجراتی کے زمانہ میں جب انہوں نے سرزمین ہند میں قدم رکھا تو جس طرف جاتے تھے لوگ ان پر اسی طرح پلے پڑ... اور ٹوٹے پڑتے تھے جیسے شمع پر پروانے گرتے اور ٹوٹتے ہیں۔ (اخبار الاخیار ص ۳۴۲)

امراء وسلاطین سے تعلقات:

پہلے کئی بار ذکر آچکا ہے کہ سلطان بہادر اور سلطان محمود شیخ علی متقی سے بڑا عقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے اور ان کی ہر قسم کی مالی امداد کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، جب مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور وہاں ان کی شہرت بڑھی تو رومی بادشاہ سلیمان ابن سلیم بن بایزید کو بھی اس کی خبر ہوئی جو اس وقت پوری دنیائے اسلام کا فرمانروا تھا، اس نے شیخ کے پاس خط لکھ کر دعا کی درخواست کی اور مدۃ العمر اُن سے روابط وتعلقات قائم رکھے۔ (ظفر الوالہ ج ۱ ص ۳۱۶)

Marfat.com

جب شیخ پہلی دفعہ گجرات آئے تو اس وقت سلطان بہادر وہاں کا فرمانروا تھا وہ شیخ کے اوصاف و کمالات سن چکا تھا اس لئے ان کا بہت گرویدہ تھا اور ملاقات و حاضری کے لئے بیقرار تھا مگر وہ اس سے ملنے سے گریز کرتے رہے اس لئے اس نے ان کے عقیدت مند قاضی عبداللہ سندھی کو درمیان میں ڈالا، ان کی سعی و سفارش کے بعد بادشاہ کی تمنائے ملاقات بر آئی، (اخبار الاخیار ص ۲۴۴) اس کے بعد اس نے جو عزت افزائی اور قدر دانی کی اس کا حال پہلے تحریر کیا جا چکا ہے۔

سلطان محمود ثانی تو ان کا مرید ہی تھا، اس کے دورِ حکومت میں وہ دوبار گجرات تشریف لائے، اس نے مکہ معظمہ میں شیخ کے لئے مکان تعمیر کرایا تھا اور خانقاہ کے مصارف بھی وہی پورا کرتا تھا اس نے اس پر ایک جائیداد وقف کی تھی جس سے خانقاہ کے واردین وصادرین کا خرچ چلتا تھا۔ (ظفر الوالہ ج ۱ ص ۳۱۶)

سلطان محمود شیخ کا اس قدر عقیدت مند تھا کہ ان کے لئے خود وضو کا پانی لاتا اور ان کے ہاتھوں اور قدموں کو دھلاتا، (النور السافر ص ۷ ۱۴ و ظفر الوالہ ج ۱) شیخ عبدالوہاب متقی فرماتے ہیں کہ وہ برابر ان کی خدمت میں آیا کرتا لیکن غیر مسنون لباس میں ہوتا اس لئے شیخ اس کی جانب نہ نگاہ اٹھاتے اور نہ التفات ہی فرماتے، ایک روز وہ صلحا کے لباس میں آیا تو شیخ کو خوشی ہوئی اور انہوں نے اس کی طرف نگاہِ التفات فرمائی، بادشاہ نے اپنی طرف میلان دیکھ کر گھر تشریف لے چلنے کی درخواست کی جسے انہوں نے منظور کرلیا، بادشاہ خود ڈولا اپنے کندھے پر رکھ کر انہیں گھر لایا اور اعزاز و اکرام کیا۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۷ و ۲۴۸)

بعض عہدوں پر متمکن ہونا اور الزامات سے متہم ہونا:

شیخ عبدالوہاب متقی کا بیان ہے کہ ایک بار شیخ علی متقی کو خیال ہوا کہ عدل و انصاف کا بہت ثواب ہے، اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اسی نیت سے منصب عدالت پر فائز ہونا چاہا، اس سے یہ امتحان اور تجربہ بھی مقصود تھا کہ دنیا کی مشغولیت کے ساتھ باطن کی اصلاح و تربیت کا کام سکون اور دلجمعی کے ساتھ انجام پا سکتا ہے یا نہیں؟ سلطان محمود گجراتی چونکہ ان کا نہایت معتقد تھا، اس لئے اسے جب اس ارادہ کی خبر ہوئی تو اس نے بہت غنیمت جانا اور اسے اپنے نظام سلطنت کی سعادت خیال کیا، چنانچہ شیخ کرسی عدالت پر رونق افروز ہوئے مگر پاجی ملازمین نے اس کی وجہ سے ان پر رشوت کا الزام عائد کر دیا اور بادشاہ کو بھی اس کی خبر کر دی کہ شیخ دیانت و تقویٰ کے باوجود رشوت لیتے ہیں، عدل و انصاف کے بجائے افراط و تفریط سے کام لیتے ہیں مگر اس نے باور نہیں کیا تو مخالفین نے یہ کہنا شروع کیا کہ شیخ کے ساتھی رشوت لیتے ہیں اور وہ اس سے واقف ہونے کے باوجود کوئی دار و گیر نہیں کرتے۔ جب شیخ کو پتہ چلا کہ بادشاہ کو اس قسم کی خبریں پہنچی ہیں تو وہ کچھ روز تک تو اس معاملہ کو درست کرنے میں لگے رہے مگر جب انہیں اندازہ ہوا کہ معاملہ سلجھ نہیں رہا ہے تو ایک روز عدالت کے چبوترے سے اپنا عصا لئے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے، دوستوں کو سلام کیا اور دوڑتے ہوئے چل دیئے اور فرمایا کہ یہ دونوں کام ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے، عاقبت بخیر ہونی چاہیے۔ (اشعۃ اللمعات فی شرح المشکوٰۃ از شاہ عبدالحق ج ۲ ص ۲۴۷)

اسی قسم کا ایک اور واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

شیخ علی متقی جب دوسری مرتبہ گجرات تشریف لائے اور سلطان محمود سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت مسرور ہوا چند روز بعد شیخ نے اس سے کہا تمہیں معلوم ہے کہ میں یہاں کس لئے آیا ہوں؟ اس نے کہا ارشاد ہو، شیخ نے فرمایا مجھ پر کشف ہوا ہے کہ

Marfat.com

تمہارے امور و احکام کو میزانِ شریعت پر تولوں جو اس کے موافق ہوں وہ باقی رہیں، سلطان اس کے لئے رضامند ہو گیا اور وزیروں کو حکم دیا کہ تمام معاملات میں شیخ کی جانب رجوع کریں شیخ نے کئی دنوں کے غور و فکر کے بعد ان احکام و اعمال کو باقی رکھا جو شریعت کے مطابق تھے اور جو خلافِ شریعت تھے انہیں موقوف کر دیا، اس کی وجہ سے تعطل اور ابتری پیدا ہو گئی اور نظام سلطنت بھی درہم برہم ہونے لگا۔ [1]

شیخ نے پرانے عمال و امرا کو نظر انداز کر کے ان کے معاملات سے واقفیت اور پیش آمدہ امور کی تحقیق اور چھان بین کا کام شیخ چیلہ کے سپرد کر دیا جو ان کے بہت قابل اعتماد مرید اور ان کی دانست میں نہایت عفیف، پاکدامن، زاہد و مرتاض شخص تھے مگر بالآخر صحبت کے اثر نے اپنا کام کیا اور وزیروں کی سازش رنگ لائی، چنانچہ ایک وزیر کے ایماء سے ایک عورت نے شیخ چیلہ کی موجودگی میں ان کی بیوی کو رشوت میں زیور دیا جس کی خبر دینے کے لئے وزیر بادشاہ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا آئین و دستور معطل ہو چکا ہے اور معاملات بھی درہم برہم ہوتے جا رہے ہیں مگر رشوت جاری ہے، شیخ کی ذات بابرکت ضرور ہے، مگر وہ نظم و نسق کے آدمی نہیں ہیں کہ نظام حکومت چلا سکیں، ایک عورت نے ان کے وکیل اور نائب کو رشوت دی ہے، سلطان ٹیک لگائے ہوئے تھا، یہ سنتے ہی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، پھر عورت سے واقعہ کے متعلق دریافت کیا، اس نے اقرار کیا مگر جب شیخ چیلہ سے پوچھا تو انہوں نے انکار کیا بادشاہ نے انہیں اور عورت کو آمنے سامنے بلا کر دریافت کیا، عورت نے اس قدر وثوق سے بات کہی کہ سلطان کو پورا یقین ہو گیا، اس کے بعد اس نے سب معاملات سابق بدستور وزیر کے سپرد کر دیئے۔

جب یہ سارا واقعہ شیخ کو معلوم ہوا تو انہوں نے مکہ واپس جانے کا قصد کیا اور اسی وقت سرکیج روانہ ہو گئے، بادشاہ کو معلوم ہوا تو اس نے واپسی کے لئے بار بار آدمی بھیجے مگر شیخ نے واپس آنے سے انکار کر دیا۔ جب امرائے کبار بھی بادشاہ کی طرف سے بلانے کیلئے پہنچے تو انہوں نے ان کے سامنے دنیا کے بارہ میں وارد حدیثیں اور بزرگوں کے اقوال بیان کرنا شروع کیا، یہ امرا وہاں موجود ہی تھے کہ خود بادشاہ بھی پہنچ گیا اور اس نے قیام کے لئے اصرار کیا اور کہا کہ اس سے ملک میں بھی برکت ہو گی اور وہ خود بھی برکت اندوز ہو گا، جواب میں ارشاد فرمایا کہ مکہ کو اللہ نے شرف بخشا ہے، دعا کی قبولیت کے لئے وہ زیادہ موزوں اور مناسب جگہ ہے، تمہارے لئے بھی یہاں کے مقابلہ میں وہاں کی دعا زیادہ سازگار اور نفع بخش ہو گی، یہ پرانا مقولہ ہے کہ:

ان الدین والدنیا ضرتان لا تجمعان۔ دین و دُنیا سوکنیں ہیں جو یکجا نہیں رہ سکتیں۔

میں نے اسے ممکن خیال کر لیا تھا اس لئے یہ تجربہ کرنا چاہا تھا اور اسی لئے مکہ سے یہاں آیا تھا لیکن تجربہ و امتحان نے ثابت کر دیا کہ یہ دونوں سوکنیں جمع نہیں ہوں گی میرے آنے کا مقصد پورا ہو چکا ہے اس لئے اب بیت اللہ کا قصد اور اس کے جوار میں عمر گزارنا ضروری ہو گیا ہے۔ یہاں میری نیابت کے لیے عبدالصمد موجود ہیں، اللہ نے انہیں رشد و ہدایت کی توفیق بھی بخشی ہے اور ان میں دعا کی اہلیت بھی ہے۔ تم لوگ ان سے دعا کرانا۔ میں تم کو انابت الی اللہ اور سارے معاملات میں اسی کی جانب رجوع ہونے کی وصیت کرتا ہوں، قانونِ شریعت کو نافذ کرنے اور اربابِ شریعت کا اعزاز کرنے اور صلحا کی صحبت

---

[1] مؤرخ الغی نے شیخ کے طرزِ عمل اور اس کی وجہ سے کاروبارِ مملکت میں تعطل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ شیخین (حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ) کے اصول طریقہ کو ایسے زمانہ میں رائج کرنا چاہتے تھے جو شیخین کے زمانہ کی طرح نہ تھا نیز جن لوگوں سے ان کا سابقہ تھا وہ بھی شیخین کے دور کے لوگوں کی طرح نہ تھے۔ (ظفر الوالہ ج ۱ ص ۲۱۶)

Marfat.com

اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہوں۔

اس کے بعد رخصت ہو کر اور الوداعی سلام کر کے کھوکہ کے بندرگاہ گئے اور وہاں سے مکہ چلے آئے۔

(ظفر الوالہ ج ا ص ۳۱۶ تا ۳۱۹)

غیرت وخودداری اور عدم مداہنت:

سلاطین وامراء سے ربط وتعلق کے باوجود شیخ نہ ان کی بیجا رعایت اور نامناسب لحاظ کرتے تھے اور نہ ان کی وجہ سے دین و شریعت کے معاملہ میں کوئی مداہنت کرتے تھے بلکہ ان کے غیر شرعی اعمال، منکرات اور غیر مسنون لباس پر نکیر اور ناگواری بھی ظاہر کرتے تھے جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

شیخ میں بڑی غیرت وخودداری اور حد درجہ استغنا و بے نیازی تھی اس لئے امرا کے یہاں جانے سے گریز کرتے مگر وہ خود حصول برکت کے لئے ان کی خدمت میں آتے، ایک دفعہ گجرات کے ایک وزیر نے انہیں برکت کے لئے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی، فرمایا کہ ہمیں اس سے معاف رکھو، ہم یہیں سے تمہارے لئے برکت کی دعا کریں گے مگر جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو ارشاد ہوا کہ تین شرطیں منظور ہوں تو میں چلنے کیلئے تیار ہوں:

1. میں جہاں چاہوں گا بیٹھوں گا، مخصوص اور نمایاں جگہ بیٹھنے کی فرمائش نہ کی جائے۔
2. کسی خاص چیز کو کھانے کیلئے مجبور نہ کیا جائے، ہمیں جو پسند ہوگا وہی کھائیں گے۔
3. جب میرا جی چاہے گا اٹھ کر چلا آؤں گا، مزید رکنے کے لئے اصرار نہ کیا جائے۔

اس نے یہ تینوں شرطیں منظور کرلیں تو فرمایا کہ ان شاء اللہ کل آؤں گا۔ چنانچہ دوسرے روز ایک تھیلے میں اپنے یہاں کے نان پارے لے کر ان کے گھر تشریف لے گئے اور دروازے کے قریب بیٹھ گئے، اس نے شاہی اہتمام کیا تھا اور پُرتکلف فرش بچھائے تھے، اس لئے وسط میں نمایاں جگہ بیٹھنے کے لئے اصرار کیا، فرمایا میں نے تو پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ جہاں چاہوں گا بیٹھوں گا، وزیر چپ ہو گیا، اس نے انواع واقسام کے کھانے پکوائے تھے، مگر شیخ نے انہیں تناول فرمانے کے بجائے اپنے تھیلے سے نان پارے نکالے اور انہی کو کھانا شروع کیا، اس نے پھر اصرار کیا کہ فلاں کھانا چکھ لیں فرمایا میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ جو چاہوں گا وہی کھاؤں گا، کسی چیز کے کھانے کے لئے مجھے مجبور نہ کیا جائے گا، اس کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے اور رخصت ہو کر چلے آئے اور کہا کہ یہ بھی پہلے ہی طے ہو چکا ہے کہ جب چاہوں گا چلا آؤں گا۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۶)

وفات:

۲، جمادی الاولیٰ ۹۷۵ھ کو منگل کے دن طلوع سحر کے وقت مکہ معظمہ میں وفات پائی۔ اس وقت عمر تقریباً ۹۰ برس کی تھی اور معلاۃ میں ایک پہاڑ کے دامن میں حضرت فضیل بن عیاضؒ کی قبر کے بالمقابل دفن ہوئے دونوں قبروں کے درمیان ایک عام شاہراہ تھی اور یہ جگہ ناظر الجیش کہلاتی تھی۔ (النور السافر ص ۳۱۵)

وفات اور مرض الموت کے زمانے کے متعدد خوارق بیان کیے جاتے ہیں، یہاں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے، شاہ عبدالحق

Marfat.com

صاحب تحریر فرماتے ہیں:

مکہ میں مردے کو کسی ولی یا صالح بزرگ کی قبر میں دفن کرنے کا دستور تھا چنانچہ امام عبداللہ یافعی حضرت فضیل بن عیاض کی قبر میں مدفون ہیں، شیخ کی وفات کے بعد یا چودہ برس بعد ان کے بھتیجے کے لڑکے شیخ احمد کا انتقال ہوا تو انہیں شیخ کی قبر میں دفن کیے جانے کی تجویز کی گئی، اس غرض سے ان کی قبر کھودی گئی تو جسم مبارک کفن میں اپنی اصلی خشک حالت میں جوں کا توں موجود تھا۔ حالانکہ مکہ کی زمین کی خصوصیت یہ ہے کہ تین یا چار مہینے میں مردہ خالی ہو جاتا ہے اور اس کے جسم کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔" (اخبار الاخیار ص ۲۵۰)

تصنیفات:

شیخ علی متقی کا بیشتر وقت درس و تدریس اور لوگوں کی اصلاح و تربیت میں بسر ہوتا تھا اس کے علاوہ تصنیف و تالیف سے بھی انہوں نے مدۃ العمر سروکار رکھا، حدیث اور تصوف سے ان کو خاص مناسبت تھی، ان کی اکثر کتابوں کا تعلق انہی فنون سے ہے۔

شاہ عبدالحق صاحب تصنیف و تالیف میں ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان کی تصنیفات دیکھ کر عقل حیران اور ششدر ہو جاتی ہے اور اس بات پر یقین محکم ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کی خاص برکت اور توفیق کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی بعض کتابیں سالکانِ طریقت اور طالبانِ آخرت کے لئے بیش قیمت سرمایہ اور ان کے حال کے لئے معین و مددگار ہیں۔" (ایضاً ص ۲۴۲)

شیخ کی تصنیفات کی تعداد سو ۱۰۰ سے متجاوز بتائی جاتی ہے مگر اب اکثر ناپید اور معدوم ہیں جن کتابوں کا علم ہو سکا ہے ذیل میں ان کے بارے میں دستیاب معلومات پیش کیے جاتے ہیں۔

☆ البرھان فی علامات المھدی آخر الزمان: اس میں حضرت مہدی موعود کے متعلق حدیثیں جمع کی گئی ہیں، علامہ سیوطی نے اس موضوع پر ایک "کتاب العرف الوردی فی اخبار المہدی" لکھی تھی جو امام ابو نعیم کی کتاب الاربعین کا خلاصہ ہے، شیخ علی متقی کی یہ تصنیف سیوطی کی کتاب کی تلخیص اور اس کی از سر نو تہذیب و تدوین ہے جس میں کچھ نیا مواد بھی بڑھایا ہے، اور اضافہ میں سیوطی کی جمع الجوامع اور عقد الدرر فی اخبار المہدی المنتظر سے امام مہدی کے بارے میں روایتیں نقل کی ہیں جن کا مرجع اور مخرج مقرر کیا ہے۔

شیخ علی متقی نے یہ کتاب اس زمانہ میں لکھی تھی جب ہندوستان میں محمد جونپوری نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا تھا، اس کی وجہ سے عرب و ہند میں یہ مسئلہ معرکۃ آراء بنا ہوا تھا، شیخ مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:

"محمد جونپوری یقیناً مہدی نہیں ہیں، وہ ایک خدا رسیدہ بزرگ اور ولی ہو سکتے ہیں، بعض اوقات ولی سے بھی غلطی ہو سکتی ہے، معصوم صرف پیغمبر ہوتے ہیں۔"

یہ کتاب مندرجہ ذیل تیرہ فصلوں میں منقسم ہے:

۱: معجزات حضرت مہدی۔ ۲: ان کا سلسلۂ نسب۔ ۳: شکل و صورت۔ ۴: کن حالات میں حضرت مہدی کا ظہور ہوگا۔ ۵: علامات۔ ۶: کس طرح ان کی اطاعت و بیعت کی جائے گی۔ ۷: ان کے انصار۔ ۸: فتوحات۔ ۹: حضرت عیسیٰ سے

Marfat.com

ملاقات۔ ۱۰: مدت قیام۔ ۱۱: موت۔ ۱۲: ان لوگوں کا ذکر جنھوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ ۱۳: علمائے مکہ و مدینہ کا فتویٰ۔

علامہ سیوطی کی کتاب ترتیب ابواب وغیرہ سے معرا تھی، شیخ علی نے اس کو ابواب و تراجم پر مرتب کیا ہے اس نئی تہذیب و تدوین کے بعد کتاب نے دوسرا جامہ پہن لیا ہے۔ (معارف دسمبر ۷۴ء ص ۴۲۸)

ریاست رام پور کے کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا، (فہرست کتب عربیہ ریاست رام پور جلد دوم ص ۱۳۹) جو کرم خوردہ تھا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے اسے ۹۲۴ھ میں مرتب کیا تھا۔

۲: تبیین الطرق الی اللہ تعالیٰ:

مصنف کے بیان کے مطابق یہ ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ (النور السافر ص ۳۱۹) شاہ عبدالحق صاحب محدث فرماتے ہیں کہ اس کی تصنیف کے وقت انھیں غیب سے الہام ہوتا تھا۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۲) حافظ محمود خان شیرانی کے کتب خانہ میں اس کا ایک مخطوطہ موجود ہے۔ (مخطوطات شیرانی ج ۱ ص ۲۰۶)

۳: جوامع الکلم فی المواعظ والحکم:

یہ سلف صالحین کے پند و نصائح اور مواعظ و حکم پر مشتمل ایک مفید رسالہ ہے، اس میں درج حکم و مواعظ کی تعداد تین ساڑھے تین ہزار بتائی جاتی ہے، اس کے قلمی نسخے مندرجہ ذیل کتب خانوں میں موجود ہیں:

بانکی پور پٹنہ میں اس کے تین نسخے ہیں، رام پور کے کتب خانہ میں دو قلمی نسخے ہیں جس میں ایک مصنف کے قریب العہد ۹۸۷ھ کا اور دوسرا ۱۲۶۱ھ کا ہے۔ اول الذکر ۳۵۶ صفحے کا اور موخر الذکر ۳۸۰ صفحے کا ہے۔ (فہرست کتب عربیہ ریاست رام پور جلد دوم ص ۳۴۴) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی سبحان اللہ اور ینٹل لائبریری میں ۱۷۵ اوراق کا ایک نسخہ ہے جو ۱۰۳۹ھ کا لکھا ہوا ہے۔ حیدر آباد اور پشاور کے کتب خانوں میں بھی اس کے قلمی نسخے موجود ہیں، (محبوب الالباب ص ۱۴۷ و فہرست لباب المعارف العلمیہ ص ۱۸۲) اس کی ابتدا مندرجہ ذیل عبارت سے ہوتی ہے۔

الحمد للہ الذی نور قلوب العارفین فاقتبسوا من لوامع کلامہ۔ (محبوب الالباب ص ۱۴۸)

۴: غایۃ الکمال فی بیان افضل الاعمال:

مصنف کے بیان کے مطابق یہ ان کی آخری تصنیف ہے، انہوں نے اس کی اور اپنی پہلی تصنیف تبیین الطرق کے متعلق خاص طور پر یہ تلقین و تاکید کی ہے کہ "جن طالبین کو دونوں میں سے کوئی ایک رسالہ میسر آجائے تو انہیں دوسرے کو بھی حاصل کر کے ان کا ساتھ ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے"۔ (النور السافر ص ۳۱۹) اس سے اور کتاب کے نام سے رسالہ کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

۵: مجموعہ حکم کبیر:

یہ تصوف کی اہم اور معرکۃ آراء کتاب ہے جس پر شیخ علی متقی کو خود فخر تھا۔ شاہ عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:

Marfat.com

''یہ بڑی مفید اور نافع کتاب ہے، جس میں تصوف کے بارہ میں اس فن کی کتابوں میں جس قدر مواد و مسائل موجود تھے ان کا خلاصہ تحریر کر دیا گیا ہے، خود شیخ اپنے دوستوں سے فرماتے تھے کہ تصوف کا جو مشکل مسئلہ بھی تمہارے سامنے آئے اس کا اس میں جواب ڈھونڈ لو اور تم لوگوں سے جو مشکل مسائل دریافت کیے جائیں ان کا جواب بھی اس میں دیکھ لو۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۲) اس سے کتاب کی اہمیت، قدر و قیمت اور جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۶: مختصر النہایہ فی اللغۃ:

علامہ ابن اثیر جزری نے حدیث کے مشکل الفاظ و لغات کی تحقیق میں النہایہ فی غریب الحدیث کے نام سے بڑی مفید، اہم اور عمدہ کتاب لکھی تھی، بعض اصحاب علم نے اس کے مختصرات تحریر کیے تھے، شیخ علی متقی نے بھی اس کا مختصر لکھا تھا۔ (کشف الظنون جلد ۲ ص ۲۶)

۷: الوسلۃ الفاخرہ فی سلطنۃ الدنیا والآخرۃ:

اس میں سلاطین اور والیان ملک کے واسطے نصائح اور آداب مملکت بہت خوبی سے تحریر کیے گئے ہیں، رسالہ مختصر مگر مفید ہے، رام پور کے کتب خانہ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے، ابتدا کی عبارت ملاحظہ ہو:

''الحمد للہ رب العالمین ـــــ اما بعد هذه رسالة فی نصائح الملوک۔''

(فہرست کتب جلد اول ص ۳۷۷ و جلد دوم ص ۲۴۰)

مولانا حکیم سید عبدالحیٔ رائے بریلوی نے ان کی مندرجہ ذیل تین کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۴۴) ان میں اوّل الذکر فارسی میں ہے۔

۸: البرہان الجلی فی معرفۃ الولی،

۹: الحج الاتم فی ترتیب الحکم،

۱۰: رسالہ فی ابطال دعوئی السید محمد بن یوسف الجونپوری،

الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند میں مولانا نے ردمہدویت کے ضمن میں شیخ علی متقی کی بھی ایک تصنیف کا ذکر کیا ہے، غالباً یہ وہی رسالہ ہے اور اس میں مہدویت کی تردید کی ہوگی۔

ان کی چند اور کتابوں کے نام بھی بروکلمن وغیرہ نے تحریر کیے ہیں۔

۱۱: شؤن المتنزلات (تفسیر)

۱۲: الفصول شرح جامع الاصول (حدیث) اس کا قلمی نسخہ بانکی پور میں ہے۔ (برہان فروری ۵۴ء ص ۸۴)

۱۳: شمائل النبیؐ (حدیث) اس کا قلمی نسخہ علی گڑھ میں ہے۔ (برہان فروری ۵۴ء ص ۸۴)

۱۴: العنوان فی سلوک النسوان (تصوف)

۱۵: المواہب العلیہ فی الجمع بین الحکم القرآنیہ والحدیثیہ (تصوف)۔

Marfat.com

۱۶: تبویب الحکم العطائیہ (تصوف)

۱۷: زادالطالبین (تصوف)

۱۸: اسرارالعارفین (تصوف)

۱۹: نعم معیارالقیاس لمعرفۃ مراتب الناس

۲۰: فتح الجواد (تصوف)

۲۱: نظم الدرر (تصوف)

۲۲: ہدایۃ ربی عندفقد المربی

۲۳: خلاصۃ الحقائق فی الحکم الدقائق

۲۴: عمدۃ الوسائل

فن حدیث میں ان کی مندرجہ ذیل کتابیں متداول ہیں، یہ سب دراصل علامہ سیوطی کی کتابوں کی ترتیب وتہذیب ہیں۔

۲۵: کنزالعمال: علامہ سیوطی نے احادیث نبویؐ کے استیعاب کی غرض سے جمع الجوامع کے نام سے ایک ضخیم مجموعہ مرتب کیا تھا جو صحاح ستہ اور مسانید عشرہ پر مشتمل ہے یہی مجموعہ جامع کبیر کے نام سے بھی مشہور اور دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں حدیث کے اصل الفاظ نقل کیے ہیں اور اس کے ماخذ اور راوی کے نام کی نشاندہی کی ہے، اسے لغوی ترتیب کے موافق حروف معجم پر مرتب کیا تھا اور ایک باب میں ایک سے لے کر دس یا اس سے بھی زیادہ حدیثیں نقل کی ہیں، دوسرے حصہ میں یا تو محض فعلی حدیثیں درج کی ہیں یا قولی اور فعلی دونوں طرح کی حدیثیں درج کی ہے، یہ حصہ صحابہ کے مسانید پر مرتب کیا گیا ہے اور پہلے اس میں عشرہ مبشرہ کی حدیثیں ذکر کی ہیں، پھر باقی صحابہ کرم کی حدیثیں ناموں اور کنیتوں وغیرہ کے لحاظ سے دی ہیں اور آخر میں مرسل حدیثیں نقل کی ہیں۔

علامہ سیوطی نے جامع صغیر میں اس کے متعلق تحریر کیا ہے کہ میں نے اس میں تمام حدیثیں جمع کی ہیں، لیکن اہل علم نے ان کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کیا ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ تمام احادیث کا استقصاء واستیعاب سخت مشکل ہے، خود جامع صغیر میں ایسی حدیثیں ہیں جو اس میں نہیں آسکی ہیں اسی لئے بعض لوگوں نے یہ توجیہ کی ہے کہ مصنف اپنے ارادہ کے مطابق اسے مکمل نہ کرسکے ہوں اور ان کی وفات ہوگئی ہو تاہم یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے یہ مجموعہ بڑی محنت شاقہ سے تیار کیا ہے اور اس کے لئے انہوں نے بیشمار کتب احادیث کا مطالعہ کیا تھا۔

شیخ علی متقی کی عظیم الشان کتاب ''کنزالعمال'' دراصل علامہ سیوطی کی ''جمع الجوامع'' (جامع کبیر) کی ترتیب وتنقیح اور ماخذ سے نیز جامع صغیر سے ماخذ ہے، ان کا بیان ہے کہ میں نے متعدد ائمہ فن کی کتابیں دیکھیں، لیکن ان میں سے کسی کی کتاب کو بھی سیوطی کی جمع الجوامع سے بہتر اور جامع نہیں پایا، انہوں نے صحاح ستہ اور دوسری کتابوں کی حدیثیں بہت عمدہ طریقہ پر جمع کی ہیں اور ان میں گوناگوں فوائد کا اضافہ بھی کیا ہے، مگر اسکے باوجود وہ کچھ بڑے اور اہم فوائد سے خالی رہ گئی تھی، جیسے۔

Marfat.com

(۱) اگر کسی شخص کو کس حدیث کی تلاش ہو اور وہ اس کے مفہوم سے بھی واقف ہو لیکن قولی حدیث کا سرا معلوم نہ ہو اور فعلی حدیث کے راوی کا علم نہ ہو تو اس وقت تک اس کے لئے اس کی تلاش بہت دشوار اور مشکل ہے۔

(۲) اگر کسی شخص کو بیوع یا نماز یا زکوٰۃ وغیرہ ابواب کی تمام حدیثوں کا احاطہ مقصود ہو اور وہ ان سے مطلع ہونا چاہے تو ایسا اس کے لئے اسی وقت ممکن ہوگا جب وہ پوری کتاب کا ایک ایک ورق الٹے، ظاہر ہے یہ کس قدر دشوار، مشکل اور وقت طلب امر ہے۔

(۳) ابواب، تراجم اور فصول وغیرہ کی حیثیت احادیث کی شرح جیسی ہوتی ہے، کیونکہ بعض حدیثیں مجمل اور بعض مفصل ہوتی ہیں، بعض میں حدیث کا قصہ مذکور ہوتا ہے اور بعض میں اس کا ذکر نہیں ہوتا چنانچہ جب میں نے علامہ سیوطی کی کتاب کی جمع و تبویب کی تو مفصل سے مجمل کی توضیح ہوگئی اور جن حدیثوں میں قصہ و سبب کا ذکر تھا انہوں نے ان حدیثوں کی تبیین و وضاحت کردی جن میں قصہ مذکور نہیں تھا۔

انہی امور کو مدنظر رکھ کر میں نے جمع الجوامع کو مرتب و مبوب کیا تا کہ ان فوائد کو بھی ان میں قلمبند کردوں جن سے وہ خالی رہ گئی تھی۔ میں نے اپنے مجموعہ کا نام کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال رکھا ہے، جو چار جلدوں پر مشتمل ایک بہتر اور کارآمد مجموعہ ہے، اور اللہ کا شکر ہے کہ یہ لوگوں میں بہت مشہور و مقبول بھی ہوا۔ (منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد جلد اول ص ۳ تا ۵)

شیخ علی متقی نے کنز العمال کو فقہی ابواب پر جامع الاصول (ابن کثیر) کے انداز و اسلوب پر اس قدر خوش اسلوبی سے مرتب کیا ہے کہ یہ احادیث نبوی کا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) بن گئی ہے۔ ان کی ترتیب و تنقیح کی وجہ سے سیوطی کی کتاب کے مقابلہ میں اس کا فائدہ بھی دو چند ہو گیا ہے اور اس سے استفادہ بھی آسان ہو گیا ہے، اسی بنا پر شیخ ابوالحسن بکری فرماتے تھے کہ:

للسیوطی منة علی العالمین و للمتقی منة علیه۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۲)

سیوطی نے (جامع کبیر مرتب کرکے) دنیا والوں پر احسان کیا تھا اور شیخ علی نے کنز العمال ترتیب دیکر خود سیوطی پر احسان کیا۔

شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ:

"کتاب دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ نے اتنا عظیم الشان کام کیسے حیرت انگیز طریقہ پر انجام دیا ہے۔"

ترتیب و تبویب میں جامعیت و افادیت کو مدنظر رکھنے کے باوجود انھوں نے بڑی احتیاط اور دیانت داری سے کام لیا ہے یہاں تک کہ علامہ سیوطی کی کتاب کے خطبہ اور دیباچہ کو بھی انہوں نے بعینہ باقی و برقرار رکھا ہے، اور اس میں اپنی طرف سے کوئی کمی اور بیشی نہیں کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"جو یہ کتاب حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے اسے گویا مرتب و مبوب جمع الجوامع حاصل ہوگئی، اس کے علاوہ اس میں بکثرت ایسی حدیثیں بھی ملیں گی جو جمع الجوامع میں نہیں ہیں، کیونکہ مصنف نے خود جامع صغیر اور اس کے ذیل میں ایسی حدیثیں نقل کی ہیں جو اس میں درج نہیں ہیں اب میں وہ دیباچہ نقل کرتا ہوں جو مصنف نے جامع صغیر اس کے تکملہ اور جامع کبیر کے شروع میں لکھے تھے، تا کہ میں نہ کسی چیز کو ترک کردوں اور نہ کسی میں ردوبدل کروں۔" (کشف الظنون)

فن حدیث میں شیخ علی متقی کی جن تصنیفات کا ذکر آگے آرہا ہے دراصل کنز العمال ان سب کا مجموعہ ہے مصنف کا خود

Marfat.com

بیان ہے کہ:

پھر میں نے اپنی دونوں کتابوں "غایۃ العمال فی سنن الاقوال" اور "مستدرک الاقوال بسنن الافعال" اور ایک مجموعہ میں اکٹھا کر دیا مثلاً کتاب الایمان کو پہلے "غایۃ العمال" سے لکھا، پھر اسے مستدرک الاقوال سے بھی لکھا اور یہی روش کتاب کے آخر تک قائم اور باقی رکھی ہے اور اس نئے مجموعہ کا نام میں نے "کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال" رکھا ہے۔ (منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد جلد اول ص ۵)

وہ کنز العمال کی تحریر و تسوید سے ۹۵۷ھ میں فارغ ہوئے اور یہ بڑی تقطیع کی آٹھ جلدوں میں حیدر آباد کے دائرۃ المعارف النظامیہ سے ۱۳۱۲ء میں مولانا وحید الزماں نواب وقار نواز جنگ کی تصحیح کی بعد پہلی دفعہ شائع ہوئی تھی، اور اب دوبارہ بھی وہیں سے چھوٹی تقطیع میں اس کے اجزاء شائع ہو رہے ہیں، اس ایڈیشن کی ۱۳ تا ۱۸ جلدیں دار المصنفین کے کتب خانہ میں آ گئی ہیں۔

(۲۶) منتخب کنز العمال: شیخ علی متقی نے خود اپنی کتاب کنز العمال کا ایک خلاصہ مرتب کیا تھا، جس کا انہوں نے منتخب "کنز العمال" نام رکھا، یہ منتخب بھی حدیث کا ایک مفید، عمدہ اور پاکیزہ مجموعہ ہے گو اس میں زوائد اور مکررات حذف کر دیئے گئے ہیں۔ (اخبار الاخیار ص ۲۴۲) تاہم اس میں بھی ہر باب کی تمام حدیثیں آ گئی ہیں۔ (محبوب الالباب ص ۶۰۱)

انہوں نے منتخب کنز العمال مرتب کرنے کی یہ وجہ تحریر کی ہے:

"کنز العمال کی ترتیب کے وقت مجھے اندازہ ہوا کہ سیوطی کی جامع کبیر کی حدیثیں حروف و مسانید پر مرتب کیے جانے کی وجہ سے بکثرت مکرر ہو گئی ہیں اور قولی و فعلی حدیثوں کے اضافے ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط بھی ہو گئے ہیں اس کی وجہ سے حدیث کے طالب علموں کو مکررات اور اضافوں کا پتہ نہیں چلتا گو بسط و تفصیل کے جویا لوگوں کے لئے یہ زبانی اور تکرار فائدہ سے خالی نہیں ہے تاہم عام لوگوں کی کم ہمتی وغیرہ کی وجہ سے میں نے ارادہ کیا کہ ان کو اس طرح حذف کر دوں کہ کوئی اہم بنیادی اور معنی خیز بات ترک نہ ہونے پائے چنانچہ اللہ تعالیٰ سے استخارہ کے بعد جب میں نے انتخاب و تلخیص کا کام شروع کیا تو تقریباً پندرہ ہزار حدیثیں حذف ہو گئیں جو اصل کتاب کا ایک تہائی حصہ تھیں۔

حذف و اختصار میں یہ امر مدنظر رہا ہے کہ جس قولی حدیث کو مصنف نے کسی سبب یا مراجعت وغیرہ کے خیال سے فعلی حدیثوں میں ذکر کیا ہے، تو میں نے اس کو قسم اقوال کے بجائے صرف قسم افعال میں نقل کیا ہے، لیکن ایسا اسی وقت کیا ہے جب حدیث کا معنی و مفہوم اسی سبب یا مراجعت وغیرہ پر موقوف رہا ہو، اور اگر معنی اس پر موقوف نہیں تھا، تو میں نے اسے قسم الافعال میں اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ اس کے لفظ و معنی قسم اقوال میں مذکور ہو چکے ہیں اور اگر دو حدیثیں معنی و مفہوم کے لحاظ مجھے برابر یکساں ملی ہیں تو میں نے ان میں سے صرف مختصر کو لے لیا ہے اور اگر وہ اختصار میں بھی یکساں ہیں تو میں نے ان میں سے زیادہ صحیح حدیث کو نقل کرنا پسند کیا ہے۔

بعض جگہ مکرر اور معنی حدیثیں اس لئے نقل کی گئی ہیں، کہ اس باب میں حدیثوں کی تعداد کم تھی یا لوگوں کو ان حدیثوں کی زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔

Marfat.com

اس طرز پر انتخاب کی وجہ سے یہ مجموعہ اصل کتاب یعنی کنز العمال سے بھی فائق اور بہتر ہوگیا ہے، کیونکہ اس میں تکرار باقی نہیں رہی اور قولی و فعلی حدیثیں ساتھ ساتھ جمع ہوگئی ہیں۔'' (منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد بن حنبل جلد اول صفحات ۶ و ۷)

صاحب کشف الظنون کو بھی منتخب کی اس خوبی کا اعتراف ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ''شیخ علی متقی نے کنز العمال کا جو انتخاب کیا تھا وہ خود ایک جامع بہتر اور کار آمد چیز ہے۔'' (کشف الظنون جلد ا ص ۳۹۹)

منتخب کنز العمال مسند احمد بن حنبل کے حواشی پر مطبع میمنہ مصر سے شائع ہوگیا ہے اس کا ایک قلمی نسخہ رام پور کے کتب خانہ میں چار جلدوں میں موجود ہے۔ (فہرست کتب عربیہ جلد ا ص ۱۱۸)

(۲۷) منہج العمال فی سنن الاقوال: علامہ سیوطی نے جامع کبیر کی طرح جامع صغیر کے نام سے بھی احادیث کا ایک مجموعہ ایک جلد میں مرتب کیا تھا جو دراصل جامع کبیر کا ملخص تھا اور پھر خود ہی اس کا اضافہ و تکملہ بھی ایک جلد میں لکھا، جس کے متعلق وہ یہ تصریح کرتے ہیں کہ:

میں نے اس میں آنحضرت ﷺ کے ہزاروں کلمات اور پند و حکمت پر مشتمل باتیں جمع کی ہیں، اور ان کی تخریج میں غیر معمولی کدوکاوش کی ہے مگر اختصار کی وجہ سے چھلکے چھوڑ کر صرف مغز ہی لیا ہے اور اس کو وضعی اور جعلی حدیثوں سے بھی محفوظ رکھا ہے، اس اعتبار سے یہ کتاب اس نوع کی دوسری کتابوں سے بہت بڑھ گئی ہے اور یہ گوناگوں فنی و حدیثی فوائد پر مشتمل ہے، اسے میں نے طلبہ کی آسانی کے خیال سے حدیث کے ابتدائی الفاظ کے لحاظ سے حروف معجم کی ترتیب پر مرتب کیا ہے اور اس کا نام الجامع الصغیر اس لئے رکھا ہے کہ یہ جمع الجوامع (جامع کبیر) کا مقتضب ہے۔''

(منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ج ا ص ۴ و ۵ و کشف الظنون ج ا ص ۶۷۳ و مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۳۷)

شیخ علی متقی نے منہج العمال میں جامع صغیر اور اسکے زوائد کو ابواب و فصول پر اچھے طرز پر مرتب کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ:

''جامع صغیر اور اس کا ضمیمہ و تکملہ چونکہ قولی حدیثوں کا عمدہ، کار آمد اور جامع ذخیرہ ہے، اس لئے مجھے اس کی حدیثوں کو ابواب و فصول پر مرتب کرنے کا خیال ہوا، اس کی ترتیب بھی حروف تہجی کے مطابق جامع الاصول کے اسلوب پر کی ہے اور کنز العمال کی طرح اس میں بھی مکمل احتیاط و دیانت ملحوظ رکھی ہے چنانچہ اصل اور ضمیمہ دونوں کے دیباچے اور رموز بعینہٖ اسی طرح ذکر کیے ہیں جس طرح سیوطی نے املا کرائے ہیں، غرض حتی الامکان اس کی پوری کوشش کی ہے کہ دونوں کی کوئی چیز چھوٹنے نہ پائے۔'' (اتحاف النبلاء ص ۱۶۲)

اہل نظر نے شیخ علی متقی کے اس کارنامے کی بھی بڑی تحسین کی ہے، ان کا خیال ہے کہ ''یہ کتاب اتباع سنت کے لئے نہایت عمدہ راہنما ہے۔ (لباب المعارف العلمیہ پشاور ص ۶۵)

منہج العمال کا ایک قلمی نسخہ ۱۲۴۲ھ کا لکھا ہوا ۹۰۶ صفحے کا رام پور کی رضا لائبریری میں موجود ہے جو ابتدا سے باب النذر تک ہے اور حدیثوں کی تعداد ۱۵۷۵۸ ہے۔ (فہرست کتب عربیہ رام پور ج ا ص ۱۱۹)

اس کے بعض حواشی بھی لکھے گئے ہیں، رام پور کے کتب خانہ میں بھی اس کا ایک قلمی حاشیہ موجود ہے جو ۳۸۸ صفحہ کا ہے مگر اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں۔ یہ نسخہ کسی قدر کرم خوردہ ہے، اس میں قولہ سرخی سے اور باقی تمام کتاب سیاہی سے لکھی

Marfat.com

ہوئی ہے منہج کی عبارت قولہ کے بعد نقل کی گئی ہے، محشی نے حمد ونعت کے بعد مشکل مقامات کو حل اور مجمل اقوال کی تشریح کی ہے، رام پور کی فہرست کتب عربیہ میں اس کے آغاز واختتام کی عبارتیں بھی درج کی ہیں۔

(فہرست کتب عربیہ رام پور جلد دوم ص ۱۹۷)

مولانا نجیب بن قاسم چندزاوتی احمد آبادی نے بھی اس کا حاشیہ لکھا تھا جس کی اسکے مقدمہ میں صراحت کی ہے کہ ''میں ۲۹، رمضان المبارک ۹۵۶ھ کو احمد آباد میں اس کی تحریر وکتابت سے فارغ ہوا'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حواشی مصنف کی زندگی میں لکھے گئے تھے کچھ بعید نہیں کہ وہ مصنف کے شاگرد بھی ہوں۔

منہج العمال کا قلمی نسخہ جس پر یہ حواشی ہیں جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں ہے، یہ نسخہ محشی کے بھانجے قاضی عبداللہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس کا سن کتابت ۹۸۶ھ ہے۔

(رسالہ برہان فروری ۵۴ء مضمون ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات از مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی)

۲۸۔ الاکمال: اس میں جمع الجوامع (جامع کبیر) کی بقیہ قولی حدیثوں کو مبوب کیا ہے اسی لئے اس کا نام الاکمال لمنہج العمال بھی ہے۔

(منتخب کنز العمال برحاشیہ احمد ج ا ص ۹ فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ا ص ۴۳۳)

۲۹۔ غایۃ العمال فی سنن الاقوال: یہ منہج العمال اور الاکمال دونوں کا مجموعہ ہے۔ (کشف الظنون ج ا ص ۳۹۹)

۳۰۔ مستدرک الاقوال بسنن الافعال: اس میں جامع کبیر کی فعلی حدیثوں (قسم الافعال) کی ترتیب وتبویب کی گئی ہے۔

(ایضاً)

Marfat.com

شیخ محمد بن طاہر

(متوفی ۹۸۶ھ ۱۵۷۸ء)

نام:

محمد نام اور جمال الدین یا مجد الدین لقب تھا۔ (النور السافر ص ۳۶۱ و شذرات الذہب ج ۸ ص ۴۱۰ والرسالہ المستطرفہ ص ۱۲۴)
تذکروں میں ان کا نام محمد بن طاہر اور محمد طاہر دو طرح سے لکھا ہے، حضرت شاہ عبدالحق دہلویؒ جو شیخ محمد بن طاہر کے ہمعصر ہیں اور بعض دوسرے تذکرہ نگاروں نے ان کا نام محمد طاہر لکھا ہے لیکن ان کے دوسرے معاصر علامہ محمد غوثی شطاری آزاد بلگرامی اور کئی دوسرے ارباب تذکرہ نے محمد بن طاہر لکھا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ صرف طاہر کسی تذکرہ نگار نے نہیں لکھا ہے اس سے اس قدر تو واضح ہو ہی جاتا ہے کہ ان کا نام طاہر نہیں تھا، اب جہاں تک محمد طاہر کے مرکب نام کا سوال ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ واقعتاً مرکب نام ہے کیونکہ ناموں کے ساتھ تبرکاً محمد لکھنے کا جو رواج اب ہو گیا ہے وہ پہلے یا کم از کم دسویں صدی ہجری تک نہیں تھا، پہلے محمد اور احمد وغیرہ خود مستقل نام ہوتے تھے اس بنا پر شیخ کا اصلی نام محمد ہی ہے اور طاہر ان کے باپ کا نام ہے۔ اس مسئلہ پر مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم نے اچھی طرح بحث کی ہے ذیل میں اس کا خلاصہ ملاحظہ ہو۔

(۱) عرب قوم میں مرکب نام کا دستور نہیں تھا اور ہوتا بھی تھا تو عبدالوہاب عبداللہ اور عبدالرشید کے طرز کا، اور اب تک بوہروں میں اس کا رواج نہیں ہے، البتہ ہندوستانی مسلمان اپنے ناموں کے ساتھ محمد کا لفظ برکت کے خیال سے لگا دیتے ہیں بخلاف اسکے بوہروں میں اگر کسی کے نام کے ساتھ محمد اضافہ کر دیا جائے تو اصل نام تو اس کے باپ کا سمجھا جائے گا اور محمد جو تبرکاً لگایا گیا ہے خود اسی کا نام سمجھا جائے گا یعنی جیسے محمد طاہر کہنے پر محمد ان کا اور طاہر ان کے باپ کا نام متصور ہوگا، اس لئے جن تذکرہ نگاروں نے ان کا نام محمد لکھا ہے اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ محمد طاہر ان کا مرکب نام ہے بلکہ محمد ان کا اور طاہر ان کے والد کا نام ہوا۔

(۲) تاریخ فرشتہ میں محمد بختیار خلجی کا نام موجود ہے جس نے بہار و بنگال کو فتح کیا تھا حالانکہ اس کا صحیح نام محمد بن بختیار ہے۔ ٹھیک اسی طرح فاتح سندھ محمد بن قاسم کا صحیح نام محمدؒ بن قاسم ہے مگر عموماً اسے محمد قاسم ہی لکھا جاتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن کو حذف کر کے باپ بیٹوں کا نام لکھنے کا رواج غیر عربوں میں موجود ہے، چنانچہ گجرات میں آج بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ باپ اور بیٹوں کے نام بغیر ابن کے ہوتے ہیں جیسے احمد اسماعیل بوٹا والا، عبداللہ احمد نہنا میاں ولی اللہ وغیرہ۔
(مقدمہ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی ص ۱۱ و ۱۲)

اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ شیخ نے خود اپنی کتابوں میں اپنا نام محمد بن طاہر ہی لکھا ہے۔

Marfat.com

(دیباچہ تذکرۃ الموضوعات ص ۳ دیباچہ قانون الموضوعات ص ۲۳۰)

ان وجوہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا اصل نام محمد تھا اور طاہر ان کے والد بزرگوار کا نام تھا، پس جن لوگوں نے محمد طاہر لکھا ہے اس کی حیثیت محمد قاسم اور محمد بختیار جیسے ناموں کی ہے۔

نسب وقومیت:

عام تذکرہ نگاروں نے ان کا نسب صرف دادا تک لکھا ہے یعنی محمد بن طاہر بن علی، مگر تاریخ گجرات کے مشہور عالم مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم نے ان کا حسب ذیل شجرۂ نسب تحریر کیا ہے جو خود شیخ کے ایک خاندانی بزرگ سے ان کو دستیاب ہوا تھا۔

محمد بن طاہر بن علی بن الیاس بن ابوالنصر داؤد بن ابوعیسیٰ عبدالملک بن ابوالفتح یونس شامی مؤلف جامع القصص ابن عمر شامی صاحب الہدایہ والنہایہ بن عبداللہ بن ابوالعطا حسین مفتی بن ابوالحامد احمد غریب بن ابو قاسم محمد بن ابوالصلاح محمد بن ابوالفیض عبداللہ بن ابوالرضا عبدالرحمٰن بن ابوالبقا قاسم البر محمد عباس بن ابوالنصر محمد طیفور شامی بن ابوالمجد خلف بن ابوالمجد احمد بن ابوالوجود شعیب بن ابوطلحہ بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر صدیق صاحب رسول اللہ۔

(مقدمہ تذکرہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی ص ۱۰ و ۱۱)

اس شجرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نسباً صدیقی تھے اور ان کے آباؤ اجداد کا تعلق عرب سے تھا، اس کے ثبوت میں چند اشعار بھی پیش کیے جاتے ہیں جو انکے پوتے اور ممتاز علم وفقیہ شیخ عبدالقادر بن شیخ ابوبکر (متوفی ۱۱۳۸ھ کے استاد شیخ عبداللہ طرفہ انصاری نے کہے تھے، وہ فرماتے ہیں:

قد کان جدابیک بل ضریحہ ۔۔۔ من اوحد الصلحاء والفضلاً

اعنی محمد بن طاھر من منجی ۔۔۔ الصدیق حققہ بغیر مراء

(اتحاف النبلاء ص ۳۹۸)

ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے پردادا کی قبر کو خدا سیراب کرے وہ یکتائے روزگار علماء وفضلا میں تھے یعنی محمد بن طاہر بلا شک وشبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نسل سے تھے۔

لیکن انہیں عام طور پر ہندنژاد اور بوہرہ قوم کا فرد خیال کیا جاتا ہے، ان کے معاصر شاہ عبدالحق دہلویؒ کا یہی خیال ہے، علامہ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

جمہور کا اتفاق ہے کہ شیخ محمد بن طاہر کا تعلق بوہرہ قوم سے تھا، شیخ عبدالحق دہلوی نے بھی اخبار الاخیار میں اسی کی تصریح کی ہے۔

(مآثر الکرام ج ا ص ۱۹۶)

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ صدیقی کیوں کہلاتے ہیں؟ اس کے جواب میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ ماں کی جانب سے نسباً صدیقی تھے اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ نسبت عقیدہ کے اعتبار سے ہے، کیونکہ فرقہ شیعہ اپنے کو حیدری کہتا تھا، اس کے مقابلہ میں یہ اپنے کو صدیقی کہتے تھے۔ (اتحاف النبلاء ص ۳۹۸، ۳۹۹)

نواب صدیق حسن خاں صاحب نے جمہور کے خیال کو مرجح بتایا ہے اور اس کی خاص وجہ یہ بتائی ہے کہ نسب ماں کی

Marfat.com

طرف سے نہیں چلتا بلکہ باپ کی جانب سے چلتا ہے مگر وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ طرح کے اشعار سے قطعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن طاہر ماں یا باپ کسی ایک جانب سے صدیقی ضرور تھے تاہم ان کے نزدیک صحیح ترین بات یہی ہے کہ وہ بوہرہ تھے۔ حالات الحرمین میں درج ہے کہ شیخ محمد طاہر بوہروں میں سے تھے۔

شیخ محمد بن طاہر نے خود اپنی کتاب تذکرۃ الموضوعات میں اپنے کو ہندی نژاد قرار دیا ہے:

فقد قال اضعف عباد القوی الولی محمد بن طاہر بن علی الفلتنی الهندی مسکنا و نسبا۔

(دیباچہ تذکرۃ الموضوعات ص ۳)

اللہ کے بندوں میں سب سے ضعیف محمد بن طاہر عرض کرتا ہے، جو سکونت اور نسب کے لحاظ سے پٹنی اور ہندی ہے۔

قانون الموضوعات کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں:

فیقول افقر عباد اللہ الغنی محمد بن طاہر بن علی الهندی الفتنی۔ (ایضاً ص ۳۳۰)

غنی اللہ کے بندوں میں زیادہ محتاج محمد بن طاہر بن علی ہندی عرض کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ خود اپنے کو ہندی الاصل اور بوہری قوم کا فرد سمجھتے تھے، آزاد بلگرامی اور بعض دوسرے اہل علم نے ان کو نومسلم ہندوستانی بتایا ہے۔

وکان رحمہ اللہ من البرهرة المتوطنین بگجرات الذین اسلام اسلافهم علی ید الشیخ علی الحیدری الملافون بکنبایت و مضی لا سلامهم نحو سبعمائة سنة۔

(بحوالہ مقدمہ بحار الانوار از مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی ص ب)

شیخ محمد بن طاہرؒ ان بوہروں کی نسل سے تھے جو گجرات میں آباد تھے اور جن کے اسلاف شیخ علی حیدری کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے شیخ حیدری کھمبایت میں دفن ہیں اور بوہرے تقریباً سات سو برس سے مسلمان ہیں۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے شیخ کی نسل و قومیت کے بارہ میں دو مختلف رائیں سامنے آتی ہیں پہلی رائے کے مطابق وہ عربی النسل اور صدیقی النسب تھے، اور دوسری رائے یہ ہے کہ وہ نومسلم ہندی النسل اور گجرات کے بوہروں کی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا عربی النسل ہونا ثابت نہیں۔

گو یہ رائیں بظاہر مختلف معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقتاً ان میں تضاد نہیں، شیخ کا بوہرہ ہونا ان کے صدیقی النسل اور عربی الاصل ہونے میں مانع نہیں ہے کیونکہ بوہروں میں خالص ہندوستانی اور نومسلم بھی تھے اور بعض عرب کے بجائے دوسرے ملکوں سے آکر ان میں شامل ہو گئے تھے اور بعض بوہرے خالص عربی بھی تھے، مولانا ابوظفر ندوی مرحوم گجرات کی تاریخ کے ماہر اور مشہور و مسلم عالم ہیں، انہوں نے بوہرہ قوم کی اصلیت پر طویل بحث کر کے آخر میں لکھا ہے۔

''خلاصہ کلام یہ ہے کہ بوہرہ قوم ایک ایسی جماعت ہے جو مختلف نسلوں اور قوموں کا مجموعہ ہے، اس میں سنی بھی ہیں اور شیعہ بھی، خالص عرب بھی ہیں اور خالص ہندی بھی، ایرانی بھی ہیں اور عراقی بھی، قدیم الاسلام بھی ہیں اور جدید الاسلام (نومسلم) بھی، تاجر بھی ہیں اور غیر تاجر بھی، غرض یہ بوہرہ مختلف قوموں اور نسلوں کا مجموعہ ہے۔''

(مقدمہ تذکرہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی ص ۲۷)

Marfat.com

اس توجیہ کے بعد شیخ کو بوہرہ قوم کا فرد ہونے کے باوجود صدیقی اور عربی بھی کہا جا سکتا ہے۔

گجرات میں بوہرہ قوم کی بڑی آبادی تھی، ان لوگوں کا ذریعۂ معاش تجارت اور صنعت وحرفت تھا اس لئے انہیں بوہرہ کہتے ہیں جو ہندی لفظ بیوپار سے بنا ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ بوہرہ عربی لفظ ہو، قاموس میں ہے۔

بھراء قبیلہ وبھرۃ بالضم بنواحی المدینۃ بالیمامۃ۔

بہرا ایک قبیلہ کا نام ہے اور بہرہ مدینہ اور یمامہ کے نواح میں رہتے ہیں۔

صراح میں ہے کہ بہرا قبیلہ قضاء کی ایک شاخ کا نام ہے، مشہور مورخ مسعودی ۳۰۲ھ میں بھروچ اور کھمبائیت کی سیاحت کے لئے آیا تھا اس کا بیان ہے کہ چمبیور (متصل بمبئی) میں علاوہ بغداد اور بصرہ کے دس ہزار بیاسرہ مسلمان ہیں اور قاموس میں بیاسرہ کے یہ معنی لکھے ہیں کہ "بیاسرہ سندھ میں ایک قوم ہے جن کو ناخدا کرایہ پر دشمنوں سے لڑنے کے لئے رکھتے تھے اس کا واحد بیسرہ ہے۔"

ابتدا میں جو تاجر جہازوں پر ان لوگوں کو نوکر رکھ کر ہندوستان لاتے تھے ممکن ہے انہی کو بیاسرہ کہنے لگے ہوں اور پھر یہ لفظ صرف ان لوگوں کے لئے مستعمل ہونے لگا ہو جو عرب سے آکر یہاں مقیم ہو جاتے ہوں اور رفتہ رفتہ ان کی اولاد (ہند میں پیدا ہونے والی) کے لئے مخصوص ہو گیا ہو۔

غرض بوہرہ کے معنی عام تاجر کے لئے جائیں یا اُس سے مراد عرب سے آنے والے تاجر ہوں، یا ان کا تعلق قبیلہ قضاعہ سے ہو، ہر صورت میں بلا تفریق مذہب ونسل یہ لفظ زیادہ تر مسلمان تاجروں کے لئے استعمال ہونا اور عرب تاجر (مسلمان) کا ہندوستان میں پہلی صدی ہجری سے آنا مسلّم ہے۔ (مقدمہ تذکرہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی ص ۱۷ تا ۱۹)

بوہری قوم کے دو مشہور فرقے تھے، چھوٹی جماعت کو شیعہ اور بڑی کو سنی کہتے تھے، شیعہ بورہے اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتے تھے، یہ فرقہ اسماعیل بن امام جعفر صادق کو امام مانتا ہے اور دوسرے ائمہ کا منکر ہے، یہ لوگ تقیہ کرتے ہیں اور اپنے عقائد کو انتہائی حد تک پوشیدہ رکھتے ہیں، شیخ محمد بن طاہر کا تعلق بڑی جماعت یعنی اہل سنت والجماعت سے تھا۔

(اتحاف النبلاء ص ۳۹۹)

ولادت ووطن:

مشہور قول کے مطابق شیخ محمد بن طاہر ۹۱۳ھ میں پیدا ہوئے، (النور السافر ص ۳۶۱) مگر شیخ کے پوتے شیخ عبدالوہاب نے لکھا ہے کہ ۹۱۴ھ میں پیدا ہوئے۔ (رسالہ مناقب اردو ترجمہ ص ۸۹) پٹن کی نسبت سے وہ فتنی (پٹنی) کہلاتے ہیں، یہ گجرات کا قدیم دارالخلافت تھا جو نہروالہ بھی کہلاتا تھا، مورخ مکہ صاحب الاعلام بالاعلام بیت اللہ الحرام قطب الدین محمد بن احمد النہروالی (متوفی ۹۹۰ھ) اسی کی جانب منسوب ہیں، (الرسالۃ المستطرفۃ ص ۱۲۴ ومقدمہ بحار الانوار مولانا اعظمی) یہ قدیم آبادی ہے جو احمد آباد سے پہلے گجرات کے بادشاہوں اور راجاؤں کا پایہ تخت تھا، اس کی پرانی آبادی جو شہر پناہ کے اندر تھی ویران ہو گئی، قلعہ بھدر کا دروازہ اور برج بطور آثار کے باقی رہ گئے ہیں۔ جدید آبادی احمد آباد سے تقریباً نوے میل پر مغرب اور شمال کے درمیان ہے۔ (تاریخ احمدی ص ۲۳۲)

Marfat.com

عام مورخین کا خیال ہے کہ پٹن کے بانی بن راج چوڑا کے ایک ساتھی انہل نامی شخص کے انتخاب پر یہ زمین پسند کی گئی تھی اور اسی کے نام پر انہل واڑا مشہور ہوئی جسے عربی مصنفین نے اپنے لہجہ کے مطابق نہروالہ کر دیا مگر آخری عہد میں لوگ اسے صرف پٹن کہتے تھے کیونکہ ہندو راجدھانی یا بڑے شہر کو پٹن کہتے تھے جیسے پاکپتن، سومناتھ پٹن وغیرہ پنجاب میں پاک پٹن موجود ہے اس لیے اس کو لوگ گجرات پٹن کہتے تھے۔ (مقدمہ تذکرہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی ص ۱۴۱ بحوالہ مرأۃ احمدی ج ۱ ص ۲۶ کلکتہ)

شیخ کا زمانہ:

شیخ کی ولادت سے سو برس قبل ہی پٹن سے تعلق خاندان کی حکمرانی کا خاتمہ ہو چکا تھا اور پٹن کی سلطنت آزاد ہو چکی تھی، شیخ کی ولادت کے وقت پٹن کا حکمران محمود اعظم عرف بیگڑہ[1] تھا ۹۱۸ھ میں اس کی وفات ہوگئی، اس کے بعد متعدد فرمانروا یکے بعد دیگرے تخت حکومت پر متمکن ہوتے رہے یہاں تک کہ ۹۸۰ھ میں اکبر بادشاہ دہلی نے گجرات فتح کر کے اسے اپنے ممالک محروسہ میں شامل کر لیا، اس طرح پٹن کی آزاد سلطنت ختم ہوگئی اور گجرات بھی ہندوستان کا ایک صوبہ بن گیا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ کا دور بڑا پر آشوب تھا، وہ سلطان محمود بن لطیف خان کے زمانہ میں مکہ سے واپس آئے تھے، یہ خانہ جنگی کا زمانہ تھا، سلطان تخت نشینی کے وقت بہت کم سن تھا اس لئے زمام حکومت امرائے دولت کے ہاتھ میں تھی، اور ان میں اقتدار کے لئے باہم سخت رسہ کشی جاری تھی اور ہر طرف شورش اور انتشار برپا تھا۔ ملک میں امن و امان مفقود تھا اہل علم ان حالات سے سخت پریشان تھے کیونکہ سکون و جمعیت خاطر کے ساتھ علمی و تعلیمی کام انجام دینے کا موقع میسر نہیں تھا، علامہ محمد بن طاہر نے اس زمانہ کے ابتر حالات اور ارباب حکومت کے ظلم و جور کا اپنی بعض تصنیفات میں کہیں کہیں ذکر کیا ہے، لیکن جب گجرات ممالک محروسہ میں شامل ہو گیا تو سیاسی استحکام پیدا ہوا اور خانہ جنگی و انتشار کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

شیخ کے زمانہ میں ہندوستان میں اسلامی علوم کے چھ بڑے مرکز تھے:

۱: دہلی۔ ۲: پنجاب۔ ۳: پورب یعنی جونپور، الٰہ آباد اور لکھنؤ کا علاقہ۔ ۴: گجرات۔ ۵: سندھ۔ ۶: برہان پور۔ گجرات میں سب سے زیادہ شہرت شیخ محمد بن طاہر پٹنی، ۱۵۷۸ء) اور علامہ وجیہ الدین گجراتی (متوفی ۱۵۹۰ھ) نے پائی۔

(رود کوثر ص ۳۹۰ و ۳۹۲)

تحصیل علم:

ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، بلوغ سے قبل ہی قرآن مجید حفظ کر لیا تھا، اس کے بعد دوسرے فنون کی جانب متوجہ ہوئے انہوں نے طلب علم میں بڑی سعی و محنت کی اور اس میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا، پندرہ برس کی عمر میں معقول و منقول اور اصول و فروع میں اس درجہ کمال حاصل کیا کہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے فاضل و کامل خیال کیے جانے لگے، اس زمانہ سے درس بھی دینے لگے تھے، مورخین کا بیان ہے کہ گجرات میں شیخ محمد بن طاہر اور شیخ وجیہ الدین سے زیادہ ممتاز کوئی آدمی نہ تھا۔

(النور السافر ص ۳۶۱ و ۳۶۲ و ترجمہ رسالہ مناقب ص ۸۹)

[1] تاریخ گجرات کے مشہور فاضل مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم نے صحیح لفظ بیگڑو بتایا ہے۔ (تذکرہ محمد بن طاہر ص ۴۳)

Marfat.com

اساتذہ:

شیخ محمد بن طاہر کے زمانہ میں گجرات ایک بڑا علمی مرکز تھا، خود ان کے وطن نہروالہ (پٹن) میں علوم وفنون کا چشمہ جاری تھا، قدیم پایہ تخت ہونے کی وجہ سے یہاں اصحابِ علم وفن اور صوفیہ ومشائخ کی بڑی تعداد موجود تھی۔ اس لئے سب سے پہلے شیخ نے اپنے وطن ہی کے علماء وفضلا اور اربابِ کمال کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، ان کے یہاں کے اساتذہ میں سے جن لوگوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

مولانا شیخ ناگوری، شیخ برہان الدین سمہودی مولانا یداللہ سوہی، ملامتہ یامٹھ۔

یہ چاروں بزرگ گجرات کے علمائے کبار میں رہے ہونگے، شیخ محمد بن طاہر نے ملامٹھ کی خدمت میں تعلیم ختم کی۔ ان کا لقب استاد الزماں تھا۔ یہ پٹن کے ایک بہت بڑے عالم تھے، ان کا اصلی نام معلوم نہ ہو سکا، انہوں نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔

علامہ محمد بن طاہر پٹنی اسی مدرسہ کے تعلیم یافتہ تھے، ان کے علاوہ اور بہت سارے لوگ اس مدرسہ سے فیضیاب ہوئے تھے، شیخ عبدالوہاب کا بیان ہے کہ جب عارف ربانی شیخ متہ کا انتقال ہوا جو شیخ محمد بن طاہر کے ہندوستانی استاد تھے اور جن سے آخری درجہ کی سب کتابیں پڑھی تھیں تو ان کے کوئی لڑکا نہ تھا جو جانشین ہوتا اس بنا پر شیخ ہی کو ان کا جانشین مقرر کیا گیا۔

(تذکرہ شیخ محمد بن طاہر ص ۲۹ حاشیہ یادایام ص ۵۵، گجرات کی تمدنی تاریخ ص ۱۹۸، ترجمہ رسالہ مناقب ص ۹۴)

شیخ محمد بن طاہر اپنے وطن میں تعلیم مکمل کرنے اور کتب متداولہ سے فراغت کے بعد حرمین تشریف لے گئے اور وہاں کے مندرجہ ذیل بزرگوں سے فن حدیث کی تحصیل کی۔

شیخ ابوالحسن بکری، علامہ احمد بن حجر ہیثمی، شیخ احمد بن حجر مصری مکی صاحب صواعق محرقہ شیخ علی بن عراق، شیخ جاراللہ بن فہد مکی، شیخ عبداللہ عیدروس مدنی، شیخ علی مدنی، شیخ برخوردار سندھی، شیخ عبیداللہ حضرمی، شیخ ابی عبیداللہ زبیدی۔

مکہ معظمہ ہی میں شیخ اجل علی متقی ہندی کی بارگاہ فضل وکمال میں بھی ان کی رسائی ہوئی اور ان سے خاص طور پر استفادہ کیا، اپنی کتاب مجمع بحار الانوار کی ابتداء میں ان کا ذکر بڑی عقیدت سے کیا ہے، یہ عقیدت اور تعلق اس قدر بڑھا کہ ان سے بیعت بھی ہوئے۔ (اخبار الاخیار ص ۲۶۴، ماثر الکرام ص ۱۹۴ النور السافر ص ۳۶۲ اتحاف النبلاء ص ۳۹۰)

تلامذہ:

شیخ کا دائرہ فیض بھی بہت وسیع تھا اور وہ طلبہ کی مالی امداد بھی کرتے تھے، ان کے فیاضانہ سلوک کی وجہ سے ان کے یہاں طالب علموں کا ہجوم لگا رہتا تھا، ان کے پوتے شیخ عبدالوہاب نے ان کے حالات میں رسالہ مناقب لکھا تھا، اس میں ان کے حسب ذیل شاگردوں کے نام درج ہیں:

ابوالبشر محمد فضل، شیخ ضیاء الدین بن شیخ محمد غوث گوالیاری، ابوالفتح میاں احمد خان پٹنی، شیخ داؤد بن شیخ حسن، برہان الدین واعظ محمد اسحق، میاں جلال بن محسن (شاہ عالم) محمد حسن، نور محمد حسن عبدل بن فتح اللہ سارنگپوری، شیخ محمد شطاری، شیخ جیون سورتی، شیخ حسین سورتی، شیخ عبدالہادی احمد آبادی، شیخ فرید کاسب پٹنی، شیخ عبدالنبی صدرالصدور (بعہد محمد اکبر بادشاہ دہلی)۔

ان ناموں کے گنانے کے بعد وہ لکھتے ہیں، ان کے علاوہ بے شمار دوسرے بزرگ بھی شاگردوں میں داخل ہیں جن میں

Marfat.com

سے کچھ مشہور کچھ غیر معروف ہیں، طوالت کے خیال سے حذف کر دیا۔ (رسالہ مناقب اردو ترجمہ ص ۹۳ و ۹۴)

حرمین کا سفر اور حج بیت اللہ:

اوپر گزر چکا ہے کہ کتب متداولہ کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لئے حرمین تشریف لے گئے، مؤرخین کے بیان کے مطابق یہ سفر ۹۴۴ھ میں ہوا جبکہ ان کی عمر ۳۰ یا ۳۱ برس تھی، شیخ پہلے مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور حج بیت اللہ سے مشرف ہونے کے بعد قبر نبوی کی زیارت کے لئے مدینہ منورہ گئے اس کے بعد مکہ معظمہ واپس آ کر علماء و مشائخ سے استفادہ کے لئے وہاں مدتوں قیام کیا۔ (اخبار الاخیار ص ۲۶۴ و مآثر الکرام ج ۱ ص ۱۹۴، النور السافر ص ۳۶۲)

ذہانت وفطانت:

شیخ نہایت ذہین اور تیز طبع تھے، اس کی وجہ سے انہیں تحصیل علم میں ابتلا اور مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا، تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ "تحصیل علم کے زمانہ میں انہیں طلبہ کی جانب سے سخت صعوبتیں جھیلنی پڑیں، جس مدرسہ میں جاتے وہاں کے طلبہ اور ہم عصر لوگ انہیں دق کرتے، یہ لوگ شیخ سے مباحثہ کی تاب نہ لانے کی وجہ سے ان سے جلتے اور رشک وحسد کرتے اور انہیں طرح طرح سے ایذا دینے کی فکر میں رہتے تھے بعض اساتذہ کا برتاؤ بھی ان سے اچھا نہ تھا، اس ناگوار صورت حال کی بنا پر انہوں نے اسی زمانہ میں یہ طے کر لیا تھا کہ اگر اللہ نے مجھ کو علم سے بہرہ ور کیا اور درس دینے کے لائق بنایا تو میں رضائے الٰہی کے لئے علم کی نشر واشاعت کروں گا اور تعلیم دینے میں کسی قسم کی بخل سے کام نہ لوں گا، طالب علموں کی عزت کروں گا اور ان کے ساتھ لطف وشفقت کا برتاؤ کروں گا، کسی کو علم سے محروم نہ رکھوں گا بلکہ بہتے ہوئے چشمہ کی طرح سے ہر شخص کو فیضیاب ہونے کا موقع دوں گا۔ (النور السافر ص ۳۶۲ و ترجمہ اردو رسالہ مناقب ص ۹۲)

طلبہ کی امداد اور حسن سلوک:

چنانچہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی جب درس وتدریس کے منصب پر فائز ہوئے تو انہیں نذر کی تکمیل کا موقع ملا اور انہوں نے استفادہ کے معاملہ میں کسی طالب علم کے ساتھ بخل سے کام نہ لیا بلکہ ایسا فیاضانہ سلوک کیا کہ ان کے یہاں علم کے شائق لوگوں کا اژدحام رہتا تھا اور بے شمار طلبہ ان کے چشمہ علم سے سیراب ہوتے تھے۔ وہ طلبہ کے وظائف پر بے دریغ خرچ کرتے تھے، انہیں اپنے والد سے کافی ترکہ ملا تھا وہ سب طالب علموں کے لئے نچھاور کر دیا تھا۔

شیخ کا یہ بھی طریقہ تھا کہ ذہین اور ذی استعداد طلبہ سے ان کے حالات دریافت کرتے جو طالب علم غنی اور مالدار ہوتے ان سے کہتے کہ مستعدی اور محنت سے علم حاصل کرو اور جو طلبہ محتاج اور ضرورت مند ہوتے ان سے فرماتے "معاش کی طرف سے بے فکر رہو میں تمہاری اور تمہارے متعلقین کی پوری کفالت کروں گا تاکہ تم سرگرمی اور انہماک سے علم حاصل کرو، غرض جو بھی محتاج اور نادار طالب علم ہوتا اس کے ساتھ وہ یہی معاملہ کرتے تھے اور اس کے لئے باقاعدہ وظیفہ مقرر کر دیتے تھے، اس کی وجہ سے طلبہ کی ایک بڑی جماعت فراغت اور بے فکری سے مختلف علوم وفنون کی ماہر ہو کر نکلتی۔

(النور السافر ص ۳۶۲، رسالہ مناقب ص ۹۳ شذرات الذہب ج ۸ ص ۴۱۰)

Marfat.com

طلبہ کی عام کفالت اوران کی ضروریات کی فراہمی کے علاوہ شیخ محمد بن طاہران کے لئے روشنائی بھی بناتے، اس کی تلقین ان کے شیخ علی متقی نے انہیں کی تھی چنانچہ پڑھاتے وقت بھی سیاہی بنانے کا سلسلہ جاری رکھتے اور جب تیار ہو جاتی تو اسے طلبہ میں تقسیم کر دیتے۔ (تاریخ احمدی ص ۷ ۱۳، اخبار الاخیار ص ۲۶۴، آثار الکرام اول ص ۱۹۴)

درس وتدریس:

حجاز میں کئی برس قیام کے بعد جب وہ وطن واپس تشریف لائے تو پورے طور پر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہو گئے۔ (تاریخ احمدی ص ۷ ۱۳، اخبار الاخیار ص ۲۶۴، آثار الکرام اول ص ۱۹۴) انہوں نے اپنے وطن نہروالہ پٹن میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جس میں ہر قسم کے علوم پڑھائے جاتے تھے مگر یہ حدیث کی تعلیم کے لئے زیادہ مشہور تھا، وہ اس کے خود مدرس اعلیٰ تھے، ان کے بعد ان کے لڑکے اور پوتے کے زیر اہتمام یہ مدرسہ عرصہ دراز تک چلتا رہا، عہد عالمگیر میں جب نیا مدرسہ قائم ہوا تو یہ اسی میں منضم ہو گیا۔ (گجرات کی تمدنی تاریخ ص ۱۹۹)

احمد آباد میں سلطان احمد کی مسجد میں بھی انہوں نے درس دیا تھا جہاں دوسرے علماء وفضلا بھی درس دیتے تھے، اس زمانہ میں دوسرے مدرسوں کے طلبہ بھی حل مشکلات اور بعض مسائل کی تحقیق کے لئے شیخ محمد بن طاہر کے حلقہ درس میں آتے اور وہ ان لوگوں کی پوری طرح تشفی فرماتے تھے، سلطان محمود ثانی کے ایک وزیر کو ان کے درس کی خبر ہوئی تو وہ بھی ملاقات کے لئے آیا اور چند مشکل امور دریافت کیے جن کا شافی جواب پا کر مطمئن ہو گیا۔ (اردو ترجمہ رسالہ مناقب ص ۹۹)

ان کے درس کی مقبولیت اور شہرت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جب ان کے استاد شیخ متھ کا انتقال ہوا جن کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے ان کی جانشینی کا مسئلہ پیش ہوا، لوگوں کا کسی خاص شاگرد پر اتفاق نہ ہوتا تھا بالآخر لوگوں نے طے کیا کہ ان کی جگہ پر مصلیٰ خالی چھوڑ دیا جائے اور پھر جس کی طبیعت مائل ہو وہ آگے بڑھ کر نماز پڑھا دے، چنانچہ اس وقت شیخ محمد بن طاہر بھی موجود تھے بغیر کسی اشارہ کے وہ خود بڑھ کر مصلے پر کھڑے ہو گئے، اس سے لوگوں نے یہ سمجھا کہ انہی کو استاد کا جانشین بنانا اللہ تعالیٰ کو منظور ہے، اسی وجہ سے کسی اور شاگرد کو قدم آگے بڑھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

(مقدمہ تذکرہ محمد بن طاہر ص ۳۳ بحوالہ رسالہ مناقب)

ملا متھ کی مسند درس پر بیٹھ کر انہوں نے ان کی جانشینی کا حق ادا کر دیا۔

شیخ کا کتب خانہ:

شیخ نے اپنے علمی ذوق اور علم وفن سے غیر معمولی اشتغال کی بناء پر ایک بڑا کتب خانہ بھی قائم کیا تھا جو نادر، بیش قیمت اور اہم کتابوں پر مشتمل تھا اس میں عرب وعجم سے کتابیں منگوا کر جمع کی تھیں، جب تک اس خاندان کے لوگوں کو علم سے اشتغال رہا کتابیں محفوظ رہیں، پھر آہستہ آہستہ ضائع ہونے لگیں، اب بھی اس کا کچھ حصہ شیخ کے اہل خاندان اور ورثاء کے پاس باقی رہ گیا ہے مگر کتابیں نہایت خراب حال میں ہیں، اس کتب خانہ میں ان کی تصنیف مجمع بحار الانوار کا ایک قلمی نسخہ بھی موجود ہے جو کہ خود انہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا بتایا جاتا ہے مگر کتاب کی کسی اندرونی شہادت سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

(گجرات کی تمدنی تاریخ ص ۳۲۳و۳۲۴)

Marfat.com

علم حدیث میں بلند پائیگی:

شیخ محمد بن طاہر مروجہ علوم میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، ارباب تذکرہ نے ان کو متعدد فنون میں ماہر و فائق قرار دیا ہے، (النور السافر ص ۳۶۲) ان کے علمی تبحر اور فضل و کمال کے متعلق شاہ عبدالحق محدث دہلوی کا یہ بیان نقل کرنا کافی ہوگا ''حق سبحانہ و تعالٰی اور اعلم و فضل داد'' (اخبار الاخیار ص ۲۶۴) لیکن حدیث میں وہ خصوصیت سے بہت ممتاز، بلند پایہ اور اس فن کے امام تھے، شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں ''تکمیل علوم خصوصاً تکمیل علم حدیث پورے طور پر کی۔ (ایضا) گجرات میں ان کے درجہ و مرتبہ کا کوئی محدث نہ تھا، ان کے اس فضل و کمال کے تمام لوگ معترف ہیں، دراصل انہوں نے فن حدیث میں بے نظیر کمال حاصل کیا تھا۔ (اذکار ابرار ص ۳۲۳ ترجمہ گلزار ابرار بحوالہ معارف مارچ ۵۵ء) اور اپنی زندگی اس مفید اور بابرکت علم کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ ان کا شمار ہندوستان کے اکابر علما اور فاضل محدثین میں ہوتا ہے، رئیس المحدثین اور ملک المحدثین کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ ان کے فضل و کمال اور علم حدیث میں خصوصیت و امتیاز کا آوازۂ شہرت ہندوستان سے گزر کر دنیائے اسلام میں بھی بلند ہو گیا تھا۔ (یاد ایام ص ۵۵)

حدیث کے علاوہ لغت اور عربی زبان کے بھی ماہر تھے اور لغوی کہلاتے تھے، اپنے اس کمال کی وجہ سے ابھی انہوں نے علم حدیث کی بڑی مفید خدمت انجام دی اور اس کے مشکل الفاظ و لغات کی ایک جامع لغت مجمع بحار الانوار مرتب کی جس کی حیثیت احادیث کی شرح کی ہے۔

انہوں نے صرف احادیث کی شرح و توضیح اور اس کی علمی خدمت ہی انجام نہیں دی ہے بلکہ حدیث و سنت کی خدمت اور اس کا فروغ و اشاعت بھی زندگی کا خاص، مقصد تھا۔ آزاد بلگرامی تحریر فرماتے ہیں۔

''خادم حدیث نبوی و ناصر سنن مصطفوی است''۔ (مآثر الکرام دفتر اول ص ۱۹۴)

حدیث و سنت نبوی کے فروغ و ترقی اور بدعات و خرافات کا قلع قمع کرنے کے لئے وہ ہر وقت مستعد اور سرگرم رہتے، اپنی قوم کی اصلاح اور اسے بدعات کی آلودگی سے پاک کرنے اور جادۂ سنت پر استوار رکھنے کے لئے انہوں نے جو مہم چلائی تھی اور جس میں ان کی جان بھی چلی گئی اس کا ذکر آگے آئے گا۔

مسلک و مذہب:

او پر گزر چکا ہے کہ شیخ کا بوہرہ قوم کے کلاں فرقہ (سنیوں) سے تعلق تھا، اور فقہی مذہب حنفی تھا۔
(ترجمہ اردو رسالہ مناقب ص ۸۸)

فیاضی و سخاوت:

شیخ کی اخلاقی خوبیوں کے ذکر سے تذکرے خالی ہیں لیکن ان کی جود و سخا، داد و دہش اور فیاضی و سخاوت کا سب ہی تذکرہ نگاروں نے ذکر کیا ہے، ان کے جد بزرگوار علی پٹن کے ایک بڑے تاجر تھے، انتقال کے وقت ان کے پاس اتنی دولت تھی کہ اسے اپنے دو حقیقی لڑکوں میں انہوں نے ترازو میں تول کر تقسیم کیا، شیخ کے والد بھی ایک کامیاب تاجر تھے اور ساری عمر اسی شغل

Marfat.com

میں مصروف رہے۔ (مقدمہ تذکرہ محمد بن طاہر محدث پٹنی ص ۲۷ و ۲۸) اس طرح شیخ محمد بن طاہر کو بھی ترکہ میں کافی دولت ملی مگر وہ اسے اپنی ذات پر خرچ کرنے کے بجائے طلبہ کی امداد و اعانت میں صرف کرتے، خود فقر و فاقہ سے گزراوقات کرتے مگر مخلوق کے ساتھ داد و دہش میں کمی نہ کرتے۔ (ترجمہ اردو رسالہ مناقب ص ۹۴) اس معاملہ میں ان کے جذبہ خیر اور فیاضی کا پہلے ذکر آچکا ہے اس لئے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

صلاح و تقویٰ:

وہ صلاح و تقویٰ کے زیور سے بھی آراستہ تھے، ارباب تذکرہ نے ان کے ورع و صلاح کا ذکر کیا ہے، دینی حیثیت سے ان کے بلند مرتبہ ہونے کا ثبوت وہ خواب بھی ہیں جن کو اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کے اور ان کے شیخ علی متقی کے حال میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے جمعہ ۲۷، رمضان کو خواب میں آنحضرت ﷺ کو دیکھا اور آپ سے پوچھا کہ اس زمانہ میں سب سے افضل کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: تم یعنی شیخ علی متقی، انہوں نے دریافت کیا پھر کون افضل ہے؟ فرمایا: محمد بن طاہر ہندی۔

اسی شب میں شیخ علی متقی کے شاگرد شیخ عبدالوہاب کو بھی خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہوئی اور انہوں نے بھی آپ سے یہی بات دریافت فرمائی تو آپ نے ان کو بھی وہی جواب دیا جو شیخ علی متقی کو دیا تھا، شیخ عبدالوہاب اپنا خواب بیان کرنے کے لئے جب اپنے استاد علی متقی کی خدمت میں آئے تو انہوں نے ان کو کچھ کہنے سے پہلے ہی یہ فرمایا کہ میں نے بھی وہی خواب دیکھا ہے جو تم نے دیکھا ہے۔ (النور السافر ص ۳۱۵ و ۳۱۶ و ۳۶۱)

رسالہ مناقب میں اس قسم کے اور بھی خواب مذکور ہیں۔

شیخ محمد بن طاہر میں بڑی دینی حمیت اور ایمانی غیرت بھی تھی، سنت کا اتباع اور اس کی ترویج اور رد بدعت ان کی زندگی کا مقصد تھا اور اس معاملہ میں ان کو جس درجہ تشدد تھا اس کا ذکر آگے آئے گا، ان کے پوتے شیخ عبدالوہاب لکھتے ہیں:

"حضرت شیخ شرعی احکام اور حدود دین کو قائم رکھنے میں اپنی ہمت صرف فرماتے تھے، کسی حاکم وقت یا طاقتور امیر کا خوف نہ کرتے تھے، وہ خاص خدا کے لئے محبت اور خالص خدا کے لئے عداوت کے قائل تھے اس بنا پر وہ رسول اللہ کی سنت اختیار کرنے والے سے دوستی اور بدعتیوں سے دشمنی رکھتے تھے۔ (ترجمہ رسالہ مناقب اردو ص ۹۸)

مخالفین کا حملہ اور زخم لگنا:

شیخ محمد بن طاہر فرقہ مہدویہ کے سخت مخالف تھے اور مہدی مذہب کو ماننے والے بھی شیخ سے بڑی نفرت کرتے تھے اور ان کے اور اہلسنت مسلمانوں کے درپے آزار رہتے تھے، چنانچہ موسیٰ خاں اور شیر خاں طالب علم بن کر ان کے مدرسہ میں آتے اور موقع کے منتظر رہتے کہ اگر کبھی ان کو تنہا پائیں تو قتل کر دیں چنانچہ ایک روز کوٹھے پر تنہا دیکھ کر وہ دونوں وہاں پہنچ گئے اور تلوار سے ان کے شانہ پر حملہ کیا جس سے شیخ زخمی ہو گئے، یہ لوگ اتر کر بھاگ گئے مگر گھبراہٹ اور جلدی میں ایک شخص زینہ سے اترتے وقت گر گیا اور اس کا سر نالی میں چلا گیا، شیخ کے ایک شاگرد نے بڑھ کر اس کا کام تمام کر دیا اور بھاگ گیا مگر شیر خان کو اس کی اطلاع ہوئی تو ان نے اس کے پیچھے سوار لگا دیئے، سواروں نے احمد آباد کے قریب ایک گاؤں میں اسے پکڑ لیا اور قتل کر

Marfat.com

دیا۔(ایضاً)

شیخ اس حادثہ کی وجہ سے زخمی ہو گئے، لیکن جلد ہی ٹھیک ہو گئے، انہوں نے اپنی کتاب مجمع البحار میں بھی اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

''اس وقت جبکہ اسلام کے دشمنوں کے ہاتھوں زخمی ہوا تو ٹانکہ دیتے وقت جراح نے سولہ دفعہ سوئی سے کام لیا اور زخمی ہونے کے دن سے تندرست ہونے تک بیس بائیس روز کے اندر تین دفعہ کے سوا کبھی تکلیف نہیں ہوئی۔ (ایضاً ص ۹۹)

جراح روزانہ آکر مرہم پٹی کر جاتا اور ہر طرح سے خدمت انجام دیتا تھا جس سے بیس پچیس روز میں بالکل ٹھیک ہو گئے۔

قوم کی اصلاح اور ردِ مہدویت:

شیخ محمد بن طاہر سنت کی اتباع و اشاعت اور بدعات کی تردید میں خاص شہرت و امتیاز رکھتے تھے اور اس معاملہ میں بڑے سرگرم تھے، ان کی قوم بوہرہ سنی اور شیعہ دو گروہوں میں بٹی ہوئی تھی، سنی بوہروں میں بھی زمانہ کے اثر اور شیعہ بوہروں کے اختلاط کی وجہ سے گوناگوں بدعتیں پھیل گئی تھیں اور دینداری مفقود ہوتی جارہی تھی، اس زمانہ میں مہدویت کا زور واثر بھی بہت بڑھ گیا تھا اس کے پیش نظر شیخ بڑی سرگرمی اور نہایت جانفشانی سے بدعت اور مہدویت کے قلع قمع کرنے اور سنت و دینداری کے فروغ اور بول بالا کرنے کے لئے کمربستہ ہو گئے، جس کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے:

شیخ محمد بن طاہر مکہ معظمہ سے واپسی کے بعد ہمہ تن درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے کام میں لگے ہوئے تھے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ہر طرف بدعتیں پھیلتی جارہی ہیں اور سنی بوہروں میں بھی غلط رسم ورواج اور خلافت سنت امور جڑ پکڑتے جارہے ہیں اور سیاسی انتشار اور امرائے گجرات کی خانہ جنگی کی وجہ سے مہدویت کا اثر ورسوخ بھی بڑھتا جارہا ہے، یہاں تک کہ پٹن کا حاکم شیر خان فولادی اور اس کا پورا خاندان مہدویت کا پشت پناہ ہو گیا ہے تو انہوں نے اس کے خلاف جدوجہد شروع کی۔ وعظ، تقریر اور تحریر ہر طریقہ سے قوم کی اصلاح اور بدعت و مہدویت کے استیصال پر کمربستہ ہو گئے، عقلی و نقلی ہر قسم کی دلیلوں سے عقائد حقہ کا اثبات کیا اور عقائد باطلہ کی تردید کی اس سلسلہ میں ایک رسالۃ نصیحۃ الولاۃ بھی لکھا اور اسے شیر خان کے پاس بھیجا، اس کے اثر سے کچھ دنوں کے لئے سکون ہو گیا لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد مہدویوں نے پھر سر اٹھایا جس میں شیر خان کے خاندان والے زیادہ پیش پیش تھے، اس نے اور موسیٰ خان نے شیخ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

شیخ بھی چپ رہنے والے نہ تھے، زخمی ہونے کے بعد بھی ان کی سرگرمی میں کمی نہیں ہوئی اور وہ اسی جوش و خروش کے ساتھ برابر مہدویت اور بدعت کے استیصال میں منہمک رہے، بالآخر مہدویوں کی شورش سے تنگ آکر انہوں نے اپنے سر سے دستار فضیلت اتار دی اور یہ عہد کیا کہ جب تک میری قوم تمام بدعتوں اور ضلالتوں سے تائب نہ ہو جائے گی اس وقت تک میں سر پر عمامہ نہ باندھوں گا۔

وہ اپنی ان کوششوں میں پوری طرح سرگرم عمل تھے کہ ۹۸۰ھ میں اکبر بادشاہ نے گجرات فتح کیا جب علامہ شیخ محمد بن

Marfat.com

طاہر سے بادشاہ کی ملاقات ہوئی تو اس نے ان سے برہنہ سر رہنے کا سبب پوچھا انہوں نے اس کے سامنے حقیقت حال بیان کی تو بادشاہ نے خود ان کے سر پر عمامہ باندھا اور کہا کہ دین کی حفاظت میرا فرض ہے، آپ اپنا کام جاری رکھیں میں بھی اس میں آپ کی پوری مدد کروں گا، چنانچہ اس نے اپنے رضاعی بھائی خان اعظم مرزا عزیز کو گجرات کا گورنر مقرر کیا، یہ راسخ العقیدہ سنی تھا، اس نے اپنے ایام حکومت میں شیخ کی پوری مدد کی اور مہدویت کا زور واثر ختم کرنے میں ان کی مکمل امداد کی اس کے نتیجہ میں پٹن میں امن وامان ہوگیا اور شیخ محمد بن طاہر مطمئن ہوکر درس وتدریس، رشد وہدایت اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہو گئے مگر کچھ عرصہ بعد خان اعظم تبدیل ہو گیا اور اس کی جگہ عبدالرحیم خان خاناں گورنر ہوا جس کے عہد حکومت میں شیعہ بوہرے پھر دلیر ہو گئے اور ان کی سرگرمیاں بھی تیز ہو گئیں، شیخ نے یہ صورتحال دیکھی تو پھر اپنا عمامہ سر سے اُتارا اور آگرہ کا رخ کیا تاکہ بادشاہ کے حضور عرضِ حال کریں۔

اس ارادہ سے ۹۸۶ھ میں وہ آگرہ کے لئے روانہ ہوئے، پہلے مالوہ پہنچے اور مشہور شہر سارنگ پور میں تین روز قیام کیا، جب وہاں سے روانہ ہوئے اور ایک گاؤں سوتی پہنچے جو اجین کے قریب تھا۔

دوسری طرف شیخ کی روانگی کی اطلاع پاکر مہدوی فرقہ کے لوگ بھی انکے تعاقب میں نکلے تاکہ کہیں موقع پاکر ان کا کام تمام کر دیں، چنانچہ ۶، شوال ۹۸۶ھ کو اسی گاؤں میں جب شیخ تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے تو مہدویوں نے نہایت بے رحمی سے انہیں شہید کر دیا۔ (ترجمہ اردو رسالہ مناقب ص ۱۰۵ و ۱۰۶ و آثار الکرام ج ا ص ۱۹۵)

"شاہ عبدالحق صاحب نے اس واقعہ کا اختصار سے ذکر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

> "بوہرہ قوم میں مروج بعض بدعتوں کی اصلاح کی اور اس قوم کے اہل سنت وبدعت میں تفریق وامتیاز پیدا کر دیا۔ انہوں نے ازالہ بدعات اور اس علاقہ کے اہل بدعت کی سرکوبی میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ بالآخر انہیں مبتدعین کے ہاتھوں ان کی شہادت واقع ہوئی"۔

ے علامہ محمد بن طاہر نے جب آگرہ جانے کا ارادہ کیا تھا تو شیخ وجیہ الدین علوی گجراتیؒ نے انہیں اشارۃً وکنایۃً مختلف طریقوں سے اس ارادہ سے روکنا چاہا لیکن محمد بن طاہر اپنے ارادہ سے باز نہ آئے، شیخ وجیہ الدین گجرات کے علمائے کبار اور صوفیائے عظام میں تھے، ان کی عظمت وبلند پایگی کا یہ حال تھا کہ حضرت سید محمد غوث گوالیاری کے قتل کا فتویٰ جب سلطان محمود ثالث کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے اس کو صرف اس لئے قبول نہیں کیا کہ اس پر علامہ وجیہ الدین کے دستخط نہ تھے، وہ علامہ طاہر کے معاصر تھے اور دونوں میں مخلصانہ تعلقات تھے مگر وہ علامہ طاہر کے اصلاحی خیالات کو مصالح اور تقاضائے وقت کے خلاف سمجھتے تھے اور فرماتے تھے "اب برادرِ من سیاست، فراست کی بات نہیں ہے اور مشغولی حق کے ساتھ ہی ہونا زیبا ہے نہ خلق کے ساتھ۔

هذا اوان السكوت والتزام البيوت.

یہ زمانہ خاموشی اور مکان میں بیٹھ رہنے کا ہے۔

(مقدمہ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی ص ۳۸ و ۳۹ بحوالہ تذکرہ ابرار ص ۳۲۴)

ے مہدویت کی سرکوبی اور ازالہ بدعات کے علاوہ شیخ کی آگرہ کی روانگی کا یہ سبب بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اکبر بادشاہ کی

Marfat.com

گمراہی اور بے دینی کی اصلاح کے خیال سے وہاں جا رہے تھے کیونکہ انہیں پتہ چلا تھا کہ ابوالفضل اور فیضی نے بادشاہ کو گمراہ اور بے دین کر دیا ہے اسی لئے ان کے قتل کے بارہ میں ایک روایت یہ بھی منقول ہے کہ جب ابوالفضل اور اس کی پارٹی کو معلوم ہوا کہ علامہ محمد بن طاہر ہمارے جتھے کو منتشر کرنے اور اکبر کو قدیم دینداری کے طریقہ پر لانے کے لئے آگرہ تشریف لا رہے ہیں تو یہ سب لوگ بہت گھبرائے کیونکہ انہیں شیخ کے غیر معمولی فضل و کمال کا اندازہ تھا اور وہ جانتے تھے کہ بحث و مناظرہ میں ان سے پیش نہیں آسکتے اس لئے ان لوگوں نے علامہ موصوف کے قتل کے لئے کچھ لوگوں کو مقرر کر دیا جنھوں نے موقع پا کر اُن کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ (مقدمہ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی ص ۷۳ تا ۷۶)

تجہیز و تکفین:

اوپر گزر چکا ہے کہ شیخ محمد بن طاہر کی شہادت کا واقعہ ۶، شوال ۹۸۶ھ کو اجین اور سارنگ پور کے درمیان پیش آیا تھا لاش وہاں سے پٹن لائی گئی اور آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شیخ نے اپنے جن مرید کے یہاں سارنگ پور میں تین روز قیام کیا تھا ان کا نام شیخ حاجی محمد تھا، انہوں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے مجھ کو شہید کر دیا تم آکر کفن دفن کرو، چنانچہ وہ اپنے عزیزوں کو لے کر وہاں پہنچے اور جسد مبارک کو سارنگ پور لاکر تجہیز و تکفین کی، جنازہ کی نماز بڑی شان سے ہوئی اور کئی دفعہ ہوئی اور شیخ بھکاری کے قبہ میں دفن کیے گئے، اکبر بادشاہ کو معلوم ہوا تو اس نے لاش پٹن میں منتقل کر دینے کا حکم دیا چنانچہ لاش پٹن لائی گئی اور ان کی اولاد نے ایک مشہور تعمیر شدہ گنبد خرید کر اس میں دفن کیا جہاں آج تک لوگ زیارت اور فاتحہ خوانی کے لئے جاتے ہیں۔

(مقدمہ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی ص ۳۵، ۷۶ و ترجمہ رسالہ مناقب ص ۱۰۵ و ۱۰۶ ماٰثر الکرام ج ۱ ص ۱۹۵، النور السافر ص ۳۶۱)

اولاد و احفاد:

تاریخ گجرات کے مشہور محقق و فاضل مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم نے شیخ محمد بن طاہر کا مختصر شجرہ نسب تحریر کیا ہے، (مقدمہ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی ص ۸۵) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل چار حضرات ان کی جسمانی یادگار تھے۔

۱: ابراہیم: شیخ محمد بن طاہر کے خلف اکبر تھے۔

۲: احمد: رسالہ مناقب کے مصنف قاضی القضاۃ شیخ عبدالوہاب کے والد ماجد تھے۔

۳: ابوبکر۔

۴: نورالحق۔

ان لوگوں کے حالات نہیں ملے، البتہ احفاد میں بعض کے نام اور حالات معلوم ہوئے ہیں جن کو یہاں اس خیال سے پیش کیا جاتا ہے کہ شاید آئندہ پھر ان پر لکھنے کا موقع نہ مل سکے۔

شیخ عبدالوہاب:

یہ احمد کے بیٹے اور شیخ کے پوتے تھے، ان کی پیدائش اور تعلیم پٹن میں ہوئی، اصول اور فقہ کی جانب ان کا میلان زیادہ

Marfat.com

تھا، شاہجہان کے دور میں پٹن کے قاضی مقرر ہوئے عالمگیر کے ایام شہزادگی میں دکن پہنچے، اس نے بڑی عزت افزائی کی اور جب خود تخت نشین ہوا تو قاضی عسکر بنایا، یہاں ان کا اثر و اقتدار بڑھتا گیا وہ عرصہ تک قاضی کے عہدہ پر فائز رہے، پھر قاضی القضاۃ اور آخر میں اقضی القضاۃ کے عہدہ پر پہنچ گئے۔

شیخ عبدالوہاب دینی معاملات میں سخت تھے اور کبھی رشوت نہیں لیتے تھے بلکہ اپنے مال سے تجارت کے ذریعہ گزر بسر کرتے تھے۔ امراء ان سے حسد کرتے تھے مگر ان کے غیر معمولی رسوخ و اقتدار کی بنا پر ان سے خوف بھی کھاتے تھے، رسالہ مناقب انہی کی تصنیف ہے جس میں اپنے دادا کے حالات و کمالات تحریر کیے ہیں، آخر عمر میں علالت کی وجہ سے پنجاب سے دہلی آئے اور ۱۸، رمضان المبارک ۱۰۸۶ھ کو وفات پائی، ان کے چار لڑکے تھے جو فضل و کمال اور زہد و اتقا میں یگانہ و بے مثال تھے۔ (مقدمہ تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر محدث پٹنی ص ۷ و ۸)

شیخ الاسلام بن شیخ عبدالوہاب:

بڑے لڑکے کا خطاب شیخ الاسلام تھا، یہ ابتدا میں دہلی کے قاضی پھر قاضی عسکر ہوئے۔ بڑے دیانتدار تھے، اپنے باپ کے ترکہ میں سے کچھ نہ لیا اور اپنا حصہ باپ کے دوسرے وارثوں میں تقسیم کر دیا، ان کے حصہ کی مقدار جواہرات اور اثاث البیت کے علاوہ ایک لاکھ اشرفی اور پانچ لاکھ روپے نقد تھی، باپ کے انتقال کے بعد ۱۰۸۶ھ میں عالمگیر نے مجبور کر کے انہیں اقضی القضاۃ کا عہدہ عنایت کیا، اس بڑے منصب کے فرائض بھی انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیئے، وہ بادشاہ کے سامنے بھی حق کہنے سے دریغ نہ کرتے، مقدمات میں اکثر یہ کوشش کرتے کہ فریقین صلح کر لیں، انہوں نے اکثر مقدمات کا تصفیہ اسی طرح کیا، ۱۰۹۶ھ میں حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے، واپس آ کر گھر پر بیٹھ رہے اور ملازمت ترک کر دی، عالمگیر ان کی خوبیوں کی وجہ سے ان کا بہت گرویدہ تھا اور ملازمت کی پیش کش بھی کرتا رہتا تھا مگر وہ ہمیشہ انکار کر دیتے تھے، ۱۱۰۹ھ میں اس نے ملاقات کے لئے طلب کیا اس کا خیال تھا کہ سامنے آنے پر جب کوئی خدمت سپرد کی جائے گی تو انکار نہ کر سکیں گے۔

بادشاہ کی طلب پر وہ روانہ ہو گئے مگر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ خداوندا میری اور بادشاہ کی ملاقات نہ ہو چنانچہ راستہ ہی میں انتقال فرما گئے، شیخ الاسلام کے بھی چار لڑکے تھے:

سراج الدین، اکرام الدین یا اکرام الحق، نور الحق، عبدالحق۔ (مقدمہ تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی ص ۸)

اکرام الحق:

یہ صوبہ احمد آباد کے صدر ہوئے، شیخ الاسلام خاں ان کا خطاب تھا، اچھی عمر پائی اور اللہ نے دولت و ثروت سے بھی نوازا، احمد آباد میں کافی صرفہ سے ایک مدرسہ قائم کیا جس کے ساتھ دار الاقامہ اور مسجد بھی تھی جواب بھی احمد آباد کے محلہ استور یہ قاضی دھابہ میں موجود ہے، مدرسہ اپنے استاد شیخ نور الدین کے سپرد کیا جن کی قبر اسی احاطہ میں آج بھی موجود ہے، شیخ الاسلام آخر عمر میں حج کے لئے تشریف لے گئے، واپسی کے بعد ابتر سیاسی حالات اور مارواڑیوں اور مرہٹوں کے گجرات پر قابض ہو جانے

Marfat.com

کی وجہ سے وہاں آنے کے بجائے سورت ہی میں مقیم ہو گئے اور یہیں وفات پائی، لاش احمد آباد لائی گئی اور اپنے تعمیر کردہ مدرسہ میں دفن ہوئے۔

نور الحق:

قاضی عبدالوہاب کے دوسرے صاحبزادے نور الحق بھی صاحب فضل وکمال اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے تھے، عالمگیر کے زمانہ میں محتسب عسکر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ (یاد ایام ص ۱۷)

عبد الحق:

یہ بھی قاضی صاحب کے صاحبزادے اور عہد عالمگیری میں باریاب حضور تھے، وقتاً فوقتاً مختلف عہدوں پر فائز رہے، زیادہ تر شاہی کارخانوں کی داروغگی کے منصب پر مامور رہے، داروغگی انہی امرا کو دی جاتی تھی جن پر بادشاہ کو اعتماد ہوتا تھا۔ (ایضاً)

محی الدین:

قاضی عبدالوہاب کے بیٹے اور عہد عالمگیری میں عہدہ دار تھے۔ قاضی القضاۃ بھی ہوئے، ۱۱۰۰ھ میں وفات پائی۔ (ایضاً)

شیخ عبد القادر:

یہ ملا محمد بن طاہر کے پوتے اور ان کے صاحبزادے ابوبکر کے بیٹے تھے، علم وفضل، فصاحت وبلاغت اور بالخصوص فقہ وافتا میں یکتائے روزگار تھے، برسوں حرم کے مفتی رہے، ان کی تصنیفات میں چار جلدوں پر مشتمل فتاوی کا ایک مجموعہ تھا، وفات ۱۱۳۸ھ میں ہوئی، شیخ عبداللہ طرفہ انصاری ان کے استاد تھے، اور انہوں نے ان کی وفات پر مرثیہ بھی کہا تھا جس میں شیخ محمد بن طاہر کے صدیقی ہونے کی صراحت کی ہے۔ (اتحاف النبلاص ۳۹۸)

تصنیفات:

گو شیخ محمد بن طاہر آخر عمر میں اپنے وطن کے پرآشوب حالات بدعتوں کے فروغ اور مہدویت کے زور کی وجہ سے کافی پریشان رہے اور انہیں وہ سکون، دلجمعی اور فراغ خاطر نصیب نہ تھا جو تصنیف وتالیف کیلئے درکار ہوتا ہے تاہم وہ جب علوم کی تحصیل کے بعد حجاز سے اپنے وطن تشریف لائے تو ان کی تمام تر توجہ علمی کاموں کی جانب ہی مبذول رہتی تھی، مورخین کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے علاوہ ان کا کوئی اور مشغلہ نہ تھا، (اخبار الاخیار ص ۲۶۴) اس سے قطع نظر وہ فطری مصنف تھے اس لئے انہوں نے بہت سے علمی رسائل اور بلند پایہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، فن حدیث سے ان کو زیادہ شغف تھا اور اس موضوع پر ان کی کتابیں بے نظیر اور عظیم الشان ہیں جن کی اہمیت ومقبولیت میں اب بھی فرق نہیں آیا ہے اور ان سے ہندوستان کی طرح حجاز میں اور دوسرے عرب ملکوں کے لوگ بھی فیض یاب ہو رہے ہیں۔ ذیل میں ان کی

Marfat.com

تصنیفات کے نام دیئے جاتے ہیں، اور اہم کتابوں پر مختصر تبصرہ بھی قلمبند کیا جاتا ہے۔

۱: توسل (فن رجال میں ہے)

۲: چہل حدیث

۳: حاشیہ توضیح وتلویح (نام سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مشہور فقہی کتاب توضیح وتلویح پر یہ حاشیہ لکھا تھا)

۴: حاشیہ صحیح بخاری (ناموں سے ظاہر ہے کہ صحیحین اور مشکوٰۃ پر

۵: حاشیہ صحیح مسلم مصنف نے حواشی تحریر کیے تھے)

۶: حاشیہ مشکوٰۃ المصابیح

۷: حاشیہ مقاصد الاصول

۸: خلاصۃ الفوائد (علم صرف میں ہے)

۹: دستور الصرف (یہ بھی صرف میں ہے)

۱۰: رسالہ احکام بیر: فقہی رسالہ معلوم ہوتا ہے جس میں کنوئیں کے احکام ومسائل درج ہوں گے۔

۱۱: رسالہ امساک مطر

۱۲: رسالہ فضیلت صحابہؓ

۱۳: رسالہ لحکیہ

۱۴: رسالہ نہروالہ: (دشمنوں کے خوف سے رسالہ مکیہ کے نام سے مشہور ہوا)

۱۵: سوانح نبویؐ، عربی زبان میں ایک مختصر رسالہ ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ کی ولادت سے لے کر وفات تک کے حالات سال بسال تحریر کیے ہیں۔

۱۶: سوانح نبویؐ، اسی قسم کا رسالہ فارسی زبان میں بھی مختصر طور پر تحریر کیا ہے۔

۱۷: شرح عقیدہ (علم کلام میں ہے)

۱۸: طبقات حنفیہ

۱۹: عدۃ المتعبدین

۲۰: کفایۃ المفرطین (شافیہ کی شرح اور علم صرف میں ہے) اس کا ایک نسخہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد کے کتب خانہ میں ہے۔ یہ ۹۶۱ھ کی تصنیف ہے۔ یہ شرح طالبعلموں کے لئے آسان زبان میں لکھی گئی ہے، اس میں اصل میں مذکور مشکل لفظوں کے معنی، اور پیچیدہ جملوں کو آسان لفظوں میں حل کیا گیا ہے اور جہاں مصنف نے غیر معروف مثالیں دی ہیں شارح نے ان کو واضح کر دیا ہے۔ (مقدمہ تذکرہ محمد بن طاہر محدث پٹنی ص ۸۲)

۲۱: مختصر اتقان: (علامہ سیوطی کی مشہور تصنیف اتقان کا مختصر ہے)

۲۲: مختصر مستظہر

Marfat.com

۲۳: مقاصد جامع الاصول (صحاح ستہ کی حدیثوں پر مشتمل ہے)
۲۴: منہاج السالکین۔ (راہ سلوک میں سالکین کو جن احادیث کی ضرورت ہوتی ہے انہیں اس میں پیش کیا ہے)
۲۵: نصاب البیان (علم معانی میں)
۲۶: نصاب المیزان (علم منطق میں)
۲۷: نصیحۃ الولاۃ والرعاۃ والرعیۃ، سلطان محمود حاکم گجرات کی وفات کے بعد شیر خان اور موسیٰ خان فولادی حاکم پٹن خود مختار ہو بیٹھے، یہ دونوں فرقہ مہدویہ کے پیروکار تھے اور اہلسنت کو بہت ایذا دیتے اور نقصان پہنچاتے تھے ان کو اس ظلم وجور سے باز رکھنے کے لئے شیخ نے یہ رسالہ تحریر فرما کر (اس کا حاکموں کے پاس ایک) ایک نسخہ بھیجا اس میں خدا کا خوف، عدل، ظلم وغیرہ کے بعد میٹھے الفاظ میں پند ونصائح بھی تحریر کیے۔

یہ تحریر لکھی جا چکی تھی کہ پاکستان کے ایک فاضل محقق ڈاکٹر سلیم اختر کا ایک مقالہ ہماری نظر سے گزرا۔ ان کو ۹۷۹ھ میں خطہ مہران کے ایک مطالعاتی دورے کے دوران خیر پور پبلک لائبریری میں شیخ محمد بن طاہر پٹنی کی مذکورہ بالا کتاب کا ایک قدیم مخطوطہ دیکھنے میں آیا، اس مقالہ میں اس نسخہ کا تعارف اور محمد بن طاہر کے حالات قلمبند کرنے کے علاوہ کتاب کا پورا متن بھی شائع کیا ہے، ڈاکٹر صاحب نے اسے محمد بن طاہر کی ایک نو دریافت تالیف بتایا ہے اور لکھا ہے کہ:

''شیخ محمد بن طاہر کے آثار کی فہارس میں اس کتاب کا نام تو کجا اس بات کا ذکر بھی نہیں ملتا کہ انہوں نے اس موضوع پر کبھی قلم بھی اٹھایا تھا۔'' تاہم ان کے شائع کردہ متن میں رسالہ کا نام تحفۃ الولاۃ ونصیحۃ الرعیۃ والرعاۃ دیا ہے، ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ خیر پور کی پبلک لائبریری کا مخطوطہ $10\frac{1}{2} \times 18\frac{1}{2}$ سم سائز کے ۸۱ صفحات پر محیط ہے اور ہر صفحے پر ۶ سم لمبی تیرہ سطریں ہیں، کتابت خط نستعلیق میں ہے، اور عنادین سرخ روشنائی میں مرقوم ہیں، اہم الفاظ وعبارات کی نشاندہی سرخ خطوط سے کی گئی ہے۔ املا کی بعض خصوصیات بھی ہیں، یہ نسخہ ۱۰۳۴ھ۔ ۱۶۲۵ء کا لکھا ہوا ہے گویا مصنف کی وفات ۹۸۶ھ۔ ۱۵۷۸ء کے نصف صدی بعد کا نسخہ ہے۔ کتاب کی ابتدا میں حمد ونعت اور منقبت کے بعد مصنف لکھتے ہیں:

''جب اس شاہ شیران اعظم وخان خاناں معظم'' نے اپنے بھائی قطب خوانین مرحوم طاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خلق خدا کے سروں پر سے جباروں اور غمازوں کے دبدبے کو ختم کر کے ان کی آسودگی خاطر کے لئے عدل کو عام کرنے، شرعی قوانین کو رواج دینے وغیرہ کا فیصلہ کیا اور اولوالامر وقضات کی درستی اور نصیحت کے جذبے نے مجھے اس بات پر ابھارا کہ اس موضوع سے متعلق نبی کریم کی چند احادیث اور ماضی کے فضلاء کے کچھ اقوال کو الگ سے لکھا جائے تاکہ وہ متذکرہ بالا سعی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے اور قطب مرحوم کی مرضی کے اجرا میں مفید ومددگار ثابت ہو سکیں اور پھر اس مجموعے کے ساتھ علم فراست پر مبنی چند لطائف کا بھی اضافہ کر دیا جائے جو امور سلطنت کی تفویض اور مستحقین کو مختلف مناصب کے اعطا میں ایک ناصح وزیر اور واضح دستور کا کام دیں اور ان سے تمام ارباب نظم ونسق کو فائدہ پہنچے اور وہ ان پر عمل پیرا ہو کر آخرت کی ابدی اور دنیا کی عارضی زندگی کے ثمرات سے بیک وقت کما حقہ بہرہ ور ہو سکیں''۔

مقدمہ کے علاوہ کتاب کے مباحث ومشمولات کی فہرست یہ ہے:

Marfat.com

(۱) فصل دومکارم اخلاق۔

(۲) فصل فی فضلہ (عام لوگوں کے مقابلے میں سلطان عادل کی فضیلت)۔

(۳) فصل فی خطرہ (اس میں یہ دکھایا ہے کہ اقتدار و بادشاہی جہاں اعزاز کی چیز ہے وہاں اس کے کچھ لوازم بھی ہیں جن کی بجا آوری میں کوتاہی قیامت کے دن سلطان کو گرفتار عذاب بھی کرا سکتی ہے)۔

(۴) فصل در سیرت سلاطین سلف (نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ اور خلفائے راشدینؓ کے ذکر میں)۔

(۵) فی شرائط السلطنت (بادشاہوں کو کن چیزوں کو کرنا اور کن سے بچنا چاہیے)۔

(۶) فصل در حقوق رعایا (مسلم وغیر مسلم رعایا کے بادشاہ پر کیا حقوق ہوتے ہیں)۔

(۷) فصل در بعض نصائح (سلطان محمد ملک شاہ کے نام امام غزالی کا ایک خط درج کیا ہے)۔

علامہ محمد بن طاہر کے پوتے شیخ عبدالوہاب نے رسالہ مناقب میں مذکورہ بالا کتب و رسائل کا ذکر کیا ہے، اب ہم ان کی اہم تصنیفات کا ذکر کریں گے، ان کتابوں کا اکثر مصنفین نے بھی ذکر کیا ہے، اور انہی کی وجہ سے علامہ کا درجہ حدیث اور اسماء الرجال وغیرہ میں بہت بلند ہے۔

۸: المغنی، اسماء الرجال کی مفید اور عمدہ کتاب ہے، تذکروں اور فہرستوں میں اس کا مکمل نام مختلف طور پر درج ہے لیکن خود مصنف نے مجمع بحار الانوار کے مقدمہ میں اس کا نام المغنی فی ضبط الرجال لکھا ہے۔ اس میں رواۃ و رجال کے ناموں کو ضبط کیا گیا ہے، اور ان کی تصحیح کی گئی ہے، شاہ عبدالحق دہلوی فرماتے ہیں۔

ورسالہ دیگر مسمی بمغنی کہ تصحیح اسماء الرجال کردہ بے تعرض بہ بیان احوال بغایت مختصر و مفید۔ (اخبار الاخیار ص ۲۶۴)

دوسرا مختصر رسالہ جو مغنی کے نام سے موسوم ہے اس میں رجال کے ناموں کی تصحیح کی گئی ہے اور ان کے حالات سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے نہایت مختصر مگر مفید ہے۔

شیخ محمد بن طاہر نے مجمع بحار الانوار میں رواۃ و رجال کے ناموں اور مقامات کو مکمل طور پر ضبط نہ کرنے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ اس پر اصل بحث المغنی میں ہو چکی ہے، (مقدمہ مجمع بحار الانوار) اس لطیف عالمانہ اور عمدہ تصنیف کا اصل مقصد رواۃ کے ناموں کا تلفظ حروف و حرکات کے ذریعہ ظاہر کرنا ہے، اس لئے اس میں ان کے حالات سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے، آخر میں رسم کتابت پر ایک فصل سپرد قلم کی گئی ہے اور ایک فصل میں علماء کی تاریخ پیدائش و وفات کی نشاندہی کی گئی ہے، یہ کتاب متعدد بار چھپ چکی ہے، بعض کتابوں کے ساتھ بھی اور علیحدہ بھی، دہلی سے ابن حجر عسقلانی کی تقریب التہذیب کے حاشیہ پر بھی طبع ہوئی تھی۔

۲۹: تذکرۃ الموضوعات:

یہ کتاب بھی اہم اور محققانہ ہے جو امام شوکانی اور ملا علی قاری کی اس فن کی تصنیفات سے ضخامت اور حجم میں زیادہ ہے، یہ ۹۵۸ھ کی تصنیف ہے۔ اس میں موضوع حدیثوں کے علاوہ ان کے بارہ میں محدثین اور نقادانِ فن کے اقوال بھی اس لیے نقل کیے ہیں تاکہ لوگ احادیث کو موضوع، ضعیف یا صحیح قرار دینے میں افراط و تفریط کے بجائے احتیاط سے کام لیں کیونکہ غالی اور

Marfat.com

مفرط قسم کے لوگ محض سنی سنائی باتوں کی وجہ سے حدیث کے موضوع ہونے کا فیصلہ کر دیتے ہیں اور خود غور وفکر سے کام نہیں لیتے، اسی لئے شیخ محمد بن طاہر نے اس کے مقدمہ میں متنبہ کیا ہے کہ اگر کوئی مصنف کسی حدیث کو موضوع بتائے تو جب تک دوسرے ذرائع سے اس کی تصدیق وتائید نہ ہو جائے اس حدیث کو موضوع نہ سمجھا جائے، حافظ ابن جوزی اس فن کے امام سمجھے جاتے ہیں مگر انہوں نے حدیثوں کو موضوع قرار دینے میں افراط سے کام لیا ہے اسی لئے علمائے فن نے ان پر نقد وتعاقب کیا ہے، علامہ سیوطی کا بیان ہے کہ ان کی کتاب موضوعات میں ضعیف تو درکنار بہت سی صحیح اور حسن روایتوں کی بھی تخریج کی گئی ہے، علامہ ابن صلاح نے ابن جوزی کی کتاب کی تین سو حدیثوں کے متعلق بتایا ہے کہ یہ موضوع نہیں ہیں، ان میں ایک حدیث صحیح مسلم اور صحیح بخاری کی بھی ہے جو حماد بن شاکر سے مروی ہے اور بقیہ حدیثیں صحاح وسنن کی دوسری کتابوں کی ہیں، احمد بن ابی المجد سے منقول ہے کہ ابن جوزی کا ان روایتوں کو موضوع بتانا درست نہیں ہے جن کے کسی راوی پر اس قسم کا نقد کیا گیا ہے کہ ''وہ ضعیف یالین ہے یا قوی نہیں ہے، کسی راوی کے بارہ میں اس قسم کے کلام کی وجہ سے اس کے روایت کو موضوع سمجھ لینا زیادتی ہے، اس افراط اور تشدد کے مقابلہ میں بعض کوتاہ اور سہولت پسند قسم کے لوگ ہر اس چیز کو جو حدیث کے نام سے بیان کی جاتی ہے صحیح باور کر لیتے ہیں''۔ (دیباچہ تذکرۃ الموضوعات ص ۳)

اس کتاب میں مختلف عنوانات قائم کر کے ان کے تحت موضوع حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔ مصنف نے یہ کتاب بڑی کاوش اور تحقیق سے لکھی ہے اور اس کی تالیف میں متعدد کتابوں سے مدد لی ہے جن کا ذکر بھی دیباچہ میں کیا ہے، مصر سے یہ کتاب چھپ چکی ہے،

• ۳: قانون الموضوعات: یہ کتاب بھی مفید اور اہم ہے، اس میں غیر صحیح، وضاع اور کذاب راویوں کا ذکر ہے، مصنف نے اس میں حروف تہجی کی ترتیب سے ان راویوں کو جمع کیا ہے جو موضوع حدیثیں بناتے تھے یا بیان کرتے تھے، آخر میں دو فصلیں کنیت اور نسب میں ہیں، انہوں نے راویوں کے نام کے ساتھ ان کے اوصاف بھی بیان کیے ہیں، جن سے ان کا غیر معتبر ہونا واضح ہو جاتا ہے اور کتابوں کے حوالے بھی دیئے ہیں، اسے تذکرۃ الموضوعات کے بعد مرتب کیا تھا، وہ خود لکھتے ہیں کہ ''تذکرۃ الموضوعات سے فارغ ہونے کے بعد میں نے ارادہ کیا کہ ضعیف، کذاب، وضاع اور مفتری راویوں کو جمع کر دوں تا کہ اس کی حیثیت موضوع روایات کی معرفت اور ضعیف اور گڑھی ہوئی حدیثوں کے ضبط کے بارہ میں ایک کلی قاعدہ وقانون کی ہو جائے''۔ (ایضا)

یہ کتاب بھی محنت وتحقیق کا نتیجہ ہے اور تذکرۃ الموضوعات کے ساتھ یہ بھی طبع ہو چکی ہے۔

• ۳: مجمع بحار الانوار: اس کتاب کا اصل اور مکمل نام مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل الاخبار ہے، مگر اختصار اور عرف کی بنا پر عموماً لوگوں نے پورا نام لکھنے کے بجائے صرف مجمع البحار لکھا ہے، یہ مصنف کی سب سے اہم اور مہتم بالشان کتاب ہے، ان کا بیان ہے کہ اس کی بنیاد نہایہ ابن اثیر اور ناظر عین الغریبین پر رکھی ہے، یہ ایک جامع لغت ہے جس میں کلام مجید اور حدیث کے مشکل الفاظ کی لغوی تحقیق کی گئی ہے، یہ کتاب اگرچہ مشکل اور غریب الفاظ حدیث کی توضیح کے لئے لکھی گئی ہے اور اس لحاظ سے یہ واقعتاً عدیم المثال ہے مگر مصنف نے چونکہ ان حدیثوں کو بھی نقل کر دیا ہے جن میں یہ الفاظ مذکور ہیں، اس طرح یہ حل

Marfat.com

لغات کے علاوہ حدیثوں کی عمدہ شرح وتفسیر بھی ہے، اسی لئے علمائے فن نے اس کو صحاح ستہ کی شرح بھی کہا ہے حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

ازآنجملہ کتابے است کہ متکفل شرح صحاح است مسمیٰ بہ مجمع البحار۔ (اخبارالاخیارص ۲۶۴)

ان کی تصنیفات میں ایک کتاب جوصحاح کی شرح کی ضامن ہے اس کا نام مجمع البحار ہے

گلزارابرار کے مصنف لکھتے ہیں:

''ایک مشکل شرح احادیث کی صحاح ستہ پر ہے''۔ (اذکارابرارادوترجمہ گلزارالابرارص ۳۲۲ بحوالہ معارف مارچ ۵۵ء)

تاریخ احمدی میں ہے:

''صحاح ستہ کی شرح کوحاوی ہے'' (تاریخ احمدی ص ۱۳۷)

شیخ عبدالوہاب کا بیان ہے:

''جوایک طرح سے حدیث کی شرح ہے''۔ (رسالہ مناقب ص ۹۹)

اور احادیث کی طرح یہ قرآنی الفاظ کی بھی جامع لغت ہے، اس کی ترتیب مادہ کے حروف پر کی گئی ہے، جواس فن کی کتابوں میں فائق اور عمدہ ہے۔ نواب صدیق حسن خان صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''یہ عمدہ اور پاکیزہ کتاب قرآن وحدیث کی غرائب کی جامع ہے جس کے پاس یہ کتاب موجود ہواسے اس فن کی دوسری کتاب کی احتیاج نہیں رہتی''۔ (اتحاف النبلاص ۱۳۴)

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی لکھتے ہیں:

''اس میں کلام مجید اور حدیث کے مشکل لغات کا حل اس انداز سے کیا ہے کہ صحاح ستہ کی شرح بھی ضمناً ہوگئی ہے''۔

(مقالات شروانی ص ۳۹۸)

ڈاکٹر زبید احمد صاحب رقمطراز ہیں:

''شیخ محمد بن طاہر پٹنی کی تصنیف لطیف ہے، اس کو اپنے مرشد کامل شیخ علی متقی کے نام گرامی سے معنون کیا ہے، یہ تصنیف قرآن و حدیث کا جامع لغت ہے، الفاظ کی ترتیب مادہ کے حروف پر ہے، ایک مادہ کے جس قدر حروف قرآن وحدیث میں آئے ہیں ان سب کو ایک جگہ بیان کرتے ہیں اور جن احادیث میں وہ الفاظ آئے ہیں ان کو بھی نقل کرتے ہیں، اس سے پہلے غرائب قرآن و حدیث پر کئی کتابیں لکھی جاچکی ہیں لیکن میری ناقص رائے میں یہ سب سے بہتر اور جامع تر ہے''۔ (معارف دسمبر ۴۲ء)

صاحب معجم المطبوعات تحریر کرتے ہیں۔

''آیات واحادیث کے مطالب کے کشف اور کتاب وسنت کے معانی کی توضیح کیلئے یہ بڑی جامع کتاب ہے''۔

(معجم المطبوعات کالم ۱۶۷۱)

غالباً طوالت کے خوف سے حدیثیں بلاسند نقل کی ہیں لیکن ان کتابوں کے حوالے دیئے ہیں جن سے حدیثیں ماخوذ ہیں کتاب کے شروع میں ان رموز واشارت کا ذکر بھی کیا ہے جو کتابوں اور مصنفوں کے دیئے گئے ہیں۔ (اکتفاء القنوع ص ۱۳۵)

کتاب کی اس عظمت واہمیت کی بناپر اسے غیر معمولی شہرت ومقبولیت نصیب ہوئی اور جب سے یہ تصنیف ہوئی ہے اسی

Marfat.com

زمانہ سے اسے اہل علم میں بڑا حسن قبول حاصل ہے، خود مصنف کی زندگی ہی میں اسے بڑی شہرت و مقبولیت ہوگئی تھی اور اس کی نقلیں اور نسخے دور دراز کے شہروں پھیل گئے تھے، اسے مرتب کر کے مصنف نے دراصل علماء پر بہت بڑا احسان کیا ہے، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

علمائے اعلام نے اس کی جانب غیر معمولی اعتنا کیا، یہی وجہ ہے کہ مصنف کی زندگی ہی میں یہ کتاب پورے طور پر مقبول ہوگئی اور اس کی نقلیں دُور دراز کے شہروں پھیل گئیں انہوں نے اس کی نقل میں ایسی رغبت دکھائی کہ ہندوستان کے شہروں کا شاید ہی کوئی قابل ذکر کتب خانہ ایسا ہو جس میں اس کا نسخہ موجود نہ ہو، یہ کتاب علوم دینیہ سے شغف رکھنے والے تمام اصحاب علم کے پیش نظر رہتی ہے، ان کے حوالہ و ماخذ کا کام دیتی ہے اور وہ اس سے مشکلات میں استفادہ کرتے ہیں''۔

(مقدمہ مجمع البحار مطبوعہ حیدر آباد)

شیخ محمد بن طاہر کے پوتے شیخ عبدالوہاب فرماتے ہیں:

''اس یگانہ روزگار کی کتابیں بے حد مقبول ہوئیں، چنانچہ قدوۃ المحققین شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس فقیر سے خود فرمایا کہ میں مکہ معظمہ میں تھا اور ہندوستان آنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ عارف کامل حضرت مولانا شیخ علی متقی کو خواب میں دیکھا کہ حضرت فرما رہے ہیں کہ گھر جاتے وقت پٹن کی طرف سے جانا کہ وہاں تم کو ایک بڑی نعمت حاصل ہوگی، چنانچہ اپنے مرشد اور استاد کے حکم کے بموجب اس ارادہ سے واپس ہوا جب موضع کجیہ پہنچا جو پٹن سے دو کوس پر واقع ہے تو شیخ کریم یعنی محمد بن طاہر کے بڑے لڑکے شیخ محمد ابراہیم جو میرے استقبال کے لئے آئے ہوئے تھے، مجھے ملے اور وہ مجھ سے اس طرح ملے جیسے مخلص اور شناسا آدمی کے ساتھ ملنا ہے، پھر مجمع البحار مجھے عنایت کی اور باوجود اس کے کہ ہماری ان کی کبھی ملاقات نہ تھی پھر بھی صداقت، خلوص اور محبت ایسی دکھائی جو دوستوں کے شایان شان ہے اس لئے ان سے اس کا سبب پوچھا، انہوں نے فرمایا کہ اس رات کو حضرت شیخ نے مجھے خواب میں فرمایا کہ شیخ عبدالحق مکہ سے روانہ ہو کر اس ملک کے اطراف میں آئے ہیں تم جا کر ان کا استقبال کرو اور کتاب مجمع البحار ان کو دے دو، اس کے بعد عرصہ تک پٹن میں مقیم رہا اور چونکہ اس کتاب کے سوا کوئی دوسری چیز مجھے نہیں ملی، سمجھا کہ ''نعمت عظمیٰ'' سے مراد یہی کتاب ہے''۔ (رسالہ مناقب ص ۹۲)

کتاب کے مقدمہ میں مصنف نے علم حدیث کی اہمیت بیان کی ہے اور غرائب پر قدیم مصنفین اور علمائے اسلام کے اعتنا اور کتابیں لکھنے کا ذکر کیا ہے پھر خود اس موضوع پر یہ کتاب لکھنے کی وجہ، اس کی نوعیت اور وہ اصول تحریر کیے ہیں جن کو اس کتاب میں مدنظر رکھا ہے، کتاب کے آخر میں مصطلحاتِ حدیث کی وضاحت اور سادات کی تاریخ درج ہے ذیل میں اس کی چند نمایاں خصوصیات پیش کی جاتی ہیں۔

۱: یہ اپنے موضوع پر اہم اور حاوی ہونے کی علاوہ احادیث کی تشریح و تفسیر کے لحاظ سے بھی نہایت مفید، کارآمد اور بلند پایہ کتاب ہے۔

۲: ابن اثیر کی نہایہ اس موضوع پر بے نظیر کتاب خیال کی جاتی ہے، مجمع البحار میں اس کے تمام مباحث سمیٹ لئے گئے ہیں اس کی کوئی اہم بحث شاذ و نادر ہی اس میں شامل ہونے سے رہ گئی ہو البتہ جو باتیں زیادہ مشہور ہیں انہیں ان میں قلم انداز کر دیا

Marfat.com

گیا ہے۔ النہایہ کے علاوہ بھی اس فن کی اہم تصانیف کے مندرجات اور مفید بحثوں کو بھی اس میں نقل کیا گیا ہے۔

۳۳: اس موضوع پر اس سے پہلے جو کتابیں لکھی گئی ہیں یہ ان سب کی جامع بھی ہے اور ان پر اضافہ بھی ہے۔ کیونکہ اس میں متعدد ایسے امور سے بھی تعرض کیا گیا ہے، جن کے ذکر سے اس فن کی دوسری کتابیں خالی ہیں۔

۳۴: اوپر ذکر آچکا ہے کہ ابن اثیر کی النہایہ اس فن کی مہتم بالشان تصنیف ہے جس کے مباحث کو مجمع البحار میں سمیٹ لیا گیا ہے اس کے علاوہ اس کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس میں اس پر متعدد اضافے بھی کیے ہیں جیسے ابن اثیر نے عموماً کلمات کو ضبط نہیں کیا ہے مگر علامہ پٹنی ان کے ضبط کا بڑا اہتمام کرتے ہیں اور طلبہ کی سہولت کے خیال سے لفظوں کو اسی ہیئت میں نقل کرتے ہیں جس میں وہ حدیث میں آئے ہیں، اسی طرح صاحب النہایہ مادہ کے ذکر میں حدیث میں وارد اس کے دوسرے صیغوں اور مشتقات کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں مگر صاحب مجمع البحار صیغوں اور مشتقات کا بھی ذکر کرتے ہیں، انہوں نے بعض شارحین کے حوالہ سے بھی ابن اثیر کے بیان پر اضافے کیے ہیں۔

۳۵: یہ کتاب شرحوں کے کتابوں کے مباحث کی جامع بھی ہے، اس موضوع کی کتابوں میں لفظوں کے جو وضعی معنی بیان کیے گئے ہیں ان سے واقفیت کے بعد بھی حدیث کے مفہوم میں اشکال باقی رہتا ہے جس کے حل کے لئے کتب شروح کی احتیاج رہ جاتی ہے لیکن اس کتاب کا مطالعہ شروح سے بے نیاز کر دیتا ہے، کیونکہ مصنف ان امور کو بھی بیان کرتے ہیں جو شرحوں میں مذکور ہیں۔

۳۶: غریب الحدیث کے مصنفین نے ان لفظوں کے معنی نہیں لکھے ہیں جن کے وضعی معنی معلوم و مشہور ہیں لیکن مجمع البحار میں اسے اس لئے نقل کیا گیا ہے کہ زیر بحث حدیث میں اس لفظ کی تاویل کسی خاص نوعیت کی ہوتی ہے۔

۳۷: معنی حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے وہ شارحین کے بیان پر اضافہ بھی کرتے ہیں اس لحاظ سے یہ عام شرحوں پر بھی یک گونہ اضافہ ہے۔

ذیول، تکملے اور تعلیقات:

مصنف نے خود اس کتاب کا تکملہ اور ذیل بھی لکھا تھا، ان میں اصل پر بعض مفید اور قیمتی اضافے ہیں، تکملہ اور ذیل دونوں اصل کتاب کے آخر میں شامل ہیں

پٹن میں مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا جو قلمی نسخہ اب تک محفوظ ہے اس کے حاشیہ پر مفید تعلیقات بھی درج ہیں۔ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مصنف ہی کی تحریر کی ہوئی ہیں۔

مجمع البحار کی اہمیت کی وجہ سے مصنف کی زندگی ہی میں اہل علم نے اس کی بے شمار نقلیں تیار کی تھیں اس لئے مختلف کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں خود مصنف کے کتب خانہ کی جو کتابیں ابھی تک محفوظ رہ گئی ہیں ان میں مجمع البحار کا ایک قلمی نسخہ بھی ہے جو خاص مصنف ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، مولانا ابوظفر ندوی مرحوم نے اسے ملاحظہ فرمایا تھا، ان کے خیال میں اس کی کسی اندرونی شہادت سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی کہ یہ مصنف ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

(گجرات کی تمدنی تاریخ ص ۳۲۴، ۳۲۴، ۳۲۴)

Marfat.com

شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی نظر سے بھی لکھنو اور حیدر آباد میں اس کے دو قلمی نسخے گزرے ہیں جن کے بارہ میں ان کا خیال ہے کہ ''دونوں مصنف کی زندگی میں لکھے گئے تھے''۔

اسلامی علوم وفنون کی کتابوں کے اشاعت میں منشی نولکشور کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں انہوں نے اپنی سعی بلیغ سے اس کے چھ نسخے کر کے اور مولانا محمد مظہر سے مقابلہ وتصحیح کرا کے ۱۲۸۳ھ میں غالباً پہلی دفعہ اسے لکھنؤ سے شائع کیا تھا، اس مطبوعہ ایڈیشن میں شاہ عبدالحق دہلوی کے قلمی نسخہ کو بنیاد بنایا گیا ہے جسے شیخ کے صاحبزادے شیخ ابراہیم نے دیا تھا اور جو ۱۰۱۹ھ کا لکھا ہوا ہے، منشی جی کے اہتمام میں مجمع البحار کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے مگر اس کے بعد یہ کتاب کم یاب ہوگئی تھی، اس لئے مصنف کے بعض اہل خاندان نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے اس کی اشاعت کی درخواست کی، انہوں نے ندوۃ العلماء کے سابق استاد ادب مولانا عبدالحفیظ بلیاوی مرحوم کو اس کے مقابلہ وتصحیح کے کام پر مامور کیا جس کی نگرانی مشہور محدث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے کی۔ چنانچہ ان کی نظر ثانی کے بعد مجمع البحار کا نیا ایڈیشن ۱۳۸۷ھ میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد سے شائع ہوا جو شاندار اور موجودہ دور کے طباعتی معیار کے مطابق ہے، اس ایڈیشن میں مولانا اعظمی کا فاضلانہ مقدمہ اور عالمانہ حواشی بھی شامل ہیں جن سے اسکی اہمیت دوچند ہوگئی۔

Marfat.com

شیخ عبدالحق محدث دہلوی

(المتوفی ۱۰۵۳ھ-۱۶۴۲)

نام ونسب:

عبدالحق نام، ابوالمجد کنیت، حقی تخلص اور محدث دہلوی عرف ہے۔ نسب نامی حسب ذیل ہے:

عبدالحق بن سیف الدین بن سعداللہ بن فیروز بن ملک موسیٰ بن ملک معزالدین بن آغا محمد ترک بخاری۔

(اخبار الاخیار ص ۲۷۹ و مابعد مطبع ہاشمی میرٹھ مطبوعہ ۱۲۷۸ھ)

خاندان:

شیخ عبدالحق ایک سربرآوردہ اور ذی وجاہت خاندان کے فرد تھے وہ نسلاً ترک تھے، ان کے اجداد کا تعلق ماوراء النہر سے تھا، سب سے پہلے اس خاندان کے آغا محمد ترک بخاری سلطان علاؤالدین خلجی کے زمانہ میں بخارا سے دہلی آئے وہ اپنے خاندان کے سردار اور سربراہ تھے، اس لئے ان کے ہمراہ بہت سے ترک بھی اپنا اصل وطن چھوڑ کر دہلی چلے آئے جن میں ان کے اعزہ واقربا کے علاوہ مریدین ومتوسلین اور خدام بھی تھے۔ (ایضاً ۲۷۹)

آغا محمد ترک اور ان کے بیٹے ملک معزالدین:

آغا محمد ترک پر سلطان علاؤالدین خلجی کی خاص نظر عنایت رہی اور وہ بلند مراتب پر فائز ہوئے، یہ جس وقت دہلی تشریف لائے تھے اس وقت گجرات کی مہم کی تیاری ہو رہی تھی، بادشاہ نے اپنے امراء واعیانِ حکومت کے ساتھ انہیں بھی وہاں روانہ کیا اور گجرات فتح ہو جانے کے بعد وہیں مقیم رہنے کا حکم دیا، مگر کسی امیر سے کسی بات پر ان کی کچھ اَن بن ہو گئی، اس لئے وہ گجرات سے دہلی واپس آ گئے۔ اس دفعہ بادشاہ نے پہلے سے زیادہ ان کا اعزاز کیا اور بلند عہدے تفویض کیے۔

سلطان علاؤالدین کے بعد قطب الدین اور تغلق شاہ کے زمانہ میں بھی وہ اپنے خاندان کے ساتھ عزت وفراغت کی زندگی بسر کرتے رہے، دولت وثروت کے ساتھ اللہ نے ان کو اولاد کی کثرت سے بھی نوازا تھا مگر دفعتاً ایک حادثہ میں سب سے بڑے صاحبزادے ملک معزالدین کے علاوہ سب فوت ہو گئے۔ اس جانگداز سانحہ نے آغا محمد ترک کا سارا عیش ونشاط ختم کر دیا اور انہیں امارت ودولت، لاؤ لشکر اور خیل وحشم کسی چیز سے بھی دلچسپی نہیں رہی، چنانچہ ایک سیاہ ماتمی لباس پہن کر شیخ صلاح الدین سہروردی کے خانقاہ میں مقیم ہو گئے۔ ایک مدت کے بعد شیخ نے ان کو اہل وعیال کے پاس واپس جانے کی ترغیب دی اور یہ بشارت بھی سنائی کہ ان شاء اللہ اسی ایک باقی ماندہ فرزند سے تمہاری نسل قیامت تک باقی رہے گی۔ چنانچہ

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے ملک معزالدین کو پوری طرح سے نوازا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تنہا ان کی ذات میں فوت ہونے والے تمام فرزندوں کی خوبیاں جمع ہوگئی ہیں۔

۱۷، ربیع الآخر ۷۳۹ھ کو آغا محمد ترک کی وفات ہوئی، ان کا مقبرہ عیدگاہ شمسی کے عقب میں ہے۔ اس کے بعد ملک معزالدین کے یہاں ایک فرزند تولد ہوا جس کا نام ملک موسیٰ رکھا گیا، مگر کچھ ہی عرصہ بعد ملک معزالدین بھی دولت وثروت اور دنیوی جاہ وحشمت چھوڑ کر عالم آخرت کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ (اخبار الاخیار ص ۲۷۹، ۲۸۰ مطبوعہ طبع میرٹھ ہاشمی میرٹھ مطبوعہ ۱۲۷۸ھ)

ملک موسیٰ:

ملک موسیٰ بھی نجابت وسعادت اور فضائل وکمالات سے متصف اور بڑی عزت وشہرت کے مالک تھے۔ فیروز تغلق کی وفات کے بعد ملک میں بدامنی اور شورش بڑھ گئی تو انہوں نے ماوراء النہر کی راہ لی مگر امیر تیمور گورکان کے لاؤ لشکر کے ساتھ پھر دہلی واپس آکر مستقل طور پر یہیں فروکش ہوگئے اور نہ صرف وہ بلکہ اس خاندان کے کسی اور فرد نے بھی اس کے بعد دہلی سے کبھی باہر قدم نہیں نکالا۔ (اخبار الاخیار ص ۲۸۰)

شیخ فیروز:

ملک موسیٰ کے کئی بیٹے ہوئے ان میں ایک بزرگ کا نام شیخ فیروز تھا جو بڑے جامع کمالات شخص تھے۔ فن حرب اور سپہ گری میں خاص طور پر یکتا ہونے کے علاوہ علم وفن، شعر وشاعری، شجاعت وسخاوت، ظرافت، لطافت طبع اور دوسرے اوصاف وکمالات میں اپنی آپ مثال تھے، انہوں نے دولت وحشمت اور عزت وعظمت میں بھی ناموری حاصل کر کے خاندان کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے، خاندان میں شاعری، سخنوری، خوش طبعی اور ظرافت کی بنیادیں انہی کی ذات سے استوار ومحکم ہوئیں، شیخ فیروز سلطان بہلول لودی کی حکومت کے ابتدائی دور میں موجود تھے، انہوں نے سلطان حسین شرقی کے دہلی آنے اور سلطان بہلول سے جنگ کرنے کے واقعہ کو نظم کیا تھا جس کے دو شعر شیخ عبدالحق نے اخبار الاخیار میں نقل کیے ہیں، حسین شرقی بہلول لودی کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

ایا قابض شہر دہلی شنو	حیاتت چو خواہی ازین جا برو
منم قابض ملک و ماراست ملک	خدا داد ما را خدا راست ملک

اے دہلی پر قابض شخص سنو! اگر اپنی زندگی کے خواہش مند ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔ اب اس ملک پر میں قابض ہوں گا اور یہ میرا ملک ہوگا کیونکہ خداوند قدوس نے اسے مجھے عطا کیا ہے اور ملک تو دراصل خدا ہی کا ہے۔

شیخ فیروز کسی جنگ میں بہرائچ گئے اور ۸۶۰ھ میں جام شہادت نوش کیا، ان کی تدفین بہرائچ ہی میں ہوئی، جب گھر سے روانہ ہو رہے تھے تو ان کی بیوی نے کہا "میں امید سے ہوں" فرمایا میں نے خدا سے دعا کی ہے کہ نرینہ اولاد پیدا ہو اور اس کی نسل خوب پھلے پھولے اور اس سے بکثرت اولاد ہو، اس کو اور تم کو خدا کے سپرد کرتا ہوں آئندہ معلوم نہیں کیا پیش آئے۔
(اخبار الاخیار ص ۲۸۰)

Marfat.com

شیخ سعد اللہ:

شیخ فیروز کی دعا اللہ نے سن لی اور ان کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام شیخ سعد اللہ تھا یہی شیخ عبدالحق کے حقیقی دادا تھے، یہ بڑی خوبیوں سے متصف اور اپنے والد بزرگوار کے کمالات کے وارث تھے، بچپن ہی سے رُشد وہدایت کے آثار ان کی پیشانی سے نمایاں تھے، علم وفضل کی تحصیل کر چکے تو شیخ محمد منگن سے بیعت ہوئے جو اپنے زمانہ کے مردِ کامل اور مصباح العاشقین کے لقب سے مشہور تھے۔ شیخ سعد اللہ نے ان کی خدمت میں رہ کر بڑی ریاضت کی اور انہی کی رہنمائی میں سلوک و معرفت کی راہیں طے کر کے ان سے اجازت وخلافت حاصل کی۔ شیخ سعد اللہ نے اپنے بڑے صاحبزادے شیخ رزق اللہ کو بھی اپنے مرشد سے بیعت کرایا، ان کے بیٹے اور شیخ عبدالحق کے والد شیخ سیف الدین کا بیان ہے کہ ''میرے والد ہمیشہ ذوق و شوق، ریاضت ومجاہدہ اور طلب فقر وفنا میں سرگرداں رہتے تھے، راتوں کو جاگتے، گریہ وزاری کرتے اور عاشقانہ اشعار پڑھتے انکی وفات جمعہ ۲۲، ربیع الاول ۹۲۸ھ کو ہوئی۔'' (ایضاً ص ۲۸۱)

شیخ سعد اللہ کی اولاد:

شیخ سعد اللہ کو اللہ نے کئی بیٹے عطا کیے تھے، اس شہر کے نام لوگ اس پر متفق ہیں کہ دہلی انہیں بھائیوں (شیخ سعد اللہ کی اولاد) سے عبارت ہے۔

حصولِ معاش کے لئے گو یہ لوگ امرا سے بھی متوسل رہے، لیکن اہل دربار اور مصاحبین ان لوگوں کے فقر وفنا سے واقف نہ تھے شہر والوں میں بھی کم ہی لوگ ان سب بھائیوں کے فقر ومعرفت کے حالات سے باخبر تھے کیونکہ یہ لوگ اخفائے حال سے کام لیتے تھے اور ان کا ظاہری فضل وکمال ان کی باطنی کیفیات کے لئے حجاب بن گیا تھا، ان کی ظاہری حالات کی وجہ سے اکثر لوگ صرف ان کے علم وفضل، شعر وشاعری اور ظرافت وخوش طبعی کو دیکھتے اور انہی چیزوں کا ذکر کرتے مگر جن لوگوں کو ان حضرات کی خلوتوں کے مشاہدہ کا موقع ملا ہوگا وہی انکے فقر ومعرفت سے کسی قدر واقف رہے ہوں گے۔ (اخبار الاخیار ص ۲۸۱)

ان سب بھائیوں میں دو کو زیادہ شہرت نصیب ہوئی اس لئے ان کے مختصر حالات بیان کیے جاتے ہیں۔

شیخ رزق اللہ مشتاقی:

یہ ۸۹۷ھ میں پیدا ہوئے، بڑے کامل وفاضل اور عارف شخص تھے جو اپنے زمانہ میں یکتائے روزگار اور یادگار سلف خیال کیے جاتے تھے، ان کی ذات گونا گوں ظاہری وباطنی فضائل وکمالات کا مجموعہ تھی، عشق ومحبت، سلامتی عقل، وسعت ظرف مصائب پر صبر کرنے اور استقامت ودوام حضور میں یگانہ تھے، ان کے مرشد مصباح العاشقین شیخ محمد منگن کی ان پر خاص نظر عنایت تھی، شیخ رزق اللہ کو ان سے سوز ودرد کا وافر حصہ ملا تھا، بانوے برس کی عمر میں بھی ان کے ذوق ومحبت اور درد وسوز میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی، اگر کوئی شخص ان کی صحبت میں پہنچ جاتا تو ان کی ان باتوں کو جو معارف وحقائق اور محبت کے اسرار ودقائق سے پر ہوتی تھیں سن کر محظوظ ہوئے بغیر نہ رہتا۔

طبیعت کی سلامتی اور قلب کی پاکیزگی کی دولت بھی حصہ میں آئی تھی۔ بات نہایت اطمینان سے کرتے اور اس میں بڑی

Marfat.com

لطافت وشیرینی ہوتی، دوسروں سے گفتگوئے محبت کرتے یا سنتے تو ان پر بھی یہی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، سفر وسیاحت بہت کی اور لوگوں سے مل کر تجربے حاصل کیے، بہت سارے مشائخ وفقرا کی صحبت میں بھی رہے۔

شیخ رزق اللہ سنسکرت، ہندی، فارسی اور عربی کے فاضل اور شعر وسخن کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے، ہندی اور فارسی دونوں میں دادِ سخن دیتے، ہندی میں راجن اور فارسی میں مشتاقی تخلص تھا، تصنیف وتالیف سے بھی دلچسپی تھی، ہندی میں متعدد رسالے لکھے جن میں پیمان جودت نرجن بہت مشہور ہوئے، بزرگوں کی حکایتیں اور سلاطین ہند کے تاریخی واقعات وقصص بہت دلچسپی اور شوق وذوق کے ساتھ سناتے تھے، ان حکایات وواقعات کا ایک مجموعہ بھی ''واقعاتِ مشتاقی'' کے نام سے مرتب کیا تھا۔ یہ سلطان بہلول لودیوں کے حالات وواقعات پر مشتمل ہے، اس کے قلمی نسخے برٹش میوزیم میں موجود ہیں، لودھیوں کی تاریخ کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے، ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے، ایلیٹ نے اپنی تاریخ ہند میں اس کے کچھ حصہ کا ترجمہ کیا ہے۔ (فہرست مخطوطات ج ۳ ص ۲۹۱)

شیخ سیف الدین:

یہ شیخ سعد اللہ کے سب سے چھوٹے لڑکے اور حضرت شیخ عبدالحق محدث کے والد ماجد تھے، ۹۴۰ھ میں پیدا ہوئے، والد کی وفات کے وقت ان کی عمر آٹھ برس تھی، جب ان کی رحلت کا زمانہ قریب ہوا تو ایک روز سحر کے وقت شیخ سیف الدین کو لے کر بالاخانہ پر گئے، تہجد کی نماز سے فارغ ہو کر انہیں قبلہ رُخ کھڑا کیا اور بارگاہ خداوندی میں یہ دعا کی۔

''خداوندا تو جانتا ہے کہ میں اپنے سب بچوں کی تربیت سے فارغ اور ان کے حقوق ادا کر چکا ہوں، لیکن اس لڑکے کو یتیم وبیکس چھوڑ رہا ہوں، اسکے حقوق ذمہ رہ گئے ہیں، اسے تیرے سپرد کرتا ہوں، تو اسکو اپنی تولیت، سرپرستی اور نگرانی میں لے لے''۔

(اخبار الاخیار ص ۲۸۱)

والد کی دعا کے اثر سے ان میں روز بروز رشد وترقی کے آثار نمایاں ہونے لگے، مواقع ومشکلات کے باوجود انہوں نے علم وفضل کی تحصیل میں کسی طرح کی کمی اور کوتاہی نہیں کی شاعری، علمی فضیلت، مقبولیت، ذوق وشوق محبت، ظرافت، لطافت، زہد، دنیا سے بے رغبتی، دل کی پاکیزگی، حضورِ قلب، نکتہ سنجی اور فہم دقائق واشارات میں بے مثال اور یگانہ تھے۔ (ایضاً)

شیخ سیف الدین ایک صاحب دل بزرگ تھے، ابتدا میں سلسلہ سہروردیہ کے ایک عالم سے بیعت ہوئے پھر شیخ امان اللہ پانی پتی (م ۹۵۷ھ) کی صحبت میں سلوک کی منزلیں طے کیں اور انہی سے خلافت بھی پائی۔ قدرت نے انہیں نگاہ کیمیا اثر اور فقر وفنا، توحید، تجرید اور تفرید میں سے حصہ وافر عطا کیا تھا ان کو نہ دولت دنیا کی ہوس تھی اور نہ کبھی ان کی طلب کا کوئی داعیہ ان میں پیدا ہوا، صرف فقر ومحبت کی جانب ان کی توجہ رہی، مشرب توحید کا ان پر شدید غلبہ تھا جس کو شیخ امان اللہ کی تربیت نے خوب چمکا دیا۔

شیخ امان اللہ کے دل میں عشق حقیقی کی آگ ہر وقت بھڑکتی رہتی تھی اور ان کو نظریہ وحدت الوجود پر پورا عبور تھا، وہ اس مسئلہ پر بڑی مدلل تقریر کرتے اور نہایت برملا طور پر توحید کے اسرار وحقائق بیان کرتے تھے، انہوں نے تصوف وتوحید میں بہت سی کتابیں لکھی تھیں، درس وتدریس کا شغل بھی تھا۔

Marfat.com

شیخ سیف الدین پر ان کی تربیت کا بڑا اثر تھا وہ گو خود صاحب علم تھے مگر فرماتے تھے کہ متقی کم علم اس عالم سے بہتر ہے جو جاہ کا طلبگار ہو۔ ایک دفعہ شیخ عبدالحق سے فرمایا کہ جب میں نے اس زمانہ کے اکابر علما کو جاہ کا طلبگار، مال و دولت کا حریص، دنیوی لذتوں میں منہمک اور بحث وجدال میں مشغول دیکھا تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہم نے تھوڑا علم حاصل کیا اور ہمارا اشمار اکابر علماء میں نہیں ہوتا وہ اپنے فرزند کو برابر تاکید کرتے تھے کہ ''علم کے معاملہ میں نہ کسی سے بحث ونزاع کرو اور نہ کسی کو تکلیف و اذیت دو، اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ حق دوسری جانب ہے تو فوراً اسے مان لو اور اگر اس کے برخلاف یہ یقین ہو کہ تم ہی حق پر ہو تو دو تین دفعہ اپنے فریق کو سمجھانے کی کوشش کرو، اگر مان لے تو فبہا ورنہ بحث نہ کرو اور یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو جاؤ کہ مجھے تو یہی معلوم ہے ممکن ہے تم جو کہہ رہے ہو وہی صحیح ہو، اس میں جھگڑنے کی کیا بات ہے۔ (اخبار الاخیار ص ۲۸۲)

شیخ سیف الدین کو شعر وسخن کا عمدہ ذوق تھا اور سیفی تخلص کرتے تھے، اخبار الاخیار میں ان کی دو غزلیں درج ہیں جن سے ان کے شاعرانہ کمالات کا پتہ چلتا ہے، ان کی ایک مثنوی سلسلۃ الوصال کا پتہ بھی چلتا ہے جو تقریباً پانچ سو اشعار پر مشتمل ہے، شیخ سیف الدین کو تصنیف وتالیف سے زیادہ مناسبت نہ تھی، ان کے پیرو مرشد شیخ امان اللہ اپنے مریدوں کو تقریر کرنے کا حکم دیتے تھے تاکہ اس سے اندازہ ہو کہ وہ شیخ کے ارشادات وتعلیمات کو پوری طرح اخذ کر سکے ہیں کہ نہیں۔ اس مقصد سے جب انہوں نے شیخ سیف الدین کو بھی تقریر کا حکم دیا تو انہوں نے عرض کیا کہ فقیر کو آپ کے سامنے تقریر کی مجال نہیں ہے، اگر حکم ہو تو لکھ کر پیش کروں، شیخ نے اجازت دی، اس طرح جو رسالے مرتب ہوئے ان میں سے ایک کا نام مکاشفات ہے۔ (ایضاً ص ۲۸۶، ۲۸۷) جس کے اقتباسات شیخ عبدالحق نے اخبار الاخیار میں نقل کیے ہیں۔

شیخ سیف الدین کو دینی علوم سے بڑا شغف تھا، انہوں نے شیخ عبدالحق کی علمی تربیت پر پوری توجہ کی تھی، ان کے خانوادہ کے علمی سلسلہ کا نقطۂ آغاز ان کے فرزند حضرت شیخ عبدالحق دہلوی کو مانا جاتا ہے، مگر مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

''آج تک شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے علمی خانوادہ کا آغاز انہی کی ذات سے کیا جاتا ہے مگر حکیم (حبیب الرحمٰن) صاحب (ڈھاکہ) کے پاس ایک دستاویز ایسی ہے جو اس آغاز کو ایک پشت اوپر تک لے جاتی ہے یعنی علامہ ذہبی کی الکاشف جو اسماء الرجال کی ایک کتاب ہے اس کا ایک ایسا نسخہ حکیم صاحب کی ملکیت میں ہے جس کے پہلے صفحہ پر مولانا عبدالحق محدث دہلوی کے والد ماجد مولانا سیف الدین ترک کے قلم کی عبارت تحریر ہے۔''

(معارف فروری ۱۹۲۹ء ص ۸۷ و مقالات سلیمان جلد دوم ص ۷۷)

دراصل شیخ سیف الدین ایک صوفی منش بزرگ تھے، ان کا خود بیان ہے کہ مجھے سات برس کی عمر سے جس میں ادراک، شعور اور عقل کی ابتدا ہوتی ہے، درد ومحبت، طلب الٰہی اور معرفت کا شوق دامنگیر تھا اور اسی ذکر وفکر میں عمر بسر ہوئی مجاہدہ وریاضت کے زمانہ میں میں نے وہ حالات دیکھے ہیں جن کا اظہار نہ کرنا ہی مناسب ہے کیونکہ ستر واخفا فقر کے لئے لازم اور ضروری ہے۔ (اخبار الاخیار ص ۲۸۲)

وہ فرماتے تھے کہ طریقت کے کئی راستے ہیں جن کو لوگوں نے اختیار کیا ہے لیکن اصل حقیقت صرف اس قدر ہے کہ معیت حق کو ہر حال میں پیش نظر رکھا جائے، دنیا کے کام میں لگے رہو مگر دل کو یار کی طرف لگائے رکھو، انسان کا ظاہر وباطن یکساں

Marfat.com

ہونا چاہیے اور اصل معاملہ تو اللہ کے ساتھ راستی اور راست بازی کا ہے جو ہمیشہ ٹھیک رہنا چاہیے۔ (ایضاً ص ۲۸۳)

شیخ سیف الدین پر بڑھاپے میں محویت وفنا کا غلبہ تھا، کھانے، پینے، پہننے، عیش وفراغت صحبت وملاقات اور ادب و شاعری وغیرہ کوئی رغبت باقی نہیں رہ گئی تھی، اگر ان کے علاج کی سعی کی جاتی تو فرماتے کہ میں نے کون سے اچھے کام کیے ہیں جو صحت وتندرستی کی خواہش کروں، میرا وجود وعدم برابر ہے، غرض ہر وقت خوف وخشیت کا غلبہ رہتا اور کبھی اس حال سے فارغ نہ رہتے، مگر جب وفات کا وقت قریب آیا تو ذوق وشوق کی کیفیت طاری رہنے لگی، اسی حالت میں اپنے فرزند عبدالحق محدث سے فرمایا کہ دعا کرو کہ خدا مجھے جلد یہاں سے لے جائے، مجھے جس چیز کی طلب تھی وہ اب حاصل ہو گئی ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ ہاتھ سے چلی جائے، میں تمام عمر دعا کرتا رہا کہ خداوندا! آخر وقت میں ذوق وشوق کے عالم میں مجھے اس جگہ سے لے جائیو" اب یہ مراد اچھی طرح بر آئی ہے، اگر اس حالت میں میرا مولیٰ مجھے اپنے سامنے بلا لے تو اس کی بڑی عنایت اور انتہائی کرم ہوگا، عیادت کے لئے آنے والے اگر ان کے لئے دعائے صحت کرتے تو آزردہ خاطر ہوتے اور فرماتے کہ اللہ سے اس کی دعا کرو کہ وہ مجھے یہاں سے بلا لے۔ (اخبار الاخیار ص ۲۸۸و۲۸۹)

بالآخر ۲۷، شعبان ۹۹۰ھ کو واصل بحق ہو گئے ولی تحت القباب سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔ (ایضاً ص ۲۹۰)

ولادت:

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اسی ذی حیثیت اور ممتاز گھرانے کے فرد اور ایسے مرد کامل بزرگ کے بیٹے تھے جو محرم ۹۵۸ھ (مطابق جنوری ۱۵۵۱ء میں منتخب روزگار شہر دہلی میں پیدا ہوئے "شیخ اولیا" سے ان کی تاریخ ولادت برآمد ہوتی ہے۔

تعلیم وتربیت:

حضرت شیخ عبدالحق کی ابتدائی تعلیم وتربیت ان کے والد بزرگوار کے سایہ عاطفت میں ہوئی، بڑھاپے میں ان کے والد کی ساری توجہ انہی کی جانب مرکوز ہو گئی تھی اور ہر وقت ان کو اپنے ساتھ رکھ کر ان کی تعلیم وتربیت میں مشغول رہتے، شیخ خود بیان کرتے ہیں۔

"آخر عمر میں جب والد بوڑھے اور ضعیف ہو گئے تھے تو خصوصیت کے ساتھ میری جانب ان کی توجہ اور دل بستگی بہت زیادہ ہو گئی تھی، میں تین یا چار برس کا تھا کہ انکو ایام جوانی گزر جانے اور غمگسار دوستوں کی رحلت کی وجہ سے ایک سخت بیماری لاحق ہوئی، اس بیماری میں ان کی دلجوئی اور ضعف پیری کی کلفتوں کو دور کرنے کے لئے یہ فقیر شب وروز ان کی خدمت میں رہتا تھا اور ان کی آغوش شفقت میں برابر تربیت پاتا تھا، اسی زمانہ طفولیت میں والد حضرات صوفیہ کے اقوال وارشادات میرے دل ودماغ میں ڈال کر میری باطنی تربیت بھی کرتے تھے، میں خود بھی فطرۃً ان باتوں کا دلدادہ تھا وہ جب ذرا دیر کے لئے خاموش ہوتے تو میں بھی خود فراموشی کی حالت میں ہو جاتا اور پھر واقفان حال کی طرح ان حقائق کو دوبارہ بیان کرنے کے لئے کہتا، اس زمانہ کی بعض باتیں میرے حافظہ خیال میں محفوظ رہ گئی ہیں اور اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ فقیر کو اپنے دودھ چھوڑنے کے وقت کی باتیں بھی اس طرح یاد ہیں گویا یہ کل کی بات ہے حالانکہ اس وقت میری عمر دو ڈھائی برس کی رہی

Marfat.com

ہو گی''۔(اخبار الاخیار ص ۲۹۰)

''بغیر سابقہ تعلیم اور قواعد تہجی کے جو عام بچوں کے پڑھنے پڑھانے کا طریقہ ہے پہلے قرآن مجید کے دو تین جزو بلکہ اس سے بھی کم کی تعلیم دی، وہ سبق لکھ دیتے تھے اور میں پڑھ لیتا تھا، قرآن حکیم کی یہی مقدار میں نے ان سے سبقاً پڑھی اس کے بعد ان کی تربیت وشفقت سے اس قدر استعداد ہو گئی کہ روزانہ قرآن کی ایک مقدار خود سے پڑھتا اور جو مقدار پڑھتا اسے ان کے سامنے دہرا دیتا، اس طرح میں نے دو تین ماہ میں قرآن مجید ختم کر دیا، معلم جس طرح بچوں کو سبق رٹا کے یاد کراتے ہیں، وہ میں نے نہیں کیا اور نہ یہ مفید ہے۔

والد بزرگوار نے مجھے بچوں کے طریقہ پر فا اور قاف تک تختی لکھائی تھی، اس کے بعد تھوڑی مدت میں اگر ایک ماہ کہوں تو جھوٹ نہ ہو گا کتابت وانشا کا سلیقہ پیدا ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے ان کی توجہ اور نظر میں ایسا اثر اور ایسی خاصیت رکھی تھی کہ غبی اور قوت اخذ واستعداد میں بہت کمتر شخص بھی ان کی توجہ وتربیت سے چمک اٹھتا تھا اور اس کی مخفی صلاحیتیں بہت ظاہر ہونے لگتی تھیں، مجھے جو کچھ بھی ملا وہ انہی کی توجہ وعنایت کا اثر ونتیجہ ہے ان کے پدری اور تعلیم وتربیت کے تمام حقوق اس نامراد کے ذمہ ثابت ومسلّم ہیں''۔

اسی زمانہ میں میں تحصیل علم میں مشغول ہوا، شب وروز والد محترم کی خدمت میں رہتا اور بحث وتکرار میں مصروف رہتا، اسی میں راتیں گزر جاتی تھیں، وہ بندہ کو ہمرکابی کا شرف عطا کر کے بہت خوش ہوتے تھے، خاص طور پر علم توحید کی تلقین اور مسئلہ وحدۃ الوجود کی تحقیق اس طرح فرماتے تھے گویا آنکھوں دیکھی باتیں کر رہے ہیں، اگر کبھی ان علوم ومسائل کے سمجھنے میں شکوک وشبہات پیدا ہوتے تو فرماتے کہ ہم کو بھی اس طرح کے مسائل میں بہت سے شکوک وشبہات پیش آتے تھے، ان شاء اللہ رفتہ رفتہ یہ سب دور ہو جائیں گے اور تم جمال یقین کا مشاہدہ کر لو گے مگر شرط یہ ہے کہ ہمیشہ اسی خیال اور دھن میں لگے رہو اور جہاں تک ہو سکے اس کے سمجھنے کی فکر وکوشش کرتے رہو''۔

اعلیٰ تعلیم:

اپنی آگے کی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے شیخ بیان کرتے ہیں کہ:

''جن منظوم کتابوں کی تعلیم کا اس ملک میں رواج تھا ان میں سے والد نے شاید گلستان وبوستاں کے چند جزو اور دیوان حافظ کی تعلیم دی، لڑکپن ہی میں ختم قرآن کے بعد میزان الصرف سے مصباح وکافیہ تک خود پڑھایا، اسی زمانہ میں اکثر یہ ارشاد فرماتے تھے کہ ان شاء اللہ تم جلد ہی عالم بن جاؤ گے۔ یہ بھی فرماتے کہ مجھے اس تصور سے بڑی مسرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس درجۂ کمال تک پہنچا دے جس کا مجھے خیال ہے اور میں تمہارے حلقہ درس وافادہ میں اپنے بڑھاپے میں اعتماد کر کے بیٹھا رہوں اور کبھی چند کتابوں کا نام لے کر فرماتے کہ بس ان کو پڑھ لو تو عالم ہو جاؤ گے''۔

میرے والد بزرگوار فرماتے کہ ہر علم میں سے ایک مختصر پڑھ لو، یہ تمہارے لئے کافی ہے اس کے بعد ان شاء اللہ برکت وسعادت کے دروازے تم پر کھل جائیں گے اور تم تمام علوم بلا تکلف حاصل کر لو گے، ان کے ان پاکیزہ ارشادات کا یہ اثر ہوا کہ میں نے علوم کی تحصیل اتنی جلدی کر لی کہ جسے طے زمان ومکان کہتے ہیں، فن نحو کے مختصرات جیسے کافیہ اور لب ارشاد کے

Marfat.com

ایک ایک جز بلکہ اس سے بھی زیادہ بعض اوقات پڑھ لیتا، علوم کی تحصیل سے فراغت اور تکمیل کا شوق وحرص اس قدر تھا کہ اگر ان مختصرات میں کسی کا صحیح اور حاشیہ والا کوئی نسخہ ہاتھ آجاتا تو اسے استاد سے پڑھنے کی ضرورت نہ پیش آتی اور دوران مطالعہ متن سمجھ لینے کے لئے محض حواشی دیکھ لینا کافی ہوتا اور پھر دوسرے جزو کے مطالعہ میں منہمک ہو جاتا اور اگر کوئی آسان بحث ہوتی یا وہ مضمون پڑھا ہوا یا پہلے سے معلوم ہوتا تو میری طبیعت اس میں غور وفکر پر آمادہ نہ ہوتی بلکہ آگے بڑھ جاتا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میں ان دنوں کیا پڑھتا اور کیا سمجھتا تھا تاہم ہر کتاب کے متن اور حاشیہ سے پورا پورا فائدہ حاصل کرتا اور انہیں اچھی طرح سمجھ لیتا تھا جو کتاب بھی میری نظر سے گزرتی یا اس کا کوئی جزو بھی کسی وقت ہاتھ لگ جاتا خواہ وہ شروع کا ہوتا یا آخر کا، اسے پڑھ کر اس پر عبور حاصل کرنا اس وقت کا اہم مشغلہ ہوتا، میں اس کا پابند نہیں تھا کہ کتاب کو اوّل سے شروع کرنا اور آخر میں ختم کرنا چاہیے بلکہ جو حصہ جہاں کا مل جاتا اسی کو پڑھنا شروع کر دیتا، کیونکہ میرا مقصد تحصیل علم تھا خواہ یہ جیسے بھی ممکن ہو۔

بارہ یا تیرہ برس کی عمر میں شرح شمسیہ اور شرح عقائد پڑھی اور پندرہ یا سولہ برس کی عمر میں مختصر ومطول ختم کر لی، پھر میں نے علوم عقلیہ ونقلیہ کی پوری تحصیل کر لی"۔ (اخبار الاخیار ص ۲۹۱)

قرآن مجید کا حفظ:

الحمد للہ کہ اس کے بعد قرآن مجید کے حفظ کی توفیق بھی نصیب ہوئی، اور میں اس طرح اللہ کے کلام کی حفاظت میں آ گیا، یہ نعمت مجھے ایک برس سے کچھ زیادہ عرصہ میں حاصل ہو گئی جس کے ایک حرف کا شکر سو برس میں بھی ادا نہیں ہو سکتا"۔

(اخبار الاخیار ص ۲۹۲)

ماوراء النہر کے علما سے استفادہ:

اس طرح میں تمام کتابوں پر عبور حاصل کر لیتا اور ادب وعربیت اور منطق وکلام کی کتابوں میں مکمل دستگاہ ہو جانے کے بعد سات آٹھ برس بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ عرصہ تک ماوراء النہری علما سے اس طرح درس لیا کہ شب وروز میں دو تین ساعت کے لئے مطالعہ، غور وفکر اور مشغولیت سے فرصت ملتی۔

شوقِ علم اور مطالعہ سے شغف:

شیخ کی تعلیم وتربیت کی جو تفصیل ان کی زبان سے پیش کی گئی ہے اس سے ان کے شوق وطلب علم اور مطالعہ میں غیر معمولی انہماک اور دلچسپی کا اندازہ بھی ہوتا ہے، ذیل میں اس سلسلہ کی کچھ مزید باتیں بھی خود ان ہی کے حوالہ سے قلمبند کی جاتی ہیں، شیخ عبد الحق علمائے ماوراء النہر سے اپنے استفادہ اور ان کے یہاں قیام کے زمانہ کے علمی اشتغال وغیرہ کا حال بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کیا شوق تھا اور کیسی طلب تھی، اگر اس قدر شوق وذوق طلب مولیٰ اور باطنی ریاضت کے لئے ہوتا تو معاملہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا، ایک مرتبہ چند طالب علم بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے دریافت کر رہے تھے کہ تحصیل علم کا کیا مقصد ہے؟ بعض نے تکلف وتصنع سے کام لے کر کہا کہ ہمارا مقصد معرفت الٰہی کی طلب ہے اور بعض نے سادگی اور سچائی

Marfat.com

سے بتایا کہ ہماری غرض دنیا طلبی ہے، میں اس زمانہ میں کافیہ بلکہ اس سے بھی نیچے کی کتابیں پڑھتا تھا، ان لوگوں نے مجھ سے بھی پوچھا کہ تم بھی تو بتاؤ کہ علم حاصل کرنے سے تمہارا کیا مقصد وارادہ ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے قطعاً معلوم نہیں کہ تحصیل علم کا نتیجہ معرفت الٰہی کی صورت میں ظاہر ہوگا یا اس سے لہو ولعب کے اسباب مہیا ہوں گے، مجھے اس وقت صرف یہی شوق دامنگیر ہے کہ یہ جان جاؤں کہ جو علماء وفضلا گزرے ہیں انہوں نے کیا کہا ہے اور کشف حقیقت اور معلومات مسائل میں کیا موتی پروئے ہیں، حصول علم کے بعد کیا صورت پیش آئے گی، نفس کو لذت وسرور حاصل ہوگا یا مولیٰ کی محبت ملے گی۔ دنیا کی طلب تحصیل کی طرف دل مائل ہوگا یا عقبیٰ کا طلبگار ہوگا۔

زمانہ طفولیت ہی سے مجھے پتہ نہیں کہ کھیل کود کیا چیز ہے؟ نیند کیسی ہوتی ہے؟ مصاحب اور لطف صحبت کس کو کہتے ہیں، آرام وآسائش کیا ہے اور سیر وتفریح کیا ہوتی ہے۔

شب خواب چہ وسکون کدام ست ☆ خود خواب بعاشقان حرام است

روزانہ سخت ٹھنڈی ہوا اور گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں دوبار دہلی کے مدرسہ میں جاتا تھا جو غالباً میرے گھر سے دو میل کے فاصلہ پر تھا، دوپہر کو گھر میں بس چند لقمے کھانے کے لئے رکتا تاکہ جسم وجان میں حرکت وقوت باقی رہے، اس سے زیادہ اس وقت گھر پر نہ رہتا، ایک مدت تک صبح ہونے سے پہلے ہی مدرسہ پہنچ جاتا اور چراغ کی روشنی میں ایک جز ولکھ لیتا، اس سے بھی عجیب بات یہ تھی کہ گو سارا وقت مطالعہ اور پڑھی ہوئی کتابوں کی بحث وتکرار میں گھرا رہتا تھا مگر اس کے باوجود میں ان شروح وحواشی کو جو نظر ومطالعہ سے گزرتے تھے لکھ لینا بھی ضروری سمجھتا تھا، رات کا زیادہ حصہ اور دن کا کچھ حصہ مطالعہ میں صرف ہوتا تھا اور رات کا تھوڑا اور دن کا بڑا حصہ لکھنے میں گزرتا تھا۔

میرے والدین برابر اس کے آرزومند رہے کہ تھوڑی دیر محلہ کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں شریک ہو جاؤں اور رات کو وقت پر سو جایا کروں، میں ان سے عرض کرتا کہ آخر کھیل کود کا مقصد تو دل کو خوش کرنا ہے اور میرا دل اس سے خوش ہوتا ہے کہ کچھ پڑھوں یا لکھوں عموماً ماں باپ اپنے بچوں کو مدرسہ جانے اور پڑھنے کے لئے تاکید وتنبیہ کیا کرتے ہیں، اس کے برعکس مجھے کھیل کود کی تاکید کی جاتی تھی، کبھی اثنائے مطالعہ میں آدھی رات ہو جاتی تو والد ماجد پکار کر فرماتے بابا! کیا کرتے ہو؟ میں اس خیال سے فوراً لیٹ جاتا کہ جھوٹ نہ بولنا پڑے اور کہتا کہ میں سویا ہوں، آپ کیا فرماتے ہیں؟ اس کے بعد پھر اٹھ جاتا اور پڑھنے میں مشغول ہو جاتا کئی دفعہ تو ایسا ہوا کہ عمامہ اور سر کے بالوں میں چراغ سے آگ لگ گئی لیکن مجھے اس وقت پتہ چلا جب اس کی حرارت دماغ کو پہنچی"۔ (اخبار الاخیار ص ۲۹۲)

اساتذہ:

شیخ عبدالحق نے زاد المتقین اجازات الحدیث فی القدیم والحدیث اور اسماء الاستاذین کے نام سے جو کتابیں لکھی تھیں، ان میں ان کے استاذوں کا ذکر ہے، غالباً ان کے تذکرہ نگاروں نے ان کے استاذوں کا اسی لئے کوئی ذکر نہیں کیا کہ خود شیخ ان کے بارے میں مستقل رسالے لکھ چکے ہیں مگر اب شیخ کی یہ کتابیں دستیاب نہیں ہیں، اس لئے ان کے عام استاذوں کا نام معلوم نہیں ہو سکا تاہم جن کا نام تلاش وتفحص سے معلوم ہوا وہ حسب ذیل ہیں:

Marfat.com

۱: شیخ سیف الدین، اوپر گزر چکا ہے کہ شیخ عبدالحق نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ہی سے ہی حاصل کی تھی نحو، منطق، عقائد، معانی اور بلاغت کی مروج کتابوں اور فارسی ادب گلستان، بوستاں اور دیوانِ حافظ کا درس انہی سے لیا تھا۔

(اخبار الاخیار ص ۲۹۱)

والد سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ مدرسہ دہلی میں داخل ہوئے۔ (ایضاً ص ۲۹۲) جہاں کئی برس تک درس لیتے رہے، انہوں نے درسیات سے باقاعدہ فراغت اور تکمیل یہیں کی تھی، ظاہر ہے اس مدرسہ میں انہوں نے متعدد استادوں سے تعلیم پائی ہوگی مگر تذکروں میں صرف ایک نام ملتا ہے۔

۲: محمد مقیم، یہ امیر محمد مرتضیٰ شریفی کے شاگرد تھے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۱)

مدرسہ دہلی کے بعد انہوں نے ماوراء النہر کے علماء وفضلا کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اس کا ذکر خود شیخ نے اخبار الاخیار میں کیا ہے، لیکن ان لوگوں کے نام نہیں لکھے ہیں، اس کے بعد جب حرمین شریفین تشریف لے گئے تو وہاں کے فضلا سے بھی استفادہ کیا، جن میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں:

۳: شیخ عبدالوہاب متقی، یہ شیخ علی متقی کے خاص شاگرد اور جانشین تھے، ان کا حال شیخ علی متقی کے تذکرہ میں گزر چکا ہے، شیخ عبدالحق نے ان کی خدمت میں دو برس گزارے اور ان سے بہت استفادہ کیا، ظاہری و باطنی دونوں طرح کے علوم ان سے حاصل کیے۔

بعض تذکرہ نگاروں نے شیخ علی متقی اور شیخ احمد بن حجر مکی سے بھی ان کے تلمذ کا ذکر کیا ہے جو صحیح نہیں ہے کیونکہ اوّل الذکر کا انتقال ۹۷۵ھ میں اور مؤخر الذکر کا ۹۷۴ھ میں ہوا اس وقت شیخ عبدالحق ہندوستان میں تھے اور غالباً مدرسہ دہلی میں زیر تعلیم تھے اور ۹۹۶ھ میں حجاز میں تشریف لے گئے تھے۔ اسی طرح ملا علی قاری سے بھی ان کے تلمذ کا ذکر کیا جاتا ہے جو محل نظر ہے۔[1]

مکہ اور مدینہ کے چند اور شیوخ کے نام یہ ہیں:

۴: قاضی علی بن جار اللہ بن ظہیرہ قرشی مخزومی مکی۔

۵: شیخ احمد بن محمد بن محمد ابی الحزم مدنی۔

۶: شیخ حمید الدین بن عبداللہ سندی مہاجر۔[2]

تعلیم سے فراغت اور دانشمندانِ ماوراء النہر سے استفادہ کا زمانہ:

شیخ عبدالحق نے اپنی تعلیم کی جو سرگزشت بیان کی ہے، اس میں بتایا ہے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں شرح شمسیہ و شرح عقائد ان کے زیر درس تھی اور پندرہ سولہ برس کی عمر میں وہ مطول و مختصر ختم کر چکے تھے پھر ایک دو برس کے اندر وہ علوم عقلیہ و نقلیہ سے اپنی فراغت و تکمیل کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ علوم کی تحصیل کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو حفظ قرآن کی

[1] ان حضرات سے تلمذ کا ذکر سید محمد مرتضیٰ زبیدی نے کیا ہے (ملاحظہ ہو تاج العروس ج ۷ ص ۳۲۸)

[2] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۲، شیخ حمید الدین سندی سے مشکوٰۃ کی اجازت کا ذکر خود شیخ عبدالحق نے لمعات شرح مشکوٰۃ کے دیباچہ میں کیا ہے۔

Marfat.com

سعادت بخشی اور اس میں برس سوا برس لگے، (اخبار الاخیار ص ۲۹۱) اس طرح تعلیم اور حفظ قرآن مکمل کر لینے کے وقت ان کی عمر انیس بیس برس رہی ہوگی۔

جیسا کہ عبدالحمید لاہوری نے بھی لکھا ہے۔ (بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۳۴۱)

شیخ عبدالحق کی ولادت محرم ۹۵۸ھ میں ہوئی تھی اس طرح گویا وہ ۹۷۷ھ تک جملہ علوم کی تحصیل سے فارغ ہو چکے تھے گو اب وہ تعلیم مکمل کر چکے تھے اسکے باوجود شوق و طلب علم میں کوئی کمی نہ آئی تھی چنانچہ لکھتے ہیں:

غیر آنکہ مدت ہفت ہشت سال بلکہ زیادہ بعد از رسیدن بکتب عربیت و منطق و کلام و حصول نوع از قوت اکمال و اتمام ملازمت درس بعضے از دانشمندان ماوراء النہر بطوری نمودہ شد کہ در تمامی شب و روز شاید کہ دو سہ ساعت از مطالعہ و تعقل و اشتغال فرصتے دست نمیداده باشد۔ (اخبار الاخیار ص ۲۹۲)

ادب و عربیت اور منطق و کلام کی کتابوں پر عبور اور مکمل دستگاہ حاصل کرنے کے بعد سات آٹھ برس بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ تک بعض ماوراء النہر علماء کے حلقہ درس میں اس طرح سے شریک رہا کہ شب و روز میں شاید دو تین گھنٹہ کے لئے مطالعہ، غور و فکر اور علمی اشغال سے فرصت ملتی تھی۔

گویا ۹۸۵ھ تک یا اس سے پہلے کا زمانہ انہوں نے دانشمندانِ ماوراء النہر کی خدمت میں گزارا، اس کے بعد کے واقعات کا ذکر آگے آرہا ہے۔

شیخ موسیٰ سے بیعت:

شیخ کو تصوف سے طبعاً بھی مناسبت اور دلچسپی تھی اور اپنے والد سے بھی ان کو اس کا ذوق ورثہ میں ملا تھا جس کی تفصیل آگے آئے گی جب وہ رسمی اور ظاہری تعلیم سے فارغ اور دانشمندانِ ماوراء النہر سے استفادہ اور کسب فیض کر چکے تو ان کو اصلاح باطن کی فکر دامنگیر ہوئی جس کے لئے مرشد کامل کی تلاش ہوئی تا کہ اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے سکیں، بخت نے یاوری کی اور یہ نعمت خداداد بھی میسر آگئی، چنانچہ ۶ شوال ۹۸۵ھ کو شیخ موسیٰ بن حامد جیلانی اچی سے بیعت کا شرف حاصل کیا، اخبار الاخیار میں اس واقعہ اور شیخ موسیٰ کا بہت والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے، (اخبار الاخیار ص ۲۹۵، ۲۹۶) اپنے وصیت نامہ میں لکھا ہے کہ اپنے والد کے حکم سے حضرت شیخ موسیٰ گیلانی کا مرید ہوا۔ (بحوالہ حیات عبدالحق ص ۱۳۰)

شیخ موسیٰ قادریہ سلسلہ کے مشہور، بزرگ مخدوم سید حامد گیلانی ۹۷۸ھ کے فرزند و خلیفہ تھے، شیخ حامد بلند مرتبہ مقام کے حامل تھے، باوجودیکہ ہر قسم کا مال و اسباب ان کو میسر تھا مگر کبھی صاحب نصاب نہیں ہوئے، جو زکوٰۃ واجب ہونے کی شرط ہے، وہ اپنے دادا شیخ عبدالقادر ثانی کے مرید تھے جن کو قبولِ عظیم حاصل تھا۔ شیخ حامد نے اپنے نیک بخت فرزند شیخ موسیٰ کو اپنی زندگی ہی میں خلافت و سجادہ نشینی اور سلسلہ کے جملہ امور تفویض کر دیئے تھے کیونکہ وہ ان سے ہر طرح راضی اور خوش تھے اور بڑی محبت بھی کرتے تھے، اس کے علاوہ ان میں خود بھی اس کی مکمل اہلیت و استعداد تھی، ملا عبدالقادر بدایونی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"شیخ حامد کے انتقال کے بعد شیخ موسیٰ اور ان کے بڑے بھائی شیخ عبدالقادر میں مدت دراز تک سجادہ نشینی کا جھگڑا رہا، (اخبار الاخیار ص ۱۹۳، ۱۹۴ و منتخب التواریخ ج ۳ ص ۹۱) اس کی وجہ سے شیخ موسیٰ اُچہ چھوڑ کر دربار سے متوسل ہو گئے تھے اور اکبر نے ان کو

Marfat.com

پانسو کا منصب دیا"۔(ایضاج ۲ص ۴۰۴)

ان کی وفات ۱۰۰۱ھ میں ہوئی، مزار پُرانوار ملتان میں ہے۔(خزینۃ الاصفیاج ۱ص ۱۳۸)

درس وتدریس کا آغاز:

۹۸۵ھ کے بعد اور حجاز کو روانگی سے پہلے انہوں نے درس وتدریس کا کام بھی انجام دیا۔ گو شیخ کے عام سوانح نگاروں نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، مگر عبدالحمید لاہوری لکھتے ہیں:

وچوں سنین عمرش بعشرین رسید از پایہ تحصیل بدرجہ تدریس برآمد و چندے ہنگامہ افادہ گرم داشتہ بپائے طلب بادیہ پیمائی سفر حجاز گردید۔

(بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۳۴۱)

جب ان کی عمر بیس برس کی ہوئی اور تحصیل علم سے فارغ ہو چکے تو منصب تدریس پر فائز ہوئے اور کچھ دنوں یہ شغل اختیار کرنے کے بعد حجاز روانہ ہوئے۔

محمد صالح کنبوہ کے بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کو روانہ ہونے سے پہلے روز سے بتدریس وتعلیم گزرانید، لیکن اوپر گزر چکا ہے کہ تکمیل علوم کے بعد وہ سات آٹھ برس سے زیادہ عرصہ تک دانشورانِ ماوراء النہر سے استفادہ کرتے رہے، جیسا کہ شیخ عبدالحق نے بھی اخبار الاخیار میں لکھا ہے، اس لئے بیس برس ہی کی عمر میں منصب درس وتدریس پر فائز ہو جانے کی بات محل نظر ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ علمائے ماوراء النہر سے استفادہ اور شیخ موسیٰ سے بیعت کے بعد ۹۸۶ھ میں وہ درس و تدریس کی مسند پر متمکن ہوئے ہوں، اس کی تائید اخبار الاخیار کی اس تصریح سے بھی ہوتی ہے جس میں شاہ صاحب نے تعلیم سے فراغت اور ماوراء النہر کے علماء اور شیخ موسیٰ سے بیعت ہونے کے بعد تعلیم وافادہ میں اپنے مشغول ہونے کا ذکر کیا ہے۔

تا الآن کہ بفضل بامتناہی الٰہی وما توفیقی الا باللہ جزائے وافر وقسطے کامل کہ من غریب شکستہ درخور ایں ہمہ انعام واکرام از حضرت غریب نواز شکستہ رو حاصل وقت شدہ است زیادہ تر ازاں محنت در ریاضت می کشم و بمشغولی تعلیم وافادہ معاذ اللہ بلکہ تعلیم واستفادہ لبر می برم۔(اخبار الاخیار ص ۲۹۳)

(ذوق سحر خیزی کی وجہ سے) مجھ غریب ومسکین کو اللہ کے فضل نامتناہی اور اس کی توفیق کے تحت کافی نعمتیں ملی ہیں اور اب بھی حضرت غریب نواز کے فیض سے پہلے سے زیادہ محنت در ریاضت اور تعلیم وافادہ میں مشغول ہوں، معاذ اللہ تعلیم وافادہ نہیں بلکہ تعلم واستفادہ میں بسر کر رہا ہوں۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ شیخ عبدالحق نے حج بیت اللہ کو جانے سے پہلے بھی درس وتدریس کی خدمت انجام دی تھی۔

فتح پور سیکری میں قیام:

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی طبعاً عزلت پسند اور گوشہ نشین قسم کے آدمی تھے اور وہ اپنے علمی ذوق وانہماک کی وجہ سے بھی لوگوں سے زیادہ ربط وضبط اور میل جول رکھنا پسند نہ کرتے تھے کیونکہ اختلاط اور میل جول کی کثرت یکسوئی جمعیت قلب اور سکونِ خاطر کو ختم کر کے ذہن کو منتشر کر دیتی اور علمی کاموں میں خلل انداز ہوتی ہے، علاوہ ازیں لوگوں سے الگ تھلگ رہ کر آدمی ان کے ضرر سے محفوظ رہتا ہے اور لوگ اس کے ضرر سے مامون رہتے ہیں، شیخ نے اپنے ابتدائی تعلیم اور

Marfat.com

مطالعہ سے شغف کا حال بیان کرتے ہوئے اپنی طبیعت کی اس افتاد اور مزاج کے رنگ کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ "ایام طفلی ہی سے میں لطف صحبت اور ہم نشینی سے ناآشنا ہوں" (اخبار الاخیار ص ۲۹۲) پھر تعلیم سے فراغت کے بعد بھی ان کی یہی کیفیت رہی، چنانچہ لکھتے ہیں۔

"دنیا کے نیک و بد سے الگ تھلگ گوشہ غربت میں پڑا رہوں۔ کسی کے خلاف دل میں کوئی کدورت نہیں ہے اور ان کی اور ان کی مصاحبت سے بھی بے نیاز اور دستکش ہوں بلکہ نحوی ترکیب میں زید و عمرو کا جو ذکر مثالاً آیا کرتا ہے اس کے قصوں سے بھی پاک ہوں۔

صد شکر کہ باہیچ کسم کارے نیست واز من بدل ہیچکس آزارے نیست
گر بر دل دشمنان من بارے نیست برخاطر دوستان من بارے نیست

"خداوند عالم نے جس کی نعمتوں کا شمار نہیں ہو سکتا اس نے مجھ غریب کو اپنے لطف سے مالا مال کیا ہے اور مجھے یہ مخصوص حالت و کیفیت عطا کی ہے، میرا دل اور میرا وقت اس کے حضور میں مشغول رہتا ہے اور لوگوں کے میل جول سے کنارہ کش رہ کر اپنے خیال میں مست اور مگن رہتا ہے"۔ (اخبار الاخیار ص ۲۹۳)

مگر تعلیم مکمل کر لینے اور غالباً اپنے والد کے انتقال کے بعد اہل تعلق و حقوق کے اصرار پر انہیں دہلی گوشۂ عزلت کو چھوڑ کر فتح پور سیکری جانا پڑا جو اس وقت اکبر کا دارالسلطنت اور علمی سرگرمیوں کا مرکز تھا، ملک الشعراء فیضی سے ان کے تعلقات پہلے سے تھے، اس کی کشش اور تحریک بھی فتح پور آنے کا باعث بنی ہوگی۔

دربار اکبری میں شیخ کا پرتپاک خیر مقدم ہوا، خود اکبر نے بھی بڑی قدر دانی کی شیخ کو خود بھی اعتراف ہے کہ:

"جب اللہ کے فضل و کرم سے مجھے علم کا خاصہ حصہ مل گیا تو بعض اہل حقوق نے مجھے اہل دنیا کی طرف بلایا اور میں بادشاہ وقت اور امراء کے پاس گیا، انہوں نے میری طرف بہت توجہ کی، میرا رتبہ بلند کیا"۔ (زاد المتقین بحوالہ رود کوثر ص ۳۴۹)

ملا عبدالقادر شیخ کے دربار میں پہنچنے کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"چندگاہے در فتح پور بغبار الفت قدیم باشیخ فیضی و میرزا نظام احمد مصاحب بود و فقیر نیز بتقریب ایشان شرف خدمتش را دریافتہ پیوستہ از فوائد صحبتش محظوظ بودم۔ (منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۱۳)

شیخ فیضی سے قدیم محبت و تعلق کی بنا پر کچھ عرصہ تک فتح پور میں قیام کیا اور فیضی اور مرزا نظام احمد کی مصاحبت کی مجھ کو بھی اسی تقریب سے ان کی خدمت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا اور میں ان کی صحبت سے فیضیاب اور لطف اندوز ہوا۔

دربار میں اس وقت دانشور امراء کا اچھا مجمع تھا، ان کی کشش و علمی ماحول کی وجہ سے شیخ نے وہاں کا قصد فرمایا ہوگا۔ ان کے سفر کا مقصد سلطان کا تقرب، دنیوی جاہ و منزلت کی طلب، جلب منفعت اور حصول مال و زر نہ تھا، یہ باتیں ان کے ذوق و مزاج کے سراسر خلاف تھیں اور انہوں نے ان کو اپنا مطمح نظر نہیں بنایا جیسا کہ آگے معلوم ہوگا، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم فرماتے ہیں۔

"لیکن علم و اصحاب علم کا مرکز ہمیشہ دہلی مرحوم ہی رہی اعلی الخصوص وہ علمائے حق جو بادشاہی تعلقات کی ابتلاؤں سے بچنا چاہتے تھے اور حرص و طمع دنیا کی آلودگی سے پاک دامن تھے، اس گوشۂ علم کے سکون کو دارالحکومت کے شور و غوغا پر ترجیح دیتے

Marfat.com

تھے، حضرت شاہ عبدالحق محدث اسی عہد میں تھے، فرماتے ہیں:

حقی اس گوشہ دہلی نہ نہم پا بیروں ☆ خود گمہ فیتم کہ ملک گجراتم دادند

لیکن جب خاندانِ مبارک کو دربارِ حکومت میں عروج ہوا اور دربارِ شاہی کی مذہبی حالت دگرگوں نظر آئی تو ہندوستان سے قطع تعلق کر کے مکہ معظمہ چلے گئے۔'' (تذکرہ مرتبہ مالک رام مطبوعہ ساہتیہ اکیڈمی ص ۴۳)

زمانہ حال کے بعض محقق اہل قلم کا بھی یہی خیال ہے، ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''اپنے والد کی وفات ۹۹۰ھ کے بعد وہ اکبر بادشاہ کے دربار میں فتح پور میں پہنچے اس زمانہ میں یہاں دانشوروں کا اچھا مجمع تھا اس نے شیخ کا بڑھ کر استقبال کیا اور بادشاہ کی جانب سے بھی بڑی پذیرائی ہوئی''۔ (مقدمہ رسالہ نوریہ سلطانیہ ص ۲)

مگر شیخ کو جلد ہی تنبہ ہو گیا کہ وہ غلط جگہ آ گئے ہیں، اس ماحول میں دین و ایمان سلامت نہیں رہ سکتا، کیونکہ دربار کی دینی حالت روز بروز دگرگوں ہوتی جا رہی ہے اور وابستگانِ دولت ان کو استعمال کر کے اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانا اور اپنے غلط مقاصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اس لئے ان کو یہاں گھٹن محسوس ہونے لگی اور وہ یہاں سے بالکل ہی دلبرداشتہ ہو گئے، چنانچہ مکہ پہنچ کر وہ اپنے پیر و مرشد شیخ عبدالوہاب سے اس کی اس طرح فریاد کرتے ہیں۔

''سیدی! صغرسنی ہی سے علم و عبادت گزاری کی محنت و ریاضت میں میری نشوونما ہوئی ہے، میں نے عام لوگوں کے اختلاط اور میل جول سے اپنے کو الگ رکھا اور جب فضل خداوندی سے مجھے علم کا اچھا خاصا حصہ مل گیا اور میں نے یہاں کی اپنی ضرورتیں پوری کر لیں تو بعض اہل حقوق نے مجھے اہل دنیا کی طرف بلایا، چنانچہ میں بادشاہ وقت اور امرا کے یہاں گیا، انہوں نے میری جانب بہت اعتنا کیا، میرا رتبہ بلند کیا اور یہ چاہا کہ میرے ذریعہ سے اپنی جماعت بڑھائیں اور مجھ ناتواں سے اپنی قوت محکم کریں لیکن اللہ نے مجھے محفوظ رکھا اور ان کے ساتھ مجھے نہیں چھوڑا، اپنے بندہ کے دل میں ایک جذبہ پیدا کیا جس نے اس مقام شریف تک پہنچایا''۔ (الکاتیب والرسائل ص ۲۷۹ بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۹۲)

اس بیان سے درباری لوگوں کے ذہن و مزاج اور شیخ کی جانب ان کے غیر معمولی اعتنا اعزاز کے اسباب بھی معلوم ہو جاتے ہیں، ان چیزوں کی وجہ سے ان کی طبیعت اُچاٹ ہو گئی اور ان پر ایسی وحشت و گھبراہٹ طاری ہوئی کہ وہ دنیاوی جاہ و منزلت کو ٹھکرا کر اپنے گوشۂ عزلت میں پناہ گیر ہو جانے کے لئے مجبور ہو گئے۔

دربار میں شیخ کب پہنچے، کتنے روز وہاں مقیم رہے، کب واپس ہوئے اور وہاں ان کی سرگرمیاں اور مشغولیتیں کیا تھیں ان چیزوں کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ لیکن ان کے علمی ذوق و شغف کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دربار میں بھی انہوں نے درس و افادہ اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھا ہوگا، شیخ محمد اکرام رقمطراز ہیں:

''یہاں آپ نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کیا لیکن علمی اور روحانی ترقیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا اور ایک برگزیدہ اور نڈر بزرگ سے اسی زمانہ میں بیعت ہوئی۔'' (رودِ کوثر ص ۳۰۸)

حجاز جانے سے قبل شیخ کے درس و افادہ کا غلغلہ بلند کرنے کا ذکر پہلے آ چکا ہے اس لیے ممکن ہے یہ سلسلہ یہاں بھی قائم رہا ہو مگر دربار میں پہنچ کر بیعت ہونے کی بات درست نہیں معلوم ہوتی کیونکہ شیخ اپنے والد کے ایما سے ان کی زندگی ہی میں

Marfat.com

۹۸۵ھ میں بیعت ہو چکے تھے اور ان کے انتقال ۹۹۰ھ کے بعد دربار سے متوسل ہوئے۔ گو اس کا کوئی متعین ثبوت موجود نہیں ہے تاہم مؤرخین کے اشارات اور بعض قرائن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ دربار میں کس زمانہ میں پہنچے اور کب تک رہے تو اس کے متعلق عام خیال یہی ہے کہ وہ اپنے والد کے انتقال ۹۹۰ھ کے بعد وہاں تشریف لے گئے تھے۔

یہ بات بھی ثابت ہے کہ شیخ دربار سے دلبرداشتہ ہو کر ۹۹۵ھ ہی میں حج کے قصد سے روانہ ہو گئے تھے، اس لحاظ سے ۹۹۰ھ کے بعد اور ۹۹۵ھ کے درمیان انہوں نے کچھ عرصہ کے لئے فتح پور میں قیام کیا کیونکہ ملا عبدالقادر بدایونی کے الفاظ ''و چندگاہے در فتح پور'' سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ فتح پور میں زیادہ مدت تک نہیں رہے۔ اس بنا پر شیخ محمد اکرام کا یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا کہ ''سیکری میں شیخ عبدالحق کا قیام کوئی دس بارہ برس رہا ہوگا'' (رود کوثر ص ۳۴۹) کیونکہ دس بارہ برس کی مدت کو ''چندگاہے'' نہیں کہہ سکتے، معلوم ہوتا ہے کہ صاحب رود کوثر شیخ کی بیعت ۹۸۵ھ ہی سے ان کو فتح پور میں مقیم خیال کر بیٹھے ہیں جب کہ قوی بات یہ ہے کہ وہ ۹۹۰ھ کے بعد وہاں تشریف لے گئے، اس لیے اگر ۹۹۰ھ اور ۹۹۵ھ تک کے تمام درمیانی عرصہ کو بھی شیخ کے فتح پور کا زمانہ مان لیا جائے تب بھی دس بارہ برس فتح پور میں قیام کرنا درست نہیں معلوم ہوتا۔

(اخبار الاخیار ص ۲۹۴)

سفر حجاز:

شیخ عبدالحق دربار اکبری میں شریعت محمدی کی بے حرمتی اور پامالی نیز علمائے سوء اور مفاد پسند امرا کی دنیا طلبی کے لئے ہنگامہ آرائی اور ریشہ دوانی سے گھبرا کر اپنے وطن دہلی واپس آ گئے مگر یہاں بھی ان کو سکون و قرار نہ ملا، بلکہ ان کی وحشت و بیزاری میں برابر اضافہ ہوتا رہا، غالباً وہ یہ سمجھتے تھے کہ اکبر کے عروج و اقبال اور مستحکم اقتدار کی موجودگی میں دین کی خدمت و اشاعت اور شریعت محمدی کی حفاظت و صیانت ممکن نہیں، ایسے ماحول اور ناساز گار حالات میں آدمی کے لیے دین و ایمان پر قائم رہنا بھی مشکل ہے اس لئے انہوں نے وطن چھوڑ کر بارِ خداوندی میں حاضر ہونے کا فیصلہ کیا، اس موقع پر توفیق الٰہی نے دستگیری کی اور ان کا جذبہ صادق دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے گھر کی طرف بلا لیا اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ خود رقمطراز ہیں:

''اللہ کی طرف رجوع و انابت کرنے والا خائب و خاسر نہیں ہوتا، جس نے اس کی پناہ طلب کی اس کو نجات ملی چنانچہ دفعتاً بے کسوں کے چارہ گر اور پریشان حال لوگوں کے راہ نما نے مجھے اپنی طرف لیا، اور مجھ بے خانماں کی گردن میں زنجیر شوق ڈال کر اپنے گھر کی طرف کھینچ لیا اور مجھ نامراد کو منزل مراد تک پہنچا دیا یعنی اپنے حبیب ﷺ کی درگاہ میں جگہ دی اور حریم مرحمت و عنایت سے محروم واپس نہیں کیا''۔ (اخبار الاخیار ص ۲۹۴)

''اپنے شیخ و مرشد عبدالوہاب متقی سے بھی اس خاص فضل خداوندی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''لیکن اللہ نے مجھے محفوظ رکھا اور ان (امراء) کے ساتھ مجھے نہیں چھوڑا، اپنے بندہ کے دل میں ایک جذبہ پیدا کیا جس نے اس مقام شریف تک پہنچا دیا''۔

شیخ عبدالحق نے زاد المتقین اور جذب القلوب وغیرہ میں بھی ہندوستان کے ماحول سے اپنی وحشت و بیزاری اور غیب

Marfat.com

سے حج وزیارت کے جذبہ خالص پیدا ہو جانے کا ذکر کیا ہے، ملا عبدالقادر بدایونی کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

''جب زمانہ اور ابنائے زمانہ کی فتنہ سامانی اور مکروہات نیز واقف وآشنا لوگوں کی وضع وروش سے تنگ آگئے اور فلاں و فلاں اشخاص کی صحبت سازگار نہ دکھائی دی تو کعبہ شریف جانے کی توفیق ان کے شامل حال ہوئی اور جذبہ کے عالم میں بغیر کسی ساز وسامان کے وہ دہلی سے گجرات کو روانہ ہوئے اور مرزا نظام الدین احمد مرحوم کی مساعی جمیلہ اور امداد سے جہاز میں بیٹھ کر حجاز کے سفر پر روانہ ہوئے۔'' (منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۱۳)

شیخ عبدالحق حج وزیارت کعبہ کے ارادہ سے دہلی سے روانہ ہوئے تو پہلے، جین ومالوہ میں وہاں کے امیر وحاکم خان اعظم میرزا عزیز کوکہ کے یہاں قیام کیا، یہ اکبر کا رضاعی بھائی اور بڑا لائق شخص تھا، علمی فضائل وکمالات کے ساتھ ہی حسن سیرت اور حسن اخلاق سے بھی متصف تھا، اس نے شیخ کی خاطر ومدارات میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا، اسی نے زاد وراحلہ مہیا کیا تو احمد آباد کے لئے روانہ ہوئے۔ (گلزار ابرار اردو ترجمہ ص ۵۹۹ بحوالہ حیات شیخ عبدالحق ص ۳۹۶)

مالوہ سے مانڈو پہنچے، یہاں محمد غوثی شطاری صاحب گلزار ابرار نے ان سے ملاقات کر کے استفادہ کیا۔ (ایضا) ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مالوہ ہوتے ہوئے ۹۹۵ھ میں گجرات پہنچے تھے، احمد آباد میں مرزا نظام الدین احمد صاحب طبقات اکبری نے ان کا استقبال کیا، یہ ان دنوں یہاں کے بخشی تھے، ان کے اصرار پر شیخ آئندہ موسم حج تک کے لئے یہاں رکے رہے۔ (ایضا)

گجرات کے قیام کے زمانہ میں وہ حضرت شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور ان کے طریقہ قادریہ کے بعض اشغال واذکار بھی سیکھے، شیخ وجیہ الدین جید عالم اور جامع کمالات بزرگ تھے علم ظاہر کی طرح علم باطن کی دولت سے بھی مالا مال تھے ان کو مختلف بزرگوں کی صحبت نصیب ہوئی اور آخر میں سید محمد غوثی گوالیاری شطاری کے دامن تربیت سے وابستہ ہوئے، احمد آباد میں ان کا حلقہ درس مدتوں قائم رہا، وہ صاحب تصانیف کثیرہ بھی تھے شیخ عبدالحق ان سے اپنے فیضیاب ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''راقم سطور جس وقت سید کائنات ﷺ کی زیارت کے قصد سے اس دیار (گجرات) میں پہنچا تو اس نے یہاں کے متاخرین مشائخ میں شیخ وجیہ الدین کی ملاقات کی سعادت حاصل کی اور سلسلۂ عالیہ قادریہ کے کچھ اذکار واشغال بھی ان سے سیکھے۔ (اخبار الاخیار ص ۱۵۳)

مؤرخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عبدالحق نے گجرات میں بڑی مشغول زندگی بسر کی اسکی کسی قدر تفصیل شیخ محمد اکرام نے بھی تحریر کی ہے، ملاحظہ ہو۔

''پھر احمد آباد پہنچے اور اپنے قدیمی دوست مرزا نظام الدین صاحب طبقات کبری کے پاس قیام کیا جو ان دنوں صوبہ گجرات کے بخشی تھے، یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ جہاز کا موسم گزر چکا ہے، چنانچہ کوئی ایک سال تک رکنا پڑا، اس دوران میں علمی اور روحانی مشاغل برابر جاری رہے بلکہ شاید آپ کے مشہور تذکرۃ الاولیا اخبار الاخیار کے زیادہ وسیع نقطہ نظر اور زیادہ صحیح معلومات کا ایک سبب یہ ہے کہ آپ نہ صرف دہلی کے اہل علم یا ان بزرگوں سے جو اپنی ضروریات کے سلسلے میں دار الخلافہ

Marfat.com

میں آتے تھے واقف تھے بلکہ آپ نے (حجاز کے علاوہ) پنجاب، بندیل کھنڈ، مالوہ اور گجرات کا سفر کیا تھا، وہاں کی زیارتیں دیکھی تھیں اہل علم سے ملاقاتیں کی تھیں اور اطراف ملک کی روحانی زندگی سے ذاتی واقفیت تھی، احمد آباد میں آپ کو وہاں کے سب سے برگزیدہ عالم شیخ وجیہ الدین علوی سے ملنے اور فیض پانے کا موقع ملا اور اخبار الاخیار میں آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے ان سے قادریہ سلسلہ کے کئی اذکار و اشغال بھی حاصل کیے، مولانا سلیمان کردی نے (جن کے صاحبزادے مولانا احمد کردی احمد آبادی گجرات کے مشہور فاضل شیخ نور الدین احمد آبادی کے استاد تھے آپ سے احمد آباد میں حدیث پڑھی۔

(رود کوثر ص ۳۵۱، ۳۵۲)

گجرات سے روانہ ہو کر مکہ معظمہ تشریف لائے تو یہاں کے علماء سے اپنی علمی تشنگی بجھائی اور ان سے احادیث کی سند کی یہاں سب سے زیادہ حضرت شیخ عبد الوہاب متقی کی ذات گرامی ان کی عقیدت و شیفتگی کا مرکز رہی، ان سے علم وفن کی تکمیل بھی کی اور سلوک و احسان کی راہیں بھی طے کیں۔

شیخ عبد الحق نے پہلے ان سے مشکوٰۃ کا درس لیا اور آخر میں صحیح مسلم پڑھی، ان کی خدمت میں رہ کر خلوت و ذکر والٰہی سے لذت آشنا ہوئے اور تصوف کے سلسلہ قادریہ شاذلیہ مدنیہ و چشتیہ کی ان سے اجازت بھی پائی، ان کی رہنمائی میں تصوف کے اسرار و آداب بھی سیکھے اور اس کی متعدد کتابیں بھی پڑھیں، منہج السالک الی اشرف المسالک اور قواعد الطریقۃ فی الجمع بین الشریعۃ والحقیقہ کا خاص طور پر ان سے درس لیا، شیخ عبد الوہاب کی تعلیم و تربیت نے دراصل ان کی زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا جس کی تفصیل حسب موقع آئے گی۔

حج و زیارتِ مدینہ:

غرض حجاز کے قیام میں انہوں نے بڑے علمی و روحانی مراتب طے کیے مگر شیخ نے یہ مقدس اور بابرکت سفر اپنی وحشت دل اور اضطراب و بیزاری دور کرنے کے لئے کیا تھا، اس لئے خیال ہے کہ انہوں نے زیادہ عرصہ حرمین میں گزارا ہوگا تاکہ ہر سال حج و زیارت کعبہ سے مشرف ہو کر بیش از بیش اس کی روحانی برکتیں اور سعادتیں حاصل کریں۔ وہ عشق نبویؐ میں بھی سرشار تھے، اس لئے دربار نبوت میں حاضر ہو کر مدینہ کے انوار و برکات سے متمتع ہونے کے لئے بھی نہایت بیتاب تھے، وہ تین برس سے زیادہ حرمین میں مقیم رہے، ظاہر ہے یہ موقع انہوں نے غنیمت سمجھا ہوگا اور ہر سال حج و زیارت سے مشرف ہوئے ہوں گے مگر تذکرہ نگاروں نے ایک یا دو بار حج کرنے کا ذکر کیا ہے۔

یہ پہلے گزر چکا ہے کہ وہ اپنے گھر بار اور اعزہ و اقارب کو ۹۹۵ھ ہی میں چھوڑ کر اس مقدس سفر کے لئے دہلی سے روانہ ہوئے تھے مگر یہ پورا برس گجرات ہی میں گزارنا پڑا اور وہ ۹۹۶ھ میں مکہ معظمہ تشریف لے جا سکے۔

شیخ کی حجاز سے ہندوستان واپسی ۱۰۰۰ھ میں ہوئی مگر مورخین لکھتے ہیں کہ وہ ۹۹۹ھ کے ختم ہونے سے پہلے ہی اپنے پیر و مرشد شیخ عبد الوہاب متقی کے حکم سے مکہ معظمہ چھوڑ چکے تھے، اس طرح گویا تین حج کا زمانہ ان کو مکہ میں ملا مگر بعض مورخین کے خیال کے مطابق انہوں نے ایک دفعہ اور بعض کے بیان کے مطابق دو دفعہ حج کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ۹۹۶ھ میں مکہ معظمہ پہنچے تو اس سال فریضہ حج ادا کیا، مکہ پہنچنے کے دس ماہ بعد ۲۳، ربیع الثانی ۹۹۷ھ کو مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوئے اور جب ۹۹۸ھ کے

Marfat.com

آخر تک وہیں رہے، اس کے بعد دوبارہ مکہ معظمہ تشریف لائے اور اس سال دوسری دفعہ حج کیا، شعبان ۹۹۹ھ کے آخری ایام میں طائف تشریف لے گئے پھر مکہ معظمہ آکر تھوڑی مدت تک قیام کرنے کے بعد اسی سال ہندوستان کیلئے روانہ ہوئے۔
(نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۲ و فوائد جامعہ ص ۱۴)

دوسرے مؤرخین کا خیال ہے کہ ان کا تمام وقت علوم کی تحصیل میں گزرا اور انہوں نے صرف ایک بار فریضۂ حج ادا کیا، خافی خان کہتے ہیں:

بعد ادائے حج واجب مدت مدید محض برائے تحقیق صحت احادیث دراں مکان بسر بردہ۔ (منتخب اللباب حصہ اول ص ۲۴۰)

فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد وہ مدت مدید تک صحت و تحقیق احادیث کی غرض سے اسی جگہ مقیم رہے۔

اس سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے صرف ایک بار فریضۂ حج ادا کیا، اس کے علاوہ انہوں نے سارا وقت علمی مشاغل اور احادیث کی طلب و تحصیل میں گزارا۔

سب سے زیادہ حیرت ناک بیان ملا عبدالقادر بدایونی کا ہے، وہ حضرت شیخ کے معاصر اور اہل تعلق تھے انہوں نے ان کی مدینہ طیبہ کی حاضری کی تردید کی ہے لکھتے ہیں۔

وبجہت مع (؟) بعضے موانع طبیعی بمدینہ طیبہ سکینہ علی ساکنہا السلام والتحیات نتوانست مشرف شد۔ (منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۱۳)

بعض طبعی اسباب و موانع کی وجہ سے مدینہ طیبہ کی زیارت سے مشرف نہیں ہو سکے

ہمارے خیال میں ملا صاحب کا یہ بیان محل نظر ہے، حضرت شیخ تو مدینہ طیبہ پہنچنے اور دربار نبوی میں حاضری کے لئے سراپا شوق و اضطراب بنے ہوئے تھے، ایسی صورت میں تین برس تک وہاں قیام کرنے کے باوجود بھلا وہ کس طرح زیارت مدینہ سے محروم رہتے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں۔

''شیخ عبدالحق دہلوی کو رسول اکرم ﷺ کی ذات پاک سے عشق تھا، دیار حبیب میں جب داخل ہوتے تو برہنہ پا ہو جاتے تھے، قصۃ الکرام میں لکھا ہے۔

درمدینہ برہنہ پا گردیدے۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۱۲) مدینہ میں ننگے پاؤں پھرتے تھے۔

خود شیخ نے مدینہ طیبہ کے انوار و برکات اور فتوحات و انعامات کا جس والہانہ و سرشارانہ انداز میں ذکر کیا ہے وہ بھی ملا صاحب کے بیان کو مشکوک اور نامعتبر بنا دیتا ہے، فرماتے ہیں:

''مجھ فقیر حقیر کو حضرت بشیر نذیر ﷺ کے اکرام و انعام سے جو بشارتیں ملیں ان کی جانب اشارہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے امید ہے کہ اس کے آثار و انوار ظاہر ہوتے رہیں گے۔ (اخبار الاخیار ص ۲۹۴)

ایک اور جگہ درگاہ سید المرسلین کے اپنے اوپر مخصوص انعام و اکرام کا تذکرہ کیا ہے اور اس کی صراحت بھی کی ہے کہ انہیں خواب میں آنحضور ﷺ کی زیارت و بقا کا شرف دوبار حاصل ہوا، آپ سے بلاواسطہ حدیث کا سماع کیا اور مقصود و مراد پالینے کی بشارت پائی''۔ (فہرس التوالیف بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۴۰)

Marfat.com

حجاز سے واپسی کے بعد کے بعض واقعات:

شیخ عبدالحق حرمین چھوڑ کر ہندوستان واپس آنے کے لئے آمادہ نہ تھے مگر مرشد و مربی کے حکم کے آگے ان کی کچھ نہ چل سکی، ان کی طرف سے جس قدر حجاز میں قیام کے لئے اصرار ہو رہا تھا مرشد کی جانب سے اسی قدر شدت سے ہندوستان واپسی پر زور دیا جا رہا تھا، بالآخر ۹۹۹ھ کے آخر میں انہوں نے حجاز چھوڑ دیا اور ۱۰۰۰ھ میں دہلی میں واپس آ گئے۔

شیخ جن حالات سے دلبرداشتہ ہو کر ہندوستان سے گئے تھے وہ ان کی واپسی کے بعد بھی برقرار تھے لیکن اب ان کی علمی و روحانی تعلیم و تربیت ہر طرح سے مکمل ہو چکی تھی اور وہ حرمین کے انوار و برکات کا مشاہدہ بھی کر چکے تھے اس لیے وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تازہ دم ہو گئے تھے، چنانچہ انہوں نے دینی علوم کی خدمت و اشاعت کے لیے اپنی مسند درس و ارشاد بچھائی اور علم و دین اور رشد و ہدایت کی شمع روشن کر کے الحاد، بے دینی اور بدعات کا قلع قمع کرنے کا فیصلہ کیا، ان کی سرگرمیوں کا ذکر آگے حسب موقع کیا جائے گا۔

شیخ کی حج سے واپسی کے بعد فیضی نے متعدد خطوط لکھ کر شوقِ ملاقات ظاہر کی اور لاہور تشریف لانے کی دعوت دی مگر غالباً گزشتہ تلخیوں کی وجہ سے شیخ اس کے پاس جانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور انہوں نے معذرت لکھ بھیجی، (منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۱۵) ملا عبدالقادر بدایونی کو بھی شیخ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا، چنانچہ کچھ وقت نکال کر وہ بدایوں سے دہلی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جب اس کے بعد لاہور گئے تو ان کے اور شیخ کے درمیان خط و کتابت بھی رہی۔ (ایضاً ص ۱۱۴)

اتفاق سے شیخ کی واپسی کے وقت حضرت خواجہ باقی باللہ بھی دہلی آئے ہوئے تھے شیخ عمر میں ان سے بڑے تھے، اس کے باوجود انہوں نے ان سے ملاقات کا شرف حاصل کیا اور ان کے دامن تربیت سے وابستہ ہو کر نقشبندیہ طریقہ کی تحصیل کی، محمد صادق دہلوی ان دونوں بزرگوں کے معاصر تھے وہ کلمات الصادقین میں لکھتے ہیں کہ شیخ محدث حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے روحانی اشارے پر حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت ہوئے تھے، اور خواجہ صاحب ان سے لطف و کمال تواضع کے ساتھ پیش آئے۔ (مراۃ العالم بختاور خان ج ۲ ص ۴۴۴)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے مجموعہ مکاتیب میں خواجہ صاحب کے نام کے سات خطوط ہیں، جن میں متعدد اہم معاملات میں ان سے رہنمائی طلب کی گئی ہے۔ ان مکاتیب سے شیخ محدث کی ان سے عقیدت و شیفتگی اور دونوں کی باہمی محبت و خصوصیت اور اخلاص کا پتہ چلتا ہے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ ''ہمارے شہر میں نسبت نقشبندیہ کے داعی اور طالبین کے مرشد عارف کامل مولانا خواجہ محمد باقی قدس سرہ ہیں، وہ اس طریقہ میں ہمارے بھی شیخ ہیں'' اور رسالہ وصیت میں لکھا ہے کہ:

> ''جب ہندوستان واپس آیا تو خواجہ محمد باقی نقشبندی کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا، ان سے عرصہ تک خواجگان کی نسبت کی مشق و تربیت حاصل کی اور ذکر، مراقبہ، رابطہ، حضور اور یادداشت کی تعلیم پائی''۔ (بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۳۶ و ۱۳۷)

شیخ عبدالوہاب متقی کی وصیت و ہدایت:

شیخ عبدالحق محدث نے حجاز پہنچ کر شیخ عبدالوہاب متقی کو اپنی قلبی کشمکش اور ہندوستان سے بیزاری کے جو اسباب بتائے

Marfat.com

اس کی بنا پر شیخ متقی نے ہندوستان واپس ہوتے وقت انہیں خاص طور پر گوشہ گیری اور عدم اختلاط کی تلقین کی اور مکمل یکسوئی و انہماک کے ساتھ علم و دین کی خدمت اور رشد و ہدایت کا کام انجام دیتے رہنے کا مشورہ دیا تا کہ اہل دنیا انہیں دربار وغیرہ سے وابستہ کر کے ان کے اصلی کاموں اور علمی و دینی مشاغل سے منحرف و غافل نہ کر سکیں، شیخ عبدالحق ان کی اس تلقین اور حجاز سے واپسی کے بعد کے مشاغل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''انہوں نے فرمایا سبحان اللہ! کیا بہتر ہوتا اگر وہ ایک پیر سے معذور ہو جاتا اور گمنامی اور گوشۂ عزلت میں بیٹھا رہتا کیونکہ وہ وصول و قبول کے مرتبہ کو پہنچا ہوا ہے، پھر فرمایا لیکن یہ عزلت نشینی بڑا دشوار کام ہے، اور اس میں ثابت قدم رہنا آسان نہیں، اس معاملہ میں اصل بات یہ ہے کہ انسان لوگوں سے اشتراک عمل کرے، امور خیر میں ان کے ساتھ رہے اور انکی بری باتوں سے بچے، بس اسی وجہ سے بندہ نے لوگوں سے میل جول نہیں رکھا، حج سے واپسی کے بعد حریص، لالچی اور جھگڑالو حاجیوں کی طرح بلادِ دکن، بیجاپور، برہان پور کی طرف نہیں گیا اور نذرانے وصول نہیں کیے، جو درویشوں اور اس طریقہ کے رہبروں پر لازم ہے، پس الحمدللہ وہ آفتوں سے بچ کر اور خدا کی مقدور کی ہوئی برکتیں لے کر اپنے وطن مالوف دہلی کو واپس آ گیا جو فقراء اور درویشوں کا ٹھکانا اور عشاق محبین کا مسکن ہے اور اللہ پر بھروسہ اور اس کے فضل و کرم کا طالب ہو کر فقر کے دروازہ پر بیٹھ گیا شیخ نے مجھے خلوت، عزلت اور الگ تھلگ رہنے کا حکم دیا تا ہم انہوں نے اس معاملہ میں آزمائش کا خیال کر کے نرمی اور رخصت سے کام لیا تا کہ دشواری اور زحمت کا باعث نہ بنے، چنانچہ یہ بندہ ناتواں اللہ کی توفیق کے مطابق اپنے تمام اوقات اعمال و اشغال کو انجام دینے میں بسر کرتا ہے، لیکن بعض اوقات اور بعض حالات میں کہیں کہیں جاتا بھی رہتا ہے اور بعض احباب و اصحاب خیر کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان کی زیارت کرنے کا شرف بھی حاصل کرتا ہے اس طرح اغیار کے اختلاط اور نقصان اٹھانے کی داغ سے محفوظ رہتا ہے۔ (فوائد جامعہ ص ۱۹ و ۲۰)

لاہور کا سفر اور شاہ ابوالمعالی سے استفادہ:

شیخ عبدالحق شیخ عبدالوہاب متقی کی تاکید و وصیت کے مطابق دہلی میں فروکش رہ کر یکسوئی کے ساتھ علمی خدمت میں مشغول رہے، مگر ان کی سہولت اور رخصت سے بھی فائدہ اٹھایا اس لئے اہل علم کی خدمت میں حاضری اور مشائخ کے پاس جانے کا وقتاً فوقتاً موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے، خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں فیض حاصل کرنے کے لئے جانے کا اوپر ذکر آیا تھا، اب ان کے لاہور جا کر مشہور شیخ طریقت حضرت شاہ ابوالمعالی سے ملاقات کا حال بیان کیا جاتا ہے۔

شاہ ابوالمعالی سلسلہ قادریہ کے صاحب کمال بزرگ اور شیخ داؤد کے مرید و خلیفہ تھے، شیخ عبدالحق ان کے بڑے قدردان اور عقیدت مند تھے، شاہ صاحب بھی ان کے اور ان کی تصنیفات کے بڑے مداح تھے وہ فرماتے تھے کہ ''ہم نے تمہاری کتابوں سے دینی و دنیاوی فائدے حاصل کیے ہیں''۔

انہوں نے شیخ عبدالحق کو مشکوٰۃ کی شرح کی تکمیل کی خاص طور پر ہدایت کی تھی، وہ جب ان سے رخصت ہو کر دہلی واپس ہو رہے تھے، انہوں نے فرمایا کہ ''مشکوٰۃ کی شرح مکمل کر دو۔ ان شاء اللہ اس سے ایک عالم مستفید ہوگا'' شیخ نے کتاب کی تکمیل کے لئے دعا کی درخواست کی تو ارشاد ہوا کہ وہ پوری ہو جائے گی، انہوں نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ شرح میں جابجا اشعار

Marfat.com

بھی درج کریں تا کہ انداز بیان دلچسپ ہو۔ (تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۵۴)

فتوح الغیب کی شرح بھی شاہ ابوالمعالی کے اصرار سے لکھی تھی۔ (شرح فتوح الغیب ص ۴۲۱)

شاہ ابوالمعالی صاحب تصنیفات بھی تھے، شعرا کے کلام پر بھی ان کی اچھی نظر تھی، خود بھی مشقِ سخن فرماتے تھے۔ غربی تخلص تھا، شیخ عبدالحق کو ان سے غیر معمولی عقیدت تھی اور انہوں نے تصوف وسلوک میں ان کے بلند مرتبہ، بکثرت ریاضت و مجاہدہ اور مقبولیت وغیرہ کا نہایت وسعت قلبی سے اعتراف کیا ہے، (اخبار الاخیار ص ۱۹۵) وہ ان کی غیر معمولی عظمت ہی کی وجہ سے ان سے اصلاح اور رہنمائی کے بھی طالب ہوئے تھے، شاہ صاحب کا ان پر اس قدر اثر تھا کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے ان کی مرضی سے لاہور میں مقید ہو گئے تھے، حضرت شاہ ابوالمعالی نے بھی ان کو لوگوں کے اختلاط اور میل جول سے سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا اور ہر طرف سے یکسو ہو کر محنت وتوجہ سے اپنا کام انجام دیتے رہنے کی ہدایت فرمائی تھی، اس معاملہ میں انہوں نے شیخ عبدالوہاب متقی کی طرح کوئی رخصت اور نرمی نہیں برتی تھی، یہاں تک تاکید کی تھی کہ وہ دہلی سے باہر قدم نہ نکالیں۔

درس وتدریس اور مدرسہ:

شیخ عبدالحق کے کارناموں، علمی ودینی مشاغل اور عملی سرگرمیوں کی باقاعدہ ابتدا حجاز کے سفر سے واپسی کے بعد ہوتی ہے، اس زمانہ میں انہوں نے گوناگوں دینی، علمی اور تعلیمی خدمت انجام دیئے، اس سلسلہ میں ان کا ایک نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ وہ حجاز سے آنے کے بعد مدۃ العمر درس وتدریس کی مسند پر فروکش رہے، اس کے لئے انہوں نے جو دینی مدرسہ قائم کیا تھا اس میں ایک نیا اور عام حلقہ ہائے درس سے مختلف نصاب تعلیم داخل کیا تھا۔

گو حجاز کی روانگی سے پہلے ان کی علمی فیضان کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا مگر حجاز سے واپسی کے بعد دینی علوم کی نشر واشاعت اور کتب دینیہ خصوصاً احادیث کی تعلیم کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور تقریباً ۵۲ برس تک درس وتدریس کے مشغلہ میں پوری یکسوئی، انہماک اور سرگرمی سے لگے رہے، اس کے لئے اپنا خواب وخور حرام کر دیا۔

ساری دلچسپیاں اور لذتیں ترک کر دیں، سیر وسفر اور لوگوں سے ملنا جلنا سب چھوڑ دیا جس کی شیخ عبدالوہاب متقی اور شاہ ابوالمعالی نے ان کو خاص طور پر ہدایت بھی کی تھی۔

ان کے حلقہ درس وتدریس اور تعلیمی اصلاح وانقلاب کی خصوصیت واہمیت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس عہد کی علمی وتعلیمی حالات کا مرقع بھی پیش نظر رہے۔

ہندوستان میں دینی علوم بالخصوص قرآن وحدیث کی تعلیم وتعلم کی جانب کم توجہ رہی چنانچہ سندھ اور ملتان وغیرہ سے عربوں کی حکومت کے خاتمہ کے بعد جب غزنوی اور غوری سلاطین برسراقتدار آئے تو ان کے زمانے میں ایران، خراسان اور ماوراء النہر کے علاقوں سے جو اصحاب علم ودرس ہندوستان آئے ان کو دینی علوم وتفسیر وحدیث میں زیادہ درخور نہ تھا، اس کی وجہ سے یہاں علم حدیث عنقا کی طرح معدوم ہو گیا اور نجوم، فلکیات، ریاضی اور منطق وفلسفہ پر ساری توجہ مرکوز کر دی گئی، قرآن مجید اور سنت نبوی کو پڑھنے پڑھانے کے بجائے دینی علوم میں صرف فقہ وتصوف سے سروکار باقی رہ گیا تھا فقہ میں سارا زور فقہ حنفی کے فروع وجزئیات پر صرف کیا جاتا تھا، علم حدیث کی کسمپرسی اور غربت کا یہ حال تھا کہ اس سے صرف اس بنا پر اور اس حد

Marfat.com

تک سروکار رہ گیا تھا کہ فقہی بحثوں میں کہیں کہیں حدیثوں کا ذکر آجاتا تھا، حدیث کی امہات کتب کے بجائے صرف صغانی کی مشارق الانوار درس وتدریس میں داخل تھی، اگر کسی نے اس سے سوا توجہ دی تو مصابیح السنۃ بغوی اور مشکوٰۃ المصابیح کو بھی دیکھ لیا، محدث بننے کے لئے بس اسی قدر کافی تھا۔ نواب صدیق حسن خاں اور مولانا حکیم سید عبدالحی دونوں نے ہندوستان کے اسلامی مدارس اور علما کے درس کی اس دردناک حالت کا ذکر کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

''علم حدیث کا سرے سے کوئی چرچا نہ تھا، لوگ نہ خود ان کی جانب مائل تھے اور نہ دوسروں کو اس کے حصول کی کوئی ترغیب دیتے تھے، وہ اس فن کی کتابوں سے ناواقف اور محدثین کے ناموں سے ناآشنا تھے، بہت تھوڑے لوگ صرف مشکوٰۃ پڑھ لیتے تھے اور وہ بھی محض حصولِ برکت کے لئے، اس پر عمل کرنا اور اس کو سمجھنا ان کا مقصد نہ ہوتا، فقہ میں صرف فقہ حنفی اور علمائے ماوراء النہر کے فتوؤں اور اجتہادات پر قانع ہو گئے تھے اور محض فروع وجزئیات میں الجھے رہتے تھے، ان کا راس المال فقہ تھی وہ بھی تقلیدی رنگ وانداز میں، تحقیق سے معدودے چند لوگوں کو ہی دلچسپی تھی''۔

(الحطۃ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۷۰ والثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند ص ۱۳۵ تا ۱۳۸)

مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

''محمد تغلق المتوفی ۷۵۲ھ جس کے براہ راست تعلقات مصر کی عباسی خلافت سے تھے اور اس کی طرف سے اس کو حکومت کا فرمان، خلعت اور علم بھی ملا تھا اور خلیفہ عباسی سے اس نے بیعت بھی کی تھی، اس کا قاعدہ تھا کہ جب لوگوں سے بیعت لیتا تھا تو مصر کے خلیفہ کے فرمان کے ساتھ ساتھ قرآن پاک اور مشارق الانوار کا نسخہ سامنے رکھ لیتا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک ہندوستان میں قرآن پاک کے بعد احادیث میں صرف مشارق الانوار کا وجود تھا، جب شاہی کتب خانہ کا یہ حال تھا تو عام لوگوں کی دسترس کا کیا پوچھنا ہے''۔ الغرض شیخ عبدالحق محدث سے پہلے صرف مشارق الانوار للصاغانی الاہوری (متوفی ۶۵۰ھ) کے نسخے اور کہیں کہیں مصابیح (اصل مشکوٰۃ) البغوی المتوفی (۵۱۶ھ) کے نسخے دستیاب ہوتے تھے اور یہی دو کتابیں یہاں کے علما کے درس میں تھیں''۔ (مقالات سلیمان جلد دوم ص ۷۴ و۷۵)

علماء اور اصحاب درس کی حالت یہ تھی کہ وہ نہ نصوص کی پروا کرتے تھے اور نہ بحث واستدلال میں احادیث کو حجت وبنیاد بناتے تھے، اجتہاد وتحقیق کا دروازہ ہی سرے سے بند تھا، فقہی اقوال کو قرآن وحدیث کی کسوٹی پر تولنے کے بجائے خود قرآن وحدیث کی کسوٹی فقہ کو بنا لیا گیا تھا، نصوص کی بے دھڑک توجیہ وتاویل کی جاتی تھی یا سرے سے ان کو ترک ہی کر دیا جاتا تھا، معقولات کی جانب بڑھتے ہوئے رجحان اور فلسفہ وکلام سے کثرت اشتغال کی وجہ سے دین کی حقیقت وصورت مسخ اور شریعت محمدی کی روح غائب ہوتی جارہی تھی اور بدعتوں اور گمراہیوں کا زور بڑھتا جارہا تھا۔

حدیث نبوی سے بے اعتنائی وبے رغبتی اور منطق وفلسفہ سے غیر معمولی شغف کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ ایران سے آنے والے علماء نے علوم عقلیہ کو خاص طور پر بڑا رواج اور فروغ دیا، شیخ فتح اللہ شیرازی نے متاخرین علمائے ایران محقق دوانی، میر صدر الدین، میر غیاث الدین منصور اور مرزا جان وغیرہ کی تصانیف کو ہندوستانی مدارس کے نصاب میں داخل کر کے ان کی نشر وترویج کی، چنانچہ طلبہ ومتعلمین انہی کا درس لیتے اور انہی میں الجھے رہنے کی بنا پر قرآن وحدیث کے علوم سے ناآشنا اور بے خبر رہتے، ان کی ساری زندگی حکماء وفلاسفہ کے نظریات کے مطالعہ وتحقیق میں بسر ہوئی، صوبہ گجرات کے مشہور زمانہ عالم و

Marfat.com

فاضل ابوالفضل گازرونی اکثر و بیشتر طوسی کی کتاب التجرید شیخ بو علی سینا کی شفاواشارات اور بطلیموس کی مجسطی کا درس دیا کرتے تھے، طلبہ ان کے پاس سفر کر کے آتے تھے، پنجاب میں علامہ کمال الدین کشمیری اور ان کے شاگرد ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے درس کا غلغلہ مچا ہوا تھا، یہ دونوں بزرگ مختلف علوم کا درس دیتے تھے مگر نہ مدارس کی اصلاح کر سکے اور نہ ان کے نصاب میں حدیث کو داخل کر سکے۔ (الحدیث ص ۱ تا ۵ ڈاکٹر محمود احمد صدیقی)

اس زمانہ کے امراء وسلاطین کو رموزِ مملکت کی گتھیاں سلجھانے اور شورشوں اور بغاوتوں کو فرو کرنے سے ہی فرصت نہ ملتی تھی، وہ تعلیم تعلم کا نظم واہتمام کیا کرتے، دہلی سے دور بعض علما کے علوم دینی کے مرکز قائم تھے لیکن جیسا کہ اوپر گزرا اُن میں سے اکثر و بیشتر میں کتاب وسنت کے بجائے معقولات اور متاخرین علمائے ایران کی تصنیفات زیر درس تھیں۔

یہی حالات تھے جن میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی مسند درس پر رونق افروز ہوئے اور انہوں نے ایک دینی مدرسہ کی دہلی میں داغ بیل ڈالی۔ وہ علم دین سے پوری طرح بہرہ ور تھے اور انہوں نے ہند وحجاز کے علمائے کاملین سے مکمل استفادہ کیا تھا، ان کے نزدیک بگڑے ہوئے مذاق وماحول کی اصلاح اور فتنوں اور گمراہیوں کا انسداد علم دین کے فروغ واشاعت ہی سے ہو سکتا تھا اس لئے انہوں نے تیرہ وتار ماحول میں علم دین کی قندیل روشن کی اور علماء کو فضول مذہبی مناقشوں، تکفیر وتفسیق کے ہنگاموں اور معقولات کی پُر پیچ بحثوں کو چھوڑ کر کتاب وسنت کی تعلیم کی جانب راغب ہونے کی دعوت دی اور فقہ وفروع میں الجھنے کے بجائے مہمات دین کی طرف متوجہ ہونے کی تلقین کی۔

ان کے فیض سے دینی علوم خصوصاً علم حدیث کو بڑا فروغ نصیب ہوا جس کی مزید تفصیل آگے آئے گی، حقیقت یہ ہے کہ شمالی ہند میں ان کی بدولت کتاب وسنت کے علم کا عام چرچا ہو گیا، ہندوستان میں درس وافادہ اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ بڑی حد تک انہی کی ذات سے شروع ہوا اور دہلی سلطنت وحکومت کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ علم دین کا بھی دارالسلطنت ہو گیا۔

شیخ محدث کا مدرسہ دہلی ہی میں نہیں تمام شمالی ہند کا پہلا مدرسہ تھا جس میں دینی علوم خصوصاً حدیث کی اہم کتابوں کا درس ہوتا تھا، انہوں نے دینی تعلیم کا ایسا مستحکم نظام قائم کیا تھا جس سے ہندوستان میں ایک علمی انقلاب رونما ہو گیا اور جس سے مسلمانوں کے معاشرہ کو ایک نئی توانائی اور زندگی مل گئی تھی مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:

''مولانا جمال الدین کے آخری عہد میں شیخ عبدالحق حجاز سے واپس آئے، اللہ نے ان کی عمر مبارک میں بڑی برکت دی اور ان کی تدریس وتصنیف نے ایک پورا سلسلۂ تعلیم ملک میں قائم کر دیا۔ (تذکرہ ص ۳۰۱)

شیخ عبدالحق کے مدرسہ اور نصاب درس میں دینی علوم خصوصاً علم حدیث کو مرکزیت واولیت حاصل تھی۔ انہوں نے مسند درس اسی لیے بچھائی تھی کہ علم دین کا صحیح اور خالص ذوق پیدا کر کے دوسرے علوم سے مستغنی کر دیں، کتاب وسنت کی تعلیم کو فروغ دے کر معقولات ومنظومات کی طرف سے رخ پھیر دیں، عقلی علوم کی کتابوں کو درسیات سے خارج کر کے احادیث کی کتابوں کو نصاب درس میں شامل کر دیں، ان کی درسگاہ کا نصاب اس زمانہ کی دوسری درسگاہوں سے مختلف تھا، اس نصاب درس میں قرآن وحدیث کو تمام علوم کا مرکزی نقطہ قرار دیا گیا تھا اور اس کا اصل مقصد حدیث نبوی کی اس سرزمین اور اس ملک میں ترویج واشاعت تھا۔ آزاد بلگرامی کا بیان ہے۔

Marfat.com

''حج سے واپسی کے بعد ۵۲ برس تک استقلال و دلجمعی کے ساتھ درس و تدریس کے مشغلہ میں منہمک رہے، اپنے فرزندوں اور دوسرے طلبہ کو پڑھاتے رہے علوم و فنون بالخصوص حدیث کی ترویج و اشاعت کا کام انجام دیتے رہے، انہوں نے تعلیم و تدریس کا نیا انداز اور ایسا نہج اختیار کیا جس کو ممالک عجم کے متقدمین و متاخرین علما نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا، ان کا طریقہ درس امتیازی خصوصیات کا حامل تھا اور مدرسہ عام مدرسوں سے ممتاز و مستثنیٰ تھا''۔ (مآثر الکرام جلد اول ص ۲۰۱)

شیخ عبدالحق کے مدرسہ سے سینکڑوں طلبہ اور کئی اساتذہ وابستہ تھے، طلبہ ملک کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔

تلامذہ:

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے درس و تعلیم کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اس کی شہرت کی گونج ہندوستان سے باہر عرب ملکوں میں بھی سنائی دیتی تھی، ان سے استفادہ کے لیے ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے طلبہ ان کی خدمت میں آتے تھے، کشمیر سے بنگال اور دہلی سے جونپور تک ان کے تلامذہ پھیلے ہوئے تھے، جن کی بدولت آج تک شیخ محدث کا سلسلہ چل رہا ہے، انہوں نے طویل عمر پائی تھی اور نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک وہ مسند درس پر فروکش رہے اس طرح ہزاروں اہل علم اور طلبہ نے ان سے کسب فیض کیا ہوگا، اب اتنی مدت گزرنے کے بعد ان سب کا پتہ لگانا بھی مشکل ہے، تاہم جن تلامذہ کا نام معلوم ہو سکا ہے ان کا ذکر سطور ذیل میں کیا جاتا ہے:

۱: شیخ نورالحق دہلوی (م سنہ ھ) یہ حضرت شیخ کے فرزند اور علمی جانشین تھے، اس کتاب میں ان کا مستقل تذکرہ آگے ہوگا۔

۲: شیخ ہاشم۔

۳: رضی الدین المناقب شیخ علی محمد۔

۴: شیخ ابوالبرکات ولی الدین عبدالنبی۔

(اول الذکر دونوں بزرگ شیخ عبدالحق کے فرزند تھے) اور تینوں حضرات ان کے اجازت یافتہ تھے، رسالہ ثبت الشیخ عبدالحق دہلوی میں اس اجازت نامہ کی نقل ہے جس میں ان سب حضرات کے نام بہت بلند مدحیہ الفاظ کے ساتھ درج ہیں اور حدیث کی جو کتابیں ہیں ان لوگوں نے شیخ دہلوی کے پاس پڑھی ہیں ان کے نام بھی درج ہیں۔

(ماہنامہ برہان مارچ ۱۹۵۴ء ص ۱۵۷ مضمون مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی بعنوان حیات عبدالحق)

۵: شیخ ابوالسعادت کمال الدین ابوالرضا بابا رتن بن اسماعیل دہلوی (م ۱۰۶۳ھ) یہ شیخ دہلوی کے نواسے تھے۔

(ایضاً فوائد جامعہ ص ۳۹)

۶: مولانا عبدالحکیم: (المتوفی ۱۰۶۷ھ) ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، انہوں نے بھی شیخ محدث سے استفادہ کیا تھا اور شیخ نے ان کو اپنی کتابوں کی روایت کی اجازت دی تھی اور ان سے ان کے فرزند عبداللہ لبیب نے ان کتابوں کی روایت کی ہے، عبداللہ لبیب سے عبداللہ بن سعد اللہ لاہوری (م ۱۰۸۳ھ نے اور ان سے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے شیخ الحدیث ابوطاہر کردی نے روایت کی ہے، حضرت شاہ صاحب شیخ ابوطاہر کے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

از اں جملہ شیخ عبداللہ لاہوری و کتب ملا عبدالحکیم سیالکوٹی از وے روایت کند عن الشیخ عبداللہ اللبیب عن مولانا عبدالحکیم و کتب شیخ

Marfat.com

عبدالحق یہ ہمیں واسطہ از مولانا عبدالحکیم روایت کنند و وے از شیخ عبدالحق اجازت روایت۔

(انسان العین ص ۱۳ بحوالہ برہان مارچ ۵۴ء ص ۱۶۰، ۱۶۱ مضمون مولانا حبیب الرحمن اعظمی)

ان کے استادوں میں شیخ عبداللہ لاہوری بھی تھے، شیخ ابوطاہر ان سے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی کتابوں کی روایت کرتے تھے، وہ شیخ عبداللہ لبیب سے اور عبداللہ لبیب مولانا عبدالحکیم سے روایت کرتے تھے، شیخ عبدالحق کی کتابوں کی روایت بھی شیخ ابوطاہر اسی واسطہ اور سند سے کرتے تھے یعنی عبداللہ لبیب مولانا عبدالحکیم شیخ عبدالحق سے اجازۃً روایت کرتے تھے۔

۷: **مولانا محمد حیدر دہلوی:** مذکورہ بالا اجازت نامہ کے ساتھ ایک مستقل اجازت نامہ مولانا محمد حیدر بن مولانا محمد صادق بن مولانا حاجی علی کے نام سے بھی ہے جس کے آخر میں ۲۲ ذی قعدہ ۱۰۴۷ھ کی تاریخ درج ہے، اس رسالہ کے آخر میں ایک اور اجازت نامہ ہے جس میں مولانا حیدر نے شیخ مولانا احمد بن شاہ محمد بن ابراہیم کو حدیث کی سند اور روایت کی اجازت دی ہے اور اس پر مولانا حیدر نے اپنا دستخط اس طرح لیا ہے۔ محمد حیدر بن محمد صادق بن میر محمد الدہلوی مولداً الہمدانی اصلاً والجعفری نسباً۔ (رسالہ برہان مارچ ۵۴ء ص ۱۵۸)

۸: **شیخ محمد حسین خانی نقشبندی:** اس رسالہ کے سرورق پر ایک تحریر شیخ احمد ابوالخیر مکی کی ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مؤلف (شیخ عبدالحق دہلوی) سے شیخ محمد حسین نقشبندی اور ان سے شیخ حسن عجمی المدنی روایت کرتے ہیں اور میں متعدد طرق سے بواسطہ شیخ عبدالحق روایت کرتا ہوں جن میں سب سے عمدہ اور صحیح طریق وہ ہے جو میرے شیوخ کے ان استاذوں سے ہے جو شیخ حسین عجمی سے متصل ہوتی ہیں۔ (ایضا) شیخ محمد حسین صاحب تصانیف تھے، ان کی کتاب ''الطریقۃ المحمدیہ فی بیان الطریقۃ النقشبندیہ'' مشہور ہے کہا جاتا ہے کہ عرب میں ان کے اور بعض دوسرے شاگردوں کے واسطہ سے شیخ عبدالحق کا سلسلہ پھیلا۔ (فوائد جامعہ ص ۳۹)

۹: **خواجہ خاوند معین الدین بن خواجہ خاوند محمود المعروف بحضرت ایشان:** شیخ دہلوی کے نامور شاگرد اور سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگ تھے، انہوں نے علوم حدیث، تفسیر، فقہ اور اصول میں شیخ سے کسب کمال کیا اور اپنے والد بزرگوار سے خرقہ خلافت پایا، کتاب رضوانی ان کی تصنیف ہے۔ (خزینۃ الاصفیاء ص ۳۰۴ بحوالہ مقالات سلیمان ج ۲ ص ۲۵)

۱۰: **خواجہ حیدر بن خواجہ فیروز کشمیری:** (م ۱۰۵۶ھ) شیخ دہلوی کے نامور شاگرد عالم عامل وعارف کامل اور علمائے کشمیر کے استاد تھے، پہلے اپنے وطن کے علماء ملا جوہر ناتھ اور بابا قطب الدین سے فنون کی تحصیل کی، آخر میں دلی آکر شیخ عبدالحق محدث کے حلقہ درس میں داخل ہوئے، ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور حدیث، فقہ اور تفسیر کی تکمیل کی، ان سے ان علوم کی اجازت بھی پائی یہاں سے واپس جاکر درس وتدریس اور ہدایت وارشاد میں مصروف ہوئے، والیٔ کشمیر نے ہر چند چاہا کہ وہ قضا کا عہدہ قبول کرلیں مگر وہ راضی نہ ہوئے۔

خواجہ حیدر کو قرآن مجید بہت اچھا یاد تھا اور حفظ کے بعد مدۃ العمر ہر سال پورا قرآن شریف تراویح میں پڑھتے رہے، جس زمانہ میں یہ شیخ عبدالحق کے یہاں تحصیل علم میں مصروف تھے، شیخ کی فرمائش پر ایک سال شب براءت کو پورا قرآن سنایا، کسی ایک جگہ بھی لقمہ دینے کی ضرورت پیش نہ آئی صبح کو شیخ نے فرمایا ''تم نے بہت اچھا پڑھا اور خوب یاد رکھا ہے لیکن اگر تھوڑا علم مخارج اور قواعد قراءت بھی حاصل کرلو تو بہتر ہو، چنانچہ اس کے بعد انہوں نے شیخ سے علم مخارج اور اصول قراءت کی تحصیل کی،

Marfat.com

بابا داؤد مشکوٰتی مصنف اسرار الابرار ان کے شاگرد ہیں۔
(اسرار الابرار برہان مارچ ۵۴ھ ص ۱۵۸ و ۱۵۹ و تذکرہ علمائے ہند ص ۵۴ بحوالہ مقالات سلیمان ج ۲ ص ۲۵)

۱۱: شاہ طیب ظفر آبادی: یہ سادات سیوانہ کی نسل سے تھے، علوم کی تکمیل مولانا شاہ عبدالحق دہلوی سے کی، فراغت کے بعد مدت تک درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا، اس کے بعد خدا طلبی کی دھن پیدا ہوئی اور حضرت شیخ تاج الدین جھونسوی سے بیعت کی اور خلافت پائی، تھوڑے عرصہ تک جھونسی اور بنارس کے اطراف میں قیام رہا، پھر ظفر آباد آکر محلہ مخدوم پور میں سکونت اختیار کرلی اور وہیں انتقال فرمایا مزار ظفر آباد ضلع جون پور میں ہے۔ (تجلی نور حصہ دوم ص ۲۷) مصنف بحر زخار کے جداعلی شیخ محمد محمود قلندر ان کے ارشد خلفا میں تھے، قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ طیب کا انتقال گیارہویں صدی کے اوائل میں ہوا۔
(سمات الاخیاء مؤلفہ حکیم مولوی عبدالحمید کاتب مصطفیٰ آبادی بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی از سید احمد عروج قادری ص ۱۶۲)

۱۲: مخدوم دیوان محمد رشید بن مصطفیٰ جونپوری: یہ ممتاز عالم اور صاحب سلسلہ شیخ وصوفی تھے، مناظرہ رشیدیہ ان کی مشہور تصنیف ہے، حدیث میں شیخ نور الحق دہلوی کے شاگرد تھے اور سند حدیث بھی انہی سے حاصل کی تھی، جب یہ حدیث کی تعلیم کے لیے دہلی پہنچے تو شیخ عبدالحق اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے مسند درس پر اپنے صاحبزادے شیخ نور الحق کو بیٹھا چکے تھے مگر دیوان محمد رشید کی خاطر سے یہ منظور فرمایا کہ میری موجودگی میں تم نور الحق سے حدیث کا درس لو، چنانچہ شیخ عبدالحق کی موجودگی میں وہ شیخ نور الحق سے حدیث کا درس لیتے رہے، یہاں تک کہ فراغت حاصل کی۔ (ایضا)

دیوان محمد رشید کے صاحبزادے دیوان محمد ارشد اپنے والد کی سند حدیث کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

واجازت حدیث از صحیح بخاری و مصابیح و مشکوٰۃ از حضرت شیخ نور الحق ولد قدوۃ المحدثین اسوۃ العارفین حضرت شیخ عبدالحق الدہلوی البخاری یافتہ۔ (تذکرہ شیخ عبدالحق محدث ص ۱۶۲)

کتب حدیث صحیح بخاری، مصابیح اور مشکوٰۃ کی اجازت حضرت شیخ نور الحق سے حاصل کی جو قدوۃ المحدثین حضرت شیخ عبدالحق دہلوی کے فرزند تھے مگر تذکرہ علمائے حنفیہ میں مذکور ہے۔

"دیوان صاحب نے سند حدیث شریف کی حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی۔ وقت پڑھنے حدیث شریف کے شیخ نے فرمایا کہ میاں نور الحق! دیوان صاحب حدیث پڑھتے ہیں، ہم سنتے ہیں، تم بھی سنتے جانا، دیوان صاحب نے کتب صحاح ستہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا، اس کے بعد شیخ نے آپ کو سند حدیث کی دی، اس کے بعد دیوان صاحب دہلی سے جونپور تشریف لائے"۔
(تذکرہ شیخ عبدالحق محدث ص ۱۶۲)

دیوان صاحب ملا محمود جونپوری کے ہم عصر و ہم سبق اور استاذ الملک ملا محمد افضل جونپوری اور ملا شمس نور بردنوی کے شاگرد رشید تھے اور حضرت مخدوم طیب بنارسی کے چشتی سلسلہ میں خلیفہ تھے، دوسرے بزرگوں سے بھی اجازت وخلافت حاصل تھی، ۱۰۸۳ھ میں وفات پائی، سال ولادت ۱۰۰۰ھ ہے۔ (ماہنامہ برہان مارچ ۵۴ھ ص ۱۶۲)

۱۳۔ مولانا شیخ ابو احمد سلیمان کردی: یہ اصلاً کرد کے باشندے تھے لیکن آخر میں احمد آباد (گجرات) میں متوطن ہوگئے تھے، اسی لیے احمد آبادی اور گجراتی کی نسبتوں سے بھی مشہور ہوئے، یہ اپنے وطن کرد سے نکلے، سیر وسیاحت کرتے ہوئے خراسان اور پھر لاہور میں کچھ دنوں قیام کرتے ہوئے دلی آئے اور یہاں آکر حضرت شیخ کے حلقۂ درس میں داخل ہوگئے،

Marfat.com

مولوی رحمان علی کا بیان ہے کہ شیخ عبدالحق دہلوی کی خدمت میں فیوض حاصل کیے اور تبحر فاضل ہوئے، متعدد بلند تصنیفات ان کی یادگار ہیں، (تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲) انہوں نے شیخ محدث سے صرف حدیث کی سند ہی حاصل نہیں کی تھی بلکہ ان کے ایسے گردیدہ ہوئے کہ ان کے خلیفہ اور روحانی جانشین بن کر دہلی سے نکلے اور احمد آباد گجرات جا کر بس گئے، حضرت شیخ کا علمی و روحانی سلسلہ انہی کے واسطے سے گجرات میں پہنچا، (تذکرہ شیخ عبدالحق محدث ص ۱۰۴) سیدنا عبدالقادر جیلانی کے حالات میں ایک مثنوی منبع الخیرات لکھی، اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے، مولانا سلیمان کے صاحبزادے مولانا احمد بھی اپنے وقت کے یگانہ روزگار عالم تھے اور حدیث کی اجازت اپنے والد سے پائی تھی، (تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲ و ۱۳) علوم میں اچھی دسترس تھی، تصنیفات بھی ان سے یادگار ہیں از اں جملہ علم کلام میں ایک تصنیف فیوض القدس ہے۔ ۱۱۱۲ھ میں وفات پائی، ان کا اور ان کے والد مولانا سلیمان کا مزار احمد آباد میں ہے۔ (ایضاً ص ۱۵،۲)

مولانا احمد کے ایک شاگرد مولانا شیخ نورالدین احمد آبادی تھے جو بلند پایہ محدث تھے، انہوں نے نورالقاری کے نام سے صحیح بخاری کی ایک شرح لکھی تھی جس کا قلمی نسخہ بھروچ کے محکمہ قضاۃ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ۱۱۵۵ھ میں وفات پائی، ان کے علوم و معارف کے وارث ان کے فرزند شیخ محمد صالح عرف پیر بابا تھے مگر ان کی وفات ۱۱۴۷ھ میں اپنے والد کی حیات ہی میں ہوگئی تھی۔

۱۴: مولانا شاہ عبدالجلیل الہ آبادی: یہ ایک عارف کامل اور حضرت شیخ محمد صادق گنگوہی کے مرید و خلیفہ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے شاگرد رشید تھے۔ (لواء العاشقین ص ۱۰۱ بحوالہ برہان مارچ ۵۴ء ص ۱۶۳)

۱۵: شیخ عبدالقادر مفتی: رسالہ مثبت شیخ عبدالحق الدہلوی کے سرورق پر ان کو بھی شیخ محدث دہلوی کا شاگرد بتایا ہے، مگر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے نزدیک شیخ عبدالقادر مفتی مکہ (المتوفی ۱۱۳۸ھ) کا سماع یا لقا شیخ دہلوی سے مستبعد ہے، اس کے انہوں نے بعض قوی اسباب بھی بیان کیے ہیں اس بنا پر مولانا اعظمی ان کو شیخ عبدالحق کا بلاواسطہ شاگرد نہیں تسلیم کرتے اور یہ فرماتے ہیں کہ غالباً ان کے اور شیخ محدث دہلوی کے درمیان ایک واسطہ چھوٹ گیا ہے۔ (ماہنامہ برہان مارچ ۵۴ء ص ۵۸)

۱۶: شیخ عنایت اللہ بن الہداد صدیقی بلگرامی۔ (فوائد جامعہ ص ۳۹)

۱۷: شیخ شاکر محمد بن وجیہ الدین حنفی دہلوی (م ۱۰۶۳ھ) (خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۱۶۴)

شیخ محدث اور دینی علوم:

شیخ عبدالحق محدث کی توجہ کا اصلی مرکز دینی علوم تھے، خصوصاً احادیث سے ان کو زیادہ شغف رہا اور اپنے زمانہ کے حالات کی وجہ سے انہوں نے علم حدیث ہی کی جانب زیادہ توجہ مبذول فرمائی اور دوسرے علوم کی جانب زیادہ اعتنا نہ کر سکے، تاہم ان کو تمام دینی علوم میں مکمل دستگاہ حاصل تھی اور سب میں انہوں نے مفید کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

Marfat.com

تفسیر و علوم قرآن:

قرآن مجید کے علوم و معارف اور تفاسیر پر وسیع نظر رکھتے تھے گو اس کی جانب زیادہ اعتنا نہیں کر سکے مگر اس فن پر ان کو عبور حاصل تھا اور انہوں نے اس کی باقاعدہ تحصیل کی تھی، مفتی غلام سرور لاہوری کا بیان ہے کہ:

''علم حدیث کی مکمل طور پر تحصیل کی تھی اور وہ اس میں درجہ کمال پر فائز تھے''۔ (خزینۃ الاصفیاج ا ص ۱۶۴)

وہ قرآن مجید کی اہمیت و مرکزیت کے پوری طرح قائل تھے، فلسفیانہ اور کلامی تفسیروں کی خرابیوں پر بھی ان کی نظر تھی، خصوصاً متاخرین کی تفسیروں میں جن پہلوؤں سے نقائص راہ پا گئے ہیں وہ ان کی نظر میں تھے، اس سے تفسیر قرآن کے بارے میں ان کے درست اور صائب نقطہ نظر کا پتہ چلتا ہے، انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر کو منطق و فلسفہ کے دلائل سے مخلوط اور گڈمڈ کر دینے پر ناگواری ظاہر کی ہے کیونکہ اسکی وجہ سے کتاب و سنت کے اصلی دلائل ان کے نیچے دب گئے ہیں۔ اپنی کتاب نکات الحق میں ایک جگہ فلسفہ کی مذمت اور متکلمین کی کجروی کا تذکرہ کیا ہے اسی سلسلہ میں تفسیر بیضاوی کے متعلق یہ اظہار خیال بھی کیا ہے۔

''قرآن مجید کی تفسیر اور اس باب کی حدیثوں کی شرح میں امام بیضاوی سے بہت سی قباحتیں ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے، اگر ان ساری جگہوں کو شمار کیا جائے تو گفتگو طویل ہو جائے گی''

(بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی از سید احمد قادری ص ۱۴۰)

اس مختصر بیان سے اس فن پر ان کی عمیق نظر اور اس کے متعلق صحیح نقطہ نظر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے اور جب بیضاوی کے بارے میں ان کا یہ خیال تھا تو تفسیر کبیر وغیرہ کے بارہ میں ان کی رائے کیا کچھ رہی ہوگی،

شیخ عبدالحق نے اپنے تفسیری ذوق کی بنا پر بیضاوی کے ربع اوّل کا حاشیہ اور بعض سورتوں کی تفسیریں بھی لکھی تھیں جن کا ذکر تصنیفات میں آئے گا۔

فقہ:

شیخ عبدالحق دہلوی فقہ و اصول میں بھی بڑی بصیرت و مہارت رکھتے تھے اور وہ فقیہ کی حیثیت سے بھی ممتاز تھے تذکرہ نگاروں نے ان کو فقیہ لکھا ہے نواب صدیق حسن خان صاحب حدیث سے زیادہ ان کی فقہی معرفت و بصیرت کے قائل تھے، ایک جگہ لکھتے ہیں: ''حدیث میں مہارت سے زیادہ ان کو فقہ میں دستگاہ حاصل تھی'' (اقصار جیود الاحرار ص ۱۴) دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں: ''حنفی فقہ کی کتابوں پر ان کو جس قدر عبور حاصل تھا وہ حیطۂ بیان سے باہر ہے'' (اتحاف النبلاء ص ۳۰۲) اوپر ذکر آچکا ہے کہ شیخ کے زمانہ میں فقہی فروع و جزئیات اور عقلی علوم کا عام چرچا تھا، اس کی وجہ سے لوگ کتاب و سنت کے علوم سے نا آشنا اور ان کے دلائل سے ناواقف تھے اور تقلید عام تھی، بعض ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر پورے ملک میں حنفی فقہ کا رواج تھا سلاطین بھی اس مذہب فقہ سے وابستہ تھے اور علماء و مشائخ بھی جمود و تعطل کا شکار تھے۔ ایسے دور میں شیخ عبدالحق نے کتاب و سنت سے براہ راست استفادہ کی دعوت دی اور درس و نصاب میں حدیث کی کتابیں داخل کیں تاکہ فقہی جمود کا خاتمہ ہو جائے، وہ خود حنفی تھے مگر مقلد نہ تھے بلکہ محقق حنفی تھے، ان کی نظر احادیث پر بڑی گہری تھی اس لئے انہوں نے اس عام رجحان کی مدلل

Marfat.com

طور پر تردید کی کہ: ''فقہ حنفی مجرد رائے و قیاس پر مبنی ہے، اور ثابت کیا کہ مذہب کتاب و سنت کے مطابق اور روح دین کے موافق ہے، ایک محقق کی طرح انہوں نے اس مذہب کا دوسرے مذاہب فقہ سے مقابلہ و موازنہ کیا اور اس کی تائید میں دلائل و شواہد پیش کر کے دکھایا کہ حنفی مذہب کا دارومدار عقلی و نقلی دونوں طرح کے دلائل پر ہے مگر اس تائید و ترجیح میں انہوں نے غالی متعصب مقلدین کی طرح دوسرے مذاہب کا کوئی استخفاف نہیں کیا بلکہ انہیں بھی قرآن و حدیث سے ماخوذ بتایا۔ اس کی وجہ سے ان پر غلو اور تعصب کا الزام بھی عائد کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔''

تصوف و سلوک:

حضرت شیخ عبدالحق پر تصوف و سلوک کا رنگ بہت غالب اور نمایاں تھا، ان کی جس ماحول میں پرورش ہوئی تھی وہ بھی تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا، ان کے پدر بزرگوار ایک صاحب دل بزرگ تھے انہوں نے اپنے فرزند کو بھی بچپن ہی سے تصوف کا لذت شناس بنا دیا تھا، جن بزرگوں سے انہوں نے بیعت و ارادت کا تعلق رکھا اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے، یہاں ہم ترتیب سے سب کے ناموں کی فہرست درج کر رہے ہیں جن کی رہنمائی میں انہوں نے سلوک کی راہیں طے کی تھیں اور جن سے تصوف کے اذکار و اشغال سیکھے تھے۔

۱: شیخ موسیٰ بن شیخ حامد سے سب سے پہلے سلسلہ قادریہ میں بیعت ہوئے اور خلافت پائی۔

۲: شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی سے طریقہ قادریہ کے بعض اشغال و اذکار سیکھے۔

۳: شیخ عبدالوہاب متقی سے سلسلہ قادریہ شاذلیہ مدنیہ چشتیہ میں بیعت کی اور اجازت پائی۔

۴: خواجہ باقی باللہ نقشبندی سے نقشبندیہ سلسلہ کی تکمیل کی۔

۵: شیخ ابوالمعالی لاہوری سے بھی بڑا تعلق رہا اور ان کے ارشادات و ہدایات پر پورے طور پر کاربند رہے۔

شیخ عبدالحق کو سلسلہ عالیہ قادریہ سے زیادہ مناسبت تھی اور ان پر اسی نسبت کا غلبہ تھا، ان کو اور ان کے والد محترم کو شیخ عبدالقادر جیلانی سے والہانہ عقیدت و شیفتگی تھی، اسی لیے اس سلسلہ میں ایک بزرگ حضرت موسیٰ سے اپنے والد کے ایما سے بیعت ہوئے جس کا نسبتی تعلق بھی حضرت شیخ عبدالقادر سے تھا۔ مفتی غلام سرور کا بیان ہے۔

اعتقاد کامل بجانب غوثیہ اعظمیہ بہم رسانیدہ بود۔ (خزینۃ الاصفیاء ج ا ص ۱۶۴)

حضرت غوث اعظم کے سلسلہ کی جانب مکمل عقیدت رکھتے تھے۔

شیخ نے خود لکھا ہے کہ ''مجھے خواب میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے رسول ﷺ کے اشارہ پر مرید کیا تھا۔ (زبدۃ الآثار قلمی نسخہ بحوالہ حیات شیخ عبدالحق ص ۱۴۲) اپنی کتابوں میں ان کا ذکر نہایت عقیدت و محبت سے کرتے ہیں، ان کی شاید ہی کوئی تصنیف ان کے ذکر سے خالی ہو، ان کا نام آتے ہی ان پر عجیب وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اخبار الاخیار ہندوستانی صوفیہ کا تذکرہ ہے لیکن غایت عقیدت کی بنا پر اس کا آغاز حضرت شیخ ہی کے تذکرہ سے کیا ہے۔

تصوف کا ذوق شیخ عبدالحق کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا، ان کے والد نے بچپن ہی میں صوفیہ و مشائخ کی پاکیزہ باتیں ان کے کانوں میں ڈال رکھی تھیں اور وہ اپنی فطرت و طبیعت کے اقتضا سے ان باتوں کے سننے میں خاص لذت و خوشی محسوس کرتے

Marfat.com

تھے اور زمانہ طفولیت ہی سے بزرگوں اور صلحا کے والہ وشیدا تھے، بچپن میں جب والد محترم توحید اور وحدت الوجود کے مسائل و نکات ان کو سمجھاتے اور وہ ان کی سمجھ میں نہ آتے اس لیے کچھ شک وتردد ظاہر فرماتے تو والد فرماتے کہ حقائق ودقائق کے بارے میں اس قسم کے شکوک وشبہات پیدا ہوجاتے ہیں لیکن ان شاء اللہ رفتہ رفتہ حجاب اٹھ جائے گا، اصل چیز یہ ہے کہ اس کا خیال اور جہل نہ ہونے پائے بلکہ اسکی دریافت کی سعی وکاوش میں برابر لگے رہنا چاہیے، (اخبار الاخیار ص ۲۹۰) چنانچہ شیخ کی محنت اور طلب صادق سے سارے رجحانات اٹھ گئے اور حقیقت کا روزِ روشن پوری طرح بے نقاب ہوگیا۔

تصوف کا ذوق عمر کے ساتھ ان میں زیادہ پختہ ہوتا اور بڑھتا گیا، چنانچہ اس میں ان کے فضل ومرتبہ کا اعتراف تمام تذکرہ نگاروں نے کیا ہے، ملا عبدالقادر بدایونی فرماتے ہیں کہ: ''وہ تصوف میں بلند مرتبہ رکھتے تھے'' (منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۱۴) مرزا نظام الدین احمد رقمطراز ہیں'' وہ دہلی میں صوفیوں کے وضع قطع میں زندگی گزارتے تھے'' (طبقات اکبری ج ۲ ص ۴۶۴) نور الدین جہانگیر کا بیان ہے کہ: ''ایک مدت سے شیخ عبدالحق دہلی کے ایک گوشہ میں توکل وتجرید کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں، بزرگ آدمی ہیں، ان کی صحبت بے ذوق نہیں'' (تزک جہانگیری ص ۲۸۵) عبدالحمید لاہوری تحریر فرماتے ہیں ''وہ صوری ومعنوی کمالات کے جامع، زاہد وصوفی مشرب، صوری ومعنوی فضائل سے آراستہ اور اسرار غیبی سے واقف تھے۔ نوے برس کی عمر میں بھی ان کی عبادت وریاضت اور اوراد ووظائف اور ذکر وتلاوت کے التزام میں کوئی فرق نہیں آیا۔ (بادشاہ نامہ جلد اول دفتر دوم ص ۳۴۱) طبقات شاہجہانی کے مصنف لکھتے ہے'': شیخ عبدالحق سے طلب علم کرنے والے اور دہلی کے عام وخاص عارفین ان کے متبرک انفاس سے محظوظ ہوتے تھے ان کی ذات فیض حق کا مظہر اور نورِ مطلق کا مہبط ہے، (عمل صالح ج ۳ ص ۳۷۷) بختاور خاں کا خیال ہے کہ'' وہ صاحب مقامات رفیعہ وسالک درجات منیعہ تھے'' (مراۃ العالم ج ۲ ص ۲۴۳) شاہنواز خاں کے نزدیک'' شیخ عبدالحق کو مشائخ سے بڑی نعمتیں ملیں، عین جوانی میں مکہ معظمہ گئے اور دربارِ رسالت سے تربیت پاکر گم گشتگانِ بادیہ ضلالت کی رہنمائی پر مختار ہوئے'' (مراۃ آفتاب نما بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۶۷) غلام علی آزاد بلگرامی مولوی رحمان علی، نواب صدیق حسن خان اور حکیم مولانا سید عبدالحی وغیرہ نے بھی اِن کو علوم ظاہر وباطن میں ممتاز وصاحب کمال، صوری ومعنوی فضائل کا جامع اور تصوف وسلوک میں بلند پایہ قرار دیا ہے، مفتی غلام سرور لاہوری فرماتے ہیں:

''اپنے زمانہ میں علم وعمل اور زہد وریاضت میں یکتا اور بے مثال تھے۔ ظاہری وباطنی علوم میں کامل واکمل تھے اور شریعت وطریقت اور حقیقت میں مقتدائے وقت تھے''۔ (خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۱۶۴)

مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں:

''بعض اولیاء اللہ ایسے بھی گزرے ہیں کہ خواب میں یا حالت غیبت میں روزمرہ ان کو دربار نبوی میں حاضری کی دولت نصیب ہوتی تھی، ایسے حضرات صاحب حضوری کہلاتے ہیں، انہی میں سے ایک حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہیں کہ یہ بھی اس دولت سے مشرف تھے اور صاحب حضوری تھے''۔ (الافاضات الیومیہ من الافادات القومیہ ج ۷ ص ۹)

تصوف میں اس درجہ بلند پر فائز ہونے کے باوجود شیخ اخفائے حال سے کام لیتے تھے، ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کے علمی ودرسی اشغال کو ستر احوال پر محمول کیا ہے تا کہ لوگ سلوک واحسان میں ان کی عظمت وبرتری سے ناواقف رہیں، ملا صاحب کے الفاظ یہ ہیں

Marfat.com

ستر حال خویش بافادہ واستفادہ علوم رسمیہ می کند۔ (منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۴)

اپنی حالت کو پوشیدہ رکھنے کے لئے انہوں نے ظاہری درسی علوم کے افادہ واستفادہ کا مشغلہ اختیار کیا تھا۔

ملا صاحب کے خیالات کی بازگشت شاہنواز خاں کے یہاں بھی سنائی دیتی ہے فرماتے ہیں:

بشہر دہلی مراجعت نمود وتربیت ارباب ارادت بتدریس کتب احادیث مشغول۔ (مراۃ آفتاب نما بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق ص ۶۷)

(حرمین سے) سے دہلی واپس ہوئے اور کتب احادیث کے درس میں مشغول رہ کر مریدین کی تربیت فرماتے رہے۔

مندرجہ بالا تحریروں سے تصوف وسلوک میں شیخ کی عظمت و بلند پایگی پوری طرح ظاہر ہوگئی لیکن ان کی ذات گرامی طریقت کی طرح شریعت کی بھی جامع تھی اور ان کی یہی جامعیت ان کے علم وتصوف دونوں میں نظر آتی ہے۔ وہ حقیقت میں تصوف کو تزکیہ باطن، اصلاحِ نفس اور علم وعمل کی تطہیر کا ذریعہ سمجھتے تھے، اس لئے وہ متقشف علمائے ظاہر اور فقہا کی طرح تصوف کے نہ مخالف تھے اور نہ بے راہ رو صوفیہ ومشائخ کی طرح ان کا تصوف فرائض واعمال سے غافل کرنے والا تھا، ان کے علم نے ان کو تصوف کی بے راہ روی سے محفوظ رکھا اور تصوف نے علم میں اخلاص کی شان پیدا کی، ان کے نزدیک شریعت طریقت پر مقدم ہے اور طریقت شریعت کے تابع ہے، ان کی کتابوں میں جن صوفیہ کے اقوال وعبارتیں منقول ہیں وہ علمی حیثیت سے بھی ممتاز، دونوں طریقوں کے جامع اور ارباب شریعت واہل طریقت دونوں گروہوں کے متفق علیہ ہیں، فقہاء و صوفیہ کے جو الگ الگ حلقے اور طبقے بن گئے ہیں اور یہ دونوں برابر ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رہتے ہیں، شیخ اس تقسیم اور طبقہ واریت کے خلاف تھے اس بنا پر انہوں نے دونوں جماعتوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی پوری کوشش کی، اور اس معاملہ میں ان کو اپنے مرشد شیخ عبدالوہاب متقی سے بڑی رہنمائی ملی، ان کی خاص تاکید تھی کہ تم شریعت وتفقہ کے عمل کو اولیت و اہمیت دو پھر اس کے بعد حقیقت وطریقت کے مراتب طے کرو، شیخ نے اس ہدایت پر عمل کرکے تصوف وتفقہ کی دوئی اور تضاد کو رفع کیا اور بتایا کہ تصوف کو فقہ کی احتیاج ہے مگر فقہ تصوف سے بے نیاز ہے، تصوف کا درجہ اعلیٰ ہے مگر عام ضرورتیں اور مصلحتیں فقہ سے وابستہ ہیں۔ شیخ عبدالوہاب کی تلقین یہ بھی تھی کہ: ''تم فقیہ صوفی بنو اور صوفی فقیہ نہ بنو'' اس کا مطلب یہ ہے کہ فقہ، عمل شریعت اور ظاہر کی حفاظت کو مقدم خیال کرو، اس کے بعد تصوف طریقت اور تصفیہ باطن کے مقامات طے کرو یہی سلامتی اور کمال کی راہ ہے۔

دین وشریعت اور تصوف وطریقت کے رمز آشنا اور ہر ایک کے حدود ومراتب سے واقف ہونے کی بنا پر وہ ائمہ اسلام فقہا، مجتہدین اور صوفیہ ومشائخ سب کے عظمت شناس تھے۔

دراصل شیخ عبدالحق کے نزدیک بنیادی چیز کتاب وسنت نبوی اور شریعت محمدی ہے اور وہ علماء وصوفیہ دونوں جماعتوں کے اقوال کی کسوٹی انہی کو مانتے تھے اور ان حضرات کے یہاں جو چیزیں ان کو نصوص کے خلاف معلوم ہوتی تھیں انہیں وہ رد فرما دیتے تھے بعض صوفیائے خام شریعت پر عمل نہیں کرتے اور شریعت وطریقت میں تفریق کرتے ہیں، شیخ محدث اس طرح کے لوگوں کو صوفی نہیں مانتے بلکہ گمراہ سمجھتے ہیں، ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ: ''جس حقیقت کو شریعت مردود قرار دے وہ زندقہ ہے، وہ حضرت شیخ جنید بغدادی کے حوالہ سے بتاتے ہیں کہ ''کتاب وسنت طریقت کی بنیاد ہے اور جو چیز ان کے مخالف ہو وہ مردود

Marfat.com

وباطل ہے''۔ [1]

اس تفصیل سے تصوف کے معاملہ میں ان کے محتاط ومعتدل مسلک وروش کا اندازہ ہوتا ہے، ان کے زمانہ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے وحدت الوجود کی شدومد سے مخالفت کی، شیخ کے والد پر اس کا غلبہ تھا مگر شیخ نے احتیاط کی وجہ سے وحدت الوجود کی تردید وحمایت سے پرہیز کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان پر شیخ عبدالوہاب متقی کا زیادہ اثر تھا، جو وحدۃ الوجود کے معاملہ میں افراط وتفریط کے بڑے مخالف تھے، ان کی تعلیم وتربیت کو بھی تصوف کے معاملہ میں شیخ عبدالحق کی روش کو معتدل بنانے میں بڑا دخل تھا، تصوف میں ان کا درجہ بلند تھا لیکن ان کا اصل میدان علم وتحقیق ہے اس لیے اندیشہ تھا کہ اگر وہ غلبہ حال کی بنا پر تصوف کی زبان میں گفتگو کریں گے تو عام لوگوں کی فہم واستعداد سے بالاتر ہوں گی اور ان سے فائدہ سے زیادہ نقصان ہوگا اس بنا پر شیخ عبدالوہاب نے اس قسم کی باتیں کرنے کی ممانعت کردی تھی، چنانچہ شیخ عبدالحق فرماتے ہیں:

''اس بندہ کو حقائق واسرار کے متعلق کلام کرنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ اس بات پر مامور ہے کہ حدیثوں کے سلسلہ میں آداب شریعت کے سوا کچھ نہ بیان کرے، ہمارے شیخ نے اس کی وصیت فرمائی ہے کہ دین وملت ہی کے مسائل وابواب اور ان امور میں بحث وکلام پر اکتفا کروں جن سے دین کی ترویج، شریعت کی تجدید، عقائد دین کی حفاظت ہوتی ہو دائرہ احتیاط واعتدال اور جادۂ استقامت سے باہر قدم نہ رکھوں اور وجودیوں کے اشارات اور باطنیوں کی تاویلات میں نہ پڑوں کیونکہ ان چیزوں سے حسرت وندامت کے سوا کچھ حاصل نہیں، انہوں نے یہ ہدایت بھی فرمائی تھی کہ ''مشائخ کی کتابوں کا مطالعہ اور ان سے استفادہ بہتر ومبارک ہے لیکن حسب مقدور مبہم اور مشتبہ باتوں میں نہ پڑنا، اگر اہل طریقت کی باتیں ظاہر شریعت کے خلاف معلوم ہوں تو یا تو ان بزرگوں کی جانب ان کی نسبت ہی کی نفی کردو یا ان کی تاویل کر کے ظاہر شریعت ودین وحق سے ان کی مطابقت بیان کردو اور اگر تطبیق وتاویل کی صورت ممکن نہ ہو تو احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں سکوت اختیار کرو''۔ (بحوالہ فوائد جامعہ ص ۲۲ تا ۲۴)

انہوں نے ان ہدایات کی پوری پابندی کی اور حقائق واسرار میں گفتگو سے احتراز کیا، اپنے کلام کو ایہام، ابہام اور شطحیات سے پاک رکھا اور کشف وکرامات کے اظہار سے باز رہے۔

شیخ عبدالحق اصلاً علمی شخص تھے، مولانا حکیم عبدالحی کا بیان ہے کہ مشائخ کرام میں وہ علم کا پرچم اٹھائے ہوئے تھے، (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۱) اس لئے علمی حیثیت سے انہوں نے تصوف کی گوناگوں مفید خدمات انجام دیں، اس فن میں ان کی متعدد بلند پایہ تصنیفات ہیں اور انہوں نے تصوف کی کئی اہم کتابوں کے مطالب ومسائل کی دلآویز شرح وتوضیح کی ہے، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ذات سے ان کو جو والہانہ عقیدت وتعلق تھا اس کی بنا پر ان کی کتابوں کی شرح اور فارسی ترجمہ کی جانب انہوں نے زیادہ اعتنا کیا، ان کی ان کوششوں کی وجہ سے ہندوستان میں تصوف کے مسائل وحقائق سے عام لوگوں کو بھی واقفیت ہوگئی اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے افکار وخیالات کی بھی عام اشاعت ہوئی۔

تصوف میں ان کا یہ کارنامہ بھی ہے کہ ان کے زمانہ کے صوفیہ ومشائخ لوگوں کی اصلاح وتربیت اور رشد وہدایت کے دینی اور ضروری کام سے غافل ہوگئے تھے، شیخ نے ان کی جانب ان کی توجہ مبذول کرائی اور انہیں اس کی ضرورت واہمیت

[1] یہ تمام باتیں شیخ کی بعض کتابوں اور مکاتیب ورسائل سے ماخوذ ہیں۔

Marfat.com

سے آگاہ فرمایا۔

علم حدیث:

شیخ عبدالحق کو حدیث میں خاص عبور حاصل تھا اس فن میں ان کی نمایاں خدمات اور عظیم الشان کارناموں کی وجہ سے ''محدث'' ان کے نام کا جزو ہو گیا ہے، دارا شکوہ نے انہیں ''امام محدثان وقت'' کہا ہے۔ (بحوالہ سکینۃ الاولیاص ۱۱۵) خافی خان کا بیان ہے کہ ''وہ اپنے زمانہ کے مشہور محدث تھے، پورے ہندوستان میں تفسیر و حدیث میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا''۔

(منتخب اللباب ج ۱ ص ۲۴۰)

انہوں نے اس فن سے عمر بھر اشتغال رکھا اور اس کی گوناگوں مفید خدمات انجام دی ہیں۔ اس میں عمدہ اور کثیر ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے، ان کی غیر معمولی اہمیت کی حامل کتب حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ وہ احادیث کی مشکلات و غوامض کو حل کرنے میں ید طولیٰ، و اما فوق العادت مہارت رکھتے تھے، مولانا غلام معین الدین عبداللہ کا بیان ہے کہ: ''انہوں نے علم حدیث میں شیخ عبدالوہاب متقی اور شیخ علی متقی کا مکمل تتبع کیا اور اس علم کی تحقیقات کو انتہائی حد کمال تک پہنچا دیا ہے۔''

فن حدیث میں شیخ کی خدمات و کمالات کا دائرہ نہایت وسیع ہے، ان کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں علم حدیث کو غیر معمولی فروغ دیا اور حجاز سے واپسی کے بعد وہ عمر بھر اسی علم کی آبیاری کرتے رہے، شیخ نے اس علم کی جانب خصوصیت سے اس لئے زیادہ اعتنا کیا کہ ان کے زمانہ میں کتاب و سنت کے بجائے دوسرے علوم و فنون لوگوں کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز بنے ہوئے تھے چنانچہ دین کے اصل سرچشمہ سے غفلت اور دوری کی بنا پر حق و صداقت کی روشنی ماند پڑ گئی تھی اور بے دینی، ضلالت اور بدعت کی تیرگی ہر طرف چھائی ہوئی تھی اس لئے انہوں نے دین کی اصل حقیقت کو روشن کرنے کے لئے احادیث کی جانب شدت سے اعتنا کیا اور اس کی ترویج و اشاعت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی، حدیث کے درس و تدریس کا غلغلہ بلند کر کے لوگوں کو اس کی اہمیت و ضرورت کا احساس دلایا، اس کے رجال و اسناد اور اصول و متون کی تدوین و تحقیق، اس کے حقائق و معارف کی جستجو و دریافت اس کے اسرار و غوامض کی عقدہ کشائی اور اس کی کتابوں کے شروح و حواشی لکھ کر اس کے خزانے کو سب کے لئے عام کر دیا، ان کی اس سعی بلیغ کے نتیجہ میں حدیث نبوی کی طرف لوگوں کا رجحان بہت بڑھ گیا اور اس کا ہر طرف عام چرچا اور بول بالا ہو گیا، ہندوستان میں علم حدیث کے احیاء و ترقی اور اس کی نشر و اشاعت کی جو سعادت و فضیلت ان کے حصہ میں آئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکی، غلام علی آزاد بلگرامی کا بیان ہے ''شیخ نے علوم و فنون کی اشاعت کی بالخصوص حدیث کی نشر و اشاعت اور اس کی ترویج و ترقی میں جو کارنامہ انجام دیا وہ متقدمین و متاخرین میں سے کسی نے بھی ہندوستان میں انجام نہیں دیا''۔ (بحوالہ الرجان ص ۵۲)

''شیخ کا یہ بھی زرین کارنامہ ہے کہ انہوں نے حدیث کے درس و تدریس اور اس کی ترقی و توسیع کا ایک ایسا وسیع نظام و سلسلہ قائم کر دیا جو ان کے بعد بھی مدت دراز تک جاری تھا، ہندوستان میں ان کی اور ان کے خانوادہ کی یہ بڑی اہم خصوصیت ہے کہ اس کی بدولت صدیوں علم حدیث کا چشمہ ابلتا رہا، دراصل انہوں نے علم حدیث کے سلسلہ میں متعدد ایسے اہم اور بنیادی کام سر انجام دیئے جن کی بنیادوں پر آگے چل کر نہایت عظیم الشان عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ ہندوستان کی علمی تاریخ اور احادیث

Marfat.com

کی ترویج واشاعت میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا نام بہت ممتاز ہے لیکن ان کے کاموں کی داغ بیل شیخ عبدالحق محدث ہی نے ڈالی تھی، شاہ صاحب نے انہی کی قائم کردہ روایات کو آگے بڑھایا اور پایہ تکمیل تک پہنچادیا اس لئے جہاں تک ہندوستان میں حدیث کے فروغ واشاعت کا معاملہ ہے اسکا اصل سہرا شیخ عبدالحق ہی کے سر بندھتا ہے، اسی لئے ایک زمانہ تک یہ مشہور رہا کہ ہندوستان میں علم حدیث کی داغ بیل ڈالنے اور یہاں اس کی تخم ریزی کرنے والے پہلے شخص وہی ہیں۔ (الحطہ ص ۷۰)

نواب صدیق حسن خان صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات کی بعد ہی سے علم حدیث معدوم تھا یہاں تک کہ اللہ نے اس سرزمین پر اپنا فضل واحسان کیا اور یہاں کے بعض علماء جیسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی وغیرہ کو اس علم سے نوازا، شیخ ہندوستان میں علم حدیث کو لانے اور اس کے باشندوں پر اس کا فیض عام کرنے والے پہلے شخص ہیں''۔

مولانا حکیم سید عبدالحی لکھتے ہیں:

''شیخ عبدالحق ہندوستان کے باشندوں میں علم حدیث کا فیض جاری کرنے والے پہلے آدمی ہیں، انہوں نے دارالحکومت دہلی میں اس کے درس وافادہ کا سلسلہ قائم کیا اور اپنی ساری محنت وتوجہ اسی کام پر مرکوز کردی، اس فن میں کتابیں تصنیف کیں، حدیثوں کی تخریج کی اور نہایت جانفشانی سے اس کی نشر واشاعت کی''۔ (الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۱۳۷)

یہ بات چاہے اس تفصیل کے ساتھ صحیح نہ ہو مگر ہندوستان کی سرزمین پر علم حدیث کے درس کا ایک منظم نظام اور تصنیف و تالیف کا باقاعدہ سلسلہ شروع کرنے کا شرف شیخ عبدالحق ہی کو حاصل ہے، ان سے پہلے گجرات (اور بعض ساحلی علاقوں میں حدیث کی تعلیم وتعلم کا انفرادی طور پر رواج تھا، مگر نہ تو اسکا کوئی باقاعدہ نظم واہتمام تھا اور نہ اس کو پڑھنے پڑھانے کا کوئی خاص رواج ودستور تھا خصوصاً شمالی ہند میں حدیث کا علم کبریت احمر کی طرح نایاب ہوگیا مگر شیخ نے گجرات کے بجائے دہلی کو علم حدیث کا مرکز بنادیا اور انکی بدولت درس وتدریس کا منظم سلسلہ شمالی ہند میں بھی جاری ہوگیا، مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

اکبر کے آخری عہد میں وہ بزرگ ہستی نمایاں ہوئی جس نے عہد جہانگیری میں اپنی جہانگیری کا سکہ بٹھادیا اور جس نے دہلی کے شاہی دارالسلطنت کو ہمیشہ کے لئے علوم دین کا دارالسلطنت بنادیا اس جس کی نسبت اہل علم کا اعتراف ہے کہ ''اوّل کسے کہ تخم حدیث در ہند کشت او بود، گوئی تاریخ کی روشنی میں بزرگوں کا یہ پرانا مقولہ صحیح نہیں تاہم معنوی حیثیت سے اس کی سچائی میں کوئی شک نہیں، مولانا عبدالحق محدث دہلوی کی ذات وہ ذات ہے جس نے ہندوستان میں رہ کر حدیث کے سربمہر خزانہ کو وقف عام کیا اور دل پسند محققانہ تصنیفات کے ذریعہ سے علمائے ظاہر وباطن دونوں کی محفلوں سے تحسین وآفرین کی داد وصول کی''۔

(مقالات سلیمان ج ۲ ص ۲۳)

مولانا سید سلیمان ندوی کے شاگرد رشید مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم رقم طراز ہیں:

''مجدد صاحب کے کارناموں کے ساتھ ان کے معاصر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی خدمات کا ذکر بھی ضروری ہے، ان کی ذات سے شمالی ہند میں علم حدیث کو زندگی ملی اور سنت نبوی کا خزانہ ہر خاص وعام کے لئے عام ہوگیا، ہمارے نزدیک حدیث کی خدمت اور کتب حدیث کی مزاولت خود بخود دین کی سچی روح سے قریب کرتی ہے، اگلے علماء اور صوفی بس متاخرین کی فقہ اور معقولیت میں الجھ کر رہ گئے اور کم از کم شمالی ہند میں حدیث کا عام چرچا نہ ہوسکا، بددینی اور بدعقیدگی کا بڑا سبب یہی ہے، شیخ عبدالحق نے اس

Marfat.com

جہل کو دور کرنے کی کوشش کی اور اس لئے ہم آج ان کے شکر گزار ہیں اور ان کی علمی خدمات کا دل سے اعتراف کرتے ہیں“۔

(الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ص ۳۷)

وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں:

”سندھ اور گجرات کے ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر شمالی ہند میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۳ھ) بلکہ امام ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ سے پہلے سنت کی گرم بازاری نہیں ہوئی“۔

مولانا عبداللہ سندھی مرحوم کتاب التمہید فی ائمۃ التجدید کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں۔

”ہندوستان میں اشاعت حدیث بارہویں صدی ہجری میں اس وقت ہوئی جب گیارہویں صدی کی ابتدا میں شیخ عبدالحق دہلوی (حرمین سے) تشریف لائے اور دہلی میں قیام پذیر ہو کر تقریباً ۵۰ برس تک حدیث کا درس دیا“۔ (ایضاً ص ۲۶۸)

شیخ محدث کے سوانح نگار پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اگرچہ اس کی شدومد سے تردید کی ہے کہ ”شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ دہلوی سے پہلے ہندوستان کے مسلمان علم حدیث سے ناآشنا تھے اور مشارق الانوار کے علاوہ کسی حدیث کی کتاب سے واقفیت نہ رکھتے تھے“ تاہم وہ بھی شمالی ہند میں ان کی فیض رسانی، اولیت اور ان کے دوررس اثرات کا اس طور پر اعتراف کرتے ہیں:

”بہرحال حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے جس وقت مسند درس بچھائی تھی اس وقت شمالی ہندوستان میں حدیث کا علم تقریباً ختم ہو چکا تھا، انہوں نے اس تنگ و تاریک ماحول میں علوم دینیہ کی ایسی شمع روشن کی کہ دور دور سے لوگ پروانوں کی طرح کھنچ کر ان کے گرد جمع ہونے لگے، درس حدیث کا ایک نیا سلسلہ شمالی ہندوستان میں جاری ہو گیا، علوم دینیہ خصوصاً حدیث کا مرکز ثقل گجرات سے منتقل ہو کر دہلی آ گیا، گیارہویں صدی ہجری کے شروع سے تیرہویں صدی کے آخر تک علم حدیث پر جتنی کتابیں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں ان کا بیشتر حصہ دہلی یا شمالی ہندوستان میں لکھا گیا ہے، یہ سب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا اثر تھا“۔

(حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۴۳)

شیخ عبدالحق سے پہلے ہندوستان کی سرزمین میں جو ائمہ فن اور محدثین پیدا ہوئے انہوں نے دوسرے عرب اور اسلامی ملکوں میں بود و باش اختیار کر لی اور وہیں اپنے علم و فن کے جوہر بھی چمکائے اسی لئے وہ ہندوستان کے بجائے ان ملکوں کی نسبت سے زیادہ مشہور ہوئے مگر شیخ عبدالحق غالباً پہلے ہندوستانی محدث ہیں جنھوں نے حرمین کا سفر کر کے وہاں کے علماء سے استفادہ تو بہت کیا مگر وہ ہندوستان ہی میں مقیم رہے اور اسی کو اپنی درسی اور تصنیفی سرگرمیوں کا مرکز و محور بھی بنایا لیکن اس کے باوجود پوری دنیائے اسلام میں ان کا غلغلہ بلند ہوا اور ہر جگہ کے علماء نے ان کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا اور معانی حدیث کی فہم میں ان کے ممنون ہوئے، مولانا احمد سعید دہلوی لکھتے ہیں ”شیخ عبدالحق محدث دہلوی دہلی بلکہ ہندوستان کے پہلے محدث ہیں جو اپنی علمی خدمات اور ذوق و تصوف اور کثرت تصانیف کے اعتبار سے بلاد اسلامیہ میں مشہور و معروف ہیں“۔

(مقدمہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱)

شیخ عبدالحق کے اولیات:

حدیث کے سلسلہ میں شیخ عبدالحق کی چند نمایاں خصوصیات اور اہم امتیازات ہیں، جن کو ہم ان کی اولیات سے بھی تعبیر

Marfat.com

کر سکتے ہیں گو اوپر ان کا ذکر آچکا ہے تاہم ذیل میں ہم ان کو نمبر وار تحریر کرتے ہیں:

(۱) وہ مسلسل ۵۲ برس تک حدیث کے درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، انہوں نے کتب حدیث کو اپنے زمانہ کے نصاب درس میں شامل کیا جس کا اس زمانہ میں کوئی رواج نہ تھا۔

مولانا سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

''الغرض شیخ عبدالحق محدث سے پہلے صرف مشارق الانوار للصاغانی اللاہوری المتوفی ۶۵۰ھ کے نسخے اور کہیں کہیں مصابیح (اصل مشکوٰۃ) للبغوی المتوفی ۵۱۶ھ کے نسخے دستیاب ہوتے تھے اور یہی دو کتابیں یہاں کے علماء کے درس میں تھیں، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ عرب سے کم سے کم مشکوٰۃ، مؤطاء امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے نسخے لائے اور ان کو درس میں داخل کیا''۔ (مقالات سلیمان ج ۲، ص ۵)

نظامی صاحب لکھتے ہیں کتب احادیث کو اپنے زمانے کی نصاب و منہاج کا ایک لازمی جز بنا دیا، خود انہوں نے اپنے مدرسہ میں کتب احادیث کے باقاعدہ درس کی ابتدا کی، ان کے بیٹے اور پوتوں نے اپنے مدرسہ کی ان خصوصیات کو برقرار رکھا۔

(۲) انہوں نے نہ صرف یہ کہ خود زندگی بھر حدیث کا درس دیا بلکہ اس کی تعلیم و تعلم کا ایک باقاعدہ سلسلہ جاری کر دیا جس کو ان کے بعد ان کی اولاد و احفاد نے بھی قائم اور باقی رکھا، ہندوستان میں ان کے خاندان کو سات آٹھ پشتوں تک فن حدیث کی خدمت کا شرف نصیب ہوا۔ نظامی صاحب لکھتے ہیں:

(۳) ہندوستان میں علم حدیث کے اکثر اصول و روایات شیخ عبدالحق ہی نے قائم کیے ہیں جن کو بعد کے لوگوں نے مزید ترقی و استحکام بخشا۔

(۴) کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں علم حدیث کو لانے والے اور اس کی داغ بیل ڈالنے والے شیخ عبدالحق محدث دہلوی پہلے شخص ہیں، یہ بات چاہے کلیۃً صحیح نہ ہو مگر اس میں شبہ نہیں کہ احادیث کے درس و افادہ اور ان پر باقاعدہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ انہی کی ذات سے شروع ہوا، اس طرح درس و تصنیف کے ذریعہ ہندوستان میں علوم حدیث کو رائج و نشر کرنے میں ان کو اولیت ضرور حاصل ہے، مولوی رحمان علی لکھتے ہیں'' علم حدیث بہ محروسہ ہندوستان از وشیوع یافتہ'' (تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۹)

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا بیان ہے:

''مولانا جمال الدین کے آخری دور میں شیخ عبدالحق حجاز سے واپس آئے، اللہ نے ان کی عمر مبارک میں بڑی برکت دی اور ان کے درس و تصنیف نے ایک پورا سلسلہ تعلیم ملک میں عام کیا۔ (تذکرہ مرتبہ مالک رام ص ۳۰۱)

مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم فرماتے ہیں:

''وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے باشندگان ہند پر حدیث کا فیض عام کیا اور دہلی کے دارالسلطنت میں درس و افادہ کی مسند پر متمکن ہوئے اور اپنی ساری توجہ اسی کام کے لیے مرکوز کر دی''۔ (الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۱۳۷)

یہ واقعہ ہے کہ شمالی ہند میں علم حدیث کے احیا کا سہرا انہی کے سر ہے، انہوں نے پہلی مرتبہ دہلی کے دارالسلطنت کو علم حدیث کا مرکز بنایا اور گھر گھر میں حدیث کا عام چرچا کر دیا، مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم ہندوستان میں حدیث کی عام ترویج کو

Marfat.com

ان کے فیوض و برکات کا نتیجہ بتاتے ہوئے انہیں اوّل المحدثین قرار دیتے ہیں، پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

''ایک ایسے دور میں جبکہ علم حدیث شمالی ہندوستان میں تقریباً ختم ہو چکا تھا، انہوں نے اپنی مسلسل اور پر خلوص جد و جہد سے اس کو ازسرنو زندہ کیا''۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۳۸۳)

(۵) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ علمائے ہند میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے حرمین کا سفر کیا، وہاں حدیثیں پڑھیں اور وہاں سے حدیث کی کتابیں اپنے ساتھ ہندوستان لائے اور انہیں داخل درس کیا، پورے ہندوستان کی نسبت سے اس بات کو اگر درست نہ مانا جائے تب بھی شمالی ہند اور دہلی کی حد تک اس کے صحیح ہونے میں کلام نہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں:

''شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ عرب سے کم سے کم مشکوٰۃ، مؤطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے نسخے لائے اور ان کو درس میں داخل کیا بہر حال شیخ عبدالحق کے ذریعے مشکوٰۃ کے نسخے حجم کے کم ہونے کی وجہ سے عام ہو گئے اور بخاری کا نام اور حوالہ بھی کتابوں میں آنے لگا''۔ (مقالات سلیمان ج ۲ ص ۷۵)

سید صاحب دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''بہر حال رفتہ رفتہ عرب سے کتابیں ہندوستان آنے لگیں اور اس بارہ خاص میں سب سے پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کے بعد مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی فیض حرمین کا ممنون ہونا چاہئے''۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۸۵)

پروفیسر خلیق احمد نظامی تحریر کرتے ہیں

''علم حدیث کی ترقی کے لئے ضروری تھا کہ حجاز اور وہاں کے محدثین سے براہ راست تعلق پیدا کیا جائے، شیخ عبدالحق نے علم حدیث حجاز میں حاصل کیا، ان کے بعد ہندوستان میں محدث بننے کے لئے حجاز میں قیام اور علمائے حجاز سے استفادہ ضروری سمجھا جانے لگا''۔

افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق مدراسی کا بیان ہے:

''اکبری دور کے ملحدانہ خیالات کی رو میں جاہ پرست علما کے قدم ڈگمگا گئے تھے لیکن شاہ صاحب کے خاندانی ماحول اور تربیت اور سفر حرمین شریفین کی وجہ سے ان میں وہ ودیعتیں ابھر آئی تھیں جن کی بدولت ہندوستان میں علوم حدیث کے احیاء و ترویج و اشاعت کا سہرا اُن کے سر رہا''۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی پیش لفظ ص ط)

۶۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے عربی زبان کی کتابوں کا فارسی ترجمہ کر کے ان کے فوائد کو عام کیا، اس سلسلہ میں احادیث کی کتابوں کے بھی فارسی زبان میں ترجمہ کرنے اور ان کے متون کی فارسی میں شرحیں لکھنے کی سعادت سے پہلے انہی کے حصہ میں آئی، مولانا ابوالکلام آزاد تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت شاہ عبدالحق محدث جس دور علم و تعلم کے بانی ہوئے، اس کی ایک عام خصوصیت یہ بھی ہے کہ علم حدیث کے متعلق فارسی زبان میں جو ملک کی عام زبان تھی تصنیف و تراجم کی بنیاد ڈالی، خود شاہ صاحب نے مشکوٰۃ وغیرہ کا ترجمہ کیا، پھر ان کے صاحبزادے شیخ الاسلام نورالحق نے صحیح بخاری کا''۔ (تذکرہ ص ۳۰۳، ۳۰۴)

مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

''ان کا اور ان کے سلسلہ کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ان کتابوں (حدیث کے متعلق) کا فارسی میں ترجمہ کیا اور فارسی میں ان کی شرحیں لکھیں''۔ (مقالات سلیمان ج ۲ ص ۷۵)

Marfat.com

ذوقِ علم ومطالعہ اور شیخ کا کتب خانہ:

شیخ عبدالحق محدث کو علم ومطالعہ سے بڑا شغف تھا اور ان کا علم ومطالعہ وسیع اور گہرا تھا، علم وفن سے ان کا اشتغال اور مطالعہ وکتب بینی کا شوق وذوق مدۃ العمر قائم رہا، چونکہ شیخ کا علمی ذوق عمدہ اور بلند تھا اس لئے امہات فن اور منتخب ومعیاری اور اعلیٰ کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں جن کے حوالے انہوں نے اپنی تصنیفات میں بکثرت دیئے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کا کتب خانہ بھی بڑا وسیع اور عظیم الشان تھا اور وہ بیش قیمت، اہم، نادر اور نایاب کتابوں پر مشتمل تھا، حجاز کے قیام کے زمانہ میں انہوں نے کتابوں کا بڑا ذخیرہ اکٹھا کرلیا تھا جن کو وہ اپنے ساتھ ہندوستان بھی لائے تھے، وہ جن کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے ان پر نوٹ، یادداشت اور حواشی بھی قلمبند کرتے تھے، پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

> ''شیخ محدث کے کتب خانہ کی جس کتاب پر بھی خاکسار کی نظر پڑی ہے، اسی پر شیخ کے دست مبارک سے تصحیح ومقابلہ کے نشانات ضرور ملے ہیں، اس سے ان کے کتب خانہ کی افادیت اور علمی حیثیت بہت بڑھ جاتی ہے''۔

(حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۵۴)

شیخ کی اولاد بھی علم وفن کی شیدائی تھی اور ان کے خاندان میں کئی پشتوں تک علم سے اشتغال رکھنے والے موجود تھے اس لئے ان کے بعد بھی عرصہ تک ان کا کتب خانہ اچھے حال میں باقی رہا لیکن اٹھارہویں صدی عیسوی میں جب دہلی کی حالت دگرگوں ہوئی اور مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں کی مسلسل ہنگامہ آرائی اور شورش سے یہ کتب خانہ بھی تباہ وبرباد ہوگیا، شیخ محدث کے پرپوتے شیخ الاسلام نے اپنی تصنیف شرح بخاری کے خاتمہ پر کتب خانہ کی بربادی کا نہایت درد وقلق سے اس طرح ذکر کیا ہے۔

> ''اس ہنگامہ، لوٹ مار اور غارتگری کے زمانہ میں ہنگامہ پردازوں اور سرکشوں نے پرانی دہلی کو تاراج کرڈالا اور وہ قدیم وجدید کتب خانہ بھی ضائع ہوگیا جس کی اکثر کتابیں اس علاقہ میں کمیاب ونایاب ہیں، ان میں سے بعض کتابیں تو ایسی تھیں جو شیخ المحدثین شیخ اجل محقق دہلوی کی تصحیح وتحشیہ سے مزین تھیں اور انہوں نے ان کا درس بھی دیا تھا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اپنے گھر کے اندر گوشوں میں چند کتابیں شکستہ اور خستہ حالت میں پڑی رہ گئی ہیں''۔

(شرح بخاری قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۰۵، ۲۰۶)

شعر وسخن کا ذوق:

شیخ محدث دہلوی کا ادبی وشعری ذوق بھی بہت عمدہ تھا، ان کی تصنیفات سے ان کے ادبی ذوق کی پختگی اور طرز نگارش کی سلاست وروانی کا پتہ چلتا ہے، جس پر آگے بحث آئے گی، یہاں ان کی موزونی طبع اور شعر وسخن میں کمال پر گفتگو مقصود ہے۔

شیخ کو شعر وسخن سے فطری مناسبت بھی تھی اور انہیں اس کا موروثی ذوق بھی تھا، ان کے جد امجد شیخ فیروز شعر وشاعری میں صاحب کمال تھے، ان کے چچا شیخ رزق اللہ مشتاقی بھی فارسی اور ہندی کے کامیاب شاعر تھے اور والد بزرگوار کے متعلق شیخ کا خود یہ بیان ہے کہ ''وہ سیفی تخلص کرتے تھے اور اپنے دور میں اپنے ہندوستانی معاصرین واقران سے سلاست سخن اور زبان کی راستی میں بہت ممتاز وفائق تھے''۔

حضرت شیخ عبدالحق جیسے یگانہ روزگار فاضل وصاحب کمال کے لئے شعر وشاعری کچھ زیادہ افتخار وامتیاز کی چیز نہیں لیکن وہ

Marfat.com

اس میں بھی ممتاز تھے، ان کے معاصر نظام الدین بخشی نے ''زبان شعر دارد'' (طبقات اکبری حصہ دوم ص ۶۳) کہہ کر ان کی موزونی طبع کا اعتراف کیا ہے اور صاحب معارج الولایت لکھتے ہیں: ''شعر سے بھی پوری رغبت رکھتے تھے ہر طرح کی نظمیں ہر بحر و وزن میں کہنے پر قدرت تھی، ان کا تخلص حقی تھا، ان کے کتب و رسائل میں ان کے اشعار مرقوم ہیں''۔

(مرأۃ العالم ج ۲ ص ۴۴۴)

مگر معلوم ہوتا ہے کہ شعر و سخن کا مشغلہ جوانی ہی تک جاری رہا، بعد میں اپنی سرگرمیاں درس و تصنیف اور علمی مسائل کی تحقیق و تدقیق کے لئے وقف کر دی تھیں بختاور خاں رقمطراز ہیں ''ان ظاہری و باطنی کمالات کے ساتھ ہی ایام جوانی میں شعر گوئی کا بھی پورا ذوق رکھتے تھے اور حقی تخلص فرماتے تھے'' ان کا دیوان اب ناپید ہے مگر نواب علی حسن خاں کی نظر سے گزرا تھا وہ فرماتے ہیں: ''دیوان مختلف اصناف سخن و انواع نظم کا مجموعہ اور بیشتر حصہ نعتیہ کلام پر مشتمل تھا''۔ (صبح گلشن ص ۱۴۱)

ان کی تصنیفات میں جو بکثرت اشعار درج ہیں ان میں اکثر خود انہی کے معلوم ہوتے ہیں انہوں نے اپنی تصنیفات کی فہرست میں مجموعہ حسن الاشعار کا ذکر کیا ہے اس کا اور ان کے دوسرے شعری رسائل کا ذکر تصنیفات کے ضمن میں آئے گا۔ نواب علی حسن خان نے بھی گلشن سخن میں حقی کے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے، ان سب سے ان کے حسن ذوق اور کلام کے درد و اثر سے معمور ہونے کا پتہ چلتا ہے، ان کو نعت گوئی سے زیادہ مناسبت تھی، نواب صاحب کا بھی بیان ہے کہ دیوان بیشتر نعتیہ قصائد پر مشتمل ہے، ان کا ایک طویل اور مؤثر نعتیہ قصیدہ اخبار الاخیار میں بھی نقل کیا ہے، (حیات عبدالحق دہلوی ص ۱۱۲) اس کی ابتداء اس شعر سے ہوتی ہے۔

؎ بیا اے دل دمے از ہستی خود ترک دعوی کن ☆ میفگن چشم بر صورت نظر در عین معنی کن

چند اشعار میں دوسرے انبیاء پر نبی اکرم ﷺ کی فضیلت بیان کی ہے اس سلسلہ کا ایک شعر ہے:

؎ قیاس رتبہ و مقدار فضل از انبیا تا وے ☆ ز قطرہ تا بدریا یا ز ذرہ ماہ بیضا کن

یہ قصیدہ ہندوستان میں لکھا گیا تھا مگر شیخ جب زیارت نبوی کے لئے گئے تو اس کی خدمت اقدس میں نذر کیا، زاد المتقین میں ہے کہ اس شعر پر پہنچے تو گریہ طاری ہو گیا۔

خرابم در غم ہجر جمالت یا رسول اللہ ☆ جمال خود نما رحمے بجان زار رشید اکن

ہندوستان کے مکدر حالات اور یہاں کی ابتر دینی فضا کا اس شعر میں ذکر ہے۔

جہان تاریک شد از ظلمت سیہ کاراں ☆ بیا و عالمے را روشن از نور تجلی کن

(ایضاً)

شیخ شعر و سخن کے اچھے نکتہ شناس اور بڑے سخن فہم تھے دہلی اور اطراف دہلی کے شعرا پر اگرچہ جچے تلے مختصر فقروں میں تبصرے کیے ہیں لیکن ان سے پتہ چلتا ہے کہ شعرا کے کلام پر آپ کی کتنی اچھی نظر تھی اور شعر کے حسن و قبح، اس کی نزاکتوں اور باریکیوں سے آپ کا ذوق کس درجہ آشنا تھا آپ نے اپنی تصانیف میں بکثرت اشعار استعمال کیے ہیں اور ان کا استعمال نہایت برمحل اور برجستہ ہے۔ (تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۵۵)

Marfat.com

شیخ کی عظمت و مقبولیت اور اعتراف جامعیت و کمال:

شیخ عبدالحق جامع کمالات تھے، قدرت نے ان کی ذات میں گوناگوں اوصاف و فضائل جمع کر دیئے تھے، متعدد علوم و موضوعات ان کا مرکز توجہ رہے اور انہوں نے مختلف فنون میں مفید کتابیں لکھیں، علمی حیثیت سے ان کا پایہ نہایت بلند تھا اور وہ اپنے معاصرین میں اپنے علم و فضل کے اعتبار سے نہایت فائق و برتر تھے، تجوید و قراءت، تفسیر و حدیث فقہ و تصوف، تاریخ، تذکرہ اور شعر و ادب وغیرہ تمام علوم میں ان کو مکمل دستگاہ تھی، ان کا حافظہ نہایت قوی تھا، سرعت استحضار، جودت ذہن، وسعت علم اور مذاہب سلف سے واقفیت واطلاع میں بہت ممتاز تھے، اپنی ان خوبیوں اور خصوصیات نیز دوسری خدمات و کمالات کی بدولت ان کو غیر معمولی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی، فارسی، اردو اور انگریزی میں ہندوستان کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں یا اردو و فارسی میں علماء و مشائخ کے جو تذکرے لکھے گئے ہیں ان سب میں حضرت شیخ کا ذکر عقیدت اور اعتراف فضل و کمال کے ساتھ موجود ہے، اللہ نے انہیں ایسا قبول عام عطا کیا تھا کہ امراء و سلاطین، علماء و فضلا اور صوفیہ و مشائخ سب ہی ان کی تعریف و تحسین میں رطب اللسان ہیں اور کسی کو نہ ان کے فضل و کمال کے اعتراف میں تامل ہوا اور نہ کسی نے ان کے خلاف کسی قسم کی لب کشائی کی ہے، شہنشاہ ہند نورالدین جہانگیر نے ان کو اہل فضل و ارباب سعادت میں بتایا ہے، (تزک جہانگیری ص ۳۸۵) ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ ''وہ مجموعہ کمالات و منبع فضائل تھے اور تمام عقلی و نقلی علوم میں درس دیتے تھے'' (منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۱۳) مرزا نظام الدین احمد نے طبقات اکبری میں ذی کمال لوگوں کی جو فہرست دی ہے اس میں ان کا بھی تذکرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: ''ملا عبدالحق حقی علوم کے اقسام میں مشاق و ماہر ہیں'' (طبقات الکبری ج ۲ ص ۴۶۴) خافی خاں لکھتے ہیں کہ ''شیخ عبدالحق اس زمانہ کے فاضل ترین شخص اور مشہور محدث ہیں'' (منتخب اللباب ج ص ۳۳۹) حضرت خواجہ باقی باللہ کے مرید خاص محمد صادق ہمدانی کا بیان ہے کہ ''آج کل دہلی کی برکت و سعادت اور رونق و خوبی حضرت شیخ محدث ہی کی ذات والاصفات سے قائم ہے، وہ علوم متداولہ و فنون متعارفہ کے عالم و عارف ہیں مختصر یہ کہ وہ فضلائے روزگار میں ہیں'' (کلمات الصادقین بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۶۸) محمد صالح کنبو کہتے ہیں ''جملہ علوم کے جامع، فقہ حدیث اور تفسیر میں یکتا تھے'' (عمل صالح ج ۲ ص ۶۸) عبدالحمید لاہوری رقمطراز ہیں ''وہ صوری و معنوی فضائل سے آراستہ، وہبی و کسبی کمالات سے پیراستہ اور فہم دقیق کے مالک تھے، علوم دین کے کاشف اور نامور فاضل و محقق تھے، عربیت، فقہ حدیث، تصوف، تاریخ اور سیر وغیرہ اکثر فنون کے ماہر تھے اور ہر ایک میں ان کی تصنیفات مشہور ہیں'' (بادشاہ نامہ جلد اول ص ۳۴۱) شاہ نواز خاں فرماتے ہیں کہ ''ان کے صوری، معنوی اور کسبی کمالات کا اندازہ ان کی تصنیفات سے ہو جاتا ہے جن کی خوب ترویج ہوئی'' مولانا آزاد بلگرامی نے بھی انہیں صوری و معنوی کمالات کا حامل قرار دیا ہے۔ (سبحۃ المرجان ص ۵۲) علامہ زبیدی نے انہیں اکابر محدثین و فضلا میں بتایا ہے۔ (تاج العروس ج ۷ ص ۳۲۸)

مفتی غلام سرور نے انہیں اپنے زمانہ کے نادر المثال فضلا اور ذی کمال علما میں بتایا ہے۔ (خزینۃ الاصفیاء ۱ ص ۱۶۴) سرسید احمد خاں لکھتے ہیں: ''آپ بڑے محدثوں میں ہیں، کمالات آپ کے آفتاب سے سوا روشن ہیں کہ غایت شہرت سے احتیاج مجھ نا کسار کے بیان کی نہیں رکھتے'' (آثار الصنادید ص ۹۴ مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق کراچی) مولوی رحمان علی فرماتے ہیں

Marfat.com

''ان کو خداداد مقبولیت حاصل تھی، کسی بھی معقولیت وانصاف پسند کو اس کے انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی'' (تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۹)
نواب صدیق حسن خان مرحوم ارشاد فرماتے ہیں: ''ظاہری و باطنی کمالات سے متصف تھے، (تقصار جیوذ الاحرار ص ۱۱۲) ان کو بڑی شہرت نصیب ہوئی'' ان کے صاحبزادہ والاتبار نواب علی حسن خاں رقمطراز ہیں: ''فرطِ شہرت کی بنا پر ان کے فضائل و کمالات محتاج شرح و بیان نہیں'' (صبح گلشن ص ۱۴۱)

شیخ عبدالحق کے اساتذہ نے جن الفاظ میں اور جس طرح ان کی تحسین فرمائی ہے اس سے بڑھ کر اور کیا سند ہوسکتی ہے، دانشمندانِ ماوراء النہر کا قول پہلے نقل کیا جاچکا ہے، یہاں موقع کی وجہ سے پھر اس کا اعادہ کیا جاتا ہے، شاہ عبدالحق خود تحریر فرماتے ہیں:

درا ثنائے درس بحثہا و سخنان مفید از طبع فاتر ایں حقیر می زائید اکثر ایں عزیزاں می گفتند کہ ما از تو مستفید یم و دمارا بر تو منتے نیست۔

(اخبار الاخیار ص ۲۹۲)

اثنائے درس میں جب میری طرف سے مفید بحث اور اچھی گفتگو ہونے لگتی تو یہ لوگ فرماتے تھے کہ ہم لوگ تم سے استفادہ کرتے ہیں اور ہمارا تم پر کوئی احسان نہیں ہے۔

مولانا حکیم سید عبدالحی شیخ کے مکی و مدنی اساتذہ کا نام گنوانے کے بعد لکھتے ہیں:

''ان سب نے ان کے مدح و تحسین کی ہے اور قاضی علی بن جار اللہ نے خاص طور پر ان کی بڑی ستائش کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ''یہ خطہ ہند میں علم میں یکتا اور منفرد شخص ہیں، اللہ نے انہیں طلب و تحصیل کے لئے ہمت بلند اور منزل مقصود تک پہنچانے والی سعی جد و جہد کی توفیق عطا کی ہے، علم حدیث کی خدمت میں انہوں نے نمایاں اور بہت ممتاز حصہ لیا ہے، کچھ عرصہ تک انہوں نے مجھ کو اپنی حاضری سے مفتخر اور مشرف فرمایا اور مسجد حرام میں صحیح بخاری اور الفیہ عراقی کے کچھ حصوں کا مجھ سے درس لیا، لیکن وہ خود ایک بحر ذخار تھے، اس لئے انہوں نے مجھ سے جتنا استفادہ کیا اس سے زیادہ میں نے ان سے استفادہ کیا، درس کے درمیان جب وہ بحث میں حصہ لیتے تو نہایت عمدہ بحث کرتے اور بڑی خوبی سے پڑھتے اس سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ استفادہ سے زیادہ افادہ کے اہل ہیں اور انہیں معتاد طریقوں کے مطابق اشتغال علم میں بڑا رسوخ حاصل تھا''۔ (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۲، ۲۰۳)

صلاح و تقویٰ اور عبادت میں انہماک:

شیخ کے ابتدائی واقعات میں اس کا ذکر آچکا ہے کہ بچپن اور طالب علمی کے زمانے ہی سے عبادت و ریاضت سے ان کی دلچسپی بڑھی ہوئی تھی اور وہ اسی زمانے سے اوراد و وظائف اور سحر خیزی اور شب بیداری کے عادی تھے، اس طرح شروع ہی سے علم کی طرف ان کو عمل سے بھی شغف تھا اور وہ زہد و تقویٰ میں بھی امتیازی شان کے مالک تھے، انہوں نے خود لکھا ہے کہ تحصیل علم میں غیر معمولی شغف و انہماک کے باوجود زمانہ طفولیت ہی سے نماز و وظائف کی کثرت شب خیزی اور دعا و مناجات میں بھی اپنی فطرت کی اقتضا کے مطابق برابر اس قدر مشغول رہتا تھا کہ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ (ایضاً ص ۲۹۳)
عبادت سے شغف آخر عمر تک قائم رہا اور بڑھاپے میں بھی وہ اسی ذوق و شوق کے ساتھ اطاعت الٰہی میں سرگرم عمل رہتے تھے عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے کہ:

''نوے برس کی عمر ہوجانے کے بعد بھی اطاعت الٰہی میں، انہماک اور عبادات کے التزام کا وہی عالم تھا اور وہ اسی شان سے

Marfat.com

ریاضت ودرود میں مشغول رہتے تھے جس طرح جوانی میں مشغول رہتے تھے"۔ (بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۴۴۴)

خافی خاں لکھتے ہیں کہ:

"شیخ عبدالحق صلاح وتقویٰ میں جو علم باعمل کے لئے لازم اور ضروری ہے، ممتاز وفائق تھے، دم واپسیں تک فرائض وسنن کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی"۔ (منتخب اللباب ج ۱ ص ۱۴۰)

غلام سرور لاہوری فرماتے ہیں:

"علم وعمل اور زہد وریاضت میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا"۔ (خزینۃ الاصفیاج ۱ ص ۱۶۴)

اصلاحی ودینی خدمات:

شیخ عبدالحق اپنے دور کے مصلح ومرشد بھی تھے، سترہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے مذہبی سیاسی، علمی، تعلیمی اور سماجی اصلاح وتربیت کا سہرا حضرت مجدد الف ثانیؒ کی طرح ان کے سر بھی بندھتا ہے، البتہ دونوں کا انداز مختلف اور طریقہ کار جدا تھا، شیخ عبدالحق نے زیادہ جوش وخروش کا مظاہرہ نہیں کیا ہے اور نہ بہت مجاہدانہ اور سرفروشانہ انداز میں اصلاح وتجدید کا کام کیا مگر وقت کے فتنوں اور گمراہیوں کا سدِ باب، باطل افکار ونظریات کی سرکوبی اور مسلمانوں کی معاشرتی ودینی اصلاح ان کے بھی پیش نظر رہی اور انہوں نے اسی کے لئے اپنی زندگی وقف کردی، وہ علمی آدمی تھے اور ان کی طبیعت اعتدال وسکون پسند تھی اس لئے تصادم اور ٹکراؤ سے کنارہ کش رہ کر انہوں نے اصلاح وتربیت کا کام انجام دیا، منکر پر نکیر سے زیادہ معروف کی تلقین و اشاعت پر زور دیا۔

اکبر کی غلط روش اور نادرست مذہبی پالیسی کی وجہ سے اس وقت جو خرابیاں رونما ہو رہی تھیں ان کے بارہ میں دو طرح کے رجحانات پائے جاتے تھے ایک گروہ تو اکبر کے مبتدعانہ اعمال اور گمراہ کن طریقوں کو نہ صرف جائز اور روا بتاتا تھا بلکہ ان کی پرزور حمایت اور تائید بھی کرتا تھا مگر دوسرا گروہ ان کی باتوں کو شریعت اسلامی کے بالکل منافی سمجھتا تھا اور نہایت جوش وشدت سے ان کی مخالفت ومقابلہ کے لئے کمربستہ رہتا تھا، شیخ عبدالحق کی روش ان دونوں گروہوں سے الگ تھی، انہوں نے اپنی سرگرمیاں علم ہی کی اشاعت وفروغ تک محدود رکھیں اور ارباب حکومت سے کشمکش ومزاحمت کو پسند نہیں کیا، ان کی اس خاموش مگر ٹھوس تحریک کے اثرات نہایت دوررس اور گہرے نکلے، جو لوگ شیخ عبدالحق کے کاموں کی اس نوعیت وحیثیت کو محسوس نہیں کرتے وہ ان کی قدر وقیمت کو بالکل ختم کر دیتے ہیں، حالانکہ شیخ کی علمی سرگرمیوں، حدیثی خدمات، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا تمام تر مقصد اعلائے کلمۃ اللہ، احیائے دین وشریعت، ترویج سنت اور اپنے زمانہ کی گمراہیوں اور خرابیوں کی اصلاح تھا، انہوں نے کتاب وسنت کے علم وتعلیم کا نظام قائم کر کے ان کی صحیح روح لوگوں میں پھونک دی اور دین کی اصل حقیقت واضح کر کے لوگوں کے عقائد واعمال کی اصلاح وتصحیح کردی اور باطل افکار وخیالات اور بدعات ومنکرات کے فروغ کو روک دیا، اس لئے مسلمانوں کی مذہبی ودینی اصلاح کے سلسلہ میں ان کا نام اور کارنامہ بھی بڑا اہم ہے، ڈاکٹر سید معین الحق نے بجا طور پر لکھا ہے۔

"شیخ عبدالحق ان بزرگوں میں ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اکبری عہد کے الحاد کو روکنے کی موثر کوشش کی، اس سلسلہ میں ان کی

Marfat.com

تصانیف ہی اہم نہیں ہیں بلکہ ان کے مکاتیب بھی قابل ذکر ہیں، جوانی میں آپ کو اس گروہ میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی جس کی سرکردگی ابوالفضل کرتا تھا لیکن باوجودیکہ آپ کے فیضی سے ذاتی تعلقات تھے آپ نے اس پیشکش کو قبول نہ کیا اور ساری زندگی درس وتدریس اور اصلاحِ معاشرہ کے لئے وقف کر دی، مسلمانان برصغیر کی دینی اور معاشرتی تاریخ میں شیخ عبدالحق کی شخصیت بہت نمایاں مقام پر نظر آتی ہے''۔ (حاشیہ آثار الصنادید ص ۹۴،۹۵)

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کا بیان پہلے نقل کیا گیا تھا کہ مجدد صاحب کے کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کے معاصر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں، حدیث کی خدمت اور کسب حدیث کی مزاولت خود بخود دین کی سچی روح سے قریب کرتی ہے، اگلے علماء اور صوفیہ بس متاخرین کی فقہ و معقولات میں الجھ کر رہ گئے بددینی اور بدعقیدگی کا بڑا سبب یہی ہے۔ شیخ عبدالحق نے اس جہل کے دور کرنے کی کوشش کی اور اس لئے آج ہم ان کے شکرگزار ہیں اور ان کی علمی خدمات کا دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ (الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ۳۷)

ذیل میں ہم شیخ عبدالحق کے علمی و دینی اور سماجی اصلاح کے بعض پہلوؤں کا مختصر جائزہ لیتے ہیں:

دین کی غلط تعبیر اور بیجا تاویل و تحریف کی مخالفت:

شیخ کے زمانہ میں کتاب وسنت کی تعلیم کو نظر انداز کر دینے اور کلام اور فقہی جزئیات سے سروکار رکھنے کی وجہ سے فلسفہ کا ذوق اور عقلیت پسندی کا رجحان اتنا بڑھ گیا تھا کہ نصوصِ دین کی غلط تعبیر اور ان کی بیجا تاویل و توجیہ ہی نہیں ان میں تحریف و تلبیس بھی کی جانے لگی تھی، اس طرح گوناگوں باطل افکار وخیالات پرورش پانے لگے تھے اور متعدد خرابیاں اور گمراہیاں رونما ہو رہی تھیں، شیخ کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کتاب وسنت کے درس و تعلیم کی جانب لوگوں کا رجحان پیدا کر کے انہیں دین کی اصل حقیقت اور صحیح روح سے واقف کر دیا، ان کے نزدیک باطل خیالات اور گمراہ کن نظریات کا علاج اور مداوا یہی تھا اس لئے انہوں نے اس کی جانب اپنی مکمل توجہ مرکوز کر دی اور فلسفہ و کلام میں غور وخوض کو مذموم قرار دے کر عقلیت پسندی اور تاویل و تحریف کے دروازے کو مسدود کرنے کی فکر وسعی کی، ان کی متعدد تصنیفات اپنے دور کے رجحانات کے ردِ عمل کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں، ان میں اس قسم کے شکوک و شبہات اور باطل افکار و نظریات کی بڑی خوبی سے تردید کی گئی ہے۔

عقیدۂ نبوت کے منافی امور کا رد و ابطال:

اکبری عہد کے فتنوں سے عقیدۂ نبوت و رسالت پر براہ راست زد پڑتی تھی، انہوں نے مدارج النبوۃ تصنیف کر کے عقیدۂ نبوت و رسالت کا اثبات کیا ہے، وحدتِ ادیان کا فتنہ بھی اسی سلسلہ کا شاخسانہ تھا، چنانچہ یہ کہا جاتا تھا کہ خدا پر ایمان ہی اصل ہے، اس کے تقاضے مجرد عقیدہ توحید کو مان لینے سے پورے ہو جاتے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے، شیخ نے مدارج النبوۃ میں آپ کے حقوق، مراتب و مناصب پر مفصل بحث کر کے بتایا کہ اسلام و ایمان کی تکمیل کے لئے توحید ہی کی طرح نبوت محمدی پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

نظریہ الفی بھی اس دور کی پیداوار ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ اسلام صرف ہزار برس کے لئے تھا، اب یہ مدت پوری ہو گئی اس لئے احکام دین اور شریعت محمدی بھی متروک ہو گئی اور اس کے اتباع کی ضرورت نہیں رہ گئی، شیخ نے اپنی اصلاحی

Marfat.com

سرگرمیوں کے سلسلہ میں اس غلط نظریئے اور گمراہ کن خیال کی بھی پرزور تردید کی اور ثابت کیا کہ احکامِ دین اور شریعت محمدی دائمی ہیں جن کی اتباع ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر قوم کے لئے ضروری ہے، اور ایک ہزار سال کے بعد بھی ان میں کوئی ردوبدل نہیں ہوسکتا۔

مہدوی تحریک کا ردوابطال:

مہدوی تحریک سے بھی نبوت کے عقیدہ پر ضرب پڑرہی تھی۔ شیخ عبدالحق کی ولادت جس زمانہ میں ہوئی اس وقت مہدوی تحریک پورے عروج پر تھی اس کا ذکر اس سے پہلے تذکروں میں آچکا ہے، اس کے بانی سید محمد جونپوری اور ان کے پیرؤوں کی اولین جماعت بڑے پاک نفس اور خداپرست لوگوں کی تھی، مولانا ابوالکلام آزاد تحریر فرماتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ اس کی بنیاد صداقت وحق پرستی پر پڑی تھی یعنی دعوت وتبلیغ حق واحیائے شریعت وقیام فرض امر بالمعروف ونہی عن المنکر اس کا مقصد اصلی تھا اور خود سید محمد اور ان کے پیرؤوں کی پہلی جماعت کے اکثر بزرگ بڑے ہی پاک نفس اور خداپرست لوگ تھے''۔ (تذکرہ مرتب مالک رام ص ۴۷)

اس سے معلوم ہوا کہ ابتداء میں یہ ایک اصلاحی ودعوتی تحریک تھی جس کا مقصد احیائے شریعت اور امر بالمعروف کا قیام تھا اور یہ اس دور کے علمائے سوء اور جاہ پسند لوگوں کی دنیا طلبی اور جاہل صوفیہ کی بدعات ومنکرات کے ردِعمل کے طور پر وجود میں آئی تھی، مگر سید محمد نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو علمائے سوء اور دنیا پرست مشائخ کی طرف سے اس کی مخالفت کا ایک طوفان اُمنڈ پڑا، سلیم شاہ کے دور میں شیخ علائی اور شیخ عبداللہ نیازی وغیرہ مہدوی تحریک کے خاص داعی ومبلغ تھے، دوسری جانب مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری شیخ الاسلام وغیرہ نے اس کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا تھا، انہوں نے اپنی ریشہ دوانیوں سے بادشاہ کو بھی ورغلایا اور اس کی وجہ سے اس تحریک کے حامیوں کو بڑے دشوار گزار اور سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

آگے چل کر مہدوی تحریک کی اصلی خصوصیات باقی نہیں رہیں اور اس کے پیرؤوں میں بھی بڑی شدت اور غیر معمولی غلو پیدا ہوگیا اور اس کے عقائد ونظریات میں بھی گوناگوں خرابیاں رونما ہوگئیں، مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:

''یہ فرقہ سید محمد جونپوری کی طرف منسوب ہے جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ مہدی ہونے کے مدعی تھے اگرچہ آگے چل کر اس فرقہ کے عقائد میں بہت سی نئی باتیں اور حدِ غلو سے بھی گزرے ہوئے اعتقادات شامل ہوگئے۔ اس قسم کے معاملات ہمیشہ ابتداء میں کچھ ہوتے ہیں اور آگے چل کر کچھ اور بن جاتے ہیں اور فتنہ غلو وتاویل پچھلی امتوں کی طرح اس امت کی ہر جماعت کے لئے بھی ایک بڑا فتنہ رہا ہے، یہی حالت اس جماعت کو بھی پیش آئی اور رفتہ رفتہ اس کی بنیادی صداقت اخلاق کے غلو ومحدثات میں گم ہوگئی''۔ (تذکرہ مرتبہ مالک رام ص ۴۷)

یہاں تک کہ اس کے نظریات عقیدۂ نبوت کے منافی ہوگئے اس بنا پر علمائے حق اور محدثین کو بھی اس سے اختلاف ہوا اور شیخ علی متقی، شیخ ابن حجر مکی اور علامہ محمد بن طاہر وغیرہ اس کی مخالفت میں بہت پیش پیش رہے، شیخ عبدالحق نے بھی اپنے بزرگوں کی روش کے مطابق مہدوی تحریک کی مخالفت کی مگر وہ علمی شخص اور اعتدال پسند آدمی تھے اس لئے اپنے دور کے فتنوں کے استیصال کیلئے وہ علمی انداز اختیار کرتے تھے اور ان کی مخالفت اعتدال پر مبنی ہوتی تھی، عقیدۂ نبوت کے باب میں مہدوی

Marfat.com

تحریک کی بے اعتدالی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ: ''سید محمد کا یہ عقیدہ کہ جو کمال محمد ﷺ کو حاصل تھا، وہی مجھ کو بھی حاصل ہے فرق صرف یہ ہے کہ آپ کو وہ کمال اصالتاً ملا تھا اور مجھے تبعیتاً ملا ہے''

علماء و مشائخ کی فتنہ سامانی سے بیزاری:

یہ ساری مصیبت اکبری عہد کے نام نہاد علماء و مشائخ کی لائی ہوئی تھی جو دنیا کی طمع اور مال و زر کی حرص میں دیوانہ ہو گئے، یہ خود فسق و فجور میں ملوث تھے مگر دوسروں کی تفسیق، تضلیل اور تکفیر کا ہنگامہ برپا کیے رہتے تھے، ان کے گھروں میں مال و دولت کا انبار جمع رہتا تھا مگر اپنے فتووں اور حیلوں کا سہارا لے کر ہمیشہ زکوٰۃ نکالنے سے اپنے کو بچا لیتے تھے سال کے ختم ہونے سے پہلے اپنا سارا اثاثہ اپنی بیویوں کے نام کر دیتے اور جب بیویوں کی ملکیت میں حولانِ حول کی نوبت آتی تو اسے اپنے نام منتقل کر لیتے تھے، یہ لوگ ڈاڑھی منڈواتے، فریضۂ حج ساقط ہو جانے اور اکبر کو سجدہ کرنے کا حکم دیتے تھے، گمراہ صوفیہ و مشائخ نے اپنے خود ساختہ اعمال و اشغال اور مجاہدات کو تصوف کا نام دے رکھا تھا، انہوں نے طریقت کو شریعت سے علیحدہ کر کے بہت سی عبادات و احکام سے اپنے کو دستکش کر لیا تھا۔

اس عہد کا سب سے بڑا فتنہ اکبر کا متوازی دین الٰہی تھا مگر اس کے مذہبی انحراف کا باعث بھی یہی علماء و صوفیہ تھے وہ ابتدا میں مذہب سے برگشتہ نہ تھا بلکہ صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا اور شعائر دین کا احترام کرتا تھا مگر جب علمائے سوء کے فتووں اور اجتہادات، گمراہیوں، بدعتوں اور فسق و فجور کا بازار گرم ہو گیا اور اس کی موشگافیوں اور کج بحثوں نے دین کو بازیچۂ اطفال بنا دیا تو اکبر نہ صرف ان کے طرزِ عمل سے بلکہ رفتہ رفتہ دین ہی سے متنفر ہو گیا۔

ان لوگوں نے ہر کس و ناکس اور اہل و غیر اہل تمام لوگوں کو اجتہاد کا حق دیدیا اس طرح ہر شخص مذہبی امور و مسائل میں دخل دینے اور رائے زنی کرنے لگا۔ اکبر کو بھی اجتہاد کا حق درباری علماء نے دے دیا تھا، یہی نہیں بلکہ اس کی حیثیت شارع اور مطاع کی ہو گئی تھی، اس کے دربار میں مختلف مذاہب کو ماننے والے جمع ہوتے تھے اس نے ہر مذہب و مسلک کے لوگوں کے لئے عام کر دیا تھا، ان مجلسوں میں کھل کر اسلام اور شریعت محمدی کو تختۂ مشق اور بحث و تنقید کا نشانہ بنایا جاتا تھا اور جو چیز بھی خلاف عقل معلوم ہوتی اس کو بے تکلف ختم کر دیا جاتا تھا امراء و حکام دین کے بارے میں کج بحثی کرتے اور من مانی تاویل کر کے بادشاہ کو خوش کرنے کی فکر میں رہتے، اسکی خوشنودی کے لئے دین میں ہر قسم کی کتر بیونت جائز قرار دیدی گئی تھی۔ شیخ عبدالحق محدث ان رجحانات کی اصلاح میں بھی لگے، ان کے اس زمانہ کے بعض امراء سے اچھے تعلقات تھے جس کی تفصیل آگے آئے گی، شیخ نے ان لوگوں کو خطوط لکھ کر انہیں دین و شریعت کی حفاظت و پاسبانی کی دعوت دی اور شرور و فتن سے باز رہنے کی تلقین فرمائی، اس طرح ان کی مساعی سے دین و شریعت بازیچۂ اطفال بننے اور بیجا تاویل و تحریف کی زد میں آنے سے محفوظ رہی۔

عقلیت پسندی اور فلسفہ کی تردید:

کتاب و سنت سے انحراف و برگشتگی اور عقلیت و فلسفہ کا زور اس قدر بڑھا کہ امت کے اندر بڑا اختلاف و انتشار پیدا ہو

Marfat.com

گیا اور لوگ اس دین وشریعت کو بھول گئے جو خیر القرون میں رائج تھا اس کی جگہ انہوں نے جو دین اختیار کر رکھا تھا اس میں عجمی رنگ آمیزیاں اور فلسفہ وکلام کی موشگافیاں شامل ہوگئیں تھیں، شیخ عبدالحق نے عقلیت پسندی کے اس رجحان اور فلسفیانہ قیل وقال کی سخت مذمت کی اور دین کی صحیح حقیقت ونوعیت واضح کر کے اس کو اختیار کرنے دعوت دی، اس موقع پر ان کی تحریروں کے اقتباس نقل کرنا نامناسب نہ ہوگا، فرماتے ہیں:

''صحابہ وتابعین وتبع تابعین کے زمانوں کے بعد جو بمصداق حدیث نبوی خیر القرون تھے۔ عقائد واصول میں نزاع اور اختلافات پیدا ہوئے، چوں وچرا پیدا ہوا، سنت کا نور بجھنے لگا اور بدعت کی تاریکیاں دنیا پر چھانے لگیں، ہر شخص کے سر میں نیا سودا اور ہر ایک کے دل میں نئی رائے نے قدم جمایا، تاویل کے دروازے کھل گئے ظواہر نصوص متروک ہوئے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طریقہ اور مذہب سلف عزیز الوجود اور اجنبی ہوگیا۔ بدء الاسلام غریبا وسیعود غریبا الخ (اسلام شروع میں اجنبی تھا اور پھر اجنبی ہوجائے گا تو خوشخبری ہو ان کے لئے جو اس اجنبی اسلام پر جمے رہیں) کا منظر سامنے آگیا۔

سخت ترین حادثہ اور عظیم ترین مصیبت جو دین اسلام اور اعتقاد سلف پر آئی وہ علم فلسفہ کا ظہور اور عربی میں اس کا ترجمہ تھا جو بعض خلفائے عباسیہ کے زمانے میں واقع ہوا، اس سے مخالفوں اور دشمنوں کے ہاتھ میں جنگ وجدال کا حربہ آگیا، بعضوں نے علم ودانش اور خصوصاً جدید ونادر علم کے حرص میں اور بعضوں نے عقائد اسلام اور قواعد ملت کو برباد وتباہ کرنے کے ارادے سے فلسفہ یونان میں توغل کیا اور اس دریا میں غوطے لگائے، علمائے دین اور اساطین امت کی ایک جماعت نے بھی مذہب سلف کی حفاظت اور سنت کی پاسبانی کے قصد سے اس کو حاصل کیا اور عقائد شرعیہ کے اثبات اور فلسفیات کے رد وابطال کے لئے مستعد ہوئے کیونکہ کسی چیز کو جانے بغیر اس کا رد نہیں کیا جاسکتا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسفیات خوب شائع ہوئے، جنگ وجدال اور قیل وقال کا دائرہ وسیع ہوا اور بازار سخن گرم ہوگیا، یہیں سے علم کلام کی پیدائش ہوئی، اگرچہ اہل اسلام اور ارباب علم کلام گمراہ فرقوں کے رد وابطال کے قصد سے اس میدان میں داخل ہوئے تھے لیکن اس کے ضمن میں خود انہیں بھی نقصان عظیم پہنچا اور ان کی یہ مشغولیت عقائد اور قواعد دین میں تذبذب کا سبب بن گئی، تشکیک وتردید کا دروازہ کھل گیا، کم ہی کوئی ایسا ہوگا جو علم کلام میں خوض وغلو کے بعد درگرداب حیرت سے سلامت نکلے اور اپنے سرمایہ یقین کو محفوظ رکھ سکے ہاں بس اللہ ہی جسے بچائے تو بچائے اور یہ بہت نادر ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

راہ سلامتی کے رہرو اور طریق استقامت کے طالب پر لازم ہے کہ فلسفیات اور علم کلام میں توغل نہ کرے اور دلائل کلامیہ کی کج بحثیوں سے اپنا دامن بچائے اہل سنت والجماعت کے اعتقاد کو دل میں جمائے اور ان کے اجمالی دلائل پر اکتفا کرے، منقول کو معقول کے تابع نہ کرے اور بیجا تاویل وتشکیک کے دروازے بند کرے۔

دین کے بہت سے اصولی عقائد ایسے ہیں کہ وحی الٰہی کے سوا کوئی انہیں حل نہیں کرسکتا اور عقل انسانی وہاں سپر انداز ہو جاتی ہے، جب آج تک عقل انسانی ''انا'' کی حقیقت دریافت نہ کرسکی تو پھر خالق انا کی حقیقت کا پتہ کیا پائے گی، انسان کی ہستی سے قریب اس کا لطیفہ انانیت ہے کہ اسی سے وہ ''انا'' کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے ''میں نے کیا'' لیکن کیا آج تک کوئی عاقل اور کوئی فلسفی اس کا فیصلہ کرسکا کہ ''انا'' کی حقیقت کیا ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے ؂

Marfat.com

آنکہ خود را شناختن نتواند آفریننده را کجا داند
تو کہ در ذات خود زبوں باشی عارف کردگار چوں باشی

(مرج البحرین قلمی نسخہ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۹۶ تا ۹۸)

متکلمین کو فساد کا سرچشمہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس فساد کی بنیاد متکلمین ہیں اور اس کا باعث و سرچشمہ فتنہ فلسفہ ہے گو ان کو اس کی احتیاج و ضرورت تھی اور ان کے لئے سکوت کی گنجائش نہ تھی تاہم اس سے نقصان ہوا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد تحقیق دین اور حکمت و شریعت کی تطبیق ہے، یہ محض ان کی سخن طرازی اور لفاظی ہے، یہ لوگ فلسفہ و کلام کے جال میں پھنس کر جادۂ حق سے باہر ہو جاتے ہیں اور حق کو باطل کے تابع اور اس میں مخلوط و ممزوج کر دیتے ہیں، یہ شروع ہی سے دین اور مسلمانوں کے عقائد کو اختیار کر کے کیوں نہیں اسی پر اکتفا کرتے ہیں''۔ (نکات الحق مطبع اعنامیہ مراد آباد ص ۱۱۳ حوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۹۹)

ان اقتباسات سے ان کی دینی غیرت وحمیت اور فلسفہ و کلام سے اس بنا پر ان کی نفرت و بیزاری کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان سے اسلام کو نقصانِ عظیم پہنچا اور حیرت و درماندگی کے علاوہ ان کا کوئی حاصل نہیں۔

اسی طرح دوسرے باطل افکار و نظریات اور گمراہ فرقوں کے عقائد و خیالات کی اصلاح و درستگی کو بھی انہوں نے اپنی مہم میں شامل کر لیا اور ان کی تردید اپنی تحریروں کے ذریعہ کی مثلاً جبریہ و قدریہ دونوں کی نفی کر کے اس سلسلہ میں حق و اعتدال کے مسلک کی اس طرح توضیح کی ہے۔

''اہل حق کے نزدیک جبریہ و قدریہ دونوں کا مسلک باطل ہے، نہ خیر ہے نہ قدر اور حق یہ ہے کہ عامل کو اپنی جانب منسوب کرے اور اس کے ساتھ یہ اعتقاد بھی رکھے کہ وہ اللہ کے خلق و توفیق سے ہوا ہے، قضاء و قدر اور اختیار کا مسئلہ غوامض و اسرار میں ہے اس پر ایمان واجب ہے اور اس میں بحث لاحاصل ہے، کیونکہ حقائق و اعمال میں کوئی چیز ان اسرار کے کشف پر موقوف نہیں ہے، عمل میں سعی واجب ہے، کیونکہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بندوں سے اوامر و نواہی کے متعلق سوال کرے گا، اپنی ذات و صفات کے بارہ میں نہیں پوچھے گا''۔ (الحدثان الدکتور محمد احمد صدیقی الہ آباد ص ۱۶ و ۱۷)

شیعیت کے زور و اثر کو مٹانے کے لئے بھی وہ سرگرم رہے، محرم میں رائج اعمال و اشغال اور بدعات و احداث کی تردید کے لئے انہوں نے ماثبت بالسنۃ لکھی اور تکمیل الایمان میں مسئلہ خلافت پر بحث کر کے شیعہ فرقہ کے اعتراضات و اعتقادات کا معقول و مدلل رد لکھا۔ (تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۳۸)

افراط و تفریط سے اجتناب اور اعتدال و سلامت روی:

وہ دینی امور و مسائل میں حد درجہ محتاط اور معتدل روش پر گامزن تھے اور ان میں کسی طرح کی بے اعتدالی اور بے راہ روی کو پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ عموماً الوہیت و نبوت کے فرق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اسی طرح نبوت اور ولایت کے حدود و مراتب بھی ایک دوسرے میں گڈمڈ کر دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان چیزوں میں ادنیٰ لغزش اور معمولی بے احتیاطی بھی کفر و ضلال کا موجب ہوتی ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارک سے والہانہ عقیدت و شیفتگی

Marfat.com

تھی اور وہ عشق رسول میں دیوانہ رہتے تھے مگر اس کے باوجود الوہیت و نبوت کے دقیق و نازک فرق کو کبھی نظر انداز نہ کرتے تھے، اسی طرح تصوف سے بھی ان کو بچپن ہی سے دلچسپی تھی اور اولیاء و صوفیہ سے بڑی عقیدت و محبت رکھتے تھے مگر کبھی کسی ولی کا درجہ انبیائے کرام کے مساوی قرار دینے کی غلطی ان سے سرزد نہ ہوئی، اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

''اس باب میں یہ ضابطہ نگاہ میں رہنا چاہیے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کا ادب واحترام یہ ہے کہ جو چیزیں مرتبہ الوہیت اور حق تعالیٰ کے صفات میں داخل ہیں ان کے سوا اور ان سے کمتر جو کمال و منقبت بھی ہو سکتی ہے وہ سب آپ کے لئے ثابت ہے، تمام مرتبے اور صوری و معنوی کمالات اللہ کے بندے اور اس کے رسول میں موجود ہیں مگر عبادت و بندگی جو صرف اللہ کی ذات کے لئے مخصوص ہے وہ اس کامل اور حقیقی بندہ کے لئے بھی نہیں کی جا سکتی کیونکہ خدا خدا ہے اور آپ اس کے بندے ہیں، رہے دوسرے لوگ تو وہ سب کے سب اللہ کے طفیلی بندے ہیں''۔ (مکتوب نمبر ۹ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۰۴)

الوہیت و نبوت کی نکتہ شناسی اور اس بارہ میں عدم افراط و تفریط کا ثبوت ان کے اس شعر میں بھی ملتا ہے۔

ے مخواں اورا خدا از بہر امر شرع و حفظ دیں ☆ دگر ہر وصف کش میخواہی اندر مدحش انشا کن

(اخبار الاخیار ص ۳۰۲)

سلاطین و امراء سے تعلقات اور انکی اصلاح کے لئے سعی و کوشش:

شاہ عبدالحق محدث دہلوی کو کئی سلاطین کا زمانہ ملا۔ وہ سلیم شاہ سوری کے عہد میں پیدا ہوئے اور شاہجہان کے سن جلوس میں وفات پائی، اکبر اور جہانگیر کے دور کو انہوں نے اچھی طرح دیکھا تھا مگر وہ اپنی طبعی عزلت گزینی اور گوشہ پسندی نیز علمی ذوق و مشغلہ کی وجہ سے سلاطین و امراء سے دور رہنا چاہتے تھے، جوانی میں اکبر کے دربار میں فتح پور بھی غالباً اپنے علمی ذوق کی تسکین ہی کے لئے گئے تھے لیکن وہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر ایسے کبیدہ خاطر ہوئے کہ حجاز ہی میں جا کر سکون ملا، وہاں سے واپسی کے بعد بھی درباری ماحول سے وحشت و بیزاری کم نہ ہوئی چنانچہ فیضی کی طلب و اصرار کے باوجود وہاں جانا پسند نہ کیا۔

اسی طرح اکبر کے دور میں وہ دربار سے نہ کسی طرح متوسل ہوئے اور نہ اس سے کوئی واسطہ و تعلق رکھا، البتہ فتح پور میں قیام کی وجہ سے بعض امراء سے ان کے ذاتی مراسم و تعلقات ہو گئے تھے جو آخر تک باقی رہے، ان امراء سے تعلق اس لئے بھی رکھا کہ یہ اکبر کی بے دینی کے باوجود دیندار تھے اور بادشاہ کی بے دینی کے مخالف تھے مگر اس کے دباؤ کی وجہ سے خاموش رہتے تھے، شیخ نے ان لوگوں کی جانب توجہ دینے کی ضرورت محسوس کی اور ان کی اصلاح اور ان کے عقائد کی تصحیح کی فکر میں لگ گئے، انہیں خطوط لکھ کر ترویج دین پر آمادہ کرتے اور حکومت کی بے دینی کے خلاف سرگرم عمل ہونے کی ترغیب دیتے۔ انہوں نے خواجہ باقی باللہ کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں بھی اس عہد کے فتنوں کا ذکر کر کے ان کے بارہ میں تشویش ظاہر کی ہے۔

عہد اکبری کے امراء میں نواب مرتضیٰ خاں فرید سے شیخ کے نہایت مخلصانہ روابط تھے، ان کے مجموعہ مکاتیب میں ان کے نام کے متعدد خطوط ہیں جن میں ان کو فرائض منصبی بجالانے اور ان کی دینی حمیت کو برانگیختہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے، اسی طرح نواب عبدالرحیم خانخاناں کو بھی انہوں نے متعدد اصلاحی خطوط لکھے، خانخاناں بھی اپنے عقائد پر سختی سے قائم رہے اور اکبری الحاد سے کنارہ کش تھے۔ ان دونوں کے علاوہ شیخ عبداللہ نیازی، ملا عبدالقادر بدایونی اور مرزا نظام الدین احمد بخشی سے

Marfat.com

بھی انہوں نے اصلاحِ معاشرت اور اشاعت دین کے جذبہ کے ماتحت تعلق رکھا، اس طرح وہ امراء کی اصلاح اور اکبر کی بے دینی کے خلاف انہیں اکسانے کے لئے پوری طرح سرگرم عمل تھے مگر ان کی یہ اصلاحی سرگرمیاں احتیاط و اعتدال کے ساتھ ہوتی تھیں وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں:

''سخن مبالغہ گفتہ نہ شود و از حیطہ احتیاط کہ روش ایں فقیر است بیرون نیفتم''۔ (بحوالہ تاریخ ازبیات ج ۲ ص ۲۲۵)

شیخ کی یہ کوششیں رائیگاں نہ گئیں، فیضی اور ابوالفضل کی وفات کے بعد الحاد اور بے دینی کا اثر کم ہونے لگا اور اکبر کا دین الٰہی کے لئے جوش و خروش بھی زیادہ نہیں رہا اس طرح اس کے آخری دور میں دیندار امراء کا اثر بڑھنے لگا، شیخ فرید اس کے خیالات میں تبدیلی لانے میں بھی کامیاب ہوئے، اس کی موت کے بعد ان کے خاص اثر کی وجہ سے جہانگیر تخت نشین ہوا تو اکبر کے دور کی بے دینی کا خاتمہ ہوگیا۔

جہانگیر کے دور میں ''دین الٰہی'' نے دم توڑ دیا اور بہت کچھ حالات میں بھی اصلاح و تغیر رونما ہوا مگر اکبر کے دور میں ملحد فلسفیوں، دین فروش علماء اور مکار صوفیہ نے جو فتنے پھیلا رکھے تھے وہ آسانی سے ختم ہونے والے نہ تھے، ان کی سرکوبی کے لئے اس وقت جو لوگ میدانِ عمل میں زیادہ سرگرم عمل رہے، ان میں حضرت مجدد الف ثانی کے ساتھ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا نام بھی ہے جس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، شیخ نے کتاب و سنت کا نور پھیلانے اور روشن کرنے کے لئے ایسی مفید کتابیں لکھیں جن سے لوگوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح ہوئی، ان کے ذہن و فکر بدلے اور ان کے خیالات و نظریات کا رخ صحیح سمت میں ہوگیا۔

جہانگیر عملاً جیسا بھی رہا ہو مگر الحاد اور بے دینی سے اس کو واسطہ نہ تھا، اس لئے شیخ کے اس سے یک گونہ روابط رہے، شیخ کا حضرت خواجہ باقی باللہ سے بھی تعلق تھا، حضراتِ نقشبندیہ کا اصول و دستور یہ ہے کہ خرابیوں کی اصلاح کیلئے اربابِ اقتدار سے الگ تھلگ رہنے کے بجائے ان سے ربط و ضبط پیدا کیا جائے، چنانچہ اس اصول کے مطابق شیخ عبدالحق نے بھی جہانگیر سے کنارہ کش رہنا پسند نہیں کیا۔ اس کے لئے رسالہ نوریہ سلطانیہ تصنیف کیا، جس میں قواعد و ارکان سلطنت پر مفصل بحث کی ہے اور اسے اس کی ذمہ داریوں اور فرائض سے آگاہ کیا ہے جہانگیر کی تخت نشینی میں نواب مرتضیٰ خاں فرید کو بڑا دخل تھا، اس بنا پر شیخ محدث نے جہانگیر کے تخت نشین ہونے کے بعد ہی نواب صاحب کو ایک مکتوب لکھا جس میں اصلاحِ احوال کی طرف خاص توجہ دلائی اور یہ تاکید بھی کی کہ اسے بادشاہ کی نظر سے گزارا جائے۔ (مراۃ الحقائق ص ۶۵ بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۴۵ و تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ج ۲ عربی ادب ص ۱۷۳) جہانگیر نے تزک میں جس انداز سے شیخ کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے شیخ سے عقیدت تھی اور وہ ان کی عظمت، بزرگی اور علمی بلند پایگی کا معترف تھا اور اس سے متاثر ہو کر ملاقات کے وقت اس نے ان کو بہت سی عنایات و نوازشات کے ساتھ رخصت کیا اور جاگیر کے طور پر ایک گاؤں بھی نذر کیا۔

(مراۃ الحقائق ۸۹ بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۴۸)

جہانگیر کے بعد شاہجہان تخت نشین ہوا تو شیخ نے اس کی رہنمائی اور خیر خواہی کے لئے بھی ایک رسالہ ''ترجمۃ الاحادیث الاربعین فی نصیحۃ الملوک والسلاطین'' تالیف کیا، شاہجہان کا لڑکا شہزادہ دارا شکوہ بھی شیخ کا معتقد

Marfat.com

تھا اور اس نے ان سے فرمائش کی کہ زبدۃ الآثار کو فارسی میں لکھیں"۔ (مقدمہ نوریہ سلطانیہ ڈاکٹر سلیم اختر ص ۱۴)

مولانا غلام معین الدین عبداللہ کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر اور شاہجہان کے دربار میں شیخ کو اس قدر رسوخ اور تقرب حاصل تھا کہ وہ ضرورت مند لوگوں کی ان بادشاہوں سے سفارش کر کے ان کی حاجت روائی بھی کرتے تھے اور مجرم لوگوں کو سزا بھی دلاتے تھے۔

چوں در زمان جہانگیر و شاہجہان بادشاہ قبولیت تمام داشت اکثر حاجات فقراء و مساکین بعرض میرسانید و بانجاح مرادات و اسعاف متصفیات واصل میگردانید و در دفع زندقہ و الحاد بسیار میکوشید و قائل شطحیات را بحد و تعزیر میرسانید۔ (ایضاً)

جہانگیر اور شاہجہان کے زمانہ میں چونکہ ان کو بڑی مقبولیت حاصل تھی اس لئے اکثر فقراء و مساکین کو ضرورتوں کے لئے ان لوگوں کی خدمت میں عرض گزار ہوتے اور ان کی حاجت روائی اور مطلب برآری کرتے، شیخ زندقہ والحاد کو دفع کرنے کے لئے بھی بہت کوشاں رہتے تھے، چنانچہ سطحیات کی طرف مائل لوگوں پر حد و تعزیر جاری کراتے۔

اتباعِ سنت کی دعوت:

فلسفہ، عقلیت پسندی اور دوسرے باطل افکار و رجحانات کی مذمت و تردید کے ساتھ ہی انہوں نے اتباع سنت اور طریقہ محمدی کو اختیار کرنے کی تلقین و ترغیب بھی دی۔ وہ خود اتباع سنت کے جذبہ سے سرشار تھے اور اس کی اشاعت و دعوت ان کی زندگی کا مقصد رہا، ان کی تصنیفات و مکاتیب میں بھی اس پر خاص زور دیا گیا ہے، ان کے نزدیک تصوف کا مقصد و منشا بھی یہی ہونا چاہیے، اس میں اصلی کمال سنت و طریقہ محمدی کے اتباع ہی کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے اس کے بغیر سلوک و طریقت بے حقیقت ہے۔ ایک مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اصلی اور بنیادی بات اصول کے ساتھ تعلق، اس منبع انوار سے اقتباس نور، اس کی محبت میں استغراق اور اس کی سنت کی متابعت کا اہتمام کرنا ہے تاکہ سالک فروع میں الجھ کر اصل سے باز نہ رہ جائے اور وسایط اصل مقصود کو اسکی نظر سے اوجھل نہ کر دیں اور یہ کہ اپنے افعال، اقوال و احوال کی ترازو رسول کی سنت اور صحابہؓ و تابعینؒ کے طریقہ کو بنائیں اور اپنی تمام چیزوں کو اس کے مطابق کریں نہ یہ کہ اس کی طلب ہی نہ کریں، اس کی تحصیل میں کوشاں نہ ہوں اور اس کا اہتمام نہ کریں بلکہ اس سے بے خبر ہوں اور اصل کو فرع کا تابع بنائیں اور فرع کے مقابلے میں اصل کی تاویل کریں، یہ طریقہ یا تو بطالت ہے یا الحاد و بے دینی ہے"۔

(مکتوب نمبر ۵ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۰۲)

ایک اور مکتوب گرامی میں رقمطراز ہیں:

"اور لازم ہے کہ آنحضرت ﷺ کی روشن سنت کا اتباع کرنا عبادات میں بھی، عادات میں بھی اور اعتقادات میں بھی اور اس بات کا اعتقاد کرنا چاہیے کہ جو کچھ انکی سنت اور طریقے کے خلاف ہے وہ باطل ہے"۔

(مکتوب نمبر ۹ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۰۳)

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

"انسان دین و ملت کی تقویت، سنت کی تائید و ترویج و اشاعت میں کوشش کرے اور سنت کی اشاعت کرنے والوں کی اعانت کرے خواہ اکیلا اور تنہا ہی کیوں نہ ہو"۔ (الحد ثان ص ۱۷ و ۱۸)

Marfat.com

ان کے نزدیک عبادت کی اصل حقیقت بھی امر خداوندی کی تعمیل اور سنت کی موافقت ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ سنت کی موافقت اور اقتدار کے خیال سے قیلولہ کے وقت قیلولہ کرنا ذکر اور نفل نماز پڑھنے سے افضل و بہتر ہے۔

(نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۱۰)

وہ اس پر بھی خاص زور دیتے ہیں، کہ قرآن و حدیث کی تفسیر و تشریح سنت نبوی کے موافق کرنی چاہئے اور اہل سنت والجماعت کے عقائد کو مضبوطی سے اختیار کرنا چاہیے اور اس معاملہ میں کسی شک و تذبذب کو راہ نہ دینی چاہیے۔

حدیث نبوی: ما احدث قوم بدعة الا رفع مثلها من السنة کی تشریح کر کے واضح کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی سنت کو اختیار کرنا نئی نئی باتیں پیدا کرنے سے بہتر ہے فرماتے ہیں تو اس پر یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اقامت سنت (سنت کو قائم و زندہ کرنا) قاطع بدعت (بدعت کا قلع قمع کرنا) ہے مثلاً چنگ کو توڑنا سنت اور بہتر ہے اور اس کی مرمت کرنا بدعت اور غلط ہے، اتباع سنت سے نور پیدا ہوتا ہے اور بدعت میں گرفتاری سے ظلمت پیدا ہوتی ہے، پس خلا و استنجا کے آداب کی سنت کے مطابق رعایت کرنا سرائے اور مدرسہ کی تعمیر سے بہتر ہے، جب سالک سنت کے، آداب کی رعایت و اہتمام میں ترقی کرتا ہے تو وہ مقام قرب حاصل کر لیتا ہے اور اس کو چھوڑنے سے وہ انحطاط و تنزل کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ چیز ہلاکت کا باعث ہوتی ہے، افضل کے ترک سے قساوت قلب میں مبتلا ہوتا ہے اسی کو ''رین''، ''ختم'' اور ''طبع'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور آدمی ترک افضل سے ان سب حالتوں تک پہنچ جاتا ہے، نعوذ باللہ من ذالک''۔

(تقصار جود الاحرار جنود الابرار ص ۱۲ اور ۱۳)

ردِ بدعت:

اتباع سنت کی دعوت و تلقین کے ساتھ ہی وہ رد بدعت میں بھی پیش پیش تھے، اوپر کی تحریروں سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اس لئے یہاں دو ایک مثالیں پیش کرنے ہی پر اکتفا کی جاتی ہے، شیخ عبدالحق کا ارشاد ہے:

''اور اس بات کا اعتقاد کرنا چاہیے کہ جو کچھ رسول اکرم ﷺ کی سنت اور طریقے کے خلاف ہے وہ باطل ہے اور جس شخص نے بھی کوئی ایسی نئی بات پیدا کی ہے جس سے سنت رسول کی مخالفت ہوتی ہے یا اس میں تغیر پیدا ہوتا ہے، چاہے یہ مخالفت و تغیر قول میں ہو یا عمل میں یا اعتقاد میں وہ گمراہی ہے اور مردود ہے''۔ (مکتوب نمبر ۹ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۰۳)

مشہور حدیث ''جس نے ہمارے اس امر (دین) میں وہ بات پیدا کی جو اس سے نہیں ہے وہ مردود ہے'' نیز آپ نے فرمایا کہ: ''ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے'' کو نقل کر کے اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: ارباب دین نے کہا ہے کہ اس دل میں جو گرفتار بدعت ہے ولایت کا نور داخل نہیں ہوتا''۔

بعض اعمال و اشغال جو صوفیہ و مشائخ کے حلقوں میں رائج اور عام ہو گئے ہیں گو ان کی حلت و حرمت کا کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں تاہم ان کو جس شکل و طور سے اور جن جذبات و میلانات کے تحت انجام دیا جاتا ہے، شیخ ان کی بھی مذمت کرتے ہیں، اس سے بھی ان کے اتباع سنت و رد بدعت کے جوش و جذبہ کا اندازہ ہوتا ہے اس لئے یہاں مسئلہ سماع کے بارہ میں ان کے خیالات پیش کیے جاتے ہیں:

Marfat.com

''مسئلہ سماع میں مشائخ طریقت کے افعال واقوال متعارض ہیں جو جماعتیں اس کو جائز سمجھتی ہیں ان کے داعیے واسباب مختلف ہیں، بعض جماعتیں تو اس کام میں اس لئے مشغول ہیں کہ ان پر خواہش نفس کا غلبہ ہے، وہ نہ تو احکام شرع کی پروا کرتی ہیں نہ انہیں صدق نیت کی دولت ملی ہے اور نہ انہیں احسن الامر کے اتباع اور اولیٰ وارجح کے اخذ کی طرف کوئی توجہ ہے، یہ جماعت خارج از بحث ہے، اس لیے کہ اس کے افعال واحوال میں کوئی ضبط قید نہیں، یہ جانوروں کے حکم میں داخل ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہے، نفس پرستوں کی دوسری جماعت وہ ہے جو طاعت وعبادت کے ذوق، ذکر وتلاوت کی لذت اور خلوت ومناجات کی دولت سے محروم ہے، نغمہ بالطبع جذبات باطن کا محرک اور پریشان خیالی کو یکسو کرنے والا ہے، ان لوگوں کو سماع نغمہ سے لذت و سرور اور مطلوب کا ایک شعور حاصل ہوتا ہے، بس، اسی چیز پر یہ اپنے حواس کھو بیٹھتے ہیں، اس حالت کو غنیمت سمجھتے ہیں اور تسویلات نفس وشیطان کی وجہ سے اس کو عبادت وریاضت پر ترجیح دیتے رہتے ہیں اور عابدوں، زاہدوں کے فضل کا انکار کرتے ہیں اور ان کو ذوق ولذت عشق سے محروم سمجھتے ہیں، اس فریب نفس کی جزا ان کو یہ ملتی ہے کہ روز بروز یہ لوگ دین ودیانت کے طریقے سے بیگانہ اور دور ہوتے جاتے ہیں اور جس کام میں یہ مشغول ہیں اس میں ان کا انہماک بڑھتا جاتا ہے، نماز سے ان کو بجز نشست وبرخاست اور کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ نمازیں محض مخلوق کی زجر وتشنیع کے خوف سے دکھاوے اور تکلف کی پڑھتے ہیں نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ ان کی مجلسوں میں گانے والی خوبصورت عورتیں راہ پاتی ہیں اور حسن صوت کے ساتھ حسن صورت کے انضمام سے ان کا ذوق وشوق حد کمال تک پہنچ جاتا ہے''۔

(مکتوب نمبر بنام حضرت خواجہ باقی باللہ، بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۰۸ و ۱۰۹)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ کی نظر مفاسد کے سرچشموں پر کیسی گہری تھی جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے اس کے بارہ میں اپنے مرشد وشیخ عبدالوہاب سے ایک مرتبہ انہوں نے دریافت کیا کہ: ''ہمارے علاقہ میں سماع کی رسم عام ہے، اس موقع پر لوگ جمع ہوتے ہیں جس میں اہل ونااہل فاسق وصالح ہر قسم کے لوگ اکٹھا ہوتے ہیں اور اس طرح کے کام کرتے ہیں، سماع کی یہ صورت جو ہندوستان میں رائج ہے اس کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟ شیخ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''اس طرح پر یہ کام اصلاً جائز نہیں، اس کو نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس سے اجتناب وقت کا ضروری تقاضا ہے، طالب حق کو اس صورت میں قطعاً سہولت ومسامحت سے کام نہیں لینا چاہیے۔'' (اخبار الاخیار ص ۲۵۶)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور حضرت شیخ احمد سرہندیؒ:

حضرت شیخ عبدالحق کے عہد میں حضرت شیخ، احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی شخصیت علمی ودینی حیثیت سے بڑی اہم اور ممتاز تھی، ان کے مہتم بالشان اصلاحی وتجدیدی کارنامے کسی تفصیل وبیان کے محتاج نہیں، ڈاکٹر محمد اقبال کا ایک شعر ہی ان کی عظمت وعلوئے مرتبہ کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان ☆ اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

(ضرب کلیم)

حضرت شیخ عبدالحق کے متعلق اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ علمی ودینی حیثیت سے ان کا پایہ بھی کم نہ تھا اسی لئے یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کے مداح وقدردان بھی تھے مگر اس کے باوجود دونوں میں اختلاف رائے بھی ہوا

Marfat.com

چنانچہ مکتوبات امام ربانی کے بعض مندرجات پر شیخ عبدالحق کو اعتراضات وشبہات ہوئے تو انہوں نے بڑے غور و تامل اور بار بار استخارہ کرنے کے بعد ان شبہات و اعتراضات کو ایک طویل مکتوب میں قلم بند کر کے حضرت مجدد صاحب کے پاس دریافت و تحقیق کی غرض سے بھیجا تا کہ جن خیالات کے بارہ میں ان کو اعتراض ہے، مجدد صاحب ان کا ازالہ کر دیں اور ان کے متعلق ان کی خلش دور کر کے ان کی تسلی و تشفی فرما دیں چنانچہ مکتوب کے شروع ہی میں لکھتے ہیں:

درد دل دارم بسے از خوئے آں زیبا نگار ☆ فرصتے یارب کہ دل را پیش وے خالی کنم

سالہا است کہ بعضے از کلمات و مکالمات کہ در مکتوب شریف مذکور است و از قبیل موہمات است می خواہد کہ استفسار کند و انکشاف نماید میسر نشد۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۳۱۳ مکتوب شیخ عبدالحق محدث بنام شیخ احمد سرہندی)

برسوں سے مکتوب شریف میں مذکور بعض اقوال و بیانات کے بارہ میں استفسار کرنا اور ان کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی سہولت میسر نہ آئی، یہ باتیں بڑی اہم اور وہم و شک میں مبتلا کرنے والی ہیں۔

آخر میں اس کے متعلق مزید وضاحت سے تحریر فرماتے ہیں:

ایں کلمات بقصد استفسار انکشاف حال نہ دفع تالم عارض بال تسکین فرقہ صدر نوشتہ شد، قصد آن داشت کہ چیزے بنویسد و بالزام نفس راضی باشد۔۔۔ وایں را از چند مجلس املا نمودہ و ہر بار استخارہ بجناب سعادۃ از شر نفس۔ (ایضاً ص ۳۴۳)

یہ باتیں استفسار اور کشف حال کی وضاحت چاہنے کے لئے لکھی گئی ہیں تا کہ دل کو جو خلش اور الم لاحق ہو گیا ہے وہ رفع ہو جائے اور قلب کو قرار و سکون حاصل ہو جائے، آپ کچھ تحریر فرما کر نفس قبولیت و رضا کے لئے مجبور کر دیں۔ اس مکتوب کو کئی نشستوں میں املا کیا ہے اور ہر دفعہ درگاہ الٰہی میں شر نفس سے بچنے کے لئے استخارہ کیا ہے۔

یہ مکتوب بدنیتی یا کسی غلط جذبہ کی وجہ سے نہیں لکھا گیا ہے اور نہ اس کا مقصد حضرت مجدد صاحب کی ذات سے کدورت و عداوت کا اظہار ہے بلکہ یہ تمام تر خیر خواہانہ اور اچھے جذبہ کے ماتحت لکھا گیا ہے اور اس کا مقصد اطمینان و شرح صدر اور زیر بحث مسئلہ کی حقیقت معلوم کرنا ہے جیسا کہ تحریر فرماتے ہیں:

اصل غرض نصیحت و خیر خواہی و کشف حال است الدین النصیحۃ۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۳۱۳)

خط کی اصل غرض نصیحت و خیر خواہی اور کشف حال ہے کیونکہ دین نصیحت ہے۔

یہاں اس کی وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ اعتراض و اختلاف کے باوجود نہ حضرت مجدد صاحب سے شیخ عبدالحق کے اخلاص و محبت میں کوئی کمی آئی تھی اور نہ ان کی عظمت و منزلت اور علوئے مقام میں کوئی فرق آیا تھا بلکہ خط تحریر کرنے کے وقت بھی ان کے دل میں حضرت شیخ احمد سرہندی کا مقام و مرتبہ پوری طرح جاگزیں تھا، خط کی ابتداء ان عربی کلمات سے کرتے ہیں:

ایھا الشیخ العالم الفاضل العارف الذی اجتباہ الیہ و خصہ بفضلہ و اعطاہ من المعارف مالم یعط غیرہ من العالمین۔ (ایضاً)

اے شیخ عالم و عارف فاضل جس کو اللہ نے اپنے فضل سے برگزیدہ و مخصوص کیا ہے اور اسے وہ معارف عطا کیے ہیں جن سے دنیا کے کسی اور شخص کو نہیں نوازا ہے۔

Marfat.com

اور آخر میں ان سے اپنے حسن ظن اور غیر معمولی محبت و یگانگت کا ذکر ان لفظوں میں فرماتے ہیں:

ظن فقیر بشیخ جمیل است این مقدار کہ مرا بشما نسبت محبت واتحاد است کم کسے را خواہد بود۔۔۔ نزد ایں فقیر شما ہم عزیز ید وہم طریقہ شما۔

فقیر کو شیخ سے حسن ظن ہے اور ان سے جس قدر محبت والفت اور اتحاد و یگانگت کا تعلق ہے کم ہی کسی سے ہوگا۔ اُس فقیر کے نزدیک آپ بھی عزیز ہیں اور آپ کا طریقہ بھی عزیز ہے۔ (ایضاً)

اس محبت واخلاص اور اعتراف فضل و کمال کے باوجود انہوں نے خیر خواہی کے جذبہ سے حضرت مجدد صاحبؒ کے مکتوب میں مجددیت و نبوت کے متعلق ظاہر کیے گئے خیالات کے بارہ میں وضاحت طلب کر کے اور استفسار فرما کر اپنے شکوک و شبہات کا ازالہ کرنے کے لئے یہ طویل مکتوب لکھا، ان کے خیال میں مجدد صاحب کی باتوں سے رسول اکرم ﷺ کی اہمیت کم ہوتی ہے اور ان کی عظمت مجروح ہوتی ہے نیز ان کے خیالات کے ڈانڈے مہدویت کے عقائد سے بھی جا ملتے ہیں، اس کے علاوہ ان کو اس پر بھی اعتراض تھا کہ مجدد صاحب کے اقوال و بیانات سے بعض بزرگوں کی تنقیص و تحقیر ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ کسی مرید کا درجہ چاہے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو جائے اور وہ اپنے پیر سے برتر ہی کیوں نہ ہو جائے مگر ادب واحتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان سے اپنے کو کمتر ہی تصور کرے اور اس کی عظمت واحترام کو نظر انداز نہ کرے۔

اگر چہ بایں اصطلاح ایں قوم ممکن است کہ مریدے در کمال از پیر درگزرد لیکن در رعایت ادب و بندگی و نیازمندی و فروتنی و حق شناسی باقیست شیخ علاء الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ در کشف تحقیقات معاملات و وقائع آیتی بود و معلوم می شود کہ دریں باب از پیران خود گزرنید است می گوید کہ اگر سر من بآسماں ساید ہنوز خاک آستانہ شیخ عبدالرحمٰن اسفرائنی و شیخ علی بالا شد بلند مرتبہ زیں خاک آستاں شدہ ام غبار کوئے توام گر بر آسماں شدہ ام۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۳۴۳)

گو ان لوگوں کی اصطلاح میں یہ ممکن ہے کہ کمال میں کوئی مرید پیر سے آگے نکل جائے لیکن پھر بھی ادب و بندگی اور نیازمندی و فروتنی کی رعایت کرنی چاہیے، شیخ علاؤالدولہ سمنانیؒ معاملات و وقائع کی تحقیقات کے کشف میں خدا کی ایک نشانی تھے اور یہ معلوم ہے کہ اس حیثیت سے وہ اپنے پیروں سے بڑھے ہوئے تھے مگر اس کے باوجود فرماتے تھے کہ اگر میرا سر آسمان پر بھی ہو جائے تو بھی شیخ عبدالرحمٰن اسفرائنی اور شیخ علی کے آستانہ کی خاک اس سے بلند و بالا رہے گی۔

شیخ عبدالحق فرماتے ہیں کہ ایسے مقدس بزرگوں کی شان میں بے ادبی و گستاخی کو طبیعت پر جبر کر کے گوارا کیا جا سکتا ہے مگر رسول ﷺ کے بارے میں ظاہر کیے گئے خیالات کو برداشت کرنا طاقت سے باہر ہے۔

اما سخنان کہ نسبت بحضرت کائنات ﷺ میگویند آنہا را تاب ندارد وانچہ نسبت بمشائخ گفتند کرہاً و جبراً برداشتہ شدہ است اما برداشت ایں کلمات از طاقت حال ایں فقیر بیرونست وہمیشہ دعائے فقیر در خلوت و جلوت بعد از صلوٰۃ در سائر اوقات این بودہ است اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ اللھم اجب۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۳۴۳)

سرور کائنات ﷺ کے متعلق مکتوب شریف میں جو باتیں کہی گئی ہیں انہیں برداشت کرنے کی کوئی تاب و طاقت نہیں خواہ مشائخ کے تعلق سے جو کچھ کیا گیا ہے اسے کرہاً و جبراً برداشت کر لیا جائے البتہ نبوت کی شان میں نازیبا کلمات کو گوارا کرنا اس فقیر کی طاقت سے باہر ہے اس فقیر کی تمام وقتوں کی نماز کے بعد خلوت و جلوت میں ہمیشہ یہ دعا رہتی ہے کہ اے اللہ! تو ہمیں حق کو حق اور باطل کو باطل دکھا اور ہمیں حق کے اتباع اور باطل سے اجتناب کی توفیق عطا فرما: اے اللہ! تو ہماری یہ دعا قبول فرما لے۔

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے دونوں بزرگوں کا اختلاف علمی و دینی تھا۔ اس میں ذاتی عناد، مخالفت اور بدنیتی کا کوئی

Marfat.com

شائبہ نہ تھا اور یہ معاصرانہ رشک وحسد سے پاک اور اخلاص وللّٰہیت پر مبنی تھا مگر متاخر مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اس اختلاف کی وجہ سے دونوں بزرگوں کے تعلقات خراب ہو گئے تھے، ان لوگوں نے ان واقعات کو ایسے رنگ میں پیش کیا ہے جس سے شیخ عبدالحق کی شخصیت مجروح ہوتی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت مجدد صاحب کے خیالات پر گرفت کر کے بڑی غلطی کی تھی، حالانکہ عموماً ایک ہی عہد کے نادرہ روزگار اشخاص میں اکثر علمی و دینی مسائل میں اختلافات رہے ہیں تاریخ کی کتابیں اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہیں اس بنا پر حضرت شیخ دہلوی اور حضرت مجدد صاحب میں اختلاف رائے کا ہونا نہ تو تاریخ کا کوئی نادر واقعہ ہے اور نہ تعجب انگیز، اس کی وجہ سے شیخ عبدالحق کو مطعون کرنا اور دونوں بزرگوں کے تعلقات کو کشیدہ بتانا غلط ہے کیونکہ حضرت شیخ کے مکتوب سے پوری طرح عیاں ہے کہ اسے تحریر کرنے کے وقت بھی ان کے دل میں مجدد صاحب کی عظمت واہمیت کارفرما تھی اور مجدد صاحب بھی شیخ کے معترف ومداح رہے۔

یہاں یہ بات ضرور تحقیق طلب ہے کہ حضرت شیخ عبدالحق کو حضرت مجدد صاحب کی جانب سے جو شکوک وشبہات ہو گئے تھے کیا وہ دور ہوئے یا نہیں اور شیخ نے اپنے خیالات سے رجوع کیا تھا یا نہیں؟

اس کے متعلق عام خیال یہی ہے کہ کچھ عرصہ کے لئے شیخ عبدالحق کو غلط فہمی ہوگئی تھی مگر جب وہ رفع ہوگئی تو انہوں نے اپنی رائے تبدیل کر لی اور اپنے خیالات سے رجوع کر لیا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں:

”شیخ عبدالحق کی مخالفت کسی غلط بیانی کی بنیاد پر یا کسی غلط فہمی کی نتیجہ میں پیدا ہوئی اور اس کا پردہ چاک ہونے یا غلط فہمی کے دور ہو جانے کے بعد رفع ہوگئی“۔ (تاریخ دعوت وعزیمت جلد چہارم ص ۳۳۶)

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم رقمطراز ہیں:

”معاصرت کی وجہ سے دونوں کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھیں جو بشریت کا تقاضا ہے اور ہر زمانہ میں ہوتا ہے۔ یہاں تو معمولی سوئے تفاہم ہوا تھا۔ جو بعد کو رفع ہوگیا اور تعلقات استوار ہو گئے“۔ (الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ص ۳۸)

مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی فرماتے ہیں:

”حضرت شیخ کی مخالفت چونکہ بدنیتی کے ساتھ نہ تھی، لہٰذا حق تعالیٰ نے ان کو بہت جلد تنبہ عطا فرمایا اور مخالفت سے رجوع کی توفیق دی بالآخر وہ بھی حضرت امام ربانی کے غایت درجہ معتقد ہو گئے“۔ (الفرقان مجدد الف ثانی نمبر ص ۷۷)

شیخ کے سوانح نگار پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے:

”عارضی طور پر شیخ محدث کو مجدد صاحب کے نظریات سے کچھ اختلاف پیدا ہوگیا تھا اور انہوں نے مجدد صاحب کی تردید میں ایک رسالہ بھی لکھا تھا جو ضمیمہ کے طور پر اس کتاب میں شامل ہے، اختلاف کی نوعیت کا اندازہ اس رسالہ کے مطالعہ سے لگایا جاسکتا ہے بعد کو جب شیخ مجدد نے اپنے خیالات کی وضاحت کی اور ان کے متعلق سب شبہات دور ہو گئے تو شیخ محدث کی رائے بھی بدل گئی، ان کا اختلاف نیک نیتی اور تحفظ شرع وسنت پر مبنی تھا، چنانچہ شکوک وشبہات رفع ہو جانے کے بعد انہوں نے انتہائی وسعت قلب کے ساتھ حضرت کے کارناموں کا اعتراف کیا“۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۲۳)

اس کے برخلاف شیخ محمد اکرام کے نزدیک غلط فہمی دور ہو جانے اور شیخ کے اپنے خیالات سے رجوع کر لینے کی بات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی، وہ فرماتے ہیں:

Marfat.com

''ابھی تک جو مواد ہمیں ملا ہے، اس کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ شیخ عبدالحق نے رسالے کے مضامین سے رجوع نہیں کیا، بلکہ جس مقصد سے انہوں نے یہ رسالہ لکھا تھا اسی کی تکمیل کے لئے اپنی ضخیم کتاب مدارج النبوۃ لکھی اور فی الواقع یہ مقصد شیخ کی علمی زندگی میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا''۔ (رودکوثر ص ۳۶۹)

دوسری جگہ وہ مدلل طور پر لکھتے ہیں:

''رجوع کی روایت کے متعلق یہ امر قابل غور ہے کہ یہ روایت صرف مجددی حلقوں میں مشہور ہے یا شیخ کی (بعد کی) کتابوں میں ملتی ہے، شیخ محدث کی کسی تصنیف میں اس کا ذکر نہیں، ان کے خاندان میں بیسیوں صاحب علم، صاحب تصنیف گزرے ہیں، ان کے صاحبزادے شیخ نورالحق ممتاز اہل قلم تھے ان کی کسی تحریر کا حوالہ نہیں دیا جاتا، آج سے ساٹھ، ستر سال پہلے ان کے خاندان کے ایک بزرگ نے شیخ محدث کی ایک مبسوط سوانح عمری مراۃ الحقائق کے نام سے شائع کی، اس میں شیخ کی تصنیفات کے ضمن میں رسالے کا اندراج بالوضاحت ہے۔'' جواب بعض کلمات حضرت مجدد الف ثانی قدس مرہ'' (ص ۴۶، ۴۷) لیکن رجوع کا کہیں کوئی ذکر نہیں''۔ (رودکوثر ص ۳۷۵)

مجددی سلسلہ کے لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت شیخ عبدالحق ؒ کے مکتوب میں حضرت مجدد ؒ کی جو باتیں نقل کی گئی ہیں وہ محرف اور غلط ہیں، یہ ایک نجی مکتوب تھا۔ حضرت شیخ نے اس کو اپنی کتاب المکاتیب والرسائل میں درج نہیں کیا، حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے ارشاد کے مطابق شیخ نے اس مکتوب کو ضائع کرنے کی وصیت کی، لیکن اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مکتوب کے مندرجات غلط ومحرف تھے اور شیخ نے واقعی اپنے اعتراضات سے رجوع کر لیا تھا تو پھر مجددی حضرات کو اس مکتوب کے جواب میں کتب ورسائل تالیف کرنے کی ضرورت کیوں پیش آتی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''اس مکتوب کے جواب میں بکثرت رسالے لکھے گئے جن میں شیخ بدرالدین سرہندی شیخ محمد یحییٰ (فرزند اصغر حضرت مجدد) شیخ محمد فرخ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور حضرت شاہ غلام علی دہلوی کا نام لیا جاسکتا ہے، مولانا وکیل احمد سکندر پوری نے ''ہدیہ مجددیہ'' کے نام سے ایک مستقل کتاب اس کے رد میں لکھی ہے جو ۳۳۶ صفحات پر مشتمل ہے''۔ (تاریخ دعوت وعزیمت جلد چہارم ص ۳۳۷ حاشیہ)

جن لوگوں کے خیال میں حضرت شیخ عبدالحق نے مجدد صاحب کے بارہ میں اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا، ان کی اہم دلیل وہ مکتوب ہے جو انہوں نے حضرت خواجہ باقی باللہ کے مرید وخلیفہ حضرت خواجہ حسام الدین احمد دہلوی کو تحریر فرمایا تھا اور جو اخبار الاخیار کے آخر میں درج ہے مگر اس سے بھی رجوع کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مجدد صاحب سے آج کل ان کا قلبی تعلق بہت بڑھ گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ بعض اسباب کی بنا پر یا مکتوبات امام ربانی کے مندرجات پر شیخ کے اعتراضات کی وجہ سے کچھ لوگوں کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ دونوں بزرگوں میں صلح وصفائی نہیں ہے شیخ عبدالحق اس کے ازالہ کی غرض سے فرماتے ہیں کہ میرے ان کے درمیان اس طرح کی کوئی بات ہی نہیں ہے بلکہ آج کل تو میرا دل ان کی جانب سے ہر قسم کے غل وغش سے پاک اور صاف ہے، میرے قلب کی حالت یہ ہوگئی ہے کہ:

درین ایام صفائی فقیر بخدمت میاں شیخ احمد سلمہ اللہ تعالیٰ از حد متجاوز است واصلا پردۂ بشریت وغشاوۂ جلیت بمیان نماند قطع،

Marfat.com

از رعایت طریقہ وانصاف وحکم عقل کہ باایں چنین عزیزاں وبزرگان بدنہ باید بود ودر باطن بطریق ذوق و وجدان وغلبہ چیزے افتادہ است کہ زبان از تقریر آں لال است سبحان اللہ مقلب القلوب ومبدل الاحوال شاید ظاہر بیناں استبعاد کنند من نمید انم کہ حال چیست وبچہ منوال است۔ (خاتمہ اخبار الاخیار ص ۳۰۵)

میاں شیخ احمد سلمہ اللہ کی طرف سے آج کل فقیر کے دل میں صفائی بہت زیادہ ہے بشریت کا کوئی پردہ اور انفاذ طبع کا کوئی شائبہ درمیان میں حائل نہیں رہا، اس سے قطع انصاف ومعقولیت کی رعایت اور عقل کے فیصلہ کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے عزیزوں اور بزرگوں کے ساتھ براخیال نہیں ہونا چاہیے، میرے دل میں ذوق ووجدان اور غلبہ کی بنا پر ایسی کیفیت ہوگئی ہے کہ اس کے بیان سے زبان قاصر ہے، دلوں کو پلٹنے اور احوال کو تبدیل کرنے والا اللہ پاک ہے، شاید ظاہر بینوں اس پر یقین نہ ہو، میں خود بھی نہیں جانتا کہ کیا حال ہے اور کیوں ہے۔

شیخ محمد اکرام نے اس مسئلہ پر بہت مفصل اظہارِ خیال کیا ہے اور دکھایا ہے کہ اس رقعہ میں رجوع کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے، ان کے تین نکات قابل توجہ ہیں لکھتے ہیں:

''یہ روایت مجددیہ سلسلے میں کافی پرانی ہے، لیکن معاصرانہ اور معتبر تذکروں یعنی زبدۃ المقامات اور حضرات القدس میں نہیں، اس کا سب سے قدیمی بیان جو ہماری نظر سے گزرا ہے، روضۃ القیومیہ میں (دفتر اول ص ۲۱۱ پر) ہے جہاں حضرت خواجہ کلاں (خلف ارشد حضرت خواجہ باقی باللہ کی کلیات) کے حوالے سے شیخ محدث کا ایک رقعہ خواجہ حسام الدین کے نام کا درج ہے جس کا مضمون تتمہ اخبار الاخیار والے مندرجہ بالا رقعہ سے ایک حد تک ملتا ہے، چونکہ حضرت خواجہ کلاں نے خواجہ حسام الدین کی سوانح عمری لکھی تھی، اس لئے ان کی کلیات میں موصوف کے نام کے رقعات کا ہونا مستبعد نہیں (ممکن ہے کلیات خواجہ کلاں کا کوئی نسخہ دستیاب ہو جائے اور حقیقت حال پر زیادہ روشنی پڑ سکے) روضۃ القیومیہ میں مندرجہ رقعہ اور تتمہ اخبار الاخیار والے رقعہ میں صرف ایک حد تک اشتراک ہے (شاید اختلاف مضمون کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے سامنے روضۃ القیومیہ کا صرف اردو ترجمہ ہے) لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ روضۃ القیومیہ میں یہ رقعہ کسی ''رجوع'' کی تائید میں نقل نہیں ہوا بلکہ مصنف نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شیخ محدث آنجناب (یعنی حضرت مجدد الف ثانی) کی تجدید اور قیومیت کے معترف تھے۔

''اس کے بعد ''رجوع'' کی روایت عام ہونی شروع ہوئی اور شیخ عبدالحق محدث کے رقعہ بنام خواجہ حسام کو اس روایت کی تائید میں پیش کیا گیا، تتمہ اخبار الاخیار (مجتبائی) میں لکھا ہے ''رجوع شیخ مشہور و برالسنۃ ثقات مذکور'' مجتبائی پریس سے اخبار الاخیار ۱۳۳۲ھ یعنی ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی، اس کے بعد عام طور پر اس روایت کو دہرا دیا جاتا ہے، چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی تذکرہ میں اسی خیال کا اظہار کیا'' (رود کوثر ص ۲۶۳ طبع چہارم)

آگے اس کو مزید صراحت سے لکھتے ہیں:

''جہاں تک خواجہ حسام الدین کے نام کا رقعہ ہے، روضۃ القیومیہ کی عبارت دیکھنے کے بعد یہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ جو رقعہ تتمہ اخبار الاخیار میں نقل کیا گیا اس سے ملتا جلتا کوئی رقعہ شیخ محدث نے کسی وقت خواجہ حسام الدین کے نام لکھا، یہ رقعہ ہم نقل کر چکے لیکن اس رسالے سے ''رجوع'' اخذ نہیں ہوتا زیادہ سے زیادہ صفائی کا خیال ہو سکتا ہے۔ شیخ محدث نے جس طرح کا رسالہ لکھا تھا

Marfat.com

اور مشتہر کیا تھا، اگر اس کو وہ غلطی سمجھتے تھے تو اعتراف سہو بھی علانیہ ہونا چاہیے تھا، اس کے علاوہ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ رقعہ رسالے کی تالیف کے بعد لکھا گیا'' (ایضاً ص ۳٦٦)

پھر تحریر فرماتے ہیں:

''اخبار الاخیار (مجتبائی) والے رقعہ کی نسبت یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں حضرت مجدد سے جتنی ارادت کا ذکر ہے اس سے زیادہ شیخ محدث رسالہ لکھتے وقت ظاہر کر چکے تھے لیکن یہ ارادت رسالہ لکھنے میں مانع نہ ہوئی، اس خط میں بھی ''میاں احمد سرہندی'' کو مجدد نہیں کہا گیا اور بہر کیف اگر کسی باطنی اشارے کی بنا پر حضرت مجدد سے شیخ کی عقیدت بڑھ گئی ہو تب بھی رسالے میں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے شیخ عبدالحق جیسا عاشق رسول ''رجوع'' کرے'' (رود کوثر طبع چہارم ص ۳٦۹)

شیخ محمد اکرام کا خیال یہ بھی ہے کہ شیخ عبدالحق کی اس رسالہ کی تالیف کا جو مقصد ہے اسی کی تکمیل کے لئے انہوں نے مدارج النبوۃ بھی لکھی تھی، ان کے زمانے میں مہدویت، قیومیت اور عقلیت کے طرفداروں نے عقائد و خیالات میں الجھنیں ڈال رکھی تھیں، شیخ نے ان سب کا علاج یہی سوچا کہ نبوت کی عظمت وحقیقت کو نمایاں کیا جائے، شیخ محمد اکرام نے مدارج النبوۃ کے بعض اقتباسات نقل کر کے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ان کا روئے سخن حضرت مجدد صاحب کی طرف ہے گویا اس کی تصنیف کا مقصد بھی حضرت مجدد صاحب کے خیالات کی تردید تھا۔

رجوع کے مسئلہ سے قطع نظر، اب بھی یہ ایک اہم اور ضروری سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا شیخ عبدالحق کے اعتراضات بجا تھے؟ اور واقعی مجدد صاحب کے اقوال و بیانات میں قابل اعتراض اور لائق تردید باتیں تھیں اور ان سے عقیدہ نبوت و رسالت پر زد پڑتی تھی۔

عام خیال یہی ہے کہ شیخ عبدالحق کو اس معاملہ میں غلط فہمی ہو گئی تھی جس کا باعث مجدد صاحب کا ''اظہار مقامات'' تھا، ان کے خیال میں مکاشفات باطنی کا اس طرح اظہار مناسب اور خلاف مصلحت تھا، حضرت شاہ غلام علی کا خیال ہے کہ شیخ محدث نے اعتراضات بطریق علمائے ظاہر کیے تھے، حضرت مجدد کے متعلقہ بیانات بطور اہل باطن کے تھے۔ (ایضاً ص ۳٦۸)

لیکن یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ حضرت شیخ عبدالحق کا پایہ تصوف وسلوک میں بھی بہت بلند تھا اس لئے ان کو اس طرح کے مکاشفات اور اظہار مقامات کی وجہ سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے تھی، اسی لئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ایک اور انداز سے اس کی توجیہ کی ہے حالانکہ شیخ عبدالحق کی شریعت وطریقت اور علم ظاہر و باطن دونوں کی جامع تھی مولانا فرماتے ہیں:

''نیز انہوں نے جن نئے علوم وتحقیقات کا اپنے مکتوبات اور مجالس کے ذریعہ اضافہ فرمایا جن میں بہت سے عوام تو عوام خواص کے لئے بھی نامانوس اور ایک حد تک (اگر موجب وحشت نہیں تو) موجب حیرت ضرور تھے، اور ان میں بہت سے ان حلقوں کے مسلمات کے خلاف تھے نسل درنسل منتقل ہوتے چلے آرہے تھے اور یہ معاملہ اکثر ان نادرۂ روزگار شخصیتوں کے ساتھ پیش آیا ہے جو کسی علم وفن کی مجتہد اور کسی سلسلۂ وطریق کی بانی اور اپنے زمانہ کی عام علمی، ذہنی و باطنی سطح سے بلند ہوتی ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ علوم وکمالات وہبی سے نوازتا ہے اور وہ عام اصطلاحات اور قدیم تعبیرات کے دائرہ سے باہر قدم نکالتی ہیں''

(تاریخ دعوت وعزیمت ج ۴ ص ۳۳۵، ۳۳٦)

Marfat.com

تقلید میں شدت اور حقیقت میں غلو و تعصب کا الزام:

نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اپنی مختلف کتابوں میں حضرت محدث کا تذکرہ کیا ہے اور گو عموماً انہوں نے ان کے کمالات کا اعتراف کیا ہے مگر ہر جگہ حنفیت میں ان کے غلو و تعصب کا ذکر بھی کیا ہے باوجودیکہ انہیں اس کا اعتراف ہے کہ حضرت محدث ہی کی بدولت ہندوستان میں احادیث کی عام نشر و اشاعت ہوئی۔ (الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۷۰ طبع نظامی کانپور ۱۲۸۳ء) مگر پھر بھی وہ انہیں حدیث میں قلیل البضاعت بتاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ شیخ کو زیادہ دستگاہ اور اصل مہارت حنفی فقہ میں تھی، ہم حدیث میں شیخ عبدالحق محدث کی بلند پائیگی پر مفصل بحث کر چکے ہیں اس سے اس اعتراض کی مکمل تردید ہو جاتی ہے اس بنا پر یہاں صرف فقہی عصبیت ہی کے بارہ میں مختصر بحث و گفتگو کی جائے گی۔

نواب صاحب فرماتے ہیں:

"حنفی مذہب کے معاملہ میں وہ متعصب تھے۔ تقلید میں شدت اور مجرد رائے سے اپنے مذہب و مسلک کے تحفظ کی خاطر احادیث کی تاویل کرنے پر اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے"۔ (ابجد العلوم ص ۹۰۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں ان کی تصنیفات نہایت مقبول و مشہور ہیں اور یہ سب کی سب مفید اور نافع ہیں مگر مذہبی تعصب سے خالی نہیں ہیں"۔ (اتحاف النبلاء ص ۳۰۴)

یہاں تک کہ وہ حضرت مجدد صاحب سے ان کے اختلاف کو بھی تقلید مذہب اور ان کے غیر معمولی تعصب ہی کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں، ملاحظہ ہو:

"اختلاف کا سبب یہ تھا کہ حضرت شیخ فقہی مذہب کی تقلید میں بڑے متعصب تھے اور حضرت مجدد صاحب اتباع سنت، رد بدعت اور شریعت و طریقت کے معاملہ میں متعصب اور سخت تھے، یہ دونوں چیزیں ایک ہی موڑ پر کیسے یکجا ہو سکتی ہیں"
(ایضاً ص ۳۰۵)

تقصار جیود الاحرار میں بھی انہیں اہل رائے کے معاملہ میں جانبداری کرنے والا اور پیچ سے کام لینے والا بتایا ہے۔
(ایضاً ص ۱۱۲)

ان اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے:

1. شیخ عبدالحق متشدد و متعصب مقلد اور غالی و متعصب حنفی تھے۔
2. اپنے مذہب کی حمایت کے جوش میں محض قیاس و رائے سے حدیث کی بیجا تاویل و توجیہ کرتے۔
3. اسی غلو اور حنفی عصبیت کی بنا پر انہوں نے مجدد الف ثانی کی مخالفت کی تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ شیخ عبدالحق دہلوی مسلکاً حنفی تھے اور تقلید کے بھی قائل تھے انہوں نے حنفی مذہب کو عقلاً و نقلاً قوی، مرجح اور حدیث کے موافق ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے اور اس عام خیال کی تردید بھی کی ہے کہ فقہ حنفی مجرد رائے اور ظن و قیاس پر مبنی ہے اور یہ بتایا کہ وہ کتاب و سنت کی روح کے مطابق اور ان سے قریب تر ہے۔

شیخ عبدالحق نے حنفی مذہب کی تائید و ترجیح کی باوجود دوسرے ائمہ و مجتہدین کے مذاہب اقوال اور دلائل بیان کرنے میں

Marfat.com

کوتاہی نہیں کی ہے بلکہ بعض مسائل میں انہوں نے حنفی مذہب ہی کی طرح دوسرے مذاہب کے دلائل کی قوت و وزن کو بھی تسلیم کیا ہے، ان کے نزدیک تمام فقہی مذاہب کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں اور برحق ہیں، وہ جن مسائل میں حنفی مذہب کی پرزور تائید کرتے ہیں ان میں بھی اعتدال و توازن کی شاہراہ پر قائم رہتے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ اور فقہائے احناف کی طرح دوسرے ارباب فقہ اور فقہی مذاہب کے ائمہ و اساطین کا ذکر بھی بڑے ادب و احترام سے کرتے ہیں، انہوں نے ان ائمہ کے تذکرے بھی اپنی کتابوں میں قلمبند کیے ہیں۔

اپنے مذہب کی تائید و ترجیح کے باوجود جب وہ دوسرے بزرگوں کی تنقیص و تحقیر نہیں کرتے تو ان کو متشدد غالی حنفی قرار دینا بیجا ہے۔

اسی طرح شیخ کی جانب تقلید کے مسئلے میں شدت کی نسبت بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ جزئی و فقہی مسائل پر بحث و گفتگو کرتے وقت آنکھ بند کر کے حنفی مذہب کی تائید نہیں کرتے بلکہ ہر ہر موقع پر کتاب و سنت کے دلائل کا بھی انبار لگا دیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ شیخ کے زمانہ میں جو فقہی تعصب و جمود عام تھا اور جس کی وجہ سے حدیث و سنت کا علم پس پردہ ہو گیا اور اس سے بعد بہت بڑھ گیا تھا شیخ نے کتب حدیث کے درس و مطالعہ کو رواج دے کر اور ان کی شروح و حواشی قلمبند کر کے اس جمود تعطل کو ختم کرنے کی کوشش کی اس طرح وہ مقلد ہونے کے بجائے جامد اور متشدد مقلد نہ تھے۔

(۲) حدیثوں کی من مانی تاویل کی بات بھی صحیح نہیں ہے، شیخ عبدالحق نے اس کی کوشش تو ضرور کی ہے کہ حنفی مذہب کو نقلی حیثیت سے بھی مدلل کر کے پیش کریں اور یہ دکھائیں کہ وہ حدیث کے خلاف نہیں ہے مگر اسے کھینچ تان کر حدیث کو اپنے مذہب کے موافق بنانا نہیں کہا جا سکتا، اگر کہیں غیر شعوری طور پر بلا قصد و ارادہ ایسا واقعتاً ہوا بھی ہو تو چونکہ شیخ کا عام طریقہ اس کے برعکس ہے اس لیے محض چند مثالوں کی وجہ سے یہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مجرد رائے و قیاس سے حدیث کی تاویل کرتے تھے اور یہ ان کا عام شیوہ تھا نواب صاحب خود ایک مذہب و مسلک سے وابستہ تھے ممکن ہے ان کا یہ تاثر اسی مذہب سے وابستگی کا نتیجہ ہو۔

(۳) حضرت مجدد صاحب خود مسلکاً حنفی تھے، ان سے شیخ کا اختلاف حنفیت میں غلو و تعصب کی بنا پر نہیں تھا بلکہ دراصل مجدد صاحب کے نظریہ قیومیت اور نبوت کے متعلق ان کے بعض آراء و خیالات کی وجہ سے انہیں اختلاف تھا، معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کے مکتوب کا علم نواب صاحب کو نہ تھا ورنہ وہ اس طرح کا بے بنیاد الزام عائد نہ کرتے۔

وفات اور مقبرہ:

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی وفات دوشنبہ ۲۳، ربیع الاول ۱۰۵۲ھ کو دار السلطنت دہلی میں ہوئی، فخر العالم سے تاریخ وفات نکلتی ہے، وفات کے وقت آپ کی عمر چورانوے برس تھی، بختاور خاں لکھتے ہیں:

> درسنہ یک ہزار و پنجاہ و دو رحلت فرمود فخر العالم تاریخ وفات ست، علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل نیز از انتقال آنصاحب کمال خبر میدہد۔ (مراۃ العالم ج ۲ ص ۴۴۴)

۱۰۵۲ھ میں شیخ عبدالحق نے رحلت فرمائی۔ فخر العالم تاریخ وفات ہے "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" سے بھی اس صاحب کمال کے انتقال کا پتہ چلتا ہے۔

Marfat.com

شاہ نواز خاں نے بھی مراۃ آفتاب نما میں یہی تاریخ لکھی ہے، متاخر تذکرہ نگاروں نے بھی یہی لکھا ہے، (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۱۰) مگر مفتی غلام سرور لاہوری کا بیان ہے:

وفات شیخ عبدالحق بقول صاحب مخبر الواصلین و دیگر اقوال صحیح در سال یک ہزار و پنجاہ و یک است بعہد شاہجہانی۔

(خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۱۶۴)

صاحب مخبر الواصلین کے قول نیز دوسرے صحیح اقوال کے مطابق شیخ عبدالحق کی وفات شاہجہاں کے دور میں ۱۰۵۱ھ میں ہوئی۔

صاحب مخبر الواصلین کے علاوہ مولوی کبیر احمد صاحب پھلواروی نے شیخ محدث کی تاریخ وفات میں جو اشعار کہے ہیں ان سے ۱۰۵۱ھ ہی نکلتا ہے۔ (تاریخ الکملاء ص ۴۰)

خافی خاں نے سب کے برخلاف "زیادہ از صد سال مرحلہ عمر طے نمودہ" (منتخب اللباب ج ۱ ص ۲۴۰) لکھا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انتقال کے وقت ان کا سن ۱۰۰ برس سے بھی زیادہ تھا مگر بختاور خاں کے بیان ہی کو عام طور پر صحیح اور مرجح مانا جاتا ہے۔

ان کی وصیت کے مطابق ان کے فرزند شیخ نورالحق نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور حوض شمسی کے قریب پاک اور مغفور لوگوں کے پہلو میں دفن کیے گئے، قبر پر ایک لوح لگانے کی وصیت بھی فرمائی تھی، شیخ نورالحق نے یہ تختی بھی لگائی اور اس میں تاریخ ولادت وفات اور مختصر حالات بھی جامعیت کے ساتھ تحریر فرمائے، ان کی قبر آج بھی زیارت گاہ خلائق ہے، نواب صدیق حسن خان نے دوبار اس کی زیارت کی تھی اور انہیں اس جگہ عجیب کشش اور دل بستگی حاصل ہوئی تھی، کہتے ہیں:

ولما وزدت بدہلی حضرت علی مزارہ وزرتہ فوجدت موضع البقر مونسا بردا۔

میں دہلی گیا تو ان کے مزار پر حاضر ہوا اور قبر کی زیارت کی، قبر کی جگہ پر مجھے بڑی انسیت ملی۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

بندہ عاجز در دہلی بر تربت شریف اور سیدہ نمی تواند گفتن کہ کدام روح و ریحان برکاتش مشاہدہ نمودہ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

(تقصار جیود الاحرار ص ۱۱۳)

یہ عاجز بندہ دہلی میں ان کی تربت پر پہنچا تو کہہ نہیں سکتا کہ ان کی برکتوں کی کیسی فرحت بخش خوشبو اور لذت مشاہدہ میں آئی۔

الیٹ نے اپنی تاریخ ہند میں تحریر کیا ہے کہ شیخ عبدالحق نے اپنا مقبرہ خود ہی تعمیر کرایا تھا اور وہ اسی میں دفن ہوئے مگر سرسید احمد خان کا بیان ہے کہ: "یہ مقبرہ آپ کے انتقال کے بعد بنا ہے" (آثار الصنادید ص ۹۵ مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق پاکستان میڈیکل سوسائٹی کراچی) مراۃ الحقائق میں ہے کہ مہابت خان سپہ سالار افواج شاہجہانی نے یہ مقبرہ شیخ کی زندگی ہی میں تعمیر کرایا تھا۔

(بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۷۲)

اولاد و احفاد:

شیخ محدث کی نسل کے ذریعہ ان کے بعد بھی ان کا علمی فیض جاری رہا ان میں متعدد ایسے اصحاب فضل و کمال ہوئے، جنھوں نے تصنیف و تالیف اور درس و افادہ کا سلسلہ شیخ کے بعد مدتوں جاری رکھا سات پشتوں تک مسلسل ان کی اولاد علمی و دینی خدمات انجام دیتی رہی اور اس کی بدولت ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں دینی علوم خصوصاً حدیث کی اشاعت و ترویج ہوئی،

Marfat.com

عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے: ''از اعقاب او ہفت تن تحصیل علوم رسمیہ نمودہ بافادہ مشغول اند'' (بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۳۴۴) ذیل میں ان کی اولاد واحفاد کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے، ان میں جو لوگ علم حدیث میں زیادہ ممتاز اور صاحب تصنیفات تھے ان کا علیحدہ سے آگے تذکرہ ہوگا۔

شیخ محدث کی جسمانی یادگار تین فرزند تھے جو حسب ذیل ہیں:

۱: شیخ نور الحق: یہ حضرت شیخ عبدالحق کے سب سے بڑے صاحبزادے اور ان کے علمی کمالات کے وارث اور جانشین تھے، ان کا شیخ کے تذکرہ کے بعد علیحدہ سے کسی قدر مفصل ذکر آئے گا اور اس ضمن میں ان کے اولاد واحفاد کا تذکرہ بھی ہوگا۔

۲: شیخ علی محمد: یہ شیخ عبدالحق کے دوسرے فرزند تھے جو اپنے زمانہ کے فضلا میں شمار کیے جاتے تھے، ان کی ولادت ونشوونما دہلی میں اپنے والد بزرگوار کے زیر سایہ ہوئی، یہ برابر ان کے ساتھ رہتے تھے اور انہوں نے ان سے بڑا فیض بھی حاصل کیا تھا، درسی کتابیں بھی اپنے والد ہی سے پڑھی تھیں، ان کی مندرجہ ذیل تین کتابیں متداول رہی ہیں:

۱: خزائن الدرر، عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کا لغت ہے۔

۲: رسالہ احوال پنج پیرانِ چشت: اس میں مندرجہ ذیل پانچ بزرگانِ چشت کے حالات تحریر کیے ہیں۔

(۱) خواجہ معین الدین چشتی۔ (۲) قطب صاحب۔ (۳) بابا فرید۔ (۴) محبوب الٰہی۔ (۵) چراغ دہلوی

۳: نجات المریدین: مراۃ الحقائق کی صراحت کے مطابق یہ رسالہ شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات پر مشتمل ہے۔

(نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۸۸)

شیخ علی محمد کے بیٹے شیخ ابوالمفاخر تھے، ان کے تین بیٹے ہوئے۔

(پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شیخ علی محمد کے اولاد واحفاد کا شجرہ دیا ہے ملاحظہ ہو حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۵۵)

☆ ابوالمکارم تقی الدین محمد ہاشم: یہ شیخ محدث کے تیسرے صاحبزادے تھے، جو جید عالم اور زاہد مرتاض بزرگ تھے، علم کی طرح عمل میں بھی بلند تھے۔ دہلی میں ولادت اور نشوونما ہوئی، اپنے والد کی صحبت میں رہ کر علم وفن کی تحصیل کی، فقہ وحدیث میں بڑی مہارت تھی، والد ہی نے ان کو اجازت وسند عطا کی تھی، (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۹۴) شیخ عبدالحق محدث نے اپنی تصنیف وتالیف القلب الالیف میں تحریر فرمایا ہے کہ:

''فرزند عزیز محمد ہاشم بھی علم وفضل میں اپنے بھائی نور الحق کے پیچھے پیچھے ہیں، جودت وسلامتی طبع کے علاوہ علم وعمل خصوصاً حدیث شریف کے علم میں موصوف وممتاز ہیں اللہ تعالیٰ انہیں بلند مراتب پر فائز کرے''۔

(بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۳۲۷)

شیخ محمد ہاشم کے ایک فرزند محمد عاصم کے متعلق شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے ایک گرامی نامہ میں شیخ نور الحق کو جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اپنے پوتے سے خاص تعلق اور وابستگی تھی۔

(کتاب المکاتب والرسائل مکتوب آخر بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۲۸)

محمد عاصم سے محمد محتشم اور ان سے محمد معتصم تولد ہوئے۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی شجرہ ص ۲۵۵)

Marfat.com

تصنیفات:

شیخ عبدالحق کو اللہ تعالیٰ نے تصنیف و تالیف کا بڑا اچھا ذوق عطا کیا تھا، انکی زندگی کا زیادہ حصہ تصنیف و تالیف میں بسر ہوا، بڑھاپے میں بھی انکے علمی انہماک اور تصنیفی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی، عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے کہ: ''جلوس کے دسویں سال ۱۰۴۷ء میں ان کی عمر ۹۰ سال کی ہوگئی تھی لیکن اسکے باوجود انکے ظاہری و باطنی حالات میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا تھا عبادات، اوراد، ذکر و تلاوت نیز تعلیم و تصنیف اور تصحیح کتب کا التزام اسی نہج پر جاری تھا، جیسے جوانی میں تھا''۔ اسی لیے انہوں نے تصنیفات کا بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے، جن کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو بتائی جاتی ہے، گو ان میں سے بعض کتابوں کا اب نام بھی معلوم نہیں ہے اور متعدد کتابیں ناپید اور معدوم ہیں، تاہم اس سے ان کے تصنیفی کام کی وسعت و کثرت کا اندازہ ہوتا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ اللہ نے ان کو کیسی غیر معمولی قوت و صلاحیت بخشی تھی اور ان کے وقت میں کتنی برکت عطا کی تھی، اسی لیے وہ مصنفین اور علمائے اسلام میں تصانیف کی کثرت کے لحاظ سے منفرد اور یکتا خیال کیے جاتے ہیں۔

شیخ عبدالحق کی تصنیفات علمی و تحقیقی حیثیت سے بلند پایہ ہیں، ان میں بڑی تلاش و جستجو کافی محنت و کاوش اور پوری تحقیق و تدقیق سے مواد فراہم کیا گیا ہے، انہوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اس کا حق ادا کر دیا ہے، زیر بحث موضوع کی تمام کتب اور اس سے متعلق سارا مواد ان کے پیش نظر ہوتا تھا اور جو کچھ لکھتے تھے بڑے غور و مطالعہ کے بعد لکھتے تھے اس لیے انکی تصنیفات موضوع کے تمام پہلوؤں اور گوشوں کا احاطہ کر لیتی تھیں خصوصاً فن حدیث سے متعلق انکی تصنیفات بڑی محنت و تحقیق اور کدو کاوش کا نتیجہ ہیں، انکی کوئی بھی کتاب علمی و تحقیقی حیثیت سے کمتر اور ساقط الاعتبار نہیں ہے۔

شیخ نے بکثرت موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں جن کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے ہی سے ان کے ذوق کے تنوع، علمی تبحر، ذہن رسا، جودت طبع اور تصنیف و تالیف کے سلیقہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

انکی کتابوں کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ ان میں ان کے عہد کے میلانات و رجحانات کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور جو شکوک و شبہات دین کے بارہ میں اس عہد میں پیدا ہو رہے تھے انکی تردید کی گئی ہے، اسی لیے انکی تصنیفات میں اکبر کے فتنوں اور اس زمانہ کے باطل افکار کو جواب بھی دیا گیا ہے اور مشائخ و صوفیہ کو ان کے احکام و فرائض بھی یاد دلائے گئے ہیں اور یہ تاکید کی گئی ہے کہ وہ مریدوں کی باطنی اصلاح و تزکیہ پر پوری توجہ مبذول کریں، امراء و حکام کو بھی احیائے دین اور بدعات کے سدباب کی تلقین کی گئی ہے۔

شیخ کا طرز نگارش باوقار عالمانہ اور سلیس و شگفتہ ہے، مضمون کے مناسب زبان ہوتی ہے وہ اگرچہ مواد پر زیادہ زور دیتے ہیں تاہم طرز تحریر کو بھی نظر انداز نہیں کرتے کتابوں کی ترتیب و تبویب میں بھی بڑے سلیقہ سے کام لیتے ہیں، عربی الفاظ بکثرت استعمال کرتے ہیں، لیکن ان کا استعمال قارئین کو گراں نہیں گزرتا بلکہ اس سے فارسی عبارت کے زور و وقار میں اضافہ ہوتا ہے، ان کو عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے میں بڑی مہارت اور کمال حاصل تھا اور اس حیثیت سے وہ اپنے زمانہ میں یکتا اور منفرد تھے انکی تصنیفات کی تین نوعیتیں ہیں:

(۱) خود براہ راست کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔

Marfat.com

(۲) کتابوں کے شروح وحواشی لکھے۔

(۳) ترجمے کیے یعنی فارسی میں کتابیں منتقل کیں۔

ان کی تحریریں ماقل و مادل اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھیں اور ان میں بڑی سلاست و روانی ہوتی تھی کہیں کوئی الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں ہوتی تھی وہ کم سے کم لفظوں میں اختصار کے ساتھ اپنا مدعا بیان کرتے ہیں، اتنی ساری کتابیں لکھنے کے باوجود کہیں بیجا اطناب اور نامناسب طول بیان نہیں ہوتا، ان خوبیوں کی وجہ سے انکی تصنیفات کو بڑی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی اور اہل علم نے بھی انکو بہت پسند کیا اور انکی جانب خاص توجہ و اعتنا کی' ان کے فرزند شیخ نورالحق لکھتے ہیں ''فنونِ علمیہ بالخصوص فن حدیث میں معتبر کتابیں تصنیف کیں، علمائے زمانہ نے ان کی جانب اسقدر اور اس حد تک اعتنا کیا کہ ان کو اپنا دستورالعمل بنایا اور خاص و عام لوگوں نے ان کو حرزِ جان بنایا۔

بعد کے مورخین اور تذکرہ نگاروں نے بھی ان کی تصنیفات کی مقبولیت اور حسن قبول کا اعتراف کیا ہے، ذیل میں حروف تہجی کی ترتیب سے ان کے نام نقل کیے جاتے ہیں اور ان کا مختصر تعارف بھی کرایا جاتا ہے، مشکوٰۃ کی شرحوں کا ذکر آخر میں آئے گا۔

(۱) اجازۃ الحدیث فی القدیم والحدیث: اس رسالہ میں اپنی اسناد حدیث درج کی ہیں مگر یہ دستیاب نہیں مراۃ الحقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قلمی نسخہ مولوی انوارالحق کے کتب خانہ میں تھا، بعض لوگوں نے اسی رسالہ کا نام ذکر اجازات الحدیث فی القدیم والحدیث لکھا ہے، (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۴) مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی مرحوم نے اسماء الاساتذہ کے نام سے بھی انکی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے۔ (ایضا)

(۲) اجوبۃ الاثنا عشری توجیہ الصلوٰۃ علی سید البشر: یہ مختصر رسالہ شیخ نے ایک ہی نشست میں سحر کے وقت تحریر کیا تھا اس میں درود شریف: اللھم صل علی محمد و علی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم کی تشبیہ پر بحث و گفتگو کی ہے، اس کا قلمی نسخہ بھی مولوی انوارالحق دہلوی کے کتب خانہ میں ۱۹۰۲ء تک موجود تھا۔ (بحوالہ مراۃ الحقائق ص ۴۸)

(۳) احوال الائمۃ الاثنا عشر: یہ رسالہ حضرت خواجہ محمد پارسا کی مشہور کتاب فصل الخطاب سے ملخص ہے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۵) اس کا قلمی نسخہ بانکی پور کے کتب خانہ میں موجود ہے، اس میں بارہ ائمہ کے حالات درج ہیں، اس کا تاریخی نام ''دم خاندان کرم'' ہے، جس سے ۱۰۱۰ھ تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۰۴)

(۴) اخبارالاخیار: یہ ہندوستان کے علماء و مشائخ کا ایک مستند تذکرہ ہے اس میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے زمانہ سے لے کر اپنے دور تک کے صوفیہ و اخیار کے حالات لکھے ہیں، ابتدا میں تبرکا اور عقیدت کی وجہ سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا تذکرہ بھی کیا ہے، جن کے سلسلہ قادریہ میں شیخ کئی بزرگوں سے بیعت تھے، اخبار الاخیار میں ہندوستانی بزرگوں کے حالات تاریخی ترتیب سے لکھے ہیں اور اسکی ترتیب مندرجہ ذیل تین طبقوں پر ہے: پہلے طبقہ میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری اور ان کے معاصرین اور مریدین وخلفا کے حالات دیئے ہیں، اور دوسرے میں بابا فرید گنج شکر اور انکے ہمعصر بزرگوں اور مریدوں کا تذکرہ ہے اور تیسرے طبقہ میں حضرت خواجہ نصیرالدین چراغ دہلوی اور ان کے سلسلہ میں بزرگوں اور معاصرین کے تراجم قلمبند کیے ہیں پھر مجاذیب اور اصحاب عرفان خواتین کا ذکر کیا ہے، آخر میں ایک تکملہ ہے، اس میں اپنے آباؤ اجداد اور خود اپنے نجی و ذاتی حالات لکھے ہیں۔

Marfat.com

اخبار الاخیار کو شیخ عبدالحق نے بڑی محنت و تحقیق اور غیر معمولی کاوش اور دیدہ ریزی سے لکھا ہے اور اس سے انکے وسعت مطالعہ اور علمی تبحر کا بھی اندازہ ہوتا ہے اس کی بعض نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

(۱) حتی المقدور مستند واقعات لکھے ہیں اور کشف و کرامات کے قصوں اور خرافات سے پرہیز کیا ہے، بزرگوں کے حالات و واقعات کے بیان میں عموماً غلو و افراط سے کام لیا جاتا ہے لیکن شیخ نے اس سے اپنے کو محفوظ رکھا ہے، عقیدت کے باوجود انہوں نے واقعات کی تحقیق اور چھان بین میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔

(۲) مصنف نے صرف سادہ حالات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ صاحب تصانیف صوفیہ کی کتابوں کے اقتباسات بھی دیئے ہیں اور بعض بزرگوں کے اقوال و ملفوظات اور مکتوبات وغیرہ بھی نقل فرماتے ہیں اس کی وجہ سے جہاں مصنف کے ذوق و رجحان کا اندازہ ہوتا ہے وہاں ان کے تذکرہ کے مستند اور بلند پایہ ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

(۳) یہ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے اور مختلف علاقوں کے صوفیہ کا تذکرہ ہے۔

(۴) یہ کتاب محض بزرگانِ دین کا تذکرہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے علم و معرفت کی گوناگوں مفید باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں اور تصوف و سلوک کی دقیق اصطلاحات اور رموز و اسرار کے بارہ میں واقفیت ہوتی ہے۔

(۵) عبارت سلیس و فصیح اور طرزِ ادا نہایت بلیغ و موثر ہے۔

(۶) غیر ضروری تفصیل اور جزئی واقعات کو نظر انداز کرنے کے باوجود کوئی اہم اور ضروری بات چھوڑی نہیں گئی ہے۔

اخبار الاخیار شیخ کی اہم، کامیاب اور مقبول کتابوں میں ہے اسکی شہرت انکے زمانہ ہی میں پورے طور پر ہوگئی تھی، جہانگیر جیسے نکتہ شناس بادشاہ نے بھی انکی اس کاوش کو پسند کیا تھا اور اسکی داد دی تھی اب تک اس کے کئی ایڈیشن چھپ گئے ہیں اور اُردو ترجمہ بھی ہوچکا ہے اور اس کے قلمی نسخے بھی کئی کتب خانوں میں موجود ہیں۔

بعض مصنفین کا خیال ہے کہ یہ شیخ کی سب سے پہلی تصنیف ہے (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۵) اور خود شیخ نے بھی اپنی کتاب تالیف القلب الالیف میں اس کی صراحت کی ہے مگر وہ اسکی تالیف میں اسکے بعد بھی برسوں محنت شاقہ فرماتے رہے اور اس میں برابر حک و اضافہ بھی کرتے رہے، یہی وجہ ہے کہ پہلے اسکی ضخامت زیادہ تھی، بعد میں اس میں برابر کمی ہوتی رہی، غالباً اسی وجہ سے اخبار الاخیار کے بعض نسخوں میں عبارت مختلف ہے۔

(۵) آداب الصالحین: شیخ محدث کے زمانہ میں اخلاقی و معاشرتی حیثیت سے جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں ان کو دور کرنے کیلئے یہ کتاب لکھی گئی ہے اس لیے اس میں اسلامی طرزِ حیات اور اصولِ اخلاق کو پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب امام غزالی کی احیاء العلوم کے اکل و شرب اور منام و معاشرت وغیرہ چند ابواب کا خلاصہ ہے، (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۸۸) اس کا فارسی متن اور اردو ترجمہ ہادی الناظرین کے نام سے چھپ گیا ہے مگر دستیاب نہیں ہے۔

(۶) آداب اللباس: اس میں رسول اللہؐ کے ملبوسات کی تفصیل لکھی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ مکروہ و ممنوع لباس کیا ہیں، رسالہ کے قلمی نسخے بانکی پور برٹش میوزیم اور برلن وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں، اردو ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۸۸) بعض لوگوں نے اس کا نام رسالہ فی آداب اللباس اور رسالہ آداب رسول اللہ ﷺ بھی لکھا ہے۔

Marfat.com

(۷) آداب المطالقہ والمناظرہ: یہ ایک منظوم مثنوی ہے، اس میں گفتگو اور مناظرہ کے آداب بتائے ہیں۔
(نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۵)

(۸) اسماء الرجال والرواۃ: اس کا پورا نام اسماء الرجال والرواۃ المذکورین فی کتاب المشکوٰۃ ہے، بعض لوگوں نے اس کا نام کتاب اسماء رجال المشکوٰۃ المصابیح بھی لکھا ہے۔ (معارف دسمبر ۴۳ھ ص ۴۳۱) اور بعض نے الاکمال فی اسماء الرجال لکھا ہے، یہ رسالہ عربی میں ہے اس میں مشکوٰۃ شریف کی تمام احادیث کے راویان کا مختصر تذکرہ ہے، پہلے خلفائے راشدین کا تذکرہ ہے پھر آل رسول کا' اس کے بعد دیگر صحابہ کرام اور روایان حدیث کا حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر ہے، علاوہ ازیں بعض اکابر محدثین اور ائمہ اربعہ نیز امام اعظم کے چند مشہور و ممتاز تلامذہ کا حال بھی لکھا ہے، اس کا قلمی نسخہ خدا بخش خان لائبریری پٹنہ میں ہے۔ (ایضاً و تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۸۴ و ۸۵)

(۹) استیناس انوار القبس فی شرح دعاء انس: یہ رسالہ شیخ کے مکتوبات کے مجموعہ میں طبع ہو چکا ہے۔
(تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۸۱)

(۱۰) افکار الصافیہ فی ترجمۃ کتاب الکافیہ: اس کا نام بعض لوگوں نے صرف افکار لکھا ہے یہ فن نحو کی کتاب ہے، اسے شیخ نے طالبعلمی کے زمانہ میں ۱۵ یا ۱۶ برس کی عمر میں لکھا تھا، وہ خود فرماتے ہیں'' بچپن میں طالبعلمی کے ابتدائی دور میں ایک شخص کی تقریب سے جس سے معنوی نسبت اور قوی رابطہ تھا منصوبات کے آخر تک اسکی تسوید مکمل ہو گئی تھی اور مرفوعات کی بحث بیاض تک پہنچ چکی تھی راقم کی عمر اس وقت ۱۵ یا ۱۶ برس تھی۔ (بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۱۳ و نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۶)

(۱۱) التعلیق الحاوی علی تفسیر البیضاوی: قاضی بیضاوی کی مشہور و مقبول تفسیر بیضاوی کی جز و اوّل کی ربع کی شرح و تعلیق ہے، اس میں تفسیر کے بعض اغلاط و نقائص دکھائے ہیں، یہ تعلیق ناپید ہے۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۶۱ و ۱۶۲)

(۱۲) الجواہر المضیہ فی شرح الدرۃ البہیہ: فن منطق میں آٹھ صفحے کا مختصر رسالہ ہے جو چھپ گیا ہے اور کتب خانہ رام پور میں موجود ہے۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۶۱ و ۱۶۲)

(۱۳) الفوائد۔ فقہ و عقائد سے متعلق یہ رسالہ ہے، قلمی نسخہ بانکی پور کے کتب خانہ میں بتایا جاتا ہے۔
(حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۸۱)

(۱۴) انتخاب المثنوی المولوی المعنوی: یہ مولانا روم کی مشہور و مقبول مثنوی کا انتخاب ہے، (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۶) شیخ نے فہرس التوالیف میں اس کا ذکر کیا ہے۔

(۱۵) الانوار الجلیہ فی احوال المشائخ الشاذلیہ، اس فارسی رسالہ میں سلسلہ شاذلیہ کے مشائخ کا تذکرہ ہے، اس کا قلمی نسخہ مولوی انوار الحق دہلوی کے کتب خانہ میں تھا۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۰۴)

(۱۶) ایراد العبارات لبیان اہل الاشارات: فوائد جامعہ میں اس کا ذکر ہے۔ (ص ۱۴)

(۱۷) البناء المرفوع فی ترصیص مباحث الموضوع: فن منطق کی کتاب ہے، جس میں شرح شمسیہ و شرح مطالع اور ان کے حواشی سے عمدہ مباحث بھی نقل کیے ہیں اور جا بجا اپنی جانب سے بھی کچھ دلچسپ نکات شامل کردیے ہیں۔
(نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۶ و تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۰۳)

Marfat.com

(۱۸) تالیف القلب الالیف بذکر فہرس التوالیف: اس میں شیخ محدث نے اپنی تصانیف کی فہرست درج کی ہے اس کی ابتدا میں دہلی کے بعض شعراء و مصنفین کے حالات بھی دیئے ہیں، یہ پہلے مطبع عزیزی رام پور سے پھر مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۳۰۹ھ میں شائع ہوئی تھی سید شمس اللہ قادری نے حیدر آباد سے اس کا ابتدائی حصہ تذکرہ مصنفین دہلی کے نام سے شائع کیا تھا اور ایلیٹ نے بھی اپنی تاریخ میں اس کے کچھ حصوں کا ترجمہ دیا ہے۔

(نزہۃ الخواطر ج ۵ ص وحیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۰۸ و رود کوثر ص ۳۸۵)

(۱۹) تجلیۃ القلوب لقدس الملکوت بشرح دعاء التضوت:

(۲۰) تحصیل البرکات والطیبات ببیان معنی التحیات: (یہ دونوں شیخ کے مکتوب ہیں جو ان کے المکاتیب والرسائل میں طبع ہو چکے ہیں)۔

(۲۱) تحصیل التعریف فی معرفۃ الفقہ والتصوف: یہ شیخ کا اہم علمی کارنامہ ہے، اس میں فقہ و تصوف یا شریعت و طریقت میں تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۸۱)

(۲۲) تحصیل الغنائم والبرکات بتفسیر سورۃ والعادیات: یہ سورۂ والعادیات کے فوائد و برکات پر مختصر نوٹ ہے جو ان کے مجموعہ مکاتیب میں شامل ہے۔ (ایضاً ص ۱۶۲)

(۲۳) تحقیق الاشارۃ الی تعمیم البشارۃ: اس میں ان حدیثوں کو نقل کیا ہے جن میں عشرہ مبشرہ کے علاوہ دوسرے بزرگوں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جنت کی بشارت صرف عشرہ مبشرہ کے لیے مخصوص نہیں، اس ضمن میں اس سے متعلق بعض امور و مباحث بھی قلمبند کیے گئے ہیں، کتاب کے مقدمہ میں اہل بیت کے فضائل اور اصول حدیث کے بعض فائدے بھی بیان کیے گئے ہیں۔ (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۵ و معارف دسمبر ۴۳ء ص ۴۲۹)

(۲۴) ترجمہ غنیۃ الطالبین، غنیۃ الطالبین حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مشہور تصنیف ہے جو مختلف دینی مسائل پر ہے شیخ عبدالحق نے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تھا مگر وہ ناپید ہے۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۸۳)

(۲۵) ترجمہ مکتوب النبی الامی فی تعزیۃ ولدہ معاذ بن جبل: یہ رسول اکرم ﷺ کے ایک مکتوب گرامی کا ترجمہ ہے جو حضرت معاذ بن جبلؓ کے نام آپ نے ان کے فرزند کی تعزیت کے سلسلہ میں لکھا تھا، شیخ کا ترجمہ مجموعہ مکاتیب میں شامل اور چھپ چکا ہے۔ (ایضاً ص ۱۶۵ و تذکرہ شیخ عبدالحق ص ۱۸۴)

(۲۶) ترجمہ منہج السالک الی اشرف المسالک، یہ نایاب ہے اصل کتاب منہج السالک کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں ہے۔

(بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق ص ۲۰۰)

(۲۷) ترغیب اہل السعادات علی تکثیر الصلوۃ علی سید الکائنات: اس رسالہ میں درود شریف کے فضائل فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں، اس کا ذکر شیخ نے فہرس التوالیف میں بھی کیا ہے اس کا قلمی نسخہ بانکی پور پٹنہ لائبریری میں بھی ہے۔

(ایضاً و حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۹۰)

(۲۸) تسلیۃ المصاب لنیل الاجر والثواب فی الصبر: مصائب و آفات میں صبر کی تلقین و تاکید سے متعلق رسالہ ہے اس کا نام بھی شیخ نے اپنی تصنیفات کی فہرست میں گنایا ہے۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۹۰)

Marfat.com

(۲۹) تکمیل الایمان وتقویۃ الایمان: یہ عقائد کے موضوع پر اہم اور مشہور کتاب ہے۔
مصنف پہلے عربی عبارت نقل کرتے ہیں پھر فارسی میں اس کی شرح تحریر فرماتے ہیں علاوہ ازیں خود بھی عمدہ فوائد اور دلچسپ نکات لکھے ہیں اس طرح اہل سنت والجماعت کے اصول پر اس میں تفصیل سے اسلامی عقائد کا ذکر ہے اور مسئلہ خلافت پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے دیباچہ میں شیخ نے خود لکھا ہے کہ یہ کتاب ہر غالب صادق مؤمن کے لیے لکھی گئی ہے اور اس میں مذہب حق اور قول صحیح کے بیان پر اقتصار کیا گیا ہے اور مذاہب رائفہ اور اقوال باطلہ کے ذکر سے پرہیز کیا گیا ہے اور بحث وجدال کا راستہ اور قیل وقال کا طریقہ اختیار نہیں کیا گیا ہے، کلامی دلائل اور فلسفیانہ موشگافیاں بھی اس میں نہیں آنے پائی ہیں تاکہ طالب ورطہ حیرت وتذبذب میں نہ پڑے یہ کتاب متنوع مضامین کا مجموعہ اور نہایت جامع ہے، سلیس اور سلجھے ہوئے اندازِ بیان کی وجہ سے اس کو بڑی شہرت ومقبولیت نصیب ہوئی اور یہ متعدد بار طبع ہوئی اس کا اردو ترجمہ بھی سبیل الجنان کے نام سے مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ (ایضاً ونزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۶)

(۳۰) تنبیہ العارف بما وقع فی العوارف: یہ کتاب عربی زبان میں ہے اس میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ کے اس قول کہ: "قدمی علی رقبۃ کل ولی اللہ" (میرا قدم ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے) کے متعلق حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی ؒ کے اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ یہ حالت سکر میں کہا گیا ہے، شیخ عبدالحق دہلوی کا خیال ہے کہ یہ حالت صحو تھا اور انہوں نے بحکم الٰہی یہ ارشاد فرمایا تھا اس سلسلہ میں صوفیہ سکر وصحو اور غلبہ حال سے تحدیث نعمت کے طور پر جو باتیں کہتے ہیں یا جو احوال و اخبار ان سے ظہور میں آتے ہیں ان کا حکم بھی بیان کیا ہے، یہ رسالہ رضا لائبریری رام پور میں "الرسالۃ فی بیان قول قدمی ھذا علی رقبۃ کل ولی اللہ" کے نام سے موجود ہے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۴ وحیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۸۱)

(۳۱) توصیل المرید الی المراد ببیان احکام الاحزاب والاوراد: فارسی میں ایک مفید رسالہ ہے فہرس التوالیف میں شیخ نے اس کے متعلق خود صراحت کی ہے کہ اس میں اوراد ووظائف اور احزاب کے علوم وقواعد بیان کیے گئے ہیں اور محدثین ومشائخ کے مذہب کی توفیق کی گئی ہے کیونکہ اس سلسلہ کے بعض اعمال کی تصحیح میں دونوں گروہوں کا اختلاف ہے، یہ رسالہ ۱۲۹۹ھ میں مطبع مفید عام آگرہ سے طبع ہوا تھا۔ اور اس کا قلمی نسخہ بانکی پور پٹنہ کی لائبریری میں موجود ہے۔ (ایضاً باختلاف صفحات)

(۳۲) جامع البرکات: اس میں اپنی کتاب شرح مشکوۃ کا خلاصہ کیا ہے جو دو جلدوں میں ہے، ہر باب میں صرف ایک یا دو حدیثیں نقل کی ہیں اور باقی حدیثوں کے صرف مضمون بیان کرنے پر اقتصار کیا ہے، یہ کتاب گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے اس کے بعض قلمی نسخے مولوی انوار الحق دہلوی کے کتب خانہ میں موجود تھے۔
(نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۴ وحیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۷۰)

(۳۳) جذب القلوب الی دیار المحبوب: یہ فارسی زبان میں مدینہ منورہ کی تاریخ ہے اسی لیے ملا عبدالقادر بدایونی نے اس کا نام ترجمہ تاریخ ہند سکینہ لکھا ہے، اس کی تالیف میں نور الدین سمہودی کی مشہور کتاب وفاء الوفا باخبار دار المصطفیٰ سے خاص مدد لی ہے اور اپنے دلکش اور مؤثر اندازِ بیان کی وجہ سے مخصوص کیفیت اور تازگی پیدا کر دی ہے، مدینہ منورہ اور رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک سے انہیں جو والہانہ تعلق تھا، اس کا اظہار اس کتاب سے پوری طرح ہوتا ہے اس کی ابتداء ان اشعار سے کی ہے:

Marfat.com

صد شکر کہ از تشنگی غم رستم چوں قطرہ بدریائے کرم پیوستم
برکشتی توفیق ازل . ایستم وززمزم قدس چہرہ دل شستم

اس کتاب کو بڑی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی اور یہ کلکتہ، لکھنؤ اور دہلی وغیرہ سے متعدد بار طبع ہو چکی ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی تاریخ مدینہ کے نام سے نولکشور پریس سے شائع ہوا ہے۔ اس کے قلمی نسخے بھی متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں بانکی پور پٹنہ کا قلمی نسخہ ۱۰۴۸ھ کا ہے گویا یہ مصنف کی زندگی ہی کا ہے۔

شیخ عبدالحق نے اس کی تالیف کے سلسلہ ۹۹۸ھ میں مدینہ منورہ ہی میں شروع کر دیا تھا اور ۱۰۰۱ھ میں اس کو دہلی میں مکمل کیا تھا۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۹۳۔ ۱۹۴)

(۳۴) جواب بعض کلمات شیخ احمد سرہندی: یہ رسالہ نایاب اور غیر مطبوعہ تھا، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب حیات شیخ عبدالحق میں اسے بطور ضمیمہ شائع کیا ہے، مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم نے اس کو رسالۃ فی الرد علی بعض اقوال الشیخ احمد بن عبدالاحد السرہندی کہا ہے۔ (نزہت الخواطر ج ۵ ص ۲۰۹)

(۳۵) حاشیہ الفوائد الضیائیہ: علم نحو سے متعلق رسالہ ہے۔ (ایضا ص ۲۰۶)

(۳۶) الدرۃ البہیہ فی اختصار الرسالۃ الشمسیہ: منطق میں مختصر و جامع رسالہ ہے، (ایضا) برٹش میوزیم میں قلمی نسخہ ہے۔
(حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۹۱)

(۳۷) الدرۃ الفرید فی بیان قواعد التجوید، فن تجوید میں ہے، اس میں متن و شرح ممزوج ہے۔
(نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۶ و تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۷۸)

(۳۸) دفاتر: اوراد پر مشتمل رسالہ ہے، فہرست کتب خانہ رام پور میں اس کا ذکر ملتا ہے۔
(بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۰۱)

(۳۹) ذکر سلوک، اس کا نام تاریخ حقی اور تاریخ سلاطین ہند بھی ہے، یہ ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ ہے اس میں ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی دور اپنے زمانہ تک کے واقعات و حالات قلمبند کیے ہیں، اس کا آغاز معزالدین بن حسام کے دور سے اور اختتام اکبر کے عہد پر کیا ہے یہ ۱۰۰۵ھ میں مکمل ہوئی اور اس میں اکبر کے چالیسویں جلوس ۱۰۰۴ھ تک کے حالات درج ہیں بہلول لودھی کے زمانہ تک کے واقعات طبقات ناصری اور تاریخ فیروز شاہی وغیرہ کی مدد سے لکھے ہیں اس کے بعد سے اپنے دور تک کے واقعات سماعی اور ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں، اس کی ابتدا میں ایک دیباچہ ہے جو: اَللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ الی قولہ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ سے شروع ہوا ہے اور اختتام اس شعر پر ہوا ہے۔

مقصود اہل ذوق زگزشتگاں ☆ تنبیہ عبرت است چہ مسکیں چہ بادشاہ

یہ ابتدائی عبارت اور شعر دونوں اہم اور پر معنی ہیں۔

پہلے باب میں اکبر کے زمانے تک کی دہلی کی تاریخ دی ہے پھر جون پور، بنگال، مانڈو، دکن، ملتان، سندھ اور کشمیر کے سلاطین کے حالات اختصار سے لکھے ہیں۔

نواب مرتضی خان شیخ فرید نے ان سے فرمائش کی کہ بعد کے واقعات کا بھی اس میں اضافہ کر دیں مگر شیخ عبدالحق کو

Marfat.com

دوسرے علمی کاموں میں مشغولیت کی وجہ سے اس کا موقع نہیں ملا، اس لیے انہوں نے اپنے فرزند شیخ انوار الحق سے اس کو مکمل کرایا، انہوں نے زبدۃ التواریخ کے نام سے اکبر کے دور کے مزید حالات اور بعد کے واقعات کا اضافہ کیا۔ اس کے بعد بھی اس کتاب کے تکملے اور تتمے لکھے گئے ایک تکملہ مولوی حاجی رفیع الدین خاں مرادآبادی کا لکھا ہوا ہے اس میں ۱۱۹۴ھ تک کے واقعات درج ہیں، یہ کتاب طبع نہیں ہوئی ہے، ہندوستان کے متعدد کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے ہیں۔

(رود کوثر ص ۳۸۶ حیات شیخ عبدالحق محدث ص ۱۹۶ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۵)

(۴۰) رسالہ اثبات توقیت: یہ غالباً علم الفقہ میں ہے، بروکلن نے اسکا ذکر کیا ہے۔ (تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۸۶)

(۴۱) رسالہ اقسام الحدیث: یہ اصول حدیث میں ہے اور اس میں حدیث کی اصطلاحات اور اقسام وغیرہ پر عام فہم انداز میں گفتگو کی ہے، یہ نہایت مفید و مقبول رسالہ ہے شیخ نے عربی میں مشکوٰۃ کی جو شرح لکھی ہے، یہ غالباً اس کے مقدمہ کے طور پر ہے، مشکوٰۃ کے ساتھ یہ بھی عربی مدارس کے نصاب میں شامل ہے، اس کے کئی اردو ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں اور مشکوٰۃ کے ساتھ اس کا عربی متن بھی کئی دفعہ چھپا ہے۔ (ایضاً ص ۱۸۵ و نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۹)

(۴۲) رسالہ تنبیہ اہل الفکر برعایۃ آداب الذکر۔

(۴۳) رسالہ ذکر الاحوال والاقوال مبہمۃ علی رعایۃ طریقۃ الاستقامۃ والاعتدال: دونوں رسالوں کا ذکر عجالہ نافعہ کے حواشی فوائد جامعہ میں مولانا عبدالحلیم چشتی نے کیا ہے۔ (فوائد جامعہ ص ۱۴)

(۴۴) رسالہ شب براءت، فارسی زبان میں شب براءت پر مختصر رسالہ ہے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۹)

(۴۵) رسالہ عقد انامل: اوراد کو انگلیوں پر شمار کرنے کے متعلق یہ رسالہ لکھا تھا۔ (ایضاً)

(۴۶) رسالہ فی اسرار الصلوٰۃ۔

(۴۷) رسالہ فی الوظائف: مولانا حکیم سید عبدالحئی نے دونوں رسالوں کا ذکر کیا ہے۔ (ایضاً)

(۴۸) رسالہ نوریہ سلطانیہ: یہ سیاست مدن سے متعلق رسالہ ہے جو اصلاً شہنشاہ ہند نورالدین جہانگیر کے لیے لکھا گیا تھا، اس میں اس کے لیے سلطنت کے قواعد وضوابط، حکمرانی کے اصول و آداب اور دوسرے مفید امور و مسائل بیان کیے گئے ہیں مصنف نے خود دیباچہ میں لکھا ہے۔

کلمہ چند از احادیث رسول اللہ ﷺ و اخبار و آثار سلف کرام و حکایات و مآثر سلاطین عظام و بزرگے آنچہ متضمن خیر و صلاح دنیا و آخرت باشد ترجمہ نمودہ است۔

رسول اکرم ﷺ کی احادیث مبارکہ اسلاف کرام کے ارشادات بڑے بادشاہوں کے واقعات وحالات اور دین و دنیا کے خیر و صلاح سے متعلق دوسری کچھ مفید باتوں کا رسالہ میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

یہ رسالہ حال ہی میں ڈاکٹر سلیم اختر نے پاکستان سے اپنے عالمانہ مقدمہ اور محققانہ حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نے اس کی تالیف میں متعدد کتابوں سے مدد لی ہے جیسے سیرت ابن ہشام، تاریخ آل برمک، جوامع الحکایات عوفی، تاریخ گزیدہ حمداللہ مستوفی، گلستان بوستاں و نصیحۃ الملوک شیخ سعدی اور اخلاق محسنی ملا حسین واعظ کاشفی سے بھی پورا استفادہ کیا ہے لیکن یہ صرف اخذ و اقتباس ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ ہر جگہ بقدر ضرورت حذف و اختصار اور انتخاب

Marfat.com

سے بھی کام لیا ہے اور صفحوں پر پھیلے ہوئے مواد کو مختصر عبارت میں سمیٹ لیا ہے اور اپنی جودت طبع اور حسن ذوق سے اسے اس انداز میں پیش کیا ہے کہ مضمون اچھوتا اور دلکش ہو گیا ہے، ایک جگہ دادرسی کے لیے سلاطین کے زنجیر بنانے کا ذکر بھی کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کے بادشاہوں میں بھی اس کا رواج تھا ممکن ہے جہانگیر کو زنجیر عدل بنانے کا خیال شیخ کے اسی رسالہ کی وجہ سے ہوا ہو۔

(۴۹) رسالہ وجودیہ: مراۃ الحقائق میں اس کا ذکر ہے اور مولوی انوار الحق دہلوی کے کتب خانہ میں موجود تھا۔

(حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۸۶)

(۵۰) زاد المتقین، اس مفید اور دلچسپ کتاب میں اپنے ان اساتذہ وشیوخ کا ذکر کیا ہے جن سے سفر حجاز میں استفادہ کیا تھا اور خصوصیات سے شیخ علی متقی اور ان کے شاگرد اور اپنے استاذ شیخ عبدالوہاب کا تذکرہ لکھا ہے، علاوہ ازیں مکہ معظمہ میں قیام کے دوران کے واقعات بھی درج کیے ہیں، اس کے دیباچہ میں خود تحریر فرماتے ہیں کہ:

''میں دو سال سے زیادہ عرصہ تک مکہ معظمہ میں رہا، وہاں جو کچھ دیکھا اور سنا اُسے میں نے ضبط کیا ہے''۔

اور فہرست التوالیف میں لکھا ہے کہ ''اس کے احوال مکہ معظمہ میں ضبط کیے گئے تھے اور ۱۰۰۳ھ میں اس کو تفصیل سے لکھا'' وہ فرماتے ہیں کہ ''اگر اس کا نام صراط مستقیم اور منہج قویم بھی رکھوں تو مناسب ہو اور میزان عدل و دین حق اس کا لقب رکھوں تو درست ہو، اگر سالک اس رفتار پر چلے تو منزل مراد کو پہنچ جائے اور اگر حاکم وقت اسے دستور حال بنائے تو جادہ سے تجاوز نہ کرے'' اس کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد اور برٹش میوزیم میں ہیں۔

(بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۰۸)

(۵۱) زبدۃ الآثار منتخب بہجۃ الاسرار، بہجۃ الاسرار حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات میں ایک مفید و مستند کتاب ہے، اس کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس کے مصنف شیخ نورالحسن ابوالحسن علی بن یوسف (۶۴۴ھ تا ۱۳ے ۷ھ) ایک جید عالم اور سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے اور ان کے اور عبدالقادر جیلانی کے درمیان صرف دو واسطے ہیں شیخ عبدالحق کو شاہ جیلانی سے والہانہ عقیدت و تعلق تھا اس لیے انہوں نے زبدۃ الآثار کے نام سے یہ خلاصہ عربی زبان میں لکھا جس میں اصل کتاب کا عطر کھینچ لیا ہے، یہ کتاب بمبئی سے ۱۳۰۴ھ میں شائع ہوئی تھی اور اس کا اردو ترجمہ بھی کحل الابصار کے نام سے چھپا تھا۔ اس کے قلمی نسخے بھی بعض کتب خانوں میں موجود ہیں، (ایضاً) داراشکوہ کی فرمائش پر خود شیخ نے اس کا فارسی ترجمہ بھی کیا تھا۔

(نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۹)

(۵۲) شرح اسماء الرجال بخاری، مولوی رحمان علی نے تذکرہ علمائے ہند میں اس کا ذکر کیا ہے۔

(۵۳) شرح سفر السعادۃ، سفر السعادۃ شیخ محمد بن یعقوب مجدالدین فیروزآبادی صاحب قاموس کی تصنیف ہے جو دراصل حافظ ابن قیم کی شہرہ آفاق تصنیف زاد المعاد کا خلاصہ ہے شیخ عبدالحق نے ان کی یہ مبسوط شرح لکھی، اس کا نام الطریق القویم فی شرح صراط مستقیم بھی ہے، حافظ ابن قیم کی تصنیف اپنے موضوع پر بے نظیر ہے اس میں رسول اللہ ﷺ کی عبادات، حالات، معمولات زندگی اور معاش و معاشرت کے آداب وغیرہ بہت خاص انداز میں پیش کیے گئے ہیں، اس کی اہمیت کی وجہ سے فیروزآبادی نے اس کا خلاصہ تیار کیا ائمہ اربعہ وغیرہ کے یہاں جو باتیں ان کو صحیح احادیث اور آپ ؐ کے

Marfat.com

معمولات کے برخلاف نظر آئیں ان کی تصریح و وضاحت بھی کی ہے، شیخ نے جہاں تک ممکن ہوا ہے ائمہ اور خصوصاً حنفی مذہب کا دفاع کیا ہے، فہرست التوالیف میں لکھتے ہیں:

''مولانا مجد الدین کا مقصد اس کتاب میں یہ ہے کہ ذاتِ نبوی کے عبادات و عادات سے متعلق اعمال شریفہ کو حدیث سے ثابت کرے، اس کے مخالف اگر مذاہب اربعہ کا مذہب ہوتا ہے تو اس کی تصریح کر کے اس کا ردو انکار کرتے ہیں، شرح میں مذاہب اربعہ خصوصاً حنفی مذہب کی تاکید کی گئی ہے اور مصنف کے کلام سے معارضہ کیا گیا ہے جو ان کے دعوے کے مطابق احادیث کے موافق ہے راقم نے اس کے برخلاف ثابت کیا ہے''۔

اس کی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں حنفی مذہب کی بیجا تائید کی گئی ہے، صاحب دراسات اللبیب اور نواب صدیق حسن خاں وغیرہ نے اسی حیثیت سے اس پر ردو کد کی ہے۔ (اتحاف النبلاص ۸۸)

شیخ عبدالحق نے شرح کو تین حصوں میں مرتب کیا ہے پہلے میں علامہ فیروز آبادی کی نقل کردہ حدیثوں پر محدثانہ کلام کیا ہے اور ان کی تحقیق و توضیح فرمائی ہے ان کے ماخذ و اسناد پر بھی گفتگو کی ہے دوسرے میں ائمہ و مجتہدین کو موضوع بحث بنایا ہے اور خاص طور پر حنفی مذہب کی بھی تائید و تقویت فرمائی ہے، یہی کتاب کا خاص حصہ ہے، تیسرے حصہ میں شرعی احکام کو مفصل طور پر بیان کیا ہے ہر مبحث میں گونا گوں فوائد اور علمی نکات بھی تحریر کیے ہیں۔

یہ شرح بھی بڑی تحقیق و کاوش سے لکھی گئی ہے اور اس میں اسماء الرجال، تاریخ و سیر، تفسیر و حدیث اور شروح حدیث سے پوری مدد لی ہے، یہ کتاب بھی شیخ کی اہم اور مفید کتابوں میں ہے، مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

''فیروز آبادی کی فارسی سفر السعادۃ کی فارسی شرح لکھی جو حافظ ابن القیم کی زاد المعاد کے لگ بھگ ہے''۔

(مقالات سلیمان ج ۲ ص ۲۳)

اس کے متعدد قلمی نسخے مختلف خانوں میں موجود ہیں، بانکی پور پٹنہ کے نسخہ کو مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا بتایا جاتا ہے، اور یہ کلکتہ اور لکھنؤ سے چھپ بھی گئی ہے۔

(۵۴) شرح الشمسیہ: منطق میں ہے اور تصور و تصدیق کے مباحث پر مشتمل ہے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۶)

(۵۵) شرح الصدور بتفسیر آیۃ النور: یہ کتاب سورۂ نور کی آیت: اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی تفسیر ہے۔ اس کا نسخہ مولوی انوار الحق دہلوی کے کتب خانہ میں موجود تھا مگر اب پتہ نہیں۔ (حیات عبدالحق ص ۱۶۲)

(۵۶) شرح فتوح الغیب: شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ملفوظات و مواعظ کو ان کے صاحبزادے شرف الدین ابو عبدالرحمٰن عیسٰی نے فتوح الغیب کے نام سے جمع کیا تھا جو تصوف کی مشہور و مقبول کتابوں میں ہے، شیخ عبدالحق کو ان کی ذات سے جو والہانہ عقیدت تھی اس کی بنا پر انہوں نے اس کی یہ عمدہ شرح لکھی اور فرط ادب و احترام سے نہ اس پر اپنا نام دیا اور نہ مقدمہ تحریر فرمایا شیخ نے بڑی شرح بڑی شستہ و سلیس زبان میں اور نہایت موثر انداز میں لکھی ہے، اس کے متعلق خود ان کا بیان ہے کہ: ''مقالات دین اور اہل یقین کی کمالات کے تحقیق میں لسان رسالت و زبان نبوت کے موافق ہے کہ صدیقین کے معارف کی شان ہوتی ہے''۔

فتوح الغیب سے ان کو رغبت اور دلچسپی اپنے مرشد شیخ عبدالوہاب متقی کی اس تاکید کی وجہ سے بھی ہوئی تھی کہ انہوں نے

Marfat.com

فرمایا تھا کہ اس کو حاصل کر کے بغور پڑھو اور جہاں تک ممکن ہو اس پر عمل کرو چنانچہ حجاز سے ہندوستان آنے کے بعد انہوں نے اس کا نسخہ حاصل کیا اور مرشد کی ہدایت کے مطابق اسے بغور ملاحظہ فرمایا اس کے بعد حضرت شاہ ابو المعالی کے حکم سے اس کی شرح و ترجمہ کا کام کیا، اور ۱۰۲۳ھ میں اس کو مکمل کیا اور مفتاح الفتوح تاریخی نام رکھا۔ یہ شرح بھی نولکشور پریس سے چھپ چکی ہے اور اس کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

(۵۷) شرح القصیدۃ الجزریہ: یہ فن تجوید میں ایک رسالہ ہے اور اس کا قلمی نسخہ پشاور کے کتب خانہ میں ہے۔
(فہرست الباب المعارف الاسلامیہ)

(۵۸) صحیفۃ المودہ: یہ مجموعہ خطوط اصل میں ایک مثنوی ہے مگر نایاب ہے، مولانا حکیم سید عبدالحیٔ نے اس کا نام ارجوزۃ فی المکاتبات الی اعزۃ واحباء لکھا ہے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۶)

(۵۹) فصول الخطب لنیل اعالی الرتب، (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۴) خطبات کا مجموعہ ہے جو نایاب ہے۔

(۶۰) کتاب الفوائد والصلوٰۃ: فارسی زبان میں اوراد پر ایک کتاب ہے اس میں آنحضرت ﷺ، صحابہ کرام، علماء و اولیاء سے منقول دعائیں جمع کی ہیں اور تعویذات بھی دیئے ہیں۔ (تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۰۱)

(۶۱) ماثبت بالسنۃ فی ایام السنۃ، یہ تصنیف عربی میں ہے اس میں سال کے بارہ مہینوں سے متعلق احادیث جمع کی گئی ہیں، اس کی ابتدا ماہ محرم سے کی ہے اور محرم و عاشورہ محرم کے مذہبی اعمال و مناسک کے بارہ میں صحیح حدیثیں اکٹھا کی ہیں پھر ان کے بارہ میں جو غلط رسوم و توہمات رائج ہو گئے ہیں ان کی تردید کی ہے مثلاً یہ خیال کہ عاشورے کے دن سرمہ لگانے سے درد نہیں ہوتا، یا اس روز غسل کرنے سے آدمی بیمار نہیں ہوتا، اسی طرح شہادت حسینؓ سے متعلق احادیث پر بھی نقد و تبصرہ کیا ہے، ماہ صفر کے ذکر میں اس خیال کی تردید کی ہے کہ یہ نامبارک مہینہ ہے، ماہ ربیع الاول کا تذکرہ کرتے ہوئے رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ پر ایک مختصر نوٹ تحریر کیا ہے، ربیع الثانی کی بحث میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا مختصر حال لکھا ہے اسی طرح شعبان، رمضان، شوال، اور ذی الحجہ کے سلسلہ میں روزہ، تراویح، عید الفطر اور عید الاضحیٰ اور حج و قربانی سے متعلق احادیث یکجا کی گئی ہیں، اس کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں اور یہ کلکتہ و لاہور سے شائع بھی ہوئے ہیں اور دہلی سے مع ترجمہ چھپی ہے۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۷۱)

(۶۲) مدارج النبوۃ: یہ فن سیر کی معرکۃ الآراء کتاب ہے جس میں سیرت نبویؐ پر محققانہ بحث کی گئی ہے، یہ کتاب شیخ محدث کا مہتم بالشان علمی کارنامہ اور رسول کریم کی حیات طیبہ کا مکمل مرقع ہے، اس کا مقصد اس زمانہ کے فتنوں کا استیصال اور نظریہ الفی وغیرہ کی تردید ہے، ان کے زمانہ میں رسول اللہ ﷺ سے مسلمانوں کے تعلق کو توڑنے اور ختم کرنے کی جو مختلف النوع سازشیں ہو رہی تھیں ان کا پردہ چاک کر کے آپ کی ذات سے مسلمانوں کا تعلق برقرار رکھنے اور جوڑنے کی مکمل کوشش کی گئی ہے، چنانچہ اس کے ایک باب "حقوق مصطفیٰ" میں رسالت محمدی پر ایمان کی ضرورت و اہمیت واضح کی گئی ہے، اور اس امر کی تردید کی گئی ہے کہ ایمان کی تکمیل کے لیے صرف خدا پر ایمان لانا کافی ہے"، شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

"حدیث کے علاوہ شیخ عبدالحق نے سب سے زیادہ توجہ سیرت اور مدینۃ النبی کی تاریخ پر (جسے سیرت کا تکملہ کہنا چاہیے) مبذول کی، مقصد ساری کوششوں کا یہ تھا کہ مہدویہ تحریک، بعض درویشان مغرور کے دعاوی اور مقام اقدس محمدی کے عدم ادراک نظریہ

Marfat.com

الفی، دربار اکبری میں توحید بلکہ عقلیت کے مقابلہ میں نبوت سے کم نگاہی، رسول کریمؐ کے صحیح واقعات زندگی سے عام ناواقفیت ان تمام اسباب کی بنا پر عوام جادۂ محمدی سے دور جارہے تھے اس کا سدباب ہوجائے چنانچہ شیخ نے اسلامی ہندوستان کی پہلی مبسوط سیرت نبوی مدارج النبوۃ کے نام سے بارہ سو صفحات میں ترتیب دی جواب بھی مقبول ہے۔'' (رود کوثر ص ۳۸۴)

ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی لٹریچر میں اس کتاب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اس سے پہلے نہ صرف ہندوستان بلکہ فارسی زبان میں بھی رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ پر ایسی مفصل اور جامع کتاب نہیں لکھی گئی تھی، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

''مدارج النبوۃ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، سیرت شامیہ اور مواہب لدنیہ سیرت کی کتابوں میں سب سے بڑی کتابیں ہیں''۔
(عجالہ نافعہ مع فوائد ص ۴۸)

اس کتاب کو شیخ نے مواہب لدنیہ اور دوسری کتب سیر کی مدد سے لکھا تھا اور یہ پانچ حصوں میں منقسم اور دو جلدوں پر مشتمل ہے، یہ متعدد بار چھپ چکی ہے اور منہاج النبوۃ کے نام سے اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے، اس کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں، دارالمصنفین کے کتب خانہ میں بھی اس کی جلد اوّل کا ایک قلمی نسخہ ہے، اس کے آخر میں کاتب کا نام صاحب خاں لکھا ہوا ہے، غالباً بارہویں صدی ہجری میں اس کی کتابت ہوئی ہے، کتاب کے آخر میں رمضان ۱۱۴۱ھ کتابت کا سن دیا ہے، تاریخ بھی لکھی ہے مگر روشنائی پھیل جانے کی وجہ سے پڑھی نہ جاسکی، پھر تصحیح کا سال ۴۲ھ دیا ہے، اور تاریخ ۱۸، رمضان لکھی ہے مگر صدی دونوں جگہ نہیں تحریر ہے، خیال یہی ہوتا ہے کہ یہ ۱۱۴۲ھ ہوگا۔

(۶۳) مرج البحرین: اس کا پورا نام مرج البحرین فی الجمع بین الطریقین ہے، یہ دراصل قواعد الطریقۃ فی الجمع بین الشریعۃ والحقیقۃ کی شرح ہے جو حضرت شیخ احمد المغربی معروف بہ شیخ رزق اللہ کی تصنیف ہے، شیخ نے شرح کے علاوہ اس کا ترجمہ بھی کیا ہے، اس کے مطالعہ کی ہدایت انہیں خاص طور پر ان کے شیخ عبدالوہاب متقی نے کی تھی، اس کے متعلق انہوں نے خود تحریر فرمایا ہے کہ:

''یہ رسالہ جامع طریقین ہے یعنی فقہ و تصوف اور شریعت و طریقت ظاہر و باطن، صورت و معنی قشر و لب، علم و حال، صحو و سکر مذہب و مشرب اور عقل و عشق، اگر اسے صراط مستقیم و طریق قویم کہیں تو جائز ہے، دین خالص اور سبیل اسلام اس کا لقب رکھا جائے تو روا ہے، دعوت حق و منہج ارشاد کہنا درست ہے اور میزان عدل و دستور العمل گرداننا ٹھیک ہے''۔
(مرج البحرین ص ۳ بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق)

اس کے متعلق مزید لکھتے ہیں:

''یہ ایک عجیب کتاب ہے جو فقہ، تصوف، علم اور حال کی جامع ہے اس سے وہ فقیہ فائدہ اٹھائے گا جو اللہ سے محبت کرنے والا اور اپنے احوال کی نگرانی کرنے والا ہو اور وہ صوفی بھی جو محقق اور مقید بہ اعمال ہو، اس سے وہ فقیہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا جو راہ اعتدال سے ہٹ جانے والا اور معاند ہے اور نہ وہ صوفی جو راہ اعتدال سے ہٹ جانے والا اور اعمال و طاعات سے بے نیاز ہو''۔
(تذکرہ شیخ عبدالحق ص ۱۹۲)

مرج البحرین مختصر ہونے کے باوجود ایک مفید کتاب ہے، شیخ نے شریعت و طریقت، تصوف و فقہ اور علم و عقل پر نہایت

Marfat.com

دلنشین بحث کی ہے، قرآن وحدیث اور کتب تصوف کے بکثرت حوالے دیئے ہیں، ان کے شگفتہ انداز بیان کی وجہ سے موضوع کی خشکی تری میں بدل گئی ہے۔

مرج البحرین کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہے، جو اس لحاظ سے قیمتی اور اہم ہے کہ اس کی تصحیح خود حضرت شیخ نے کی ہے اس کی پشت پر شیخ کی یہ تحریر بھی ثبت ہے۔ (ایضاً ص ۱۸ و ۱۹)

ھذا سبع رسائل تالیف الفقیر الحقیر اضعف عباد اللہ القوی عبد الحق بن سیف الدین الدھلوی عفا عنھما۔

یہ سات رسالے فقیر حقیر اور ضعیف ترین بندہ خدا عبد الحق بن سیف الدین دہلوی عفا اللہ عنہما کی تصنیف ہیں۔

مرج البحرین ۱۲۶۵ھ میں مطبع عبد الرحمان سے اور ۱۲۷۴ھ میں مطبع محمدی کلکتہ سے شائع ہوئی تھی، وصال السعدین کے نام سے اس کا اردو ترجمہ مولوی غوث محمد فرخ آبادی نے کیا تھا جو مطبع نامی لکھنؤ سے ۱۳۱۴ھ میں چھپا تھا، مولوی شیخ عبد القادر صدیقی نے اس کی شرح فارسی زبان میں شرح البحرین کے نام سے کی تھی"۔ (حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی ص ۱۸۵)

(۶۴) مکتوبات ورسائل: اس کا نام کتاب المکاتیب والرسائل بھی ہے، یہ ارسٹھ خطوط کا مجموعہ ہے، جو حضرت باقی باللہ، شیخ عبد اللہ نیازی، شاہ ابو المعالی، نواب مرتضیٰ خان (شیخ فرید) نواب خان خانان، شیخ ابو الخیر مبارک اور فیضی وغیرہ کے نام لکھے گئے تھے جن میں شرح وبسط کے ساتھ بعض اہم مسائل ومباحث پر گفتگو کی گئی ہے، اور جس موضوع پر گفتگو کی ہے اس میں بڑی تلاش وتحقیق سے کام لیا ہے، اس حیثیت سے ہر مکتوب بڑا اہم ہے جو قدر وقیمت میں ایک رسالہ سے کم نہیں ہے، مکتوبات کا یہ مجموعہ ۱۳۳۴ھ میں چھپا تھا اس کے قلمی نسخے کم ہیں اور جو ہیں ان میں مضامین کی کمی بیشی ہے۔ (ایضاً ص ۲۱)

(۶۵) نکات الحق والحقیقۃ من معارف الطریقۃ: یہ فارسی زبان میں ایک مختصر لیکن بیش قیمت تصنیف ہے، اس کی تقسیم نکات پر کی گئی ہے اور ہر نکتہ لطیف خیالات سے پر ہے، اس کو مولوی سید محمد یوسف مراد آبادی نے مطبع احتشامیہ مراد آبادی سے ۱۸۹۱ء میں شائع کیا تھا، مولوی انوار الحق صاحب نے جو شیخ کے ہم خاندان تھے۔ ۱۳۱۹ھ میں اس کا ایک مطبوعہ نسخہ دہلی سے خان بہادر خدا بخش خان کو ہدیتاً بھیجا تھا جو ان کی لائبریری میں موجود ہے، کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں مطبوعہ اور قلمی دونوں نسخے موجود ہیں۔ (حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی ص ۱۸۶ و تذکرہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی ص ۱۹۹ و ۲۰۰)

(۶۶) نکات العشق والمحبۃ فی تطییب قلوب الاحبۃ: شیخ نے اپنی فہرست میں اس ادبی کتاب کا ذکر کیا ہے۔ (تذکرہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی ص ۲۰۴)

(۶۷) وصیت نامہ: اس میں شیخ کی وصیتیں درج ہیں، (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۱۰) اس کا ایک قلمی نسخہ انوار الحق حقی دہلوی کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ (مراۃ الحق ص ۶۰ بحوالہ حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی ص ۲۰۸)

(۶۸) ہدایۃ الناسک الی طریق المناسک: اس رسالہ میں زیارت حرمین اور مناسک واعمال حج پر بحث کی گئی ہے، شیخ فہرس التوالیف میں اسکے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

اس راہ کے سالکوں اور اس درگاہ کے قاصدوں کے لیے مناسک حج وآداب زیارت کا خلاصہ پیش کیا ہے۔

(بحوالہ تذکرہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی ص ۱۸۴ تا ۱۸۵)

Marfat.com

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا سب سے اہم اور قابل ذکر کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مشکوٰۃ المصابیح کی فارسی اور عربی زبان میں شرحیں لکھ کر حدیث وسنت کو فروغ دیا، اس کتاب کی شرح لکھنے کا خیال انہیں اسی لیے ہوا ہوگا کہ اس میں صحاح کی حدیثیں جمع کی گئی ہیں، اس لیے وہ صحیح حدیثوں کا منتخب مجموعہ ہے، اور اس کو پڑھ لینے کے بعد آدمی یک گونہ دوسری کتابوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اس لیے اس کی شرح دراصل صحاح ہی کی شرح ہے، کتب حدیث میں مشکوٰۃ جامعیت وترتیب کے لحاظ سے بھی اہم ہے، اس میں اسناد حذف کر کے صرف صحابی کا نام دیا ہے اور آخر میں ماخذ کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔

پہلے ہم شیخ کی فارسی شرح کا اور آخر میں عربی شرح کا ذکر کرتے ہیں۔

(۶۹) اشعۃ اللمعات: یہ فارسی زبان میں مشکوٰۃ المصابیح کی جامع ومکمل شرح ہے، اس کی تالیف کی تقریب بیان کرتے ہوئے شیخ نے دیباچہ میں لکھا ہے:

''حرمین کے اساتذہ وشیوخ حدیث سے استفادہ کے بعد ہندوستان واپس ہوا تو اللہ نے حدیث شریف کے علم کی خدمت کی توفیق عطا فرمائی، اس کی بدولت مشکوٰۃ المصابیح کی شرح لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا کیونکہ اس وقت یہ ایک متبرک کتاب ہے، شرح لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے جو فوائد مشائخ وقت سے سنے ہیں یا ان کی کتابوں میں دیکھے یا جو اپنے خیال میں آئے انہیں طلبہ تک پہنچا دوں، بعض جلیل القدر اصحاب صفہ اور اہل تعلق ومحبت نے فرمایا کہ اگر شرح فارسی میں ہو تو اس کا نفع زیادہ عام ہوگا، شروع کرنے پر ایسی باتیں مطالعہ میں آئیں کہ جن کو فارسی شرح میں لکھنا مناسب نہ تھا، لیکن لوگوں کی فرمائش سے ہاتھ اٹھا لینے کی بھی گنجائش نہ تھی اس لیے عربی شرح بھی اسی کے ساتھ شروع کر دی جو پہلے مکمل ہوگئی اور فارسی درمیان میں ہی رک گئی پھر امر ہوا کہ فارسی بھی پوری کروں، اس طرح جو کچھ تحریر ہو چکی تھی وہ بیاض میں لایا اور باقی کی تکمیل شروع کی''۔ (دیباچہ اول ص ۲)

کہا جاتا ہے کہ شرح کی تکمیل کے لیے شیخ کے مرشد حضرت شاہ ابوالمعالی کی جانب سے بار بار تقاضا اور اصرار ہو رہا تھا ایک مرتبہ انہوں نے فرمایا: ''شرح مشکوٰۃ کو مکمل کیجئے ان شاء اللہ اس سے ایک عالم مستفید ہوگا'' (کتاب المکاتیب والرسائل ص ۳۰۶ بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۶۵) شاہ صاحب نے انہیں اس کی بھی ہدایت کی تھی کہ ''شرح میں موقع کی مناسبت سے اشعار بھی لکھے جائیں'' (حیات عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۶۵) شیخ نے اس پر عمل کیا۔

اس طرح چھ برس میں یہ شرح مکمل ہوئی، ابتدا ۱۰۱۹ھ بمطابق ۱۶۱۰ء میں کی تھی اور ۱۰۲۵ھ بمطابق ۱۶۱۶ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی گو عربی شرح دقیق علمی وفنی بحثوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے زیادہ اہم اور فائق ہے مگر خود شاہ صاحب کا بیان ہے کہ:

''مشکوٰۃ کی یہ فارسی شرح گو قدر ومنزلت میں عربی شرح سے فروتر ہے لیکن تنقیح وترتیب اور ضبط وربط میں اس سے فائق اور قابل ترجیح ہے حجم وضخامت میں بھی اس سے بڑھ گئی ہے، تائید الٰہی اور نصرت باری سے نفیس، عمدہ، مرتب، پسندیدہ اور مقبول کتاب تیار ہوگئی'' (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۴ بحوالہ التالیف قلب الالیف)

اس میں مشکل لفظوں اور دقیق بحثوں کی عمدہ شرح کی گئی ہے اور یہ شرح ترتیب وتہذیب میں عربی شرح سے بہتر اور اختصار وجامعیت اور افادیت میں اس سے سوا ہے، نواب صدیق حسن خان صاحب رقمطراز ہیں:

''یہ شرح تنقیح وتہذیب اور معانی کے ضبط وربط کے لحاظ سے عربی شرح کے مقابلہ میں فائق وبرتر، اس سے زیادہ مفصل اور ضخامت میں بڑھ کر ہے، اخذ واستفادہ کی سہولت، غریب کی شرح، مشکل کے ضبط اور فقہ حنفی کے مسائل کے بیان میں اشعۃ

Marfat.com

اللمعات بے نظیر کتاب ہے، اس کی شہرت و مقبولیت بیان سے مستغنی ہے"۔ (اتحاف النبلا)

ہندوستان میں اس شرح کی وجہ سے علم حدیث کا چرچا ہوا، حدیث کا ذوق پیدا ہوا اور اس سے اشتغال بڑھا۔

ترتیب و تبویب:

اشعۃ اللمعات چار حصوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد کی ابتدا میں ایک مقدمہ ہے، اس میں فن حدیث کے اصول و مصطلحات اور علم حدیث کے اقسام وغیرہ پر مفید بحث کی ہے اور بعض کبار محدثین کے مختصر حالات بھی تحریر کیے ہیں، چاروں جلدوں کے مندرجات کی تقسیم اس طرح کی ہے:

پہلی جلد میں ۵ کتب کا ذکر ہے: کتاب الایمان، کتاب العلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجنائز۔

دوسری جلد چھ کتب پر مشتمل ہے، کتاب الزکوٰۃ اور کتاب الصوم، کتاب فضائل القرآن، کتاب الدعوات، کتاب اسماء الٰہی، کتاب المناسک۔

تیسری جلد ۹ کتب کا مجموعہ ہے، کتاب البیوع، کتاب العتق، کتاب الحدود، کتاب الامارۃ والقضاء، کتاب الجہاد، کتاب الصید والذبائح، کتاب الاطعمہ، کتاب اللباس، کتاب الطب والرقی۔

چوتھی جلد میں کتاب الآداب اور کتاب الفتن کے ابواب درج ہیں۔

شرح کی قدر و قیمت اور اصل نوعیت معلوم کرنے کے لیے ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں، محدثین نے کتاب الایمان میں یہ مشہور حدیث نقل کی ہے:

عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ۔

مشکوٰۃ میں یہ حدیث مذکور ہے شیخ عبدالحق نے اس کی شرح کرتے ہوئے پہلے تو رسول اکرم ﷺ سے حدیث کی روایت کرنے والے صحابی کے متعلق یہ تحریر کیا ہے:

"عبداللہ بن عمرو بن عاص بن وائل سہمی، سہمی، سہم بن عمر کی جانب نسبت ہے جو قبیلہ قریش کا ایک بطن ہے، حضرت عبداللہ عابد و عالم تھے، دن میں روزہ رکھتے تھے، اور رات میں قیام کرتے تھے، وہ اپنے والد سے ۱۳ سال چھوٹے تھے، وہ آنحضرتؐ کی حدیثوں کو قلمبند کر لیتے تھے" [1]۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے تھے کہ میرے اور ان کے درمیان یہ فرق تھا کہ وہ احادیث کو قلمبند کرتے تھے اور میں حدیثیں نقل نہیں کرتا تھا۔

حضرت عبداللہ اہل بیت سے بھی محبت کرتے تھے، گو رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنے والد کی رضا جوئی کی خاص طور پر وصیت اور تاکید کی تھی، اس وجہ سے اہل بیت سے تعلق و محبت کے باوجود حضرت امیر معاویہؓ اور اپنے والد بزرگوار کی صحبت میں بھی رہتے تھے، ان کا اصل نام عاص تھا جو ان کے دادا کا بھی نام تھا مگر رسول اللہؐ نے ان کا نام عبداللہ رکھا تھا" شیخ محدث نے حدیث کا جو ترجمہ کیا ہے وہ قابل توجہ ہے فرماتے ہیں:

---

[1] حضرت عبداللہؓ نے حدیثوں کا ایک مجموعہ قلمبند کیا تھا جو صحیفہ عمرو بن عاص کہلاتا تھا۔

Marfat.com

''کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے عام مسلمان سلامت رہیں''۔

حدیث کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

مسلمان زبان سے گالی نہیں دیتا، غیبت نہیں کرتا، ناروا اور ناگفتنی باتیں نہیں کرتا اور ہاتھ سے مارتا نہیں، رنج نہیں دیتا اور غصب نہیں کرتا، حدیث میں زبان اور ہاتھ کا ذکر خصوصیت سے اسی لیے آیا ہے کہ ایذا کی اکثر صورتوں کا باعث یہی دونوں عضو ہوتے ہیں، انسان کے اندرون اور باطن کی تعبیر و ترجمانی بھی زبان ہی کرتی ہے اور ہاتھ سے بہت سارے کام انجام پاتے ہیں، زبان کا پہلے اسی لیے ذکر کیا ہے کہ اس کی ایذا زیادہ تکلیف دہ اور سخت ترین ہوتی ہے، اور اس کی زد گذشتہ، موجودہ اور آئندہ آنے والے سب ہی لوگوں پر پڑتی ہے مگر ہاتھ کی ایذا صرف حاضر اور موجود لوگوں ہی پر اثر انداز ہوتی ہے، تحریر و کتابت کی ایذا کا تعلق بھی زبان ہی سے ہوتا ہے بلکہ اس کے موجب ہاتھ اور زبان دونوں ہوتے ہیں، مسلمان کی تخصیص باعتبار غالب ہے ورنہ ذمی اور فرمانبردار غیر مسلم بھی اس حکم میں شامل ہیں، چنانچہ ابن حبان کی روایت میں: من سلم الناس .... (کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے عام لوگ سلامت رہیں) کے الفاظ وارد ہیں جو اس روایت کے مقابلہ میں زیادہ عموم کو شامل ہے جیسا کہ سیوطی نے بیان کیا ہے۔ یہاں مراد ناحق ایذا سے ہے ورنہ جو ایذا شریعت کے حکم کے مطابق ہو وہ جائز ہے اور ایسی صورت میں زجر، ضرب اور شتم وغیرہ بالکل روا ہے بلکہ بعض اوقات واجب بھی ہے۔

بے حکم شرع آب خون است ☆ واگر خون بفتوی بریز درواست

حدیث کا مقصود و منشا یہ بتانا ہے کہ مسلمانوں کے اوصاف و خصائص یہ ہیں کہ وہ لوگوں کو ایذا نہیں دیتے اور ہر مسلمان کو اسی وصف کا حامل ہونا چاہیے، اور جس کے اندر یہ وصف نہ پایا جائے وہ گویا مسلمان نہیں ہے، اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ کہ محض یہ وصف رکھنے والا ہی مسلمان ہے، خواہ دین کے باقی احکام وارکان میں وہ کمی اور کوتاہی ہی کیوں نہ کرے جیسا کہ کہا گیا ہے:

مباش درپے آزار و ہرچہ خواہی کن ☆ کہ شریعت ماغیر ازیں گناہے نیست

بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو شخص حقوق اللہ کو ادا کرنے کے ساتھ ہی حقوق العباد کو بھی ادا کرتا ہے وہ کامل مسلمان ہے''۔

(اشعۃ اللمعات مطبوعہ کلکتہ ج ۱ ص ۲۷ و ۲۸)

آنحضرت ﷺ کے اخلاق وشمائل کے باب کی فصل اوّل کی پہلی روایت ہے''۔

عن انس قال خدمت النبی ﷺ عشر سنین فما قال لی اف ولا لم صنعتہ ولم لا صنعت۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کی دس برس تک خدمت کی مگر آپ ﷺ نے مجھ سے نہ اُف کہا اور نہ یہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا اور کیوں نہیں کیا۔

اس حدیث کا مطلب خیز ترجمہ جس طرح کیا ہے اس سے اس کا مفہوم اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے، لکھتے ہیں:

''حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کی دس برس تک خدمت کی، آپ جب مدینہ ہجرت کر کے تشریف لائے تو حضرت انسؓ کی والدہ اور قبیلہ انصار کے ان کے بعض اعزہ نے انہیں آنحضرتؐ کی خدمت کے لیے پیش کیا، ان کی عمر اس وقت آٹھ یا دس برس تھی، اس میں اختلاف ہے، البتہ وہ دس سال تک جو آپ کے قیام مدینہ کی مدت ہے آپ کی خدمت میں رہے لیکن اس طویل زمانہ میں جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گذارا آپ نے ان سے اُف تک

Marfat.com

نہیں کہا۔

اُف میں الف کو پیش ہے اور ف مشدد و مکسور ہے جو تنوین کے ساتھ بھی ادا کیا جاتا ہے اور بلا تنوین بھی یہ لفظ کراہت پر دلالت کرتا اور کسی نا گوار امر کو دیکھنے پر اس کے ذریعہ زجر و توبیخ کی جاتی ہے یا چیخ کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔

اسی طرح کبھی آپ نے مجھ سے یہ نہیں فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا اور نہ ہی یہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا یعنی جو دنیوی خدمت ان کے سپرد تھی یا دینی اُمور کے بارے میں بھی آپ نے ان کو کچھ نہیں فرمایا۔

اس سے رسول اللہ ﷺ کے کمال سماحت اور حسن خلق کا اندازہ ہوتا ہے مگر مشکوٰۃ کے شارح علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ ''اس سے حضرت انسؓ کا مقصد خود اپنی مدح و تحسین بھی ہے کہ میں نے ہرگز کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی وجہ سے آپؐ مجھ پر اعتراض و نکیر فرماتے۔ مگر یہ بات اہل نظر سے مخفی نہیں ہے کہ پہلا مفہوم موقع و محل کے لحاظ سے زیادہ مناسب و موافق ہے جو آپؐ کی مدح و ستائش اور شرافت و کرامت نیز حضرت انسؓ پر لطف و شفقت کا متضمن ہے''۔ (اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۳۶۸)

تسویۃ الصفوف کے باب میں جماعت کے صفوں کو درست نہ کرنے پر اس وعید کا ذکر ہے۔

اولیخالفن اللہ بین وجوھکم۔۔ اللہ تمہارے اندر مخالفت پیدا کر دے گا۔

اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے شیخ رقمطراز ہیں:

''حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں بھی اس قسم کی بات بیان ہوئی ہے، کہ اختلاف نہ کرو کہ تمہارے دل مختلف ہو جائیں یہ اس وجہ سے کہ اختلاف یا بعض لوگوں کے بعض پر اظہار تفوق سے قلوب میں باہم نفرت پیدا ہوتی ہے، کینہ کپٹ اور عداوت بھڑکتی ہے اور اس کے نتیجہ میں دین کے کلمہ میں اختلاف ہوتا ہے اور اسلام کی شوکت میں ضعف و انحلال واقع ہوتا ہے یا خدا اور رسول کے حکم کو ترک کرنے اور اس کی نافرمانی کی وجہ سے قلوب پر ظلمت و کدورت طاری ہوتی ہے جو انسان کے ظواہر میں بھی سرایت کر جاتی ہے اور یہ غالباً اختلاف کی خصوصیت ہے۔

حدیث کے سیاق سے یہی مفہوم ظاہر ہوتا ہے، لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ مخالفتِ وجوہ سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے چہروں کو ان کی پشت کی جانب کر دے گا یا ان کی شکل مسخ کر کے حیوانات کی صورت کا بنا دے گا جیسا کہ امام کی مخالفت کے سلسلہ میں وارد ہے کہ امام سے پہلے اپنا سر اٹھانے والا کیا اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ اس کے سر کو گدھے کے سر کی طرح کر دے گا''۔ (اشعۃ اللمعات ج ۱ کتاب الصلوۃ باب تسویۃ الصفوف ص ۲۳۳)

اس حدیث کی تشریح میں جس دوسری حدیث کا حوالہ ہے اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

امایخشی الذی یرفع راسہ قبل الامام ان یحول اللہ راسہ راس حمار۔

کیا وہ شخص جو امام سے پہلے (رکوع وسجدہ میں) اپنا سر اٹھاتا ہے، اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ اسکے سر کو گدھے کے سر سے پلٹ دے گا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ ایسے آدمی کی صورت کو اللہ تعالیٰ گدھے کی صورت جیسا بنا دے گا۔ شیخ عبدالحق اس روایت کی تشریح میں رقمطراز ہیں:

''امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ آدمی کی ناسمجھی اور بلادت سے کنایہ ہے اور اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ وہ کس قدر نافہم

Marfat.com

اور بلید ہے کہ امامت کا مفہوم بھی نہیں سمجھتا، ان کے نزدیک حدیث کی یہی تاویل متعین ہے چنانچہ وہ یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم برابر یہ دیکھتے اور مشاہدہ کرتے ہیں کہ امام سے سبقت کرنے والے کسی شخص کا چہرہ یا صورت گدھے کے چہرے یا صورت میں تبدیل نہیں ہوتا حدیث سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ تحویل کی خشیت ہے نہ کہ اس کا وقوع طبعی کا بیان ہے۔ گدھے کی صورت میں تبدیل کیے جانے سے مراد بلادت اور بیوقوفی ہے، مسخ اس امت میں روا نہیں ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ تحویل کا تعلق دنیا کے بجائے آخرت سے ہے، اس امت میں مسخ کے وقوع کے''۔

ان مثالوں سے ترجمہ وتشریح کی نوعیت وخوبی کا اندازہ ہوا ہوگا اب ہم اسکی بعض نمایاں خصوصیات تحریر کرتے ہیں:

خصوصیات:

اس کی چند نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

(۱) ترجمہ وتشریح میں سہل، عام فہم اور دلنشیں انداز و پیرایہ اختیار کیا گیا ہے، لیکن اس کی وجہ سے حدیث کا مطلب ومفہوم اچھی طرح واضح ہو گیا ہے اور عام لوگوں کے لیے بھی اس سے فائدہ اٹھانا ممکن ہو گیا ہے۔

(۲) اس میں اہم مباحث ومسائل سے بقدرِ ضرورت تعرض کیا گیا ہے، لیکن ان پر اس طرح بحث کی ہے کہ پڑھنے والا دقیق امور میں الجھے بغیر حدیث کی روح ومنشا سے واقف ہو جاتا ہے، ایسے موقع پر تفصیل واطناب اور غیر متعلق مباحث سے بھی پرہیز کیا گیا ہے تاکہ قاری کو اکتاہٹ اور گھبراہٹ نہ ہو۔

(۳) اختصار کے باوجود مطلب ومفہوم کو سمجھنے میں خلل اور دشواری نہیں ہوتی۔

(۴) مصنف نے احادیث سے دلچسپ استنباط کیا ہے۔

(۵) دفع تعارض بھی کیا ہے اور مختلف یا متضاد حدیثوں میں جمع وتطبیق کی ہے۔

(۶) تشریح وتفہیم کے لیے آیات قرآنی واحادیث نبوی سے استشہاد کیا ہے اور ائمہ دین، محدثین اور شراح کے اقوال بھی پیش کیے ہیں۔

(۷) حنفی مذہب کو شرح وبسط سے بیان کیا ہے اور اس کے دلائل نقل کیے ہیں اور اسے حدیث کے مطابق قرار دیا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ دوسرے فقہاء ومجتہدین کے اقوال ودلائل بھی ذکر کیے ہیں۔

(۸) الفاظ کی تحقیق اور راویوں کے بارہ میں معلومات تحریر کیے ہیں۔

(۹) یہ جس طرح عام لوگوں کے لیے کارآمد اور مفید شرح ہے، اسی طرح اہل علم اور خواص کے لیے بھی مفید ہے، اس بنا پر اساتذہ وطلبہ سب اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے یہ اہل علم میں ہمیشہ قدر وعظمت کی نگاہ سے دیکھی گئی، چونکہ مشکوٰۃ اکثر مدارس کے نصاب میں داخل ہے، اس لیے اس شرح سے بھی خاص طور پر استفادہ کیا جاتا ہے، اور شیخ کا مقدمہ تو عموماً مدارس کے نصاب کا جز ہی ہے۔

اس شرح کی اہمیت ومقبولیت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں، اور یہ متعدد بار شائع بھی ہو چکی ہے پہلے کلکتہ کے مطبع احمدی سے ۱۲۵۱ھ کے لگ بھگ چار ضخیم جلدوں میں چھپی، پھر بمبئی سے طبع ہوئی، اور مطبع نول کشور سے اس کے کئی ایڈیشن نکلے۔

Marfat.com

(۱۰) لمعات التنقیح علی مشکوٰۃ المصابیح: شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو حدیث کی کتابوں میں مشکوٰۃ المصابیح سے خاص دلچسپی تھی، اس لیے انہوں نے فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں اس کی شرح لکھی، یہ پہلے گزر چکا ہے کہ فارسی شرح لکھتے وقت چند ایسے اہم علمی مسائل و نکات ان کے سامنے آئے جن کو فارسی زبان میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے انہوں نے عربی میں شرح لکھنا شروع کیا (تعارف مخطوطات دارالعلوم دیوبند ص ۱۵ بحوالہ دیباچہ لمعات) اور فارسی سے پہلے یہ پایہ تکمیل کو پہنچ گئی۔

یہ شیخ کی تالیف انیق اور شرح احادیث میں ایک مکمل، جامع، مفید و نافع اور عظیم و جلیل کتاب ہے، جو مفید تحقیقات، لطیف نکات، دقیق مباحث اور گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے، (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۴ بحوالہ تالیف قلب الالیف) اس میں لغوی و نحوی مشکلات اور فقہی مسائل کو بہت خوبی سے حل کیا ہے۔

علاوہ ازیں احادیث سے فقہ حنفی کی مطابقت بھی کامیابی سے دکھائی ہے، خود فرماتے ہیں کہ اس شرح کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ حضرت امام شافعیؒ اصحاب رائے میں سے ہیں اور حضرت امام اعظم اصحاب ظواہر میں سے، انہوں نے شرح میں ایک ہی حدیث کے مختلف طرق روایات بھی جابجا بیان کر دیے ہیں اور راویوں کے اسماء والقاب صحت کے ساتھ منضبط کیے ہیں، شروع کا مقدمہ نہایت جامع و مفید ہے، جو مشکوٰۃ کے متن کے ساتھ اور علیحدہ رسالہ کی صورت میں بھی شائع کیا گیا ہے، (معارف دسمبر ۴۲ء مضمون ڈاکٹر زبید احمد صاحب) اس کے چند اردو ترجمے بھی ہوئے ہیں، یہ مقدمہ حدیث کے اقسام و اصطلاحات اور اصولی مباحث پر مشتمل اور نہایت مقبول ہے، افسوس ہے کہ شیخ کی یہ تالیف ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے، مگر اس کے قلمی نسخے بانکی پور پٹنہ، رام پور، حیدر آباد، پشاور، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، دہلی، علی گڑھ، اور دیوبند وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

شیخ کی اولاد و احفاد:

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے بعد بھی ان کے خاندان میں علمی روایات باقی رہیں اور ان کی اولاد و احفاد علم کی خدمت اور احادیث کی نشر و اشاعت میں مشغول رہی، ان کے کارنامے بھی اہم ہیں عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے:

"از اعقاب او ہفت تن تحصیل علم رسیدہ نمودہ بافادہ مشغول اند" (بادشاہ نامہ جلد اول نصف آخر ص ۳۴۲ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۷ء)

ہم ان سب کا مفصل حال تحریر کرنا چاہتے تھے مگر افسوس کہ تلاش و تفحص کے باوجود انکے زیادہ حالات دستیاب نہیں ہو سکے تاہم اس نسل و خانوادہ کے لوگوں کے جس قدر حالات معلوم ہو سکے ہیں ذیل میں وہ پیش کیے جاتے ہیں:

شیخ نور الحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی ۱۰۷۳ھ۔ ۱۶۶۳ء)

نام، خاندان، پیدائش، وطن اور تعلیم:

یہ شیخ عبدالحق کے سب سے بڑے بیٹے تھے، ان کا نام نور الحق، کنیت ابو السعادت اور لقب جمال تھا، ان کا خاندان بخارا (ترکستان) سے دہلی آیا تھا، اس لیے ترکی، بخاری اور دہلوی کی نسبتوں سے مشہور ہوئے، شیخ نور الحق شاعر تھے اور مشرقی تخلص

Marfat.com

کرتے تھے، اس لیے اس نسبت سے بھی مشہور ہیں۔

ان کی ولادت ۹۸۳ھ میں دہلی میں ہوئی، انہوں نے ساری تعلیم از ابتدا تا انتہا اپنے والد بزرگوار شیخ عبدالحق محدث سے حاصل کی اور حدیث کی سند بھی انہی سے لی۔ (مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۰۲ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۲۴)

درس وتدریس:

اپنے والد کے انتقال کے بعد سرکاری عہدہ سے مستعفی ہو کر ان کی مسند درس پر فروکش ہوئے اور اپنے خاندانی مدرسہ میں درسِ حدیث کی خدمت اور فرائض صدارت انجام دینے لگے، محمد صالح کنبوہ کا بیان ہے:

وپس از رحلت آں جناب نور الحق خلف الصدق کہ درعلم وفضل شہرۂ آفاق بود مدت مدید صدر آرائی مدرسہ استفادہ گشتہ۔

(عمل صالح ج ۳ ص ۳۷۸ شائع کردہ مجلس ترقی ادب' لاہور)

آنجناب (عبدالحق) کے رحلت فرمانے کے بعد ان کے خلف الصدق نور الحق جو علم وفضل میں شہرۂ آفاق تھے مدرسہ کے صدر نشین ہو کر عرصہ دراز تک لوگوں کو مستفید فرماتے رہے۔

مگر اس کا پتہ نہیں چلتا کہ کن لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا، شیخ اکرام نے صرف ایک شاگرد قطب المحدثین مولانا سید مبارک حسین واسطی بلگرامی (متوفی ۱۱۰۵ھ) کا نام تحریر کیا ہے۔ (رود کوثر ص ۳۸۸)

شیخ مبارک کے والد کا نام فخر الدین تھا یہ شعبان ۱۰۳۳ھ میں بلگرام میں پیدا ہوئے یہیں تعلیم کی ابتدا ہوئی اور بعض درسی کتابیں پڑھنے کے بعد دہلی تشریف لے گئے، اور خواجہ عبداللہ بن عبدالباقی نقشبندی کے حلقہ درس سے وابستہ ہوئے یہیں عبدالحق محدث دہلوی کے فرزند رشید شیخ نور الحق اور نواسے شیخ ابو رضا بن اسماعیل سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۰۶۴ھ میں اپنے وطن واپس آئے اور درس وتدریس کے مشغلہ میں لگ گئے، وہ ایک باوقار اور پُررعب شخص تھے، جن کے سامنے کسی کو منکر ومعصیت کے ارتکاب کی جرأت نہیں ہوتی تھی، اچھے مقرر وخطیب اور بڑے خلیق بھی تھے، ربیع الثانی ۱۱۱۵ھ میں انتقال ہوا۔ (مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۰۲)

جامعیت اور علمی کمالات:

شیخ نور الحق اپنے والد ماجد کی طرح علم وفضل میں یکتا اور ان کے دینی وعلمی کمالات کے وارث وجانشین تھے، آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ:

''یہ یگانہ روزگار حضرت شیخ کے خلف الصدق، ان کے شاگرد اور ان کے صوری ومعنوی کمالات کے وارث تھے''۔

(ایضاً ج ۱ ص ۲۰۳)

خود ان کے والد بزرگوار کو بھی ان کے علم وفضل کی بنا پر ان سے بڑا انس تھا اور وہ انہیں اپنا خلیفہ وجانشین کہتے تھے، اپنے رسالہ وصیت میں ان کے بارے میں اس کی تلقین فرماتے ہیں کہ فرزند عزیز نور الحق کو فقیر کا خلیفہ وجانشین سمجھا جائے اور ان کے ساتھ تعظیم وتقدیم سے پیش آیا جائے''۔ (بحوالہ حیات عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۵۸)

وہ حدیث وفقہ میں یگانہ اور بلند پایہ مؤرخ ہونے کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے، صاحب

Marfat.com

طبقات شاہجہانی نے انہیں "جامع علوم متداول" قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

ولد ارشد مخدوم الانامی شیخ عبدالحق دہلوی است ان علوم صوری و معنوی فراواں بہرہ دارد و منظور و مقبول پدر بزرگوار خود است اد از برکات آں نظر با علی مرتبۂ دانش و فضل برآمدہ و مقبول خاص و عام است۔

(طبقات شاہجہانی ص ۶۱۹ مخطوطہ نمبر ۲۲۶ فارسیہ اخبار یونیورسٹی کلکشن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

شیخ نور الحق مخدوم الانام شیخ عبدالحق دہلوی کے فرزند رشید ہیں، ان کو صوری و معنوی علوم سے بہرہ وافر ملا ہے، وہ اپنے پدر بزرگوار کے منظور نظر اور مقبول ہیں، ان کی نظر کی برکتوں کی وجہ سے فضل و دانش کے اعلا مرتبہ پر فائز اور خاص و عام ہر طبقہ میں مقبول ہیں۔

محمد صالح کنبوہ کا بیان اوپر گذرا ہے کہ "در علم و فضل شہرۂ آفاق بود" صاحب فرحت الناظرین رقمطراز ہیں:

فاضل محدث و عالم متبحر بود خلیفہ و جانشین پدر خود شیخ عبدالحق دہلوی است"۔

(اقتباس فرحت الناظرین ص ۵۸ مطبوعہ اورنٹیل کالج میگزین لاہور)

شیخ نور الحق متبحر عالم و فاضل محدث اور اپنے والد شیخ عبدالحق کے جانشین ہیں۔

بختاور خاں نے بھی ان کو "فاضل محدث و عالم متبحر" لکھا ہے، (مرأۃ العالم ج ۲ ص بتصحیح و مقدمہ ساجدہ علوی ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب لاہور) مولوی فقیر محمد جہلمی لاہوری رقمطراز ہیں:

شیخ نور الحق بن شیخ عبدالحق دہلوی فقیہ محدث جامع کمالات صوری و معنوی فاضل متبحر عالم تھے، اور تلمیذ و مرید و مقبول اپنے والد بزرگوار یگانہ روزگار کے تھے۔ (حدائق الحنفیہ حدیقہ یازدہم ص ۴۱۸ مطبع نول کشور ۱۳۶۴ھ ۱۹۰۶ء)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام تذکرہ نگاروں نے ان کے فضل و کمال کا اعتراف کیا ہے اور انکی علمی عظمت و برتری اور جامعیت پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔

فقہی مسلک:

اپنے والد کی طرح مسلکاً حنفی تھے، ان کی زندگی اس مسلک کی تائید و ترجیح اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے وقف رہی، اپنی تصنیف شرح بخاری شریف میں بھی اس مذہب کی تائید و تقویت کی ہے، صاحب فرحت الناظرین لکھتے ہیں:

در تقویت مذہب امام ابوحنیفہ جہد بلیغ نمودہ و احادیث مخالف ایں مذہب را تاویلات نجستہ فرمودہ۔

(اقتباس فرحت الناظرین ص ۵۸ و ۵۹)

امام ابوحنیفہ کے مذہب کو قوی قرار دینے میں جہد بلیغ سے کام لیا ہے اور اس مذہب کی مخالف حدیثوں کی تاویل و توجیہ کی ہے۔

بختاور خان کا بھی بیان ہے کہ "در تقویت مذہب امام ابوحنیفہ جہد بلیغ نمودہ"۔

زہد و اتقا:

علم کی طرح عمل کے جامع، ورع و تقویٰ میں ممتاز اور پاکیزہ خو تھے، سرکاری عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اس کی خرابیوں سے محفوظ اور قابل ستائش سیرت کے مالک تھے، ان کے والد بھی ان کی سیرت کی پاکیزگی و طہارت اور صلاح و تقویٰ کے معترف تھے اور انہیں اپنی نجات کا وسیلہ خیال کرتے تھے، فرماتے تھے کہ:

Marfat.com

''مجھ سے کوئی ایسا عمل نہیں ہوا جو عاقبت میں میری نجات کا سبب و واسطہ ہے، سوائے اس فرزند مسعود کے وجود کے کیونکہ لڑکا باپ کے اعمالِ خیر میں شمار ہوتا ہے'' (مکتوب شیخ عبدالحق بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۸۸)

خافی خان کا بیان ہے کہ:

از فضلائے نیک سیر آں عہد بود۔ (منتخب اللباب حصہ اول ص ۱۸۶۹۵۵۱ء کلکتہ)

۔ اس زمانہ کے نیک سیرت فضلا میں تھے۔

صاحب نزہۃ الخواطر نے محمود السیرۃ فی القضا تحریر کیا ہے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۴۲۲)

سلوک و معرفت:

شیخ نور الحق کا درجہ سلوک و عرفان میں بھی اونچا تھا، اپنے والد سے بیعت تھے، ان سے خلافت بھی پائی تھی، علم کی طرح تصوف و معرفت میں بھی ان کی جانشینی کی۔ سرکاری عہدہ سے سبکدوش ہو کر گو ہمہ تن حدیث کے درس و تدریس میں مشغول ہو گئے تھے، مگر اسی کے ساتھ ارشاد و ہدایت کا کام بھی انجام دیتے تھے۔

تصوف سے اشتغال کی بنا پر وہ صوفیوں اور درویشوں کے بارے میں حسن ظن اور اچھا اعتقاد رکھتے تھے صاحب طبقاتِ شاہجہانی کا بیان ہے:

اعتقادے صاف و اخلاق درست بدرویشاں و عارفاں دارد علی الخصوص بقدوہ عارفان و زبدہ خداشناساں خواجہ محمد باقی نقشبندی اویسی قدس سرہ و حضرت خواجہ نیز بوئے التفاتے خاص و توجہے تمام داشتہ چندگاہ درخانقاہ پدر بزرگوار خود بدرس قیام می نمودہ۔

(طبقات شاہجہانی قلمی ص ۶۱۹ و ۶۲۰ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

درویشوں اور عارفوں کے بارے میں صاف عقیدہ رکھتے تھے خصوصاً عارفوں اور خداشناسوں کے نمونہ خواجہ محمد باقی نقشبندی سے انہیں بڑا اخلاص تھا اور حضرت خواجہ بھی ان کے ساتھ بڑا اعتنا فرماتے تھے، شیخ نور الحق کچھ عرصہ تک اپنے والد کی خانقاہ میں درس میں بھی مشغول رہے۔

مولوی رحمان علی نے ان کو خواجہ محمد معصوم مجددی کا مرید بتایا ہے، (تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۶) مگر بعض اہل علم کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے، دراصل وہ اپنے والد ہی کے مرید و خلیفہ تھے، اور ان کی وفات کے بعد حضرت عاشق محمد نبیرہ حضرت خواجہ شاہ نظام الدین نارنولی سے عقیدت و ارادت رکھنے لگے تھے۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۵۸)

عہدۂ قضاء:

اپنے علمی و دینی کمالات، ورع و تقویٰ، علوم و فنون میں مہارت، خصوصاً فقہ و حدیث میں امتیاز کی بنا پر عہد شاہجہانی میں اکبر آباد کے قاضی مقرر ہوئے، شاہجہان کو اپنے ایام شہزادگی ہی سے شیخ نور الحق کے علم و کمال سے واقفیت تھی، اس لیے وہ ان کے ساتھ بڑی خصوصیت کا معاملہ کرتا تھا اور جب دکن روانہ ہونے لگا تو اکبر آباد کا محکمہ قضا سپرد کیا، وہ اس عہدہ پر اپنے والد کی زندگی تک فائز رہے انہوں نے اس نازک اور بھاری ذمہ داری کو بڑی خوش اسلوبی اور نہایت دیانتداری کے ساتھ انجام دیا طبقاتِ شاہجہانی کے مصنف کا بیان ہے:

Marfat.com

چوں حضرت صاحب قرن ثانی از جوہر استعداد عالی دے از ایام شاہزادگی مطلع بودند وقتیکہ متوجہ دکن شدند اورا قاضی اکبرآباد کردند الیوم بقضائے قیام وارد وحق قضا چنانکہ باید ادا کردہ۔ (طبقات شاہجہانی ص ۶۱۹و۶۲۰)

چونکہ بادشاہ شاہزادگی کے زمانہ ہی سے شیخ نورالحق کی بلند استعداد سے واقف تھے اس لیے جب دکن روانہ ہونے لگے تو انہیں اکبرآباد کا قاضی مقرر کیا، اس وقت شیخ قضا کے منصب پر فائز ہیں اور اس ذمہ داری کو جیسا چاہیے تھا ادا کر رہے ہیں۔

آزاد بلگرامی رقمطراز ہیں:

وھوادی ھذا المنصب العالی فی نھایۃ الدیانۃ والسداد۔

(سبحۃ المرجان ص ۱۴۱ تحقیق الدکتور فضل الرحمٰن ندوی معہد الدراسات الاسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

اور شیخ نورالحق نے اس بڑے عہدہ کو نہایت دیانتداری اور بڑی خوبی سے ادا کیا۔

مولوی فقیر محمد جہلمی کا بیان ہے:

''شاہجہاں ایام شاہزادگی سے آپ کے جوہر استعداد عالی سے اطلاع رکھتا تھا، جب دکن کو جانے لگا تو آپ کو اکبرآباد کا قاضی مقرر کیا گیا، چنانچہ آپ نے ایک مدت تک قضا کے منصب کو جیسا کہ چاہیے ادا کیا''۔ (حدائق الحنفیہ ص ۴۱۸)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے فیصلے منصفانہ ہوتے تھے اور وہ اس بارے میں حق و انصاف سے کام لیتے تھے، اور کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔

سلاطین سے تعلقات اور ان کی قدردانی:

شیخ نورالحق اپنے فضل و کمال اور حسن سیرت کی بنا پر علماء مشائخ کی طرح سلاطین میں بھی مقبول و محبوب تھے، اوپر بتایا جا چکا ہے کہ شاہجہاں اپنے بچپن ہی سے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں سے واقف تھا اس لیے انہیں اس نے عہدۂ قضا پر مامور کیا وہ ان پر بڑا اعتماد کرتا تھا اور ان کا بہت قدرداں تھا، شیخ عالمگیر کے دربار میں بھی باریاب ہوتے اور انعامات سے نوازے جاتے، صاحب فرحت الناظرین لکھتے ہیں:

بارہا بہ ملازمت اقدس عالمگیر بادشاہ رسیدہ بغایات پادشاہانہ ممتاز گردیدہ بود۔ (اقتباس فرحت الناظرین ص ۵۸و۵۹)

کئی بار عالمگیر بادشاہ کی خدمت میں تشریف لے گئے اور شاہی انعامات سے ممتاز و مفتخر ہوئے۔

شعر و سخن:

شیخ نورالحق شعر و ادب کا ستھرا ذوق رکھتے تھے، خود بھی موزوں طبع تھے اور نثر ہی کی طرح نظم پر بھی ان کو بڑی قدرت تھی، بختاور خاں کا بیان ہے کہ نظم و نثر دونوں میں یکتا تھے، مگر ان کی خاص توجہ نثر ہی کی طرف رہی البتہ بمقتضائے طبیعت کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، مشرقی تخلص تھا، ان کے والد محترم کو بھی انکے شاعرانہ کمالات کا اعتراف تھا اپنی کتاب اخبار الفضلاء میں لکھتے ہیں کہ:

''ان کی طبیعت میں جودت تھی، اور انہیں ذوق سلیم ملا تھا، بڑے صاحب ذوق اور ذی فضل و کمال تھے، کبھی کبھی شعر کہتے اور مشرقی لقب تھا، اگر ساری توجہ شعر ہی کی طرف ہوتی تو نظامی وخسرو کے خمسہ کا تتبع کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے علم و صلاح

Marfat.com

سے اصل سروکار رکھا اور یہی اصلی اور بنیادی چیز بھی ہے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۴۲۴)
صاحب طبقات شاہجہانی لکھتے ہیں:

از شعر و انشاء نیز بحظے ادفر محظی است۔ (طبقات شاہجہانی مخطوطہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ص ۶۱۹ و ۶۲۰)
انہیں شعر و انشاء میں سے بھی بڑا وافر حصہ ملا ہے۔

ایک مثنوی تحفۃ العراقین اور ایک دیوان یادگار چھوڑا جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل تھا تذکرہ نگاروں نے ان کی بعض رباعیاں اور اشعار نقل کیے ہیں، ایک رباعی ملاحظہ ہو:

از شیوہ ہمدماں ایں دور خلاف — گویم رمزی اگر نگیری بگزاف
چوں شیشہ ساعت اند پیوستہ بہم — دلہا ہمہ پر غبار و رہا ہمہ صاف

ان کا ایک شعر یہ ہے:

با آنکہ مشرقی ہمہ تن دیدہ چوں گل است ☆ باہیچ کس چو چشم حباب آشنا بود

(فرحت الناظرین ص ۱۰۵)

صاحب طبقات شاہجہانی نے بھی چند اشعار نقل کیے ہیں۔

وفات:

نوے برس کی عمر میں ۹ شوال ۱۰۷۳ھ کو انتقال کیا، فیض العلم سے تاریخ وفات نکلتی ہے، بعض تذکروں میں ۱۰۸۳ھ لکھ گیا ہے جو کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، اپنے والد کے مقبرہ میں ان کے جوار میں دفن ہوئے۔

(اقتباس فرحت الناظرین ص ۵۸ و ۵۹ و مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۰۲)

اولاد و احفاد:

شیخ نور الحق کے ایک ہی بیٹے تھے، جن کا نام نور اللہ تھا، اُن کے چار فرزند تھے۔

تصنیفات:

شیخ نور الحق اپنے والد ہی کی طرح بلند پایہ مصنف تھے، اور اس حیثیت سے بھی وہ الولد سر لابیہ کا مصداق تھے۔ ان کی تحریر سلیس اور زبان شستہ ہوتی تھی، اس کا اندازہ اس کتبہ سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے والد کے مقبرہ کے لیے لکھا تھا، ان کی بحث و استدلال میں قوت اور زور ہوتا تھا، ان کی تصنیفات کو بڑا حسن قبول نصیب ہوا، مولانا حکیم سید عبدالحی کا بیان ہے کہ ان کی کتابوں سے فیض ربانی کی تاثیر ظاہر ہوتی ہے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۴۲۵)
جن کتابوں کا علم ہو سکا ہے ان کا حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) اثبات رفع المسبحۃ فی التشہد، یہ ایک مختصر رسالہ ہے، (ایضا) موضوع نام سے ظاہر ہے۔ (۲) تحفۃ العراقین، یہ شیخ نور الحق کی مثنوی کا نام ہے۔ (۳) تعلیقات علی شرح المطالع۔ (۴) تعلیقات علی شرح ہدایۃ الحکمۃ۔ (۵) تعلیقات علی العضدیہ۔ (یہ سب درسی کتابوں کی شروح و حواشی ہیں)۔ (ایضاً ص ۵۸ و ۵۹)

Marfat.com

(۶) تفسیر سورۃ فاتحہ، اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ہے۔ (۷) حاشیہ علی شرح الجامی: پشاور، حیدرآباد میں قلمی نسخے موجود ہیں۔ پشاور کا نسخہ خوشخط ہے۔ (لباب المعارف الاسلامیہ پشاور ص ۲۵۲) (۸) دیوان مشرقی: پانچ ہزار اشعار پر مشتمل دیوان تھا۔ (فرحت الناظرین ص ۱۰۵) (۹) رسالہ در بیان رؤیا۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۶۰)

(۱۰) زبدۃ التواریخ: یہ کتاب نواب مرتضیٰ خان کی فرمائش پر لکھی گئی، بعض تذکرہ نگاروں نے اسے ان کے والد کی تصنیف بتایا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ نواب صاحب نے ان کے والد سے اس کے لکھنے کی فرمائش کی تھی مگر وہ اپنی مشغولیتوں کی بنا پر اس کے لیے فرصت نہیں نکال سکے اس لیے شیخ نورالحق نے نواب صاحب کی فرمائش کی تکمیل کی اور یہ کتاب لکھی، شیخ اکرام کے خیال میں یہ کتاب فی الحقیقت شیخ عبدالحق کی کتاب ذکرالملوک کا ترمیم شدہ نسخہ ہے، لیکن اس میں عہد اکبری کے حالات اضافہ کیے گئے ہیں، (رود کوثر ص ۳۸۸) سی، اے، اسٹوری کا بیان ہے کہ معزالدین محمد بن سام غوری کے عہد سے لے کر جہانگیر کی تخت نشینی ۱۶۰۵ھ تک کے حالات ان کے والد نے لکھے، اس کے بعد کا حصہ شیخ نورالحق نے لکھا۔

(پرشین لٹریچر ج اول ص ۴۲۲)

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ یہ کتاب ہندوستان کی تاریخ ہے اور اس میں محمد غوری کے زمانہ سے جہانگیر کے زمانہ تک کے حالات درج ہیں اور نواب مرتضیٰ خاں کا حال بھی تحریر کیا گیا ہے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ شیخ نورالحق نے اس میں اپنے والد کی تصنیف ذکرالملوک کے بڑے حصہ کا خلاصہ دے دیا ہو اور کہیں کہیں معمولی ردوبدل بھی کیا ہو باقی آخری دور کے حالات خود ان کے قلم سے ہونگے اسی بنا پر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دراصل ان کے والد کی تاریخ حقی کا ایک بڑا ایڈیشن ہے، (تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند ج ۴ ص ۵۰۴ فارسی ادب دوم) اس کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد اور برلین میں موجود ہیں، (اسٹوری ص ۴۴۲) ایلیٹ نے اپنے ہسٹری آف انڈیا میں اس کا کچھ حصہ شامل کیا ہے۔ (حواشی تذکرہ علمائے ہند محمد ایوب قادری ص ۵۳۵)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں دکن کی تاریخ بہت مختصر ہے اور بعض علاقوں کی تاریخ سرے سے غائب ہے، صرف دہلی، مالوہ، گجرات، دکن، کشمیر سندھ، ٹھٹھہ، ملتان، بنگال اور جون پور کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔

(اسٹوری ص ۴۴۱ و ایلیٹ ج ۶ ص ۱۸۳)

(۱۱) شرح بخاری: اس کا ذکر آگے آئے گا۔ (۱۲) شرح شمائل: یہ فارسی میں شمائل ترمذی کی شرح ہے، (الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند طبع دوم ص ۱۵۳) قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں ہے۔ (حیات شیخ عبدالحق ص ۲۵۹)

(۱۳) شرح صحیح مسلم: اس کا ذکر مولوی رحمان علی نے کیا ہے (بحوالہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند ج ۴ ص ۵۰۴ فارسی ادب دوم) اور اسٹوری نے بھی کیا ہے، اور نام منبع العلم بتایا ہے، مگر یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے لڑکے فخرالدین محب اللہ نے اس کو ترتیب دیا، معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیخ نورالحق ہی کی تصنیف ہے، جس کو فخرالدین نے ازسرنو مرتب کیا اور اس میں کچھ اضافے بھی کئے۔

(۱۴) محی القلوب۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۶۰)

(۱۵) نورالعین در شرح قران السعدین: یہ خسرو کی مشہور مثنوی قران السعدین کی شرح ہے۔ (معارف اکتوبر ۴۶ء ص ۲۸۷) جس میں کیقباد اور بغرا خان کی ملاقات کا حال بیان کیا گیا ہے، شیخ نورالحق نے اس کی شرح لکھی جس کو ان کے والد نے بھی ملاحظہ فرمایا تھا، اور اس میں انہوں نے بعض اضافے بھی کیے تھے۔ اس کے قلمی نسخے برٹش میوزیم اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

Marfat.com

کے کتاب خانے میں موجود ہیں۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۶۰)

مولانا یوسف بنوری نے شیخ نورالحق کو شارح مؤطا بھی لکھا ہے، (المقدمات البنوریہ ص ۲۸ ۱۴۰۰ھ۔ ۱۹۸۰ء کراچی) مگر کسی اور تذکرہ نگار نے ان کی شرح مؤطا کا ذکر نہیں کیا ہے، دراصل شیخ شارح بخاری تھے، غالباً مولانا کا وہم ہے۔

☆ تیسیر القاری: اس کا ذکر پہلے آچکا ہے لیکن چونکہ یہ شیخ نورالحق کی سب سے اہم اور ممتاز تصنیف ہے اس لیے اس پر کسی قدر تفصیل سے اظہار خیال کیا جاتا ہے،

شیخ کے والد بزرگوار شیخ عبدالحق دہلوی نے مشکوٰۃ المصابیح کا ترجمہ وتشریح کر کے فارسی زبان میں احادیث نبوی کی شرح وترجمے کے جس کام کی ابتدا کی تھی، ان کے فرزند اور خلف الرشید نے اس سلسلہ کو مزید آگے بڑھایا اور فارسی زبان میں بخاری شریف کا ترجمہ اور اس کی شرح لکھی جس کو شہنشاہ ہند اورنگزیب عالمگیر کے نام معنون کیا، اس کا وہی طرز وانداز ہے جو ان کے والد کی تصنیف شرح مشکوٰۃ کا ہے، یہ شرح دراصل انہی کے ایما سے لکھی گئی تھی، مولانا نورالحق تحریر فرماتے ہیں:

والد ماجد چاہتے تھے کہ صحیح بخاری کی شرح وتعلیق بھی اسی رنگ کی فارسی زبان میں لکھی جائے جیسی کہ وہ خود مشکوٰۃ المصابیح کی لکھ چکے تھے اور جس کو بڑی شہرت اور غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور تمام مسلمان اس کے فیوض سے بہرہ مند ہوئے، لیکن چونکہ ہر کام کا وقت مقرر ہوتا ہے اس لیے ان کی زندگی میں اس اہم اور عظیم الشان کام کو انجام دینے کی توفیق میسر نہیں ہوئی اور ان کے انتقال کے بعد استخارہ کر کے ان کے حکم کی تعمیل میں کمر ہمت باندھی گئی۔ (تیسیر القاری ج اول ص ۲)

شیخ نورالحق نے بخاری کی مروج ومتداول شرحوں کرمانی، فتح الباری، عینی سیوطی اور قسطلانی وغیرہ کو اپنا ماخذ بنایا اور ان سے مکمل استفادہ کیا، لیکن اس میں ان شرحوں کی طرح زیادہ اطناب وتفصیل سے کام نہیں لیا ہے بلکہ فارسی زبان میں ضروری مقاصد ومطالب مکمل طور پر اس طرح بیان کر دینے کی کوشش ہے کہ پایہ کمال دانش سے قاصر طالبین کے لیے بھی مطالعہ بخاری سہل اور آسان ہو جائے، مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی مرحوم لکھتے ہیں۔

"گو بخاری شریف کی مفصل ومختصر شرحیں لکھی جا چکی تھیں لیکن زبان کے فرق کی وجہ سے اہل عجم صحیح بخاری کی تحصیل اور اس کے اسرار ودقائق سے کماحقہ واقفیت سے قاصر ومحروم تھے، تا آنکہ مولانا نورالحق نے اس کی فارسی شرح لکھی جس کا نام انہوں نے تیسیر القاری رکھا جس میں مفید مطالب عمدہ فوائد، لطیف مباحث اور دقیق غرائب بیان کیے، اللہ تعالیٰ ان کی سعی کو مشکور بنائے اور انہیں جزائے خیر دے کیونکہ انہوں نے تمام لوگوں کے لیے صحیح بخاری کی تحصیل کو آسان کر دیا اور ہر قاری و سامع کے لیے اسے سہل بنا دیا۔ (تیسیر القاری ج اول آغاز)

شرح کے شروع میں ایک مقدمہ ہے، اس میں امام بخاری کے حالات وسوانح، حدیث میں ان کے علوئے مرتبت اور دوسرے کمالات وغیرہ پر بحث وگفتگو کی گئی ہے، اس کے بعد پہلے بخاری شریف کی مرویات کا معنی خیز ترجمہ کیا ہے، پھر ان کی مختصر اور جامع تشریح کی ہے، یہ شرح وترجمہ متن کے ساتھ نواب محمد علی خاں بہادر صولت جنگ والی ریاست ٹونک کی توجہ سے مطبع علوی محمد علی بخش لکھنؤ سے ۵ جلدوں میں شائع ہوا ہے جن کی تصحیح وتہذیب کی خدمت مولوی محمد معشوق علی نے انجام دی ہے، حواشی پر اسی خانوادہ کے ایک بزرگ شیخ الاسلام کی شرح بخاری، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا رسالہ ترجمۃ الابواب اور ایک رسالہ اسماء الرجال بھی درج ہے، پہلی جلد کے شروع میں مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی اور بعض دوسرے حضرات کی تقریظیں بھی

Marfat.com

دی گئی ہیں، دوسری جلدوں کے آخر میں بھی منثور و منظوم تقریظیں شامل ہیں، ذیل میں اس شرح کی خوبیوں اور خصوصیات کو پیش کیا جاتا ہے۔

کتب کی ابتدا کے نوٹ:

تیسیر القاری میں بخاری شریف کی کتب و ابواب کے شروع میں بطور تمہید شارح نے مختصر نوٹ تحریر کیے ہیں جو عموماً قابل غور اور لائق توجہ ہیں اور ان سے اس شرح کی خصوصیتیں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کی ابتدائی باب کیف کان بدء الوحی سے کی ہے، اور کتاب الوحی کا عنوان نہیں قائم کیا ہے، مولانا نور الحق اس کے شروع میں یہ نوٹ فرماتے ہیں:

''مؤلف نے کتاب کے ابتدا میں وحی اور اس کے آغاز کے بارے میں جو حدیثیں نقل کی ہیں ان کی حیثیت کتاب کے مقدمہ کی ہے، انہوں نے اس کو پسند نہیں کیا کہ خطبہ یا کسی اور قسم کی بات کو ابتدا میں لاکر دوسرے لوگوں کی طرح کلام رسول پر اپنے کلام کو مقدم کریں، انہوں نے بہت سے ابواب میں یہ انوکھا طریقہ اختیار کیا ہے کہ حدیثوں ہی کو ان کا عنوان بنایا ہے اور ان کی تائید کیلئے یا ان سے ربط کی بنا پر آیتیں نقل کی ہیں، اس باب کے عنوان میں بھی انہوں نے آیت نقل کی ہے اور اس کے تحت جو حدیثیں لائے ہیں ان میں آپؐ کی جانب کی جانے والی وحی کی صورت و کیفیت اور آپ تک اس کے پہنچنے اور اترنے کی شکل بیان کی گئی ہے علاوہ ازیں مصنف نے اس سے بھی آگاہ کیا ہے کہ وحی تمام انبیاء و رسل کی ایک مستمر خصوصیت و امتیاز ہے۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کا آغاز حدیث: انما الاعمال بالنیات سے کر کے یہ واضح کیا ہے کہ صحیح نیت اور تقرب الی اللہ کے جذبہ کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احادیث کا یہ مجموعہ مرتب کرنے میں خود ان کی نیت پاکیزہ اور ارادہ صحیح رہا ہے، اس طرح حدیث کی طلب و تحصیل کرنے والوں کو انہوں نے بتایا ہے کہ وہ درست اور صحیح ارادہ سے اس کتاب کو شروع کریں''۔ (تیسیر القاری ج ۱ ص ۶)

شارح کے اس نوٹ میں جن نکتوںؔ کی نشاندہی کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) اس میں صحیح بخاری کے ابواب و کتب کی بعض منفرد اور انوکھی نوعیتیں اور خصوصیتیں بتائی گئی ہیں۔ (۲) شروع میں خطبہ کتاب نہ تحریر کرنے کی وجہ بتائی ہے۔ (۳) صحیح بخاری کا آغاز وحی سے متعلق روایتوں سے کیوں کیا گیا ہے، نیز ان حدیثوں میں کس امر کا ذکر ہے؟ (۴) الاعمال بالنیات سے صحیح بخاری کے آغاز کی وجہ کیا ہے؟

کتاب الایمان اور کتاب العلم کے شروع میں بھی مختصر انوٹ قلمبند کیا گیا ہے اور کتاب الوضو کی ابتداء میں جو نوٹ تحریر کیا گیا ہے اس میں پہلے اور بعد کی کتب و ابواب سے صحیح بخاری کی باہمی مناسبت اس طرح واضح کی ہے۔

''مصنف نے کتاب کو احادیث وحی سے شروع کیا تھا جو دینی احکام کی اصل الاصول اور بنیادی سرچشمہ ہے اس کے بعد ایمان کی حدیثیں لائے ہیں کیونکہ تمام احکام کی اصل و بنیاد یہی ہے، اس کے بعد احادیث علم کو بیان کیا ہے کیونکہ احکام اسی سے وابستہ ہوتے ہیں اور جب احکام وعبادات کا بیان شروع کیا تو نماز کا ذکر دوسری عبادتوں سے پہلے اس لیے کیا ہے کہ وہ تمام عبادتوں میں سب سے افضل ہے اور نماز سے پہلے طہارت کی حدیثیں اس لیے بیان کی ہیں کہ نماز کی سب سے اہم اور بڑی شرط یہی ہے اور قاعدہ ہے کہ شرط مشروط پر مقدم ہوتی ہے'' (ج اول ص ۷)

Marfat.com

بعض کتب کے شروع کا نوٹ قدرے طویل ہے، ان میں مختلف لغوی، فقہی اور علمی مسائل زیر بحث آئے ہیں اس سلسلہ میں کتاب التہجد کا نوٹ لائق مطالعہ ہے مگر طوالت کے سبب سے اس کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

استنباط واخذ نتائج:

شارح نے احادیث کی شرح وتوضیح کرتے ہوئے ان سے کہیں کہیں مفید استنباط اور دلچسپ نتائج اخذ کیے ہیں ان پر بھی ایک نگاہ ڈال لینا مفید ہوگا۔

صحیح بخاری کی کتاب الایمان میں ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے حضرت عدی کو لکھا کہ ایمان کے فرائض، شرائع حدود اور سنن ہیں جس نے ان کو کمال تک پہنچایا اس نے ایمان کو کمال تک پہنچایا اور جس نے ان کو تمام وکمال تک نہیں پہنچایا اس نے ایمان کو تمام وکمال تک نہیں پہنچایا، اس سے شارح کا یہ استنباط ملاحظہ ہو:

''حضرت عمر بن عبدالعزیز کا یہ قول اس پر دلالت کرتا ہے کہ تصدیق واعمال ایمان کامل میں داخل ہیں جیسا کہ معمولی فہم و دانش سے یہ بات ظاہر ہے'' (ج اوّل ص ۱۷)

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اس قول کے بعد مصنف حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

اجلس بنا نومن ساعة۔

ہمارے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھو تاکہ ہم امور آخرت واحکام دین کا ذکر کرکے ایمان کی زیادتی کا سامان کریں۔

مولانا نورالحق فرماتے ہیں کہ:

''اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ امور دین ایمان میں داخل ہیں، نؤمن سے ظاہر ہے کہ تجدید ایمان مراد ہے''۔

آگے امام بخاریؒ حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ ''بندہ مؤمن کی رسائی تقویٰ کی حقیقت تک اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ ان چیزوں کو بھی نہ چھوڑ دے جو اس کے سینہ میں کھٹکیں اور خلجان پیدا کریں'' اس کے متعلق حضرت شیخ نورالحق فرماتے ہیں کہ:

''اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بعض مؤمنین ایمان کی حقیقت اور کنہہ تک پہنچ جاتے ہیں اور بعض نہیں پہنچتے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایمان متجزی ہے، اس کے اجزا ہوسکتے ہیں۔ (ص:۱۷)

امام بخاریؒ نے تحویل قبلہ کے بیان میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ ''نبی ﷺ نے کعبہ کی جانب رخ کرکے سب سے پہلے عصر کی نماز پڑھی، آپؐ کے ساتھ اس نماز کو پڑھنے والے لوگوں میں سے ایک صاحب کسی اور مسجد کے پاس سے گزرے جہاں لوگ رکوع میں تھے، تو انہوں نے فرمایا کہ میں اللہ کی گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ کی جانب رخ کرکے نماز پڑھی ہے، شیخ نورالحق اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

''یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ دیانات میں خواہ وہ فرائض ہی کیوں نہ ہوں ایک شخص کی بات پر بھی عمل کیا جاسکتا ہے''

(ج ۱ ص: ۳۰)

امام بخاری نے کتاب الایمان میں ایک باب یہ قائم کیا ہے کہ ''فتنہ اور آزمائش کی جگہ سے فرار اختیار کرنا بھی دین و ایمان میں داخل ہے'' اس سلسلہ میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث درج کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا

Marfat.com

ہے کہ ”قریب ہے کہ مسلمان کا بہترین مال بکریوں کو وہ گلہ ہو جس کو لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور پانی والی جگہوں میں گوشوں اور صحراؤں میں بھاگ جائے تاکہ وہ اپنے دین کو فتنوں اور آزمائشوں سے بچالے“۔

شیخ نورالحق اس کی شرح میں ان نکتوں کی نشاندہی کرتے ہیں:

”اس میں سلف کا اختلاف ہے کہ خلق سے عزلت وانزوا بہتر ہے یا ان کے درمیان رہنا؟ بعض لوگوں نے عزلت کے فائدوں کو مدنظر رکھ کر کہا ہے کہ خلق سے انقطاع میں شر وفساد سے سلامتی رہتی ہے، اور طاعت وعبادت، جمعیت باطن اور ذکر الٰہی کے لیے وقت فارغ رہتا ہے، اس میں آدمی کو اپنی حالت کے لحاظ سے اخلاص وعمل کا موقع ملتا ہے اس لیے عزلت ہی بہتر ہے، لیکن جن لوگوں کی نظر اختلاط وصحبت کے ان فوائد پر ہے کہ اس میں علم دین کو سیکھنے اور سکھانے کی توفیق ملتی ہے، لوگوں کی داد وتحسین نصیب ہوتی ہے، ان کی جفا وایذا پر صبر وتحمل کا اجر ملتا ہے، اور ان کے ساتھ تواضع سے پیش آنے، بیماروں کی عیادت، جنازہ میں شرکت ومشایعت، جمعہ اور فرض نمازوں کی جماعت میں حاضری کا موقع میسر آتا ہے وغیرہ وغیرہ تو وہ لوگ ان دینی فوائد ومصالح کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ اختلاط اور خلق کے اندر رہنا ہی پسندیدہ اور بہتر ہے۔ قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ“۔ (ج ا ص: ۲۱، ۲۲)

دفع تعارض:

شیخ نورالحق نے اپنی شرح میں احادیث کے ظاہری تضاد کو بھی رفع کیا ہے مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جب حضرت جبرائیل پہلی بار وحی لے کر آئے تو آپ پر جو اضطرابی کیفیت طاری ہوئی اس کے ازالہ کے لیے حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دینے اور آپ کی وحشت کو دور کرنے والی جو باتیں فرمائیں ان میں آپ کے ان مکارم اخلاق اور عمدہ اوصاف کا خاص طور پر ذکر کیا جو آپؐ میں بدرجہ اتم پائے جاتے تھے، اور جن کا انہوں نے اچھی طرح مشاہدہ کیا تھا، حضرت خدیجہؓ کا استدلال اس طور پر تھا کہ آپؐ کے ان اوصافِ حمیدہ کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ ہرگز آپ کو بے سہارا نہ چھوڑے گا اور نہ آپ جیسے عمدہ اطوار وعادات کے آدمی کو وہ ذلیل وخوار اور بے یار ومددگار چھوڑے گا، شیخ نورالحق اس حدیث سے اوّلاً تو یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ واقعی اگر کسی کے اندر مدح وستائش کے لائق باتیں ہوں تو انہیں اس کے سامنے بیان کرنا روا ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے رہی وہ حدیث جس میں اس کے برعکس یہ کہا گیا ہے کہ

”اپنی تعریف کرنے والے کے منہ میں خاک ڈال دو“۔

تو یہ حکم ایسے شخص کے ساتھ مخصوص ہے جو مدح وستائش کو اپنا شیوہ اور شعار بنالے یہ بلاشبہ ایک نامناسب فعل ہے۔ (ج ا ص: ۹)

صحیح بخاری کی کتاب الایمان میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے یہ حدیث بیان کی گئی ہے کہ ”ایک نیکی کا بدلہ دس سے لے کر سات سو گنا تک ملتا ہے، شارح فرماتے ہیں کہ عدد کی اس صراحت وقطعیت سے اس کے سوا کی نفی مقصود نہیں ہے، اس بنا پر یہ حدیث اس حدیث کے معارض نہیں ہے جس کو مصنف باب رقاق میں لائے ہیں کہ ”سات سو سے بہت زیادہ گنا تک اجر ملتا ہے کیونکہ تضعیف کا معاملہ اللہ کے فضل وارادہ سے جڑا ہوا ہے، وہ جس کو جس قدر چاہتا ہے عطا کرتا

Marfat.com

ہے۔ (ص: ۳۰)

مشہور حدیث ہے کہ حضرت جبرائیلؑ نے رسول اکرم ﷺ سے ایمان، اسلام اور احسان کے بارہ میں سوال کیا۔ امام بخاریؒ نے اسلام کے متعلق ایک ایسی روایت نقل کی ہے جس میں حج کا ذکر نہیں ہے جب کہ دوسری حدیثوں میں اور عبادات کی طرح اس کا بھی ذکر ہے، اس کو بعض لوگوں نے راوی کے سہو ونسیان کا نتیجہ بتایا ہے، شیخ نورالحق فرماتے ہیں:

''بخاری کے رواۃ میں اس طرح کے احتمال کو راہ دینا نامناسب اور بعید ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس وقت آپ نے یہ فرمایا تھا، اس وقت حج فرض نہیں ہوا تھا، اس سے ابن مندہ کی وہ تصریح باطل ہو جاتی ہے جس کو انہوں ایسی سند سے بیان کیا ہے جو امام مسلم کی شرط کے مطابق ہے اور جس میں وضاحت کے ساتھ یہ مذکور ہے کہ حضرت جبرائیلؑ رسول اللہ ﷺ کی عمر کے آخری زمانہ میں تشریف لائے تھے، حضرت جبرائیلؑ کے اس واقعہ سے متعلق بعض روایتوں میں کچھ مزید اعمال کا ذکر بھی ہے، لیکن بعض میں ان سے کم اعمال کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلاف سائل کے سوال اور مقتضائے حال کے اعتبار سے تھا واللہ اعلم''۔

(ج ۱، ص: ۳۵)

اشکالات کے جواب:

شیخ نورالحق نے بعض جگہ شکوک وشبہات اور اشکالات کے جواب بھی دیئے ہیں جن میں وہ عام شارحین کی رائے سے یک گونہ اختلاف کرتے ہیں مثلاً حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی سچی دل سے گواہی دینے والا کوئی شخص ایسا نہیں جس پر اللہ آگ کو حرام نہ کردے۔

حضرت معاذ نے آپ کا یہ ارشاد سن کر فرمایا: ''اے اللہ کے رسولؐ! کیا میں اس سے لوگوں کو مطلع نہ کردوں تاکہ وہ بشارت سن لیں؟'' آپؐ نے فرمایا تب تو لوگ اسی پر بھروسہ کرلیں گے اور عمل سے دست کش ہو جائیں گی۔ اس کے بعد اسی روایت میں ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت کتمانِ علم کے گناہ کے اندیشہ سے یہ بات بیان کردی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبر کے حکم کی تعمیل نہ کرنا بھی تو ایک گناہ ہے حضرت معاذؓ نے جب اس کی خبر دیدی تو وہ اس گناہ کے مرتکب ہو گئے، شیخ نورالحق اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ آپؐ کی نہی تحریمی کے بجائے تنزیہی تھی، اور کتمان علم کی نہی تحریمی ہے، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ مجتہدین صحابہ میں تھے اس لیے آخر میں انہوں نے اس کو ترجیح دے کر اس پر عمل کیا۔

شارحین کہتے ہیں کہ امر ایجابی ہے اور نہی اتکال (تکیہ اور بھروسہ کرنے) سے مقید ومشروط ہے، حضرت معاذؓ چونکہ دین میں کوہِ راسخ تھے اسی لیے آنحضرت ﷺ نے انہیں یہ مژدہ جانفزا سنایا اور ہر شخص کو اسے سنانے سے منع فرمایا چنانچہ انہوں نے اس کی خبر ایسے شخص کو اسے سنانے سے منع فرمایا چنانچہ انہوں نے اس کی خبر ایسے شخص کو دی ہوگی جس کے بارے میں انہیں اس کا اندیشہ نہ رہا ہوگا کہ وہ اس پر بھروسہ کرے گا مگر شیخ نورالحق کے نزدیک یہ جواب پر از تکلف ہے وہ فرماتے ہیں کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ آخر حضرت معاذ نے کیوں مدۃ العمر اس سے ان لوگوں کو مطلع نہیں کیا جن کے بارے میں بھروسہ کر لینے کا وہم وگمان نہیں تھا ظاہر بات ہے کہ اس طرح کے لوگ ان کے زمانے میں بے شمار رہے ہوں گے، دوسری بات یہ ہے کہ بالآخر یہ اطلاع خاص وعام ہر شخص کو ہو ہی گئی، پس جس نے بھی اس کو مشتہر کیا ہو اس نے گویا اس ایجابی حکم کی خلاف ورزی کی''۔

(ج ۱، ص: ۶۹)

Marfat.com

شارحین کے اقوال سے بے اطمینانی:

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نورالحق نے اپنی شرح میں صرف شارحین کے اقوال و آرا ہی نہیں تحریر کیے ہیں بلکہ ان پر بحث و تبصرہ کیا ہے اور ان کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے اور جہاں ان کی رائے سے اختلاف کیا ہے وہاں اپنی رائے و تحقیق کو مدلل انداز میں پیش کیا ہے، مثلاً امام بخاری نے کتاب التیمم میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ:

اعطیت خمسا لم یعطھن احد قبلی۔

مجھے ایسی پانچ چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی اور نبی کو نہیں دی گئیں۔

مولانا نورالحق فرماتے ہیں کہ کتب سیر میں آپ کے بے شمار خصائص مذکور ہیں، ان پانچوں کی تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ شارحین کہتے ہیں کہ کسی چیز کو عدد کے ساتھ معین کرنے سے ماسوا کی نفی و تردید نہیں ہوتی، پس یہ حدیث ان حدیثوں کے معارض نہیں ہے، جن میں آپ کی مزید خصوصیات کا ذکر ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوسری خصوصیات کی اطلاع آپ کو اس کے بعد ہوئی ہو۔

شیخ نورالحق کو ان دونوں باتوں سے تشفی نہیں ہوتی، وہ فرماتے ہیں کہ پانچ ہی چیزوں پر اکتفا کی یہ کوئی مناسب توجیہ نہیں ہے۔

کتاب الجنائز کی ایک حدیث کا فقرہ ہے:

واللہ ما ادری وانا رسول اللہ ما یفعل بی۔

بخدا! اللہ کا رسول ہوتے ہوئے بھی مجھ کو معلوم نہیں ہے کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔

شیخ فرماتے ہیں کہ یہ بات محض جذبہ عبودیت اور تقاضائے ادب و بندگی کی وجہ سے آپؐ نے فرمائی ہے، اور اس واسطے بھی کہ دوسرے لوگ متنبہ ہو جائیں اور فضول کاموں کے مرتکب نہ ہوں، ورنہ آنحضرت ﷺ کی علوئے شان و منزلت وحی متلو و غیر متلو دونوں میں وارد ہے، اور آپؐ بالیقین جانتے تھے کہ آپؐ قیامت کے دن تمام نبیوں سے معزز اور شافع و مشفع ہوں گے۔

شارحین کا خیال ہے کہ یہ بات سورۂ فتح کی آیت: لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ سے پہلے کی ہے، جب آپ ﷺ کو اپنے اچھے انجام کی خبر نہیں تھی، بعد میں تو آپ کو نہ صرف اپنے بلکہ عشرۂ مبشرہ کے حسن انجام کا بھی علم ہو گیا تھا، لیکن جس وقت آپؐ نے یہ فرمایا تھا اس زمانے میں آپ اپنی مغفرت کے بارے میں متردد تھے۔

شیخ نورالحق اس توجیہ پر بے اطمینانی ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بات اہل ایمان کے عقیدت مند دل میں کبھی متمکن نہیں ہوسکتی کہ آپؐ کے آخری دور میں ہونے والی صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہونے والی اس آیت سے پہلے آپ اپنے انجام کے بارے میں متردد رہے ہوں، باوجودیکہ آپؐ خدا کے مقرب اور اس کے گوناگوں انعامات کے مورد تھے، آپؐ سے اس قسم کا سوءِ ظن رکھنے والا ہی اس توجیہ کو پسند کرسکتا ہے، کرمانی وغیرہ کا یہ خیال بھی بے معنی ہے کہ یہ بات سورۂ فتح کی آیت سے منسوخ ہو گئی ہے، کیونکہ اس حدیث میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ خبر ہے جس میں نسخ نہیں ہوتا۔

قرطبی وغیرہ نے کہا ہے کہ آپؐ کی مراد یہ ہے کہ مجھے خبر نہیں کہ میرے اور تمہارے ساتھ دنیا میں نفع و ضرر کا کیا معاملہ ہوگا،

Marfat.com

واضح رہے کہ اس توجیہ سے حدیث کا سیاق ابا کر رہا ہے، بیضاوی کے نزدیک اس سے دارین کے احوال کی تفصیل مراد ہے کیونکہ آپؐ کو تفصیل کے بارے میں کوئی واقفیت نہ تھی، اس بنا پر کہ غیب کی تمام باتوں کا علم اللہ کے لیے مخصوص ہے، بعض روایتوں میں ما یفعل بی کے بجائے بہ آیا ہے، اس صورت میں ضمیر کا مرجع حضرت عثمانؓ کی طرف ہوگا، فتح الباری میں لیث کے واسطہ سے اس روایت کی صحت میں کچھ کلام کیا گیا ہے، غرض اس کی متعدد تکلف پر مبنی توجیہات کی گئی ہیں، واللہ اعلم''۔ (ج۱،ص:۲۱۶)

فقہی اختلاف کا ذکر اور حنفی مذہب کی تائید و ترجیح:

وہ اس شرح میں فقہا کے اقوال و آرا اور مختلف فقہی مذاہب کو بھی جا بجا بیان کرتے ہیں اور چونکہ خود حنفی المذہب تھے اس لیے اس مذہب کو دلائل سے مرجح و افضل بتاتے ہیں چند مثالوں سے اس کی وضاحت ہوگی۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پیٹھ نہیں کرنی چاہیے''۔ اس کے متعلق شیخ نور الحق ارشاد فرماتے ہیں۔

''یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ اس حدیث میں نہی عام ہے جس میں صحرا وغیرہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے، اسی کو امام ابو حنیفہ، مجاہد ابراہیم نخعی، سفیان ثوری اور ایک روایت کے مطابق امام احمدؒ نے اختیار کیا ہے اور قیاس بھی اسی کا متقاضی ہے کہ نہی قبلہ کی تعظیم کی وجہ سے ہے جس کا استقبال و استدبار صحرا میں بھی ہوتا ہے اور عمارت کے اندر بھی اور اگر اس میں حائل کا اعتبار کیا جائے تو صحرا میں بھی پہاڑ اور عمارتیں حائل ہو سکتی ہیں۔

امام شافعی و امام مالک نے اس عموم کو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے خاص کر دیا ہے جس سے مکانوں میں اس کا لحاظ نہ کیے جانے کی گنجائش ملتی ہے، لیکن عروہ بن زبیر اور ابو داؤد حضرت ابن عمرؓ کی حدیث کو منسوخ مانتے ہیں''۔

(تیسیر القاری ج،ص:۷۴، ۷۵)

تیمم کے بیان میں شارح لکھتے ہیں:

مصنف اس کتاب میں جو حدیثیں لائے ہیں ان میں ایک ہی ضرب اور مسح کفین (ایک مرتبہ مٹی پر ہاتھ مار کر اسی سے منہ اور دونوں ہتھیلیوں کو پونچھ لینے) کا ذکر ہے محدثین اور امام احمد کا یہی مذہب ہے، ان حضرات کے نزدیک دوسری ضرب اور مسح ذراعین واجب نہیں ہے، لیکن مشہور مسلک یہ ہے کہ تیمم میں دو ضربہ ہے، ایک منہ کے لیے اور دوسری کلائیوں سے کہنیوں تک کے لیے ہے، اس کے ثبوت میں بہت سی صحیح حدیثیں موجود ہے، بعض ناقدین فن کا خیال ہے کہ پہلا مذہب دلیل کے لحاظ سے اور دوسرا قیاس کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے، امام خطابی فرماتے ہیں کہ کفین پر اکتفا کرنا جب روایت صحیح ہے اور اصول و قیاس کے اعتبار سے تیمم میں ذراعین کا وجوب اشبہ ہے۔

اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ قیاس کو نص کے مساوی قرار دینا غلط اور فاسد ہے، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو ہمارا دارومدار صرف قیاس پر نہیں ہے بلکہ وہ محض ایک وجہ ترجیح ہے، کیونکہ جو روایت قیاس کے موافق ہو اس کو اس روایت پر ترجیح حاصل ہوگی جو قیاس کے موافق نہ ہو۔ (ص:۴۷۷) ثانیاً یہ کہ حضرت عمارؓ کی حدیث مضطرب ہے جو لائق احتجاج نہیں ان کی

Marfat.com

ایک روایت میں کفین اور دوسری میں ذراعین کا ذکر ہے، ابوداؤد نے ان سے جو روایت کی ہے اس میں یدین سے نصف ذراع تک کا ذکر ہے اور وہ مرفق (کہنی) کے ذکر سے خالی ہے مگر دوسری میں مرفقین (دونوں کہنیوں) تک کا ذکر ہے۔
ابوداؤد، نسائی کی ایک روایت میں ابطین (بغلوں) اور مناکب (کندھوں) تک کا ذکر بھی ہے۔
حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ تیمم کے مسئلہ میں جس قدر حدیثیں مروی ہیں ان میں ابوجہیم اور عمار کی حدیثوں کے سوا سب ضعیف اور مختلف فیہ ہیں رسول اللہ ﷺ سے مرفوعاً اسی قدر مذکور ہے، شرح سفر السعادۃ میں اس پر زیادہ شرح وبسط کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے، اور ضربتین کے بارے میں حدیثیں صحاح سے منقول ہیں۔ (ص: ۱۳۱)

شیخ نور الحق غالی حنفی نہ تھے:

عموماً شیخ عبدالحق اور ان کے خلف الصدق شیخ نور الحق کو غالی اور متشدد حنفی کہا جاتا ہے، لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اس میں شبہ نہیں کہ یہ دونوں بزرگ حنفی المذہب تھے اور اپنے مذہب کی تائید وحمایت بھی کرتے تھے اور دلائل وشواہد سے دوسرے مذاہب پر اسے ترجیح بھی دیتے تھے مگر عام اہل تقلید اور مذاہب کے معاملہ میں غلو اختیار کرنے والوں کی طرح نہ اپنے مذہب کی جا وبیجا حمایت کرتے تھے، اور نہ اس شدت وتصلب کا مظاہرہ کرتے تھے جو مقلدین اور عام اہل مذاہب کا شیوہ ہے۔
ذیل میں ہم ایک ایسی مثال پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ اپنے مذہب ومسلک سے ان کا شغف وانہماک چاہے جتنا بھی بڑھا ہوا ہو مگر اس کے باوجود وہ حق وانصاف پسند تھے۔
رکوع سے پہلے اور اس کے بعد میں رفع یدین (دونوں ہاتھوں کو اٹھانے) کے بارے میں احناف اور دوسرے مذاہب کا اختلاف بہت مشہور ہے، امام بخاریؒ نے رفع یدین کے ثبوت میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث نقل کر کے صراحت کی ہے کہ وہ اسے رسول اللہ ﷺ سے مرفوعاً بیان کرتے تھے، شیخ نور الحق اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں:
"معلوم ہونا چاہیے کہ رکوع میں جاتے اور اس سے اٹھتے وقت ہاتھوں کو اٹھانے کے متعلق جو صحیح حدیثیں وارد ہیں ان میں سے اکثر حضرت ابن عمرؓ کے واسطہ سے مروی ہیں، لیکن ہاتھ نہ اٹھانے کے بارہ میں بھی صحیح حدیثیں بیان کی گئی ہیں، شیخ نور الحق اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہ کی اس روایت کو پیش کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے شیوخ سے بیان کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے رسول اکرم ﷺ کا یہ معمول بتایا ہے کہ آپ صرف نماز شروع کرتے وقت دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے اس کے سوا کسی اور موقع پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ امام طحاوی صحیح سندوں سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ صرف نماز کی ابتدا میں دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے۔
امام ترمذی نے اپنی جامع میں اس مسئلہ کے متعلق دو ابواب قائم کیے ہیں ایک میں امام بخاریؒ کی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے اور کہا ہے کہ کبار صحابہ کی ایک بڑی جماعت اس کی قائل ہے، دوسرے باب میں یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ افتتاح کے علاوہ کسی اور موقع پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے، اس باب میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت تحریر کی ہے جس سے صرف افتتاح کے وقت دونوں ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے، امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس کے قائل بھی علمائے

Marfat.com

صحابہ وتابعین کی بڑی جماعت ہے، اور سفیان ثوری اور اہل کوفہ یعنی حنفیہ کا یہی مذہب ہے، جامع الاصول میں ابن مسعود کی حدیث ابوداؤد اور نسائی کے حوالہ سے منقول ہے اور براء بن عازب کی حدیث امام ابوداؤد مرفوعاً لائے ہیں، صحیح روایتوں سے حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے بھی یہی منقول ہے کہ وہ نماز کے شروع میں رفع یدین کرتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ احادیث وآثار صحیحہ دونوں جانب موجود ہیں، علمائے حنفیہ جو عدم رفع کے قائل ہیں یہ کہتے ہیں کہ رفع والی حدیث منسوخ ہوگئی ہے، خود اس کے راوی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو اس کے برخلاف کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے، اور منسوخ حدیث کی روایت کرنا ممنوع نہیں ہے۔ پس جب راوی ہی اپنی روایت کے خلاف عمل کر رہا ہو تو ایسی حدیث کو حجت قرار دینا مناسب نہیں ہے، یہ ایک طے شدہ اصول ہے، ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ مجھ سے اتنی بڑی جماعت نے بیان کیا ہے جس کے ناموں کو شمار نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ وہ صرف نماز کی ابتداء ہی میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے، امام طحاوی نے مشکل الآثار میں مجاہد سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز ادا کی، وہ صرف تکبیر اولیٰ میں ہاتھ اٹھاتے تھے، نہایہ شرح ہدایہ میں ہے کہ عبداللہ بن زبیر نے مسجد حرام میں ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ وہ رکوع میں جاتے اور اس سے اٹھتے ہوئے رفع یدین کر رہا ہے، جب وہ نماز سے فارغ ہوگیا تو انہوں نے اس کہا کہ ایسا نہ کرو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پہلے کیا تھا مگر بعد میں ترک کر دیا تھا، مجاہد کہتے ہیں کہ میں بیس برس تک حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں رہا لیکن میں نے انہیں تکبیر اولیٰ کے سوا اور نماز میں کسی موقع پر ہاتھوں کو اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا''۔

شیخ نورالحق ان سب اقوال وتوجیہات کو بیان کرنے کے بعد جو کچھ تحریر فرماتے ہیں اس سے ان کی بے تعصبی اور حق پسندی ظاہر ہوتی ہے، فرماتے ہیں:

''ان تمام آثار واعمال میں صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے نسخ کا جو قول منقول ہے وہ اشکال سے خالی نہیں، اس باب میں اس سے زیادہ آسان تر بات اور کوئی نہیں کہ کہ رفع (ہاتھ اٹھانے) اور عدم رفع (ہاتھ نہ اٹھانے) دونوں کی سنیت کا قائل ہونا چاہیے واللہ اعلم یہ بحث فتح المنان فی تائید مذہب النعمان سے منقول ہے جس میں شیخ المحدثین عبدالحق نے شرح وبسط سے گفتگو کی ہے''۔

شافعیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ رکوع میں جاتے ہوئے اور اس سے سر اٹھاتے ہوئے رفع یدین کرنا چاہیے، یہ لوگ تشہد سے اٹھتے وقت رفع یدین کے قائل نہیں ہیں اور یہ حدیث جسے امام بخاریؒ باب کے آخر میں لائے ہیں اس کے موافق بہت سی صحیح حدیثیں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور دوسرے حضرات سے مروی ہیں اسی بناء پر بعض شوافع اس کو بھی سنت سمجھتے ہیں لیکن یہ امام شافعی سے منقول نہیں ہے، ان کی وصیت یہ تھی کہ اگر میرے فیصلہ کے خلاف کوئی حدیث موجود ہو تو میرے قول کو چھوڑ کر اسی حدیث پر عمل کرو، اکثر شافعیہ کے برخلاف امام نووی نے اس کی سنیت کو صحیح قرار دیا ہے۔ (ج ۱، ص: ۲۵۴ و ۲۵۵)

بعض اہم بحثیں:

امامت وخلافت کا مسئلہ بڑا اہم ہے، اس کی وجہ سے مسلمان دو فرقوں میں بٹ گئے اور اس سے ان کو شدید نقصانات پہنچے اس نزاع کا ایک اہم باعث واقعہ قرطاس بھی ہے، اس کو بعض لوگوں نے جس طرح سے پیش کیا ہے اس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت مجروح ہوتی ہے، اور نعوذ باللہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی دعوت وتبلیغ پر

Marfat.com

مامور فرمایا تھا ان کو بیان کرنے میں آپ نے کوتاہی سے کام لیا، اگر آپ کے لیے مسئلہ خلافت میں نامزدگی اور صراحت کرنا ضروری ہوتا تو آپ اس میں اخفا سے کیوں کام لیتے، صوفیہ باطنیہ بھی اسی قسم کی گمراہی میں جا پھنسے ہیں جنھوں نے ظاہر و باطن کی تقسیم کر کے یہ کہا ہے کہ علم باطن صرف حضرت علیؓ کو عطا ہوا تھا اس لیے علم باطن کا منبع انہیں کو قرار دیا جاتا ہے، یہاں موقع نہیں ورنہ ہم دکھاتے کہ یہ کیسی شدید گمراہیاں ہیں جن کے لیے حضرت علیؓ کی ذات کو استعمال کیا جارہا ہے۔

واقعہ قرطاس کے بارے میں شیخ نورالحق نے جو کچھ لکھا ہے وہ اعتدال و توازن کا نمونہ اور بڑے غور و فکر کا نتیجہ ہے ملاحظہ ہو:

امام بخاریؒ نے کتاب العلم کے باب کتابۃ العلم میں واقعہ قرطاس کے متعلق جو حدیث نقل کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

''حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب نبی ﷺ کی بیماری شدید ہوگئی تو آپؐ نے فرمایا کہ کاغذ و قلم لاؤ تاکہ میں ایسا نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد تم لوگ گمراہ نہ ہو گے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آپ پر وجع و الم غالب ہے، اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے جو ہمارے لیے کافی ہے، پھر حاضرین جھگڑ پڑے اور شور و ہنگامہ برپا ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس سے تم لوگ چلے جاؤ میرے پاس اختلاف و نزاع مناسب نہیں ہے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ وہاں سے یہ کہتے ہوئے نکل پڑے کہ آپ کے اور آپ کی تحریر کے درمیان حائل ہونا ہی ساری مصیبت تھی''۔ (تیسر القاری ج ۱، ص: ۶۱)

شیخ نورالحق فرماتے ہیں کہ یہ حدیث وجہ نزاع اور لوگوں کی گمراہی و کجی کا باعث بن گئی ہے، بعض لوگ نہایت وثوق اور پوری قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کا مقصود حضرت علیؓ کے لیے خلافت نامہ تحریر کرنا تھا مگر چونکہ حضرت عمرؓ کو ان سے عداوت اور کد تھی اور وہ آپ کی منشا و مراد کو سمجھ گئے تھے اس لیے انہوں نے آپ ﷺ کو خلافت نامہ تحریر کرنے کا موقع نہیں دیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر رسول کریم ﷺ یہی چاہتے تھے کہ آپ کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ ہوں تو آپ نے انہیں نماز پڑھانے کا حکم کیوں نہیں دیا جبکہ وہ آپ کی خدمت میں موجود تھے اور حضرت ابوبکرؓ اپنے گھر میں فروکش تھے مگر رسول اللہ ﷺ نے انہیں اصرار کر کے ان کے گھر سے بلوایا اور نماز پڑھانے کا حکم دیا۔

درحقیقت یہ ایک باطل وہم ہے جس کا سرچشمہ وہ تعصب اور بدگمانی ہے جو اساطین دین و ملت کی جانب سے ان لوگوں کے دلوں میں متمکن ہے، بلکہ یہ تو خود آنحضرت ﷺ سے بھی سوئے عقیدت کا نتیجہ ہے، اگر آپؐ کا مقصود وہی ہوتا تو جب آپ نے دیکھا کہ لوگ کتابت کے بارہ میں جھگڑ رہے ہیں تو آپ نے حق کو پوشیدہ رکھنا کیسے پسند کیا اور کیوں نہیں اپنی زبان مبارک سے یہ فرما دیا کہ میرے بعد حضرت علیؓ خلیفہ ہوں گے۔

یہ معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کافرین کی اصلاح و ہدایت کی جانب سے بھی کبھی بے توجہی نہیں کی جو برسہا برس تک آپ سے بحث و مجادلہ کرتے رہے بلکہ آپ ان میں سے ایک ایک کی رہنمائی کے لیے برابر فکرمند اور سرگرداں رہے تو اپنے ان ساتھیوں کے معاملہ میں کیسے تساہل سے کام لیتے جو ہمیشہ آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے بے چین رہتے اور اپنی جان و مال سب کچھ آپؐ کے لیے نچھاور کر دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے اور آپؐ زندگی بھر ان سے خوش رہے تو زندگی کے آخری لمحہ میں ان کے اختلاف سے کیسے اس قدر دل برداشتہ ہو سکتے تھے کہ محض ایک لفظ نہ کہنے کی بنا پر سب کو گمراہ چھوڑ جاتے

Marfat.com

اس سے بڑھ کر کون سی بداعتقادی آپ کی شان میں ہو سکتی ہے اللہ ہم سب کو اس سے بچائے۔

دراصل یہ معاملہ مبہم ہے اور اس کا پتہ نہیں چلتا کہ آپ کیا لکھانا چاہتے تھے، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قطعی طور سے ضروریات دین، اوامر ونواہی پر استقامت، اولوالامر کی اطاعت اور اہل بیت کی عزت وحرمت کی حفاظت کی تجدید فرمانا چاہتے تھے، کیونکہ ایک بڑی جماعت کے ان امور کی رعایت نہ کرنے کی بنا پر جادۂ مستقیم سے منحرف ہو جانے کا اندیشہ تھا، لیکن چونکہ یہ ساری باتیں تاکیداً اور تفصیلاً کتاب اللہ سے معلوم ہو جاتی ہیں اس لیے حضرت عمرؓ نے اس نورِ فراست سے جو خدا نے ان کو عطا کیا تھا اور اپنی صائب رائے سے یہ دریافت کر لیا تھا کہ آپ ﷺ کا مقصد ومدعا کیا ہے اس لیے وہ آپ کی اس شدید تکلیف کی وجہ سے جس میں آپ مبتلا تھے آپ کو مزید زحمت میں ڈالنے کے لیے راضی نہیں ہوئے۔

موقع ومحل اور دوسرے قرائن سے بھی اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی کہ آپ حضرت علیؓ کے لیے خلافت نامہ تحریر فرمانا چاہتے تھے کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے کا آپ ﷺ حکم دے چکے تھے اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کی اقتدا میں نماز بھی ادا کی تھی، اس سے بطریق لزوم خود ہی ثابت ہو جاتا ہے کہ آپ خلافت کبریٰ کے منصب پر بھی انہیں کو فائز کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے اگر آپؐ ان کی خلافت کی صراحت فرمانا یا ان کے لیے وصیت تحریر کرنا چاہتے رہے ہوں تو یہ ایک قریبی احتمال ہے، اور وہ احتمال جو بیان کیا جاتا ہے بعید تر ہے، کتاب الجہاد کے باب ھل یستشفع الی اھل الذمہ میں شارح قسطلانی تحریر کرتے ہیں کہ آپ نے کاغذ یہ تحریر فرمانے کے لیے مانگا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی صراحت فرما دیں لیکن چونکہ لوگ آپس میں جھگڑ پڑے اور آپ کو بیماری سے شدید تکلیف تھی اس لیے آپ نے اس کی جانب سے اس لیے صرف نظر کر لیا کہ آپ حضرت ابوبکرؓ کو نماز میں اپنا جانشین بنا ہی چکے تھے، امام بخاریؒ کتاب الطب کے باب المریض میں آپ کے اس ارشاد گرامی کو نقل کرتے ہیں:

لقد هممت اردت ان ارسل الی ابی بکر و ابنه۔

میں نے قصد یا ارادہ (راوی کو شک ہے کہ هممت فرمایا یا اردت) کیا کہ ابوبکرؓ اور ان کے صاحبزادے (عبدالرحمان) کو بلاؤں۔

امام مسلمؒ کی روایت میں اس کی بھی تصریح ہے کہ:

واعهد ان یقول القایلون ویتمنی المتمنون۔

اور (ان کے لیے خلافت کی) وصیت کر دوں تاکہ کسی کو اس (خلافت) کی طلب وتمنا نہ رہے۔

اللہ تعالیٰ اور تمام مسلمان حضرات ابوبکر کی خلافت کے سوا کسی اور کو میرے بعد خلیفہ بنانے پر راضی نہ ہوں گے، یہ مفہوم چونکہ دوسری حدیثوں کے منطوق کے مطابق ہے اس لیے اس باب میں یہ مختصر حدیث بیان کرنے پر اکتفا کی ہے۔

امام مسلمؒ حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ان سے فرمایا کہ ابوبکر اور اپنے بھائی کو بلاؤ تاکہ میں ان کے لیے یہ تحریر کر دوں کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ دوسرے لوگ اس کے دعویدار ہو جائیں گے اور اپنے کو خلافت کا زیادہ اہل بتائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ اور تمام مسلمان حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ کسی اور کو خلیفہ بنانے پر راضی نہ ہوں گے۔ بزار حضرت عائشہ کے واسطہ سے یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ جس وقت آپ کے مرض نے شدت اختیار کر لی تھی اس وقت آپ نے فرمایا کہ

Marfat.com

دوات، قلم اور کاغذ لاؤ تا کہ میں ابوبکرؓ کے لیے ایک تحریر لکھ دوں تا کہ لوگ اس معاملہ میں ان سے اختلاف نہ کریں، پھر آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ خدا کی پناہ اس بات سے کہ لوگ ابوبکرؓ سے اس بارے میں اختلاف کریں۔

یہاں یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ جو دو حدیثیں اوپر بیان کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کی، اس کا جواب ہے کہ آپ کے پاس جو لوگ موجود تھے انہوں نے آپ کے اس حکم کو ایجابی (واجب) نہیں سمجھا، ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ امر ایجابی ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مانعین کتابت پر ناگواری ظاہر فرماتے اور واجب کا مکلف بتانے میں کسی کی بھی پروا نہ کرتے، علاوہ ازیں خود حضرت عمرؓ کس طرح امر ایجابی کی تعمیل میں توقف فرماتے جب کہ ان کی رائے عموماً وحی قرآنی کے مطابق ہوتی تھی شارح نے اسکی متعدد مثالیں دی ہیں جن کو طوالت کے خوف سے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

کتاب الجہاد کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عمرؓ کی رائے پسند آئی تھی، اور آپؐ نے دوسرے لوگوں کی بات سنی اَن سنی کر دی تھی اور ان کے اعتراض کو سرے سے نظر انداز فرما دیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں طعن و تشنیع، ذاتی خبث اور طبعی عناد کا نتیجہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (ج ۱ ص: ۶۱، ۶۲)

اسباب و وجوہ کا ذکر:

شیخ نورالحق نے اپنی شرح میں جا بجا کسی حدیث کو لانے کا مقصد اور احادیث میں درج باتوں کے وجوہ و اسباب اور مصالح بھی تحریر کیے ہیں مثلاً امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کا آغاز اس مشہور حدیث (انما الاعمال بالنیات الخ) سے کیا ہے، شیخ نے اس کی غایت یہ بیان کی ہے کہ کتاب کا آغاز اس حدیث سے کیا جانا اس کو ظاہر کرتا ہے کہ سچی نیت اور تقرب الٰہی کے ارادہ کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا۔

آگے وحی کی کیفیت کی تشبیہ آواز جرس سے دیئے جانے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ "وحی پیہم آتی تھی اور کلمات ایک دوسرے سے منفصل اور جدا نہیں ہوتے تھے یا اس لحاظ سے تشبیہ دی ہے کہ آسانی سے اس کے معنی سمجھ میں نہیں آتے تھے اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے نفس وحی مراد ہے اور آواز سے فرشتہ کے بال و پر کی آواز مراد ہے جو کہ وحی کا دیباچہ و مقدمہ تھی۔ (ص: ۷)

اسی سلسلہ روایت میں حضرت عائشہؓ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ سخت ٹھنڈک کے دنوں میں بھی جب آپ پر وحی آتی تھی تو آپ کی پیشانی سے پسینہ بہنے لگتا تھا، اس رنج و تعب کی وجہ سے جو احکام الٰہی کی تبلیغ کی ذمہ داری کو محسوس کرنے کی وجہ سے آپ کو پہنچتا تھا۔

وحی کے سلسلہ کی روایت میں آگے یہ بیان ہوا ہے کہ وحی کی جو پہلی نوع آپ پر نازل ہوئی وہ خواب میں رویائے صالحہ تھے۔ شیخ کا بیان ہے کہ یہ کیفیت چھ ماہ تک رہی اور اس کی حکمت یہ تھی کہ فرشتہ اگر دفعتاً آجاتا اور یکبارگی بار نبوت آپ پر ڈال دیا جاتا تو آپ کی قوائے بشری اس کے متحمل نہ ہوتے اور بیداری کی حالت میں آپ پر جو ہیبت طاری ہوتی اس کا ذکر اسی روایت کے آخر میں ہے۔

Marfat.com

اس حدیث کے آخر میں حضرت ورقہ بن نوفل کے اس قول کا ذکر ہے کہ: ''یہ وہی ناموس ہے جس کو اللہ نے موسیٰ کے پاس بھیجا تھا'' نصرانی ہونے کے باوجود انہوں حضرت عیسیٰ کی بجائے حضرت موسیٰ کا کیوں ذکر کیا۔ اس کی وجہ شارحین یہ بتاتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کی کتاب کا بڑا حصہ احکام پر مشتمل ہے اور یہی حال ہمارے پیغمبر کی کتاب کا بھی ہے، اس کے برعکس حضرت عیسیٰ کو جو کتاب دی گئی تھی وہ تمامتر امثال و مواعظ کا مجموعہ ہے، شیخ نورالحق اس توجیہ سے متفق نہیں ہیں، کیونکہ حضرت عیسیٰ متفقہ طور پر نہایت مشہور و مقرب نبیوں میں تھے، اس کے برخلاف حضرت عیسیٰ کی نبوت میں بھی یہود کی ایک جماعت کو اختلاف تھا اور یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت جبرائیل حضرت موسیٰ کی پاس حضرت عیسیٰ کی بنسبت زیادہ آتے تھے۔ کیونکہ توریت احکام پر مشتمل تھی اور احکام نجماً نجماً اترتے تھے، جس طرح کہ قرآن احتیاج کے وقت اترتا تھا، کشاف میں ہے کہ جنی (جنات) یہودی تھے اس لحاظ سے حضرت موسیٰ کے نام کی تعین کی گئی ہے اور بیضاوی میں ہے کہ جنیوں کو حضرت عیسیٰ کی نبوت کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ شیخ نورالحق کے نزدیک یہ ساری وجہیں نہایت دُوراز کار ہیں۔ جنات تو مشرق و مغرب ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے، انہیں حضرت عیسیٰ کی بعثت کی بھلا کیوں اطلاع نہ ہوتی۔ (ج ا ص: ۹ و ۱۰)

صحیح بخاری کے ابواب کی مناسبت کا ذکر:

امام بخاریؒ کا ایک خاص فضل و امتیاز ان کی کتاب کے ابواب و تراجم بھی ہیں ان کے تحت انہوں نے جو حدیثیں نقل کی ہیں ان کی مناسبت کے پہلو نہایت دقیق اور مخفی ہیں جن کی حقیقت امعان نظر کے بغیر معلوم نہیں ہوتی، اسی لیے علمائے فن نے ان کو اپنے غور و فکر کا خاص موضوع بنایا ہے، اور اپنی شرحوں میں اس پر مفصل بحث و گفتگو کی ہے، شیخ نورالحق نے بھی ابواب و کتب سے احادیث کی مناسبت جا بجا دکھائی ہے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

صحیح بخاری کے باب بدء الوحی کے آخر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطہ سے ابوسفیان و ہرقل کا جو مکالمہ بیان کیا گیا ہے، شیخ نورالحق عنوانِ باب سے اس حدیث کی مناسبت یوں بیان کرتے ہیں۔

''قسطلانی کے نزدیک باب مذکور سے حدیث کی مناسبت اس اعتبار سے ہے کہ اس میں آپ کے ابتدائی حالات اور عمدہ صفات و اطوار کا ذکر ہے جن کی وجہ سے آپ وحی و رسالت سے سرفراز کیے گئے، علاوہ ازیں اس روایت میں ظہور نبوت کی ابتدا کا واقعہ درج ہے، ایک جماعت کے نزدیک عنوان میں مذکور آیت سے ابوسفیان و ہرقل کی گفتگو کی مناسبت اس طرح ہے کہ گزشتہ تمام انبیاء علیہم السلام کے حالات جن پر وحی نازل ہوتی تھی اسی طرح کے ہیں، واللہ اعلم۔ (ص: ۱۶)

کتاب الایمان کے باب المعاصی من امر الجاھلیتہ و لایکفر صاحبھا (گناہ جاہلیت کے امور میں داخل ہے، اور گناہ گار کی تکفیر نہ کی جائے گی) میں حضرت ابوذر کی یہ حدیث نقل کی ہے جس میں ایک شخص کو ان کے گالی دینے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: انک امرء فیک جاھلیة (تم ایسے شخص ہو جس میں جاہلیت کی خو بو ہے) اس کے متعلق شیخ لکھتے ہیں:

عنوان سے حدیث کی مناسبت اس قدر ہے کہ حضرت ابوذرؓ جیسے جلیل القدر شخص سے بھی گناہ سرزد ہوا اور اس کے باوجود وہ مسلمان رہے۔ (ص: ۲۶)

Marfat.com

کتاب العلم کے باب المناولہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ایک شخص کو اپنا نامہ مبارک دے کر بھیجا، اس نے جب نامہ مبارک کسریٰ کے حوالہ کیا تو اس نے اسے چاک کر ڈالا۔

شیخ نے ترجمۃ الباب سے اس حدیث کی مناسبت اس طرح بیان کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنا خط قاصد کے سامنے پڑھے بغیر اس کے حوالہ کر دیا اور اسے اس کی اجازت دی کہ وہ یہ کہے کہ یہ نامہ مبارک ہے جس پر عمل کیا جانا چاہیے، مناولت اور اجازت کا یہی ثمرہ اور حاصل ہے۔ (ج ۱، ص: ۴۴)

اسی کتاب کے باب من ترک بعض الاختیار مخافة ان یقصر فهم بعض الناس عنه فیقعوا فی اشد منه (جو کسی مختار اور پسندیدہ کام کو اس اندیشہ سے ترک کر دے کہ بعض لوگ اسے نہ سمجھنے کی وجہ سے اس سے سخت تر بات میں پڑ جائیں) میں امام بخاریؒ یہ حدیث لائے ہیں کہ نبی ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اگر تیری قوم کا زمانہ جاہلیت کے دور سے قریب تر نہ ہوتا تو میں کعبہ کو توڑ کر اس کے دو دروازے کر دیتا تا کہ ایک سے لوگ اس میں داخل ہوتے اور دوسرے سے نکلتے۔ شیخ نور الحق فرماتے ہیں کہ عنوان باب سے حدیث کی مناسبت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بنائے کعبہ کے سلسلے میں ایک مختار امر کو اس اندیشہ کی وجہ سے ترک کر دیا تھا کہ ضعیف الایمان لوگوں کے فتنہ میں پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔

(ج ۱، ص: ۶۸)

شیخ نور الحق نے احادیث سے ترجمہ ابواب کی مناسبت ہی نہیں بیان کی ہے بلکہ کتب و ابواب کی باہم دگر مناسبت بھی بیان کی ہے جس کی مثالیں پہلے گزر چکی ہیں۔

شیخ نور الحق صحیح بخاری کے نسخوں کے فرق و اختلاف کو بھی واضح کرتے ہیں، اس سلسلہ میں انہوں نے تراجم ابواب کے اس فرق کو بھی دکھایا ہے جو مختلف نسخوں میں پایا جاتا ہے، اس ضمن میں بھی انہوں نے کہیں کہیں احادیث سے تراجم ابواب کی مناسبت دکھائی ہے مثلاً امام بخاریؒ نے کتاب الایمان کے باب علامات الایمان حب الانصار (ایمان کی علامتوں میں انصار کی محبت بھی ہے) کے بعد جس باب کا ذکر کیا ہے اس کا کوئی عنوان نہیں دیا ہے، شیخ نور الحق کا بیان ہے کہ بعض نسخوں میں یہاں سرے سے باب ہی موجود نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس باب مذکور حدیث کا تعلق سابق باب علامات الایمان سے ہوگا اور پھر حدیث کی اس سے مناسبت واضح کی ہے۔

کتاب الایمان کی ایک باب کا عنوان یہ ہے: باب المعاصی من امر الجاهلیة ولا یکفر صاحبها بارتکابها الا بالشرک۔ (گناہ کے کام جاہلیت کے کاموں میں سے ہیں جن کے مرتکب کی تکفیر نہیں کی جائے گی سوائے شرک کے گناہ کے) اس باب کے آخر میں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب دو مسلمان اپنی تلواروں سے قتال کریں تو قاتل و مقتول دونوں آگ میں ہوں گے میں نے عرض کیا کہ خیر یہ تو قاتل ہے، لیکن مقتول کیوں آگ میں جائے گا؟ آپ نے ارشاد فرمایا اس لیے کہ وہ بھی اپنے حریف کو قتل کرنے کا آرزومند تھا۔

شیخ نور الحق اس حدیث کی شرح کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "یہ کتاب کے بعض نسخوں میں علیحدہ باب میں درج ہے، جس کا عنوان یہ ہے": وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا (اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑائی کریں تو

Marfat.com

ان کے درمیان صلح کراؤ)۔

اس شرح میں اس نسخہ پر اعتماد کیا گیا ہے جو ہمارے شیخ وسید ابوالمجد عبدالحق کا تصحیح کیا ہوا ہے۔ (ج ۱،ص: ۲۷)

شیخ نے نسخوں کے الفاظ وحروف تک کے فرق واختلاف کو بھی بتایا ہے، جیسے کتاب الایمان کے شروع ہی میں بتایا ہے کہ صحیح بخاری کے بعض نسخوں کی روایات کے مطابق اس کی بجائے من کتاب الایمان مذکور ہے مگر ان کے نزدیک زیادہ صحیح روایت وہ ہے جس کو انہوں نے اختیار کیا ہے، اس کے معاً بعد امام صاحب جو باب لائے ہیں وہ یہ ہے:

باب قول النبی ﷺ، شیخ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ بعض روایات کے مطابق عنوان اس طرح ہے، باب الایمان وقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم، مگر مختار اول ہے۔

اس باب میں امام بخاریؒ نے جو آیتیں نقل کی ہیں ان میں دوسری آیت: وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى کے متعلق شیخ دہلوی نے لکھا ہے کہ "ہم کو کسی نسخہ میں اس آیت سے پہلے قال اللہ نہیں ملا، نیز بعض نسخوں سے یہ آیت ساقط ہے، اس صورت میں اس باب میں یہاں کُل سات ہی آیتیں ہوں گی"۔ (ص: ۱۶،۱۷)

امام بخاریؒ نے بعض ابواب میں کوئی حدیث نہیں بیان کی ہے، بلکہ چند آیتیں نقل کر دی ہیں مثلاً کتاب العلم کا پہلا باب فضل العلم (علم کی فضیلت) قائم کیا ہے، اور اس میں دو آیتیں نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور کوئی حدیث نہیں درج کی ہے۔ شیخ نور الحق نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ زیر نظر باب میں ان کو اپنی شرائط کے مطابق کوئی حدیث نہیں ملی ہے، اس لیے انہوں نے بہتر یہی سمجھا کہ آیتوں کو نقل کر دیں کیونکہ یہ سب سے بڑی دلیل اور صریح ثبوت ہیں"۔ (ج ۱،ص: ۴۰)

شکوک وشبہات کا جواب:

اس سے پہلے اشکالات کے جواب دینے کا ذکر آچکا ہے، ذیل میں یہ دکھایا جائے گا کہ شیخ نور الحق نے شکوک وشبہات کا ازالہ کس طرح کیا ہے۔

منافقین کے استغفار کے مسئلہ پر بڑی مفصل بحث کر کے اس کے متعلق شکوک وشبہات کا جواب دیا ہے، پہلے وہ حدیث ملاحظہ ہو جس کے ضمن میں یہ بحث کی گئی ہے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب عبداللہ بن ابی کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! مجھے اپنی قمیص عطا کیجیے تاکہ میں اسے اپنے باپ کا کفن بناؤں اور ان کے جنازہ کی نماز پڑھیے اور ان کے لیے استغفار کیجیے چنانچہ آپؐ نے ان کو اپنی قمیص دیدی اور فرمایا کہ جنازہ تیار ہو جائے تو مجھے بتلانا تاکہ میں نماز پڑھوں، پس جب انہوں نے خبر دی اور آپ نے نماز کا ارادہ کیا تو حضرت عمرؓ نے آپ کا دامن کھینچ لیا اور کہا کہ کیا اللہ نے آپ کو منافقین کی نماز پڑھنے سے منع نہیں کیا ہے، آپ نے فرمایا کہ مجھے دونوں کا اختیار دیا گیا ہے۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ (التوبہ: ۸۰)

آپ منافقین کیلئے استغفار کیجئے یا نہ کیجئے اگر آپ ان کے لیے ستر بار بھی استغفار کریں تو اللہ ہرگز ان کی مغفرت نہیں کرے گا۔

چنانچہ آپ نے ان کی نماز پڑھی جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

Marfat.com

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ (التوبہ:۸۴)
منافقین میں سے اگر کوئی مرجائے تو آپ کبھی بھی نہ اس کی نماز پڑھیں اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔

شیخ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے متعلق دل میں کچھ خلجان پیدا ہوتا ہے جسے رفع کرنا ضروری ہے۔

ابن ابی کے صاحبزادے اسلام کے مخلص وفدائی تھے، انہیں اپنے والد کے نفاق اور آنحضرت ﷺ اور اہل اسلام سے ان کی شدید عداوت کا علم تھا، ان کو اہل نفاق کی تکفیر وتقبیح اور سوئے عاقبت سے متعلق نصوص سے بھی پوری واقفیت تھی اسی بنا پر جب ان کے کانوں میں ان کے والد کے یہ الفاظ پڑے کہ ''ہم جیسے ہی مدینہ پہنچیں گے تو ہم عزت والے لوگ ان ذلیل و خوار لوگوں کو وہاں سے نکال باہر کریں گے'' تو برسر راہ انہوں نے باپ کو پکڑا اور تلوار کھینچ لی کہ آپ یہ کہیے کہ ہم جیسے لوگ ذلیل وخوار ہیں اور پیغمبر خدا ﷺ اور ان کے ساتھی تمام لوگوں سے زیادہ معزز و برتر ہیں، اگر آپ یہ نہیں کہیں گے تو اسی تلوار سے آپ کا سر آپ کے تن سے جدا کردوں گا، چنانچہ جب تک ان سے اس کا اقرار نہ کرالیا، انہیں نہیں چھوڑا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود انہوں نے آنحضرت ﷺ سے جو اس منافق کے حال سے قطعی طور پر واقف تھے، اس کے باوجود آپ نے کس طرح اسکے لیے درخواست کو منظور کرلیا جب کہ اس سے پہلے ابوطالب کی وفات کے بعد مکہ ہی میں یہ آیت نازل ہوچکی تھی کہ:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ (التوبہ:۱۱۳)
نبی اور مسلمانوں کو زیبا نہیں ہے کہ وہ مشرکین کیلئے استغفار کریں۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ افصح العرب تھے، آپ عربی زبان کے استعمال کے سب سے بڑھ کر عارف اور اللہ کی مراد ومنشا کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے، ایسی صورت میں: اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سے استغفار وعدم استغفار میں تخییر کا مفہوم آپ نے کیسے سمجھ لیا، مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں مراد اس برابری سے ہے جو ان دونوں امور کے غیر مفید ہونے میں ہے جیسا کہ آیت میں بتصریح کیا گیا ہے کہ: اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (التوبہ:۸۰) (اگر آپ ان کے لیے ستر بار بھی استغفار کریں گے تو بھی اللہ ان کی مغفرت نہیں کرے گا)۔

شیخ فرماتے ہیں کہ قسطلانی نے خلجان کو دور کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارا ہے، ہم اس کے بعض مقدمات کو جو اس وقت ذہن میں اور نوک قلم پر آرہے ہیں، اللہ کی توفیق سے قلمبند کرتے ہیں۔

ابن ابی کی ظاہری حالت اہل اسلام کے مطابق تھی اور ان کے صاحبزادے راسخ العقیدہ مسلمان تھے، ان کو اپنے والد کے عام حالات کی وجہ سے ایک طرح کی پشیمانی اور ندامت رہتی تھی، انہی احساسات وجذبات سے انہیں رسول اللہ ﷺ سے اس طرح کی خواہش کے اظہار پر آمادہ کیا ہوگا کہ آپ کے ظاہری وباطنی برکات ایمانی اور مغفرت کی دعا سے ان کے والد محروم نہ رہیں، عبدالرزاق نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ خود ان کے والد نے انہیں آنحضرت کی خدمت میں یہ التماس کرنے کیلئے بھیجا تھا کہ آنحضرت ﷺ بندگان خدا سے شدید محبت ورافت کی بنا پر ان کی ہدایت کے نہایت حریص اور مشتاق رہتے تھے، نیز آپ کو ابن ابی کے صاحبزادے سے بڑا تعلق خاطر بھی تھا اس لیے آپ تشریف لے جانے کے لیے تیار ہوگئے اور ان کے صاحبزادے سے فرمایا کہ یہودی کی محبت نے تجھے ہلاک کیا، انہوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول میں تو

Marfat.com

فرستادہ ہوں، آپ میری خاطر سے استغفار فرما دیجئے اور اپنا پیراہن مبارک کفن کیلئے عطا کیجئے اور میری سرزنش نہ کیجئے، فتح الباری میں اس حدیث کو مرسل مگر اس کے تمام رجال کو ثقہ کہا گیا ہے، اسکی تائید طبرانی کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطہ سے مروی ہے کہ جب ابن ابی بیمار ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھ پر احسان کیجئے، میری تکفین کے لیے اپنا پیراہن عطا کیجئے اور میری نمازِ جنازہ ادا کیجئے۔

شیخ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان کی ان گذارشات نے ان کی موت کے بعد ان کے لڑکے اور خاندان والوں کے شرم وعار کو ختم کر دیا کیونکہ انہوں نے اخبات وانقیاد کا ارادہ کیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ ظاہری حالات دیکھ کر ان کی جانب رغبت ہوگئی مگر جب یہ وحی نازل ہوئی: وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا۔ تو آپ کو تنبہ ہوا اور آپ پر سارے حالات منکشف ہو گئے، قسطلانی کے خیال میں اس واقعہ کے تعلق سے یہ بہترین جواب ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس وقت حضرت عباسؓ کو غزوہ بدر میں برہنہ قیدی بنا کر لایا گیا اور کوئی کپڑا موجود نہ تھا جو ان کی قامت پر راست آتا تو عبداللہ بن ابیٔ نے جو ان کا ہم قامت تھا انہیں اپنا کپڑا پہنایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بدلے میں اپنا پیراہن ان کو دیا تا کہ منافق کا کوئی احسان آپ پر نہ رہ جائے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی شخص بھی سوال کرتا تھا تو آپ نہیں نہ کہتے تھے، اور یہاں تو سوال کرنے والے ایک مخلص مسلمان تھے، پھر پیراہن دینے میں بخل سے کام لینا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کرم وسخاوت کے منافی تھا، اس لیے آپ کو پیراہن دینے میں تامل نہیں ہوا۔ چنانچہ جو آیت بعد میں نازل ہوئی اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیراہن کی بخشش کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔

اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ آیت کریمہ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ اس واقعہ سے پہلے نازل ہوئی ہے، اور اس میں نمازِ جنازہ کے بجائے صرف استغفار کی ممانعت ہے تو اوپر بیان کی گئی توجیہ سے خلجان کیسے دور ہو سکتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں اس استغفار سے منع کیا گیا ہے جس کی اجابت کی امید ہو اور جو واقعتاً تحصیل مغفرت کی غرض سے کیا گیا ہو، حضرت ابوطالب کے معاملہ میں آپ نے اسی لیے استغفار کیا تھا، لیکن اس منافق کے لیے آپ نے جو استغفار کیا تھا اس کا یہ مقصد نہیں تھا بلکہ یہ اس کے صاحبزادے اور اہل خاندان کی تالیف قلب اور دلجوئی کے لیے کیا تھا، روایت کی گئی ہے کہ اس کریمانہ خلق نبویؐ کا مشاہدہ کر کے خزرج کے ایک ہزار آدمی ایمان سے مشرف ہو گئے تھے، اور انہوں نے کہا کہ جب سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی لطف وکرم اور دعا واستغفار کا یہ حال ایک ایسے شخص کے ساتھ جو زبان سے تو ایمان ظاہر کرتا ہے لیکن اندر سے اس کے برعکس تھا تو جن کا ظاہر وباطن یکساں ہو اور جو واقعی ایمان واسلام میں مخلص ہوں ان کے ساتھ آپ کا برتاؤ کتنا عمدہ اور اچھا ہوگا۔

جواب میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے اس کی نماز اس لیے پڑھی تھی کہ آپ امت کو یہ تعلیم دینا چاہتے تھے کہ احکام شرع ظواہر حال پر مرتب ہوتے ہیں چنانچہ جس نے اقرار شہادت کر لیا اس پر باتفاق احکام جاری ہوں گے، رہی آیت: (وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ) جو اس واقع کے بعد نازل ہوئی تو یہ ان منافقین کے لیے مخصوص ہے جن کے کفر کا یقین آپ کو اللہ تعالیٰ کے خبر دینے کی وجہ سے ہو گیا تھا۔

Marfat.com

آگے شیخ نور الحق نے آیت استغفار سے آنحضرتؐ کے تخییر کا مفہوم لینے پر جس تردد اور خلجان کا اظہار کیا گیا ہے اس کا جواب دیا ہے مگر یہ جواب خود ان کے نزدیک بھی شافی اور دشواری سے خالی نہیں ہے۔

اس طرح کے شکوک وشبہات کا جواب انہوں نے اور جگہوں پر بھی دیا ہے مثلاً کتاب الایمان کے باب علامات المنافق میں حضرت ابوہریرہؓ کی یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ منافق کی تین علامتیں ہیں:

۱ جب کوئی بات کرے تو جھوٹ کہے۔

۲ وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے۔

۳ جب کوئی امانت سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

شیخ نور الحق اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ اوصاف بد تو مؤمنین میں بھی پائے جاتے ہیں، پس ان کو نفاق کی علامت کیسے مانا جائے اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ان اوصاف بد کو اپنی عادت بنالیں اور یہ حالات ان کے لوازم میں داخل ہوجائیں وہ مخلص مؤمن نہیں ہیں بلکہ پکے منافق ہیں جیسا کہ دوسری حدیث اس مفہوم میں بالکل صریح ہے۔

یہ جواب بھی دیا جاسکتا ہے کہ یہ عادتیں نفاق کی علامت ہیں جس شخص میں یہ جمع ہوجائیں ظاہر حکم کے مطابق اس کے اندر نفاق کی علامتیں جمع ہوگئیں رہی دل کی تصدیق تو اس کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ نفاق سے عمل میں نفاق مراد ہے، یہ لوگ کہتے ہیں کہ لغت میں باطن سے ظاہر کی مخالفت کا نام نفاق ہے۔ اگر یہ مخالفت ایمان وعقیدہ میں ہو تو اسے نفاق کفر کہا جائے گا ورنہ یہ نفاق عمل کہلائے گا، اس کے معنی یہ ہوئے کہ عمل عقیدہ کے مطابق نہیں ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حدیث کسی خاص اور متعین شخص کے بارے میں ہے جو منافقین کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا اور آنحضرت ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کی آپ اشارہ وکنایہ میں گفتگو کرتے تھے مثلاً فرمایا: مابال اقوام یا اسی طرح کے اور فرمودات بھی ہیں، یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ جس طرح اخلاص کے مقامات ودرجات ہیں اسی طرح اس کے مقابل نفاق کے بھی مراتب ودرجات ہیں، چونکہ ان صفات کے ہوتے ہوئے آدمی کمال اخلاص کے مرتبہ پر نہیں پہنچ سکتا اور جب ان مذموم باتوں میں وہ بہت آگے نکل جائے تو منافق کہلائے گا، اسی کی طرف حدیث نافق حنظلہ الخ میں بھی اشارہ ہے۔ (ج ۱، ص: ۲۷)

اصول ومصطلحات حدیث کی تشریح:

شیخ نور الحق نے جابجا احادیث کے اصول ومصطلحات پر بھی بحث وگفتگو کی ہے، یہاں ہم بعض مثالوں سے اسکو واضح کریں گے محدثین کی ایک اصطلاح متابعت ہے، اس کے متعلق شیخ کی وضاحت کو سمجھنے کیلئے یہ پس منظر پہلے جان لینا چاہیے۔

امام بخاریؒ نے کتاب کے پہلے: باب کیف کان بدٔ الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جو تیسری حدیث نقل کی ہے، اس کی سند ملاحظہ ہو۔

حدثنا یحیی بن بکیر قال اخبرنا اللیث عن عقیل ابن شہاب عن عروۃ بن الزبیر عن عائشۃ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا انہا قالت اول مابدیٔ بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الوحی، حدیث کو ختم

Marfat.com

کرنے کے بعد امام بخاری فترۃ الوحی کے متعلق ابن شہاب کے واسطہ سے جابر بن عبداللہ انصاری کی حدیث کے بعض حصے نقل کر کے لکھتے ہیں:

تابع عبداللہ بن یوسف و ابو صالح۔

عبداللہ بن یوسف اور ابوصالح نے یحیٰ بن بکیر کی متابعت کی ہے

پھر لکھتے ہیں:

وتابعہ ھلال بن رداد عن الذھری۔

زہری سے روایت کرنے میں عقیل کی متابعت ہلال بن رداد نے کی ہے

اس کے بعد شیخ نورالحق کی تقریر ملاحظہ ہو:

"اہل حدیث کی اصطلاحات میں ایک متابعت بھی ہے، مصنف نے اپنی جامع میں اس سے اکثر تعرض کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ راوی نے ایک روایت اپنے شیخ سے کی اور اسے کسی دوسرے شخص سے بھی بیان کیا جس نے اس کے شیخ کے شیخ سے اسی کو روایت کیا ہے، اب اگر یہ دوسرا راوی معتبر ہے اور صحابی تک اس کی سند کے تمام رواۃ متفق علیہ ہیں تو اس قسم کو متابعت تامہ (مکمل متابعت) کہتے ہیں مثلاً امام بخاریؒ نے اس روایت کو یحییٰ کے واسطہ سے بیان کیا ہے اور انہوں نے اسے لیث کے واسطہ سے بیان کیا ہے اور اس کی تائید عبداللہ وابوصالح کی روایت سے کی ہے جو معتبر و متفق علیہ ہیں، متابعت کی دوسری قسم یہ ہے کہ جو راوی اس کی روایت کی تائید کرتا ہے وہ شیخ کے شیخ سے روایت کرنے میں اوپر کے راوی کا شریک ہے، اس کو متابعت ناقصہ کہتے ہیں، اگر یہ دور تر ہو تو متابعت انقص کہلائیگی، اس اعتبار سے کہ بعض رجال نے اس کی عدم موافقت کی ہے جیسا کہ مصنف نے دوسری بار اسکی طرف اشارہ کیا ہے، اور کہا ہے کہ عقیل کی متابعت ہلال بن رداد نے کی ہے یعنی جس طرح عقیل نے ابن شہاب سے روایت کی ہے جو تابعی ہیں اسی طرح ان سے ہلال بن رداد نے بھی کی ہے اور چونکہ ہلال و عقیل دونوں ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں اسی لیے بلاشبہ ہلال کی روایت عقیل کی روایت کی متابع ہوئی۔

متابعت میں بعض لوگوں نے یہ شرط بھی عائد کی ہے کہ متابعت کرنے والے دونوں افراد کے متن کو لفظاً متحد ہونا چاہیے مگر کچھ لوگ صرف معنی کے اتحاد کو کافی سمجھتے ہیں، متابعت کو مشاہد کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ (ج ا ص: ۱۰، ۱۱)

محدثین کی ایک اصلاح تعلیق ہے جس کی مثالیں صحیح بخاری میں بکثرت ملتی ہیں، شارح نے کہیں کہیں اس کی نشاندہی کی ہے، مثلاً کتاب الایمان میں باب الصلوٰۃ من الایمان (نماز ایمان میں شامل ہے) کا باب باندھا ہے اور اس میں جو حدیث نقل کی ہے اس کے خاتمہ سے قبل لکھا ہے: قال زھیر حدثنا ابو اسحاق عن البرانی حدیثہ ھذا۔ اور اس کے بارے میں بتایا ہے، کہ یہ مقولہ بھی اسی حدیث کا جز ہے جو سند مذکور سے وارد ہے مگر ان کے نزدیک اس کا احتمال بھی ہے کہ مصنف اسے زہیر کے واسطے سے بطریق تعلیق لائے ہوں۔ (ج ا ص: ۳۰)

ایک جگہ تعلیق کی نشاندہی کر کے اس کا مفہوم مثال سے واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تعلیق کا مطلب یہ ہے کہ راوی حدیث کو ایسے شخص کی طرف منسوب کرے جس کا زمانہ اسے نہ ملا ہو چنانچہ امام بخاریؒ نے حدیث مذکور کی طرف دو دیگر طرق سے جو کہ تعلیقات میں ہیں اشارہ کیا ہے جیسے ابو معاویہ نے ۱۹۵ھ یا ۱۹۴ھ میں وفات

Marfat.com

پائی اور عبدالاعلیٰ نے ۱۸۹ھ میں جبکہ امام بخاری کی ولادت ۱۹۴ھ میں ہوئی"۔ (ج۱،ص:۱۹)

ایک جگہ وہ امام بخاری کے اس طریقہ تخریج کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ ایک ہی حدیث کو متعدد ابواب میں اس بنا پر لاتے ہیں کہ ہر ہر باب سے اسکی مناسبت جزأ ہوتی ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں ایک ہی متن اگر متعدد طرق سے آئے اور ایک راوی بھی اس کی پوری سند میں متغائر ہو تو اسے دو حدیث کہا جائے گا، یہ حدیث اسی قبیل سے ہے جس کو مؤلف نے ایک بار قتیبہ اور انہوں نے اسماعیل کے واسطے سے بیان کیا ہے اور دوسری مرتبہ خالد سے جو اسے سلیمان سے بیان کرتے، ہیں لائے ہیں"۔ (ج۱،ص:۴۲)

کہیں کہیں ان حدیثوں کو جنھیں امام بخاریؒ نے بلاسند نقل کیا ہے، شیخ نورالحق نے بتایا ہے کہ انہیں کس مصنف نے سنداً نقل کیا ہے، مثلاً کتاب الایمان کے پہلے باب کی اس حدیث: الحب فی اللہ و البغض فی اللہ عز و جل من الایمان (اللہ کے لیے حب و بغض ایمان میں داخل ہے) کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"مصنف اس حدیث کو سند کے بغیر لائے ہیں لیکن ابوداؤد نے اسے ابوامامہ کے واسطہ سے اور امام ترمذی نے معاذ بن جبلؓ کے واسطے سے بیان کیا ہے"۔ (ج۱،ص:۱۷)

شارح نے سلسلہ سند میں مذکور عطف و معطوف کی وضاحت کی ہے، مثلاً کتاب الایمان کے: باب من الایمان ان یحب لاخیہ مایحب لنفسہ (ایمان میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے) کی پہلی سند یہ ہے: حدثنا مسدد قال حدثنا یحی عن شعبۃ عن قتادۃ عن انس عن النبی ﷺ و عن حسین المعلم حدثنا قتادۃ عن انس عن النبی سلی اللہ علیہ و سلم۔

اس میں شیخ نورالحق وعن حسین المعلم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ظاہر ہے کہ اس کا عطف شعبہ پر ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ یحییٰ کو یہ حدیث دو شیوخ شعبہ و حسین المعلم سے پہنچی ہے اور یہ دونوں حضرات اسے قتادہ سے بیان کرتے ہیں، مگر بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کا عطف حدثنا مسدد پر ہے، اس طرح یہ حدیث تعلیق کے قبیل کی ہوگی۔ (ج۱،ص:۱۹،۲۰)

امام بخاریؒ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ کبھی کبھی وہ حدیث کا متن پہلے بیان کرتے ہیں، اس کے بعد اس کی سندوں کو لاتے ہیں، اس سے ان کا مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ حدیث کی سندیں ضعیف ہیں مثلاً کتاب العلم کے باب کا عنوان یہ ہے: من خص بالعلم قوما دون قوم کراھیۃ ان لا یفھموا۔ (جو شخص علم کے معاملہ میں تخصیص سے کام لے اور کچھ لوگوں کو اس سے واقف کرے اور کچھ لوگوں کو اس اندیشہ سے نہ مطلع کرے کہ وہ اسے نہ سمجھنے کی وجہ سے گمراہی میں پڑ جائیں گے)

امام بخاری نے اس میں پہلے حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے:

حدثوا الناس بما یعرفون اتحبون ان یکذب اللہ و رسولہ۔

لوگوں سے وہی باتیں بیان کرو جن سے وہ مانوس اور واقف ہوں اور وہ ان کی فہم سے بالا نہ ہوں کیا تم لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کا جھٹلایا جانا پسند ہے۔

اس کے بعد وہ اس کی یہ سند بیان کرتے ہیں: حدثنا عبداللہ بن موسیٰ عن معروف بن خربوذ عن ابی الطفیل عن علی رضی اللہ عنہ بذلک۔

Marfat.com

اس کے متعلق مولانا نورالحق تحریر فرماتے ہیں:

''مصنف حدیث مذکور کا متن اس کی سند سے پہلے لاکر یہ متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ اس کی سند میں ضعف ہے۔ ابن معین نے خربوذ کو ضعفا میں شمار کیا ہے، بعض حدیثوں کو انہوں نے ابواب کا عنوان قرار دیا ہے گو یہ صحیح ہیں مگر ان کی سندیں امام بخاری کی شرطوں کے مطابق نہیں ہیں اس لیے انہیں بھی اسی انداز پر لائے ہیں، یہ حدیث اور اس کی سندیں اسی نوعیت کی ہیں''۔

بعض جگہ راویوں کے کچھ اہم خصوصیات بھی شیخ نورالحق نے بیان کیے ہیں:

مثلاً کتاب الایمان کے: باب المعاصی من امر الجاھلیة و لا یکفر صاحبھا (ص:۲۵) کے ضمن میں حضرت ابوذرؓ کے بارہ میں لکھتے ہیں:

''وہ اکابر صحابہ میں تھے، اور ان کا مسلک یہ تھا کہ ضرورت سے زیادہ مال و اسباب کا ذخیرہ کرنا حرام ہے''۔ (ج ا، ص:۲۶)

آگے چل کر ایک راوی ابوبکرہ کے متعلق رقمطراز ہیں۔ ''یہ بھی صحابی ہیں اور مصنف نے ان سے چودہ حدیثیں روایت کی ہیں۔ (ایضا)

زبان کے اسلوب، بلاغت اور عربیت کے مباحث:

شیخ نورالحق عربی زبان و ادب کے بھی ماہر تھے، اس لیے اس شرح میں جا بجا زبان کی اسلوب و استعمال اور بلاغت و عربیت کے نکتوں کو بھی واضح کرتے گئے ہیں جیسے کتاب الایمان کے باب اذالم یکن الاسلام علی الحقیقة میں حضرت سعد کے واسطہ سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس میں یہ الفاظ وارد ہیں:

ان رسول اللہ ﷺ اعطی رھطا و سعد جالس۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک جماعت کو عطا کیا اس حال میں کہ سعد بھی بیٹھا ہوا تھا۔

شیخ نورالحق فرماتے ہیں کہ سعد جالس خود حضرت سعد کا قول ہے، اپنے آپ کو اس طرح ذکر کرنا اور اپنے نام کی صراحت کرنا بطریق التفات ہے۔

تَرِبَتْ یَمِیْنُکَ کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ عربوں کا مالوف طریقہ استعمال ہے، اس سے مقصود بددعا نہیں بلکہ یہ اسلوب زجر کے لیے آتا ہے۔

ابواب الاستسقا کے باب ما قیل فی الزلازل و الآیات میں ایک فقرہ یتقارب الزمان آیا ہے، یعنی قیامت نہ ہو گی یہاں تک کہ زمانہ نزدیک ہونے لگے۔ اس کے متعلق شیخ نورالحق لکھتے ہیں:

تقارب زمان کنایہ ہے بے برکتی و بے فیضی اور اس بات سے کہ لوگ اچھے کاموں سے بے بہرہ ہو جائیں گے، یہ کثرت ہموم اور بہت زیادہ حوادث و شدائد سے بھی کنایہ ہو سکتا ہے اور یہ جو جامع ترمذی میں حضرت انسؓ کی حدیث میں ہے کہ سال جب ماہ اور ماہ ہفتہ اور ہفتہ دن اور دن گھنٹہ اور گھنٹہ لحظہ کی طرح ہو جائے تو یہ بھی اسی معنی میں ہے لیکن حقیقت پر اسے محمول کرنا خفا سے خالی نہیں ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ تقارب زماں سے رات و دن کا برابر ہونا مراد ہے یعنی دنیا کے آخری دور میں روز

Marfat.com

وشب میں یہ تفاوت نہ ہوگا اور اس کی کثرت آخرت کی علامتوں میں سے ہیں بعض لوگوں کے نزدیک اس سے مراد دنیا کی مدت کا آخر ہونا ہے۔

کتاب الایمان کی ایک حدیث میں ہے کہ چار باتیں جس کے اندر ہوں وہ خالص منافق ہوگا یعنی اس کے اندر ایمان کی خوبو نہ ہوگی، شیخ اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ بظاہر آپ کا یہ ارشاد تہدید وتشدید کے لیے آیا ہے ورنہ اہل ایمان کا حال سخت دشوار ہو جائے۔ (ص:۲۸)

اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ شیخ نے کہیں کہیں لفظوں کی تحقیق بھی کی ہے جس میں ان کے معنی بتانے کے علاوہ ان کے اعراب وحرکات کی وضاحت کی ہے اور جن لفظوں کی روایت یا ان کے معنی میں اختلاف ہے ان میں مرجح کی تصریح کی ہے، مثلاً: باب بدء الوحی میں لفظ ''بدء'' کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

بدء میں باء موحدہ پر فتح اور دال مہملہ پر سکون ہے اور آخر میں ہمزہ ہے جس کے معنی آغاز کے ہیں اور بدُوّ کے آخر میں واؤ ہے جو مشدد ہے اور باء و دال دونوں مضموم ہیں، اس کے معنی ظہور کے ہیں، بدء علاوہ بدو کی روایت بھی کی گئی ہے لیکن مشائخ سے مسموع بدء ہے۔

ایک ہی مشتق سے بنے ہوئے لفظوں کی حقیقت وخصوصیت بیان کر کے ان کا فرق واضح کیا ہے مثلاً رؤیا کے متعلق لکھتے ہیں:

''رؤیا کا لفظ رجعی کی طرح مصدر ہے جو خواب میں دیکھنے کے لیے مخصوص ہے، جس طرح رائی دل کے دیکھنے کے لیے اور رؤیت آنکھ سے دیکھنے کے لیے مخصوص ہے''۔ (ج۱،ص:۷)

ناموس اور جاسوس کے معنی کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اول الذکر حضرت جبریل سے کنایہ اور لغت میں صاحب سر خیر (اچھے راز دار) کے لیے آتا ہے جس طرح جاسوس صاحب سر شر (برے راز دار) کے لیے مخصوص ہے''۔ (ج۱،ص:۹)

جنائز کے بارے میں لکھتے ہیں ''یہ جنازہ کی جمع ہے جس کی جیم پر فتحہ اور کسرہ دونوں آتا ہے اور یہ اس مردہ کو کہتے ہیں جو نعش کے اندر ہو، دوسرا قول یہ ہے کہ جب جیم مفتوح ہو تو اس سے مردہ مراد ہوتا ہے اور مکسور کی صورت میں اس سے وہ نعش مراد ہے جس میں میت ہو۔ بعض لوگوں نے اس کے برعکس کہا ہے یعنی مفتوح سے نعش اور مکسور سے میت مراد ہے۔

لفظ ''عصابۃ'' کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''عین مکسور ہے اور اس کا اطلاق ۱۰ سے ۴۰ افراد پر ہوتا ہے، اس لفظ کا واحد نہیں آتا۔

اسی طرح شہروں اور پہاڑوں وغیرہ کے ناموں کے تلفظ واعراب بتائے ہیں اور کہیں کہیں نحوی وصرفی بحثیں کی ہیں نیز معطوف علیہ اور معطوف کی تعیین کی ہے۔

مقدمہ میں شیخ نور الحق نے ان کتابوں کے نام لکھے ہیں جو ان کا ماخذ رہی ہیں اور جن کا ذکر اس تذکرہ کی ابتدا میں ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ انہوں نے اپنے والد بزرگوار شیخ عبد الحق کی شروح وتحقیقات سے بھی بڑا استفادہ کیا ہے ان کتابوں میں فتح المنان اور شرح سفر السعادۃ کے بکثرت حوالے دیے ہیں۔

Marfat.com

شیخ نور اللہ رحمۃ اللہ علیہ

یہ شیخ نور الحق بن شیخ عبدالحق کے اکلوتے بیٹے تھے، ان کے چار بیٹے ہوئے: (۱) سیف اللہ، (۲) علیم اللہ، (۳) محب اللہ اور (۴) جار اللہ۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۵۵)

ان کے مزید حالات نہ معلوم ہو سکے، البتہ بعض بیٹوں کے بارے میں کچھ معلومات درج کی جاتی ہیں۔

شیخ سیف اللہ رحمۃ اللہ علیہ

یہ شیخ نور اللہ کے بیٹے، شیخ نور الحق کے پوتے اور شیخ عبدالحق کے پڑپوتے تھے جو عہد عالمگیری کے ممتاز اور جید عالم تھے، ان کو حدیث وفقہ میں عبور تھا۔ ۱۰۹۱ھ۔ ۱۶۸۰ء میں شمائل النبی کی ایک شرح فارسی زبان میں لکھی جس کا نام اشرف الوسائل فی شرح الشمائل ہے۔ (نزہۃ الخواطر ج۶ ص ۱۰۲)

شرح مکمل کرنے کے بعد مصنف نے اسے اورنگ زیب عالمگیر کو پیش کیا تھا۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۶۱ حاشیہ)

شیخ محب اللہ رحمۃ اللہ علیہ

یہ بھی شیخ نور اللہ کے بیٹے اور شیخ نور الحق بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے پوتے اور علم وفضل میں فائق وبرتر تھے، انہوں نے منبع العلم کے نام سے صحیح مسلم کی ایک شرح لکھی تھی مگر آخر عمر میں شروع کرنے کی وجہ سے وہ اس پر نظر ثانی نہیں کر سکے تھے۔

۱۸۵۷ء سے پہلے یہ کتاب کتب خانہ مولوی انوار الحق میں موجود تھی مگر اس کے بعد مفقود ہو گئی۔

(حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۶۱ بحوالہ مرأۃ الحقائق ص ۱۱۵)

شیخ محب اللہ کے دو بیٹے ہوئے جن کا ذکر آگے آرہا ہے، شیخ نور اللہ کے اور بیٹوں سے بھی ان کی نسل بڑھی اور پھلی پھولی۔

حافظ فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ

ان کا نام عبدالصمد اور کنیت ابوالمکارم تھی، یہ شیخ نور الحق کے پڑپوتے تھے، شجرہ نسب اس طرح ہے:

فخر الدین بن محب اللہ بن نور اللہ بن نوار الحق بن عبدالحق۔

شیخ فخر الدین کو اپنے والد سے فخر تلمذ حاصل ہوا جو اپنے دادا شیخ نور الحق کے براہ راست شاگرد تھے، شیخ فخر الدین نے اپنے والد ہی سے صحاح ستہ کا درس لیا تھا اور ان کو حدیث میں کامل دستگاہ تھی۔ (نزہۃ الخواطر ج۶ ص ۲۱۸)

شیخ فخر الدین کے بعد کی نسل کا ذکر آگے آئے گا، ان کی تصنیفات کے نام یہ ہیں:

Marfat.com

(۱) شرح صحیح مسلم اوپر گزر چکا ہے کہ ان کے والد نے منبع العلم فی شرح صحیح مسلم کے نام سے جو کتاب لکھی تھی اس پر وہ نظر ثانی نہیں کر سکے تھے اس لیے وہ غیر مرتب وغیر مدون تھی، حافظ فخر الدین نے اسے از سر نو مرتب کر کے اس میں مناسب ردوبدل اور حذف واضافہ کیا، وہ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"والد نے یہ کتاب اپنی عمر کے آخری ایام میں لکھی تھی جس پر وہ نظر ثانی نہیں کر سکے تھے، اس لیے میں اس پر نظر ثانی کی اور مناسب ترمیم واضافہ کیا"۔ (علم حدیث میں برعظیم پاک وہند کا حصہ ص ۱۸۵ و ۱۸۶)

کتب خانہ خدا بخش پٹنہ میں اسکا قلمی نسخہ موجود ہے۔ (مقالات سلیمان ج ۲ ص ۲۴)

(۲) شرح عین العلم: یہ محمد بن عثمان بلخی کی تصنیف عین العلم کی فارسی شرح ہے، اس میں بحث کا دارومدار قرآن مجید اور احادیث نبوی کو بنایا گیا ہے، اوّل الذکر کے لیے ق اور مؤخر الذکر کے لیے ح کے رموز استعمال کیے گئے ہیں، شیخ فخر الدین کا بیان ہے کہ:

"شیخ عبدالحق نے اپنے وصایا میں تحریر فرمایا ہے کہ عین العلم کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے اور سفر وحضر میں کبھی اپنے سے اسے دور نہ کیا جائے اس لیے بچپن سے ہی میں اس کا شیفتہ رہا اور وہ ہمیشہ میرے مطالعہ میں رہی، اب فارسی کا رواج ہے اس لیے عربی سے ہر شخص استفادہ نہیں کر سکتا، اس بنا پر عام فائدہ کے لیے اس کی شرح فارسی میں لکھی۔"

(تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۲۸ و ۲۲۹ بحوالہ قلمی نسخہ کتب خانہ خدا بخش)

شرح میں حدیث روایت کرنے والے صحابیوں کے ناموں کے ساتھ ان کتابوں کے نام بھی دیئے گئے ہیں جن میں یہ احادیث درج ہیں، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ پٹنہ میں ہے۔ (محبوب الالباب ص ۴۳۹)

(۳) شرح حصن حصین: یہ علامہ جزری کی مشہور ومقبول کتاب حصن حصین کی فارسی شرح ہے جو مطبع نولکشور سے چھپ چکی ہے۔[۱]

شیخ نور الحق ثانی رحمۃ اللہ علیہ

یہ بھی شیخ محب اللہ کے بیٹے اور حافظ فخر الدین کے بھائی تھے گویا شیخ نور اللہ کے پوتے اور شیخ نور الحق بن عبدالحق اوّل کے پڑپوتے تھے، انہوں نے اپنے والد سے تحصیل علم کی تھی اور متجر عالم، مفتی اور فقیہ تھے۔

شیخ عبدالحق کی عربی تصنیف: ماثبت بالسنة فی ایام السنة کی شرح فارسی میں لکھی تھی:

اللہ سے ان کی نسل کو فروغ ہوا۔

۱۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۶۳) ان سب کتابوں کا ذکر نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۸، حدائق الحنفیہ ص ۴۶۸ اور تذکرہ علماء ہند میں [illegible]

۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۸۹ اصل کتاب کا اردو ترجمہ بھی ۱۳۰۹ھ اور ۱۳۲۶ھ میں چھپ گیا ہے جو کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ فہرست ج ۱ ص ۵۰ و ۵۱ و فہرست ج ۳ ص ۲۶۲ و ۲۶۳۔

Marfat.com

حافظ محمد محسن دہلویؒ اور شیخ محمد احسانؒ

(المتوفی ۱۱۴۷ھ ۔ ۱۷۳۴ء) (المتوفی ۱۲۰۶ھ ۔ ۱۷۹۱ء)

ان دونوں کا تعلق بھی خانوادۂ حقی سے تھا، اوّل الذکر کو صاحب نزہۃ الخواطر نے شیخ عبدالحق کے اسباط (نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۴۷) (نواسوں) اور دوسروں نے اولاد (خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۶۶۴) واحفاد (تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۲) میں بتایا ہے یہ عالم وفقیہ تھے، ارباب تذکرہ نے جامع منقول ومعقول لکھا ہے، (ایضا) ان کی پیدائش دہلی میں ہوئی اور یہیں نشوونما بھی ہوئی، خواجہ محمد معصوم بن شیخ احمد سرہندی سے خلافت پائی، خواجہ کی خدمت میں مدت دراز تک رہنے کی بناء پر مجددی ونقشبندی کی نسبتوں سے مشہور ہوئے، (ایضا) مفتی غلام سرور کا بیان ہے۔

"حافظ محمد محسن نے پہلے علوم ظاہری کی تحصیل کی اور اس میں نہایت بلند پایہ اور صاحب کمال ہوئے، دہلی میں کوئی انکا ہمسر اور ہم پایہ نہ تھا، اسکے بعد ہدایت ربانی کی کشش سے شیخ محمد معصوم کی خدمت میں باریاب ہوئے اور علوم باطنی سے مالامال ہوئے، طریقہ عالیہ مجددیہ میں کامل ومکمل ہونے کے بعد خرقہ خلافت پہنا ورع وتقوی اور زہد وریاضت میں یکتائے روزگار تھے"۔

(خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۶۶۴)

شیخ نور محمد بدایونی اور دوسرے حضرات نے ان سے کسب فیض کیا، ۱۱۴۷ھ میں وفات پائی۔ (نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۴۷)

شیخ محمد احسان: شیخ محمد محسن کے صاحبزادے اور حضرت میرزا مظہر جان جاناں کے کبار خلفا میں تھے، اوائل عمر میں منحرف العقیدہ اور صراط مستقیم سے روگرداں تھے پھر حضرت میرزا مظہر جان جاناں کی توجہ وبرکت سے توبہ وانابت کی توفیق ملی اور اپنی غیر معمولی استقامت اور ثابت قدمی سے اس راہ میں بڑی ترقی کی اور سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ میں بلند مقامات پر فائز ہوئے۔

غایت محبت کی وجہ سے جس وقت اللہ کا نام شیخ محمد احسان کے حق نیوش کانوں میں پڑتا تو بے ہوش ہو جاتے، ان کے مرشد حضرت مظہر جان جاناں فرماتے ہیں کہ:

"احمد شاہ درانی کی غارت گری کے زمانہ میں شیخ محمد احسان اپنے کوچہ کے دروازہ پر پوری ہمت وبہادری سے بیٹھے اور جمے رہے، اللہ کے فضل سے کوئی غارت گر اس کوچہ میں نہیں آیا اور تمام اہل کوچہ کا جان ومال سلامت رہا شیخ محمد احسان کی وفات ۱۲۰۶ھ میں ہوئی"۔ (خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۶۸۸)

Marfat.com

شیخ الاسلام محمد رحمۃ اللہ علیہ

یہ حافظ فخر الدین کے فرزند تھے، انہی سے تحصیل علم کی اور صحاح ستہ نیز دوسری کتب حدیث کی اجازت پائی، شیخ الاسلام کو علمی فضیلت کے ساتھ دینی وجاہت بھی حاصل تھی، محمد شاہ کے عہد میں صدر الصدور کے منصب پر فائز تھے، (تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۳۰ بحوالہ خاتمہ شرح بخاری جلد چہارم بر حاشیہ تیسیر القاری) جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تھا تو وہ شاہجہان آباد (دہلی) میں مقیم تھے، (مقالات سلیمان جلد ۲ ص ۲۵) یہ بڑا پُر آشوب دور تھا، سکھوں، مرہٹوں اور جاٹوں کی شورش نے قیامت بپا کر رکھی تھی، اسی زمانہ میں وہ بخاری کی شرح تحریر فرما رہے تھے، انہوں نے شرح کے نصف اوّل کے آخر میں اپنے زمانہ کے ابتر حالات کا بڑے دکھ سے ذکر کیا ہے۔

شیخ سلام اللہ رام پوری، شیخ الاسلام کے فرزند تھے، ان کا ذکر آگے ہوگا۔

تصانیف:

شیخ الاسلام کی تصانیف یہ ہیں:

☆ رسالہ کشف الغطا عما لزم للموتی علی الاحیاء: اس میں تجہیز و تکفین سے متعلق امور کا ذکر ہے، یہ دہلی سے طبع ہو چکی ہے۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۶۲)

☆ رسالہ طرد الاوہام عن اثر الامام الہمام: امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے اثبات پر ہے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۸)

☆ شرح بخاری: شیخ الاسلام کی یہ سب سے اہم تصنیف ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی اور شیخ نور الحق کی شرح بخاری فارسی تیسیر القاری کے حاشیہ پر چھپی ہے۔ اس کا قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں دو جلدوں میں موجود ہے، (مقالات سلیمان ج ۲ ص ۵۳ و تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۳۰) ان جلدوں میں تقریباً نصف بخاری کی شرح آ گئی ہے، غالباً آخری نصف حصہ وہ اپنے زمانہ کے حالات کی وجہ سے مکمل نہیں کر سکے اور اس کی تکمیل ملا احسن الملقب بحافظ پشاوری نے کی۔ (تقریظ جلد اول ص ۲۰)

شرح دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شیخ نور الحق کی شرح کے مقابلہ میں زیادہ مفصل ہے۔

شروع میں ایک مقدمہ ہے، اس میں حدیث کی اصطلاحات، امام بخاری کے حالات صحیح بخاری کی خصوصیات، وجہ تصنیف، صحیح کے شرائط، تعداد احادیث، تراجم ابواب، تعلیقات، اس کی طرق و روایات اور اسناد وغیرہ پر بحث و گفتگو کی ہے، شرح میں احادیث کے ترجمہ و تشریح کے ضمن میں لفظوں کی تحقیق، قریب المعنی لفظوں کے معنوی فرق کی وضاحت، نحو و اعراب کے مسائل، راوی کے ناموں کا صحیح تلفظ، اور ان کے سنین وفات دیئے گئے ہیں رسول اللہ ﷺ کا ذکر مبارک آ گیا ہے تو آپ کا پورا نسب نامہ تحریر کیا ہے، فقہی و کلامی مسائل پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے، ابواب سے احادیث کی مناسبت اور نسخوں کے فرق و اختلاف کو جابجا واضح کیا ہے، شرح کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس میں امام نووی کی شرح مسلم، حافظ ابن حجر کی فتح الباری، شیخ عبدالحق کی شروح مشکوٰۃ اور شیخ نور الحق کی شرح بخاری سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے، وہ شیخ عبدالحق کا ذکر بڑی عقیدت و احترام سے کرتے ہیں، انہیں "شیخ اجل" لکھتے ہیں اور ان کے خیالات جابجا نقل کرتے ہیں:

Marfat.com

شرح کی مزید خصوصیات کا اندازہ دو چار مثالوں سے ہوگا جو ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

حضرت عروہ بیان کرتے ہیں کہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حارث بن ہشام نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت فرمایا کہ اے اللہ کے رسول آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟ آپ نے فرمایا کبھی کبھی وہ آواز جرس کی طرح آتی ہے، اور یہ مجھ پر بڑی سخت ہوتی ہے اور مجھے چور چور کر دیتی ہے۔ حدیث کے اس ابتدائی حصہ کی شرح میں شیخ الاسلام نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، نمبروار ملاحظہ ہو:

(۱) حضرت عائشہ کو ام المؤمنین کہنا دراصل آیت کریمہ: وَاَزْوٰجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ سے ماخوذ ہے جس سے مقصود صرف اس قدر ہے کہ ازواج مطہراتؓ مسلمانوں کی مائیں ہیں جن سے انکا نکاح حرام ہے، یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ ان سے خلوت میں مل سکتے ہیں یا انہیں دیکھ سکتے ہیں یا ان کی بیٹیوں سے بھی ان کا نکاح ممنوع ہے، حضرت عائشہؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی اور آنحضرت ﷺ کی تمام بیویوں میں سب سے افضل اور آپ کی چہیتی تھی سوائے حضرت خدیجہؓ کے، اس بارے میں اختلاف ہے۔

حضرت عائشہؓ مجتہد تھیں اور خلفائے اربعہؓ کے زمانہ میں فتوے دیتی تھیں، ان کی وفات ۵۵ھ یا ۵۸ھ میں ہوئی۔

(۲) حارث بن ہشام ابوجہل کے بھائی تھے، یہ فتح مکہ کے روز اسلام لائے فضلائے صحابہ میں تھے اور معرکہ یرموک ۱۱ھ میں شہید ہوئے۔

(۳) حارث نے جب رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تو ممکن ہے حضرت عائشہؓ وہاں موجود رہی ہوں جیسا کہ مشہور اور اکثر لوگوں کا معتمد قول ہے مگر دوسرا احتمال یہ ہے کہ انہوں نے اسے حارث سے سنا ہو اور جمہور کے نزدیک مرسل صحابی وصل کے حکم میں ہے۔

(۴) حدیث میں آواز کے لیے صلصلہ کا لفظ آیا ہے لوہے پر مارنے سے جو آواز ہوتی ہے اسے صلصلہ کہتے ہیں بعد میں اس کا اطلاق ہر اس آواز پر ہونے لگا جس میں طنین (ٹن ٹن) ہو، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ پیہم آنے والی آواز کو کہتے ہیں، پہلے قول کے مطابق مفہوم تامل و تحقیق کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے۔

جرس ایک مشہور آلہ (گھنٹی) ہے جو جانوروں کی گردن میں باندھا جاتا ہے اس سے وحی کی تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کہ عام لوگ اسے سمجھ لیں کہ کانوں میں اس کی آواز پیہم پڑتی ہے اور یہ یا تو وحی کی آواز ہوتی ہے یا حضرت جبریل کی آواز۔

(۵) اس طور پر وحی کے سخت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مقصود کو سمجھنا میرے لیے مشکل ہوتا ہے، کیونکہ خطاب کے معروف طریقوں کے برخلاف اس طرح کی آواز سے مطلب سمجھنا دشوار ہوتا ہے اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جسمانی حیثیت سے آپ شدید کرب اور بے چینی میں پڑ جاتے تھے اور بشریت کے تقاضے سے ان اوقات میں ایسا مغلوب ہو جاتے تھے کہ سخت ٹھنڈک میں بھی آپ کی پیشانی پر پسینے کے قطرے دکھائی دیتے تھے۔

پہلے اس آواز کے آنے کی حکمت یہ ہے کہ آپ وحی سننے کے لیے متنبہ اور ہوشیار ہو جائیں اور تمام تر اس کی جانب متوجہ ہو جائیں اور جو کچھ سنیں اسکو ذہن نشین کر لیں۔

(۶) حدیث میں فصم سے مضارع کا جو صیغہ استعمال ہوا ہے وہ معروف و مجہول دونوں طرح سے ہے، صیغہ مجہول کی

Marfat.com

صورت میں فصم ثلاثی مجرد سے ہے، جو شکستن اور بریدن کے معنی میں ہے اور معروف کی صورت میں یہ ثلاثی مزید افصام سے ہوگا جس کے معنی باز ماندن اور رفع دفع کرنا ہوں گے اور یہ تینوں معنی روا ہیں"۔ (شرح بخاری شیخ الاسلام ص ۲۹ و ۳۰)

ایک مشہور حدیث ہے کہ: الایمان بضع و ستون شعبۃ (ایمان کے ساٹھ اور چند شعبے ہیں) اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

بعض روایتوں میں ستر اور چند آیا ہے، مطلب یہ ہے کہ ایمان کے شعبے جیسے اخلاص، اعمال، واجبات، سنن، مستحبات اور آداب وغیرہ حد و شمار سے باہر ہیں، جس طرح ملائکہ و انبیا کی تفصیل کا علم غیر ضروری ہے، اسی طرح اس کی تفصیل کا علم بھی ضروری نہیں ہے، اس کے ذکر کا مقصد حصر و تعیین کے بجائے کثرت و تعدد کو بیان کرنا ہے، مبالغہ اور کثرت کے موقع پر اس طرح سے اعداد کو لانا متعارف ہے، غالباً قواعد و احکام کے اصول کا مجموعہ یہی عدد ہوں۔

روایتوں میں عدد کا اختلاف مختلف چیزوں کے اعتبار کی وجہ سے ہے، کبھی ایک بات کا اعتبار کر کے ایک عدد کی صراحت فرمائی ہے اور کبھی دوسری بات کا اعتبار کر کے دوسرے عدد کا ذکر کیا ہے، بعض لوگوں نے اس میں تکلف کی راہ اختیار کی ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ اس سے حصر ہی مقصود ہے۔ (جلد اول، ص: ۵۸)

اس کے بعد شعب ایمان پر طویل اور اچھی بحث کی ہے۔

ایک اور مشہور حدیث ہے کہ: "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اس وقت تک قتال کروں جب تک کہ وہ اس کی گواہی نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، پس جب وہ یہ (باتیں) کرنے لگیں تو مجھ سے ان کے جان و مال محفوظ ہو جائیں گے۔ سوائے اسلام کے حق کے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہوگا"۔

اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

"نماز و زکوٰۃ کا ذکر، ان کی عظمت شان کی بنا پر اور یہ بتانے کے لیے ہوا ہے کہ عبادات بھی کلمہ شہادت کے حکم میں ہیں، پس دوسرے واجبات و فرائض کے ترک پر بھی قتال ثابت ہوگا، یہاں تک کہا گیا ہے کہ وہ سنتیں جو اسلام کے شعائر میں داخل ہیں، جیسے اذان اور ختنہ وغیرہ اگر ان کو چھوڑا جائے اور ان کے ترک پر اصرار کیا جائے تو ایسے لوگوں سے قتال کیا جائے گا بصورت دیگر ان لوگوں کے جان و مال محفوظ رہیں گے، سوائے اسلام کے حق کے کہ ایک شخص دوسرے کو قتل کر دے یا زنا و سرقہ کرے یا دوسرے کا مال تلف کر دے یا اللہ و رسول کے حقوق یعنی عبادات کی ادائیگی اور شریعت کی تعظیم سے باز رہے تو اس وقت یہ عظمت و حرمت اٹھ جائے گی اور شریعت کے حکم کے مطابق اسے سزا دی جائیگی۔ ان کا حساب ان کی جزا و سزا اور ان کے ظاہر و باطن کا معاملہ خدا کے حوالہ ہوگا۔ ہم لوگ احکام ظاہری ہی کے مکلف و مامور ہیں، یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ ظاہری اعمال کے قبول پر معاملہ کیا جائے گا اور مقتضائے ظاہر کے مطابق حکم و فیصلہ عائد ہوگا اور ان اہل بدع کی تکفیر نہ کی جائے گی جو توحید کو ضرر پہنچانے والے کاموں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس حدیث کے فوائد کے ضمن میں نووی نے تحریر کیا ہے کہ وجوب کا اعتقاد رکھنے کے باوجود قصداً نماز ترک کرنے والا قتل کر دیا جائے گا۔ یہی جمہور کا نظریہ ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ وہ فوراً قتل کیا جائے گا یا تین روز کی مہلت دینے کے بعد اسے قتل کیا جائے گا۔ زیادہ صحیح پہلا قول ہے اور صحیح یہ ہے کہ ایک نماز ترک کرنے پر بھی جب اس کا وقت ختم ہو جائے گا وہ قتل کر دیا جائے گا۔ امام احمدؒ کے نزدیک یہ قتل، کفر و ارتداد کی وجہ سے ہوگا مگر دوسروں کے نزدیک عدوان و

Marfat.com

بغاوت کی بنا پر قتل کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ عِلیہ قتل وتکفیر کے بجائے اسے محبوس کیے جانے کے قائل ہیں۔ روزہ ترک کرنے پر حبس وقید کے ساتھ کھانے سے بھی روکا جائے گا۔ اور زکوٰۃ ترک کرنے پر اس سے زبردستی لی جائے گی۔ یہ بات مخفی نہیں رہنی چاہیے کہ حدیث کا مقتضا یہ ہے کہ نماز وزکوٰۃ اور اسطرح کے دوسرے اعمال کو ترک کرنے والے سے قتال مباح ہے، اس میں قتل کے مباح ہونے کا پہلو نہیں ہے چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ نے مانعین زکوٰۃ سے قتال کیا تھا اور انہیں قتل نہیں کیا تھا۔ قتال جو دو فریقوں کی جانب سے ہوتا ہے اس کی اباحت سے قتل کی اباحت لازم نہیں آتی"۔

شیخ الاسلام کی بحث وتحقیق کا اندازہ کرنے کیلئے ایک اور مثال پیش کی جاتی ہے:

امام بخاریؒ نے کتاب الصلوٰۃ میں ایک باب یہ قائم کیا ہے کہ "حالت نماز میں چھوٹی لڑکی کو اپنی گردن پر اٹھانے کا بیان" اس باب میں انہوں نے عمرو بن سلیم زرقی کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضرت ابوقتادۃ انصاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے، اور اسی حالت میں وہ اپنی صاحبزادی زینب کی بیٹی امامہ کو اٹھائے ہوئے تھے، یہ ابوالعاص بن ربیعہ بن عبدشمس کی لڑکی تھیں، آپؐ نے جب سجدہ کرتے تو انہیں اتار دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو انہیں اٹھا لیتے۔

شیخ الاسلام نے اس باب اور حدیث کے رواۃ ومتن کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ ملاحظہ ہو۔

(۱) باب میں مذکور صورت میں نماز فاسد نہیں ہوگی، ابن بطال فرماتے ہیں کہ اس موقع پر اس باب کو لانے سے امام بخاریؒ کا منشا یہ ہے کہ جب نماز پڑھنے والے کا بچی کو اٹھانا مضر نہیں ہے تو اس کے آگے سے بچی کا گزرنا بطریق اولی مضر نہ ہوگا لیکن مصنف نے صغیرہ (چھوٹی) کی قید لگا کر یہ بتایا ہے کہ کبیرہ (بڑی) کی صورت میں یہ بات نہیں ہوگی۔

(۲) سُلَیم کو مصغر اور زُرَقی کا تلفظ بیان کرنے کے بعد وہ حضرت زینب کے بارے میں بتاتے ہیں کہ یہ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے تھیں اور حضرت امامہ آنحضرت ﷺ کے عہد میں صغیر السن تھیں، حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق حضرت علیؓ کے عقد میں آئیں۔

آگے ابوالعاص، ربیعہ اور عبدالشمس وغیرہ کے بارے میں تحریر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

(۳) مختار قول کے مطابق ابوالعاص کا نام مقسم (بکسیر میم وسکون قاف وفتح سین) ہے، ان کا نکاح آنحضرت ﷺ نے حضرت زینب سے ظہور نبوت سے پہلے کیا تھا، ظہور اسلام کے بعد وہ کافروں کے ساتھ تھے، اور بدر میں قیدی ہو کر جب آپؐ کے پاس لائے گئے تو آپؐ نے ان سے عہد لیا کہ زینب کو بھیج دیں چنانچہ انہوں نے حضرت زینبؓ کو آپؐ کے پاس بھیج دیا اور خود مکہ ہی میں رہے، بعد ازاں وہ اسلام لائے اور ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے اس وقت آنحضرت ﷺ نے حضرت زینبؓ سے ان کا نکاح دوبارہ کیا عہد صدیقی میں یمامہ کی لڑائی میں وفات پائی۔

(۴) حدیث میں صرف سجدہ کے وقت حضرت امامہ کو رکھنے کا ذکر ہے اس سے مقصود مطلق جھکنا اور پست ہونا ہے اس لیے رکوع بھی اس میں شامل ہے جیسا کہ بعض روایتوں میں اس کی تصریح موجود ہے۔

(۵) یہاں یہ خیال ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا امامہ کو اس طرح اٹھانا اور پھر رکھنا فعل کثیر [1] میں داخل ہے اور یہ فعل

---

[1] فعل کثیر سے مراد نماز کے اندر کے غیر متعلق اعمال واشغال ہیں جن کو فقہا نے ممنوع قرار دیا ہے البتہ فعل قلیل کو جائز کہا ہے مگر دونوں کی تعیین وتحدید میں اختلاف ہے۔

Marfat.com

قلیل بھی ہو تو اس کو یقیناً مکروہ ہونا چاہیے اسی لیے علما نے اس حدیث کی تاویل میں اختلاف کیا ہے، امام خطابی فرماتے ہیں کہ یہ فعل آنحضرت ﷺ کی جانب سے نہیں ہوا تھا بلکہ حضرت امامہ خود آپؐ سے لپٹ جاتی تھیں اور رکوع و سجدہ کے وقت گر پڑتی تھیں اور آپ ان سے شدید تعلق و محبت کی وجہ سے انہیں دور نہیں کرتے تھے، گویا اس فعل کی نسبت آپ کی جانب مجازاً کی گئی ہے لیکن مسلم، ابوداؤد اور احمد کی روایتوں میں صراحتاً یہ موجود ہے کہ اٹھانا اور اتارنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ہوتا تھا نہ کہ امامہ کی جانب سے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ فعل کثیر وہ ہوتا ہے جو متواتر اور پے در پے کیا جائے یہاں یہ صورت نہیں تھی، علاوہ ازیں آپ کی طمانینت اور ارکان کی ادائیگی میں اس کی وجہ سے کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ آپؐ نے نفل نماز میں ایسا کیا تھا حالانکہ ابوداؤد کی روایت میں ظہر و عصر اور امامت کی صراحت موجود ہے، امام مسلم کی روایت میں بھی امامت کی تصریح ہے، امام نووی فرماتے ہیں کہ بعض مالکیہ نے حدیث کو منسوخ اور بعض نے اسے آپؐ کے خصائص میں بتایا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایسا آپؐ نے ضرورتاً کیا تھا کیونکہ اس وقت کوئی ایسا شخص آپ کو نہیں ملا جس کے حوالہ آپ امامہ کو کر دیتے۔

یہ سب دعوے مردود و باطل اور بلا دلیل ہیں، حدیث میں کوئی بات شریعت کے اصول و قواعد کے منافی نہیں اس لیے کہ آدمی پاک ہوتا ہے اور بچوں کے کپڑے اور بدن کو بھی طہارت ہی پر محمول کرنا چاہیے تا آنکہ نجاست ظاہراً معلوم ہو۔ اعمال سے نماز فاسد نہیں ہوتی جبکہ وہ قلیل ہوں یا متفرق طور پر کیے جائیں اور آنحضرت ﷺ نے ایسا صرف بیانِ جواز کیلئے کیا تھا۔ (ج ۱ص: ۴۴۷و۴۴۸)

شیخ الاسلام کی شرح بخاری کی نوعیت وخصوصیت ماننے کے لیے یہ مثالیں کافی ہیں۔

Marfat.com

مولانا سلام اللہ محدث رام پوری رحمۃ اللہ علیہ

المتوفی ۱۲۲۹ھ۔ ۱۸۱۴ء

مولانا سلام اللہ محدث کو شیخ عبدالحق دہلوی کے خاندان کا آخری نامور عالم بتایا جاتا ہے، یہ شیخ الاسلام محمد کے فرزند تھے مگر صاحب نزہۃ الخواطر (ج ا ص ۲۰۱) تتبع میں بعض حضرات نے انہیں حافظ فخر الدین کا بیٹا لکھا ہے (تعارف مخطوطات دارالعلوم دیوبند از مفتی ظفیر الدین ص ۱۱۶) جو صحیح نہیں ہے۔ شیخ الاسلام کے زمانہ ہی میں دہلی کے حالات نہایت ابتر ہو گئے تھے، غالباً ان حالات سے بددل ہو کر مولانا سلام اللہ نے دہلی کی سکونت ترک کر کے رام پور میں بود و باش اختیار کر لی تھی، اس وقت نواب فیض اللہ خاں کا زمانہ تھا، انہوں نے ان کی اچھی پذیرائی کی اور صلہ و اکرام سے نوازنے کے علاوہ صدارت کے منصب پر فائز کیا۔

(نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۰۱ و تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ج دوم ب ششم ص ۳۷۰)

مولانا شیخ سلام اللہ نے حدیث اور دوسرے مروجہ علوم کی تعلیم اپنے والد شیخ الاسلام اور دوسرے علمائے عصر سے حاصل کی تھی، مولوی رحمان علی کا بیان ہے کہ "علوم متداولہ کی تحصیل اپنے والد سے کی تھی، انہی سے حدیث کی اجازت و سند پائی تھی"۔

(تذکرہ علماء ہند ص ۷۶)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی ولادت و نشو و نما اور تعلیم دہلی ہی میں ہو چکی تھی لیکن سن ولادت کا علم نہیں ہو سکا۔

فضل و کمال:

علم و فن سے شغف ان کو اپنے آباؤ اجداد سے وراثتاً ملا تھا شرح مؤطاء میں خود لکھا ہے کہ "مجھے اپنے دادا شیخ عبدالحق کی مصنفات سے بڑا گہرا شغف تھا، میں نے یہیں سے فن حدیث میں استفادہ کیا" وہ عقلی و نقلی دونوں طرح کے علوم میں فائق تھے، تفسیر، حدیث اور فقہ میں پوری دستگاہ رکھتے تھے، حدیث میں زیادہ ممتاز اور صاحب کمال ہونے کی بنا پر محدث اور محدث رام پور کہے جاتے تھے، مولوی رحمان علی لکھتے ہیں:

"فن حدیث میں خاص امتیاز رکھتے تھے اور محدث کی حیثیت سے بڑی شہرت پائی"۔ (تذکرہ علماء ہند ص ۷۶)

تذکرہ نگاروں نے ان کی علمی جامعیت اور فضل و کمال کا مکمل اعتراف کیا ہے، مولوی محمد فقیر جہلمی لکھتے ہیں:

"فقیہ فاضل، محدث کامل، مفسر تبحر، علامہ عصر، محقق مدقق تھے۔ (حدائق الحنفیہ ص ۴۶۸) نواب صدیق حسن خان مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

کان جامعا للمعقول و المعقول عارفا بالحدیث مشهورا به۔ (ابجد العلوم ج ۳ ص ۹۲۷)

عقلی و نقلی علوم کے جامع اور حدیث کی معرفت میں مشہور تھے۔

حافظ احمد علی خاں تسوق رامپوری کا بیان ہے:

"جملہ علوم سے مناسبت تام تھی اور تمام کتب غیر درسیہ پر مثل کتب درسیہ کے قادر تھے، علوم منقول حدیث، رجال، تاریخ لغت، ادب سب میں کامل تھے، اور عربی زبان میں مطالب علمیہ کو لکھنے میں ید طولیٰ تھا۔ (تذکرہ کاملان رام پور ص ۱۵۹)

مولوی رحمان علی نے بھی ان کو فقیہ، محدث اور مفسر لکھا ہے۔

Marfat.com

درس وافادہ:

علوم کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد اپنے نامور اسلاف کی طرح مسند درس کو رونق بخشی اور علوم کی نشر واشاعت فرمانے لگے، رام پور میں مدۃ العمر ان کے درس وتدریس کا کام اعلیٰ پیمانے پر جاری رہا۔

وفات:

سن وفات میں اختلاف ہے ۱۲۲۹ھ بمطابق ۱۸۱۴ء صحیح معلوم ہوتی ہے، ''شیخ شہید'' سے یہی تاریخ نکلتی ہے، مگر بعض اہل علم نے ۱۲۳۳ھ بمطابق ۱۸۱۸ء بھی لکھا ہے۔

ان کا مدفن رام پور میں بغدادی صاحب کے مزار کے احاطہ میں مسجد کے قریب جانب جنوب واقع ہے۔

اولاد:

شیخ سلام اللہ کی جسمانی یادگار دو فرزند تھے ان کا مختصر حال ہم آگے بیان کریں گے۔

تصنیفات:

ان کی معنوی یادگار حسب ذیل کتابیں ہیں:

(۱) ترجمہ شمائل ترمذی۔ (۲) ترجمہ صحیح بخاری: بعض مصنفین نے اوّل الذکر کا نام ترجمہ فارسی شمائل (مقالات سلیمان ج ۲ ص ۲۵) ترمذی (حدائق الحنفیہ ص ۴۶۸ و تذکرہ علمائے ہند ص ۷۶) لکھا ہے، اور بعض لوگوں کے خیال میں مولانا نے فارسی میں جامع ترمذی کا ترجمہ کیا تھا، اس اعتبار سے اس کا نام ترجمہ ترمذی ہوگا، (تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند ج دوم ص ۳۷۱) گویا انہوں نے بخاری کی طرح سنن ترمذی کا بھی ترجمہ کیا تھا مگر پہلا نام صحیح معلوم ہوتا ہے۔

(۳) خلاصۃ المناقب: یہ مناقب اہل بیت پر ایک رسالہ تھا۔ (نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۰۱)

(۴) رسالہ اصول حدیث: (مقالات سلیمان جلد ۲ ص ۲۵)

(۵) رسالۃ فی الاشارۃ بالسبابۃ عند التشہد فی الصلوٰۃ: نزہۃ الخواطر میں اس کا ذکر ہے، (نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۰۲) اور غالباً اسی کی بنیاد پر مولوی محمد ایوب قادری نے تذکرہ علمائے ہند کے اردو ترجمہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ شیخ نور الحق دہلوی کی تصنیفات کے ضمن میں اسی طرح کے ایک رسالہ اثبات رفع المسبحۃ فی التشہد، کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ (تذکرۃ المحدثین جلد سوم ص ۳۲۹)

(۶) کشف القناع عن اباحۃ السماع: اس کا ذکر صرف ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے اپنے مقالہ سلطنت مغلیہ کا زوال میں کیا ہے۔ (تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند جلد دوم ص ۲۷۰)

(۷) کمالین: یہ عربی کی مشہور متداول تفسیر جلالین کا عربی میں حاشیہ ہے کتب تفسیر میں جلالین اپنے اختصار وجامعیت کی بنا پر بڑی اہم خیال کی جاتی ہے اور وہ اکثر عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہے، مولانا سلام اللہ نے اپنا حاشیہ جلالین ہی کی طرز واسلوب میں مختصر اور جامع لکھا ہے، اس بنا پر اصل تفسیر کی طرح اس کا یہ حاشیہ بھی بہت مقبول ہوا، جو مولانا سلام اللہ کی اہم تصانیف میں خیال کیا جاتا ہے، کمالین کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں ۱۲۸۷ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے تفسیر جلالین کے

Marfat.com

حاشیہ پر جونسخہ چھپا تھا وہ رام پور کے کتب خانہ میں موجود ہے، (بحوالہ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۳۲) ۱۳۱۰ھ میں بھی یہ جلالین کے ساتھ طبع ہوا ہے، یہ نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ہے۔ (فہرست کتب خانہ آصفیہ ج ۲ ص ۲۲۴ و ۲۲۵)

(۸) المحلی بحل اسرار الموطاء: یہ شیخ سلام اللہ محدث رام پوری کی سب سے اہم کتاب ہے جو مؤطا امام مالکؒ کی دو جلدوں پر مشتمل ایک مبسوط شرح ہے اس کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں حدیث کی اصطلاحات کا بیان اور امام مالکؒ کا تذکرہ اور مؤطا کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ (معارف دسمبر ۴۳ ص ۴۲۳) جس سے اس کی اہمیت و خصوصیت ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے بیان کے بموجب انہیں یہ شرح لکھنے کا خیال اس بنا پر ہوا کہ:

''مؤطاء امام مالک حدیث کی اہم اور سب سے قدیم کتاب ہے اور وہی ساری کتب حدیث کی اصل و بنیاد ہے، گو اس کی بہت سے شرحیں لکھی گئیں، جن میں علامہ زرقانی کی شرح زندہ ہے مگر وہ ہمارے دیار میں رائج نہیں، علامہ سیوطی کی شرح لوگوں میں متداول ضرور ہے مگر وہ زیادہ قیمتی نہیں اس لیے میں نے یہ شرح لکھنے کا تہیہ کیا اور اس میں ائمہ فقہ کے مذاہب کے دلائل تحریر کیے اور جن کو میں نے راجح سمجھا مرجح کر کے بتایا، اس سلسلہ میں چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابیں مطالعہ کیں اور ان سے کام کی باتیں منتخب کر کے اس میں سمو دینے کی کوشش کی، اپنی فہم نے جو کام کیا اسے بھی شامل کر دیا مگر کہیں تعصب کو دخل نہیں دیا''۔ (بحوالہ تعارف مخطوطات دارالعلوم حصہ اول ص ۱۱۶)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے یہ شرح کس قدر محنت اور کدوکاوش سے لکھی ہے، نیز اس شرح کی نوعیت اور غرض و غایت کیا تھی، معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پیشتر لکھی جانی والی شرحوں کا انہیں علم نہیں تھا، حالانکہ ان سے پہلے شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے مسوی و مصفی کے ناموں سے عربی و فارسی مؤطا کی بلند پایہ شرحیں لکھی تھیں مگر ان کا اور یعقوب لاہوری (متوفی ۱۰۹۸ء) کی شرح کا بھی انہیں علم نہ تھا۔

سب سے پہلے فہرست مضامین دی ہے اس کے بعد اصل شرح شروع ہوتی ہے جو دو جلدوں میں تمام ہوئی ہے، پہلی جلد میں ابتدا سے کتاب الزکوٰۃ تک کی حدیثوں کی شرح کی گئی ہے اور دوسری میں کتاب الحج سے آخر تک کی شرح ہے۔

محلی موطاء امام مالک کی ایک محققانہ شرح ہے، (حیات امام مالک ص ۱۰۲) جو زرقانی کی شرح کی طرح ضخیم ہے، اس میں مشکل الفاظ کی لغوی تشریح اور مطالب کو حل کر کے فقہی مسائل سے بھی تعرض کیا گیا ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ مشہور فاضل ڈاکٹر زبید احمد کے اس بیان سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

''محلی مسوی سے زیادہ جامع ہے مگر مسوی کی ترتیب محلی کی ترتیب سے بہتر ہے''۔ (معارف دسمبر ۱۹۴۳ء ص ۴۲۳)

ممکن ہے اس بیان میں کسی قدر مبالغہ ہو عام اہل نظر کے نزدیک شاہ صاحب کی شرح حسن ترتیب اور عمق نظر کے اعتبار سے محلی سے بدرجہا بہتر ہے، (تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند جلد دوم ص ۱۷۳) تاہم یہ مسلّم ہے کہ شیخ سلام اللہ کی شرح اہمیت اور فائدہ سے خالی نہیں۔ مصنف کو اس کی تالیف سے ۱۲۱۵ھ میں فراغت ملی، پہلے صفحہ پر ھو الفضل الکبیر مادہ تاریخ درج ہے جس سے ۱۲۱۵ھ تاریخ تالیف برآمد ہوتی ہے۔ (حیات امام مالک ص ۱۰۲ و حدائق الحنفیہ ص ۴۶۸)

اس شرح کے قلمی نسخے بعض کتب خانوں میں موجود ہیں، (مثلاً کتب خانہ دارالعلوم دیوبند) خدا بخش خان لائبریری کا مخطوطہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ خاص مصنف کا نسخہ ہے۔ (حیات امام مالک ص ۱۰۲)

Marfat.com

مولانا نورالاسلام رحمۃ اللہ علیہ

یہ شیخ سلام اللہ محدث رامپوری کے صاحبزادے اور جانشین تھے، خود بھی صاحب کمالات تھے، حافظ احمد علی خاں شوق تحریر فرماتے ہیں:

''مولوی نورالاسلام ان (شیخ سلام اللہ) کے جانشین تھے سلامت طبع، رسائی فکر اور اصابت رائے میں مغتنمات روزگار ہیں''۔

(تذکرہ کاملان رام پور ص ۱۵ و ۴۲)

عقلی و نقلی دونوں علوم میں ممتاز اور اچھی دسترس کے مالک تھے، طب و ریاضی میں درجہ کمال پر فائز تھے، نواب صدیق حسن خان صاحب فرماتے ہیں:

برع فی العلوم العقلية و النقلية لا سيما علم الرياضی۔ (ابجد العلوم ج ۳ ص ۹۲۷)

وہ علوم عقلیہ و نقلیہ خصوصاً علم ریاضی کے ماہر تھے۔

حکیم مولانا سید عبدالحیٔ رقمطراز ہیں:

وصار بارعاً فی الهيئة و الهندسة و الحساب و غيرها من الفنو ن الرياضية۔

(نزهته الخواطر ج ۷ ص ۵۱۰)

ہیئت، ہندسہ اور حساب وغیرہ فنون ریاضی میں ماہر و کامل تھے۔

حافظ احمد علی خاں شوق کا بیان ہے۔

''اس وقت رامپور میں ان کی مثل کوئی ریاضی دان نہ تھا فن ریاضی ان کی وجہ سے رام پور میں شائع ہوا''۔

(تذکرہ کاملان رام پور ص ۴۳۶)

صاحب نزہۃ الخواطر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ولادت و نشو و نما رام پور میں ہوئی تھی لیکن حافظ احمد علی خاں شوق فرماتے ہیں کہ: ''نواب سید احمد علی صاحب بہادر کے عہد میں دہلی سے رام پور آئے اور سو روپے ماہانہ کے ملازم ہوئے'' (ایضاً ص ۴۳۷) نیز ''رامپور کے مفتی عدالت رہے''۔ (ایضاً ص ۴۱۵)

تعلیم:

کتب متداولہ اور طب کا درس اپنے والد اور ملا حسن بن غلام مصطفیٰ اور ملک العلاء عبدالعلی بن نظام الدین فرنگی محلی سے لیا۔

(ایضاً ص ۴۳۶ و نزہۃ الخواطر جلد ۷ ص ۵۱۰)

ان کی عظمت اور علمی جامعیت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ متعدد کامل الفن حضرات ان کے حلقہ درس سے وابستہ تھے، چند نام یہ ہیں:

حکیم محمد اعظم خان: رام پور کے اچھے طبیب تھے، ان کے آباؤ اجداد سوات سے پہلے بدایوں اور پھر رام پور میں وارد ہوئے، شعر و شاعری سے بھی شغف تھا، اکسیر اعظم اور دوسری تصانیف یادگار چھوڑیں، ۱۳۲۰ھ میں اندور میں انتقال کیا اور

Marfat.com

وہیں دفن ہوئے۔ (تذکرہ کاملان رام پور صفحات ۴۳، ۴۷، ۴۳)

مولانا غیاث الدین: انہوں نے مولانا نورالاسلام سے علم طب حاصل کیا تھا، غیاث اللغات اور دوسری کئی کتابوں کی مصنف تھے، نواب سید یوسف علی خان بہادر فردوس مکان اور نواب سید کلب علی خان بہادر خلد آشیاں کے استاد تھے، ان کا مولد و مدفن رام پور ہے ۲۲ رذی الحجہ ۱۲۶۸ھ کو انتقال ہوا۔ (تذکرہ کاملان رام پور ص ۳۰۶)

مولوی حافظ حبیب النبی رقت: ۱۲۰۸ میں رام پور میں پیدا ہوئے تفسیر و حدیث کی سند پہلے مولانا نورالاسلام سے لی، پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ سے لی اور وہاں درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دی کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، نمونہ کلام انتخاب یادگار میں درج ہے اردو میں قصیدہ طحاویہ کی مبسوط شرح لکھی، ترپین برس کی عمر میں ۴ ررجب ۱۲۶۱ھ کو کلکتہ میں وفات ہوئی۔

(ایضاً ص ۱۰۱)

☆ مولوی نصیر الدین خان صابر: علوم عربیہ کی تحصیل مولانا نورالاسلام سے کی، نہایت ذہین شخص تھے، حافظ احمد علی خان شوق کا بیان ہے کہ "علم ادب میں بڑے ذی کمال، علم معقول میں بے عدیل اور نثر عربی لکھنے میں بے مثال تھے، فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے، انتخاب یادگار میں کلام کا نمونہ دیا ہے، عربی میں کئی رسالے لکھے تھے، حکمائے یونان کے عقائد کی تردید میں بھی ایک کتاب لکھی تھی، چون برس کی عمر میں ۲۷ رذی الحجہ ۱۲۶۶ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے دادا مولوی غلام جیلانی کی قبر کی متصل ہی مدفون ہوئے۔

☆ مولوی نصیر الدین کے تلامذہ میں رامپور کے مشہور محدث مولانا ارشاد حسین مجددی عالم متجر حافظ غلام نبی اور نواب خلد آشیاں جیسے لوگ شامل تھے۔ (تذکرہ کاملان رام پور صفحات ۴۱۵ تا ۴۱۷)

☆ مولوی عبدالعلی خاں: یہ ریاضی میں مولانا نورالاسلام کے شاگرد تھے، (ایضاً ص ۴۳۷) انہوں نے دہلی جا کر شاہ اسحاق صاحب سے حدیث کا درس لیا، ان کی ولادت رام پور میں ہوئی، نواب سید کلب علی خان بہادر اور نواب سید یوسف علی خان بہادر ان کے شاگرد تھے، مدرسہ عالیہ رام پور میں مدرس اوّل رہے، مدرسہ کے علاوہ مکان پر بھی ریاضیات کا درس جاری رہتا تھا، صاحب تصانیف تھے، سرکار سے وظیفہ ملتا تھا، ۱۳۰۳ھ میں انتقال ہوا۔ (ایضاً ص ۲۲۸ و ۲۲۹)

وفات:

وفات کا سال معلوم نہیں تاہم ۱۲۴۷ھ تک زندہ رہنے کا ثبوت ملتا ہے، ان کی قبر رام پور میں شاہ بغدادی صاحب کے احاطہ مزار میں ہے۔ جہاں ان کے والد ماجد بھی دفن ہیں۔

تصنیفات:

شیخ نورالاسلام کی تصنیفات کے نام یہ ہیں:

۱: رسالہ اسطرلاب: فارسی زبان میں ۲۸ صفحات پر مشتمل اس رسالہ کو نواب نصر اللہ خان بہادر کے نام معنون کیا تھا، ۲۷ رربیع الثانی ۱۲۲۰ھ کو اس کی تالیف سے فارغ ہوئے، کتب خانہ رام پور میں قلمی نسخہ موجود ہے۔ (ایضاً ص ۴۳۷)

۲: رسالہ بحث زماں: یہ ایثار الحق کے نام سے بھی موسوم ہے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۵۱۰)

Marfat.com

۳: رسالہ بحث مکان: یہ ۲۴ صفحے کا عربی رسالہ جس کی تالیف سے ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۴۷ھ کو فارغ ہوئے، کتب خانہ رام پور میں قلمی نسخہ موجود ہے۔ (ایضاً و تذکرہ کاملان رام پور ص ۴۳۷)

۴: رسالہ اصول حدیث۔ (نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۵۱۰)

۵: حاشیہ علی میر زاہد علی الرسالۃ القطبیۃ، اس کا قلمی نسخہ رام پور کے کتب خانہ میں ہے۔
(تذکرہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی ص ۲۳۶)

۶: حاشیہ علی شرح السلم۔ (نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۵۱)

شیخ محمد سالم رحمۃ اللہ علیہ

ابوالخیر محمد سالم، شیخ سلام اللہ کے فرزند اور شیخ نور الاسلام کے بھائی تھے، اپنے عہد کے علما سے کسب فیض کیا، تعلیم مکمل کرنے کے بعد حج و زیارت کیلئے حرمین شریفین تشریف لے گئے، پھر وطن واپس آکر درس و تدریس میں لگ گئے، ان کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

۱: رسالہ اصول الایمان: یہ ایک مقدمہ اور پانچ فصلوں پر مشتمل ہے، جو دہلی سے ان کی زندگی میں ۱۲۵۹ھ میں چھپا تھا۔

۲: رسالہ در بیان سماع۔

۳: رسالہ عذب نہر، یہ حزب البحر کا فارسی ترجمہ ہے۔

۴: رسالہ نور الایمان۔

۵: طریق السالم۔

۶: لطائف الاسرار: یہ تعویذ اور عملیات پر مشتمل رسالہ ہے۔ (بحوالہ مراۃ الحقائق)

ان دونوں بھائیوں کے بعد شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے خاندان کی علمی حیثیت باقی نہیں رہی، حدیث سے شغف و انہماک کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا، البتہ آخری دور میں دو بزرگ مولانا انوار الحق حنفی اور مولانا برکت علی حقی دہلوی ایسے پیدا ہوئے جن کو اپنی خاندانی روایات نہایت عزیز تھیں اور انہوں نے شیخ محدث اور دوسرے بزرگوں کے حالات کی اشاعت اور ان کی تصنیفات کی حفاظت پر بڑی توجہ مبذول کی۔

اول الذکر ۱۸۳۸ھ میں پیدا ہوئے، دہلی میں تراہہ بہرام خان میں رہتے تھے، انہوں نے مولانا صہبا سے فارسی، مولانا مملوک علی کے تلمیذ مولوی مشتاق احمد سے حساب و ہندسہ، مفتی صدر الدین خاں سے منطق، مولانا حیدر علی فیض آبادی سے علم کلام اور مولانا عبد الرزاق سے شرح وقایہ اور ہدایہ کا درس لیا، شروع میں علم سے اشتغال رہا اور شیخ محدث کی کتابوں کو جمع کیا، مگر غدر کے بعد زندگی بدل گئی اور میرٹھ میں سرکاری ملازمت اختیار کر لی، اور خان بہادر کا خطاب ملا، شیخ محدث کے مکتوبات کی اشاعت کا سہرا انہی کے سر ہے، شاہ کلیم اللہ دہلوی کے حالات میں ان کا ایک مختصر رسالہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے

Marfat.com

کتب خانہ کے ذخیرہ سرشاہ سلیمان میں موجود ہے، جس کے ساتھ میر حسن علا سجزی صاحب فوائد الفواد کی ایک مختصر لیکن نایاب تصنیف مخ المعنی بھی شامل ہے جو شیخ نظام الدین اولیاء کو بہت پسند تھی۔

دوسرے بزرگ مولانا برکت علی حنفی نے مراۃ الحقائق لکھی جو شیخ محدث کے حالات پر مشتمل ہے۔ [۱]

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس طرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا فیضان ان کے اولاد واحفاد کے ذریعہ کئی صدی تک جاری رہا اسی طرح ان کے اوران کے سلسلہ کے تلامذہ کی بدولت بھی ان کے علوم وافکار کی اشاعت مدتوں ہوتی رہی، یہاں ان لوگوں کے ناموں کی ایک مختصر فہرست پیش کی جاتی ہے، طوالت کے خوف سے ان کے حالات وخدمات کی تفصیل قلم انداز کردی گئی ہے۔

١. خواجہ حیدر پٹلو ربن فیروز کشمیری (۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء)
٢. خواجہ خواجہ معین الدین (م ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء)
٣. بابا داؤد مشکاتی کشمیری (م ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۵ء)
٤. میر سید مبارک بلگرامی (۱۰۳۳ھ/۱۱۱۵ھ/۱۶۲۴ء تا ۱۷۰۳ء)
٥. میر عبدالجلیل بن احمد حسینی بلگرامی (۱۰۷۱ھ/۱۱۳۸ھ/۱۶۶۰ء تا ۱۷۲۵ء)
٦. شیخ عنایت اللہ شال کشمیری (م ۱۱۸۵ھ/۱۷۱۳ء)
٧. غلام علی آزاد بلگرامی (۱۱۱۶ھ تا ۱۲۰۰ھ/۱۷۰۴ء تا ۱۷۸۵ء)

[۱] یہ معلومات پروفیسر شیخ خلیق احمد نظامی کی تصنیف حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے ماخوذ ہیں۔ (دیکھئے ص: ۲۶۴)

Marfat.com

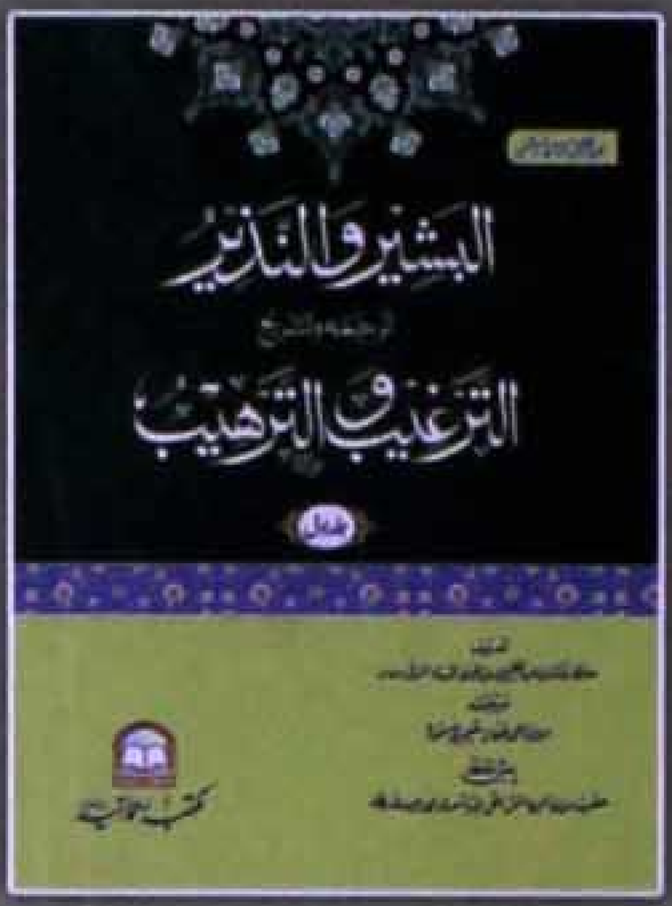

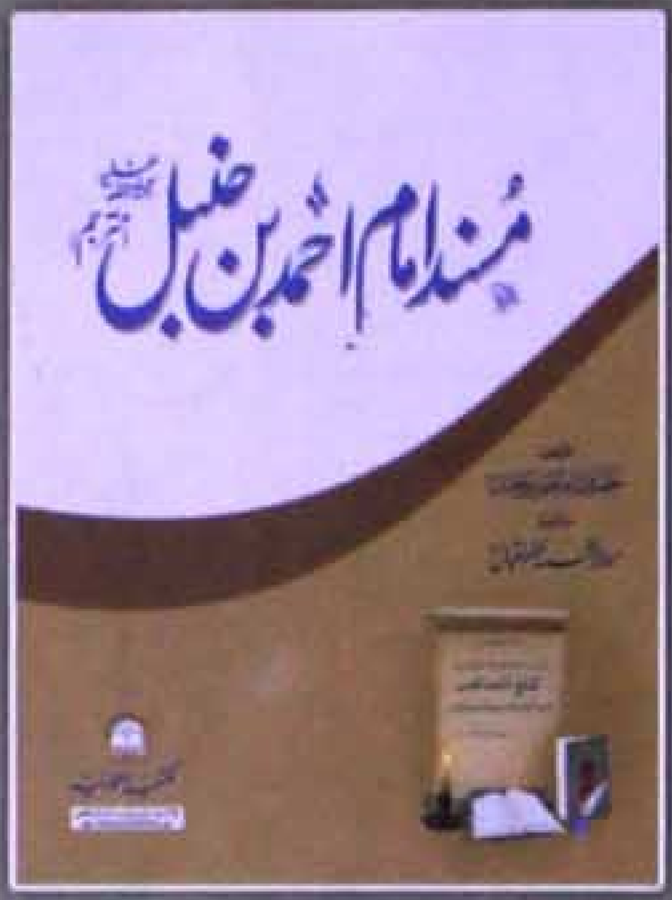

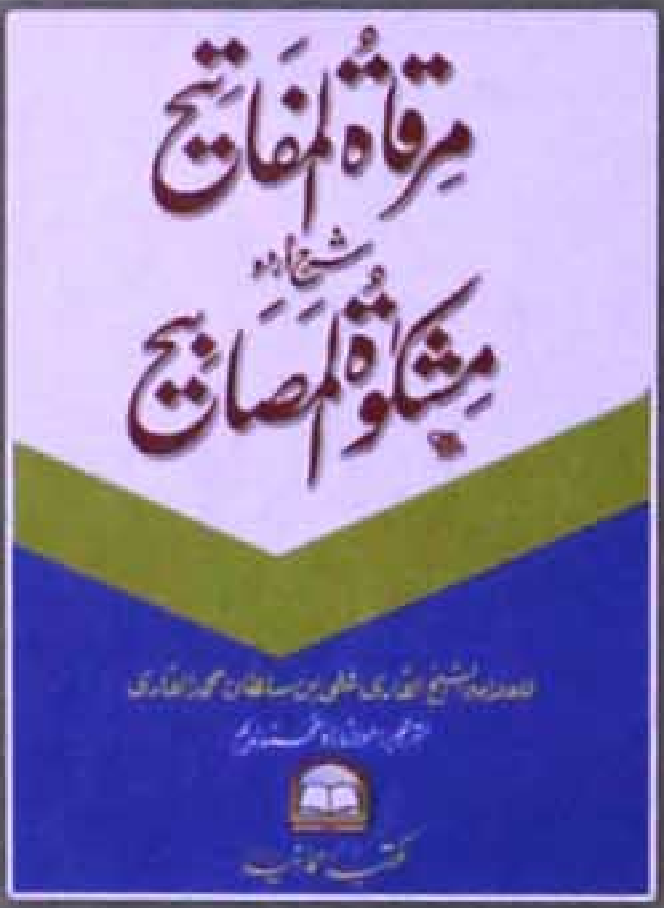

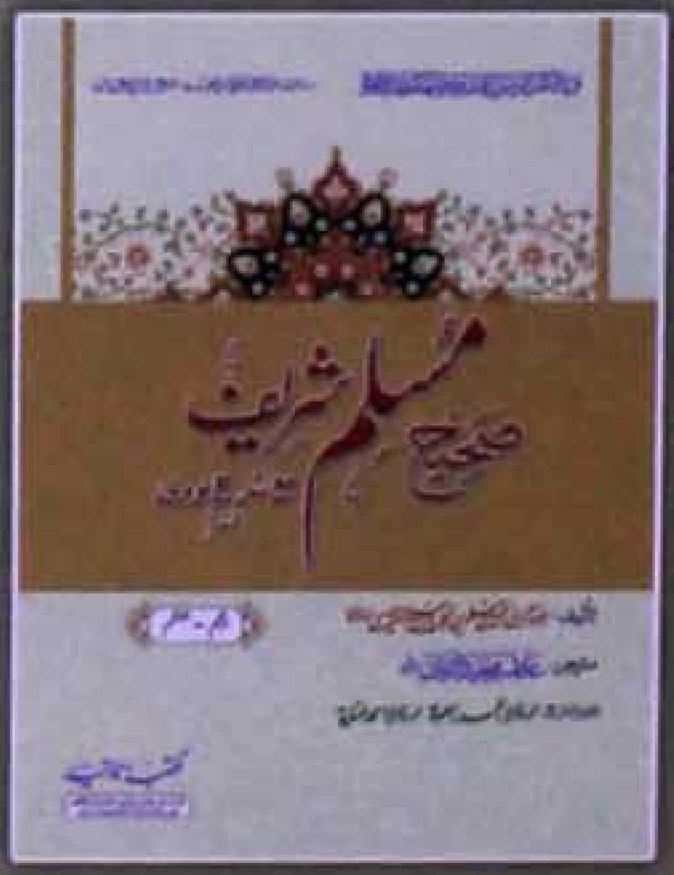

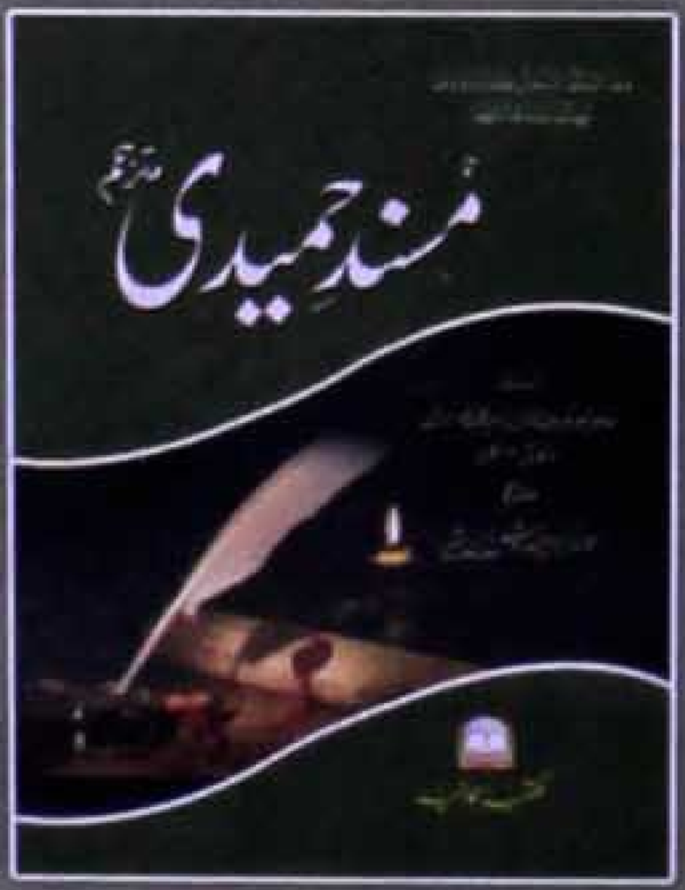

مکتبہ رحمانیہ

اقرأ سنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
فون: 042-37724228-37355743

MAKTABA-E-REHMANIA